
تحریک

سرورق ۔ مصلح احمد

جدید شاعری : ایک سمپوزیم

ناولٹ

انجمن ترقی پسند مصنفین

نظمیں

سالنامہ ۱۹۷۰

AHMAD
FARAZ
NAYYAR

دورِ جدید میں

جبکہ ہر شے میں ملاوٹ کا بازار گرم ہے

ایمانداری

ہماری ترقی کی علامت ہے
ہماری مصنوعات میں
عطر حنا ، عطر خس ، عطر گلاب ، عطر کیوڑہ
کے علاوہ

عرق کیوڑہ اور عرق گلاب

کو خصوصی مقبولیت حاصل ہے

ایم ہارون اینڈ کمپنی

کے تیار کردہ عطریات خالص صندل ، دیسی مسالوں اور تازہ
پھولوں سے ہی تیار کیے جاتے ہیں

ایم ہارون اینڈ کمپنی ، پرفیومرس ، منصور نگر لکھنؤ

کتاب

اپنی باتیں

ادیب اور قاری کے رشتہ کو یوں تو ادب میں ہمیشہ سے اہمیت حاصل رہی ہے لیکن آج اس کی اہمیت میں اور بھی اضافہ ہوگیا ہے۔ پہلے ادیب کو ایک طرح سے اس بات کا حق حاصل تھا کہ وہ اپنے قاری کا انتخاب کرے ــــــ رسائل، کتابوں اور لائبریریوں کی تعداد محدود تھی اور ان تک ہر شخص کی رسائی ممکن نہ تھی۔ پھر پہلے زیادہ تر علمی اور ادبی رسائل ہی شائع ہوتے تھے، تجارتی نہیں۔ اور وہ خواص کے ایک محدود حلقہ میں گھوم پھر کر رہ جاتے تھے ــــــ لیکن آج صورت حال بالکل مختلف ہے۔ دیوان غالب کی جتنی جلدیں اور انتخابات پچھلے دس برسوں میں شائع ہوئے اور فروخت ہو گئے اتنے غالب کی زندگی سے دس سال ادھر تک فروخت نہ ہوئے ہونگے۔ یہی حال دوسری کتابوں اور رسائل کا بھی ہے۔ گھٹیا دوسرے اور تیسرے درجہ کے ادب کے ساتھ ساتھ اچھا ادب بھی تیزی سے فروخت ہوتا ہے۔ ملک کے طول و عرض میں پھیلی ہوئی سیکڑوں، ہزاروں لائبریریوں میں اچھی بری، ہر طرح کی کتابیں، ناولیں، افسانوی اور شعری مجموعے اور ایک حد تک تنقیدی کتابیں تک خریدی جاتی ہیں اور مہینہ دو مہینہ میں پرانی ہو جاتی ہیں۔ آج کتابیں مشہور ہونے کے بعد فروخت نہیں ہوتیں، فروخت ہونے کے بعد مشہور ہوتی ہیں۔ بیشتر کتابوں پر تبصروں کی نوبت اس وقت آپاتی ہے جب ان کی خاصی تعداد بک چکتی ہے۔

ادب آج ایک مخصوص حلقہ کا خصوصی حق نہیں رہ گیا ہے بلکہ اگر آپ اقتصادیات کی اصطلاح استعمال کرنے کی اجازت دیں تو کہوں "عوام کی ملکیت" بن گیا ہے ــــــ آج سے دو دہائی ادھر کوئی ادیب یا شاعر کسی ایسے شخص کے خط یا رائے پر غور کرنے کے بھی تیار نہ ہوتا جو اس کے خیال میں فن کی لطافتوں اور نزاکتوں سے بے بہرہ ہو لیکن آج کوئی فنکار عام قاری کی رائے کو نظر انداز نہیں کر سکتا ــــــ رسائل میں شائع ہونے والے خطوط اس رجحان کی علامت ہیں۔ ہندوستان اور پاکستان کے تقریباً سارے ہی ادبی رسائل قاری کی رائے کا احترام کرنے، اکثر اس سے اختلاف رکھتے ہوئے بھی انکی رائے کی اشاعت پر خود کو مجبور پاتے ہیں۔ اسے مدیروں کی 'بدعت' کہہ کر ٹالا نہیں جا سکتا۔

آج ادیب کی سماجی اہمیت بھی پہلے سے کہیں زیادہ ہے۔ ویٹ نام کی جنگ کے خلاف ادیبوں کے بیانات متعلقہ حکومتوں کی نظروں میں شاید سیاسی جماعتوں کے بیانات سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ فنکار آج رائے عامہ کو جس طرح متاثر کرتا ہے پہلے کبھی نہ کرتا تھا۔ پہلے ادیب "آنکھیں میری باقی ان کا" ہی کہنے پر اکتفا کرتا تھا لیکن آج کا دانشور کرشنا مینن اور پنڈت آنند نرائن ملّا کے انتخابات میں علانیہ طور سے باقاعدہ اپیل بھی کرتا ہے اور اثر انداز بھی ہوتا ہے۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] | [illegible]



[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

آسان، ماھوار

قسطوں پر

قرض حاصل کیجئے

ہماری قرض اسکیم کی تفصیلات حسب ذیل ہیں جن سے آپ
فائدہ اٹھا سکتے ہیں

ماہانہ قسط	تعداد ممبران	مدت	قرض کی رقم
10 روپے	40	40 ماہ	320 روپے
20 روپے	40	40 ماہ	640 روپے
50 روپے	40	40 ماہ	1,600 روپے
100 روپے	40	40 ماہ	3,200 روپے

اس گروپ میں ہر ماہ ایک ممبر کو قرض ملے گا۔ قرض کا فیصلہ
قرعہ اندازی سے ہو گا

قرض نہ لینے والے ممبروں کو قسطوں میں دس فیصدی چھوٹ ملے گی

تردیپ انویسٹمنٹ پرائیوٹ لمیٹڈ

فلیٹ نمبر ۲۔ نیو مارکٹ۔ حضرت گنج۔ لکھنؤ
برانچ:۔ بابی ہوٹل، گول گھر، گورکھپور

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

احساس اور اظہار کے باوجود بعض نئے شعراء کے یہاں مغرب کی سطحی تقلید یا ماخوذ شاعری دونوں باتیں بکثرت مل جائیں گی۔

جیسا کہ اوپر کہا گیا نئی شاعری سے پہلے اردو شاعری کے سامنے جو تصورات اور آدرش تھے وہ سب کے سب مضحکہ خیز اور فرسودہ نہیں ہوگئے ہیں۔ مثلاً رومانیت یا کسی طرح کا آدرشی مزاج اب بھی پڑھنے والوں کو متاثر کرسکتا ہے۔ مثلاً حسرت کا یہ شعر۔

حسن بے پروا کو خود بیں و خود آرا کر دیا
کیا کیا میں نے کہ اظہار تمنا کر دیا

یا اختر شیرانی کا یہ شعر۔

یہ کس کو دیکھ کر دیکھا ہے میں نے بزم ہستی کو
کہ جو شئے ہے خدائی میں حسیں معلوم ہوتی ہے

یا اقبال کا یہ شعر۔

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی

یا میر کا یہ شعر۔

دور بیٹھا غبار میر اس سے
عشق بن یہ ادب نہیں آتا

بات یہ ہے کہ ادب میں زندگی کی طرح نئے اور پرانے کا فرق صرف اچھے اور برے کے پیمانے سے ناپنا غلط ہوگا۔ پرانے موضوعات کو جس طرح تازگی اور نیا پن عطا کیا جاسکتا ہے یا ان میں انفرادی احساس کی آنچ آسکتی ہے، بالکل اسی طرح نئے احساس میں نئے پن کے حقیقی وجود کی بجائے خود نمائی، محض مختلف ہونے کا جذبہ یا ایسے جذبات کی نمائش بھی ہوسکتی ہے جو محض بغاوت کی وجہ سے یا مغرب کی تقلید میں ہوسکتے ہیں، یا ان میں ریاض کی کمی یا چونکانے کا جذبہ بھی ہوسکتا ہے جس کی زیادہ قدر و قیمت نہیں ہے۔ ہاں پرانے پن اور فرسودگی میں فرق ہے۔ فرسودگی اس وقت محسوس ہوتی ہے جب کوئی روایتی مضمون اس طرح آتا ہے کہ اس میں کوئی جان، کوئی کیفیت، کوئی جذبہ نہیں ملتا۔ بلکہ اس مضمون کی تکرار سے ذہن ایک ناگواری محسوس کرتا ہے کہ یہ تو اگلے برس کی تیلیاں ہیں یا وہ جذبہ جس طرح پہلے ادا ہوتا تھا اور ذہنوں کو متاثر کرتا تھا، آج کا ذہن اس منزل سے آگے نکل چکا ہے۔ مثلاً اصغر کا یہ مصرعہ

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موج حوادث سے

مضحکہ خیز نہیں ہے۔ ہاں دوسرے مصرعے میں شاعر نے جو محاسیات استعمال کئے ہیں اس کی وجہ سے پورا شعر بھی اب اس طرح متاثر نہیں کرتا جس طرح پہلے کرتا تھا۔ ہاں جنون، وحشت، محبوب کی نزاکت، رشک کے وہ مضمون جو پرانے شعراء نظم کیا کرتے تھے اب مضحکہ خیز ہوگئے ہیں۔ مضحکہ خیز مضمون وہ ہوتا ہے جو آج بیان کیا جائے مگر انیسویں صدی کے مناسبات کے ساتھ بیان کیا جائے۔ فرسودہ مضمون وہ ہوتا ہے جو اپنی کیفیت کھو چکا ہو جس طرح موڑ کی بیٹری ہے جس کی توانائی ختم ہوگئی ہے اور اسے استعمال کرنے کی کوشش کی جارہی ہے یا گنڈیری کا رس چوسا جاچکا ہے اور اس کے پھوک سے دل بہلانے کی کوشش کی جارہی ہے۔

نئی شاعری آج کے لمحے بہ لمحہ وسیع تر ہوتے ہوئے تہذیبی، علمی اور ذہنی افق اور معاشرتی اور نفسیاتی پس منظر کو دیکھتے ہوئے عصری شعور اور احساس کے اظہار کی ذمہ داری ابھی پوری نہیں کرسکی ہے، ہاں اس کی کوشش ضرور کررہی ہے اور اس کوشش کے جو نتائج سامنے آئے ہیں

اور جذبہ کی گہرائی کی وجہ سے متاثر کرے، جب اس کے تجربے کی سچائی پڑھنے والے کے دل میں بھی گھر کر سکے۔ بہت سے نئے شاعر اس لحاظ سے کامیاب ہیں اور بہت سے ناکام۔ لیکن شاعر اگر عام قاری کو بالکل نظر انداز کرتا ہے اور اپنے لئے یا اپنے ایک مخصوص حلقے کے لئے لکھتا ہے یا من مانے اشاروں یا علامات سے کام لیتا ہے تو اس کی حیثیت اس قافلے کی ہے جو اتنی گرد اڑاتا ہے کہ نظر نہیں آ سکتا۔ ناقدوں کا معاملہ دوسرا ہے۔ اچھا ناقد نہ صرف کلاسیکل مزاج اور آہنگ کو پہچانتا ہے، وہ تجربوں کے امکانات اور اظہار کے نئے سانچوں کے لئے بھی اپنے ذہن کے دریچے کھلے رکھتا ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ سب ناقد ایک سے نہیں ہوتے کچھ حسن کی ایک ہی ادا سے مانوس ہوتے ہیں اور اس کے ہزار شیوہ انداز کو نہیں پہچان سکتے۔ اگر نئی شاعری سب پڑھنے والوں یا سب ناقدوں سے خراج تحسین وصول نہیں کرتی تو یہ قدرتی بات ہے۔ بہت سے پڑھنے والے ادب میں صرف اپنے پسندیدہ موضوعات دیکھتے ہیں، کچھ صرف ایک طلسمی فضا کے قائل ہوتے ہیں، کچھ رومان یا آدرش واد کے مارے ہوتے ہیں، کچھ ایک خاص حقیقت پسندی کے جس طرح تصویر میں کسی کی مشابہت ڈھونڈنے والے جدید مصوری خصوصاً تجریدی آرٹ کو نہیں سمجھ سکتے، اسی طرح غزل کے رسیا یا کھلے اخلاقی یا واضح سماجی میلان کے دلدادہ فن کے اپنے اخلاقی اسلوب، اپنی سماجی تنقید اور اپنے مخصوص طریقۂ کار کے ساتھ انصاف نہیں کر پاتے۔ یہ بات ہر ادب کے پڑھنے والوں میں مل جائے گی۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ مغرب میں شاعری سے سنجیدہ دلچسپی لینے والوں اور اس کی عظمت کو سمجھنے والوں کی تعداد زیادہ ہے گو اسے نظر انداز کرنے والوں کی تعداد اس سے کئی گنا زیادہ ہے۔ ہمارے یہاں شاعری کو بے وقت کی راگنی سمجھنے والوں یا اسے سستے نشے کے طور پر استعمال کرنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے مگر نسبتاً سنجیدہ دلچسپی لینے والوں کی تعداد مغرب کے مقابلے میں بہت کم ہے۔ ہاں شاعری سے کام لینے کو اور اپنا کام نکالنے کو ہر ایک تیار رہتا ہے اور اس گناہ میں سبھی کم و بیش شریک ہیں۔

جدید شعرا نے میرے نزدیک قارئین تک اپنا مافی الضمیر پہنچانے کی سنجیدہ کوشش کی ہے، مگر ایسے شعرا کی تعداد ابھی خاصی ہے جو اس معاملے میں سارا بوجھ پڑھنے والے پر ڈال دینا چاہتے ہیں۔ میرے خیال میں ابہام کی جو نئے ادھر بڑھی ہے وہ خطرناک ہے۔ یہ وہ ابہام نہیں ہے جو معنی کی کئی تہوں کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے اور قابل قدر ہے۔ یہ وہ ابہام ہے جو ابلاغ کی ضروریات کو نظر انداز کرنے کی وجہ سے ہے یا شاعر کے صرف اپنے ذہن کے دھندلکے کی تصویر کھینچنے کی وجہ سے ہے۔ شاعری احساس کی رو کو قلم بند کرنے کا ہی نام نہیں، اس رو میں کوئی تصویر، کوئی فارم پیدا کرنے کا نام ہے۔

نئے شعرا میں سے میراجی، راشد، اختر الایمان، مختار صدیقی، مجید امجد، منیب الرحمن، خلیل الرحمن اعظمی، ابن انشا، مصطفیٰ زیدی، حامد عزیز مدنی، عمیق حنفی، وحید اختر، باقر مہدی، وزیر آغا، بلراج کومل، شاذ تمکنت، شہریار، کمار پاشی، افتخار جالب، محمد علوی، عادل منصوری کا مطالعہ میرے نزدیک اس رجحان کے متعلق ایک واضح تصور قائم کرنے میں مدد دے سکتا ہے۔ یہ فہرست مکمل نہیں ہے لیکن اس میں نئی شاعری کے کئی نمائندہ رنگ مل جائیں گے۔ افتخار جالب اور عادل منصوری کے یہاں اس شاعری کے وہ رنگ بھی نظر آ سکتے ہیں جو معترضوں کو بہت کچھ مواد مہیا کرتے ہیں۔

ہمارا نصاب تعلیم سوچ سمجھ کر نہیں بنایا گیا ہے۔ اس کے پیچھے کوئی واضح اور مرتب شعور نہیں ہے جس طرح ہمارے شہر بس ضروریات کے تحت وجود میں آ گئے ہیں اسی طرح نصاب تعلیم بس بن گیا ہے۔ ہاں جس طرح اب شہروں کی پلاننگ کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے اسی طرح نصاب تعلیم کے منصوبے کی بھی بات چلی ہے۔ ہم نے دراصل ادبیات کو ابھی تک مناسب اہمیت نہیں دی۔ یا زبان کو دی یا اخلاقی یا سیاسی یا سماجی مسائل کو۔ اگر ہم ادبیات کی اہمیت کو سمجھتے ہوتے اور زبان کے ارتقا، تہذیب کے تصور، جمالیات کے مسائل، عالمی ادبی معیار، اپنے کلاسیکل ادب کی عظمت اور قانون قدرت کے مطابق اس کی کوکھ سے پیدا ہونے والے جدید ادب کے وجود کا، پورا احساس رکھتے تو

حسین ٹریڈرز

فون نمبر ۔ ۲۴۵۸۶ | فون نمبر 24586

دہ ہے جب

زندگی کی جدوجہد، بھاگ دوڑ، ترقی کی طرف بڑھتے ہوئے ہر قدم اور
وقت سے آگے نکل جانے کی کوششوں میں ایک قابل اعتماد

سائیکل آپ کی مددگار بنتی ہے

ہر قسم کی بائیسکل

ریلے ۔ ہند ۔ ہرکولیس ۔ ایون ۔ ہیرو ۔ رابن ہڈ

وغیرہ وغیرہ

آسان قسطوں پر خریدنے کے لئے
ہماری خدمات سے فائدہ اٹھایئے

یونائیٹڈ برادرز ۔ ۴۷ لاٹوش روڈ لکھنؤ

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

کر سے میں دیکھا تو جی جان سے اس پر عاشق ہو گیا۔ کیونکہ کر۔ کولہے۔ اور سینے کا تناسب وہی تھا جو مس یونیورس کے مقابلے میں سٹینڈرڈ مانا جاتا ہے۔ اس ربڑ کی عورت کی جلد کسی بھی خوبصورت عورت کی جلد کی طرح بے داغ اور خوبصورت تھی۔ نرم۔ ملائم۔ چکنی اور صاف ستھری نکھری گلابی رنگت۔ آنکھیں بڑی بڑی اور روشن کٹیلی۔ سینہ ابھرا ہوا۔ گردن لانبی۔ داہنے گال پر ایک تل۔ ہر طرح نک سک سے درست اس ربڑ کی عورت میں وہ سب کچھ تھا۔ جو مختلف جگہوں میں مختلف عورتوں میں کہیں کہیں پر ملتا ہے۔ مگر ایک جگہ کسی عورت میں نہیں ملتا۔ اسپرنگ اتنے اچھے اور بے آواز لگے ہوئے تھے کہ ذرا سی جنبش سے گردن کا زاویہ بدلا جا سکتا تھا اور گردن کے زاویے بدل جانے سے آنکھوں کی پتلیوں کا زاویہ بھی بدل جاتا تھا۔ یہ عورت ڈرائنگ روم کے صوفے پر بیٹھ سکتی تھی پلنگ پر لیٹ سکتی تھی۔ کروٹ بدل سکتی تھی۔ کھڑی ہو سکتی تھی۔ جس پوز میں چاہیئے آپ اس کے ہاتھوں کے زاویے بدل سکتے تھے۔ حسن نے بڑی احتیاط سے اسے جانچا پر کھا اور ہر طرح سے درست پایا۔ تین ہزار روپے ضرور خرچ ہوتے تھے۔ مگر گوشت پوست کی ایسی عورت تین لاکھ میں نہیں مل سکتی تھی۔ حسن بیحد خوش ہوا۔ فوراً ایک ڈبے میں اسے پیک کروا کے حفاظت اپنے گھر لے آیا۔

پہلی سوچی ہوئی اسکیم کے تحت اس نے سب نوکروں کو چھٹی دے دی تھی۔ اور ان چھ ماہ میں اس نے خود کھانا پکانا سیکھ لیا تھا۔ اور گھر کے دوسرے کام کاج میں بھی دسترس حاصل کر لی تھی۔ ان چھ ماہ کے عرصے میں وہ اس ربڑ کی عورت کے لئے انواع و اقسام کے کپڑے خریدتا رہا تھا۔ اور درزی سے سلواتا رہا تھا۔ عمدہ ساڑھیاں اور دنیا کے وہ تمام رنگ جو اسے پسند تھے۔ کامدانی غرارے اور کڑھے ہوئے کرتے اور جھلمل کرتے ہوئے نظروں کو خیرہ کرنے والے دوپٹے۔ اور بیئر اور فراکیں اور سینڈل اور وہ سب سامان آرائش جو ایک عورت کے لئے بیحد ضروری ہوتا ہے۔

باہر کی کھڑکیاں اور دروازے بند کر کے اس نے وہ کنڈ لگشن کھولا۔ ڈبے میں پیک کی گئی عورت کو نکالا۔ اسے کرتا غرارہ پہنایا۔ اس کے کانوں میں کرن پھول سجائے۔ گلے میں گلوبند پہنایا۔ ہاتھوں میں کنگن۔ سر اور بال کھلے رکھ کر اسے صوفے پر بٹھایا۔ دیر تک اس عورت کے عقب میں ایستادہ۔ لیمپ شیڈ کے زاویے درست کرتا رہا۔ اور شیڈ گھما گھما کر دیکھتا رہا کہ کس زاویے سے اس پر روشنی ٹھیک پڑتی ہے۔ سب ٹھیک ٹھاک کر کے اس نے اس ربڑ کی عورت کے قریب ایک تپائی پر پاندان کھول کے رکھ دیا۔ اور اس کے ہاتھوں کو پاندان کی طرف ایسے پوز میں بڑھا دیا۔۔۔۔ گویا کسی اعلیٰ خاندان کی نہایت ہی سگھڑ اور باسلیقہ خوبصورت لڑکی اس کے لئے پان بنانے میں مصروف ہے۔

وہ غالیچے پر اس عورت کے قدموں میں بیٹھ گیا۔ کہنے لگا۔ "۔۔۔۔۔ بہت خوبصورت لگتی ہو۔ بہت حسین۔ یوں پاندان پر جھکی ہوئی گلوری بناتی ہوئی۔۔۔۔ اب اپنے ہاتھوں سے ایک گلوری بھی عنایت کر دو۔۔۔۔"

اتنا کہہ کر حسن نے پاندان میں سے خود ایک پان بنایا اور اسے کھا کر بولا۔

"سبحان اللہ! کیا ملائم گلوری تھی۔ پھر اس نے ربڑ کی عورت کی لانبی مخروطی انگلیاں چوم لیں۔ بولا۔ "گلوری کے فن کی نزاکت کوئی تم سے سیکھے ـــــ ایک اور عنایت ہو۔" دوسری گلوری لگا کر حسن بولا۔ "میں نے تمہارا نام زہرہ تجویز کیا ہے۔ کیونکہ تم سچ مچ حسن و خوبی میں زہرہ سے مشابہ ہو۔ تمہاری آنکھوں میں ایشیائی شرم ہے۔ رودان کے مجسموں کی روانی ہے۔ حسن میں اسپینی مصور گویا کی نسائی مصوری کا لوچ ہے۔ اس لئے میں تمہارا نام زہرہ رکھتا ہوں۔ ٹھیک ہے نا؟"

حسن نے مسکرا کر ربڑ کی عورت کی طرف دیکھا۔ پھر کہنے لگا۔

"شاباش۔۔۔۔۔ مجھے معلوم تھا۔ تمہیں یہ نام پسند آئے گا۔ تم بہت سمجھدار عورت معلوم ہوتی ہو۔ میں تمہارا قائل ہوتا جا رہا ہوں۔" حسن نے پھر دوسری بار اس کی انگلیوں کو چوما۔ اور بولا۔ "اپنا بیڈ روم دیکھو گی؟"

جب ربڑ کی عورت نے کوئی جواب نہیں دیا تو بولا۔

"گڈ۔۔۔۔۔ ویری گڈ۔۔۔! " وہ مسکرانے لگا ـــــ

تم بول نہیں سکتیں۔ یہی تمھاری سب سے بڑی خوبی ہے۔ اس وقت اگر میری ان تین بیویوں میں سے کوئی ہوتی تو اس نام کو لے کر کھٹ پھٹ جاتی اور ممکن ہے مار پٹائی تک نوبت آجاتی۔ ایک آدھ گلدان ٹوٹتا۔ سات دن تک گھر میں تناتنی رہتی۔ مگر زہرہ تم تو بے حد سلجھی ہوئی عورت ہو۔ تمھیں یقیناً یہ نام پسند ہے۔ ہولے ہولے تمھیں یہ گھر بھی پسند آجائے گا۔ میں تمھیں یہاں کسی طرح کی تکلیف نہیں ہونے دوں گا۔ ایک عورت کو جو کچھ چاہیئے اس گھر میں سب موجود ہے۔ تم کیا چاہتی ہو..... ؟ کپڑے! میں نے تمھارا وارڈروب کپڑوں سے بھر دیا ہے۔ نت نئے ڈیزائن اور فیشن کے کپڑے جو تم اب میری مرضی کے مطابق پہن سکو گی۔ سنگھار میز پر چلو تمھیں دکھاؤں۔ تمھارے میک اپ کے لئے میں نے کہاں کہاں سے سامان فراہم کیا ہے۔"

حسن نے زہرہ کو اٹھا کر کھڑا کر دیا۔ پھر اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے اٹھا کر بیڈ روم میں لے گیا۔ اسے سنگھار میز کے سامنے تپائی پر بٹھا دیا۔ اب وہ سنگھار میز کے سامنے بیٹھی تھی۔ اس کے بال کر تک لٹک رہے تھے۔ اور اس کے ایک ہاتھ میں کنگھی دے کر حسن نے اسے اتنا ادھچا کر دیا جیسے زہرہ کنگھی کر رہی ہو۔ وہ اسے سنگھار میز کے سامنے سنگھار کرتا چھوڑ کر خود واپس ڈرائینگ روم میں چلا گیا۔ اور وہاں سے بیڈ روم کی مدھم مدھم روشنیوں کے ہالے میں بیٹھی ہوئی اس عورت کو دیکھنے لگا۔ جو اپنے بالوں میں کنگھی کرنے میں مصروف تھی۔ وہ اس کا شفاف سجیلا نکھرا اسنگھار میز کے تینوں آئینوں میں دیکھ رہا تھا۔ کیسی بڑی بڑی روشن آنکھیں تھیں۔

اب وہ دونوں کھانے کی میز پر آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ ربڑ کی عورت کے ایک ہاتھ میں کانٹا تھا۔ دوسرے میں چھری اور وہ پلیٹ پر جھکی ہوئی اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کے سامنے حسن بیٹھا کھانا کھاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

تم کہو گی میں شادی سے بچنے کے لئے کوئی داشتہ بھی رکھ سکتا تھا۔ تم پر اس قدر خرچ کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ تمھارا سوال بالکل فطری ہے۔ اور میں داشتائیں رکھ کے بھی دیکھ چکا ہوں۔ وہ بیوی سے دگنی مہنگی ہوتی ہیں۔ بیوی سے زیادہ جھگڑالو ہوتی ہیں۔ ان سے زیادہ باتونی ہوتی ہیں پھر ایسی داشتہ رکھنے سے کیا فائدہ؟ کیوں ٹھیک کہتا ہوں نا میری جان! شاباش..... کتنی جلدی معاملے کی تہہ تک پہنچ جاتی ہو۔ اس کا اندازہ کر کے مجھے بڑی حیرت ہوتی ہے۔ تم یقیناً کسی اعلیٰ سے اعلیٰ ڈگری یافتہ عورت سے زیادہ عقل مند ہو۔ تمھاری میری خوب نبھے گی۔ یہ چوتھی شادی ہم دونوں کو یقیناً راس آئے گی ———

وہ بہت خوش تھا اور مگن۔ دفتر میں اب اس کا موڈ بہت ٹھیک رہتا۔ اپنے کام میں بھی اب وہ مستعدی اور چستی دکھلانے لگا۔ ادھر اس فہم و فراست نے فرم کے کئی بگڑتے ہوئے کام بنوادیے۔ فرم نے خوش ہو کر اس کی تنخواہ میں اضافہ کر دیا۔

گھر پر بھی وہ بہت خوش رہتا۔ ربڑ کی عورت اس کے پسند کے کپڑے پہنتی۔ اس کی پسند کا کھانا کھاتی۔ جب وہ دفتر سے گھر آتا تو ڈرائنگ روم میں وہ اسے صوفے پر کوئی کتاب پڑھتی یا چھالیہ کترتی ملتی یا اس کے لئے سویٹر بنتی ہوئی۔ جس پوز میں وہ اسے چھوڑ جاتا واپسی میں وہ اسے اسی پوز میں ملتی۔ مسکراتے ہوئے اس کا انتظار کرتے ہوئے۔ خاموشی سے اس کی راہ تکتے ہوئے..... کون عورت ایسا کرتی ہے۔

وہ ربڑ کی عورت پا کر بہت خوش تھا۔ اس کے گھر کا سونا پن مٹ گیا تھا۔ تمام گھریلو جھگڑے اور خدشے ختم ہو گئے تھے۔ ربڑ کی عورت ہر حالت میں دوسری عورتوں سے بہتر تھی۔ ایک تو ایسی عورت کا رنگ روپ کبھی نہیں بگڑتا۔ جسم کے اعضا کا تناسب نہیں بدلتا۔ دوسری عورتوں کی طرح وہ یکلخت موٹی نہیں ہو جاتی۔ کبھی دُبلی نہیں ہوتی۔ کبھی بیمار نہیں پڑتی۔ کبھی کھانا نہیں پکاتی۔ کبھی زیور نہیں مانگتی۔ میکے جانے کے لئے ضد نہیں کرتی۔ اور سب سے اچھی بات تو یہ ہے کہ وہ بولتی نہیں۔ سو خوبیوں کی ایک خوبی تو یہی ہے۔

حسن کا دل اس ربڑ کی عورت سے لگ گیا۔ دھیرے دھیرے وہ اس سے بہت مانوس ہوتا گیا۔ اب تو وہ گھنٹوں اس سے باتیں کرتا تھا

کچھ اپنی طرف سے کچھ اس کی طرف سے۔ خود ہی سوال کرتا خود ہی جواب دیتا۔ کبھی کبھی اس کی طرف سے بھی سوال کرتا تھا اور خود ہی جواب بھی دیتا تھا۔ وہ معاملہ میں اس کا پلہ بھاری رہتا تھا۔ حسن ربڑ کی خاموش عورت کو بہت چاہنے لگا۔ وہ اسے نت نئے لباس پہناتا۔ ایک نیا نام دیتا۔ کبھی مراٹھی نوگزی ساڑی پہناتا۔ کبھی راجستھانی چنریا کبھی اسپینی ڈریس۔ کبھی عربی لباس کبھی جاپانی کیمونو۔ تو کبھی ہوائی ہولا ہولا..... کبھی جینز پہنا کے اسے دیکھتا کبھی محض بکنی پہنا کے اسے باتھ روم کے ٹب میں ڈال دیتا۔

وہ اس سے ہر موضوع پر گفتگو کرتا تھا۔ دھیرے دھیرے اس کی خود کلامی اس درجہ بڑھ گئی کہ اب وہ اس سے گھنٹوں مصروف گفتگو رہتا اب وہ خود ایک باتونی عورت کی طرح باتیں کرنے لگا تھا۔ گو اسے ابھی اپنے اس نئے وصف کا احساس نہیں تھا۔ اور غالباً ہو گا بھی نہیں۔ کبھی کبھی اگر الکاموڈ خراب ہوتا تو وہ خود اس ربڑ کی عورت سے جھگڑ پڑتا۔ ایک رواں دواں تک میں گنگناتے ہوئے لہجے میں شکایتوں کا دفتر کھول دیتا۔ وہ سب کچھ اس سے کہہ دیتا جو وہ اپنی پہلی تین بیویوں سے نہیں کہہ پایا تھا۔ زہرا مسکرا کر اس کی طرف دیکھتی رہتی اور پلٹ کر جواب تک نہ دیتی اور ہوتے ہوتے حسن کا غبار چھٹ جاتا....... اور بول بول کر خود ہی چپ ہو جاتا۔ پھر خود ہی اپنی یکطرفہ شکایت پر شرمندہ ہو کر اسے گلے سے لگا لیتا۔ اور اس سے معذرت خواہ ہوتا.....

دھیرے دھیرے وہ ربڑ کی عورت سے اتنا مانوس ہو گیا کہ اسے اپنے مطالعے کے کمرے میں بھی لے جانے لگا۔ جہاں آج تک اس نے اپنی پہلی تین بیویوں کو بھی داخل ہونے کی اجازت نہیں دی تھی۔ یہ اس کا خاص کمرہ تھا۔ جہاں وہ رات کو کھانا کھا کر اپنے دفتر کی فائلیں وغیرہ دیکھتا تھا۔ اب تو زہرہ اس کے ساتھ ساتھ اس کمرے میں جاتی تھی۔ وہ اسے اپنے قریب کی کرسی پر بٹھا دیتا۔ اور اس کا ایک ہاتھ اپنے کندھے پر رکھ لیتا۔ اور پھر خود نہایت اطمینان سے اپنے دفتر کی فائلیں دیکھنے میں مشغول ہو جاتا۔ اسے احساس ہوتا کہ اس کی حسین بیوی کا ہاتھ اس کے کندھے پر ہے۔ وہ خاموشی سے اس کے قریب بیٹھی ہے۔ اور وہ اس کے جسم کی خاموش قربت میں اپنے دفتر کا کام بہتر طریق سے کر سکتا ہے۔ اب وہ زہرہ کو اپنی چوتھی بیوی سمجھنے لگا۔ اور خوشی و مسرت اور سکون کا ایک رچا ہوا احساس اس کے چہرے سے جھلکنے لگا۔

اچانک اس کی فرم نے اسے ایک ہفتے کے لئے پیرس بھیجنے کا فیصلہ کر لیا۔ ایک فرنچ فرم سے کچھ پیٹنٹ خریدنے کی بات ایک عرصے سے چل رہی تھی۔ اور وہ بات چیت ایک نازک مرحلہ پر پہونچ گئی تھی۔ اسے اس نازک موڑ سے نکال کر کامیابی سے اختتام تک پہونچانے کے لئے فرم نے حسن کی فراست و ذہانت پر بھروسہ کیا تھا۔ دو دن کے بعد حسن کو پیرس روانہ ہونا تھا۔

پیرس جانے کے خیال سے حسن بہت خوش تھا۔ جب وہ سوچتا کہ وہ زہرہ کو ایک ہفتے کے لئے چھوڑے جا رہا ہے تو اسے تھوڑا سا ملال بھی ہوتا۔ مگر پھر پیرس کی گلیوں کے منظر۔ وہاں کے کیفوں۔ ریستورانوں کی زندگی۔ اس کے نشاط گھروں کی کیف و مستی کا عالم اس کی نگاہوں میں گھومنے لگتا۔ تو ملال کا یہ احساس چند لمحوں کے بعد ہی مٹ جاتا اور پیرس کی دلکش رنگینیاں قوس و قزح کی طرح اس کے دل و دماغ پر چھا جاتیں ایک ہفتہ کے لئے وہ بھی کھل کھیلے گا جی بھر کے داد نشاط دے گا۔ ٹھیک ہے گھر میں ربڑ کی عورت ہے گھر کے سونے پن کو دور کرنے کے لئے ——— ——— مگر یہاں بھی اپنے جنسی جذبے کی تسکین کے لئے عارضی دوستیاں تو کرنی پڑتی ہیں۔ ادھر ادھر جانا ہی پڑتا ہے ہوس کی آگ بجھانے کے لئے اس لئے وہ پیرس اکیلا ہی جائے گا۔

"سات دن کی تو بات ہے" اس نے ربڑ کی عورت سے کہا۔ سات دن کے بعد میں پیرس سے لوٹ آؤں گا۔ میرا جی خود وہاں نہیں لگے گا تمہارے بغیر۔ مگر کیا کروں فرم کا معاملہ ہے جانا ہی پڑے گا۔ ہر دم تمہاری یاد آئے گی وہاں۔ اور ایک ایک لمحے تم کو یاد کروں گا میری جان! اور تمہارے بغیر پیرس مجھے ایسے ہی لگے گا جیسے سولی ٹم۔ یا گورداسپور یا جھمکم پورہ یا کوئی ایسا ہی مضحکہ خیز شہر..... مگر مجبوری ہے۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

غلام ربانی تاباں

فروغِ دل کو کہاں غم کے مشغلے کے سوا
سکون کچھ بھی نہیں ایک واہمے کے سوا

حرم بھی دیر بھی ہنگامہ زارِ سود و زیاں
مقامِ امن نہیں کوئی میکدے کے سوا

نہ کوئی راہ سے نسبت بجز حسنِ رائی راہ
نہ کوئی ربط ہے منزل سے فاصلے کے سوا

ہم اہلِ شوق پہ سب آسرے حرام ہوئے
تری جفائے فراواں کے آسرے کے سوا

کرے ہے دردِ تمنا گلوں کے ساتھ نمو
بہار کیا ہے غمِ دل کے مرحلے کے سوا

بہت دنوں میں یہ جانا کہ کچھ نہیں تاباںؔ
حیاتِ شوق شکستوں کے سلسلے کے سوا

[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]

ویت نام میں ابھی ایک زبردست ہولناک جنگ لڑی جا رہی ہے۔ اس میں زہریلی گیس کا استعمال بھی ہو رہا ہے امراض کے جراثیم بھی ہوائی جہازوں سے برسائے جا رہے ہیں لیکن ویت نام کا چھوٹا سا ملک، جو کسی بڑے نقشے میں بھی ہتھیلی کے برابر بھی نہیں دکھایا جاتا دنیا کی عظیم ترین استعماری طاقت امریکا سے دست و گریباں ہے اور اس طرح کہ کامرانی، باوجود تمام سختیوں کے، اسی چھوٹی سی قوم کی پیشانی چومتی نظر آتی ہے۔ کیا انسانی استقامت اور قوت حیات کا یہ معجزہ درخور اعتنا نہیں؟

پھر ایک مدت سے انسان روزی، روٹی اور اقتصادی مساوات کا خواب دیکھتا آیا ہے۔ اس خواب کی تازہ ترین تعبیر سوشلزم تھی جسے ایک پوری صدی پہلے علمی اور سائنٹفک بنا دیا گیا تھا۔ یہ تعبیر دنیا کے پانچویں حصے میں مجسم ہو گئی اشتراکی نظام کے ملکوں کے بارے میں اختلاف رائے ہو سکتا ہے یہ ملکتیں ہر حیثیت سے مکمل اور حرف آخر نہیں ہیں لیکن اتنی بات تو دوست دشمن سبھی مانتے ہیں کہ یہاں روزی، روٹی اور اقتصادی مساوات موجود ہے۔ اقتصادی طور پر انہوں نے اتنی ترقی تو ضرور کی ہے کہ ہر شہری کی بنیادی مادی ضروریات کی کفالت کا انتظام ہو گیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ سوشلزم کے تصور کو جسے بیس برس پہلے باغیانہ سمجھا جاتا ہے آج غیر کمیونسٹ ممالک نے بھی اختیار کر لیا ہے برطانیہ، ہندوستان، مصر اور دوسرے متعدد ممالک اس تصور کو کسی نہ کسی شکل میں قبول کرتے ہیں۔ سوشلزم کے بنیادی تصورات کو تمام دنیا میں وہ قبول عام حاصل ہوا ہے کہ وہ عصر حاضر کے ضمیر اور آگہی کا ایک جزو بن گیا ہے۔ یہ بات لائق توجہ نہیں ہے کہ بنیادی اقتصادی مسائل کرۂ زمین کے کم سے کم پانچویں حصے میں حل ہو چکے ہیں۔

یہ باتیں ذرا دور کی معلوم ہوتی ہیں۔ ہماری شخصیت اور ہمارے ملکی حالات میں ان کا تصور اور ان کے بارے میں کسی حوصلے یا جذبے کا جوڑنا دشوار ہے لیکن کوئی بڑا فن کار صرف شخصیت میں محصور نہیں رہتا بلکہ اپنی شخصیت اور اپنے تصورات Concepts کو وسیع تر کائناتی پس منظر میں دیکھنے کی کوشش کرتا ہے اگر یہ کوشش مجنونانہ نہیں ہے تو پھر اس پس منظر سے امید اور روشنی کی ایک ہلکی سی کرن تو ضرور پھوٹتی ہے۔ تقریباً سبھی عظیم فن کار انسان کے رجز خواں رہے ہیں۔ انھوں نے انسان کے زوال اور تذلیل کی داستان بھی لکھی مگر انھیں اس مشت خاک کی قوت مقاومت نے ضرور متاثر کیا۔ وہ اس کے مٹ جانے کے اتنے ماتم گسار نہ تھے جتنے اس کی ہمت اور حوصلے کے معترف تھے۔ وہ انسان، حقیر، بے کس انسان۔ کی قوت پرواز اور کوہ ساروں سے ٹکرا جانے والی جرأت رندانہ سے متاثر ہوئے تھے۔ آج کے دور میں یہ معجزے اور زیادہ نمایاں اور تابناک ہیں۔

جہاں تک ہمارے گردوپیش کا سوال ہے اس میں صرف مایوسی کے سہارے ہم بہت دور تک نہیں جا سکتے۔ قحط مسلّم مگر قحط کا مقابلہ کرنے والے انسان کی جرأت اور ان پستیوں سے آفتاب تازہ کے ابھرنے کی آرزو اور امید کیا رسی کی کوئی کرن پیدا نہیں کر سکتی۔ آج جب انسان بھوک سے تلملا رہا ہے ایک گروہ اُن کو ہتھیار بند کرانے کے لئے بے قرار ہے اور اس کے نام پر انسانی جان و مال کا نقصان کرنے سے بھی گریز نہیں کرتا۔ کیا یہ بات ایک بھرپور طنزیہ قہقہے کے لئے کافی نہیں۔ ایسا قہقہہ جس میں طنز ہو مگر مردم بیزاری اور کلبیت نہ ہو۔

آج جو لوگ موت، تنہائی اور محرومی کا ذکر کر رہے ہیں کیا ان کے سامنے تصویر کا یہ رخ بھی موجود ہے؟ اس میں نیت کے فتور یا ذہانت کے فقدان کا سوال نہیں ہے۔ صرف تصویر کو کسی خاص زاویے سے دیکھنے کا سوال ہے۔ ایسا کیوں ہے کہ ہمارے ادب میں عالم گیر سطح پر بھی عام طور پر مایوسی، موت، تنہائی اور محرومی کا چرچا زیادہ ہے۔ یورپ اور امریکا میں بیٹ جنریشن Beat Generation کا دور شروع ہوا یہ اصطلاح پہلی بار غالباً جیک کرواک Jack Kerovac کے ناول "On The Road" کی اشاعت سے عام ہوا اس ناول کا عنوان پہلے بیٹ جنریشن رکھا گیا تھا مصنف نے اسے امریکہ کے بورژوائی طبقے کی اقدار کے خلاف بغاوت قرار دیا اور اسے Revolution in Manners کا درجہ دے دیا۔ فکری طور پر یہ لوگ زیادہ سے زیادہ انتخابی یا Eclectic کہے جا سکتے ہیں گو ان میں سے بعض کبھی بدھ ازم سے بڑی وابستگی، کبھی کبھی مشرقی تصوف کی طرف کھنچے کبھی نطشے، ایذرا پاؤنڈ اور جیمس جوائس کے گیت گانے لگے مگر

مجموعی طور پر فکری ناوابستگی Non-Commitment ان کی بنیادی قدر ہے اور اس ناوابستگی سے فکر وعمل چال چلن اور طرز زندگی میں ایک خاص قسم کا انتشار اور بوہیمین ازم ان کا اسلوب اور آئین ہے۔ ایک فقرے کے الفاظ میں ان کی ذہنی اور جذباتی حالت ایلیٹ کی نظم ویسٹ لینڈ کے پیرو پروفرک کی سی ہے جو اپنے اندر بعض ایسی لرزشیں محسوس کرتا اور سرگوشیاں سنتا ہے جو اس کے گرد وپیش سے ہم آہنگ نہیں ہیں یہی لرزشیں اور سرگوشیاں اسے موت، تنہائی، محرومی اور مایوسی کی طرف لے جاتی ہیں۔

دراصل موت، تنہائی محرومی اور مایوسی زندگی، سماج، کامرانی اور کامیابی توام ہے۔ سماج کے ہر دور میں ان دونوں مثبت اور منفی پہلوؤں کا چولی دامن کا ساتھ ہے جسے سماجی حقیقت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے وہ دراصل دو سچائیوں سے عبارت ہوتی ہے ایک مرتی ہوئی گزرتے ہوئے کل کی سچائی جو آنے والے کل میں اپنی جگہ نہیں پا سکتی اور بے قراری کے ساتھ زندگی سے چمٹے رہنے کی کوشش کرتی ہے دوسری پیدا ہوتی ہوئی ابھرتی ہوئی گرد اور نحیف نئی سچائی جو آہستہ آہستہ بلکہ کبھی اکثر تکلیف دہ آہستگی کے ساتھ اس مرتی ہوئی سچائی کی جگہ لیتی ہے۔ یقیناً جو لوگ (خواہ وہ اپنے آپ کو نیا کہتے ہوں یا پرانا) گزرے ہوئے کل کی مرتی ہوئی سچائی ہی کو دیکھتے ہیں اور جنہیں ابھرتی ہوئی گرد اور نحیف سچائی کا چہرا ابھی دکھائی نہیں دیتا انہیں چار سو موت۔ تنہائی۔ محرومی اور مایوسی نظر آئے تو کچھ تعجب نہیں۔

سائنس، نفسیات اور سماجیات کے اس دور میں ان سچائیوں کا ہونا یا نہ ہونا اور ان کی طرف ایک رویے یا دوسرے رویے کا اپنایا جانا بھی محض اتفاقی نہیں ہو سکتا۔ ہمارا ادب اور ادب ہی کیوں افکار و اقدار کا پورا انظام متوسط طبقے کے ہاتھ میں ہے متوسط طبقے کا طبقاتی کردار یہ ہے کہ وہ ہمیشہ دو طبقوں کے درمیان جھولتا رہتا ہے اور جس کا اثر اور اقتدار بڑھتا ہے اسی کی طرف جھکنے لگتا ہے چنانچہ ایک زمانہ میں جب مزدوروں کی جدوجہد کی تو قیر تھی تو متوسط طبقے کے ادیبوں کو ہر جگہ انقلاب نظر آنے لگا تھا اور وہ انقلابیوں سے بڑھ کر انقلابی ہو گئے تھے جب جدوجہد کی لے مدھم پڑی تو ان کا ایمان بھی متزلزل ہوا۔ یوں بھی تعلیم و تربیت کے اعتبار سے ان کی ذہنی فضا انگریزی ادبیات اور علم و دانش کے برطانوی اور امریکی منطقے سے زیادہ قریب رہی ہے لہٰذا انہوں نے (اور خصوصاً ان ذہنوں نے جو اپنے کو ناوابستہ رکھتے آئے تھے) یورپی برطانوی اور امریکی اثرات شدت سے قبول کر لئے جہاں کا برسر اقتدار طبقہ ایک زبردست طبقاتی بحران میں مبتلا تھا اور ہے۔

اقوام عالم کو آزادی ملی تو یورپ کے براہ راست اقتدار کا دور ختم ہوا جس کے اقبال کی کائنات پر کبھی آفتاب غروب نہیں ہوتا تھا اب وہاں شام کی شفق چھا گئی خود امریکہ کے لواح میں کیوبا جیسی آزاد مملکت وجود میں آئی۔ تجارتی منڈیوں میں اثر و اقتدار کی یہ جنگ بھی ان کے حق میں نہیں تھی ایسے ممالک بھی تھے جو یا تو اس امداد کو غلامانہ قبول کرنے کو تیار نہ تھے یا دوسرے ذرائع سے مدد حاصل کر کے اس قرضے کے بنا پر نئے اقرارنامے لکھنے کو تیار نہ تھے پھر یہ زبردست اعتراف شکست کہ چھوٹی سی چھوٹی قوت کو بھی محض استبداد کے زور پر کچلا اور دبایا نہیں جا سکتا خواہ وہ شمالی کوریا ہو یا ویت نام یا مصر۔ اس کے علاوہ وہ چیلنج جو خلائی پرواز سے لے کر کینسر کا علاج تلاش کرنے تک فکر و عمل کے ہر میدان میں درپیش ہے۔ امریکہ اور یورپ کے با اقتدار طبقوں کو نئی نظریاتی اور نفسیاتی الجھنوں میں مبتلا کرنے کے لئے کافی ہے ان کے سامنے مستقبل کی جو تصویر ہے وہ امید سے خالی ہے۔ جو آج دست نگر ہیں کل وہ آزاد اور با اقتدار ہوں گے دنیا تیزی سے سماجی انصاف اور اقتصادی مساوات کی طرف قدم بڑھا رہی ہے اجارہ داری کا سنگھاسن ڈول رہا ہے وہ نظام کہن کو اپنی آنکھوں کے سامنے مٹتے ہوئے دیکھ رہے ہیں اور اقتدار کی تلوار ان کے ہاتھ سے گر چکی ہے۔

ہندوستان کا دانشور طبقہ (جو متوسط طبقے ہی کا ایک جزو ہے) برطانیہ اور امریکہ سے رہنمائی حاصل کرتا رہا ہے چنانچہ اس معاملہ میں بھی ان کا اثر قبول کر رہا ہے ہندوستان آج بھی سرمایہ دارانہ ملک نہیں ہے یہاں مشینی دور کی ابھی آمد آمد ہی ہے ہماری معیشت زرعی ہے اور اسی فیصدی آبادی دیہاتوں میں بستی ہے نہ کارخانے بڑے پیمانے پر قائم ہوئے ہیں نہ صنعتی دور پوری طرح آیا ہے اس لئے نہ مزدوروں کی رہنمائی میں انقلاب کا تصور

[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

- [illegible]
- [illegible]
- [illegible]
- [illegible]
- [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

مہندر ناتھ

کنواری

کچھ اِس کہانی کے بارے میں

آپ کا خط ملا۔ اپنا وعدہ یاد آیا۔ شرمندگی کا اور احساس ہوا۔ اب ایک افسانہ بھیج رہا ہوں خدا کرے آپ اسے چھاپ سکیں۔ افسانہ کا نام کنواری ہے لیکن ہے السا سیدھا۔ تند، تلخ، شیریں ایک جملہ کافی تند ہے۔ دو تین جملے عریاں ضرور ہیں لیکن یہ بھی کیا ظلم ہے کہ ہم اپنی بات نہ کہہ سکیں۔ یوں فیملی پلاننگ کے سلسلے میں آج کل عام پروپگنڈہ ہو رہے ہیں۔ اسلئے میں نے (F.L.) کا ذکر کیا ہے۔ یہ اُنسے shocking ضرور ہے۔ انکی طرف اشارہ کئے بغیر بات نہیں بنتی۔ افسانہ ادھورا رہ جاتا ہے ——— مہندر ناتھ

کمرے میں گھپ اندھیرا تھا۔ چارپائی پر لیٹی ہوئی رادھا سسکیاں لے رہی تھی۔

"کیوں رو رہی ہو؟"

"روؤں نہیں تو کیا کروں ——— تم نے میری عزت لوٹ لی۔!" رادھا نے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا۔

"تم نے ہی کہا تھا!"

"کیا کہا تھا؟"

"یہی کہ میں تمہارے میں کمرے میں سو سکتا ہوں۔"

"سونے کے لئے کہا تھا۔ جو کچھ تم نے کیا اس کے لئے تھوڑا ہی کہا تھا۔"

"ہوا کیا؟"

"اس سے آگے اور کیا ہو سکتا ہے۔"

"تم انکار کر دیتیں۔"

"مجھے کیا معلوم۔ تم حد سے بڑھ جاؤ گے۔"

"تم نے کہا تھا باہر سخت سردی ہے۔ اس لئے میں اندر سکتا ہوں۔"

"ٹھیک تو کہا تھا۔ اگر یقین نہیں آتا تو باہر نکل کر دیکھو۔"

"میں سردی سے بچنے کے لئے اندر آ گیا۔ پھر تم نے میرا بستر بچھایا۔ اوڑھنے کے لئے کمبل اور رضائی دی۔"

"تو کیا بُرا کیا؟"

"میں کب کہتا ہوں کہ تم نے بُرا کیا۔ بلکہ بہت اچھا کیا۔ اگر اسی طرح کرتی رہو تو زندگی بھر تمہارا احسانمند رہونگا۔"

"بچ کہیں کے۔ اتنا بڑا گناہ۔ اگر پتا جی کو معلوم ہو گیا تو؟!"

"انھیں کیسے معلوم ہوگا؟"

"انھیں اس قسم کی باتیں فوراً معلوم ہو جاتی ہیں!"

"تمھاری پتا جی جوتشی کب سے ہوئے؟"
"جوتشی نہیں ہیں۔ لیکن پتا جی میری صورت دیکھ کر بتا دینگے۔"
یہ کہہ کر وہ رونے لگی۔
"اب جو بات ہونی تھی ہو گئی اب رونے سے کیا فائدہ؟"
را دھا اور زور سے رونے لگی اور روتے روتے کہنے لگی۔ "جانتے ہو میری شادی ہونے والی ہے پتا جی شادی کا مہورت نکلوانے گئے ہیں۔"
"مبارک ہو"
"مُردار۔ ہر دوار نہیں مبارک۔"
"شادی کرنے سے تمھیں کون روکتا ہے۔"
"جو کچھ آج کی رات ہوا ہے اس کے بعد شادی کیسے ہوگی؟"
"تمھاری عمر کتنی ہے؟"
"بیس برس"
"اس سے پہلے کبھی اور گناہ کیا تھا؟"
"صرف ایک بار"
"کس کے ساتھ؟"
"وہ بھی تمھاری طرح کا ایک بدمعاش ٹیچ آدمی تھا۔ اکثر ہمارے گھر آتا جاتا تھا۔"
"تمھارا واسطہ اکثر بدمعاشوں سے پڑتا ہے کسی شریف انسان سے....."
"چپ رہو بے غیرت کہیں کے ——"
"وہ کیا کرتا تھا؟"
"بس چھیڑتا تھا۔ گندی گندی باتیں کرتا تھا مجھ سے ——
ایک دن میں نے پتا جی سے شکایت کر دی انھوں نے اس کا آنا جانا بند کر دیا۔"
"اس کے بعد کیا ہوا؟"
"ایک رات وہ کھڑکی سے کود کر میرے کمرے میں آ گیا۔"
"تمھارے پتا جی کہاں گئے تھے؟"
"کانپور"
"اکثر جب کوئی تمھارے گھر آتا ہے تمھارے پتا جی کہیں باہر چلے جاتے ہیں؟"
"اس قسم کی باتیں کرتے ہوئے شرم نہیں آتی؟"
"خیر تمھاری ماں کہاں تھی؟"
"وہ اپنے میکے میں تھی۔ میں نے چیخنا چاہا اس نے میرے منھ میں کپڑا ٹھونس دیا....."
"پھر.....؟"

وہی ہوا۔ جو تم نے کیا۔ بے غیرت کہیں گے۔"

یہ کہہ کر وہ پھر رونے لگی۔

"اب کیوں رو رہی ہو؟"

"کتنا بڑا گناہ کیا تھا میں نے"

"تم سے کس اُلو کے پٹھے نے کہا کہ تم نے گناہ کیا۔"

"پتا جی نے۔ وہ پنڈت ہیں نا۔ ہنومان جی کے پجاری ـــ کوئی ایسا ویسا الٹا کام کرو تو ہنومان جی خفا ہو جاتے ہیں۔"

"ہنومان جی خفا ہو جاتے ہیں.... اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں پر؟"

"اگر یہ چھوٹی سی بات ہے تو بڑی بات کسے کہتے ہیں کیسے کہیں کے؟"

"ہنومان جی کے ناراض ہونے سے کیا ہوتا ہے؟"

"گھر کا کوئی آدمی مر جاتا ہے۔"

"اس وقت کون مرا تھا؟"

"میری ماں"

"اس کے بعد؟"

"کوئی نہیں مرا"

"تری ماں کیسے مری تھی؟"

"ٹی بی سے"

"بچارے ہنومان جی کے اس میں کیا قصور۔ تمہارے پتا جی نے تمہاری ماں کا کسی اچھے ڈاکٹر سے علاج نہیں کروایا ہوگا۔ اس لئے وہ مر گئی۔ یا وہ تمہاری ماں سے نفرت کرتے ہوں گے۔ سوچا ہوگا کہ مر جائے تو دوسری شادی کر لوں۔؟....."

"نہیں نہیں! میں نے گناہ کیا تھا اس لئے میری ماں مر گئی۔"

"یہ تیرا وہم ہے۔"

"یہ وہم نہیں حقیقت ہے۔ ہائے اب کیا کروں؟"

وہ پھر سسکیاں لینے لگی۔

"اب جو ہونا تھا ہو گیا لائٹ آن کر دوں؟"

"نا۔ بابا"

"تم اپنا جسم چادر سے کیوں ڈھانپ رہی ہو؟"

"تم ابھی تک میرے جسم کو دیکھ رہے ہو۔ نردیے کہیں کے...."

"تمہارا جسم بڑا خوبصورت ہے۔ پرماتما کی قسم ـــ ایسا حسین جسم میں نے کبھی نہیں دیکھا!"

"بکو مت!"

"خوبصورت جسم کی تعریف تو کرنے دو۔ ایسا شفاف بلوریں نرم اور گرم جسم کہاں دیکھنے کو ملتا ہے۔"

"تیری اپنی ماں بہن کوئی نہیں...."

"ہے۔"

"اسے کیوں نہیں دیکھتے۔"

"ایکبار دیکھا اپنی ماں کو ننگا۔"

"بے حیا۔ جی چاہتا ہے تمہاری آنکھیں پھوڑ دوں۔ تیری زبان کھینچ لوں۔ کیا کروں۔ بہنتی ہوں کچھ نہیں کر سکتی۔ سوائے اس کے تم سے پوچھوں۔ کہ اب میں کیا کروں؟"

"اٹھ کر بیٹھو، ٹھنڈا پانی پیو۔"

"ہائے ــــ"

ہائے رام۔ پیٹ سے ہو گئی تو ـــــ"

"بالکل نہیں ہو گی۔"

"کیوں۔"

"میں نے اس کا انتظام کر لیا تھا۔"

"کیا۔"

"بتانے سے کیا فائدہ؟"

"تین مہینے کے بعد میری شادی ہو جائے گی۔"

"شوق سے کر دینا شادی۔ کون روکتا ہے۔ ہم ٹھاٹ سے دولہا کی برات میں آئیں گے۔"

اب شادی کیسے ہو گی۔ تم نے میری زندگی تباہ کر دی۔ اب میں کہیں کی نہیں رہی۔ اب تمہیں میرے ساتھ شادی کرنا پڑے گی۔" وہ پھر زور زور سے رونے لگی۔

"اگر اس طرح روؤ گی تو وہ بات کبھی نہیں بتاؤں گی۔"

"کونسی بات؟"

"جو بتانے والا تھا۔ اور جس میں تمہاری بھلائی ہے۔"

"بتاؤ نا۔ تیرے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں نہیں تو میرا جیون تباہ ہو جائے گا۔"

"پہلے رونا بند کرو۔"

"لو اب نہیں روؤں گی۔ بالکل نہیں روؤں گی۔"

یہ کہہ کر وہ چپ ہو گئی۔

"تمہیں یاد ہے نا؟"

"کیا؟"

"میں تمہارے گھر تقریباً روز آتا تھا۔ اور تمہارے پتا جی کو مجھ پر کتنا بھروسہ تھا۔
اگر بھروسہ نہ ہوتا تو وہ تمہیں یہاں ٹھہرنے کے لئے کبھی نہ کہتے تم نے ان کے وشواس کا اپمان کیا ہے۔"

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible] ١١٤٤	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	١٢١٣٥	١٣٣
١٣٣	[illegible]	١٣٣	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	١٣٣	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	١٣٤٤	١٣٤٤	[illegible]
١٤٤٣ [illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

وزیر آغا

ادب اور جبر

سوال اگر یہ ہو کہ کیا کسی ادب پارے میں صحافتی رجحان کی آمیزش مستحسن ہے تو میرا جواب ہوگا: "ہرگز نہیں" ـــــ اس لئے کہ ادبی اور صحافتی اور رجحانات میں بُعد القطبین ہے اور وہ جب کسی فن پارے کی تشکیل میں بیک وقت صرف ہوتے ہیں تو ایک [illegible] نتیجتاً جو "تخلیق" وجود میں آتی ہے، تو ادب کے زمرے میں شامل ہوتی ہے اور نہ صحافت کے ـــــ ادب بنیادی طور پر ادیب کے اظہار [illegible] صورت ہے اور یہ اظہار، باطن کا وہ نغمہ ہے جو رمزاً اشارے کنائے، استعارے اور تمثیل کی اساس پر قائم ہے اور جذبے کی تہذیب [illegible] جمالیاتی نظام میں پھیلاتا ہے۔ ادب لیڈی آف شیلٹ کا وہ آئینہ ہے جس میں خارجی حقیقت منعکس ہو کر ایک عجیب سی خوابناک اور تحیر انگیز کیفیت میں ڈھل جاتی ہے لیکن اس کے برعکس صحافت خارجی حقائق کو براہِ راست مس کرتی ہے اور اس کا کام فہم و شعور کی مدد سے حقائق اور واقعات کا تجزیہ اور ادراک ہے۔ صحافت کے لئے یہ بات انتہائی خطرناک ہے کہ وہ واقعے کو جذبے کے آئینے میں سے دیکھنے کی کوشش کرے کیونکہ اس طرح خارج اور اس کے رجحانات اپنی واقعی صورت میں سامنے نہیں آتا اور استخراجِ نتائج کے اس عمل کو جو صحافت کا منتہائے مقصود ہے بُری طرح مسخ کر دیتے ہیں۔ صحافت تو تجزیے اور تحلیل کے اس عمل کا نام ہے جو جذباتی خود کشی سے دامن چھڑا کر حقائق اور واقعات کو پرکھتا اور ان سے نتائج اخذ کرنے کے لئے ایک جج کی سی بصیرت اور خنک مزاجی کو بروئے کار لاتا ہے۔ صحافت اور ادب کے اس فرق کو ملحوظ رکھیں تو ظاہر ہے کہ کسی فن پارے میں ان دونوں رجحانات کے بیک وقت وجود کی گنجائش کا امکان نہیں ہوگا اور اسی لئے میں سوال کی اس خاص "ترتیب" کو نظر انداز کرکے اسے از سرِ نو مرتب کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔

سوال کچھ یوں مرتب ہو سکتا ہے کہ کیا کسی معاشرے میں صحافتی رجحانات کا فروغ، اس کے ادبی فن پاروں کی تخلیق میں ممد تو نہیں ہوتا؟ میرا جواب یہ ہے کہ ایک فنکار جو فن کے مقتضیات سے کما حقہٗ آگاہ ہے، اپنی تخلیق کو صحافتی انداز نظر سے تو صاف بچا لیتا ہے تاہم اس کے اس فن کی بقا کا یہ تقاضا ہے کہ وہ اپنے زمانے کے صحافتی افق سے کما حقہٗ آشنا ہو۔ اگر ایسا نہیں ہوگا تو فن اظہار کے باوصف ادب پارے کے مزاج میں وہ کشادگی اور گہرائی پیدا نہ ہو سکے گی جو زمانے کے واقعات، حادثات اور رجحانات کے مطالعہ سے حاصل ہوتی ہے اور جو ایک بڑے فن کار کو کوئی درجے کے لکھنے والوں سے جدا کرتی ہے دوسرے لفظوں میں ایک فن پارے کی اہم ترین خوبی یہ ہے کہ وہ [illegible] ہوتا ہے کشادگی سے روحِ عصر کی بھی ترجمانی کرے۔ یہاں مجھے ایک لطیفہ یاد آ گیا کچھ عرصہ ہوا لاہور کا ایک اردو ادیب پیرس گیا اور ژاں پال سارتر سے ملا۔ جب باتیں شروع ہوئیں تو سارتر نے اس سے پہلا سوال یہ کیا: "الجزائر کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟" ہمارے ادیب نے عرض کیا کہ مجھے سیاسی مسائل سے کوئی سروکار نہیں۔ میں تو صرف راہگزارِ ادب کا مسافر ہوں، اس پر سارتر نے گفتگو کے سارے سلسلے کو یہ کہہ کر ختم کر دیا کہ جو ادیب

اپنے زمانے کے حالات و واقعات ہی سے بے نیاز ہو مجھے اس کے ادیب ہونے پر بھی شک ہے! ـــــ مبادا کوئی غلط فہمی پیدا ہو جائے اس بات کا اظہار ضروری ہے کہ میں اس واقعہ کی طرف اشارہ کرکے ادب میں خبر کے عنصر کی آمیزش کو مستحسن قرار نہیں دے رہا ہوں۔ میں تو صرف یہ عرض کر رہا ہوں کہ ادیب کے لئے لازم ہے کہ وہ باخبر رہے، اس کی آنکھیں ماحول کے ہر بدلتے ہوئے رنگ کو غور سے دیکھیں اور اس کے کان ماحول کی ہر ابھرتی ڈوبتی چاپ کو سنیں اور اس کا یہ ادراک وہ پس منظر تیار کرے جس پر اس کے فن کا موئے قلم نئے سے نئے نقوش ابھارتا چلا جائے۔ اردو شاعری میں مولانا ظفر علی خاں اور علامہ اقبال کا کلام خبر کے عنصر سے بلا واسطہ اور بالواسطہ متاثر ہونے کے فرق کو بڑی خوبی سے بیان کرتا ہے۔ ظفر علیخاں اپنے عہد کے سیاسی جذر و مد سے بےحد متاثر تھے۔ وہ خود ایک مقبول اخبار کے مدیر اعلیٰ بھی تھے اور ہندوستان کی سیاسی تحریک میں انھیں ایک اہم لیڈر کی حیثیت بھی حاصل تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ ایک قادر الکلام شاعر بھی تھے لیکن صاف محسوس ہوتا ہے کہ ان کے ہاں خبر نے فن پر فتح حاصل کی اور وہ سامنے کے واقعات و حادثات کو بعینہ اپنے اشعار میں سموتے چلے گئے۔ نتیجہ ظاہر ہے ان اشعار نے وقتی طور پر تو عوام کو بےحد متاثر کیا لیکن جب وہ ہنگامی حالات جو ان اشعار کا موضوع تھے، وقت کی گود میں دب گئے تو ان سے متعلق اشعار بھی تاثر سے تہی ہو گئے اور آج انکی حیثیت تاریخ کے ایک پامال ورق سے زیادہ نہیں ـــــ

دوسری طرف علامہ اقبال بھی خبر کے عنصر سے متاثر تھے لیکن بالواسطہ انداز میں! ان کا ذہنی افق کشادہ اور ان کی سیاسی بصیرت بہت تیز تھی اور ان پر وقت کی ہر کروٹ گہرے اثرات بھی ثبت کرتی تھی۔ لیکن اقبال کے ہاں یہ سارے واقعات و حادثات گڈمڈ ہو کر ایک کشادہ سے پس منظر میں ڈھل جاتے تھے اور علامہ اقبال اسی پس منظر سے اکتساب نور کرکے اپنے اشعار میں ایک نئی سطح کا اضافہ کر دیتے تھے۔ گویا اقبال کے ہاں خبر پر فن غالب آگیا تھا اور یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ کلام اقبال کا مطالعہ کرتے ہوئے ذہن کسی خاص واقعے یا حادثے کی طرف منتقل نہیں ہوتا بلکہ سطح کے نیچے کی کروٹوں سے متعارف ہوتا ہے بجز ظفر علی خاں کے ہاں تو خبر کا عنصر جذباتیت سے ملوث ہوا ہے جس کے نتیجے میں خبر اور جذبہ دونوں متاثر ہوئے ہیں۔ لیکن اقبال نے خارج کے حقائق کو دیکھنے کے لئے لیڈی آف شیلٹ کا آئینہ استعمال کیا ہے اور اس آئینے کی یہ خوبی ہے کہ وہ اصل کا عکس ہی پیش نہیں کرتا بلکہ اس عکس کی تہذیب بھی کر دیتا ہے۔ لیڈی آف شیلٹ نے جب ایک اضطراری جذبے کے تحت آئینے سے منہ موڑ کر حقیقت کا سامنا کرنے کی کوشش کی تو یہ عمل اس کی موت کا باعث ثابت ہوا۔ اسی طرح جب کوئی فنکار فن کے شفاف آئینے کو ترک کرکے زندگی کے حقائق کے حوادث سے براہ راست متصادم ہوتا ہے تو خبر کی ناتراشیدہ صورت کو استعارے کی بیضویت عطا کرنے میں ناکام ہو جاتا ہے۔ نتیجہ فن کی موت کی صورت میں برآمد ہوتا ہے۔ مگر خود اس تمثیل میں یہ امر ناگزیر ہے کہ لیڈی آف شیلٹ کا آئینہ باہر کی فضا کا عکس پیش کرے یا کم از کم اس میں اپنا رنگ مستعار لے یہی دراصل فنکار اور اس کے اردگرد پھیلی ہوئی زندگی کا ازلی و ابدی رشتہ بھی ہے جب کوئی فنکار اپنے ماحول اور معاشرے سے منقطع ہو کر خود کو محض ایک رومانی قلعے میں محصور کر لیتا ہے تو دراصل اپنے فن کے پھیلاؤ کے سارے امکانات کو ختم کر دیتا ہے۔

حاصل گفتگو یہ ہے کہ جب صحافتی رجحانات اور وہ حادثات و واقعات جو ان کے اساس ہیں، ادب پارے کے پیکر میں داخل ہوتے ہیں تو اسے یقیناً مجروح کر دیتے ہیں اور ہر اچھا فنکار صحافت کی اس یلغار سے خود کو سدا بچائے رکھتا ہے لیکن اعلیٰ فن اس بات کا یقیناً متقاضی ہوگا کہ فن کار کا مطمح نظر وسیع اور اس کے ہاں خبر سے متاثر ہونے کا میلان قوی ہو تاکہ وہ زمانے کی نت نئی کروٹوں سے اپنے لئے ایک وسیع پس منظر تیار کر سکے۔

[illegible]

[illegible]

●

[illegible]

● [illegible]
[illegible]

● [illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]

● [illegible] ———
[illegible]

● [illegible]
[illegible]

● [illegible]

● [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

ހަވީރު

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]	[illegible]	—	[illegible]	[illegible]	—
[illegible]	[illegible]	—	[illegible]	[illegible]	—
[illegible]			[illegible]	[illegible]	—
[illegible]	[illegible]	—	[illegible]	[illegible]	—
[illegible]	[illegible]	—	[illegible]	[illegible]	—
[illegible]	[illegible]	—	[illegible]	[illegible]	—
[illegible]	[illegible]	—	[illegible]	[illegible]	—
[illegible]	[illegible]	—	[illegible]	[illegible]	—
[illegible]	[illegible]	—	[illegible]	[illegible]	—
[illegible]	[illegible]		[illegible]		
[illegible]	[illegible]		[illegible]	[illegible]	—
[illegible]			[illegible]	"	—
[illegible]	[illegible]		[illegible]	[illegible]	—
[illegible]	[illegible]		[illegible]	[illegible]	—
[illegible]	[illegible]		[illegible]	[illegible]	—
[illegible]	[illegible]		[illegible]	"	—
[illegible]	[illegible]		[illegible]	[illegible]	—
[illegible]	[illegible]		[illegible]	[illegible]	—
[illegible]			[illegible]	[illegible]	—
[illegible]	[illegible]		[illegible]	[illegible]	—
[illegible]	[illegible]		[illegible]	[illegible]	—

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

چشم بینا

آنکھیں میری باقی اُن کا

یکم جنوری ۱۹۶۷ء کو انجمن ترقی پسند مصنفین کی پانچ روزہ کانفرنس دہلی میں اختتام پذیر ہوئی۔ کانفرنس میں بہت کم ادیبوں نے شرکت کی ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جو لوگ شریک ہوئے وہ تحریک اور انجمن کی ہمنوائی کے بجائے سجاد ظہیر صاحب کی مروّت میں آئے تھے کانفرنس میں آل احمد سرور، مجنوں گورکھپوری، آنند نرائن مُلّا، کیفی اعظمی، ساحر لدھیانوی، اختر الایمان، مجروح سلطانپوری، فراق گورکھپوری، راجندر سنگھ بیدی، معین احسن جذبی، عصمت چغتائی، جاں نثار اختر، خواجہ احمد عباس، اپندر ناتھ اشک، اقبال متین، باقر مہدی، رام لعل، سلیمان اریب، عابد سہیل، شاذ تمکنت، مظہر سلیم، وحید اختر، حسن شہیر، رتن سنگھ، سلام مچھلی شہری، اقبال مجید، احمد جمال پاشا وغیرہ کو نگاہیں ڈھونڈ رہی تھیں لیکن کہیں کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جو ہمیشہ سے انجمن کے ساتھ رہے ہیں حالانکہ اس وقت ضرورت اس بات کی تھی کہ ان تمام نئے اور پرانے ادیبوں کو بھی مدعو کیا جاتا جو ہمارے نظریات سے متفق نہیں ہیں۔ کانفرنس ہال میں ایک نشست میں ۲۰ - ۲۵ پنجابی ادیبوں کا ایک جتھا بیٹھا تھا جن میں چند جانے پہچانے ادیب بھی تھے اور دوسری طرف کچھ حیدرآباد اور علیگڑھ کے ایسے لوگ تھے جن کے ناموں سے کوئی واقف نہیں تھا۔ ہندی کے ادیب بھی چند تھے جن میں ڈاکٹر نامور سنگھ اور امرت رائے کے علاوہ کوئی قابل ذکر نہیں تھا ایسی صورت میں اس کانفرنس کو ہندوستان کے ترقی پسند ادیبوں کی نمائندہ کانفرنس کہنا سراسر ناانصافی ہوگی۔

کانفرنس میں بعض لوگوں کا رویہ شروع سے تنقیدی رہا۔ انجمن کی گذشتہ ناکامیوں اور کامیابیوں کا سختی سے جائزہ لیا گیا۔ ایسے مقالوں میں ڈاکٹر قمر رئیس اور انور عظیم کے مقالے اہم تھے۔ لیکن اتنی سخت تنقید تالیوں کی گونج میں اڑ گئی نہ تو کانفرنس کرنے والے انجمن کے بزرگ رہنماؤں نے ان مقالوں میں اٹھائے جانے والے سوالوں کا جواب دیا اور نہ اس کی بنیادوں کو صحت مند بنانے کی کوئی شکل سامنے آئی۔ ڈاکٹر علیم اور احتشام حسین سے توقع تھی کہ وہ نئی نسل کو روشنی دکھائیں گے اور کانفرنس و انجمن کو زیادہ سے زیادہ کارآمد بنانے کی کوشش کریں گے بالکل بے نیاز رہے۔ شاید وہ سجاد ظہیر کے مفادات سے ٹکرانا نہیں چاہتے تھے۔ ڈاکٹر علیم ابتدائی چار دنوں تک کانفرنس میں شریک رہے لیکن بالکل خاموش انھوں نے ایک لفظ بھی نہیں کہا اور نہ کانفرنس کو مخاطب کیا۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ سجاد ظہیر صاحب سے اختلافات کی بنا پر وہ کسی مسئلہ پر بولنا نہیں چاہتے تھے۔ چوتھے دن ڈاکٹر علیم اور احتشام حسین دہلی سے واپس چلے گئے۔ احتشام حسین نے ایک تقریر کی لیکن انھوں نے بھی انجمن کی نئی تشکیل میں کوئی حصہ نہیں لیا اور نہ کوئی راہ دکھائی۔

سردار جعفری شروع میں انجمن کی تشکیل ہی کے خلاف تھے لیکن اکیدن دہلی میں گذارنے کے بعد وہ نہ صرف انجمن کے قیام کے حق میں ہوگئے

بلکہ انھوں نے کانفرنس سے الگ ایک موقع پر کہا کہ سجاد ظہیر کو انجمن کا جنرل سکریٹری ۔ تقی حیدر کو آفس سکریٹری اور رضیہ سجاد ظہیر کو خازن ہونا چاہیئے ۔ انور عظیم جنھوں نے انجمن کے سلسلہ میں بہت عرصہ پہلے سے کافی ہنگامہ برپا کر رکھا تھا ۔ تمام ادیبوں کے پاس انجمن کے ELDERS کے خلاف سرکلر بھیجے تھے اور زبیر کا مضمون بڑے طمطراق سے شائع کیا تھا اور کانفرنس میں خود بھی ایک اچھا مقالہ پڑھا تھا آخر میں انہی لوگوں سے سمجھوتہ کر بیٹھے جن کے خلاف اتنے دنوں سے آواز اٹھا رہے تھے ۔ یہاں تک کہ جب کانسٹی ٹیوشن کمیٹی کی مدد سے بنایا ہوا ان کا دستور ہوم میں خاص میں بدل دیا گیا تب بھی وہ خاموش رہے اور انھوں نے یہ بھی نہ سوچا کہ اس کے تبدیل کرنے کا حق کس کو ہے ۔ عام خیال یہ تھا کہ انور عظیم کے رویہ کی تبدیلی کا سبب یہ تھا کہ وہ بلٹز کی ملازمت چھوڑ کر دہلی واپس آرہے ہیں اور ایسی صورت میں وہ بمبئی والا رویہ یہاں اپنانا نہیں چاہتے کیونکہ یہاں ہر جہاں انکو سجاد ظہیر کی مدد کی ضرورت پڑے گی کانسٹی ٹیوشن کمیٹی نے جو دستور بنایا تھا اسمیں مجلس عاملہ کی تعداد زیادہ سے زیادہ تیس رکھی تھی جسمیں کم سے کم ہر زبان کا ایک نمائندہ ہوگا لیکن جب دستور ہاؤس کے سامنے پیش ہوا تو تیس کی یہ قید ختم کردی گئی تھی تاکہ اپنی مرضی کے مطابق لوگوں کو Stooge کیا جاسکے ۔

کرشن چندر کانفرنس میں سب سے زیادہ سرگرم نظر آرہے تھے ۔

تجویزیں کانفرنس میں چند اہم مسئلوں پر تجویزیں بھی پاس کی گئیں جو انجمن کے رہنماؤں کے سمجھوتے بازی کی ذہنیت کی پوری طرح غمازی کرتی ہیں ۔ پہلی تجویز اردو کے متعلق تھی جس میں اردو کے مسئلہ کو پوری طرح تباہ کرنے کی کوشش کی گئی تھی ۔ جس کی پہلی شکل یہ تھی کہ اردو اور ہندی ایک زبان کے دو رسم الخط ہیں اور جن طلبا کی مادری زبان اردو ہے ان کو لازمی ہندی کے ساتھ اسے پڑھنے کی پوری سہولت ملنی چاہیئے ۔ بعض اردو والوں نے لازمی ہندی اور ایک زبان کے دو رسم الخط پر اعتراض کیا کافی بحث کے بعد لازمی ہندی کا لفظ نکال دیا گیا اور ایک زبان کے دو رسم الخط کو بدل کر کھڑی بولی سے پیدا ہونے والی زبانیں کر دیا گیا ۔ تجویز میں آگے چل کر اردو پڑھنے کی سہولت ۔ سرکاری اعلانوں کی اردو میں اشاعت کی مانگ کی گئی تھی اور کہا گیا تھا کہ سرکاری دفتروں اور عدالتوں میں اردو کی درخواستیں قبول کی جانی چاہئیں ۔ یہ باتیں اکثر کانگریسی لیڈران اور اردو کی معمولی انجمنیں دہراتی رہی ہیں ۔ اگر ترقی پسند ادیب اردو کی ثانوی حیثیت تسلیم کرانے کی مانگ نہیں کر سکتے تو ان سے بہتر تو کانگریس کے وہ ممبران پارلیمنٹ ہیں جو اردو کے سلسلے میں پچھلے دنوں صدر جمہوریہ سے ملے تھے اور اس پر زور دیا تھا کہ صدر جمہوریہ اردو کے حقوق کی حفاظت کے لئے اعلانیہ جاری کریں ۔ ایسی ترقی پسند انجمن سے کیا فائدہ جو صحیح بات صرف اس لئے نہ کہے کہ امرت رائے یا ہندی کے دوسرے ادیب اسکا ساتھ چھوڑ کر چلے جائیں گے ۔

دوسری تجویز بہار اور مشرقی یوپی میں قحط سالی سے متعلق تھی جس میں کہا گیا تھا کہ ادیب مصیبت زدگان کی مدد کریں اسی تجویز میں قحط زدہ علاقہ میں ایک Fact finding وفد بھیجنے کا فیصلہ کیا گیا تھا یہ ترقی پسند تمام رجعت پسند پارٹیوں سے بھی گئے گذرے ہوگئے جو بہار اور مشرقی یوپی میں Fact finding وفد بھیجیں گے شاید اس حقیقت کا پتہ چلانے کے لئے کہ وہاں جو لوگ مر رہے ہیں وہ حقیقت میں بھوک سے مر رہے ہیں یا ہارٹ فیل اور محبت میں خودکشی کے سبب سے ۔ برایں عقل و دانش ببا ید گریست ۔

ایک تجویز ویت نامی عوام پر احسان رکھنے کے لئے بھی پاس کی گئی جس کی تائید امریکہ کی ایک نوجوان خاتون نے کی شاید یہ کانفرنس کی معراج تھی ۔ ان خاتون نے اپنی تقریر میں کہا کہ مجھے فخر ہے کہ میں امریکہ کی شہری ہوں جنگ بڑی چیز ہے اس لئے ویٹ نام کی جنگ بند ہونی چاہیئے تجویز میں وہی کچھ کہا گیا تھا جو صدر جانسن بھی نہ جانے کتنی بار کہہ چکے ہیں کہ جنگ کو جلد از جلد بند ہونا چاہیئے ۔ ہم ہندوستانیوں کی یہ بدقسمتی ہے کہ ہم جب انقلاب لانے کے لئے اٹھتے ہیں تو کامریڈ رنڈوے ہو جاتے ہیں اور جب سمجھوتے بازی پر آتے ہیں تو سجاد ظہیر بن جاتے ہیں ۔

الیکشن پانچویں دن شام کو الیکشن ہوا جو کسی بھی حالت میں دستوری حیثیت سے درست نہیں کہا جاسکتا کیونکہ یا تو کانفرنس کے سارے فیصلے غلط یا الیکشن غلط تھا ۔ اب تک ہر فیصلے میں کانفرنس ہال میں بیٹھے ہوئے تمام لوگ موافقت یا مخالفت میں ووٹ دے رہے تھے لیکن الیکشن کے وقت صدر نے اعلان کیا کہ جو لوگ ڈیلی گیٹ نہیں ہیں وہ ہال سے باہر چلے جائیں انھیں الیکشن میں حصہ لینے کا حق نہیں ہے یا تو

ایسے تمام لوگ پانچ روپیہ دے کر ڈیلی گیٹ بن جائیں یہ اعلان کئی بار ہوا ہال میں اس اعلان سے اچھی خاصی کھلبلی مچ گئی کچھ لوگ سجاد ظہیر کے پاس روپیہ جمع کرکے ڈیلی گیٹ کارڈ لینے لگے لیکن کچھ لوگ کانفرنس ہال سے باہر چلے گئے جن میں ڈاکٹر محمد حسن، ڈاکٹر قمر رئیس، شریف احمد، ڈاکٹر شارب ردولوی، ڈاکٹر فضل الحق، صدیق الرحمٰن قدوائی نمایاں طور پر نظر آرہے تھے ان کے باہر جاتے ہی کرشن چندر بھاگ کر باہر پہنچے اور کہا کہ آپ لوگ کہاں جا رہے ہیں ان لوگوں نے کہا کہ ہم ڈیلی گیٹ نہیں ہیں کرشن چندر نے جواب دیا "ارے آؤ کون دیکھتا ہے" میں نے دیکھا کہ ایکبار پھر یہ سب لوگ واپس آگئے ابھی یہ لوگ بیٹھ بھی نہیں پائے تھے کہ صدر جلسہ نے پھر اعلان کیا اور ڈیلی گیٹ فیس کا مطالبہ دہرایا۔ اندر آنے والے لوگوں میں اب کچھ بیٹھ چکے تھے شاید ڈاکٹر محمد حسن کے ضمیر نے یہ بے ایمانی گوارہ نہیں کی اس لئے وہ دوبارہ باہر چلے گئے اس مرتبہ ان کے ساتھ ساتھ شریف احمد لکچرر دہلی یونیورسٹی، ڈاکٹر فضل الحق اور ڈاکٹر شارب ردولوی تھے پھر یہ لوگ کانفرنس ہال میں نظر نہیں آئے تھوڑی دیر بعد الکشن شروع ہوا۔ ۲۴۔ حرفِ خاص سے ایک ریڈی میڈ مجلس عاملہ کی فہرست آئی تھی وہ پڑھ کر سنائی گئی لیکن اس کے سننے کے بعد خلاف توقع حاضرین نے تالی نہیں بجائی بلکہ دیویندر ستیارتھی نے کھڑے ہو کر کہا کہ کیا یہ بوڑھوں کی انجمن بن رہی ہے جو اس میں کسی نوجوان کا نام نہیں ہے۔ اس میں زیادہ سے زیادہ تعداد نوجوانوں کی ہونی چاہیئے۔ بہت معصومیت سے ان سے کہا گیا کہ آپ بتائیے کہ کن نوجوانوں کو لیا جائے۔ اس فہرست میں زیادہ تعداد ایسے ادیبوں کی تھی جو کانفرنس میں نہیں شریک ہوئے تھے اس پر بھی اعتراض ہوا اس لئے دوسری فہرست حاضرین میں سے بنائی گئی اردو میں نوجوانوں کا انتخاب ڈاکٹر قمر رئیس اور متین صاحب (تجویز نجم الحسن) ڈاکٹر محمد حسن (تجویز۔ قمر رئیس) کے ناموں سے کیا گیا پوری فہرست دس گیارہ ناموں کی تیار ہوئی جس میں سکریٹری اپنی مرضی کے مطابق ناموں کا اضافہ کر سکتا ہے یہ اس لئے تاکہ ان ناموں کو رکھا جا سکے جو غیر حاضر کے زمرے میں کاٹ دئے گئے ہیں موجودہ فہرست کے کچھ نام یہ ہیں۔ رضیہ سجاد ظہیر۔ احتشام حسین۔ سردار جعفری۔ انور عظیم، ہنس راج رہبر۔ کرشن چندر۔ ڈاکٹر محمد حسن۔ ڈاکٹر قمر رئیس۔ نریندر شرما۔ متین صاحب۔

جب زیادہ سے زیادہ حاضرین کو سنٹرل کمیٹی کی رکنیت کا اعزاز مل گیا تو جنرل سکریٹری کے لئے سجاد ظہیر صاحب کا نام پیش ہوا جو منظور کر لیا گیا اس کے بعد جوائنٹ سکریٹری کے لئے تقی حیدر، پنجابی حلقے سے سرجیت سنگھ یا کوئی اور (مجھے صحیح نام یاد نہیں) اور ہندی سے ڈاکٹر نامور سنگھ کے نام پیش ہوئے جو منظور کر لئے گئے۔ خازن کے لئے رضیہ سجاد ظہیر کا نام پیش ہوا تھا لیکن آخر کار لوک سبھا کے ممبر کے دامودرن خازن چنے گئے۔

یہ الکشن اصولاً اس لئے غلط ہے کہ اس میں بہت سے ایسے لوگوں نے نہ صرف ووٹ دیا بلکہ حصہ بھی لیا جو ڈیلی گیٹ نہیں تھے جنھیں ڈاکٹر قمر رئیس اور صدیق الرحمٰن قدوائی کے نام اوپر آچکے ہیں۔

کانفرنس کے درمیان ہی میں یہ بات واضح ہوگئی تھی کہ یہ کانفرنس ادب کے مسائل سے متعلق نہیں بلکہ ایک "گھریلو معاملہ" ہے۔ بہت سے اہم لوگوں کا نہ آنا احتشام حسین اور ڈاکٹر علیم کی خاموشی۔ خاص لوگوں کا کانفرنس ختم ہونے سے پہلے چلے جانا بھی یہی ظاہر کرتا ہے۔ الکشن دونوں سشن کے درمیانی وقفہ میں دستور ساز کمیٹی کے ایک اہم رکن اور ایک مشہور ادیب میں گفتگو ہو رہی تھی۔ ادیب نے کہا کہ اب بنّے بھائی کو انجمن سے الگ ہو جانا چاہیئے اور دوسرے لوگوں سے کہنا چاہیئے کہ وہ انجمن چلائیں ان کی حیثیت ایک سرپرست کی رہنی چاہیئے۔ دستور ساز کمیٹی کے رکن نے جواب دیا کہ "اس کا مطلب یہ ہے کہ آپکو کانفرنس کے بنیادی اغراض و مقاصد سے اختلاف ہے" بہر حال بنیادی اغراض و مقاصد پورے ہو گئے سجاد ظہیر۔ جنرل سکریٹری۔ تقی حیدر۔ جوائنٹ سکریٹری۔ رضیہ سجاد ظہیر ممبر مجلس عاملہ ہو گئیں اور کانفرنس یکم جنوری ۱۹۷۶ء کو ۱ بجے شب میں بخیر و خوبی بہت کامیابی کے ساتھ ختم ہو گئی۔ جو نئے سال کا سب سے بڑا المیہ تصور کی جائے گی۔ میرا ایک مشورہ تھا جو میں نہیں دے سکا کہ انجمن کے نام میں ذرا سی تبدیلی کر دی جائے اور آج سے اسکو انجمن سجاد ظہیر ترقی پسند مصنفین کہا جائے لیکن کانفرنس کے اختتام

ބާބު

سنہ ہی تھا لیکن بعض دوسرے شبہات زیادہ اہم تھے۔ مثلاً ایک شبہ دہلی سے آنے والوں کی زبانی یہ پہنچنے والی اس خبر کی وجہ سے تھا کہ کوئی صاحب مرکزی انجمن کے صدر ہیں ۱۹۵۱ء سے اب تک انجمن کا کبھی کوئی صدر نہ ہوتا تھا۔ صرف جنرل سکریٹری ہوا کرتا تھا اور آخری باقاعدہ جنرل سکریٹری کرشن چندر رہے تھے۔ یہ خبر بھی آئی کہ انجمن کا کوئی خازن بھی مقرر کیا گیا ہے اور سکریٹری بھی کسی دوسرے کو مقرر کیا گیا ہے۔ یہ تمام باتیں لکھنؤ کے ترقی پسندوں کے لیے تشویش انگیز تھیں کیونکہ ان کے خیال میں یہ تمام باتیں اس وجہ سے ہو رہی ہیں کہ انجمن چند افراد کے ہاتھوں میں کھلونا بن گئی ہے اور بجائے اس کے کہ وہ ملک کے حالات کے مدنظر جمہوریت، آزادی اور سوشلزم کی طاقتوں کے ہاتھ مضبوط کرتے [illegible] انجمن چند افراد کے مفاد کا آلہ کار بنتی جا رہی ہے۔

اس کے بعد دہلی ہی سے یہ خبر موصول ہوئی کہ وہاں کی مقامی شاخ کے سکریٹری نے بھی انہی یا ایسی ہی وجوہ کی بنا پر اپنے عہدے سے استعفا دے دیا۔ لکھنؤ والوں کے شبہات قوی تر ہوگئے۔ اور ان کو سخت حیرت تھی کہ آخر مرکزی انجمن ان شبہات کو رفع کرنے کے لیے کچھ کیوں نہیں کر رہی ہے۔ خصوصاً جبکہ یہ شبہات صرف لکھنؤ تک ہی محدود نہیں بلکہ دوسرے شہروں میں بھی اسی قسم کے شبہات رونما ہو رہے ہیں۔

آخر کار لکھنؤ کے چند ترقی پسند ادیبوں نے یہ فیصلہ کیا کہ مل کر اس صورتِ حال پر غور کیا جائے۔ چنانچہ ماہنامہ کتاب کے دفتر میں لکھنؤ کے ترقی پسند ادیبوں کا ایک جلسہ مشہور مصور مسٹر حسن شہیر کی صدارت میں ہوا۔ جس میں شریک ہونے والوں میں مسیح الحسن رضوی منظر سلیم، رام لعل، عابد سہیل، قاضی عبدالستار (علی گڑھ) احمد جمال پاشا، اوصاف احمد، اور عثمان غنی وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

اس جلسہ میں ترقی پسند تحریک سے متعلق تمام مسائل اور امور پر تفصیل سے مباحثہ ہوا۔ مباحثہ کا آغاز منظر سلیم نے کیا۔ انھوں نے انجمن ترقی پسند مصنفین کی گزشتہ پندرہ بیس برس کی تاریخ بیان کرتے ہوئے بتایا کہ حیدرآباد کانفرنس ہی میں بعض لوگوں نے اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ تنظیم کو توڑ دیا جائے۔ انھوں نے کہا پچھلے پندرہ برسوں میں انجمن نے کوئی قابلِ ذکر کام نہیں کیا۔ جن لوگوں کے ہاتھ میں انجمن کی زمام تھی ان کو ہندستان کے ادیبوں یا ادب سے کوئی دلچسپی نہیں تھی صرف مصلحت پرستی، روپیہ کی لالچ اور غیر ملکی دوروں کی خواہش نے انجمن کو ان لوگوں کے لیے ایک آڑ بنا رکھا تھا۔ انھوں نے کہا کہ بشمول دیگر لوگوں کے سجاد ظہیر صاحب کا بھی یہی حال رہا ہم کو ان سے کوئی شکایت نہ ہونا چاہیے کیونکہ بہرحال ہر فرد اپنی مرضی کا مختار ہو رہا ہے لیکن ہم کو ان سے کوئی توقع بھی نہ رکھنا چاہیے۔ ان کو غالباً ایشیائی مصنفین کی کانفرنس کے لیے ایک کارروائی کرنا مقصود ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ ہم کو بجائے کیچڑ اچھالنے کے نیک نیتی سے کام کرتے رہنا چاہیے۔

صدر جلسہ حسن شہیر نے کہا کہ پچھلی نسل کے ترقی پسند ادیبوں نے ہندستانی عوام کو بھوک اور بے روزگاری کی لعنت سے نجات دلانے کے لیے کوئی قابلِ عمل اور قابلِ یقین راستہ نہیں دکھایا ہے ان کی تحریروں نے مادی حقائق سے ماورا ہو کر جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ خیال پرستی کی طرف اپنی باگ ڈور موڑ دی ہے جس کی ترویج و اشاعت سے ہمیشہ مادی حقائق اور پرولتاری انقلاب کی نفی ہوتی۔

اس کے بعد جلسہ میں نظریات کی بحث شروع ہو گئی اور خود ترقی پسندی کے نظریات کے بارے میں تفصیل سے گفتگو ہوئی جس میں مسٹر مسیح الحسن رضوی، عثمان غنی، عابد سہیل اور رام لعل وغیرہ نے حصہ لیا۔ عابد سہیل نے جلسہ کو پھر اصل مسئلہ کی طرف متوجہ کیا اور بتایا کہ دراصل اس وقت ہم لوگ صرف اسی لیے جمع ہوئے ہیں کہ مقامی اور ریاستی انجمن کی تشکیل کا کام از سرِ نو کیا جا سکے۔ کیونکہ ہم کو انجمن کے پروگرام سے کوئی اختلاف نہیں ہے صرف طریقِ کار سے اختلاف ہے۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

ادیب اب ڈرائنگ روم کا ہی ادب پروڈیوس کر رہے ہیں نئے لکھنے والے ہی اب صحیح معنوں میں تخلیقی اور عوامی ادب پیش کرتے ہیں کیونکہ ہم سے بیشتر ادیب ہی عام زندگی کی کڑی جدوجہد سے قریب تر ہیں۔ ان کے یہی تجربات ان کے ادب کا بھی حصہ بن جاتے ہیں۔ آخری دور میں انجمن ترقی پسند مصنفین کئی ادیبوں کے لیے سلاٹر ہاؤس بن کر رہ گئی تھی۔ ادبی سطح پر بے حد تشدد کا مظاہرہ کیا گیا تھا جو کہ اب بالکل نہیں ہونا چاہیے۔

نوعمر افسانہ نگار اوصاف احمد نے کہا مجھے اس تحریک کے ساتھ ہمیشہ ایک ذہنی وابستگی رہی ہے آج جب کہ یہ چند لوگوں کی جاگیر بنی ہوئی ہے تو مجھے سخت تکلیف ہوتی ہے ترقی پسند تحریک ایک زندہ اور جاندار تحریک تھی اس کا ادب آج بھی ہمیں روشنی دیتا ہے۔

آخر میں ایک تجویز اتفاق رائے سے منظور کی گئی جس میں کہا گیا کہ جس ذہنی انتشار اور اخلاقی فضا میں انجمن کی کانفرنس طلب کی گئی ہے اور اس سلسلہ میں جو طریق کار اختیار کیا گیا ہے اس کے پیش نظر لکھنؤ کے ترقی پسند ادیب اس بات کو بالکل مناسب سمجھتے ہیں کہ اس کانفرنس سے کوئی سروکار نہ رکھیں۔ گزشتہ اپریل میں تمام جمہوری روایتوں کو توڑ کر کل ہند انجمن کے عہدیداروں کے انتخاب میں جس اقربا پروری کا ثبوت دیا گیا ہے۔ اس سے ہم لکھنؤ کے ادیب اپنی بیزاری کا اظہار کرتے ہیں۔ مرکزی انجمن گزشتہ چند برسوں سے جس طرح چلائی جا رہی ہے اس سے ہمارا اشتراک و تعاون کرنا اپنے آپ کو دھوکا دینا اور اپنے قلم کو شرمندہ کرنا ہوگا۔

ان تمام طویل تقریروں سے مجموعی طور پر یہ رائے سامنے آئی کہ لکھنؤ کے ادیبوں کو دہلی کی کانفرنس میں شرکت سے انکار کر دینا چاہیے۔ اس سلسلہ میں دو نقطہ نظر تھے پہلا تو یہ کہ چند ادیبوں کو یہاں کے ادیب اپنا نمائندہ بنا کر کانفرنس میں بھیجیں اور وہ وہاں دہلی کانفرنس ہی میں اس ساری صورت حال کو صاف الفاظ میں بیان کریں۔ دوسرا نقطہ نظر یہ تھا کہ لکھنؤ کے ادیبوں کو دہلی کانفرنس کا قطعی بائیکاٹ کر دینا چاہیے اور وہاں نہ جانا چاہیے۔ آخر میں اس پہلے جلسہ میں یہی رائے متفقہ طور پر تسلیم کی گئی کہ لکھنؤ سے کوئی ادیب دہلی کانفرنس میں شرکت کے لیے نہیں جائے گا۔ دوسرا فیصلہ یہ کیا گیا کہ مجھ کو مقامی شاخ کی ایک کانفرنس طلب کرنے کی ذمہ داری ڈالی گئی۔ مقامی انجمن کے اس فیصلہ کی خبر مقامی اردو ہندی اور انگریزی کے اخباروں اور خبر رساں ایجنسی سے سارے ملک میں پھیل گئی چنانچہ چند روز کے اندر ہی چند افراد کے پاس دہلی سے مرکزی انجمن نے دعوت نامے، ڈیلی گیٹ کارڈ اور کانفرنس کا پروگرام وغیرہ موصول ہوئے سجاد ظہیر صاحب نے عابد سہیل کو تار دے کر خصوصیت سے مدعو کیا۔

ان خصوصی دعوت ناموں اور عابد سہیل کے پاس چند سادہ ڈیلی گیٹ کارڈ اور تار آنے سے جو صورت حال رونما ہوئی اس پر مقامی ادیبوں نے پھر ایک جلسہ میں غور کیا۔ یہ جلسہ ۲۵ دسمبر ۱۹۶۶ء کو احمد جمال پاشا کے مکان پر ہوا۔ اس میں شرکت کرنے والوں میں حسن شہیر، منظر سلیم، رام لعل، عابد سہیل، عثمان غنی، اوصاف احمد، لطیف صدیقی، شتاق احمد اور بہت سے دیگر افراد کے علاوہ دہلی سے آنے والے مہمان شارب ردولوی بھی شامل تھے۔ جلسہ میں ایک مرتبہ پھر بہت تفصیل سے اس بات پر گفتگو ہوئی کہ لکھنؤ کے ادیبوں کا کوئی وفد دہلی جائے یا نہ جائے۔ ڈاکٹر شارب ردولوی نے تفصیل سے دہلی کی صورت حال پر روشنی ڈالی اور بتایا کہ دہلی میں ادیبوں کی ایک بہت بڑی تعداد بھی لکھنؤ والوں کی ہم خیال ہے لیکن چونکہ دہلی والے کانفرنس میں شرکت کا فیصلہ کر چکے ہیں اس لیے لکھنؤ والوں کو بھی کانفرنس میں شریک ہو کر ان کا ہاتھ مضبوط کرنا چاہیے۔ بہرحال مقامی انجمن اپنے اس فیصلہ پر قائم رہی کہ لکھنؤ کے ادیب دہلی کانفرنس میں شریک نہ ہوں۔ اس جلسے میں دو اہم فیصلے بھی کیے گئے۔ ایک تو یہ کہ ۲۸ دسمبر کو مقامی شاخ

کی ایک کانفرنس کی جائے اور دوسرے یہ کہ اس کانفرنس میں ایک قرارداد منظور کی جائے اور اس کو لکھنؤ کے ادیبوں کی طرف سے ایک پیغام کی صورت میں دہلی کانفرنس میں بھیجا جائے۔

مقامی شاخ کی یہ کانفرنس ۸ ۲ر دسمبر کو شام کے ۵ بجے یو۔ پی۔ پریس کلب میں مسٹر سیّد احسن رضوی کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ اس کا افتتاح پنڈت آنند نرائن ملّا نے کیا۔ اور اس میں رام لعل نے اردو افسانہ پر انگریزی میں ایک مضمون، حسن تمہید نے ترقی پسند تحریک کے ۲۵ برس پر ایک مضمون پڑھا۔ اس کے بعد ایک قرارداد عابد سہیل نے پیش کی جس کی تائید ہندی کے شاعر بیر راجا اور سنتر سلیم نے کی۔ آخر میں یہ قرارداد اتفاق رائے سے منظور ہوئی۔ قرارداد کے متن کا اردو ترجمہ حسب ذیل ہے۔

"ہم لکھنؤ کے ترقی پسند مصنفین ترقی پسندی پر اپنے یقین کا اعادہ کرتے ہوئے اس طریقہ کی مذمت کرتے ہیں کہ جس طرح انجمن ترقی پسند مصنفین کی چھٹی کانفرنس طلب کی گئی۔

گذشتہ ۵ برسوں میں پی۔ ڈبلیو۔ اے کے مرکزی دفتر کی جو کارگذاری رہی ہے اس کو قابل اطمینان کے علاوہ سب کچھ کہا جاسکتا ہے۔ پی۔ ڈبلیو۔ اے کے لیڈروں نے نہ صرف یہ کہ ادیبوں کی رہبری و رہنمائی اور ان کا اعتماد حاصل کرنے میں ناکام رہے ہیں بلکہ انھوں نے تنظیم کو نجی فوائد حاصل کرانے کے لیے استعمال کیا ہے۔ انجمن کے مرکزی دفتر کی باگ ڈور جن ہاتھوں میں رہی وہ صرف اپنے، اپنے عزیزوں اور دوستوں کے لیے غیر ملکی دوروں کا ہی بندوبست کرتے رہے۔ وہ صرف مالی فوائد کے حصول کے لیے کام کرتے رہے اور اس طرح پی۔ ڈبلیو۔ اے موقع پرستوں اور مفاد پرستوں کی آماجگاہ بن گئی۔ ہم اس کی بھی مذمت کرتے ہیں۔

ہمارا خیال ہے کہ اس کانفرنس کو صرف اسی لیے منعقد کیا جا رہا ہے کہ ان تمام مندرجہ بالا باتوں کو ادبی سرگرمی کا نام دیا جاسکے اور مستقبل میں ان موقع پرستوں کو مزید مالی منفعت حاصل کرنے کا موقع دیا جاسکے۔ یہ سب کچھ ہے ترقی پسندی نہیں ہے۔

لکھنؤ کے ترقی پسند مصنفین کا یہ خیال بھی ہے کہ انجمن ترقی پسند مصنفین کے موجودہ لیڈر تحریک کی نظری اساس سے منحرف ہوگئے ہیں۔ ترقی پسند کا نظریہ ایک انقلابی نظریہ تھا اور تنظیم کے موجودہ لیڈران متواتر ان عناصر سے سمجھوتے کرتے رہے ہیں جو اگرچہ سوشلزم اور جمہوریت کے رستہ پیرو ہیں لیکن جو در اصل ترقی پسندی کے مخالف ہیں۔ ہم اس رویہ کی مذمت کرتے ہیں اور ان سمجھوتوں کا فریق بننے سے انکار کرتے ہیں۔

ایک مرتبہ پھر ہم ترقی پسندی پر اپنے یقین کا اظہار کرتے ہیں اور اس مقصد کے لیے کام کرتے رہنے کا عہد کرتے ہیں۔

ترقی پسند مصنفین، لکھنؤ"

اس قرارداد کو پیغام کی شکل میں دہلی کانفرنس کو بھیج دیا گیا اور اس کو چھپوا کر بھی دہلی روانہ کیا گیا تاکہ اس کو کانفرنس کے شرکا میں تقسیم کر دیا جائے۔ اس پیغام پر، اردو، ہندی، بنگالی اور پنجابی کے تقریباً ۵۰ مقامی ادیبوں نے دستخط بھی کیے۔ جن میں پنڈت آنند نرائن ملّا بھی شامل ہیں۔

لکھنؤ ترقی پسند کانفرنس نے مقامی شاخ کے عہدیداروں کا بھی انتخاب کیا اور عثمان غنی کو سکریٹری اور داؤد صاف احمد کو معاون سکریٹری منتخب کیا گیا۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]: 29269 —— [illegible]: 29269

حکومت کرنے والا طبقہ تو کبھی یہ پسند نہیں کرتا ہے کہ اس کی رعایا میں انصاف اور مساوات کے متعلق حقیقی شعور پیدا ہو اس لئے کہ عوام میں اس شعور کے بیدار ہونے سے اس کی حکومت کو خطرہ لاحق ہوتا ہے۔

عوام کے پڑھے لکھے طبقہ میں ——— جو دانشور کہلاتا ہے ——— وہ ایسے خیالات کو برقرار رکھنے میں معاون ہوا ہے جو عوام کے سوچنے اور سمجھنے کی طاقت کو ناکارہ بنا دیتی ہے اور ان کے عمل کی قوت درجہ بدرجہ زائل ہوتی رہتی ہے۔ با اقتدار طبقہ کے بورژوا نظریات زندگی کے ہر شعبے میں اور سماج کے ہر ادارے میں پھیلتے، بڑھتے، پھلتے پھولتے اور اپنی شکلیں بدلتے رہتے ہیں۔

اپنا مختلف روپ رکھتے ہوئے بھی بورژوا نظریوں میں ایک بنیادی فرق کا رونما ہونا قریب قریب ناممکن ہوتا ہے۔ مختلف بورژوا نظریے ایک بنیادی مماثلت کی بنا پر پرانی اور نئی دنیاؤں کے اصولوں کے مابین فاصلے پیدا کرتے ہیں۔ ان نظریوں کا ایک جگہ پر آکر ملنا ——— خواہ ان کی تشکیل ایک دوسرے سے کتنی ہی جدا جدا اور مختلف کیوں نہ ہوں ——— بہت ضروری ہوتا ہے۔ یہاں پر آکر تمام بورژوا نظریے تاریخ کو ذہنی اور مادی دونوں حیثیتوں سے دو بڑے حصوں میں بانٹ دیتے ہیں ——— قدیم اور جدید زمانوں کی دو بڑی بڑی، واضح اور نمایاں شکلیں یہاں پر نظر آئیں گی۔

تمام بورژوا نظریوں نے انسانیت کو ایک خیالی دنیا کی پرستش پر آمادہ کیا ہے اور حقیقی اور عملی دنیا سے انسان کو کم از کم نفرت دلانے میں ان سے مدد ملی ہے۔ اس نقطۂ نگاہ کے ماتحت عوام کو فرار پسند نظریوں پر یقین ہونے لگتا ہے اور حقیقی زندگی کو وہ دھوکا سمجھنے پر مجبور رہتے ہیں۔ حقیقی، عملی اور مادی دنیا سے وہ نفرت کرنے لگتے ہیں۔ دنیا اور دنیا سے متعلق تمام چیزوں میں "سراپا گناہ" کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ ہر مادی چیز کو وہ سراپا گناہ کہنے پر مجبور ہوتے ہیں۔

ذہنی اور نظریاتی توہمات سے مجبور ہو کر ہی فرار کا راستہ اختیار کرنا انسان کے لئے لازمی ہوا ہے۔ اپنے رہنے کے لئے وہ خیال کا مرتب کھنے کے لئے اچھوتا اور خوبصورت تابوت تعمیر کرتا ہے اور وہ اس تابوت کی پرستش کرنے پر مجبور رہتا ہے۔ خیال پرستی اس کی مادی ترقی میں ہمیشہ مانع ہوئی ہے اور زندگی کی جدوجہد میں پیچھے رہنے کا وہ عادی ہو گیا ہے۔ مادی زندگی کی احساس کمتری کو نباہنے کی خاطر طرح طرح کے خیالی مجسمے وہ بناتا ہے اور ان کے ذریعے احساس برتری کا مظاہرہ کرتا ہے۔ وہ دوسروں کی خوشگوار زندگی کو تنقیص کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور مجہول اور بے معنی خیالات کے زیر اثر اپنے کو بڑا ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

اس کے ذہن میں خیالِ محض کے تانوں بانوں کی ایک رنگین اور پراسرار ——— لیکن ناقابلِ عمل تصویر کا خاکہ ہوتا ہے۔

صدیوں سے غیر ترقی یافتہ انسان ہی نہیں بلکہ شاعر، ادیب اور فنکار بھی خود ساختہ اور خیالی دیوتاؤں کی پرستش کرنے پر مجبور ہوا ہے۔ عینیت پرست صوفیوں اور فلسفیوں نے انہی مجسموں کو خیالِ محض کے تانوں بانوں میں پرو دیا ہے۔ سادھو سنتوں، رشیوں منیوں اور مولوی پنڈتوں نے بھی انہی مجسموں کی ایک ازلی اور ابدی ——— لیکن قطعی خیالی شکل کی پرستش کی ہے۔ یہ خیالی مجسمے ہزاروں سال کی تاریخ کو اپنے دامان اثر میں لئے ہوئے ہیں۔

ہر دور میں اور ہر زمانے میں انسانیت کو اس مجسمہ کی پرستش پر آمادہ کیا گیا ہے ——— لیکن تمام ادوار سے گزر کر تاریخ نے ایک ایسے دور میں قدم رکھا ہے جب اس مجسمہ کی تصوراتی اور خیالی شکل پچھلے تمام ادوار میں درجہ بدرجہ واضح ہو کر آج کے دور میں ٹھوس اور حقیقی بن گئی ہے۔ کچھ اس درجہ کہ اس مجسمہ کی خیالی اور مادی شکلوں میں امتیاز اور فرق کرنا مشکل ہو گیا ہے۔

جس دور سے آجکل تاریخ گزر رہی ہے اس دور کی [illegible] سے نمایاں خصوصیت یہی ہے کہ صدیوں کے توہمات میں پلا بڑھا ہوا تاریخ کا یہ تصوراتی اور خیالی مجسمہ عملی اور حقیقی روپ میں ظاہر ہو رہا ہے۔

[illegible]

[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]	[illegible]	[illegible]

[illegible]

کوثر چاندپوری

عالمِ بالا

آل نبی بڑا خوش نصیب تھا کہ شہر میں بالکل نووارد ہونے کے باوجود دفتر میں اپر ڈویژن کلرک ہو گیا اس کا آفس ایک سات منزلہ عمارت میں تھا جہاں نیچے سے اوپر جانے اور اوپر سے نیچے آنے کے لئے لفٹ لگی ہوئی تھی جو آپ ہی آپ بٹن دبانے سے چل پڑتی تھی اس میں زنگنت کمرے تھے کلرکوں سے بھری ہوئی یہ عالیشان اور خوبصورت بلڈنگ یوں لگتی تھی جیسے شہد کا بڑا سا چھتہ ہو جس کے ہر خانے میں مکھیاں بھنبھنا رہی ہوں بابو لوگ مکھیوں کے مانند ہی کمروں میں ٹھسے رہتے تھے جگہ جگہ بہت سے لیٹرن اور باتھ روم تھے لیٹرن کا لفظ کلرکوں کی ڈکشنری سے خارج کر دیا گیا تھا اسکو باتھ روم ہی کہا جاتا تھا شام کو چھٹی کے وقت کلرک اس طرح دفتر سے نکلتے تھے جیسے سفید بھیڑیں چراگاہ سے لوٹ رہی ہوں اس وقت یہ خالی پیٹ ہوتے تھے بہت تھوڑے بابو تھے جو شام کو کینٹین میں چائے پیتے اور بسکٹ کھاتے تھے نوکری مل جانے کے بعد بھی آل نبی مطمئن نہ تھا اب اس کے سامنے رہائش کا سوال تھا جس کو حل آسان نہ تھا اس وقت تک وہ ایک مل مزدور کا مہمان تھا اور اس کی جگی میں ٹھہرا ہوا تھا جس پر ترپال کی چھت تھی برسات میں اس کے نیچے سونا شاور باتھ لینے کے برابر تھا ایک روز بارش کا پانی جگی کے اندر بالکل طوفانی انداز سے داخل ہو گیا جو لوگ بے خبر سو رہے تھے وہ بدحواسی کے عالم میں اٹھ کر بھاگنے لگے کسی نے بستر لپیٹ کر مسجد کا رخ کیا کسی نے سرائے اور ہوٹل کا۔ آل نبی نے چند روز کے لئے ہوٹل میں ڈیرا ڈال لیا کرائے کے بوجھ سے اس کی کمر دوہری ہوئی جا رہی تھی کہ اچانک اس کی ملاقات شعیب سے ہو گئی جو اس کا پرانا دوست تھا اور وقف بورڈ کے محکمہ میں نوکر تھا اس نے ہمدردانہ لہجہ میں کہا۔

"یہاں کب تک پڑے رہو گے کوئی مستقل ٹھکانا کر لو۔"

"کہاں کروں وہ بولا ایک پلنگ کی جگہ بھی ہزار پانچسو سے کم میں نہیں ملتی جہاں جاتا ہوں روپئے کا سوال ہوتا ہے اس دن بارش سے بچنے کے لئے چند گھنٹے مسجد میں پڑا رہا تھا ملاجی نے ایک روپیہ لے کر وہاں سے بھگا دیا وہ کہنے لگے ہوٹل میں جاؤ یہ خدا کا گھر ہے یہاں پاؤں پھیلا کر سونا یا لیٹنا جائز نہیں۔

"میں وہاں سے بھاگ کر یہاں آ گیا۔ لیکن اس روپے کا بڑا غم ہے وہ خدا کے نام پر ملاجی کے پیٹ میں گیا ہوگا۔"

"یہ دلی ہے دوست یہاں پلنگ کا نام نہ لو صرف بستر بچھانے کے لئے کسی کونے کی تلاش کرو۔"

"کہیں بستر بچھانے ہی کی جگہ مل جائے تو غنیمت سمجھوں گا تم کہاں رہتے ہو؟"

"میں؟ ——— میرا گھر ایک مزار میں ہے تم ہنسو گے مگر سچ کہتا ہوں بڑے آرام کی جگہ ہے جس طرح صاحب مزار جنت میں مزے کی نیند سو رہے

ہیں اسی طرح میں اپنے ساتھیوں سمیت رات بھر نہایت اطمینان سے لمبی تان کر سوتا ہوں گنبد کی چھت اتنی مضبوط اور دبیز ہے کہ پانی کی ایک بوند بھی رس کر اندر نہیں آتی اگر میرے ساتھ رہنا چاہو تو بتاؤ آج ہی ایک سیٹ خالی ہوئی ہے ویٹنگ لسٹ میں بہت سے نام ہیں میں کوشش کرکے تمھارے نام الاٹ کرا دوں گا۔

وہ اسی وقت شعیب کے ساتھ درگاہ شریف چلا گیا دور سے وہ جتنی شاندار نظر آرہی تھی قریب سے بھی ویسی ہی نظر آئی کسی زمانہ میں یہ علاقہ ویران اور سنسان ہوگا اب چاروں طرف آبادی ہی آبادی تھی بازار تھے سڑکیں تھیں ان کے کنارے اونچے اونچے بجلی کے کھمبے تھے سڑکوں پر ہر وقت موٹریں سائیکلیں اور دوسری سواریاں دوڑتی رہتی تھیں چار دیواری کے اندر بیس کمرے تھے جن کے دروازوں میں لکڑی کے مضبوط کواڑ لگے ہوئے تھے ہر کمرے کا کرایہ پچیس روپے ماہانہ تھا۔ شعیب نے بتایا کہ میں اب تک کمرہ حاصل نہیں کرسکا مزار کے اندر رہتا ہوں یہاں ایک بستر کے لئے بارہ روپے دینے پڑتے تھے اور وہاں چوبیس بستر بچھائے جاسکتے ہیں۔ کچھ دن پہلے تک ہم لوگ باہر سائبان میں رہا کرتے تھے مزار کے اندر کسی کو سونے کی اجازت نہ تھی برسات کی ایک اندھیری رات میں بہت تیز ہوا چلی اور خوب موسلا دھار مینہ برسا، اس آندھی اور طوفان میں سائبان اڑکر دور جا پڑا ہمارے بستر بھیگ گئے ایک ساتھی نے درگاہ کھول کر کہا۔

"یہاں آجاؤ"

"سب لوگ وہیں گھس گئے اور موم بتی کی دھیمی روشنی میں برابر برابر چوبیس دریاں بچھالیں اس طرح قبرستان میں زندوں کی دنیا آباد ہوگئی یہ بستی اب تک کسی کے اجاڑے اجڑ نہ سکی کوشش بہت کی جارہی ہے دو مہینے ہوئے ہم نے کسی نہ کسی طرح بجلی کی فٹنگ بھی کرالی"

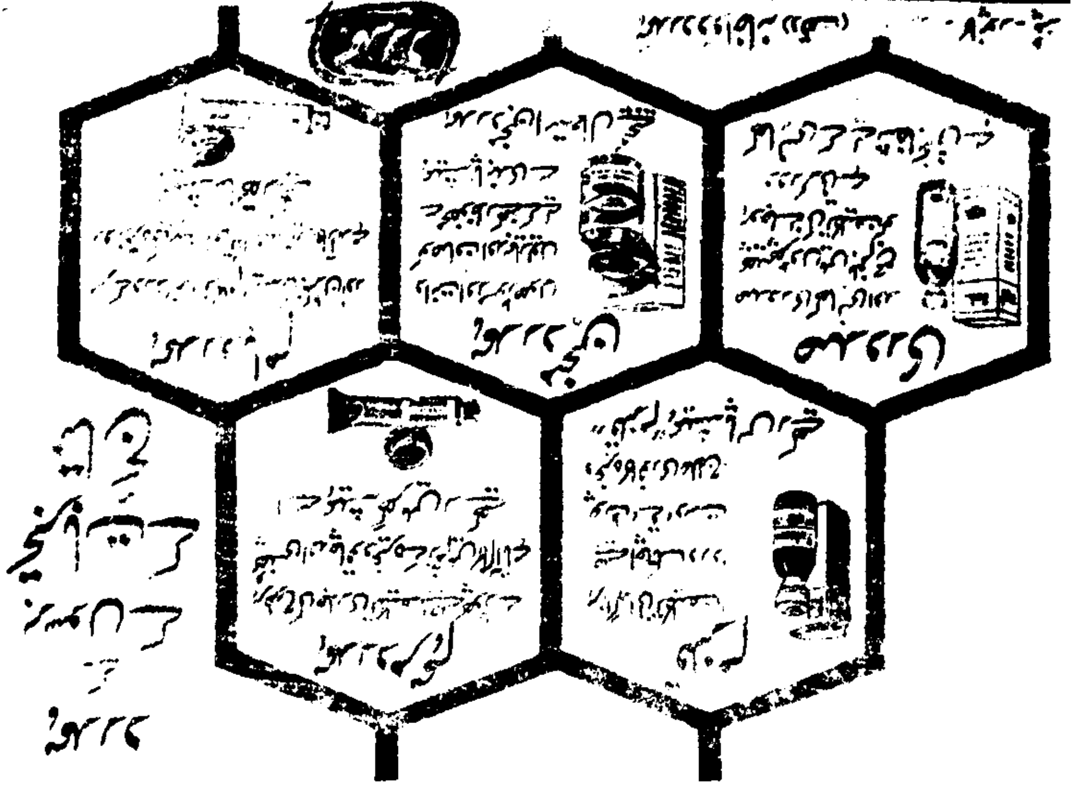
آل نبی نے اندر جھانک کر دیکھا سچ مچ بڑی رونق تھی چھت کے اندر جہاں صدیوں جنگلی کبوتروں نے گھونسلے بنائے ہوں گے ایک بڑی سی بیرک تھی جس میں مختلف رنگ کی دریاں بچھی ہوئی تھیں سرہانے کہیں ایک بکس رکھا تھا اور کہیں نیچے اوپر دو صندوق رکھے ہوئے تھے بیچ میں زمین سے ڈیڑھ فٹ اونچا تعویذ تھا اس پر سوکھے پھول بکھرے ہوئے تھے کوئی تازہ پھول نظر نہ آیا۔ اتنا ممکن ہے ان چوبیس میں کوئی من چلا اپنی محبوبہ کے لئے چن لیتا ہو۔ یہ منظر دیکھ کر آل نبی کو بڑی حیرت ہوئی وہ ذرا دیر یوں ہی ٹہلتا رہا اور ہر چیز کو غور سے دیکھنے کی کوشش کرتا رہا۔ اسے متحیر اور خاموش دیکھ کر شعیب بولا۔

"سوچتے کیا ہو اس سے اچھا مکان نہیں مل سکے گا فٹ پاتھ کے مقابلہ میں بیرک ہر اعتبار سے غنیمت ہے"

"مگر سب اکھٹے ہی رہتے ہیں سامان روپیہ پیسہ رکھنے کی کوئی محفوظ جگہ بھی تو نہیں روپیہ پیسہ بنک میں رکھا جاتا ہے یا جیب میں اور سامان بکس بند کرکے تالا لگا دیا جاتا۔ یہاں آج تک چوری کی کوئی واردات نہیں ہوئی ہم سب خاندان کے مختلف ممبروں کی طرح رہتے ہیں ہر شخص سویرے ہی یہاں سے نکل جاتا ہے اور کسی ہوٹل میں ناشتہ کرکے کام پر چلا جاتا ہے شام کو تھکا ہارا لوٹتا ہے اور دری پر لیٹ کر سو جاتا ہے چاروں کونوں میں پنکھے رکھے ہوئے ہیں گرمی لگتی تو بجلی کا بٹن دبا دیا جاتا ہے جنت کی ٹھنڈی ہوائیں آنے لگتی ہیں اس طرح گرمی سردی اور برسات آرام سے گزر جاتی ہے۔

شعیب شہد کی مکھی کے لئے بھی چھتے میں ایک الگ خانہ ہوتا ہے جس میں وہ انڈے دیتی اور بچے نکالتی ہے بچے بڑے ہوجاتے ہیں تو انھیں بھی ایک خانہ رہنے کو مل جاتا ہے۔

"بے وقوف" شعیب بولا "تو مکھیوں کی حکومت میں پہنچ گیا جہاں اختلاف رائے کی ذرہ بھر گنجائش نہیں یہ ہمارا دیس ہے یہاں ہر بات پر لڑائی ہوتی ہے، کرائے دار قتل کر دئے جاتے ہیں پھر بیوی بچوں کا ذکر کیوں لے بیٹھے بھائی یہ تیس لاکھ آبادی کا شہر ہے یہاں اب بھی مصنوعی تخم ریزی کے ذریعہ بچے پیدا کئے جارہے ہیں دوسری طرف فیملی پلاننگ کی اسکیم کامیاب بنائی جارہی ہے یہاں اکیلے رہنا بھی آسان نہیں ہم سب کی شادی ہوچکی



[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

ށ – [illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

ނ — [illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]

ނިމުނީއެވެ

[illegible]

•

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

•

[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

•

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

✲

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

چیخیں سانس بنیں
رُوح کا سنّاٹا کم ہوتا جاتا ہے

جسم کے جانے کس گوشے میں
میرا سایہ چھپا ہوا تھا
آج تڑپ کر باہر نکلا مجھ سے کچھ کہنے والا ہے
"کچھ تو بولو ، کچھ تو بولو
تھر تھر تھر ——
دل کی دھرتی کانپ رہی ہے
میرے پاس تو لفظ نہیں
جانے کیا ہونے والا ہے !"

"تیرے دل میں ایک قیامت
مہماں بن کر آئی ہے !
تجھ کو پاگل پن سے آگے رہ کر بھی
جینا ہوگا۔!!"

"[illegible]
[illegible]
[illegible]"
[illegible]...
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

"[illegible]"

[illegible]

[illegible]

*

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

(4)

[illegible]

(1)

[illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

([illegible])

[illegible]

[illegible]

سحر انصاری

جہانِ گزراں

رکھے ہیں مری میز پہ سب خاک کے ذرات
بکھرے ہیں مرے سامنے اوراقِ سماوات
ہے خواب گہ ارض و فلک جوفِ شبِ تار
ہیں جوفِ شبِ تار میں بیدار خیالات
ہیں شعلہ فگن وقت کی بے رحم زبانیں
ہیں لرزہ براندام شکایات و مفادات
کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ اس عرصۂ غم میں
ہیں وقت کی خوراک جمادات و نباتات
انسان کے ہاتھوں میں ہیں فطرت کی عنانیں
انسان ہے آقائے فلزات و بخارات
انسان کے قبضے میں ہو کُل گردشِ رفتار
انسان ہے معمارِ محلات و عمارات
ہیں ثابت و سیار یہ انساں کی کمندیں
تکوین کے اسرار ہیں انساں کے اشارات

محروم ہے، شاکی ہے، فسردہ ہے، حزیں ہے
وہ تارکِ دُنیا ہو کہ ہو بندۂ لذات
عاجز ہے نباتات و جمادات کے مانند
ہو صاحبِ الہام کہ پیغمبرِ تورات
ہر سمت ہے اک کش مکشِ گردشِ رفتار
ہر سمت ہے اک جبر پُر اسرار و پُر آفات
ہر سانس ہے اک معرکۂ صرصر و کہسار
اس رزم میں کیا ضربِ پرِ کاہ کی اوقات
کیا جذب و کشش، ربط و وفا، مہر و محبت
کیا دوستی و رشتہ و اخلاص و عنایات
ہر چیز ہے بے معنی و لحاقی و فانی
ہر شخص ہے آئینۂ اوہام و طلسمات
انفاس کی جنبش کی حقیقت ہی بھلا کیا
جب گھات میں ہو زہر بسر خنجرِ آنات

کچھ سوچ رہے ہیں کہ بہ ایں حکمت و دانش
احساسِ زیاں کیوں ہے بھلا منکشفِ ذات
اس کہنہ گزرگاہ کی ہر شئے گزراں ہے
اشجار کہ اجسام کہ افکار و خیالات
ہر آن گزر جاتا ہے بیگانہ دستی سے
رہ جاتے ہیں ہر آن کے ناخواستہ صدمات

کمرے میں مرے کون ہے لے خلوتِ جاں بول
اب کاکلُ و عارض ہیں نہ افسانہ و نغمات
اب حکمت و دانش ہے نہ شعر و ہنر و رنگ
محمل ہے نہ معبد ہے نہ آلات نہ آیات
اک میں ہوں نگارندۂ تقویم مہ و سال
اک سوزنِ ساعت ہے شمارندۂ لمحات

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]

وحید احسن

جزیرہ

میں نے ہر چند چاہا
تصوّر کی دُنیا سے نکلوں
خیالات کی ان فصیلوں کو توڑوں
قیدِ تفکّر کی سرحد سے باہر چلا آؤں لیکن
دست بستہ تھا زنجیر میں
پاؤں میں بیڑیاں تھیں پڑی
میں گرفتارِ حالات تھا
مقید کیا تھا مجھے سوچ نے
جس کی باڑیں نوکیلی نہیں
اور نظروں میں چبھتی نہیں
پردہ اک تارِ معدوم ہے
دائرہ جس کا ہر وقت
گھٹتا ہوا اور بڑھتا ہوا
کوئی ترکیب ایسی نہیں
کوئی اوزار ایسا نہیں
جو اسے کاٹ دے
مجھ کو حقائق کے طغیان نے
تصوّر کے ایسے جزیرہ میں پھینکا ہے کہ
تنہائی خنجر بنی میرے سینے میں اُترے گی یا
مجھ کو سچائی کے اس اُبلتے سمندر میں لینی پڑے گی پناہ

انتخاب سید

خُواہش

زندگی!
حادثاتِ جہاں سے لرزتی ہوئی
اپنے ماضی کے چہرے پہ جمتی ہوئی گردکو دیکھتی
اپنی معصومیت کا جنازہ اُٹھائے ہوئے، کانپتی
کتنی گستاخ نظروں کا مرکز بنی
کتنے بے باک جملوں کی زد سے چراتی ہوئی
اپنی آہستگی
رات، دن کے مسلسل سفر سے پریشان ہے
چاہتی ہے کہ اب
مدتوں کی تھکن کا یہ بارِ گراں
وقت کو سونپ کر
خواہشوں
آرزوؤں
تمناؤں کی آہٹوں سے پرے
آسمانوں پہ ابدی سکوں کی ردا اوڑھ لے
دیوتاؤں کے پاکیزہ نقشِ قدم چوم لے
تاکہ پھر
جنگلوں میں بھٹکنے کا احساس جاتا رہے
موت کو پھر کلیجے لگانے کی خواہش نہ ہو!!

[illegible] [illegible]
[illegible] [illegible]

[illegible] [illegible]
[illegible] [illegible]

[illegible] [illegible]
[illegible] [illegible]

[illegible] [illegible]
[illegible] [illegible]

[illegible]

[illegible]

نئی شاعری دراصل اسی فنی رویہ کے ردِعمل کے طور پر پیدا ہوئی ہے۔ کچھ تو اس کا سبب یہ بھی ہے کہ سیاسی و سماجی حالات نے پرانے عقائد و تصورات کی نارسائیوں کا پردہ چاک کر دیا ہے اور نئی نسل کا ایمان ان سے اٹھ گیا ہے، دوسرا سبب ۱۹۳۵ء کے نئے شاعروں کے ایک خاصے بڑے گروہ کی ہنگامی اور تجرباتی شاعری کی بے اثری کا احساس ہے۔

جیسا کہ میں نے پہلے کہا نئی شاعری انھیں خانوں اور حد بندیوں کے ٹوٹنے سے پیدا ہوئی ہے اسی لئے نئی شاعری پر تنقید و تبصرے کا کام بھی اب ذرا مشکل ہو گیا ہے۔ ترقی پسند تحریک اور حلقۂ ارباب ذوق کے اپنے اپنے نقاد تھے جو اپنے نظریات اور ادبی عقائد کی روشنی میں اپنے شاعروں کی تشریح و توضیح کرتے تھے اور انھیں سراہتے تھے۔ اپنے گروہ کے شاعر کو اچھا اور دوسرے گروہ کے شاعر کو برا کہنے کیلئے انھیں بہت زیادہ غور و فکر سے کام لینے کی ضرورت نہیں تھی۔ ان کے سامنے ایک واضح لکیر تھی جس کے ایک طرف سب اچھے تھے اور دوسری طرف سب برے۔ ترقی پسند نقاد اپنے شاعروں کو سماج کا ہمدرد، باشعور، ایک روشن مستقبل کا پیغامبر، صحت مند خیالات کا علمبردار، وقت اور زمانے کا نباض، بین الاقوامی شعور کا مالک اور انسانیت کا بہی خواہ اور دوسرے شاعروں کو سماج دشمن، داخلیت پرست، مریض، اپنی جبلتوں کا اسیر وغیرہ کہہ کر اپنے تنقیدی فرائض سے عہدہ برآ ہو جاتے تھے اسی طرح حلقۂ ارباب ذوق والے ترقی پسند شاعروں کو مبلغ، ڈھنڈورچی، ہنگامی اور صحافتی شاعر، فن سے بیگانہ وغیرہ کہہ کر انھیں رد کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ نیا شاعر اس تنقیدی رویے کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں۔ وہ نہ اپنے آپ پر لیبل لگانا چاہتا ہے اور نہ دوسروں پر۔ نیا شاعر ان دونوں گروہوں میں سے ان شعراء کو اپنے قریب محسوس کرتا ہے جنھوں نے ان گروہوں سے وابستہ رہتے ہوئے بھی اپنے آپ کو کسی خانے میں بند نہیں کیا بلکہ اپنی تخلیقی شخصیت اپنی افتادِ طبع اور اپنے تجربات و محسوسات کا لحاظ رکھا اور اسی بنا پر مؤثر اور قابلِ قدر تخلیقات پیش کیں چنانچہ اختر الایمان، مختار صدیقی، مجید امجد، منیب الرحمن، حامد عزیز مدنی اور اس نوع کے شاعروں سے نئی نسل کے شاعر ذہنی طور پر قربت محسوس کر رہے ہیں اور فیض، راشد، میراجی، مخدوم، سردار جعفری وغیرہ نے اسلوب و اظہار کے جو تجربے کئے تھے اس سے حسب توفیق فائدہ اٹھانے کی بھی کوشش کر رہے ہیں۔

چونکہ نئی شاعری خانوں اور حد بندیوں کے ٹوٹنے سے پیدا ہوئی ہے اس لئے نئے شاعروں پر کوئی لیبل نہیں لگایا جا سکتا نہ کوئی ایسی بات کہی جا سکتی ہے جو سب پر صادق آتی ہو۔ کسی ایک خصوصیت یا صفت یا کسی ایک شاعر کے فنی رویے یا کسی ایک شاعر کی کسی ایک نظم یا غزل کو سامنے رکھ کر اور اس سے کچھ نتائج نکال کر اگر انھیں پوری نئی شاعری یا نئی نسل پر منطبق کرنے کی کوشش کی جائے گی تو وہ اب زیادہ کامیاب نہیں ہو سکتی اس لئے کہ اس کی ایک خصوصیت، کو اگر ہم اس دور کی ساری نئی شاعری پر چسپاں کرنا چاہیں گے تو اس کا بہت سا حصہ اس کے دائرے سے نکل جائے گا۔ اسی طرح کسی ایک کیفیت کو ہم نئی شاعری کی پہچان بتائیں گے تو ہمیں خود محسوس ہوگا کہ یہ کیفیت سب شاعروں کے یہاں نہیں ہے بلکہ بعض اوقات ایک ہی شاعر کی ایک نظم یا غزل میں موجود ہوگی تو دوسری نظم یا غزل کسی اور کیفیت کا پتہ دے گی۔ غرض کہ اس دور کی نئی شاعری کی سب سے نمایاں صفت اس کی رنگا رنگی ہے۔ ایک ہی شاعر کے یہاں بعض اوقات تنوع ملے گا۔ وہ کسی ایک نظم میں داخلی شاعر معلوم ہوگا تو دوسری نظم میں خارجی تجربے کو برتنے کی کوشش کر رہا ہوگا اور کسی تیسری نظم میں داخلیت اور خارجیت کے امتزاج یا ٹکراؤ سے ایک تیسری کیفیت جنم لیتی ہوئی معلوم ہوگی۔ کسی شاعر کی ایک نظم ناکام اور بے کیف ہوگی تو دوسری نظم میں اس کا تخلیقی عمل کامیاب ہوتا نظر آئے گا۔ اس لئے پرانے نقادوں کی دشواری ہماری سمجھ میں آسکتی ہے۔ وہ اب تک کسی ایک شاعر یا کسی شاعر کی ایک نظم پر عملی تنقید کرنے کے بجائے رجحانات پر مضامین لکھنے کے عادی رہے ہیں۔ رجحانات پر مضمون لکھنے میں آسانی یہ ہوتی ہے کہ کسی نظم یا شعری تخلیق کے اندر جانے اور اس کا مکمل تجزیہ کر کے اس کے ادبی و جمالیاتی حسن و معائب کے بارے میں کوئی فیصلہ کرنے کے بجائے کسی موضوع کو خارجی طور پر سامنے رکھ کر اس پر لکھی گئی سب چیزوں کا سر دے کر ڈالا اور اعلیٰ، اوسط، ادنیٰ ہر طرح کی ادبی تخلیق کا ایک ہی سانس میں ذکر کرتے گئے اور پھر آخر میں اس رجحان سے وابستہ سب شاعروں

کو ان کی محنت کی داد دیدی۔ ہندوستان کی آزادی میں اردو شاعروں کا حصہ، اردو شاعری اور حب الوطنی، اردو شاعری میں سماجی شعور، اردو شاعری اور قحط بنگال، اردو شاعری اور عالمی جنگ، اردو شاعری اور تقسیم ہند ________ اردو شاعری اور فسادات، اردو شاعری اور امن، اردو شاعری اور بین الاقوامی شعور، اردو شاعری اور روایت۔ اردو شاعری میں مناظر فطرت۔ غرض کہ اس طرح موضوع قائم کرکے نظموں اور شاعروں کی فہرست جمع کیجیے اور ان نظموں کا خلاصہ نثر میں لکھنے کے بعد اس کے کچھ اقتباسات دے دیجیے۔ چلیے ایک تنقیدی مضمون ہو گیا۔

میرا خیال ہے کہ اس طرح کے نقادوں کے لیے نئی شاعری اپنے ساتھ بڑی مصیبتیں لائی ہے۔ میں نے ادھر کچھ مضامین نئی شاعری پر پرانے نقادوں کے دیکھے جن میں یہ کہا گیا ہے کہ نئے شاعروں کی نظمیں سمجھ میں نہیں آتیں، نئے شاعر اپنے ذاتی خول میں بند ہو گئے ہیں، ان کے یہاں اپنے زمانے کا کوئی شعور نہیں ہے۔ یہ داخلیت کی بھول بھلیاں میں قید ہیں، یہ صرف ٹیڑھی میڑھی نظمیں لکھ رہے ہیں اور ہیئت پرستی کی طرف مائل ہیں۔ یہ سب باتیں اپنی جگہ پر صحیح ہیں اور بعض نئے شاعروں کے یہاں یہ باتیں موجود ہیں لیکن ان کے علاوہ بھی نئے شاعروں کے یہاں بہت کچھ ہے اور ان شاعروں کے علاوہ بھی نئے شاعر ہیں۔ چونکہ نقادوں کو یہ اندیشہ ہے کہ کہیں ایسا ہی نہ ہو اس لئے وہ نام لینے یا مثالیں دینے سے گریز کرتے ہیں کیوں کہ مثالیں دینے کے بعد اس بات کی پرکھ بھی کی جا سکتی ہے کہ آیا نقاد جو کچھ کہہ رہا ہے وہ صحیح ہے یا وہ خود کسی غلط فہمی میں مبتلا ہے دوسرے یہ کہ ان کے برخلاف دوسری طرح کی مثالیں پیش کی جا سکیں گی تو پھر اس تنقید کا بھرم کھل جائے گا۔

میں سمجھتا ہوں کہ نئی شاعری کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے فہرست سازی، سرسری اور خالص نظریاتی تنقید کو بے معنی بنا کر رکھ دیا ہے اور عملی اور تجزیاتی تنقید کی ضرورت کا شدید احساس دلایا ہے۔ یہ توقع رکھنا کہ شعر و ادب کی تاریخ میں کوئی ایسا زمانہ آئے گا جب صرف اچھے شاعر پیدا ہوں گے یا کوئی شاعر صرف اعلیٰ درجہ کی چیزیں لکھے گا یا کسی شاعر کو ہر نظم یا ہر غزل کے لکھنے میں یکساں کامیابی ہوگی نہ صرف ناجائز بلکہ فضول اور مہمل توقع ہے۔ نقاد کا کام یہ ہے کہ وہ اپنے زمانے کی تخلیقات کو سمجھنے اور ان سے لطف اندوز ہونے کی کوشش کرے۔ اپنے دور کے طرز احساس، طرز فکر اور آہنگ و اسلوب سے موانست پیدا کرنے کی کوشش کرے، اور ماضی و حال کے ربط کو سمجھ کر فنی تخلیقات کی گہرائیوں میں جا کر ان کی کامیابی یا ان کی ناکامی کا راز معلوم کرے۔ ہمارے پرانے تنقید نگار اگر اس مشکل کام کو کرنے کے لئے تیار نہیں اور پرانے طریقے سے ہی لیبل اور ٹھپے بنا بنا کر کام چلانا چاہتے ہیں تو نئی شاعری کا مسئلہ ان کے لئے ہمیشہ دردسر بنا رہے گا اور نئی شاعری انھیں اسی حالت میں چھوڑ کر آگے بڑھتی رہے گی۔

گزشتہ دس پندرہ برسوں میں اردو کے نئے شاعروں کے یہاں زندگی کو ایک مکمل اکائی کی حیثیت سے دیکھنے، سمجھنے اور برتنے کا جو رجحان سامنے آیا ہے وہی اس منزل کا سب سے بڑا اکتساب ہے۔ داخلیت اور خارجیت، مواد اور ہیئت، ذات اور کائنات، غم جاناں اور غم دوراں، بڑے موضوعات اور چھوٹے موضوعات ان سب کی تقسیم اور انھیں علیحدہ علیحدہ سمجھ کر کسی ایک کو رد اور دوسرے کو قبول کرنے یا اپنے اوپر مسلط کرنے کو نیا شاعر ایک غیر فطری عمل سمجھتا ہے۔ وہ خارجی دنیا اور داخلی دنیا کو الگ الگ کر کے دیکھنے کا قائل نہیں بلکہ ان دونوں کے گہرے ربط کو سمجھنا چاہتا ہے۔ وہ فرد اور سماج دونوں کو الگ الگ نہیں بلکہ ایک دوسرے کا لازمہ قرار دیتا ہے۔ وہ شاعری کو اجتماعی خیالات کا منظوم بیان نہیں سمجھتا بلکہ اسے زندگی کے تجربات و مشاہدات کا ایسا تخلیقی اظہار سمجھتا ہے جو اس کی اپنی شخصیت، اس کے مزاج اور اس کے محسوسات سے ہم آہنگ ہو کر ایک منفرد پیکر اختیار کرے۔ وہ شاعری کو جماعتی کورس کے بجائے انفرادی تخلیقی عمل سمجھتا ہے۔ اس کے نزدیک ہر شاعر اپنی جگہ پر ایک منفرد وجود ہے اور اس کی ہر نظم خود اپنی جگہ پر ایک منفرد اکائی ہے۔ انفرادی اسلوب اور طرز کی اہمیت اس زمانے میں زیادہ بڑھ گئی ہے جبکہ گزشتہ ادوار میں عمومی اسلوب اور یکساں انداز بیان کو برتنے کا رجحان عام تھا۔

میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ نئے شاعروں میں ہر شاعر کو یا ایک شاعر کی ہر نظم یا غزل کو کسی ایک پیمانے سے جانچنا غلط ہوگا۔ ہمیں یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ ایک ایسے زمانے میں جب اردو زبان بعض پیچیدہ اور صبر آزما مراحل سے گزر رہی ہے اردو کا نیا شاعر اس زبان میں شاعری کی

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

رام لعل

کہرا اور کہرا

دہرہ دون ایکسپریس میں لکھنؤ سے سہارن پور جانے والے مسافروں کے لئے ایک علیحدہ کوچ بھی لگائی جاتی ہے لیکن اس میں راستے کے کئی اسٹیشنوں کے بھی مسافر گھس آتے ہیں۔ جیسے اُس روز میں رام پور جا رہا تھا۔ دوسری طرف کھڑکی کے سامنے لیٹا ہوا مسافر بریلی جا رہا تھا اور ریلوے کی بھاری یونیفارموں میں کئی فائرمین، ڈرائیور، بلاک فیٹر، ٹرین اگزامنر اور گینگ مین اپنی اپنی منزل کو جا رہے تھے۔ کوئی بالامئو تک، کوئی شاہ جہاں پور تک کوئی بجنور یا بریلی تک ہی، لیکن وہ جو کونے میں لیڈی ڈاکٹر موجود تھی صرف اس کو سہارن پور تک سفر کرنا تھا۔ آیئے اب اسی لیڈی ڈاکٹر کا ذکر کریں۔

اس کی آواز سن کر ہی میں نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا تھا۔ اس وقت میں اپنا ہولڈال کھولنے میں مصروف تھا۔ اس کی آواز سُن کر (سچ کہوں) میں کچھ لمحوں تک ہولڈال کھولنا ہی بھول گیا۔ میں نے سر گھما کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ قلی سے اپنا ہولڈال کھلوا رہی تھی۔ ساتھ ساتھ اپنے چھوٹے سے قد کی بوڑھی ماں سے باتیں بھی کرتی جا رہی تھی۔

"ماں میں جاتے ہی تمہیں خط لکھوں گی۔ تم میری چنتا مت کرنا۔ اس کمپارٹمنٹ میں بالکل سیف ہوں۔ دیکھو نا یہاں کتنے سارے پسنجر ہیں۔ فرسٹ کلاس میں تو رات کو ٹریول کرنے کی میری ہمت ہی نہیں پڑتی!"

جس عورت کے سر پر ڈھیر سارے بال ہوتے ہیں وہ مجھے بہت اچھی لگتی ہے۔ اس کی طرف میں بڑی دلچسپی سے دیکھتا ہوں۔ اس کے چہرے میں کوئی جاذبیت ہو یا نہ ہو۔ لیکن وہ تو خاصی دلکش تھی۔ گندمی اور تیکھی۔ لیکن بے حد سنجیدہ۔ تیز تیز باتیں کرتی ہوئی وہ مجھے سنجیدہ ہی نظر آئی۔ جب اس نے قلی کو باسکٹ گرا دینے پر ڈانٹا تب بھی وہ بے حد سنجیدہ لگی۔ یعنی اس کا ارادہ درحقیقت غصہ ہونے کا نہیں تھا۔ اسے محض تنبیہہ کرنا ہی مقصود تھا تاکہ آئندہ وہ محتاط رہے۔

جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے گاڑی چھوٹنے سے پہلے بعض مسافر پلیٹ فارم پر اپنے واقف کاروں کے نیم دائرے میں کھڑے رہتے ہیں جو انھیں سی آف کرنے کے لئے آتے ہیں۔ وہ بھی کمپارٹمنٹ سے باہر جا کر پلیٹ فارم پر کھڑی ہو گئی۔ اس کے گرد واقف کاروں کا کوئی نیم دائرہ نہ تھا۔ اپنی بوڑھی ماں کا ہی نہنا سا ایک ہالہ تھا جس سے وہ کافی متاثر نظر آتی تھی۔ اس کی باتوں سے کبھی مسرور ہو اٹھتی کبھی گھبرا جاتی!

اچانک ان کے پاس ایک بے حد اسمارٹ و خوش پوش نوجوان آکر کھڑا ہو گیا۔ اس نے بڑھیا کے پاؤں چھوئے اور لیڈی ڈاکٹر کو (اُس وقت تک مجھے معلوم نہ ہو سکا تھا کہ وہ دراصل کون ہے!) — "ہیلو"، کہہ کر اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ انہیں اسٹیشن پر دیکھ کر تعجب کا اظہار کیا۔

"جی نہیں جس لڑکے سے اس نے محبت کی اُسی کے ساتھ اس کی منگنی کی گئی تھی۔ لیکن اب وہ نہ تو اُس کے ساتھ شادی کرنے کو تیار ہے نہ کسی دوسرے کے ساتھ"۔ نوجوان کے لہجے میں عجیب سی تیزی تھی۔

میرے دخل در معقولات کا انہوں نے بُرا نہ مانا۔ ڈاکٹر بولی ـــ "پہلے ہمارا بھی خیال یہی تھا جو آپ نے ظاہر کیا ہے لیکن اب تو اسے شادی کے عمل سے ہی نفرت ہو گئی ہے۔!"

میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "ہو سکتا ہے شادی کے تصور کے ساتھ اس کا کوئی خوف وابستہ ہو!"

ڈاکٹر کا کزن بولا ـــ "ہاں صاحب ایک خوف تو میری سمجھ میں یہ آتا ہے ـــ کہ اس کی ایک فرینڈ ابھی حال ہی میں بیوہ ہو گئی ہے۔ اس کی حالت دیکھ کر ہی ممکن ہے اس نے فیصلہ کر لیا ہو!"

میں نے کہا ـــ "میں آپ کو اسی قسم کا ایک واقعہ سناتا ہوں۔ جب چین کے ساتھ ہمارا سرحدی جھگڑا ہوا تھا اُسی میں ایک نوجوان کیپٹن ہمارے شہر کا شہید ہوا تھا۔ اس کی ایک لڑکی سے منگنی ہو چکی تھی۔ جس روز اس کی استھیاں ایک کلس میں بند کر کے لائی گئیں تو ان کا سواگت گورنر اور ملٹری کے بڑے افسروں کے علاوہ قریب قریب سارے شہر نے کیا۔ اسٹیشن سے گنگا گھاٹ تک اسے ایک شاندار جلوس میں لے جایا گیا۔ اُس جلوس میں وہ ملول اور افسردہ لڑکی بھی تھی جو سر جھکائے کلس کے رتھ کے پیچھے چل رہی تھی لیکن اسے کوئی نہیں جانتا تھا۔ اگر اس کی شادی ہو چکی ہوتی تو شاید اسے کلس کے پہلو میں رتھ کے اوپر ہی جگہ ملتی۔ اور اس طرح اسے ایک شہید کی بیوہ ہونے کا فخر اور سمّان بھی نصیب ہوا ہوتا۔ اس لڑکی نے اس کے بعد کسی سے شادی کرنے سے انکار کر دیا۔ جس کے لئے اُسے بہت مجبور کیا جاتا رہا۔ آخر اُس نے ایک آدمی سے شادی کر لی۔ اتفاق دیکھیے جس سے اس کی شادی ہوئی وہ بھی ایک فوجی ہی تھا اور شادی کے فوراً بعد پاکستان کے ساتھ فوجی ٹکراؤ ہو گیا اور وہ بھی اس جنگ میں شہید ہو گیا!"

میری بات سن کر وہ دونوں کچھ دیر تک چپ سے بیٹھے رہے۔ پھر ڈاکٹر نے جیسے ایک خواب کی کیفیت سے بیدار ہوتے ہوئے کہا "یہ تو بالکل ایک کہانی کی طرح لگتا ہے۔ ایسا سچ مچ کیونکر ہو سکتا ہے!"

اس کے کزن نے کہا۔ "بِمّی کا خوف بھی دراصل سائیکولوجیکل ہی ہے۔ لیکن میں اس خوف کو کوئی اہمیت نہیں دینا چاہتا۔ میں تو اس بات کے حق ہوں کہ اس کی فورسڈ میرج کر دی جائے۔!"

ڈاکٹر نے بڑی نفرت سے اس کی طرف دیکھا۔ اور کہا ـــ "تم کتنے جنگلی ہو پریم! کیا تم واقعی ایسے ہو!"

پریم نے ڈاکٹر وملا کی طرف گہری نظر سے دیکھا۔ پھر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بولا ـــ "میں جنگلی ہوں یا نہیں یہ تو بعد میں بتاؤں گا۔ پہلے تم بتاؤ تم نے کس خوف کی بنا پر ابھی تک شادی نہیں کی؟"

ڈاکٹر زور سے ہنس پڑی۔ بولی۔ "تم بہت شریر ہو!"

میں نے ڈاکٹر کی طرف چونک کر دیکھا۔ اس کے چہرے پر سچ مچ شادی شدہ ہونے کی تو کوئی علامت نہیں تھی لیکن جذباتی طور پر وہ کافی پختہ نظر آتی تھی۔ وہ ابھی تک پریم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے مسکرا رہی ـــ "بِمّی شادی نہ کرنا چاہے، اس میں حرج تو کوئی نہیں ہو لیکن اگر اس کا یہ فیصلہ کسی خوف کی بنا پر ہے تو بہت بُرا ہے۔ اس طرح تو وہ ہمیشہ شادی کے لئے ترستی بھی رہے گی اور اس سے ڈرتی بھی!"

اسی وقت اچانک گاڑی کسی اسٹیشن پر رک گئی۔ کچھ مسافر اور اندر آ گئے۔ یہ لوگ لائن بچھانے والے خلاصی تھے جن کے ساتھ بہت سے پھاوڑے تھے اور گینتیاں بھی، وہ اپنے ساتھ بہت سے ٹھنڈی ہوا بھی اندر لے آئے۔

کوئی چلّا اٹھا ـــ "بند کرو دروازہ! بند کرو بھئی! مر گئے ہم تو!"

جن لوگوں نے اوور کوٹ پہن رکھے تھے انھوں نے کالر کھڑے کر لئے۔ کالروں کے اندر اپنے چہرے چھپالئے۔ کچھوؤں کی طرح لیکن اپنے اپنے خول میں گھس کر بھی وہ باتیں کئے جارہے تھے۔

اچانک مجھے احساس ہوا وہ کسی آدمی کی خودکشی پر گفتگو کر رہے ہیں۔ میرے پوچھنے پر انھوں نے بتایا۔ اُن کا ایک ساتھی جو بھی پورٹر تھا اس نے اسٹیشن ماسٹر سے خفا ہو کر جان دے دی ہے۔ وہ لوگ لاش کا پوسٹ مارٹم کرانے اور پھر کریاکرم کے لئے شمشان لے گئے تھے۔

ان کی باتوں سے یہ بھی معلوم ہوا جس آدمی نے خودکشی کی ہے وہ ہائی اسکول پاس تھا۔ لیکن اسے ملازمت میسر پر گارڈوں کے بھاری بھاری بکس ڈھونے کی ملی ہوئی تھی وہ چاہتا تھا اُسے کسی لکھنے پڑھنے کی ہی ڈیوٹی پر لگایا جائے لیکن ایسا نہیں کیا گیا تھا۔

اس کے ایک ساتھی نے اس کی کٹی ہوئی لاش کا ذکر بڑے جذباتی انداز میں کیا تو اچانک لیڈی ڈاکٹر چیخ اٹھی " بند کیجئے! بند کیجئے! یہ باتیں!"

اچانک سناٹا چھا گیا۔ سب نے سر گھما کر اس کی طرف دیکھا ـــــــ کسی کو یہ احساس بھی نہ تھا کہ وہ بھی ان کی باتیں غور سے سُن رہی ہے۔ وہ اب دونوں ہاتھوں میں منھ چھپا کر سسک رہی تھی۔ اس کا کزن پریم اُس کے گرد اپنا بازو ڈال کر اسے دلاسہ دے رہا تھا ـــ " تم تو پاگل ہو گئی ہو! ٹھیک ہے نا؟ یہ تمہیں کیا ہوا رملا؟ ہولڈ یور سیلف!"

میں نے اس کے کزن سے ڈاکٹر کے اس قدر جذباتی ہو جانے کا سبب پوچھا لیکن وہ مجھے کوئی جواب دینے کے بجائے اسے دلاسا دینے میں ہی لگا رہا۔

کمپارٹمنٹ کے سارے لوگ اس کے بعد خاموش رہے۔

ہردوئی میں اس کا کزن اُس سے اجازت لے کر چلا گیا۔ اسے اب اپنے سامان کے پاس جا کر بیٹھنا تھا۔ بالکل آخری ڈبے میں اور اس کے بعد اگلے اسٹاپ پر اسے اتر جانا تھا۔

ڈاکٹر نے اس کے جانے کے بعد آنکھیں پونچھ ڈالیں۔ سلیپر پہن کر باتھ روم بھی گئی۔ وہاں سے آئی تو اس کا چہرہ بشاش تھا۔ کچھ مطمئن بھی۔ واپس آکر اُس نے اپنا کوٹ اتار کر ایک طرف رکھ دیا۔ بستر میں سے ایک کمبل نکال لیا اور اسے اوڑھ کر بیٹھ گئی۔ وہاں جتنے لوگ موجود تھے ان سب کی نسبت میں ہی اب اس کے زیادہ قریب تھا۔ میں نے پوچھا ـــ " آپ سہارن پور کتنے بجے تک پہونچ جائیں گی؟"

اس نے کہا۔ چھ یا سات بجے تک۔ لیکن پتہ نہیں گاڑی لیٹ چل رہی ہے یا رائٹ ٹائم"

میں نے گھڑی دیکھی۔ اپنے ٹائم ٹیبل میں سے گاڑی کے اسٹیشن پر پہونچنے کا وقت تلاش کیا جہاں سے یہ ابھی چلی تھی۔ اسے بتایا ـــ "گاڑی آدھ گھنٹہ لیٹ ہے۔"

اس نے کہا ـــ اگر اس سے زیادہ لیٹ ہو گئی تو لکسر جنکشن پر مجھے دوسری گاڑی کا کنکشن نہیں مل سکے گا۔ وہاں یہ بوگی دوسری گاڑی کے انتظار میں پڑی رہے گی!"

اب اس کی آواز بالکل صاف تھی۔ جذباتیت سے بالکل عاری۔ آدمی ذرا سا رو لیتا ہے تو اس کے اندر کا سارا غبار دھل جاتا ہے۔ اس کا لہجہ بھی نکھر جاتا ہے۔ لیکن میں اس سے یہ پوچھنے کی ہمت نہ کر سکا کہ تھوڑی دیر پہلے وہ رو کیوں اٹھی تھی! اس کے گھنے بالوں سے ڈھکے ہوئے سر کی طرف دیکھتے ہوئے میں نے کہا ـــ " ڈاکٹر میرے تھرماس میں چائے ہے۔ کیا آپ میرا ساتھ دیں گی؟"

اس نے ذرا سا تکلف ضرور دکھایا۔ پھر میرے اصرار پر چائے پینے کے لئے تیار ہو گئی۔

چائے پیتے پیتے اُس نے پوچھا ـــ " آپ کہاں ہیں؟ بزنس میں یا سروس میں!"

میں نے اسے بتایا " میں سیکریٹریٹ میں ہوں "۔
اس نے میری طرف کچھ قدر حیرانی سے دیکھا۔ " سیکریٹریٹ میں تو آج کل ہڑتال چل رہی ہے۔ آپ! کیا آپ بھی ہڑتال پر ہیں۔؟"
میں نے اثبات میں دھیرے سے سر ہلا کر اسے بتایا۔ " میرے نام تو وارنٹ بھی نکل چکا ہے۔ لیکن میں فی الحال اپنے بچوں سے ملنے کے لئے رام پور جا رہا ہوں۔ انھیں میں نے پندرہ بیس روز پہلے بھیج دیا تھا۔ وہاں میری سسرال ہے۔ ان سب کے گرم کپڑے وغیرہ میرے پاس پڑے تھے۔ سوچا یہ سب ان کے حوالے کر آؤں تو اپنے آپ کو گرفتاری کے لئے پیش کر دوں گا۔"

وہ میرے ساتھ ہڑتال اور مہنگائی پر باتیں کرنے لگی۔ یہ باتیں ختم ہو گئیں تو وہ فیملی پلاننگ اور پھر الیکشن پر بولنے لگی۔ وہ باتونی عورت نہیں تھی لیکن شاید ہر موضوع پر ایک پڑھی لکھی خاتون کی طرح اظہار کرنے کی عادی ضرور معلوم ہوتی تھی۔ لیکن ان ساری باتوں سے کہیں زیادہ دلچسپ خود اس کی ذات تھی۔ اس کا اپنا وجود تھا۔ اس کی ساری کی ساری دلکش شخصیت تھی جو میرے دل و دماغ میں جذب ہوتی جا رہی تھی۔ اور وہ بڑی بے خوفی سے بول رہی تھی۔ بڑی آزادی سے۔ میں اس کے ہاتھوں کی، چہرے کی، ہونٹوں کی، آنکھوں کی ہر ایک جنبش اور ادا کو گہری دلچسپی سے دیکھ رہا تھا اور وہ بھی اس بات سے خوش نظر آتی تھی کہ میں اس کی دلکشی اور گفتگو دونوں کی طرف متوجہ تھا۔

گاڑی بریلی اسٹیشن پر پہونچی تو ایک بج چکا تھا۔ ہم اس وقت تک جاگ رہے تھے۔ باتیں کر رہے تھے۔ اسی اسٹیشن پر سب ریلوے والے اپنے لمبے، عقاب کے پروں کے سے اونچے اونچے کالروں والے کوٹوں میں سمٹے سکڑے دھیرے دھیرے ایک دوسرے کے پیچھے چلتے ہوئے، کبھی کبھی مڑ کر ایک نظر لیڈی ڈاکٹر پر ڈالتے ہوئے اتر کر چل دیئے۔ غالباً ایسی ہی نظروں سے انھوں نے آج اپنے ساتھی کو شمشان میں چھوڑتے وقت دیکھا ہو گا!

وہاں سے اتفاق سے کوئی اور مسافر سوار نہ ہوا۔ گاڑی چلی تو اچانک ہم دونوں اکیلے رہ گئے۔ ایک دوسرے کو اکیلے دکھائی دیئے اور بہت حیران بھی ہوئے۔ ہماری آنکھیں اچانک ایک دوسرے سے مل گئیں تو مجھے اسکی آنکھوں میں ایک خوف اور بے اعتمادی کی جھلک نظر آئی۔ شاید اسے اس بات کی ہرگز توقع نہ تھی کہ وہ اس ڈبے میں آکر بھی مرد کے ساتھ اکیلی رہ جائے گی۔ میری موجودگی نے اس کے تنہائی کے احساس کو تقویت پہونچائی تھی۔ ابھی تک ہم نے بڑے اطمینان اور اعتماد سے باتیں کی تھیں ایکدوسرے کو پہچان کر، ایک دوسرے کے بہت قریب آکر باتیں کی تھیں۔ لیکن اب گاڑی چلتے ہی ہم ایک دوسرے کے لئے بالکل اجنبی بن کر رہ گئے تھے۔

اب وہ کوئی نئی گفتگو نہیں چھیڑ رہی تھی۔ جیسے سارے موضوع ختم ہو گئے تھے۔ کوئی نہ کوئی بات اب میں ہی چھیڑنا چاہتا تھا لیکن ایسا کرنا مجھے بہت مصنوعی سا لگ رہا تھا۔ میری نظریں اس پر سے ہٹ کر دروازے پر جا کر ٹک گئیں جسے جانے والے مسافر کھلا چھوڑ گئے تھے۔ کھلے ہوئے دروازے میں سے منوں بلکہ ٹنوں کے حساب سے برفیلی ہوا اندر آ رہی تھی۔

" دروازہ بند ہی کر دیا جائے ــ! کہتا ہوا میں دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ ٹھنڈی ہوا کو جیسے زبردستی باہر روک کر میں نے دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ لیکن اس کے بعد میرے لئے اپنی برتھ تک پہونچنا محال ہو گیا۔ یوں لگا جیسے اپنے برتھ کی طرف نہیں اس عورت کی طرف جا رہا ہوں۔ ڈاکٹر اب میری نظر میں ایک دلکش عورت ہی بن کر رہ گئی تھی جو سامنے بیٹھی میری طرف دیکھ رہی تھی۔ خوف زدہ، گھبرائی ہوئی ہرنی کی طرح!

دروازے کے پاس کھڑے کھڑے مجھے کئی لمحے گزر گئے۔ بالکل غیر ارادی طور پر ہی میں رکا سا رہ گیا تھا۔ لیکن اب وہاں کھڑے رہنا بھی مجھے عجیب لگ رہا تھا۔ آگ، ورڈ! میں نے اپنے بستر کی جانب قدم بڑھائے تو گھبراہٹ میں اس کی طرف بڑھ گیا۔ جدھر وہ بیٹھی تھی۔ لیکن پھر فوراً ہی اپنی غلطی محسوس کر کے پلٹ گیا۔ اپنے بستر پر جا کر بیٹھ گیا۔ لیکن ندامت اور گھبراہٹ کے کارن میں قریب قریب ہانپ رہا تھا۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

ނިމުނީ

[illegible]

گئی ـــــ اس نے چھوٹی چھوٹی لکڑیاں جمع کیں اور یکے بعد دیگرے تہمینہ پر پھینکیں جو تہمینہ کو لگیں بھی لیکن کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ ہر بات سے بے نیاز بس سوتی رہی۔ اس کا جی چاہا تیز سا برچھا لے کر تہمینہ کی رانوں میں چبھو دے اور وہ تڑپ کر اٹھے تو ہنستے ہوئے زخم پر اپنے ہونٹ رکھ دے۔

چچی نے کھانس کر کراہتے ہوئے کروٹ لی اور وہ کھڑکی سے ہٹ آیا۔ پیروں تلے بچھی ہوئی سیلو کے پتھروں کا ٹھنڈا فرش بھی اسے اپنے تلوؤں کی گرمی سے چٹختا ہوا محسوس ہوا ـــــ بھولا بھٹکا کوئی پرندہ اس کے اتنے قریب سے پر پھڑپھڑاتا نکل گیا کہ اس نے پروں کی ہوا اپنی گردن پر محسوس کی ـــــ پرندہ کہیں کھو گیا تو اس نے احاطے کے باہر جھاڑیوں میں پکارتے ہوئے کیڑوں کی آواز سنی جو یونہی مسلسل پکار رہے تھے لیکن اس کو متوجہ نہ کر سکتے تھے۔

اس نے بڑی حسرت سے چاند کو دیکھا۔

ٹھہر جاؤ ـــــ رک جاؤ ـــــ چندا

لیکن چاند اس کی التجاؤں سے بے نیاز ابر کی مہین سی چادر میں اپنا چہرہ چھپاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"میں ڈوب جاؤں گا۔ سینے میں ڈوبتی ہوئی محبتوں کی طرح"

اور جب چاند کو اس کی چاندنی سمیت ایک دیوہیکل اڑتے ہوئے بادل نے دبوچ لیا تو اپنے اطراف یکایک پھیل جانے والے گھپ اندھیرے سے اسے ایک گونہ سکون سا ہوا۔ وہ پھر کھڑکی تک آ کر اس کی سلاخوں پر جھک گیا۔ اپنے گالوں اور پیشانی پر اس نے برف کی قاشیں محسوس کیں ـــــ بدن میں رواں خون کی حدت اور تناؤ نے کھڑکی کی سلاخوں کی ٹھنڈک کو ناگواری کی حد تک محسوس کر دیا۔

اب اس کی جھلاہٹ کا عالم دیدنی تھا۔

کھڑکی کے نیچے پڑی ہوئی جھاڑو پر نظر پڑی تو اس نے جھنجھلا کر جھاڑو اٹھالی اور سلاخوں کے اندر کر کے احتیاط سے اپنے داہنے ہاتھ کی گرفت میں لے لیا اور بڑی مشاقی سے کلائی کو بل دے کر تہمینہ پر کھینچ مارا۔

جھاڑو تہمینہ کے ڈھلتے ہوئے سینے پر سرک کر اس کے برابر سوتی ہوئی بوا خالہ کے چہرے پر اس طرح پڑا اور ہوئی کہ اس کی نوک اور ریشے ان کے نتھنوں میں جا گھسے۔ بوا خالہ ہڑبڑا کر اٹھیں۔ ادھر ادھر نظریں دوڑا کر کمرے میں دیکھا۔ چچی امی سوتے میں بھی انھیں سسکیاں لیتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ جیسے منورمیاں کو آخری بوسہ دے کر وداع کر رہی ہوں ـــــ تہمینہ پاس ہی اپنے گدرائے بدن کو لیے ایسے زاویوں میں پھیلا کر سو رہی تھی کہ بوا خالہ نے اس کو بغور دیکھا تو ان کے ہاتھ بھی انجانے میں انگڑائی کے لیے اٹھ گئے ـــــ اور جب یہ نیم انگڑائی جمائی پر ختم ہوئی تو انھوں نے ہاتھ بڑھا کر تہمینہ کے کرتے کا دامن اس کی شلوار پر درست کیا۔ پھر اوڑھنی سے سینے کو اس طرح ڈھک دیا جیسے اس کی ساری جوانی کی پوٹ بنا کر سینے میں اڑس لینگی۔ یہ سب کر کے بوا خالہ نے جانے کیوں پہلے اپنی نیم عریاں باہیں دیکھیں جو تہمینہ کی عریاں باہوں سے گوری تھیں ـــــ لیکن اس کی باہوں میں دوڑنے والے خون میں جانے کتنا پگھلا ہوا لوہا ملا تھا کہ بوا خالہ پھر اسی کی باہوں کو دیکھتی رہ گئیں ـــــ یکایک ان کی نظر اپنے سرہانے تکیے پر دھری جھاڑو پر پڑی تو انھوں نے پلکیں جھپکا جھپکا کر دیکھا ـــــ پھر نظروں نے کمرے بھر کا طواف کیا اور کھڑکی پر اٹھیں تو کوئی سایہ کھڑکی کی جانب بڑھتا بڑھتا پیچھے ہٹ گیا ـــــ بوا خالہ جہاں دیدہ تھیں ـــــ موئے آتش دیدہ کی طرح بل کھا کر رہ گئیں اور سارا ماجرا یوں پلک جھپکتے میں سمجھ لیا جیسے کوئی چپکے سے کان میں سب کچھ کہہ گیا ہو۔

جب وہ تیز تیز قدم اٹھاتا برآمدے میں پہنچا تو بوا خالہ کے خوف سے خود کو محفوظ رکھنے کے لیے اس نے کچھ گنگنانے کی کوشش کی لیکن چچی امی کی نیند میں ابھرتی ہوئی سسکیوں نے جنھیں وہ ابھی ابھی سن آیا تھا اسے گنگنانے سے باز رکھا۔ اس کو چچی امی پر ترس

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

5/8/99 [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]

متاج سعید

مٹی کی مورتوں سے بہلتا نہیں ہے من
ہردم اسے تو چاہیئے مہکی ہوئی کرن
ہم سے بچھڑ کے تیرا یہ کیا حال ہو گیا
جیسے خزاں کی زد میں چلا جائے اک چمن
گھر اپنا کس کے جسم کی مہکار سے بھرا
ان جانی خوشبوؤں سے مہکتی ہے انجمن
پت جھڑ کی رت ہی میرا مقدر بنی ہوئی
کیسے کھلے گا دل کا یہ اُجڑا ہوا چمن
روئیں اگر تو ساتھ بھی دیتا نہیں کوئی
اپنا جنوں وہی ہے وہی یار کا چلن
آنگن میں شور چڑیوں کا بڑھنے لگا سعید
کمرے میں دیر سے کوئی نیندوں میں ہے مگن

مدحت الاختر

جدائی میں تمھاری یاد بھی تھی
تمھیں پاکر تو تنہا ہو گئے ہم
خزاں میں پھول کی صورت تھے لیکن
بہار آئی تو کانٹا ہو گئے ہم
کبھی اُن کی تمنا تھی مگر اب
سراپا خود تمنا ہو گئے ہم
ترے ملنے سے پہلے راز تھے ہم
تجھے پاکر فسانہ ہو گئے ہم
فسانہ بن کے اُبھرے تھے جہاں میں
حقیقت ہو کے رُسوا ہو گئے ہم
نہ پایا جب سکونِ دل زمیں پر
فضا میں کارفرما ہو گئے ہم
کبھی محفل کی خاموشی کا باعث
کبھی صحرا کا نغمہ ہو گئے ہم

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

عادل منصوری

خوابوں کا سورج پگھلا
سایہ سایہ ڈوب گیا
پت جھڑ کا پیلا رستہ
ہوا چلی تو چیخ اٹھا
شبنم نے موتی ٹانکے
کرنوں نے سونا بخشا
خوں آلود زمینوں پر
شمشیروں کا سایہ تھا
اندر سے شعلے لپکے
اوپر سے پانی برسا
آگے کو بڑھتا ہی نہیں
موٹر کا پچھلا پہیا
گیسو ہیں بکھرے بکھرے
چہرہ ہے اترا اترا
خاموشی کے کمرے میں
لذت کا دروازہ تھا
الفاظوں کے پربت پر
معنی کا ریشم پھیلا
وہ بھی کچھ افسردہ تھی
میرا بھی کچھ موڈ نہ تھا

رنگوں کی باہیں پھیلیں
خوشبوؤں کو بھینچ لیا
آئینے کی آنکھ کھلی
سونے کا کمرہ جاگا
گرمی بڑھتی جاتی ہے
سر سے بادل کہاں گیا
ناچ رہے تھے سارے رنگ
نیلا پیلا لال ہرا
نظمیں لکھ اور باتیں کر
کافی پی اور بسکٹ کھا

باب دانش

میں بھی اک جلتا سورج دن کے پہلے صحرا کا
سارا جیون بھٹکا ہوں پاؤں نے جب چلنا سیکھا
آج فضا میں رنگ کہاں درد کے کالے سائے ہیں
رات ڈر دگے اور بہت ڈھل جانے دو شام ذرا
بھرے گھروں نے لوٹ لیا صدا لگانے والوں کو
اس دروازے کون گیا جس گھر میں میں تنہا تھا
ان آوازوں، رنگوں میں، خوشبو بنتی سانسوں میں
میرا بھی کچھ حصہ ہے میں بھی ہوں تیرے جیسا
جن بانہوں نے بھینچ لیا رات مجھے تنہا پا کے
خود کو کیا سمجھاؤں میں وہ میرا ہی سایہ تھا
سب مٹی کے روپ وہی اور خوشبو ہنستی گاتی سی
شاخیں خود میں سمٹ گئیں جب ہاتوں نے پھول چنا
جسم کی نازک سرحد سے دانش ہم محروم رہے
ہونٹ ہواؤں کو چومے، وقت ترستے ہی گزرا

[illegible]

[illegible]

ناولٹ　　　　ساتویں قسط

قاضی عبدالستار

دارا شکوہ

"قلعہ اکبر کی معزز فصیلوں پر لہراتے ہوئے شاہجہانی نشانوں کی جبیں پر چھائیوں کو بوڑھی جمنا بوسۂ تسلیم دیتی گزرتی تھی اور موج در موج بہتی روضۂ مبارک (تاج محل) کے پاؤں دھلاتی ہوئی جب آٹھ میل کا سفر طے کر لیتی تو عماد پور کی جاگیری شکارگاہ اپنے دو محلوں اور درندوں پرندوں کو رکاب میں لیے اشنان کو کھڑی ملتی۔ اسی عماد پور کی سرخ شاہی عمارتوں اور سبز محفوظ رمنوں کے پیچھے ایک گاؤں آباد تھا۔ تاریخ جب کسی فرد پر مہربان ہوتی ہے تو اپنے آتشیں گھوڑوں کی لگام اس کے خاکی ہاتھوں میں سونپ دیتی ہے اور جب کسی آبادی کی کوئی ادا بھا جاتی ہے تو اسے دائمی شہرت کا خلعت پہنا دیتی ہے۔ اس گمنام گاؤں کی میلی کچیلی پیشانی پر بھی تاریخ نے اپنے ہونٹ رکھ دیئے اور سامو گڈھ کا نام ہندوستان کی تاریخ میں محفوظ ہو گیا۔

"سامو گڈھ ——؟"

سامو گڈھ کے سینے پر وہ میزان نصب ہوئی جس کے ایک پلڑے میں روایت تھی اور دوسرے میں تجربہ تھا، ایک میں عقل تھی دوسرے میں دل، ایک طرف سیاست تھی دوسری طرف محبت، ایک طرف فلسفہ و حکمت تو دوسری طرف شعر و ادب اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ایک طرف تلوار تھی اور دوسری طرف قلم اور یہاں بھی قلم کو تلوار سے قلم ہونا تھا۔

سامو گڈھ کے قلب میں کھڑے ہوئے برگد کے دیو پیکر درخت پر چڑھ کر اگر کوئی دیکھتا تو سامنے میدان پر چھائی ہوئی ڈوبتے سورج کی گلابی روشنی میں ایک الف لیلوی شہر نظر آتا۔ زنگارنگ بارگاہوں، شامیانوں، خرگاہوں، سراپردوں، خیموں، سراچوں، قناتوں اور چھولداریوں کے محلات و مکانات آباد نظر آتے۔ وسط میں سات درجوں، پانچ کلسوں اور دو منزلوں والی قرمزی مخمل و زربفت و بانات کی وہ "فلک بارگاہ" کھڑی تھی جس کے ایک ایک اطلس پوش شہتیر کو روئے زمین کی سب سے بڑی سلطنت کے جلیل المرتبت شہنشاہ (شاہجہاں) کے آنسوؤں کے خلعت میں ملبوس دعائیں تھامے ہوئے تھیں۔ بارگاہ کے گرد سرخ بانات کی قناتوں کا حصار تھا۔ جس کے چاروں جانب پاکھروں میں ڈوبے گھوڑوں پر آہن پوش سواروں کا ناپیدا کنار سمندر موجیں مار رہا تھا اور آسمان سے باتیں کرتے ہوئے کلس طوغ و علم اور ماہی مراتب کی سنہری ڈانڈیں پکڑے غلاموں کی طرح کھڑے تھے۔ پیش گاہ کالق و دق میدان سیکڑوں جنگی آراستہ ہاتھیوں سے لبریز تھا۔ دوسری تینوں سمتیں "دارائی کارخانوں" سے چھلک رہی تھیں۔

کی دیوار ایک طرف سے پھٹ گئی۔ گلال بارہ میں کھڑے ہوئے چوبداروں نے اندر جاکر اجازت حاصل کی۔ واپس آکر اپنے ساتھ امیروں کی جماعت کو باریاب کیا۔ اورنگ زیب چاندی کی چوکی پر جانماز بچھائے بیٹھا تھا۔ اکہرا کشیدہ جسم سر سے پاؤں تک سفید پوشش تھا۔ اونچی فراخ پیشانی پر سفید مندیل کسی ہوئی تھی۔ موتیوں کا سرپیچ مرصع جھاڑ کی روشنی میں جگمگا رہا تھا۔ سیاہ گھنے کھنچے ہوئے ابروؤں کے نیچے تیز لیکن ٹھنڈی سیاہ ذہین آنکھیں روشن تھیں۔ جن میں تیرتے ہوئے منصوبوں سے اپنی دنیا کی سب سے بڑی سلطنت کا مطلق العنان حکمراں خائف تھا۔ سیاہ پٹکے میں ایک ڈال کے نیلم کے دستے کا خنجر آویزاں تھا۔ جس کی تڑپ مغل دارالسلطنت پر قہر الٰہی کی طرح مسلط تھی۔ زانوؤں پر وہ مضبوط ہاتھ رکھے ہوئے تھے۔ جن میں تاریخ نے کشورِ ہند کا مقدر سونپ دینے کی قسم کھالی تھی۔ سامنے سونے کی رحل پر آخری صحیفۂ آسمانی زرنگار جزدان میں بند رکھا تھا یعنی ہونے والا شہنشاہ ابھی تلاوتِ کلام پاک سے فارغ ہوا تھا۔ پشت پر بوڑھے منظور نظر مسلح خواجہ سراؤں کا دستہ صف باندھے موجود تھا۔ پھر نقیبوں کی آوازیں بلند ہوئیں۔

"خان دوراں ناصری خاں۔"

"خانخانان مہابت خاں۔"

"بہادر خاں کوکلتاش۔"

"صف شکن خاں میر آتش۔"

"راجہ اندر دیو تا دھمد ھرا۔"

"راجہ بھگونت سنگھ ہاڈا۔"

"خان کلاں ذوالفقار خاں۔"

"شیخ میر" اور "خان زماں اسلام خاں۔"

باریاب ہونے والوں نے کورنش ادا کی۔ چوکی کے سامنے بچھی ہوئی سرخ مخملیں مسندوں پر اجازت کے شکریہ میں سلام کرکے دو زانو بیٹھ گئے۔ زرپوش خدام کی ایک قطار روپہلی کشتیاں لے کر حاضر ہوئی۔ انواع و اقسام کے شربتوں کے کامدار بلوریں گلاس چن دیئے گئے۔ نقرئی گلوریوں سے بھرے ہوئے خاصدان رکھ دیے گئے۔ ان تکلفات کے بعد اورنگ زیب نے نگاہ اٹھائی۔ حاضرین سراپا گوش ہوگئے۔ شاہزادہ محی الدین پہلی بار مخاطب ہوا۔

"غنیم کا وہ بھاری توپ خانہ جس کا خوف یلغاروں سے چور ہر کاب لشکر کے دل پر طاری تھا چنبل کے کناروں پر ہماری حفاظت میں بیکار پڑا ہے۔ ہماری کمک پر آنے والے لشکر آچکے۔ سلیمان کی فوجیں یہاں سے سیکڑوں میل دور پڑی ہیں۔ دشمن سراسیمہ ہے۔ ان تمام باتوں کے پیش نظر ہم بروقت فیصلہ کن جنگ کے لیے تیار ہیں۔"

"آفریں ..... آفریں ..... آفریں۔"

سپہ سالار جو سب کے سب اپنے پیچھے تاریخ رکھتے تھے یک زبان ہو کر گرجے۔

"لشکر میں خبر پہنچا دی جائے کہ آفتاب طلوع ہوتے ہی یلغار ہوگی۔"

ابرو کی جنبش سے دربار کی برخاستگی کا اعلان کیا۔ امراء رخصت ہونے لگے۔ جب صف شکن خاں کورنش کو جھکا تو ابرو کی جنبش سے روک لیا گیا۔ تخلیے میں حکم ملا۔

"نصف رات کا گجر بجتے ہی جبل مرگ (توپ کا نام) کو تین بار داغ دیا جائے۔"
صف شکن خاں نے تسلیم میں سر جھکا دیا۔

چاندی کے پلنگ پر ریشمیں مچھردان میں دارا شکوہ اونچے تکیوں پر سر رکھے دراز تھا۔ خوبصورت رات کی خنک ہواؤں کے مرمریں لمس دن بھر کی شدید گرمی میں بے پناہ مشقت سے چور جسم کو سہلا رہے تھے۔ قالینوں سے آراستہ صحن کے کنارے ایک خواجہ سرا ہلکی خوابناک دھن میں رباب بجا رہا تھا۔ پلنگ کے چاروں طرف چار حسین غلام ہاتھوں کے زرشی پنکھے ہلا رہے تھے۔ لیکن دارا کا ذہن بے قرار تھا۔ ایک کشمکش میں مبتلا تھا۔ لالہ کی خبریں زہر میں بجھے ہوئے نشتروں کی طرح اس کی رگ رگ میں پیوست تھیں۔ برق انداز خاں کے قتل سے لشکر بے دل اور بے چینی پھیل سکتی تھی۔ اورنگ زیب کے منصوبوں کا رنگ اور گہرا ہو سکتا تھا اور نواب ہی (خلیل اللہ خاں) نواب اگر غداری کرنا چاہتا تو سب سے بڑی غداری یہ کرتا کہ دشمن کے چنبل عبور کرنے کی اطلاع نہ دیتا۔ اس اہم خبر کو اتنی دیر تک روکے رکھتا کہ غنیم کو شب خون کا موقع فراہم ہو جاتا لیکن اس نے پہلی فرصت میں مطلع کیا۔ کاش سلیمان آگیا ہوتا۔ سلیمان ... دلیر خاں روہیلہ، راجہ میرزا، داؤد خاں، جسونت ... کیسے کیسے کارگزار اور وفادار امیر ہماری خدمت سے جدا ہو گئے۔ کیسا بھاری اور آزمودہ کار توپ خانہ رکاب سے نکل گیا۔ توپ خانہ ...... توپ خانے کی تو کمر ٹوٹ گئی۔ کیسی کیسی بے نظیر توپیں چنبل کے کنارے ہی چھوڑ دینا پڑیں۔ شاہی لشکر کی یہ پہلی جنگ ہوگی جس میں کوئی مشہور توپ شریک نہ ہو سکے گی۔ چنبل ..... اس ناگن نے تو ڈس ہی لیا۔ چمپت رائے ...... راجہ چمپت رائے بندیلہ۔ اس کم بخت کے ساتھ کیسے کیسے سلوک کیے، جہتور کی بغاوت میں اس کو شریک سمجھا گیا۔ عساکر شاہی کو سرکوبی کا حکم دے دیا گیا لیکن مابدولت نے یاوری کی۔ علاقہ واگذار کیا۔ جان بحال کی اور اس نے ایسی غداری کی جس کا گمان تک نہ ہو سکتا تھا۔ غداری کا تو جعفر (برق انداز خاں) سے بھی کبھی اندیشہ نہ ہوا۔

"دھوں .... دھوں .... دھوں ..... "

دشمن کی کوئی بھاری توپ تین بار سر ہوئی۔ اور خیالوں کے فانوس بجھ گئے۔ ایک لمحے کے لیے غلاموں کے ہاتھوں کے پنکھے تھم گئے۔ رباب کا سر ٹوٹ گیا۔ شاید ہمیشہ کے لیے ٹوٹ گیا۔ اس نے چاہا کہ تالی بجا دے لیکن مصلحت نے ہاتھ پکڑ لیے۔ آواز تمام لشکر نے سنی ہوگی۔ امرا کو بھی کچھ سوچنے اور کرنے کا موقع دیا جائے۔ تھوڑی دیر بعد خواجہ سرا تنک حاضر ہوا۔ گزارش کی۔

"امیر الامرا وزیر الممالک نواب خلیل اللہ خاں سپہ سالار لشکر شاہی در دولت پر حاضر ہیں اور ملتمس ہیں کہ اگر والا جاہ بیدار ہوں تو شرف باریابی عطا کیا جائے۔"

نواب کی آواز نے نواب کے چہرے پر لگی ہوئی سیاہی کو اور دھو دیا۔ پلنگ کے پائتیں کھڑے ہو کر کورنش ادا کی پھر عرض کیا۔

"غلام کی ناقص رائے میں دشمن کا توپ خانہ حرکت کر رہا ہے۔"
"شب خون۔؟"
"نہیں صاحب عالم ...... جنگ۔"
"جنگ کے لیے ہم تیار ہیں امیر الامرا۔"

"قراولوں کو حکم دیا جائے کہ غنیم کی جنبش کی تفصیلات حضور سے گزاری جائیں۔"
"نقیب کو لشکر کو آراستہ ہونے کا فرمان پہنچائیں۔"

فجر کی اذان ہوتے ہی دارا "فلک بارگاہ" کے "گلال بار" میں طلوع ہوا اکبر کے بیٹے کی دو دو بیٹیں آب زر سے لکھے ہوئے سنسکرت کے کلمات سے زرد قبیص۔ خود مرصع پر دو ہلالی کلغیوں کے درمیان یاقوت کا تاگ دیوتا پھن کاڑھے بیٹھا تھا۔ فولادی ساق پوش پر جواہر کا جال کھچا تھا۔ دونوں بازوؤں پر اندر اور شیو کی مورتیں بڑے بڑے پکھراج کے ٹکڑوں سے بنی ہوئی تھیں امرائے جلیل الشان نے کورنش ادا کی۔ مہا سنتھ نے فتح کی بشارت دی اور زرد مالا گردن میں پہنادی۔ دارا نے فکر سے عاری آواز میں اعلان کیا۔

"مہاراؤ...... مہاراجہ چھترسال ہاڑا والیٔ بوندی کو ہراول عطا کیا گیا۔ ہفت ہزاری منصب کے ساتھ بارہ ہزار سوار رکاب میں دیئے گئے۔..... داؤد خاں کی پشت پناہی پر مقرر کیا گیا۔"

شاعر، سپاہی، جنرل راجہ نے سات سلام کئے اور ایک شعر پڑھا جس کا مطلب تھا۔

"داؤ کو اگر ستر زندگیاں ملیں اور وہ تمام کی تمام مہابلی پر
نچھاور ہو جائیں تو بھی مہابلی کے دستور کا بدل نہیں ہو سکتا۔"

"مہاراجہ مرزا رام سنگھ راٹھور کو ہفت ہزاری منصب بارہ ہزار سوار اور "پیش تول" عنایت ہوا۔"
راجہ کورنش ادا کر رہا تھا کہ دوسرا اعلان ہوا۔

"خانِ اعظم رستم خاں فیروز جنگ بہادر صوبے دار دکن بارہ ہزار لشکر کے ساتھ ہمارے بائیں بازو کی سربراہی پر مقرر ہوئے۔"

"امیر الامراء وزیر الممالک نواب خلیل اللہ خاں دستِ راست پر قائم کئے گئے۔"

(تینوں اعزاز یافتہ سپہ سالاروں کو مغل شہنشاہی کے ان بیش بہا انعامات پر مبارکباد دی جا رہی تھی لیکن تقدیر جو تمام انعاموں اور عذابوں کی ماں ہے دور کھڑی ہنس رہی تھی۔)

زنگار فولاد کی گُگھر دار پاکھر پہنے آہنی مستک پوش میں سونڈ چھپائے لعل و جواہر سے جگمگاتی سنہری عماری پیٹھ پر رکھے دارا کا مشہور و محبوب ہاتھی "فتح و جنگ" سامنے آیا۔ اگلے پیروں پر جھک کر سونڈ کو مستک پر رکھ کر سلام کیا چنگھاڑ کر فتح کی مبارکباد دی اور کھڑا ہو کر جھومنے لگا۔ غلاموں نے طلائی سیڑھی تھام لی۔ دارا نے حاضرین کو دیکھا۔ تبسم کیا۔ سیڑھی پر داہنا پاؤں رکھا اور کڑک کر کہا۔

"غریب نواز..... مغرور مرگ۔"

پچیس اونٹوں پر لدے ہوئے باجے گرجنے لگے اور زمین و آسمان ان کے شور سے بھر گئے۔

اورنگ زیب نے مچھلی کے سفنوں سے بھرا ہوا شلوکا اور چست پائجامہ پہنا۔ دونوں حصوں کو غلاموں نے ریشمی ڈوریوں سے کس دیا۔ اس پر فتوحاتِ دکن سے بنگال میں آئی ہوئی وہ زرہ پہنی جس کے فولاد پر سونے کا تبر چڑھا ہوا تھا زنجیروں سے بنے ہوئے ساق پوش اور دستانے زیب تن کئے۔ وہ خود سر پر رکھا جس پر ہیرے کا ہلال روشن تھا۔ بھاری آہنی جڑاؤ ٹیکے میں وہ تلوار لگائی جس پر اٹھارہ سال کی لڑائیوں نے صیقل کی تھی۔ بارگاہ سے برآمد ہوا تو سالاروں نے فتح کی بشارت نذر

ދިވެހިރާއްޖޭގެ [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] ٨
[illegible]
[illegible] ٥
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] ٤
[illegible]
[illegible]
[illegible] ٣
[illegible]
[illegible] ٢
[illegible]
[illegible]
[illegible] ١

[illegible]

[illegible]

سید احتشام حسین

(۱) نئی شاعری سے میں تو عام طور پر وہ شاعری مراد لیتا ہوں جو گذشتہ پچیس تیس سال میں کی گئی ہے۔ اس کے مختلف اسالیب، مختلف نصب العین مختلف رجحانات اور انتخاب ہوا ہے مختلف تحریکات ہیں نئے کا لفظ وقت کے مفہوم میں استعمال کیا جائے تو اس وقت کے سبھی شاعر نئے ہیں لیکن جب میں تفصیل سے گفتگو کروں گا تو ان میں بھی مختلف بنیادوں پر تفریق کرنا ضروری سمجھوں گا مثلاً جس خانہ میں فراق اور جوش کو رکھوں گا اس میں مجاز اور سردار جعفری کو نہیں رکھوں گا، صرف اس لئے نہیں کہ ان کی عمروں میں فرق ہے بلکہ اس لئے کہ ان کے طرز فکر اور طرز احساس بھی مختلف ہیں جب میں مجاز اور سردار پر تفصیل سے لکھوں گا تو ان کے افکار اور اسالیب کے فرق کو بھی نمایاں کروں گا کیوں کہ ان کے شعور کی سطح اور ان کے تصور فن میں مجھے اختلاف نظر آتا ہے۔ یہی نہیں اس سردار جعفری کو جس نے پرواز کی ابتدائی نظمیں لکھی تھیں، ایک خواب اور کے سردار سے الگ کرنے کی کوشش بھی کروں گا۔ پھر میرے سامنے وہ شعرا آئیں گے جو جدید تر ہیں، ان میں سب یکساں نہیں ہیں، ہم خیال اور ہم رنگ نہیں ہیں مقصد شاعری کے متعلق متفق نہیں ہیں، ان میں ماضی کی طرف دیکھنے والے بھی ہیں مستقبل کی امید پر جینے والے بھی، غم کوش بھی ہیں۔ آہنگ نشاط سے معمور بھی، ترقی پسند بھی ہیں اور غیر ترقی پسند بھی۔۔۔ میں ترقی پسندوں کو نئی شاعری میں شامل سمجھوں گا۔ میرے خیال میں صرف وہی نئے شاعر نہیں جو موت، تنہائی، جبر حیات، اکتاہٹ، ابلیسی، عدم مقصدیت کی باتیں کرتے ہیں یا محض چونکا دینے والی ترکیبیں، بے ربط فقرے، بے معنی علامات اور بے کیف استعارے استعمال کرتے ہیں۔ ترقی پسند شاعر بھی علامات، استعارے، جدید تراکیب استعمال کر رہے ہیں لیکن ان کا زندگی اور فن کی طرف رویہ مختلف ہے، وہ بھی نئی زندگی میں سائنس، مشین، معاشی عدم مساوات، سیاسی دباؤ اور استحصال سے پیدا ہونے والی کشمکش کا شعور رکھتے ہیں لیکن جمال حیات اور شعور وارتقا کے منکر نہیں ہیں۔ ان کی شاعری میں کس بات کی کمی ہے کہ انھیں نیا شاعر یا ان کی تخلیقات کو نئی شاعری نہ کہا جائے؛ جو لوگ نئی شاعری کی اصطلاح کو ایک خاص قسم کی شاعری کے لیے استعمال کرتے ہیں میں ان سے متفق نہیں ہوں۔ ان میں سے کئی ایسے ہیں جنھیں نئی زندگی کا شعور ہی نہیں ہے، وہ نئے کا محض سطحی مفہوم رکھتے ہیں۔

(۲)۔ ہر زمانے میں ـــــ نیا ہو یا پرانا ـــ کچھ انسانی مسائل ایسے رہے ہیں جنھیں شعرا نے اپنا موضوع بنایا ہے۔ یہ مسائل اپنی ذات سے متعلق بھی ہو سکتے ہیں اور ذات سے باہر ان باتوں سے بھی، ذات جن کا ادراک کر سکتی ہے۔ یہ مسائل گوناگوں اور لاتعداد ہیں، اور ذاتی تجربہ اور شعور کی رنگا رنگی سے طرح طرح ظاہر ہوتے ہیں۔ جنھیں ہم مختلف علوم کی مدد سے یا جذبات کی نوعیت کے لحاظ سے کچھ موٹی موٹی قسموں میں بانٹ لیتے ہیں اور انھیں کی بنیاد پر یہ رائے قائم کرتے ہیں کہ شاعری کے موضوعات کیا ہیں۔ جہاں تک اپنی ذات کا تعلق ہے، شعرا کے تجربے یکساں ہوتے ہوئے بھی انفرادی، شخصی اور مخصوص ہو سکتے ہیں لیکن باہر کی دنیا سے شاعر کا جو رشتہ ہے اس کی طرف اس کا رویہ اس کے شعور، مطالعہ، مشاہدہ، بصیرت حیات، نصب العین اور دائرہ فکر وعمل سے متعین ہوگا۔ میرے خیال میں اس کے بہت سے پہلو ایسے ہیں جو ہر عہد میں نئے حالات کے ماتحت جذباتی یا ذہنی تحریک پیدا کرتے رہیں گے۔ اگر کچھ دن پہلے محبت، غم زندگی، احساس حسن، ظلم اور ناانصافی سے نفرت، غلامی پر آزادی کو ترجیح، موت کے مقابلہ میں زندگی کی خواہش نیکی، دردمندی، انسانی دوستی کے تصورات شاعری کا موضوع بن سکتے تھے تو آج کیوں نہیں بن سکتے؟ کون سی گتھیاں ہیں جو حل ہو گئی ہیں یا جن کے متعلق سوچنا، جن کی بشریت کو محسوس کرنا بنجر زمین میں ہل چلانا ہے؛ اظہار کے طریقے فرسودہ ہو جاتے ہیں، موضوعات

نھیں انسان محسوس کرتا ہے فرسودہ نہیں ہوتے۔

(۳)۔ میں نئی شاعری کے متعلق اپنا خیال ظاہر کر چکا ہوں۔ جسے اصطلاحی مفہوم میں نئی شاعری کہا جاتا ہے وہ تو محض حیوانی ردِ عمل کی قائل ہے، مثبت طور پر وہ کسی قسم کی ذمہ داری قبول ہی نہیں کرتی، اُسے پورا کیسے کرے گی۔ ہاں کچھ نئے شاعر ضرور اس کی کوشش کر رہے ہیں لیکن یہ ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ شاعری کتنی ہی عظیم ہو زندگی کے ہر پہلو کا احاطہ نہیں کر سکتی اور نہ شعور کے ہر پہلو کو آسودہ کر سکتی ہے۔

(۴)۔ محض اظہار تو کافی نہیں ہے مگر ہر اظہار شعوری کوشش کے بغیر بھی کچھ ترسیل کرتا ہے۔ اگر اظہار ہی میں اہمال یا کوئی لفظی اور معنوی نقص ہوگا تو البتہ ترسیل کی کمی رہ جائے گی۔ بدقسمتی سے نئی شاعری کو ایک علاحدہ صنف، یا اسلوب شاعری کی حیثیت سے فروغ دینے کے خواہش مند اس کی فکر نہیں کرتے کہ ان کی بات سمجھی جائے۔ بلکہ اکثر تو اس پر فخر کرتے ہیں کہ ان کے سمجھنے والے محض چند برگزیدہ لوگ ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ان کا جس طرح جی چاہے، اظہار خیال کریں، کسی کو یہ کہنے کا حق نہیں ہے کہ بات واضح نہیں ہوئی، کسی کی نے کوئی ردِ عمل پیدا نہیں کیا، شعر یا نظم کا مفہوم سمجھ میں نہیں آیا۔ قاری اور ناقد اگر واقعی شعر و سخن کا کوئی تجربہ، کسی قسم کا ذوق، معمولی احساس جمال بھی رکھتا ہے تو اپنی پسند کو روک ہی نہیں سکتا، وہ تو پڑھنے اور سمجھنے کے لئے بے چین ہے لیکن اگر سمجھ نہ سکے کسی قسم کی لطافت اس کے دل کو نہ چھوئے، کوئی موضوع اس کے ذہن میں الجھن نہ پیدا کرے تو وہ کیا کرے؟ کچھ نئے شاعر اظہار کی بے چارگی، موضوع کی سطحیت، خیال کی بے ربطی کو قاری کی نارسائی ذہن یا عدم صلاحیت کے سر تھوپنے کی کوشش کرتے ہیں، انھیں کبھی اپنی شاعری کو بھی دیکھنا چاہیئے۔

(۵)۔ نئے شعرا کون ہیں اور کون نہیں ہیں، ہر نئی شاعری کا علم بردار اپنی الگ الگ فہرست بناتا ہے۔ ایسے میں کس کا نام لیا جائے اور کس کا چھوڑا جائے۔ بعض کی اکثر، بعض کی کچھ نظمیں نئے شعور فن اور شعور حیات کی حامل ہوتی ہیں، چند نظمیں یا چند اشعار تو سبھی کے یہاں ایسے مل جائیں گے جن کی داد دی جا سکتی ہے اور جنھیں پڑھ کر یا سن کر احساس مسرت جاگ اٹھتا ہے۔ ایسی صورت میں اگر نام گنائے بھی جائیں تو کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ یہ البتہ کہہ سکتا ہوں کہ جتنی نظمیں رسائل میں دیکھ سکتا ہوں اور جتنے مجموعے دستیاب ہو جاتے ہیں انھیں ہمدردانہ شروع کرتا ہوں اور یہ بھی سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں کہ مجھے کوئی نظم کیوں پسند آئی اور کیوں میرے سر کے اوپر سے میرے دل یا ذہن کو چھوئے بغیر گذر گئی۔

(۶)۔ میں اس بات کا قائل نہیں ہوں کہ جب تک کوئی شاعر نصاب تعلیم میں شامل نہیں ہوتا اس کو سمجھا یا پسند بھی نہیں کیا جا سکتا۔ نصاب تعلیم تو محض ایک اشارہ ہے۔ اس طرح میں یہ بھی نہیں سمجھتا کہ زاویۂ تنقید میں باقاعدہ کسی تجویز کے ذریعہ کوئی تبدیلی کی جائے تاکہ نئی شاعری سمجھ میں آئے۔ شاعر کی تخلیقی قوت، شاعری کے اندر چھپی ہوئی فنی لطافت، معنی کی گرمی اور انداز بیان کی طلاوت خود اپنا حلقہ پیدا کرتی ہے، پڑھنے والے نصاب اور ناقد کے علی الرغم اُسے پڑھتے اور پسند کرتے ہیں اور جب وہ شاعر ادبی سرمایہ کا جز بن جاتا ہے تو نصاب میں بھی داخل کیا جاتا ہے اور اس پر کتابیں لکھی جاتی ہیں۔ یہ طریق کار الٹا ہوگا کہ کوئی کتاب یا نظم نصاب میں اس لئے داخل کی جائے کہ اس کی اہمیت نمایاں ہو۔ نئی شاعری کو ایک علاحدہ "کلٹ" بننے کے بجائے ادبی روایت کا جز بننا چاہیئے۔ جو قاری اور ناقد اس کے محاسن سمجھتے ہیں انھیں ان کے متعلق بغیر جھنجلاہٹ اور غصہ کے لکھنا چاہیئے، جو نہیں سمجھتے ہیں، انھیں گالیاں دینے کے بجائے سمجھانے کی کوشش کرنا چاہیئے۔ نئے شاعروں کو یہ یاد رکھنا چاہیئے، کہ شاعری مانگے تانگے کے مواد اور اسلوب سے بن نہیں سکتی، اسے قومی شعور اور زبان کے ادبی مزاج سے مکمل طور پر نہ سہی تو کسی حد تک ہم آہنگ ہونا

چاہیئے۔ جبھی اُسے شاعری کی طرح پڑھا جائے گا۔

عمیق حنفی

(۱) نئی شاعری آج کے انسان کے ادراک و احساس کا اظہار ہے۔ نیا شاعر اپنی ذات کے وسیلے سے باہر رونما ہونے والی تبدیلیوں کے اثرات قبول کرتا ہے اور اس کے آہستہ رو جذبات پر ان تند خو اور بلاخیز تبدیلیوں کے جو عکس پڑتے ہیں انھیں دکھاتا ہے۔ یہ شاعر خود دار ہے، خود شناسی کے لئے بیتاب ہے اور اس کا قلم غیر شاعرانہ قوتوں کی جنبشِ ابرو پر نہیں بلکہ اس کی اپنی ذات کے کرب کی لے پر رقص کرتا ہے۔ ۔۔۔ اپنے فکر و فن کا دائرہ اپنی ذات کو مرکز مان کر کھینچتا ہے اور اس دائرے کے محیط میں حیات و کائنات کو گردش کرتا ہوا پاتا ہے۔

ہمارا عہد بھی عجیب ہے۔ رفتار تیز تر ہے۔ ماہ و مریخ منازلِ سفر ہیں۔ کائنات ایک اکائی بنتی چلی جا رہی ہے لیکن انسان اور فطرت، انسان اور انسان کے درمیان فاصلہ اور اجنبیت بڑھ رہی ہے۔ بے دلی اور بے حسی نے دلوں کو اسیر کر لیا ہے۔ ذات ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر رہی ہے۔ سائنس اور ٹکنولوجی جہاں زندگی بخش ہیں وہیں اجتماعی موت کا ساز و سامان بھی مہیا کر رہے ہیں۔ ماضی مہمل اور مستقبل مبہم ہوتا جا رہا ہے۔ قدریں برعکس ہوتی جا رہی ہیں۔ آگہی بڑھ رہی لیکن روشنیٔ طبع مدھم ہے۔ بے یقینی، عدم فیصلگی، نامرادی، اکتاہٹ، بحران (Crisis) اور ہیجانات (excitements) کے احساسات گہرے ہوتے جا رہے ہیں۔ فطرت اور زندگی کے اتنے راز طشت ازبام ہو چکے ہیں کہ ان میں پہلے سی کشش اور دلچسپی اور Urgency نہیں رہی۔

نئی شاعری آج کے ان تلخ و تند حقائق کا احساس اپنے قارئین میں جگا کر اور نازک صورتِ حال کی خطرناکی سے باخبر کر کے آج کی ترقی کی جہت متعین کرنے اور مسائل کا حل ڈھونڈھنے کی ضرورت کا احساس دلانا چاہتی ہے۔ اختصار، اقتصادِ الفاظ، منطق کے بجائے تلازمۂ خیال، جذبات کی فضول خرچی سے احتراز، عام انسان سے واسطہ، ذاتی تجربات و مشاہدات و واردات، حسی تجربات کا اظہار اور دوش و فردا پر امروز کو ترجیح دینا اس کی خصوصیات ہیں۔ نئی شاعری کی امیجری، لفظیات اور لب و لہجہ بول چال اور عام فکری اور جذباتی عوامل کے قریب تر ہیں۔ نئی شاعری کو بڑے بڑے موضوعات عظیم شخصیات اور ماہیت و مقدرِ عالم کے نکات کی احتیاج نہیں۔ انسان، انسانی زندگی اور انسانیت اس کے لئے عرفان کے سرچشمے ہیں۔ Understatement کی قائل ہوتے ہوئے بھی نئی شاعری بے باکی، بے لاگی، بے حجابی سے کام لیتی ہے۔ دل، دماغ اور روح ہی سے نہیں اسے جسم سے بھی محبت ہے اور وہ سیاست، مذہب، اخلاق، روایات، اقدار وغیرہ کی قربانگاہ پر انسان اور انسانیت کی قربانی کو گناہ کبیرہ سمجھتی ہے۔ اس میں غصہ ہے جھنجلاہٹ ہے، خلوص ہے۔ قید و بند کو توڑنے اور مکمل آزادی حاصل کرنے کی بے پناہ خواہش ہے۔ وہ روایت کو آگے بڑھاتی ہے اور جب روایت ساتھ نہیں دے پاتی تو اسے پیچھے چھوڑ کر اور جب آڑے آتی ہے تو راستے سے ہٹا کر آگے بڑھ جاتی ہے۔ نئی شاعری حقائق و اشیاء و حالات سے نئے حسی اور جذباتی رشتوں کی تلاش میں ہے۔ یہ رشتے وسیلۂ ذات ہمیں میسر آئیں گے ایسا اسے یقین ہے

نئی شاعری بیان و اظہار کی حد تک بھلے ہی مقامی یا ملکی قیود کی پابند ہو مگر شعور و احساس کے لحاظ سے عالمگیر اور آفاقی ہے۔ سیا

جغرافیہ اور نسل انسان کو منقسم نہیں کر سکتی۔ ممالک و اقوام کی حد بندیاں اپنی جگہ ہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ آج ہماری پوری دنیا تاریخ و معاشرت کے ایک اور یکساں دور سے گزر رہی ہے۔ برکات و آفات ہمہ گیر ہیں۔

نئی اور پرانی شاعری میں کئی امتیازی خطوط ہیں۔ پرانی شاعری زبان و بیان ہی کو سب کچھ سمجھتی ہے اس کی نظر میں شاعر الفاظ کا صناع اور تمثالات کا ہنرمند ہے Master of words, maker of images اس کے پلے بس چند stock ideas ہیں۔ فرسودہ روایات و مفروضات کا احترام و اتباع اس پر فرض ہو۔ شاعرانہ زبان اور عروض کے بارے میں اس کے مفروضات نہایت سخت اور Rigid ہیں۔ عرض ہنر اس کا مقصود رہے۔ اس کی لفظیات ہی نہیں فکر و احساس اور جمالیات بھی پہلے سے طے شدہ اور Fixed ہیں۔ سکہ بند زبان و بیان، ڈھلی ڈھلائی صنعتیں اور بندھے ٹکے خیالات کے کرتب دکھانا اس کا کمال ہے۔

نئی شاعری ترقی پسند شاعری کی طرح شاعر کے عقائد اور فرائض منصبی کو شاعری پر افضلیت اور فوقیت نہیں دیتی۔ اس کی نظر میں شاعری انسان کے شعور و جذبات و احساس کا اظہار ہے نہ کہ سماج اور ریاست کا آلہ کار۔ کلچر، مذہب، اخلاق، قانون، سیاسی اور سماجی نظام انسان نے اپنے لیے بنائے انسان ان کے لیے نہیں بنا۔ ترقی پسند شاعری ایک مخصوص اور محدود سیاسی مسلک سے بری طرح منسوب تھی۔ اس کے لیے اس کی مخصوص مقصدیت ہر شے حتیٰ کہ انسان سے بھی افضل تھی۔ اس میں نظریاتی اعتبار سے ایک مذہبی قسم کا کٹر پن پیدا ہو گیا تھا۔ کلاسکی آئیڈیلس کی فرسودگی اور رومانی آدرشوں کی نوعیت کو رد کر کے اس نے حقیقت پسندی اور معقولیت کو بے شک اپنایا تھا لیکن حقیقت اور معقولیت کی تعریف جملہ حقوق ایک مخصوص سیاسی جماعت کے نام محفوظ کر دیے تھے۔ زبان و بیان، اسالیب، تیکنک اور فارم کے ضمن میں ترقی پسند شاعری نے نئی راہیں نکالی تھیں لیکن یہ تمام راہیں صرف ایک ہی منزل مقصود کی طرف مڑتی تھیں۔ نئی شاعری ہر قسم کے جبر و استحصال کے خلاف ہے۔ اس کا کینوس زیادہ وسیع ہے اور اس کے تجربات میں بڑی ہمہ گیری ہے۔

(۲) نئی شاعری سے پہلے اردو شعرا کے سامنے جو تصورات اور آئیڈیلس تھے وہ موجودہ صورت حال میں خارج از وقت اور خارج از مقام ہیں۔ تصورات اور آدرش حقائق سے فرار اختیار کرنے میں معاون ہوتے ہیں اور زندگی کرنے کے بجائے زندگی گزارنے میں مدد کرتے ہیں۔ ان کا نشہ جنون پرور ہوتا ہے۔

آج خاندان کی اکائی بکھر چکی ہے۔ پیشہ موروثی اور آبائی نہیں رہا۔ تلاش معاش نے دربدری کو فروغ دیا ہے۔ [illegible] رسل لکھتا ہے: "سائنس کی ترقی نے اور صنعتی تبدیلیوں نے اس کلچر کو بالکل تباہ کر دیا ہے جو زرعی بنیادوں پر قائم تھا۔ جیسے جیسے تعلیم و تدریس کی بنیاد زیادہ سے زیادہ سائنٹیفک ہوتی گئی ویسے ویسے قدیم مذہبی اور اخلاقی آدرشوں کا زوال بھی ہوتا گیا۔ مذہب اور کلاسکس سے ہمیں اساطیری داستانوں کا جو ذخیرہ مل جاتا تھا وہ سماجی مقاصد اور سماج میں فرد کے فرائض کی نشان دہی کرتا تھا۔ اب وہ سرچشمہ بھی خشک ہو گیا ہے۔ اس سے جو بدحالی اور افراتفری پیدا ہوئی ہے اس نے سنجیدہ اور ذمہ دار شاعر کو متفکر و پریشان کر دیا ہے، خواہ وہ دنیا کے کسی حصے کا کیوں نہ ہو۔"

عورت اور فطرت کی پر اسراریت اور رومانی دلکشی تقریباً ختم ہو چکی ہے۔ بیشتر حجابات اٹھ چکے ہیں۔ محبوبہ پر اب کوئی عاشق Reservationship نہیں لگاتا۔ ضبط تولید کے بڑھتے ہوئے تقاضوں نے سکس کو تولید اور اخلاق دونوں سے جدا کر دیا ہے۔ عشق اب وہ جنون ہے نہ ایمان۔ دوستی، رفاقت، ہمدردی اور ہمنفس کے جذبے نے پرانے تصور عشق کی جگہ لے لی ہے۔ سکس کی طرف آج کے شاعر کا

رویہ ہے کہ اصل مداوائے غم تنہائی ہے اور ایک ایسی عریاں اور فاش حقیقت حیات جس کی پردہ داری غیر ضروری ہے۔

وطنیت اور قومیت پر بین الاقوامیت اور آفاقیت روز بروز فوقیت حاصل کرتی جارہی ہے۔ آزادی اور امن سیاسی نعروں کے روپ میں ناکام ہو چکے ہیں اور یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ جب تک سیاست کا تمام شعبہ ہائے حیات پر کلی اقتدار اور تسلط ہے امن و آزادی کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔

سنتوں، بھگتوں، صوفیوں اور ہر عہد کے سچے شاعروں کا ایک آئیڈیل یعنی انسانیت آج بھی زندہ و تابندہ ہے بس دشواری اتنی ہے کہ اسے آج کی میکانکی اور ایٹمی معاشرت میں کیسے حاصل کیا جائے۔

۳۔ نئی شاعری حسی تجربات کے اظہار کا نام ہے۔ ذاتی احساس نئی شاعری میں کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ حالات و واقعات آئینۂ ادراک پر اور شیشۂ احساس پر جو بھی عکس ڈالتے ہیں نئی شاعری انھیں ظاہر کر دیتی ہے۔ ذات کے آئینہ میں کائنات کا عکس دکھاتی ہے۔ چونکہ نئی شاعری آج کے ذہن و احساس کی شاعری ہے اس لیے آج کے تہذیبی، علمی اور ذہنی افق اور ذہن و احساس کا نفسیاتی پس منظر اس میں کہیں سطروں میں اور کہیں بین السطور نظر آتا ہے۔

تہذیبی اور علمی آفاق کا اظہار نئی شاعری میں بیانیہ اور بلند بانگ انداز میں نہیں ہوتا کیونکہ نئی شاعری ہنگامی اور موضوعاتی نہیں ہے۔ نیا شاعر نہ قصیدہ گو ہے نہ ذہن گرا اور نہ تاریخ نگار۔ وہ تو جذبات و احساسات کو لفظوں اور آوازوں میں جذب کرتا ہے۔ اس کی امیجیں علامتیں، استعارے، حوالے، اشارے اور پیٹرن اپنے عہد کے تہذیبی اور علمی اور ذہنی آفاق کے مختلف عکس گھیر لیتے ہیں۔ نئی شاعری نے اردو شاعری کو بین الاقوامی سطح پر پہنچا دیا ہے۔

۴۔ اظہار در اصل ابلاغ ہی کا دوسرا نام ہے۔ سمجھنا یا نہ سمجھنا قاری کے موڈ، صلاحیت، تربیت اور مزاج پر منحصر ہے۔ ابہام تخلیق میں بہت کم ہوتا ہے قاری کے ذہن میں زیادہ۔ قاری کو اگر پہلے سے خوف زدہ نہ کیا جائے۔ اور اس پر روایتی طریق افہام و تفہیم کو مسلط نہ کیا جائے تو اس کا ذہن نئی شاعری کے مافی الضمیر تک یقیناً پہونچ جائے گا۔ یہ بات ایک حد تک ٹھیک ہے کہ نئی شاعری کے نام پر بعض تخلیقات ایسی بھی سامنے آجاتی ہیں جن میں اظہار کے ابلاغی امکانات کو ذاتی علائم، الفاظ کے فنتاسیائی استعمال اور لاشعوری اور رویائی امیجوں کے ذریعے بہت ہی کند کر دیا گیا ہو۔ بہرحال نئی شاعری کا مبینہ ابہام ایک بہت بڑی حد تک تنقید و تدریس کی زرفن ناشناسی، snobbery تساہل اور نقادوں کے خوفِ جدت کے باعث ہے۔ اگر نئی شاعری میں قارئین کی دلچسپی اور ذوق پیدا کرنے اور نئی شاعری کے تخلیقی عوامل، زاویۂ فکر و فن، تکنیک اور اسالیب کی تعلیم دینے میں ناقدین و مدرسینِ ادب نے خلوص کے ساتھ کوئی قدم اٹھایا ہوتا تو ابہام کی یہ شکایت عام نہ ہوتی۔

جدید شعرا نے اپنے مجموعوں کے پیش لفظ، مضامین، تبصرے، تجزیے اور مکاتیب کے ذریعے نئی شاعری کے لئے مناسب اور موافق فضا تیار کرنے کی پرخلوص کوششیں کی ہیں۔ ادبی دنیا، سوغات (جدید نظم نمبر) اور اوراق میں نظموں کے تجزیاتی مطالعے کے سلسلے بھی کافی مفید ثابت ہوئے ہیں۔

۵۔ ظاہر ہے کہ نئی شاعری کی حدود کا تعین اس طرح تو نہیں کیا جا سکتا جس طرح کسی علاقے کا نقشہ بنایا جاتا ہے نئی شاعری نہ کوئی مکتب فکر و فن ہے نہ منظم تحریک۔ اس کا نہ کوئی منشور ہے اور نہ کوئی لائحہ عمل۔ افراد کی شاعری ہے، ذہن و احساس کا وسیلہ ذات سے غیر مشروط اظہار ہے۔ لیکن چونکہ ہر نیا شاعر (بشرطیکہ وہ شاعر ہو اور نیا ہو) ذہن و احساس کی خالص انسانی سطح پر تجربہ

حاصل کرتا ہے اور خالص انسانی سطح پر اس کا اظہار کرتا ہے اس لیے نئی شاعری میں فکر، احساس اور اظہار کی متعدد مشترک قدریں اپنے آپ پیدا

ہو گئی ہیں۔ کچھ اور رجحانات ہیں جو تمام دنیا کی نئی شاعری میں مشترک ہیں۔ یہ اشتراک مراسلات و مواصلات کی جدید سہولتوں اور مطالعے اور مشاہدے کے نئے آفاق کی وسعتوں تک نئے شاعر کی رسائی کے باعث پیدا ہوا ہے اور شاعری کے فنی اور ابلاغی پہلو میں نمایاں ہے۔ ایک اور حقیقت ہے جس نے حدود کے تعین کا مسئلہ اُلجھا دیا ہے۔ آج نئی شاعری میں جدید، جدید تر اور جدید ترین شعرا کی تخلیقات روز بروز شامل ہو رہی ہیں۔ انھیں ان شعرا کے تجربات بھی شامل ہیں جنھیں ذہنی اور حسی آزادی کے تقاضوں اور آج کی زندگی کی بوریت اور لایعنیت کے تصورات نے اسمائے اشیا کے انبار لگانے اور Absurdity کو ایک قائم بالذات فنی اور جمالیاتی قدر کی صورت قبول کرنے پر اکسایا ہے۔ یہ لوگ علامت نگاروں اور شعور کی رو میں بہنے والوں کو بھی کئی کوس پیچھے چھوڑ گئے ہیں۔ یہ جدید ترین شعرا ذہین بھی ہیں اور پڑھے لکھے بھی اور ان کے پاس اپنے تجربات کے سماجی اور نفسیاتی جوازوں کی بھی کمی نہیں لیکن ان کی مساعی جمیلہ کی اہمیت ابھی پردۂ غیب سے باہر نہیں آسکی ہے۔ پھر بھی اردو کی نئی شاعری میں نئے شعور، احساس کی صورت و سیرت کا واضح تصور قائم کرنا ناممکن نہیں ہے۔ میں نئی شاعری کا نصاب مرتب کرنے کے موڈ میں نہیں ہوں، اس لیے ان نئے شاعروں کی ایک مکمل نہ سہی کافی طویل فہرست یہاں پیش کرتا ہوں جن کی تخلیقات کا مطالعہ نئی شاعری کی خوبیوں اور خامیوں کا اندازہ لگانے میں قارئین اور ناقدین کی مدد کر سکتا ہے۔

ابن انشا۔ احمد فراز۔ احمد ہمیش۔ اختر الایمان۔ افتخار جالب۔ انیس ناگی۔ باقر مہدی۔ بشر نواز۔ بلراج کومل۔ بمل کرشن اشک۔ تصدق حسین خالد۔ جلیل حشمی۔ جمیل ملک۔ خلیل الرحمن اعظمی۔ راج نراین راز۔ زاہد ڈار۔ ساقی فاروقی۔ سلیم الرحمن۔ شاذ تمکنت۔ شاد عارفی۔ شفیق فاطمہ شعریٰ۔ شہاب جعفری۔ شہریار۔ شہزاد احمد۔ ضیا جالندھری۔ ظفر اقبال۔ ظہور نظر۔ عادل منصوری۔ عارف عبدالمتین۔ عباس اطہر۔ عتیق تابش۔ عزیز تمنائی۔ عمیق حنفی۔ فارغ بخاری۔ فضل تابش۔ فہمیدہ ریاض۔ قاضی سلیم۔ قیوم نظر۔ کمار پاشی۔ گوپال متل۔ مجید امجد۔ محمد سلیم الرحمن۔ محمد علوی۔ محمود ایاز۔ مختار صدیقی۔ مخمور سعیدی۔ مظفر حنفی۔ منیب الرحمن۔ منیر نیازی۔ میراجی۔ ناصر کاظمی۔ ندا فاضلی۔ نذیر احمد ناجی۔ ن۔ م۔ راشد۔ وحید اختر۔ وزیر آغا۔ یوسف ظفر۔

یہاں مجھے نئے شاعروں کی چھان بین اور جانچ پرکھ نہیں کرنی ہے لیکن اتنا ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ دو چار نئے شاعر آج بھی مجاز و فراق یا فراق و فیض کے طرز فکر و فن کو روایت کی طرح اختیار کیے ہوئے ہیں اور اس روایت کو آگے بڑھانے کا نام ہی ان کے لیے جدت ہے۔ بعض ایسے ہیں جنھیں نوکلاسکی اور بعض کو نو رومانی کہا جا سکتا ہے۔ بعض پر ترقی پسند شاعری کا خمار اب تک طاری ہے اور انھیں موضوعاتی اور ہنگامی نظمیں کہہ ڈالنے میں کوئی عار نہیں۔ فیض، ندیم، سردار، جاں نثار، وامق، سلام، مخمور جالندھری، فکر تونسوی، رفعت سروش، مخدوم، راہی معصوم رضا وغیرہ کی ایسی نظمیں جن میں خطابت، تبلیغِ مقاصد اور اظہار عقائد کے بجائے اظہار ذات ہوا ہے نئی شاعری کی اچھی مثالیں ہیں۔

۶۔ اردو ادب کا نصابِ تعلیم نہایت نامعقول، فرسودہ، پچھڑا ہوا اور Out of date ہے۔ ظاہر ہے کہ کوچوانی کی ٹریننگ پایا ہوا شخص ہوائی جہاز یا موٹر کار نہیں چلا سکتا۔ ہماری درسگاہیں ادب کے نام پر تاریخ و آثار ادب کی تعلیم دیتی ہیں۔ اب تک کوئی یونیورسٹی جدید اردو ادب میں ایم اے کی ڈگری دینے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کر سکی۔ اگر جدید اردو ادب میں ایم اے کا جداگانہ نصاب نہیں تیار کیا جاتا تو کم از کم اتنا ہی کر دیا جائے کہ ۱۸۵۷ء سے ۱۹۳۶ء تک کے ادب اور ۱۹۳۶ء تا حال کے ادب میں تقلین کو optional دے دیا جائے۔ اس کے علاوہ جدید ادب پر ایکسٹینشن لکچرز بھی کرائے جا سکتے ہیں۔

شاعری پر سیاست اور سماج اور اخلاق کی کمیں گاہ سے اصطلاحات کے تیر چلانے کو جو ناقدین اپنے فن کا کمال سمجھتے ہیں وہ

نئی شاعری پر شب خون مار کر اب بھی خوش ہو جاتے ہیں۔ اگر مقدمے کی سماعت اور طرفین کے شواہد پرکھے بغیر فیصلہ صادر کرنے کا فن کسی سے سیکھنا ہو تو

کوئی اردو کے ناقدین کرام سے رجوع کرے۔

نئی شاعری کے رجحانات، تخلیقی عوامل، طرز احساس، فکر Modern Sensibility طریق اظہار، اسالیب، تیکنک وغیرہ سے قارئین کو روشناس کرانے اور نیا شاعر کیا کہتا ہے؟ کیوں کہتا ہے؟ کیسے کہتا ہے۔؟ ان سوالات کا جواب دینے سے پہلے ہی ہمارے ناقدین نئی شاعری کے مستقبل کے تاریک ہونے کی پیشین گوئی کر دیتے ہیں۔

یہ زاویہ تنقید کم از کم نئی شاعری کے لیے صحیح نہیں ہے۔ اگر تنقید کے فرائض منصبی میں یہ بھی داخل ہے کہ وہ شاعری میں رونما ہونے والے تغیرات اور واقعات و حادثات سے قارئین کو باخبر رکھے اور یہ بتائے کہ کیا ہو رہا ہے؟ کیوں؟ کیسے ہو رہا ہے؟ کیا ہو رہا ہے؟ تو اصطلاحات اور رفتار موڑوں کے چکر توڑ کر نئی شاعری کی خامیاں، کمیاں اور عیوب کی نشان دہی کرنے سے پہلے تنقید کو نئی شاعری کو سمجھنے اور سمجھانے کی پرخلوص کوشش کرنی چاہیے۔ تشریح، تفسیر اور تعبیر کی منزل سے گزرنے کے بعد ہی تنقید، تقدیر اور تحسین کی منزل آتی ہے۔

اس سوال کا جواب دینا میرے بجائے کسی ناقد کے لیے زیادہ آسان ہوگا۔ میرے جواب سے یہ غلط فہمی بھی ہو سکتی ہے کہ میں تنقید کی عدم توجہی اور کم التفاتی کا شاکی ہوں یا یہ کہ میں نئی شاعری کو تنقید کا محتاج کرم اور تنقید کی سند کا مرہون منت سمجھتا ہوں۔ ایسا نہیں ہے۔ سوال شاعری کے بقا یا فلاح و بہبود کا نہیں اس کے ابلاغ کا ہے۔ ابلاغ کے مسئلے کو حل کرنے میں تنقید معاون ہو سکتی ہے بشرطیکہ وہ نئی شاعری میں دلچسپی لے اور نیا ذوق پیدا کرے۔ نئی بوطیقا کی داغ بیل ڈالے۔

خلیل الرحمن اعظمی، ڈاکٹر محمد حسن، جمیل جالبی، افتخار جالب، ڈاکٹر وزیر آغا، سلیم احمد، شمیم احمد، بلراج کومل، محمود ہاشمی، ریاض احمد وغیرہ نے نئی شاعری پر تنقید کی نئی راہیں نکالنے کی مستحسن کوشش کی ہے اور ان کی کوشش اہم اور سودمند بھی ثابت ہوئی ہے۔ لیکن یہ کوششیں ناکافی ہیں۔

کماریاشی

(۱ - ۲) نئی شاعری سے میری مراد اس شاعری سے ہے جسے میرے عہد کے انسان نے تخلیق کیا ہو۔ میرا عہد جس میں میں آج سانس لے رہا ہوں تیزی کے ساتھ اپنے زوال کی جانب گامزن ہے۔ میرا شاندار ماضی اب میرے ہاتھ میں نہیں۔ نیچر کی گود میں مجھے جو سکون اور طمانیت میسر تھی وہ اب میرا مقدر نہیں رہی۔ میں جب خود کو اپنے عہد کے انسان کی جگہ رکھ کر دیکھتا ہوں تو ایک عجیب و غریب کرب سے دوچار ہوتا ہوں۔ نئے انسان نے وہ سب کچھ کھو دیا ہے جو اس نے روز ازل حاصل کیا تھا۔ پہلے وہ اپنی قوتوں پر زندہ تھا اور نیچر سے اس کا رشتہ بہت گہرا تھا جس کے ذریعے وہ خود کو پہچانتا تھا۔ لیکن آج وہ مشینوں کے رحم و کرم پر ہے۔ نیچر سے اس کا رشتہ ٹوٹتا جا رہا ہے اور خدا کے ساتھ اس کے جو تصورات وابستہ تھے اور جن کے تحت وہ نیکی اور بدی، اچھائی اور برائی، کھرے اور کھوٹے، اجالے اور اندھیرے میں تمیز کر سکتا تھا وہ تصورات اب ختم ہو چکے ہیں۔ جس زمینی رشتے کو وہ ازلی اور ابدی رشتہ سمجھتا تھا۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کے اس دور میں اس کا بھی زوال ہو چکا ہے۔ وہ اب جان چکا ہے کہ اس پوری کائنات میں اس کی حیثیت ایک ذرّے کے برابر بھی نہیں ہے اور اس کی زمین جسے وہ ابد تک قائم و دائم سمجھتا تھا کسی بھی وقت ایٹم کی ہولناکیوں میں ریزہ ریزہ ہو کر بکھر سکتی ہے۔

آج کا انسان اب سے پہلے کے انسان سے ذہنی طور پر بہت ہی مختلف ہے۔ وہ اب زمینی فاصلوں کے کم یا ختم ہو جانے سے

بین الاقوامی سطح پر ایک عالمگیر قوم میں شامل ہو چکا ہے۔ اس کا کرب اب محض ذہنیت کا نہیں رہا۔ آج جبکہ پوری کائنات کے اسرار کی گرہیں کھل چکی ہیں۔ اس کے کرب کی شدت میں بھی اضافہ ہوا ہے۔

نیا انسان خارجی وسعتوں کے سامنے خود کو ہیچ پاکر اب اپنے وجود کی تلاش کرنے نکلا ہے۔ اس کا سفر اب اپنے خارج سے باطن کی جانب ہے۔ اس لیے آج وہ خود سے ہم کلام ہے۔ سوالات نئے ہیں اور پیچیدہ ——— وہ ان سب کا جواب چاہتا ہے۔ ——— اس کا اضطراب گہرا بھی ہے اور شدید بھی۔ اس کی آواز میں اس زوال خوردہ معاشرے کی چیخیں شامل ہیں۔ اس لئے اس میں درد کی دھیمی دھیمی آنچ بھی ہے اور شدید تاثر بھی۔

(۳-۵) دراصل ادب میں جب بھی کوئی تحریک شروع ہوتی ہے۔ اس پر چند ایک عناصر کے ساتھ ساتھ بہت سی برائیاں بھی در آتی ہیں۔ میں یہ نہیں کہوں گا کہ ان دنوں نئی شاعری کے نام پر جو کچھ لکھا جا رہا ہے یا لکھا جا چکا ہے وہ سب اعلیٰ درجے کا ہے اور اس میں عصری شعور جلوہ گر ہے۔ بلکہ میں تو یہ کہنے کی اجازت چاہوں گا کہ گذشتہ چند برسوں میں ہمارے معاشرے میں جو نمایاں تبدیلیاں ہوئی ہیں ان کی واضح جھلکیاں ہمیں موجودہ دور کے بہت سے نئے شعراء کے یہاں نظر آتی ہیں۔ جن دنوں ترقی پسند تحریک کا بول بالا تھا اس زمانے میں بھی باصلاحیت لوگوں کے ساتھ غلط لوگوں کا ایک ہجوم شامل ہو گیا تھا۔ لیکن آج چند ہی برسوں میں صرف انہی لوگوں کا نام باقی رہ گیا ہے جنھوں نے اس تحریک کو فیشن کے طور پر قبول نہ کرتے ہوئے اپنی تخلیقی قوتوں سے کام لیا تھا۔ کچھ یہی حال ان دنوں نئی شاعری کی تحریک کا ہے۔ اس قافلے میں بھی بہت سے غلط قسم کے لوگ شامل ہو گئے ہیں اس بات سے مجھے قطعی انکار نہیں ہے لیکن یہ کہنا کہ نئے شعراء میں سبھی نے اس نئے پن کو فیشن کے طور پر اختیار کر لیا ہے بالکل غیر مناسب ہوگا۔

نئی شاعری درحقیقت نئے انسان کی خارجی اور داخلی شکست و ریخت کا اظہار ہے اور نئی شاعری کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ اس عہد کو اور اس عہد کے انسان کو اور اس کے مسائل کو سمجھا جائے۔ اس وقت میرے ذہن میں بہت سے نام ہیں جن کے ہاں اس عہد کا کرب شعور ملتا ہے۔ اور جن کی شاعری پڑھتے ہوئے اس عہد کا انسان اپنے پورے عروج و زوال کے ساتھ ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ مشینی زندگی، تنہائی، انسان کی ازلی وابستگی کے خاتمے، خدا کے تصور کے زوال نیز تمام پرانی اقدار کے مٹ جانے سے نیا انسان آج جن مسائل سے دوچار ہے اور نئی اقدار کی تلاش میں جس تخلیقی کرب سے گزر رہا ہے۔ اس کی جھلک اگر آج کے کسی شاعر کے ہاں نظر آتی ہے تو اسے نیا شاعر کہنے میں مجھے کوئی تامل نہیں ہے نئے شاعر کا المیہ یہ ہے کہ نہ تو اسے لکھنؤ کے بالاخانوں کی چھچھاتی فضا میسر آئی اور نہ ہی اس نے دلی دربار کی عظمت کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ـــ اس کی جب آنکھ کھلی تو ادھر اس کے اپنے ملکی حالات بدل چکے تھے (ملک تقسیم ہو چکا تھا اور ایک جاندار اور عظیم قوم۔ جس کا ایک شاندار ماضی تھا۔ دو حصوں میں منقسم ہو گئی تھی)۔ پھر انسانیت کا قتل عام روز بروز بڑھتے ہوئے سرحدی جھگڑے، اقتصادی ترقی کے لیے غیر ممالک سے جڑتے رشتے اور ان کا مآل ـــ اس کے ساتھ ہی سرحدوں پر چھوٹی چھوٹی لڑائیاں اور ان کے بھیانک نتائج اور ادھر ملک سے باہر بھی تمام دوسرے ممالک اور تمام قومیں کچھ اسی قسم کے انتشار میں گرفتار تھیں ـــ اور اب پوری انسانیت پر ہر لمحہ منڈلاتے ہوئے تیسری عالمگیر جنگ کے ہیبت ناک سائے ہیں۔ جو دن بہ دن گہرے ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ سارے مسائل نئے انسان کے مسائل ہیں اور نئی شاعری ان تمام مسائل کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔

(۴) دراصل اب سے پہلے شعر فہمی کا معیار بہت ہی مختلف تھا۔ ہمارے بزرگ خود کو شاعر نہیں بلکہ مداری سمجھتے تھے اور اپنے قارئین کو محض تماشائی کا درجہ دیتے تھے۔ اب چونکہ یہ سارا کھیل مداری اور تماشائی سے متعلق تھا اس لیے دونوں

کا رشتہ بہت ہی کھلی، خارجی اور لمحاتی تھا۔ شاعر لفظوں کے بندر نچاتا تھا اور قارئین تماشائیوں کا فرض ادا کرتے ہوئے تالیاں پیٹتے تھے۔ نئی شاعری سے متعلق پہلی بات تو یہ ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ نئی شاعری مداری کا کھیل نہیں ہے اور نہ ہی بندر کا تماشا ہے۔ نیا شاعر نہ تو خود کو مداری سمجھتا ہے اور نہ ہی اپنے قاری کو تماشائی کا سطحی درجہ دیتا ہے۔

گزشتہ چند برسوں میں اردو میں جو شاعری ہوئی ہے اور جسے نئی شاعری کا نام دیا جانے لگا ہے۔ (کیونکہ وہ اپنے موضوع، ہیئت، کیفیت اور تاثر کے اعتبار سے اردو کی چند برس پہلے تک کی تمام پرانی شاعری سے مختلف ہے) اسے شاعر اور قاری نے مل کر تخلیق کیا ہے۔ در اصل نیا شاعر قاری کو خود سے الگ کوئی اور کسی چیز تصور نہیں کرتا بلکہ اسے اپنی ذات میں شامل سمجھتا ہے۔ اس لئے اگر اب نیا شاعر یہ کہتا ہوا اسٹیج پر آتا ہے کہ ابلاغ کا مسئلہ میرا مسئلہ نہیں ہے۔ تو اس کا یہ مطلب لینا درست نہیں کہ اس نے قاری کے وجود کو یکسر فراموش کر دیا ہے۔ اور وہ اپنے اور اپنی شاعری کے درمیان قاری کی موجودگی کو ایک لعنت تصور کرتا ہے۔ بلکہ نئے شاعر نے تو قاری کو وہ مقام دیا ہے جو آج سے پہلے کبھی اس کا مقدر نہیں رہا۔ کیا یہ کم ہے کہ اب وہ تماشائی نہیں رہا بلکہ شاعر کی تخلیق میں برابر کا شریک ہے۔

اب سارا جھگڑا تو وہاں کھڑا ہوتا ہے۔ جہاں قاری اس گہرے، داخلی اور دیرپا رشتے کو قبول نہیں کرتا۔ اور خود کو پہلے کی طرح تماشائی سمجھتا ہے۔ اور یوں نئی شاعری یا نئے شاعر کا مطالعہ کرتے ہوئے تالی پیٹنے کا پرانا عمل دہرانا چاہتا ہے۔ اور اس طرح ہمارے بوڑھے نقاد ایک مسئلہ کھڑا کر دیتے ہیں کہ نئی شاعری میں ابلاغ نہیں ہے۔ نیا شاعر قاری کے وجود سے منکر ہے۔ نیا شاعر اپنی تخلیقات میں صرف لفظوں کو جمع کر رہا ہے۔ اب ان شعر فہم لوگوں کو کون سمجھائے کہ کبھی الفاظ جمع کرنے کا کام تو ہمارے بزرگوں کا تھا۔ نئے شاعر کا جرم تو یہ ہے کہ اس نے بزرگوں کے تھوک سے لتھڑے، جمع شدہ الفاظ کو پاک و صاف کیا ہے۔ اور یوں انھیں نئی شکل و صورت عطا کی ہے۔ در اصل نیا شاعر الفاظ کو رنگوں سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔ ایک مصور جب اپنی کسی داخلی کیفیت کے اظہار کے لیے کینوس پر مختلف رنگوں کا استعمال کرتا ہے تو وہاں تمام رنگ مل کر ایک ایسے رنگ کی تخلیق کا موجب بنتے ہیں جو مصور کی اس داخلی کیفیت کو دوسرے تک منتقل کر سکے۔

نئے شاعر نے الفاظ کے ساتھ کچھ ایسا ہی رویہ اختیار کیا ہے۔ نئی شاعری کو سمجھنے کے لیے نہ تو پرانے دیوان ہی کام آ سکتے ہیں اور نہ ہی لغت۔ نئی شاعری کو سمجھنے کے لئے تو الفاظ کی مدد سے شعری محرکات کا ادراک اور شاعر کے تخلیقی کرب کو محسوس کرنا بہت ضروری ہے۔ اس لئے کہ نئی شاعری میں الفاظ کی حیثیت بالکل ثانوی ہے۔

(۶) نئی شاعری کے ابلاغ کے سلسلے میں میں نے اوپر کافی واضح اشارے کیے ہیں۔ چونکہ میں قاری اور شاعر کو الگ الگ تصور نہیں کرتا بلکہ شاعر کی تخلیق میں قاری کو برابر کا شریک سمجھتا ہوں اس لئے میرے نزدیک ابلاغ کوئی مسئلہ بن کر سامنے نہیں آتا۔ اور اگر بعض لوگوں کے نزدیک اس مسئلے کا واقعی کوئی وجود ہے تو ہمارے نقادوں کو اس سلسلے میں ضرور کوئی ایسی کوشش کرنی چاہیئے جس سے قاری اور شاعر کے درمیان کا فاصلہ ختم ہو سکے۔ میرا اشارہ ان نقادوں کی طرف نہیں ہے جو اپنا بھلا، برا فرض ادا کر چکے ہیں اور اب نئی شاعری کو بھی پرانی کسوٹی پر پرکھ کر کھوٹا ثابت کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ اب ان لوگوں کو کون سمجھائے کہ بھئی کھوٹ تو آپ کی کسوٹی میں ہے نہ کہ نئی شاعری میں۔ شاعری نئی ہے تو اس کے لئے کسوٹی بھی نئی حاصل کیجیے اور اسی پر نئی شاعری کو پرکھ کر اس کا کھرا پن یا کھوٹا پن ثابت کیجیے)۔ میرا اشارہ تو ان نقادوں کی طرف ہے جو ذہنی طور پر میرے عہد میں زندہ ہیں اور جو اس عہد کو اس کی تمام غلاظتوں اور خباثتوں سمیت قبول کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں اور جو کسی ادب پارے کو اپنی ذاتی پسند یا ناپسند کے مطابق با مقصدی یا غیر مقصدی ثابت کر کے قبول یا رد نہیں کرتے بلکہ نئے انسان کے مسائل کو سامنے رکھ کر شعر کا تجزیہ کرنے

کی کوشش کرتے ہیں ۔

شیروانی کا آخری بٹن بند کرکے اور خود کو کسی تخلیق پر لاد کر اسے پسند یا ناپسند کرنے کا زمانہ لد چکا ہے نئی شاعری یا نئے شاعر کو سمجھنے کے لئے ہمیں اپنی شیروانی کے اوپر والے بٹن کھولنے پڑیں گے اور وہ یوں کہ نیا شاعر نہ تو لکھنؤ کا صاحبزادہ ہے اور نہ ہی کسی دربار سے منسلک ہے۔ وہ تو سیدھا سادہ سا انسان ہے ۔ اس کی شاعری اس کی ذات کا ، اور اس کے عہد کے مسائل کا تجزیہ ہے جس میں کسی قسم کے تصنع یا بناوٹ کا کوئی دخل نہیں ۔ اس سے کسی بزرگ کی طرح ملیں گے تو وہ آپ سے کھل کر بات نہیں کرے گا ۔ اس سے ایک بے تکلف دوست کی طرح ملئے ۔ اس کی باتیں آپ کو یقیناً اچھی لگیں گی ۔

جن نوجوان نقادوں نے نئی شاعری یا نئے ادب کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے ....

...... اور نئے راستے سمجھائے ہیں ان میں وزیر آغا، ریاض احمد، محمود ہاشمی، مظفر علی سید، عمیق حنفی وغیرہ کا ذکر کرنا بہت ضروری خیال کرتا ہوں چونکہ یہ لوگ تخلیقی عمل سے واقف ہیں اس لئے ان کا رویہ تمام پرانے نقادوں سے مختلف ہے اور ان کی کوششیں قابلِ قدر ہیں ۔

آخر میں پھر وہی جملہ دہرانا چاہتا ہوں کہ نیا شاعر ایک سیدھا سادہ سا اس عہد کا زوال خوردہ انسان ہے اور اسے ہر قسم کے تصنع یا بناوٹ سے سخت نفرت ہے ۔ اس سے اسی کی طرح (ایک سیدھے سادے انسان کی طرح) ملئے اور ہاں اپنی شیروانی کے اوپر والے بٹن کھولنا مت بھولیے گا ـــــ ورنہ پھر وہی ابلاغ کا مسئلہ کھڑا ہو جائے گا ـــــ اور مجھے پھر یہی بات دہرانی پڑے گی کہ ابلاغ کا مسئلہ نئے شاعر کا مسئلہ نہیں ہے ۔

ڈاکٹر وارث کرمانی

(۱) نئی شاعری سے مراد وہ تخلیقی سرمایہ ہے جو ترقی پسند تحریک کے ردِّ عمل میں ہماری زبان میں ظاہر ہوا ہے نئی اور پرانی شاعری کے درمیان حدِ فاصل قائم کرنا ایسا ہے جیسے ذرہ کو صحرا سے الگ کرنا ۔ نئی شاعری کی عمر زمانۂ حاضر سے تقریباً بارہ پندرہ سال کہی جا سکتی ہے جبکہ پرانی شاعری کی عمر خود زبان کی عمر کے برابر ہے ویسے خورد بین سے اگر دیکھا جائے تو یہ قلیل مدت بھی شمار کی جا سکتی ہے لیکن یہ طریقہ معتبر نہ ہوگا ہر زمانے کے لوگوں کو اپنے عہد کی شاعری قریب ہونے کی وجہ سے بڑی معلوم ہوئی ہے لیکن اکثر اوقات وہ بعد کو مسترد کر دی گئی ہے اس لیے میری رائے میں نئی شاعری کو پرانی شاعری کا حریف یا مدِ مقابل مان کر ایک حدِ فاصل قائم کرنا رائی کا پہاڑ بنانا ہوگا زیادہ سے زیادہ اسے ایک نیا دلچسپ اور حقیقت پسند رجحان کہا جا سکتا ہے جس نے نئی نسل کو متاثر کیا ہے اسی لئے اس کے مستقبل میں امکانات بھی ہیں ۔

نئی شاعری ترقی پسند شاعری سے بنیادی طور سے مختلف ہے ۔ ترقی پسند شاعری میں ضبط و نظم ، شہریت و صناعی ، مفادِ عامہ اور عزم و یقین کے میلانات پائے جاتے تھے ۔ نئی شاعری میں ضبط و نظم کی جگہ بے راہ روی ، شہریت و صناعی کی جگہ دیہاتیت اور سادگی ، مفادِ عامہ کی باتوں کی جگہ اپنا غم اور مبہم خیالات ، اور عزم و یقین کے بجائے شکست اور بے یقینی کا اثر چھایا ہوا ہے یہ پوچھنا کہ نئی شاعری ترقی پسند شاعری سے آگے ہے یا پیچھے میری رائے میں بے معنی سوال ہے ۔ ادب یا شاعری کی رفتار ایک خطِ مستقیم پر سفر کرنے کے مترادف نہیں جس میں کسی کو آگے یا پیچھے تسلیم کیا جا سکے ادبی قدریں ایک خاص دائرے میں گردش کرتی ہیں جس میں پیچھے

چھوٹ جانے والی چیز آگے پھر ملتی ہے

(۲) نئی شاعری سے پہلے اردو شعراء کے سامنے جو تصورات اور آدرش تھے وہ کبھی مضحکہ خیز یا فرسودہ نہیں ہو سکتے۔ میں ایسے تصورات اور آدرشوں کی بات کر رہا ہوں جن کی جڑیں انسانی جبلت میں پیوست ہیں مثلاً امن و آرام کی خواہش، حفظ زندگی کی تحریک یا افزائش نسل کے جنسی جذبات۔ سیاسی نصب العین البتہ فرسودہ ہو سکتے ہیں لیکن یہیں بھی جہاں تک وسیع سیاسی آدرشوں کا تعلق ہے نئی اور پرانی شاعری میں کوئی خاص فرق نہیں زندگی کو بنانے اور سنوارنے سے دونوں کو عشق رہا ہے ایک کے یہاں اس نے خروش و اشتعال کی شکل اختیار کی ہے دوسرے کے یہاں افسردگی و اضمحلال کی۔

(۳-۴) نئی شاعری عصری شعور و احساس کے اظہار کی ذمہ داری کسی حد تک پوری کر رہی ہے بلکہ اصل عصری شعور ہی کے اظہار نے اسے ترقی پسند شاعری سے علیحدہ کر دیا ہے۔ ترقی پسند شاعری کی اساس عقل اور استدلال پر تھی موجودہ عصری شعور کو عقل پر اعتبار نہیں رہا ہے جس کی بنا پر اس میں ناامیدی و گمشدگی کی کیفیت ہے۔ سترھویں صدی عیسوی سے لیکر بیسویں صدی کے تقریباً وسط تک کا زمانہ دنیا میں عقل کا زمانہ کہا جا سکتا ہے اس زمانے میں انسان نے عقل سے نہ صرف مادی فتوحات حاصل کیں بلکہ مذہب کو بھی یا تو معقول بنایا یا نامعقول مان کر مسترد کر دیا ترقی پسند شاعری انسانی عقل کے اسی نقطۂ عروج کی ترجمانی کرتی ہے۔ موجودہ دور کو اس نقطۂ عروج کے بعد کا قوس نزولی کہا جا سکتا ہے اور ایسی جو تھکن فسردگی اور نارسائی کی کیفیت ہو وہ نئی شاعری میں ظاہر ہوئی ہو تاہم یہ کہنا کہ نئی شاعری عصری شعور کے اظہار کی ذمہ داری پوری کر رہی ہے ابھی قبل از وقت ہو نئی شاعری میں اظہار کے وسائل ابھی تجرباتی منزل میں ہیں۔ بحر قافیہ ردیف میں ڈھلی ہوئی پر زور خطابتیں جس طرح ترقی پسندوں کے ایمان و اعتقاد کو ظاہر کرتی تھیں وہ صورت یہاں نہیں ہو ترقی پسند شاعری ہی کی طرح توانا اور تندرست تھے نئے شاعر الحاد اور بے یقینی کی وجہ سے افراد کر رہے ہیں کوئی بھوکا ہے کوئی خفا ہے ان کے سروں پر شامت ہے سامنے ٹوٹی ہوئی بحروں اور گھسے ہوئے الفاظ کا ایک ڈھیر ہے جسے جوڑ جاڑ کر یہ لوگ اپنی بات کہنا چاہتے ہیں لیکن پوری طرح کہہ نہیں پاتے کہیں الفاظ دھڑ کر رہ جاتے ہیں کہیں مطلب مبہم ہو جاتا ہے اور کہیں آواز میں لکنت پیدا ہو جاتی ہے اسی لیے نئی شاعری میں قارئین سے تخاطب کے مقابلہ پر خود گری و خود کلامی کی کیفیت زیادہ ہے پرانے قارئین بلکہ عمر دراز نقاد بھی اگر اسے پورے طور پر نہ سمجھ سکیں تو کوئی تعجب کی بات نہیں اس لئے کہ وہ اس آزار اور اس کے اظہار کے کرب سے ناواقف ہیں یہ ضرور ہے کہ آگے چل کر قاری و شاعر کا یہ فاصلہ آہستہ آہستہ ختم ہو جائے گا۔

(۵) ہمعصر شاعروں کے نام گنوانا درست طریقہ نہیں اس میں غلط انتخاب کے خاصے امکانات رہتے ہیں اس عرصے میں بہت سے شعری مجموعے شائع ہوئے ہیں انھیں پڑھ کر ہم ایک اندازہ لگا سکتے ہیں۔

(۶) نصاب تعلیم اور زاویۂ تنقید کے ذریعہ ان تمام عناصر کا محاسبہ مناسب ہوگا جنھوں نے نئی شاعری کو جنم دیا ہے دوسری عالمی جنگ کے بعد دنیا میں جو سیاسی معاشی اور نفسیاتی تبدیلیاں ہوئی ہیں انھیں ذہن نشین کرنے سے نئی شاعری کافی حد تک سمجھی جا سکتی ہو جہاں تک زاویۂ تنقید کا تعلق ہے اس میں ایک بنیادی تبدیلی کی ضرورت ہوگی جس کی طرف میں اپنے ایک اور مضمون "جدید شعری تنقید" پر تفصیل سے میں اشارہ کر چکا ہوں۔ پرانی تنقید بالخصوص ترقی پسند تنقید شعری سرمائے کا تجزیہ سائنٹفک نقطہ نظر سے کرتی تھی نئی

شاعری کے لئے تنقید کو نیم شاعرانہ اور نیم فلسفیانہ ہونا پڑے گا یعنی سابقہ تنقید کے برخلاف اسے نظموں کے تاثراتی ردعمل پر اصرار کرنا ہوگا اور ان نظموں کی مخصوص کیفیت جتنے فاصلے تک ناقد کی قوت متخیلہ کو لے جائے اور اس ذہنی سفر میں جن تجربات کا لطف یا کرب اُسے حاصل ہو اسے بھی تنقید میں قاری تک پہنچانا ضروری ہوگا۔

شمس الرحمٰن فاروقی

(۱) خالص میکانکی اور زمانی نقطۂ نظر سے "نئی شاعری" سے میں وہ شاعری مراد لیتا ہوں جو ۱۹۵۵ کے بعد تخلیق ہوئی ہو۔ ۱۹۵۵ کے پہلے کے ادب کو میں نیا نہیں سمجھتا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ۱۹۵۵ کے بعد جو کچھ بھی لکھا گیا وہ سب نئی شاعری کے زمرے میں آتا ہے اور یہ بھی نہیں کہ ۱۹۵۵ کے پہلے کے ادب میں "جدیدیت" کے عناصر نہیں ملتے۔ میری اس تعین زمانی کی حیثیت صرف ایک frame of reference کی ہے۔ داخلی اور معنوی حیثیت سے میں اس شاعری کو "جدید" سمجھتا ہوں جو ہمارے دور کے احساس جرم، خوف تنہائی، کیفیت انتشار اور اس ذہنی بے چینی کا (کسی نہ کسی نہج سے) اظہار کرتی ہو جو جدید صنعتی، مشینی اور میکانکی تہذیب کی لائی ہوئی مادی خوش حالی، ذہنی کھوکھلے پن، روحانی دیوالیہ پن اور احساس بے چارگی کا عطیہ ہے۔ جدید ادب گرتی ہوئی چھتوں، لڑکھڑاتے ہوئے سہاروں اور لاتعداد بھول بھلیوں کے خوف ناک احساس گم کردہ راہی سے عبارت ہے۔ پہلے کے ادیبوں نے اپنے خدا تلاش کر لئے تھے۔ شیکسپیر اگر اعلیٰ انسانی اقدار اور عالی ظرفی اور بہیروئی توکل heroic acceptance کا سہارا ڈھونڈتا ہے تو ٹینی سن مادی خوش حالی اور خداوندِ ارض و فلک کی بنیادی منصف مزاجی کا۔ ہارڈی اگر کسی اندھی قوت کے آگے خود کو مجبور پاتا ہے تو یہ بھی امید کرتا ہے کہ کسی نہ کسی دن یہ قوت شعور و ادراک سے بھر جائے گی اور ہر چیز کو حسین بنا دے گی۔ غالب اگر ہونے اور ڈوبنے کا ماتم کرتے ہیں تو کسی کسی لمحہ میں نالہ بجز ہلاکہہ اٹھتے ہیں۔ ایلیٹ نے اگر قدیم عیسائیت کی کیفیت معصوم state of grace ڈھونڈلی تو یئٹس Yeats نے روحانیت، علم الاسرار اور آئرستانی دیومالا کا سہارا لیا۔ سیسل ڈے لیوس مخدوم اور سردار نے اگر اشتراکی نظام کے قیام و استقلال کی امیدیں باندھیں تو بیدی نے پنجاب کے دیہاتوں میں اعلیٰ انسانی اقدار تلاش کیں۔ نیا شاعر اس طرح کے نشہ آور خوابوں کے سرور اور خدا باپ یا قوم پرستی یا خوش اعتقادی کے father image کی متحد چھت کے سائے سے محروم ہے۔ نئے دور کا المیہ شکست کا المیہ ہے۔ نیا شاعر "ہاتھوں کا ترانہ" لکھ سکتا ہے نہ "طلوع اسلام"۔ اس کے پاس نہ اختر الایمان کی یادوں کا سہارا ہے نہ عبدالعزیز خالد کی سطحی علمیت زدہ مذہبیت اور دیومالائیت کا۔ نئے شاعر کے پاس صرف دو چیزیں ہیں۔ اس کی اپنی کچلی ہوئی تڑپی مڑی مجروح شخصیت — اور اس شخصیت کے زندہ متحرک اور حساس ہونے اور رائے زنی comment کرنے کا استحقاق رکھنے کا احساس۔ لیکن یہ comment کسی پلیٹ فارم، کسی خارجی دباؤ، کسی گروہ یا بلاک کے مفاد و منفعت یا عناد و مخاصمت کے لئے نہیں، بلکہ خود اپنی شخصیت اور خارجی دنیا کے ٹکراؤ کے نتیجے میں اچھلنے والی چنگاریوں سے اٹھتا ہے۔ نیا شاعر، شاعری کو صرف شاعری سمجھتا ہے، فلسفہ، پروگرام، مناظرہ، بحث و تمحیث، نصیحت، وصیت، اشتہار یا اخبار نہیں۔ اگر یہ فن برائے فن ہے تو ہو، رجعت پرستی ہے تو ہو، لیکن نیا شاعر خود کو ہر طرح uncommitted سمجھتا ہے۔ وہ نہ میمنہ میں ہے نہ میسرہ میں، نہ سرخ ہے نہ سیاہ نہ سفید۔

فنی نقطۂ نظر سے دیکھیں تو ابھی اردو کا نیا شاعر مغرب کے نئے شاعر سے بہت پیچھے ہے۔ اردو کا نیا شاعر ابھی تمثیلیت یعنی Symbolism کا ہی مسئلہ نہیں حل کر پایا ہے۔ مغرب کی بہت سی شاعری تمثیلیت کو بحیثیت ایک cult بھلا چکی ہے، ہاں تمثیلیت بحیثیت ایک طرز ادا کے ابھی زندہ ہے۔ کچھ نقاد (مثلاً سی۔ ایم۔ باورا[1]) کہتے ہیں کہ نئی شاعری (مغرب میں) تمثیلیت کی بالکل ضد ہے۔ میں اس سے متفق نہیں ہوں۔ لیکن اظہار و ابلاغ کے جو مسائل آج ہمارے شاعروں کو پریشان اور ہمارے نقادوں کو خشمگیں

---

[1] ایک حالیہ مضمون، شائع شدہ ENCOUNTER شمارہ ۔ میں اس حوالے کے لیے اپنے استاد پروفیسر ایس۔ سی۔ دیب کا ممنون ہوں۔

دیکھتے ہیں، اور جو تمثیلیت کی تحریک کے پروردہ و پرداختہ تھے، مغرب میں بہت حد تک ختم ہو چکے ہیں۔ بہرحال اردو کا نیا شاعر کسی بھی حیثیت سے تمثیلیت پرست ہے اور نہ کلی ابلاغ کا قائل ان معنوں میں نہیں ہے جن معنوں میں غالب کے ہم عصر کلی ابلاغ کے قائل تھے۔ جو میرے خیال میں نئے کو پرانے سے ممیز کرتی ہے وہ تخلیقی عمل کے نظریہ کا اختلاف ہے۔ نیا شاعر نظم یا شعر کو ایک کل اکائی کی حیثیت سے تخلیق کرتا ہے۔ وہ ہیئت کے ان روایتی اصولوں کا قائل نہیں جنھیں ترقی پسندوں نے مشہور و مقبول کیا تھا اور جن کی رو سے نظم یا شعر میں فکر و جذبہ کا منطقی استدلال و تدریج نمایاں اور واضح ہونا چاہیئے۔ نیا شعر نظم یا شعر کو کسی ایک نقطۂ وقت کی شدت میں جنم دیتا ہے، اور اس نقطۂ وقت کی منطق اس کی اصل منطق ہوتی ہے۔ نیا شاعر ہر اس اسلوب اور طرزِ اظہار کو روایتی سمجھتا ہے جو تمیم emotionalism کو راہ دے۔ اسی وجہ سے نیا شاعر سڈول، ڈھلی ڈھلائی، سلیس شاعری کا مخالف ہے۔ اس کا طرزِ اظہار لامحالہ کچھ کھردرا اور غیر متوقع ہوتا ہے۔ نیا شاعر "سنجیدگی" اور "طنز" کے فرق کو تسلیم نہیں کرتا۔ وہ بیک وقت ایک ہی بات کو "طنزیہ" اور "سنجیدہ" لہجے میں کہہ سکتا ہے اور کہتا ہے۔

فن کی خارجی حیثیت سے دیکھیں تو اردو کا نیا شاعر ابھی خاصا پس ماندہ اور کم ہمت ہے کیوں کہ وہ زیادہ تر روایتی بحر و آہنگ کے جال میں گرفتار ہے۔ اصولی حیثیت سے نئے شاعر کو عروض و آہنگ کے ایک بہت زیادہ لچک دار اور متنوع ڈھانچے کی ضرورت ہے، اور وہ اس ضرورت کو تسلیم بھی کرتا ہے، لیکن ابھی جراءت تجربہ ذرا کم ہے۔ نئے شاعر کا نظریہ مغربی ہیئت کے بارے میں یہ ہے کہ قدیم ہیئت جدید حالات کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ اور اس نظریہ پر خفا ہونے کی ضرورت نہیں کیوں کہ بیسویں صدی کے اردو ادب کی بہت سی ہیئتیں جواب روایتی ہو جانے کی حد تک معروف ہو گئی ہیں (مثلاً معرا اور آزاد نظم) اسی لئے اپنائی گئی تھیں کہ مروجہ ہیئتیں ناکافی تھیں۔ ان کے اپنائے جانے پر بھی بہت واویلا ہوا، اسی طرح عروض کے لچک دار ڈھانچے اور مختلف الوزن مصرعوں کی وکالت کرنے والوں پر بھی بہت لے دے ہوگی لیکن حقیقت، حقیقت ہی رہتی ہے۔ آج کے دور نے جو شدت انتشار اور خوف و محزونی ہم پر مسلط کر دی ہے اس کے مفصل اور سچے اظہار کے لئے اکھڑی اکھڑی ہیئت خود ایک اچھے اور روشن Objective Correlative کا کام دے سکتی ہے۔ اس کے علاوہ پرانے لب و لہجہ کا طلسم ہر عہد میں کسی نہ کسی طرح توڑا گیا ہے، اس عہد میں اس طرح سہی۔

یہ سوال کہ کیا نئی شاعری ترقی پسند شاعری سے مختلف ہے اور کیا یہ ترقی پسند شاعری سے آگے ہے؟ کچھ عجیب سا سوال ہے۔ مختلف تو ہوگی ہی، کیوں کہ نئی شاعری کے محرکات اور اس کے طلاق مختلف ہیں۔ آگے اور پیچھے کا سوال نئے شاعر کو تنگ نہیں کرتا۔ نئی شاعری زمانی اعتبار سے تو آگے ہے ہی، کیوں کہ اب کی شاعری ہے۔ لیکن آگے کا مفہوم اگر "بلند تر" ہے تو نئے شاعر کو اس سے کوئی واسطہ نہیں۔ ترقی پسند شاعری آج کے دور میں بے معنی ہے "نئی شاعری" غالباً کل کے دور میں بے معنی ہوگی۔ بڑے اور چھوٹے شاعر کا سوال ہی نہیں اٹھتا؛ یہ کوئی محمد علی کلے اور سانی لسٹن کی بازی کا مقابلہ نہیں ہے۔ ہر دور کے کچھ ہی شاعر زندہ رہ پاتے ہیں، ترقی پسند دور کے بھی کچھ شاعر زندہ رہیں گے، کچھ نئے شاعر بھی زندہ رہیں گے — بس۔

یہ سوال البتہ پوچھنے کا تھا کہ کیا نئی شاعری ترقی پسند شاعری کے خلاف ایک ردعمل ہے، جس طرح فرانس کی تمثیلیت پسندی بودلیئر ورلین وغیرہ کی نظر میں انیسویں صدی کی گاڑھی رومانیت (ہیوگو وغیرہ) کے خلاف ردعمل تھی؟ میرے خیال میں اس سوال کا جواب ایک حد تک اثبات میں ہے۔ ترقی پسندوں کی تبلیغی اور مقصدی شاعری اور نیم مردانہ decadence رومانیت کا بوجھ کب تک اٹھایا جاتا؟

(۲) کوئی آدرش یا تصور اپنے وقت میں مضحکہ خیز نہیں ہوتا۔ اور جو آدرش اور تصورات بے نیاز وقت **Timeless** ہوتے ہیں وہ کبھی مضحکہ انگیز اور فرسودہ نہیں ہوتے۔ انسان دوستی پر کب کون ہنس سکا ہے؟ دیو جانس بھی نہیں۔ ہاں بہت سے وقتی آدرش اور محرکات اپنے زمانے کے بعد اپنی قدر و قیمت کھو دیتے ہیں۔ ۱۹۴۷ء سے پہلے جنگ آزادی اور جد و جہد آزادی کے آدرش کے کیا معنی رہ گئے؟ کچھ بھی نہیں۔ نئی شاعری کے پہلے اردو شعرا کے سامنے جو بھی اعلیٰ اور رومانی تصورات تھے انہیں شاعر کو اچھے لگتے ہیں یہ اور بات ہے کہ خود اسے اپنی زندگی اور شخصیت کے تاب و تب میں آدرش پرستی کی فرصت نہ ہو۔ ہاں نئے شاعر کو وہ آدرش ضرور مضحکہ خیز لگتے ہیں جنھیں اقبال نے نوابیگی کے چون چرا بنائے ہوئے مسکرات کہا تھا، اور وہ آدرش بھی مضحکہ خیز لگتے ہیں مثلاً **Stalinism** جن پر ایمان رکھنا کبھی تو باعث مغفرت ہوا اور کبھی موجب آتش زنی۔

(۳) جناب! شاعر کوئی پیغمبر یا قطب وقت نہیں ہوتا کہ وہ لمحہ بہ لمحہ وسیع تر ہوتے ہوئے... پس منظر کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے عصری شعور و احساس کی ذمہ داری کے ساتھ نمائندگی کر سکے۔ ایسا تو شیکسپیئر بھی نہیں کر سکا، ہم آپ کس گنتی میں ہیں۔ شیکسپیئر ہی کے ہم عصروں میں مارلو جیسا مادہ پرست اور جانسن جیسا عقلیت پرست بھی تھا۔ لیکن یہ تینوں اپنے عہد کے مختلف شعور و احساس کی نمائندگی کرتے ہیں۔ یا یوں کہہ لیجئے کہ کسی عہد کا ذہن و شعور کوئی ایک ہلکی پھلکی اکائی نہیں ہوتا کہ کوئی ایک فرد واحد یا ذہن واحد اس کا احاطہ کر سکے۔ حدیث قدسی میں بڑی گہری بات کہی گئی ہے کہ زمانے کو برا مت کہو، زمانہ خود میں ہوں۔ اس وسیع الشان، غیر مختتم، چکرا دینے والی پیچیدگی اور بوقلمونی کا ادراک و اظہار کوئی ایک ذہن نہیں کر سکتا۔ شاید ہزاروں ذہن بھی مل کر نہیں کر سکتے۔ ہاں ایک بات ممکن ہے کہ کسی عہد کا شاعر اس عہد میں بے جوڑ **anachronistic** یعنی قبل التاریخ یا بعد التاریخ کا شاعر نہ معلوم ہو۔ نیا شاعر "روح عصر" وغیرہ جیسے گول مول تصورات کی نمائندگی نہیں کر سکتا، لیکن اس کا لب و لہجہ، اس کا طرز فکر اور طرز اظہار، اور خاص کر اس کے موضوعات یقیناً بدلتے ہوئے ذہنی علمی معاشرتی اور نفسیاتی افق کی نشان دہی کرتے ہیں۔ یہ بات بالکل صحیح ہے اور بار بار دہرائی جانے کے قابل ہے کہ نئی شاعری ہی اس عہد کا محاورہ، اس عہد کا طرز اظہار اور اس عہد کی زبان ہے۔ آج اگر آپ بھی پالکی لُم لُم پر بیٹھنا بے وقوفی سمجھتے ہیں تو آج غالب اقبال جوش اور فیض کے رنگ کی شاعری کرنا معیوب کیوں نہیں سمجھتے؟

(۴) شاعری کے لیے مجرد اظہار کافی نہیں، لیکن مکمل وضاحت اور ابلاغ کی بھی ضرورت نہیں۔ نیا شاعر نیم روشنی یعنی **Translucence** کا قائل ہے۔ اس کا نظریۂ فن ارادی ابہام کو اہم ترین درجہ دیتا ہے، کیونکہ ابہام مختلف النوع تصورات، انسلاکات **Association** اور امکانات کو راہ دے کر الفاظ میں ایک ڈرامائی تناؤ پیدا کرتا ہے جس سے شعر کے معنی کو حیاتیاتی زندگی ملتی ہے۔ "معنی" سے نیا شاعر وہ ذہنی کیفیات ہی مراد لیتا ہے جو شعر سے پیوستہ ہوتی ہیں۔ نئے شاعر کی نظر میں معنی کوئی علیحدہ چیز نہیں جسے شعر پر لادا یا جا سکے، بلکہ معنی کو شعر سے الگ نہیں کیا جا سکتا اس لئے اسے موضوع ہی کہہ سکتے ہیں۔ نیم روشنی جس طرح مختلف النوع امکانات کو راہ اور فروغ دیتی ہے اس کو سمجھنے کے لئے مندرجہ ذیل اشعار کا حوالہ کافی ہے۔

مکمل ابلاغ

۱۔ توڑ کر عہد کرم ناآشنا ہو جائیے — بندہ پرور جائیے اچھا خفا ہو جائیے
۲۔ عمر برق و شرار ہے دنیا — کتنی ناپائدار ہے دنیا
۳۔ کسی کو دے کے دل کوئی نواسنج فغاں کیوں ہو — نہ ہو جب دل ہی سینے میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو
۴۔ میراں نیم باز آنکھوں میں — ساری مستی شراب کی سی ہے

نیم روشن ابلاغ

۱۔ میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسدؔ — سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

۲۔ ناحق ہم مجبوروں پر تہمت ہے مختاری کی — جو چاہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

۳۔ عشق ہی عشق ہے جدھر دیکھو — سارے عالم میں بھر رہا ہے عشق

۴۔ تری کف خاکستر بلبل قفس رنگ — اے نالہ نشان جگر سوختہ کیا ہے

یہ بات فوراً صاف ہو جاتی ہے کہ اگرچہ دوسرے اقتباس کے اشعار میں فکر و خیال کی کوئی خاص گہرائی نہیں ہے لیکن ابہام کی وجہ سے ہر شعر میں جمالیاتی اور معنیاتی امکانات اور وسعتیں پیدا ہو گئی ہیں اور پہلے اقتباس میں یہ باتیں مفقود ہیں۔ میں نے جان بوجھ کر سادہ اشعار نقل کیے ہیں ورنہ غالب (اور کبھی کبھی میر) و اقبال کے بہت سے بہتر اشعار میں ابہام کے پیدا کردہ ڈرامائی تناؤ کی اعلیٰ مثالیں ملتی ہیں۔ ہمارے یہاں نئے شاعروں پر ابہام کے جو الزامات لگائے جا رہے ہیں ان کی وقعت زیادہ سے زیادہ ان اعتراضات کی ہے جو غالب پر کیے گئے تھے۔ اگر ابہام اس وجہ سے پیدا ہوتا ہے کہ شاعر اپنی بات موثر طریقے سے کہنے سے قاصر ہے یا جان بوجھ کر محض عقلی گدا رکھنا چاہتا ہے تو یقیناً ابہام پر اعتراض وارد ہو سکتا ہے (اور بس ایک حد تک)۔ لیکن نئے شاعر کا ابہام ارادی اور معنی خیز ہے۔ اس کے علاوہ نیا شاعر اس حقیقت سے پوری طرح واقف ہے کہ کوئی بھی خیال مکمل ابلاغ پا جانے کے بعد خیال نہیں رہ جاتا۔ دوسرے الفاظ میں خیال مکمل ابلاغ کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ خیال سے مراد شعری خیال ہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ روزمرہ کے عام فہم platitude کا ابلاغ تو ممکن ہی ہے۔ اور ہماری شاعری اس طرح کے گھسے فقروں (cliches) سے بھری پڑی ہے۔

ایک بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔ لوگ نئے شاعروں سے ابلاغ و اظہار کی اتنی بحث کیوں لگاتے ہیں؟ شیکسپیر کے آخری دور کے ڈراموں کے بارے میں دنیا کہتی ہے کہ جگہ جگہ الفاظ خیال کا ساتھ نہیں دے پائے ہیں۔ آخری دور کے ڈراموں کو چھوڑیے، اول دور ہی میں شیکسپیر کے یہاں کون ایسا مفصل ابلاغ رونما ہو گیا؟ رومیو جولیٹ سے لے کر میکبتھ تک ہر ڈرامے کی ہزار تشریحیں اور تفسیریں کیا معنی رکھتی ہیں؟ کون کہتا ہے کہ ملٹن کا تصور خدا، شیطان و آدم سمجھنا بائیں ہاتھ کا کھیل ہے؟ دیوان غالب کی شرحوں پر شرحیں کیوں لکھی جا رہی ہیں؟ عرفی اور خاقانی کا کلام کس کی سمجھ میں بلا غور و فکر کے آ گیا؟ (اور اکثر تو غور و فکر کے ساتھ استاد کی مدد بھی لینی پڑی۔) سوفکلیز اور ڈانٹے کو کس نے یوں ہی سمجھ لیا جس طرح کریما بہ بخشائے برحال ما سمجھی جاتی ہے؟ اور کریما کو بھی سمجھ لینا کوئی آسان بات ہے کیا؟ ایلیٹ اور ییٹس کے کلام کی شرحیں دیکھ کر اور بلیک کی نظموں کی معنوی پیچیدگی کا سامنا کرنے پر کوئی طعن و تشنیع کے تیر و تبر سنبھال کر میدان وغا میں کیوں نہیں کود پڑتا؟ اگر ایسا ہے تو نئے شاعر کو آپ کیوں گردن زدنی ٹھہراتے ہیں؟ شاید اس لیے کہ شیکسپیر اور غالب اور عرفی اور سور داس اور ایلیٹ کی عظمت مسلم ہو چکی ہے۔ اور وہ ہم سے دور تاریخ کی دھند میں لپٹے اپنے سر اٹھائے آسمان سے باتیں کر رہے ہیں اور نئے شاعر کو آپ چھینکتے کھانستے پیشاب کرتے روٹی روزی کی فکر کرتے دیکھ سکتے ہیں

اور سوچتے ہیں کہ یہ تو ہماری ہی طرح کا من الخطا والنسیان ہے، اس میں دیوتا کی صفات کہاں سے آ سکتی ہیں؟ میں یہ نہیں کہتا کہ نئے شاعر شیکسپیر اور غالب ہیں۔ میں صرف یہ کہتا ہوں کہ وہ بھی شاعر ہیں اور آپ سے توقع رکھتے ہیں کہ آپ ان کا کلام شعر کی طرح پڑھیں، اردو کی پہلی کتاب کی طرح نہیں۔ میں مانتا ہوں کہ چونکہ نیا شاعر ارادی ابہام کا قائل ہے (اور اگر نہیں ہے تو اسے ہونا چاہیے) اس لیے اس کا کلام پڑھتے وقت ذہن پر تھوڑا سا زور دینا پڑتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کہیں کہیں بات پوری طرح سمجھ میں نہ آئے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ جو سمجھ میں نہ آئے وہ شعر نہیں۔ میں اوپر واضح کر چکا ہوں کہ ابہام اور غیر قطعیت indeterminacy سے شعر کے معنوی حسن میں (اور اکثر ظاہری حسن میں بھی) اضافہ ہوتا ہے۔ اگر آپ ابہام کو مقصد نہیں بلکہ ذریعہ سمجھ کر دیکھیں تو بات بہت حد تک صاف ہو جائے گی۔

ایک بات اور۔ میں نے ایلیٹ پر اپنے مضمون میں ریوڈس کا قول نقل کیا تھا اور اسے یہاں دہراتا ہوں۔ ہر شاعر کو حق ہے کہ وہ اپنے قاری سے محنت، ریاضت اور غور و فکر کا مطالبہ کرے۔ اور ہر قاری کا حق ہے کہ اس ریاض و فکر کے صلہ میں شاعر سے قرار واقعی جمالیاتی یا فکری تسکین کا مطالبہ کرے۔ مگر قاری حسب دل خواہ ریاض کرنے پر قادر نہیں ہے تو اسے شعر پڑھنے کی ضرورت نہیں، اور اگر شاعر اس ریاض کے بدلے کچھ دینے کا اہل نہیں ہے تو اسے شعر کہنے کی ضرورت نہیں۔

جدید شعرا نے اپنا مافی الضمیر قاری تک پہونچانے کی کوشش کی ہے اور ضرور کی ہے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو وہ اپنا کلام رسالوں اور کتابوں میں کیوں شائع کراتے ہیں؟ ذہنی تن آسانی کے مجرم شعرا نے ضرور جدید شاعری کو آسان سمجھ کر ردیف و قافیہ اور معنی و مطلب کے قیود و بند سے آزاد ہونے کی کوشش کی ہے، لیکن ایسوں کو میں کیا شاعر کیا، شاعر ہی نہیں مانتا۔ لیکن عام طور پر نئے شاعر نے اپنی بات ڈھنگ سے اور سنجیدگی سے کہنے کی کوشش کی ہے۔ افسوس یہ ہے کہ نقادوں نے اور قارئین کرام نے روایت کو قرآن و حدیث سمجھ کر نئے شاعر پر بادتراد کی حد قائم کر دی اور اسے سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش نہیں کی۔ شیکسپیر کے محاسن کب واضح ہوئے؟ جب نقادوں نے اس پر ریاض کیا۔ ہر ایک کو کھوٹے اور کھرے کی پرکھ نہیں ہوتی۔ نقاد قاری کو محاسن اور معائب سے آگاہ کرتے ہیں اور پرکھنے کے ڈھنگ بتاتے ہیں اور ان کے ذوق کی تربیت کرتے ہیں۔ میرے سامنے ایک کتاب ہے جس میں احتشام حسین سے لے کر شارب ردولوی تک کے تنقیدی مضامین کا انتخاب ہے ایک بھی مضمون نئے ادب کے بارے میں نہیں۔ مانا کہ انتخاب مرتب کرنے والے کے بھی کچھ تعصبات ہوں گے، مگر ایسا تو ممکن نہیں ہے کہ تنقید کا ایک اہم حصہ نئے ادب کے بارے میں ہو اور وہ پورا پورا نظر انداز کر دیا جائے؟ جی نہیں۔ ہماری تنقید کا ایک بہت ہی چھوٹا اور غیر اہم حصہ نئے ادب کے بارے میں ہے۔ ہم حسرت موہانی اور جگر مراد آبادی اور اصغر اور فانی پر تو ہزارہا صفحات سیاہ کر سکتے ہیں لیکن ہمارے گرد و پیش جو ہو رہا ہے اس کا حق ادا کرنے کے لئے چند کتابوں پر مروتاً یا مجبوراً یا اخلاقاً چند لفظ یا تبصرہ لکھ دیتے ہیں۔ پانچ سو صفحے کی تنقیدی کتاب میں پانچ صفحے بھی نئے ادب کے بارے میں نہیں ملتے۔

اس کی ذمہ داری ایک حد تک نئے شعرا پر بھی ہے۔ انھوں نے شعر خوانی تو بہت کی لیکن اپنے اشعار کے حدودِ اربعہ بتانے سے پہلو بچاتے رہے۔ نئی نسل میں اب تک کوئی قد آور نقاد نہیں پیدا ہو سکا ہے۔ اور شاعروں نے کچھ تو کاہلی اور کچھ پوشیدہ احساس کم تری کی وجہ سے زیادہ تر "شعر میں کہتا ہوں سمجھے تم کرو" والا رویہ اختیار کر رکھا ہے۔ یہ صورت حال نئی شاعری کے لئے بہت مضر ہے۔ ترقی پسند ادیبوں کو بڑھاوا دینے میں ان کے نقادوں کا بھی بہت بڑا ہاتھ تھا۔ انھوں نے اپنے ادیبوں کو فلم اسٹاروں کی طرح glamorous اور ان کے ادب کو دیوتاؤں کی طرح مقدس اور مکمل بنا کر پیش کیا۔ عصمت، بیدی، منٹو، قاسمی، جذبی، جعفری، کرشن چندر، حتیٰ کہ مجاز جیسے چھٹ بھیوں کی بھی تعریف میں قصیدہ نما مضامین اور کتابیں لکھی گئیں، ان کی تصویریں اور عکسی تحریریں شائع ہوئیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ میں نہیں کہتا کہ ہم بھی اپنی نسل کے بارے میں وہی dramatisation کا رویہ اختیار کریں اور قاری کو مرعوب و مسحور کریں۔ ایک تو اب قاری بھی پہلے کی طرح سادہ لوح نہیں رہ گیا ہے کہ اپنے محبوب ادیبوں اور شاعروں کے تکلفی پینے، شراب نوشی، مزدور دوستی، آزاد خیالی، بلند فکری، اعلیٰ ادیبانہ صلاحیتوں اور منفرد انداز نظر و تحریر کے بارے میں افسانوں کو لپ لپ کر کے پی جائے اور دوسرے ہماری قریب شکستہ نسل کو شاید اس طرح کا DRAMATISATION کچھ بہت سجتا نہیں۔ لیکن سنجیدہ تنقید و توضیح و تشریح بلکہ سنجیدہ عیب جوئی میں بھی کوئی برائی نہیں۔ نئے ادب کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ اس کے پاس سنجیدہ نقادوں کی کمی ہے۔

۵. اس فہرست میں صرف ہندستانی شاعر ہیں اور تقدم و تقدیم کا کوئی خیال نہیں رکھا گیا ہے۔ براج کومل، عمیق حنفی، محمد علوی، وحید اختر، شہریار، عادل منصوری، کمار پاشی، زبیر رضوی، ندا فاضلی، باقر مہدی، محمد ایاز، فضیل جعفری، شاذ تمکنت، فضل تابش،

پرکاش فکری، صادق مولی وغیرہ۔

۶۔ نصاب تعلیم سے مراد اگر شعرا کا نصاب میں داخلہ اور کلاس روم میں ان کا تفصیلی مطالعہ ہے تو میرے خیال میں ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ نئے شاعر کا کلام درسی کتابوں میں رکھا جائے۔ ہاں تاریخ و تنقید ادب کے مطالعہ میں نئے شعرا اور نئے اسالیب کو اہمیت دینے کی سخت ضرورت ہے۔ اس وقت ہمارے بی اے اور ایم اے کے طالب علم بھی نئے رجحانات سے تقریباً بے بہرہ ہیں۔ لیکن سب سے زیادہ ضرورت معلمانہ اور تدریسی انداز نظر کو یک قلم مسترد کر دینے کی ہے۔ آج بھی کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ شعر و ادب پر گفتگو کرنے کا حق انہی لوگوں کو ہے جن کے پاس ایم اے یا پی ایچ ڈی کی ڈگری ہو۔ (چاہے پی ایچ ڈی کی ڈگری اختر شیرانی جیسے فرومایہ شاعر کے حالات زندگی ہی لکھ کر کیوں نہ لی ہو) اردو ادب، تنقید پر علموں کا راج بہت دن رہا ہے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ ہم علم کے بجائے عالم اور مدرس کے بجائے عارف کی قدر کریں۔ نئے شعر کا عرفان ایم اے کی ڈگری یا نصاب کی کتابوں سے نہیں بلکہ زندگی اور ادب کے بدلے ہوئے رخ کے اعتراف و احترام سے حاصل ہو سکتا ہے۔

بشیر بدر

مجھے صرف جدید غزل پر بات کرنی چاہئے۔

اس لئے کہ ادبی کار تخلیق میں، میں نے اور کیا بھی کیا ہے، اور اس لئے بھی کہ گزشتہ دو سال سے میں اپنا مقالہ "جدید غزل" لکھ رہا تھا۔ ان دونوں غزل اور جدید غزل کے ساتھ میرا رویہ بے طور طالب علمانہ رہا ہے اردو نظمیں، میں نے انگریزی نظموں اور کہانیوں کی طرح صرف اپنے ذوق کی آسودگی کے لئے پڑھی ہیں انہیں کافی مجھے اچھی لگیں۔ کچھ سمجھ میں آتے آتے رہ گئیں، کچھ سرے ہی سے روٹھی رہیں۔ میں نے کبھی ان کا زیادہ پیچھا نہیں کیا۔ اور یہی غیر طالب علمانہ انداز مطالعہ مجھے نئی نظم کا طالب علم نہیں بلکہ ایک نیم مخلص ناظر بناتا ہے۔ اس لئے میں نئی نظم پر رائے دینے کے قابل نہیں۔ لیکن آج کی غزل کا شاعر ہونے کے لئے زندگی کے ساتھ ساتھ اپنے قدیم و جدید ادبی سرمائے (جس میں جدید نظمیں بھی شامل ہیں) ملکی اور غیر ملکی ادبی رجحانات کی واقفیت ناگزیر ہے۔

جدید غزل وہی ہے جس میں آج کے انسان کے احساسات ہوں۔ آج کی زندگی کی خوشی، محبت، فکر، آرزو اور یادوں کی سب سے تیز رفتار جھلک غزل کے شعر میں ٹھہر جائے۔ آپ کے اشعار تین ہزار سال پہلے کے ماضی سے لطف اندوز ہوں، یا آنے والی صدیوں میں دنیا کے مستقبل سے فکرمند یا مطمئن ہوں۔ سوال صرف اتنا ہے کہ آج سے سلسلہ د ٹوٹے۔ تین ہزار سال پہلے کے انسان نے اپنے دور کی زندگی کا پاکیزہ نغمہ جب گنگا کی موجوں کی لے پر گایا تھا۔ اور آج کا انسان تصور اور تاریخی یادداشت کے سہارے اس پرسکون ماحول میں جب خود کو لے جائے گا۔ تو ضرور فرق ہوگا۔ وہی فرق جو حقیقت اور بھولی بسری یادوں میں ہوتا ہے۔ آج ہم ورڈسورتھ کی طرح نیچر میں کھو جانے کی صرف تمنا ہی کر سکتے ہیں، ان کی شاعری کی تازگی سے کچھ دیر کو تازہ ہو سکتے ہیں لیکن نہ تو ان کی طرح نیچر کو ہر دکھ کا علاج مان سکتے ہیں اور نہ ہی ویسی سچی شاعری، نیچر کی محبت اور عقیدت میں کر سکتے ہیں (یہاں ہم سے مراد وہ شاعر ہیں جو انگلینڈ میں پیدا ہوئے ہیں اور انگریزی بان جن کا وسیلہ اظہار ہے) اس لئے تین سو سال پہلے کے انسان کے جو احساسات، آج کے انسان میں ہو بہو پائے جاتے ہیں، وہی شباہت ہمیں تین سو سال کی سچی غزل اور آج کی سچی غزل میں مل بھی سکتی ہے اور جہاں جہاں زندگی کے تجربات اور احساسات یکسر بدل گئے ہیں وہاں قدیم غزل اور جدید غزل میں بعید واضح فرق صاف نظر آنا چاہئے۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] ISMS [illegible]

[illegible] ISLAMISM [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] MODERN AGE

[illegible] ELIZABETHIAN AGE, VICTORIAN AGE, ROMANTIC AGE

CLASSIC AGE, RESTORATION AGE, PURITAN [illegible]

[illegible] SOX [illegible]

[illegible]

[illegible]

چلا جاتا ہے گا۔ خواہ وہ modernism ہی کیوں نہ ہو اس کا انجام یہی ہوگا۔ اس لئے نئی شاعری کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ وہ نئی ہو۔ نئے انسان کے احساسات کی شاعری ہو مگر اس میں نئی شاعری کا فارمولا یا مینفسٹو نہ منظوم ہو۔

اچھی شاعری کے لیے کبھی کسی فارم کی قید نہیں لگ سکی۔ جدید شاعری بھی کسی فارم کی حراست میں نہیں، کوئی بھی صحیح العقل اس بات پر اصرار نہیں کرے گا کہ جدید شاعری صرف غزل، یا بند نظم، آزاد نظم، نثری نظم، قطعہ، رباعی، مسدس، مثنوی یا کسی مخصوص صنف میں ہی ہو سکتی ہے۔ فکر و احساس جدید ہوں، نئی زندگی سے واسطہ ہو، اس کے دکھ سکھ، فکر و آرزو کی خبر ہو تو قدیم فارم میں جدید شاعری ہو سکتی ہے۔ برخلاف اس کے دل و دماغ قدیم و فرسودہ ہوں تو جدید ترین عجوبہ فارم بھلے ہی ڈھونڈھا جا سکتا ہے۔ مگر اس میں عصر جدید کی روح کہاں سے آئے گی۔ فارم کی لکیر کا فقیر ہونا یا نت نئے فارم کا صرف کرتب دکھانا۔ جدید شاعری نہیں۔

اچھی غزل میں اس کا عہد ہمیشہ محسوس ہوا ہے اور آج بھی محسوس ہوتا ہے، ہمیشہ کی طرح اچھی غزل آج بھی مشکل ہے۔ پوری فنکاری اور خوبصورتی سے کب، اور کون سا کام آسان رہا ہے!۔ اچھا یا بُرا فن لاکھوں کرتے ہیں تب ایک آدھ فنکار ہوتا ہے۔

شاعری اور خاص طور پر غزل کی شاعری کو تیسرے اور چوتھے درجے کے ذہن سے ہمیشہ رسوائی ملی۔ اکثر ان کی بیہودہ، تقلیدی غزلوں سے، اور کبھی کبھی ان کی نام نہاد انفرادیت سے جس میں وہ صنف غزل ہی کو گالی دینے لگتے ہیں۔ سو یہ عالم آج بھی ہے۔ ..... غزل کو گالی ہمیشہ گھٹیا ذہن دے گا۔

آج بھی نثر میں ڈاکٹر اعجاز اور آل احمد سرور سے لے کر احراز نقوی تک، کہانی میں ممتاز شیریں سے لے کر رفعت نواز تک، شاعری میں فراق و فیض سے لے کر امیر عارفی تک، غزل کی اہمیت کا منکر، کوئی نہیں۔

ساری دنیا جو کچھ شدید ہوتا ہے اس کا عکس ہلکا یا گہرا ہر ملک کے ادب پر پڑتا ہے۔ انگلستان کے اینگری ینگ مین، یا امریکہ کے بیٹنکس کے غم میں ہم شریک ہیں۔ اس لئے کہ ان کا مسئلہ بھی انسانی مسئلہ ہے۔ لیکن ان کے اس غم اور مسئلے اور ہمارے نمائندہ غم اور مسئلے میں بہت فرق ہے۔ ہماری اُداسی اور مصیبت پیٹ کی بھوک کپڑا اور مکان بھی ہیں۔ ان کے مسائل بھی زیادہ شدید ہیں۔

چھ سات سال میں سیکس کا بیدار اور رواں ہو جانا۔ جوانی آتے آتے abnormal یا impotent ہو جانا۔ (جی ہاں مغرب کا بیشتر نوجوان واقعی IMPOTENCY یا کم از کم PSYCHOLOGICAL IMPOTENCY کا، اور لڑکیاں بچپن ہی سے SEXUAL ABNORMATITY کا شکار ہیں۔ سائمن دی بوئیر کی کتاب SECONDSEX یا دیگر مغربی مفکروں کی چیزوں سے اس کی تصدیق ہو سکتی ہے) ان کی تنہائی اور ہماری تنہائی میں بھی فرق ہے۔ ذرا سوچئے جب انسان یقین سے اپنے باپ کو باپ نہ کہہ سکے، اپنی اولاد کو اولاد نہ کہہ سکے، جہاں مریم بھی مشرقی بیوی یا محبوبہ کا اعتماد نہ پائے۔ وہاں تنہائی کتنی شدید ہوگی۔ ویسے تو یہ انتہائی رجعت پسند باتیں ہیں مگر انسان ہزاروں سال کی روایت کا نیا روپ ہوتا ہے۔ روایت سے آپ اسے بالکل الگ کر دیں تو وہ اپنی اداسی اور تنہائی کا نام تک نہ جان سکے گا۔

اس لئے یہ ملنگے کی اُداسی، تنہائی اور غصہ ہمارا وصف نہیں، ..... ہماری اداسی تنہائی اور غصہ جن حالات کے پیداوار ہیں انھیں آپ جاننا چاہیں تو خود میں جھانکیں۔ کنواں بول اٹھے گا۔

نئی غزل زندگی کی کم از کم ہزار سالہ، اور اردو کی تین سو سالہ روایت کی چند سالہ جدت ہے۔ جیسے ایک بچے کی کمسنی میں زندگی کے ہزاروں سال کی روایت اور اس کی مادری زبان کی کئی سو سال کی روایت ہوتی ہے۔ محسوس کیجئے کہ اس بچے کی ہر لمحہ صاف اور واضح ہوتی ہوئی تتلاہٹ میں کتنی قوت، تجربہ کا نیاپن، حیرت اور تازگی ہوتی ہے۔ بالکل یہی روایت کی جدت نئی غزل کی خصوصیت ہے۔ یہ اکتسابی نہیں۔ فطری ہے۔

[illegible]

[illegible]

"آہ۔ آہ۔ واہ۔ واہ۔ حضرت یہ آپ کہاں تھے۔" یہ کہہ کر مجذوب نے اس گرمجوشی سے مصافحہ کیا جیسے میرے لئے وہ سراپا اشتیاق تھے ممکن ہے وہ لکھنؤ میں میرا ذکر سن چکے ہوں۔

میں مجذوب کی شخصیت اور مستی سے بیحد متاثر ہوا۔ میں نے کہا میں خود آپ کو تلاش کر رہا تھا۔ یہ میری خوش قسمتی کہ آپ میرے ہی وطن میں مجھے مل گئے ؎

رواقِ منظرِ چشم من آشیانۂ تست
کرم نما و فرود آ کہ خانہ خانۂ تست

خواجہ حافظ کے اس پُر وجد مطلع نے مجذوب پر بادۂ دو آتشہ کا کام کیا۔ وہ بار بار اس مطلع کو اپنے مخصوص لحن میں پڑھتے رہے۔ اس کے بعد اسی مستی کے عالم میں (غالباً) اپنی یہ غزل شروع کی ؎

بحرِ خوں کی تہہ نظر آتی ہے ساحل سے مجھے
موت ہے یعنی گزرنا کوئے قاتل سے مجھے
آ رہی ہے سوئے گورستاں ہوائے جانفزا
پھر بلا دے آ رہے ہیں کوئے قاتل سے مجھے

اس غزل کے درمیان کچھ اور حضرات بھی آ گئے۔ بیٹھنے کا ہوش کسے؟ صحن میں کھڑے ہوئے مجذوب اپنا کلام سنا رہے تھے اور سامعین جھوم رہے تھے۔ ایک غزل کے بعد دوسری ہوئی اور دوسری کے بعد تیسری۔ مجذوب کو اپنا [illegible] کلام زبانی یاد تھا۔ میں نے شعر خوانی میں انھیں کبھی کسی بیاض کا سہارا لیتے نہ دیکھا۔ حالانکہ انکی غزلیں بیحد طویل ہوتی تھیں۔

ہم لوگ شعر پر شعر اور غزل پہ غزل سن رہے تھے۔ لیکن کیا مجال کہ سننے والوں میں کہیں سے بر داشتہ خاطری پیدا ہو۔ "از دل خیزد۔ بر دل ریزد۔" مجذوب کے اشعار ان کے دل کے بے تصنع آواز تھے اور سننے والوں پر جادو کر رہے تھے۔ شاید گھنٹہ بھر یہ شعر خوانی ہوتی رہی۔ دفعتاً مغرب کی اذان نے اس طلسم وجدان کو توڑ دیا اور مجذوب مع دوسرے نمازیوں کے مسجد کی طرف بھاگے۔ میں نے ان سے وعدہ لیا کہ یہ ناتمام ادبی صحبت کل میرے گھر پر جاری ہوگی۔ مجذوب تو مسجد میں پہونچ گئے اور میں بڑی دیر تک سناٹے کے عالم میں وہیں کھڑا رہا۔ ہماری پہلی ملاقات کتنی عجیب تھی اس ملاقات کے تاثرات آجتک میرے ذہن سے محو نہیں ہو سکے ہیں۔

دوسرے دن میں نے بعض مقامی ادب دوستوں کو اپنے یہاں مدعو کر دیا۔ وقت پر مجذوب بھی آ گئے۔ کھانے کے بعد تقریباً دس بجے شعر خوانی شروع ہوئی۔ بس مجذوب تھے اور سامعین۔ پوری رات بارش بارانِ شعر میں گزر گئی۔ ہوش اس وقت آیا جب فجر کی اذان ہوئی۔ مجذوب اٹھ پڑے۔ لیکن اس طرح کہ میرا بازو پکڑے شعر سناتے مسجد کی طرف جا رہے تھے اور نمازی داد دیتے ہوئے ہمارے ساتھ تھے۔ میں نے اپنی تمام عمر میں ایسا کوئی شاعر نہیں دیکھا جو صرف اپنے شعر مسلسل سنا کر حاضرین کو بھرپور کشش کے ساتھ رات بھر روکے رکھے۔

مجذوب اسکولوں کے معائنے کے سلسلے میں دو تین دن سیتاپور ٹھہرے اور میرا کافی وقت ان کے ساتھ گزرا۔ اب جا کر مجھے معلوم ہوا کہ وہ حکیم کرم حسین کے مرشد مولانا اشرف علی تھانوی کے خلیفہ ہیں اور مولانا موصوف انکو اپنا امیر خسرو کہتے ہیں۔

اس کے باوجود مجذوب سے میرے مراسم کافی بڑھ گئے۔ میں اُن سے اکثر لکھنؤ میں بھی ملتا رہتا تھا۔ لیکن وہ جب سیتاپور آتے تو ایک رات میرے یہاں شعر خوانی ضرور ہوتی۔ میں ۱۹۳۶ء میں بمبئی آیا۔ اس وقت تک یہ سلسلہ برابر جاری رہا۔

مذہبی لوگوں میں مجذوب کا بڑا احترام تھا۔ وہ فنا فی الشیخ درجے کے سالک سمجھے جاتے تھے۔ اپنے مرشد سے ان کے والہانہ عشق

کی کہانیاں بڑی دلچسپ ہیں۔ لیکن میں نے اس موضوع پر ان سے کبھی کوئی گفتگو نہیں کی۔ نہ خود مجذوب نے کار تبلیغ انجام دینے کی کوشش کی۔ ہمارے روابط شعر و ادب یا بعض نجی معاملات تک محدود تھے۔

یہ سچ ہے کہ مجذوب میں مذہبی رواداری بے انتہا تھی ـــــ پھر بھی اپنی شاعری سے انھوں نے بعض موقعوں پر جوابی کام بھی لیا ہے۔ ان کی طویل نظم "مسٹر اور مُلّا کی جھڑپ" ان کے ایک ادبی معرکے کی یادگار ہے۔ کسی عام ذہن مغرب زدہ مسٹر نے رسوم اسلام کے خلاف (پانی۔ طولانی۔ پاشانی) کے قافیوں میں ایک نظم کہی تھی جس کا جواب اس زمین میں مجذوب نے دیا ہے۔ زور کلام کے علاوہ اس نظم کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ مجذوب نے اس زمین میں آنے والا کوئی قافیہ باقی نہیں چھوڑا۔ گویا بقول خود مسٹر کا قافیہ تنگ کر دیا۔

مجذوب کہتے تھے کہ نظم مکمل ہو چکی تھی اور مسلسل غور و فکر کے بعد بھی کوئی ایسا قافیہ نظر نہ آتا تھا جو نظم ہونے سے رہ گیا ہو۔ میں نینی تال سے واپس آ رہا تھا کہ ریل کے ڈبے کے سامنے ایک پھل بیچنے والا خوبانی۔ خوبانی کرتا ہوا خوبانی کی ٹوکریاں بیچ رہا تھا۔ میں نے کہا ہت تیرے کی یہ قافیہ تو چھوٹ گیا ـــ بس فوراً ایک شعر خوبانی کے قافیے پر بھی موزوں کر کے نظم میں شامل کر دیا۔"

زور بیان کے اعتبار سے یہ نظم بڑی اچھی تھی۔ لیکن مجذوب کے خیالات سے مجھے مطلق اتفاق نہیں ہے۔

بمبئی آ جانے کے بعد میں نے سنا کہ جوشؔ کی بعض خلاف مذہب نظموں کا جواب مجذوب نے دیا ہے میں نے مجذوب کی یہ نظمیں دیکھی نہیں لیکن بظاہر انکی اہمیت ان کے وقتی غصے سے زیادہ کچھ نہیں ہو سکتی۔ جوشؔ بہر حال جوشؔ ہے۔

مجذوب نے مسلمانوں میں قومی بیداری پیدا کرنے کے لئے کچھ قومی نظمیں بھی کہی تھیں لیکن افسوس ہے اس وقت انکی کوئی نظم میرے پاس موجود نہیں۔

مجذوب کی شخصیت میں سب سے زیادہ نمایاں اُن کی مستی، شرافت اور ذہانت تھی۔ میں انھیں شاعر سے زیادہ مشکل اور مبہم شاعری کہوں گا۔ ان کا شعر، ان کا انوکھا لحن اور ان کی ذات یہ سب مل کر ایک واحد چیز کی تکمیل کرتی تھیں اور ہم اس کو مجذوب کی شاعری کہتے تھے۔ ان کے شعر خود ان کی زبان سے سننے میں جو کیفیت پیدا ہوتی تھی آج اس کا اعادہ ناممکن ہے۔ نہ مطبع کی روشنائی ان کے کلام کا بھرپور تاثر قارئین تک پہونچا سکتی ہے۔ نہ کوئی بہتر سے بہتر ملحن ان کی لحن کی کمی کو پورا کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے وہ ادب پارے جو ان کے عہد میں مہکتے پھول اور دہکتے انگارے تھے آج مرجھا گئے ہیں یا سرد پڑ گئے ہیں۔

اسمیں تو شک نہیں کہ مجذوب اپنے عہد کا ایک بدیہی اعجاز تھے۔ جس مشاعرے میں وہ جاتے مشاعرہ ہمیشہ ان ہی کے ہاتھ رہتا حالانکہ خود ان کو مشاعروں میں کامیابی یا ناکامی کی متعلق پروا نہ تھی۔ لکھنؤ کا وہ مشاعرہ دیکھنے والوں کو کبھی نہ بھولے گا جس میں مجذوب نے یہ غزل پڑھی تھی ؎

بے خودِ شوق یہاں جلوہ گہ ناز میں ہے
طور پر بحث ابھی صورت و آواز میں ہے
ہچکیاں بھی مری سُن لو مرے نالے تو سُنے
ٹھہرو اک نغمہ ابھی اور مرے ساز میں ہے

خصوصاً یہ مقطع پڑھتے وقت تو یہ حالت تھی کہ مجذوب بیچ مشاعرے میں رقص کر رہے تھے اور سارا مشاعرہ ان کے چاروں طرف لوٹ رہا تھا۔

لاکھ اٹھا اب نہیں اٹھتا ہے یہ مجذوب کا سر
سجدہ بھلا ہے ترے در پہ جبیں ناز میں ہے

اس مشاعرے میں سارے اساتذہ یہاں تک کہ مولانا صفی بھی موجود تھے لیکن مجذوب کے بعد کسی کا رنگ نہیں جما۔ مجذوب کے شعر اچھے اور بہت اچھے سہی لیکن یہ معرکہ جیتنے میں بے ریا مستی اور وجد کا کافی ہاتھ تھا۔

اس موقع پر ایک واقعہ لکھ دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ ایکدن بہار کا ایک سادھو میرے پاس آیا جس میں بڑی دلکش مستی تھی۔ اس نے اپنے مخصوص لحن میں میتھلی کے مشہور شاعر ودیا پتی کا کلام سنایا جس سے میں اتنا متاثر ہوا کہ اس وقت ودیا پتی کا مجموعۂ کلام منگوانے کا آرڈر بھیجنے لگا۔ سادھو نے ہنس کر کہا کہ کتاب پڑھ کر آپکو وہ تاثر کیوں کر ملے گا جو ایک یوگی کی آواز نے اسمیں بھر دیا ہے۔ واقعہ بھی یہی ہوا۔ ودیا پتی کا کلام جس وقت میں نے پڑھا تو اسمیں شاعرانہ محاسن کی افراط کے باوجود تاثر کی متوقع شدت نہ تھی۔

سنسکرت دانشوروں کا ایک گروہ رس (تاثر) پیدا کرنے کے لئے دُھنی کو کاویہ (شعر) سے زیادہ اہمیت دیتا ہے۔

مجذوب یاس، حفیظ یا جگر وغیرہ کی طرح خوش گلو اور سریلے نہ تھے۔ موسیقی کے نکتۂ نظر سے ان کی آواز کن سری تھی۔ پھر ان کے پڑھنے کا بے ہنگم انداز ایسا تھا کہ آج اگر کوئی نقل کرے تو مضحکہ خیز اور پاگل معلوم ہو۔ ڈرامے کے مکالموں کی طرح ان کے اشعار بھی بھرپور ایکشن کی جگہیں ہوتی تھیں۔ ایکشن کے بغیر ان کے شعر کا اثر مکمل نہیں ہوتا۔ اُن کا لحن سامعہ کو، ان کا ایکشن نظر کو اور ان کا شعر ذہن کو متاثر کرتا تھا۔ اس طرح سہ بعدی تاثر کے ساتھ وہ اپنے سامعین پر چھا جاتے تھے۔

جب مجذوب کا وجد اور مستی حد سے گزرنے لگتا تو ان کے مرشد مولنا تھانوی معین عرصے کے لئے انکی شعر گوئی اور شعر خوانی بند کروا دیتے تھے۔ یہ زمانہ خود مجذوب کے لئے اور ان کے احباب کے لئے بجد تکلیف دہ ہوتا تھا۔ لیکن مجذوب کے احباب اس جبری توبہ کو تڑوانے کی تدبیر بھی جانتے تھے۔ ایک اچھا شعر مجذوب کے لئے بادۂ لالہ رنگ کا کام کرتا تھا اور وہ بیخود ہو کر شعر خوانی شروع کر دیتے۔ توبہ ٹوٹنے کے بعد ان کی مستی بہت دیر تک بحر بیخودی رہتی تھی۔ گویا وہ کھل کھیلتے تھے۔ وہ جی بھر کے شعر لکھتے تھے اور جی بھر کر سناتے تھے۔ شعر سنانے کے معاملے میں ان کے لئے اچھے سننے والے کی بھی شرط نہ تھی۔ عاقل، احمق۔ عالم، جاہل کوئی بھی مل جائے وہ اپنا لحن بکھیر کر تسکین خاطر کر لیتے تھے۔

مجذوب نے اپنے وجود کی ساری صلاحیتیں اور اپنے ذہن کی مکمل توجہ شاعری کو دے رکھی تھی۔ اس قسم کے شاعر بالعموم زندگی کے دوسرے شعبوں میں ناکام رہتے ہیں۔ لیکن مجذوب اپنے کار منصبی میں کامیاب سمجھے جاتے تھے۔ انھیں انگریزی حکومت کی طرف سے پہلے خانصاحب کا خطاب ملا جس پر انھوں نے یہ شعر کہا ؂

ہوئے خواجہ صاحب سے ہم خان صاحب
بڑھی خاک عزت، گئی شان صاحب

اس کے بعد وہ خان بہادر ہوئے تو ایک شعر اور کہا۔ جس کا مفہوم کچھ اس طرح کا تھا۔

"پھر کیا ہوا گر ہو گئے ہم خان بہادر۔ اللہ سلامت رکھے ایمان بہادر"۔

مجذوب با اصول آدمی تھے۔ دنیا کی بڑی سے بڑی منفعت انھیں اپنے اصول سے منحرف نہیں کر سکتی تھی۔ کالج سے نکل کر وہ ڈپٹی کلکٹر ہو گئے۔ لیکن ظاہر ہے ایک ڈپٹی کلکٹر کو قانون کے نام پر دنیا بھر کی نحوستیں کرنا پڑتی ہیں۔ بھلا مجذوب یہ سب کیونکر برداشت کر سکتے تھے ایکدن ملازمت سے استعفیٰ دے کر گھر واپس آ گئے۔ فرماتے تھے کہ استعفے پر ایک شعر بھی لکھ دیا تھا۔ جہاں تک مجھے یاد آتا ہے وہ شعر یہ تھا ؂

چسکا لگا ہے جام کا شغل ہے صبح و شام کا
اب میں تمھارے کام کا ہم نفسو رہا نہیں

حکومت نے مجذوب کی دیانتداری، خاندان اور تعلیمی کیرکٹر کو دیکھ کر انھیں ڈپٹی انسپکٹر مدارس بنا دیا۔ ڈپٹی انسپکٹر کا گریڈ ایک

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]		[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

احمد جمال پاشا

ادب میں بینک بیلنس

لیجئے صاحب! اب تک سنا کرتے تھے کہ فلاں سیٹھ، ساہوکار یا ایکٹر کے گھر فرم یا بینک لاکر پر چھاپہ مار کر اتنا کالا دھن برآمد کر لیا گیا۔ یا فلاں اسمگلر کے قبضہ سے اتنی ناجائز کرنسی، سونا، گانجا یا چرس برآمد کر لی، مگر آج اخبار پر نظر پڑتے ہی مارے حیرت کے تقریباً اچھل پڑا۔ جلی حروف میں شاہ سرخیوں کے ساتھ لکھا ہوا تھا:۔

"ملک کے طول و عرض میں ادبی اسمگلروں، لٹریری ایکٹروں ساہتیہ کار سیٹھوں اور سرمایہ دار ادیبوں کے گھروں اور کارخانوں پر بڑے پیمانے پر چھاپے"

ایک سنسنی خیز خبر تھی کہ "محکمہ سیلس ٹیکس کے ذمہ داروں نے اسپشل انفورسمنٹ اسٹبلشمنٹ کے عملے کے ساتھ کسانوں، مزدوروں اور محنت کشوں کے ایک بورژوا ادیب کے گھر سے جب کالا ادب برآمد کرنے کے لئے چھاپہ مارا تو غریبوں کا یہ نجات دہندہ شراب کے ایک ٹب میں قوم کا غم غلط کر رہا تھا۔

ملزم بھونڈو بھائی اینڈ بھوندو بھائی پرائیوٹ لیمیٹڈ کے کھاتوں کی جانچ پڑتال سے پتہ چلا کہ سیلس ٹیکس والے جس کو گھر سمجھ رہے تھے دراصل وہ ایک عالیشان ایر کنڈیشنڈ محل تھا اور جس میں ادب کی ایک بہت بڑی فیکٹری چالو تھی۔ جس میں مختلف ملکوں کے ادب کے ترجمہ کا ہول سیل میں کام ہو رہا تھا۔

اقبالِ جرم کے دوران خاصی پٹائی کے بعد بھوندو بھائی نے بتلایا کہ "اب وہ دراصل ٹائپ رائٹر نہیں بلکہ کمپیوٹر ہو چکے ہیں۔ لہٰذا ان سے چاہے جتنا لکھوا لو، کیونکہ اس کے لئے اگر ۵۰ روپیہ صفحہ بھی ہم ترجمے کا کام امپورٹ کرتے ہیں ہیں۔ تو ہمارے پر دلتاری ادیب چار آنے آٹھ آنے صفحہ دو دو کر ترجمہ کر دیتے ہیں۔"

بھوندو بھائی نے اپنی ادبی اور قومی خدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے یہ بھی انکشاف کیا کہ "ملک میں چھوٹی بچت کی جو قومی اسکیم چل رہی ہے اس کو کامیاب بنانے کے لئے ہم یہ چوتی اور اٹھنی بھی زیادہ تر ہی لیتے ہیں۔"

سیلس ٹیکس کے ایک ترجمان نے اخباری نمائندوں کو بتایا کہ "بھوندو کے لیفٹیننٹ کی نشاندہی پر اس ادبی محل سے لاکھوں روپے کی مالیت کے ریفری جریٹر، غیر ملکی کرنسی، مشینیں، ٹائپ رائٹر، موٹر، قالین، جواہرات، کالا دھن اور بڑی تعداد میں ایسی کتابیں بھی برآمد ہی ہیں جو ایک بوگس ادبی انجمن کے نام پر دوسرے ملکوں سے بطور امداد حاصل کی گئیں تھیں تاکہ اس رقم سے ملک میں انقلاب لایا جا سکے۔"

بھونرو کے لیفٹیننٹ نے کافی پٹائی کے بعد یہ بھی اقرار کیا کہ "ان سب کتابوں کا تعلق عالمی ادب عالیہ سے ہے جس کو ہم لونڈے لاڑیوں سے اونے پونے ترجمہ کروا کے بڑے جہازی اور جدید ناموں سے چھپوا کر فارن ایکسچینج کما گئے ہیں اس سے اب تک اس لئے انقلاب نہ لاسکے کیوں کہ ہم میں خود انقلاب آگیا۔"

اسپیشل انفورسمنٹ اسٹیبلشمنٹ کے ایک ذمہ دار نے بتلایا کہ "ادب کے نام پر اسمگلنگ کرنے والے یہ بوڑھے ادیب عملاً ادب سے اتنا ہی تعلق رکھتے ہیں جتنا پنواری کا اس کے کھاتے سے اور بنئے کا اس کی کتاب سے تعلق ہوا کرتا ہے۔ ان کا نام نہاد ادب محض کاغذی خانہ پُری ہے کہ کس ادیب سے کیا لینا ہے یا کس ادیب کے بہانے کیا حاصل کرنا ہے۔"

سیلس ٹیکس والوں نے بتایا کہ "ان کے خلاف "ادبی تعزیرات" کے تحت کارروائی ممکن نہیں، کیونکہ اس دھندے کا، کاروبار شدہ ادب سے دور کا بھی تعلق یا کوئی لگاؤ نہیں۔ البتہ سیلس ٹیکس، انکم ٹیکس ایکسائز اور کسٹم کی خلاف ورزیوں کے تحت ان پر ساتھ ساتھ مقدمے چلیں گے اور سخت ترین کارروائی کی جائے گی۔"

خفیہ پولیس نے ایک ادبی فیکٹری پر چھاپہ مارا جہاں ایک ادبی کانفرنس کے دعوت نامے تیار کئے جارہے تھے۔ چھٹے جلنے والے کاغذات سے انکشاف ہوا کہ "ایک عالمی کانفرنس کے بہانے لاکھوں روپیہ ادب کے نام پر حاصل کیا گیا تھا۔ اور اب وہ پبلک میں فروخت کرنے کے لئے ٹکٹ کے بجائے پاس تیار کر رہے تھے تاکہ تفریحی ٹیکس کی رقم مار کر خود تفریح کی جاسکے۔ کانفرنس کے لئے انہوں نے جو عطیات حاصل کئے تھے وہ وہ ان کی جیبوں میں پہونچ چکے تھے۔"

یہ بھی کہا گیا کہ "اس کانفرنس میں انہوں نے ادیبوں کے بجائے اپنے رشتے دار، دوست اور ہم مشرب بلائے تھے۔ اب ان کے خلاف اینٹی کرپشن والے کارروائی کریں گے۔

اینٹی کرپشن والوں نے ایک ادبی دوکان پر چھاپہ مار کر ایک ادیب کی کئی سو تصنیفات پر قبضہ کر لیا جس کے بارے میں الزام لگایا گیا کہ اس نے اپنے عہدے سے ناجائز فائدہ اٹھا کر یہ کتابیں اپنے ماتحتوں سے لکھوائی تھیں مگر یہ سب کتابیں اس کے نام سے چھپی ہیں اور وہ ان کا باقاعدہ مصنف کہلاتا ہے۔ ان میں وہ کتابیں بھی شامل ہیں جو اس نے پیسے دے کر خریدی تھیں ایسے کچھ مسودات پر بھی قبضہ کر لیا گیا ہے جو اس کے لکھے ہوئے نہیں تھے۔ مگر یہ انھیں اپنے نام سے چھپوانے کا پروگرام بنا چکا تھا۔

انکم ٹیکس والوں نے ایک شاعر کے گھر پر چھاپہ مارا اور اس شاعر کے بہت سے ملازم پکڑے جو اس کے لئے چیزیں لکھتے تھے اس کی تجوری سے تقریباً ۵۰ دیوان اور لاتعداد فلمی گیت برآمد ہوئے جو بے روزگار شعرا اور اس کے ملازم شعراء کے نتیجۂ فکر ہیں۔ ایسی تمام بیاضیں اور قلمی دیوان اُن شعراء کو واپس کئے جائیں گے جنھوں نے انھیں تخلیق کیا تھا اور جو غزلیں، نظمیں اور فلمی گیت اس کے نام سے چھپے اور نشر ہو چکے تھے وہ اب اصلی ناموں سے شائع اور براڈ کاسٹ کئے جائیں گے۔

پولیس والوں نے بہت سے ایسے خان بہادر اور رائے بہادر قسم کے پہلوان ادب بھی پکڑ لئے ہیں جو نہایت دنگلی قسم کے ادیب اور شاعر ہونے کے باوجود خود نہیں لکھتے تھے بلکہ خریدے ہوئے کلام کے ساتھ ایک خوش کلام بھی رکھتے۔ ان کا گلا خراب ہونے کی وجہ سے وہی ان کا کلام بھی سناتا۔ ایسے ادیبوں اور شاعروں نے تھانوں میں یہ اقبال بھی کر لیا کہ "وہ صرف داد پانے کے گنہگار ہیں۔" مگر پولیس کو پریشانی یہ ہے کہ اس قسم زیادہ تر پکڑے جانے والے وہ ہیں جو اپنے اثر و رسوخ کی وجہ سے اپنی ان مانگے تانگے کی کتابوں پر انعامات تک حاصل کر چکے ہیں۔ ان کے انعامات اور تخلص جیل میں جمع کرلئے گئے ہیں۔

حکومت نے ایک بڑے ادیب کا لائسنس ضبط کر کے اسکو جیل بھیج دیا۔ اس نے عدالت کے سامنے اقرار کیا کہ وہ اپنے آپ کو ملک بھر کے ادیبوں کا منتخب نمائندہ

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

یوسف ناظم

ہدایت نامۂ سامعین

دنیا میں چند قومیں ایسی ہیں جو بہت ہی مظلوم ہیں، انہی مظلوم قوموں میں سامعین کا شمار ہوتا ہے۔ ایک زمانہ تھا جب عورتوں کی قوم مظلوم ہوا کرتی تھی لیکن عورتوں نے اپنی نسوانیت کا پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ اب عورتیں، مردوں کی مجازی خدا ہیں اور مردان کے نیک اور اطاعت گزار بندے۔ لیکن اہم اور عمر رسیدہ فلاسفروں کا خیال ہے کہ اگر عورت، مرد سے پہلے پیدا ہوتی اور تنہائی محسوس کرتی تو اللہ تعالیٰ سے کسی ساتھی کی نہیں، ملازم ہی کی فرمائش کرتی۔ اسی لیے عورتوں کے تدبّر کو دیکھتے ہوئے انھیں ناقص العقل کہا گیا ہے مردوں کے بارے میں ناقص العقل کا لفظ بھی استعمال نہیں کیا گیا۔ پھر ایک زمانہ آیا جب جانوروں کی قوم بہت زیادہ مظلوم ہوگئی۔ لیکن جب جانوروں میں بھی علم کی روشنی پہونچی تو انھوں نے سیاسی اور سماجی جماعتوں سے رشتہ جوڑ کر اپنا موقف درست کر لیا اور اب بہت سے جانور، آدمیوں سے بہتر منصب اور مراتب کے مستحق ہیں۔ تیسری مظلوم قوم طالب علموں کی تھی، ایک زمانہ تک طالب علموں پر ظلم ڈھایا جاتا رہا اور انھیں علم حاصل کرنے پر مجبور کیا گیا لیکن طالب علموں نے بھی ظلم کے خلاف آواز بلند کی اور علم کو آئندہ نسلوں کے لیے محفوظ چھوڑ دیا

لیکن نہیں بدلے تو سامعین۔ اس میں شک نہیں کہ سامعین کی قوم میں بھی بعض اوقات ہلچل پیدا ہوئی اور کبھی کبھار ان لوگوں نے بھی مقررین پر آلو، ٹماٹر اور انڈے پھینکے لیکن ان مقررین نے اپنے بچاؤ کا یہ طریقہ اختیار کیا کہ ترکاریوں اور انڈوں کی قیمتیں بڑھا دیں، سامعین پھر نہتے ہو گئے۔ ذہنی طور پر سامعین کبھی افلاس کے دور سے آگے نہیں بڑھے۔ اب یہ زمانہ آگیا ہے کہ اگر کسی مقرر کو پلیٹ فارم اور مائیکروفون مل جاتا ہے تو پھر وہ پلیٹ فارم چھوڑتا ہے اور نہ مائیکروفون۔ چند دنوں بعد دیکھئے گا کہ مائیکروفون بھی اتنے چھوٹے بننے لگیں گے کہ ہر مقرر اپنی ایک جیب میں مائیکروفون سٹ لیکر گھوما کرے گا۔ سامعین اس کی دوسری جیب میں ہوں گے۔

سامعین کی قوم کو تین مختلف ذاتوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ مشاعروں کے سامعین، ادبی کانفرنسوں کے سامعین اور سیاسی جلسوں کے سامعین۔ مشاعروں اور کانفرنسوں میں بنیادی فرق ہے۔ کانفرنسیں زیادہ مقدار میں نہیں ہوا کرتیں۔ اسکے برعکس مشاعرے اتنی کثرت سے ہوا کرتے ہیں کہ اب شاعروں کی نہیں، خود مشاعروں کی مردم شماری کی نوبت آگئی ہے۔ لمحے لمحے کے وقفے سے مشاعرے ہوتے ہیں تب بھی کئی شاعر مشاعرہ پڑھنے سے رہ جاتے ہیں اور ان کی خاطر پھر مشاعرہ کرنا پڑتا ہے۔ یونان کے حکماء نے کہا تھا کہ ایک زمانہ آئے گا جب دنیا کے کسی علاقہ میں فلموں کی طرح شاعروں کی بھی کاسٹ ہونے لگے گی۔ مشاعرہ کرنے والوں کا "بینی" سپنے

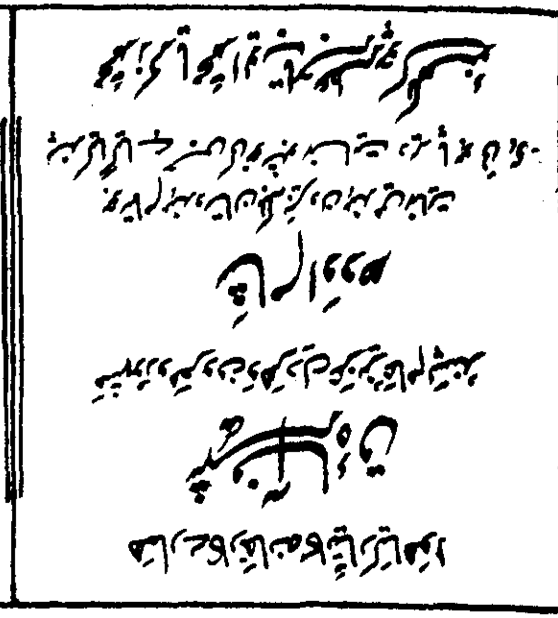
جگے گا۔ وہ زمانہ آگیا ہے لیکن ہمیں شاعروں کی تفصیل میں نہیں جانا ہے بلکہ یہ بتانا ہے کہ شاعروں کی فراوانی نے سامعین کو بڑا فیض پہونچایا اور سامعین کو مشاعرہ سننے کے ڈھنگ پر اتنا عبور حاصل ہوگیا ہے جتنا خود شاعروں کو شاعری پر حاصل نہ ہو سکا۔ مشاعرہ سننے کے آسان سہل اور ہلکے پھلکے قاعدوں کی وجہ سے ہر وہ شخص جو کہیں اور نہیں جا سکتا ہے مشاعروں میں چلا جاتا ہے اسے نہ تکلیف ہوتی ہے نہ تکلف۔ مشاعروں کے سامعین کے لیے کوئی ہدایت نامہ مرتب کرنے یا کوئی دستور بنا کر اس میں مسلسل ترمیمات کرنے کی ضرورت نہیں پڑی وجہ یہ کہ نابالغ "بچے" نومولود بچیاں بھی مشاعروں میں شرکت کرنے سے گریز نہیں کرتیں لیکن ادبی کانفرنس کی بات اور ہے ادبی کانفرنسیں نثر نابالغوں کے لیے ہوا کرتی ہیں۔ کانفرنسوں میں بچوں کا داخلہ ممنوع تو ہوا نہیں کرتا لیکن بچے خود سمجھ داری سے کام لے کر اس مفید اور بامقصد مشغلہ میں مصروف ہونا پسند نہیں کرتے۔ والدین بھی جانتے ہیں کہ ادبی کانفرنس کوئی ولیمہ کی دعوت تو ہے نہیں کہ بچوں کو ساتھ لے جایا جائے ادبی کانفرنسوں میں شرکت ہی کا مسئلہ وہ واحد مسئلہ ہے جس پر دنیا کے تمام والدین اور دنیا کے تمام بچے متفق الرائے ہیں۔

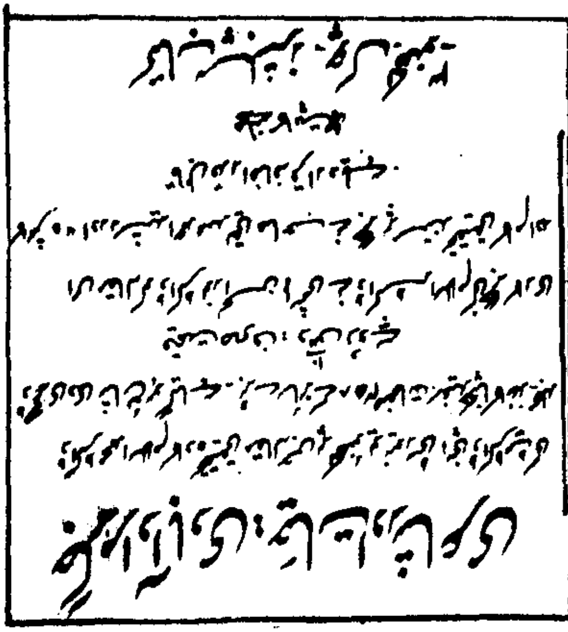
کانفرنسوں اور مشاعروں کے سامعین ساخت، مزاج اور نوعیت کے اعتبار سے مختلف ہوا کرتے ہیں مشاعرہ کے سامعین کے اندر (زیادہ اندر نہیں) وہ مادہ ہوتا ہے جسے جہلِ تفریح کا مادہ کہا جاتا ہے کانفرنسوں کے شرکا کے اندر (بہت زیادہ اندر) سنجیدگی، متانت بلکہ خشونت کے زہریلے جراثیم پائے جاتے ہیں۔ مشاعروں کے سامعین میں کوئی انفرادیت بھی نہیں ہوتی لیکن کانفرنسوں کا ہر آدمی ایک اکائی کی حیثیت رکھتا ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ اس پر کوئی ذمہ داری آن پڑی ہے۔ مشاعرہ مرگِ انبوہ ہے لیکن کانفرنس کے سامعین کو اپنی اپنی صلیب خود اٹھانی پڑتی ہے کانفرنس کے سامعین کو اعلیٰ ذات کے سامعین سمجھنا چاہیے۔

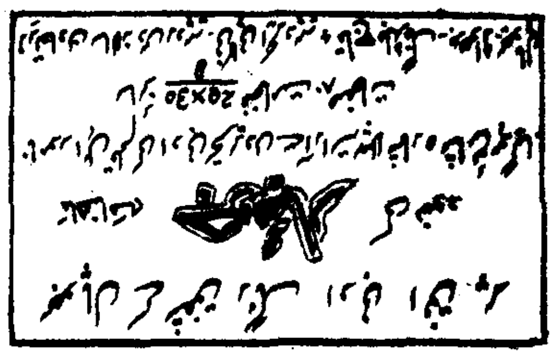
ان سامعین کے مسائل کئی ہوتے ہیں اول تو ان کی سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ شہ نشین کے نزدیک بیٹھیں یا مقرر کی زد سے دور مقام کا تعین کرنے کے بعد پھر ان کی سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ کس پہلو بیٹھیں کہ قرار آئے۔ کانفرنس سننے کا پینترا یعنی صحیح پینترا ابھی مقرر بھی کہاں ہوا ہے اب تک سارا معاملہ فری اسٹائل کے طور پر چل رہا ہے مزید تکلیف انھیں اس بات کی ہوتی ہے کہ انھیں یہ نہیں معلوم ہوتا کہ کانفرنس کے دوران مسکرانے کا صحیح وقت کون سا ہے اور سر دھننے کا کون سا۔ یوں بھی ادبی کانفرنسوں میں سر دھننے کا موقع کم ہی آتا ہے۔ ادبی کانفرنس ادبی کانفرنس ہوتی ہے بسم اللہ خاں کی شہنائی کا پروگرام نہیں ہوا کرتی، اس کے علاوہ کانفرنسوں کی مباحثہ میں حصہ لینے جب دو عقلا یعنی جینس (Genius) الجھ جاتے ہیں تو سامعین مطلق نہیں جانتے کہ انھیں کیا کرنا ہوگا کیونکہ بحث تو دونوں عقلا بڑی علمی کرتے ہیں لیکن گفتگو کا انداز بالکل فلمی ہوتا ہے بیچ بچاؤ نہیں کیا جا سکتا کیونکہ دونوں خود ہاتھا پائی سے گریز کرتے ہیں کسی ایک کی تائید نہیں کی جا سکتی، کیونکہ دونوں اپنی اپنی جگہ غلط بلکہ بر خود غلط ہوتے ہیں۔

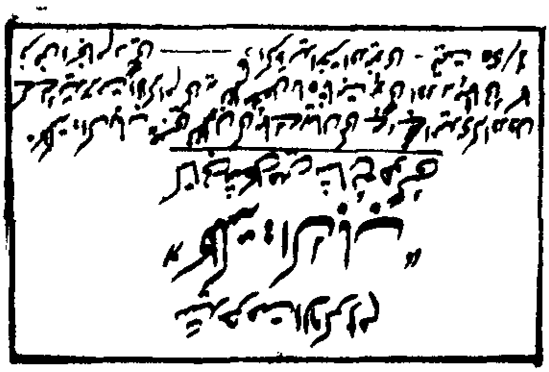
کانفرنس کے سامعین کی اور بھی کئی تکلیفیں ہوتی ہیں جو علی الاعلان بیان نہیں کی جا سکتیں یہ ذرا پرائیوٹ قسم کی ہوا کرتی ہیں۔ مثلاً یہ کہ کانفرنس کے دن گھر میں کوئی ایسی بات ہو جاتی ہے کہ بیچارے سامع کا دل ٹوٹ جاتا ہے یوں جا کون خوشی کے ساتھ کانفرنس میں شرکت کا پروگرام بناتا ہے اور پروگرام بنانے کے بعد اگر کوئی دل توڑنے والا واقعہ ہو جائے تو رہا سہا شوق بھی ختم ہو جاتا ہے ان پرائیوٹ تکلیفوں کا علاج ممکن نہیں لیکن دوسری قسم کی تکالیف اور صعوبتوں کا سدباب کیا جا سکتا ہے حل یہی ہے کہ ادبی کانفرنس کو لوگوں نے خواہ مخواہ ہوا بنا لیا ہے ورنہ کانفرنس تو آسانی سے سہہ لی جا سکتی ہے۔

کانفرنس کے موقع پر اگر شہر سے باہر جانے کا کوئی معقول بہانہ نہ ملے تو اور مصروفیتوں سے بہتر مصروفیت کانفرنس کی شرکت ہوتی ہے۔ کانفرنس کے سامع کو بہ لحاظ عقل و شعور مشاعرہ کے سامع سے اونچا سمجھا گیا ہے مشاعرے کے سارے سامعین سخن فہم نہیں سمجھے جاتے لیکن کانفرنس کے ہر سامع کو بلند نظر، خلیق، شفقت پسند اور علم رسیدہ مانا جاتا ہے۔









[illegible]

[illegible]

[illegible]

عبدالمجیب سہالوی

آخری درخواست

آئندہ الکشن میں پارلیمنٹ اور ریاستی اسمبلی کی ممبری کے لئے امیدواروں نے پارٹی ٹکٹ حاصل کرنے کی غرض سے جو درخواستیں دی ہیں ان میں سے ایک درخواست ہم سیاسی چوہوں کی مدد سے پارٹی کے دفتر سے کسی طرح پار کرلانے میں کامیاب ہوگئے ہیں جسے ہم آپ کے سامنے پیش کر رہے ہیں تاکہ اگر آپ کے گھرانے میں کسی حوصلہ مند کے دل میں لیڈری کی مبارک تمنا اور ممبری کا منافع بخش شوق پیدا ہو تو اسے امیدوار کی حیثیت سے درخواست دینے میں کسی دقت کا سامنا نہ کرنا پڑے اور وہ اس میں ضروری تبدیلی کرکے آسانی کے ساتھ اپنی امیدواری کی درخواست تیار کرسکے۔

اصل میں دقت یہ ہے کہ یہاں کے ناشروں اور کتب فروشوں کی توجہ ابھی اس طرف مبذول نہیں ہوئی ہے کہ اب الکشن کے موقعہ پر پارلیمنٹ اور اسمبلی کی ممبری کے لئے پارٹی کا ٹکٹ حاصل کرنے کے واسطے صرف سو، پچاس امیدواروں کو نہیں بلکہ ہزاروں امیدواروں کو ٹکٹ کے لئے درخواستوں کے نمونے کی ضرورت ہوتی ہے۔ کیونکہ امتحانات کے امیدواروں کی طرح اسمبلی کے اکثر امیدواروں کا بھی یہ حال ہے کہ درخواست لکھنا تو بڑی بات ہے بچاروں کو اس کا صحیح طرح نقل کرنا بھی دشوار ہوتا ہے۔ لیکن ناشر فی الحال اپنی پوری توجہ صرف جاسوسی ناول چھاپنے کی طرف مبذول کئے ہوئے ہیں اور بازار میں بھی ایسی کتابیں نہیں ملتیں جن میں پارٹی ٹکٹ کے لئے درخواستوں کے مختلف نمونے دئے ہوں اس لئے ہم محض امیدواروں کی مدد کے لئے، کار خیر سمجھ کر ایک درخواست کی نقل پیش کر رہے ہیں جو خوش قسمتی سے ہمارے ہاتھ آگئی ہے۔ امید ہے کہ اس سے امیدواروں کو پارٹی ٹکٹ کے لئے درخواست تیار کرنے میں اور ہمیں صنعت کے لئے راستہ ہموار کرنے میں مدد ملے گی۔

ہم ذیل میں جس امیدوار کی درخواست کا مضمون درج کر رہے ہیں وہ کوئی نوسکھیا امیدوار نہیں ہے بلکہ وہ کافی منجھا ہوا امیدوار ہے وہ سیاست کی تمام سرد و گرم سہے اور نشیب و فراز دیکھے ہوئے ہے اور اگر اسے "گرگ سیاست دیدہ" کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ اس نے پارٹی ٹکٹ کے لئے ایک دو نہیں سیکڑوں درخواستیں لکھی ہونگی اور جہاں تک ہمیں علم ہے آج تک اسکی کوئی درخواست نامنظور نہیں ہوئی یہ دوسری بات ہے کہ اس نے موسم کا رنگ دیکھ کر اپنی مرضی سے اپنی درخواست خود واپس لے لی ہو۔ گرچہ سو پشت سے پیشۂ آبا لیڈری نہیں ہے لیکن اس کی عمر گذری ہے اسی دشت کی سیاحی میں۔

ان امیدوار صاحب کی عمر ، کے پیٹے میں ہے پرانے خادم قوم ہونے کی وجہ سے قوم کے غم میں صحت کمزور ہوگئی ہے اور یہ درخواست

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

خاطر اس کے قبول کرنے میں بھی کبھی پس و پیش نہیں کیا اور بے دریغ اب تک جن سیوا یعنی تن سیوا کرتا رہا۔ کیونکہ "من تو شدم تو من شدی، من تن شدم تو جاں شدی"، کی منزل پر پہونچنے کے بعد جن اور تن میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔

اب تمنا ہے کہ اگر دم نکلے تو گھر میں چارپائی پر لیٹے لیٹے نہیں بلکہ جن سیوا میں وزارت کی کرسی پر بیٹھے بیٹھے۔۔۔۔ اس لئے مجھے امید ہے کہ میری دیرینہ خدمات کو سامنے رکھتے ہوئے مجھے آئندہ الکشن میں کھڑے ہونے کے لئے پارٹی کا ٹکٹ عنایت کرکے کچھ دن اور قومی خدمت کا موقعہ دیا جائے گا۔ اس سلسلہ میں یہ کہنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مجھے دوسرے امیدواروں کے مقابلہ میں اس لئے ترجیح دینے کی ضرورت ہے کہ وہ اس الکشن کے بعد دوسرے الکشنوں میں بھی پارٹی ٹکٹ حاصل کر سکتے ہیں لیکن میرا یہ آخری چانس ہے کیونکہ سفرِ آخرت کے لئے میرا پاسپورٹ بالکل تیار رکھا ہے مگر محض اس خیال سے کہ ملک اس وقت بڑے نازک دور سے گزر رہا ہے اس وقت موت کا بہانہ ڈھونڈ کر خدمتِ قوم سے منھ موڑ لینا اپنی پچھلی تمام خدمات پر پانی پھیرنا ہوگا۔ اس لئے اس رحمان و رحیم کی بارگاہ میں گڑگڑا کر پانچ سال کی اور مہلت مانگ لی ہے اور پکا وعدہ کیا ہے کہ مزید مہلت نہ مانگوں گا۔

رہا بڑھاپے کا سوال تو بقول غالب صاحب ؎

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

جتنی جسمانی قوت کم ہوتی جاتی ہے اتنا ہی دل میں قومی خدمت کا جوش موجزن ہوتا جاتا ہے شاید محبت کے ماروں اور سیاست کے پروانوں کا ایک ہی جیسا حال ہوتا ہے کہ بڑھاپے میں قومی خدمت کا جذبہ اور بھڑک اٹھتا ہے کیونکہ شاعر کہتا ہے ؎

بڑھاپے میں جوانی سے زیادہ جوش ہوتا ہے
بھڑکتا ہے چراغِ صبح جب خاموش ہوتا ہے

چنانچہ اب میرا یہ حال ہے کہ جب سے الکشن کی ہماہمی شروع ہوئی ہے میری رگ رگ میں ایک بجلی سی دوڑ گئی ہے اور دن رات کسی کل چین نہیں ملتا۔ رگوں میں تناؤ پیدا ہو گیا ہے اور پٹھے کس گئے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دل میں قومی خدمت کا نوسو واٹ کا بلب یکدم روشن کر دیا گیا ہے اور مجھ میں جوانی سے لاکھوں گنا زیادہ جن سیوا کا جذبہ پیدا ہو گیا ہے۔

کچھ نئے لوگ خواہ مخواہ ناتجربہ کاری کی بنا پر سیاست کے جسم میں نئے خون کے بہہ جانے کا نعرہ لگا رہے ہیں، حالانکہ وہ نہیں جانتے کہ سیاست کے پلاؤ کا ذائقہ اتنا ہی اچھا اترتا ہے جتنے پرانے چاول ہوتے ہیں۔ نئے الڑھ بیلوں کو سیاست کی گاڑی میں جوت دینے کا نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ وہ گاڑی کو ڈگر پر لے جانے کے بجائے کھائی خندق میں لے جا کر الٹ دیتے ہیں جس سے خود بھی چوٹ کھاتے ہیں اور گاڑی کا جو حال ہوتا ہے وہ ظاہر ہے، چول چول ڈھیلی ہو جاتی ہے اور منزل کے قریب پہونچنے سے پہلے ہی ڈھر الوٹ کر رہ جاتا ہے۔

سیاسی کشتی میں جسمانی قوت سے کہیں زیادہ داؤں پیچ کی ضرورت ہوتی ہے آپ جسمانی قوت کے بل بوتے اپنے سیاسی حریف کو ڈھکیل تو سکتے ہیں لیکن چت نہیں کر سکتے اور الکشنی کشتی میں چاروں خانے چت کئے بغیر کام نہیں بنتا۔ اس لئے آنے والے الکشنی دنگل میں سیاسی داؤں پیچ کے استاد، منجھے ہوئے، تجربہ کار پہلوانوں کو اکھاڑے میں اتارنے کے بجائے نئے خون کے چکر میں نئے نویلے، نوسکھیا سیاسی پٹھوں کو اتارنا وہ ہمالیہ مارکہ غلطی ہوگی جس کا خمیازہ آئندہ کئی الکشنوں تک بھگتنا پڑے گا اور پھر بھی نقصان کی تلافی نہ ہو سکے گی۔ اکھڑ تجربہ میدان سیاست میں پاؤں اکھڑنے کے بعد پھر جمانا اتنا ہی مشکل ہوتا ہے جتنا بازار میں ساکھ گر جانے کے بعد نئے سرے سے ساکھ قائم کرنا۔

اس لئے میں اپنی خاطر نہیں بلکہ قوم و ملک کے مفاد میں جس کی جوتیوں کے صدقے میں اپنا مفاد بھی پورا ہوتا ہے دست بستہ درخواست

وجاہت علی سندیلوی

مرزا تچپیر

مرزا بڑی بدحواسی سے گھر میں گھسے تو کواڑوں کو اس زور و شور سے بند کیا کہ صرف ان کی چولیں کیا مکان کی بنیادیں بھی ہل گئیں۔ کنڈی بند کر کے اندر پہونچے تو ترکاری کے جھولے کو تخت پر پٹکا اور شیروانی اتارنے سے زیادہ نوچ کر الگنی کی طرف ایسی تاک کر پھینکی وہ الگنی کو پھاند کر گھڑونچی سے جا لپٹی۔ اس کے بعد اظہار وحشت کے لئے اور کچھ سمجھ میں نہ آیا تو اپنی ٹوپی اتار کر بیوی کے پاندان پر دے ماری اور اپنی داڑھی کھجلاتے ہوئے صحنچی میں ٹہلنے لگے۔

اس ساری کارروائی کا خاموش تماشائی صرف گھر کا کتا شیرا تھا جو پلنگ کے نیچے اطمینان سے لیٹا ایک آنکھ بند کئے ایک آنکھ کھولے مرزا کی حرکات کا بڑے غور سے مطالعہ کر رہا تھا۔ مرزا کی نظریں اس پر پڑی تو انھیں اس کے اس طرح دیکھنے میں ایک کھلا ہوا انداز تمسخر نظر آیا۔ وہ جھلا کر اس کی طرف بڑھے اور اس کے قریب پیر پٹخ کر "چل بے یہاں سے ناشدنی!" کہا تو وہ بڑی شان استغنا سے ٹھکتا، دم ہلاتا، باورچی خانے کی طرف چل پڑا۔ مرزا کو اس کی یہ ادا ایک آنکھ نہ بھائی بلکہ اس خیال سے دل پر چوٹ سی لگی کہ دیکھو یہ ٹکے کا جانور بھی مجھے مسخرا سمجھ کر منہ چڑاتا ہے۔ انھیں کچھ ایسا محسوس ہوا کہ شیرا دم نہیں ہلا رہا ہے بلکہ دراصل اپنی دم سے انھیں چونچ دکھلا رہا ہے۔ انہوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ پیر کا جوتا اتار کر اس سے زیادہ اس کی دم کو تاک کر مارا۔ جوتا کئی سو میل کی رفتار سے پرواز کرتا ہوا کتے کی دم سے کئی گز فاصلے پر پانی سے بھرے ہوئے تسلے میں غڑاپ سے جا ڈوبا اور اس آواز سے اوپر چھتری پر بیٹھے ہوئے کبوتر پر پھڑپھڑاتے اڑ پڑے۔

ایک جوتے کی مفارقت نے مرزا کو دوسرا جوتا بھی اتار کر پلنگ پر بیٹھ جانے کے لئے مجبور کر دیا۔ اب انہوں نے ہانک لگائی "ارے کہاں ہو چھبن کی ماں؟" جواب نہیں ملا تو پھر چیخے۔ "سانپ سونگھ گیا ہے سب کو اس گھر میں!" اور پھر مقابلتاً کچھ دھیمے لہجے میں بڑبڑائے "کیا سب اللہ کے پیارے ہو گئے اس قبرستان میں؟"

"کیوں کیا ہوا؟ آج ترکاری لینے گئے تو بس بازار ہی کے ہو گئے۔ لڑکے باسی دال کھا کر اسکول سدھارے ہیں۔ آپ کو کیا؟"

"لڑکے اسکول سدھارے ہیں اور میں جیل خانے سدھار رہا ہوں۔ اب تو بر آئی آپ کی منہ مانگی مراد؟"

"کیا ہزیان بک رہے ہیں آپ؟ جیل جانے کے لئے بڑا دل گردہ چاہیئے۔"

"آپ کا مطلب یہ ہے کہ ہم بغیر دل اور گردے کے زندہ ہیں اب تک!

چہ خوش! اور ابھی جو تھانے کے سپاہی آئیں گے ہم کو پکڑنے تو بس آپ کی اس صفائی پر کہ ہمارے دل گردہ نہیں ہے، وہ ہمیں

چھوڑ کر اپنا منہ پیٹتے واپس چلے جائیں گے۔"

"کیسا تھانا اور کیسے سپاہی؟ کیا اس موئے بانگڑو داس کے یہاں شطرنج کھیلتے ہوئے دھر لئے گئے؟ یہی کہتی تھی..."

"بس بس خدا کے غضب سے ڈریئے۔ میرا ہر دوست آپ کو لچا اور شہدا ہی نظر آتا ہے۔ خبردار جو ہم نے کسی کی شان میں کوئی ناشائستہ الفاظ سُنے۔"

"خود ہی پولس اور تھانے کا قصہ لے بیٹھتے ہیں آپ؟ پولس لچوں اور شہدوں کے پیچھے نہیں گھومتی ہے تو اور کس کے؟"

"اب یہاں آکر پوری بات سنئے گا یا وہیں سے حلق میں لاؤڈ اسپیکر لگائے سارے محلے میں میری بداعمالیاں اور بدتماشیاں نشر کرتی رہیئے گا؟"

"اور ہانڈی کو جلنے کے لئے چھوڑ دوں؟"

"چولھے میں گئی ہانڈی، ہمیں نہ ہوں گے تو ہانڈی کیا آپ کا سگا شیرا کھائے گا؟"

"اے نوج! شیرا میرا سگا کیوں ہونے لگا۔ سگا ہوگا تمہارا جو ایسے خبیث کتے پر جان چھڑکتے ہو!"

"ہم جان چھڑکتے ہیں شیرا پر؟ اجی حد کر دی جھوٹ کی تم نے بھی۔ ہم تو سمجھتے ہیں کتنا مبارک دن ہوگا وہ جب اس نجاست کے پوٹ سے ہمارا گھر پاک ہو جائے گا۔ ہم تو دعا مانگتے ہیں کہ وہ کم بخت کل کو مرتا ہو تو آج ہی مر جائے۔"

"کیوں کسی بے زبان کا صبر سمیٹتے ہیں آپ؟"

"اجی وہ بے زبان ہے اور ہم زبان دراز! ڈیڑھ ہاتھ کی تو دم ہے اُس سالے کی۔"

"ہزار بار منع کر دیا کہ اس قسم کے واہی تباہی رشتے مت جوڑا کیجئے!"

"تو کٹوا کیوں نہیں دیتیں دم اس کی؟"

"اس کی دم آپ کو کیا کھلتی ہے؟"

"یہ بھی ایک ہی رہی گویا کہ ہمیں اُس کی دُم سے کوئی مطلب ہی نہیں۔ ہم اپنے گھر میں نہیں بلکہ کسی بھٹیار خانے میں رہتے ہیں!"

"توبہ! توبہ! ناک میں دم کر دیتے ہیں آپ اپنی اوٹ پٹانگ بکواس سے!"

"سرکاری سپاہی ہمارا وارنٹ گرفتاری لئے محلے میں گھوم رہے ہیں اور یہ عورت کتے کی دم کا قصہ لئے ہماری جان کو رو رہی ہے۔"

"دم کا قصہ میں نے شروع کیا تھا؟"

"اور کیا ہم نے جس کا ایک پیر حوالات کے اندر ہے؟"

بیگم باورچی خانے سے باہر نکل آتی ہیں "دشمنوں کے کان بہرے یہ حوالات کون جا رہا ہے اور کیوں؟"

"دشمنوں کے کان بہرے بھی ہوں گے تو بھی آپکی چیخ پکار سے سُن لیں گے یہ ناچیز فدوی حقیر دلگیر، المتخلص بہ نخچیر جیل جا رہا ہے۔"

"کیوں کیا ہوا؟ جیل میں بھی کوئی مشاعرہ ہو رہا ہے؟"

"جیل میں مشاعرے کی بھی ایک ہی رہی۔ اجی بیگم صاحبہ جیل میں غزلیں نہیں پڑھی جاتیں بلکہ چکیاں پیسی جاتی ہیں۔"

بیگم مرزا کے پاس ہی پلنگ پر آکر بیٹھ جاتی ہیں اور پاندان کھول کر پان بنانے لگتی ہیں "اب خدا کے لئے بتا بھی چکئے کہ کیا بات ہے۔ جب بھی گھر میں قدم رکھتے ہیں آپ مجھے دہلانے کی لئے ایک نیا شگوفہ چھوڑ دیتے ہیں۔"

"گویا کہ ہم اپنی خوشی سے تفریحاً محض تبدیلی آب وہوا کے لئے جیل جا رہے ہیں اور وہاں کسی مشاعرے میں غزل پڑھنے کا

[illegible]

[illegible]

ڈوریا ٹی۔ پی کا دوست ہے اور ٹی پی میرا۔ لیکن مجھے ڈوریا کی ان بیباک نگاہوں سے ہمیشہ ڈر لگتا ہے۔ میں پھر اس کی طرف دیکھتا ہوں۔ ڈوریا کی نگاہیں کسی کتاب پر جمی ہیں۔ لیکن شاید وہ اس کتاب کو اتنی کھلی نگاہوں کے سامنے خریدنے کی ہمت نہیں پاتا۔ وہ دیر تک اسی کشمکش میں مبتلا ہے۔ لڑکیاں بھی دیر سے کتابیں الٹ پلٹ رہی ہیں شاید وہ بھی کوئی ایسی ہی کتاب خریدنے کا ارادہ رکھتی ہیں۔ اتنے میں گاڑی کے آنے کا شور ہوتا ہے۔ اسٹیشن کی بے چینی اور سناٹا شور وغل میں بدل جاتا ہے۔ مسافر تیزی سے اسٹالوں کو چھوڑ کر گاڑی کی طرف لپکتے ہیں۔ ڈوریا جلدی سے وہ کتاب خرید لیتا ہے۔ وہ لڑکیاں بھی جب گاڑی کی طرف لپکتی ہیں تو ایک کے ہاتھ میں بھی کچھ ایسی ہی قسم کی کتاب ہوتی ہے۔ ان دونوں کا بھید صرف بک اسٹال والا جانتا ہے!

گاڑی کا سیاہ اور سبز دیو نما ڈیزل انجن رینگتا، بدنما گاڑیوں کو گھسیٹتا ہمارے سامنے سے تیزی سے گزر جاتا ہے۔ کچھ یوں محسوس ہوتا ہے۔ جیسے زندگی کے تمام سریلے راگ ختم ہو چکے ہوں اور ان کی جگہ ایسی ہی بھدی اور کرخت آوازوں نے لے لی ہو جیسے اس مشینی دور نے تمام تر نفاست، لطافت اور حسن کو دھکے دے دے کر باہر نکال دیا ہو۔ گاڑیوں میں سے ایک بھیڑ باہر نکلنے کے لیے بے تاب ہے، دوسری اندر جانے کے لیے۔ یوں معلوم ہوتا ہے گویا اندر والے اپنے ماحول سے سخت بیزار ہوں اور باہر والے اپنے ماحول سے اکتا گئے ہوں۔ ڈبوں کے دروازوں سے سامان باہر پھینکا جا رہا ہو اور کھڑکیوں سے اندر۔

ڈوریا میں اور ٹی پی اپنا مختصر سا سامان کھڑکی میں سے اندر سیٹ تک پہنچا چکے ہیں۔ اس کارنمایاں کو ٹی پی نے ایک فراخدل قلی کی مدد سے نہایت اچھی طرح سر انجام دیا ہے۔ ٹی پی سامان رکھنے کے بعد ہم سب سے داد چاہتا ہے جو بڑے کھلے دل سے دی جاتی ہے۔ ڈوریا کی نگاہیں پلیٹ فارم پر چند لڑکیوں کا تعاقب کرتی ہیں۔ اس کی آنکھوں میں بھوک ہے اور ہماری آنتوں میں۔ فیصلہ یہ ہوتا ہے کہ گاڑی روانہ ہوتے ہی ریفرشمنٹ کار پر حملہ کیا جائے۔

ٹی پی کی شخصیت کافی مرعوب کن ہے۔ وہ قد کا لمبا اور چال سے سپورٹسمین معلوم پڑتا ہے۔ جا بجا قہقہے لگانا اس کی فطرت میں شامل ہے۔ بولتا ہے تو الفاظ جیسے اس کے حلق سے کار کامیل کی رفتار ہی سے نکلتے چلے آتے ہیں۔ اس کا ذہن بھی اسی تیزی سے کام کرتا ہے۔ بولتے وقت اس کے منہ سے عجب سڑ سڑ کی آواز نکلتی ہے جیسے وہ لعاب کو باہر گرنے سے بچا رہا ہو۔ اس کا پورا نام تیج پال ہے لیکن ہم سب اسے ٹی۔ پی ہی کہتے ہیں اور وہ بھی اپنے اس امریکن زدہ نام سے کافی متاثر اور مطمئن معلوم ہوتا ہے۔

ڈوریا ہر وقت اپنی آنکھوں پر سیاہ عینک کا غلاف چڑھائے رہتا ہے۔ یہ کالی عینک پتہ ہی نہیں لگنے دیتی کہ اس کی نگاہیں کہاں اور کس کا پیچھا کر رہی ہیں۔ اس کا چہرہ گول اور چکنا ہے۔ اس کی ہتھیلیاں بھاری اور گوشت سے بھری ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے وہ زندگی کو محض اپنی پانچ حسوں سے ہی پہچانتا ہو۔

گاڑی دھیرے دھیرے رینگنے لگتی ہے۔ ہم اپنے کمپارٹمنٹ کے مسافروں سے سامان پر نگاہ رکھنے کی تاکید کرتے، ریفرشمنٹ کار میں گھس جاتے ہیں لیکن وہاں پہلے سے ہی بھیڑ لگی ہے۔ تمام میزیں رکی ہوئی ہیں، کوئی سیٹ تک خالی نہیں۔ کونے والی میز پر ریفرشمنٹ کار کے کلرک حساب کتاب پھیلائے ہوئے ہیں۔ ہم سب اسی میز کی طرف نہایت ڈھٹائی اور بے شرمی سے گھور رہے ہیں۔ آخر وہ ہماری ذلیل نگاہوں کی تاب نہ لاکر اپنا رجسٹر اور رقم میں سمیٹتا ہوا میز خالی کر دیتا ہے۔ ہم سب بیک کراس میز کو دبوچ لیتے ہیں۔ چاروں طرف دوسری نگاہیں ہمیں گھورتی معلوم ہوتی ہیں۔ میں اس شور وغل میں شکریہ کے کچھ رسمی الفاظ بڑبڑاتا ہوں جو ٹھیک سے مجھے بھی سنائی نہیں دیتے۔ وہ کلرک ہمارے اس چھیننے والے انداز سے جھلا سا گیا ہے اور چہرے پر بناوٹی ہنسی لاتے ہوئے اندر کیبن کی طرف بڑھ جاتا ہے۔

کھانا شروع ہو چکا ہے۔ ہماری آنکھوں کے سامنے سے بیرے پانی کا جگ اٹھائے، روٹی یا چاول لیے ادھر ادھر کود جاتے ہیں۔

ہم ان بیروں کی بھی چشم کرم کے محتاج ہیں لیکن کھٹکانے کے باوجود انھیں اپنی طرف راغب نہیں کر پاتے۔ دوریا ہماری کوششوں کو ناکام ہوتے دیکھ کر مسکرا رہا ہے۔ وہ ہنستا نہیں، ہمیں اس بات پر حیرت ہے۔ شاید بھوک کی شدت نے اس کی ہنسی کو مسکراہٹ میں تبدیل کر دیا ہے۔

مجھے اور ٹی۔ پی کو بھوک بے حد ستا رہی ہے۔ ہم پھر بیروں کو متوجہ کرنے میں لگ جاتے ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ ہماری آوازیں اونچی اور لہجہ ترش ہوتا چلا جاتا ہے۔ ٹی۔ پی کی نگاہیں میز کے قریب لگے ہوئے کال بیل کی طرف جاتی ہیں اور وہ پورے آدھ منٹ اسے دبائے رکھتا ہے۔ شاید یہ سوچ کر کہ کہیں گاڑی کی زنجیر کھینچنے کی نوبت نہ آ جائے، اندر سے منیجر بھاگا بھاگا سیدھا ہماری میز کی طرف آتا ہے۔

ہم بیروں کی بے رُخی کا رونا روتے ہیں۔ وہ نہایت انکساری سے کھانا ختم ہو جانے کا دُکھڑا روتا ہے۔ اپنی مجبوریوں کا اظہار کرتا ہے۔ ہمارا سارا غصہ بھاپ کے بخارات کی طرح اڑ جاتا ہے۔ آواز میں یکدم ریشم کی ملائمیت اور شہد کی سی مٹھاس آ جاتی ہے۔ ہم چٹنی پیاز ہی کی مدد سے پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لیے تیار ہیں۔ اگر روٹی بھی نہ ہو تو چاول یا ٹوسٹ پر ہی اکتفا کرنے کا یقین دلاتے ہیں۔ منیجر جس کی بڑی بڑی مونچھیں ہیں اور جو تیزی سے آنکھیں جھپکاتا رہتا ہے، آلوؤں کی بھجیا اور کچھ چپاتیاں بنوانے کا وعدہ کر کے اندر چلا جاتا ہے۔

تھوڑی دیر میں ایک موٹا، لنگڑاتا ہوا بیرا چند گلاس اور پانی کا جگ لیے ہماری میز پر آتا ہے۔ اس کی آنکھیں سوج رہی ہیں۔ وہ گلاسوں میں پانی ڈال کر چلا جاتا ہے۔ معلوم نہیں اس نے ہماری فرمائش کو سنا یا نہیں۔ ہم اس کے جاتے ہی پانی کے گلاسوں کو ایک ہی گھونٹ میں خالی کر دیتے ہیں۔

دوریا گلاس خالی کر کے ہم دونوں کی طرف دیکھتا ہے اور پھر کال بیل بجا دیتا ہے۔ شاید اس کی بھوک بھی آنکھوں سے اتر کر انتوں تک آن پہنچی ہے۔

کسی ڈرامہ کے کردار کی طرح وہ موٹا، لنگڑاتا ہوا بیرا چند منٹوں کی انتظار کے بعد پھر پانی کا جگ لیے جھومتا ہوا پھر واپس آتا ہے۔ ہم اُسے سلاد کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ وہ گلاسوں میں پانی انڈیل کر عجب جاب خاموش واپس چلا جاتا ہے۔ ہم ایک دوسرے کا منھ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد وہ موٹا بیرا پھر اسٹیج پر نمودار ہوتا ہے اور اس بار خالی پلیٹیں لگا کر رخصت ہو جاتا ہے۔ وہ ہمارے کسی بھی سوال کا جواب نہیں دیتا۔ پلیٹیں لگ جانے سے ہمیں تسلی سی ہو گئی ہے کہ ہم منزل کی جانب تھوڑا اور کھسک آئے ہیں۔ ہماری توقعات کی شدت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔

ہماری نگاہیں بار بار کچن سے ریفریشمنٹ روم میں کھلنے والے دروازے کی طرف اٹھتی ہیں۔ سامنے منیجر دکھائی دیتا ہے۔ وہ ہماری کریدتی ہوئی نگاہوں کی تاب نہ لا کر ایک نہایت کاروباری مسکراہٹ چہرہ پر لاتے ہوئے، تھوڑی سی اور دیر کے لیے معافی مانگتا ہے۔ وہ ریلوے کے نظام کو کوستا ہے۔ مناسب راشن نہ ملنے کی وجہ سے اپنی مجبوریاں گنواتا ہے۔ وہ ہمیں بتاتا ہے کہ کس طرح اس نے پرائیوٹ کنٹریکٹر کی نوکری کے دوران ایک بار حادثہ میں متواتر تین دن ساڑھے چار سو مسافروں کو دو وقت کھانا کھلایا تھا۔ وہ اس سلسلہ میں ہمیں فرسٹ، سکنڈ اور تیسرے درجے کے مسافروں کا رویہ بتاتا ہے۔ فرسٹ کلاس کے مسافران غیر معمولی حالات میں بھی کمپارٹمنٹ میں ہی سروس کی فرمائش کرتے ہیں۔ انھیں کھانے کے لیے تب بھی مکھن ڈبل روٹی، انڈے بسکٹ، چکن جیم اور پڈنگ۔ تیسرے درجے کے مسافر اٹھا پانی کی منزل پر آ جاتے ہیں۔ دال، روٹی پیاز چٹنی حتیٰ کہ نمک مرچ تک ان کے لیے کافی ہے البتہ روٹیاں کافی مقدار ہونی لازمی ہیں۔ چھینا جھپٹی، گالیاں گلوچ سب جائز ہے۔ دوسرے درجے کے مسافروں کی حالت واقعی قابل رحم ہوتی ہے۔

ایک طرف سفید پوشی، تہذیب کا اور رکھ رکھاؤ کا بناوٹی ملمع، دوسری طرف خالی جیب۔ ایسی حالت میں صرف خدا ہی ان کا مالک ہے۔
ٹی ٹی کو گمان ہوتا ہے کہ منیجر صرف باتوں سے ہی ان کا خالی پیٹ بھرنا چاہتا ہے۔ منیجر آلو کی سبزی تیار ہوا جانے کا وشواس دلاتا ہے۔
اگر ہم چاہیں تو وہ اس انتظار میں چکن چاٹ تیار کروا کر بھجوا سکتا ہے۔ ہم اُسے فوراً سے بیشتر چکن چاٹ بھجوانے کے لیے کہہ دیتے ہیں۔ جاتے
جاتے ٹی ٹی ڈوریا اس موٹے بیرے کی چستی بڑھانے کے لیے منیجر سے کوئی دوا تجویز کرنے کے لیے کہتا ہے۔ منیجر جاتے جاتے لوٹ آتا ہے۔ وہ ہمیں بتاتا ہے
کہ عین وقت پر دو بیرے چھٹی چلے جانے کی وجہ سے بیروں کا کام کس قدر بڑھ گیا ہے۔ وہ موٹے بیرے کو ہمارے سامنے بلاتا ہے اور اس کی
ٹانگ سے پتلون اٹھا کر اس کی سوجی ہوئی موٹی ٹانگیں دکھاتا ہے۔ متواتر تین دن سے ہر وقت کھڑے رہنے کی وجہ سے اس کی ٹانگیں سوج
گئی ہیں۔ ہم سب موٹے بیرے کی عظمت کے قائل ہو جاتے ہیں اور جلدی سے سوجی ہوئی پھولی ٹانگوں سے نگاہیں ہٹا کر ادھر اُدھر دیکھنے لگ جاتے ہیں
ساری گاڑی سفر کی دھول سے اَٹی پڑی ہے۔ ریفریشمنٹ کار بالکل نئی تیار شدہ گاڑیوں میں سے ہے۔ ڈبے کی دیواریں نئی روغن شدہ
ہیں۔ تمام میزیں چمکتے ہوئے سن مائیکا کی بنی ہیں۔ کرسیاں بھی نئے ڈیزائن کی ہیں اور ان کی سیٹیں پلاسٹک کے سفید بینت سے بنی گئی ہیں۔
پنکھے چاروں طرف گھوم کر ہوا دینے والے ہیں۔ کھڑکیوں میں رنگین شیشے جڑے ہیں جو کہ آنکھوں کو بھلے لگتے ہیں۔ ان شیشوں میں سے دھوپ
اندر نہیں آ سکتی لیکن تیز بھاگتے ہوئے کھیت، پیڑ، ٹیلیفون کے کھمبے، ندی نالے صاف دکھائی دیتے ہیں۔ نہ جانے کیوں اس ڈبے کے اندر
گرد و غبار کی تہہ ہر جگہ جمی ہوئی ہے۔ بیروں کی سفید وردیاں اپنی سفیدی عرصہ ہوئے کھو چکی ہیں۔ ان پر اب طرح طرح کے مٹی اور دھول
سے بنے ہوئے نقش کسی جدید پینٹنگ کی طرح ابھر آئے ہیں۔ ان کی جیبوں میں اڑسا ہوا جھاڑن تار و تار اور بھی غلیظ معلوم ہو رہا ہے۔
دوسری میزوں پر بیٹھے ہوئے مسافر کچھ صاف طور پر دکھائی نہیں دیتے ہیں۔ شاید بھوک بری طرح سے اعصابوں کو نچوڑ رہی ہے۔ لنگڑاتا
ہوا موٹا بیرا لیکن کافی دور سے بھی دکھائی دے جاتا ہے۔ وہ ہمارے سامنے چکن چاٹ کی تین پلیٹیں رکھ دیتا ہے۔ پلیٹوں میں ابلی ہوئی چند
سبزیاں ہیں اور ٹماٹو ساس سے آلودہ محض چکن کے دو تین ٹکڑے۔ ہم بھوکے گدھوں کی طرح ان پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ دو تین لقموں میں ہی پلیٹ
ختم ہو جاتی ہے اور ہماری نگاہیں پھر بیرے کی کھوج میں اٹھ جاتی ہیں۔ شاید ایسی ہی چکن چاٹ لائن ہلاک ہو جانے والے فرسٹ
کلاس مسافروں کے لیے کافی تھی لیکن اس حربہ کا ہم پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اس چکن چاٹ کی وجہ سے ہماری بھوک اور بھی چمک اٹھی ہے۔
لیکن اس کے باوجود ہمیں تھوڑا سا اطمینان ضرور ہو جاتا ہے۔ ٹی ٹی کا چہرہ کھل سا جاتا ہے اور ڈوریا کی مرجھائی ہوئی آنکھوں
میں ایک رونق سی آ جاتی ہے۔

ڈبے میں دوسرے بیٹھے ہوئے مسافروں کے چہرے آہستہ آہستہ واضح اور صاف دکھائی دینے لگتے ہیں۔ کانوں میں سریلی آوازوں کا
شور سنائی دیتا ہے۔ ڈوریا گردن گھما کر اس ٹیبل کی طرف دیکھتا ہے جہاں وہ بک اسٹال والی لڑکیاں کافی ختم کر کے آپس میں کسی بحث مباحثہ
میں اُلجھی ہوئی ہیں۔ اس کی آنکھیں خوشی سے پھیل جاتی ہیں اور اسے اپنی ہپ پاکٹ میں اڑسی ہوئی کتاب کا خیال آ جاتا ہے۔ وہ اسے
نکال کر ورق گردانی کرنے لگتا ہے اور پھر اس میں سے کوئی نیم برہنہ تصویر ٹی ٹی کو دکھانے لگتا ہے۔ مجھے ڈوریا کی ایسی حرکتیں بالکل اچھی نہیں
لگتیں۔

اتنے میں آلو کی بھجیا، سلاد اور دال آ جاتی ہے۔ دال ہمارے لیے اچنبھے کی بات ہے کیوں کہ اس کا ذکر ابھی تک نہ منیجر نے
اور نہ ہی کسی بیرے نے کیا تھا۔ گرم گرم چپاتیوں کے ساتھ ارہر کی دال اور آلو کی بھجیا اپنا مزہ دے جاتی ہے۔ سلاد میں پیاز ٹماٹر کے
کے علاوہ ہری مرچ کے کترے ہوئے ہیں جو سلاد کو اور بھی چٹپٹا بنا دیتے ہیں۔ بیرے کی لنگڑاتی چال میں بھی ایک روانی سی آ جاتی ہے۔
وہ بھاگ بھاگ کر چپاتیاں لا رہا ہے لیکن پلک جھپکنے سے پہلے ہی اس کی لائی ہوئی چپاتیاں غائب ہو جاتی ہیں۔ ڈوریا کو یہ مرچوں بھرا

سلاد بیحد پسند آیا ہے۔ وہ سلاد کا ایک ٹکڑا منہ میں ڈالتا ہے اور کتاب کی آٹھ دس لائنیں پڑھ ڈالتا ہے۔ شاید اس کے جذبات بھی اسی طرح چل رہے ہیں جیسے کہ اس کا منہ۔ کیونکہ اس کی نگاہیں اب بار بار ان لڑکیوں کی طرف اٹھ رہی ہیں۔

کھانا ختم ہونے پر ایک تسکین سی ہو جاتی ہے۔ ٹی۔ پی بیرا کو بلاتا ہے اور میٹھی چیز کی فرمائش کرتا ہے۔ شاید شکم سیری کے بعد ذہن زندگی کی غیر ضروری چیزوں کی طرف پرواز کرتا ہے۔ تمام آرٹ، عیش و آرائش، زندگی کی دوسری اعلیٰ قدریں، سبھی وقت ہی تو پروان چڑھتی ہیں جب انسان پیٹ کی آگ سے نجات پا جاتا ہے۔ میں جیب سے سگرٹ نکال کر دونوں ساتھیوں کو پیش کرتا ہوں۔

میٹھی چیز دستیاب نہیں۔ ٹی پی بجھا سا جاتا ہے۔ اور منہ لبور لیتا ہے۔ اُسے کھانے کے بعد کوئی نہ کوئی میٹھی چیز کھانے کی عادت ہے۔ ڈوریا ٹکٹکی باندھے ان لڑکیوں کی طرف دیکھ رہا ہے۔ میں اس کی ننگی نگاہوں کی تیزی سے لرز جاتا ہوں۔ میں اُسے بار بار منع کرنا چاہتا ہوں لیکن اپنے اندر ہمت کی کمی پاتا ہوں۔ کوئی چیز میرے ذہن میں بار بار آ کر سلگتی ہے لیکن میں جیسے کچھ کرنے کہنے سے گھبرا سا جاتا ہوں۔

بیرا بل لے کر آگیا ہے۔ ٹی۔ پی بل اٹھا لیتا ہے۔ میں جھکی نگاہوں سے بل کا جائزہ لیتا ہوں۔ تین ویسٹرن کھانوں کا چارج نو روپے دکھایا گیا ہے۔ دال بھوجیا اور چپاتیوں کا میزان ساڑھے چھ روپے ہے۔ تین چکن چاٹ نو روپے؟ شاید منیجر نے ضرورت کا فائدہ اٹھا کر ایسے ہی کئی بار بیروں پر ڈاکہ ڈالا ہے۔ ٹی پی منیجر کو طلب کرنے کے لیے زور سے گھنٹی بجا امنیجر نے ضرورت کا فائدہ اٹھا کر ایسے ہی کئی بار یوں پر ڈاکہ ڈالا ہے۔ ٹی پی منیجر کو طلب کرنے کے لیے زور سے گھنٹی بجاتا ہے۔

منیجر چکن چاٹ کو ویسٹرن ڈش بتاتا ہے۔ ڈوریا اور ٹی پی ڈش کے کورسوں کے بارے میں تقاضہ کرتے ہیں۔ فیصلہ اس بات پر ہوتا ہے کہ منیجر ہم کو اسی بل کے اندر کافی اور بسکٹ پنیر ادا کرے گا۔ ٹی۔ پی مطمئن ہے کہ میٹھی چیز کا تقاضہ کسی حد تک پورا ہو گیا۔ میں پھر بھی سمجھتا ہوں کہ ہمارے ساتھ مکمل انصاف نہیں ہوا۔ لیکن کھل کر کہنے سے گریز کرتا ہوں۔

ہم کو ریفریشمنٹ کار کا ماحول بے حد غلیظ معلوم ہوتا ہے۔ ہر جگہ ڈھول ہے۔ غلیظ دریاں، غلیظ جھاڑن۔ نامکمل دھلی ہوئی پلیٹیں ٹوٹی ہوئی کراکری۔ کند چھریاں اور کانٹے۔ پرانے گھسے چمچے۔ بیمار اور لنگڑا بیرا۔ چالاک اور باتونی منیجر۔ ہم سب شکایتیں ریلوے کے بالاترین افسران کو لکھنے کا فیصلہ کرتے ہیں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ ہم گاڑی سے نکلتے ہی تمام باتیں بھول جائیں گے۔ اسٹیشن آنے والا ہے۔ ہم جلدی جلدی کافی ختم کرتے ہیں۔ بل چکانے کے بعد ڈوریا آگے آگے ہے۔ وہ لڑکیوں کے پاس گزرتے وقت جان بوجھ کر ان میں سے ایک پر جا گرا ہے۔ مجھے ڈوریا کی اس حرکت پر سخت غصہ آگیا ہے۔ لڑکی ہلکی سی چیخ بلند کرتی ہے۔ ڈوریا بڑے رومانی انداز میں ذرا سا سر جھکا کر سوری کہتا ہے۔ مجھے کامل امید ہے کہ وہ لڑکی زنّاٹے کا تھپڑ مارے گی کہ ڈوریا کو چھٹی کا دودھ یاد آ جائے گا۔ ڈوریا ہاتھ میں پکڑی ہوئی کتاب کو ایک عجیب انداز میں ہلاتا، ہپ پاکٹ میں ڈال لیتا ہے۔ دوسری لڑکی ہنسنے لگی جاتی ہے اس کے چہرے سے یوں معلوم ہوتا ہے گویا اسے رشک ہو۔ مجھے یقین ہو جاتا ہے کہ ہم سب چغد ہیں! نرے چغد!

الیاس احمد گدی

عزت آرا

ٹیلی گرام کی تحریر بالکل مختصر تھی ۔ عزت آرا نے خودکشی کر لی ۔

میں ایک دم ششدر رہ گیا ۔ پھر آہستہ آہستہ مجھ پر ایک بے پناہ غم مسلط ہوتا گیا ۔ یہاں تک کہ میں دنیا و مافیہا سے بیگانہ ہو کر اپنی دونوں ہتھیلیوں میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا ۔ میرے ٹیبل پر وہ ٹیلی گرام کھلا پڑا تھا ۔ مجھے پتہ بھی نہیں چلا کہ کب میری بیوی آ کر میری پشت پر کھڑی ہو گئی اور کب اس نے ٹیلی گرام کو پڑھا ۔ جب اس نے میرے کاندھے پر پیار سے ہاتھ رکھ کر پوچھا کہ یہ عزت آرا کون تھی تو میں یکایک چونک اٹھا ۔

عزت آرا ـــ ؟

شادی کے سلسلے میں آئے ہوئے مہمانوں میں وہ لڑکی بھی آئی تھی جس کے ہم سب عاشق تھے ۔ آٹھ دس اپنے اور چچازاد بھائی کے چند بے تکلف دوست جن کا آنا جانا ہمارے یہاں تھا گویا ایک پوری ٹیم تھی جو اس لڑکی پر دل و جان سے فریفتہ تھی ۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ ان میں سے تقریباً کسی نے اس لڑکی کو دیکھا تک نہیں تھا ۔ لیکن وہ کہانیاں جو اس لڑکی سے وابستہ تھیں کچھ اس قدر پر اسرار اس قدر رنگین اور اس قدر رومان پرور تھیں کہ انہیں سن کر ہی دم نکلنے لگتا تھا ۔

جہاں وہ جاتی یہ کہانیاں وہاں پہلے سے پہنچ جاتیں ۔ اس کے عاشقوں کا حال تمام لوگوں کو معلوم تھا ۔ بلکہ یہاں تک سنا گیا تھا کہ ایک بار ایک کالے بھجنگ لڑکے کے ساتھ فرار ہونے کے لیے وہ گھر سے نکل بھی گئی تھی مگر پکڑی گئی ۔

بدنامی کی اس رنگ آمیزی نے جو پر اسرار دلکشی اس کی شخصیت کو بخشی تھی اس نے ہمارے خاندان کے نوجوان طبقے کو انتہائی مشتعل کر دیا تھا ۔

پھر وہ بڑے بھائی صاحب کی سالی بھی لگتی تھی اس رشتے نے ہمیں اور ورغلا دیا تھا ۔ چنانچہ اب یہ عالم تھا کہ گھر کا ہر فرد یہ سمجھے ہوئے تھا کہ بس اب وہ اس پر عاشق ہوئی کہ ہوئی ۔ انتہا یہ کہ منجھلے بھیا بھی جن کی عمر پینتالیس کے لگ بھگ تھی بے حد بنے ٹھنے رہتے تھے اور آنگن یا باہر آمدے سے گزرتے تو ایسا لگتا جیسے کسی فوج کے کمانڈر جا رہے ہوں ، سینہ تانے ہوئے ، بازو پھیلائے ہوئے ـــــ

ایک دن بڑی بھابی نے ازراہِ مذاق کہا کہ یہاں کیوں اپنی ہنسی اڑاتے ہو ۔ جوان جوان لڑکے تمہیں دیکھ دیکھ کر ہنستے ہیں ۔ وہ لڑکی جس کے لیے تم اتنا سوانگ بھرے ہو اتنی آسان نہیں ہے ۔

سچ مچ وہ لڑکی اتنی آسان نہیں تھی ۔ باری باری تمام لوگوں نے اظہارِ عشق کر کے دیکھ لیا ۔ اس کی تعریفوں کے پل باندھے

گئے۔ کسی نے اس کو آسمانی حور کہا۔ کسی نے چودھویں کے چاند سے تشبیہ دی کسی نے صبح کا پہلا اُجالا کہا، کسی نے اسے آسمانی مخلوق قرار دیا۔ لیکن وہ ہر ایک کو ٹال گئی۔

میں نے اس کو پہلی بار دیکھا تو وہ میری بھابی یعنی اپنی خالہ زاد بہن سے باتوں میں معروف تھی۔ یہ سچ ہے کہ وہ انتہائی خوبصورت تھی۔ بے انتہا سڈول جسم، بڑی بڑی کالی آنکھیں، سرخی مائل رنگت اور بھرے بھرے سرخ ہونٹ۔ اس نے ایک سرسری نظر مجھ پر ڈالی پھر استفہامیہ انداز میں بھابی کی طرف دیکھا، بھابی اس کا مطلب سمجھ کر بولیں۔

میرا چھوٹا دیور ہے ــــ!

"کھوٹا دیور ــــ؟" اس نے بن کر پوچھا۔ بھابی ہنس پڑیں۔

"کھوٹا دیور نہیں بھائی چھوٹا دیور ــــ!"

میں اس مذاق سے بے تعلق سا رہا۔ بھابی سے چند باتیں کیں۔ بڑے بھیا نے جو روپے دیئے تھے وہ بھابی کو دیدیئے اور الٹے پیروں لوٹ گیا۔

لیکن وار بڑا گہرا لگا تھا۔ اس کی شرارت سے چمکتی ہوئی آنکھیں۔ اور مسکراہٹوں کے تناؤ سے کھنچے ہونٹوں کی مار بڑی شدید تھی۔ میں بہت دیر تک بے چین رہا۔

دوسرے دن وہ مجھے سیڑھیوں پر ملی۔ اتفاق کہہ لیجئے کہ اس وقت کوئی دوسرا آدمی موجود نہیں تھا۔ تیزی سے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اچانک جب اس کی نظر مجھ پر پڑی تو وہ ٹھٹھک کر کھڑی ہو گئی۔ میں دو سیڑھیاں اتر کر اس کے قریب آ گیا۔

"تم بہت خوبصورت ہو!" اس بار میں نے براہ راست حملہ کیا۔

"یہ جملہ میں کئی بار سن چکی ہوں!"

"سنو تم واقعی اس قدر خوبصورت ہو کہ اگر کوئی یہ شرط رکھے کہ ایک رات تمہارے ساتھ رہنے کے بعد صبح کو مجھے گولی مار دی جائے گی تو شاید میں اس شرط کو منظور کر لوں گا۔"

وہ چونک سی گئی ایک رنگ سا اس کے چہرے پر آ گیا۔ اس نے تیز گہری نظروں سے مجھے دیکھا شاید میرے الفاظ کارگر ہوئے تھے۔ پھر اچانک وہ تیزی سے سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ میں چند لمحے بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ پھر دھیرے دھیرے نیچے اتر آیا۔

جیسے جیسے شادی کا دن نزدیک آتا گیا مہمانوں کی ریل پیل بڑھتی گئی یہاں تک کہ تمام گھر پر عورتوں کا قبضہ ہو گیا۔ بیچارے مردوں نے باہر کے کمروں اور دالانوں میں پناہ لی۔ میں نے بھی آہستہ سے اپنا بستر لپیٹا اور دوسری منزل کے اس دور افتادہ اور تاریک کمرے میں ڈیرا ڈال دیا جس میں گھر کی ناکارہ چیزیں بے ترتیبی سے پھینک دی جاتی تھیں۔ خوش قسمتی سے اس کمرے میں ایک تین ٹانگوں والا تخت بھی تھا۔ اسی پر بستر لگا دیا۔

دو دن اور دو راتیں تو شادی کا وہ ہنگامہ بپا رہا کہ کسی کو کسی کا ہوش نہ تھا۔ تیسرے روز جب بارات رخصت ہو گئی تو ذرا اطمینان نصیب ہوا۔ اناسین کی دو گولیاں کھا کر میں اپنے بستر پر لیٹ گیا مگر نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ متواتر پانچ سگریٹ پھونک ڈالے پر نیند کا کہیں پتہ نہ تھا بے ربط خیالوں کے بیچ بیچ میں کبھی کبھی عزت آرا کی صورت آنکھوں کے سامنے ابھر آتی اور پھر ڈوب جاتی۔

رات کا پتہ نہیں کیا بجا تھا کہ اچانک ایک سایہ میرے کمرے میں رینگ آیا۔ میں ابھی اپنے خوف پر قابو بھی نہ پا سکا تھا کہ وہ سایہ آ کر میرے بستر پر بیٹھ گیا۔ تب میں نے دیکھا وہ عزت آرا تھی۔

"تم ——؟"

"تمہیں اپنی شرط یاد ہے —؟"

آہستہ آہستہ میں اپنے خوف پر قابو پاتا گیا چند لمحوں بعد میں پرسکون ہو چکا تھا۔

"تمہاری کیا خاطر کروں۔ سگریٹ پیوگی۔؟"

سگریٹ میں پی سکتی ہوں۔ اپنے بھائی کا سگریٹ چرا کر اکثر پیتی رہتی ہوں"

اس نے ایک سگریٹ لے لیا اور سلگا کر کسی نئے سگریٹ پینے والے کی طرح پھونکنے لگی۔

"جانتی ہو ابھی رات کے دو بج رہے ہیں۔ اگر کسی کو معلوم ہو گیا کہ تم میرے کمرے میں ہو تو کیا ہوگا؟"

"ہوگا کیا ایک شادی اور ہو جائے گی —" وہ ہنس پڑی۔

مگر میم صاحب تمہاری تو شادی ہو چکی ہے —

شادی کہاں صرف نکاح ہوا ہے" اس نے معصومیت سے کہا۔

اس کا نکاح بچپن ہی میں ہو چکا تھا۔ شادی لڑکے کی تعلیمی فراغت کے بعد قرار پائی تھی۔ وہ لوگ کافی پرانے خیالات کے تھے۔ پتہ نہیں اس کے متعلق افواہیں وہاں تک پہونچی تھیں کہ نہیں۔ میں نے اس کو ڈرانے کے لیے کہا۔

جب تمہارے میاں کو معلوم ہوگا کہ تم آدھی رات کو میرے کمرے میں تھیں تو وہ تمہاری چمڑی ادھیڑ دے گا۔

ہونہہ۔ بڑا آیا چمڑی ادھیڑنے والا۔ اس کے باپ کا قرض کھایا ہے کیا —؟

وہ میرے بستر پر بیٹھی رہی میں دیر تک اس کے جسم کی مہک اور حدت محسوس کرتا رہا۔ بڑی دیر تک وہ چپ چاپ رہی پھر وہ میرے ساتھ ہی لیٹ گئی۔

"مجھے تم بہت پسند ہو —" اس نے بیباکی سے کہا۔

پسند تو تمہیں ظفر صاحب بھی تھے" — میں نے چوٹ کی یہ ظفر صاحب وہی بدصورت آدمی تھے جس کے ساتھ وہ فرار ہوتے ہوئے پکڑی گئی۔۔ وہ شاید اس حملے کے لیے تیار نہیں تھی۔ ایک لمحے کے لیے تلملا گئی پھر اس نے ایک ٹھنڈی آہ بھری آہستگی سے بولی۔

"وہ بڑا خودسر آدمی ہے۔"

"خودسر آدمی" کی کچھ اور وضاحت کرو —" میں نے اندھیرے میں، اس کی آنکھوں کی طرف دیکھنے کی کوشش کی مگر اس کی آنکھیں بند تھیں۔

"تم نہیں سمجھ سکوگے — تم اگر لڑکی ہوتے تو اس لفظ کا مطلب سمجھ جاتے مگر —"

"ایک بات پوچھوں —" میں نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

وہ چپ رہی۔

کیا تم اس سے محبت کرتی ہو" —؟

"پتہ نہیں! میں کچھ ٹھیک سے نہیں کہہ سکتی۔ وہ مجھے اس لیے پسند ہے کہ وہ بڑا مغرور اور خودسر ہے۔ اور تم اس لیے پسند ہو کہ تم باتیں بہت اچھی کرتے ہو" —

"میں پسند کی نہیں محبت کی بات کر رہا تھا"!

"بکواس مت کرو۔ مجھے یہ بتاؤ کل صبح تم مرنے کے لیے تیار ہو"۔؟
"مر تو میں اسی وقت گیا تھا جب پہلی بار تمہیں دیکھا تھا"۔!
"جھوٹ مت بولو۔ مجھے یہ خوشامد والی باتیں پسند نہیں۔ یہ باتیں تم اپنی ہونے والی بیوی سے کرنا"۔!
"اور تم کون ہو۔؟"
"ہونہہ آئینہ دیکھا ہے۔ ہ میری تو خود شادی ہونے جاری ہے"۔
"اچھا۔ کب۔!!"
"اگلے جاڑوں میں، دعوت بھیج دوں گی چلے آنا۔ آؤ گے نا۔؟؟"
"نہیں کرسکتا کیونکہ اس وقت ہمارے امتحانات چل رہے ہوں گے"۔!
"اچھا تو شادی کے بعد آنا"۔!
"کیا تمہاری سسرال میں۔؟ اور اگر تمہارے سسر نے پٹائی کر دی تو۔؟"
وہ ہنس پڑی۔
"محبت میں لوگ گردن کٹوا دیتے ہیں۔ تم اگر تھوڑی سی مار ہی کھا لوگے تو کیا بگڑ جائے گا"۔!

——— اس نے بستر پر رکھے ہوئے پیکٹ سے ایک سگریٹ نکالا اور سلگا کر پینے لگی۔ چند منٹ خاموشی میں گزر گئے پھر اس نے آدھا سگریٹ میرے منہ سے لگا دیا۔

"لو میرا جھوٹا سگریٹ پیو۔ تمہیں ایک نئی لذت کا احساس ہوگا"۔!
"میں براہ راست اس لذت سے آشنا ہونا چاہتا ہوں۔!"
وہ ہنسی "تم بہت ہوشیار ہو"!

رات جو لمحہ لمحہ گزر رہی تھی۔ اور ٹھنڈی ہوا جو نیٹ کی کھلی کھڑکی سے آرہی تھی، اور کئی راتوں کے جاگنے اور تھکاوٹ جس کا غلبہ ہم دونوں پر یکساں طور سے ہو رہا تھا۔ وہ نیند بن کر ہم پر حاوی ہوتی گئی۔ اور جب ہم ذرا طویل وقفے کے لیے خاموش ہوئے تو دونوں سو چکے تھے۔

اور آنکھ دوبارہ اس وقت کھلی جب دروازہ زور زور سے پیٹا جا رہا تھا۔ ایک لمحے کے لیے مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں سُن ہو گیا ہوں۔ میرا ذہن ماؤف ہو گیا، اور تمام جسم سرد پڑ گیا۔ بدنامی اور رسوائی کے خوف نے مجھے ایک دم ہلا سا دیا۔ میں نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر پیچھے کی کھڑکی پر ہاتھ ٹکائے اور نیچے کود گیا۔ نیچے زمین نرم تھی خدا کا شکر ہے میرے ہاتھ پاؤں ٹوٹنے سے بچ گئے۔ مگر پیر میں شدید چوٹ آئی میں لنگڑاتا ہوا نوکروں کے کوارٹروں کی طرف بھاگا۔

گو ہم ساتھ ساتھ ایک ہی کمرے میں نہیں پکڑے گئے تھے مگر اسکے میرے کمرے سے برآمد ہونے اور میرے داہنے پیروں کی موچ کا علاقہ قائم کر لیا گیا۔ اور شدہ شدہ یہ بات تمام لوگوں میں پھیل گئی کہ وہ رات میرے کمرے میں تھی اور میں نے چھت سے کود کر اپنے آپ کو بچایا ہے ——— یار دوستوں نے مبارک باد دی، بھابی نے منہ پھلا لیا۔ بھائی صاحب مسکرا مسکرا کر دیکھتے رہے۔ اور میں مجرم سا جھینپا ہوا ادھر ادھر پھرتا رہا ——— صرف ایک عزت آرا تھی جو بالکل مطمئن تھی اس کا اطمینان دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔

——— اس حادثے کو ابھی دو روز بھی نہ ہوئے تھے کہ ایک اور واقعہ ظہور پذیر ہوا۔

سب لوگ بڑے ہال میں بیٹھے تھے سبھی لوگ تھے۔ بڑے بھائی منجھلے بھائی، بھابیاں، پھوپھی صاحبہ اور دو ایک مہمان جو ابھی رخصت نہ ہوئے تھے۔ میرے ہاتھ میں پیتل کی ایک انگوٹھی تھی۔ اس انگوٹھی کا ڈیزائن اس قدر خوبصورت تھا کہ میں نے اسے بازار سے گزرتے ہوئے خرید لیا تھا کہ اسی ڈیزائن کی سونے کی انگوٹھی بنواسکوں چند لمحے غور سے عزت آرا میری انگوٹھی کی طرف دیکھتی رہی پھر اٹھ کر میرے قریب چلی آئی۔

"یہ انگوٹھی مجھے دے دیجئے۔"

کمرے میں گفتگو کا سلسلہ اچانک بند ہوگیا۔ میں نے ایک نظر انگوٹھی کی طرف ایک نظر اس کی طرف دیکھا اور بولا

"یہ انگوٹھی پیتل کی ہے"!

"اس سے کیا ہوتا ہے۔ مجھے یہ انگوٹھی چاہیئے"!

اچانک اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور انگوٹھی میری انگلی سے کھینچ کر اتار لی اور اپنی انگلی میں ڈال لی۔ تمام لوگ مبہوت رہ گئے چند لمحے کے لیے گہری خاموشی چھا گئی۔ پھر بڑے بھائی صاحب نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور بولے۔

"میاں تمہیں دیکھ کر تو رقابت کا احساس ہوتا ہے۔ میں ایک سے ایک سونے کی انگوٹھی پہنے پھرتا ہوں مگر کوئی پوچھتا بھی نہیں۔ ادھر تمہاری معمولی پیتل کی دو آنے والی انگوٹھی پر لوگ جان دیئے پھرتے ہیں بھائی اپنی قسمت ہے"!

بھابی غصہ سے بے تاب ہو کر اٹھ کھڑی ہوئیں کیونکہ عزت آرا ان کی بہن تھی اور وہ اس ہنسی کے لیے تیار نہیں تھیں اور میں شرمندہ ہو کر بھاگ کھڑا ہوا۔ کمرے میں بھائی صاحب اور دوسرے لوگوں کی ہنسی دیر تک لرزتی رہی۔

عزت آرا کا ارادہ کچھ دن اور ٹھہرنے کا تھا لیکن بھابی نے اسے جلد ہی چلتا کر دیا۔ جانے سے پہلے اس نے چند چیزیں رومال میں باندھ کر بطور نشانی دیں۔ ان میں ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کے ٹکڑے، بالوں کی ایک لٹ، ایک استعمال شدہ رومال اور ایسی ہی چند دوسری چیزیں تھیں جنھیں لوگ خوشبو میں بسا کر سوٹ کیسوں میں رکھتے ہیں۔ لیکن میرے لیے ان چیزوں کی کوئی اہمیت نہیں تھی کیونکہ مجھے اس بات کا اعتراف کرلینے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں کہ میں اس سے بالکل محبت نہ کرتا تھا۔

اس کے چلے جانے کے بعد کچھ دنوں تک اس کا تذکرہ ہمارے یہاں ہوتا رہتا۔ اس کے تذکرے میں اکثر میرا نام بھی لیا جاتا۔ گھر کے لوگوں کے علاوہ آس پاس کے لوگوں کو بھی میرے اور اس کے تعلق کا علم تھا۔ حیرت انگیز بات یہ کہ چند مہینوں کے بعد عشرت کا جو خط آیا اس میں بھی ان باتوں کا ذکر تھا۔ عشرت میرا دوست تھا اور کلکتہ میں رہتا تھا۔ واضح ہو کہ کلکتہ ہی میں عزت آرا کی ہونے والی سسرال بھی تھی اور عین اس کے مکان کے پہلو میں۔ ظاہر ہے کہ جو بات عشرت کو معلوم ہوسکتی ہے وہ اس کی سسرال والوں کو بھی ضرور معلوم ہوئی ہوگی۔

وقت گزرتا گیا۔ عزت آرا کی شادی ہوگئی۔ ایک الگ دعوت نامہ میرے نام بھی آیا تھا مگر میں نے دانستہ جانے سے پرہیز کیا مبادا کوئی ایسی بات ہو جائے جو اس کے مستقبل پر اثر انداز ہو۔ اسی خیال کے تحت میں نے اپنی شادی میں بھی اسکو مدعو نہیں کیا پتہ نہیں اس نے کیا سوچا ہوگا۔

کئی برس بعد جب میں کلکتہ گیا تو عشرت ہی کے یہاں ٹھہرا۔ رات کے کھانے سے فارغ ہو کر جب اس کی بیوی بچوں کو سلانے چلی گئی اور ہم لوگ تنہا رہ گئے تو عشرت نے اس کا ذکر چھیڑ دیا بڑی رات تک ہم اس کی باتیں کرتے رہے۔ عشرت نے جو باتیں اس کے متعلق بتلائیں وہ حیرت انگیز بھی تھیں اور افسوسناک بھی۔

عشرت آرا کا شوہر گورنمنٹ سروس میں کسی اچھے عہدے پر فائز تھا۔ خوش شکل ہونے کے علاوہ کافی صحت مند بھی تھا۔ اور سب سے بڑی خوبی یہ کہ وہ عزت آرا کو بے حد چاہتا تھا۔ اس کے آرام و آسائش کا ہر دم خیال رکھتا۔ عزت آرا بھی اپنے گھر میں بہت خوش

بے چین ہو اٹھتا ہے۔ اور میں اپنے پر قابو نہیں رکھ سکتی ۔۔۔ اب اسی کو دیکھو تمہارے متعلق معلوم ہوا کہ تم یہاں آئے ہو تو میں ہزار پابندیوں کو ٹھکرا کر تم سے ملنے چلی آئی ۔ حالانکہ اگر کسی کو معلوم ہو گیا تو آفت آجائے گی۔۔!

"بہر حال تم کو اتنی بات ضرور یاد رکھنی چاہیئے عزت کہ تم شادی شدہ عورت ہو اور ایک مرد یا ایک خاندان کی عزت و آبرو تم سے وابستہ ہے۔"

"میں یہاں تم سے لیکچر سننے نہیں آئی ہوں ۔۔۔" اچانک وہ پھر اسی شوخ و شنگ لڑکی میں تبدیل ہو گئی ۔ اور ذرا سی دیر کے لیے جو سنجیدگی اس پر طاری ہوئی تھی اچانک غائب ہو گئی ۔

"تم نے اپنی شادی میں مجھے کیوں نہیں بلایا ۔۔۔" اس نے شکوہ کرنے کے سے انداز میں کہا

"یہ بات تو تم اپنی بہن سے پوچھ سکتی ہو ۔ تمام انتظامات انھیں کے ذمہ تھے ۔"

"ہونہہ! وہ تو جلتی ہیں ۔ وہ نہیں چاہتی کہ میں تمہارے قریب آؤں ۔ اچھا سگریٹ پلاؤ ۔۔!"

اس سے پہلے کہ میں سگریٹ نکال کر اسکو دوں اس نے میری انگلیوں میں سے جلتا ہوا سگریٹ نکال لیا ۔ اور زبان کی نوک سے اس کا کارک نم کر کے پینے لگی ۔ چند لمبے کش کھینچنے کے بعد اچانک اس نے سگریٹ میری طرف بڑھا دیا ۔

"لو میرا جھوٹا سگریٹ پیو ۔ مگر اس لذت سے براہ راست آشنا ہونے کی خواہش مت کرنا ۔۔۔!"

وہ ہنس پڑی اور میرے ذہن میں یادوں کی قوس و قزح دور تک تنتی چلی گئی ۔

اس کے جانے کے بعد میں نے اسی دن کلکتہ چھوڑ دیا ۔

اور ابھی چار دن پہلے عشرت کا خط آیا ہے ۔ وہ خط جو میرے لیے ایک سانحہ سے کم نہیں ۔ اس نے لکھا تھا کہ عزت آرا سے میری ملاقات کا حال ان لوگوں کو معلوم ہو گیا تھا ۔ اور ان لوگوں نے خوب اچھی طرح عزت آرا کی ڈنڈے سے پٹائی کی تھی ۔ میرے آنے کے کوئی ایک ہفتہ بعد ظفر صاحب کلکتہ تشریف لائے تو اس قدر ذلت اٹھانے کے باوجود وہ ان سے ملنے چلی آئی ۔ نتیجہ یہ کہ سارا گھر آگ بگولہ ہو گیا اور عزت آرا کے میاں نے اسے کھڑے کھڑے طلاق دیدی ۔

اور آج یہ ٹیلی گرام میرے سامنے پڑا ہے ۔ جس میں اس کی خودکشی کی اطلاع ہے اور میری بیوی مجھ سے پوچھ رہی ہے کہ یہ عزت آرا کون تھی ۔۔۔!

ڈاکٹر ولی الحق انصاری

عرفی شیرازی چند لطائف

عرفی شیرازی زبان فارسی کے ان چند شعراء میں ہے جنھیں ایک نئے طرز کا موجد سمجھا جاتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ ان خوش نصیبوں میں سے ہے کہ جن کی شہرت خود انکی زندگی ہی میں اس حد تک ہوئی کہ دوسرے شعرا کے کلام کو لوگوں نے دلوں سے بھلا دیا جیسا کہ عرفی کے ایک معاصر تقی الدین کاشی (صاحب خلاصۃ الاشعار) کی حسب ذیل عبارت سے ظاہر ہے۔[1]

"بے شائبہ اغراق و مبالغہ حقائق غزلیاتش بشابہ بر صفحات خو طرحای نقش بستہ کہ اشعار سوزدنان فارسی و عراق در کاشانہ نسیان بودن وجہے ندارد۔"

عرفی کی شہرت خود اس کی زندگی میں ہندوستان سے لے کر ترکی تک پھیلی ہوئی تھی۔[2] دوسرے شعراء اس کے طرز کی پیروی کرنا اپنے لئے باعث فخر سمجھتے تھے چنانچہ[3] ایک دوسرا معاصر عبدالباقی نہاوندی اپنی مشہور تصنیف مآثر رحیمی میں رقم طراز ہے کہ:

"مخترع طرز تازہ ایست کہ الحال در میان مردم معتبر است و مستعدان و سخن سنجان و نکتہ شناسان"

---

[1] خلاصۃ الاشعار (مخطوطہ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ)، ذکر عرفی شیرازی

[2] E.J.W.Gibb اپنی مشہور تصنیف میں رقم طراز ہیں کہ History of ottoman poetry, Vol. III chapter IX pp. 275-276

"He was recognised as a master by the contemporary Persian poets and as a matter of course, his works were forth with studied and imitated in Turkey. His infeluence together with that of the Indian "Faizi" forms the most potent foreign element in moulding the ottoman poetry of this period."

[3] مآثر رحیمی (مطبوعہ کلکتہ) جلد سوم صفحہ ۲۹۳۔ عرفی کے مخترع طرز تازہ ہونے کی اور زیادہ وضاحت عبدالباقی نہاوندی نے اپنے تصنیف کردہ دیباچہ کلیات عرفی میں کی ہے وہ لکھتے ہیں کہ: "طرز متقدمین و متاخرین کہ قبل از زمان سخن سنجی و نکتہ گزاری او در میدان فصاحت اسپ بلاغت راندہ بودند منسوخ ساختہ طرز تازہ گوئی کہ الحال در میان متعدد ربع مسکون پسندیدہ است، بمیان مردم عالم آوردہ۔ فاضلان این فن و استادان این علم بہ این طرز معتقد شدہ پایہ سخنوری و معراج نکتہ پردازی را بدین نہادند و شیخ ابوالفیض فیضی در ہندوستان و جمعے دیگر از فحول شعرا و ایران مثلا حکیم شفائی اصفہانی و مولانا شانی تکلو و سائر سخندان و سخنوران این بلاد در گفتار طرز خود را بہ طرز او آشنا ساختند...."

پسندیدہ ... دانستہ تتبع او می نماید۔ چنداں ابداع معانی غریبہ و مضامین عجیبہ و ابیات عارفانہ عاشقانہ
کردہ کہ ہرگز ہیچ کس نکردہ و بدین طور شہرتے کہ او را ہم رسیدہ ہیچ یک از امثال و اقران او را ہم نرسیدہ
و نخواہد رسید۔ چہ امثال و اقران کہ استادان سخنوران ماضیہ مثل خاقانی و انوری و سعدی و شیخ نظامی را در
زمان حیات این اشتہار در قصیدہ و غزل و مثنوی زیادہ شہرتش بجائے رسیدہ بود کہ دیوان غزلیات قصائد
او را اہل سخن و نکتہ دانان تعویذ وار بہ بازوے خویش بستہ شب و روز با خود ہمراہ می داشتند۔۔۔۔"

اور اس کے کلام کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ ہر کوچہ و بازار میں کتاب فروش اس کے دیوان کی نقلیں بیچتے پھرتے تھے اور اہل عراق و ہندوستان سب ہی بطور تبرک انھیں خریدا کرتے تھے چنانچہ ملا عبدالقادر بدایونی اس سلسلہ میں لکھتے ہیں کہ[۵۳]:

" او و حسین ثنائی از شعر عجب طالعے دارند کہ ہیچ کوچہ و بازارے نیست کہ کتاب فروشان دیوان ہر دو کس را
در سر راہ گرفتہ نایستند و عراقیان و ہندوستانیان نیز بہ تبرک می خرند۔۔۔۔"

متذکرہ بالا تذکرہ نگاروں کے بیانات تذکرہ نگاروں کے عام دستور کے مطابق مبالغہ پر مبنی نہیں ہیں بلکہ ان کی تصدیق خود ملک الشعراء فیضی جسے خود اہل ایران نے استاد کا مرتبہ دے رکھا تھا[۵۴] کے حسب ذیل الفاظ سے ہوتی ہے[۵۵]:

"بحق دوستی کہ عظیم تر سوگندے نمی داند کہ بہ بلندی و وفور قدرت و ایجاد معانی و چاشنی الفاظ و دقت
نظر فقیر کسے را چوں او ندیدہ و نہ شنیدہ"

بہ حیثیت شاعر کے عرفی کی بزرگی کے معترف ہونے کے باوجود مورخین اس کے کردار اور اخلاق و عادات کے متعلق اختلاف رائے رکھتے ہیں۔ ان میں کچھ ایسے ہیں جو اسے انتہائی متکبر و مغرور لکھتے ہیں لیکن کچھ ایسے بھی ہیں جو اس کی شگفتہ مزاجی، خوش اخلاقی اور خوش طبعی کے معترف و مداح ہیں چنانچہ فیضی جسے عرفی کا اس حد تک حریف قرار دیا جاتا ہے کہ کچھ مورخین کے بقول اس نے عرفی کو زہر تک دلوا دیا، وہ اس کے اخلاق کے متعلق لکھتا ہے کہ[۵۵]:

" واز تہذیب اخلاق چہ گوید کہ در خاکی بنیاد شیراز ذاتی باشد بر نگسی"

اور ایک دوسرا معاصر تقی کاشی جسے خود عرفی نے اپنے کلام کا انتخاب خلاصۃ الاشعار میں شامل کرنے کے لئے بھیجا تھا، فیضی کی عرفی کے اخلاق کے متعلق رائے کی حسب ذیل الفاظ میں تصدیق کرتا ہے[۵۶]:-

---

۵۳۔ منتخب التواریخ جلد سوم، صفحہ ۲۸۵
۵۴۔ شیخ علی نقی کمرہ اپنے ایک قصیدہ میں کہتا ہے:-

مرا فگند بہ نظم اموزم پہ تو فیضی	ابو الفیض آن گزین اکبر و شیخ کبیر من
ظہیر قدوہ پیشینیان حتیٰ ظہیر الدین	امیر زبدہ اہل زمان حتیٰ امیر من
اگر ہستم مجیر اندر سخن او ہست خاقانی	وگر من مستجیرم آستان او مجیر من
کیم با او رسد در شاعری دعویٰ ہم چشمی	کہ در این خانقاہم من مرید و دستگیر من

۵۵۔ بحوالہ شعر العجم، جلد سوم، صفحہ ۱۰ (طبع چہارم)
۵۶۔ خلاصۃ الاشعار (مخطوطہ علی گڑھ) ذکر عرفی شیرازی۔

"جماعتے کہ دیدہ اند وصحبت او در رسیدہ بگویند کہ مرد خوش طبع و ظرافت دوست بود و باوجود خود رائی کہ لشعریہ مستعدان و شعرائے زمان در میان ملاقات دقیقہ از دقائق خوش طبعی فروگزاشت نمی نمود و لطائفے کہ میان او و شعرائے دیار ہند خصوصاً شیخ ابوالفیض فیضی و دیگران گزشتہ در میان خوش طبعان مشہور اند ....؟"

تقی کاشی کی مندرجہ بالا عبارت سے ظاہر ہے کہ عرفی انتہائی خوش طبع و ظریف مزاج تھا اور اس کی اپنے معاصرین خصوصاً شیخ فیضی سے نوک جھونک رہا کرتی تھی اور ان کے لطیفے خود ان کی زندگی ہی میں لوگوں میں مشہور ہو چکے تھے افسوس ہے کہ یہ لطیفے

معاصرین عرفی میں سوائے ملا عبدالقادر بدایونی کے اور کسی نے تحریر نہیں کئے اور ملا صاحب نے بھی ان میں سے صرف ایک ہی لطیفہ قلمبند کیا ہے جسے اکثر بعد کے تذکرہ نگاروں نے نقل کیا ہے اگرچہ ان میں سے کچھ نے اس میں اپنی طرف سے ایسی حاشیہ آرائی بھی کی ہے جس سے انھوں نے فیضی کو بے دین و ملحد قرار دینے کی کوشش کی ہے۔ ملا عبدالقادر بدایونی کا بیان ہے کہ ایک روز عرفی شیخ فیضی کے مکان پر گیا اور اس نے فیضی کو ایک کتے کے پلے کے ساتھ کھیلتا ہوا پایا۔ عرفی کو فیضی کی یہ حرکت بری معلوم ہوئی اور اس نے طنزاً فیضی سے پوچھا کہ اس مخدوم زادہ کا کیا نام ہے۔ فیضی فوراً اس طنز کو سمجھ گیا اور اس نے جواب میں عرفی پر چوٹ کرتے ہوئے کہا "عرفی" یعنی یہی مشہور ناموں میں سے ایک۔ اس جواب کو سن کر بھلا عرفی کب چوکنے والا تھا اس نے فوراً جواب دیا "مبارک باشد" یعنی مبارک ہو لیکن حقیقتاً اس نے فیضی پر چوٹ کی تھی اس لئے کہ فیضی کے باپ کا نام شیخ مبارک تھا اور عرفی کے جواب کا مطلب یہ بھی نکلتا تھا کہ کتے کے بچے کا نام عرفی نہیں بلکہ مبارک ہو گا۔ ملا بدایونی اس لطیفہ کو حسب ذیل الفاظ میں بیان کرتے ہیں[8]!

"روزے بخانہ شیخ فیضی آمد چون سگ بچہ را با شیخ مخلوط دید پرسید کہ این مخدوم زادہ را چہ نام است۔ شیخ گفت "عرفی" او در بدیہہ گفت "مبارک باشد" و شیخ بسیار برہم و درہم شد اما چہ فائدہ؟"

اس لطیفہ کو تقریباً ملا بدایونی ہی کے الفاظ میں صادق ہمدانی (مصنف طبقات شاہجہانی) بختاور خان (مصنف مرآۃ العالم) اور حسین دوست (صاحب تذکرہ حسینی) نے بھی بیان کیا ہے لیکن خافی خان نے اس پر عبارت آرائی کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ[9]:

"روزے عرفی بہ عیادت شیخ فیضی رفتہ بود۔ نزدیک خوابگاہ او سگ بچہ چند دید کہ قلادہائے زربفت بازنجیر طلا در گردن داشتند۔ پرسید کہ مخدوم زادہا بچہ اسم موسوم اند۔ فیضی گفت بہ اسم عرفی۔ در جواب از زبان عرفی برآمد مبارک باشد؟"

حسین قلی خان عاشقی اس پر اور رنگ آمیزی کرتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ[10]:

"گویند شیخ فیضی را چند سگ مع قلادہ طلائی در سن کلابتوی وجل زربفت بودند۔ روزے عرفی بدیدن شیخ رفت و بمشاہدہ کلاب بہ این زینت و آرائش عمداً خود را بر در تجاہل پرسید کہ این صاحبزادہا چہ نام دارند۔ شیخ گفت "عرفی" مولانا گفت "مبارک"؟

---

[8] - منتخب التواریخ (مطبوعہ کلکتہ) جلد سوم، صفحہ ۲۸۵

[9] - منتخب اللباب (مطبوعہ) جلد اول، صفحہ ۲۰۰

[10] - نشتر عشق (مخطوطہ رضا لائبریری، رامپور) ذکر عرفی شیرازی

[11] - قرآن العجائب (، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ)، صفحہ ۲۷۵

محمد علی سندیلوی نے اس واقعہ پر اور زیادہ حاشیہ آرائی کی ہے چنانچہ وہ مخزن الغرائب میں لکھتے ہیں کہ

"روزے مولانا عرفی بہ جہت دیدن شیخ فیضی رفت۔ دید کہ سگ تولہ اوراق مصحف مجید را کہ دران روز ہا تفسیر کردہ پامال می سازند۔ پرسید کہ نام صاحبزادگان چیست۔ گفت "عرفی" گفت "مبارک باشد" تا نام پدر فیضی مبارک بودہ ....."

متذکرہ بالا تمام تذکرہ نگاروں کے برخلاف فضل علی خاں نے بستان بے خزاں میں اس لطیفہ کو مابین ملا عرفی و شیخ مبارک لکھا ہے اور ظرافت و طنز کے پہلو کو اور زیادہ اجاگر کر دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ عرفی شیخ مبارک سے ملنے گیا تھا اور وہاں اس نے کتوں کو مسند پر رونق افروز پاکر شیخ سے پوچھا کہ ان صاحبزادوں کا کیا نام ہے۔ اس پر شیخ مبارک نے جل کر جواب دیا کہ "عرفی" یعنی یہی عام نام جو ہوا کرتے ہیں۔ عرفی شیخ کی اس جھنجھلاہٹ پر مسکرایا اور اس نے کہا "مبارک باد" جس کے دو معنی تھے ایک تو یہ کہ آپ کو مبارک ہو دوسرے یہ کہ ان کا نام مبارک ہوگا۔ شیخ کو یہ بات اور زیادہ ناگوار ہوئی اور انھوں نے طیش میں آکر کہا کہ تجھ میں اور کتے میں کیا فرق ہے اس پر عرفی نے اس فاصلے کو جو اس کے اور شیخ کے درمیان تھا ناپ کر بتایا کہ ایک بالشت۔ فضل علی خاں کا بیان کہ وہ یہ لطیفہ ان ہی کے درج ذیل الفاظ میں سنیے "روزے شاعری بدیدن شیخ مبارک پدر ابوالفضل و فیضی رفت۔ دید کہ سگاں چند بر دے مسند نشستہ اند۔ بہ ظرافت پرسید کہ نام ایں صاحبزادگان چیست۔ گفت کہ "ہمیں عرفی است"۔ عرفی تبسم کردہ گفت "مبارک باد"۔ شیخ ناخوش آمدہ گفت "در تو و سگ چہ فرق است"۔ عرفی بہ فاصلہ کہ نشستہ بود در بر زمین گزاشتہ گفت "یک وجب"....."

متذکرہ بالا لطیفے کے علاوہ عرفی کے کچھ اور لطیفے بھی مشہور ہیں جن کا ذکر بارھویں صدی ہجری کے کچھ تذکرہ نویسوں نے کیا ہے۔ ان میں سے ایک جو بہت مشہور ہے اور جس کو مختلف تذکرہ نگاروں نے بیان کیا ہے یہ ہے کہ ابوالفضل و فیضی اپنے حسد کی بنا پر یہ نہ چاہتے تھے کہ عرفی کی دربار اکبری تک رسائی ہو۔ لیکن وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکے تو انھوں نے اسے بادشاہ کی نظروں سے گرانا چاہا چنانچہ عرفی کی دربار میں حاضری کے پہلے ہی روز ابوالفضل نے اس سے پوچھا کہ تمھارے مذہب میں کوا حلال ہے یا حرام۔ عرفی نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ کچھ وقفے کے بعد فیضی نے اس سے سوال کیا کہ تمھارے مذہب میں سور حلال ہے یا حرام۔ عرفی نے اس کا بھی کچھ جواب نہ دیا۔ لیکن اس عرصے میں بادشاہ بھی اس کی طرف متوجہ ہو گیا اور اس نے اس سے پوچھا کہ آخر جواب کیوں نہیں دیتے۔ تب عرفی نے زبان کشائی کی اور کہا کہ اس مسئلے کا جواب صاف ہے ہر شخص کو معلوم ہے کہ دونوں (یعنی زاغ اور خوک) کو کھاتے ہیں لیکن حقیقتاً دونوں سے اس کی مراد ابوالفضل اور فیضی تھے۔ اکبر کو اس جواب پر ہنسی آگئی اور اسے انعام و اکرام سے نوازا۔ یہ لطیفہ سب سے پہلے شیر خاں لودی نے اپنے تذکرہ مراۃ الخیال میں تحریر کیا ہے۔ ممکن ہے کہ ان تک یہ لطیفہ سینہ بہ سینہ پہونچا ہو۔ بہرحال وہ اس کو حسب ذیل الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

"ابوالفضل و فیضی را بار ہا الزام داد از آں جملہ آں کہ چوں ایشاں نمی خواستند کہ اہل استعداد پیش آیند و مذہب تشیعش معلوم بود، بہ ارادہ آں کہ او را در نظر بادشاہ خفیف سازند اول روز ملازمت ابوالفضل از و پرسید کہ در مذہب شما زاغ حرام است یا حلال۔ عرفی جواب نداد۔ بعد از و فیضی پرسید کہ در مذہب شما خوک حرام است یا حلال۔ عرفی جواب نداد باز تغافل کرد۔ درایں حال بادشاہ متوجہ شدہ فرمود کہ چرا جواب نمی دہی۔ گفت جواب ایں مسئلہ بدیہی است کہ ہر کس می داند کہ ہر دو را می خورند یعنی زاغ و خوک و

خلاصہ اشارہ بجانب ہر دو برادر باشد۔ بادشاہ بخندید و انعام و اکرام فراخور حالش بخشید۔۔۔۔"

بعد کے تذکرہ نگاروں میں قدرت اللہ گوپاموی (صاحب نتائج الافکار) حسین دوست (صاحب تذکرۂ حسینی) صاحب نشتر عشق، افضل علی خاں (صاحب بستان بے خزاں) قدرت اللہ شوق (صاحب تکملۃ الشعراء) اور احمد علی ہاشمی (صاحب مخزن الغرائب) سبھوں نے اس لطیفے کو بیان کیا ہے، لیکن موخر الذکر نے اس کے ساتھ ہی ساتھ حسب ذیل عبارت کا بھی اضافہ کیا ہے؛[۱۲]

"ولیکن نزد ایں حقیر ایں نقل معقول نمی نماید چرا کہ پیش چنیں بادشاہ صاحب سطوت و ہیبت کرا طاقت مجال باشد کہ چنیں حرف واہی و رکیک کہ بعید از ادب است بر زبان آورد۔ اغلب کہ ایں تصنیف از ظرفا باشد"

محمد علی تبریزی (صاحب ریحانۃ الادب) نے اس لطیفے میں اتنی حاشیہ آرائی اور کی ہے کہ حسد کے علاوہ تعصب مذہبی کی وجہ سے بھی ابوالفضل و فیضی نے عرفی سے ایسے سوال کیے تھے۔ جہاں تک اس لطیفے کی صداقت کا سوال ہے کسی بھی معاصر تذکرہ نگار نے اس کا ذکر نہیں کیا ہے، ممکن ہے کہ شیر خاں لودی تک یہ سینہ بہ سینہ پہونچا ہو لیکن جیسا کہ احمد علی صاحب ہاشمی کا خیال ہے، یہ کچھ بعید از قیاس معلوم ہوتا ہے کہ اکبر کے دربار میں اس قسم کی گفتگو ہوئی ہو۔ ممکن ہے کہ یہ لطیفہ کسی اور ہی محفل میں ان تینوں حضرات کے درمیان پیش آیا ہو۔ جہاں تک ابوالفضل و فیضی کے تعصب مذہب کا خیال ہے یہ بات طے شدہ کہ دونوں بھائی اس لعنت سے پاک تھے۔ وہ دونوں اتنے وسیع المشرب تھے کہ یقین کے ساتھ یہ کہنا ہی مشکل ہے کہ خود ان کا مذہب کیا تھا[۱۳]۔ اس لیے یہ بات بالکل بعید از قیاس ہے کہ ابوالفضل اور فیضی نے متذکرہ بالا سوالات کسی مذہبی دل آزاری کے خیال سے کیے ہوں گے۔ لہٰذا اس لطیفے کے ضمن میں تعصب مذہبی کا ذکر کرنا یقیناً ان دونوں حضرات کے ساتھ سراسر زیادتی ہے۔

عرفی کا ایک تیسرا لطیفہ جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اہل ایران اہل ہند کو زباں دانی کے معاملے میں اپنے مقابلے میں کتنا حقیر سمجھتے تھے یہ ہے کہ ایک روز عرفی ابوالفضل کے مکان پر گیا اور اس نے دیکھا کہ ابوالفضل قلم ہاتھ میں لیے کچھ سوچ رہا ہے۔ عرفی نے پوچھا کہ قبلہ کیا غور فرما رہے ہیں؟ ابوالفضل نے جواب دیا کہ بھائی فیضی کی صنعت مہملہ میں لکھی ہوئی قرآن مجید کی تفسیر کا دیباچہ اسی صنعت میں لکھ رہا ہوں اور چاہتا ہوں کہ شیخ مبارک کے نام کو بھی اس طرح لکھوں کہ اس میں کوئی لفظ ایسا نہ آئے کہ جس میں نقطہ ہو۔ عرفی نے فوراً جواب دیا کہ اس میں غور و فکر کی کیا بات ہے "ممارک" لکھ دیجئے۔ عرفی کا مطلب یہ تھا کہ اگر ابوالفضل مبارک کے بجائے ممارک بھی لکھ دے تب بھی کوئی اس کی گرفت نہ کرے گا۔ اس لطیفے کا راوی محمد ہاشم خافی خاں ہے جو اسے منتخب اللباب میں حسب ذیل الفاظ میں بیان کرتا ہے[۱۴]۔

"گویند روزے عرفی وارد خانۂ ابوالفضل گردید و ابوالفضل قلم در دست گرفتہ در تحریر دیباچہ قرآن کہ می خواست بلا نقط تصنیف نماید بہ بحر فکر فرو رفتہ بود۔ عرفی پرسید کہ مخدوم در چہ فکر اید۔

---

[۱۲] بستان بے خزاں (مخطوطہ رضا لائبریری رامپور) ذکر عرفی شیرازی

[۱۳] ابوالفضل و فیضی کے خیالات وہی تھے جو ان کے والد شیخ مبارک کے تھے اور شیخ مبارک کے متعلق خافی خاں کا خیال ہے کہ وہ شیعیت کی طرف رجحان رکھتے تھے چنانچہ منتخب اللباب جلد اول صفحہ ۲۰۰ پر وہ شیخ مبارک کے متعلق لکھتے ہیں کہ "میل بہ مذہب تشیع بہم رسانده"

[۱۴] منتخب اللباب (مطبوعہ کلکتہ)، جلد اول، صفحہ ۲۰۰۔

[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

الفاظ میں بیان کرتے ہیں [۱۴]

"یکے از آشنایش صد اشرفی بدست ملازمے داد و گفت نزد ملا عرفی برد و بگو کہ یک کف

زر سرخ فرستادہ شد خواہد رسید برساں (کذا) ملازم شفقت اشرفی سرفہ کرد و پنجاہ داد و
سلام و پیام ادا کرد۔ ملا متامل شد کہ اگر از کف مراد است بجواب ابجد صد می باید۔ گفت از ما ہم
سلام خواہی گفت کم از کف بنود۔ او خوش وقت شد کہ طرفین پیام زبانی حوالہ کردند۔ ہمیں کہ ملازم
ادائے جواب کرد آنقا فہمیدہ گفت شصت اشرفی بیار و بار دیگر مرتکب ایں حرکت مباشی۔ او حوالہ کرد"

عرفی کے ایران سے ہندوستان آنے کے متعلق بھی ایک لطیفہ آقا محمد علی داعی الاسلام نے اپنی تصنیف شعر و شاعری عرفی میں تحریر کیا ہے لیکن جیسا کہ خود داعی الاسلام کا خیال ہے، غالباً لوگوں نے عرفی کے متعلق اس قصہ کو اسکے مشہور قصیدہ ترجمۃ الشوق کو پڑھنے کے بعد تصنیف کر لیا۔ یہ قصہ بھی کیونکہ کافی دلچسپ ہے اس لیے پیش کیا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ عرفی ہندوستان آنے سے قبل نجف اشرف گیا تھا اور وہاں ایک خبر گرم تھی کہ ایک شاعر نے حضرت علی مرتضٰے کی شان میں ایک قصیدہ کہا۔ جس کا مطلع یہ ہے

شمع می ریزم برایت یا امیر المومنین   ہم تو گلدستہ بیایت یا امیر المومنین

اور اسے خواب میں بشارت ہوئی کہ فلاں تاجر کے پاس چلا جائے اور چار سو تومان صلہ لے اس ہدایت کے مطابق شاعر تاجر کے پاس گیا اور اس سے صلہ وصول کر لیا۔ یہ قصہ سن کر عرفی کے دل میں لالچ سمایا اور اس نے بھی حضرت علیؑ کی شان میں ایک قصیدہ تصنیف کیا۔ جس کا مطلع حسب ذیل ہے:۔

ایں بارگاہ کیست کہ گویند بے ہراس   کاے اوج عرش سطح حضیض ترا مماس

اور مقبرہ مطہرہ کے سامنے اس کو پڑھا اور رات کو بشارت کا امیدوار رہا لیکن صبح تک ایسے کسی قسم کی بشارت نہ ہوئی۔ دوسرے روز اس نے روضۂ مبارک کے سامنے جاکر پھر اپنا قصیدہ پڑھا اور اس رات بھی بشارت ہونے کا منتظر رہا لیکن اس مرتبہ بھی اسے خواب میں بشارت نہ ہوئی۔ تیسرے روز صلہ کی طرف سے ناامید ہو کر وہ پھر روضۂ مطہرہ پر گیا اور حضرت علی مرتضٰے کو مخاطب کرکے کہا کہ

"یا علی امامت چیز دیگر است و شعر فہمی چیز دیگر۔ آں شاعر کہ قصیدہ مہمل در مدحت
ساخت برائے چہار صد تومان صلہ دادی و برائے چناں قصیدہ عالی من ہیچ ندادی"

اور اس کے بعد وہاں سے واپس چلا آیا۔ اس رات کو اس نے خواب میں دیکھا کہ جناب علی مرتضٰے عالم غیض میں فرماتے ہیں کہ۔

"از نجف بر و دالا استخوانہایت را خورد می کنم"

عرفی پر اس واقعہ سے کچھ ایسی ہیبت طاری ہوئی کہ صبح ہوتے ہی وہ نجف اشرف سے روانہ ہو گیا اور اس نے ایران ہی کو خیر باد کہہ دیا اور ہندوستان آکر اپنی گستاخی کی معذرت میں قصیدہ ترجمۃ الشوق نظم کیا۔

یہ ہیں وہ چند لطیفے جو کہ مختلف تذکروں میں عرفی کے نام سے منسوب ہیں یہ امر تو یقینی ہے کہ عرفی ظریف الطبع تھا لیکن ان لطیفوں کا ذکر کیونکہ معاصرین عرفی نے نہیں کیا ہے اس لیے یہ وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ واقعی وہ پیش بھی آئے تھے یا نہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اس کی ظریف طبیعت نے وقتاً فوقتاً گلکاریاں کی ہوں گی لیکن افسوس ہے کہ اس کے یہ لطیفے وقتی طور پر لوگوں کی تفریح طبع کا باعث بن کر رہ گئے اور معاصرین تذکرہ نگاروں نے انھیں محض ہزل سمجھ کر اپنے تذکروں میں جگہ دی۔

بھی تھے اس لئے ان کا کام قبیلہ کی چھوٹی سی دنیا میں مثالی زندگی کی نقشہ کشی کا کام دیتا تھا۔

لیکن قصیدہ نے الف لیلہ کو براہ راست جنم نہیں دیا۔ یہ خطیبانہ نثر کے ذمہ تھا کہ وہ ریگ زاروں سے بہت دور، کوفہ، بصرہ، موصل، دمشق اور قاہرہ کے شہروں میں الف لیلہ کو جنم دیتی۔ ان شہروں میں شاعروں کا فرض ادا کرنے والے قصہ گو موجود تھے۔ یہ اسلام کی ابتدائی لڑائیوں، پرانے معرکوں، سورماؤں کی زندگی اور قبائل کی تاریخ بیان کرتے تھے۔ جب صحرا نوردوں نے روم و ایران کے شہنشاہوں سے بڑی سلطنتیں چھین کر دنیا تعمیر کرنا شروع کی تو ان کی مادیت پرستی کا ردعمل بھی ہوا اور ان شاداب شہروں میں صوفیوں کا ایک طبقہ ابھرا۔ یہ لوگ زندگی کے اخلاقی پہلو پر زور دیتے تھے اور ان حقائق کو حکایتوں کے ذریعے ادا کرتے تھے ایک اعتبار سے یہ صحرا کے ان راویوں کے جانشین تھے جو کھلے آسمان کے نیچے راتوں کو قبیلہ کا رزمیہ، حسن و عشق کی واردات یا کسی اکیلے بہادر کی کوئی کہانی سنایا کرتے تھے۔ شہروں کے یہ قصہ گو اور صحرائی راوی اپنے سامعین سے صرف بالشت بھر دور ہوتے تھے اس لئے چہروں کے آثار چڑھاؤ پر نظر برابر رہتی تھی۔ احساس کی ہر پرچھائیں کا اندازہ ممکن تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ راوی اور قصہ گو نے خون کو گرمانے اور فکر و تخیل کو حرکت میں لانے کی خاطر شاعری اور شاعرانہ زبان سے کام لیا۔ دوسری طرف اس نے خام مواد کی تلاش میں پرانی کہانیوں، تاریخ اور خیال آرائی کو استعمال کرنے میں بھی تکلف نہیں کیا۔ اسکو تو سامعین سے داد لینا تھی۔ اس اعتبار سے بغداد کے قصہ گو کا رابطہ انسانوں سے بہت قریبی تھا۔ اس کی فن کاری جیتے جاگتے آدمیوں کے درمیان ایک زندہ تعلق کا درجہ رکھتی تھی۔ یہ ناممکن تھا کہ وہ کسی بھی انسانی جذبہ کو نظر انداز کر سکتا۔

یہ بات یقینی طور پر نہیں کہی جا سکتی کہ ہمارے قصہ گو نے الف لیلہ کی ابتدا کس سنہ میں کی، بس اتنا ہے کہ اس ایرانی مجموعہ نے اس کی بسم اللہ کی جو خود ہندوستانی کہانیوں کا ایک چربہ تھا۔ الف لیلہ کا آغاز دوسری صدی ہجری کے بعد ہوا اور اس نے ایک ہزار برس کی مدت تک برابر اپنا ارتقا جاری رکھا۔ اس دوران میں تحریری ادب نے چھوٹے چھوٹے دلچسپ ڈرامائی واقعات کی ایک صنف بھی پیدا کر لی جو مقامات کہلائی۔ دسویں صدی ہجری میں بدیع الزماں ہمدانی نے اپنے کردار ابو الفتح کے ذریعے اور گیارہویں ہجری میں الحریری نے اپنے کردار ابو زید سروجی کے ذریعے مقامات کو آخری فن کارانہ بلندیوں پر پہونچا دیا تب بھی یہ ظاہر تھا کہ وہ الف لیلہ کے قصہ گو اور راوی کے خوشہ چین ہیں فرق صرف یہ تھا کہ مقامات لکھے گئے تھے۔ ان میں لسانی ندرت تھی۔ زبان کے داؤں پیچ تھے اس لئے لسانیات کا کارنامہ قرار پانے کے باوجود ان میں زندگی کی وہ بھرپور جھلک نہیں آ سکی جس نے الف لیلہ کو مالا مال کر رکھا ہے۔

الف لیلہ میں عرب شاعری کا مزاج ہے۔ شاعری حقیقت و مجاز کا ایک مرکب ہوتی ہے الف لیلہ میں بھی مجاز کی ایک دنیا ہے۔ یہ جنوں، جادوگروں، پریوں سے آباد ہے۔ یہ وہ قوتیں ہیں جو قرون وسطیٰ کے انسان سے بہت بڑھے چڑھے تھے۔ یہ ہوا میں اڑتے تھے۔ زمین کے پردے پھاڑ کر عرب سے چین پہونچ جاتے تھے۔ آناً فاناً بڑی بڑی عمارتیں اور محل کھڑے کر دیتے تھے۔ یہ انسانوں ان کی بستیوں اور شہروں کو برباد کر ڈالتے تھے۔ الف لیلہ میں سحر و ساحری، الہ دین کے چراغ، اڑن کھٹولہ اور ارواح خبیثہ کو قابو میں لانے والی ذاتوں کی ایک دنیا آباد ہے۔ یہ سب کچھ حقیقی نہیں ہے۔ مجاز اور خیال بلکہ خواہش ہے۔ یہاں بیسویں صدی کی سائنس اور ٹکنالوجی کا تصور کیا جا رہا ہے۔ فطرت اور فطرت کی طاقتوں پر قابو پانے کی اس خواہش میں یقین بھی جھلک رہا ہے کہ آدم زاد اس کائنات کی سب سے بڑی حقیقت ہے اور اس کے سوا جو کچھ ہے وہ مجاز ہے۔ ان دیکھی اور انجانی قوتوں کو اس کی خدمت بجا لانا ہے۔ شاعرانہ خود کلامی جس طرح زمان و مکان کے پردے پار کر کے نامعلوم لمحوں کا سبب بنتی ہے اسی طرح الف لیلہ کی یہ شاعری محیر العقول طاقتوں کے تصور کے ذریعہ انسانی امکانات کی ایک تصویر پیش کرتی ہے۔ شاید یہ قصہ گو جانتے تھے کہ ایک دن پر اسرار طاقتوں کی کنجی انسان کے ہاتھوں میں ہوگی۔ کم از کم ان کی یہ خواہش مزید تھی اور اسی خواہش نے بھاپ، بجلی اور جوہری ذرات پر قابو حاصل کیا ہے۔ الف لیلہ میں یہ

ساری طاقتیں انسان کی خدمت کے لئے سامنے آتی ہیں اور کبھی اس کی راہ میں کانٹے بھی بوتی ہیں ۔ یہی شکایت ہم کو آج اپنے صنعتی تمدن سے ہے ۔ اس نے ہم کو بہت کچھ دیا ہے اور بہت کچھ چھین بھی لیا ہے ۔ انسان جب اپنے سے زیادہ طاقت رکھنے والے عناصر پر قابو پاتا ہے تو اس کو کچھ ایسا ہی تجربہ ہوتا ہے ۔

الف لیلہ میں مافوق الفطرت عناصر کی کارفرمائی اس کے تانے بانے کا ایک جز ہے ۔ دوسری طرف اس میں انسانی کردار ہیں اور یہ ایسے کردار ہیں جو قرون وسطیٰ کے شہر میں واقعی موجود ہیں ۔ بادشاہ ، اور شہزادے ، وزیر اور وزیر زادے ، بڑے بڑے تاجر ، عام پیشہ ور لوگ اور پھر عورت ، عورت کے ان گنت روپ الف لیلہ میں نظر آتے ہیں ۔ یہ شہزادی ہے ، وزیر زادی ہے ، تاجر زادی ہے اور جادوگرنی ہے ۔ یہ نیکی اور حسن کی مورت بھی ہے اور بد اطوار ، بے اعتبار بھی ، ہر ایک داستان میں یہ ساری انسانی جدوجہد کا مقصود ہے ۔ کیونکہ الف لیلہ کی تقریباً ہر کہانی عشق کے گرد گھومتی ہے ۔ ان سب عورتوں کی سرتاج شہرزاد ہے جس نے ایک بادشاہ سے یہ جانتے بوجھتے شادی کی کہ وہ اپنی ملکہ کی بے وفائی دیکھ کر عورتوں سے بیزار ہو گیا تھا اور ہر شب ایک نئی عورت کے ساتھ بسر کر کے سویرے اس کو جلاد کے حوالے کر دیتا تھا ۔ شہرزاد نے پہلی رات ہی ایک کہانی ادھوری کہی تھی کہ سویرا ہو گیا اور بادشاہ نے اس کو پورا سننے کی خواہش میں اس کا قتل موقوف رکھا ۔ اس طرح یہ سلسلہ ایک ہزار اکیو ایک رات جاری رہا ۔ اس مدت میں الف لیلہ کی ساری کہانیاں سنی سنائی جا چکیں تو وہ بادشاہ بالکل بدل چکا تھا ۔

یہ تبدیلی معمولی نہیں ہے اور یہی الف لیلہ کی معنویت ہے ۔ کہانیوں کی اس داستان در داستان سلسلہ کی شیرازہ بندی بھی اسی تبدیلی سے وابستہ ہے ۔ دراصل قرون وسطیٰ کے قصہ گو نے زندگی پر تنقید عالیہ کے لئے شہرزاد کو اپنا ترجمان بنایا ہے ۔ وہ ایک اور علامت بادشاہ کی حریف ہے ۔ یہ بادشاہ اقتدار ، دست رسی اور قابو پانے کی انسانی خواہش ہے ۔ جو کائنات پر چھا جانا چاہتی ہے مگر زندگی سے ناواقف ، ادھوری اور اندھی ہے ۔ صرف ایک محبت ، ایک محبت میں محبوب کی بے وفائی سے اس کی نظر میں سارا تناسب بگڑ جاتا ہے اور وہ تخریب ، نفرت اور موت کی منفی علامت بن کر رہ جاتا ہے ۔ اس حالت میں شہرزاد کے سرخ ہونٹوں سے اس کا زندگی کا درس ملتا ہے ۔ شہرزاد اس کو نیکی ، بدی ، محبت اور رقابت ، کامیابی اور ناکامی ، دکھ اور سکھ کے بیشمار قصے سناتی ہے اور ان کے رنگارنگ سلسلہ سے یہ سبق ملتا ہے کہ زندگی تضاد اور جدل باہمی کرنے والے عناصر کا نام ہے ۔ یہ صرف سفید یا صرف سیاہ نہیں ہے بلکہ زندگی میں ان گنت دھاریاں ہیں ۔ یہ خیر و شر کا ایک آمیزہ ہے جس میں کبھی شر کو خیر پر کامیابی حاصل ہوتی ہے اور کبھی خیر کو شر پر مگر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ زندگی کا اصل قانون کیا ہے ۔ اس طرح شہرزاد نے الف لیلہ کے بادشاہ سے بے اعتدالی اور اس کے جلاد سے تلوار واپس لے لی ۔

شہرزاد کے مرنے کھپنے کے صدیوں بعد آج ہم الف لیلہ کی داستانوں کے اس طویل سلسلہ کے پار زندگی کو جھانک کر دیکھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم آغاز اور انجام کو سب سے پہلے نگاہ میں رکھیں اور پھر اس کینوس پر نظر ڈالیں جس پر عرب راویوں نے بیشمار نقش بنائے ہیں اور تصویریں کھینچی ہیں ۔ ان تصویروں میں بڑی جانداری ہے ۔ اتنی زیادہ کہ اکثر جگہ اشرافیہ کا مسخ بگڑ جاتا ہے جنسی بیان کھلا کھلا ہے ۔ عورت کے سراپا میں جسم کا گداز اور قوس کا بیان ہے ۔ کر کولھوں اور سینے کا ذکر ہے ۔ یہ لذت پرستی ضرور ہے مگر الف لیلہ کے راوی کے سامعین تندرست اور توانا مرد تھے ۔ اس زمانے میں بہو بیٹیوں کی جگہ حرم میں تھی ۔

لیکن یہ الزام لگانا ناانصافی ہوگی کہ الف لیلیٰ فحش ہے ۔ اس کی عریانی کلاسیکل ادب کی صاف گوئی کے سوا کچھ نہیں ۔ یہ جاہلیت کی عرب شاعری کا ایک عکس ہے اور انسانی زندگی کے بارے میں اس عرب رویہ کی ترجمانی ہے جس نے اپنا روپ بیسویں صدی میں بھی نہیں

بدلا۔ گرم علاقوں کے کھجور اونٹ کے دودھ اور گوشت پر بسر اوقات کرنے والے اپنی داخلی زندگی کو خارجی زندگی سے ہم آہنگ رکھنے کے عادی تھے۔ ان کو یونانیوں، رومیوں، ہندوستانیوں کی طرح اپنے کلاسیکل عہد میں زندگی سے شرمانا کبھی نہیں آیا۔ دشواری یہ ہے کہ چالیس پچاس کروڑ غیر عرب مسلمانوں کے لئے وہ سراپا تقدیس ہیں۔ ان کی زبان خدا کی زبان ہے اور وہ غیر عرب مسلمانوں کی نظر میں جلیل القدر پیغمبر کے ہم قوم ہیں۔ اسلام نے تیرہ سو برس کی مدت میں اخلاقیات، انسانی فضائل اور مابعد الطبیعات کے انسانی ذخیرہ میں جتنا بھی روشن اضافہ کیا ہے وہ سب عربوں کے حساب میں زبردستی لکھ دیا گیا ہے حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ تقدیس واحترام کے ان سارے کارناموں میں عرب قوم کے ذہن کا حصہ مشکل دس فی صد ہے۔ پہلی صدی ہجری کے اولین نصف حصہ کے بعد عرب پھر وہی عرب ہو گئے تھے جن کو اپنے آبا و اجداد کی سنت اللہ اور رسول کی سنت سے زیادہ عزیز تھی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو عرب سماج میں خیر و شر کی وہ کشمکش نہ ہوتی جس کی تصویریں الف لیلہ کے بدکردار مرد اور بدکار عورتیں پیش کرتی ہیں۔ جب عرب سورماؤں نے ایک بڑی سلطنت اور ایک بڑی تہذیب کا سنگ بنیاد رکھا تو پھر وہ آدم کے گنہگار فرزند ہو چکے تھے۔ ہم لوگ چونکہ خود بھی فرشتے نہیں ہیں اس لئے ہم کو اس سانحہ پر آنسو بہانے کا کوئی اخلاقی جواز حاصل نہیں بلکہ ہمارا کام صرف اتنا ہے کہ الف لیلہ کی سحر آفریں دنیا میں پہنچیں تو اس کی ماورائیت میں کھو کر نہ رہ جائیں بلکہ اس کے آغاز اور انجام کے اس ربط کو سمجھیں جس کے درمیان زندگی کی رنگا رنگی چھپی ہوئی ہے۔ صرف اسی صورت میں ہم شہرزاد سے وہ سبق لے سکتے ہیں جو اس قنوطی بادشاہ نے لیا تھا۔ اس کے بعد نہ الف لیلہ کو سمجھنا مشکل رہتا ہے نہ ان عربوں کو جن کی زندگی الف لیلہ میں جھلک آئی ہے۔

اگلے شمارے میں

مضامین:-
سید احتشام حسین، انفرادیت اور ادبی رجحانات
قاضی سلیم، جدیدیت

جدید شاعری: ایک مبحوثہ
ڈاکٹر محمد حسن، ڈاکٹر وحید اختر
زبیر رضوی، محمد علوی

کچھ تو کہیئے: ایک مباحثہ
ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، عتیق احمد صدیقی،
کرشن موہن، محمود ہاشمی
زرینہ ثانی، راج نرائن راز

ناولٹ:-
قاضی عبد الستار: دارا شکوہ

نظمیں:-
عبد العزیز خالد، محمد علوی، قمر رئیس،
وارث کرمانی، شہریار، علیم اللہ حالی
قیصر قلندر، ساغر مہدی، سید احمد شمیم،
اختر نظمی، حسن فرخ، خالد رحیم،

غزلیں:-
خلیل الرحمن اعظمی، شہاب جعفری،
شارق میرٹھی، جمیل کلیمی،
جون ایلیا، ممتاز راشد
شاہد اعظمی، حنیف کیفی برلوی
حیدر شاہین
شاہد ماہلی
عادل جعفری

افسانے:-
جیلانی بانو
سریندر پرکاش
عفت موہانی
نازش انصاری
انوار علیگی
سید محمد الحسن رضوی (طنز و مزاح)

تبصرے:-
منظر سلیم، ڈاکٹر وارث کرمانی، کنول کرشن لالی
زلمی، تنویر، شہریار۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

مجھے خیال آیا کہ اگر میری تنہا میز پر دام جی کی خوبصورت بیٹی بینا آ نکلی تو میں یہ نمکین بسکٹ چبا چبا کر اس کے باپ کے پر ذائقہ نمک سے لطف اندوز ہو ہو کر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لوں گا اور اس دن کے جھگڑے کی اس سے معافی مانگ لوں گا۔

"معاف کر دو بینا۔ دیکھو میں تمہارے ڈیڈی کی ملازمت سے صرف تمہاری وجہ سے استعفا نہیں دیتا، ورنہ شیام پرشاد مجھے پورے ڈھائی ہزار ماہانہ کی آفر کر چکا ہے۔

بینا ــ بینا ــ آؤ ڈانس کریں ــــــ"

میں اپنی کرسی پر بیٹھا بیٹھا بینا کے ساتھ ناچ رہا تھا اور میری میز پر سوائے میرے اور کوئی نہ تھا اور اپنی میز کی دوا اور کرسیوں پر بھی گویا میں ہی بیٹھا تھا اور ہم تینوں یعنی میں اور میں ایک دوسرے کو یقین دلا رہے تھے کہ بینا کو آج گھیر کر ہی دم لیں گے۔ اور پھر میں ــــ نہیں میں ــــ نو، نی ــــ او حرام خور و، پہلے بسکٹوں کو پیک تو کر لو، پھر ایک ایک کر کے کھا بھی لینا۔!

"دا رائیٹ آنریبل سر۔" ہاؤس آف دام جی لمیٹڈ کا مالک آن ہینڈ تعظیم سے افریقی وزیر کی طرف سر جھکا کر شاید محسوس کر رہا تھا کہ وہ مندر میں کھڑا اپنے کسی کالے بھجنگ اور نہایت بلوان دیوتا سے پرارتھنا کر رہا ہے۔ "پچھلے سال انڈی پنڈنس ویک میں ہمارے محبوب پرائم منسٹر نے ہاؤس آف دام جی کے جشن آزادی میں شریک ہو کر ہمیں اعزاز بخشا اور آج آپ کی شرکت سے ہمارا وقار دو بالا ہو رہا ہے۔ جناب من، مجھے ــ"

بینا وہ بیٹھی ہے، وہ اپنے باپ کی بڑی میز کے دائیں پہلو میں اس نوجوان افریقی ایگزیکیٹو سے جڑ کر اس سے سر نکالتی ہوئی، جیسے کالی مٹی کے ٹیلے سے گلابی پھولوں کی کوئی ٹہنی برآمد ہو رہی ہو۔

میں نے چاہا کہ اس ٹہنی کو نوچ کر اپنی میز کے فلاور واس میں لا سجاؤں اور پھر سکاچ اور سوڈا، ایک ڈبل، دو، تین، چار ــــ اور پھر ہنسی ہنسی کر اس سجی ہوئی ٹہنی کو فلاور واس سے بھی نوچ لوں اور اسے مسل مسل کر ــــ نہیں، بینا مسلنے کی شے نہیں، یا ہونے ہونے مسلنے کی شے ہے، بڑی احتیاط سے، تاکہ وہ اس کے بعد بھی جوں کی توں رہے۔ اسے دیکھ دیکھ کر میرے ذہن میں ان خوش شکل اور لذیذ بسکٹوں کے نار مولے بننے لگتے ہیں جنھیں کھا کھا کر پیٹ نہیں بھرتا، زبان کھاتی اور بھوک بڑھتی چلی جاتی ہے۔

"لیڈیز اینڈ جنٹلمین، میں اپنی نو عمر کینئن نیشن کی صحت کا ٹوسٹ تجویز کرتا ہوں" دام جی نے اپنا شراب کا گلاس اٹھا کر ہاتھ کو گرمجوشی کے اظہار کے لیے آگے پھیلا دیا۔ "فار ہیلتھ اینڈ ویلتھ آف دا گریٹ نیشن!"

"شاوری افریگہ! (افریقہ کے لیے) کالے وزیر کی افریقی صدا ایکویٹر نائٹ کے وسیع ہال میں ہمارے کانوں کو چھو کر غائب ہو گئی گویا ماؤ ماؤ کے ڈیڈن کماتھی نے اپنے کسی پہاڑی ہائیڈ آؤٹ میں خوب سیر ہو کر شراب پی کے ہوا میں فائر کیا ہو اور جب انگریز افسر وہاں لپک کر پہونچے ہوں تو سوائے اپنے آپ کے انھیں کوئی اور دکھائی نہ دے رہا ہو۔

ہم سب تیز تیز "افریگہ" کا جام صحت پینے لگے اور ہمارے گلوں سے شراب یوں نیچے بہنے لگی جیسے افریقی پہاڑوں میں ڈھکے چھپے سوراخوں سے آبشار غاروں میں گر جاتے ہیں۔ اور یہ آبشار دیکھ دیکھ کر غاروں میں چھپے ہوئے بے فکر اور رفر مند جانور مسرت سے ناچنے کے لیے اپنے اگلے دو پیر اٹھا لیتے ہیں، اگر گر کر ناچتے ہیں۔

ہال کے ایک کونے سے ڈانس فلور پر آرکسٹرا بجنے لگا اور یہ میوزک سن کر مجھے محسوس ہونے لگا کہ میرے دل پر کوئی نقب لگا رہا ہے۔

"بینا، تم ہمارے کنٹری دائیڈ فیمس ڈیل کو ہاک بسکٹوں کے مانند پر ذائقہ اور نشہ آور ہو۔ میرے دل میں داخل ہونے کے لیے یہ توڑ پھوڑ کیوں؟ جھگڑا کیے بغیر بھی تو تم مجھ سے مجھے لے سکتی ہو۔

"ہنس کے بولو بینا، تو میں کیا، تمہارے لئے میں اپنے جیسے دس اور رہیا کر سکتا ہوں۔ بس تم اک جھگڑنا بند کر دو۔ میرے دل پر

نقب نہ لگاؤ۔ میرا دل اڑانا چاہتی ہو تو اپنی یہ ضرب میں روکو ——— روکو بیٹا ———"

میں نے گلاس میں باقی وہسکی بھی انڈیل دی اور پاس ہی کھڑے ایک ویٹر سے مزید لانے کو کہا۔

"بیٹا، مسکرا کر لوٹو میرا دل، دو چار سال کے لئے نہیں تو کم از کم چھ ایک ماہ کے لئے واحد تمہارا ہو کے رہ سکتا ہے اس عرصہ کے دوران تمہارے باپ کی دی ہوئی سالم تنخواہ تم پر خرچ کر سکتا ہے۔ تمہارا باپ مجھے بسکٹ بنانے کی ایک نئی مشین کے لئے انگلینڈ بھیجنا چاہتا ہے۔ آؤ تم بھی میرے ساتھ چلو۔ ایڈن برا سے مشین کا کام ختم کر کے ہم لندن آ جائیں گے اور لندن میں ایک چھوٹا سا ہنی مون منا کر واپس۔"

ویٹر نے وہسکی اور سوڈا لا کے میرے سامنے رکھ دیا اور میں وہسکی کے پاٹ میں سوڈا انڈیلنے لگا۔ وہسکی کے گہرے رنگ میں سوڈے کے امتزاج سے ایک خوشگوار ہلکا پن آ گیا۔ پیاری، ہلکی سی تازہ دم، گیس آور پر جوش زردی، گویا انسانی نسل کے ملے جلے خون کا ایک نوجوان صحت مند چہرہ، جسے چوم لینے کو جی چاہے۔

میں نے گلاس کو بے اختیار منھ سے لگا لیا۔

میرے سر پر ہاؤس آف رام جی کا اسسٹنٹ سیلز منیجر کھامبا کھڑا تھا۔ دو ڈھائی سال پہلے کھامبا ہماری کمپنی میں سیلز بوائے تھا۔ پچھلے سال آزادی کے موقع پر اُسے سیلز مین بنا دیا گیا اور حال ہی میں کمپنی نے اُسے موجودہ پروموشن دی تھی۔ رام جی کی خواہش تھی کہ حکومت کی خوشنودی کے لئے چند ذمہ دار آسامیاں افریقیوں کو سونپ دی جائیں۔

"پلیز سٹ ڈاؤن، کھامبا۔ وہ افریقہ کی کھلی دھوپ چھاؤں کے مانند مجھے بڑا عزیز تھا۔

"تھینک یو، بوانا۔ (بوانا جناب کی فاصلہ آمیز تعظیم سے قریب تر لفظ ہے) میری ایک دوست بھی آ رہی ہے" وہ اپنے جنگلوں کے کسی تناور درخت کی طرح سارے کا سارا جھوم رہا تھا۔

"پینے کے لئے آئے ہو مگر معلوم ہوتا ہے پی کے آ رہے ہو دوست۔ بیٹھ جاؤ نا" میں نے خالی کرسی کی جانب اشارہ کیا "کہاں ہے تمہاری دوست؟"

"ذرا باتھ روم میں گئی ہے" وہ دبی دبی آواز میں ہنس کر بیٹھ گیا۔ "لیڈیز کا باتھ روم مجھے کہیں آس پاس نظر نہیں آیا سو میں نے اُسے ایک مردانہ باتھ روم میں ہی ڈھکیل دیا ——— وہ آ رہی ہے" اس نے ہاتھ اونچا کر کے اپنی افریقی دوست کو ہماری میز کی طرف آنے کا اشارہ کیا۔

کھامبا کی دوست کو دیکھ دیکھ کر مجھے اپنی بسکٹ کمپنی کی پروڈکشن نمبر چار سو تین کا خیال آنے لگا: چمکیلے سیاہ رنگ کا ایک نہایت سوئیٹ چاکلیٹ بسکٹ، جس کی شوخ پیکنگ نظر سے لپٹ سی جاتی ہے۔

میں اپنی میز کی خالی کرسی کو سیٹ کرنے لگا اور جب وہ پہنچ گئی تو میں ہیلو مادام، کہہ کر کھڑا ہو گیا۔ کھامبا میری طرف تشکر سے دیکھنے لگا۔

"یہ میری دوست ہے، مس ماٹی ——— اور یہ ہمارے ہاؤس آف رام جی کے پروڈکشن باس ہیں، بوانا چندو"

"پلیز بیٹھ جاؤ مادام" اس کی متوازن گٹھی ہوئی سیاہ باڈی کسی نہایت خوبصورت عورت کی پرچھائیں کی طرح ہلی اور بیٹھ گئی۔

"آپ کیا پئیں گی؟" میں نے ویٹر کو بلا کر مس ماٹی سے پوچھا۔

"رم اینڈ جنجر" اس کے بجائے کھامبا نے جواب دیا "ہم دونوں کے لیے رم اینڈ جنجر منگواؤ بوانا"

ویٹر چلا گیا تو کھامبا مجھے ماٹی کے بارے میں مزید بتانے لگا۔

"ماٹی ہمارے قبیلے کے چیف کی بھتیجی یا اولاد ہے۔ اس کے تیس بھائی ہیں، پندرہ بہنیں، چھ مائیں اور ایک باپ ——— اِن صرف ایک باپ، جو ہمارے قبیلے کا چیف ہے"

"تمہارا بھی تو ایک ہی باپ ہو گا کمابا؟"

"نہیں بوانا، میں اپنی ماں کے پانچویں شوہر کا بیٹا ہوں بوانا۔ اُسے کوئی جانور کھا گیا تھا ——— میرے باپوں کی تعداد ——— دراصل مجھے اپنے باپوں کی صحیح تعداد کا اندازہ نہیں۔ بوانا" رم اینڈ جنجر آگئی تو اس نے تیزی سے اپنا گلاس تیار کر کے اسے جھٹ خالی کر دیا۔

"ماٹی، تم ذرا ٹھہر جاؤ" اس نے ماٹی کی رم اینڈ جنجر بھی لے لی "بات یہ ہے بوانا کہ میں ہمیشہ ایک کے بعد دوسرا ڈبل بڑھا کے ہی اپنے پینے کا سلسلہ شروع کرتا ہوں" "ویٹر، دو اور لاؤ"

ماٹی مسکرا رہی تھی جیسے رین آکاش میں کوئی تنہا ستارہ کسی کی نظر پڑنے پر چپ چاپ ہنسنے لگے اور پھر جب تک اس کی طرف دیکھتے چلے جاؤ اس کی ہنسی نہ تھمے۔

"بوانا، ایک دفعہ یوں ہوا کہ میرے پہلے باپ کی روح مجھ سے ملنے آئی" کمابا اپنا کوئی قبائلی گیت سنانے کے انداز میں لہرا لہرا کر بتا رہا تھا۔ "یہ ان دنوں کا واقعہ ہے جب میں ہاؤس آف وامبی میں آنے سے بہت پہلے کسی وزونگو (یورپی) کا ہاؤس بوائے تھا۔ میرا پانچواں باپ ان دنوں مجھ سے ناراض تھا اور اس نے میرے گاؤں کے راستے مجھ پر بند کر رکھے تھے۔ روح نے مجھے اپنے دونوں گم بازوؤں میں لے کر گلے لگا لیا اور مجھے بڑا پیار کیا اور بتایا کہ تمہارا بیج ضرور تمہارے پانچویں باپ نے بویا تھا پر دھرتی اس کی ہوتی ہے جس کی سب سے پہلے ہو۔ تم میرے بیٹے ہو، میرا کاشت ہو۔ اور بوانا، اس نے مجھے گدگدا کر میں روتے روتے ہنس پڑا" اس کے نشیلے قہقہے نے طفلانہ نسبیت کا وہ لمحہ اپنی گرفت میں لے لیا۔

"یہ ماٹی ہے نا بوانا، اس کو سب سے پہلے لڑکی سے عورت میں نے بنایا تھا۔ اس لئے اب یہ سدا کے لئے میری ہے، خواہ میں مر جاؤں، خواہ زندہ رہوں۔ اس کا بیٹا تمہارا بیٹا ہو تو بھی وہ میرا ہی ہوگا"

ماٹی بڑے پیار سے اس کی طرف دیکھنے لگی، مانو کالی دھرتی کے سینے میں ہل چل رہا ہو اور اس کی سخت زمین پولی ہو ہو کر چاہ رہی ہو کہ اس کے انگ انگ سے بھٹوں کی ہریالی پھوٹ آئے۔

"بوانا، ایک بات کہوں" اس کی نئی رم اینڈ جنجر بھی آ چکی تھی۔ "مجھے اپنی ماٹی کی ایک بات نہیں بھاتی۔ مچاکوس میں ہم ایک دوسرے سے ملتے تھے تو اس کا ننگا ننگا پنڈا دیکھ کر مجھے محسوس ہوتا تھا کہ اس سے لپٹ کر میں نے اپنے گاؤں کی زرخیز مٹی کو اپنے بدن پر مل لیا ہے پر اب یہ وزونگو گڑیا جن کے ہر دم کپڑوں میں ڈھنپی رہتی ہے ——— تمہیں میری ماٹی پسند ہے نا بوانا؟ تم ——— تم چاہو تو اسے لے لو!"

اچانک ڈانس فلور کی تیز و تند دھنیں اچھل اچھل کر میرے کانوں سے ٹکرانے لگیں۔

"اور بوانا، اپنی اُس ——— کیا نام ہے اس کا ——— بینا کو مجھے دے دو۔ جب سے ملک کو آزادی ملی ہے، گورے رنگ سے لپٹنے کو ترس رہا ہوں"

ڈانس فلور پر اولڈ اینڈ نیو ہورائزنز اپنی اپنی اولڈ اینڈ نیو گرل کو ایک دوسرے سے بدل بدل کر والہانہ طور سے ناچ رہے تھے۔

میں نے نظر گھما کر بینا کی میز کی طرف دیکھا۔ افریقی ایگزیکیوٹو اپنی جگہ سے اٹھ کر بینا کے پاس کھڑا تھا اور شاید اس سے درخواست کر رہا تھا "میڈم، کیا آپ مجھے اپنے ساتھ ڈانس کرنے کا فخر بخشیں گی؟" اتنے موٹے موٹے افریقی ہونٹوں کا اتنا چھوٹا سا مہذب لہجہ کتنا مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے!

بینا نے مسکرا کر اپنا بازو ایگزیکیوٹو کے بازو پر ڈال دیا ہے۔ اب وہ اپنی جگہ سے چل پڑے ہیں۔ اب میرے قریب آرہے ہیں۔

ٹمک ٹمک ٹاٹا ٹٹا ـــــ

جیسے سب جانور اپنی خواہش سے بے چین ہو ہو کر فرش پر دولتیاں مار رہے ہوں اور ان کی ایک ہی خواہش سے ان کی دولتیوں سے ایک ہی تال پیدا ہو گیا ہو۔

ٹمک ٹمک ٹاٹا ـــــ ٹٹا!

"ار ـــــ ے!" ڈانس ختم ہوتے ہی وہ میرا ہاتھ چھڑا کر اپنی میز کی طرف لوٹ گئی۔

"بینا!"

لیکن اس نے مڑ کر نہیں دیکھا۔

محبت وحبت کے جھگڑے میں میں آج تک نہیں پڑا۔ جہاں جس پر جب تک دل آ گیا، آ گیا اور بس۔ پر اب مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ بینا کی خفگی مجھے لے ڈوبے گی۔ شاید اس کی نیت خراب ہو اور وہ مجھے شادی کے جال میں پھانسنا چاہتی ہو ـــــ مگر شادی کرنا اور گھر گرہستی سنبھالنا تو سنیاسیوں کا کام ہے، ہم دنیا والوں کو اس سے کیا غرض؟

میں آہستہ آہستہ چل کر اپنی میز کی طرف آ گیا۔

کھامبا بھی اپنی سیٹ پر لوٹ آیا تھا اور ماٹی کو اپنے ہاتھ سے شراب پلا رہا تھا۔

"مجھے افسوس ہے مس ماٹی۔" میں نے اپنی کرسی پر بیٹھتے ہی اس سے معذرت طلب کی: "میں تمہیں تنہا چھوڑ کر چلا گیا تھا ـــــ"

"میں بتاؤں بوانا، تم میری ماٹی کو چھوڑ کر کیوں چلے گئے؟" کھامبا نے شراب کا گلاس میز پر ٹیک کر مجھے ٹوکا۔ "اس لیے کہ وہ کالی ہے۔ تمہیں کیا معلوم کہ اس گیلی گیلی کالی مٹی کی تہہ میں کتنی خوبصورت کائنات کے بیج پڑے ہوتے ہیں ـــــ وہ دیکھو!" اس نے اچانک بینا کی طرف دیکھ کر ادھر اشارہ کیا۔ وہ مسکرا مسکرا کر افریقی ایجنٹ کیوکو کے ہونٹوں سے اس کا سگریٹ کھینچ رہی تھی۔ "ہمارا طاقتور گہرا رنگ تمہارے کورے سفید کاغذ پر اس کا بھاؤ لکھ رہا ہے۔ تم سب کو، سب غیر ملکیوں کو اپنی اکاؤنٹس بکس کے موٹے موٹے ہندسوں کی تحریر میں کالا رنگ بڑا پیارا لگتا ہے۔ بینا نے اپنی مسکراہٹ کو گہرا کر کے اپنے افریقی ساتھی کی سگریٹ کو اپنے لبوں میں داب لیا تھا۔" اتنا پیارا کہ گھڑی دو گھڑی کے لیے تم اپنی گوری بیوی جاہ کو بھی بھول جاتے ہو۔"

"کھامبا!"

"آہستہ بولو بوانا!" اس نے اپنے جبڑا دو رم کے گلاس سے منہ ہٹا کر جواب دیا۔ "اس وقت تم میرے پاس نہیں ہو۔ جوئی (شراب) پیتے ہوئے ہم لوگ بسکٹ کے پیکٹ نہیں گنتے، اپنے مونگو (خدا) سے باتیں کرتے ہیں۔"

"تم بہک رہے ہو میرے دوست۔"

"اسی لئے سچ بول رہا ہوں۔ تم میرے دوست نہیں ہو، دوست۔ اگر تم میری کالی بکری کو ذبح کر کے پیار سے مزے سے کھا بھی جاتے تو تم میرے دوست ہوتے، مگر ـــــ"

"ماٹی، مجھے معاف کر دو پلیز، ورنہ یہ شیطان مجھے ہڑپ کر جائے گا۔" میں نے بڑی محبت سے پہلے ماٹی کی طرف دیکھا اور پھر کھامبا کی طرف۔

ماٹی ہنسنے لگی اور اسے ہنستا دیکھ کر کھامبا بھی، اور مجھے لگا کہ گھنگھور گھٹا پانی کی چھوٹی چھوٹی سفید بوندیں بن بن کر برسنے لگی ہے، اور میں بھی ہنسنے لگا اور پھر ہم سب اپنا اپنا گلاس منہ کی طرف لے جاتے ہوئے بیک وقت کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

"بوانا رفیقی" کھامبا مجھ سے کہنے لگا۔ "بس نیوائیر تک حوصلہ رکھو، تمہاری بنیا کو گفٹ پیکٹ میں سجا کر تمہیں پیش کر دوں گا، پر بوانا رفیقی، اس سے پہلے مجھے ذرا اس گوری چھوکری کو پیک کر لینے دو۔ چٹے رنگ سے لپٹنے کی خواہش مجھے دم نہیں لینے دیتی بوانا"

"تم اس وزونگو (یورپی) لڑکی کے پاس گئے تھے" میں نے فنانس منسٹری کے یورپی سکریٹری کی بیٹی کی طرف اشارہ کیا۔ "کیا بنا؟"

اُس نے جواب دینے سے پہلے ہاؤس آف دام جی کے چھوٹے چھوٹے نمکین بسکٹوں کی ایک مٹھی منہ میں دھر لی۔

"بننا کیا تھا، میں نے لڑکی سے ناچنے کی درخواست کی اور جواب میں اس کا وہ بھرباپ کہنے لگا کہ ڈاکٹر نے میری بیٹی کو ناچنے سے منع کر رکھا ہے ———"

"پھر ———؟"

"پھر میں نے اُس سے کہا کہ تمہاری بیٹی ایک بار میری جڑی بوٹی چاٹ لے تو چوبیس گھنٹے گوما (ایک تیز افریقی ناچ) کرتی پھرے ———" میں اور مانی ہنس پڑے، جیسے آسمان میں قوسِ قزح کے دو رنگ یکجا ہو رہے ہوں! ان دو رنگوں کا بیاہ ہو رہا ہو اور دیکھتے دیکھتے یہ دو، سات ہو جائیں۔

کھامبا نے بسکٹوں کی ایک اور مٹھی منہ میں الٹ دی۔

"میری بات سن کر وزونگو کے ماتھے پر کئی شکنیں ابھر آئیں اور منسٹر نے اپنی آنکھ کے اشارے سے مجھے وہاں سے سرک جانے کا اشارہ کیا ———"

"آؤ مانی، ڈانس کریں"

"نہیں، تم مجھ پر ترس کھا کے کہہ رہے ہو" مانی نے بولنا شروع کیا تو مجھے محسوس ہوا کہ رات کی سیاہی میں کسی معصوم بچے نے پھلجڑی جلائی ہے۔ "جب تم اپنی خواہش سے بے تاب ہو کر مجھے کھینچ کر لے جاؤ گے تو میں تمہارے ساتھ ضرور ناچوں گی"

"ہاں" میں اس کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہا تھا۔ "کالا رنگ کتنا پیارا اور گنجان ہوتا ہے، غموں، خوشیوں، مسکراہٹوں، چیخوں، آہوں اور آنسوؤں سے سربسر آباد! سفیدی میں کبھی ہلکی سی گہرائی نہ ہو تو وہ خالی خولی رہے، گہرائی سے ہی سفیدی کے نقوش بنتے ہیں، کالے رنگ سے ہی زندگی کی تخلیق و تحریک ہوتی ہے ———" میں نے پلیٹ سے تھوڑا اُڑا ہوا چکن اٹھا کر مانی کے منہ میں ڈال دیا۔ "ہمارے دنوں کی تاب راتوں کے پُربہار اندھیرے آنچل سے ہی ہے" میں نے محبت سے مانی کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے۔

"رفیقی" کھامبا اچانک بے چین ہو کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ "تم میری مانی کا دل بہلاؤ۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ وزونگو کی سفید برف بیٹی کے ساتھ آج ناچ کر ہی دم لوں گا" وہ اپنی کامیابی کے خیال سے خوش ہو ہو کر ہنسنے لگا۔ "بوانا رفیقی برف کو پہاڑ کی چوٹی سے اٹھا کر پیار سے گرم گرم ہتھیلیوں میں لے لیا جائے تو وہ اپنے آپ پگھل جاتی ہے"

"چھوڑو اُسے کھامبا، بیٹھ جاؤ" اُسے نشے سے لڑکھڑاتا پا کر مجھے ڈر محسوس ہونے لگا کہ وہ چیف گیسٹ کی ٹیبل پر جا کے گڑبڑ کرے گا۔

"بوانا رفیقی، آج میں اپنی خواہش ضرور پوری کروں گا، خواہ اسے پورا کرتے ہوئے سب کچھ الٹ پلٹ جائے۔ بڑی پیاری عورت ہے، اتنی سفید، جتنا میری کالی گائے کا میٹھا دودھ"

"بیٹھ جاؤ کھامبا!"

"نہیں، اس وقت میں یہاں پاس ہوں۔ تم بسکٹ کے ڈبے گنو بوانا اور میں پروڈکشن ایڈمنسٹریشن کے لیے جاتا ہوں ———" چند قدم چل کر وہ واپس آ گیا۔ "دیکھو، میرے اس چاکلیٹی بسکٹ کو راہ میں ڈال کر پھر ادھر اُدھر نہیں ہو لینا" اس نے مانی سے

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

رتن سنگھ

ماں بیٹے

آٹھ نو سال کے وہ دونوں بھائی، سردی میں ٹھٹھرتے ہوئے جالندھر کے تنگ بازاروں میں سے گزرتے سینما پوسٹروں کے جلوس میں ایک دوسرے سے لڑتے سب سے آگے جا رہے تھے۔

"اور تینوں ستو ار کھیا! جلدی جلدی چل کتے کے پڑ" بڑے بھائی نے بانس کی وہی سوٹی چھوٹے کے کندھے پر مار دی جس کے دونوں سروں پر کپڑے کا اشتہار بندھا ہوا تھا۔ دے نے کو پتہ نہیں چلا کہ جتنا تیز چلیں گے اتنی سردی کم لگے گی!"

کپڑے کے اشتہار کا ٹکڑا چھوٹے کی سوٹی سے بھی بندھا ہوا تھا اس لیے جب بڑے نے اپنا بانس چھوٹے کے کندھے پر مارا تو کپڑے کا ایک پنکھا سا بن گیا تھا۔ چھوٹے کو سوٹی کی چوٹ تو جو لگی سو لگی لیکن پنکھے سے نکلی ہوا کا جھونکا اس کے آدھے جسم کو چیرتا نکل گیا۔ پنجاب کی دسمبر کی سردی میں جب آسمان پر بادل بھی چھائے ہوئے تھے ہوا پہلے ہی بلیڈ کی دھار کی طرح تیز تھی۔ اور ان دونوں نے پھٹی ہوئی قمیضوں اور نیکروں کے سوا کچھ نہیں پہن رکھا تھا۔ چھوٹے کی قمیض کا بازو کندھے سے پھٹا ہوا اس طرح جھول رہا تھا جیسے کٹے ہوئے بازو والے کی قمیض لٹکتی ہے۔

سردی سے وہ پہلے ہی کانپ رہا تھا۔ ہونٹ کالے پڑ رہے تھے۔ بھائی کی ماری ہوئی چوٹ کھا کر وہ تڑپ گیا۔ بڑے کو مارنے کی تو اس میں ہمت نہیں تھی اس لئے وہ موٹی سی گالی دیتا ہوا بولا" بیو گھر چل۔ تینوں ماں سے نہ پٹوایا تو کہنا!"

سیدھا ہو کے چلتا ہے کہ دوں اک اور۔ ماں کون سی تیں لگی ہوئی ہے۔ اور وہ تینوں ہاتھ تو لگا کے دیکھے۔ اس کی بھی ہڈیاں نہ سینک دوں!" یہ کہتے ہوئے بڑے نے سڑک پر تھوک دیا۔ جیتنے کے بعد تھوکنا بڑے کی عادت ہے۔ جب بھی وہ لڑائی میں جیت جاتا ہے، تو زمین پر تھوک دیتا ہے جیسے وہ ہارنے والے پر تھوک رہا ہو۔

لیکن چھوٹے نے ابھی تک ہار نہیں مانی تھی۔ یوں اس نے اپنا بانس اٹھائے تیز تیز چلنا بھی شروع کر دیا تھا۔ لیکن وہ کبھی کبھی کنکھیوں سے بڑے کی طرف دیکھ بھی لیتا تھا تاکہ موقع ملنے پر اپنا بدلہ لے سکے۔ بینڈ باجے والے ان کے پیچھے پیچھے آ رہے تھے اس کے پیچھے اشتہار بانٹنے والا تانگہ تھا۔ چھوٹے نے پہلا بند کر بینڈ کی تال پر ایک فلمی گیت بھی گانا شروع کر دیا۔ لیکن دل ہی دل میں وہ مار دھاڑ والی کسی فلم کا سین یاد کر رہا تھا جس میں کوئی پہلوان ایک ہی کے سے دوسرے کو زمین پر گرا دیتا ہے۔ اب اسے یہ نہیں یاد آ رہا تھا کہ پہلوان نے کہاں

مارتا تھا کمر میں یا پیٹ میں۔ پھر اُسے یہ بھی احساس تھا کہ اس کا مکا اتنے زور کا نہیں پڑے گا ہو سکتا ہے الٹا اسی کے ہاتھ پر چوٹ لگے۔ ابھی ادھیڑ بن میں سامنے سے آتے ہوئے ایک گدھے کو دیکھ کر اسے شرارت سوجھ گئی۔ جیسے ہی گدھا نزدیک آیا اس نے بڑے کو زور سے گدھے کی طرف دھکا دے دیا۔ غنیمت یہ ہوئی کہ گدھا خود ہی بڑے کے ہاتھ میں سوئی ہونے کی وجہ سے ڈر گیا اور دوسری طرف بھاگ گیا ورنہ۔۔۔

بڑے نے کھا جانے والی نظروں سے چھوٹے کی طرف دیکھا اور پھر تابڑ توڑ اس پر مکّے برسانے شروع کر دیئے۔ چار پانچ مکّے کھا جانے پر بھی جب چھوٹے نے مزاحمت نہ کی تو بڑے نے زمین پر زور سے تھوک دیا اور پھر اپنا بانس اٹھا کر یوں چل دیا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ اس طرح وہ سارے راستہ ایک دوسرے سے لڑتے، گالیاں دیتے سینما تک پہونچ گئے۔ دونوں نے دس دس آنے مزدوری کے لئے اور گھر کی طرف چل دیئے۔ گھر کیا تھا؛ گندے نالے پر یونہی اینٹ اور پتھر جوڑ کر چھ سات مربع فٹ جگہ گھیر لی گئی تھی؛ جہاں بارش سے کچھ بچاؤ ہو جاتا تھا۔

ماں دوپہر سے بھوکی بیٹھی تھی۔ دوپہر سے ذرا پہلے وہ لکڑیاں بیننے کے لئے نکلی۔ واپس آئی تو آٹے والی خالی دیگچی ہنس کہ رہی تھی مجھے ہاتھ ہی نہ لگاؤ۔ پتہ نہیں کون چندری الٹ کر لے گئی تھی۔ صبح کی آدھی روٹی بچ گئی تھی وہی زہر مار کر کے اور پانی پی کر اڑوسیوں پڑوسیوں کو گالیاں دیتی رہی۔

شام کو بھوک کی شدت کی وجہ سے بری بے چینی سے وہ بیٹوں کے لوٹنے کا انتظار کر رہی تھی۔

دونوں لڑکے ماں سے کوئی بات کئے بغیر چولھے کے گرد آ کر بیٹھ گئے۔ جہاں اس نے آگ جلا رکھی تھی۔ آگ تھوڑی تھی اور وہ دونوں جلد سے جلد اپنے جسموں کو گرم کرنا چاہتے تھے۔ چولھے کے ایک طرف ان کی ماں بھی بیٹھی آگ تاپ رہی تھی۔ دونوں لڑکے چولھے پر زیادہ سے زیادہ جھکے ہوئے آگ تاپ رہے تھے۔ اس طرح دونوں کو پوری گرمی نہیں مل رہی تھی۔ چھوٹا لڑکا ابھی تک دن کی مار کا بدلا لینا چاہتا تھا اس لئے اس نے جلتی ہوئی چھوٹی سی لکڑی بڑے کے گھٹنے پر چپ چاپ چھوا دی۔ بڑے لڑکے نے گندی سی گالی دیتے ہوئے چھوٹے کو زور سے پیچھے سے پرے ڈھکیل دیا۔ چھوٹے کو سر کے بل لڑھکتے ہوئے دیکھ کر اس نے ایک طرف تھوکا اور پھر اپنی پوری چھاتی اور چہرہ آگ پر جھکا دیا۔ ماں نے چھوٹے کی شرارت تو دیکھی نہیں تھی اس لئے وہ بڑے پر برس پڑی۔

"ہائے ہائے وے ٹٹ جانیا۔ تیرا کچھ نہ رہے۔ سول پئے جائے۔

وے تینوں۔۔۔"

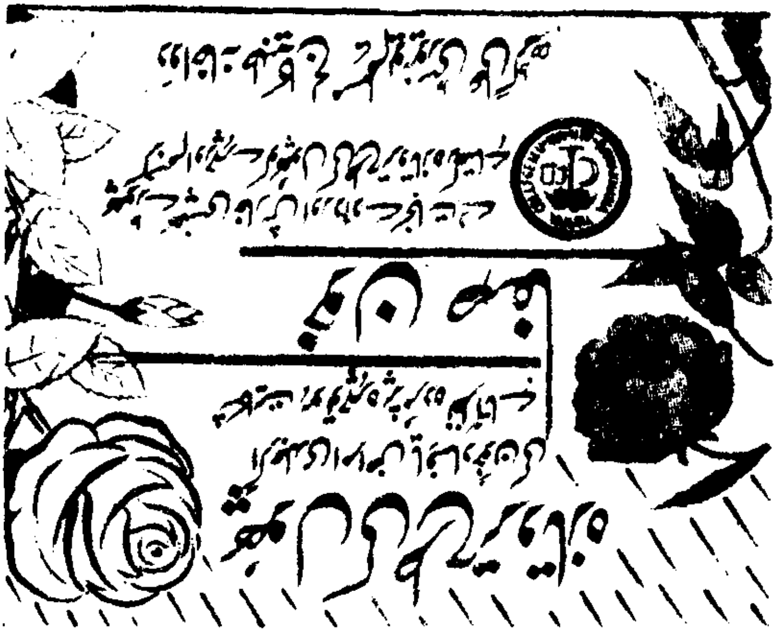
"چپ کر کے بیٹھ اوکی پوکھی۔ حرام زادی دیکھتی نہیں کہ اس نے میرا گھٹنا جلا کر رکھ دیا اے۔ اس باپ کو تو کچھ نہیں کہندی!"

"تھر پیلے میں تیری ایسی زبان دے ٹکڑے کرواں۔ پھر اس نے دونوں لڑکوں کو روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیا۔ غصہ ———

تو اسے چڑھا تھا آٹا چرانے والی پر وہ تو اسے مل نہ سکی۔ اور یہ دونوں قابو آ گئے۔ دونوں کو مارنے کے بعد اس کی بھوک اور تیز ہو گئی۔ دونوں لڑکوں کو بھی بھوک لگی ہوئی تھی۔ چھوٹا لڑکا بولا "حرام زادیئے پھر مار لیں پہلے روٹی تو دے!"

ماں دونوں لڑکوں کے لائے ہوئے پیسے جو انھوں نے چولھے کے پاس ہی رکھ دیئے تھے، لے کر روٹی خریدنے کے لئے چل دی۔ آٹا لا کر پکانے کا وقت اب نہیں رہا تھا۔ ہوٹل کی طرف جاتی ہوئی وہ دونوں کو کہہ گئی کہ اگر وہ اس کے پیچھے لڑے تو وہ ان کی بوٹیاں کتوں سے نچوا دے گی۔ ہوٹل سے اس نے دس آنے کی روٹیوں کے ٹکڑے خریدے، کٹوری میں دال سبزی لی۔ دس کا دودھ اور بیس پیسے کا گڑ بھی وہ اپنے ساتھ لائی۔

جب وہ سوئی تو لڑکے پہلے کی طرح سردی سے کانپ نہیں رہے تھے۔ اب وہ بڑے آرام سے بیٹھے آگ تاپ رہے



[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

بچے کبھی کبھی شیشے کی رنگین ، چھوٹی چھوٹی گولیاں کھیلتے ہیں نا۔ بس اتنے ہی تنوکی گولیاں، کھیتوں میں خود مختار
پگڈنڈیوں کی چوٹیوں پر چڑھ کر، وہ تلاش لیتا ہے۔ پہلے تو وہ کئی بار گرتا چڑھتا ہے۔ آخر چوٹی پر چڑھ کر وہ چپک جاتا ہے۔ پھر جب
وہ ایک بے ترتیب گولی تراشنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ تو اسے پچھلی ٹانگوں میں لپیٹ کر نیچے لڑھکاتا ہے۔ گویا یہ اس کا کوئی بڑا
کارنامہ ہو۔ یہاں وہ کھیت کی سطح پر مسلسل لڑھکتا چلا جاتا ہے۔ اگلی ٹانگوں سے وہ پچھلی ٹانگوں میں لپٹی ہوئی گولی کو کھینچ کر آگے
کی طرف ڈھکیلتا ہے۔ پھر اسے پچھلی ٹانگوں میں لپیٹ کر لڑھکتا ہے۔ اس عمل میں وہ کھیت کی مٹی سے گولی کے تنظیر پر ایک
متناسب بلکہ فنکارانہ خول چڑھا لیتا ہے۔ ایک طرح سے گولی کے اندر کا مواد اس کے ٹھکانے پر پہنچنے تک محفوظ بھی رہتا ہو۔
لیکن اس کا ٹھکانہ بھلا ہے ہی کہاں۔ ٹھکانا اگر ہوتا بھی تو کھیتوں میں ہی ہوتا۔ ہندوستان میں تو کہیں کھیت ہی نہیں ہیں۔
یوں روایت میں اگر کہیں ان کا ذکر ہو تو ہو۔ فی الحال تو نکار مذکور کی ٹانگیں خالی ہیں۔ اگر میں اسے اٹھا نہ لیتا تو کتبہ کے نچلے حاشیے
سے رینگتا ہوا کئی دھنسی ہوئی قبروں کے درمیان ضرور پہنچ چکا ہوتا۔

وہاں ضرور کسی دھنسی ہوئی قبر میں گر جاتا۔ قبر میں نہ گرتا تو کسی بکری کے کھر تلے دب جاتا۔ دو تین بکریاں پہلے سے بچی ہوئی گھاس
کو مسلسل نوچ رہی ہیں لیکن میں نے اسے کتبہ کے نچلے حاشیہ سے آگے بڑھنے ہی نہ دیا۔ ممکن ہو، وہ کسی ہڈی کے ٹکڑے کی تلاش میں
ہو۔ لیکن یہ ناممکن ہے۔ وہ ہڈی چاٹ ہی نہیں سکتا۔ ہڈی چاٹنے والے کیڑے اور ہوتے ہیں۔ اول تو ہڈی بھی کہیں دکھائی نہیں
دے رہی ہے۔ آبادی کے آدمیوں سے کچھ کتے مانوس نہیں ہوتے۔ مگر وہ مردوں کی ایک ہڈی تک نہیں چھوڑتے۔ یا گورکنوں
کے بچے اکثر ہڈیوں کے ٹکڑے جمع کرتے رہتے ہیں اور انہیں آبادی میں لے جا کر بیچ دیتے ہیں۔ مردوں کی ہڈیاں بہرحال کام آ ہی جاتی
ہیں۔ یقیناً آدمی ان کام میں لے آتے ہیں۔ شاید میرا ساتھی مشکل میں ہے۔ وہ کیا کرے؟ بھلا وہ قبرستان میں کیا کھائے گا! شاید
وہ بیوقوف نہیں ہے، بدبخت ہے؟ تو یہ طے ہوا کہ وہ غلطی سے قبرستان میں آ گیا ہے۔ اب اسے خوراک کہاں سے مہیا کی جائے
گی، یہ آئندہ مجھے ہی سوچنا ہے ......

'چلو میرے دوست میرے ساتھ چلو'
میں نے قمیض کی جیب سے ایک مڑا ہوا کاغذ نکالا اور اسے اس میں احتیاط سے لپیٹ لیا۔

(۳)

پناہ گاہ میں شام کی ڈھلان، سائبان کے آخری کونوں تک چلی گئی ہے۔ سائبان میں رکھے ہوئے امکان صاف نہیں
دکھائی دے رہے ہیں۔ ٹوٹی ہوئی کرسیاں بیٹھنے کا امکان ہیں۔ چارپائیوں پر ادھورے بستر کسی طرح سو جانے کا امکان ہیں۔
لالٹین بھی کہیں رکھی ہی ہوگی۔ مٹی کا تیل اس کا امکان ہے اور وہ ہے نہیں۔ پچھلے سال کی بارش سے گری ہوئی دیوار
کے ملبے سے جو چبوترا آنگن میں بنا لیا گیا ہے، اس پر تھوڑی ہی دیر میں پناہ گاہ کی مالکہ آ کر بیٹھ جائے گی اور دیر تک یہی سوچے
گی کہ لالٹین کیسے جلائی جائے۔ سو، اس تحریر کے ذمہ دار کو ڈھلان سے اترنا ہے۔ لالٹین تلاش کرنی ہے۔ ممکن ہو کہ اس میں کچھ
تیل ہو۔ اگر لالٹین کسی طرح کام دے جائے تو وہ کاغذ میں لپٹے ہوئے اپنے ساتھی کے لیے خوراک تلاش کرے گا۔
'الشرر' بچے ابھی تک نہیں لوٹے۔

مالکہ گھبرائی ہوئی چبوترے کی طرف آ رہی ہے۔

'تمہیں راستے میں بچے نہیں ملے'؟

سوال، مجھ سے کیا گیا ہے۔ جب کہ میں بچوں کی واپسی والے راستے سے نہیں آیا۔ یوں مجھے معلوم ہے کہ بچے ہندستان کے دور افتادہ بازار میں مٹی کا تیل لینے گئے ہوں گے۔ انہیں معلوم نہیں کہ کچھ دنوں سے تیل کے تاجر دور اندیش ہو گئے ہیں۔

میں نے مالکہ سے کچھ نہیں کہا۔ بلکہ سائبان کے کونوں میں لالٹین تلاش کرنے لگا۔ اتفاق سے ایک تاریک کونے میں ٹوٹے پر لالٹین چھوٹی میز پر رکھی ہوئی مل گئی۔ میں نے اسے میز سمیت آنگن میں چبوترے کے پاس لا کر رکھ دیا۔ میز پر باہر سے اڑ اڑ کر پڑی ہوئی دھول چکنی کلو نج کے ساتھ جم گئی تھی۔ کسی زمانہ میں جب مٹی کا تیل سستا ہوگا تو وہ میز کی سطح پر گر گیا ہوگا۔ چبوترے کے پاس بھی روشنی نہیں ہے۔ سو میں سطح دیکھ نہیں رہا ہوں اس پر ہاتھ پھیر پھیر کر اندازہ لگا رہا ہوں۔ رات جیسے روز بیوقوفوں کے سروں پر ہوتی ہے، ویسے ہی بس ہو گئی ہے۔

دروازے پر دستک ہوئی۔ بچے آ گئے۔ مالکہ ہڑبڑا کر چبوترے سے اٹھی، دروازہ، میاں نے کھولا۔

'کیوں تیل نہیں ملا؟'

مجھے معلوم ہے کہ مالکہ بچوں کو بس اچٹتی نگاہ سے دیکھے گی۔ بچے ایک طرح کے مغلوط اور ضعیف سبب کا مظہر بن گئے ہیں۔ انہیں اتنا ہی معلوم ہے کہ ایک آدمی کیو میں تیل لینے کی کوشش میں مار ڈالا گیا۔ افسوس، خوراک ملے بغیر ہی مر گیا ..... کم از کم خوراک لے کر ہی اسے مرنا چاہئے تھا!

مالکہ حکومت کو بہ آواز بلند کوستی ہے۔ ساتھ ہی وہ ایک روایتی وزیر کی نیکی کا قصہ دہراتی ہے۔ تھا تو وہ وزیر خوراک، لیکن مارا گیا بے چارا مقبولیت کی موت .....

اب میں کیا کروں۔ گالی تو مجھے بھی دینی آتی ہے لیکن دوں کس کس کو! ...... مالکہ تو چیختے چیختے سو جائے گی اگر مٹی کا تیل بچے لے آئے ہوتے تو لالٹین جلتی۔ روشنی میں میں جیب سے کاغذ میں لپٹے ہوئے ساتھی کو نکال کر میز پر رکھ دیتا۔ تاکہ مالکہ اور اس کے بچوں کی نگاہ اس پر پڑتی۔ مالکہ نہ سہی، بچے اس میں دلچسپی لیتے۔ کیونکہ میں انہیں انتہائی انہماک سے بتاتا کہ میں نے کس طرح اسے قبرستان میں پایا۔ اس طرح باتوں باتوں میں اس کی صفات کا ذکر بھی چھیڑتا اور مجھے یقین ہے کہ کم از کم بچے اسے تسلیم کر لیتے ...... یہ کہ وہ مزدور کھیتوں میں خود مختار پانچانوں سے گوریاں تراشنے والا فنکار رہا ہوگا۔

مگر مالکہ کے ساتھ ساتھ بچے بھی سو چکے ہیں اور یہ طے ہے کہ اب تلاش اندھیرے میں صرف ہوکر ان کی مینڈک محدود ہو گئی ہے۔ مجھے اپنے ساتھی کے لیے خوراک بھی مہیا کرنی ہے۔ وہ کیا کھائے گا؟ یہ چیتا مجھے رات کے ساتھ ہی کاٹ رہا ہے۔ ابھی تک میری جیب میں کاغذ میں لپٹا پڑا ہے۔ کچھ دیر پہلے تلاش کا مطلب امکان تھا، امکان اندھیرے میں خوراک نہ بن سکا۔ تلاش کا مطلب اگرچہ لہا ہوتا تو چار سال کا اشوا سے خلا محسوس نہیں کرتا۔ وہ کہتا ہے کہ وہ محض اس لیے پیدا ہوا ہے کہ اس کی ماں مزدوری پر نے پر اس سے لکڑی کی ٹال سے بارہ نئے پیسوں کی لکڑیاں منگوائی تھیں۔ مزدورت کا مطلب کبھی کبھی خلا میں جلنا — لکڑیاں خالی چولھے میں تیرتی ہیں۔ برتن میں صرف پانی ابلتا ہے۔ آخر وہ مایوس ہو کر سو جاتا ہے۔ سناٹے میں جاگ رہا ہوں۔ افسوس کہ میں شیو یا حضرت سلیمان کا کوئی اعلیٰ تراشیدہ نہ بن سکا۔ یوں لگتا ہے کہ میں خود بھوک کی خالص ہندستانی بیماری میں مبتلا ہوں۔ یہاں تک کہ کبھی کچھ کھانے جیسی چیز مل گئی تو اس کا استعمال ہی مجھے یاد نہ رہا۔ اب ایک ساتھی کی خوراک کا سوال ہے۔ سو ممکن ہو،

اسے اپنا پاتال یاد ہو۔ یعنی جو کچھ میں بھول گیا ہوں، اسے یاد آجائے۔ بات اتنی گمبھیر ہے کہ میں خود بھی سو نہیں سکوں گا اور اندھیرے میں کوئی تدبیر بھی کارگر نہ ہوگی۔

(۳)

سائبان کے پورب میں چو طرفہ شگاف پڑی ہوئی دیواروں کا ایک چھوٹا سا حصہ ہے۔ پچھلے سال کی بارش میں اس کی چھت گر گئی تھی۔ جب چھت نہ ہی ہوگی تو مزدور کسی کام میں آتی ہوگی۔ دیر سے جاگی ہوئی پناہ گاہ کی مالکہ اکثر کہتی ہے کہ وہ حصہ کبھی اسٹور روم تھا۔ اس میں غلے کے کنستر رکھے جاتے تھے۔ اب وہ ایک ایسا حصہ ہے جہاں بچے چھپ چھپ کر پاخانہ کر لیتے ہیں۔ صبح کی روشنی میں وہ کافی واضح ہو گیا ہے۔ ابھی ابھی مرت جاگتے ہوئے بچوں نے میرے ساتھی کو دیکھا اور مجھ پر ہنس پڑے۔ انشو کو سب سے زیادہ اس بات پر ہنسی آئی کہ ایک کیڑے کے بے غوراک تلاش کی جا رہی ہے۔ یوں مجھے اس کی ہنسی پر شبہہ ہوتا ہے۔ رات بھر تو وہ خالی چولھے پر ابلتے ہوئے پانی کی نیند سویا۔ پتہ نہیں وہ سویا یا نہیں۔ جاگتے ہوئے تو اسے رونا چاہیئے۔ اس کے باوجود وہ ہنس رہا ہے۔ صاف پتہ چلتا ہے کہ یہ مسخ آنتوں کی ہنسی ہے۔ میں نے ہتھیلی پر رکھے ہوئے اپنے ساتھی کو ایک دو پل کے لیے اسٹور روم میں چھوڑ دیا ہے۔ ابھی وہ سکڑا ہوا ہے۔ شاید دھوپ لگتے ہی وہ کچھ حرکت کرے۔ دراصل میں اس کے فن کا تماشا بھی دیکھنا چاہتا ہوں۔

"ارے یہ کیا کر رہے ہو، پاگل تو نہیں ہو گئے" مالکہ نے اچانک دخل دیا۔

مجھے برا لگا۔ چاہتا تو یہ کہہ سکتا تھا کہ ایک دلچسپ کام کر رہا ہوں۔ لیکن چونکہ مالکہ کے چہرہ پر پہلے ہی سے ایک اعلانیہ نفرت محسوس ہوئی لہٰذا چپ چاپ تماشے میں مصروف رہا۔ اس میں کچھ حرکت آئی۔ لیکن کٹھنی پرتوں کے حصار میں گھر اور گھبرا گیا۔ یوں وہ مسخ آنتوں کے ایک ڈھیر کے بہت قریب تھا۔ چاہتا تو اس سے چپک جاتا۔ ذرا ہی مجھے اس سے مایوس ہونا پڑا۔ وہ کٹھنی پرتوں کی حد کو چھوئے بنا ہی پیچھے ڈھلک گیا۔ شاید وہ اپنی خوراک پہچان نہیں سکا۔

انشو اب ہنس نہیں رہا ہے۔ وہ مالکہ کو دیکھتے ہی سہم گیا۔ وجہ مجھے معلوم ہے۔ ذرا سمجھ سے کام لے تو وہ مالکہ سے کہہ سکتا ہے کہ اسٹور روم کو صرف وہی خراب نہیں کرتا بلکہ دوسرے بچے بھی ذمہ دار ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ اپنی نسل کا نمائندہ ہے۔ اس کے معدہ میں کچھ نہ ہو، اس کی آنتیں مسخ ہوں تو وہ بھلا کیا خارج کرے گا! — صرف دھبے!! صرف دھبوں سے ایک ایسا اسٹور روم گندا نہیں ہو سکتا، جس پر کوئی چھت نہیں ہے۔ مالکہ یہ سب کچھ سننا نہیں چاہتی۔ وہ میرے ساتھی کو نحوست سمجھ رہی ہے۔ یہ اور بات ہے اس نے اسے دوبارہ کاغذ میں لپیٹ کر جیب میں رکھ لیا ہے۔

"چلو میرے دوست باہر چلیں"

میں نے جیب پر اس طرح ہاتھ پھیرا، گویا وہ اس میں محفوظ ہے۔ اس میں چپکا ہوا ہے۔ اس سے کبھی علٰحدہ نہیں ہوگا۔

باہر نکلتے ہوئے میں مالکہ کی آواز کو امکان کی سوت سمجھ رہا ہوں۔ یعنی میں سب کچھ سننا نہیں چاہتا جس کی تفصیل کا نتیجہ لفظاً بالکل نحوست ہے۔ میں نے واضح طور پر اپنے ساتھی کو زندہ رکھنے کی ذمہ داری لی ہے۔ اس کے لیے میں کبھی نادم نہیں ہوں گا۔ مالکہ جسے نحوست سمجھ رہی ہے، اس نے تو مجھے اب تک بیدار رکھا ہے۔ اتنی تلاش — اتنا تجسس! اتنا تو اس سے پہلے

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

(ل)

[illegible]

[illegible]

(٧)

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

غیاث احمد گدی

کالے شاہ

جب کبھی مجھے تجو بھائی یاد آتے ہیں تو ان کی آنکھوں کی وہ چمک بھی یاد آجاتی ہے ، جو میں نے انہیں اماں کی گود میں دم توڑتے وقت دیکھی تھی۔ ابھی کوئی زیادہ دن نہیں ہوئے تجو بھائی کی موت کو۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے جیسے صبح انگنی پر جو قمیص میں نے سوکھنے کو ٹانگی تھی وہ ابھی اچھی طرح خشک بھی نہیں ہونے پائی ہے۔ اور ہوا کے جھونکوں سے اس طرح کانپ رہی ہے جیسے صبح میں نے دیکھی تھی ..... مگر گھر والوں نے زندگی کے چھوٹے بڑے جھمیلوں میں پڑ کر تجو بھائی کو یوں فراموش کر دیا گویا تجو بھائی نام کا کوئی متنفس تھا ہی نہیں ہمارے خاندان میں۔ ذرا غور کرو تو تجو بھائی کی شیروانی کا وہ ٹکڑا جو ابھی تک اماں کے گیندڑے میں موجود ہے ـــــ تجو بھائی کے جسم کا ایک ٹکڑا معلوم ہوتا ہے۔ اسی طرح مڑا تڑا بدرنگ جیسے بار بار دھونے کی غرض سے پتھروں پر ٹپکتے رہنے کے سبب پھیکا اور جگہ جگہ سے مسک گیا تھا۔ تجو بھائی کا جسم بھی کچھ اس طرح سوکھا ٹھٹا تھا۔ سانولی جلد ملگجی ہو گئی تھی۔ اور ہاتھ کی رگیں ایسی پھول آئی تھیں گویا بجلی کا تار لپیٹ لیا ہو ، تجو بھائی نے اپنے ہاتھوں پر۔ گال پچکے پچکے ، اور آنکھیں بڑی بڑی سرخ اور عجیب افسردہ سی۔ ان میں ایک طرح کی بے چارگی اور شاید ندامت کا احساس ہر وقت جھلکتا رہتا۔ پھر اپنی لمبی لمبی ٹانگوں سے چلتے کس طرح تھے ، ٹھہر ٹھہر کر گویا ان کی سوکھی مریل ٹانگیں جو بہ مشکل آدھ سیر کی وزن میں نہ ہوں گی ، من من بھر کی ہوں۔ گھر بھر میں کسی سے کچھ نہیں بولتے۔ آپ بیٹھے ہوں ، ہنس رہے ہوں ، یا چیخ پکار کر رہے ہوں ، آپ کے پاس سے گردن جھکائے یوں گزر جائیں گے گویا اس دنیا میں موجود نہیں ہیں۔ کوئی موڈ میں آکر کبھی ان سے مذاق کر بیٹھتا تو ہنس دیتے۔ بڑے بھیا کسی بات پر ڈانٹتے یا بھابی جھڑک دیتیں تو دھیرے سے مسکرا دیتے اور چپ چاپ وہاں سے ٹل جاتے۔ کبھی کبھی بڑی خواہش ہوتی کہ تجو بھائی ہم لوگوں میں بیٹھتے ، ہنستے جس طرح بڑے بھیا کرتے ہیں ، بڑے بھیا کی طرح ہماری گڑیا ہی چرالیں ، ہمارے بال ہی نوچ ڈالیں یا خفا ہی ہو لیں ... مگر پتہ نہیں ہمارے بھیا کس مٹی کے بنے تھے ، کس خیالی دنیا میں رہتے تھے کہ کبھی ہماری طرف پلٹ کر دیکھتے نہیں۔ گھر میں ہوتے تو اپنے کمرے میں پڑے چارپائی پر اونگھا کرتے ، باہر نکلتے تو کالے شاہ کے مزار کے پکے فرش پر بیٹھے پیپل کے پتوں کو گھورا کرتے اور کنکری اٹھا اٹھا کر پتوں کا نشانہ لگایا کرتے۔

اماں کہتی تھیں۔ اسی لئے کالے شاہ کے سائے نے اسے دبوچا تھا! کالے شاہ کون تھا ، اور اس برسوں پہلے مرے ہوئے کالے شاہ کے سائے نے کس طرح تجو بھائی کو دبوچا تھا۔ اُس وقت میں کچھ نہیں جانتی تھی۔ البتہ ایک بار کھڑکی سے جھانک کر دیکھا تھا تجو بھائی کو جب ان پر کالے شاہ آئے ہوئے تھے بھیا زور زور سے گردن کو جھٹکے دے رہے تھے۔ اور منہ سے لف لف کی آواز نکال رہے تھے ، اور لوگ ان کی منتیں کر رہے تھے کہ تجو بھائی کو چھوڑ دیں۔ ان کی خطائیں معاف فرمائیں......!

اماں کہتی تھیں کہ اسی کالے شاہ نے تجو بھائی کا سارا خون چوس لیا تھا۔ اور ان کے جسم پر ماس نہیں چڑھنے دیتا تھا۔ وہی کالے شاہ ان کے ذہن پر سوار رہتا ہے۔ جو تجو بھائی کھوئے کھوئے رہتے ہیں۔ مگر مجھے یاد پڑتا ہے کہ تجو بھائی کی یہ عادت پہلے نہ تھی۔ ہاں اُن دنوں اتنا زیادہ کھوئے کھوئے نہیں رہتے تھے کبھی کبھی ہنس لیتے تھے، بول لیتے تھے۔ کسی شہر سے نوکری کی تلاش کے بعد مایوس آتے، کچھ دیر افسردہ دکھائی دیتے، مگر گھنٹہ دو گھنٹہ بعد پھر ٹھیک ٹھاک ہو جاتے۔ اور اماں کے قریب فرش پر بیٹھ کر لمبی لمبی باتیں کہنے لگتے کہ نوکری ملتے ہی ایک گھر بنواؤں گا، چھوٹا سا صاف ستھرا، ایک اچھا سا پلنگ خریدوں گا تمھیں بٹھا کر، تمھاری بہو سے کہوں گا کہ اماں کی دن رات خدمت کیا کر! خوب اچھی اچھی چیزیں پکا کر کھلا، یہ بڑے بھیا تو آدمی رو دیتے ہیں تو طرح طرح کی باتیں سُناتے ہیں کتنی تکلیف اٹھانی پڑتی ہے میری اماں کو یہاں .... !!

اماں اکثر تو چپ رہتیں۔ لیکن پر تجربہ کرتے ہوئے آنکھ اٹھا کر ان کی طرف تکتیں، پھر منھ بنا کر سلائی میں مصروف ہو جاتیں۔ گویا بھیا زمانے بھر کے خراب آدمی ہوں۔ بڑے بھیا سے زیادہ تکلیف دینے ہوں، بخیں مگر کبھی کبھی جب ان کا موڈ ٹھیک رہتا تو آہستہ سے ہنس دیتیں۔

"پر کہاں ہے تیری دلھن، ذرا بھجوں تو سہی۔؟"

"دلھن! ارے اماں لے آؤں گا دلھن ایک دن اٹھا کر کہیں سے دیکھ لینا۔!" بھیا بڑے جوش سے بولتے۔

"مگر کب لے آئے گا کہیں سے، کسی دن۔؟"

"بس بس..... ملازمت ملتے ہی۔!" یہاں پہونچ کر بھیا کی آنکھیں خلاء کی طرف اٹھ جاتیں۔ اور ان کا چہرہ یوں پھیکا اور مدھم ہو جاتا گویا باہر کی دھوپ اچانک ڈوب گئی ہو۔ اور کمرے میں ذرا اجالا کم ہو گیا ہے۔

پتہ نہیں اس ملازمت کے لفظ میں کیا اُداسی تھی کہ لمحہ بھر میں تجو بھائی کی ساری ہنسی افسردگی میں بدل جاتی اور تجو بھائی آہستہ سے کمرے سے باہر نکل جاتے۔ وہ باہر چلے جاتے تو اماں سُوئی میں پرونے والے دھاگے کے سروں کو دانتوں سے کھٹکتے ہوئے زور سے تھوکتیں۔ اور کسی قدر جلے ہوئے لہجے میں تجو بھائی کو کوستیں ــــ کام کا نہ کاج کا دشمن اناج کا....!

اماں کی بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔ کہ وہ دشمن اناج کا کیوں کہتیں۔ تجو بھائی کی خوراک تو بہت کم تھی، وہ بھی ہفتے میں دو ایک دن ناغہ ہی ہو جاتے۔ کسی دن بڑے بھیا سے جھگڑا ہو جاتا، بھابی بھڑک رہتیں اور ان کی بے کاری اور مفت خوری پر ڈھکے چھپے لفظوں میں طعنے دیتے لگتیں... اور تجو بھائی رنجیدہ ہو کر یہ کہتے ہوئے گھر سے باہر چلے جاتے کہ مجھے نوکری ملے گی، تب ہی کچھ کھاؤں گا اس گھر میں۔ مگر نوکری کہاں ملتی تھی۔ وہ تو کہانیوں والی سبز پری بن گئی تھی کہ تجو بھائی جس قدر اس کی تلاش کرتے اتنا ہی وہ اُن سے الگ تھلگ کھچی رہتی....!

کیا کیا جتن نہیں کئے تجو بھائی نے ملازمت کے لئے، مجھ سے کیا پوشیدہ تھا۔ شہزادہ گلفام کی طرح پاگل ہو گئے تھے۔ انٹرنس پاس کرنے کے بعد چھ سال تک انھوں نے کہاں کہاں کی خاک نہ چھانی، کتنی سفارشیں حاصل کیں، کتنی کتنی خوشامد سے بڑے بھیا سے سفر خرچ کے لئے روپے حاصل کئے، کتنی منت سے میرے بنانے لئے تھے مجھ سے، جو پھر کبھی واپس نہ ہوئے۔ کہنے لگے۔ "ننو! تو میری چھوٹی بہن نہیں ــــــ، بڑی بہن ہو۔ تو میری مالکن اور میں تیرا غلام ہوں.....!" اب سوچتی ہوں تو بے اختیار ہنسی آ جاتی ہے۔ انھوں نے میرا سر دبایا تھا میری چٹیا تک صاف کرنے لگے تھے مارے خوشامد کے۔ کہنے لگے ننو تو زیور دے چپکے سے، اس بار کلکتہ والی نوکری ضرور مل جائے گی۔ انٹرویو کے لئے طلب کیا گیا ہوں... بے طرح گھگھیاہٹ دیکھ کر مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں نے چپکے سے بتانے نکال کر تھما دیئے۔ مگر تجو بھائی بتانے پا کر پتہ نہیں کیوں خوش نہ ہوئے۔ بتانے لے کر اسے ایک ٹک دیکھتے رہے۔ پھر اچانک لپک کر مجھے اتنے زور سے بھینچ لیا کہ میں سہم گئی۔ "تو نے بڑے موقع پر کام دیا میری ننھی.....! تو نے مجھے ڈوبنے سے بچا لیا ننو.....!!"

مجھے لگا ان کی آواز رندھ گئی تھی۔ جب وہ الگ ہوئے تو ان کی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگی ہوئی نظر آئیں۔

میں تعجب سے انھیں دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔ اور وہ میرے سر پر ہاتھ پھیر کر چلے گئے۔ کیسے عجیب ہیں تجو بھائی! کہاں تو بتانے کے لئے یوں بے طرح گھگیا رہے تھے، کہاں بتانا ملنے کے بعد خوش ہونے کے بجائے رونے لگے۔ میں جانتی کہ تجو بھائی پا کر رونے لگیں گے تو ہرگز نہ دیتی انھیں۔

پھر سات دنوں کے بعد کلکتہ سے واپس آئے تو اسی طرح بے نیل و مرام گردن جھکائے تھکے تھکے سے ۔۔۔ گھر کے اور لوگوں نے تو کچھ بھی نہ پوچھا۔ اپنے کاموں میں مصروف ایک ذرا گردن اٹھا کر دیکھا پھر جٹ گئے اپنے کاموں میں۔ تجو بھائی نے چپ چاپ اپنے کمرے میں جا کر، ٹوپی سر سے اتار کر میز پر پھینکی، جو میز کے بجائے فرش پر گری، پھر پلٹ کر میری طرف دیکھا۔ پھر منہ سے کچھ کہے بغیر چارپائی پر پڑ رہے۔ جیسے پیدل ہی تو کلکتے سے چل کر آ رہے ہیں ..... میں نے بہت پوچھا تب بھی کچھ نہ بولے ..... تھوڑی دیر بعد میں نے کچھ پوچھا تو اس بار ایک دم بھپک پڑے، "تو کیوں مری جاتی ہے! تیسے بنانے پھر دلوا دوں گا ۔۔۔ لے کر مر نہ جاؤں گا تیری چیز۔!!"

میں ہکا بکا رہ گئی۔ لو بھئی! ان کے لئے چوری کر رہی تھی جیسے۔ واہ رے دنیا۔ اللہ گواہ ہے جو میرے دل میں ذرا بھی زیور کی بات رہا ہو۔ میں تو ہمدردی سے پوچھ رہی تھی کہ بیچارے نے اتنے ارمانوں کی بھیڑ لگا رکھی ہے، جس ملازمت کے نام پر وہ انھیں ملی بھی یا نہیں۔ مجھے بڑا غصہ آیا۔ تجو بھائی پر۔ پہلی بار میں نے محسوس کیا کہ بڑے بھیا، بھابی اور اماں جو تجو بھائی سے اتنا برا سلوک کرتے ہیں، بات بات پر جھڑکیاں اور طعنے سنائے جاتے ہیں تو وہ دراصل ہیں بھی ایسے ہی۔ سچ مچ تجو بھائی نکمے ہیں زمانے بھر کے ...... ٹھیک کرتی ہیں بھابی جو ایک گھر میں دو ہانڈیاں کرتی ہیں اور بڑے بھیا کے مقابلے میں روکھا سوکھا کھانا لا پٹختی ہیں ان کے سامنے....

اس دن مجھے اتنا غصہ آیا کہ میں نے آگا سوچا نہ پیچھا اور اسی وقت جا کر اماں سے زیور والی بات کہہ دی۔ اماں نے سنا تو ایسی بن گئیں جیسے انھیں غش آ گیا ہو۔ ہوش میں آئیں تو سارے مکان کو سر پر اٹھا لیا۔ اور تڑاتڑ دونوں ہاتھوں سے مجھے پیٹنے لگیں۔ پھر سارے گھر میں کہرام مچ گیا۔ اماں، اپنے کمرے سے اٹھ کر تجو بھائی کی چارپائی کے نیچے فرش پر دھرنا دے کر بیٹھ گئیں۔ اور چیخ چیخ کر تقاضے کرنے لگیں کہ جس طرح بھی ہو وہ زیور لاؤ۔ سیکڑوں گالیاں دے ڈالیں اماں نے انھیں یہی بات تو اماں کی پسند نہیں مجھے۔ ذرا دیر میں بھوت سوار ہو جاتا ہے ان پر۔ اور اس وقت وہ اتنا بھی نہیں غور کرتیں کہ وہ کیا بول رہی ہیں، کیسے بول رہی ہیں....!

شور و غل سن کر اپنے کمرے سے بھابی اور بڑے بھیا بھی آ دھمکے اور تجو بھائی کی ایسی کھنچائی کی، ایسی فضیحت ہوئی کہ میں خود شرمندہ ہو گئی، اپنی حرکت پر اور تجو بھائی پر رحم آنے لگا مجھے۔ بڑے بھیا، بھابی اور اماں انھیں طرح طرح سے کوس رہی تھیں۔ گھر کے بچے سے لے کر محلے کی دو ایک عورتیں بھی آ دھمکی تھیں۔ اور سب کی سب تجو بھائی کو ملامت آمیز نظروں سے تک رہی تھیں۔ گویا تجو بھائی نے زیور مجھ سے مانگ کر نہیں چوری کر کے گروی رکھ دیا تھا۔ اس وقت تجو بھائی کی حالت دیکھنے کے لائق تھی۔ چاروں طرف سے پھٹکار پڑ رہی تھی۔ اور وہ بے زبانوں کی طرح چاروں طرف کبھی اماں کو، کبھی بھابی اور بڑے بھیا کو ہونق کی طرح دیکھ رہے تھے۔ وہ سفر سے آئے تھے۔ کسی نے ایک گلاس پانی تک کو نہیں پوچھا تھا بلکہ اور لوگ ان کو ذلیل کر رہے تھے۔ تجو بھائی ساری باتیں بے حسی سے سنتے رہے۔ پھر دفعتاً چہرے پر ہاتھ رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔

تجو بھائی کی وہ بے چارگی اور رونے کا وہ انداز میں شاید کوشش کرنے پر بھی فراموش نہیں کر سکوں گی۔ یوں معلوم پڑ رہا تھا گویا وہ برسوں سے رونے کے لئے کسی مناسب موقع کی تلاش میں تھے۔ پتہ نہیں ان کے سیدھے سادھے دل میں کتنے زخم لگے تھے۔ آنسوؤں اور آہوں کی جتنی باڑھیں رکے ہوئے تھے وہ سب چند منٹوں کے گریہ میں بہنے لگیں۔ تجو بھائی کے رونے کا یہ انداز دیکھ کر میری بھی آنکھ بھر آئی، چپکے کمرے سے نکل کر میں نے آہستہ سے ڈوپٹے سے خشک کر لیا۔

رات بھر میں بہت مضطرب رہی۔ تجو بھائی پر جو زیادتی ہوئی تھی، اس کی ذمہ دار دراصل میں تھی۔ زیور تو میں نے ویسے ہی دیا تھا

اور یہ بھی جانتی تھی کہ جب تک تجو بھائی کی ملازمت نہ مل جائے اُسے نہیں چھڑا سکیں گے۔ کیا ہوتا اگر اس دن اماں سے نہ بتاتی زیور والی بات ۔ ۔ ۔ ۔ ہر گھر میں بڑے بھائی بہنوں پر ناراض ہوتے ہیں۔ ڈانٹتے بلکہ مارتے پیٹتے تک ہیں۔ اس کی شکایت کبھی نہیں کی کسی نے کسی سے۔ تجو بھائی نے تو کبھی ترچھی نظر سے مجھے دیکھا تک نہیں تھا۔ اس دن میں ہی دو آنسو بہا کر رہ جاتی تو کیا بگڑ جاتا میرا۔ رات بھر میں بستر پر کروٹ بدلتی رہی۔ جیسے کوئی بھاری گناہ سرزد ہو گیا ہو مجھ سے۔ دوسرے دن دوپہر کو جب تجو بھائی اپنے کمرے میں لیٹے چھت کی کڑیاں گن رہے تھے میں ان کی چارپائی کے قریب جا کر چپ چاپ کھڑی ہو گئی۔ انھوں نے پلٹ کر مجھے دیکھا اور پھر اٹھ بیٹھے۔

"کیا بات ہے زبی؟" ان کی آواز کچھ بدلی بدلی سی تھی —— میں ایک لفظ بولے بغیر چارپائی پر بیٹھ گئی۔ اس وقت میری آنکھوں سے جانے کہاں سے ڈھیروں آنسو بہہ آئے اور میں تجو بھائی کے شانے پر سر رکھ کر بے اختیار سسک سسک رونے لگی۔ یہ دیکھ کر وہ میرے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرنے لگے۔ "تو کیوں رو رہی ہے پگلی! میں کوئی ناراض تھوڑا ہی ہوں۔ مجھے تو کسی سے شکایت نہیں بتو! کسی سے کچھ نہیں مجھے —— مجھے تو اپنے آپ سے گلا ہے۔ اپنے آپ سے ۔ ۔ ۔ ۔ !!"

پھر پتہ نہیں بہت دیر تک وہ کیا کہتے رہے۔ پھر انھوں نے میرے آنسوؤں کو اپنی انگلیوں سے پونچھ ڈالا اور ہنس پڑے۔ عجیب سی مُردہ ہنسی۔ "جا دو بتو! کھیل لگی ۔ ۔ ۔ ۔ !! پتہ نہیں ان آنسوؤں کی تجھیں کب ضرورت پڑے۔ انھیں اس طرح برباد کر دوگی تو کل کے دن اپنے تجو بھائی کی موت پر کہاں سے مانگتی پھرو گی۔ احمق ۔ ۔ ۔ !"

میں نے سوچا تھا، تجو بھائی ہمیں معاف کر دیں گے، بڑا دل ہے اُن کا۔ کچھ نہ کہیں گے۔ مگر کتنی بڑی سزا دی تھی انھوں نے مجھے اس دن کیسے بڑے وقت میں۔ کہے تھے یہ الفاظ انھوں نے کہ آج بھی جب میں سوچتی ہوں تو میری آنکھوں سے ساون بھادوں کی جھڑی لگ جاتی ہے۔ اور میں اکیلے کمرے میں آنچل سے چہرہ ڈھانپ کر پہروں ہچکیاں لے لے کر رویا کرتی ہوں۔ تجو بھائی تم کس قدر اندھیرے میں ڈوب گئے۔ تجو بھائی ۔ ۔ ۔ ۔ !

تجو بھائی مجھے اندر ہی اندر کتنا چاہتے تھے یہ کوئی کیا جانے۔ وہ کیک والی بات بھولتی نہیں۔ زیور والے واقعہ کے تیسرے دن کی بات ہے۔ بھابی کے بھائی اُن کے میکے سے آئے ہوئے تھے۔ سوغات میں ایک بڑا سا بادام اور پستے لگا کیک لیتے آئے تھے۔ بھابی نے تو پتہ تک چلنے نہ دیا تھا۔ وہ تو میں نے کھڑکی سے مکان کے پچھواڑے تجو پان والے کی دکان کے پاس بھابی کے بڑے بیٹے شکور کو کیک کھاتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ شکور کو بلایا تو اس نے تتلا تتلا کر کہا کہ ماموں جان لائے تھے، بڑا سا کیک تھا، کشمش بھرا ہوا ۔ ۔ ۔ ۔ یہ بات تو چھپی نہیں تھی کہ بھابی کس دل کی انسان ہیں، پھر بھی مجھے بڑا افسوس ہوا کہ اماں اور تجو بھائی تو دور رہے، گھر بھر میں چھوٹی لڑکی میں تھی اکیلی ننند۔ انھوں نے جھوٹے منہ پوچھا تک نہیں مجھ سے ۔ ۔ ۔ ۔ مجھ سے رہا نہیں گیا۔ دوپہر تک میں نے ان سے ذکر کر دیا۔ اس پر وہ خفا ہو پڑیں کہ میں بہت چٹوری ہوتی جا رہی ہوں۔ انھوں نے کچھ ایسے لفظوں میں مجھے ڈانٹ پلائی کہ میں ضبط نہ کر سکی اور میں نے بھی الٹی سیدھی کہہ دی کہ اس گھر میں ایک ایک چیز کو تو آدمی ترستا ہی رہتا ہے، کون یہاں مٹھائیوں کے دونے لا کر دیتا رہتا ہے۔ عید بقرعید میں چار آنے کی ریوڑیاں آتی نہیں۔ چٹورا نہیں ہوگا آدمی تو اکھا کہاں سے ہوگا —— میں غصے میں بولے جا رہی تھی کہ عین اُسی وقت تجو بھائی اپنے کمرے سے اٹھے اور خاموشی سے گردن جھکائے، ہاتھ میں ایک موٹی سی کتاب لیے باہر نکل گئے۔ شام کو لوٹے تو ان کے ہاتھ میں ایک کیک تھا جسے انھوں نے چپکے سے میرے ہاتھ پر رکھ دیا۔ اماں وہیں تھیں۔ انھوں نے پلٹ کر کچھ ایسی نظروں سے تجو بھائی کی طرف دیکھا گویا وہ گھر کا کوئی سامان چرا کر یہ کیک لائے ہوں۔

"یہ کہاں سے اٹھا لائے ہو۔۔؟ کہیں کوئی برتن تو نہیں بیچ دیا۔ ایسی محبت ہے بہن کی تو کہیں سے کما کر لائے ہوتے!"

تجو بھائی کا چہرہ ایک منٹ میں سیاہ فام ہو گیا۔!

اماں کی بات ابھی ختم بھی نہیں ہونے پائی تھی کہ وہ کانپنے سے لگے۔ اور گھور کر اماں کو یوں دیکھا کہ میں تو ڈر گئی، کہیں مار نہ بیٹھیں اماں کو

وہ ـــــ اماں بھی سہم گئیں ـــــ وہ آگے بڑھے، یوں گویا اب مار بیٹھیں گے اماں کو، مگر پھر رک گئے .... اور کچھ کہے بغیر گھر سے باہر کالے شاہ کے مزار کی سمت چلے گئے۔

پھر اس دن سے تجو بھائی جو کبھی کبھار عجیب سی ہنسی ہنس دیتے، وہ بھی چھن گئی اُن سے۔ زیادہ بولتے تو پہلے بھی نہ تھے، اب تو ایسے چپ چاپ رہنے لگے کہ کھانا کھاتے وقت اگر دال یا سبزی گھٹ گئی تو منہ کھول کر مانگتے تک نہ تھے ـــــ جو ہوتا اتنا ہی کھا کر اُٹھ کھڑے ہوتے اور نہیں تو پہلے ہر صبح ڈاکیا ضرور، جاتے تھے کہ شاید کوئی خط، کوئی انٹرویو لیٹر آیا ہو کہیں سے ـــــ مگر اب اس کی کوئی فکر نہ تھی۔ بلکہ اُن دنوں جو انٹرویو کے خطوط آئے انھیں لفافہ چاک کر کے دیکھا تک نہیں۔

ادھر گھر کے سارے لوگ، حتیٰ کہ اماں نے بھی اس دن کے بعد کبھی یہ تک سوچنے کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ تجو بھائی بھی متنفس ہیں اس گھر کے یہاں ان کے کھانے پینے، کپڑے لتے ... کسی چیز کی طرف کوئی توجہ نہیں دی جاتی .... وہ تو میں تھی جو اسکول کے کام سے فرصت نکال کر ان کا تھوڑا بہت کام کر دیا کرتی تھی۔ مگر حیرت اماں پر ہوتی تھی!

اماں کو تو سوچنا چاہیئے تھا کہ وہ ماں تھیں۔ مجھے بڑا تعجب ہوتا کہ ۔ ایک دن تو میں نے اشاروں اشاروں میں کہہ دیا تھا کہ اماں کیا زمانے کا لہو سفید ہو گیا ہے۔ لیکن اماں نے سمجھا نہیں۔ انھوں نے مجھے ڈانٹا کہ بڑی بوڑھیوں کی طرح بات کرتی ہوں۔

مگر اماں کا پیار تو سویا ہوا تھا۔ سچ کہا کرتی تھیں استانی جی کہ ماں کے دل کو کوئی کیا پہچان سکتا ہے۔ واقعی، جب بیکراں دن مہینوں کے ساتھ تجو بھائی پر ایک اور مصیبت آ پڑی، یعنی کالے شاہ کی روح نے انھیں پکڑ لیا، اُس وقت اماں کا پیار دیکھنے کے قابل تھا۔ پاگل سی ہوئی تھیں وہ تجو بھائی کی حالت دیکھ کر۔ کیا کیا منت نہیں کی انھوں نے تجو بھائی کے لئے۔ کتنے پیسے پھونک ڈالے۔ کہاں تو وہ چھوٹے سے بنانے کے لئے اس درجہ چراغ پا ہوئی تھیں ایک دن، اور اب تو ہی اماں انسان نہیں کچھ اور ہیں، اور کہاں کتنے گڑے چھپے زیور اُن پر سے اتار کر فقیروں اور پیروں کی نذر کر دیئے۔ کتنے ہی مزاروں کی زیارت کروائی انھوں نے .... یوں اب تو بڑے بھیا اور بھابی بھی انکا خیال رکھنے لگے تھے۔ مگر میں جانتی ہوں، کہاں تو ساگ اور خشک روٹی دیتے وقت یوں تیوریاں چڑھ جایا کرتی تھیں، کہاں اب طرح طرح کے حلوے کھلائے جا رہے ہیں۔ ڈانٹنا ڈپٹنا تو دور کی بات بھیا بے حد پیار سے پیش آتے۔ یہ سب تجو بھائی کی محبت کے زیر اثر تھوڑے ہی ہو رہا تھا، تو بھابی اور بھیا کو ایک خوف دامن گیر تھا کہ کالے شاہ کا سایہ کہیں انھیں نہ آ چپٹے۔ بھابی کے ایک ایک انداز سے یہ بات صاف ظاہر تھی .... تجو بھائی کے نزدیک بہت کم جاتیں۔ تجو بھائی کبھی اچھی حالت میں بھی قریب سے گزر جاتے تو یوں چونک اٹھتیں گویا کہ کالے شاہ کے سائے نے انھیں اب دبوچا کہ اب دبوچا ـــ!

کالے شاہ کے سائے سے تو سبھی ڈرتے تھے۔ تین ماہ قبل ہی محلے والی سکینہ کو کتنا پریشان کیا تھا اُس نے جب سے سُنا تھا کہ یہ سائے کنواروں کو ڈھونڈا کرتے ہیں، میں تھر تھر کانپنے لگی تھی۔

تجو بھائی پر جب کبھی کالے شاہ کا سایہ آتا، اس روز ان کی اور گھر والوں کی کیفیت دیکھنے کے لائق ہوتی۔ مجھے تو ان کے قریب جانے بھی نہ دیا جاتا تھا۔ میں خود بھی ڈر کے مارے نہ جاتی تھی۔ ایک روز میں نے کھڑکی سے چھپ کر دیکھا تھا، تجو بھائی آنگن میں چارپائی پر بیٹھے زور زور سے گردن کو جھٹکے دے رہے تھے۔ اور منہ سے لف لف کی آواز نکال رہے تھے۔ اُن کی چارپائی کے نزدیک محلے کے کئی بڑے بوڑھے کھڑے عقیدت مندانہ نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ عظمت چچا جو بڑے تگڑے جوان ہیں، تجو بھائی کو زور سے تھامے ہوئے تھے۔ اور پہلو میں اماں کھڑی منہ پر آنچل رکھے سسکیاں لے لے کر رو رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد بڑی سی پگڑی والے محلے کی مسجد کے امام کو لئے بڑے بھیا آ پہونچے۔ بڑے بھیا اندر سے چھپے آئے۔ چھپر پر بیٹھتے ہوئے منہ ہی منہ میں امام صاحب کچھ بڑبڑائے۔ اور آہستہ آہستہ پڑھتے رہے۔ تھوڑا سا سرسوں کا تیل منگوا دیا گیا۔ امام صاحب نے کچھ پڑھ کر تین بار تیل پر پھونکیں ماریں اور بڑے بھیا کی طرف کٹوری بڑھا دی کہ تجو بھائی کے دونوں کانوں میں تیل ڈال کر اے

شہادت کی انگلی سے دبا دیں۔ کان میں تیل ڈال کر دباتے ہی تجو بھائی بلبلا اٹھے۔ اور گھٹی ہوئی آواز میں چیخ پڑے: "علی علی!.... مرتضیٰ علی.. .... علی توڑ دشمن کی نلی.......... بالکل محلے کے کریم الدین پان والے کی لڑکی سکینہ کی طرح، ابھی تین ماہ قبل اس پر کالے شاہ کا سایہ آیا تھا، تو اسی طرح وہ گردن کو جھٹکے دے کر علی.... مرتضیٰ علی.... کہتی تھی.....! تجو بھائی کی آواز بھی بدلی، نا معلوم پڑ رہی تھی۔ وہ زور زور سے چیخ رہے تھے۔ گرج رہے تھے۔ اور ایسے کہ لوگوں نے تجو بھائی کے گلے سے ایسی آواز سننی تک نہیں تھی کبھی۔ امام صاحب تک تجو بھائی کی آواز سن کر سہم گئے اور بڑی ملائمت اور عقیدت مندانہ لہجے میں بولے۔ "کہئے، فرمائیے، آپ کون ذات شریف ہیں۔؟ اور اس نادان کو کیوں پریشان کر رہے ہیں۔؟؟ فرمائیے، ہم گنہگار اس وقت آپ کی کیا خدمت کر سکتے ہیں۔؟؟؟ میں بخوبی دیکھ رہی تھی کہ امام صاحب کی آواز کانپ رہی تھی۔ اور وہ سہمے سہمے سے لگ رہے تھے۔ پھر جب کالے شاہ کے سائے نے سرخ سرخ آنکھیں نکالیں اور گرج کر پوچھا کہ "کون ہے گستاخ جو میرے جلال سے ٹکر لینا چاہتا ہے" تو امام صاحب کی گھگھی بندھ گئی۔

تجو بھائی نے آنکھیں نکال کر چاروں طرف دیکھا، پھر گرج کر بولے۔ "میں اس چھوکرے کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ اس نالائق نے اپنے دوستوں میں میری کھلی اڑائی ہے.... کبھی نہیں چھوڑوں گا اسے......" اتنا سننا تھا کہ اماں کے ضبط کے بند ٹوٹ گئے۔ اور وہ بے اختیار ہو کر تجو بھائی کے پیروں پر گر پڑیں۔ اور سر پٹک پٹک کر منتیں کرنے لگیں۔ کچھ ایسے انداز سے کہ آس پاس کھڑے لوگوں کی آنکھیں بھی بھیگ گئیں.... مگر کالے شاہ کے سائے کو رحم نہ آیا۔ اس نے پیروں کو جھٹکا دے کر اماں کو الگ کر دیا۔ پھر بہت سی باتیں ہوئیں۔ بڑی دیر تک سارا گھر کالے شاہ کے اشارے پر ناچتا رہا۔ پھر کچھ دیر بعد تجو بھائی آپ سے آپ سجدے میں چلے گئے۔ جب سر اٹھایا تو سایہ چلا گیا تھا اور تجو بھائی بدحواسی سے چاروں طرف گھور رہے تھے.....!

جس دن ایسا ہوتا، یعنی کالے شاہ کا سایہ تجو بھائی پر آتا، بڑے بھیا خصوصاً بھابی بڑی سہمی سہمی رہتیں اور رات کے کھانے کے وقت کوئی نہ کوئی اچھی چیز ضرور بنا لاتیں اور بڑے پیار سے پکھا جھل جھل کر تجو بھائی کو کھلاتیں۔

اب تجو بھائی کو تو کوئی تکلیف نہیں تھی۔ کالے شاہ کے خوف سے محلے والے تک ان سے بڑی اچھی طرح پیش آنے لگے تھے۔ بلکہ اکثر ان کو دعوتیں بھی دینے لگے تھے۔ اماں تو آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دیتی تھیں۔ نہانا چاہتے تو جلدی جلدی پانی گرم کر کے غسل خانے میں پہونچا دیتیں۔ سوتے ہوتے تو رات کو اٹھ کر ان کا بستر جھاڑا جاتا۔ ان کا کمرہ جسے کبھی کبھار میں ہی صاف کر دیا کرتی تھی، اب ہر وقت چمکتا رہتا۔ بستر اور چادر بھی صاف۔ غرض ہر طرح کی آسانیاں میسر تھیں اُن دنوں تجو بھائی کو ــــــ میں تو خوش تھی۔ جب دور دور سے جھاڑنے پھونکنے والے مولوی آتے تو میرے دل میں سے ایسی دعا اٹھتی کہ تجو بھائی پر یہ سایہ برابر رہے تاکہ اچھے ہو جانے پر وہ گھر والوں کے برے سلوک سے تو بچے رہیں ــــــ توبہ توبہ! میں بھی کیسی احمق تھی جو میرے دل میں ایسے ایسے خیالات آئے تھے!

مگر اتنا کچھ ہونے کے باوجود وہ خوش نہیں رہتے تھے۔ پہلے کچھ دنوں تک تو ٹھیک رہے۔ اب تو کچھ عجیب عجیب سی کھچی کھچی کیفیت ہر وقت ان کی آنکھوں میں رہتی۔ گویا وہ تجو بھائی کی آنکھیں نہ ہوں، دو ویران قبریں ہوں۔ جن میں سے ملگجا ملگجا دھواں اٹھتا رہتا ہو ہر دم۔

پھر ایک روز یوں ہوا کہ اسی طرح کالے شاہ کا سایہ آیا ہوا تھا، کہ اماں نے زور سے اس کے پاؤں پکڑ لئے اور گھگھیانے لگیں۔ سائے نے بدستور زور سے پیروں کو جھٹکا دیا۔ اماں بیچاری ہفتوں سے ٹھیک سے کھانا بھی نہیں کھا رہی تھیں ــــــ سامنے والی دیوار سے جا ٹکرائیں اور ان کا سر پھٹ گیا۔ تر تر لہو بہنے لگا سر سے۔ کچھ دیر تک تو اماں ہاتھ سے زخم دبائے رہیں، بدحواسی سی اسی طرح کالے شاہ کے سایہ سے تجو بھائی کو معاف کرنے کی التجا کرتی رہیں، پھر بے ہوش ہو کر ایک طرف لڑھک پڑیں.!

سارے گھر میں کہرام سا مچ گیا۔ ذرا دیر میں سایہ تو چلا گیا اور تجو بھائی اپنی حالت پہ آ گئے۔ مگر اماں جو بے ہوش ہوئیں تو پھر دو

چارپائی پر پڑی رہیں۔ ڈاکٹر نے کئی انجکشن دیئے، دوائیں سنگھائیں۔ میں بھابی اور تجو بھائی ہتھیلیوں اور تلووں میں تیل ملا کئے تب جا کر پورے تین گھنٹے بعد ہوش میں آئیں۔ ہوش میں آتے ہی پلٹ پلٹ کر چاروں طرف گھورا۔ پھر تجو بھائی سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر یوں رونے لگیں کہ ان کے ساتھ میں بھی اور بڑے بھیا بھی اپنے آنسو نہ روک سکے۔ صرف تجو بھائی کاٹھ سے چپ رہے۔ ان کا چہرہ جو پہلے اداس اداس مریضوں کی طرح تھا ایک دم سے زرد ہو گیا۔ پھر وہ اچانک اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور عجیب سی پشیمان نگاہوں سے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئے۔ دن بھر گھر واپس نہ آئے۔ پتہ نہیں کہاں کہاں پھرتے رہے۔ اماں نے کئی بار سلطان کو بھیجا کہ انھیں بلاؤ۔ سلطان نے واپس آکر بتایا کہ وہ کہتے ہیں، جلد آتا ہوں۔ آخر کار اسی حالت میں اماں آہستہ آہستہ بازار جا کر تھلو پان والے کے چبوترے سے انھیں کھینچ کر لائیں۔

اس دن اماں کا زخم دیکھ کر اور تجو بھائی کے حواس میں رہتے ہوئے بھی انھیں چھوڑ کر اس بے رخی سے چلے جانے پر مجھے تجو بھائی پر بڑا افسوس ہوا۔ مجھے یقین ہوا کہ اب تجو بھائی ہمارے ہاتھوں سے نکل گئے۔ کالے شاہ کے سائے نے ہم لوگوں کی محبت ان کے دل سے اکھاڑ پھینکی ہے۔ ورنہ اماں کو اتنا گہرا زخم آیا اور تجو بھائی انھیں یوں روتا بلکتا چھوڑ کر چل دیئے۔ کہاں اماں کا ذرا سر دکھتا تھا تو تجو بھائی آدھی آدھی رات تک ان کی چارپائی چھوڑ کر ہٹتے تک نہ تھے۔ کہاں آج یہ حالت تھی کہ......

مگر میرا خیال غلط نکلا۔ کیوں کہ اسی روز رات کے وقت جب گھر کے سب لوگ سو چکے تھے، میں اماں کے پہلو میں چارپائی ڈال کر پڑی اونگھ رہی تھی کہ میں نے محسوس کیا جیسے کوئی سایہ اماں کے پینتانے کھڑا ہے۔ میں خوف سے تھر تھر کانپنے لگی کہ یقیناً یہ کالے شاہ کا سایہ ہے۔ اور اب اماں کی خیر نہیں۔ لیکن غور کرنے پر تجو بھائی معلوم ہوئے۔ تجو بھائی اماں کے پیروں کو تھامے ہوئے سسکیاں لے کر رو رہے تھے۔ اور بار بار معافی مانگ رہے تھے۔ "...اماں! مجھ گناہ گار کو معاف کر دو...... اماں! آج میں نے بڑی تکلیف دی تھی......!!"

میں سمجھ نہ پائی کہ آخر تجو بھائی معافی کس بات کی مانگ رہے ہیں! اماں سے کیا خطا کی تھی انھوں نے۔ کیسی تکلیف دی تھی اماں کو جو آج اس طرح گڑگڑا رہے تھے۔ اماں کو چوٹ ان کی وجہ سے تو نہیں لگی تھی، وہ تو کالے شاہ کے سائے کی زیادتی تھی۔ تکلیف اماں کو اگر ہوئی بھی تھی تو کالے سائے کے باعث ــــــ تجو بھائی نے تو کبھی دانستہ یا نادانستہ اماں کو کیا کسی شخص کو تکلیف نہیں پہنچائی۔ مجھے تعجب ہوا۔ جی میں آیا تجو بھائی کے آنسو خشک کر ڈالوں۔ مگر ہمت نہ ہوئی۔ پتہ نہیں تجو بھائی پر اس وقت بھی کالے شاہ کا سایہ ہو......!

پھر تجو بھائی کی خوراک کم ہونا شروع ہو گئی۔ کہاں تو وہ اچھی غذائیں جو ان پر سایہ آنے کے بعد سے ملنے لگی تھیں، ان پر ٹوٹ کر گرتے تھے، کہاں اب بہ مشکل دو تین لقمے اٹھاتے۔ پچھلے دنوں ان کی صورت نکھر رہی تھی۔ پھر اب ان کے گال پچکنے لگے تھے۔ اور آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے نمودار ہونا شروع ہو گئے تھے۔ دوسرے تیسرے بخار بھی ہو جاتا۔ اندر ہی اندر جیسے دیمک لگ رہی ہو تجو بھائی کو...... لوگوں کو بہت تعجب ہونے لگا کیوں کہ اب کالے شاہ کا سایہ بھی ہفتے دو ہفتے میں ایک بار ذرا دیر کے لئے آجاتا اور کسی نئی چیز کی فرمائش کئے بغیر چل دیتا۔ اماں خوش تھیں کہ کالے شاہ کا سایہ اب نہیں آتا ہے۔ آتا ہے تو اس کے بچے کو بہت کم تکلیف پہونچاتا ہے۔

پھر ایک دن ــــ کہیں سے ایک مولوی صاحب آئے۔ انھوں نے اماں سے وعدہ کیا کہ میں کالے شاہ کے سائے سے تجو بھائی کو بچالوں گا۔ مگر سوا بھر سونا، سوا بھر چاندی، سوا گز ریشم اور سوا سیر بادام کاغذی کی ضرورت پڑے گی۔

اس غریب گھرانے میں جو کچھ تھا اماں پہلے ہی کالے شاہ کے سائے کے نذر کر چکی تھیں۔ اس وقت اماں کے پاس سوا روپے بھی نہیں تھے۔ اماں نے منڈر کے مکان سے ملحق "پڑتی زمین" کو گروی رکھنے کی تجویز سوچی۔ مگر مولوی صاحب تیسرے روز ہی اجمیر جانے والے تھے، اور گروی رکھنے اور روپیہ حاصل کرنے میں کم از کم ایک ہفتہ تو ضرور لگ جاتا۔ اماں تڑپ کر رہ گئیں۔ اس دن اماں کی حالت دیکھی نہ جاتی تھی۔ روپوں کے لئے وہ کس طرح بھاگے بھاگے گھگھیا رہی تھیں۔ کہاں کہاں نہ گئیں، کس کس کے آگے نہ گڑگڑائیں۔ آخر کار جب چاروں طرف سے

مجبور ہوگئیں تو اپنے کمرے میں چھپ کر اس طرح چیخ چیخ کر روتی رہیں کہ شاید آسمان تک لرز گیا ہوگا۔ اس ماتم بھرے گریہ سے مجو بھائی اس وقت اپنے کمرے میں تھے۔ ان سے نہ رہا گیا تو اماں کے کمرے میں آکر ان کو تسلیاں دینے لگے اور بڑے وثوق سے یقین دلایا کہ وہ ایک دم اچھے ہیں۔ اور اب کوئی سایہ دایہ انھیں نہیں ستائے گا..... اماں کو بھلا کب یقین آنے والا تھا۔ مگر مجبوری میں جھوٹی تسلی بھی انھیں بہلا گئی۔ یعنی بہ حالت مجبوری انھوں نے اپنے آنسو پونچھ ڈالے۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ اس کے بعد مجو بھائی واقعی کسی قدر اچھے بھلے رہے۔ چھ ماہ تک کوئی بات نہ ہوئی۔ اس درمیان میں انھوں نے پھر سے ملازمت کے لئے کوششیں شروع کردیں۔ اور اب کے تو رات دن کچھ نہ کچھ کرتے رہتے گھر والوں کو یقین ہو گیا کہ اب کالے شاہ کے سائے نے مجو بھائی کو معاف کر دیا ہے۔ ان دنوں انٹرویو کے لئے وہ کتنی جگہ گئے، کتنی دوڑ دھوپ کی۔ مگر بات نہ بنی۔ گویا مجو بھائی کی قسمت میں ملازمت لکھی ہی نہ تھی۔ کیوں کہ آخری بار جب انھوں نے ریلوے کے لئے درخواست دی تو انٹرویو تک میں پاس ہوگئے۔ گھر میں لوگ بہت خوش تھے۔ برسوں بعد مجو بھائی کے چہرے پر بھی کبھی کبھی چمک آجاتی تھی۔ مگر ایک ساعت کے لئے وہ اسی طرح اداس ہو جاتے۔ بالآخر بلائے گئے۔ میڈیکل ٹسٹ ہوا اور ان فٹ کر دئے گئے۔ ساتھ ہی یہ خوش خبری لیتے آئے کہ داہنے پھیپھڑے میں ابا مرحوم والے زخم کی ابتدا ہو چکی ہے۔

ہائے ہائے کیسی کیسی مصیبت ٹوٹ رہی تھی ان دنوں ہمارے گھر پر۔ وہ جو ایک کچا دھاگا سا چاروں طرف سے پھیلا ہوا تھا، وہ جگہ جگہ سے ٹوٹ رہا تھا۔ الا اللہ کیا ہوگا۔ ڈاکٹر نے علاج کے لئے کہا تھا۔ اچھی غذائیں تجویز کی تھیں۔ اور گھر یوں ویران تھا گویا کسی نے جھاڑو پھیر دی ہو، چاروں سمت سے۔ دوا دارو تو دور کی بات تھی، پہلے جو کالے شاہ کے سائے کے ڈر سے انھیں بھر پیٹ مناسب کھانا مل جاتا تھا وہ اب نہیں میسر تھا۔ ابھی یہ مصیبت ختم بھی نہ ہونے پائی تھی کہ ایک نئی افتاد آ پڑی ہم لوگوں پر۔ یعنی ہماری شادی کی بات چل نکلی۔ افتاد ہی تو تھی ایسے وقت میں میری شادی! ایک طرف اماں کی کوکھ میں آگ لگ رہی تھی۔ ہم لوگ پیسہ پیسہ کو محتاج ہو رہے تھے۔ ایک طرف شادیانے بجانے کی بات چل رہی تھی۔ اتنی جلدی تو نہ تھی۔ یوں میری عمر بھی اتنی نہیں ہو گئی تھی کہ شادی کرنا عین ضروری ہو۔ بات یوں ہوئی کہ محلے کی ایک لڑکی جو عمر میں مجھ سے چھوٹی ہی ہوگی۔ سبحان علیف کے ایک ملازم کے ساتھ بھاگ گئی۔ اب کیا تھا، محلے والوں کو گویا یقین ہوگیا کہ دوسری تمام محلے کی لڑکیاں عن قریب بھاگ نکلنے کی تیاریاں کر رہی تھیں۔ چنانچہ محلے میں دھڑا دھڑ لڑکیوں کی شادی شروع ہوگئی۔ میں جس گھر میں منسوب تھی وہاں سے بار بار مامائیں اور لونڈیاں آنے لگیں۔ اک دن تو میری ہونے والی ساس اور سسر بھی آدھمکے اور صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ اگر شادی جلد سے جلد نہ ہو سکی تو ہم اپنے لاڈلے کا کہیں اور نکاح کر دیں گے۔ اب کیا تھا اماں کے ہاتھ کے طوطے اڑ گئے۔ برسوں کی چھان بین کے بعد کہیں ایک لڑکا انھیں کم سے کم جہیز میں ہاتھ آیا تھا وہ بھی نکل بھاگنے کی سوچ رہا تھا۔ اماں کی مصیبتیں پہلے ہی کیا کم تھیں کہ اس اچانک ٹوٹنے والے آسمان کو بھی سنبھال سکتیں انکی تو کمر ہی ٹوٹ گئی۔ میری شادی کے لئے جو زیور تھے وہ پہلے ہی مجو بھائی پر اٹھ چکی تھیں۔ بڑے بھیا کے پاس پیسے کہاں ان کے تو اپنے نصف درجن کے قریب بال بچے روتے بسورتے نظر آتے انھوں نے تو چاروں لڑکوں کے سر پر ہاتھ رکھ کر قسم کھالی۔ اماں کی حالت دیکھی نہ جاتی تھی۔ انکی بےچینیوں کا اندازہ کون لگا سکتا تھا۔ اس دن مجو بھائی سے نہ رہا گیا۔ جو مجو بھائی اپنے پہلو سے گزر جانے والی قیامت کی بھی پرواہ نہیں کرتے تھے اس آفت پر تڑپ اٹھے۔ اس دن جب بڑے بھیا دفتر چلے گئے بچے اسکول اور بھابی باورچی خانے میں لیٹ گئیں تو وہ چپکے سے اٹھے اور لوہے کی ایک سیخ سے بھائی کے صندوق کے تالے توڑنے لگے۔ آہستہ آہستہ چوروں کی طرح۔ اتنے میں بھابی کسی کام سے گئیں تو چلا اٹھیں۔ میں اور اماں دوڑتی ہوئی پہونچیں دیکھا تو مجو بھائی ایک ہاتھ سے پوری قوت سے صندوق کا تالا پکڑے ہوئے ہیں اور دوسرے ہاتھ سے بھابی کو اور بھابی انھیں زور زور سے نوچ رہی ہیں اور گالیاں بک رہی ہیں اور مجو بھائی کہے جا رہے ہیں کہ اس میں ضرور روپے ہیں۔ میں صندوق ضرور کھولوں گا۔ اتنے میں اماں نے دوڑ کر مجو بھائی کو پکڑ لیا اور گھسیٹتے ہوئے الگ کر دیا۔ وہ ہانپ رہے تھے۔ بری طرح ہانپ رہے تھے۔ اور

امّاں منہ پر آنچل رکھ کر پہلی بار اس شدت کے ساتھ روئیں جیسے ان کے کسی بڑے عزیز کا جنازہ اٹھ گیا ہو۔

رات ہوئی، صبح ہوئی..... مگر تجو بھائی کو کھانے کے لئے ایک دانہ نہ ملا گھر سے۔ رات کو امّاں چار آنے کی پوریاں لے آئیں بازار سے جنہیں تجو بھائی نے چھوا تک نہیں۔ رات کو بھائی مجھے اور امّاں کو بڑے رو دکھے لہجے میں بُلانے کو آئیں۔ ہم نے جانے سے انکار کر دیا۔

دوسرے دن ہم ماں بیٹی نے تو کھانا کھایا مگر تجو بھائی نے گھر کا پانی تک نہ پیا۔ پیاس لگی تو باہر نکل کر پانی پی آئے۔ اور چپ چاپ چارپائی پر اسی طرح لیٹ گئے ——— دوپہر کو گھر سے نکل گئے۔ شام ہوئی۔ رات آئی، مگر تجو بھائی لوٹ کر نہیں آئے۔ امّاں بیچین ہو اٹھیں۔ جانے کیسے امّاں کو پتہ مل گیا کہ آج کی رات ان پر بڑی بھاری گزرے گی۔ بار بار دروازے کی طرف دیکھتیں۔ ہُو کا عالم۔ رات آدھی سے زیادہ گزر گئی۔ سارا عالم سو رہا تھا۔ میں بھی اونگھ رہی تھی۔ مگر امّاں گویا ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپ رہی تھیں۔ جیسے رہ رہ کر کوئی جھجھو دیتا ہو اُن کے دل میں کوئی۔ آخر نہیں رہا گیا۔ تو بڑی خوشامدوں سے بڑے بھیا کو جگایا اور ساتھ لئے، لالٹین سے ڈھونڈنے نکلیں۔ کالے شاہ کے مزار کے قریب سے گزرنے لگیں تو اندر سے کسی کے کراہنے کی آواز سُنائی دی۔ لالٹین لئے اماں اور بھیا دوڑے۔

تجو بھائی فرش پر اوندھے منہ پڑے کراہ رہے تھے۔ بھیا نے لپک کر اٹھایا تو ڈھیروں خون سے منہ اور قمیص کا گریبان لتھڑا ہوا تھا۔ رات گئی، صبح ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب آئے۔ دیکھنے کے بعد بھیا کو الگ لے جا کر نفی میں گردن ہلائی۔ امّاں تجو بھائی کو گود میں لئے پاگلوں کی طرح کبھی ان کا منہ چومتیں، کبھی پیشانی چھوتیں میں، بھائی اور بھیا سبھی منہ میں کپڑا دیئے ہچکیں دبا کر رو رہے تھے۔ آخر کالے شاہ کے سائے نے تجو بھائی کی جان لے ہی لی۔!

عین اسی وقت تجو بھائی نے آنکھیں کھولیں۔ پھر ایک بار گردن گھما کر چاروں اور دیکھا۔ پھر امّاں پر ٹکٹکی لگا دی۔ ان کا سر امّاں کی گود میں تھا۔ امّاں پیشانی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولیں۔

"تجو، کیسے ہو..... تجو..... میرے لال..... کچھ چاہیئے میرے بچّے.....!"

جواب میں تجو بھائی مُسکرا دیئے۔ عجیب سی مسکراہٹ، جیسے ساری دنیا پر ہنس رہے ہوں۔

"ذرا سا بھات کھلاؤ گی امّاں اپنے ہاتھ سے..... بہت دن ہوئے تمھارے ہاتھ سے کھائے ہوئے.....!"

پھر بڑے بھیا کی طرف مخاطب ہوئے۔ "بھیّا! ذرا سا بھات دو گے آج اپنے گھر کا مجھے۔؟ آپ نے منع کر دیا تھا نا بھائی کو کہ تجو کو ایک دانہ نہ دینا۔ میں نے بھی فیصلہ کر لیا تھا کہ کبھی نہ کھاؤں گا۔ مگر میں ہار گیا بڑے بھیّا، بری طرح ہار گیا..... آج ذرا سا کھانا دے دو بھیّا..... ورنہ میری روح تڑپتی رہے گی قیامت تک.....!!"

یہ سنتے ہی ہم لوگوں پر جیسے قیامت ٹوٹ پڑی۔ امّاں دوڑیں۔ باورچی خانے سے ایک پلیٹ میں تھوڑا سا بھات اور دال لے آئیں۔ اِدھر آنکھوں سے جھر جھر آنسو گر رہے تھے، اُدھر منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑا رہی تھیں بدحواس سی.....!

اُسی طرح گود میں سر رکھ کر امّاں نے تھر تھر کانپتے ہاتھوں سے چھوٹا سا لقمہ تجو بھائی کے منہ میں رکھ دیا۔ "میرے لال! کھالے بیٹا۔!! آخر کالے شاہ کے سائے نے تجھے نابود ہی کر دیا میرے بچّے.....!"

تجو بھائی نے ہاتھ ہٹا کر کہا۔ "ہاں امّاں! یہ کالے شاہ کا سایہ بڑا منحوس ہوتا ہے۔ مگر اماں! اب کبھی نہ آئے گا یہ سایہ تمھارے گھر.....!!"

پھر خاموش ہو گئے۔ دو لقمہ کھانے کے بعد ذرا سا پانی پیا، اور آنکھیں بند کر لیں۔ تھوڑی دیر بعد انھیں اُبکائی آئی۔ اور سارا بھات منہ سے باہر آ گیا۔ امّاں چیخ کر آنچل سے منہ پونچھنے لگیں۔ اتنے میں تجو بھائی نے ہاتھ اٹھا کر کچھ کہنا چاہا۔ مگر بول نہ سکے۔ ہاتھ گر گیا۔ ایک ہچکی آئی اور ان کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔

[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]

معاف کیجئے پروفیسر صاحب میں کچھ سوچ رہا تھا۔
تم تو ہر دم سوچتے رہوگے اور دنیا تمھارے دیکھتے ہی دیکھتے بہت آگے نکل جائے گی۔
یہ تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو پروفیسر۔ دنیا واقعی میرے دیکھتے ہی دیکھتے آگے نکل جائے گی۔ بلکہ نکلے جارہی ہے۔ دیکھ رہا ہوں کہ کس طرح یہ کارواں اس چوک میں سے آگے بڑھ رہا ہے۔ میں تو اس آگے بڑھتے ہوئی دنیا کے قدموں کا نشان ہوں ـــ اور یہ چوک ـــ جو اس شہر کی شہ رگ ہے، اور یہ شہر جو اس ملک کا دل ہے اور یہ ملک اس دنیا کا جگر ہے۔ اور یہ دنیا جو اس کائنات کا ایک حقیر سا، ننھا سا سیارہ ہے ـــ اب تو ہم سیاروں اور ستاروں کو پھاند رہے ہیں۔ مگر یہ سستی سی چائے کی دکان میں اس دکان سے اپنا پنڈ کیسے چھڑاؤں؟ کیسے آزاد کردوں اپنے آپ کو اس بندھن سے۔ میں رگھو ناتھ برس بینڈ کے ماسٹر جیک کو کہاں لے جاؤں، جو ہر شادی پر زرق برق وردی پہنتا ہے اور کلارینٹ ہاتھوں میں لے کر برات کے آگے آگے چلتا ہے۔ اور جس کے مسکین بچے برات میں پھینکے گئے۔ سکوں کو تلاش کرتے کرتے قدموں کے تلے روندے جاتے ہیں۔
ان بچوں کا اسکول کیا مریخ پر بنے گا یا چاند کی روپہلی دھرتی پر۔؟
میں اسکول ماسٹر مرادی لال کو کیا سمجھاؤں۔ جس کی عمر بچوں کو سمجھاتے سمجھاتے، سوچ سمجھ کی حدوں کو پار کرگئی ہے۔ مگر جس کی پھٹی ہوئی جوتی زماں دمکاں کی بات بن گئی ہے۔
یہ جوتا کیا بیرونی خلاء سے آئے گا؟
اور یہ علی اکبر تو تمھارے ہی کالج کا چپراسی ہے، جس کی چھتیس ۳۶ سالہ کنواری لڑکی اپنے ہی گھر کی چھت سے لٹک کر مرگئی۔ اور جس کی پاداش میں علی اکبر کو ایک سال برابر اپنے تھانے پر رپورٹ دینی پڑی ـــ اب یہ کس ستارے کا باشندہ آکر بتائے گا کہ ایک باپ کن حالات میں اپنی چھتیس سالہ کنواری لڑکی کی خودکشی کا باعث بن سکتا ہے۔
ہیلو برادر!!
ارے یہ تو وکیل صاحب کی آواز ہے۔
ہیلو وکیل صاحب۔ پروفیسر تو چلے گئے بس ابھی ابھی چند لمحے پیشتر ہی۔
چند لمحے؟ چند لمحوں میں تو آج کل ایک انٹر کانٹی نینٹل بیلسٹک میزائل اپنی base سے اٹھ کر اور پانچ ہزار میل کا سفر طے کر کے دشمن کے دارالخلافہ کو تباہ کرسکتی ہے۔
کیا انٹر کنسر کہہ رہے تھے اپنے وکیل صاحب؟ ـــ چائے کی دکان کا مالک نہایت رازداری سے مجھ سے پوچھ رہا ہے۔
کچھ نہیں دوست! تم سناؤ، تمھارا لونڈا فارمولے یاد کر رہا ہے کیا؟
ارے کہاں صاحب! بس یہی تو ایک دکھ ہے ہمیں۔ ورنہ شنکر بھگوان کا دیا ہوا سب کچھ ہے۔ جانے پٹھے کے دماغ میں کوئی بات گھستی کیوں نہیں۔
ہشاد دوست۔ کیا کرے گا بیچارہ فارمولے یاد کر کے۔ میری مانو تو اسے ایک دکان دلادو۔ چار پیسے کما کھائے گا۔
آپ نہیں سمجھتے صاحب۔ میں چاہتا تھا دو چار فارمولے یاد کرلیتا تو ٹھاٹ سے اپنی ایک فلم بناتا۔
فلم؟ یعنی جیومیٹری اور فلم میں کوئی رشتہ ہوتا ہے کیا؟
تو کیا نہیں ہوتا ہے؟ آپ کا ایک لوگ ہی تو باتیں کرتے ہو کہ فلمیں فارمولا پر بنتی ہیں۔
لاؤ وکیل صاحب اپنی انٹر کانٹی نینٹل میزائل اور داغ دو میرے سر کے دارالخلافہ پر۔

اور تم جو یہ چند لموں کی بات کرتے ہو تو بھلا ایک معمولی مقدمے کی پیروی ڈیڑھ سال تک کیوں کھینچ لے جاتے ہو۔؟ کیا تمھارے موکل کا دارالخزانہ میزائل پروف ہوتا ہے۔؟

ہیلو برادر!!!

ہیلو!

کیا ہو رہا ہے؟ باتی لگ گئے؟

جی ہاں، پہلے پروفیسر گئے۔ پھر وکیل صاحب۔ آج آپ بعد میں آئے ہیں۔

گڈ! اچھا برادر، بائی ـــــــ

چلا گیا۔ یہ آخری آدمی تھا۔ اب کوئی ہیلو برادر کی آواز نہیں آئے گی۔ کل شام تک کم از کم۔ اب یہ تینوں سیکورٹی کونسل کے ہال میں، یعنی مے فیئر بار کے ہال میں جمع ہو جائیں گے۔ پھر دیسی شراب مرمریں گلاسوں میں انڈیلی جائے گی۔ مس میری کھنکار کر گلا صاف کرے گی اور مائک پر اسکی سُریلی سنائی دے گی۔

ہلو ایوری باڈی ـــ اور پھر گوا کے ان لونڈوں کا بیٹ میوزک شروع ہوگا۔ جن کے بال کنپٹیوں پر گر آئے ہیں اور جو سرطان کے مریضوں کی طرح اپنے سروں کو نچا نچا کر لوگوں کا نشہ دوبالا کریں گے۔

اور یہ تینوں دوست جو پچھلے نو برسوں سے اسٹڈی جا رہے ہیں یعنی بدستور دوست ہیں، ایک ایک پیگ پینے کے بعد ویٹ نام کرائسس سے روڈیشیا کی حالت زار تک سبھی بین الاقوامی سیاسی موضوعات پر خیال آرائی فرمائیں گے۔ در اصل ان تینوں مختلف پیشوں اور مختلف طبقوں کے آدمیوں کی دوستی ڈپلومیسی کے اصولوں پر استوار ہو گئی ہے۔ یعنی دوست بناؤ، جان پہچان بڑھاؤ اور اس دوستی اور جان پہچان کو قائم رکھو اس کے باوجود کہ دوست سے یا جان پہچان والے سے تم اندر ہی اندر نفرت کرتے ہو۔

پروفیسر سوچ سمجھ والا آدمی ہے مگر مفلس ہے۔

وکیل بڑا نکتہ داں ہے، کامیاب زندگی کا مالک ہے، مگر اُس کی کانشنس الکوٹنگ کرتی رہتی ہے۔

اور تیسرا ٹھیکیدار ہے۔ لاکھوں کے وارے نیارے کرتا ہے، مگر اَن پڑھ اور جاہل ہے۔

یہ تینوں ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھ کر اپنا اپنا ایگو Satisfy کرتے رہتے ہیں۔

معاف کیجیے زبان کچھ ڈپلومیٹک رنگ اختیار کر گئی ہے۔

پروفیسر کو وکیل سے دل ہی دل میں نفرت ہے۔ وکیل کو ٹھیکیدار کی جہالت کھٹکتی ہے۔ اور ٹھیکیدار کو دونوں بور کرتے ہیں۔ اس کے باوجود یہ تینوں شام کو مے فیئر بار میں جمع ہو جاتے ہیں۔ اور اُس طبقے میں شامل ہیں جس کو انٹیلی جینشیا کہتے ہیں۔

میں ان تینوں کا ہیلو برادر ہوں۔

کبھی کبھی مجھے بھی مے فیئر بار میں جانے کی دعوت ملتی تھی اور میں بھی دیسی ساخت کی ولایتی شراب کا گلاس ہاتھ میں لے کر سیاست کی شطرنج پر مہرے چلانے لگتا۔ اور مس میری کی سریلی آواز اور گوا کے لونڈوں کا بیٹ میوزک سنتا ہوں۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے مجھے نشہ ہو جاتا۔ اور نشے کی حالت میں مجھے آس پاس بیٹھے ہوئے چہروں کو مسخ کرنے کا خیال آتا۔ ان چہروں کو آپ جانتے ہیں۔ ان چہروں کو آپ جانتے ہیں۔ ان چہروں کے ساتھ اس شہر اور اس ملک کی امیدیں وابستہ ہیں۔

ایک چہرہ جنگل کے دیودار کا ہے اور فارسٹ لینسر کے ساتھ بیٹھا ہوا نئے ٹھیکوں کے بارے میں کاروباری مرحلے طے کر رہا ہے۔ ان مرحلوں

: ذکر کسی ٹنڈر نوٹس میں نہیں آئے گا۔ یہ کسی سرکاری فائل پر درج نہیں ہوں گے۔ نگران کا تعلق دیو دار کے بنک اکاؤنٹوں کے ساتھ ضرور ہوگا۔

ایک چہرہ تعلیم کے محکمے کا ہے۔ جو سرکردہ پبلشروں کے ساتھ بیٹھا نئی درسی کتابوں کے بارے میں پبلک ریلیشن کر رہا ہے اور لوگ کے بچوں کے بجائے اپنے بچوں کا مستقبل سنوار رہا ہے۔ ایک چہرہ ریڈیو کا مائیکروفون ہے۔ جو پروگراموں کے نئے شیڈیول چند فنکاروں اور کلاکاروں کے ساتھ بیٹھ کر مرتب کر رہا ہے۔

تو پریہ ہے دھرتی ساری کا
پنواڑی کا، پنساری کا

ایک کری بہو دے اُسکو اپنی نوی کو بتا رہا ہے۔ ایک چہرہ ہاؤس بوٹ کا ہے، جو چند خوبصورت لڑکیوں کے ساتھ بیٹھ کر خوبصورت ٹورسٹ اسپاٹ اور خوبصورت چہروں پر اپنی دلیلیں پیش کر رہا ہے ــــ تھوڑی دیر کے بعد یہ کسی لڑکی کے ساتھ اپنے ہوٹل کے کمرے میں جائے گا۔

ایک چہرہ ــــ ایک چہرہ ہو تو ــــ یہ فیئر بار میں تو زندگی کے ہر شعبے سے تعلق رکھنے والے چہرے ہیں۔ مختلف نقاب لگائے۔ مختلف خولوں کے پیچھے محفوظ۔

پھر نہ جانے کیا ہو جاتا ہے کہ ایک ساتھ تمام نقابیں الٹ جاتی ہیں۔ سارے خول اُتر جاتے ہیں، اور سارے چہرے گڈمڈ ہو جاتے ہیں، بس صرف ایک چہرہ باقی رہ جاتا ہے، شیطان کا چہرہ۔

واہ ری دیسی ساخت کی انگریزی شراب!

تیسرا پیگ آتا ہے اور میں ایک ہی گھونٹ میں ختم کر کے اپنے پہلو بردار وکیل سے پوچھتا ہوں ــــ کیوں وکیل صاحب! کیا کوئی ٹیبل ٹو ٹیبل میزائل بھی ایجاد ہوئی ہے۔؟ جس کو میں اپنے ٹیبل سے داغ کر اس بے نقاب چہرے کو مسخ کر سکوں۔؟

جواب میں وکیل پروفیسر کی طرف دیکھتا ہے۔ پروفیسر ٹھیکیدار کی طرف دیکھتا ہے اور یہ تینوں اپنی نفرت بھول کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور بڑی احتیاط سے مجھے فیئر بار سے باہر لے آتے ہیں۔

کمبخت نے ساری شام غارت کر دی۔ باہر آکر ٹھیکیدار پروفیسر کے کان میں کہتا ہے۔

ایسی ہی دو چار شامیں ــــ اور پھر انہوں نے مجھے فیئر بار میں لے جانے کی غلطی کبھی نہیں

آخری بار جب مجھے ان تینوں دوستوں نے کمال ڈپلومیسی سے فیئر بار سے باہر نکالا تو ایک نیتا دوسرے نیتا سے کہہ رہا تھا ــــ روس ہمارا سچا دوست ہے۔ ہمارا روز کیلا اور بھلائی ہے ــــ مگر امریکہ کی کیا بات ہے۔ گندم کے علاوہ وہاں دو اور چیزیں اُگتی ہیں۔ ڈالر اور خوبصورت عورتیں۔ کیا خیال ہے؟

خیال تو صحیح ہے البتہ یہ حقیقت ہے کہ الیکشن قریب آگیا ہے ــــ دوسرے نیتا کا یہ جملہ سنتے سنتے مجھے باہر دھکیل دیا گیا۔

باہر وہی سنگو رام کی چائے کی دکان ہے۔ اور وہی شہر کا چوک اور مختلف آوازیں۔ جن میں رگھوناتھ برس بینڈ کی بے ہنگم صدائیں بھی شامل ہیں۔

رسوئی گھروں سے اٹھتا ہوا دھواں چھتوں کے آس پاس ہی منڈلا رہا ہے۔ جانے یہ دھواں اوپر کیوں نہیں جاتا۔؟ آسمان بہت قریب لگتا ہے۔ ہاتھ بڑھاؤ اور چھو کے دیکھو۔

ویٹ نام کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟ میں منسی ڈرائی کلینرز سے پوچھ رہا ہوں۔

کیا کوئی کپڑے پریس کرنے کی نئی مشین ہے؟ منسی دس کیلو گرام وزنی پریس ایک پینٹ کریز پر رکھتے ہوئے پوچھتا ہے۔ چوک میں ردّد کی طرح

گہما گہمی ہے۔ لوگ آرہے ہیں، جا رہے ہیں۔ بے چارے لوگ۔ بھولے بھالے، سیدھے سادے۔ اپنی بیوی بچوں کے ساتھ جا رہے ہیں۔ میاں سوچتا ہے اگر میری بیوی اس عورت کی طرح کا جل ورم کی اس خوبصورت ساڑی میں ملبوس ہوتی، تو کیا خوبصورت نظر آتی؟ بیوی سوچتی ہے کاش ٹھیل اتنی چپے کلو ہوگیا ہے، اور کھنڈی ترئی کھاتے کھاتے پیٹ جم گیا ہے۔ بچہ سوچتا ہے میرا باپ کتنا کمینہ ہے، جو مجھے بارہ آنے والا گڈا لاکے نہیں دیتا ——

وہ کاٹا۔

وہ گیا۔

دنیا واقعی آگے بڑھ رہی ہے۔ راتوں رات نئے مکانوں کی بنیادیں تیار ہو رہی ہیں۔ نت نئے ماڈرن اسٹور کھل رہے ہیں۔ نئے دو نئے سینما گھر تعمیر ہو رہے ہیں۔ لیمبے سیڈز گاڑی بدل کے نئی ٹرولٹ گاڑی خریدی جا رہی ہے۔ ہر ہفتے ایک نیا بار کھل رہا ہے —— اسکولوں کی چھتیں تین سالوں سے ٹپک رہی ہیں۔ چیزوں کے دام حیث رفتار سے ترقی کر رہے ہیں۔

ہاں! دنیا واقعی آگے بڑھ رہی ہے ——

جانے اس منگو رام چائے والے کی حالت کیوں نہیں سدھرتی۔ اس اسٹیشنری والے کی دکان میں نحوست کیوں برستی رہتی ہے۔ اس ڈرائی کلینر کی قمیص کیوں میلی رہتی ہے۔ اس دفتری بابو کے چہرے پر غم کے بادل کیوں چھائے ہی رہتے ہیں۔ اس اسکول ماسٹر کی لڑکی تو ابھی تک کنواری ہی گھر میں بیٹھی ہے۔

دکیل صاحب! ذرا اپنی تعزیرات میں سے ان باتوں کے بارے میں کوئی نکتہ تلاش کیجئے۔ نہیں ملتا؟ کوئی بات نہیں۔ آپ کے پاس انٹر کانٹی نینٹل بیلسٹک میزائل تو ہے ہی۔

بینڈ ماسٹر چھیک لال! تم ہی اپنی اس زنگ آلودہ کلارینٹ پر کوئی نغمہ سناؤ تاکہ آج کی یہ اداس سی شام گزر جائے۔

مگر بینڈ ماسٹر چھیک لال ایک چلبلی سی، لجائی سی، سمٹی سمٹی سی، جھکی جھکی سی عورت کو دیکھ کر سوچ رہا ہے کہ اس کے میاں کی برات میں میرا ہی بینڈ بجا تھا —— اتنی سی بات سے ہی اس بچارے کا انگ انگ Saxophone ہو جاتا

یہ چھوٹی چھوٹی باتیں نہ ہوتیں تو ——

چائے کی دکان میں اب بھرے ہی چہرے نظر آرہے ہیں۔ بیمار چہرے، پیلے چہرے، بدصورت چہرے، خوبصورت چہرے —— ایک چہرہ اپنے گھر سے چند لمحوں کے لیے بھاگ آیا ہے کیونکہ گھر میں دو دھ والا بل چھوڑ گیا ہے۔ ایک چہرہ دفتر سے آکر ابھی گھر نہیں گیا ہے، کیونکہ اس کا منہ ہندوستانی افسر کی گالیاں کھا کر ابھی تک بدمزہ ہے۔ ایک چہرہ گھر سے بچے کے لئے نیکر خریدنے نکلا ہے اور یہاں آکر بیٹھ گیا ہے کیونکہ چائے کا کپ پندرہ پیسے میں ملتا ہے اور نیکر پانچ روپے میں —— ایک چہرہ اپنی بیوی کو پیٹ کے سیدھا یہاں آیا ہے اور بیٹھا اپنے ضمیر کو کوس رہا ہے۔

ایک چہرہ اخبار میں کوئی اچھی سی خبر پڑھ کر یہاں آیا ہے، تاکہ اس اچھائی کو بانٹ کے ہضم کرے۔

کیسی زندگی ہے جس سے پیار بھی کیا جاتا ہے اور جس کے سائے سے بھاگنا بھی پڑتا ہے۔ یہ کیسی محبت ہے؟ جو بیک وقت وصال بھی چاہتی ہے اور فراق بھی۔ یہ کیسی آگ ہے جو ایک ہی وقت میں جھلسا بھی دیتی ہے اور آبلوں پر ٹھنڈا پھاہا بن کر رکھ بھی دیتی ہے؟ یہ کیسی جدوجہد ہے جو منزل تک لے بھی آتی ہے اور منزل سے پرے بھی پھینکتی ہے —؟

یہ کونسی طاقتیں، کونسی کشش، کونسی قدریں، کونسی مصلحتیں ہیں جو ——

اُف! اب تو میں چائے پی کر بھی بہک جاتا ہوں۔ لے جاؤ! لے جاؤ اس چائے کی پیالی کو میرے آگے سے۔ میری چائے کی پیالی میں طوفان آگیا ہے۔



ہسٹیریا

لارنس ڈریل

ترجمہ کے۔ پی سکسینہ

تعارف

لارنس ڈریل (LAWRENCE DURELL) کے چار ناول، جسٹین، کلیا، بالتھازار، ماؤنٹ اولیو — ۱۹۵۷ اور ۱۹۶۰ کے درمیان شائع ہوئے۔ سارے کردار فرضی ہیں مگر پس منظر اصلی ہے۔ چاروں ناولوں کو مجموعی طور پر لارنس ڈریل نے الیکزینڈریا کوارٹیٹ (ALEXANDRIA QUARTET) کا نام دیا ہے۔

زیر نظر افسانہ "ہسٹریا" لارنس ڈریل کے اسی مجموعۂ ناول کے چند اوراق سے ماخوذ ترجمہ ہے۔

(مترجم)

ہمارا عشق ایک ذہنی کیفیت کی طرح تھا جس نے ہم دونوں کو قید کر رکھا تھا۔ لیکن اسے بیان کرنے کے لئے یہ الفاظ مناسب نہیں ہیں۔ میں اس کی عکاسی ایک دوسرے طریقے سے کرنا چاہتا ہوں۔

جب ہم غیر ملکی سفر کو نکلے تھے تو ایلڈاں کے پانی میں اپنی رناصائیوں کی تیرتی پرچھائیاں اور ہزاروں سگرٹوں کے دھوئیں میں ملفوف جیسے ہم نے دیکھے ...... بڑے گہرے پانی میں خاموشی سے بہتے ہوئے بے جان تپوں پر اس کے گرم آنسو گرے ہیں۔ ... اسپنی میدانوں کی خاموشی کو ہم نے اپنے گھوڑوں کی ٹاپوں سے روندا ہے ... کنارے کی چٹانوں پر ہم خاموشی سے کافی دیر لیٹے رہے ہیں۔ اس کے انکاروں نے مجھے کبھی پریشان نہیں کیا۔ میں جانتا ہوں کہ جشن کے جوان جسم کی قربت میں مرد ہونے کا احساس اور شدید ہو جاتا ہے۔ اس وہم نے مجھے آج بھی گرفتار کر رکھا ہے۔ اُس نے کہا تھا ——— "میں ہر جگہ اس زندگی کی تلاش کرتی ہوں جو جینے لائق ہو۔ شاید میں مر جاؤں ..... یا پاگل ہو جاؤں جیکب اجس ڈاکٹر سے میں نے پیار کیا تھا اُس نے میرے پیار کو محض جنسی سمجھا تھا۔ حالانکہ میرے جذبات میں جنس کا کوئی خاص امتزاج نہیں تھا۔ اس طرح وہ ایک زندگی ختم ہو گئی تم اداس اور غمگین ہو کر خوشی حاصل کرنا چاہتے ہو۔ تم بھی میرے ساتھ انصاف نہیں کر رہے ہو یہی میری زندگی کا المیہ ہے۔"

مجھے محسوس ہوتا ہے کہ یہ کوئی معمولی الفاظ نہیں ہیں جنہیں ایک عورت ادا کر رہی ہو۔ آج مجھے اُن نظاروں کی یاد آ رہی ہے جو بیڈروم کی پرسکون فضا میں میں نے دیکھے یہ نظارے آج بھی میری روح پر غلاف بن کر جم گئے ہیں۔ اس کی چیخ پکار دبانے کے لئے میں باتھ روم کا پائپ پوری رفتار سے کھول دیتا تھا۔ اوپر سے نیچے بار بار آتی جاتی، اپنے ہی ہاتھوں میں اپنا جسم کسے ہوئے، خود سے سرگوشیاں کرتی ہوئی وہ یوں لگتی تھی گویا ڈائنامائٹ کا کوئی بند کنستر پھٹنے سے پہلے اندر ہی اندر

کھول رہا ہو۔ ایسے لمحات میں اپنے بیمار جسم اور کمزوری کے باوجود میں اُس کے صبر کی داد دیتا تھا۔

کسی ڈنر پارٹی میں کسی معمولی سے مذاق پر اداس ہو کر وہ بستر کے نیچے بچھی چٹائی پر کافی دیر پیچ و تاب کے عالم میں پڑی رہتی۔ پھر اچانک بپھر اٹھتی اور اپنے کندھے جھنجوڑ کر مجھے جگا دیتی "ــــ اٹھو جیک! میرے ذہنی اضطراب کی تمھیں کوئی فکر نہیں؟ ــــ" اور جب میں دوبارہ کروٹ بدل لیتا تو وہ سنگار میز پر رکھی کوئی چیز توڑ ڈالتی۔ رات میں اکثر ایسے ہی واقعات کے ساتھ اُس کے خوبصورت چہرے کے میں نے کئی روپ دیکھے۔

پھر شام کے وقت سنہری پوشاک میں ملبوس وہ بے حد عاجزی کے عالم میں کہتی ــــ "مہربانی کر کے میری سنگار میز صاف کر دو، وہاں کوئی چیز ٹوٹ گئی ہے۔" اس کے بعد وہ سگرٹ پر سگرٹ پیتی رہتی ــــ میں جانتی ہوں یہ سب کیا ہے؟ ایک دن میں نے کہا تھا ــــ "تم جب جب مجھ سے بیوفائی کرتی ہو اپنی ہی غلطیوں سے مجھے بھڑکانا چاہتی ہو تاکہ میں تمھیں پیٹ دوں۔ اس طرح شاید تمھارے گناہوں کا کفارہ ادا ہو جائے۔ لیکن میں تمھیں اس طرح سکون نہیں دے سکتا۔ تم اپنے صدمے خود ہی اٹھاؤ۔ مجھے چابک اٹھانے کے لئے تم مجبور نہیں کر سکتیں۔ اور ہاں! .... اپنی چولی کے تسمے بند کر لو ......"

بعد میں بھی اکثر میں یوں ہی پریشان رہا ہوں۔ اکثر اس کی حالت پر ہنستا رہا ہوں۔ ایک رات میں نے اُسے ٹھکا ڈالنے والی ہسٹیریا کی مریض تک کہہ دیا۔ تب میں نے اس کی پر درد سسکیاں سنیں۔ ان سسکیوں کی یاد سے مجھے آج بھی تکلیف ہوتی ہے۔ وہ اچانک اپنے بستر پر جا گری؛ اپنے ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دیئے اور ہسٹیریا کے مریضوں کی طرح گردن اینٹھنے لگی۔

کیا اس قسم کے واقعات ہمیشہ ہوتے رہتے تھے؟ شاید یہ سب ایک ہی مرتبہ ہوا۔ اُسی نے مجھے بہکا دیا۔ میں نے ہمیشہ نیند کی گولیوں کی شیشی کھلنے کی آواز ٹھیک ٹھیک سُنی ہے۔ ایک چھوٹی سی گولی کی گلاس میں گرنے کی ننھی سی جھنکار بھی سُنی ہے۔ اکثر نیند کے جھونکوں میں میں نے اُن گولیوں کے جھنکار سُنی ہے ــــ کہیں وہ زیادہ گولیاں نہ کھا جائے۔ شروع کے دنوں میں اسے اپنے پاس آنے کو کہتا اور وہ میری بات بچوں کی طرح مان لیتی۔ یہ سوچا میری بیوتوفی تھی کہ میں اسے جنسی خوشی سے بہلا ڈالوں گا۔ میرے خیال میں جنسی خوشی پر ہی ذہنی سکون کا انحصار ہے۔ مگر میں نے غلط سوچا تھا۔ لٹتے ہوئے ہرن کو سمیٹتے اور بالوں میں پن لگاتے وقت بھی اسکے دندھے ہوئے گلے سے ہلکی ہلکی سسکیاں اٹھتی تھیں۔ اُن دنوں بھی مجھے ہسٹیریا کے بارے میں اتنا ہی علم تھا جتنا اب ہے۔ مگر اس میں غالباً کوئی اور بات تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ زندگی کی تلاش میں نہیں بلکہ ایک ایسے انتشار و راز کی تلاش میں تھی جو اس کی زندگی کا رُخ موڑ دیتا .... میری اس کی ملاقات ــــ

سیسل کا وہ بال روم، وہ ہم دونوں کا ملنا، وہ پہلے پہلے بے معنی جملے ...... مگر میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس کی خوبصورتی نے مجھے دیوانہ بنا دیا۔ ہاں کسی حد تک اس کے جسم کی ساخت .....

عورت فنکاروں کا ہمیشہ مذاق اڑاتی ہے۔ یہ فطری ہے۔ جب پہلی مرتبہ اُسے یہ معلوم ہوا کہ میں فنکار ہوں تو اس نے میری بخیا ادھیڑنا شروع کر دی۔ اس کی تلخ بیانی کے سامنے میں خود کو بہت کمزور پاتا تھا۔ ہاں! ایسے لمحات میں اس کے چہرے کی جاذبیت میں اضافہ ہو جاتا تھا۔

اس کے بعد مجھے ایک خوبصورت رات یاد ہے ــــ گرمی کی رات، پورے چاند کی رات۔ ہم بالکنی میں کھڑے تھے اور اس نے مجھ سے کہا...

الفاظ مجھے یاد نہیں۔ مگر مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ مجھے ایک تجربہ گاہ سمجھتی ہے۔ اس کی زندگی میں بہت سے راز پوشیدہ تھے۔ میں انھیں بے نقاب کرنے کے لئے بیقرار رہتا تھا۔ میں نے ان دنوں جاسوسی بھی کی۔ قصبے کی عورتوں سے وہ اکثر ملا کرتی تھی۔ ایک آدمی بھی تھا جسے وہ لمبے لمبے خط لکھا کرتی تھی۔ بعد میں مجھے پتہ چلا کہ وہ آدمی ایک ڈاکٹر ہے جس نے کبھی اس کا علاج کیا تھا۔ اپنے ایک خط میں اس نے ڈاکٹر کو لکھا تھا کہ وہ ہر وقت بھیڑ بھاڑ میں گھری رہنا چاہتی ہے۔ گردن تک پانی میں ڈوبی رہنے پر بھی وہ تشنہ لب ہے ــــ میں نے اس کے وجود کے احساس سے اپنے کو الگ کرنے کی کوشش کی مگر مجھے یہ جان کر تعجب ہوا کہ میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میں نے کئی مرتبہ طویل سفر کئے مگر اس کی کمی مجھے پریشان کرتی رہی۔

اب میں نے خود کو آئینے میں دیکھا ——

عمر چالیس سال، کنپٹیوں کے بال تقریباً سفید۔ بارہا خیال آیا کہ اس بندھن کو توڑ ڈالوں —— مگر جسٹین کی مسکراہٹ، دہکتے لب، کسمساتے جسم ...... میرا فیصلہ ٹوٹ کر بکھر جاتا ہے۔ میرا خیال تھا کہ عورت کی ہر قربت انسان کو موت کے نزدیک پہونچاتی ہے۔ تاہم میں ایک لمحے کے لئے بھی خود کو اس کے وجود سے آزاد نہ کر سکا۔ ایک ڈوبتا ہوا احساس ہر وقت مجھے دبوچے رہتا تھا —— ایک ایسا احساس جو کسی دوست کو اسپتال میں چھوڑنے پر لفٹ سے نچلی منزل سے اترنے پر ہوتا ہے ...... میرے کمرے کی خاموشی نے مجھے بہرا کر دیا تھا ——

تخیل کے دو دائرے باہمی اختلاف کے باوجود میرے ذہن میں ساتھ ساتھ سکڑتے پھیلتے تھے۔ میں اطمینان سے خود کو سمجھا لیتا تھا کہ میں نے واقعی کسی سے پیار تو کیا ہے۔ عین اسی وقت میرا انگ انگ چیخ اٹھتا —— جسٹین کے دہکتے رخساروں اور مرمریں باہوں سے تم نے سودا کیا ہے۔ اسے نجات دلا دو، جذبات کی یہ انوکھی کشمکش اپنی زندگی میں پیشتر میں نے کبھی محسوس نہیں کی۔ جسٹین نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ میں اس کی زندگی کی کتاب کو الٹی طرف سے پڑھنا چاہتا ہوں .....

ایلکزینڈریا —— یہاں تھکے ہارے لوگ اپنی بالکنیوں کے دروازے بند کر لیتے تھے اور آنکھوں میں پیلا گرم اجالا مقید کئے ہوئے اپنی دوپہر کے لمحات گزارتے تھے۔ وہ سب ناراض، لوگ تھے، گندے بستروں پر سوتے تھے، خوابوں کی پٹیاں آنکھوں پر باندھے ہوئے ...... ان سب افسانوں کی زندگی میں عشق کا وہی درجہ تھا جو گملے میں لگے کسی پودے کی زندگی میں پانی نہ ہونے کا ہوتا ہے۔

دراصل میری زندگی کا مسئلہ ایک ایسی عورت کی قربت ہے جسے میں صحیح معنوں میں پیار کر سکوں۔ اسی ذہنی کشمکش میں میں نے کئی مرتبہ جسٹین کو پیٹا۔ اتنا مارا کہ بید ٹوٹ گئی اور میرے ہاتھ دکھنے لگے۔ مگر چند لمحات گزرنے کے بعد میں نے اسے اپنی باہوں کے آہنی شکنجوں میں اس قدر جھنجھوڑا ہے کہ اس کی ہڈی ہڈی چٹخنے لگی ہے۔ اپنی دیوانگی کی اس کیفیت میں اپنے اضطراب کو سیراب کر کے میں نے خود اپنے ہاتھوں جسٹین کو کپڑے پہنائے ہیں اور اس کے چہرے کو پاؤڈر کا لیپ دیا ہے۔

—— "ایسے کب تک چلے گا" اس نے گاؤن کے بٹنوں کو دوبارہ بند کرتے ہوئے مجھ سے پوچھا ہے۔

"مجھے نہیں معلوم ——"

"تین ہفتے، تین برس ..... یا ....."

"..... تم بھی دوسرے لوگوں کی طرح ہی سوچتی ہو ——"

بارہا میں نے خود یہ سوچ کر اپنا چہرہ اپنے ہاتھوں میں چھپا لیا ہے کہ جسٹین جسے میں نے حاصل کر لیا ہے، جو فقط میری ہے، مجھے دھوکا دے سکتی ہے، بے وفا ہو سکتی ہے۔ اس پریشان کن حقیقت کو مان لینا بہت مشکل ہے۔

خیر! وہ جو کچھ بھی کرے ...... مجھے میرا بھرپور حق دے دیتی ہے ...... اب میرے اندر سکون ہے، ابدی سکون —— سب کچھ سب کچھ وہم ہے، محض ذہنی تسلی ...... لیکن ..... لیکن عشق آخرکار اسی تسلی کے سہارے تو آگے بڑھتا ہے ..... دیکھا ہے ——

دوسرے کمرے میں خواب آور گولی آہستہ سے چھن کی آواز پیدا کر کے گلاس کے پیندے سے ٹکراتی ہے ......

[illegible]

شاعری کو نصیب ہے۔ آج انگریزی کی کوئی نمائندہ نظم لے لیجیے۔ خود شاعر کا بیان، حالات تخلیق و تخلیق کار، شاعر کا موڈ، وغیرہ کے بارے میں ساری تفصیل مل جائے گی۔ پھر سینکڑوں مستند نقادوں کی صرف اس نظم پر رائے مل جائے گی۔ آج جب کہ احساس و اظہار زمانے کی طرح نئے اور پیچیدہ ہو رہے ہیں تو شاعری کو سمجھنے اور سمجھانے کا کام اور مستعدی سے ہونا ضروری ہے۔ اپنی نئی نظموں کے پس منظر اور مخصوص عمل کے بارے میں ذرا سا اشارہ دیا کیا بُرا ہوگا۔

فراقؔ و جذبیؔ کے بعد جدید غزل میں ناصر کاظمی، سلیمان اریب، بشیر بدر، شہرت بخاری، بل کرشن اشک، ظفر اقبال، جمیل ملک وغیرہ چند ہی نام ایسے ہیں جو خالص غزل گو ہیں اور نظم نہیں کہتے اور کہتے بھی ہیں تو ان کی نظمیں بےحد قابل رحم ہوتی ہیں۔ ورنہ خورشید الاسلام خلیل الرحمان اعظمی، ابن انشا، وحید اختر، شہریار، باقر مہدی، انشا ذ تمکنت، محمد علوی، حمید امجد، فضیل جعفری، راہی معصوم رضا، عادل منصوری، احمد فراز، نور بجنوری، منظر سلیم، سلیم احمد، عنایت علی شاعر، کمار پاشی، پرکاش فکری، امیر عارفی، بشر نواز، قاضی سلیم، شہاب جعفری، مظفر حنفی، شمیم حنفی، قمر اقبال، تاج، دلکش ساگری، وہاب دانش، مدحت الاختر، زبیر رضوی، کرشن موہن، مخمور سعیدی، کیلاش ماہر، بانی، رفعت سروش، اختر ہوشیارپوری، ساحر ہوشیارپوری، محبوب خزاں، منیر نیازی، حسن کمال، ذکا الدین شایاں وغیرہ نئی غزل کے ایسے شاعر ہیں جو نئی نظم بھی بڑی خوبصورتی سے کہتے ہیں۔ ان کی غزل کی کمزوری نئی غزل کی کمزوری اور ان کی غزل کی قوت نئی غزل کی قوت ہے۔

نشتر

مراٹھی کہانی

ناسی۔ پھڑکے
ترجمہ : نور پرکار

کاریگر

13/12

کبھی کبھار جی ہوتا ہے، بے ترتیب گھنی داڑھی بڑھالی جائے۔ اور روز کے شیو کرنے کی غلامی سے ہمیشہ کے لئے نجات حاصل کرلی جائے۔ اسے تو غلامی ہی کہنا چاہیے۔ روز کا بندھن روز روز شیو کرنا۔ صبح کی چائے پی چکنے کے بعد احساسات جاگ اٹھتے ہیں جو کہتے ہیں اس آرام کرسی پر اپنی انگلیوں میں سگار دابے پڑے رہو۔ صبح کا پہلا سگار پینے میں جو لطف حاصل ہوتا ہے اسے بیان کرنا بس سے باہر ہے۔ کچھ ایسے جیسے پہلی بار دو جوان ہونٹ ایک دوسرے میں پیوست ہو گئے ہوں۔ ورنہ دفتر جانے سے پہلے دھاندلی میں انگریزوں کی طرح جو بچ مارنے کے فن کو کیا کسی طرح ڈ Kiss کہا جا سکے گا؟ بالکل اسی طرح سگار کے دو چار کش لینا سکون سے سگار پینے کے برابر نہ ہو سکے گا۔ صبح کی چائے پی لینے کے بعد لگتا ہے کہ سگار کو آہستہ سے اٹھا لیں اور کہیں ـــ جانِ من آؤ میرے قریب۔ اب کوئی اور نہیں صرف تم اور میں! لیکن ایسا موقع ابھی تک ہاتھ نہیں آیا۔ پہلے ہی کش کے ساتھ داڑھی بنانے کا خیال آتا ہے اور اس کی لذت کافور ہو جاتی ہے۔

داڑھی بنانا بھی تو کوئی آسان کام نہیں۔ گھر میں گرم پانی حاصل کرنا، بلیڈ تیز کرنا اور سرکس کے جوکر کی طرح چہرے پر صابن کی موٹی سی تہہ چڑھالینا۔ اتنا سب کچھ کر لینے کے باوجود بھی خون کے قطرات ضائع نہ ہونے پائیں اس احتیاط سے کھر.... کھر.... کھرر کی آواز سنتے ہوئے اگے ہوئے بالوں کو آزادی دے دینا۔ اسی لئے تو کبھی کبھار جی ہوتا ہے کہ اس ہمیشہ کی غلامی سے نجات حاصل کرنے کے لئے داڑھی بڑھالینا بہتر ہوگا۔ کبھی کبھی تو اس خیال کی جڑیں دل کی گہرائیوں میں اتر جاتی ہیں۔ پھر ایک اہم مسئلہ سامنے آکھڑا ہوتا ہے کسی قسم کی داڑھی رکھی جائے.... چونکہ اس کی بہت ساری قسمیں ہیں۔ فرانسیسی داڑھی رکھنا فرض سمجھتے ہیں، البتہ اس سے اتنا پیار بھی نہیں جتاتے۔ چونکہ اسے پورے چہرے پر اپنی حکومت پھیلانے کا اختیار نہیں دیتے۔ اگر انھیں اسی قدر داڑھی سے پیار ہوتا تو یقیناً اسے چہرے کے کونے کھدرے میں بھی اپنی سلطنت قائم کرنے کا حق دے دیتے۔ لیکن ان کی رائے کے مطابق وہ صرف چار انچ کی جگہ ہی گھیر سکتی ہے۔ اس کے پرے آزادی کے نشانات ہوں گے۔ آدھی غلامی اور آدھی آزادی نہ ہی پورے غلام اور نہ ہی پورے آزاد.... ! سکھوں کو تو اس سے اس قدر پیار ہے کہ وہ اسے اپنی محنت و مشقت سے پروان چڑھاتے ہیں اور رکھوالی بھی کرتے ہیں۔ مغل داڑھی کی بھی ایک قسم عام ہے اور شیوا جی داڑھی سے آپ بھی واقف ہیں۔ جب میں داڑھی رکھنے کے مسئلہ پر غور کرتا ہوں تو شیوا جی داڑھی رکھنے میں آسانی معلوم ہوتی ہے۔ کم سے کم محنت اور زیادہ سے زیادہ فائدہ۔ یہ سب کچھ تو داڑھی بڑھنے کے بعد ہو گا البتہ اس کے بڑھتے اور پروان چڑھتے وقت.... ! اس وقت تک خود کو کہاں چھپایا جائے۔ کن کن نظروں سے بچایا جائے؟ کئی سوال جن کا ٹھیک بھی جواب نہیں۔ اس لئے میں داڑھی بڑھانے کے خیال کو ترک کر کے چہرے داڑھی جانے کی غلامی میں اپنے آپ کو مجبور دیتا ہوں اور ان

[illegible] والے چہروں کی فہرست میں ایک نام بڑھتے بڑھتے رہ جاتا ہے۔ کر بھی کیا سکتا ہوں؟ البتہ میرا دوسرا من اس کی زنجیریں توڑ [illegible] سنبھال لیتا ہے!

اس بار میں بہت مسرور و شاداں تھا۔ اپنے ایک دوست کے گھر چار روز کی تعطیل گزارنے چلا گیا۔ اسی وقت میرے دل و دماغ نے سرگوشی کی۔ یہی موقع غنیمت ہے، اب تم آرام سے داڑھی رکھ سکتے ہو۔ اور غلامی کی زنجیریں توڑ سکتے ہو، ہمیشہ ہمیشہ کے لئے! اسی لئے میں بہت بہت مسرور و شاداں تھا کیونکہ ہر چیز کے مکمل ہونے کے لئے کچھ وقت درکار ہوتا ہے۔ بس میرے داڑھی رکھنے کا وقت آ گیا تھا۔ لو بھر کے لئے بھی خدشے [illegible] سے بھی نجات حاصل ہو گیا۔ پورا دن تو اسی خوشی میں بیت گیا۔ رات خواب میں میں نے اپنی تصویریں مختلف پرچوں میں چھپی ہوئی دیکھیں۔ جس میں شیوا جی داڑھی صاف صاف دکھائی دے رہی تھی۔ صبح اٹھتے ہی میں نے آئینہ اپنے ہاتھوں میں لیا۔ دیکھا تو واقعی وہ بڑھ رہی تھی۔ میں نے اندازہ لگا لیا، مہینے بھر میں یہ اپنا جال پوری طرح پھیلا لے گی۔

اسی وقت میرے دوست نے مخاطب ہو کر کہا، "داڑھی بنوانے کے لئے پانی لے آؤں؟"

میں نے سوچا کیوں نہ اس تاریخی شخصیت کے کردار پر روشنی ڈالوں جو داڑھی رکھا کرتا تھا اور اسی قسم کی داڑھی رکھنے کا خیال میرا بھی ہو۔ کیا شیوا جی نے داڑھی رکھنے سے قبل اپنے والد سے اجازت لی تھی — ؟ اس خیال کے ذہن میں آتے ہی میں نے سوچا کیوں نہ شیوا جی کی داڑھی پر ریسرچ کر لی جائے اور آئندہ سال سالانہ جلسۂ عام میں اس پر ایک بھرپور مقالہ پڑھا جائے۔ لیکن میں یہ سب کچھ اپنے دوست سے نہ کہہ سکا۔ میں نے کہا، "میں اپنا سامان بھول آیا ہوں۔"

"اس میں اس قدر سوچنے کی کیا بات ہے! میں ابھی اپنے پانڈو کو بلوا لیتا ہوں، بہت ہی ہلکا ہاتھ ہے اس کا!"

میرے دوست نے اپنے نوکر گنو کو آواز دی اور کہا — پانڈو کو لے آؤ، کہو بھئی سے مہمان آئے ہیں اور ان کی ...... " کوئی دس منٹ بعد پانڈو اپنا ادزار کھولے استرا تیز کر رہا تھا۔ اسکے بعد چٹ پٹ پرسٹ پٹ کی آواز سے استرے کو پھرایا اور میری جانب دیکھ کر مسکرایا۔

واقعی اس کا ہاتھ بہت ہی ہلکا تھا۔ مگر اس کی زبان اس کے ہاتھ سے بھی ہلکی، کس قدر مٹھاس تھی اس کی باتوں میں۔ ستر سال کے اس بوڑھے کاریگر کا ہاتھ بھی چل رہا تھا اور زبان بھی! اس سال بارش اچھی رہی، یقیناً فصل بھی اچھی ہوگی۔ کیا کسانوں کے دکھ دور ہوں گے؟ وہ بیچارے کیا سکھی ہوں گے۔ ساہوکاروں نے ان کو کہیں کا نہیں رکھا۔ زیادہ دھان پیدا بھی ہو جائے تو جائے گا ساہوکاروں ہی کے گھر۔ کسان پر بھو بھوکے رہیں گے۔ اس پر طرہ یہ کہ قریبی تعلقہ کے ایک دیہات میں اب بہت ساری چیزوں کی سہولتیں ہو گئی ہیں۔ شراب، رنڈی! پہلے نشہ کرنے کے لئے پہیں کوس دور ستارا جانا پڑتا تھا۔ اب بالٹی بائی صرف دس میل کی دوری پر ہے۔ دو آنے موٹر کا کرایہ۔ ارادہ کیا اور چل دیئے۔ اب تو ارادے کی بھی ضرورت نہیں رہی۔ اب کاہے کو کسان کے دلدر دور ہوں گے۔ ؟ رہے کانگریس والے۔ ان میں سبھی گاندھی ٹوپی والے کہاں ہیں؟ اب دیکھو نا —— وہ دو ملدار داڑھی کا بچھو کرا۔ کھادی پہنے پھرتا ہے۔ کراڈ تک جا کر دھواں دھار تقریریں کرتا ہے۔ پر کون جانتا ہے اس نے لوکل بورڈ میں کتنے روپے ہضم کئے! راؤ صاحب یہ ہے ہمارے گاؤں کی حالت۔ اور اب کیا کہوں آپ سے، آپ تو مہمان ہیں ہمارے۔! اسی طرح اس کی سرگوشیاں برابر چلتی رہتی ہیں۔ مجھے اس کی گفتگو کا انداز بہت بھایا۔ وہ حجام ہی نہیں — پرچار سبھا کا ممبر بھی لگتا تھا۔

اسکے بعد بھی وہ مجھ سے ملتا رہا۔ اور نئی نئی وارداتیں سناتا رہا۔ مجھے اس بات کا صد درجہ احساس ہے کہ اگر میں اس دیہات میں چھ ماہ تک رک جاتا بھی میری معلومات کا ذخیرہ اس قدر نہ بڑھتا جس قدر اس نے صرف پانچ ہی دنوں کے قلیل سے عرصہ میں میری معلومات میں اضافہ کر دیا تھا۔ داڑھی کا سامان گھر چھوڑ کر آنے کا دکھ مجھے ذرہ برابر بھی نہیں ہوا۔ کیونکہ پانڈو حجام ہی نہیں اطلاعات کا دفتر بھی تھا اور دلچسپی کا سامان بھی۔

اس بدلتے دور میں ایسے کاریگر کی مانگ اب روز بروز کم ہو رہی ہے۔ لوگ اپنی ساری ضروریات اپنے ہی ہاتھوں پوری کر رہے ہیں۔ سوائے گا

بچت، پیسے کی بچت، گھر کا انگریزی استاد، گھر کا وید، گھر کا موسیقار، اور ایسی کتابوں کا مطالعہ کرکے ہر شہری اپنے گھر کا ڈاکٹر، وید، گلوکار اور ٹیچر بھی بن گیا ہے۔ کیا نہیں ڈیڑھ دو روپے میں ایک استرا خرید کر وہ اپنے گھر کا حجام بن بھی چکا ہے۔ اور پانڈو جیسے کاریگر بازار سے عنقا ہوتے جا رہے ہیں۔ پرانے وقتوں میں ان کی حد درجہ قدر و قیمت تھی۔ اکبر نے ایکبار بیربل سے دریافت کیا۔ "پوری دنیا میں سب سے بڑی حکمرانی بادشاہ کی ہوتی ہے نا؟"

"نہیں۔"

"پھر کس کی؟"

"حجام کی۔"

"وہ کیسے؟" بیربل نے جواب دیا۔ "جس کے سامنے ساری دنیا اپنا سر جھکاتی ہے، وہی بادشاہ حجام کے سامنے سر جھکاتا ہے۔"

پرانے وقتوں کا یہ کاریگر جو صرف بال نہیں بناتا تھا، بلکہ گاؤں بھر کے قصے کہانیاں اور افواہیں بھی سنایا کرتا ــــ وہ چلتا پھرتا اخبار تھا جس طرح بہت ساری چیزیں مٹ رہی ہیں۔ اسی طرح یہ بھی مٹ جائے گا۔

اب بھی کبھی کبھار ہاتھ سے داڑھی بناتے وقت اس پانڈو کا خیال جاگ اٹھتا ہے اور آئینہ میں پرانے کاریگروں کے نقوش مٹتے نظر آتے ہیں۔ میں صابن کا جھاگ چہرے پر پھیلائے ہوئے اپنے آپ سے کہہ اٹھتا ہوں، پرانی مٹنے والی چیزوں میں جہاں کئی برائیاں مٹ رہی ہیں، یقیناً اس کے ساتھ کچھ اچھائیاں ختم ہو جائیں گی جس کا کوئی علاج نہیں!

یادوں کے چراغ

مصنفہ: صالحہ عابد حسین

زبان و بیان کی سلاست، روانی اور پاکیزگی جو صالحہ عابد حسین کا طرۂ امتیاز ہے ــــ آپ اس ناول میں بھی پائیں گے۔ اخلاقی اور اصلاحی نقطۂ نظر کے ساتھ ہی فن کے تقاضوں کو پورا کرنا آسان نہیں ہوتا مگر صالحہ عابد حسین کے اس ناول میں یہ خوبی بھی موجود ہے

کتابی پبلشرز نخلوکر روڈ لکھنؤ ۳

چند عمدہ کتابیں

اعتبارِ نظر ــــ سید احتشام حسین کا شمار اردو کے ان چند نقادوں میں ہوتا ہے جنہوں نے فکری طور پر کئی نسلوں کی رہنمائی کی ہے۔ احتشام صاحب کے مضامین کے اس مجموعہ میں ان کے ۱۱ معرکہ آرا مقالے شامل ہیں ــــ قیمت ۴/۵۰

چراغوں کا سفر ــــ نئی دھرتی پرانے گیت' اور 'گلی گلی' جیسے افسانوں کے مصنف رام لعل کے تازہ ترین افسانوں کا مجموعہ۔ قیمت ۴/-

لب و رخسار ــــ ہندوستان کے نئے کھلاڑی ناول نگاروں میں جیسا گہرا سیاسی اور سماجی شعور اور جیسی زبردست فنی مہارت ... کے ناولوں میں ملتی ہے ویسی شاید ہی کسی دوسرے ناول نگار کی تخلیقات میں پائی جاتی ہے۔ لب و رخسار ... کا سب سے عمدہ ناول ہے ...... قیمت ۴/۵۰

برف کی دیوار ــــ برف کی دیوار دو دلوں کے درمیان مہربانیوں کے درمیان اسے پگھلانے کے لئے محبت اور خلوص کی گرمی کی ضرورت ہوتی ہے۔ مائل ملیح آبادی نے اس ناول میں ایک ایسے ہی سماجی مسئلہ کی نشاندہی کی ہے جو ہمارے سماج کو گھن کی طرح کھائے جا رہا ہے ــــ قیمت ۴/۵۰

سپید اور کالی ــــ مائل ملیح آبادی کو تاریخی ناول نگاری پر عبور حاصل ہے۔ اور اسکا شمار مائل صاحب کے مقبول ترین ناولوں میں ہوتا ہے۔ قیمت ۴/-

بہار کا پہلا دن ــــ بیوگی کی سفید چادر اوڑھے ہوئے ایک حسین اور خوبصورت کی کہانی ــــ دل اور دماغ میں کشمکش کی ایک ایسی داستان جسے آپ فراموش نہ کر سکیں گے ..... قیمت ۴/-

ستم ایجاد ــــ احمد جمال پاشا کے طنزیہ مزاحیہ مضامین کا تازہ ترین مجموعہ جو آپ کو قہقہہ زار بنا دے گا قیمت ۴/۵۰

کتابی پبلشرز نخلوکر روڈ لکھنؤ ۳

فرانسیسی کہانی

پارلاگر وسٹ
ترجمہ ل۔ م۔ شاھد

مُقدس ھڈیاں

تعارف

پارلاگر وسٹ فرانس کا ایک عظیم ادیب ہے۔ اسے ۱۹۵۱ء میں ادب کا نوبل انعام ملا تھا۔ اس کے ایک ناول "BARABBAS" پر کسو لجبیا نے ایک فلم بھی تیار کی ہے۔ زیرِ نظر افسانہ مقدس ھڈیاں کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ COMMUNICATE کرنے اور ضرورت سے زیادہ ایک لفظ بھی استعمال نہ کرنے کی ایک عمدہ مثال ہے۔ (مترجم)

دونوں ملکوں کے درمیان گھمسان کی جنگ ہوئی۔ دونوں ملکوں کو اس پر بڑا فخر تھا۔ جو لوگ زندہ رہ گئے تھے وہ ایک دوسرے کی ہمتیں بڑھا رہے تھے۔ سرحد کے دونوں طرف بہادر شہیدوں کے بڑے بڑے مجسمے نصب کئے گئے۔ دونوں ملک اپنے اپنے شہیدوں کے مزاروں پر عقیدت کے پھول چڑھاتے تھے۔ عوام کو ان سورماؤں کے بارے میں فخریہ گیت سنائے جاتے تھے۔ جن کی ہڈیاں ان کے شہید ہونے کے باعث مقدس اور باعث تعظیم بن گئی تھیں۔

تبھی ایک افواہ پھیلی کہ رات کو مرنے والوں کی روحیں قبروں سے نکلتی ہیں اور سرحد پار کر کے ایک دوسرے سے اس طرح ملتی ہیں جیسے اب ان میں کوئی من مٹاؤ نہ رہا ہو۔

دونوں ملکوں نے جانچ پڑتال کے لئے ایک کمیشن مقرر کیا۔ کمیشن کے ممبران اس جگہ گئے اور چھپ کر آدھی رات کا انتظار کرنے لگے۔

پھر انہوں نے دیکھتے ہی دیکھتے کھلبلی ہوئی زمین سے بڑی خوفناک شکلیں اٹھیں اور سرحد کی طرف بڑھیں۔ ایسا لگتا تھا وہ لاشیں ہاتھوں میں کچھ اٹھا کر لے جا رہی ہوں۔ غصے سے بھرے ہوئے کمیشن کے ممبران نے ان کا پیچھا کیا۔

"اے تم لوگ، جنہوں نے اپنے دیش کے لئے جانیں قربان کی ہیں۔ جن کے آگے ہم سر جھکاتے ہیں۔ جنہیں عزت دینے اور ہمیشہ زندہ رکھنے کے لئے مزاروں پر جاتے ہیں جن کی قبروں کو ہم مقدس تصور کرتے ہیں۔ اب تم ہی لوگ دشمن سے دوستی کر رہے ہو۔ اس سے صلح کر رہے ہو۔!"

شہید سہما حیران ہو کر کمیشن کی طرف دیکھنے لگے۔

"بالکل نہیں۔ ہم پہلے ہی کی طرح ایک دوسرے سے نفرت کرتے ہیں۔ ہم تو صرف ہڈیوں کا تبادلہ کر رہے ہیں۔ ہر چیز گڈمڈ ہو گئی ہے۔"

[illegible]

[illegible] پھر وہ جھک کر ریت میں سے سیپیاں بٹورنے لگا کیکڑے اور دوسرے کیڑے مکوڑے اُچھلتے ہوئے سمندر کی طرف سے آتے تھے۔ وہاں سے نکل جاتے تھے۔ وہ ٹوٹی ہوئی سیپوں کو دور پھینک دیتا اور ان سیپوں میں سے جو اسے خوبصورت لگتیں انھیں قمیص سے صاف کرکے جیب میں ڈال لیتا۔ تاریکی آہستہ آہستہ بڑھتی جارہی تھی اس لئے سیپیاں ڈھونڈھنا مشکل ہوگیا تھا لڑکا ایک بڑی خوبصورت سیپی کو جو ایک طرف سے تھوڑی ٹوٹی ہوئی تھی ہاتھ میں لے کر غیر دانستہ طور پر دیکھتا رہا کہ اُسے جیب میں رکھ لینا چاہیئے یا نہیں مگر اس کی نظر نے ٹوٹی ہوئی سیپی کو قبول نہیں کیا۔ اس لئے ـــــ اس لئے ... آہستہ سے وہیں ریت پر رکھ دیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی نظریں چند لمحے کے لئے خوفناک آوازیں پیدا کرنے والی لہروں پر ٹکی رہیں اور اس سمت ہوگئیں جدھر چوپاٹی کی بتی کا رنگ لال سے پیلا اور پیلے سے ہرا ہو رہا تھا اور لال رنگ کی کئی بسیں کھڑکھڑاتی ہوئی ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتی جاتی تھیں۔

ایک بچہ اپنی ماں کی انگلی پکڑے ناچتا ہوا آرہا تھا وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا۔ ایک غبارے والے کے پاس سے نکلتے ہوئے اس نے غباروں کو چھیڑ دیا۔ غبارے والے نے گھوم کر غصیلی نظروں سے اس کی طرف دیکھا تو اس نے اس کی طرف منہ کرکے زور سے سیٹی بجائی اور ہاتھ سے جیب میں بھری ہوئی سیپیوں کا وزن اور بھلاؤ محسوس کرتا ہوا ذرا تیز تیز چلنے لگا۔

سڑک کے اس کے پار چرنی روڈ اسٹیشن پر ایک لوکل ٹرین آدھا منٹ پہلے چرنی لائن کی طرف سے کر رکی تھی جو اب سیٹی بجا کر گرانٹ روڈ کی طرف چل دی۔ کچھ دیر بعد بہت بڑی بھیڑ چرنی روڈ کا پل پار کرتی ہوئی دکھائی دینے لگی۔ کچھ بھایا لوگ دودھ بیچ کر خالی برتن لئے ہوئے آرہے تھے۔ [illegible] لڑکیاں ایک دوسرے کو چھیڑتی ہوئی پل کے زینوں سے اتر رہی تھیں۔ لڑکے کی نظر ریڈ یو کلب کے اس حصّہ پر مرکوز رہی جہاں پر ہر گھسنے نئے چہرے قریب آتے ہوئے دکھائی دیتے اور کچھ دیر بعد سیڑھیوں سے اتر کر اوجھل ہو جاتے تھے

کھپ، کھپ، کھرر لڑکے نے منہ میں دو انگلیاں ڈال کر آواز پیدا کی اور مسکرا کر چاروں طرف دیکھا کہ لوگوں پر اس کا کیا ردعمل ہوتا ہے ـــ مگر یہ دیکھ کر کہ اس کی آواز پر کسی نے غور نہیں کیا، وہ بانہیں پھیلا کر اکڑ اکڑ کر چلنے لگا۔ کالے پتھر کے بت کے پاس پہونچ کر اس نے اس کے چاروں طرف دو مرتبہ چکر لگایا۔ پھر بھاگتا ہوا وہاں پہونچ گیا، جہاں ایک خاندان کے چھ سات لوگ ایک گیند کو اونچے سے اونچا پھینکنے کا مقابلہ کر رہے تھے۔ وہ اپنے روکھے بالوں کو کھجاتا اور بیچ بیچ میں بائیں پنڈلی کو داہنے پیر سے کھجلاتا ہوا ان کا کھیل دیکھنے لگا۔ ان میں سے جب ایک پندرہ سولہ سال کی لڑکی جس نے اپنا نیلا دوپٹہ کس کر کمرسے لپیٹ رکھا تھا، گیند کے ساتھ اچھلتی تو لڑکے کی ایڑیاں بھی زمین سے تین چار انچ اٹھ جاتیں۔

اے لڑکے! کسی نے اسے قریب سے آواز دی۔

اس نے دیکھا کہ ایک پارسی اپنے سوئے ہوئے بچہ کو کندھے سے لگائے کھڑا تھا اور اسے اشارہ سے اپنی طرف بلا رہا تھا۔ اس نے ہونٹ گول کرکے پارسی کی طرف دیکھا اور پھر کھیل دیکھنے میں محو ہوگیا۔

ادھر آـــــ پھر پارسی کی آواز آئی ـــــ بچہ کو اٹھا کر سیٹی باغ تک لے چل، پیسہ ملے گا۔

ـــ خالی نہیں ہے ـــــ لڑکے نے انکار کے انداز میں ہاتھ ہلا کر کہا۔

ـــ سالے کا دماغ دیکھو ـــ پارسی بڑبڑایا ـــ خالی نہیں ہے!۔ چلنا ہو تو دو آنے پیسہ ملے گا۔

ـــ خالی نہیں ہے ـــــ لڑکے نے اور بھی بے رخی کے ساتھ کہا اور جیب سے ایک سیپی نکال کر اسے ہوا میں اچھالا اور دبوچ لیا۔

ـــ سالا بدمعاش ہے ـــ پارسی نے اپنی بیوی کو مخاطب کرکے کہا، جو گردن ایک طرف جھکائے خاموش کھڑی تھی۔ وہ [illegible]

لیا پر دیئے۔

سڑک کی طرف ... کا ... بہ تقریباً ختم ہو گیا تھا۔ اب وہ لڑکی ہی اکیلی گھما کر گیند اچھال رہی رہی تھی اور ہاتھ پیچھے کرکے اسے لپک لیتا گیند ... باہر گھمانے میں گیند ذرا زیادہ گھوم گئی اور تیزی سے سمندر کی لہروں کی طرف بڑھ گئی۔ لڑکی کے منھ سے ہلکی سی آواز نکلی۔ لڑکا تیزی تھی ایک ... بھاگا۔ اس سے پہلے کہ گیند سامنے سے آتی ہوئی لہر کی لپیٹ میں آجاتی، اس نے ٹخنے ٹخنے پانی میں جا کر اسے پکڑ لیا، حالانکہ اندھیرا سے گیند کی ... اور پھر میں تیز کرنا مشکل ہو گیا۔ وہ گیلی گیند کو آہستہ آہستہ اچھالتا ہوا ان کے پاس واپس لے آیا۔

اوا ... بڑی تیز آنکھ ہے رے! ــــ بھاری گردن کے ادھیڑ عمر والے آدمی نے، جو اس لڑکی کا باپ معلوم ہوتا تھا، گیند اس کے لیتے ہوئے عجیب مسکراہٹ سے کہا۔

ــــ کس طرح چمگادڑ کی طرح لپکا تھا! ــــ لڑکی بولی۔

لڑکے کے گلے سے خشک ہنسی کی آواز سنائی دی۔

ــــ چل ہمارا سامان اٹھا کے چل ــــ لڑکی کی ماں، جو سوکھی ہڈیوں کا ڈھانچہ تھی، احسان کرنے کے انداز میں بولی ــــ گھر جاتے جاتے ایک دو آنہ کی کمائی کرلے۔ ــــ اور پھر وہ خاندان کے دوسرے لوگوں کو مخاطب کرکے بولی ــــ اور کیا! بچارے کو کچھ تو بدل مل جائے۔

ــــ چلے گا؟ ــــ آدمی نے اسے خاموش دیکھ کر حقارت سے کہا۔

ــــ چلے گا، ــــ لڑکے نے جواب دیا۔

ــــ تو یہ دری اور سب سامان سمیٹ کر ٹوکری میں رکھ لے ــــ اس آدمی نے پاس دری پر رکھی پلیٹوں اور چمچوں وغیرہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

لڑکے نے ذرا جھجک کر بکھرے ہوئے سامان کو دیکھا، ایک نگاہ لڑکی پر ڈالی اور جھک کر چیزیں جمع کرنے لگا۔

ــــ سب چیزیں ٹھیک سے رکھ اور جا پہلے پلیٹیں اور چمچ دھولا،

ــــ عورت نے حکم دیا۔

اس نے چھوٹی پلیٹیں اور چمچ جمع کرلئے اور انھیں لئے ہوئے سمندر کی طرف چلا گیا۔ اس نے ان سب کو ریت سے مل مل کر صاف کیا اور پھر اچھی طرح اپنی قمیص کے دامن سے پونچھ لیا۔ ایک پلیٹ دامن سے چھوٹ کر لہر کے ساتھ بہہ چلی، تو اس نے جھپٹ کر اسے پکڑ لیا۔ اور پھر سے صاف کرنے لگا۔ جب اسے اطمینان ہو گیا کہ سب چیزیں اچھی طرح چمک گئیں ہیں، وہ انھیں لئے ہوئے سیٹی بجاتا ہوا واپس لوٹا۔

ــــ اتنی دیر کیا کر رہا تھا وہاں؟ ــــ عورت اس کے آتے ہی بھڑک کر بولی ــــ تیرے لئے ہم یہیں بیٹھے رہیں گے کیا؟ جلدی کر۔

وہ بیٹھ کر پلیٹوں کو ٹوکری میں لگانے لگا۔ عورت بالکل اس کے پاس آکر کھڑی ہوئی اور بولی ــــ سب چیزیں گن کر رکھنا۔ پلیٹیں پوری بارہ ہیں نا؟

لڑکے نے پلیٹیں گنیں اور جواب دیا ــــ ہاں۔

ــــ اور چمچ؟ ــــ عورت نے جھکتے ہوئے کہا ــــ چمچ تو مجھے پانچ ہی دکھائی دے رہے ہیں؟

لڑکے نے بھی انھیں گنا اور کہا ــــ ہاں، چمچ پانچ ہی ہیں۔

—— باپ کیسے ہیں؟ —— عورت کرخت آواز میں بولی —— پورے چھ تھے۔ ایک چمچ کہاں ہے؟
—— ہوگا —— میں رکھ لیا ہوگا۔ اس کی جیب دیکھو —— آدمی نے پاس آتے ہوئے کہا۔
لڑکے کا ہاتھ اچانک جیب پر چلا گیا۔ اور سیپوں کے پھیلاؤ کو چھو کر ان کے بچاؤ کے لئے دہیں پر رکا رہا۔
—— نکال رے چمچ۔ وہاں پر ہاتھ کیا رکھے ہوئے ہے؟ آدمی نے اسے زور سے ڈانٹا۔
لڑکا خوف سے لڑکی کے پاس سے اٹھ کر دو ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔
—— میں نے چمچ نہیں لیا —— اس نے کمزور آواز میں کہا —— مجھے اس کا کچھ پتا نہیں۔
—— مجھے نہیں پتا۔ تو تیرے باپ کو پتا ہے؟ —— کہتے ہوئے اس آدمی نے لڑکے کو بالوں سے پکڑ لیا اور اس کے منہ پر ایک طمانچہ جڑ دیا۔
دے دے چمچ، تجھے کچھ نہیں کہیں گے —— عورت نرمی سے بولی۔
—— چمچ میرے پاس نہیں ہے —— لڑکا اسی آواز میں بولا —— میری جیب میں میری اپنی چیزیں ہیں!
—— اپنی چیزیں ہیں! —— وہ آدمی بڑبڑایا —— ابھی دیکھتا ہوں، تیری کون سی اپنی چیزیں ہیں! —— اور اس نے لڑکے کو بالوں سے اچھی طرح جھنجھوڑ کر جیب پر رکھا ہوا اس کا ہاتھ اپنے موٹے ہاتھ میں کس لیا۔ اس ہاتھ کے دباؤ سے لڑکے نے محسوس کیا کہ اس کے اپنے ہاتھ کے نیچے اس کی سیپیاں ٹوٹ رہی ہیں۔ اسے جیسے ان سب سیپیوں کے چہرے یاد تھے اور اس کا ہاتھ پہچان رہا تھا کہ ان میں سے کون کون سی سیپی ٹوٹ رہی ہے۔ اس آدمی کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑانے کی ہر ممکن کوشش کی، مگر وہ چھوٹ نہ کیا پاتا، اس آدمی نے اس کی گردن کو دبوچ لیا۔
—— سالا بھاگنا چاہتا ہے؟ —— وہ آدمی ہونٹ چباتا ہوا بولا —— میں تجھے بھاگنے دیتا ہوں! دیکھ ابھی تیرا کیسے بھرتا بناتا ہوں! ہٹا ہاتھ!
اور لڑکے کا ہاتھ اس موٹے ہاتھ کے شکنجے کی وجہ سے مردہ ہو کر ہٹ گیا۔ آدمی نے اس کی جیب کو باہر سے ہی پکڑ دبایا، جس سے جیب میں پڑی ہوئی نامعلوم کئی اور سیپیاں بھی ٹوٹ گئیں۔
—— ہے چمچ! —— اس نے اپنی بیوی کی طرف دیکھ کر کہا —— حرامی نے نامعلوم جیب میں اور کیا کیا چیزیں بھر رکھی ہیں!
—— ہائے کیسا چور ہے! —— وہ لڑکی، جو اپنے چھوٹے بھائیوں کو لے کر اب الگ کھڑی تھی، اچانک بول اٹھی۔
لڑکے کی کشمکش ختم ہو گئی تھی۔ اس آدمی نے اس کی جیب میں ہاتھ ڈال کر جیب کی سب چیزیں باہر نکال لی تھیں۔ زیادہ تر ٹوٹی ہوئی سیپیاں ہی تھیں۔ ان کے علاوہ اور جو مال اس کی جیب سے برآمد ہوا، وہ تھا، ایک تانبے کا تعویذ، ایک آدھا کھایا ہوا امرود، کچھ کوڑیاں اور ایک پیسہ ——
—— نہیں نکلا؟ —— عورت نے ان سب چیزوں پر نظر ڈالتے ہوئے ناامید آواز میں پوچھا۔
—— نہیں —— آدمی ذرا کھسیانی آواز میں بولا —— نامعلوم سور کا بچہ کہاں چھپا آیا ہے!
—— ادھر دھونے لے گیا تھا، تو کہیں رکھ آیا ہوگا —— لڑکی دور سے بولی۔
اتنی تھوڑی عمر میں۔ سالے سب کچھ سیکھ جاتے ہیں! —— آدمی نے لڑکے کی چیزیں زور سے دور پھینکتے ہوئے کہا —— جلے لے۔ سنبھال سب ماں کے پاس!

اندھیرے

اندھیرے میں تانبہ کی چمک کچھ دور تک دکھائی دی، پھر تعویذ معلوم کہاں جا گرا۔ سیپیاں ہلکی تھیں، اس لئے وہیں پاس ہی بکھر کر گئیں۔ جس طرف اس کی چیزیں پھینکی گئی تھیں، لڑکا تیزی سے اس طرف بھاگا۔ وہاں وہ اندھیرے میں آنکھیں گڑا گڑا کر دیکھنے لگا۔ لوگوں نے پھینکے ہوئے جھوٹے پتے اور ردّی خالی ناریل اور مسلی ہوئی کاغذ کی تھیلیاں ہی جہاں تہاں دکھائی دے رہی تھیں۔ ایک چمکتی ہوئی چیز کو دیکھ کر وہ جھکا۔ وہ سگریٹ کی ڈبیہ کی پنی کا ٹکڑا تھا۔ پھر ایک جگہ ایک پتھر کو دیکھ کر بھی اسے کچھ دھوکا ہوا۔ اسے اس نے اٹھا کر دور سے پھینک دیا۔ وہ تھیلیوں اور پتوں کو پیروں سے دبا دبا کر ٹٹولنے لگا۔ پھر اس نے دو ایک خالی ناریلوں کو جھٹک کر دیکھا۔ کافی دیر ادھر ادھر دیکھنے پر بھی اسے کچھ نہیں ملا، تو وہ سیدھا کھڑا ہو گیا۔ اس نے دیکھا کہ وہ آدمی سمندر کی طرف سے ہو کر آ رہا ہے۔ لڑکا تیزی سے اس کی طرف لپکا۔

— میرا ٹکا دو! — اس نے اس کے پاس پہنچ کر مایوسی کے ساتھ زور سے کہا۔

— پرے ہٹ! — وہ آدمی اسے بانہہ سے ڈھکیل کر آگے بڑھا۔

لڑکے نے پیچھے سے اس کی بانہہ پکڑ لی اور بولا — پہلے میرا ٹکا دو۔ میں تمہیں ایسے نہیں جانے دوں گا۔

ہٹ جا نہیں تو کبھی چھوڑ دوں گا! وہ آدمی اس سے بانہہ چھڑانے کی کوشش کرتا ہوا بولا۔

— یہ ..... یہاں موالی گیری کرتا ہے؟

— گالی مت دو! — لڑکے نے للکارنے کے انداز میں کہا۔

— ارے ہٹ بھی! بڑا آیا! — اس آدمی نے اس سے بانہہ چھڑا کر اب اسے زور سے دھکا دیا۔ لڑکا گرنے کو ہوا، مگر سنبھل گیا۔ اس نے جھپٹ کر اس کی بانہہ پر دانت گڑا دیئے۔ وہ آدمی تڑپ اٹھا۔ پھر اسے زمین پر گرا کر جوتے سے ٹھوکریں لگانے لگا۔ اس آدمی کے بیوی اور بچے قریب آ گئے اور آس پاس سے اور بھی لوگ جمع ہو گئے۔ لڑکا گر کر زور زور چلا رہا تھا — مار دے! میری جان نکال دے۔ مگر میں اپنا ٹکا لئے بغیر نہیں چھوڑوں گا! مار جتنا چاہے مار۔ . . .

تین چار لوگوں کے پکڑنے پر وہ آدمی الگ ہٹا۔ اس کی بیوی لوگوں کو مخاطب کر کے کہہ رہی تھی — اتنا سا ہے مگر پکا چور! ہم نے اسے سامان اٹھانے کے لئے لگایا اور سامان ٹوکری میں رکھنے کو کہا، تو دیکھتے دیکھتے اس نے ایک چیز بیچ میں غائب کر دیا۔ پوچھنے لگے تو بھاگ کھڑا ہوا۔ اب ان کی بانہہ پر دانت کاٹ رہا تھا۔ دنیا میں ایسے نالائق بھی ہوتے ہیں۔

اور وہ آدمی ان لوگوں سے جس نے موالی کو چھڑا دیا تھا کہہ رہا تھا۔ میں نے تو ابھی اسے چند ہی ٹھوکریں لگائی ہیں، ایسوں کو زندہ دفن کروا دو! سالے ایک تو چوری کرتے ہیں، پھر موالی گیری کر کے دھمکاتے ہیں۔

اور لڑکا رو رہا تھا اور دو آدمیوں کے شکنجہ میں پھنسا ہوا کہہ رہا تھا میرا ٹکا مجھے میری ماں نے دیا تھا۔ میری ماں مر گئی ہے، اب مجھے ٹکا کہاں سے ملے گا؟ میں اس سے اپنا ٹکا لیکر چھوڑوں گا، خواہ یہ میری جان ہی کیوں نا لے لے، یا میں اس کی جان ... — اور وہ لوگوں کی گرفت سے نکلنے کی کوشش کرنے لگا۔

وہ آدمی کہہ رہا تھا — میں کہتا ہوں، اسے پولیس کے سپرد کر دینا چاہیئے۔ اس کی تلاشی لی تو اس کی جیب سے ایک تانبہ کے پیسہ کا تعویذ نکلا تھا۔ وہ سالے نے کسی کا اٹھایا ہو گا۔ وہ یہیں کہیں پر پڑا ہے۔ اس کے لئے بدمعاش کے سر پر خون سوار ہو رہا ہے۔

— خیر جناب چھوڑیئے — ایک آدمی اسے سمجھاتا ہوا بولا — آپ شریف آدمی ہیں، آپ کیوں اس موالی کے منہ لگتے ہیں؟ چوری اور جیب کاٹنا تو ان لوگوں کا پیشہ ہوتا ہے۔ آپ کے ساتھ عورتیں اور بچے ہیں، آپ یہاں سے جایئے۔

نزدیک سے گزرتے ہوئے ایک آدمی نے پوچھا ——— یہاں کیا بات ہوئی ہے؟

——— پتہ نہیں، ——— کسی نے جواب دیا ——— اس لڑکے نے کوئی چوری اور ی کی ہے۔ اس کے لئے اسے مار وار پڑی ہے۔

——— بمبئی میں ان لوگوں کے مارے ناک میں دم ہے، ——— اس نے کہا۔

——— ہاں اور چوپاٹی تو ان لوگوں کا خاص اڈا ہے ——— دوسرے نے ہاں میں ہاں ملائی۔

——— دیکھو تو کیسے گالیاں بک رہا ہے! ——— ایک اور بولا۔

——— چلئے بکنے دیجئے۔ آپ کیوں اپنا وقت خراب کر رہے ہیں۔

اور وہ آدمی دوسروں کے کہنے سے اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ وہاں سے چل دیا۔ جاتے ہوئے وہ لوگوں کو سمجھانے لگا کہ ایسے لوگوں کے ساتھ سختی سے پیش آنا کیوں ضروری ہے۔ دو آدمی اب بھی لڑکے کو پکڑے ہوئے تھے اور وہ ان کے ہاتھ سے چھوٹنے کی کوشش کرتا ہوا سب کو گالیاں دے رہا تھا۔ لوگ اُسے کھینچتے ہوئے دوسری طرف لے گئے۔ جب اسے چھوڑا گیا تو کچھ دور جاکر اور بھی زور زور سے گالیاں دینے لگا۔ اس پر اسے پکڑ کر دو چار چانٹے لگائے گئے۔ تو وہ ریت پر گر کر سسکیاں بھرنے لگا۔

تاریکی اور بڑھ گئی تھی۔ میدان میں ٹہلنے والے کم ہو گئے تھے۔ کہیں کہیں پر دو ایک لوگ نظر آتے تھے یا دور کونے میں ایک آدمی ایک لڑکی کی کمر میں ہاتھ ڈالے بنچ پر بیٹھا اسے چوم رہا تھا۔ سائیں شوں شی۔ آواز کے ساتھ ایک لہر دوسری لہر سے آگے بڑھ آتی تھی۔ دور جھوا تا ؤں کی بتیاں ٹمٹاتی دکھائی دے رہی تھیں۔ ٹھپ ٹھپ ٹھپ، ٹھپ ٹھپ ٹھپ، ٹھپ ٹھپ ٹھپ، فضا میں اس طرح کی آوازیں بڑھتی جا رہی تھیں۔

کافی دیر پڑے رہنے کے بعد لڑکا ریت سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ کچھ تلاش کرتے ہوئے گھسٹتے قدموں میں سیدھا چلنے لگا۔ چلتے ہوئے اس کا پیر ایک ناریل پر سے پھسل گیا۔ اس نے اس ناریل کو زور سے ایک گالی دی اور ایک زور دار ٹھوکر لگائی۔ ناریل لڑھکتا ہوا سمندر کی لہروں کی طرف چلا گیا۔ اس نے قریب جاکر اسے دوسری ٹھوکر لگائی تو ناریل سامنے سے اٹھتی ہوئی لہر میں کھو گیا۔ اس لہر کے لوٹتے لوٹتے اسے وہ ناریل پھر دکھائی دیا۔ دوسری لہر بڑھتی آرہی تھی، اس لئے اس نے قریب نہ جاکر دہیں سے زور سے ایک پتھر ناریل کو مارا اور ساتھ میں زور دار گالی دی ——— تیری ماں کو. . . . . . . اور پھر وہ سامنے سے آتی ہوئی ہر لہر کو زور زور سے پتھر مارنے لگا ——— تیری ماں کو ——— تیری بہن کو. . . . . . .

اطلاع بابت ملکیت از روئے فارم ۴

ملکیت:- ایم۔ ایچ انصاری۔ قومیت۔ ہندستانی۔ پتہ عبدالعزیز روڈ لکھنؤ
ایڈیٹر:- سید جمیل احمد۔ قومیت ہندستانی۔ پتہ۔ کتاب چوک۔ لکھنؤ ۳
پرنٹر و پبلشر سید جمیل احمد۔ قومیت ہندستانی۔ پتہ۔ کتاب۔ چوک لکھنؤ ۳
میں سید جمیل احمد تصدیق کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا اطلاعات میرے
علم و یقین کے مطابق بالکل صحیح ہیں۔ سید جمیل احمد ۲۵ فروری ۱۹۶۷

تلخ و تند و شیریں

جدید شاعری، عظمت کی تلاش — خلیل الرحمن اعظمی

بڑی خوشی کی بات ہے کہ ادھر نئی شاعری کے سلسلے میں بڑی سرگرمی اور چہل پہل ہے اور لوگ نئے رجحانات کو سمجھنا چاہتے ہیں۔ یہ اچھا ہے کہ آپ سالنامے میں اس کے لئے ایک حصہ مخصوص کر رہے ہیں اس سے بہت سی باتیں سامنے آئیں گی۔ اب تک زیادہ تر بحثیں مکتوب نگاری کی شکل میں ہوئی ہیں اور ان بحثوں میں مناظرے کا رنگ اور ذاتیات کے چھینٹے بہت زیادہ آگئے ہیں، اس طرح کی تحریروں میں زیر بحث مسئلہ تو پیچھے رہ جاتا ہے لکھنے والا اپنی بات کو بنانے اور فریق مخالف کو قائل کرنے یا زیر کرنے کی فکر میں زیادہ رہتا ہے۔ میرا خیال ہے نئی شاعری پر اظہار خیال آزادانہ ہونا چاہئے دوسروں کی رایوں کے ردعمل میں نہیں۔

کتاب کے پچھلے شمارے میں شمیم حنفی کا مضمون "شعلے کی شناخت" خاص طور پر خیال افروز ہے۔ اس مضمون میں نئے مسائل کو سمجھنے کے لئے حنفی صاحب نے جو پیرایہ اختیار کیا ہے وہ قابل قدر ہے۔ رہی یہ بات کہ فراق صاحب جدید شاعری میں وہ عظمت ڈھونڈھنا چاہتے ہیں جو ہومر، دانتے اور شیکسپیر جیسے شعرا میں ہے تو میں نہایت ادب سے عرض کروں گا کہ یہ عظمت تو فراق صاحب کے حلقے میں بھی نہیں آئی۔ ان کی شاعری کی قدر و قیمت بیسویں صدی کی اردو شاعری اور وہ بھی محض غزلیہ شاعری کے پس منظر میں ابھرتی ہے۔ عالمی شاعری کے سلسلے میں اقبال کے علاوہ اور کس شاعر کو ہم پیش کر سکتے ہیں؟ بات یہ ہے کہ اس طرح کے شاعر صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ دس پانچ سال یا پندرہ بیس سال کے دائرے میں انہیں ڈھونڈنا ایک طرح کی سادہ لوحی ہے۔ البتہ نئے شاعروں کو یہ احساس دلاتے رہنا زیادہ صحیح ہے کہ نئی شاعری نے فیشن کی طرح کی چیز نہیں ہونی چاہئے کہ ہر چار پانچ سال کے بعد ڈیزائن بدلنے سے پرانی چیزیں بیکار ہوتی چلی جائیں۔ ادب متحرک اور تغیر پذیر ہے لیکن اس میں ایک تسلسل بھی ہوتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ جو ادب اپنے وقت کی پیداوار ہوتے ہوئے حقیقی معنی میں ادب ہوگا وہ آئندہ بھی زندہ رہے گا۔ میر، غالب اور اقبال مرحوم ان معنوں میں نہیں ہیں جس طرح عام آدمی مرنے کے بعد ہو جاتا ہے، انکی شاعری آج بھی ہمارے لئے زندہ ہے اور ہمارے شعور و احساس میں شامل ہے۔ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ نے ایک موقع پر بڑی اچھی بات کہی تھی کہ جدت اور ندرت کی مسلسل خواہش اور محض اسی پر اصرار اتنا ہی مضر اور غیر صحت مند ہے جتنا اپنے بزرگوں اور قدیم شعرا کے اسالیب کو بجنسہ قائم رکھنے کی ضد۔ نئے شعرا میں جو لوگ محض فیشن کی خاطر ادھر ادھر سے کچھ کتابیں اور رسالے پڑھ کر یا انگریزی میں اور بیٹلکس کا ذکر سن کر نئے شاعر بننے کے خواہش مند ہیں انہیں مشورہ دینے کی ضرورت ہے کہ شاعری زندگی کے حقیقی تجربات و احساسات، عہد حاضر کے مسائل کے ادراک اور انہیں اپنے اندر رچا بسا کر ان کے خوبصورت، معنی خیز اور مؤثر اظہار سے وجود میں آتی ہے۔ یہ شاعری اپنے اندر تازگی بھی رکھتی ہے اور اسکا اثر دیرپا ہوتا ہے۔

کرشن چندر۔ ایک سدا بہار فنکار — زین العابدین جمشید پور

ان دنوں کرشن چندر پر کافی تنقیدیں ہو رہی ہیں ——— کوئی کہتا ہے کرشن چندر کا فن مر چکا ہے ——— کوئی کہتا ہے کرشن چندر اپنی کہانیوں میں بکواس کرتا ہے۔ ——— لیکن یہ وہ لوگ ہیں جو کرشن کے افسانے اور دوسری تخلیقات پڑھنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کرتے۔ اور دوسروں کے کہے سنے کو دہرا کر سمجھتے ہیں کہ کوئی بڑی نئی اور فکر انگیز بات کہہ رہے ہیں۔

صحافت یا بیان بازی — نور پرکار

اس بار کتابت بہت سنبھل گئی ہے۔ نیاز کا ادبی مرتبہ خاصے کی چیز ہے۔ ان دنوں جو نئے ادب اپنے کی بحث جاری ہے اس میں کتاب بھی ایک رول ادا کر رہا ہے۔ کیا یہ فاصلے ختم ہو جائیں گے؟ باقر مہدی، شمس آگئے

ہمارے کتنے بچے ہونے چاہئیں؟



ہم خوشی خوشی زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں اور چاہتے ہیں: کوئی فکر، کوئی مسئلہ، کوئی الجھن نہ ہو۔ لیکن سوال یہ ہے
کہ خوشحال گھرانے کے لئے کتنے بچے ہونے چاہئیں؟ — ہر شادی شدہ جوڑے کو اس کا فیصلہ
فیصلہ کرنا چاہئے۔ اب وہ دن گئے جب ماں باپ زیادہ بچوں کو خوشی کا سبب سمجھتے تھے۔ اب بچوں کی پیدائش میں
وقفے کے متعدد طریقے ہیں۔

کنڈوم، گولیاں، انجکشن، لوپ اور آپریشن آبادی کا ...

معلومات اور مفت مشورے کے لئے
فیملی ویلفیئر پلاننگ سینٹر میں جائیں

چھوت چھات

سماج پر دھبہ ہے

۱- خدا نے ساری مخلوق ایک سی پیدا کی اور اس کی نظر میں سب ہی یکساں ہیں اسلئے ان میں چھوت چھات اور تعصب کا جذبہ رکھنا زبردست گناہ ہے۔

۲- ہندستانی آئین میں تمام باشندگان کی سماجی اور آئینی مساوات کا ذکر ہے، جن کو نظرانداز کرنا اور چھوت چھات برتنا قانوناً قابل سزا ہے۔

۳- سماجی [illegible] قومی استحکام اور سوسائٹی کے مفاد کا معیار ہے، سماج کے کسی طبقے کے ساتھ چھوت چھات برتنا اور تعصب رکھنا قومی یکجہتی اور طاقت کو مجروح کرنا ہے۔

ھریجن اینڈ سوشل ویلفیئر ڈپارٹمنٹ

اترپردیش، لکھنؤ

کہنے لگے ——— "فسادات سے کچھ نہیں ہوگا ——— میں تمہیں ایک واقعہ سُناتا ہوں۔ بس کوئی ایسی ہی صورت پیدا کرنے سے یہ سلسلہ ختم ہو سکتا ہے"

میں ہمہ تن گوش ہوگیا اور وہ ہنس ہنس کر یہ واقعہ اپنے دلچسپ انداز میں بیان کرنے لگے۔

"حیدر آباد میں ایک دفعہ سنی شیعوں میں تعلقات بہت کشیدہ ہوگئے۔ اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ بعض محلّوں میں دیواروں تک پہ تبرّہ لکھا جانے لگا۔ سنی مسلمان یہ دیکھ کر بہت پریشان ہوئے۔ میں جہاں رہتا تھا اس محلّے میں پانی کے نل کی دیوار پہ کوئی روزانہ رات کو تبرّہ لکھ جاتا تھا۔ میں نے خود دیکھا کوئلے سے کوئی شخص ابوبکر صدیقؓ، عمر فاروقؓ اور عثمان غنیؓ کے نام لکھ کر بہت بڑا سا "لعنت" کا لفظ لکھ دیتا تھا۔ صبح کو جو بیچارے اس نل کی دیوار پہ پانی بھرنے آتے تھے وہ سخت چیں بہ جبیں ہوتے تھے لیکن ان کی کچھ پیش نہ جاتی تھی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کریں۔ محلّے کے لوگ میرے پاس بھی آئے اور ساری روداد بیان کی۔ میں نے یہ ساری روداد سُن کر اُن سے کہا کہ تم لوگ تو اپنی تمام کوششیں کر کے ہار چکے ہو۔ اب مجھ پر چھوڑ دو۔ پرسوں سے تم اس نل کی دیوار پر تبرّہ لکھا ہوا نہیں پاؤ گے۔ ——— وہ لوگ میرے اس دعوے پر بہت حیران ہوئے لیکن ڈوبتے کو تنکے کا سہارا، خوش خوش واپس چلے گئے اور بے چینی کے ساتھ آنے والے پرسوں کے دن کا انتظار کرنے لگے۔ میں صبح کو منہ اندھیرے ٹہلنے کے لئے نکلتا تھا ——— دوسرے دن اُدھر سے گزرا تو وہی تین ناموں کے بعد لعنت کا بڑا سا لفظ لکھا ہوا تھا ——— میں نے کوئلہ اُٹھا کر چوتھا نام حضرت علیؓ کا لکھ دیا ——— جب لوگوں نے دن میں آکر یہ دیکھا تو اور بھی پریشان ہوئے۔ میرے پاس آئے اور کہنے لگے "صاحب! آج تو کوئی چاروں پہ تبرّہ لکھ گیا ہے"۔ میں نے کہا اس کا عذاب و ثواب میری گردن پر۔ آج اسے یونہی لکھا رہنے دو۔ کل سے کوئی نہیں لکھے گا ——— زندگی بھر تو چاروں ساتھ رہے۔ اب آخر وقت میں یہ کس طرح جدا ہو سکتے ہیں ——— لوگ چلے گئے ——— دوسرے دن سے وہاں تبرّہ نہیں لکھا گیا"

یہ سُن کر میں زور سے ہنسا۔ اور میں نے کہا "مولوی صاحب واقعی یہ نسخہ تیر بہدف ہے"

جیسا کہ اس واقعہ سے ظاہر ہے اُن کی کسی مذہبی عصبیت کو اس میں دخل نہیں ہے ——— یہ واقعہ تو اس مضحکہ خیز غیر مذہبی حرکت کا ایک دلچسپ جواب ہے۔ جس نے لوگوں کو خواہ مخواہ پریشان کر رکھا تھا۔

اس سے بحث نہیں کہ یہ بات صحیح تھی یا غلط ——— دیکھنے کی بات تو یہ ہے کہ اس واقعے سے اُن کی شخصیت کا ایک بہت ہی دلچسپ پہلو سامنے آتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ بابائے اردو ملّاؤں کی طرح مذہبی آدمی نہیں ہیں لیکن ویسے اسلام کو وہ دنیا کا سب سے زیادہ عقلی مذہب سمجھتے ہیں۔ اور اس کا جو درد اُن کے دل میں ہے اس کا اندازہ کچھ ان سے گفتگو کرنے کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔

اسلام اور مسلمانوں کے معاملات پر میں نے ان سے بارہا گفتگو کی ہے ——— اور اس سلسلے میں بے شمار باتیں ہوئی ہیں۔ ایک دن دورانِ گفتگو میں کہنے لگے ——— "مسلمان ہر حال میں مسلمان ہوتا ہے۔ جب بھی وہ اپنے مذہب سے متعلق کسی چیز کو کسمپرسی کے عالم میں دیکھتا ہے تو اس کے جذبۂ اسلامی میں ایسی تحریک پیدا ہوتی ہے جس کا عام حالات میں وہ تصوّر بھی نہیں کر سکتا"

پھر مجھے اپنا ایک واقعہ سُنایا۔

کہنے لگے ——— "میں ایک دفعہ چند احباب کے ساتھ جنوبی ہند کے ایک ایسے دُور دراز علاقے میں گیا جہاں اب مسلمان نام کو بھی باقی نہیں ہیں لیکن میں نے وہاں دیکھا کہ ایک پہاڑی پر نہایت ہی پرانی ویران سی مسجد ہے۔ اس مسجد سے یہ اندازہ ہوا کہ یہاں کسی زمانے میں مسلمان ضرور موجود تھے لیکن زمانے نے ان کا نشان باقی نہ رکھا۔ میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا مسلمانوں کی یہ مسجد نہ جانے کب سے ویران پڑی ہے۔ یہاں ہمیں اذانیں دینے کی ضرورت ہے۔ آباد مسجدوں میں تو سب ہی اذانیں دیتے ہیں۔ اذان یہاں دینی چاہیئے ——— چنانچہ ہم نے اس مسجد میں خوب اذانیں دیں ——— خوب نمازیں

پڑھیں ——— اور اس طرح کئی دن گزارنے کے بعد ہم وہاں سے رخصت ہوئے "

" میرے منہ سے دعا نکلا ——— "مولوی صاحب! آپ نے اپنی بخشش کا سامان کر لیا "

اور پھر مجھ پر نہ جانے کیوں گہری سنجیدگی طاری ہوگئی۔ آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے ——— اور مولوی صاحب بھی خدا جانے کن خیالات میں گم ہو گئے۔

دیر تک سکوت کا عالم رہا!۔

مولوی صاحب کو میں نے دیکھا ہے، جب بھی پیغمبروں اور مذہبی رہنماؤں کا ذکر آئے تو وہ ایسی رسمی باتیں نہیں کرتے جن میں عام طور پر عقیدت کا اظہار ہوتا ہے۔ برخلاف اس کے اُن کی زندگی کے ایسے پہلوؤں کی وضاحت کرتے ہیں جن کی نوعیت انسانی ہوتی ہے۔ اور آنحضرتؐ کے ذکر میں تو خاص طور پر یہ پہلو ان کے پیش نظر رہتا ہے ——— کیونکہ وہ انھیں سب سے کامل اور سب سے عظیم انسان سمجھتے ہیں۔

چند سال ہوئے ایک امریکی خاتون نے " AYESH THE BELOVED OF MOHAMMED " کے نام سے ایک بڑی زہریلی کتاب لکھی۔ یہ کتاب اتفاق سے میرے ہاتھ آگئی۔ اس کتاب کو پڑھنے سے یہ اندازہ ہوا کہ لکھنے والی نے یہ کتاب یوں تو اسلام کے مخالفانہ جذبے کے زیر اثر لکھی ہے۔ لیکن اس کی اپنی ذہنی اُلجھنوں کے اثرات بھی اس میں کچھ کم شامل نہیں ہیں۔ کتاب ختم کرنے کے بعد میں نے مولوی صاحب کو بھی وہ کتاب دی اور ان سے کہا کہ آپ بھی ذرا اس کو پڑھیے۔ اور مجھے اپنی رائے دیجیے ——— چنانچہ انھوں نے بھی وہ کتاب پڑھ ڈالی ——— میں نے جب رائے پوچھی تو کہنے لگے ——— اس نے باتیں تو سب ٹھیک لکھی ہیں لیکن نتائج غلط نکالے ہیں اور اس میں اس کی اسلام دشمنی کے ساتھ اس کی اپنی ذاتی ذہنی اُلجھنیں بھی شامل ہیں۔ ورنہ جو واقعات اس نے پیش کیے ہیں ان سے آنحضرتؐ کی عظمت کا احساس ہوتا ہے۔ قدم قدم پر ان کی انسانیت اپنے آپ کو نمایاں کرتی ہے ——— ان سے بڑا انسان کوئی اور پیدا نہیں ہوا ——— انسانی زندگی سے انھیں کتنی گہری دلچسپی تھی ——— اور کس قدر خوش اسلوبی سے اس کے مختلف پہلوؤں کو برتتے ہیں وہ پیش پیش رہتے تھے ——— کاش ان باتوں کو اس نے اپنے پیش نظر رکھا ہوتا! اسی صورت میں وہ حضرت عائشہؓ اور آنحضرتؐ دونوں کے بارے میں کوئی معقول بات کہہ سکتی تھی "

غرض مذہب اور مذہبی شخصیتوں کو وہ انسانیت اور انسانی زندگی سے الگ کر کے نہیں دیکھتے۔ بلکہ دونوں کو لازم و ملزوم سمجھتے ہیں ——— یہی وجہ ہے کہ مذہب میں انھیں انسانیت نظر آتی ہے اور انسانیت میں مذہب!

اور مذہب کے اسی نقطۂ نظر کا یہ اثر ہے کہ بابائے اُردو کو مذہب اور تہذیب و ثقافت کے باہمی تعلق سے گہری دلچسپی رہی ہے۔ مذہب ان کے خیال میں ایک بہت بڑی طاقت ہے۔ اور اس طاقت کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے دوسری طاقتوں کے ساتھ ساتھ تہذیب و ثقافت کی تشکیل و تعمیر میں نمایاں حصہ لیا ہے ——— اس لئے انسانی زندگی میں تہذیب و ثقافت کو وہ بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ ان کی ہر بات کی تان جا کر اسی موضوع پر ٹوٹتی ہے۔ ان کا خاص میدان بھی ہے ——— اور زبان کے معاملات سے جو انھیں اتنا گہرا لگاؤ ہے، اس کا سبب یہ ہے کہ زبان ہمیشہ تہذیب و ثقافت کی بنیاد ہوتی ہے۔ اسی لئے زبان کے معاملات و مسائل کو انسانی زندگی میں وہ بڑی اہمیت دیتے ہیں اور اُردو زبان کے لئے انھوں نے جو اپنی ساری زندگی وقف کر دی اس کا بنیادی سبب بھی یہی ہے۔

اُردو ان کی دنیا ہے، اُردو ان کی زندگی ہے، اُردو ان کا نصب العین ہے، اُردو ان کا نظریۂ حیات ہے۔ اُردو ان کا مزاج ہے، اُردو ان کی طبیعت ہے ——— غرض وہ اُردو کے سوا اور کچھ نہیں ہیں۔ اُردو کو اُن کی شخصیت سے یا ان کی شخصیت کو اُردو سے الگ کر لیا جائے تو ہر صورت میں دونوں کے وجود کو خطرہ لاحق ہو جاتا ہے ——— میں کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ اگر بابائے اُردو نہ ہوتے اور اُردو سے انھیں یہ والہانہ وابستگی اور مجنونانہ شیفتگی نہ ہوتی تو کیا واقعی موجودہ دور میں اُردو کو وہ مرتبہ حاصل ہوتا جو آج بہت سی زبانوں کے لئے باعثِ رشک ہے ——— انھوں نے

اُردو کو اس کی اہمیت کا احساس دلایا، اس کو اپنے پیروں پر کھڑا ہونا سکھایا۔ زندگی کی راہوں پر دوڑایا، اس کے بازوؤں میں حریفوں سے مقابلے کی سکت پیدا کی۔ اور اس نے بڑے بڑوں کے دانت کھٹے کر دیئے ——— اُردو کی تاریخ مخالفت کی تاریخ ہے، کشمکش کی تاریخ ہے، ہنگاموں کی تاریخ ہے ——— بابائے اُردو کی ذات نہ ہوتی تو اُردو کے لئے آزمائش کی ان منزلوں سے گزرنا آسان نہ ہوتا۔ ان معرکوں میں وہ کام آجاتی ——— اور آج کوئی اس کا نام بھی نہ لیتا۔

بابائے اُردو نے جس وقت اُردو زبان کو ایک تحریک کی صورت دی، اس وقت کسی کے خیال و گمان میں بھی یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ زبان کے لئے کچھ کیا بھی جاسکتا ہے۔ اس کے لئے کوئی تحریک بھی چلائی جاسکتی ہے ——— اس کو ارتقا کی راہوں پر گامزن کرنے کے لئے کوئی عملی قدم بھی اُٹھایا جاسکتا ہے۔ زبان تو صرف بولنے کی چیز سمجھی جاتی تھی۔ بابائے اُردو نے اس بات کا احساس دلایا کہ زبان کو اگر سہارا نہ دیا جائے، اس کے لئے کوئی عملی قدم نہ اُٹھایا جائے تو وہ خاطر خواہ ترقی نہیں کر سکتی۔ چنانچہ زبان کے لئے کچھ کرنے کا شعور عام ہوا۔ اُردو کے منت پذیر شانہ گیسوؤں کو سنوارنے کی ایک فضا پیدا ہوئی۔ اور اس طرح اس تحریک کا آغاز ہوا۔ بابائے اُردو نے اس تحریک کی رہنمائی کی۔ لوگوں نے اس سلسلے میں ان کو اپنا قائد مانا۔ انھوں نے بڑی بڑی منزلیں طے کیں، بڑے بڑے میدان سر کئے۔ یہی سبب ہے کہ آج انھیں بابائے اُردو کے محبت بھرے نام سے یاد کرنے میں قوم کا ہر فرد ایک فخر محسوس کرتا ہے۔

اُردو کے لئے انھوں نے جو کچھ کیا ہے اس کی تفصیل لکھنے کے لئے دفتر چاہیئے ——— اس کا صحیح جائزہ تو زبان کا کوئی مورخ ہی لے سکتا ہے ——— دیکھنے والا تو صرف یہ دیکھ سکتا ہے کہ انھوں نے زبان میں توانائی پیدا کی۔ اس کے جسم میں زندگی کا نیا خون دوڑایا۔ اس کے اصول منضبط کرکے، اصطلاحات بنا کے، لغات مرتب کرکے مختلف علوم کی کتابیں اس میں منتقل کرکے، اس کو ذریعۂ تعلیم بنا کے، اس کو عظمت سے ہمکنار کیا ——— اس کے ادبی سرمائے میں اضافے کئے۔ ادبی تحقیق کا ماحول پیدا کیا جس سے اس کی تاریخ میں تقریباً تین سو سال کا اضافہ ہوا ——— ورنہ اُردو ادب کو صرف بیسویں صدی تک محدود سمجھا جاتا تھا۔ اس سے صدیوں پہلے کے ادبی کارناموں سے لوگ واقف نہیں تھے۔ بابائے اُردو نے ان کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر نکالنے میں اپنی ساری زندگی صرف کر دی۔ اور اس کے ساتھ ہی ساتھ نئے ادب کی تخلیق کے لئے سازگار ماحول بھی پیدا کیا ——— ایک زمانہ وہ تھا جب مغرب زدہ لوگ اُردو ادب کو حقارت کی نظر سے دیکھتے اور اس کے مطالعے کو کسرِ شان سمجھتے تھے ——— بابائے اُردو نے اس تاریکی میں شوق اور ولولے کی شمعیں فروزاں کیں اور دیکھتے دیکھتے لوگ اُردو ادب کے شیدائی ہو گئے ——— اور سب سے بڑا کام یہ کیا کہ اُردو زبان کی حیثیت منوانے کے لئے اُردو کے دشمنوں سے ٹکر لی۔ اور ان کے سیاسی پینتروں سے اُس کو محفوظ رکھا ——— اور آج نصف صدی کی اسی مسلسل جد و جہد اور مستقل کاوش کا یہ اثر ہے کہ اُردو زبان کسی زبان سے بھی آنکھ ملا سکتی ہے۔ اور اس کا ادب کسی زبان کے ادب کے مقابلے میں بھی رکھا جا سکتا ہے۔

میں نے انھیں ہر حال میں اُردو کی باتیں کرتے اور اس کی ترقی کے منصوبے بناتے دیکھا ہے ——— مصیبت ہو، پریشانی ہو، راحت ہو، آرام ہو، کوئی فساد ہو جائے، کوئی ہنگامہ ہو جائے ——— وہ اُردو کی ترقی کے بارے میں سوچیں گے۔ بابائے اُردو پر خراب سے خراب موڈ طاری ہو، اُردو کی ترقی کے لئے اُن کے سامنے کوئی نیا منصوبہ یا کوئی نئی بات کہہ دیجئے وہ خوش ہو جائیں گے۔ اور ان کی طبیعت رواں ہو جائے گی۔ جب بھی میں اُن کی شخصیت کے اس پہلو پر غور کرتا ہوں تو مجھے اُس یورپین پروفیسر کے انہماک کی یاد آتی ہے جو جنگ کے زمانے کی ایک رات کو جب شہر پر بم برس رہے تھے، وہ اپنے ایک شاگرد کو ٹیلی فون کرکے ایک لفظ کی اصلیت دریافت کر رہا تھا ——— بم اس کی راہ میں حائل نہیں ہوئے تھے۔ موت کے خوف نے اس کو اپنے کام سے غافل نہیں کیا تھا ——— بابائے اُردو کا بھی یہی حال ہے ——— دلی میں قتلِ عام ہو رہا ہے ——— وہ لوگوں کی زبوں حالی پر خون کے آنسو بہا رہے ہیں۔ انھیں اس کا بڑا غم ہے۔ خطوں میں اس غم کا اظہار بھی کرتے ہیں۔ لیکن اُردو کے خیال کو اس موقع پر بھی دل سے نہیں نکالتے ——— اور آخر میں لکھ ہی دیتے ہیں :-

"میں نے ایک اسکیم پاکستان میں اُردو کی اشاعت کے متعلق تیار کی ہے۔ کراچی میں پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس ہونے والی ہے جس میں پاکستانی وائس چانسلر اور ڈائرکٹرانِ تعلیم خاص طور پر شریک ہوں گے۔ اُن سے گفتگو کر کے صوبوں میں کام کرنے کا پروگرام بناؤں گا۔ اب مجھے نئی دُنیا بنانی ہے۔ ہندوستان سے تو اُردو کو دیس نکالا مل گیا۔ اب کراچی جا کر مشورہ کروں گا کہ انجمن کا صدر مقام کہاں ہو اور ہندوستان اور پاکستان میں کام کس طرح انجام دیا جائے۔"

دِلّی کی خونچکاں داستان کی تفصیل کے ساتھ جب میں نے بابائے اُردو کے خط میں یہ جملے پڑھے تو مجھ پر وہ کیفیت طاری ہوئی جن کو میں الفاظ میں بیان کرنے سے قاصر ہوں ——— ان جملوں میں کیسی لگن ہے! ——— ان کے ایک ایک لفظ سے کیسا انہماک ٹپکتا ہے!

اس لگن اور انہماک ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ انھوں نے اُردو کے لئے صحیح معنوں میں تن من دھن کی بازی لگا دی۔ اپنے آپ کو، اپنی تمام صلاحیتوں کو، اپنے تمام سرمائے کو انھوں نے اُردو پر نچھاور کر دیا۔ انجمن ترقی اُردو، اُردو کی تحریک کی علمبردار تھی۔ چنانچہ انھوں نے اپنی ساری زندگی انجمن کے لئے وقف کر دی۔ شب و روز اسی کے لئے کام کیا ——— جو کچھ کمایا وہ سب انجمن کو دے دیا۔ ایک پیسہ اپنے پاس نہیں رکھا ——— غالباً سنہ کے آس پاس کی بات ہے، ساٹھ ہزار روپے کی رقم (غالباً پراویڈنٹ فنڈ) انھیں ملی۔ وہ سب یک مشت انھوں نے انجمن کو دے دی ——— اور "ہماری زبان" میں یہ نوٹ شائع کیا کہ میرا سب کچھ اُردو اور انجمن ترقی اُردو کے لئے ہے۔ میں ایک پیسہ بھی اپنے پاس رکھنا نہیں چاہتا ——— اور خود اگرچہ زندگی بھر اُنھوں نے انجمن کی خدمت کی لیکن ایک پیسہ کبھی انجمن سے نہیں لیا ——— حیدرآباد سے جو پنشن ملتی تھی اُسی میں گزر کرتے تھے ——— اور اگر اُردو کے لئے کسی کو ضرورت ہو تو اس میں سے بھی کچھ نہ کچھ دے ہی دیتے تھے ——— مجھے اچھی طرح یاد ہے جب میں نے دِلّی یونیورسٹی میں اُردو کے شعبے کو بڑی جد و جہد اور ہنگامہ آرائی کے بعد فارسی سے الگ کرایا اور ایک جونیئر لکچرار کے تقرر کی طرف توجہ دلائی تو یونیورسٹی نے مدد دینے سے صاف انکار کر دیا اور یہ جواب دیا کہ یونیورسٹی سائنس کی طرف توجہ کر رہی ہے، اس لئے اُردو کے لئے روپیہ منظور نہیں کر سکتی۔ میں نے بابائے اُردو کو جب صورتِ حال سے مطلع کیا تو کہنے لگے جس اُستاد کا تم تقرر کرانا چاہتے ہو، اگر اس کی تنخواہ یونیورسٹی نہیں دیتی تو نہ دے! لاؤ اس کی ایک سال کی تنخواہ میں دوں گا ——— اور انھوں نے دو ہزار روپے کا چک مجھے دیا ——— اس طرح دِلّی میں شعبۂ اُردو کی بنیاد پڑی ——— مولوی صاحب کی ذات نہ ہوتی اور وہ اس طرح کی امداد نہ کرتے تو اُردو کا شعبہ وہاں کبھی بھی قائم نہ ہوتا ——— غرض اُردو کے لئے وہ سب کچھ کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں ——— ان کے نزدیک روپے کی تو اُردو کے سامنے کوئی اہمیت ہی نہیں!

ایک صاحب نے ایک دفعہ اُردو کے اس محسنِ اعظم کے بارے میں اس خیال کا اظہار کیا کہ بابائے اُردو سیاسی آدمی ہیں۔ بلکہ انھوں نے ایک سیاست کو پیدا کیا۔ یہ سیاست اُردو زبان کی سیاست ہے۔ اور وہ اس سیاست کے ماہر اور رہبر ہیں۔ اس میں ان کا کوئی ثانی نہیں ——— یہ خیال ایسا کچھ غلط نہیں ہے۔ بابائے اُردو اس سیاست کے خالق ہیں لیکن یہ سیاست ان کا میدان نہیں ہے۔ ان کا میدان علم و ادب ہے۔ علمی تحقیق اور ادبی تخلیق سے انھیں جو نسبت ہے وہ اور کسی چیز سے نہیں۔ اس سیاست کو تو انھیں پیدا کرنا پڑا۔ کیونکہ اُردو کی بقا کے لئے اس کی ضرورت تھی۔ لیکن ویسے وہ بنیادی طور پر علم و ادب کی دُنیا کے انسان ہیں۔ جو مسرّت انھیں پڑھنے لکھنے کے کاموں میں حاصل ہوتی ہے کسی اور کام سے حاصل نہیں ہوتی۔ ان کا بہترین وقت وہی ہوتا ہے جو وہ پڑھنے لکھنے کے کاموں میں صرف کرتے ہیں۔ اکثر انھوں نے مجھ سے اس بات کا اظہار کیا ہے کہ ان کے شوق کے کام یہی ہیں۔ چنانچہ ان کاموں میں بھی ان کا انہماک دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے ——— میں نے دن دن بھر انھیں لکھنے پڑھنے کے کاموں میں مصروف دیکھا ہے لیکن ان پر کسی کام کی تھکن یا کام سے اکتاہٹ کے آثار نمایاں نہیں ہوتے ہیں ——— اکثر ایسا ہوا ہے کہ میں شام کے وقت ان کے پاس پہنچا ہوں۔ اور میں نے انھیں کام کرتے ہوئے پایا ہے۔ اور اس کام میں اتنا منہمک دیکھا ہے کہ میں کمرے میں داخل ہو گیا ہوں لیکن انھیں میرے آنے کی خبر تک نہیں ہوئی ہے۔ میں چُپ چاپ ان کے سامنے بیٹھ گیا ہوں۔ لیکن انھوں نے میری آہٹ تک محسوس نہیں کی ہے۔ پھر لکھتے لکھتے کسی کتاب کی ضرورت ہوئی

ہے تو ان کی نظر پڑ جاتی ہیں، اور انھوں نے مجھے دیکھا ہے ——— اور معذرت کی ہے۔ لیکن اس معذرت نے ہمیشہ مجھے شرمندہ کیا ہے۔ ایک دن میں شام کو پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ بابائے اُردو بیٹے کی اس الماری کے سامنے کھڑے ہوئے کچھ پڑھ رہے ہیں، جس میں وہ خاص قلمی نسخے رکھتے تھے ——— میں کمرے میں داخل ہو گیا۔ لیکن انھوں نے آہٹ محسوس نہیں کی۔ میں نے بھی کچھ نہ کہا اور آدھ گھنٹے تک یونہی کھڑا رہا ——— پھر جب بہت اندھیرا ہو گیا تو وہاں سے ہٹے اور مجھے دیکھتے ہی کہا ——— " اچھا بھئی آ گئے۔ چلو اندھیرا ہو گیا ہے باہر چل کے بیٹھتے ہیں" ——— اور پھر ہم باہر جا کے بیٹھ گئے ہیں ——— اور ایک بار نہیں بارہا میں نے انھیں اسی عالم میں دیکھا ہے۔ کتابیں ان کی سب سے بڑی رفیق اور دمساز ہیں۔ وہ بغیر کتابوں کے نہیں رہ سکتے۔ انھیں پڑھنے کا جنون ہے ——— مختلف اور متنوع موضوعات پر ایسا باخبر اور ہوشمند پڑھنے والا کوئی اور میری نظر سے نہیں گذرا ——— ان کی ساری زندگی پڑھنے اور پڑھنے کے لئے کتابیں جمع کرتے ہوئے گذر گئی۔ کیسی کیسی کوششوں سے انھوں نے کیسی کیسی نایاب کتابیں جمع کیں ——— اس کا اندازہ اس وقت ہوتا تھا جب کبھی کسی کام سے وہ اپنے خاص کتب خانے میں جاتے تھے ——— ایک الماری کھولی ——— اس میں سے کوئی کتاب نکالی۔ اور اس کے ساتھ کئی اور کتابیں نکال لیں ——— اب ایک ایک کو اٹھاتے جاتے ہیں، اور رکھتے جاتے ہیں۔ یہ کیسی اہم کتاب ہے۔ اس کے حاصل کرنے کے لئے مجھے فلاں فلاں جگہ کا سفر کرنا پڑا۔ فلاں شخص کے ذریعے اس کتاب تک رسائی ہوئی۔ اس پر اتنی رقم صرف ہوئی ——— غرض ہر کتاب کے بارے میں وہ پوری تفصیل بیان کرتے ——— اور اس میں شک نہیں کہ اپنے ذاتی کتب خانے میں جو کتابیں انھوں نے جمع کی تھیں، ان میں سے ہر ایک کے حاصل کرنے کی ایک تاریخ تھی ——— اور میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ اس تاریخ کو بیان کرنے میں وہ ہمیشہ ایک لذت سی محسوس کرتے تھے۔ تقسیم نے ان کتابوں کو تتر بتر کر دیا۔ اور آج اس سے بڑا غم بابائے اُردو کی زندگی میں اور کوئی نہیں۔

یوں تو تمام علوم سے ان کی دلچسپی مسلّم ہے لیکن ادب سے جو لگاؤ انھیں ہے وہ اور کسی چیز سے نہیں۔ ادب کی بات ہوتی ہے، تو ایسا محسوس ہوتا ہے، جیسے وہ ایک مانوس سی دنیا میں پہنچ گئے ہیں۔ گھنٹوں ادب کے مختلف موضوعات پر بات کرنے سے بھی وہ نہیں تھکتے۔ پھر ان کی ادبی باتوں میں جو تنوع ہوتا ہے وہ انہیں کے ساتھ مخصوص ہے۔ کبھی وہ انگریزی کی تنقید پر گفتگو کریں گے۔ کبھی روس کی ناول نگاری پر، کبھی فرانس کے افسانے پر، کبھی ایران اور عرب کی شاعری پر ——— اور اگر اُردو ادب کی بات چھڑ جائے تب تو ایک سمندر اُمڈنے لگتا ہے۔ جس پہلو کا ذکر ہو گا اس پر ایسی سیر حاصل گفتگو کریں گے کہ ہر لمحہ سننے والوں کو ایک روشنی کا احساس ہو گا۔ مجھے دورانِ گفتگو میں ان سے ان گنت نئی باتیں معلوم ہوئی ہیں۔ اور یہ باتیں سن کر مجھے ہمیشہ یہ احساس ہوا ہے کہ ان سے بڑا اُردو ادب کا عالم آج تک کوئی پیدا نہیں ہوا۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ قدیم ادب اور جدید ادب سے انھیں دلچسپی ہے ——— اگرچہ ان کی تحقیق کا میدان قدیم ادب رہا ہے لیکن انھوں نے اُردو ادب کے رجحانات کو دوسرے بزرگوں کی طرح پوچ اور لایعنی سمجھ کر نظر انداز نہیں کیا ہے۔ وہ ان رجحانات سے گہری دلچسپی رکھتے ہیں ——— اور جب کوئی نیا لکھنے والا ان سے ملتا ہے تو انھیں بڑی مسرت ہوتی ہے۔ اس سے تمام رجحانات پر گفتگو کرتے ہیں۔ یہ پوچھتے ہیں کہ وہ کیا لکھ رہا ہے؟ ایک ایک لکھنے والے کے مشاغل کو دریافت کرتے ہیں ——— غرض ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تمام لکھنے والوں کا ان سے قریبی تعلق ہے۔ ایک بھی ان کے لئے اجنبی نہیں ہے ——— نئے سے نئے لکھنے والوں کے مضامین وہ شوق سے پڑھتے ہیں۔ اور ان کے بارے میں ایک رائے رکھتے ہیں ——— اور اس رائے میں بڑی ہی ہمدردی، بڑی ہی شفقت اور بڑی محبت ہوتی ہے ——— تنگ نظری نام کو نہیں ہوتی ——— کبھی کسی نئے لکھنے والے کے خلاف وہ کوئی ایسی بات نہیں کہتے جو تنگ نظری پر مبنی ہو۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے آج سے چند سال قبل ایک صاحبہ نے اُردو میں ذرا عریاں قسم کے افسانے لکھے۔ پرانے لکھنے والوں نے ان افسانوں کو پسند نہیں کیا ——— اور اس پر خاصی ہنگامہ آرائی ہوئی ——— بابائے اُردو نے بھی یہ افسانے پڑھے۔ اور جب میں نے ان کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے بھی رائے دی کہ ان کے موضوع سے اختلاف ہو سکتا ہے لیکن جس انداز میں یہ افسانے

لکھے گئے ہیں وہ اُردو افسانہ نگاری میں ایک اضافہ ہے۔ یہ افسانے ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ کیونکہ ان کی بنیاد حقیقت و واقعیت پر استوار ہے۔

بابائے اُردو خود ایک عظیم ادیب ہیں لیکن انھیں اپنی عظمت کا احساس نہیں ——— اور یہی ان کی عظمت کی دلیل ہے عظیم شخصیت کو اپنی عظمت کا خود احساس نہیں ہوتا۔ دوسرے اس کی عظمت کو محسوس کرتے ہیں۔

مجھے ایسے کئی واقعات معلوم ہیں کہ انھوں نے کسی نئے لکھنے والے کا مضمون پڑھا ——— انھیں اچھا معلوم ہوا۔ فوراً اس مضمون کا خط اُسے لکھ دیا کہ تم نے نہایت اعلیٰ درجے کا مضمون لکھا ہے ——— مجھے تمہارے انداز پر رشک آتا ہے۔ تم نے ایک نیا انداز پیدا کیا ہے۔ مجھے تو تم لوگوں کے سامنے اپنی بے بضاعتی اور کم مائگی کا احساس ہوتا ہے۔

بابائے اُردو نے جن لوگوں کو اس مضمون کا خط لکھا تھا اُن میں سے ایک صاحب نے یہ خط اپنی بڑائی کو ظاہر کرنے کے لئے بیسیوں لوگوں کو دکھایا اس طرح مجھے بھی اس کا علم ہو گیا۔

بہرحال بابائے اُردو کی عظمت اس واقعے سے ظاہر ہوتی ہے۔

ایک دن میں نے ان سے پوچھا ——— "مولوی صاحب! آپ کو ایسے اعلیٰ درجے کے ادبی کام کی تحریک کس طرح ہوئی؟"

کہنے لگے ——— "میں نے کام ہی کونسا کیا ہے؟"

میں نے کہا: "مولوی صاحب! میں صرف اس خیال سے یہ سوال پوچھ رہا ہوں تاکہ مجھے بھی کام کرنے کا گُر معلوم ہو جائے۔"

کہنے لگے: "جو تھوڑا بہت کام میں نے کیا ہے، جب بھی اس کو دیکھتا ہوں تو اپنی خامیاں زیادہ نظر آتی ہیں۔ کبھی مجھے یہ خیال نہیں ہوتا کہ میں نے کوئی مکمل کام کیا ہے ——— اور جو کچھ کیا ہے اس کے بارے میں آج تک میں یہ نہ سمجھ سکا کہ یہ کس طرح ہوا ہے؟ ——— کام کرنے کا شوق مجھے ضرور تھا۔ دُھن بھی ضرور تھی ——— سو یہ دونوں باتیں اب بھی موجود ہیں ——— لیکن ان سے کیا ہوتا ہے۔"

میں نے جب بھی یہ باتیں سُنی ہیں میں ایک گہری سوچ میں گم ہو گیا ہوں ——— اور یہ خیال مجھ پر چھا گیا ہے کہ ایک عظیم شخصیت ہی اس طرح کی باتیں کر سکتی ہے۔ عجز و انکسار عظیم شخصیت کے مزاج کا خاصہ ہوتا ہے۔ سو یہ بابائے اُردو کی شخصیت میں بھی بدرجۂ اتم موجود ہے۔ انھیں اپنی بڑائی کا ذرا بھی احساس نہیں۔ جو کام اُنھوں نے کئے ہیں ان کو وہ اپنے لئے باعثِ فخر و افتخار نہیں سمجھتے ——— ان کے خیال میں وہ مکمل نہیں ہیں۔ اپنی تعریف و توصیف سے انھیں بڑی اُلجھن ہوتی ہے ——— اور یہ تمام باتیں ان کی عظمت پر دلالت کرتی ہیں۔

بابائے اُردو نے جو ادبی کام کیا ہے اس میں تحقیق کا پلّہ بھاری ہے۔ تحقیق اُن کے مزاج میں داخل ہے۔ وہ ان کی طبیعت کا بنیادی جزو ہے۔ لیکن اُن کی تحقیق ان لوگوں کی تحقیق نہیں ہے جو صرف حاشیے لکھنے اور حوالے دینے کو تحقیق سمجھتے ہیں اور خواہ مخواہ حاشیے لکھ کر اور حوالے دے کر محققین کی فہرست میں اپنا نام لکھوانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اُن کی تحقیق حاشیے لکھنے اور حوالے دینے کا نام نہیں ہے ——— وہ صحیح معنوں میں تحقیق ہے ——— نئی باتوں کو معلوم کرنے کی خواہش اس کو پیدا کرتی ہے۔ چھان بین کا صحیح جذبہ اس کو وجود میں لاتا ہے ——— اسی لئے اس میں زندگی محسوس ہوتی ہے ——— انھوں نے تحقیق کو تخلیق سے ہم آہنگ کر دیا ہے۔ اسی لئے اس میں ایک ادبی شان اور تنقیدی آن نظر آتی ہے۔ بابائے اُردو بیک وقت محقق بھی ہیں، ادیب بھی اور نقاد بھی!

ان تینوں کا حسین امتزاج بابائے اُردو کی شخصیت کی بڑی نمایاں خصوصیت ہے، اور اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ ان کے مزاج میں بلا کی شگفتگی ہے۔ مزاج کی یہ شگفتگی جس نے انھیں زندگی اور ادب کے اَن گنت جمالیاتی پہلوؤں کا احساس دلایا ہے دراصل یہ شگفتگی زندگی سے گہری دلچسپی اور اس کے مختلف پہلوؤں سے والہانہ وابستگی کے نتیجے میں پیدا ہوئی ہے۔ وہ ان کی زندگی کا حصہ ہے۔ ان کی کوئی بات بھی اس شگفتگی سے خالی نہیں ہوتی ہر معاملے میں وہ کچھ نہ کچھ شگفتہ پہلو نکال لیتے ہیں ——— اُن پر عمر کا کوئی اثر نہیں ہوا ہے۔ آج بھی ان کی طبیعت میں نوجوانوں کی سی شوخی اور شگفتگی نظر

آتی ہے ۔ اور اُن کی ایک ایک بات کے زعفران زار ہونے کا احساس ہوتا ہے ۔ خواہ وہ کسی عالم میں ہوں ہمیشہ وہ ایسی ہی باتیں کرتے ہیں ۔

یہاں مجھے ایک دلچسپ واقعہ یاد آیا ۔

دلی میں حکومت ہند نے انجمن کو فیروز شاہ روڈ پر عمارت بنانے کے لئے بڑی عمدہ سی زمین الاٹ کی تھی ۔ جنگ کے زمانے میں فوج کے محکمے نے اس زمین پر کچھ عارضی قسم کی چھوٹی چھوٹی عمارتیں تعمیر کر دی تھیں ۔ ان عمارتوں میں کئی سال تک فوج میں کام کرنے والی عورتوں کا، جن کو اس زمانے میں "ویکائز" (WACIS) کہتے تھے، دفتر اور ہوٹل رہا ۔ اس لئے انجمن کو اس کا قبضہ نہ مل سکا ۔ بابائے اردو برابر کوشش کرتے رہے ۔ لیکن حکومت نے کوئی توجہ نہیں کی ۔ سر کلاڈ آکنلک سے ان کے گہرے تعلقات تھے ۔ ان کی سفارش پر اختتام جنگ سے ایک سال قبل اس زمین کے ملنے کا کچھ امکان پیدا ہو گیا ۔ حکومت نے اس بات کی کوشش کی کہ فی الحال عمارت کا ایک حصہ انجمن کو دے دیا جائے اور دوسرے حصے میں وقتی طور پر "ویکائز" کا ہوسٹل قائم رہے ۔ بڑے لوگ انجمن سے دلچسپی رکھتے تھے ، انھیں اس سے بڑی خوشی ہوئی ۔

میں تو جب بھی شام کو اُن کے پاس جاتا تو پہلا سوال یہی کرتا " مولوی صاحب زمین کا کیا ہوا ؟"

اور وہ یہی کہہ دیتے ——— " ابھی کوشش جاری ہے " ۔

ایک دن میں شام کو پہنچا تو دیکھا مولوی صاحب خوش خوش بیٹھے ہیں ۔ میں نے سوچا آج کوئی خاص بات ضرور ہوئی ہے ۔ — مجھے دیکھتے ہی بولے ——— " آج ایک بڑا دلچسپ خط آیا ہے " ۔

میں نے کہا ——— " زمین کے سلسلے میں ہوگا " ۔

کہنے لگے ——— " ہاں ، ہے تو زمین ہی کے بارے میں ۔ حکومت کی طرف سے آیا ہے ۔ لیکن اس کا مضمون بہت ہی دلچسپ ہے " ۔

میں نے کہا " مجھے وہ خط ضرور دکھائیے " ۔

بابائے اردو نے وہ خط منگوایا ۔ وہ ایک عجیب و غریب خط تھا ۔ اس کی عبارت یہ تھی کہ حکومت انجمن کو عمارت کا ایک حصہ دینے کے لئے تیار ہے لیکن قبضہ دینے سے قبل یہ جاننا چاہتی ہے کہ انجمن کے عملے میں کوئی نوجوان غیر شادی شدہ تو نہیں ہے ——— یہ اس لئے دریافت کیا جا رہا ہے کہ "ویکائز" ابھی کچھ عرصے برابر کے حصے میں رہیں گی ۔ اگر انجمن کے عملے میں کچھ نوجوان غیر شادی شدہ لوگ ہوئے تو اس کی وجہ سے بعض اُلجھنیں پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہے ۔ حکومت اس سے بچنا چاہتی ہے ۔

خط پڑھنے کے بعد مجھے بے اختیار ہنسی آگئی ۔ میں نے کہا " اس کا جواب بھی اتنا ہی دلچسپ ہو سکتا ہے " ۔

کہنے لگے " میں نے جواب لکھ دیا ہے ۔ اور یہ لکھا ہے کہ میں انجمن کا سکرٹری ہوں ۔ میری عمر ۷۸ سال کی ہے لیکن اس عمر میں بھی میں ۲۰ سال کے جوانوں سے بہتر ہوں ۔ اگر حکومت "ویکائز" کے لئے مجھے خطرناک نہیں سمجھتی تو زمین کا قبضہ انجمن کو دے دیا جائے " ۔

میں زور سے ہنسا ۔ اور میں نے کہا ——— " مولوی صاحب اس سے بہتر جواب اس خط کا نہیں ہو سکتا تھا " ۔

وہ بھی ہنسنے لگے ۔ اور دیر تک اس موضوع پر دلچسپ باتوں کا سلسلہ جاری رہا ۔

ایسی شگفتہ بات سوائے اُن کے اور کسی کے ذہن میں نہیں آسکتی !

ایک دن ایک اور دلچسپ بات ہوئی ۔ میں بابائے اردو کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ کچھ خواتین آگئیں ۔ اور دھرنا دے کے بیٹھ گئیں ۔ میں نے یہ سوچا کہ عورتوں کی باتیں ہمیشہ مہمل اور لایعنی ہوتی ہیں اور یہ عورتیں بھی ایسی ہی باتیں کریں گی ۔ اس لئے اُن سے اجازت لے کر وہاں سے چلا آیا ۔ وہ عورتیں وہاں بیٹھی رہیں ۔

دوسرے دن میں اُن کے پاس پہنچا تو کہنے لگے ——— " بھئی تم تو کل چلے گئے ۔ وہ عورتیں میرے لئے کئی گھنٹے درد سر بنی رہیں ۔ کہنے لگیں ۔

صاحب! ہم نے سنا ہے کہ آپ عورتوں سے نفرت کرتے ہیں۔ آج ہم آپ سے اس کا سبب پوچھنے آئی ہیں۔

میں نے کہا ——— سوال تو بڑا دلچسپ تھا۔ پھر اس کا جواب آپ نے کیا دیا؟۔

کہنے لگے ——— میں نے انھیں یہ جواب دیا کہ آپ لوگ بھی تو مردوں سے نفرت کرتی ہیں اور اگر نفرت نہیں کرتیں تو کم از کم یہ ظاہر ضرور کرتی ہیں کہ آپ کو مردوں سے نفرت ہے ——— میری عورتوں سے نفرت درحقیقت آپ کی اس حرکت کا انتقام ہے۔"

میں ہنسنے لگا ——— اور میں نے کہا ——— "آپ نے کیسی لطیف بات کہی۔ کاش ان پر اس کا کچھ اثر بھی ہوا ہو۔"

کہنے لگے "اثر ان پر کسی بات کا بھی نہیں ہوتا۔"

میں نے کہا "شاید اسی وجہ سے ان عورتوں کو ناقص العقل کہا گیا ہے۔"

غرض دیر تک ہم اس قسم کی دلچسپ باتیں کرتے اور ہنستے ہنساتے رہے ——— آج بھی جب میں اس شام کو یاد کرتا ہوں تو اس باغ و بہار شخصیت کی شگفتگی مجھ پر ایک سرخوشی بن کر چھا جاتی ہے ——— اور میں یہ سوچنے لگتا ہوں کہ ان کی اس شوخی اور شگفتگی مجھ پر ایک سرخوشی بن کر کیوں چھا جاتی ہے ——— اور میں یہ بھی سوچنے لگتا ہوں کہ ان کی اس شوخی اور شگفتگی میں بھی کتنا توازن ہے۔ اور اس توازن نے اس میں کیسا ستھرا پن اور کس درجہ نکھری ہوئی کیفیت پیدا کی ہے۔ ورنہ عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ بہت سی شخصیتوں میں مزاج کی یہ شگفتگی اپنے حدود سے باہر نکل کر ایسی سرحدوں میں داخل ہو جاتی ہے جہاں ابتذال اور عامیانہ پن ہوتا ہے ——— اور وہ اسی رنگ میں رنگ جاتی ہے ——— مولوی صاحب کی شخصیت میں ان کے توازن اور باقاعدگی نے اس شگفتگی کو ابتذال کی سرحدوں میں داخل ہونے سے روک لیا ہے۔ چنانچہ ان کی شگفتگی اور شوخی میں بھی ایک لئے دیئے رہنے والی کیفیت نظر آتی ہے۔ ایک رکھ رکھاؤ کا احساس ہوتا ہے۔ اس لئے دیئے رہنے والی کیفیت کے ساتھ وہ بات بات میں شگفتگی کو پیدا کرتے ہیں۔ لیکن اس میں ان کی شعوری کوشش کو دخل نہیں ہوتا۔ وہ تو ان کے مزاج میں داخل ہے۔ اور اس لئے شخصیت کا لازمی جزو ہے۔

مولوی صاحب کی شخصیت میں اس شگفتگی کے ساتھ ساتھ چند اور خصوصیات بھی ایسی ہیں جن کے بغیر ان کی تصویر مکمل نہیں ہوتی۔ ان خصوصیات میں بے باکی اور صاف گوئی، محنت اور جفاکشی، خلوص اور صداقت، روشن خیالی اور کشادہ دلی خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں ——— جو کچھ ان کے دل میں ہوتا ہے وہ زبان پر آجاتا ہے۔ وہ کسی بات کو چھپا نہیں سکتے۔ انھیں تساہل پسندی نہیں آتی۔ وہ بیکار نہیں بیٹھ سکتے ——— آرام طلبی سے انھیں نفرت ہے۔ تکلفات کے وہ قائل نہیں ہیں۔ باقاعدگی کے بغیر وہ زندہ نہیں رہ سکتے ——— اس لئے ان کی شخصیت ایک کردار کی حامل ہے، اور اس کردار میں ایک ایسی عظمت اور بلندی ہے جو موجودہ دور میں ڈھونڈنے سے بھی نہیں مل سکتی ——— اس عظمت اور بلندی کا احساس کچھ اور بھی ہوتا ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ انھوں نے اپنے ماحول کی ناسازگار کیفیت کے باوجود ان خصوصیات کو اپنے اندر باقی رکھا ہے ——— انھوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ ریاستی ماحول میں گزارا ہے۔ لیکن ریاستی ماحول کے مذموم اثرات سے انھوں نے ہمیشہ اپنا دامن بچائے رکھا ہے۔ بلکہ ان کی شخصیت کے مطالعے سے تو یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ ان پر اس ماحول کا ردِ عمل ہوا ہے۔ اسی لئے انھیں ایسی باتوں سے ہمیشہ نفرت رہی ہے جو ریاستی ماحول میں پیدا ہونے والے انحطاط و زوال کا منطقی نتیجہ ہوتی ہیں۔

ریاستی ماحول موقع شناسی اور زمانہ سازی سکھاتا ہے، خوشامد اور چاپلوسی کا درس دیتا ہے۔ بابائے اردو کو ان باتوں سے نفرت ہے ——— اور اس حد تک نفرت ہے کہ بعض اوقات اپنی اس نفرت سے بنتی ہوئی باتوں کو بگاڑ دیتے ہیں لیکن اپنے ضمیر کا گلا نہیں گھونٹتے۔ انھوں نے زندگی میں کبھی کسی کی پروا نہیں کی۔ اپنے ضمیر کی آرزو کو کبھی نہیں دبایا۔ حالانکہ انھیں ایسا کرنے میں بڑے نقصانات اٹھانے پڑے۔ ان کی ساری زندگی لڑتے ہوئے گزر گئی۔ بڑے بڑے معرکے سر کرنا پڑے۔ بڑے بڑوں سے ٹکر لینا پڑی لیکن اپنے راستے سے ہٹنا انھوں نے

گوارا نہیں کیا ——— بلکہ میں نے تو یہ دیکھا ہے کہ جب ان کا حریف زیادہ طاقتور ہو تو وہ اپنی اس بے باکی اور صاف گوئی کا اظہار کچھ زیادہ ہی کرتے ہیں انہیں ڈر نام نہیں آتا ——— خوف کا مادہ وہ نہیں جانتے۔ کیسا ہی ماحول ہو، جو کچھ ان کے دل میں آتا ہے وہ اس کا اظہار کر دیتے ہیں۔ انہیں اس کی مطلق پروا نہیں ہوتی کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ اس سے انہیں زندگی میں نقصان بھی بہت پہنچا ہے۔ بہت سے لوگ ان کے دشمن بھی ہوگئے ہیں لیکن انھوں نے ان تمام باتوں کی کبھی بھی پروا نہیں کی ہے۔ ایسا کرنے میں ان کا مقصد کسی کو نیچا دکھانا یا اپنی بڑائی ثابت کرنا نہیں ہوتا بلکہ حقیقت کا اظہار ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں جو بات بھی ان کے منہ سے نکلتی ہے، اگرچہ اس کا رنگ جارحانہ اور اس کا انداز طنزیہ ہوتا ہے لیکن اس میں کوئی نہ کوئی اہم حقیقت ضرور ہوتی ہے۔

ایک واقعہ مجھے یاد آیا جو اس حقیقت کی وضاحت کرتا ہے۔

برعظیم کی تقسیم کے بعد انجمن ترقی اردو کے معاملات کو طے کرنے کے لئے حکومت ہند اور بابائے اردو کے درمیان کئی دن تک طویل گفتگو ہوتی رہی۔ حکومت کی طرف سے وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد اس کام کے لئے مقرر تھے۔ دوران گفتگو میں مولانا آزاد بار بار یہی کہتے تھے کہ حکومت یہ نہیں چاہتی کہ آپ ہندوستان میں رہیں۔ حکومت یہ نہیں چاہتی کہ انجمن کا ایک دفتر کراچی میں رہے اور ایک دلی میں ——— لیکن وہ یہی کہتے تھے کہ انجمن کو دونوں جگہ کام کرنا چاہیئے کیونکہ انجمن ثقافتی ادارہ ہے ——— جب ان کی بات کو درخور اعتنا نہ سمجھا گیا اور مولانا آزاد نے بار بار حکومت کا تذکرہ کیا تو مولوی صاحب سے نہ رہا گیا ——— جل کر کہنے لگے کہ آپ بار بار حکومت کا ذکر کرتے ہیں کہ حکومت یہ نہیں چاہتی، حکومت وہ نہیں چاہتی ——— حکومت اب کہاں ہے؟ ——— وہ تو پندرہ اگست ۴۷ء کے بعد ختم ہوگئی! ——— آپ اپنے آپ کو حکومت سمجھتے ہیں؟ بابائے اردو نے مجھ سے بیان کیا کہ بے اختیار میرے منہ سے یہ بات نکل گئی میں اپنے آپ کو روک نہ سکا۔ میں نے کہا کہ آدمی کے پیر شدی ——— حکومت ہی کیا ہے جس کا اتنا زور و شور ہے ——— اس لئے اس حقیقت کا اظہار ضرور کر دینا چاہیئے۔ چنانچہ اس طرح میں نے اس کا اظہار کر دیا ——— مولانا آزاد کو یہ بات بری تو بہت معلوم ہوئی ہوگی۔ کیونکہ جب میں نے یہ بات کہی تو ان کے چہرے کا رنگ بدل گیا تھا ——— لیکن میں نے یہ بات غلط تو نہیں کہی ——— آخر میرے لئے اس اظہار حقیقت کے سوا اور چارہ ہی کیا تھا۔

اس واقعے سے مولوی صاحب کی بے باکی اور صاف گوئی پر روشنی پڑتی ہے ——— یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ شخصیتوں سے مرعوب ہونا نہیں جانتے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ وہ زندگی بھر کسی شخصیت سے خواہ مخواہ مرعوب نہیں ہوئے۔ ان پر کسی کی امارت، منصب اور مرتبے کا کوئی اثر نہیں ہوا ——— بلکہ موقع آنے پر تو ایسے لوگوں کو انھوں نے کچھ زیادہ ہی آڑے ہاتھوں لیا ہے۔

ان کی شخصیت میں اس قسم کی سختی ضرور ہے لیکن، ویسے وہ کرخت آدمی نہیں ہیں۔ ملنے جلنے میں انھیں آداب اور حفظ مراتب کا بڑا خیال رہتا ہے۔ اپنے چھوٹوں تک کی وہ عزت کرتے ہیں۔ بڑی نرمی اور ملائمت سے اُن کے ساتھ پیش آتے ہیں۔ شفقت اور محبت کا اظہار ان کی طرف سے قدم قدم پر ہوتا ہے۔ شرافت اور نیکی تو ان پر ختم ہے۔ وہ کسی کے ساتھ برائی نہیں کر سکتے ——— وہ شروع سے آخر تک خیر ہی خیر، نیکی ہی نیکی ہیں، شر کا لفظ ان کی لغت میں نہیں ہے۔ ان کا نصب العین خدمت ہے۔ اور خدمت ہی کو وہ انسانی زندگی کی معراج سمجھتے ہیں۔ ساری زندگی انھوں نے انفرادی اور اجتماعی طور پر خدمت ہی کی ہے ——— خدمت کا خیال نرمی کو پیدا کرتا ہے۔ چنانچہ یہ نرمی مزاج کی تیزی کے باوجود ان کی شخصیت میں اپنا اثر دکھاتی ہے۔ انھیں ایک انقلابی کہا جائے تو بے جا نہیں۔ ایک انقلابی شر کے خلاف تیزی اور تندی کو روا رکھتا ہے لیکن خیر کے لئے اس کے پاس نرمی ہی نرمی اور ملائمت ہی ملائمت ہوتی ہے۔ بابائے اردو کا بھی کچھ یہی حال ہے۔

ایک انقلابی کی طرح بابائے اردو بڑی سخت زندگی بسر کرنے کے عادی ہیں۔ اور صحیح کردار کی تعمیر کے لئے سخت زندگی بسر کرنے کو ضروری خیال کرتے ہیں۔ چنانچہ آرام طلبی سے انھیں نفرت ہے۔ اس لئے جو چیزیں آرام طلبی کے ماحول کو پیدا کرتی ہیں اُن کو بھی وہ اچھا نہیں سمجھتے۔ انھیں انگریزی صوفوں اور ایرانی

قالینوں پر بیٹھ کر کام کرنا نہیں آتا۔ وہ تو راحت اور آرام کے بغیر کام کرنے کے عادی ہیں۔ میں نے سخت گرمی میں بھی انھیں مسلسل کام کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ کام کرنے کے لئے گرمی کی شدت کو وہ کم کرنے کے قائل نہیں۔ چنانچہ گرمی کے موسم میں کمروں کو خس کے ذریعے ٹھنڈا کرنے سے انھیں چڑ ہے۔ اس کو وہ تن آسانی سمجھتے ہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ دلّی میں ایک دفعہ بعض لوگوں نے اس بات کی کوشش کی کہ ان کے کمرے میں خس کی ٹٹیوں کا انتظام کر دیا جائے لیکن انھوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ ساری مخلوق تو کام کرنے کے لئے خس نہیں لگاتی۔ بغیر خس کے گرمیوں میں کام زیادہ ہو سکتا ہے۔ لطف تو جب ہے کہ لو اور دھوپ میں بھی کام جاری رہے۔ انسان کو کسی چیز کا محتاج نہیں ہونا چاہیئے۔ جہاں وہ راحت اور آرام کی خاطر بعض چیزوں کا عادی ہو گیا تو سمجھ لیجئے کہ اس دنیا میں اس کا مزا کا نہیں ہے۔ یہ دنیا تو انسان سے سخت جانی کا تقاضا کرتی ہے ——— اور انسان کو سخت جان ہونا چاہیئے کہ اس سے فکر و عمل کی صلاحیتیں بیدار ہوتی ہیں۔ اور اس طرح انسان صحیح معنوں میں انسان بنتا ہے۔

بابائے اردو صحیح معنوں میں انسان ہیں، اور یہی ان کی شخصیت کی سب سے بڑی خصوصیت ہے ——— ان کی شخصیت میں جو بھی خصوصیات ہیں، وہ سب اسی ایک خصوصیت کے گرد گھومتی ہیں۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ ان تمام خصوصیات کے مجموعے ہی سے اس انسانی خصوصیت کا ہیولا تیار ہوتا ہے ——— ان کی شخصیت میں کوئی ایک بات بھی ایسی نہیں ملتی جس کی نوعیت غیر انسانی ہو ——— وہ انسان ہیں۔ انھیں انسان سے محبت ہے۔ وہ انسان کو سمجھتے ہیں۔ وہ اس کی عظمت کے قائل ہیں۔ انھیں اس کے ماضی پر فخر اور حال اور مستقبل پر بھروسہ ہے۔ چنانچہ وہ ایک انسان کی حیثیت سے انسانی زندگی میں ہمیشہ رجائی پہلوؤں کو دیکھتے ہیں۔ اسی لئے ان کی شخصیت میں ولولوں کے چراغ روشن نظر آتے ہیں، امنگوں کی شمعیں فروزاں دکھائی دیتی ہیں ——— اور ان کی اسی خصوصیت نے انھیں سراپا نور بنا دیا ہے ——— لیکن وہ صرف اس نور کو اپنے آپ تک محدود نہیں کرتے۔ اس کی روشنی دور دور تک پہنچاتے ہیں ——— اور اس روشنی سے زندگی کی تاریکیوں میں اجالا ہوتا ہے۔ یہ اجالا افراد کو نئی راہیں دکھاتا ہے، نئے میدانوں سے روشناس کرتا ہے۔ نئی جولانگاہوں کا پتہ بتاتا ہے ——— ان کی شخصیت نے ان گنت لوگوں کو یہ راہیں دکھائی ہیں، ان میدانوں سے روشناس کیا ہے، ان جولانگاہوں کا پتہ بتایا ہے۔ ہماری ثقافتی تہذیبی اور ادبی زندگی پر جو اثرات موجودہ دور میں ان کی شخصیت نے چھوڑے ہیں۔ وہ اپنی جگہ پر بڑے ہی گہرے اور ہمہ گیر ہیں ——— اور اس میں ان کی شخصیت کی انھیں خصوصیات اور ان کے کردار کے انھیں پہلوؤں کو دخل ہے جن کو برسوں کی مستقل کاوش اور مسلسل جد و جہد کے بعد انھوں نے پیدا کیا ہے۔ اسی میں ان کی شخصیت کی عظمت اور اور ہمہ گیری کا راز مضمر ہے۔

میں جب بھی ان کی عظیم اور ہمہ گیر شخصیت کے بارے میں سوچتا ہوں تو مجھے ایک اتھاہ سمندر اور ایک سربفلک پہاڑ کا خیال آتا ہے، اور یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں اس سمندر کی بے پایاں وسعت اور اس پہاڑ کی بے اندازہ عظمت کے نظارے سے مبہوت ہو جانے والا ایک خاموش تماشائی ہوں!

ابو الکلام

غلام رسول مہر

نوا را تلخ تر می زن چو ذوق نغمہ کم یابی
غزل را ساز تر می خواں چو محمل را گراں بینی

نوا فروخت ز اندازۂ بریشم عود
غزل بہ زمزمہ خوانم کہ پردہ ہا پست اند

۱۹۱۳ء کے موسم گرما کا آغاز تھا۔ میں ایف۔ اے کے امتحان کی تیاری کر رہا تھا کہ چند دوست دستخط کے لئے ایک فارم میرے پاس لائے اور بولے کہ "حزب اللہ" کے ممبر بن جاؤ۔ میں نے پہلی مرتبہ یہ نام سُنا تھا، لیکن دوستوں پر اعتماد تھا اس لئے تذبذب کے بغیر دستخط کر دئے۔ دیکھا کہ چھوٹا سا فارم ہے۔ اس پر ٹائپ میں تین چار سطریں چھپی ہوئی ہیں۔ اوپر جلی حروف میں "مَنْ انصاری الی اللہ" مرقوم ہے۔ اس کے نیچے قرآن مجید کی ایک آیت ہے اور اس کے ساتھ اُردو ترجمہ۔ پایان تحریر نام، "پیشہ" عمر اور پتے کی جگہ خالی چھوڑ رکھی ہے۔ چند روز بعد میں اس فارم کے متعلق سب کچھ بھول گیا۔ ایف، اے کا امتحان دے کر گھر جانے لگا تو دوستوں سے پوچھا کہ بھئی! کوئی دلچسپ مشغلہ بتاؤ، جس سے نتیجۂ امتحان کے انتظار کا وقت بخوبی گزر سکے۔ انہوں نے کہا کہ اخبار جاری کرا لو۔ اور ساتھ ہی دو اخباروں کے نام تجویز کر دئے۔ ایک روزانہ "زمیندار" دوسرا ہفتہ وار "الہلال"۔ "الہلال" کا چندہ اس زمانے میں آٹھ روپے سالانہ تھا اور اعلان ہو چکا تھا کہ جو لوگ، ایک معین مدت میں خریداری کی درخواست کریں گے ان کے چندے میں سے ساڑھے سات روپے "ہلال احمر فنڈ" میں بھیج دیئے جائیں گے۔ میں نے "ہم خرما و ہم ثواب" کے پیش نظر فوراً درخواست بھیج دی، لیکن نہ اس وقت تک "الہلال" کی شکل دیکھی تھی نہ یہ معلوم تھا کہ وہ کس قسم کا پرچہ ہے۔ صرف اتنا جانتا تھا کہ "حزب اللہ" کا فارم "الہلال" ہی کے دفتر سے آیا تھا۔

میں گھر پہنچا تو چند روز بعد "الہلال" کا وی، پی آ گیا۔ پرچہ کھولا تو پورا ٹائپ میں چھپا ہوا تھا اور ٹائپ کے پڑھنے کا میں عادی نہ تھا۔ تکلف سے عبارت پڑھنی چاہی، تو وہ عربی الفاظ و تراکیب سے لبریز تھی اور جا بجا آیات درج تھیں۔ کچھ وقت صرف کرنے کے بعد میں نے سمجھ لیا کہ ممکن ہے "ہلال احمر فنڈ" میں چندہ دینے کا "ثواب" میرے نامۂ اعمال میں لکھا جائے۔ لیکن "خرما" کی امید تو نقش بر آب ثابت ہوئی۔ پرچہ ویسے ہی رکھ دیا اور اس کے کسی حصے سے استفادہ کا سوال باقی نہ رہا۔ آٹھویں دن پرچہ آتا تھا۔ میں اسے کھولتا اور پڑھے بغیر ایک جگہ رکھتا جاتا۔ چھٹا ساتواں پرچہ آیا تو اس میں "حزب اللہ" کے اغراض و مقاصد کا ذکر تھا۔ میں چونکہ اس جماعت کا ممبر بن چکا تھا، اس لئے طبیعت پر جبر کر کے مضمون پڑھا کہ جس جماعت سے وابستہ ہو رہا ہوں اس کے مقاصد سے آگاہی لازم ہے۔ فارغ ہوا تو دل پر ایک عجیب کیفیت طاری تھی۔ پھر تمام پرچوں کو اوّل سے آخر تک حرفاً حرفاً دیکھا اور اس امر پر برابر افسوس کرتا رہا کہ پہلے دن اس کا باقاعدہ

مطالعہ کیوں نہ شروع کر دیں ؎

بے فروغِ عشق تو سینہ ام زمرے کہ گذشت　　　پیش ازیں کاش گرفتارِ غمت می بودم

میں گاؤں میں رہتا تھا۔ وہاں ہفتے میں ایک مرتبہ ڈاک آتی تھی۔ "الہلال" کی آمد کے دن ڈاکئے کی پیشوائی کے جوشِ اشتیاق میں میل میل دو دو میل باہر نکل جاتا۔ جہاں وہ ملتا وہیں سے پرچہ کھول کر پڑھنا شروع کر دیتا اور جو دوست یا بزرگ ملنے کے لئے آتے ان سب کو ایک ایک مضمون سناتا۔ یہ الہلال سے عشق و شیفتگی کی ابتدا تھی۔ اسی وقت سے مولانا ابوالکلام آزاد کے ساتھ عقیدت کا رشتہ استوار ہوا۔ چالیس سال کی مدت میں کاروانِ حیات نے وابستگی و انقطاع کی سینکڑوں منزلیں طے کیں لیکن یہ رشتہ ستوار سے استوار تر ہوتا رہا اور آج بھی جبکہ آخری منزل بہت قریب نظر آتی ہے اس تعلق کو زندگی کی یگانہ عزیز ترین متاع سمجھتا ہوں۔

اسی زمانے میں مولانا سے خط و کتابت شروع ہو گئی تھی اور میری درخواست پر انہوں نے اپنی ایک مستقل تصویر بھی بھیج دی تھی۔ اگرچہ اس واقعے کو ایک عمر گذر چکی ہے لیکن آج بھی تصویر پانے کی لذت اسی طرح محسوس کرتا ہوں گویا یہ نعمت ابھی حاصل ہوئی ہے۔ مولانا سے ملاقات ۱۹۱۵ء میں ہوئی جب میں بی۔ اے میں پڑھتا تھا۔ وہ راولپنڈی کانفرنس سے مراجعت پر برگینزا ہوٹل میں ٹھہرے تھے۔ میں چند احباب کی معیت میں زیارت کے لئے گیا اور انہیں دیکھا تو اپنے ذہن میں جو نقشہ قائم کر رکھا تھا اس سے وہ بالکل مختلف نکلے۔ میانہ قامت، جسم نہایت دبلا پتلا، رنگ سرخ و سفید، داڑھی مونچھ صاف، کمبل اوڑھے پلنگ پر بیٹھے تھے۔ صرف چند منٹ سرسری باتیں ہوئیں۔ پھر تعارف ہوا تو فرمایا کہ آج شام کے چار بجے ملو۔ مقررہ وقت پر حاضر ہوا تو ان کے علم و فضل کا رعب دل پر اس قدر چھایا ہوا تھا کہ جذباتِ عقیدت کو دل ہی دل میں موزوں الفاظ کا لباس پہنانے کے لئے ہر کوشش ناکام رہی گویا یہ نقشہ پیش تھا ؎

آزردہ زمن حالِ شب وصل چہ پرسی
نے دل خبرم داشت نہ از دل خبرم بود

مولانا نے پوچھا کہ بی۔ اے پاس کرنے کے بعد کیا ارادہ ہے؟ میری سمجھ میں اس کے سوا کچھ نہ آیا کہ اخبار جاری کروں گا تاکہ ملک و ملت کی کچھ خدمت بجا لاؤں۔ فرمایا: "مشغلہ اچھا ہے لیکن تمہیں اندازہ ہے کہ اس طرح منزلِ مقصود کے قریب پہنچنے میں کتنا وقت لگے گا؟ فرض کرو کہ ابتدا ہی میں آرزو کے مطابق سامان میسر آ جاتے ہیں تو اخبار کے استقلال اور اس کی آواز کی پذیرائی کے لئے کم و بیش دو سال کا انتظار تو ضروری ہوگا۔ پھر دو سال اس پذیرائی کے نتائج کا انتظار کرنا پڑے گا۔ گویا جس ذریعۂ خدمت سے کام لینے کا ارادہ کئے بیٹھے ہو اس کے نتائج دیکھنے کے لئے کم از کم چار سال صرف ہو جائیں گے۔ میرے نزدیک حالات کی رفتار ایسی ہے کہ اس مدت کے ایک حصے کا بھی انتظار مشکل ہے۔ نہیں کہا جا سکتا کہ اس اثنا میں کیا کچھ ہو جائے گا" میں دم بخود رہ گیا اور عرض کیا کہ آپ فرمائیں مجھے کیا کرنا چاہئے؟ فرمایا کہ امتحان سے فارغ ہونے کا انتظار کرو۔

"الہلال" بند ہو چکا تھا مولانا نے "البلاغ" نکالا تو اس کے ساتھ ہی کلکتہ میں "دارالارشاد" قائم کر دیا جس میں وہ منتخب نوجوانوں کو قرآنِ حکیم کا درس دیا کرتے تھے۔ یہ قومی اور دینی کارکنوں کی تعلیم و تربیت کا وہ مرکز تھا جس کے لئے مولانا "الہلال" کے زمانے سے انتظامات کر رہے تھے۔ لیکن "دارالارشاد" کے قیام کو ابھی چند ہی مہینے گذرے تھے کہ حکومتِ بنگال نے انہیں بنگال کے حدود سے نکل جانے کا حکم دے دیا۔ وہ رانچی چلے گئے تو وہاں انہیں نظر بند کر دیا گیا۔ ساتھ ہی "البلاغ" بھی بند ہو گیا اور "دارالارشاد" بھی۔ اس اثنا میں درس صرف اڑھائی تین پاروں تک پہنچا تھا۔ میرے دل میں ان کی ذاتِ بابرکات سے استفادہ کی جو آرزوئیں موجزن تھیں وہ بھی خون ہو کر رہ گئیں ؎

پنہاں تھا دامِ سخت قریب آشیانے کے　　　اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

۱۹۲۰ء میں نظربندی سے رہا ہوئے تو ملک میں ترکِ موالات کی تحریک جاری ہوئی اور وہ ہمہ تن اس تحریک کو کامیاب بنانے کے لئے وقف ہو گئے۔ میں اس زمانے میں "زمیندار" سے وابستہ ہو چکا تھا۔ ان سے نیازمندی کے روابط کی تجدید ہوئی۔ اگرچہ سیاسی افکار میں بعض اوقات اختلاف کی صورت بھی پیش آتی رہی۔ لیکن رشتۂ عقیدت بدستور قائم رہا اور ذاتی تعلقات میں بفضلہٖ تعالیٰ کوئی خلل نہ آیا۔ ہمارے عہد کی عام حالت یہ ہے کہ شخصی نسبت کی بنا پر بھی کسی سے اختلاف ہو تو اسے ناقابلِ برداشت سمجھا جاتا ہے۔ لیکن مولانا اپنے دوسرے اوصاف و محامد کی طرح اس وصف میں بھی یگانہ حیثیت کے مالک ہیں کہ رائے کے اختلاف یا مسلک کے تفاوت کو انہوں نے ذاتی تعلقات پر کبھی اثر انداز نہیں ہونے دیا۔

میں ان کے بے مثال علم و فضل کے متعلق یہاں کچھ نہ کہوں گا جو نصف صدی سے اس وسیع سرزمین کے آسمان پر آفتابِ جہاں تاب کی طرح تابندہ و درخشندہ ہے۔ وہ ان اصحاب میں سے ہیں جنہیں قدرت صدیوں کے بعد عالمِ انسانیت کو اپنی خاص نعمت کے طور پر عطا کرتی ہے۔ وہ تحریر و تقریر دونوں کی اقلیم کے تاجدار ہیں۔ ان کی غیر معمولی صلاحیتیں اس زمانے میں بھی مشہور فرمانروایانِ علم و فضل کے لئے یکسر حیرت انگیز تھیں۔ جب ان کی عمر بمشکل سولہ برس سے زیادہ نہ تھی۔ ۱۹۰۴ء میں وہ پہلی مرتبہ انجمن حمایتِ اسلام کے سالانہ جلسے میں شرکت کے لئے لاہور آئے تو خواجہ الطاف حسین حالی بھی تشریف لائے ہوئے تھے۔ مولانا وحید الدین سلیم مرحوم مولانا کو لے کر خواجہ صاحب مرحوم کی خدمت میں پہنچے تو پوچھا کہ خواجہ صاحب اس لڑکے کی عمر کتنی ہوگی؟ انہوں نے فرمایا کہ چودہ پندرہ برس کے ہوں گے۔ سلیم نے کہا یہ "لسان الصدق" کے ایڈیٹر ہیں۔ خواجہ صاحب نے فرمایا کہ ان کے والد ایڈیٹر ہوں گے۔ جب معلوم ہوا کہ یہی ایڈیٹر ہیں تو متحیر رہ گئے اور بہت شفقت فرمائی۔ اس وقت سے مولانا کے ساتھ گہرے روابط پیدا ہو گئے۔ "الہلال" کا ابتدائی دور تھا کہ مولانا ایجوکیشنل کانفرنس میں شرکت کے لئے گئے۔ خواجہ حالی کے فرزندِ ارجمند خواجہ سجاد حسین بھی اس میں شریک تھے۔ ان کے ہاتھ خواجہ صاحب نے مولانا کو بہت بہت سلام کہلا بھیجا۔ نیز فرمایا کہ "الہلال" آتا ہے تو چار چار پانچ پانچ دن اس کے سوا کوئی مشغولیت نہیں رہتی۔

اس سے بھی عجیب تر واقعہ یہ ہے کہ مولانا بارہ تیرہ برس کی عمر میں شعر کہنے لگے تھے۔ "ارمغانِ فرخ" کے نام سے ایک گلدستہ نکلتا تھا جس کی ماہانہ طرحوں پر کلکتہ میں مشاعرے ہوتے تھے۔ اسی زمانے کی کہی ہوئی غزلیں اس گلدستے میں شائع ہوتی تھیں۔ مرزا غالب کے ایک شاگرد نادر شاہ خان شوخی رامپوری کلکتہ میں مقیم تھے۔ انہیں کسی طرح یقین نہ آتا تھا کہ مولانا جو غزلیں مشاعروں میں سناتے ہیں وہ انہی کی ہوتی ہیں۔ ایک روز مولانا مسجد سے نکل رہے تھے۔ نادر شاہ خان نے روک دیا اور کہا کہ ایک شاگرد نے جان عذاب میں ڈال دی ہے۔ میں بیمار ہوں اور وہ غزل کے لئے متقاضی ہے۔ چند شعر اسی وقت کہہ دو۔ انہوں نے زمین بتائی "یاد نہ ہو" "شاد نہ ہو"۔ مولانا نے ایک کتب فروش کی دکان پر بیٹھے بیٹھے چھ شعر کہہ دئے۔ نادر شاہ خان بولے کہ اشعار کی تعداد طاق ہونی چاہئے۔ مولانا نے بے توقف کہا ؎

وعدۂ وصل بھی اک طرفہ تماشے کی ہے بات

ہیں تو مجنوں نہ کبھی، ان کو کبھی یاد نہ ہو

نادر شاہ خان نے کہا کہ صورت سے تو دس بارہ برس کے صاحبزادے معلوم ہوتے ہو لیکن خدا کی قسم عقل باور نہیں کرتی۔

شمس العلماء شبلی مرحوم سے بھی اسی قسم کا واقعہ پیش آیا۔ ان سے مولانا کی خط و کتابت تھی۔ شبلی ۱۹۰۵ء میں بمبئی گئے تو اس زمانے میں مولانا وہیں مقیم تھے۔ ایک دوست کے ہمراہ ملاقات کے لئے پہنچے۔ دوست نے تعارف کرایا تو شبلی کو یقین نہ آیا کہ ابوالکلام آزاد یہی ہیں۔ جب شک کی کوئی گنجائش نہ رہی تو اس درجہ گرویدہ ہوئے کہ "الندوہ" کی ایڈیٹری سونپ دی اور مولانا نے ۱۹۰۵ء کے اواخر سے ۱۹۰۶ء کے اوائل تک یہ خدمت انجام دی۔

بہرحال جو وجود عمر کے ابتدائی مراحل میں وقت کے اکابرِ علم و فضل کے لئے باعثِ حیرت و استعجاب بن گیا تھا، اس کی شان و عظمت کے متعلق میں ہیچ مدان کیا کہہ سکتا ہوں۔ مولانا کو خدا نے غیر معمولی حافظہ عطا کیا ہے۔ اس کی محسوس و مشہور مثالیں "تذکرہ" اور "غبارِ خاطر" کی شکل میں دنیا کے

سامنے موجود ہیں۔ "تذکرہ" رانچی کی نظربندی کے زمانے میں لکھا گیا، جب مولانا کے پاس کوئی قابلِ ذکر کتاب موجود نہ تھی۔ "غبارِ خاطر" کے خطوط احمد نگر کی اسیری کے زمانے میں مرتب ہوئے۔ اس وقت بھی وہ کتابوں سے بڑی حد تک محروم تھے۔ لیکن ان کتابوں کے مطالعے سے ہر شخص پر آشکارا ہو سکتا ہے کہ بڑے بڑے کتب خانوں میں بیٹھ کر بھی اس قسم کی چیزیں مرتب نہیں کی جا سکتیں۔ "غبارِ خاطر" پہلی مرتبہ لاہور میں چھپی تھی اور اس کی کاپیاں دیکھنے کا کام مجھے سونپا گیا تھا۔ "مآثر الامراء" کی ایک عبارت کے متعلق میرے دل میں شبہ پیدا ہوا۔ مطبوعہ کتاب میں عبارت وہی تھی جو مولانا نے "غبارِ خاطر" میں درج کی تھی۔ میرا خیال ہے کہ کتاب ایڈٹ کرنے والے نے ایک لفظ کے سمجھنے میں غلطی کی۔ استصواب کی غرض سے مولانا کو لکھا۔ فرمایا: "منقولہ عبارت درست ہے اور یہ "مآثر الامراء" کی فلاں جلد کے فلاں صفحے پر فلاں طرف اوپر کی سطروں میں موجود ہے۔ میں نے تیس سال پیشتر "مآثر الامراء" دیکھی تھی اور یہ الفاظ اسی طرح لوحِ حافظہ پر منقوش ہیں۔"

عزیمت و استقامت مولانا کے آئینۂ طبع کے درخشاں ترین جوہر ہیں۔ انہوں نے جن اصول و مقاصد کی دعوت کے لئے زندگی وقف فرمائی، ان پر کاربندی اور عمل پیرائی میں ہمیشہ چٹان کی طرح جمے رہے۔ اس سلسلے میں ان کی صحت کو نقصان پہنچا، کاروبار تباہ ہوا، ان کی نہایت قیمتی تصانیف کے مسودے ضائع ہو گئے؛ انہوں نے علمی یادداشتوں کے جو مجموعے مرتب کئے تھے اور انہیں اپنی زندگی کا حاصل سمجھتے تھے، وہ سب تلاشیوں میں تلف ہو گئے۔ لیکن ان کی شانِ عزیمت ان تمام نقصانات سے بالکل غیر متاثر رہی۔

ذاتی تعلقات کے سلسلے میں ایک نہایت دشوار و دل گداز مرحلۂ امتحان اس وقت پیش آیا جب احمد نگر کی اسیری کے زمانے میں ان کی اہلیہ محترمہ سخت بیمار ہوئیں۔ اس موقع پر سپرنٹنڈنٹ ان کے پاس پہنچا اور کہا کہ اگر حکومت سے کچھ کہنا ہو تو میں اسے فوراً بمبئی پہنچا دوں گا۔ مطلب غالباً یہ تھا کہ اگر رفیقۂ حیات کی شدید علالت کی بنا پر مشروط رہائی کی درخواست کریں تو وہ حکومت کے ملاحظہ میں پیش کر دی جائے گی۔ لیکن مولانا نے صاف صاف کہہ دیا کہ میں حکومت سے کوئی درخواست نہیں کرنا چاہتا۔ سپرنٹنڈنٹ نے پنڈت جواہر لال کی وساطت سے بھی مولانا کو راضی کرنے کی کوشش کی لیکن وہ جو فیصلہ فرما چکے تھے اس پر قائم رہے۔ وہ خود فرماتے ہیں:

> "جونہی خطرناک صورتِ حال کی پہلی خبر ملی۔۔۔۔ میں نے محسوس کیا کہ طبیعت کا سکون ہل گیا ہے اور اسے قابو میں رکھنے کے لئے جد و جہد کرنی پڑے گی۔ یہ جد و جہد دماغ کو نہیں مگر جسم کو تھکا دیتی ہے۔ اس زمانے میں میرے دل و دماغ کا جو حال رہا میں اسے چھپانا نہیں چاہتا۔ میری کوشش تھی کہ اس صورتِ حال کو پورے صبر و سکون کے ساتھ برداشت کروں۔ اس میں میں ظاہر کامیاب ہوا لیکن شاید باطن نہ ہو سکا۔"

آگے چل کر فرماتے ہیں:

> "میں نے تمام معمولات جاری رکھے، لیکن۔۔۔۔ اعتراف کرتا ہوں کہ یہ تمام ظاہرداریاں دکھاوے کا ایک پارٹ تھیں جس سے دماغ کا مغرورانہ احساس کھیلتا رہتا تھا اور اس لئے کہ پتا تھا کہ کہیں اس کے دامنِ صبر و وقار پر بے حالی اور پریشان خاطری کا کوئی دھبہ نہ لگ جائے۔"

اس کے باوجود مولانا نے حکومت سے کوئی درخواست نہ کی اور ان کی صاحبِ عزیمت رفیقۂ حیات اس حالت میں دنیا سے رخصت ہوئیں جب وہ سینکڑوں میل دور اپنے اہم اصول و مقاصد کی خاطر احمد نگر کے قلعے میں محبوس تھے۔ اصول و مقاصد کی قربان گاہ پر عزیز ترین رشتوں کو وہی ہستیاں اس طرح بھینٹ چڑھا سکتی ہیں جنہیں کارکنندۂ حیات سے عزیمت و استقامت کی غیر معمولی صلاحیتیں ارزانی ہوئی ہوں۔

مبادا کسی کو خیال ہو کہ مولانا اس افتاد پر انتہائی اضطراب و پریشانی سے تو محفوظ نہ رہ سکے، جیسا کہ انہوں نے خود اعتراف کیا ہے۔ یہ

ہے لیکن یہ خیال صحیح نہ ہوگا۔ صبر کا مفہوم ہی یہ ہے کہ انسان موجباتِ غم کی شدت و فراوانی کے باوجود اپنے احساساتِ حزن پر قابو پالے اور انہیں مناسب حدود سے تجاوز کا موقع نہ دے۔ یہ نہیں کہ احساسات سرے سے باقی ہی نہ رہیں اور انسان کا دل پتھر بن جائے۔ ایک سلیم الفطرت انسان کی طرح مولانا طبعی احساسات سے بدرجۂ اتم بہرہ مند تھے۔ کون اندازہ کر سکتا ہے کہ رفیقۂ حیات کی خطرناک علالت کا خط ملتے ہی ان کے دل پر کیا قیامت گزری ہوگی خصوصاً اس حالت میں کہ وہ اسیر تھے اور پاس رہ کر تیمارداری بھی نہ کر سکتے تھے، جو اکثر انسانوں کے لئے فی الجملہ باعثِ تسکینِ قلب ہوتی ہے۔ یقیناً انہیں بھی آرزو ہوگی کہ رہائی ملے تو خود اپنی اہلیہ کا علاج کرائیں اور تا بحدِ امکان اس کا دکھ مٹانے کی کوشش کریں لیکن ان کے سامنے زندگی کے اہم بنیادی اصول و مقاصد بھی تھے۔ وہ کوئی ایسی صورت قبول نہ کر سکتے تھے جو ان اصول و مقاصد کی آبرو پر اثر انداز ہوتی۔ انہوں نے جب اس راستے میں قدم رکھا تھا تو ان تمام قربانیوں کا اٹل فیصلہ کر لیا تھا جو اس سفر کے لوازم میں شامل تھیں۔ جب پے بہ پے وہ قربانیاں طلب کی گئیں تو مولانا نے ایک صاحبِ عزیمت انسان کی طرح انہیں پیش کرنے میں تامل نہ کیا۔ ذاتی تعلقات کے سلسلے میں غالباً یہ سب سے بڑی قربانی تھی جس کا ان سے مطالبہ ہوا۔

ایک مرتبہ انہوں نے مجھے تحریر فرمایا تھا:

> "ہر وقت اسے پیشِ نظر رکھئے کہ استقامت اصل کار ہے۔ اگر ایک آدمی فوج کی نوکری قبول نہیں کرتا تو یہ کوئی جرم نہیں، لیکن اگر سپاہی بن کر اور میدانِ جنگ میں آ کر پیچھے ہٹتا ہے تو اس کی سزا موت کے سوا کچھ نہیں ہوتی ؏
>
> ہاں، رہِ عشق ہست کہ رفتن ندارد باز گشت
>
> جرم را اینجا عقوبت ہست و استغفار نیست
>
> دریا میں اترنے سے پہلے سب کچھ سوچ لینا چاہئے، لیکن جب اتر گئے تو موجوں کا شکوہ فضول ہے اور کبھی بھی سنا نہ جائے گا۔ ممکن ہے پہلے ہی غوطے میں خونخوار نہنگوں کا سامنا ہو جائے لیکن جو شخص سمندر میں کودتا ہے، اسے نہنگوں کے وجود سے بے خبر نہ ہونا چاہیئے۔"

مولانا کی ذاتِ گرامی اس تعلیم ہی کا نہیں بلکہ ہر اس تعلیم کا عملی نمونہ رہی ہے جو ان کی زبان پر جاری ہوئی۔ بلا شبہ ان کے قلب پر بھی رنج والم کی تمام کیفیتیں پوری شدت سے طاری ہوئیں جو عزیز ترین رشتوں سے انقطاع کا لازمہ ہیں لیکن انہوں نے مقامِ صبر کے واجبات جس شانِ عزیمت سے ادا کئے، ان کی مثالیں تاریخ میں بہت ہی کم ملتی ہیں۔ موجباتِ غم سے متاثر ہونا ہر قلبِ سلیم کا خاصہ ہے لیکن احساسات پر قابو پا لینا صرف صابرین، متقین کا کام ہے۔

ان کی زندگی میں استقامت کی ایک اور نادر مثال ملتی ہے۔ جب ہم قوموں کی اکثریت نے ان کے سیاسی مسلک سے اختلاف کیا۔ میرے علم کے مطابق وہ اپنے لئے ۱۹۱۲ء میں جو راہِ عمل طے کر چکے تھے، اس پر مدت العمر بے خوفِ لومۃ لائم قائم رہے۔ بیچ میں اکثر ایسے مرحلے آئے کہ بڑے بڑے دعویدارانِ عزم و ہمت کے قدم بھی لڑکھڑا گئے۔ انہوں نے اپنا مسلک بدلنے کے لئے معقول دلائل بھی فراہم کر لئے۔ لیکن مولانا کے نزدیک صحیح، مفید اور بہترین راستہ وہی تھا جو انہوں نے ۱۹۱۲ء میں اختیار کیا تھا۔ اس سلسلے میں انہیں بے شمار قربانیاں کرنی پڑیں۔ کم و بیش دس سال قید و بند میں گزارے۔ ان کے نہایت اہم دینی و علمی مشاغل کو سخت نقصان پہنچا۔ وہ وسائلِ معاش بھی بالکل تباہ ہو گئے جو انہوں نے اپنی طبیعت کے ذوق کے مطابق اختیار کر رکھے تھے اور جن میں وہ سب سے بڑھ کر کامیاب تھے۔ لیکن ان تمام قربانیوں سے گراں بہا تر قربانی یہ تھی کہ ان کی ہر دل عزیزی کی متاعِ عظیم جل کر راکھ کا ڈھیر بن گئی۔

وہ اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کی بنا پر عنفوانِ شباب ہی میں ہمہ گیر شہرت حاصل کر چکے تھے۔ وہ جس طرف نکلتے تھے، لوگ اپنی آنکھیں ان کے لئے بچھانے پر آمادہ رہتے تھے اور یہ کہنا قطعاً مبالغہ نہ ہوگا کہ ان کے لئے مسلسل و متواتر عقیدت کی جن گرم جوشیوں کا اظہار ہوتا رہا، وہ شاید مولانا محمد علی مرحوم کو مستثنیٰ کر کے کے بعد کسی مسلمان رہنما کو نصیب نہ ہوئیں اور یہ غیر معمولی ہر دل عزیزی انہیں اس وقت حاصل تھی جب ان کی عمر بیس اور تیس کے درمیان تھی، بالخصوص یہ قابلِ ذکر

امر یہ ہے کہ ان سے محبت و عقیدت کا تقاضا بے غرضانہ تھا، یعنی وہ ان رہنماؤں میں نہ تھے، جنہیں مختلف گروہوں نے صاحبِ اختیار و اقتدار دیکھ کر فتحِ بابِ مقاصد کا مرجع سمجھ لیا ہو، لیکن انہیں پیشِ نظر مقاصد کے لئے استقامت و عزیمت کی راہ میں ہر دل عزیزی کی متاعِ عظیم بھی قربان کرنی پڑی اور وہ جس شے کو حق سمجھتے تھے اس سے بال برابر بھی ادھر ادھر نہ ہوئے۔ یہ قربانیاں ذکر و بیان میں شاید بہت دل پسند معلوم ہوں، لیکن اس پر عمل سہل نہیں۔ نظیری کیا خوب کہہ گیا ہے ؎

نیست آسان برصفِ آتش زدن
می نماید گرچہ از پروانہ خوش

یہاں سوال مولانا کے افکار و آراء کی درستی یا نادرستی کا نہیں، مقصود صرف یہ ہے کہ ان کی شانِ عزیمت و استقامت واضح ہو جائے۔

مولانا کے عادات و خصائل کا باب بہت وسیع ہے اور اپنے علمی و عملی جوہروں کی طرح عادات و خصائل میں بھی وہ بالکل یگانہ حیثیت کے مالک ہیں۔ مثلاً سحر خیزی ابتدائی دور ہی سے ان کی فطرتِ ثانیہ بنی ہوئی ہے۔ وہ ہمیشہ اوّل وقت اٹھتے ہیں، گویا نظیری کے اس شعر کی عملی تصویر ہیں ؎

عبادتِ سحری را مکن نظیری کم
کہ ہرچہ کرد دعا ہائے صبح گاہی کرد

ایک مرتبہ سیاسی مصروفیتوں کے سلسلے میں لاہور آئے۔ سردیوں کا موسم تھا۔ میں نے عرض کیا کہ ملاقات کے لئے کوئی وقت بتا دیجئے۔ فرمایا: صبح کے چھ بجے سے آٹھ بجے تک مل سکتے ہو۔ وہ آٹھ دس دن یہاں مقیم رہے اور میں زیادہ سے زیادہ پانچ بجے ان کے پاس پہنچ جاتا تھا۔ تین گھنٹے اطمینان سے باتیں کرنے کے لئے مل جاتے تھے۔ پچھلے دنوں میں دہلی گیا تو اس وقت بھی وہ اپنے انتظامی کاموں میں بہت مصروف تھے۔ دس دن ان کے پاس ٹھہرا رہا۔ یہی صبح کا وقت گفتگو کے لئے مقرر تھا۔ سیاسی ہنگاموں میں عمر گزارنے کے باوجود انہیں خلوت و تنہائی بہت پسند ہے۔

تنہائی و خلوت طلبد عشق نظیری
ایں خیل و خدم ما بہ امیرِ حشمہ بخش

وہ ایک زمانے میں بہت خوش پوش تھے۔ غالباً ۱۹۲۰ء سے کھدر پہننا شروع کیا اور اب تک اسی پر قائم ہیں۔ وہ ابتدا ہی سے ہلکی غذا کھانے کے عادی ہیں اور بہت کم کھاتے ہیں۔ آج کل تو غذا کی تقلیل غیر معمولی صورت اختیار کر چکی ہے۔ لطیف چینی چائے وقتاً فوقتاً ضرور پیتے ہیں اور اس کے دلکش تذکرے "غبارِ خاطر" میں جابجا موجود ہیں۔

انہوں نے کبھی کسی کا احسان لینا گوارا نہیں کیا، حتیٰ کہ اپنے ان عقیدت مندوں سے بھی کوئی تحفہ نیاز بہ آسانی قبول نہیں کرتے جنہیں انتہائی شفقت و نوازش سے انہوں نے عزیزوں کا درجہ دے دیا ہے۔ ایک مرتبہ انہیں عرق النسا کا عارضہ ہوا۔ شفاء الملک حکیم فقیر محمد چشتی نظامی مرحوم بھی میری طرح مولانا کے عقیدت مند تھے۔ انہوں نے فرمایا کہ مولانا سے بیماری کے مفصل حالات پوچھ کر مجھے بتاؤ، میں ایسا نسخہ تجویز کروں گا کہ بفضلِ خدا یہ عارضہ دوبارہ نہ ہوگا۔ میں نے حالات منگوالئے۔ حکیم صاحب مرحوم نے خوب غور و فکر کے بعد نسخہ تجویز کر دیا اور یہاں سے دوائیں کلکتہ بھیج دی گئیں۔ ان سے فائدہ ہوا۔ حکیم صاحب کی رائے تھی کہ دوائیں کچھ دیر جاری رکھی جائیں۔ مولانا نے لکھا:

"مجھے حکیم صاحب کی دواؤں کے استعمال میں ہرگز تامل نہیں۔ اگر اب بھی ان کا فیصلہ یہی ہے کہ جوہر منتّٰی وغیرہ استعمال کرنا چاہئے تو ضرور کروں گا مگر شرط یہ ہے کہ وہ دواخانے کو حکم دے دیا کریں تاکہ مجوزہ مرکبات وی۔ پی پارسل کے ذریعے پہنچتے رہیں۔ اس صورت میں شکرگزار ہوں گا اور انشراحِ خاطر سے علاج کروں گا۔ ورنہ طبیعت رک جاتی ہے کہ تحفہ ایک مرتبہ ہونا چاہئے نہ کہ مسلسل۔ اگر حکیم صاحب یا آپ اسے منظور نہ کریں گے تو پھر میں نہ تو فراغِ خاطر کے ساتھ دوا استعمال کروں گا، نہ امتداد و اجرا کی حالت گوارا ہو سکے گی۔"

ایک مشہور عالمِ دین نے مولانا کی تفسیرِ فاتحہ کے بعض حصوں پر ایرادات کئے اور اس سلسلے میں مناظرانہ رنگ اختیار کر لیا۔ ایرادات کے متعلق مجھے بعض باتیں مولانا سے پوچھنے کی ضرورت پڑی۔ ضمناً یہ بھی لکھا کہ کتاب آپ نے نہیں دیکھی تو میں بھیج دوں۔ فرمایا: "کتاب ہرگز نہ بھیجو۔ یہی بہتر ہے کہ میں اسے نہ دیکھوں۔"

"سنہ ۱۹۱۰ء سے میں نے جن تین باتوں کا عہد کیا ہے، ان میں سے ایک یہ ہے کہ ہر اس شخص کو جو مناظرانہ طریق پر میرے خلاف کچھ لکھے گا

نہ تو جواب دوں گا، نہ اس کی شکایت سے اپنے نفس کو آلودہ کروں گا۔"

پنجاب کے ایک سیاست داں نے ایک بیان میں ایسی باتیں کہیں جو مولانا کے نزدیک یکسر بے اصل تھیں۔ انہوں نے مجھے لکھا:

"اگر میری طبیعت کا وہ انداز ہوتا جو اس وقت تھا جب "الهلال" نکالتا تھا تو یہ ایسا صریح کذب ہے کہ نہیں معلوم کسی عام بیان میں میرے قلم سے کیسے سخت الفاظ اس شخص کی نسبت نکل جاتے، لیکن اب میرا حال دوسرا ہے۔ کوئی شخص کتنے ہی قبیح فعل کا مرتکب ہو، میں یقین کے ساتھ اسے پبلک میں بُرا کہنا پسند نہیں کرتا۔ ہمیشہ ایسے موقعوں پر اپنا نفس سامنے آجاتا ہے۔ میں چونکہ اچھا ہوں کہ اگر بُرا ہی کہنا ہے تو اپنے نفس کو کیوں بُرا نہ کہوں؟"

آخر میں فرماتے ہیں:

"اگر ایک مدعیٔ اسلام میں صدقِ مقال نہیں تو اسلام میں سے کوئی چیز بھی نہیں۔ ولیس وراء ذالک من الایمان حبۃ خردل"

ایک مرتبہ وزیر تک ملاقات کی کوئی صورت پیدا نہ ہوئی۔ میں نے ایک عریضے میں شعلۂ اصفہانی کا یہ شعر لکھ دیا:

آں بخت نہ دارم کہ بہ بزمِ تو باشیم   تا و سرِ راہِ تو و آہے و نگاہے

انہوں نے جواب میں تحریر فرمایا کہ اس شعر کا یہاں کیا موقع تھا:

"ایک حدیثِ قدسی ہے: من تقرب الیّ شبراً تقربتُ الیہ ذراعاً۔ جو ایک بالشت میرے قریب آتا ہے میں ایک ہاتھ اس کے قریب جاتا ہوں۔ عمر بھر میری یہ کوشش رہی ہے کہ اس وصف کے تخلّق سے محروم نہ رہوں۔ اب بھی اس پر عامل ہوں اور عامل رہوں گا: ع   ہزار بار برو صد ہزار بار بیا"

مضمون بہت طویل ہو گیا لیکن جو کچھ کہنا چاہتا تھا، نہ کہہ سکا۔ وہی عرفی والی بات ہوئی کہ

زباں زنکتہ فرو ماند و رازِ من باقیست   بضاعتِ سخن آخر شد و سخن باقیست

آخر میں مولانا کی تحریر کا ایک اقتباس پیش کرتا ہوں جو ان کے ایک طویل مکتوب سے ماخوذ ہے۔ کچھ علمی بحثیں فرما رہے تھے کہ خلافِ عادت ان کے قلم سے یہ الفاظ بے اختیار نکل گئے۔ فرماتے ہیں:

"افسوس ہے کہ زمانہ میرے دماغ سے کام لینے کا کوئی سامان نہ کر سکا۔ غالب کو تو صرف اپنی ایک شاعری کا رونا تھا۔ نہیں معلوم میرے ساتھ قبر میں کیا کیا چیزیں جائیں گی۔

ناروا بود بہ بازارِ جہاں جنسِ وفا   رونقے گشتم و از طالعِ دکاں رفتم

بعض اوقات سوچتا ہوں تو طبیعت پر حسرت و الم کا ایک عجیب عالم طاری ہو جاتا ہے۔ مذہب، علوم و فنون، ادب، انشاء، شاعری، کوئی وادی ایسی نہیں جس کی بے شمار نئی راہیں مبدءِ فیاض نے مجھ نامراد کے دل و دماغ پر نہ کھول دی ہوں اور ہر آن و ہر لحظہ بخششوں سے دامن مالامال نہ ہوا ہو۔ بحمد للہ ہر روز اپنے آپ کو عالمِ معنی کے ایک نئے مقام پر پاتا ہوں اور ہر منزل کی کرشمہ سنجیاں پچھلی منزلوں کی جلوہ طرازیاں ماند کر دیتی ہیں لیکن افسوس جس ہاتھ نے فکر و نظر کی ان دولتوں سے گراں بار کیا، اس نے شاید سروسامان کے لحاظ سے تہی دست رکھنا چاہا۔ میری زندگی کا سارا ماتم یہ ہے کہ اس عہد اور محل کا آدمی نہ تھا مگر اس کے حوالے کر دیا گیا۔"

یہ جو کچھ فرمایا گیا ہے سخن گستری ہے، نہ تعلّی بلکہ سراسر حقیقت ہے۔ کاش مجھے اندازہ شناسی میں سنائی کا درجہ نصیب ہوتا تو اس کی زبان سے کہتا:

دور ہا باید کہ تا یک مردِ حق پیدا شود
بایزید اندر خراساں یا اویس اندر قرن

علّامہ پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفیؔ

رحمت قطبی

ایک فن کا واقف ہی اس کے ماہر یا استاد کی شان میں کچھ کہہ سکتا ہے۔ عالم اہلِ علم کی تنقید کے ماہر ایک اعلیٰ نقاد کی، لسانیات کی واقفیت رکھنے والا ایک بے نظیر نقاد کی توصیف یا اعتراف میں کچھ کہنے کا اہل ہو سکتا ہے۔ بادش بخیر آج جس بزرگ کی زندگی کا تذکرہ مقصود ہے اس کی ذاتِ گرامی ایسے کمالات اور فضیلتوں کا مجموعہ ہے جن کی معترفانہ تعریف کے لئے بھی ایک ممتاز شخصیت کی ضرورت ہے، اس واسطے اس فرض کو اوروں کے لئے چھوڑ کر جو ہر طرح اس کے ادا کرنے کے اہل ہیں میں علامہ کیفیؔ کی روزانہ زندگی کے چند ایسے کوائف کا ذکر کروں گا جو ان کی شخصی زندگی اور ان کے کردار پر روشنی ڈالتے ہیں اور ادب سے متعلق ان کے بعض نظریوں کو اجاگر کرتے ہیں۔

"میں اسی موضوع پر لکھ یا کہہ سکتا ہوں جس کو میرے شعور نے احاطہ کیا ہوا ہو۔ آہنگ کی بلند لفظی یا معنوی اَبرد بازی تم کو میری نثر یا نظم میں کہیں نہ ملے گی۔"

"چونکہ میں ہمہ اوست کے مسلک کا سالک ہوں اس لئے مجھ کو ضرورت نہیں کہ عرش سے پرے جا کر اپنا آشیاں بناؤں اور جبکہ دوئی اور انوکھا پن مجھ سے کوسوں دور ہے تو غیریت اور اجنبیت میرے وہم و گمان میں کس طرح سما سکتی ہے۔"

ایک بار انہوں نے فرمایا کہ ایک دفعہ کسی شخص نے تاکیدی خط بھیجا اور دریافت کیا کہ آپ شعر کس طرح کہتے ہیں؟ آپ نے جواب میں لکھا۔ تمہارے سوال کا مطلب سمجھ میں نہیں آیا کہ میں یا کوئی شاعر کس حالت میں شعر کہتا ہے مثلاً یونان کا سارا فلسفہ فلسفیوں کی چہل قدمی کرتے ہوئے وجود پذیر ہوا ہے۔ خیر سنئے میں اسی حالت میں شعر کہہ سکتا ہوں جب میرا ذہن کسی خارجی حقیقت سے متاثر ہو یا جذبۂ صادقہ کی تحریک ہو محض کہنے کے لئے یا فرمائش کی تعمیل میں کبھی شعر نہیں کہا کرتا۔ میں کبھی مضامین وغیرہ کو جو موضوع سے تعلق رکھتے ہوں نوٹ نہیں کیا کرتا۔ ناول ہو یا افسانہ، نظم ہو یا ڈرامہ اس کا مقصد اور ضروری افراد یا کردار میرے ذہن میں مرتب ہوتے ہیں اور میں لکھنا شروع کر دیتا ہوں۔ اب رہی غزل، اگرچہ اس میں مضمون کے تسلسل کی پابندی لازم نہیں ہے اور میری غزلیں عموماً مسلسل ہوتی ہیں جو بظاہر نہیں ہوتیں، ان میں بھی تخیّل کا ایک قسم کا باہمی واسطہ مضمر ہوتا ہے۔"

کئی بار اس کا بھی اقرار کیا کہ "اگرچہ فارسی بہت پڑھی اور سو دو سو شعر بھی کہے مگر میں اپنے تئیں فارسی کے شاعروں میں شمار نہیں کرتا۔" مجھے چونکہ آپ کی خدمت میں حاضری کا شرف حاصل ہے آپ کے مجموعۂ کلام "واردات" میں سے ایک غزل نکال کے سامنے رکھ دی جس کے دو شعر آپ

بھی سنئے ـــ

استوارم لیک ز آشوب زماں ایمن نیم　　سایہ بر آلم ز سر و جویبار افتادہ ام
زاہدا جذب کشش دارد چہ خاک سے کدہ　　بار بار است تا رہ گشتم بار بار افتادہ ام

تبسم کے ساتھ فرمایا کہ "ہاں یہ شعر میرے نہیں مگر ایک تقریب سے وابستہ ہیں جو میرے عزیز دوست لالہ سری رام صاحب مؤلف "خمخانۂ جاوید" کی ذات سے تعلق رکھتی تھی اس لئے دل سے لکھے گئے ہیں۔ وہ کشمیر تشریف لے گئے ہیں وہاں ملازم تھا اور احباب بھی لالہ صاحب کو جانتے تھے اور اردو ادب سے متعلق ان کے مساعی سے مداح تھے۔ تجویز ہوئی کہ ان کی خدمت میں سپاسنامہ پیش کیا جائے اور طرحی مشاعرہ بھی منعقد ہو یہ غزل فارسی کی طرح میں ہوئی"

ایک دفعہ کا واقعہ ذکر کے قابل ہے کہ دوپہر کو آپ کے آرام کرنے کا وقت تھا کہ دو صاحب تشریف لائے خاصی دیر تک بیٹھے رہے اور ادبی باتیں بگھارتے رہے جیسے غالب کے بعض اشعار کی تشریح، فلاں شعر وزن میں ٹھیک ہے یا نہیں، فلاں محاورہ صحیح باندھا گیا ہے یا غلط؟ ملاقاتیوں کا لہجہ سائلانہ بھی تھا اور ناقدانہ بھی۔ آپ بہت سہولت سے ان کو جواب دیتے رہے۔ ایک معاملہ میں ان سے کہا "میاں یہ بات تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گی کیونکہ اس کا تعلق اُردو کے روزمرّہ سے ہے۔" میں اس ملاقات کے وقت موجود تھا۔ جب وہ لوگ چلے گئے تو میں نے عرض کیا۔ شاید آپ کو معلوم نہیں کہ یہ وہ صاحب تھے جو آپ کے کلام پر ایراد و تعریض کرتے ہیں۔ آپ مسکرائے اور فرمایا "میاں کیا میں ان کو یہاں سے نکلوا دیتا؟ یا ان سے شکایت کرتا؟ یہ دونوں باتیں میری شان کے خلاف تھیں تم دیکھو گے کہ وہ پھر آئیں گے اور ان کو تم بدلا ہوا پاؤ گے" چنانچہ بعد میں ایسا ہی دیکھا گیا۔

دہلی میں ایک صاحب کہیں سے آ ٹپکے ہیں اور اپنے آپ کو نظامی عروضی کا ہمسر سمجھتے ہیں ایک دن وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اتفاق سے میں بھی موجود تھا۔ انہوں نے لکھنؤ کے کسی شاعر کا ایک شعر پیش کیا اور پوچھا اس میں کیا عروضی نقص ہے؟ جواب میں آپ نے فرمایا "شاید آپ کو میری ادبی مصروفیتوں کا علم نہیں اور نہ یہ معلوم ہے کہ کن کن امراض نے مجھے دبا رکھا ہے۔ معانی و بیان کو تو آگے رکھئے اردو کے خلاف جو تازہ حملے ہو رہے ہیں ان کا دفاع مشکل سے ہو رہا ہے پھر مجھے فرصت کہاں کہ فلاں شاعر نے بحر متدارک کا زحاف بحر متقارب میں استعمال کر لیا ہے" اور لکچر کے انداز میں فرمایا "یہ وقت ہے کہ سارے اردو والے یک دل اور ہم آہنگ ہو کر اردو کے مستقبل کے لئے سوچیں اور کمر باندھ لیں کہ اس پر ہرگز ہرگز آنچ نہ آنے دیں گے۔" ملاقاتی نے کہا کہ جناب یہ تو بالکل درست ہے جو آپ نے فرمایا۔ لیکن اس شعر کے وزن کے متعلق کیا رائے عالی ہے؟ آپ ہنسے اور فرمایا "آپ شاید بیٹھے بیٹھے بخیر حاضر بھی ہو جایا کرتے ہیں۔ میاں تم اپنی کسی دھن میں ہو گے میں سوال کا جواب دے چکا ہوں"

خاکسار کو عروض پر عبور نہیں ہے صرف بحور وغیرہ کا نام جانتا ہوں میں نے ان سے کہا کہ کیفی صاحب نے زحاف کی بابت کچھ فرمایا تو تھا۔ وہ محجوب ہوئے اور ہاں ہاں کر کے رہ گئے۔

آپ کی روزانہ زندگی کے بعض واقعات ایسے ہیں جو ادھر آپ کی وسیع الاخلاقی پر روشنی ڈالتے ہیں، تو اُدھر نفسیات کے عجیب اور دشوار نکتے پیش کرتے ہیں۔ سنئیے ایک واقعہ جس کا مجھے پورا علم ہے۔ ایک صاحب جو اکثر آیا کرتے ہیں، آتے ہیں اور نہایت منت سماجت اور لجاجت سے مشاعرے کی صدارت کی درخواست کرتے ہیں جو انہیں کے اہتمام سے ہو رہا تھا۔ علامہ کیفی اپنی بیماری اور جسمانی ناقابلیتوں کا ذکر کر کے فرماتے ہیں "تم دیکھتے ہی ہو جو میرا حال ہے کھلی جگہ میں مشاعرہ، رات کا وقت اور میرا یہ حال!" بہت معذرت کی مگر وہ نہ مانے۔ آخر یہ طے پایا کہ مشاعرے کے وقت سے کچھ پہلے وہ آئیں گے اور علامہ کیفی کو لے جائیں گے۔ اور یہ کہ علامہ موصوف صرف مشاعرہ افتتاح کر کے اور اپنی نظم سنا کے واپس پہنچا دیئے جائیں گے۔ پندرہ بیس منٹ سے زیادہ ان کو وہاں نہیں رہنا پڑے گا۔ اگلے دن داعی نے ایک دفعہ سے زبانی قرارداد کی توثیق و یاددہانی کی اب وہ دن اور وقت آیا مگر نہ کوئی آپ کو لینے آیا نہ کسی قسم کی اطلاع و پیغام ہی آیا۔ ان اگلے دن اخباروں سے معلوم ہوا کہ وہ مشاعرہ ہوا اور خوب ہوا۔

ایک مہینے بعد راجی صاحب آئے مگر انہوں نے مشاعرے کے متعلق اپنی اس عہد شکنی کا ذکر تک بھی نہیں کیا۔ آپ نے جو کچھ ان کا کام تھا وہ کر دیا اور وہ چلے گئے۔ تقریباً دو مہینے بعد وہ پھر آئے ان کی فرمائش جو ادبی نوعیت کی تھی وہ پوری کر کے جب جانے لگے تو علامہ کیفی نے ان کو روکا اور فرمایا "تم دیکھ ہی رہے ہو کہ میں بوڑھا آدمی ہوں ایک زمانہ دیکھا ہے اور ہزاروں آدمیوں کو پرکھا ہے تم کو یہ بھی معلوم ہے کہ لوگ مجھے علامہ بھی کہتے ہیں علامہ وعلامہ تو میں نہیں مگر علم نفسیات کو میں نے بہت اچھی طرح پڑھا ہے لیکن تم نے مجھے خبردار کر دیا کہ اس شعبہ میں میری تحقیق اور مطالعہ ناقص ہے۔ میاں کیا تم بھول گئے کہ پرسوں ایک دن تم نے مجھ سے اس روز مشاعرے کی شرکت کا وعدہ لیا اور اگلے دن تحریر سے اس کی توثیق و یاددہانی بھی کی۔ لیکن مشاعرے کے وقت تم کو وہ سب کچھ بھول گیا۔ اس کے بعد نہ زبانی نہ تحریر کے ذریعہ اس عہد شکنی کی معذرت کی۔ ایک مہینے بعد آئے تو بھی اس کا ذکر نہیں اب پھر آئے تو اپنا کام کر کے جا رہے تھے کہ میں نے روکا۔ میں حیران ہوں کہ تم نے مجھ کو کیا سمجھا۔ دونوں ملاقاتوں کے وقت میں تمہارے چہرے کو غور سے دیکھتا رہا نہ اس پر شرم کی سرخی تھی نہ آنکھوں میں جھکاؤ تھا نہ ہچکچاہٹ کا کوئی پسینہ تمہاری پیشانی پر تھا۔ یہ تو ایسی ہی بات ہوئی کہ کوئی اپنے نوکر سے کہے کہ پانی کا گلاس لاؤ۔ جب وہ لائے تو کہا جائے لے جاؤ کس نے مانگا تھا" راجی صاحب کچھ کہنے کو ہوئے مگر کیفی صاحب نے ذرا سخت آواز سے ان کو روک دیا اور فرمایا "آپ کی معذرت کی میعاد کبھی کی گذر چکی ہے۔ میں اس سلسلہ میں اب ایک لفظ بھی آپ کی زبان سے نہیں سننا چاہتا۔ میں نے اپنے ذہن میں فیصلہ کر لیا ہے کہ تیمور اور نادر کی فہرست میں آپ کا نام لکھا جانا چاہئے۔ احساسات اور جذبات پر تسلط آپ کو ہے وہ آپ کو اس کا مستحق بناتا ہے۔ کہا جاتا ہے نادر کا ہاتھ میں ایک سال تک سخت خارش رہی مگر اس نے ایک دفعہ بھی کھجلایا نہیں۔ اب میں نے آپ کی نسبت آپ کے معاملہ میں یہ فیصلہ کیا ہے کہ ادبی امداد تو یہاں تک ممکن ہو گا روکی نہیں جائے گی لیکن آپ کی کسی بات پر اعتبار نہیں کیا جائے گا۔"

حضرت فرمایا کرتے تھے "بعضوں کا خیال ہے کہ میں جھگڑالو یا طبیعت کا نہایت فیاض ہوں یہ دونوں باتیں غلط ہیں۔ جو کوئی میرے ساتھ کسی قسم کی بدی کرے میں اس کو بھولتا نہیں نہ مجھے غصہ آتا ہے۔ لیکن انتقام کو میں اپنے سے نیچے اور اپنی توہین سمجھتا ہوں" بارہا آپ نے اشعار میں فرمایا ہے اور آپ کا عمل بھی اسی اصول پر ہے کہ بدی کے بدلے میں بدی کرنا بدی کی زندگی کو بڑھانا ہے گناہ نہیں۔ کسی شخص نے بری بات کہی اب اس کا جواب دینا گویا اس برائی میں شرکت کرنا ہے۔

جنوری ۱۹۵۴ء میں آپ کی سالگرہ کے جشن کے موقع پر چار ہزار کی تھیلی جو پبلک کی طرف سے آپ کو پیش کی گئی وہ رقم آپ نے ادبی کاموں اور اداروں کی امداد کے لئے صرف کرنے کو بطور امانت منتظمان تقریب کے سپرد کر دی اور اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے فرمایا "میرے متعلق احباب میں بعض غلط فہمیاں بھی ہیں۔ ایک ان میں سے یہ ہے کہ میں امیر آدمی ہوں۔ جو رقم ابھی پیش کی گئی ہے اتنا روپیہ کبھی میرے دستخط کے تحت نہیں ہوا۔ لیکن میں جس طرح چاہوں چار ہزار روپیہ صرف کر دوں۔ یہ رقم علمی اور ادبی ہی کاموں میں صرف ہونی چاہیئے۔"

یہ سن کر مجھے یاد آیا کہ آپ نے کبھی فرمایا تھا کہ میری زندگی ایسی رہی ہے کہ ذکر کے قابل لین دین کی صورت کبھی پیدا نہیں ہوئی۔ ہاں مجھے اس وقت قلق ہوتا تھا جب پیسے کی کمی کی وجہ سے میں اپنے مطلب کی کتاب خرید نہیں سکتا تھا۔ یا جب میں کسی اصلی حاجت مند کو تکلیف میں دیکھتا اور اپنی جیب کو خالی پاتا۔

سیاسی جد و جہد اور حصول آزادی کے سلسلہ میں علامہ موصوف کے مساعی کسی سے کم نہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ محض کہہ دینے اور غل غپاڑہ مچانے کی آوازیں ان کے یہاں نہیں ہیں۔ چونکہ جو لوگ بہ حصول بجا کر ناموری حاصل کرنا چاہتے ہیں انہوں نے آج تک دنیا میں کوئی کام کر کے نہیں دکھایا۔ ہندو مسلمانوں میں باہمی اتحاد اور رواداری کی ترقی ان کی زندگی کا مقصد اعظم رہی ہے۔ اس بارے میں نہ صرف تحریر اور تقریر بلکہ ان کا عمل اور برتاؤ شاہد ہیں ایسے آدمی دنیا میں کم ملیں گے جن کے قول اور فعل میں مکمل ہم آہنگی ہو۔ پچھلے بیس تیس برسوں میں خاص کر حصول آزادی اور بٹوارے کے سلسلہ میں، وقت کے طوفان نے جب

قدم ہو استوار سمجھے جاتے تھے ہلا دیے، لیکن علامہ کیفی کے اصول اور طرزِ عمل میں سرِ مو بھی فرق نہ آیا۔ اس طوفان کے ابتدائی زمانے میں یہ منحوس خبر بھی کسی طرح شائع ہو گئی تھی کہ موصوف لال پور میں قتل کر دیے گئے۔ اس پر ہندو اخباروں کے مقابلے میں مسلم پریس کی آواز زیادہ جگر گداز اور اندوہناک تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ خبر غلط نکلی جیسی توکل کی بات ہے کہ آپ کی ۸۸ ویں سالگرہ کی تقریب میں پاکستان کے مشہور ادیب و صحافی مولانا عبد المجید صاحب سالک نے یہ فرمایا: "حضرت کیفی کے مداح ہندوستان کی بہ نسبت پاکستان میں بہت زیادہ ہیں" میرے خیال میں علامہ موصوف کی صلح پسندی، عدیمانہ زندگی اور باہمی رواداری سے متعلق اس سے زیادہ بہتر شہادت اور کیا ہو سکتی ہے۔

علامہ موصوف کی قابلیت اور استعداد جس قدر جامع ہے اسی قدر ان کے اخلاق وسیع اور ان کا دل فراخ ہے وہ ہندوستان کے کسی باشندے کی عام اس سے کہ اس کا مذہب و ملت کیا ہے تحقیر و توہین گوارا نہیں کر سکتے۔ حال کی بات ہے کہ دہلی میں جشنِ جمہوریت پہلی دفعہ منایا گیا۔ لال قلعہ کے دیوانِ عام میں جشن سے متعلق ایک مشاعرہ منعقد ہوا جس کے افتتاح کی ذمہ داری موصوف سے منسوب تھی۔ چنانچہ آپ وقت پر تشریف لائے۔ دیوانِ عام بہت خوبصورتی سے سجایا گیا تھا آپ نے ادھر ادھر انتظامات دیکھ کر پوچھا کہ صدر اور شعراء کے پڑھنے کی جگہ کہاں ہے؟ منتظمین نے "شاہ نشین" کی طرف اشارہ کیا۔ "شاہ نشین" وہ مقام ہے جہاں حضرت بادشاہ رونق افروز ہوا کرتے تھے۔ اتفاق سے راقم اس وقت علامہ کے قریب تھا۔ میں نے دیکھا کہ آپ کا مرجھایا ہوا چہرہ غصہ سے لال ہو گیا۔ جذبات اس قدر غلبہ آور ہوئے کہ مشکل سے یہ الفاظ ان کی زبان سے ادا ہو سکے "مسلمانوں کے نزدیک بادشاہ ظل اللہ (خدا کا سایہ) ہوتا ہے اور پھر بہادر شاہ جس کو تم لوگ اولین جنگِ آزادی کا لیڈر مانتے ہو اس کی نشست کی جگہ کی بے حرمتی میں برداشت نہیں کر سکتا۔" پاس کے لوگوں نے بھی یہ سنا ان کے مزاج بھی بھڑکنے لگے تھے اور منتظم گھبرائے ہوئے تھے کہ آپ کے واپس چلے جانے سے تقریب ہی درہم برہم نہ ہو جائے۔ غرضیکہ منتظموں کی از حد لجاجت اور معذرت کے بعد آپ نے یہ منظور کیا کہ وہ "شاہ نشین" پر جا کر مشاعرہ کا افتتاح کر دیں گے اور جو نظم اس موقع کے لیے لکھی تھی وہ بھی اسی وقت پڑھ دیں گے مگر وہاں بیٹھیں گے نہیں۔ چنانچہ آپ نے بصد پیچ و تاب "شاہ نشین" پر جا کر مشاعرہ کا افتتاح کیا اور کھڑے کھڑے نظم پڑھی۔ شری شنکر پرشاد صاحب چیف کمشنر دہلی نے جو صدرِ مشاعرہ تھے بہت زور دیا کہ آپ بیٹھیں مگر آپ چپ چاپ الٹے پاؤں نیچے اتر آئے۔ طبیعت اتنی بے مزہ ہو گئی تھی کہ فوراً ہی میری ہمراہی میں مکان پر چلنے کا ارادہ ظاہر فرمایا۔ سواری کا انتظام قلعہ سے باہر تھا۔ رات کا وقت اور سردی کا موسم پھر دیوانِ عام سے قلعہ کے لاہوری دروازے تک کا راستہ کوئی فرلانگ سے کم نہیں اور آپ کی یہ پیرانہ سالی اور بیماری اس پر مستزاد۔ میں نے مؤدبانہ عرض کیا کہ قبلہ میں آپ کو اپنی پیٹھ پر آرام سے لے چلتا ہوں۔ فرمانے لگے "نہیں نہیں تو سید زادہ ہے، کیوں مجھے گنہگار کرتا ہے؟" آخر نانے اور میرا ہاتھ تھامے ہانپتے کانپتے قلعہ کے باہر پہنچے وہاں ایک ہنگامہ تھا کوئی سواری نہ مل سکی۔ آخر سائیکل رکشا پر سوار ہو چلے۔ راستہ اتنا ناہموار تھا کہ ہچکولے کھاتے کھاتے سارا بدن ٹوٹ گیا اور خدا خدا کر کے آپ کی قیام گاہ "سری نواس" ۱۷، علی پور روڈ پہنچے۔ جب آپ کو پہنچا کر میں واپس ہونے لگا تو ارشاد ہوا "میاں تمہیں معلوم ہے میں جتنی دیر "شاہ نشین" پر کھڑا رہا محسوس ہوا کہ انگاروں پر کھڑا ہوں اور جانتے ہو راستے کی یہ تمام صعوبتیں اتنی دیر کھڑے ہونے کا کفارہ ہیں۔" اللہ اللہ یہ اخلاق اور یہ تہذیب اب کہاں؟ زمانہ اپنا ورق الٹ چکا ہے وہ دور ہی پلٹ گیا ہے اور ماحول کا وہ سانچہ ہی ٹوٹ گیا ہے جس میں ڈھل کر آدمی انسان بنتے تھے۔ خدا ہماری اس ملی جلی گنگا جمنی تہذیب کی جھلملاتی شمع کو بادِ حوادث کے جھونکوں سے بچائے رکھے کہ اس کے بعد اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ یہ مشاعرہ دو دن تک ہوتا رہا مگر دوسرے روز منتظمین کو "شاہ نشین" چھوڑنا پڑا۔

اکتوبر ۱۹۴۶ء کا واقعہ ہے کہ شیخ مستجاب علی صاحب نے اپنی لڑکی کی شادی میں جے پور علامہ کیفی کو شرکت کی دعوت دی۔ شیخ مستجاب علی کے والد سے کیفی صاحب کے دوستانہ ہی نہیں بلکہ برادرانہ تعلقات تھے اور ان تعلقات میں ایک عاشقانہ وارفتگی سی پیدا ہو گئی تھی۔ مستجاب علی صاحب کے والد کے انتقال کو نصف صدی سے زیادہ زمانہ گذر چکا ہے اور علامہ کیفی کی پیرانہ سالی انتہائی منازل کی طرف بڑھ رہی تھی موصوف نے مستجاب علی صاحب

کی دعوت قبول کی اور باوجود ضعف و نقاہت سچے پور شادی میں شرکت فرمائی اور پچاس روپے دُلہن کو سلامی میں دیئے۔ اہلِ سچے پور نے علامہ کے آخر میں کالج کے سب سے بڑے ہال میں ایک بزمِ مشاعرہ موصوف ہی کی صدارت میں منعقد کی۔ مشاعرے کے سب سے آخر میں مولانا اطہر ہاپوڑی کی غزل پڑھی گئی۔ مولانا اطہر ہاپوڑی ایک کہنہ مشق شاعر ہیں اور ان کا شمار صفِ اول کے اساتذہ میں ہے اور ان کی ادبی خدمات سچے پور ہی نہیں بلکہ سارے راجستھان میں بے بہا ہیں۔ نواب ممتاز الدولہ بہادر رئیس ٹونک بھی اسی مشاعرہ میں تشریف فرما تھے جن کی غزل پڑھی جانے والی تھی کہ علامہ کیفی نے فرمایا "مولانا اطہر کی غزل کے بعد کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اپنی غزل پڑھے۔ مشاعرہ مولانا اطہر کی غزل پر ختم ہو چکا ہے اور اب میں کسی کو اجازت نہیں دے سکتا۔" چونکہ نواب ممتاز الدولہ ریاست کے رکنِ اعظم اور شعراء نواز تھے اس لئے اصرار کیا گیا کہ نواب صاحب کی غزل پڑھوایا جائے۔ ان کے سیکرٹری جو غزل پڑھنی چاہتے تھے انہوں نے کہا کہ یہاں کا یہی طریقہ ہے کہ نواب صاحب کا کلام بوجہ رکنِ اعظم ریاست ہونے کے سب سے آخر میں پڑھا جاتا ہے۔ علامہ نے فرمایا "یہ وجہ میرے لئے قابلِ تقلید نہیں۔ میں ہرگز ہرگز اجازت نہیں دوں گا۔ میری صدارت میں ایسا نہیں ہو سکتا۔ نواب صاحب، نواب صاحب ہیں اگر ہمارا لحاظ چاہتے پور نہیں پڑھنا چاہیں تو میری صدارت میں یہ ناممکن ہے۔" اس کے بعد مولانا اطہر صاحب نے خود اسٹیج پر آکر علامہ سے درخواست کی کہ نواب صاحب کی غزل پڑھوا دیجئے کیونکہ وہ اُردو کے بڑے حامی ہیں اور شعراء پر ہمیشہ ان کے لطف و کرم کی بارش رہی ہے نیز ماہانہ بزمِ سخن کا جلسہ بھی نواب صاحب کے دولت کدہ پر ہوتا ہے جس سے اُردو کی ترقی متصور ہے۔ یہ سب سُن کر بھی علامہ کیفی نے فرمایا کہ "میں ان دلائل کو قبول کرتے ہوئے بھی اپنی صدارت میں آپ کے بعد کسی کو پڑھنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ میں مشاعرہ ختم کر چکا ہوں اور صدارت کے فرائض بھی ختم ہو چکے ہیں۔" یہ کہہ کر دوسری کرسی پر بیٹھ گئے اور مولانا اطہر صاحب سے کہا کہ "اب آپ اس کرسیٔ صدارت پر تشریف رکھئے۔" لیکن مولانا اطہر صاحب نے بھی اس کو سوء ادب خیال کر کے یہ جرأت نہیں کی کہ علامہ کے بعد ان کی کرسی پر بیٹھیں۔ غرضیکہ نواب صاحب کی غزل ان کے سیکرٹری نے پڑھ کر سُنائی۔ اس حالت میں کہ کرسیٔ صدارت خالی تھی۔ اسے فرقِ مراتب کہئے یا اصول پرستی۔ دراصل علامہ مرحوم کی وضعداری کی یہ ایک معمولی مثال ہے۔ زندگی کا جو ضابطہ اور اصول انہوں نے بنا لیا تھا کیا مجال کہ دنیا کی کوئی طاقت اسے ادھر سے اُدھر کر سکے۔

جو حضرات علامہ کیفی کے ادبی کارناموں ان کے بحرِ علم و جہانگیر واقفیت اور ہمہ گیر ادراک سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں جو تبحر موصوف کو مشرق اور مغرب کے قدیم و جدید ادب اور ثقافت میں حاصل تھا ان کو بھی یہ دیکھ کر ایک قسم کی حیرت ہوتی ہے کہ ہندی اور ہندو قوم پر بھی ان کا احسان کم نہیں۔ ہندی کے حوشیے اور منتسب ہندوانہ ان کو "پنڈت" کی جگہ "مولوی" خطاب دیں، خواہ مسلمان پکاریں لیکن جو احسان ان کا ہندی زبان اور ہندو قومیت پر ہے وہ فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی حیثیت واقعاتی اور تاریخی ہے جس کی مجمل تفصیل یہ ہے کہ ۱۹۰۵ء میں انہوں نے ایک مسدس تصنیف کیا جس میں ہندوؤں کی گذشتہ زمانے کی قومی عظمت، شائستگی اور ادب و مختلف علوم میں ایجاد و ترقی کا ذکر کر کے اس وقت کی گری ہوئی حالت کی سچی تصویر کھینچ کر ہندوؤں کی غیرت اور خودداری کو جگایا اور رشک و حسد سے بچتے ہوئے ترقی کا سیدھا راستہ بتایا۔ خواجہ حالی اپنے مسدس میں مسلمانوں کے بارے میں جو کچھ لکھ چکے تھے وہ آپ کی نظر میں تھا ہی آپ نے اس پر یہ اضافہ کیا کہ ایک سرسری سا پروگرام آئندہ کے لئے پیش کیا۔ یہ نوٹ کرنا ضروری ہے کہ اس وقت تک ہندی زبان میں قومی ادب اور وطنی شاعری کی بنیاد نہیں پڑی تھی۔ لوگ مئے غفلت کے نشے کے خمار میں ہی گرفتار تھے اور نہیں جانتے تھے کہ اُٹھ کر کچھ کام کریں بلکہ پڑے ہوئے جمائیاں اور انگڑائیاں لیتے رہیں۔ علامہ کیفی کی تصنیف "بھارت درپن" نے ہند و ذہنیت کو زور سے جھنجھوڑا اور اس کی دُکھتی رگوں کو ایسا مسوسا کہ بیداری کے آثار پیدا ہونے لگے۔ ہندوؤں کا شعور اس جانچ میں پڑ گیا کہ ان کی موجودہ حالت گذشتہ زمانے کے مقابلہ میں کتنی گری ہوئی ہے۔ مختصر یہ کہ جو بیج بھارت درپن نے بویا تھا وہ پنپتا رہا اور نتیجہ میتھلی شرن گپت کی کتاب بھارت بھارتی کی شکل میں بار آور ہوا۔ بھارت درپن کے دس بارہ برس بعد شائع ہوئی۔ گپت جی نے اپنی کتاب کے دیباچہ میں دونوں مسدسوں یعنی مدوجزرِ اسلام اور بھارت درپن سے مستفید ہونے کا اقرار کیا ہے۔ ان کے قلم سے نکلے ہوئے یہ چند الفاظ ہیں

کافی ہیں :

"میں نے حالی اور کیفی کی مسدسوں سے بھی لابھ (فائدہ) اٹھایا ہے اور میں ان کے پرتی (نزدیک) ہاردِک (دلی) دھنیہ باد (شکریہ) پرگٹ (ظاہر) کرتا ہوں۔"

حقیقت یہ ہے کہ قومی اور وطنی شاعری کے باب میں علامہ کیفی ہندی کے استاد تسلیم کئے جانے چاہئیں۔

حضرت عزیز لکھنوی کا مجموعۂ کلام "گل کدہ" شائع ہوا۔ انہوں نے تبصرہ کے لئے ایک کاپی مولانا ابوالکلام آزاد کی خدمت میں بھی۔ مولانا آزاد نے اس پر دو اعتراض وارد کئے ایک یہ کہ لفظ "تحریک" آمادہ کرنے کے معنی میں فارسی میں مستعمل نہیں ہے بلکہ فارسی اور عربی میں اس کے معنی حرکت کے ہیں۔ دوسرا اعتراض یہ تھا کہ لفظ "مستی" ایک مبتذل لفظ ہے اور عزیز لکھنوی چونکہ غالب الکحول کے پیرو ہیں اس لئے ان کو یہ لفظ استعمال نہیں کرنا چاہئے تھا۔ مصرعہ یہ تھا ——— "سامنے آئنہ تھا مستی تھی"

عزیز لکھنوی نے پہلے اعتراض کی تردید میں لفظ "تحریک" کی سند میں عرفی کا شعر پیش کیا اور لفظ "مستی" کے متعلق مولانا ابوالکلام آزاد کے اعتراض کو قبول کر لیا۔ مولانا اطہر ہاپوڑی نے مولانا آزاد کی تردید میں ایک مضمون لکھا جو رسالہ مخزن میں شائع ہوا۔ اس میں کہا گیا تھا کہ لفظ "تحریک" کے متعلق جو سند عزیز صاحب نے پیش کی ہے وہ کافی ہے۔ لفظ "مستی" کے متعلق مولانا اطہر نے اخذ و ترک کا فلسفہ پیش کیا اور لکھا کہ کسی لفظ کی ذات میں ابتذال نہیں ہوتا۔ یہ شاعر اور ادیب کا فرض ہے کہ اس کو قرینے سے استعمال کرے۔ خود مرزا غالب کے اس شعر میں ؎

ہم سے کھل جاؤ بوقتِ مے پرستی ایک دن
ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کے عذرِ مستی ایک دن

وہ ابتذال موجود ہے جس کی طرف مولانا آزاد نے اشارہ کیا ہے اور پھر مولانا اطہر نے اپنا یہ شعر پیش کیا ؎

ان آنکھوں میں مستی بھی ہے، شوخی بھی، حیا بھی!
لیکن نہیں دیکھی تو مروّت نہیں دیکھی

اور لکھا کہ اس شعر میں لفظ مستی بغیر عطف و اضافت نظم ہوا ہے۔ لیکن ابتذال کا شائبہ بھی نہیں۔ اس مضمون کے شائع ہونے کے بعد منشی اعجاز علی شوق قدوائی ایڈیٹر آزاد نے ایک مضمون لکھا اور کہا کہ "عزیز لکھنوی ہیں اور آزاد دہلوی اور دونوں اپنی زبان میں پختہ اور ماہر ہیں۔ اطہر ایک ہاپوڑ کا رہنے والا آدمی جو نہ دلی کی زبان سے واقف نہ لکھنؤ کی، اس کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ دو اہلِ زبان ادیبوں کے معاملہ میں دخل دے۔ مولانا اطہر نے تو اس بات کو قابلِ اعتنا نہیں سمجھا لیکن علامہ کیفی نے مولانا اطہر کی تائید میں ایک مضمون لکھا جو مخزن میں شائع ہوا۔ جس میں موصوف نے مشورہ دیا کہ اگر ہمیں اُردو کو بین الاقوامی زبان بنانا ہے تو یہ صوبائی تعصبات اور اہلِ زبان اور زبان دانی کے دعووں سے منہ موڑ کر تمام اختلافات کو ختم کرنا چاہئے اور جو خلیج ہندوستانی و پنجابی، دہلوی و لکھنوی حضرات کے درمیان حائل ہے ہمارا فرض ہے کہ اسے پاٹ کر اُردو کے دامن کو وسیع کریں تب ہی تو علامہ کیفی "بابائے اُردو" ہیں کہ وہ تمام دنیائے اُردو کو ایک ہی کنبہ اور برادری سمجھتے ہیں۔ مجھے یاد آیا کہ ایک مرتبہ علامہ نے شوکت سبزواری کو خط میں لکھا تھا کہ :

"جہاں تک اُردو کا تعلق ہے میں ہندوستان و پاکستان کو دو ملک نہیں سمجھتا"

پہلے بھی ذکر آیا ہے کہ ہندی والے آپ کو طنزاً "مولوی کیفی" لکھا کرتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ آپ جو دیکھتے یا پڑھتے ہیں وہ ذہن میں محفوظ ہو کر شعور میں جذب ہو جاتا ہے ان کے مجموعۂ کلام واردات میں ہندو اور مسلمان بزرگوں اور واجب التکریم شخصیتوں کی شان میں بہت سی نظمیں ہیں یہاں صرف ایک کا ذکر کیا جائیگا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی زندگی کے ایک واقعہ کا ذکر علامہ شبلی نے اس طرح کیا ہے کہ آپ چند آدمیوں کے ساتھ کسی جگہ

جا رہے تھے۔ رستے کے کنارے پر ایک سرسبز درخت دیکھ کر آپ کھڑے ہو گئے اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ بڑبڑا رہے تھے کہ کاش میں بھی ایک درخت ہوتا۔ لوگوں نے حیرانی سے پوچھا کہ حضرت کیا بات ہے؟ ارشاد ہوا اس درخت کی زندگی پر غور کرو۔ اس کی افادیت اور فیض رسانی تقلید کے قابل ہے۔ اس کا سایہ، اس کے پتے، اس کا پھل کتنے انسانوں اور حیوانوں کی ضرورتوں کو پورا کرتے ہیں یہاں تک کہ جب یہ اس قابل نہیں رہتا کہ اس کی ذات سے استفادہ ہو سکے تو کڑیوں اور تختوں کی صورت میں تمہارے گھر کی حفاظت کرتا ہے اور تم کو دھوپ اور بارش کی تکلیف سے بچاتا ہے۔ ہم انسانوں میں کتنے ایسے ہیں جو تمام عمر بلکہ مرنے کے بعد بھی خلق اللہ کی خدمت کرتے ہیں؟ یہ نظم اس قابل ہے کہ بلا قید مذہب و ملت اس کا مضمون ہر شخص کا جزو اعظم ہونا چاہیئے۔ مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ اس وقت تک بے شمار ہندو مسلمان شاعر اور سخن گو ہو چکے ہیں اور صحابہ کرام کے حالات اور سوانح عمری سبھی کو معلوم ہیں مگر آج تک کسی کو نہ سوجھا کہ اس واقعہ کو نظم کا جامہ پہنائے۔ جی چاہتا تھا کہ وہ نظم یہاں نقل کروں مگر طوالت کے خوف سے صرف آخر کا بند پیش کیا جاتا ہے:

بتاؤ تم میں ایسا رحم دل انسان ہے کوئی	شجر کی مثل فیض اور شفقتوں کی کان ہے کوئی
بدی کا بدلہ دے نیکی یہی کیا آسان ہے کوئی	ہے کوئی جس سے ایذا کا نہیں امکان ہے کوئی

حضور ایزدی میں بار بسندہ کو اگر ہوتا
یہی درخواست کرتا کاش میں بھی اک شجر ہوتا

"بہ ہر شئے از ہر شئے می خیزد" والا مضمون ہے۔ دراصل علامہ کیفیؔ کی زندگی ایک عظیم داستان ہے اور میں حیران ہوں کہ ان کی کن کن باتوں کا ذکر کروں کہ ان کی بات بات ہمارے لئے پند و موعظت کا ایک دفتر ہے لہٰذا ؎

سفینہ چاہیئے اس بحرِ بیکراں کے لئے

انگریزی میں آپ کی قابلیت نہایت اعلیٰ درجے کی ہے۔ انگریزی ادب پر آپ اتنے ہی حاوی ہیں جتنے اپنے اردو اور فارسی ادب پر۔ فرائڈ اور مارکس کے نظریوں پر انگریزی کے پروفیسوں سے بحث کرتے ہوئے میں نے ان کی طراری اور بیدار مغزی دیکھی ہے۔ یونیورسٹیوں میں آپ کے توسیعی لکچر اور آل انڈیا اورینٹل کانفرنس وغیرہ میں مقالے تحقیق اور استدلال کا خزانہ ہوتے ہیں۔ ان کی نظیر چند مخصوص شخصیتوں کے سوا انگریزی تعلیم یافتوں میں کم ملتی ہے۔

آپ کی اردو زبان کی واقفیت ابتدا سے لے کر آج تک کی ہے اور اس کا مطالعہ حال کے سائنٹیفک طرز اور اصول پر ہے۔ چونکہ سنسکرت اور عربی سے بھی آپ بالکل ناواقف نہیں اس لئے اپنے مقالوں، خاص کر اپنی عہد آفریں کتاب کیفیہ میں زبان سے متعلق جہاں کہیں آپ کسی امر سے بالمقابل بحث کرتے ہیں تو پڑھنے اور سننے والے حیران رہ جاتے ہیں۔ آپ کی تحقیق کا طریق بھی اپنا ہی ہے۔ راقم کو یاد ہے آپ نے فرمایا تھا اگرچہ سنسکرت شاعری میں سولہ سنگار کا وضاحت سے ذکر ہے۔ لیکن اس میں مہندی کا لفظ نہیں آیا ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ بعض دوسری چیزوں کی طرح مہندی بھی باہر سے آئی ہوئی ہے۔ یہ بات راقم کی سمجھ میں نہیں آئی کیونکہ مہندی شادی وغیرہ تہواروں کے مراسم میں ہندو مسلمانوں کے یہاں ایسی رچی بچی چیز ہے کہ باہر سے آئی ہوئی نہیں معلوم ہوتی ہیں چپ ہو گیا اور بات آئی گئی ہوئی۔ ایک دن میں خدمت میں حاضر تھا کہ دہلی کا ہفتہ وار اخبار ریاست مورخہ ۸ ستمبر ۱۹۵۸ء آیا۔ آپ کام میں مصروف تھے۔ مجھ سے کہا دیکھو اس میں کوئی خاص بات ہے؟ ریاست کے ایڈیٹر سردار دیوان سنگھ مفتون اپنے قارئین کے جذبات کا پورا لحاظ رکھتے ہیں۔ ان کے اخبار میں "جذبات مشرق" ایک مستقل عنوان ہے۔ جس اشاعت کا ابھی ذکر ہوا ہے اس میں عنوان مذکور کے نیچے سولہ سنگار مخفی عنوان تھا اور بھاشا کے مشہور شاعر کیشو کا ایک مشہور کبت دیا ہوا تھا جس میں سولہ سنگار کی اشیاء گنائی گئی تھیں۔ ان میں ایک لفظ مہاوک بھی آیا تھا جس کے معنی مہندی لکھے ہوئے تھے۔ میں نے علامہ موصوف کو اس کبت کی طرف متوجہ کیا۔ آپ نے فرمایا یہ ترجمہ غلط ہے۔ مہندی یقیناً مسلمانوں کے ساتھ

ہندوستان آئی۔ یہاں دلہن اور جوان عورتوں کے ہاتھ پاؤں سُرخ رنگ سے ضرور رنگے جاتے تھے مگر وہ لاکھ کا ایک مرکب ہوتا تھا جسے مہاور کہتے ہیں۔ مہاور کی ٹکیاں پہلے پنساریوں کے یہاں بکا کرتی تھیں آج کل کا حال معلوم نہیں۔ آپ نے ہندی ڈکشنری (المارا) ہی سے منگوائی اور مجھ سے فرمایا اس میں وہ لفظ دیکھو۔ چنانچہ اس میں بھی مہاور کے معنی لاکھ یا مہاور لکھے تھے۔ کمار سمبھو جس کا اردو منظوم ترجمہ حضرت منور لکھنوی کا شائع ہوا ہے نکالا گیا تو معلوم ہوا کہ پاربتی جی کے عروسی سنگار کی اشیاء میں بھی لاکھ اور مہاوری کا ذکر ہے۔ دلی یونیورسٹی کے سنسکرت شعبہ کے صدر سے آپ نے درخواست کی کہ کام سوترا میں پتہ لیں کہ مہندی کا ذکر ہے یا نہیں۔ وہاں سے بھی نفی میں جواب ملا۔ آیور وید کی کتاب مفردات میٹیریا میڈیکا سے بھی استفادہ کیا گیا اس میں بھی مہندی کا پتہ نہ چلا۔ آخر ماننا پڑا کہ مہندی اصلی ہندوستانی چیز نہیں ہے۔ ان تحقیقات کی وجہ سے شہر کے ایک حلقہ میں اس بات کا چرچا ایک مدت تک رہا۔

علامہ موصوف کی روزانہ زندگی سادگی کے ساتھ کچھ ایک غیر معمولی رہی ہے۔ فرماتے ہیں "جب سے ہوش سنبھالا قبض کا علم ہوا۔ جوں توں کام چلتا رہا آخر تیس برس بعد سے اس نسخے پر کاربند ہوں کہ علی الصباح بغیر کچھ کھائے چائے پیتا ہوں جس میں دودھ کی مقدار کم ہوتی ہے اور پھر حقہ کا شغل ہوتا ہے۔ اس عمل سے قبض کی شکایت رفع ہو گئی۔ آپ ناشتہ نہیں کرتے، بارہ بجے کے قریب کھانا جسے لنچ کہئے کھاتے ہیں۔ ہاں تیسرے پہر کو چائے کے ساتھ میوہ یا کوئی کھانے کی چیز ضرور ہوتی ہے۔ پھر موسم کے مطابق رات کے آٹھ نو بجے رات کا کھانا۔ دودھ کا شوق نہیں ہے۔ میووں میں آم اور خربزہ بہت پسند کرتے ہیں۔ آپ کو سادہ کھانے بہت پسند ہیں۔ ضیافتی کھانوں سے گھبراتے ہیں۔ حقہ کا بہت شوق ہے۔ برسوں ان کا حقہ اور قلم برابر چلتے رہے۔ پندرہ گھنٹے نوشت و خواند کی مصروفیت انضباط کے ساتھ رہی۔ ابتدا میں ڈنڈ، مگدر کی دلچسپی ورزش اور پیدل چلنے وغیرہ کی کسرت ضرور کی تھی مگر بعد میں یہ سب چیزیں چھوٹ گئیں۔ جب کبھی ہوا خوری کا ذکر آتا تو فرماتے "اس کے لئے وقت نہیں نکالا جا سکتا۔" کھانے میں سبزیاں زیادہ پسند ہیں۔ لحم سے پرہیز نہیں لیکن اس کا استعمال کم کرتے ہیں۔ یہی حال انڈے اور مچھلی کا ہے۔ کیونکہ طبیعت سادگی پسند تھی اور اول ہی سے کردار حمیدہ کی پابندی اور بے اعتدالی ناہنجاری سے نفرت رہی جس کا نتیجہ بقول آپ کے یہ تھا کہ ڈاڑھ کی تکلیف کے سوا آپ کبھی بیمار نہیں ہوئے۔ فرماتے ہیں "بد ہضمی یا معدے کی تکلیف کبھی نہیں ہوئی۔ دلی چھوڑنے اور پنجاب جانے کے بعد بخار کبھی نہیں ہوا۔" فرماتے ہیں "شاید دائمی ادبی سرگرمی کی وجہ ہو یا کچھ، سر کے درد کی بھی شکایت کبھی نہیں ہوئی۔ منشیات اور مسکرات سے ہمیشہ پرہیز رہا۔ جہاں جہاں گئے ادبی انجمنوں کے ساتھ لٹریری سوسائٹیوں کی بھی بنیاد رکھتے گئے۔

یہ حالات ۱۹۴۷ء کی مئی تک ہیں۔ اس منحوس مہینہ میں یکایک بیماریوں کا شکار ہوئے جن سے اب تک چھٹکارا نہیں ملا ہے۔ وجع مفاصل، اختلاج قلب، اور خون کی ازحد کمی وغیرہ خاص شکایتیں تھیں۔ اگرچہ علاج اور پرہیز میں کوئی کمی نہیں تھی مگر جو تکلیفیں تھیں وہ بالکل رفع نہیں ہوئیں ان کی شکلیں بدلتی رہیں اور ان میں افراط ہوتی رہی۔ اس وقت وجع مفاصل کی ازحد تکلیف آپ کو ہے۔ مہینے میں دو تین بار نقرس اور قلب کے دورے بھی پڑتے رہتے ہیں۔ پچھلے جاڑوں میں دل اور سانس کا بہت سخت دورہ پڑا۔ کئی دن تک مایوسی کی حالت اوپر والوں پر طاری رہی۔ آپ نے کچھ نوٹ ایک صاحب کو دئیے اور کہا کہ "انہیں رکھ چھوڑو یہ آخری وقت کے لئے ہیں نہیں کہہ سکتے وہ گھڑی کتنی دیر میں آنے والی ہے۔" ہم لوگ جو ان کی دیکھ بھال کرتے تھے بہت غمگین اور مایوس ہوئے۔ دل افزائی اور تسلی کا تو کیا ذکر ہے کوئی لفظ ہماری زبان سے نہ نکل سکا۔ آپ نے کروٹ بدلوائی اور سانس کی ذرا خوشامد کر کے مسکرانے لگے۔ اب ہم کو ذرا جرأت ہوئی اور پوچھا کہ کیا بات ہے فرمائیے۔ کمزوری بہت تھی۔ دھیمی آواز میں مسکراتے ہوئے ارشاد کیا۔

"وہ عزرائیل ہو یا یم راج میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ اس نے فیض بازار کے ڈاکٹر داور سے سازش کی ہوئی ہے کہ یہ

بڈھا بڑا پاپی ہے تم اس کو زندہ رکھو تاکہ ہم اس کے اعمال کی سزا ہیں اس کو پوری دے لیں، دوزخ اس کو قبول نہ کرے گا۔"

ہم لوگ کچھ نہ کہہ سکے۔ سوائے اس کے کہ یہ آپ کیا فرما رہے ہیں اور کئی آنکھیں نم آلود بھی ہو گئیں۔

ڈاکٹر ایچ۔ آر۔ داور دہلی کے مشہور ڈاکٹر ہیں اور کیفی صاحب کے بڑے عقیدت مند اور معالج خاص ہیں۔ کیفی صاحب بھی ان پر اپنے عزیزوں کی طرح شفقت فرماتے ہیں۔ ایک دفعہ بیماری کے دوران میں ڈاکٹر داور سے اپنی محبت کا اظہار مجھ سے یوں فرمایا "بھئی اگر تمہاری جنت یا سورگ کی واقعی کچھ حقیقت ہے،

اور میں وہاں گیا بھی تو اپنے ڈاکٹر داور کو کہاں سے لاؤں گا؟"

اب یہ حال ہے کہ ضعفِ پیری تو جو ہونا چاہئے تھا ہے ہی امراض نے بہت معذور کر دیا ہے۔ زینہ چڑھنا یا دس بیس قدم سے زیادہ چلنا ان کے لئے ناممکن ہے۔ سماعت اور بصارت برائے نام باقی رہ گئی ہے۔ فرماتے ہیں کہ "یہ جو اُردو کی کہاوت ہے" بہ ہشتی اندھا دوزخی" کچھ دنوں میں یہ دونوں باتیں مجھ پر عائد ہونے والی ہیں اس لئے ہیں سمجھتا ہوں کہ مرنے کے بعد غالباً اعراف ہیں مجھ کو جگہ ملے گی" مختصر یہ کہ اب معمولی خط و کتابت بھی اپنے ہاتھ سے نہیں کر سکتے اور ہر کام میں دوسروں کی امداد کے محتاج ہیں۔ باوجود ان سب ناخواستہ عوارض کے مقدمہ، پیش لفظ، تعارف اور تقریب وغیرہ کی درخواستوں سے شاید ہی کوئی ہفتہ خالی جاتا ہوگا اور آپ ہر ایک کو کچھ نہ کچھ بھیج دیتے ہیں۔ کیونکہ آپ کو کسی کی دل شکنی گوارا نہیں۔ ادبی مشورہ اور اصلاح بھی بالکل بند نہیں ہوئی یہ کام بھی دیر سویر چلا ہی جاتا ہے۔

دیکھا گیا ہے کہ جب خاص احباب یا قریبی رشتہ داروں میں سے کوئی آپ کو تاکید کرتے ہیں کہ اب تو ادبی جھنجھٹ کو چھوڑ دو اور رہے سہے قوٰی کی حفاظت کرو تو آپ مسکرا کر جواب دیتے ہیں کہ "میں بدترین سے خوب ترین استفادہ کرنے کا قائل ہوں۔ میاں جب میں جانتا ہوں کہ وہ عناصر جن سے میرا جسم بنا ہے بتدریج کے ساتھ زوال اور تحلیل کا شکار ہو رہے ہیں تو کیوں نہ میں باقی ماندہ لمحوں کو ادب کی خدمت کے لئے صرف کروں" غالباً خواجہ میر درد ایسے ہی موقع کے لئے فرما گئے ہیں ؎

ساقیا یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ
جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

اگر مدح منظور نہ سمجھی جائے تو میں بلا تامل کہوں گا کہ علامہ کیفی کی ہستی مغتنماتِ زمانہ میں سے ہے۔ آپ کے اوصاف کیا بہ اعتبار ایک ادیب، عہد آفریں شاعر اور نقاد کے ایسے عالی قدر اور ممتاز ہیں جن کی نظیر مشکل سے ملے گی اور کیا بہ لحاظ ایک شہری کے آپ کے اخلاق ایسے حمیدہ، مشرب اتنا وسیع اور دل اتنا فراخ ہے کہ جن کو آپ سے کچھ بھی واسطہ پڑا ہے بلا قید قوم و ملت آپ کی شان میں یہ شعر دہرا کر کچھ مایوس ہو جاتے ہیں کہ آپ کے بعد کیا ہوگا اور کسے ہندوستان کی شرافت اور ثقافت کے اعلیٰ نمونہ کی طرح پیش کیا جا سکے گا۔

کفر کافر را و دیں دیندار را
ذرۂ دردے دلِ عطار را

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

بلائے جانے لگے۔ پیری اور پیرزادگی نے انشا پردازی کو چمکایا اور انشا پردازی نے پیرزادگی اور پیری کو شہرت دی۔

خواجہ صاحب کی تاریخ پیدائش ۲ محرم ۱۲۹۶ہجری ہے۔ بارہ سال تک کے تھے کہ والد اور والدہ دونوں کا انتقال ہوگیا۔ بڑے بھائی نے کچھ سنبھالا، کچھ نہیں سنبھالا۔ بچپن بہت عسرت میں گزرا۔ اپنے پیروں پر کھڑے ہو جانے کے بعد تو خواجہ صاحب کو درگاہ کی آمدنی کی ضرورت کیا تھی مگر اُس آمدنی نے اُن کا ساتھ والدین کے انتقال کے بعد ہی چھوڑ دیا تھا۔ وہ آمدنی بڑے بھائی کے لئے ہی کافی نہ تھی۔

ایک دفعہ خواجہ صاحب راجہ نوشاد علی خاں تعلقہ دار جہانگیر آباد (اودھ) کو درگاہ حضرت سلطان جیؒ لے گئے۔ اُس زمانے میں خواجہ صاحب نے بستی نظام الدین کی رہائش ترک کر رکھی تھی اور دلی میں میرے ہاں رہتے تھے۔ اس لئے میں بھی راجہ صاحب اور خواجہ صاحب کے ساتھ تھا۔ درگاہوں کے دروازوں پر جوتیوں کے رکھوالے بیٹھا کرتے ہیں۔ ہم سب نے جوتیاں اُن کے سپرد کیں۔ واپس آنے لگے تو خواجہ صاحب نے رکھوالوں کو انعام دینے کی غرض سے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ اتفاق سے ریزگاری کی بجائے روپیہ ہاتھ آگیا۔ خواجہ صاحب نے روپیہ رکھوالوں کو دے دیا اور ہمیں یہ قصہ سنایا کہ بچپن میں مجھے خود یہاں بیٹھنا پڑتا تھا اور میں پیسہ پیسہ انعام کا لیا کرتا تھا۔

خواجہ صاحب عجیب غریب حوصلے کے آدمی ہیں۔ میں نے خواجہ صاحب کا وہ دور دیکھا ہے کہ اُن کی مالی حالت بُری نہیں تھی تو اچھی بھی نہیں تھی۔ لیکن دوستوں اور ملنے جلنے والوں کی مدارات میں خواجہ صاحب ایسے حوصلے سے روپیہ لٹاتے تھے کہ واقعی پھر فاقہ ہو جاتا تھا۔ اِس کا علم بھی مجھے کبھی فاقے کے وقت نہیں ہوا۔ افلاس کو ظاہر نہ ہونے دینے کا بھی خواجہ صاحب میں حوصلہ ہے اور عروج پاکر افلاس کے وقت کی باتیں بیان کرنے کا بھی وہ حوصلہ رکھتے ہیں۔ فاقے میں خواجہ صاحب کے چہرے پر ضعف کے آثار نہیں آتے تھے اور شگفتگی پژمردگی سے نہیں بدلتی تھی۔

ایک صاحب عبدالنعیم خاں نے جن کا آجکل تاج کمپنی کراچی سے تعلق ہے متعدد حضرات سے خواجہ صاحب کے متعلق مضامین لکھوائے ہیں۔ ان میں مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی کا مضمون بھی ہے۔ مرزا صاحب لکھتے ہیں :-

> میں نے فقط دو آدمی ایسے دیکھے ہیں جنہوں نے اپنے زور بل پر نیچے سے اتنے اونچے درجے تک ترقی کی اور اپنے بیتے زمانے کو نہ صرف یاد رکھا بلکہ اس کے اظہار سے نہیں شرمائے۔ ایک مولوی نذیر احمد مرحوم اور دوسرے خواجہ حسن نظامی۔ ورنہ آجکل تو جو لاہے اونچی کرسی پر بیٹھ جاتے ہیں تو باپ کو باپ کہتے شرماتے ہیں۔"

خواجہ صاحب کی ترقی کی رفتار تیز ۱۹۱۱ء سے ہوئی۔ ۱۹۱۱ء میں اُنہوں نے مصر و شام و حجاز کا سفر کیا اور سفرنامہ شائع فرمایا۔ اس سفرنامے کے علاوہ ایک چھوٹی سی کتاب شیخ سنوسی کی پیشین گوئیاں لکھی۔ اس چھوٹی کتاب کے پے درپے چھ ایڈیشن اردو میں نکلے اور گجراتی اور مرہٹی وغیرہ زبانوں میں ترجمے چھپے۔

سفرنامے کے البیلے طرز نگارش نے ادب نواز اور باذوق لوگوں کے دلوں میں خواجہ صاحب کی جگہ مستحکم کر دی۔

حجاز ریلوے کی گاڑی میں خواجہ صاحب کو حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سبز گنبد کی جھلک نظر آتی ہے۔ خواجہ صاحب لکھنا شروع کر دیتے ہیں :-

> فجر کی نماز کے بعد سے مسافروں میں خوشی کی لہر دوڑ رہی ہے کہ وہ قریب ہیں جن کے لئے یہ سفر کیا ہے۔ ذرا دن چڑھا تو کالے کالے پہاڑوں کے بیچ میں سبز گنبد کی ذرا سی جھلک دکھائی دی۔ جیسے اندھیری رات میں کہیں دور آسمان کے کنارے بجلی کوندا کرتی ہے۔ اس تجلّی نے جو کہرام مچایا اُسے بیان نہیں کیا جاسکتا۔

کلیجے پھٹے جاتے تھے۔ ہاتھ گریبانوں پر تھے۔ دل تھامتے تھے۔ کرتے چاک کرتے تھے۔ گردنیں کھڑکیوں سے باہر تھیں۔ آنکھیں ٹکٹکی باندھ رہی تھیں۔ ریل لہراتی چلی جاتی تھی۔

لے لو، اب تو صاف دکھائی دینے لگا۔ ہاں سبز گنبد ہے۔ اونچے مینار ہیں۔ مدینہ آیا۔ مدینہ آیا۔ ذرا ہم بھی دیکھیں۔ کہاں ہے۔ کیا ہے۔ کچھ سنا، آسمان والے نغمہ سرائی کر رہے ہیں۔ انجن روکو۔ پہلے وہ کیوں جائے۔ ہمیں بڑھنے دو۔ ہم اشرف المخلوقات ہیں۔ اشرف الانبیاؐ کی امت ہیں۔ بصارت اور بصیرت رکھتے ہیں۔ لو وہ رک گیا۔

ذرا دیکھنا کیسی سہانی قباؤں والے نورانی چہرے استقبال کو آئے ہیں۔ کہتے ہیں۔ اترو۔ پہلے کون سا قدم اتاروں۔ سر کے بل کیسے چلا کرتے ہیں۔ کیا یونہی چلوں۔

دل دھڑکتا ہے۔ ہاتھ پاؤں میں رعشہ ہے۔ توانائی نے جواب دے دیا۔ کیا کروں۔

لوگو! میرا ہاتھ پکڑنا۔ میں چلا۔ مجھے سہارا دو۔ میں گرا۔"

محراب حضرت زکریا علیہ السلام کے نیچے کھڑے ہو کر یہ دعا کر رہے ہیں:۔

" زکریاؑ کے رب، اپنے بندے کی ندا کو رحمت سے سننے والے! زکریاؑ نے اس محراب میں بیٹھ کر تجھ سے کچھ مانگا۔ جسے تو نے سن لیا۔ اور زکریاؑ کے دامن کو گوہرِ مقصود سے بھر دیا۔ بتا، میں ندائے خفی سے پکاروں یا صدائے جہر لگاؤں۔ زکریاؑ عمر میں بوڑھے تھے۔ اور میں قوتوں کے اعتبار سے ضعیف ہوں۔ زکریاؑ کو اپنی بیوی کے بانجھ ہونے کی شکایت تھی اور مجھے اپنی قوم کے بانجھ پن کا شکوہ ہے۔ اس سے نمو کی صفت مفقود ہو گئی ہے۔"

حضرت یوسف علیہ السلام کے مزار پر پہنچتے ہیں اور کہتے ہیں:۔

" یوسف، ایہا الصدیق! دروازہ کیوں بند ہے۔ صورت دیکھنے دیجئے۔ مصری عورتوں کی طرح چھری سے ہاتھ نہیں کاٹوں گا۔ جلوۂ محمدیؐ نے جمال بینی کا عادی کر دیا ہے۔

میرے اچھے یوسفؑ! تم سے کس طرح ہم کلام ہوں۔ جی چاہتا ہے، بیباک ہو کر، گستاخ ہو کر، از خود رفتہ کیف میں، مجنونانہ جوش سے خطاب کروں، مگر پیغمبری آداب مانع ہیں۔ ادب روکتا ہے۔ معاف کیجئے۔ میں نے بادشاہ مصر اور مقبولِ پروردگار پیغمبر کو تم کہہ کر مخاطب کیا۔

خواب کی تعبیر بتانے میں حضور کو ملکہ تھا۔ فرمائیے تو اس دنیا کے خواب کی کیا تعبیر ہے۔ یہاں کے متحرک نظاروں نے میری نیند برباد کر دی ہے۔"

فرعون کی لاش کے پاس کھڑے ہیں اور فرماتے ہیں:۔

" فرعون کے ہونٹوں کو دیکھتا ہوں اور سوچتا ہوں۔ یہی حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بولتے وقت حرکت میں آتے تھے۔ ان ہی سے وزیر ہامان کو حکم دیا تھا کہ اونچا مینار بنا تاکہ موسیٰ کے خدا کو جھانکوں اور دیکھوں وہ کیسا اور کتنا بڑا ہے۔

او سرکش انسان! تو نے دیکھا موسیٰ کا خدا کیسا اور کتنا بڑا ہے۔

جی اُمنڈ فرعون ـــ آ ـــ چل ـــ ہوٹل میں بیٹھ کر وسکی کا ایک ایک جام پئیں اور دیکھیں
دنیا میں کتنے انسان تجھ سے زیادہ سرکشی کے جذبات میں سرشار ہیں۔"

سفرنامۂ مصر و شام و حجاز باوجود ضخیم ہونے کے ہاتھوں ہاتھ بکا۔ ہمت کی خواجہ صاحب میں پہلے بھی کمی نہیں تھی۔ کامیابی نے اور ہمت بڑھادی۔ خواجہ صاحب نے اپنے ۱۹۱۱ء تک کے شائع شدہ مضامین کا مجموعہ چھاپا۔ وہ بھی مقبول ہوا تو غدر دہلی کے افسانے اور غدر ۱۸۵۷ء کے متعلق گیارہ بارہ کتابیں لکھیں۔ اور پھر کتابوں کا سلسلہ جاری رہا۔

اِدھر خواجہ صاحب کی کتابیں چلیں۔ اُدھر مریدوں اور معتقدوں کی تعداد کہیں سے کہیں پہنچ گئی۔

کتابوں کے ساتھ ساتھ خواجہ صاحب نے اخبار اور رسالے بھی کئی نکالے۔ حکومت میں خواجہ صاحب کا رسوخ ہوگیا، اور اُونچے اُونچے لوگ، حتّٰی کہ ملک کے بڑے راجہ نواب سر آنکھوں پر بٹھانے لگے۔ مالی حالت اتنی بڑھی کہ پچھلی جنگ میں خواجہ صاحب کے فرزند اکبر میاں حسین نظامی نے گوشت خشک کرنے اور ڈبوں میں بند کرکے بھیجنے کا ٹھیکہ لیا تھا۔

مجھے خواجہ صاحب کی کامیابی پر تعجب نہیں ہوتا۔ بے حد پس ماندہ سرپرستوں کی نگرانی اور انتہائی عسرت و گمنامی کی حالت میں کامیابی حاصل کرنے پر تعجب ہوتا ہے۔ اور تعجب کی بات یہ ہے کہ مخالفت کے طوفانوں میں خواجہ صاحب نے اپنی زندگی کی کشتی چلائی ہے۔

عبدالنعیم خاں صاحب کے جمع کردہ مضامین میں ایک مضمون مسٹر عبدالعزیز "فلک پیما" کا بھی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"خواجہ صاحب کو اپنی زندگی میں عجیب عجیب طرح سے تائیدِ غیبی نصیب ہوئی۔ علی گڑھ کے سٹیشن پر مسلم یونیورسٹی کے عمائد قطار باندھے پرنس آف برار کے استقبال کے واسطے کھڑے تھے۔ کسی انسان ناشناس بزرگ نے خواجہ صاحب کو درشتی سے حکم دیا کہ آپ دُور جہاں مولوی صاحبان ہیں، وہاں کھڑے ہوں۔ خواجہ صاحب نے محسوس ضرور کیا۔ مگر تعمیل حکم کی۔

شاہزادہ قطاروں کے آگے سے شانِ آصفجاہی کے ساتھ ناموں کو سنتا گزر گیا۔ لیکن جب خواجہ صاحب کے قریب پہنچا تو شہزادے نے "مولا" کہہ کر مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا اور باتیں شروع کردیں۔ لوگ دنگ رہ گئے۔ اِسے کہتے ہیں تائیدِ غیبی۔"

انسان اُوپر سے نیچے گرتا ہے تو لوگ اُس سے ہمدردی کرتے ہیں۔ اُس کی عزت کرنے کو شرافت گردانتے ہیں۔ اور انسان نیچے سے اُوپر چڑھتا ہے تو ٹانگیں پکڑ کر گھسیٹتے ہیں۔ خواجہ صاحب کا جرمِ عظیم یہی تھا کہ وہ بہت نیچے سے اُونچے اُٹھ رہے تھے۔

خواجہ صاحب نے دلّی میں بھی دیوبندی علما سے تعلیم پائی تھی۔ اور آخر میں وہ مولانا رشید احمد صاحبؒ بانی مدرسہ دیوبند کے مدرسہ گنگوہ میں داخل ہوگئے تھے۔ وہاں سے گھر پہنچے تو اُنھوں نے درگاہ حضرت سلطان جیؒ اور ہندوستان بھر کی درگاہوں کی اصلاح کا بیڑا اُٹھایا۔ اُس دن سے جو مخالفت اور تائیدِ غیبی کا ساتھ ساتھ سلسلہ چھڑا ہے تو اُس کا تار آج کے دن تک نہیں ٹوٹا۔ خواجہ صاحب ڈیڑھ سال سے سخت علیل ہیں۔ اس پر بھی مخالفت اور تائیدِ غیبی کا سلسلہ جاری ہے اور خواجہ صاحب علالت کی طرح اُسے برداشت کر رہے ہیں۔

برداشت کا لفظ اب استعمال کیا جاسکتا ہے۔ ایک زمانے میں یہ عالم تھا کہ خواجہ صاحب مخالفت کو قابلِ توجہ نہیں سمجھتے تھے۔ مخالف راستے میں کانٹے بچھاتے تھے اور خواجہ صاحب کانٹوں کے ہٹانے میں وقت ضائع نہیں کرتے تھے۔ کانٹوں سے بچ کر اور راستہ کاٹ کر نکل جاتے تھے۔

ابتدا خواجہ صاحب کو انجمنوں کی ممبری کا شوق تھا۔ پھر دیکھا کہ انجمنیں میری رفتار کا ساتھ نہ دے سکیں گی، انجمنوں سے الگ ہوگئے اور تنہا کام شروع کردیا۔ اہلِ انجمن نے اسے پسند نہیں کیا۔ یہ بھی مخالفت کا ایک محاذ بن گیا۔

میں سیلف میڈ کا لفظ استعمال نہیں کیا کرتا۔ خواجہ صاحب نے بے شک بڑی محنت کی ہے۔ لیکن محنت کرنے کی طاقت اُن کے جسم ناتواں نے کہاں سے پائی۔ تحریر کا اسٹائل۔ بات چیت کا انداز۔ شخصیت کی کشش ایسی چیزیں ہیں جیسی خوش گلوئی۔ کیا انسان اپنے آپ کو خوش گلو بنا سکتا ہے؟

خواجہ صاحب نے جتنے کام کیے ہیں اُن کی چھٹائی کی جائے جس طرح کلیات میں سے دیوان کے لئے اشعار کی چھٹائی کی جاتی ہے تو بہت سے کام ردی کرنے پڑیں گے۔ لیکن بچے ہوئے منتخب اور اچھے کاموں کی تعداد بھی کچھ کم نہیں رہے گی۔ خواجہ صاحب میں خوبیاں خرابیوں سے بہت زیادہ ہیں۔ ایک ایک کام اور ایک ایک خوبی لکھنے کے لئے کتاب چاہیئے۔ مضمون میں جو طویل ہوتا جاتا ہے اُنہیں گنوانا ممکن نہیں ہے۔

خواجہ صاحب کا بہترین کام میرے نزدیک قرآن مجید کا ترجمہ ہے۔ خواجہ صاحب نے قرآن مجید کا اُردو ترجمہ بھی شائع کیا ہے اور ہندی ترجمہ بھی۔

خواجہ صاحب کی خوبیوں میں قدرتاً مجھے یہ خوبی بہت محبوب ہے کہ وُہ انتہائی عروج پانے کے بعد اپنے ابتدائی ملنے والوں کو نہیں بھولے۔ اور اُن سے برتاؤ کا بال برابر فرق نہیں کیا۔

خواجہ صاحب میں بنیادی خرابی یہ ہے کہ مزاج میں اعتدال اور استقلال نہیں ہے۔ رائے بڑی جلدی بدلتے ہیں۔

خواجہ صاحب کا حافظہ بے مثال ہے۔ لڑتے یا سخت کلامی کرتے انہیں کبھی نہیں دیکھا۔ گانے یا گنگناتے بھی کبھی نہیں سُنا۔ ہنسی مذاق سے نفرت ہے۔ قہقہہ لگا کر نہیں ہنستے۔ غیبت کرنے کی تو شاید فرصت ہی نہیں ہے۔ علی ہذا سیر و تفریح کی بھی فرصت نہیں ملتی۔ البتہ تھیٹر اور سینما دیکھتے تھے۔ مضمون لکھنے بیٹھتے ہیں تو پان پر پان کھاتے ہیں۔ پان ہی کا کام تھیٹر اور سینما دیتا تھا۔

کھانا راجاؤں اور نوابوں کے ساتھ بھی کھا لیتے ہیں اور دھوبی اور سقوں کے ساتھ بھی۔

مطبع اور اخبار کا نام خواجہ صاحب نے پہلی مرتبہ گیارہ سال کی عمر میں سُنا۔ بستی حضرت سلطان جی کے ایک باشندے لالہ چرنجی لال نے مطبع کھولا تھا اور اُس میں کتاب سیر الاولیا چھاپی تھی۔ اِس کا چرچا ہوا تو خواجہ صاحب نے اُسی وقت ارادہ کر لیا کہ میں بھی کتابیں شائع کروں گا۔

خواجہ صاحب کے گھر میں خواجہ صاحب کی رہنمائی کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ درگاہ حضرت سلطان جیؒ کے ایک حاضر باش منشی غلام نظام الدین صاحب عُرف خاکسار عالم نے دُنیا کے نشیب و فراز جھیلے اور درگاہ کی آمدنی سے بیزار ہو کر معاش پیدا کرنے کے راستے بنائے۔ خاکسار صاحب کتب فروش تھے اس لئے کتابوں ہی کا کاروبار اُنہوں نے بھی سکھایا۔

کتابیں شائع کرنے کا خیال گیارہ سال کی عمر میں ہو گیا تھا۔ لیکن اخباروں اور رسالوں کو خواجہ صاحب سولہ سال کی عمر تک نہیں جانتے تھے۔ سولہ سال کی عمر میں اخبار "ہمدرد" مراد آباد کسی نے دیا۔ دینے والے سے پوچھا۔ یہ کیا ہے۔ اُس نے کہا۔ اخبار ہے۔

اخبار پڑھنے میں خواجہ صاحب کا جی لگا۔

۱۸۹۷ء میں سب سے پہلا مضمون انڈیا گزٹ کے لئے "انڈیا کی نازک حالت" کے عنوان سے لکھا۔

کتاب خواجہ صاحب نے سب سے پہلی، سولہ صفحے ضخامت کی ۱۹۰۰ء میں لکھی۔ اِس کا نام "مفلسی کے مجرب علاج" تھا۔ یہ علامہ جلال الدین سیوطیؒ کے ایک رسالے کا ترجمہ تھا۔

میں اُوپر ذکر کر چکا ہوں کہ خواجہ صاحب کی مالی حالت کتابیں تصنیف کرنے کے بعد سنبھلی ہے۔ کتابوں کے کاروبار کا بھی اُوپر تذکرہ آیا ہے ۱۹۰۳ء کے دربار دہلی میں خواجہ صاحب کتابوں کی گٹھری لے کر وہاں پہنچ جاتے تھے۔ جہاں باہر کے لوگوں کے خیمے نصب تھے۔ ایک روز اُن لوگوں میں سے کسی نے ان سے سیّد علی حسن نظامی خواہر زادہ حضرت سلطان نظام الدین اولیاؒ محبوب الٰہیؒ کو دریافت کیا۔ (خواجہ صاحب کا اصلی نام علی حسن ہے۔ بڑے بھائی کا نام حسن علی تھا۔ علی حسن نظامی کو مختصر خواجہ صاحب نے ۱۹۰۴ء میں کیا اور ۱۹۰۴ء ہی میں خواجہ صاحب کا لفظ حسن نظامی کے ساتھ علامہ اقبالؒ

---

[1] تحریری لڑائیاں آخر عمر میں دو ایک لڑی ہیں مگر اِس فن کے امام نہیں بن سکے۔ (دوا حامدی)

نے لگایا، جو اس وقت پروفیسر شیخ محمد اقبال تھے۔) خیر خواجہ صاحب نے دریافت کرنے والوں سے یہ نہیں کہا کہ علی حسن میں ہی ہوں۔ کہا کہ درگاہ میں آیئے۔ فلاں حجرے میں علی حسن ملیں گے۔ دوسرے دن وہ صاحب درگاہ پہنچے اور اُن کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں کہ خواجہ زادہ صاحب جن کے مضامین کی دھوم ہے کتابوں کی گٹھری لئے پھرنے پر مجبور ہیں۔

خواجہ صاحب نے عمر کے کسی حصے میں یہ نہیں سوچا کہ فلاں کام میرے کرنے کا ہے یا میرے کرنے کا نہیں ہے۔ ضرورت پڑے اور ضعیفی مانع نہ ہو تو وہ آج بھی کتابوں کی گٹھری لے کر پھر سکتے ہیں۔ اِسی نہ سوچنے نے انہیں کامیاب کیا اور اِسی نہ سوچنے سے انہوں نے ٹھوکریں کھائیں۔ دل میں سما جائے کہ فلاں کام کرنا ہے۔ بس کافی ہے۔ حرکت اور عمل کی قوت اللہ تعالیٰ نے خواجہ صاحب میں کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ ۱۹۱۱ء کا سفر شروع کرتے وقت خواجہ صاحب کی جیب میں صرف اس قدر روپے تھے کہ تھرڈ کلاس میں بمبئی پہنچ جائیں۔ لیکن مصر و شام و حجاز کا قصد کر کے چل کھڑے ہوئے تھے۔ یہ معمولی جرأت نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ نے خواجہ صاحب کی جرأت کو ہمیشہ عزت آبرو کے ساتھ نبھوا دیا۔ خواجہ صاحب نے فاقے کئے ہیں لیکن ہاتھ کبھی کسی کے آگے نہیں پھیلایا۔ ہاتھ اُن کا اُوپر ہی رہا۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

کالج کی تعلیم کے ساتھ ساتھ لکھنؤ کے علمی وادبی حلقوں اور محفلوں میں خاص طور سے شریک ہوتے تھے، اس لئے فلسفیت کے ساتھ ذوقِ ادب بھی شروع ہی سے انہیں ہوگیا۔ سب سے زیادہ انہیں علامہ شبلی نعمانی کا فیضِ صحبت حاصل ہوا اور ان کے خاص اور نامور شاگردوں مثلاً علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم، مولوی عبدالسلام ندوی، مولانا عبدالباری ندوی اور مولانا مسعود علی ندوی سے ان کا ربط ضبط بہت بڑھ گیا۔ اس زمانہ میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کے علمی رسالہ الندوہ کا اجراء ہوا۔ اس میں ان کے مضامین بھی نکلے۔ مولانا شبلی کے علاوہ مولانا عبدالحلیم شررؔ اور مرزا محمد ہادی رسواؔ سے بھی فیضِ صحبت حاصل کیا۔ مولانا شبلی نے جب سیرۃ النبی کی تالیف شروع کی تو موضوع سے متعلق انگریزی کتب کی عبارات کے ترجمہ وتلخیص کے کاموں کے لئے انہیں اپنے اسٹاف میں رکھا (اس کا ذکر مکاتیبِ شبلی حصّہ دوم میں موجود ہے) اس زمانہ میں لکھنؤ کے مشہور ادبی رسالہ الناظر میں انہوں نے بکثرت مضامین (زیادہ تر فلسفیانہ) لکھے۔ اس وقت ان کا طرزِ تحریر بڑی حد تک مولانا شبلی سے ملتا تھا تاہم ان کی انفرادیت بھی نمایاں تھی۔ ان کے اس دور کے مضامین کا ایک مجموعہ "ناظر بک ایجنسی لکھنؤ نے "فلسفیانہ مضامین" کے نام سے شائع کیا تھا۔ الناظر ہی میں انہوں نے "طالب علم" کے فرضی نام سے مولانا شبلی کی کتاب "الکلام" پر تنقید کئی نمبروں میں لکھی تھی۔

بی۔اے کی ڈگری لکھنؤ سے لینے کے بعد ایم۔اے اور کالج علی گڈھ کی ایم۔اے کلاس میں داخل ہوئے اور اس کا فرسٹ ائیر پاس کر چکے تھے کہ ان کے والد ماجد کا انتقال، سفرِ حجاز کے دوران میں عین ایامِ حج میں ہوگیا۔ اس لئے انہیں مجبوراً سلسلۂ تعلیم منقطع کرنا پڑا۔ کچھ دنوں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڈھ میں، صاحبزادہ آفتاب احمد خاں مرحوم کی طلبی پر بطور لٹریری اسسٹنٹ کام کیا۔ اس کے بعد دارالترجمہ حیدرآباد دکن میں تقریباً ۲ سال ترجمہ کے کام پر مامور رہے۔ اس زمانے میں ان کی مشہور کتاب "فلسفۂ جذبات"، جو اُردو میں نفسیات کی پہلی مقبول ترین کتاب تھی انجمن ترقیٔ اُردو کی طرف سے شائع ہوئی۔ حیدرآباد کے زمانۂ قیام میں بھی وہاں کی علمی سوسائٹی میں نمایاں حصّہ لیتے رہے۔ اس زمانہ میں ان کے مضامین اُردو رسالوں، الناظر (لکھنؤ)، ادیب (الہ آباد)، افادہ (آگرہ)، کانفرنس گزٹ (علی گڈھ)، ذخیرہ (حیدرآباد دکن) میں اور انگریزی مضامین "نیو انڈیا" (مدراس)، رسالہ ایسٹ اینڈ ویسٹ، ماڈرن ریویو (کلکتہ) وغیرہ میں بھی نکلتے رہے۔ اور ان کی ایک انگریزی کتاب "سائیکالوجی آف لیڈر شپ" انگلستان کے مشہور ناشر فشر اینڈ انون (لندن) نے شائع کی۔ یہی انگریزی کتاب ان میں اور مولانا محمد علی مرحوم میں ذریعۂ تعارف اور باعثِ خط وکتابت بنی اور اس وقت سے تا دمِ آخر مولانا محمد علی سے ان کے تعلقات انتہائی گہرے قائم رہے۔ اس انگریزی کتاب کا اُردو ایڈیشن "فلسفۂ اجتماع" کے نام سے انجمن ترقیٔ اُردو کے زیرِ اہتمام نکلا۔ اس کتاب کے بعض مندرجات پر بعض علماء نے ان پر کفر کے فتوے دیئے اور حیدرآباد کے بعض اخبارات نے ان کے خلاف شورش میں نمایاں حصّہ لیا۔ حیدرآباد کے زمانۂ قیام میں انہوں نے "منطق" کے نام سے ایک ضخیم کتاب، جدید علمِ منطق پر لکھی جو مدتوں تک عثمانیہ یونیورسٹی میں داخلِ نصاب رہی۔ حیدرآباد کے زمانۂ قیام میں انجمن ترقیٔ اُردو کے رُوحِ رواں مولوی عبدالحق صاحب سے خاص مراسم ہوگئے اور انجمن ترقیٔ اُردو نے مذکورہ بالا دو کتابوں کے علاوہ ذیل کی کتابیں ان سے ترجمہ کرائیں۔ لیکی کی تاریخ اخلاقِ یورپ کا ترجمہ ۲ جلدوں میں۔ ٹامس بکل کی تاریخ تمدن کا ترجمہ۔ موخرالذکر کتاب کی پہلی جلد اور دوسری جلد کے ایک حصّہ کا ترجمہ منشی احمد علی مرحوم کاکوروی نے کیا تھا، ان کے انتقال کے بعد ترجمہ کی تکمیل، مولانا عبدالماجد صاحب نے کی۔

کالج کے زمانۂ تعلیم ہی سے مولانا پر فلسفیت کا غلبہ ہوگیا تھا اور ابتدائی زمانہ کی مذہبیت کی جگہ الحاد اور "عقلیت" نے لے لی تھی حیدرآباد کے دورانِ ملازمت میں بھی یہی رنگ رہا۔ اس دورِ فلسفیت میں بھی طبیعت ملازمت کے قیود سے متنفر تھی۔ اس لئے ملازمت سے مستعفی ہو کر وطن چلے آئے۔ اعلیٰ حضرت نظامِ دکن نے وطن سے بلا کر سبب استعفا دریافت کیا۔ انہوں نے ملازمت کی پابندیوں کو اپنے لئے ناقابلِ تحمل بتایا۔ اس پر نظامِ دکن نے ان کے لئے ایک سو پچیس روپیہ ماہوار کا وظیفۂ علمی عین حیاتی مقرر کر دیا (پولیس ایکشن کے بعد یہ وظیفہ بند کر دیا گیا تھا لیکن مولانا آزاد وغیرہ کی مداخلت سے دوبارہ جاری ہوا۔ اور ان سطور کی تحریر کے وقت دوبارہ اس کے بند ہونے کا حکم آگیا ہے)۔

۱۹۱۸ء سے ان کے افکار و خیالات میں انقلاب عظیم واقع ہوا۔ اولاً مسز اینی بسنٹ کی تحریروں سے وہ ہندوؤں کے روحانی افکار و خیالات کی طرف راغب ہوئے۔ گیتا کے انگریزی تراجم پڑھے۔ گاندھی جی کی تحریریں بھی مادیت کو روحانیت سے بدلنے میں کسی حد تک معین ہوئیں۔ اس کے بعد مثنوی مولانا روم کے مطالعہ نے ان کی بالکل ہی قلب ماہیت کر دی۔ اب فلسفہ کی جگہ ان پر تصوف کا غلبہ ہوا۔ شہر لکھنؤ کا قیام ترک کر کے اپنے آبائی وطن قصبہ دریا آباد ضلع بارہ بنکی (جو لکھنؤ سے ۴۷ میل کے فاصلہ پر واقع ہے) آ کر ایک حد تک گوشہ نشینی کی زندگی بسر کرنی شروع کر دی۔ مذہب کا رنگ روز بروز غالب آتا گیا۔ داڑھی رکھی۔ وضع قطع، طرز ماندو بود، سب پر مذہب کا اثر نمایاں ہوا۔ اس زمانہ میں روحانی مشقیں بھی کثرت سے کیں، روزے کثرت سے رکھے۔ محافلِ سماع میں بھی کثرت سے شریک ہوئے۔ حضرت نظام الدین محبوبِ الٰہیؒ کے مزار پر چلہ کشی بھی کی۔ تحریکِ خلافت و ترکِ موالات سے بھی بہت متاثر ہوئے۔ اس زمانہ میں مولانا محمد علی کا اثر ان پر خاص طور سے پڑا۔ مولانا محمد علی نے اپنی نظر بندی چھندواڑہ کے زمانہ میں ان کی کتاب سائیکالوجی آف لیڈرشپ پر تبصرہ کرتے ہوئے ان پر تبلیغ اسلام شروع کر دی تھی، وہ تبلیغ رفتہ رفتہ مؤثر ہوئی۔ اسی طرح لسان العصر حضرتِ اکبر الٰہ آبادی بھی شروع سے ان پر بہت مہربان تھے۔ یہ اپنے دورِ فلسفیت میں بھی اکبر صاحب سے بہت زیادہ متاثر تھے۔ مراسلت کے علاوہ ملاقات بھی ہوتی رہتی تھی۔ حضرتِ اکبرؔ مراسلت اور ملاقات دونوں میں نہایت حکیمانہ انداز میں (نہ کہ بحث و مناظرہ کے طریق پر) انہیں تبلیغ کرتے رہتے تھے۔ اس کا اثر بھی رفتہ رفتہ مرتب ہوا اور جس وقت حضرتِ اکبرؔ نے وفات پائی (ستمبر ۱۹۲۱ء) فلسفی عبدالماجد صاحب، مولانا عبدالماجد صاحب بن چکے تھے۔ حضرتِ اکبرؔ کی تبلیغ کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو۔ اپنے خط مورخہ ۱۱ر فروری ۱۹۱۶ء میں فلسفۂ اجتماع کے مصنف عبدالماجد صاحب کو (جن کے متعلق فتاویٰ تکفیر اس وقت علماء بے تکان دے رہے تھے) اکبر صاحب بھی یوں لکھتے ہیں:

"برادرم! قرآن شوق سے دیکھیے، خوب دیکھیے، یہاں تک کہ بلا مدد ترجمہ اس کے ظاہری معنی سمجھنے لگیں۔ تفسیر کی تو حد نہیں۔ مذاقِ مفسرین کی بوقلمونی حیرت انگیز ہے۔ قرآن مجید کو بطرزِ تلاوت پڑھا کیجئے۔ ایک سرے سے پڑھ جائیے اور پھر پڑھئے اور پھر پڑھئے۔ زیادہ نہ رکئے پڑھتے جائیے۔ ثواب کا عقیدہ نہ سہی، لٹریری لطف و ذوق کا خیال کیجئے۔ ہر وقت طبیعت یکساں نہیں رہتی۔ کسی وقت کوئی آیت دل کو متوجہ کرے گی۔ مزا آئے گا یا کوئی مسئلہ منکشف ہوگا۔ جو اس وقت یا ان روزوں ذہن میں ہے۔ کسی وقت اس طرح کوئی اور آیت دامنِ دل کو کھینچے گی۔ غور اور اسٹڈی اور کریٹسزم (criticism) اور مضمون نگاری کے لئے قرآن مجید کو خاص طور پر جا بجا حسبِ مرضی دیکھنے کا کوئی اور وقت نکالیے۔"

(خطوطِ مشاہیر حصہ اول، صفحہ ۸۹۔۹۰)

۱۲ر جون ۱۹۱۸ء کے خط میں انہی فلسفی اور دہری، عبدالماجد صاحب کے بارہ میں لسان العصر حضرتِ اکبرؔ نے ذیل کی پیشین گوئی حضرت نیازؔ بریلویؒ کے فارسی شعر پر تضمین کرتے ہوئے فرمائی تھی ؎

ماجد کو آپ سمجھیں بیگانۂ طریقت — دل میں مرے تو ہے اک اُمید کا قصیدہ
ہیں غالباً وہ مصداق اس شعر با اثر کے — ارشاد کر گیا ہے اک عبدِ برگزیدہ
من پاکبازِ عشقم ذوقِ فنا چشیدہ — آہوئے دشتِ ہوہم از ما سوا رمیدہ

اور جب حضرتِ اکبرؔ نے اپنی زندگی کے آخری دور میں یہ پیشین گوئی پوری ہوتی دیکھی تو انہوں نے اپنے ایک خط میں جو ۱۹۱۹ء کا لکھا ہوا ہے تحریر فرمایا:۔

"میں نے بے ساختہ آپ کی نسبت لکھ دیا تھا کہ

آہوئے وحشت ہویم از ماسوا رمیدہ

میں خوش ہوں کہ اس کی ...اقت کے آثار آپ کی صاف اور بلند طبیعت سے نمایاں ہوتے جاتے ہیں۔ ہمارے مکرم ڈپٹی صاحب مرحوم کو شاید شبہ وافسوس تھا کہ لڑکا دین سے بیگانہ ہوتا جاتا ہے۔ اب فرشتوں سے یہ سُن کر ان کی رُوح خوش ہوگی کہ وہ لڑکا حقیقت آشنا ہوتا جا رہا ہے اور انشاء اللہ بہت جلد کہہ دے گا:

"بمقامے رسیدہ ام کہ مپرس"

(خطوطِ مشاہیر جلد اوّل صفحہ ۱۵۴۔۱۵۵)

اس زمانہ میں گاندھی جی کی تحریک ترکِ موالات وستیہ گرہ کے سیاسی پہلوؤں سے زیادہ روحانی پہلوؤں سے وہ خاص طور پر متاثر ہوئے اور فرنگی تہذیب و تمدن، فرنگی نظامِ تعلیم و نظامِ معاشرت کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرنے والوں میں جلد ہی نمایاں حیثیت اختیار کر لی اور ملک وملت کے لئے انگریزوں کی غلامی سے زیادہ انگریزیت بلکہ فرنگیت کے مسحور کن ومرعوب کن اثرات سے آزادی ضروری سمجھنے لگے۔ اس زمانہ سے انہوں نے کھدر پہننا شروع کر دیا اور اس پر اب تک قائم ہیں۔

۱۹۲۸ء میں ان کی ملاقات پہلے پہل حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی سے ہوئی۔ ان کی صحبت کے اثرات ان پر بہت نمایاں پڑے۔ ان کی تفصیل مولانا دریابادی کی کتاب حکیم الامت ـــ نقوش وتاثرات (دار المصنفین اعظم گڑھ۔ شائع شدہ ۱۹۵۲ء) میں مل سکتی ہے۔

اس تحریکِ ترکِ موالات کے زمانہ میں مولانا نے تحریکِ خلافت سے، اپنی گوشہ نشینی کے باوجود ایک حد تک دلچسپی لی۔ حضرت مولانا محمد علی کی وجہ سے ایک زمانہ میں اودھ خلافت کمیٹی کے صدر بھی رہے۔ مرکزی خلافت کمیٹی کے رکن عرصہ تک رہے اور جب ۱۹۲۷ء میں آل انڈیا خلافت کانفرنس کا اجلاس لکھنؤ میں منعقد ہوا تو اس کی مجلسِ استقبالیہ کے صدر بھی تھے۔

۱۹۱۹ء میں لکھنؤ سے ایک ہفتہ وار اخبار حقیقت کے نام سے نکلا۔ مولانا نے اس میں کثرت سے مضامین لکھے اور ان میں سیاسی مضامین بھی شامل تھے۔ ۱۹۱۶ء سے دار المصنفین اعظم گڑھ کا مشہور علمی رسالہ معارف نکلنا شروع ہوا۔ اس کے مضمون نگاروں میں یہ شریک تھے 'اخبارِ علمیہ' کا عنوان سالہا سال انہی کے قلم کا رہینِ منت رہا اور ۱۹۲۰ء میں جب صاحبِ معارف، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا محمد علی کی معیت میں وفدِ خلافت کے رکن کی حیثیت سے یورپ گئے تو معارف کی ادارت مولانا عبد الماجد صاحب نے کی اور اس کے شذرات انہی کے قلم سے نکلے۔ تقسیمِ ملک کے بعد، مولانا سید سلیمان صاحب ندوی کے پاکستان چلے جانے کے بعد سے اب تک اس رسالہ معارف اور اس ادارۂ دار المصنفین کی نگرانی مولانا ہی کے سپرد ہے۔

۱۹۲۵ء سے مولانا نے ایک ہفتہ وار دینی واصلاحی پرچہ "سچ" کے نام سے نکالا۔ اس کا خاص مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور خصوصیت کے ساتھ فرنگیت اور مغربیت کے سیلاب سے ان کو بچانا تھا۔ اس اخبار کی زبان بہت ہی سہل اور دل نشین ہوتی تھی۔ ۱۹۲۹ء میں سفرِ حج و زیارتِ مدینۂ طیبہ سے مشرف ہوئے۔ اور پورا سفرنامہ اولاً اخبار سچ میں بصورتِ مضمون قسط وار اور بعد ازاں کتابی شکل میں سفرِ حجاز کے نام سے شائع ہوا۔ اس کے پڑھنے سے ان کی انشاپردازی کا اصل رنگ ظاہر ہوتا ہے۔ حج کے متعلق مذہبی وفقہی معلومات کے ساتھ ساتھ ادب وانشا کے جواہر ریزے، سفر وسیاحت کی دلچسپیوں کے ساتھ ساتھ سیاسیات وجغرافیہ کی معلومات کا ایک عجیب دل کش گلدستہ۔

۱۹۳۲ء میں قرآن مجید کے انگریزی ترجمہ وتفسیر کے کام کا آغاز کیا۔ اس لئے اخبار "سچ" کو وقتی طور پر بند کر دیا۔ ۱۹۳۴ء سے یہی اخبار "صدق" کے نام سے لکھنؤ سے نکلنا شروع ہوا۔ شروع شروع میں سہ روزہ تھا، بعدازاں ہفتہ وار ہو گیا۔ اس کی سچی باتوں اور نوٹوں اور مقالات نے بہت جلد ملک گیر شہرت حاصل کر لی۔ اخبار "سچ" کی سابقہ خصوصیات کے ساتھ ساتھ عہدِ حاضر کے جدید ترین فتنوں کے مقابلہ میں بھی اس اخبار نے نمایاں شہرت حاصل کر لی۔ اس کے علاوہ اُردو کتب اور رسائل پر اس کی بلند پایہ تنقیدات کی بھی ملک میں دھوم مچ گئی۔ ۱۹۵۰ء میں بعض مجبوریوں کے باعث اخبار صدق بند کرنا پڑا اور چند ماہ کے تعطل کے بعد یکم دسمبر ۱۹۵۰ء سے یہی اخبار صدقِ جدید کے نام سے نکل رہا ہے۔ ہر ہفتہ اس کے اقتباسات ہند اور پاکستان کے بیشتر اخبارات میں کثرت سے نقل ہوتے ہیں۔ اُردو کے بہت کم پرچے ایسے ہیں جن کے مضامین اس کثرت سے دوسرے پرچے اپنے یہاں نقل کرتے ہوں۔

انگریزی ترجمہ کلام مجید اور تفسیر کا کام مولانا عرصہ ہوا ختم کر چکے ہیں۔ ۱۹۴۱ء میں تاج کمپنی لاہور نے پارۂ اول بڑے اہتمام سے شائع کیا۔ ۱۹۴۳ء میں پارۂ دوم طبع ہوا۔ اس کے بعد سے اس کی طباعت کا کام رُکا پڑا ہے جس کی ذمہ داری تمام تر ناشر پر ہے۔ حال میں کمپنی مذکور نے وعدہ کیا ہے کہ عنقریب پانچ پاروں کا ترجمہ وتفسیر یکجائی طور پر شائع ہوگا۔ اس انگریزی ترجمہ وتفسیر کی خصوصیات امتیازی یہ ہیں:-

(۱) ترجمہ اہلِ سنت کے راسخ عقائد کے مطابق ہے۔

(۲) پوری کوشش کی گئی ہے کہ حتی الامکان کسی چیز حتیٰ کہ کسی حرف کا بھی ترجمہ چھوٹنے نہ پائے۔

(۳) ترجمہ کے الفاظ کے لئے انتخاب بھی ایسے لفظوں کا کیا گیا ہے جو قرآن پاک کے اصل مفہوم سے قریب تر ہیں۔

(۴) ترجمہ کے تفسیری حواشی ہیں جو بہت بڑی تعداد میں ہیں، خصوصیت کے ساتھ یورپ اور یورپ زدہ لوگوں کو سامنے رکھا گیا ہے اور ان کی طرف سے ہونے والے عقلی، تاریخی، جغرافی اور مذہبی ہر قسم کے اعتراضات اور شبہات کی پوری تشفی کر دی گئی ہے اور اس کے لئے خود مغربی کتب کے حوالہ جات اور نامور مصنفین کی کتابوں کے بکثرت حوالے پیش کئے گئے ہیں۔

(۵) اسلام کی تعلیم کا مقابلہ دوسرے مذاہب سے کر کے اس کی فوقیت کے دلائل پیش کئے گئے ہیں۔

الغرض یہ ترجمہ اسلام سے متعلق ایک ضروری انسائیکلو پیڈیا کی حیثیت رکھتا ہے۔

انگریزی ترجمہ وتفسیر کا کام تقریباً دس گیارہ سال کی محنتِ شاقہ میں مکمل ہوا۔ اس کے بعد مولانا نے اُردو ترجمہ وتفسیر کا کام شروع کیا۔ خدا کے فضل سے اس کا مسودہ بھی عرصہ ہوا مکمل ہو چکا، اور تفسیر ماجدی کے نام سے اس کی دو جلدیں، منزل اول اور منزل ثانی کی تفسیر پر مشتمل تاج کمپنی لاہور و کراچی کے یہاں سے شائع ہو چکی ہیں، بقیہ پانچ جلدیں بعد میں شائع ہوں گی۔ اس اُردو تفسیر میں انگریزی ترجمہ وتفسیر کے مذکورہ بالا حصہ جات کے علاوہ مستند عربی کتب تفسیر کے حوالے بھی کثرت سے درج ہیں جن سے اُردو خواں طبقہ کی تفسیری معلومات بہت وسیع ہو سکتی ہیں۔ اس تفسیر اُردو پر فاضل علماء نے نہایت اچھی رائیں ظاہر کی ہیں۔ دارالعلوم دیوبند کے مہتمم مولانا محمد طیب صاحب نے جلد دوم پر اظہارِ رائے فرماتے ہوئے لکھا ہے:-

> "تفسیر کی خوبی کے لئے مفسر سلمہٗ کا علم اور قلم بہترین شہادت ہیں۔ اس تفسیر کا امتیازی پہلو وہ موازنہ ہے جو جگہ جگہ قرآنِ حکیم اور عہدِ قدیم کی کتب میں کر کے قرآنی معارف کی حقیقی فطرت کھولی گئی ہے جس سے اسلامی تعلیمات کا تفوق ہی نہیں، بلکہ دنیا کے ہر دور کے لئے ان کی ہمہ گیری اور ناگزیری نمایاں ہو جاتی ہے۔ ساتھ ہی عام تفسیری خوبیاں اور صاحبِ قلم مفسر کے تفسیری کمالات اس پر مستزاد ہیں۔"

مولانا ان سطور کی تحریر کے وقت، اخبار "صدقِ جدید" لکھنؤ کے مدیر کی حیثیت سے ہندوستان اور پاکستان دونوں میں نمایاں شہرت رکھتے ہیں۔ ان کی تحریر کی گئی باتیں اور نوٹ دونوں ملکوں کے اخبارات کثرت سے نقل کرتے ہیں۔ اس اخبار میں مولانا کے قلم سے کتب و رسائل پر تنقیدیں بھی وقتاً فوقتاً نکلتی رہتی ہیں جو اعلیٰ تنقید اور انشائے ماجد کا بہترین نمونہ ہوتی ہیں۔

مولانا کا طرزِ تحریر ان کے دورِ فلسفیت میں ایک حد تک مولانا شبلی مرحوم کے تتبع کو ظاہر کرتا تھا۔ اب ان کا طرز پہلے سے بالکل مختلف ہو چکا ہے۔ بے ساختگی، سادگی، شدّتِ تاثر، رعایتِ لفظی کا وقتاً فوقتاً استعمال، لیکن اس خوشں اسلوبی کے ساتھ کہ ذرا بھی آورد نہ معلوم ہو۔ مضمون کے لحاظ سے موزوں الفاظ اور فقروں کا انتخاب ان کی تحریر کے خاص جوہر ہیں۔ طنز نگاری میں آپ کا اسٹائل درجۂ کمال کو پہنچ چکا ہے لیکن اس میں نہ تو دوسروں پر ذاتی حملے ہوتے ہیں نہ کسی قسم کی رکاکت و ابتذال۔

مولانا کے طرزِ تحریر پر، مولوی رئیس احمد جعفری (مؤلف سیرت محمد علی) اپنی کتاب "دید و شنید" میں یہ لکھتے ہیں:

"مولانا طنزیات کے بادشاہ ہیں۔ نثر میں رعایتِ لفظی اس کمال سے استعمال کرتے ہیں کہ سہلِ ممتنع کا مزا آجاتا ہے۔ طرزِ تحریر اتنا دلکش:

بلائے جاں ہے غالبؔ اس کی ہر بات
عبارت کیا، اشارت کیا، ادا کیا

اور پھر لطف یہ کہ جس موضوع پر لکھیں گے، اپنی انفرادیت کو قائم رکھتے ہوئے طرزِ تحریر بھی ایسا جو موضوع سے مناسبت رکھتا ہو۔ ایک ہی قلم ہے جس نے تاریخِ اخلاقِ یورپ بھی لکھی اور فلسفۂ جذبات بھی۔ جس نے تصوفِ اسلام بھی لکھی اور فلسفۂ اجتماع بھی۔ جس نے مثنوی بحر المحبت (مصحفی) مرتب و مہذب کی اور مکالماتِ برکلے بھی۔ سفرِ حجاز بھی لکھا اور حکیم الامت بھی لکھتا ہے۔ ان میں ہر ایک میں انفرادیت پوری شان سے قائم ہے۔ طرزِ تحریر کہیں معلم کا، کہیں مترجم کا۔ کہیں فلسفی کا، کہیں انشا پرداز کا، کہیں ادیب کا۔ تاریخِ اخلاقِ یورپ شستہ و رواں ترجمہ ہے۔ فلسفۂ جذبات اور فلسفۂ اجتماع کا اندازِ تحریر باوقار اور سنجیدہ ہے۔ تصوفِ اسلام اور فیہ ما فیہ میں تصوف کی متانت غالب ہے۔ سفرنامۂ حجاز میں قلم ایک ایسے مصوّر کا موقلم ہو جاتا ہے جو دل کے جذبات کو تصور کی نقش آرائیوں، عقیدت اور احترام کے تاثرات کو محسوس اور مرئی صورت میں دکھا سکتا ہے۔ ہر مصنف کو اپنے قلم پر یہ قدرت نہیں ہوتی۔"

مولانا کے متعلق ناواقفوں کو شاید یہ غلط فہمی ہو کہ وہ بڑے خشک مزاج اور کٹر مذہبی ہیں، جو لوگ ان سے ذاتی واقفیت رکھتے ہیں، وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ چیز حقیقت سے کتنی دور ہے۔ مولوی رئیس احمد جعفری کی تحریری شہادت اس سلسلہ میں خاص وزن رکھتی ہے۔ وہ اپنی اسی کتاب دید و شنید میں لکھتے ہیں:

"ایک بڑی چیز ہے توازن۔ کم لوگ ایسے ہیں جو اس نعمت سے بہرہ ور ہیں۔ افراط میں مبتلا ہیں یا تفریط میں۔ مولانا کو خدا نے توازن کے ساتھ وہ سلامتیِ فکر عطا کی ہے جو افراط و تفریط سے بہت دور ہے۔ وہ کٹر حنفی ہیں، لیکن غیر مقلدوں کے دشمن نہیں۔ وہ سیاسیات

(bunyam)

(۸) فلسفیانہ مضامین — موصوف کے ان فلسفیانہ مضامین کا مجموعہ جو رسالہ الناظر لکھنؤ میں شائع ہوئے تھے۔

(۹) مبادیٔ فلسفہ حصہ اول
(۱۰) 〃 〃 〃 دوم
} ان فلسفیانہ مضامین کا مجموعہ جو رسائل معارف و الناظر و ادیب وغیرہ میں شائع ہوئے۔ مکمل نظر ثانی کے بعد۔

(۱۱) فرائضِ والدین — "خادمِ تعلیم" کے فرضی نام سے شائع کردہ مطبع نولکشور لکھنؤ۔

(۱۲) مکالماتِ برکلے — مشہور فلسفی برکلے کے ڈیلاگس کا ترجمہ۔ دارالمصنفین اعظم گڈھ سے شائع ہوئی۔

(۱۳) پیامِ امن — ایک فرانسیسی مفکر مسیو پال رچرڈ کی تصنیف کا اُردو ترجمہ۔ ختمِ جنگِ عظیم اول کے بعد، دنیا میں امن کے قیام کی تدابیر کا ذکر۔ مترجم نے اسلام کے نظریۂ امن سے متعلق ایک مستقل باب اپنے قلم سے لکھ کر کتاب میں اضافہ کیا ہے۔

(۱۴) تحفۂ خسروی — حاکم و محکوم کے تعلقات کے بارہ میں اسلامی تعلیمات اور قدیم حکماء و حکمائے اسلام کے اقوال و افکار کا مجموعہ۔

(۱۵) مثنوی بحرالمحبت — اُردو کے استاد مصحفی کی ایک غیر مطبوعہ مثنوی۔ ترتیب و تصحیح و تحشیہ کے ساتھ مع ایک مقدمہ کے۔

(۱۶) تصوفِ اسلام — تصوفِ اسلام کی مختصر مگر جامع کتاب۔

(۱۷) فیہ ما فیہ — مولانا جلال الدین رومی کے غیر مطبوعہ ملفوظات۔ ترتیب و تصحیح کے ساتھ۔ شروع میں ایک مبسوط مقدمہ۔

(۱۸) سفرِ حجاز — مولانا کے سفرِ حج و زیارتِ مدینہ منورہ کی روداد۔ پہلا ایڈیشن ۱۹۳۱ء میں اور دوسرا مع ضمیموں اور تصحیح حالیہ کے ۱۹۴۹ء میں شائع ہوا۔

(۱۹) زُود پشیمان — ایک ڈرامہ جو موجودہ دَور سے بہت قبل انہوں نے 'ناظر' کے فرضی نام سے لکھا۔ لیکن اب وہ اس کی اشاعت کے روادار نہیں ہیں۔

(۲۰) ہم آپ — جدید نفسیات پر مولانا کی آخری کتاب۔ شائع کردہ ہندوستانی اکاڈمی الہ آباد۔

(۲۱) ترجمہ و شرح مناجاتِ مقبول — مولانا اشرف علی تھانوی کی دُعاؤں کی کتاب کا ترجمہ مع تشریحی حاشی۔

(۲۲) تمدنِ اسلام کا پیامِ بیسویں صدی کے نام
(۲۳) تمدنِ اسلام کی کہانی خود اس کی زبانی
} مولانا کے دو لکچر جو مجلسِ اسلامیات مسلم یونیورسٹی علی گڈھ میں پڑھے گئے۔

(۲۴) مردوں کی مسیحائی — مضامین متعلق سیرتِ نبوی و متعلقات کا مجموعہ۔

(۲۵) مضامینِ عبدالماجد — اخبار 'سچ' و 'صدق' میں شائع شدہ مقالات کا انتخاب۔

یہ دونوں کتابیں ادارۂ اشاعتِ اُردو حیدرآباد نے شائع کی تھیں۔

(۲۶) قصص و مسائل — مولانا کے دو قرآنی مضامین، قدیم مسائل جدید روشنی میں اور جدید قصص الانبیاء پر مشتمل۔

(۲۷) سچی باتیں — اخبار 'سچ' و 'صدق' میں شائع ہونے والی سچی باتوں کا مجموعہ۔

(۲۸) تفسیرِ ماجدی جلد اول و جلد دوم — قرآنِ مجید کا ترجمہ و تفسیر۔ اب تک اس کی دو جلدیں جو پہلی اور دوسری منزلوں کی تفسیر پر مشتمل ہیں تاج کمپنی لاہور کے زیرِ اہتمام شائع ہو چکی ہیں۔

(۲۹) ترجمہ و تفسیرِ قرآنِ مجید (انگریزی) — مولانا کا یہ شاہکار بھی تاج کمپنی شائع کر رہی ہے۔ ابھی تک صرف دو پارے طبع ہوئے ہیں۔
پارۂ اول و دوم

(۳۰) حکیم الامت۔ نقوش و تاثرات — حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی سے متعلق مولانا دریابادی کے تاثرات۔

(۴۱) محمد علی۔ ذاتی ڈائری حصہ اوّل، رئیس الاحرار مولانا محمد علی مرحوم سے متعلق مولانا دریابادی کی تازہ ترین تصنیف۔ اکثر نقادوں کے نزدیک ان کی سب سے زیادہ مؤثر اور آبدار کتاب۔ اس کا حصہ دوم ابھی طبع نہیں ہوا۔ یہی کتاب دس بارہ سال ہوئے، نا تمام صورت میں اسی نام سے حیدر آباد سے بھی ایک ناشر کتب شائع کر چکے ہیں۔

(۴۲) مقالاتِ ماجد حصہ اوّل — مولانا کے ادبی مضامین مثلاً پیامِ اکبر ایک بدنام شاعر، اور تنقیدات کا مجموعہ۔ پہلا ایڈیشن تاج آفس بمبئی نے شائع کیا تھا اور اب دوسرا ایڈیشن، عشرت پبلشنگ ہاؤس لاہور نے شائع کیا ہے۔

(۴۳) مقالاتِ ماجد حصہ دوم — یہ مجموعہ بھی عشرت پبلشنگ ہاؤس عنقریب شائع کرنے والا ہے۔

(۴۴) خطوطِ مشاہیر حصہ اوّل — مولانا دریا بادی کے نام مولانا شبلی نعمانی، حضرت اکبر الہ آبادی اور مولانا محمد علی جوہر کے خطوط مع مستند حواشی۔

(۴۵) اکبر نامہ یا اکبر میری نظر میں — اکبر الہ آبادی سے متعلق مولانا کے نوشتوں کا مجموعہ۔

ان کتابوں کے علاوہ متعدد تصنیفات کے مسودے تیار ہیں جن کی اشاعت ابھی نہیں ہو سکی۔ مثلاً خطوطِ مشاہیر حصہ دوم، نشریاتِ ماجد (ریڈیائی تقریروں کا مجموعہ) الحیوانات فی القرآن یا حیواناتِ قرآنی، الاماکن فی القرآن یا جغرافیہ قرآنی۔

مولانا نے حال ہی میں اپنی آپ بیتی بھی لکھنی شروع کی ہے لیکن اس کے متعلق ان کا ارادہ یہی ہے کہ ان کی زندگی میں شائع نہ ہو۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

فلسفیوں کی افراط و تفریط سے بچ کر تاریخ کا بے لاگ مطالعہ کرنے والا جانتا ہے کہ شخصیت اس انجن کی طرح ہے جس سے بڑی سے بڑی اصلاحی یا انقلابی تحریک کو ترقی مل سکتی ہے۔ لیکن خود یہ انجن جس طاقت سے چلتا ہے وہ اسے زمانے یا ماحول سے ملتی ہے۔ ایسی شخصیتیں جن میں اصلاح یا انقلاب پیدا کرنے کی صلاحیت ہے کبھی کبھی پیدا ہوتی ہیں لیکن ان کی صلاحیت کا قوت سے فعل میں آنا اس پر موقوف ہے کہ ان کے زمانے کے حالات اور زمانے کے لوگ ان کا ساتھ دیں۔

میں نے اپنے زمانے یعنی بیسویں صدی کے نصف اول میں جن مسلمانوں کو لوح تاریخ پر نمودار ہوتے دیکھا تھا ان میں کھری شخصیتیں بھی تھیں اور ملمع کی ہوئی بھی۔ نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ مسلمانوں میں عام طور پر ملمع کا مال کھرے مال سے کہیں زیادہ مقبول ہوا۔ اس لئے کہ اس میں ظاہری چمک جس پر مسلمان جان دیتے ہیں زیادہ تھی۔ ذاکر صاحب ان کھری شخصیتوں میں سے ہیں جن کی مقبولیت کا دائرہ اب تک بہت محدود ہے۔ لیکن ملمع کی عارضی چمک ماند پڑنی شروع ہو گئی ہے اور کھرے سونے کی پرکھ کا شعور موجود ہے۔ ممکن ہے اب ہندوستان کے مسلمان ذاکر صاحب کی شخصیت کو پرکھ سکیں:

ہم دیکھنے والوں کی نظر دیکھ رہے ہیں

اور ان کی مدد کے لئے ذاکر صاحب کی شخصیت کی نشوونما اور موجودہ آب و رنگ پر تھوڑی سی روشنی ڈالتے ہیں۔

ذاکر حسین ۱۸۹۷ء میں حیدر آباد (دکن) میں پیدا ہوئے ان کے والد فدا حسین خاں صاحب ضلع فرخ آباد (یو۔ پی) کے مشہور قصبے قائم گنج کے رہنے والے تھے اور حیدر آباد میں وکالت کرتے تھے۔ قائم گنج کے پٹھان صدیوں سے سپہ گری کا پیشہ رکھتے تھے چنانچہ ذاکر حسین کے خاندان کے بھی بہت سے لوگ فوج میں ملازم رہے۔ ان کے والد کا مشرقی علوم کی اعلیٰ تعلیم پانا اور وکالت کا پیشہ اختیار کرنا قائم گنج والوں کے نزدیک بدعت سے کم نہ تھا۔

ذاکر حسین کا بچپن حیدر آباد میں گذرا لیکن وہ اپنے گھر کی چار دیواری میں پلے اور بڑھے اور ریاست کی جاگیردارانہ آب و ہوا سے متاثر نہیں ہوئے۔ اس زمانے میں سب سے گہرا اثر ان کی سیرت پر اپنے پیر حسن شاہ صاحب کا پڑا جن کے وہ بہت کم عمری میں مرید ہو گئے تھے۔ یہ بزرگ ذاکر حسین کے عزیزوں میں سے تھے اور حضرت شاہ طالب حسین فرخ آبادی سے ارادت رکھتے تھے۔ حسن شاہ صاحب پر ایک واردات ایسی گذری تھی جس سے ان کی روحانی زندگی کی کایا پلٹ گئی۔ ابتدا میں وہ ہندوؤں سے تعصب رکھتے تھے اور شاید انہیں برا بھلا بھی کہتے تھے جب ان کے مرشد حضرت شاہ طالب حسین کو اس کا علم ہوا تو انہوں نے ان کی تادیب اور تہذیب کے لئے یہ حکم دیا کہ تم چوٹی رکھو اور پشاور تک پیدل جاؤ اور واپس آؤ۔ اس تادیب نے حسن شاہ صاحب کو آزادہ روی اور صلح کل سکھانے کے علاوہ جہانیان جہاں گشت بنا دیا اور ان کا یہ شعار ہو گیا کہ ایک گٹھڑی کپڑوں اور کتابوں کی ساتھ لئے پیدل دنیا بھر میں پھرا کرتے۔ جب کبھی حیدر آباد آ کر کچھ دن رہتے تو ذاکر حسین کی ہدایت و ارشاد کا کام زیادہ تر ان دو طریقوں سے انجام دیتے: ایک تو وہ کمسن مرید سے علم دین یا سلوک و معرفت کی کسی کتاب کی نقل کراتے، دوسرے اسے روپیہ دیتے اور پھر حاجتمندوں کو اس کے پیچھے لگا دیتے کہ خیرات و حسنات کی مشق سے اس کا دل بھی کھل جائے اور ہاتھ بھی۔

۱۹۰۷ء میں ذاکر حسین تعلیم کے لئے اٹاوہ کے اسلامیہ ہائی اسکول میں بھیج دئے گئے جسے سید احمد خاں کے ایک دور کے رفیق مولوی بشیر الدین نے قائم کیا تھا۔ ان بزرگ کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ انہیں ایک ہی دھن تھی اور اپنی دھن کے پکے تھے۔ اسکول کے ہیڈ ماسٹر سید الطاف حسین ان پکے معلموں میں سے تھے جو اس راز سے واقف ہوتے ہیں:

درس ادب اگر بود زمزمۂ محبتش (۶)
جمعہ بہ مکتب آورد طفل گریز پائے را

ذاکر حسین کے حساس دل پر مولوی صاحب کی ایک صفت اور سید صاحب کی بہت سی صفات کا بڑا گہرا نقش بیٹھا جو کبھی مٹ نہ سکا۔

۱۹۱۳ء میں ذاکر حسین ایم۔ اے۔ او کالج علی گڈھ میں داخل ہوئے۔ انٹرمیڈیٹ انہوں نے سائنس میں پاس کیا اور ۱۹۱۵ء میں بی۔ ایس۔ سی کا امتحان

دینے کے لئے لکھنؤ کرسچن کالج میں داخل ہوئے تاکہ میڈیکل کالج میں داخلہ لے سکیں لیکن شدید علالت کی وجہ سے اس ارادہ کو ترک کر کے پھر علی گڑھ واپس آنا پڑا۔ اس طرح ان کا ایک سال بیکار گیا۔ اس بار انہوں نے آرٹس کا کورس لیا۔ ۱۹۱۸ء میں بی۔ اے اور ۱۹۱۹ء میں اقتصادیات کے مضمون میں ایم۔ اے پاس کیا۔ ایم۔ اے کی تیاری کے ساتھ ساتھ ذاکر صاحب اقتصادیات کے شعبے میں جونیئر لیکچرار کے فرائض انجام دے رہے تھے کہ علی گڑھ میں ترک موالات کا زلزلہ آیا جس سے سید احمد خان کا ایم۔ اے۔ او کالج زیر و زبر ہو کر ڈاکٹر ضیاء الدین کی مسلم یونیورسٹی بن گیا۔ کچھ لوگوں نے گرتی ہوئی عمارت سے نکل کر ایک خیموں کی بستی میں پناہ لی اور اس کا نام جامعہ ملیہ اسلامیہ رکھا۔ ان پناہ گزینوں میں ذاکر حسین بھی تھے جو اب ذاکر صاحب کہلانے لگے تھے۔ علی گڑھ کالج کی تعلیم کے دوران میں ذاکر یونین کے اور عام طور پر طالب علموں کی اجتماعی زندگی کے روح و رواں تھے۔ انہوں نے اپنے بہت سے ساتھیوں پر گہرا اثر ڈالا۔ لیکن خود سب سے گہرا اثر ڈاکٹر ضیاء الدین کا قبول کیا۔ گو وہ مثبت نہیں منفی اثر تھا۔ ڈاکٹر ضیاء الدین کی ذات، ان سب صفات کا مجموعہ تھی جن سے سرکار برطانیہ کا تقرب اور عنادید قوم میں خصوصیت حاصل ہوتی تھی۔ ذاکر صاحب نے شعوری یا غیر شعوری طور پر ڈاکٹر ضیاء الدین کی ضد کو اپنی زندگی کا اصول بنا لیا۔ ۱۹۲۰ء میں جب گاندھی جی اور مولانا آزاد نے علی گڑھ کے طلبہ کو ترک موالات کی دعوت دی تھی اور مولانا محمد علی نے شیخ الہند مولانا محمود حسن مرحوم کے دست مبارک سے جامعہ ملیہ کا افتتاح کرایا تھا تو ذاکر صاحب کے لئے ایم۔ اے۔ او کالج کو چھوڑ کر جامعہ ملیہ میں شریک ہونے کا فیصلہ کرنا نہایت دشوار معلوم ہوتا تھا۔ کئی روز شدید کشمکش میں مبتلا رہے مگر ایک دن جب ڈاکٹر ضیاء الدین نے انہیں بلا کر بڑی محبت سے زندگی کے نشیب و فراز سمجھائے اور یقین دلایا کہ ایم۔ اے۔ او کالج میں رہ کر تم کو ایک ہی سال کے اندر ڈپٹی کلکٹری مل جائے گی تو ذاکر صاحب کی مشکل آسان ہو گئی۔ وہ فوراً ایم۔ اے۔ او کالج کو خیرباد کہہ کر جامعہ ملیہ پہنچ گئے۔

دو سال تک جامعہ ملیہ کی تعمیر میں مولانا محمد علی کا ہاتھ بٹانے کے بعد ۱۹۲۲ء میں ذاکر صاحب معاشیات کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے برلن پہنچے۔ میری ملاقات ان سے ایک مرتبہ علی گڑھ میں ہو چکی تھی۔ لیکن اب سوا تین برس تک برلن میں ان کا ہر وقت کا ساتھ رہا۔ میں نے انہیں ہر رنگ میں دیکھا اور ہر رنگ میں چوکھا پایا۔ سب سے زیادہ مجھ پر اس بات کا سکہ بیٹھا کہ ذاکر صاحب "در ایام جوانی چناں کہ افتد و دانی" کی وادیٔ پر خار سے بڑی پامردی سے گذرے۔ گھبرا کر بھاگنے کی کوشش میں کانٹوں میں الجھے نہیں بلکہ او سان قائم رکھے دامن بچائے قدم بڑھائے چلے گئے۔ برلن میں ذاکر صاحب کے استادوں میں پروفیسر زومبارٹ اور دوسرے بڑے پایہ کے عالم تھے جن سے انہوں نے بہت فیض اٹھایا مگر فیضان اگر تھوڑا بہت کسی سے پایا تو شاید میرے استاد اشپرانگر سے جو خبر کے ساتھ ساتھ نظر بھی رکھتے ہیں۔

۱۹۲۶ء میں ذاکر صاحب جرمنی سے ڈاکٹر ذاکر حسین بن کر لوٹے تو ملک کی یہ کیفیت دیکھی کہ ترک موالات اور خلافت کی تحریکیں ٹھنڈی پڑ چکی ہیں اور لوگوں پر خصوصاً مسلمانوں پر ایک عام افسردگی چھائی ہوئی تھی۔

گلشن میں کہیں بوئے دمساز نہیں آتی
اللہ رے سناٹا آواز نہیں آتی

مگر ایک آواز اب بھی سنائی دے رہی تھی اور وہ خود ان کے دل کی آواز تھی:

بیگانہ ہوئی دنیا رسم و رہ الفت سے
اک میری طبیعت ہے جو باز نہیں آتی

یہ سخت جان طبیعت باز نہیں آئی اس نے جامعہ ملیہ کی سوکھتی ہوئی بیل کو خون جگر سے سینچا اور پروان چڑھایا۔ ۱۹۲۸ء کے آخر میں حکیم اجمل خان کے انتقال کے بعد جامعہ ملیہ کا چلنا قریب قریب ناممکن نظر آتا تھا۔ جن لوگوں نے ان دنوں ذاکر صاحب کے ساتھ کام کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ وسائل کے فقدان، اپنوں کی مخالفت، غیروں کی شماتت، حکومت کے عتاب کے باوجود جامعہ ملیہ کو چلانا ہر ایک کا کام نہیں تھا۔ یہ وہی کر سکتا تھا جسے

خدا پر، انسان پر اور خاص کر اپنے آپ پر پورا پورا اور گہرا بھروسہ ہو۔ جو ایثار ذاکر صاحب نے جامعہ ملیہ کے لئے کیا اس میں تن من دھن کی قربانی تو سب کو نظر آتی مگر ایک قربانی جو حوصلہ مند طبیعتوں کے لئے ان سب سے مشکل ہے بہت کم لوگوں نے دیکھی وہ یہ ہے کہ پبلک لیڈری کے موقعے جن کے لئے ذاکر صاحب کے ہم چشم ہزاروں جتن کرتے تھے ان کو بے مانگے مل رہے تھے مگر انہوں نے بے تامل چھوڑ دیئے۔ اس لئے کہ ان کے نزدیک تعلیم کا کام یوں بھی یکسوئی چاہتا ہے اور ان دنوں جامعہ ملیہ کی جوئے شیر لانے کے لئے خاص طور پر اپنے آپ کو پوری طرح کھپا دینے اور پتہ مار کر کام کرنے کی ضرورت تھی۔

ان دنوں ذاکر صاحب کو قریب قریب سبھی قومی اور ملی لیڈروں سے سابقہ رہا لیکن ان کی شخصیت پر قابل ذکر اثر صرف مہاتما گاندھی اور حکیم اجمل خاں کا پڑا۔ گاندھی جی کی حق بینی، حق گوئی، حق شناسی اور مجسم انسانیت کی آنچ نے اگر کچھ سونے کو کندن بنایا تو حکیم اجمل خاں کے خلق و مروت، صبر اور حلم نے اس پر جلا کر دی۔

بزرگان قوم میں سے سوا ڈاکٹر انصاری اور مولانا ابوالکلام آزاد کے سب، اس سبے دلی کی فضا میں جو خلافت اور سوراج کی تحریک کے ناکام ہونے کے بعد چھا گئی تھی، اس ادارے کی کشتی کو حکومت کی مدد کے بغیر پار لگانے سے ہمت ہار چکے تھے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین نے وہ کام کر دکھایا جو انگریزی تعلیم پائے ہوئے مسلمانوں کے کبھی خواب و خیال میں بھی نہ آیا تھا۔ انہوں نے گاندھی جی کے مشورے سے جامعہ کے استادوں میں سے ان لوگوں کو جنہوں نے بیس سال تک ڈیڑھ سو ماہوار سے زیادہ نہ لینے اور جامعہ ملیہ کی خدمت کا عہد کیا، انجمن تعلیم ملی کی بنا ڈالی۔ اس انجمن نے جامعہ ملیہ کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور چلایا۔ ارباب حکومت روڑے اٹکاتے رہے۔ بزرگان قوم (الا ماشاء اللہ) دور سے تماشا دیکھتے رہے اور خود داران قوم ذاکر صاحب کی سرکردگی میں روکھی سوکھی کھا کر، موٹا جھوٹا پہن کر ایک آزاد تعلیم گاہ کی تعمیر کرتے رہے۔

۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۷ء تک کا زمانہ ذاکر صاحب کے لئے بڑی سخت آزمائش کا زمانہ تھا۔ یوں تو ہندوستان کے خون میں تحریک آزادی نے ۱۹۱۸ء سے ہیجان پیدا کر رکھا تھا۔ لیکن ۱۹۳۷ء میں حکومت خود اختیاری ملنے کے بعد ہندو مسلمان اہل غرض کی اغراض کے تصادم سے فرقہ داری زہر اس شدت سے پھیلنے لگا تھا کہ ہیجان بحران نے زہر باد کی صورت اختیار کر لی۔ ذاکر صاحب اور ان کی جامعہ ملیہ اس زمانہ میں دوگونہ رنج و عذاب میں مبتلا تھی۔ فرقہ پرست ہندو اور مسلمان چاہتے تھے کہ دونوں کو نفرت کی آگ میں بھسم کر دیں یا جلا کر خاک کر دیں۔ قوم پرور ہندو اور مسلمان چاہتے تھے کہ دونوں کو محبت کی زنجیروں سے سیاست کی جنگ میں گھسیٹ لیں۔ ذاکر صاحب کو پورا احساس تھا کہ اس وقت جب ملک کی موت اور زندگی کا فیصلہ ہونے والا تھا سیاست سب سے زیادہ اہم چیز ہے۔ لیکن معلم کی روح مجاہد کی روح نہ بن سکی۔ دشمنوں کی عداوت اور دوستوں کی محبت دونوں ان کو عملی سیاست میں کھینچنے میں ناکام رہے۔ البتہ ذاکر صاحب نے اپنی سی کوشش کی کہ کانگریس اور مسلم لیگ میں مفاہمت کرانے اور ملک کی تقسیم کو روکنے میں گاندھی جی کا ہاتھ بٹائیں اور انہیں آخر تک یہ آس رہی کہ اس کوشش میں کامیابی ہوگی چنانچہ ۱۹۴۶ء میں جب معتبر ذریعوں سے معلوم ہوا کہ ذاکر صاحب کو پہلی قومی کابینہ میں لینے کی تجویز ہے تو انہوں نے اس امید پر کہ ایک دن کانگریس اور لیگ کی مشترک کابینہ متحد ہندوستان کا اصول مان کر بنے گی، اس وقت وزارت قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اور یہ وہی کر سکتا تھا جو اقبال کی اصطلاح میں مرد فقیر ہو۔ مگر ظاہر ہے ساحل پر رہ کر طوفان کو روکنے کی سعی کیا کامیاب ہوتی۔ فرقہ وارانہ فساد کی آگ بھڑکتی ہی چلی گئی۔ ہندوستان کو تقسیم کرنا ہی پڑا جس کے ساتھ ہندوستان کے مسلمانوں کے جسم و روح تین ٹکڑوں میں تقسیم ہو گئے ——— بھارت، مشرقی پاکستان، مغربی پاکستان۔ ذاکر صاحب کے جگر پر آرے چل گئے، ان کی آنکھوں میں دنیا تاریک ہو گئی۔ مگر اس اندھیرے میں انہیں اپنے فرض کی راہ صاف نظر آتی رہی۔ انہوں نے پاکستان کو دعا خیر دی، اور اپنے آپ کو تن من سے ہندوستان (بھارت) کے حوالے کر دیا۔

۱۹۴۷ء کے بعد کے تین سال ذاکر صاحب کے لئے سخت روحانی کرب اور شدید جسمانی اور دماغی محنت کے تھے۔ اس عرصے میں انہیں دہلی کے مسلمانوں کی تباہی، اضطرار، مایوسی، ہراس، دہلی میں آئے ہوئے ہندوؤں اور سکھوں کی بے سروسامانی، مصیبت، آزردگی، طیش کے جگر خراش منظر دیکھنے پڑے اور ان سب کی یکساں خدمت کرنے والے مردوں اور عورتوں کے ساتھ ان تھک کام کرنا پڑا، گاندھی جی کی شہادت کا جانکاہ صدمہ اٹھانا پڑا، جامعہ ملیہ کو اپنے معتمد ساتھیوں

کے سپرد کر کے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو اندر اور باہر کے بے شمار خطروں سے بچانے کی جدوجہد کرنی پڑی اور اسی زمانے میں یونیورسٹی کمیشن کے ساتھ سارے ملک کی خاک چھاننی پڑی۔ روح دماغ اور جسم تینوں پر مسلسل بوجھ پڑتا رہے تو انسان کہاں تک سہہ سکتا ہے۔ آخر جسم کی قوت برداشت نے جواب دے دیا۔ ۱۹۴۹ء کے آخر میں شدید قلبی مرض (THROMBOSIS) کا حملہ ہوا جس سے جان کے لالے پڑ گئے۔ مگر خدا کو ذاکر صاحب سے کچھ اور کام لینا تھا۔ اس لئے چار پانچ مہینے صاحب فراش رہ کر اچھے ہو گئے۔

۱۹۵۰ء اور ۱۹۵۱ء میں ذاکر صاحب نے اپنا سارا وقت اور توجہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی خدمت میں صرف کی اور جہاں تک ان سے ہو سکتا تھا انہوں نے اس میں امید سے زیادہ ولولہ، بدنظمی میں نظم پیدا کر کے علی گڑھ کو ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں بڑی اونچی جگہ پر پہنچا دیا۔

۱۹۵۲ء سے ان کی مصروفیتوں کا دائرہ بڑھ گیا ہے۔ ہندوستانی پارلیمنٹ کے ایوانِ بالا، یونیورسٹی گرانٹ کمیشن اور اس طرح کی بے شمار عارضی اور مستقل مجلسوں کی رکنیت، انجمن ترقی اردو (ہند)، اور عثمانیہ یونیورسٹی کی تنظیمِ نو کمیٹی کی صدارت ان کے وقت کا بہت سا حصہ لے لیتی ہے۔ اس لئے ان کو مسلم یونیورسٹی کے کاموں میں ہاتھ بٹانے کے لئے بمبئی کے ایڈمنسٹریٹو سروس کے قابل ترین افسر سید نوراللہ صاحب کو بلا کر پرو وائس چانسلر بنانا پڑا ہے۔ مگر اب بھی ان کی توجہ اور سعی کا مرکز علی گڑھ ہے اور اس کو سنوارنے اور سدھارنے میں دل و جان سے لگے ہوئے ہیں۔

ذاکر صاحب کی شخصیت کی نشوونما کا ایک سرسری سا خاکہ کھینچنے کے بعد اب ہم اس میں کچھ تھوڑا سا رنگ بھرتے ہیں تاکہ ان قلمی تصویر کے نقش کسی حد تک ابھر آئیں۔

میرے محترم استاد پروفیسر اشپرانگر نے انسانی شخصیتوں کی چھ بنیادی قسمیں قرار دی ہیں۔ مذہبی، سماجی، علمی، جمالیاتی، سیاسی، معاشی۔ ذاکر صاحب کی شخصیت ان میں سے دوسری قسم سے تعلق رکھتی ہے۔ یعنی گو اس میں مذہب و تصوف، فکر و نظر اور ذوقِ جمال کا خاصا گہرا رنگ ہے اور اقتصاد و سیاست کا کچھ ہلکا سا رنگ موجود ہے لیکن ساری زمین انسان دوستی سے رچی ہوئی ہے۔ ان کے لئے انسان سے، خواہ فرد کی شکل میں ہو یا جماعت کی شکل میں، محبت اور اس کی خدمت کرنا نہ کوئی مذہبی یا اخلاقی فرض ہے، جس کے لئے شعوری عقیدے اور ارادے کی، نہ کوئی علمی اصول ہے جس کے لئے فکر کی اور نہ کوئی سیاسی تدبیر ہے جس کے لئے تدبر کی ضرورت ہو بلکہ وہ تو ان کی فطرت کا قانون ہے جو بلا شعور، بلا ارادہ کام کرتا ہے۔ ہم سنا کرتے ہیں کہ فلاں شخص نے دوستوں عزیزوں یا عام طور پر بندگانِ خدا کی خدمت کا بیڑا اٹھایا ہے۔ فلاں نے قوم و ملت کے لئے اپنی زندگی کو وقف کر دیا ہے۔ دنیا کو تج دیا ہے، ایثار کیا ہے، قربانی کی ہے۔ ذاکر صاحب کو میں نے پچھلے ۳۴ سال میں ہمیشہ افراد اور جماعتوں کی بھلائی کی کوشش میں محو دیکھا ہے۔ لیکن میرے علم و یقین میں نہ انہیں کبھی خدمت کا بیڑا اٹھانے کا احساس ہوا، نہ اپنے آپ کو وقف کرنے کا، نہ تیاگ کا، نہ ایثار و قربانی کا۔ احساس ہوا تو صرف یہ کہ زندگی کا دھارا خود بخود بے تکلف، بے رکاوٹ ایک سمت بہہ رہا ہے اور انہوں نے کہا اچھا ہے بہنے دو۔ سماجی یا انسان دوست ٹائپ کی ایک اور بڑی پہچان ہے اور وہ بھی ذاکر صاحب میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔ ان میں "خودی" اور "بے خودی" اس طرح گھل مل کر شیر و شکر ہو گئی ہے کہ دوسرے انسانوں کے مقابلے میں خواہ وہ کسی ملک، کسی مذہب، کسی طبقے کے ہوں انہیں احساسِ کمتری اور اظہارِ برتری کی کشمکش سے گذرنا، خود فروشی اور خود فراموشی کے بیچ میں جھولنا نہیں پڑتا۔ نئے آدمی سے وہ اس طرح کھلے آغوش اور کھلے دل سے ملتے ہیں جیسے برسوں کا دوست ہو، وہ انسان کو کتاب سمجھ کر اس کی تنقید، تحلیل اور تجزیہ نہیں کرتے کہ کسی جزو کو رد، اور کسی کو قبول کریں، بلکہ جیسا ہے سارے کا سارا لے لیتے ہیں اور اپنے کو تمام و کمال اس کے حوالے کر دیتے ہیں۔ اخلاقی رہنما ہمیشہ سے کہتے آئے ہیں اور ہمارے زمانے میں گاندھی جی نے اس پر بہت زور دیا ہے کہ برے آدمی اور اس کی برائی میں فرق کرو، اس طرح جیسے بیمار اور بیماری میں کرتے ہو۔ برائی کو ضرور برا کہو اور دفع کرنے کی کوشش کرو۔ مگر اس انسان کو جس کے اندر برائی نظر آئے بیمار کی طرح ہمدردی کے قابل، علاج کا محتاج، محبت کا سزاوار سمجھو۔ اس اصول پر اپنی طبیعت کے تقاضے سے عمل کرتے ہوئے میں نے کسی کو دیکھا ہے تو ذاکر صاحب کو۔ برے اعمال کی وجہ سے کسی کو برا سمجھنا تو درکنار،

ذاکر صاحب کی انتہا مروّت اکثر انسان کے جوہر انسانیت کی خاطر اس کے بُرے اعمال کو قبول نہیں تو گوارا تو ضرور کر لیتی ہے۔ کسی کے دل کو ہاتھ میں لینا ان کی طریقت میں حج اکبر ہے اور کسی کے دل کو توڑنا گناہ کبیرہ بلکہ کفر ہے۔ ان کی طبیعت حوصلہ مند ہے اور قومی اعزاز، اجتماعی منصب بے مانگے ملے تو ان کا دل قبول کرنے کو چاہتا ہے۔ لیکن اگر اس میں کسی حریف کا مقابلہ کر کے اس کو شکست دینا ہو، کسی انسان کو روند کر آگے بڑھنا ہو تو وہ فوراً پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔ جب ذاکر صاحب تعلیم کے لئے برلن پہنچے تو وہاں کے ہندوستانیوں کی قومی انجمن ہندوستان ایسوسی ایشن کے عہدہ داروں کا انتخاب درپیش تھا۔ ذاکر صاحب کی شخصیت نے چند ہی روز میں اتنا گہرا اثر ڈال رکھا تھا کہ بہت بڑی اکثریت ان کو صدر منتخب کرنا چاہتی تھی۔ لیکن ذاکر صاحب اپنے حریف کے حق میں دستبردار ہو گئے۔ دوسرے سال جب لوگ انہیں اچھی طرح جان گئے تھے اور کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ آ سکتا تھا کہ وہ ان کا حریف بنے، بلا مقابلہ وہ صدر منتخب ہوئے۔

انسان دوستی کے جذبے سے گہرا رنگ ذاکر صاحب کی شخصیت میں خدا پرستی کا ہے۔ ان کی دینداری دنیاداری کے پردے میں سے یوں بھی تھوڑی بہت جھلکتی رہتی ہے۔ لیکن اچھی طرح نکلتی اس وقت ہے جب آس پاس کی فضا میں مایوسی کا اندھیرا چھا جاتا ہے۔ ان کے ایمان کی ثابت قدمی اس وقت ظاہر ہوتی ہے جب اچھے اچھوں کے ایمان ڈانواں ڈول ہو جاتے ہیں۔ اس کی سب سے روشن مثال وہ ہے جب ستمبر ۱۹۴۷ء میں دہلی میں مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ ہو گیا تھا۔ جامعہ ملیہ کے کارکنوں کی جان ہر وقت خطرے میں تھی۔ اس کے بہت سے سچے ہمدرد جو اہل اقتدار سمجھے جاتے تھے اصرار کر رہے تھے کہ کچھ دن کے لئے دہلی چھوڑ کر کہیں اور چلے جاؤ۔ لیکن ذاکر صاحب کے قدم مجھے رہے اور ان کی وجہ سے ہزاروں اکھڑے ہوئے قدم پھر جم گئے۔ جسمانی اور روحانی ہلاکت کے سیلاب میں ذاکر صاحب نے نہ خود اپنا لنگر سنبھالے رکھا بلکہ بہت سے ڈوبنے والوں کو یہاں تک کہ ان لوگوں کو جو خود ان کو ڈبونا چاہتے تھے، سہارا دے کر کنارے پر پہنچا دیا۔ ان دنوں ذاکر صاحب نے ایک دوست کو لکھا تھا کہ مجھے انسان کی انسانیت پر بھروسہ ہے۔ جنون کی یہ لہر دیکھتے دیکھتے گذر جائے گی۔ ظاہر ہے انسان کی انسانیت پر ایسا بھروسہ وہی کر سکتا ہے جو خدا کی خدائی پر اٹل ایمان رکھتا ہو۔

نفاستِ ذوق اور لطافتِ احساس وہ صفات ہیں جو ذاکر صاحب کی شخصیت کی گہرائی سے ناسازگار ماحول کے باوجود ابھر کر رہیں۔ مولوی بشیر الدین کے اٹاوے اور ذاکر شبیاء لدین کے علی گڈھ میں رہ کر شعر و ادب اور فنونِ لطیفہ کا ذوق رکھنا، روزمرہ کی زندگی میں رہن سہن اور اخلاق و آداب میں بیرونی صفائی اور ستھرائی اندرونی پاکیزگی اور حسن و تناسب کا لحاظ رکھنا بہت دشوار تھا۔ مگر ذاکر صاحب نے کر دکھایا۔

جامعہ ملیہ کے دورِ تنگدستی ہی میں ذاکر صاحب نے اپنے گھر اور اپنے ادارے کو سادگی اور سلیقے کا نمونہ بنا دیا تھا۔ اب علی گڈھ میں جہاں انہیں مقابلتاً فراغت حاصل ہے، ان کی ذاتی توجہ اور اہتمام کی بدولت وائس چانسلر کے بنگلے سے لے کر یونیورسٹی کی آخری حدود تک ساری بستی گلزار نظر آتی ہے۔ سڑکوں نالیوں، چپے چپے کی صفائی سے صحتِ جسم و صحتِ دماغ دونوں کی سطح اونچی ہو گئی ہے۔ علی گڈھ کی بے ہنگم اور بدنما عمارتیں ذاکر صاحب کی آنکھوں میں طالب علمی کے زمانے سے کھٹکتی ہیں۔ مگر ظاہر ہے انہیں ایک دم سے گرا کر بدل نہیں سکتے۔ اب جہاں تک وسائل میسر آتے ہیں نئی عمارتیں اپنے مذاق کے مطابق بنوا رہے ہیں۔

موسیقی اور مصوری میں ذاکر صاحب خاصا وسیع ذوق رکھتے ہیں اور مشرقی اور مغربی فنکاروں کے کمال سے یکساں لطف اندوز ہوتے ہیں۔ ان کے پاس منتخب تصویروں اور ریکارڈوں کا ایک چھوٹا سا مجموعہ ہے جس میں آہستہ آہستہ اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ خطاطی کا فن بھی ان کا پسندیدہ فن ہے اور ایک زمانے میں ان کے پاس کتبوں کا بہت اچھا ذخیرہ تھا۔ جس کا بڑا حصہ ضائع ہو گیا۔ شعر میں ان کی دلچسپی کا دائرہ اردو، فارسی، انگریزی، جرمن شاعری کو محیط کئے ہوئے ہے۔ مگر سب سے زیادہ حظ وہ فارسی شاعری سے خصوصاً اقبال کے فارسی کلام سے اٹھاتے ہیں۔ ذاکر صاحب کو جھوم جھوم کر دلکش لحن میں اقبال کے شعر پڑھتے سنئے تو آپ کو یاد آ جائے گا کہ اقبال مفکر، معلم، مصلح ہونے کے علاوہ شاعر بھی تھے۔

علمی مشاغل میں ذاکر صاحب کو سب سے زیادہ پڑھنا اس سے کم پڑھانا اور اس سے کم لکھنا مرغوب ہے۔ کتب بینی کا ان کو اتنا گہرا اور

سچا شوق ہے کہ انتہائی مصروفیت، پریشانی یہاں تک کہ علالت کی حالت میں بھی اس کا تھوڑا بہت سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ باقاعدہ تحصیل انہوں نے علمِ معاشیات کی کی تھی اور آگے چل کر فنِ تعلیم کو اپنا فن بنایا لیکن ان کا مطالعہ ان دونوں کے علاوہ اور دنیا بھر کے موضوعات پر بھی حاوی ہے۔ البتہ قصے کہانیاں جن کا شوق اس زمانے میں لوگوں کو خبط کی حد تک پہنچ گیا ہے، ذاکر صاحب کم پڑھتے ہیں، درس و تدریس کا کام جب تک انہوں نے کیا خاص دلچسپی سے کیا لیکن باقاعدہ درس سے زیادہ ان کو اس کی لگن تھی اور اب بھی ہے کہ طلبہ کے دل میں عام مطالعے کا اپنی اپج سے پڑھنے اور لکھنے کا شوق پیدا کریں۔ علی گڈھ ہی پر موقوف نہیں کسی یونیورسٹی کا کوئی نوجوان طالب علم یا استاد جو زر و منصب کی طلب اور پارٹی بازی کی لت سے محفوظ رہ کر خلوص سے علمی کام کرنا چاہتا ہے، ذاکر صاحب کو دل سے عزیز ہوتا ہے اور وہ اس کی اپنے امکان بھر پوری مدد کرتے ہیں۔

ذاکر صاحب اردو و انگریزی تقریر و تحریر پر پوری قدرت رکھتے ہیں۔ ان کی تقریر سادگی اور پرکاری میں ان کی شخصیت کی بولتی ہوئی تصویر اور ان کی تحریر اگر یکسوئی سے لکھی ہوئی ہو، بے ساختہ پن، جوش اور خلوص میں ان کی سیرت کا آئینہ ہوتی ہے۔ لیکن ہندوستان کی علمی اور قلبی دنیا کو ذاکر صاحب سے یہ شکایت ہے کہ وہ بہت کم بولتے اور لکھتے ہیں۔ تقریر سے بچنے کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ قلب کی بیماری کا دورہ پڑنے کے بعد ڈاکٹروں نے ذاکر صاحب کو زیادہ تقریر کرنے سے منع کر دیا ہے۔ شاید اس وجہ سے کہ وہ اس میں دل کی طاقت بہت کھپاتے ہیں۔ اب رہی تحریر سو اس کے لئے آج کل تو انہیں جتنی فرصت چاہئے وہ نصیب نہیں، لیکن دراصل یہ ان کی پرانی کمزوری ہے کہ لکھنے کے کام کو برابر ٹالتے رہتے ہیں یہاں تک کہ یا تو وہ بالکل ہی ٹل جاتا ہے یا عین وقت پر رات بھر جاگ کر پورا کیا جاتا ہے۔

لوگوں کو مشکل سے یقین آئے گا کہ بیسویں صدی کی دوسری چوتھائی میں ہندوستان میں زندگی گزارنے اور جامعہ ملیہ اور مسلم یونیورسٹی جیسی قومی اور ملی تعلیم گاہوں کے وائس چانسلر رہنے کے بعد ذاکر صاحب سیاست سے بالکل بے تعلق رہے۔ سیاسی لیڈر بننے کے لئے جن اوصاف کی ضرورت ہے ان میں سے اکثر ذاکر صاحب میں بڑے بڑے لیڈروں سے زیادہ موجود ہیں —— مردم شناسی، موقع شناسی، مصلحت بینی، شخصیت کی کشش، زبان کی طلاقت، جلد فیصلہ کرنے کی قوت۔ مگر ایک تو معلمی کی غالب صلاحیت نے انہیں اس طرح باندھ کر جکڑ لیا کہ کسی اور صلاحیت کے آزمانے کا موقع ہی نہیں دیا۔ دوسرے اور سب صفات کے باوجود ان میں ایک صفت یعنی سخت دلی کی اس حد تک کمی ہے کہ سیاسی لیڈری کے میدان میں ان کا کامیاب ہونا بہت مشکل ہے۔ جس کا دل دوسرے کو گراتے ہوئے دکھتا ہو وہ اس اکھاڑے میں ہر ایک سے چت ہو سکتا ہے۔

سب سے زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ اقتصادیات اور معاشیات میں مہارت حاصل کرنے کے باوجود اقتصاد و معیشت ذاکر صاحب کا سب سے کمزور پہلو ہے۔ جہاں تک ان کا بس چلتا ہے وہ کوئی کام پہلے سے پورا منصوبہ بنا کر نہیں کرتے۔ اس لئے اکثر انہیں بے جا زحمت اور زیرباری اٹھانی پڑتی ہے۔ ضبط و نظم کی کمی نے ان کی کارکردگی کو جتنی ہو سکتی تھی، اس سے کم کر دیا ہے۔ ان کا معاشی قانون یہ ہے کہ طلب کو رسد کا پابند نہیں بلکہ رسد کو طلب کا پابند بناؤ۔ چادر دیکھ کر پاؤں نہ پھیلاؤ بلکہ پاؤں دیکھ کر چادر بناؤ۔ یہ بات اصولاً بالکل صحیح معلوم ہوتی ہے لیکن اس پر عمل کرنے میں بڑی دشواریاں پیش آتی ہیں۔ جہاں تک قومی کاموں مثلاً جامعہ ملیہ اور مسلم یونیورسٹی کا تعلق ہے ذاکر صاحب کا یہ اصول کہ وہ خرچ ضرورت یا حوصلہ کے مطابق بڑھاتے چلے جائیں اور آمدنی خرچ کے مطابق بڑھنے کی امید رکھیں، عموماً کامیاب رہا اس لئے کہ قوم اور حکومت کو ان کی جرأت رندانہ کی لاج رکھنی پڑی۔ لیکن نجی زندگی میں انہیں بے اندازہ خرچ کرنے سے نہ صرف عسرت کے زمانے میں سخت دقتیں اٹھانی پڑیں بلکہ اب یک گونہ فراغت کے زمانے میں بھی اٹھانی پڑتی ہیں اس لئے کہ جس نسبت سے آمدنی بڑھی اسی نسبت سے جا و بیجا خرچ خصوصاً داد و دہش بھی بڑھتی چلی گئی۔

ہم نے دیکھا کہ ذاکر صاحب کی شخصیت کے کئی پہلو ہیں مگر ان میں مرکزی اور بنیادی حیثیت انسان دوستی کو حاصل ہے۔ انسان دوست شخصیت دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک مرشد و معلم کی دوسرے مصلح و مجاہد کی۔ مرشد و معلم کی توجہ کا موضوع انسان بحیثیت فرد کے ہے۔ وہ ارشاد و ہدایت

تعلیم وتربیت کے ذریعے افراد کے اندر ان قدروں کو پیدا کرتا ہے جو اسے انسانیت کے بلند منصب کے سزاوار بنائیں۔ مصلح ومجاہد کا کام انسانی جماعت یا سماج کا سدھار کرنا ہے، یعنی ان خرابیوں سے جو سماج میں پیدا ہوگئی ہیں لڑنا اور ان کو دور کرنا تاکہ انسانیت کی دبی ہوئی قدریں ابھر آئیں، چمک اٹھیں۔ دونوں قسم کے انسان دوستوں کی زندگی کا قانون محبت ہے لیکن ایک کے ہاں محبت جمالی شان دکھاتی ہے اور دوسرے کے ہاں جلالی۔ کبھی کبھی یہ دونوں شانیں ایک ہی شخصیت میں جمع ہو جاتی ہیں۔ اور وہ پیمبرانہ یا مجدد کی شخصیت بن جاتی ہے۔

ذاکر صاحب کی انسان دوستی اب تک مرشد و معلّم کی شان رکھتی ہے۔ وہ انسان کو فرد کی حیثیت سے دیکھتے ہیں اس کی روح سے محبت رکھتے ہیں۔ اور اسے تعلیم و ہدایت کے ذریعے سنوارنا چاہتے ہیں۔ وہ کہا کرتے ہیں اچھے مسلمان پیدا کرو، اچھی اسلامی جماعت پیدا ہو جائے گی اچھے ہندوستانی بناؤ اچھا ہندوستان بن جائے گا۔ لیکن وہ اس بات کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ معلّم کا مدرسہ ہو یا مرشد کی خانقاہ، دونوں کا اثر فرد کی تعلیم و ہدایت میں محدود ہے۔ دوسرے اجتماعی ادارے خاندان، طبقہ، قوم، مذہب، رسم و رواج اگر الگ الگ نہیں تو مل کر انسانی شخصیت کی تشکیل میں کہیں زیادہ اثر انداز ہوتے ہیں۔ اگر ان اجتماعی سانچوں میں سے اکثر خراب ہو گئے ہوں، اگر آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہو تو معلّم اور مرشد کی ساری سعی رائگاں جاتی ہے جب تک کوئی مصلح اور مجاہد اجتماعی سانچوں کو نہ سدھارے یا ان کو توڑ کر نئے سانچے نہ بنائے اور جو ایک ہی شخص میں معلّم اور مرشد کے ساتھ مصلح اور مجاہد یعنی مجموعی طور پر مجدد کی شان پیدا ہو جائے تو پھر کیا کہنا!

شاید ذاکر صاحب جیسے صوفی منش کو یہ توڑ پھوڑ قانونِ وحدت اور آئینِ محبت کے خلاف نظر آئے لیکن اس مشکل کو اس مردِ عارف نے حل کر دیا ہے جس نے کہا ہے ؎

نقشِ حق را ہم بہ امرِ حق شکن!
بر زجاجِ دوست سنگِ دوست زن

اور اس مردِ عمل نے ثابت کر دیا کہ پرانے سانچے خواہ سنگ و خارا کے بنے ہوئے ہوں بے تیشہ و گرز محض نسبت بالحق صرف "ستیہ گرہ" سے توڑے جا سکتے ہیں۔

کے چکنے چکنے پات۔ انٹرنس تو تعلیم کی پہلی منزل تھی اور آپ کو اس صحرا کا ہفت خواں طے کرنا تھا۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہو کر انگریزی کا ایم اے پاس کیا اور یونیورسٹی میں سب سے اول رہے جس پر آپ کو گولڈ میڈل اور مبلغ ایک صد روپے کی تھیلی انعام میں حاصل کی۔ اس وقت آپ کی عمر ۱۹ سال سے کم تھی۔ چھوٹی عمر میں یہ اعزاز۔ خدا جسے چاہے عطا کرے۔ ایم اے پاس کرنے کے بعد آپ کی ژرف نگاہی اور علمی موشگافیوں کا شہرہ پڑھا تو ایم اے او کالج علی گڑھ نے آپ کو کھینچا۔ وہاں آپ نواب وقار الملک کے عہد میں لیکچرار مقرر ہوئے۔ کوئی ایک سال وہاں گزرا ہوگا کہ ۱۹۰۷ء یا ۱۹۰۸ء میں گورنمنٹ کالج لاہور میں منتقل اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہوئے۔ اور یہاں برسوں طلبا کو علم کی دولت سے مالا مال کرتے رہے۔ منطق، ادب، فلسفہ تاریخ غرض ہر شعبۂ علمی میں کامل دسترس حاصل ہے۔

۱۹۱۸ء میں آئی ای ایس کے درجہ میں آپ کو ترقی ملی تو اسسٹنٹ پروفیسر سے پروفیسر ہوئے۔ پھر دہلی اور شملہ میں گورنمنٹ آف انڈیا کے محکمۂ تعلیم میں اسسٹنٹ سکرٹری کا عہدہ ملا۔ جب یہ عہدہ تخفیف میں آیا تو آپ پھر گورنمنٹ کالج لاہور میں اپنے سابقہ عہدہ پر آ گئے۔ لیکن اب کی دفعہ زیادہ جم کر نہ رہے بلکہ لدھیانہ میں ایک نئے سرکاری کالج کی پرنسپلی اختیار کرنے کا حکم ملا۔

۱۹۲۴ء میں ایک نیا کالج رہتک میں کھلا تو دہلی سے قریب ہونے کے باعث وہاں چلے گئے۔ اور یہاں بھی پرنسپل ہو گئے۔ پنڈت جواہر لعل نہرو اسی زمانے میں رہتک آئے تو ایک مقامی کانگریسی لیڈر سے آپ کی تعریف سن کر ملنے کے لیے آئے اور گفتگو کے بعد افسوس ظاہر کیا کہ ایسے قابل آدمی سیاسیات کی بجائے سرکاری ملازمت میں ہیں۔

رہتک میں آپ پورے چار سال تک رہے۔ اس کے بعد کچھ صحت کی خرابی اور کچھ محکمہ کی ناقدر شناسی کے باعث قبل از وقت ملازمت ترک کر دی اور پنشن لے کر اپنے آبائی وطن دہلی میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔

آپ کی اہلیہ محترمہ آپ کے حقیقی ماموں نواب سید محمد علی مرحوم کی صاحبزادی ہیں جو علی گڑھ کالج کے بورڈ آف ٹرسٹیز کے آخری آنریری سیکرٹری اور مسلم یونیورسٹی کے پہلے آنریری خزانچی تھے۔ اور آپ کی ممانی سرسید کے بڑے لڑکے سید حامد کی اکلوتی بیٹی تھیں۔ اس شجرہ سے یہ بات واضح ہو گئی کہ آپ سرسید کے خاندان کے ایک قابل فرد ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس بیوی سے کئی اولادیں مرحمت فرمائیں۔

دہلی کے ترا ہا بیرم خاں میں اولیا مسجد سے ملحق سرِ راہ آپ کے مکان کا پھاٹک تھا۔ اندر داخل ہوں تو ایک مختصر سا احاطہ جس میں نیم کا درخت۔ ایک طرف دو تین سیڑھیاں چڑھ کر ایک چھوٹا سا لمبا کمرہ۔ دنیاوی آرائش و زیبائش سے خالی۔ جاڑے گرمی میں یہی آپ کی نشست گاہ تھی اور مطالعہ کا کمرہ۔ یہیں سب قسم کے لوگ کھنچے چلے آتے تھے۔ ادیب، شاعر، طبیب، ماہرانِ تعلیم، قومی رہنما، ورکار کن، خواجہ حسن نظامی، مولانا راشد الخیری، جوش ملیح آبادی، مسٹر آصف علی، پروفیسر بخاری، مرزا فرحت اللہ بیگ، بہار کے سید محمود مشہور کانگریسی لیڈر، پرنسپل مشتاق احمد زاہدی۔ اختر شیرانی، حکیم محمد احمد خاں دہلوی وغیرہم گھنٹوں پروفیسر صاحب سے مصروف گفتگو رہتے تھے۔ آل انڈیا ریڈیو کے پہلے ڈائرکٹر جنرل مسٹر فیلڈن بھی ایک آدھ مرتبہ مرزا صاحب سے ملاقات کرنے وہیں آئے تھے۔ ستمبر ۱۹۴۷ء میں جب ہر طرف قیامت برپا تھی تو ایک انگریز ماہر قانون جو ہندوستان کا نیا قانون وضع کرنے میں بغرض امداد ولایت سے آیا تھا آپ کے پاس گھنٹوں بیٹھا رہتا تھا۔ ایک مرتبہ آپ دہلی کی قدامت کے متعلق اس سے گفتگو فرما رہے تھے۔ اور وہ اس طرح دم بخود بیٹھا سن رہا تھا جیسے کوئی شاگرد استاد کے سامنے۔ غرض اس دیوان خانے یا کمرے میں لوگ مختلف فیہ مسائل زیرِ بحث لاتے تھے۔ اور پروفیسر صاحب کا فلسفیانہ طرزِ بیان دل نشیں انداز استدلال ہر پیچیدگی کو سلجھا دیتا تھا۔ گو یہ صحبتیں اب خواب و خیال ہو گئیں لیکن ان کی یاد کبھی دل سے محو نہیں ہو سکتی۔ یہ دیوان خانہ پورے سولہ برس تک مرجع عام و خاص رہا۔ آخر ۱۹۴۷ء کے پر آشوب زمانے میں جبکہ محلے کی سلامتی غیر محفوظ ہو گئی اور لوگ اپنے اپنے مکانوں کو خالی کر کے پاکستان چلے گئے یا اور محلوں میں منتقل ہو گئے تو آپ بھی اپنے داماد میجر طیب حسین کے ہمراہ (جو حال میں پاکستان کے نائب سفیر تھے) دہلی سے راولپنڈی پہنچے۔ اور وہاں ایک سال رہ کر اب کراچی میں مقیم ہیں۔

پنشن کے بعد آپ کے مشاغل کا کچھ حال تحریر کیا جا چکا ہے۔ اس کے علاوہ دہلی یونیورسٹی۔ اینگلو عربک کالج۔ ہارڈنگ لائبریری، آل انڈیا ریڈیو کی مشاورتی مجلس کے اعزازی رکن کی حیثیت سے مفید کام سرانجام دیتے رہے۔ نیز مختلف یونیورسٹیوں اور پبلک سروس کمیشنوں کے ممتحن بھی رہے۔ حیدر آباد دکن کی سول سروس کے پرچے آپ کے پاس آتے تھے۔ یہ سارے کام صرف علمی خدمت کو مدِ نظر رکھ کر کئے جاتے تھے، اور حصولِ زر کی خواہش نہ تھی۔ مزاج میں توکل و استغنا حد سے زیادہ ہے۔ اور یہ صفت ہر باکمال آدمی میں دیکھی گئی ہے۔ آپ اسی پنشن پر قانع تھے جو آپ کی تنخواہ کا تہائی حصہ بھی نہ تھی۔ اسی میں سارے خرچ پورے ہوتے تھے۔ چونکہ خدا پر پورا توکل ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے آپ کی مختصر آمدنی میں برکت عطا فرما دی ہے۔ غالباً ۱۹۲۶ء میں پہلی مرتبہ مجھے جناب کی خدمت میں نیاز حاصل ہوا۔ اس کے بعد سے آپ کے دہلی چھوڑ آنے تک تقریباً اکیس سال کی ملاقات میں کبھی کوئی موقع ایسا نہیں آیا کہ میں نے آپ کو کسی طرح کی مالی پریشانی کا ذکر کرتے سنا ہو۔ ہمیشہ آپ کے چہرے پر اطمینان کی کیفیت پائی۔

بچپن سے تلاشِ علم کا جذبہ تھا اور اہلِ علم کی صحبت نشینی کا شوق۔ اس زمانے میں مولوی نذیر احمد صاحب مرحوم ہر سال انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسے میں شرکت کے لئے لاہور آتے اور آپ کے والد مرحوم کے پاس فروکش ہوتے۔ یہ سلسلہ ۱۹۰۵ء تک جاری رہا۔ آپ ان کی باتیں سنتے اور ان سے نہایت متانت سے باتیں پوچھتے۔ مولوی صاحب آپ کی غیر معمولی ذہانت سے بہت خوش ہوتے اور آپ سے خاص محبت سے پیش آتے۔ بعض دفعہ انجمن کے جلسے میں اپنی تقریر کے دوران میں نظم یا اشعار آپ سے پڑھواتے۔ اور اس کام کے لئے آپ کو بھرے جلسے میں میز پر کھڑا کر دیتے۔

لاہور کے زمانۂ طالب علمی میں علامہ اقبال۔ شیخ عبدالقادر ایڈیٹر مخزن۔ جسٹس شاہ دین ہمایوں، میاں عبدالعزیز فلک پیما خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ یہ سب لوگ آپ سے عمر میں بڑے تھے لیکن جلد یہ تعلقات برابر کی دوستی میں تبدیل ہو گئے۔

جس کسی اہلِ نظر کو آپ سے کچھ واسطہ پڑا گرویدہ ہو گیا۔ ان میں بعض بڑے بڑے آدمی بھی شامل ہیں۔ مثلاً سروجنی نائیڈو اس قدر مہربان تھیں کہ جب ۱۹۱۸ء کے لگ بھگ بحیثیت ایک آل انڈیا لیڈر کے لاہور تشریف لائیں تو کئی ہندو مسلمان عمائدینِ شہر کی میزبانی کی پیش کش کو رد کر کے آپ کی مہمان ہوئیں۔

گورنمنٹ کالج لاہور کے بیشتر طلباء جن میں سر محمد ظفراللہ خاں سابق وزیر خارجہ پاکستان۔ پروفیسر اے۔ ایس بخاری (پطرس) جیسے نام آور لوگ شامل ہیں آپ کے عقیدت مند شاگردوں میں سے ہیں۔ اسی طرح علی گڑھ کالج کے اکثر طلباء جن میں مشہور کانگرسی لیڈر سید محمود بہاری اور سید حسین مرحوم جو مشہور اخبار نویس تھے اور آخر میں ہند سرکار کی طرف سے قاہرہ میں سفیر بن کر گئے تھے آپ کے شاگردوں کی صف میں نظر آتے ہیں۔ ان کے علاوہ سینکڑوں شاگرد ہیں جو آج جلیل القدر عہدوں پر ممتاز ہیں۔ جس طرح مفتی صدر الدین صدر الصدور آزردہ دہلوی کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ان کا ایک بھی شاگرد ایسا نہیں تھا جو دنیاوی وجاہت سے محروم رہا ہو۔ ٹھیک اسی طرح آپ کے شاگرد بھی خدا کے فضل و کرم سے عزت و ناموری کی بلند سطح پر پہنچتے رہے۔

اردو تو خیر اپنی زبان ہے۔ انگریزی تحریر و تقریر کی قابلیت کا لوہا انگریز تک مانتے رہے۔ انگلستان کے مشہور پروفیسر اور نقاد سر البور ایلٹن SIR OLIVER ELTON جب پنجاب یونیورسٹی کی دعوت پر لاہور آئے تو آپ سے ملاقات کر کے دریافت کرنے لگے "WHERE DID YOUR LEARN TO SPEA K THIS BEAUTIFUL ENGLISH" پھر جب یہ معلوم ہوا کہ آپ کبھی ولایت نہیں گئے تو بے حد متعجب ہوئے۔

عربی فارسی کے علاوہ فرانسیسی اور ہندی میں اس قدر استعداد ہے کہ دونوں زبانوں کی کتابیں بلا تکلف پڑھ سکتے ہیں۔ فلسفہ کالج میں خود پڑھا تھا اور برسوں گورنمنٹ کالج لاہور میں پڑھاتے رہے۔ تاریخ سے ہمیشہ دلچسپی رہی۔ خصوصاً اسلام کی مذہبی اور سیاسی تاریخ سے جو آپ کو واقفیت ہے بہت کم تاریخ دانوں کو ہوگی۔ مشرقی اور مغربی ادبیات میں ایک سند کا درجہ حاصل ہے۔ قدیم افسانے اور جدید ناول بھی آپ کے مطالعہ اور توجہ کا مرکز رہے ہیں۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

پاکستان سے لگاؤ فطری طور پر تھا۔ اگرچہ عملی طور پر آپ نے سیاست میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ ایک مرتبہ دہلی میں صوبائی مسلم لیگ کا صدر بنا دیا گیا تھا مگر خاص علمی مشاغل کے پیش نظر استعفا دے دیا۔ لیکن وہ اس بات کے زبردست حامی تھے کہ مسلمانوں کا ایک علیحدہ وطن ہو جس میں ان کی تہذیب، تمدن اور مذہب کو پھلنے پھولنے کا موقع ملے۔ جس زمانے میں مسلم لیگ نے کیبنٹ مشن کے پلان کے مطابق ہندوستان کی سالمیت کو عارضی طور پر منظور کر لیا تھا تو اس پر آپ بہت رنجیدہ ہوئے تھے۔ دراصل آپ ایک مخلص مسلمان ہیں اور سچائی و دیانت داری کے ساتھ اس نتیجے پر پہنچے کہ اس برصغیر کے مسلمان اس وقت تک نہیں پنپ سکتے جب تک ایک خطہ ان کے پاس نہ ہو۔ اس خیال کے مطابق کانگریس سے اختلاف ہونا لازمی چیز ہے۔ باایں ہمہ یہ اختلاف ان دوستانہ مراسم میں حائل نہیں ہوا جو کانگریس کے سرکردہ لیڈروں سے تھے۔

طبیعت کی نفاست اور پاکیزگی حد سے بھی کچھ آگے ہے۔ ایک مرتبہ کسی یونانی دواخانے سے جوارش شاہی منگوائی۔ اتفاق سے عطار نے جوارش ٹین کی اصلی ڈبیہ میں دینے کی بجائے جست کی ڈبیہ میں دے دی۔ ڈبیہ اگرچہ نئی تھی مگر چونکہ جست کا رنگ میلا ہوتا ہے۔ آپ نے اسے دیکھنا بھی گوارا نہ فرمایا۔ اور پھینک دی۔ اسی طرح ایک اور دماغی طاقت کے لئے کوئی معجون منگوائی تھی۔ جب اس کا پیکنگ کھولا تو ڈبیا پر غلطی سے طلائے اعظم کا لیبل لگا ہوا تھا۔ یہ دیکھ کر طبیعت حد درجہ منغض ہوئی اور دوا کو دیکھے بغیر ہی اٹھا کر پھینک دیا اور مجھ سے شکایت کی کہ ہمارے دواخانوں میں کتنی بے غوری سے کام ہوتا ہے۔

ضابطہ کی پابندی کی صرف ایک مثال ہی پیش کرنی کافی ہوگی۔ عثمانیہ یونیورسٹی نے سے آپ کو انگریزی کا پرچہ بنانا تھا اور اس کے لئے بیک وقت سات آٹھ کتابوں کی ضرورت تھی۔ اور یہ کتابیں دہلی یونیورسٹی کی لائبریری میں موجود تھیں۔ آپ اس یونیورسٹی کے ممتحن بھی تھے اور لائبریری کے ممبر بھی۔ وہاں کے ہیڈ کلرک عبدالسلام صاحب آپ کے ہمسایہ بھی تھے اور ملاقاتی بھی۔ لیکن دو کتابوں سے زیادہ ایک وقت میں نکالنے کا قاعدہ نہ تھا۔ لہٰذا آپ نے مجھ سے فرمایا کہ یہ کتابیں اپنے طور پر کہیں سے فراہم کیجئے میں اپنے اثر و رسوخ سے اس قاعدہ کو توڑنا نہیں چاہتا۔

فرض شناسی کا یہ عالم کہ ممتحن بننے سے اس لئے انکار کر دیا کہ طالب علموں کو پڑھانے کا واسطہ نہیں رہا جس سے ان کے معیار کا اندازہ ہوتا مبادا پرچہ بنانے یا دیکھنے میں ان کی حق تلفی ہو جائے۔

غرض یہ جامع کمالات ہستی پاکستان کے دارالحکومت کراچی میں خاموش زندگی گزار رہی ہے۔ اور وہ آنکھیں بند ہیں جو اس ہیرے کی آب و تاب دیکھتیں اور اس کے علم و فضل سے اپنے ملک کو منور ہونے کا موقع بہم پہنچاتیں ؎

کب ایسے لوگ ہوتے ہیں پیدا جہان میں
افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

آخر میں مجھے اپنے محترم جناب مرزا محمد رشید صاحب ایم۔ اے ریٹائرڈ پرنسپل گورنمنٹ کالج لدھیانہ ساکن حال ملتان کا شکریہ ادا کرنا ہے کہ جناب نے اپنے برادر گرامی قدر کے متعلق مجھے کافی معلومات بہم پہنچائیں۔

"[illegible]"

"[illegible]"

"[illegible]"

"[illegible]"

"[illegible]"

[illegible]:

[illegible]

[illegible]

[illegible]

"مشرق و مغرب کے طریقۂ ازدواج پر!"

"اوہو ہو! یہ آپ بڑے میاں کب سے ہو گئے؟ ایک داڑھی اور لگا لیجئے شیخ صاحب!"

میری آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ قادری صاحب قریب تھے۔ انہوں نے شاید معاملہ کی نزاکت کو سمجھا اور ان کے ہاتھ سے مضمون لیتے ہوئے بڑی دلکش نرمی کے ساتھ فرمایا "واہ واہ! بڑا اچھا عنوان ہے یہ تو۔ جب بچپن کی شادیاں ہوں تو بچوں کی بھی تو ایک رائے ہونا چاہئے۔" چند جملے زور سے پڑھے اور شاباش دی۔

اس واقعہ کے بعد میں نے وہ مضمون ڈاک کے سپرد نہیں کیا۔ لیکن دو ڈھائی سال کے بعد وہ اعتماد پھر لوٹا اور میں نے اسے "عالمگیر" لاہور کو بھیج دیا جس نے اسے "مولانا خواجہ احمد فاروقی" کے نام سے چھاپا ——— حامد علی صاحب کی بات غلط نہ تھی!

قادری صاحب کی وہ صورت، اور وہ دل نواز تبسم اب تک میری آنکھوں میں پھر رہا ہے۔ خوب گورا چٹا رنگ، معمولی ناک نقشہ، موٹی سی عینک لگائے ہوئے، سفید نورانی داڑھی، پستہ قد، دبلے پتلے، چھوٹی بوٹی کے چکن کی بہت صاف دھلی ہوئی شیروانی، پتّے کی بیل دار سفید ٹوپی، جس کا کلف اسی طرح قائم تھا، لیکن نکّے دار نہیں، دہلی کی سی گہری اور مولویانہ، علی گڑھ کاٹ کا پاجامہ لیکن ٹخنوں سے اونچا، آگرے کا سیاہ پمپ گرگابی پہنے ہوئے تھے۔

اس کے بعد سے اب تک میں نے قادری صاحب کو بارہا دیکھا ہے لیکن ان کی وضع قطع میں مطلق کوئی فرق نہیں آیا۔ وہی پاک صورت اور نورانی چہرہ جو پہلے تھا، اب بھی ہے، بلکہ عمر کے ساتھ یہ پاکیزگیٔ وضع اور نورانیت اور بڑھ گئی ہے۔

قادری صاحب بڑے باغ و بہار، زندہ دل اور باعجوبہ لوگوں میں سے ہیں۔ ان کی ہر بات میں لطیفہ اور ہر لطیفہ میں زبان یا ادب کا چٹخارا ہوتا ہے۔ وہ باتیں کم کہتے ہیں لیکن جب کرتے ہیں تو ایسے مزے کی کہ "وہ کہیں اور سنا کرے کوئی"۔ آپ ان سے اختلاف کر سکتے ہیں لیکن یہ ممکن نہیں کہ ان کی بزرگی اور ان کے خلوص نیت کا احترام نہ کریں۔

اور اب سے ان کا تعلق آج کا نہیں، نصف صدی سے زیادہ کا ہے۔ ان کی ولادت بمقام بچھراؤں (ضلع مراد آباد) مارچ ۱۸۸۰ء میں ہوئی۔ ان کے پردادا مولوی محمود عالم، سرسید کے ہم عصر اور دوست تھے۔ غدر میں ثمر الدین ان کے پاس آ کر ٹھہرے تھے۔ مولانا حالی نے حیاتِ جاوید میں لکھا ہے:

> "سرسید برابر اس فکر میں تھے کہ کسی طرح بجنور سے نکل کر میرٹھ پہنچ جائیں۔ مگر موقع نہ ملتا تھا..... میر صادق علی نے خود ساتھ ہو کر ان کو موضع نجو لنہ تک پہنچا دیا۔ وہاں سے سرسید نے بچھراؤں پہنچ کر بسبب ملالت اور رستے کی کوفت کے چند روز مولوی محمود عالم کے مکان پر جو ان کے دوست تھے، مقام کیا اور اپنی مفصل سرگذشت حکامِ انگریزی کو لکھ بھیجی اور چند روز بعد خود بھی میرٹھ چلے گئے۔"

جب سرسید نے اپنی تحریک شروع کی ہے اور لوگوں نے انہیں کرسٹان مشہور کیا تو اسی گھرانے کی ایک بی بی نے تعجب سے کہا تھا "ہے ہے سید احمد خاں اور کافر! یہاں تو ان کی ایک وقت کی نماز قضا نہیں ہوئی۔ میں نے خود ان کے قرآن شریف پر جولی پڑھائی ہے۔"

قادری صاحب کے والد مولوی احمد حسن رام پور میں وکیل تھے۔ اس کی چمن بندی لکھنؤ اور دہلی کی خزاں سے ہوئی تھی اور وہ غدر کے بعد اہل کمال کے لئے دارالسرور بن گیا تھا۔ "ناظم منیر آئے یہاں، ہم ہیں قدرداں" مخصوص دعوت کے ساتھ صلائے عام بھی ہے۔ چنانچہ ۱۸۵۸ء میں امیر رام پور پہنچ گئے اور عدالت عالیہ کا منصب افتا ان کے سپرد کیا گیا۔ اس وقت ہر جگہ شاعری کے چرچے تھے۔ زبان کا کھرا کھوٹا پرکھا جا رہا تھا اور ایک ایک لفظ کی تراش خراش دیکھی جا رہی تھی۔

لہ صفحہ نمبر ۲۸۰ کے بعد ۲۷۳، ۲۷۴ غلطی سے دوبارہ لگ گیا ہے۔ لیکن مضمون مسلسل ہے۔

قادری صاحب نے اسی ماحول میں ہوش کی آنکھ کھولی اور ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی جو خود اچھے شاعر، عالم اور محدث تھے۔ ان کا گھر فرنگی محل کہنہ میں امیر مینائی کے گھر سے زیادہ دور نہیں تھا۔ جب نومبر ۱۸۹۹ء میں امیر کے گھر میں آگ لگی ہے تو قادری صاحب کے الفاظ میں اس کے "اڑ اڑ کر" یہاں گرتے تھے۔" اس آگ سے متعلق امیر مینائی زاہد حسین رئیس سہارن پور کو لکھتے ہیں:

"میں ایسی کاہشوں میں رہا اور ہوں کہ میری کوتاہ قلمی عفو کے قابل ہے۔ مرض سے رنجوری و معذوری ایک طرف۔
نومبر کے مہینے میں آگ نے زنانے مکان سے مشتعل ہو کر مردانے مکان تک دو پہر میں تمام اسباب راحت،
سامانِ معاشرت جلا کر خاک کر دیا۔ قلمی اور مطبوعہ کتابیں بھی بہت سی جل گئیں۔ بڑا حصہ میرے کلام غیر مطبوعہ کا
بھی نذرِ آتش ہوا۔" (خطوط امیر مینائی ص ۲۱۶)

قادری صاحب داستان تاریخ اردو کے ایک حاشیہ میں لکھتے ہیں:

"بعض تذکروں میں آگ لگنے کا سال ۱۸۹۵ء درج ہے اگر ایسا ہے تو ممکن ہے وہ آگ پہلے لگی ہو۔ ۱۸۹۹ء میں
آگ لگنا خود مجھے یاد ہے۔ میں رام پور میں حضرت امیر مینائی کے محلے میں ان کے مکانات سے قریب ہی رہتا تھا
میرا لڑکپن کا زمانہ تھا۔ آگ ایسے غضب کی تھی کہ اگرچہ مکان آتش زدہ سے میرا مکان فاصلے پر تھا ———
——— پھر بھی وہاں سے جلے ہوئے کاغذ اڑ کر میرے گھر آتے تھے۔ اس حادثہ سے ہم سب پر
عجیب ہیبت چھائی ہوئی تھی۔ امیر صاحب اور جلیل صاحب کا دیکھنا اچھی طرح یاد ہے۔ بعض نقرے بھی جن میں شریک
ہوا یاد ہیں۔" (ص ۲۶۹)

اس وقت قادری صاحب کی عمر گیارہ برس کی تھی، لیکن وہ امیر و داغ کے اشعار گنگناتے اور ان سے مزے لیتے تھے۔ انہوں نے منشی امتیاز احمد خان راز تلمیذ امیر سے اصلاح بھی لی تھی۔ ان کے والد مولوی احمد حسن اور چچا پروفیسر محمد حسن فاروقی استاذ عربی اسلامیہ کالج پشاور، دونوں "بزم احباب" رام پور کے سرگرم ممبر تھے جہاں شعر و شاعری، اخبارات و رسائل کا ذکر رہتا تھا۔ ان کے والد مولوی احمد حسن نے "فسانہ قاضی جون پور" فارسی زبان میں بطرز مثنوی لکھا اور اسے قادری صاحب کے نام منسوب کر کے چھپوا دیا تھا۔ سستے کا زمانہ تھا۔ جہاں میں سو نسخے چھپ گئے۔ یہ مثنوی جس کا تاریخی نام "نظم رنگین" (۱۳۲۰ھ) ہے قادری صاحب کو حفظ یاد تھی اور اسی نے ان کے اندر تاریخ گوئی اور شعر فہمی کی عجیب و غریب صلاحیتوں کو بیدار کیا۔ قادری صاحب کی اکثر تاریخیں ایسی ہیں جن میں اول پورا مصرع تاریخ ذہن میں آیا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ سعادت معمولی نہیں۔ انہوں نے امیر مینائی کی تاریخ وفات کہی تھی: "آں قدح بشکست و آں ساقی نماند" (۱۳۱۸ھ)۔ یا گھر کی نوکری چھوڑتے وقت فرمایا تھا: "رخصت اے اہلِ گھر جاتے ہیں ہم" (۱۹۱۲ء)۔ اب تک انہوں نے دو ہزار سے زیادہ تاریخی مادے نکالے ہیں اور ان میں سے ایک ہزار سے زیادہ نظم کر دئے ہیں۔ پھر کوئی تاریخ ایسی نہیں جس میں کوئی لطیفہ اور کوئی چٹکلہ نہ ہو۔ شگفتگی اور برجستگی بلا استثنا ہر تاریخ میں ملے گی۔ اندر سے چار لا رہے ہیں، ریل میں سوار ہو رہے ہیں، وضو کر رہے ہیں اور تاریخ کہہ رہے ہیں۔ یہ روانی اور آمد تاریخ کے معاملہ میں نہ دیکھی، نہ سنی۔

ان کے بڑے صاحبزادے ساجد حسن قادری کے تیسرا لڑکا ہوا۔ تاریخ نکالی "فرزند ثالث" دوسری تاریخ ہے "سرور دل ہے یہ نورِ نظر بھی" مزے کی بات یہ ہے کہ لڑکا یکم جنوری ۱۹۵۳ء کی صبح کو پیدا ہوا۔ حساب کیسا صحیح ہے!

میں نے "قدیم دلی کالج" نمبر نکالا۔ اس کی عجیب تاریخ نکالی ہے۔ لکھتے ہیں:

"دہلی کالج نمبر موصول ہوا۔ کیا کہنا۔ کیا خوب یادگار قائم کی ہے۔ مضامین، ترتیب، سلیقہ، سب کچھ اعلیٰ سے اعلیٰ۔ بڑی مسرت ہوئی۔ ڈپٹی نذیر احمد اور مولوی ذکاء اللہ وغیرہ سب کی ارواح کی طرف سے جزاک اللہ:

LABOUR OF LOVE

قادری صاحب نچی نظریں کرکے پڑھاتے ہیں اور نیچی نظریں کرکے چلتے ہیں۔ راستہ میں سلام کیجئے، انہیں خبر نہ ہوگی۔ پان بہت کھاتے ہیں لیکن کالج میں نہیں۔ لمبا سفر ہیں رکھتے ہیں لیکن وہ بھی عجوبہ ہے۔ سگریٹ کیس سے ملتی جلتی۔ اس میں چھوٹے چھوٹے پان اور چھالیہ خشخاش کے دانہ کے برابر۔ فاؤنٹین پن پرانا ہے جو اُلٹا اور سیدھا دونوں طرف سے لکھتا ہے اور اس میں بہت سی روشنائی آتی ہے۔ اسی سے انہوں نے ہزاروں صفحے لکھے ہیں۔ خط ایسا پاکیزہ ہے کہ دیکھ کر آنکھوں کا نور بڑھ جاتا ہے۔

قادری صاحب بڑے سنجیدہ، متین اور منکسرالمزاج آدمی ہیں۔ لیکن زاہدِ خشک نہیں۔ وہ روایت پرست ہونے کے باوجود اچھی اور نئی بات جہاں بھی ملتی ہے اسے پسند کرتے ہیں اور داد دیتے ہیں۔ وہ جدید ایرانی افسانوں کے قائل ہیں لیکن جدید ایرانی شاعری کے قائل نہیں۔ ایک مرتبہ کہنے لگے "اقبال کا کلام ایک پلہ میں اور جدید ایرانی شاعری کا پورا سرمایہ دوسرے پلہ میں ——— جب آپ تازو اُٹھائیں گے تو اقبال کا پلہ بھاری رہے گا۔"

قادری صاحب رائے دینے میں بڑے نڈر اور بیباک ہیں۔ لگی لپٹی نہیں رکھتے، لیکن ان کی ادبی بحث کبھی ذاتیات تک نہیں پہنچتی۔ سیماب اکبرآبادی سے ان کے کیسے کیسے علمی مباحثے ہوئے لیکن "ہنوز رنگِ ادب برزخِ سخن باقیست" مجھے ایک خط میں مومن کے متعلق لکھتے ہیں:

"میں نے مومن کی غزلیات کا تو انتخاب مع شرح و تنقید لکھ لیا ہے، ان کی مثنویوں کا بھی انتخاب و تبصرہ لکھنا چاہتا ہوں۔ مگر مقصد یہ ہے کہ میں اپنی عادت کے مطابق کسی کو بخشنے والا نہیں۔ ایسے مضامین بھی نہ چھوڑوں گا ؎

کچھ تجھ کو نہ غم سے کام ہووے
ہر چند کہ غم امام ہووے

ان ہی باتوں نے مومن خان کو مقبول نہ ہونے دیا۔ میری تحریر سے لوگ اور بدکیں گے۔ غنیمت ہے کہ ان کی غزلیں ان جذبات سے خالی ہیں۔"

قادری صاحب ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی دونوں نظریوں کا احترام کرتے ہیں لیکن وہ بے راہ روی اور مغرب کی کورانہ تقلید کو برداشت نہیں کرسکتے۔ وہ اپنی ادبی بنیادوں سے واقف ہیں۔ علمی مزاج رکھتے ہیں اور اپنی تہذیبی عظمت کے شناسا ہیں۔

ایک مرتبہ مرزا شوق کے متعلق قادری صاحب سے گفتگو ہوئی۔ اس سلسلہ میں فرمانے لگے "اشعار سے کسی شاعر کی سیرت اور عادت کے متعلق قطعی حکم نہیں لگایا جاسکتا۔ میری شاعری، تاریخ گوئی، تصانیف، تنقید، ان چیزوں کو میری شخصیت سے کچھ بہت تعلق نہیں۔ کم سے کم تعلق ہونا لازمی اور ضروری نہیں ؎

در حقِ من بہ درد کشی ظن بد مبر!
کآلودہ گشت خرقہ ولے پاک دامنم

امیر مینائی کیسے نیک سیرت بزرگ تھے لیکن شعر کہتے ہیں تو اس رنگ کے:

ع شرم بھی جائے تو میں جانوں کہ تنہائی ہوئی

شبلی کے استاد مولانا فیض الحسن سہارن پوری کا یہ شعر آپ نے سنا ہوگا ؎

پہلے ہی اپنی کون سی تھی قدر و منزلت
پر شب کی منتوں نے ڈبو دی رہی سہی

اور خود علامہ شبلی کا یہ لطیفہ نصیر عالم صاحب نے مجھے سنایا تھا۔ انہوں نے ایک مرتبہ شبلی کے سامنے یہ شعر پڑھا ؎

کارخانے ہیں خدا کے ہے کسے دخل اے لوگو
بچہ تم پہلے جنیں، بیاہ ہوا میرے بعد

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible] [illegible]
[illegible] [illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

بھلا اس کی کیا شک ہے ..... اگر میرے مجبور کی یہی حالت رہی تو آئندہ شاید یہ سلسلہ بالکل ہی ختم ہو جائے مگر میرے دل و دماغ کی یہ کیفیت ابھی لوگوں کی عقل میں نہیں آ سکتی۔ خدا کرے آپ کی عقل میں آ سکے اور یقین کر سکیں۔"

۲۶ مارچ ۵۰ء کے خط میں لکھتے ہیں:

"یہ آپ نے خوب کی کہ شوق کا مقدمہ نہ لکھئے لیکن خیریت لکھئے یعنی میں نے مقدمہ نہیں لکھا تو سب تعلقات خاندانی و برادرانہ منقطع ہوگئے؟ آپ بھی بہت اچھے رہے۔"

۲۰ اکتوبر ۴۲ء کے خط میں اپنا حال لکھا ہے۔ چند الفاظ ہیں لیکن پوری تصویر سامنے آ جاتی ہے:

"میں اچھا ہوں ...... (عید کے روز) بعض احباب نے ڈیڑھ ڈیڑھ دو دو کو ایک ایک بکرا خریدا اور ڈھیر گوشت ہمارے گھر بھیج دیا۔ پھر کیا تھا۔ کیسا بخار اور کہاں کا پرہیز۔ گوشت کیا تھا موٹی موٹی چکنی بے محاط و قصور۔ میں نے بھی خوب اڑایا ــــــ عمدہ گوشت کو میں بغیر روٹی کی لاگ کے کھایا کرتا ہوں خلاصہ نتیجہ یہ کہ عید کے تیسرے دن سے پھر حرارت محسوس ہونے لگی مگر اب اچھا ہوں ..... ضعف بھی کچھ کم ہے۔"

مولوی حفیظ الرحمن صاحب کو آموں کا شکریہ لکھتے ہیں۔ روزمرہ ملاحظہ ہو:

"آج بلٹی ملی اور پارسل آ گیا۔ محفوظ پہنچا مگر اسٹیشن سے گھر تک قلی پر رس ٹپکتا آیا۔ چھوٹے آم نیچے تھے بالکل دب کر بہہ گئے۔ بڑے آم بھی دب کر نرم ہوگئے۔ بہر حال خوب آئے۔ کھائے ہی جائیں گے۔ بہت بہت شکریہ۔" (مورخہ ۲۰ جون ۱۹۵۲ء)

ہڈسن نے لکھا ہے کہ شخصی اور انفرادی تجربہ ادب کی جان ہے۔ اسی لئے شخصیت کا اظہار جتنا ان بے تکلف اور سرسری خطوں سے ہوتا ہے جہاں مصلحت کی دراندازی نہ ہو، اتنا کسی اور ذریعے سے نہیں ہوتا۔ وہ سوانحی مواد کا گنجینہ اور رمز ہیں اور ہم ان کے آئینے میں شخصیت کے اکثر خدوخال صاف دیکھ سکتے ہیں۔ قادری صاحب ہماری قدیم تہذیب کا نمونہ ہیں۔ ان کے نظام فکر میں معاشرتی اور اخلاقی اقدار کا ایک خاص معیار ہے جس کا اظہار بعض خطوں میں بھی ہے

۵ اگست ۱۹۵۳ء کے خط میں لکھتے ہیں:

"مدراس والے ڈاکٹر عبدالحق صاحب کا خطاب شاید افضل العلماء بھی ہے۔ مجھے بھی ایک مرتبہ ان کی زیارت کا موقع ملا ہے جب وہ جامعہ اردو کے جلسے میں آگرہ تشریف لائے تھے۔ مجھے ایک ادا ان کی بہت پسند آئی تھی۔ ایک مشہور بزرگ گزرے ہیں مولانا احمد حسن صاحب محدث کانپوری۔ ڈاکٹر صاحب کے والد مرحوم محدث کانپوری رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد تھے۔ صرف اس تعلق سے ڈاکٹر صاحب آگرہ سے کانپور گئے ــــــ مولانائے مغفور کے مزار شریف پر فاتحہ پڑھی اور ان کے خاندان سے ملے۔ یہ سن کر آپ کو لطف آئے گا کہ حضرت محدث کانپوری منیث الدین فریدی کے حقیقی نانا تھے اور لطف مزید کا باعث یہ لطیفہ ہوگا کہ حضرت مولانا احمد حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ میرے پیر و مرشد حضرت قبلۂ عالم محدث علی پوری روحی فداہ کے بھی استاد تھے۔ حضرت صاحب نے کانپور آ کر اور مولانا صاحب کی خدمت میں رہ کر حدیث شریف پڑھی ہے لطیفہ یہ ہے کہ جب حضرت صاحب آگرہ تشریف لائے اور فریدی صاحب مرحوم نے منیث اور ان کے بھائی کو حضرت کی خدمت میں پیش کیا تو حضرت صاحب اپنے استاد کے نواسوں کی تعظیم کے لئے کھڑے ہوگئے۔

مگر یہ مشکلیں ہیں امتحانِ شوق کی خاطر
ہوا تھا کب غلو ہمتِ مردانہ برسوں سے
یہ برسوں بعد اے ہمدم ملا ہے شیخِ اُردو سے
کہاں سوئی ہوئی ہے فطرتِ پروانہ برسوں سے

ایک صاحب نے پاکستان جا کر داڑھی منڈا دی۔ ان کو لکھتے ہیں:

وہاں جا کر جو مونڈی تم نے داڑھی
دیا گویا یہ پاکستان کو باج!
ذرا سے بال تھے رہنے ہی دیتے
نہ تھی آخر وہ عرض و طول میں چھاج
یہ ڈر تھا آ ہی جاتی ہے سفیدی
مگر تھا یہ تو ذریعۂ سبّ و تاج
اگر روئی کا گالا ہو بھی جاتی
نہ آتا اس کو دُھننے کوئی حلّاج
نہ دیتا آ کے بچّہ اس میں خرگوش
جو کی پہلے سے تم نے فکرِ اخراج
کبھی قصّاب سمجھا تھا کسی نے؟
کہ ذبحِ ریش کو سمجھا حلال آج!
بنایا تھا مُو مجزِ اخفش کسی نے؟
کہ چڑھ آیا غضب کا بحرِ موّاج
نہ کرتے تم جو منڈوانے کی غلطی
تو کیوں بنتے مرے طعنوں کا آماج؟
صفائی کی سنو یہ صاف تاریخ
خس و خاشاک داڑھی کا نہیں آج

۱۹۴۸ء

قادری صاحب نے رباعی کے میدان میں بھی اپنے جوہر دکھائے ہیں۔ ان کی بعض رباعیاں قدرتِ ادا کا کامیاب نمونہ ہیں جن سے ان کی انفرادیت
[illegible]ات کی پختگی ظاہر ہوتی ہے —

اس عہدِ شباب پر جو مغرور ہے تو
یہ سوچ کہ حق سے کس قدر دور ہے تو
بہتر ہے کہ خوشی سے کر لے سجدہ بھی کبھی
پیری میں تو رکوع پر مجبور ہے تو

اُٹھ صبح ہوئی، خبر ہے غافل تجھ کو
فیضانِ سحر نہیں ہے حاصل تجھ کو
شکنیں کس لی ہیں کروٹوں نے تیری
شکنیں بستر کی ہیں سلاسل تجھ کو

آخر میں اس مضمون کے متعلق بھی چند جملے لکھنا ضروری ہیں۔ میں عرصہ سے قادری صاحب کے متعلق ایک مضمون لکھنا چاہتا تھا لیکن انہوں نے کبھی ہمت افزائی نہیں کی۔ ۱۲ر ستمبر ۱۹۵۰ء کے خط میں لکھتے ہیں:

"آپ کا خط بڑا دلچسپ ہے۔ ہمیشہ دلچسپ لکھتے ہیں۔ بہت لطف آیا......
میں اس قابل یقیناً نہیں ہوں کہ میرے "اوپر" مضمون لکھئے۔ میرا تو یہ حال ہے کہ
"زادہ و مردہ ویچ نکرد" آپ لکھیں گے کیا؟ سعید کوئی بڑی کارگزاری نہ تھی ـــ
کتابیں بڑا کارنامہ نہیں ـــ پھر مضمون آپ کی "کارستانی" رہے گی میں تو ملاقاتوں
اور باتوں کا بھی آدمی نہیں کہ آپ لطفِ صحبت کے واقعات لکھ سکیں۔ خواہ مخواہ
آپ کو خیال پیدا ہو گیا ہے۔ چھوڑیئے اس خیال کو۔"

یہ لڑائی ان سے آج کی نہیں، پرانی ہے۔ ۲۸ر دسمبر ۱۹۳۹ء کے خط میں جو کچھ لکھتے ہیں وہ خود پوشی کی آخری حد ہے:

"میرے کچھ حالات ہی نہیں جو لکھے جائیں۔ بہت خاموش اور پُرسکون زندگی ہے۔"

۲۵ر نومبر ۵۲ء کے خط میں تحریر فرماتے ہیں:

"میرے متعلق مضمون کو میرے بعد رکھئے۔ اب تو ایسا معلوم ہوگا کہ میں نے خود فرمائش
کر کے چھپوا دیا۔ میں نے تو کبھی تصویر بھی نہ چھپوائی۔"

نفی ذات کا معاملہ بھی عجیب ہے اس لئے کہ خود "عملِ نفی" دوسروں کو نفی کرنے والے کی طرف متوجہ کر دیتا ہے۔ اس مضمون کے سلسلہ میں بھی میرے پاس اس معذرت کے سوا اور کچھ نہیں۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

ادا کیں پائی ہیں۔ وہ اس زمانے میں علی گڑھ پہنچے جب علی گڑھ ایک طرف شائستگی اور علم طلبی کے لیے مشہور تھا اور دوسری طرف بقول سجاد انصاری تیرہ و تار کی خانقاہ سے مجاہدوں کا لشکر برآمد ہونے والا تھا۔ ۱۹۱۹ء میں مسٹر ٹول کالج کے پرنسپل تھے۔ اس زمانے میں ترک ہندوستانی مسلمانوں کے ہیرو تھے اور رشید صاحب کے کئی ساتھیوں نے قومی زندگی میں اسی وقت سے حصہ لینا شروع کر دیا تھا، مگر رشید صاحب نہ غازی بنے نہ شہید ہوئے۔ وہ زندگی کے ایک خاموش تماشائی ہی رہے! اور شاید اسی ذوقِ تماشا ہی نے اردو ادب کو ایک صاحبِ طرز انشا پرداز، ایک نکتہ سنج ادیب، ایک اعلیٰ درجے کا مزاح نگار اور طنز نگار دیا۔ زندگی کی بعض محرومیاں، ادب کی کامرانیاں بھی ہوتی ہیں۔

بی۔ اے کرنے کے بعد رشید صاحب نے علی گڑھ سے فارسی میں ایم۔ اے کیا۔ طالب علمی کے دوران میں وہ یونین کے سیکرٹری بھی رہے اور اسی زمانے میں انہوں نے مزاحیہ مضامین بھی لکھنے شروع کیے۔ ان مضامین میں ولایت علی بمبوق کا ہلکا سا پرتو ہے، مگر بہت جلد رشید صاحب نے اپنا علیحدہ رنگ قائم کر لیا۔ علی گڑھ منتھلی جو بعد میں علی گڑھ میگزین کہلایا، اس زمانے میں اردو کے موقر رسالوں میں شمار ہوتا تھا۔ رشید صاحب عرصے تک اس کے ایڈیٹر رہے۔ انہیں ذاکر صاحب (ڈاکٹر ذاکر حسین وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی)، مولانا سہیل، اقبال احمد، نور اللہ جیسے ممتاز ساتھی ملے۔ اردو ادب میں ایسے نثر نگار کم ہیں جو زمانۂ طالب علمی ہی میں ادبی شہرت حاصل کر چکے ہوں۔ ان میں رشید صاحب کا نام ممتاز ہے۔ عظمت اللہ خان اور سجاد انصاری جو ایک دوسرے سے بہت مختلف تھے، رشید صاحب کا جوہر پہلے پہچاننے میں مشترک ہیں۔

۱۹۲۱ء میں علی گڑھ میں ایک بہت بڑا ذہنی سیلاب آیا۔ یہ سیلاب بہت سوں کو بہا لے گیا اور اس کی موجوں نے ہماری ادبی اور علمی زندگی میں کتنے ہی طوفان پیدا کیے، مگر رشید صاحب پر بظاہر اس کا کوئی خاص اثر نہیں ہوا۔ جن لوگوں نے قوم پر اپنی زندگیاں قربان کر دیں، رشید صاحب نے انہیں بڑے احترام اور عزت کی نظر سے دیکھا، مگر خود انہوں نے کوئی قربانی یا ایثار اس قسم کا کبھی نہیں کیا۔ وہ کبھی ہیرو نہ بن سکے۔ نہ انہوں نے بڑے بڑے اصول اپنی زندگی میں بنائے۔ ایک جگہ انہوں نے لکھا ہے کہ مخالف چاہے بقراط یا جالینوس ہی کیوں نہ ہو، انہوں نے ووٹ ہمیشہ اپنے دوست کو دیا۔ انہوں نے اصول پرستی کے خطروں کو دیکھ لیا تھا۔ انہیں خیالات یا تصورات سے زیادہ انسانوں سے دلچسپی رہی۔ ان انہوں نے ہر تصور کی آب و تاب، اس کی گرمی اور روشنی، اس کی بلندی یا پستی کو دیکھنے کی کوشش کی۔ انہیں ادب ایک "پناہ گاہ" کی شکل میں نظر آیا۔ سعدیؒ اور حافظؒ، غالب اور اقبال، شبلی اور اکبر، گوئٹے اور ملٹن، برنارڈ شا اور وکٹر ہیوگو کی تصانیف سے انہوں نے انسانوں کے متعلق ایک بصیرت بھی حاصل کی اور انہیں ایک پاکیزہ ادبی ذوق بھی ملا۔ ان کے مضامین اس وجہ سے مسرت اور بصیرت کے خزانے ہیں۔

رشید صاحب اس زمانے میں علی گڑھ پہنچے تھے جب وہاں کی اقامتی زندگی بڑی رنگینی اور کشش رکھتی تھی۔ وہ اس کے جادو کا شکار ہو گئے۔ یہ ان کی خوبی بھی ہے اور خامی بھی کہ اس کے بعد کوئی اور حسن ان کی نظر میں نہ جچا۔ رشید صاحب نہ مصلح ہیں نہ امیرِ قوم، وہ صرف معلم بھی نہیں ہیں۔ وہ دراصل ایک عاشق ہیں۔ انہوں نے ایک فرد سے نہیں بلکہ ایک ادارے اور ایک انجمن سے عشق کیا ہے اور اسی انجمن کو خلاصۂ کائنات سمجھتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ رشید صاحب علی گڑھ سے باہر نہ گئے ہوں۔ انہوں نے پہاڑوں کی سیر بھی کی ہے اور ہندوستان کے میدانوں کی بھی۔ وہ برما تک ہو آئے ہیں اور میرا ان کا جنوبی ہند کے ایک سفر میں بھی ساتھ رہا۔ مگر دراصل ہر جگہ وہ اپنی علی گڑھ والی عینک پہنے رہے۔ وہ نہ کسی انسان کے پیچھے چلتے ہیں نہ کسی تصور کے۔ یہ اور بات ہے کہ کوئی شخص یا خیال کسی نہ کسی طرح ان کے حرم میں داخل ہو جائے۔ اپنے مزاج کے اعتبار سے وہ ایک مضبوط چٹان کی طرح ہیں جس پر جلال بھی ہے اور جمود بھی۔ ان کے خیالات میں کوئی بڑا انقلاب نہ ملے گا، ہاں ایک مدھم سا ارتقا ضرور ہے۔ ان کی شرافت نے انہیں بعض اہلِ غرض کا شکار بھی بنایا۔ انہوں نے دوستی کو ایک فنِ لطیف بنا دیا ہے۔ انہیں دوسرے کی مطلب پرستی سے سروکار نہیں، اپنی دوستی سے غرض ہے۔ وہ اپنی ہر ضرورت کو دوستوں کی معمولی سی مصلحت پر قربان کر سکتے ہیں۔ وہ کسی سے کچھ مانگتے نہیں، اسے بہت کچھ دینے کو تیار رہتے ہیں۔ مشرقیت، شرافت، معقولیت، انسانیت کو انہوں نے جس طرح

زندگی میں برت کر دکھایا ہے، کم نے دکھایا ہوگا۔ گو وہ اس راز سے بے خبر ہیں کہ یہ چیزیں بھی مطلق نہیں، اضافی ہوتی ہیں۔ ان کے یہاں مشرقیت بعض اوقات قدامت پرستی کی شکل میں، شرافت کمزوری کے روپ میں، معقولیت مصلحت کے قالب میں اور انسانیت سستی رواداری کے لباس میں بھی نظر آتی ہے۔ اسی لئے ان سے اختلاف کیا جاسکتا ہے، مگر ان کی عزت اور محبت کئے بغیر چارہ نہیں۔

رشید صاحب ۱۹۲۲ء میں یونیورسٹی میں اُردو کے لکچرار ہوئے۔ علی گڑھ یونیورسٹی میں شروع شروع میں صرف بی۔ اے میں لازمی اُردو تھی۔ رشید صاحب کو طالب علمی میں ٹینس کا شوق تھا۔ اس شوق کو وہ دردِ گردہ کی وجہ سے جاری نہ رکھ سکے۔ ان کا کمپلیکس سلیم کی سلامت روی اور مستقل مزاجی کا مظہر تھا۔ لازمی اُردو کا کورس کچھ زیادہ نہ تھا۔ اس لئے ایک عرصے تک رشید صاحب آبِ حیات اور دیوانِ غالب اور جدید شعرا کے کچھ انتخابات پڑھاتے رہے۔ ڈاکٹر ضیاء الدین کو یہ گوارا نہ تھا کہ اردو میں کوئی فیل ہو۔ اردو دانوں کے لئے ایک (N E C E S S A R Y E V I L) سے زیادہ نہ تھی۔ ۱۹۳۲ء سے ایف۔ اے اور بی۔ اے میں اختیاری مضمون کی حیثیت سے اُردو شروع ہوئی۔ ۱۹۳۵ء میں وہ اردو کے ریڈر ہوئے۔ ان کا انتخاب علامہ اقبال نے کیا تھا۔ حال ہی میں وہ پروفیسر بنا دیئے گئے ہیں۔ علی گڑھ میں اُردو کی تدریس کی اہمیت صحیح معنی میں ذاکر صاحب کے دور سے شروع ہوئی ہے۔

رشید صاحب کی جوانی دردِ گردہ کے پیہم حملوں میں گذری۔ ان کی شادی ۱۹۲۳ء میں ہوگئی تھی۔ ۱۹۳۰ء تک گردہ کی تکلیف نے انہیں بہت پریشان کیا۔ ڈاکٹر عطائیا نے بالآخر ایک کامیاب اپریشن کر کے ایک گردے کو بالکل "آں جہانی" کر دیا۔ ان کا مضمون "شیطان کی آنت" اسی خلاف کا آب حیات ہے۔ رشید صاحب نے عشق کیا یا نہیں، یہ میں نہیں کہہ سکتا۔ ان کے اعصاب پر عورت سوار نہیں ہے مگر وہ اس معاملے میں میر کے اس مسلک پر عامل رہے ہیں:۔

ع   تک دیکھ لیا، دل شاد کیا، خوش وقت ہوئے اور چل نکلے

رشید صاحب پڑھے لکھے آدمی ہیں۔ اُردو اور فارسی کے کلاسیکل سرمائے پر ان کی نظر گہری ہے۔ انہوں نے انگریزی ادب کے شاہکاروں کا نہ صرف مطالعہ کیا ہے، بلکہ ان سے اثر بھی قبول کیا ہے۔ وہ نہایت ذہین آدمی ہیں اور بڑی جلدی بات کی تہ تک پہنچ جاتے ہیں۔ مگر وہ کتابوں کے کیڑے نہیں ہیں۔ ان کے پاس ہر سال بہت سی کتابیں آتی ہیں، مگر رہتی نہیں، دوست احباب لے جاتے ہیں۔ باقاعدہ مطالعے کے وہ عادی نہیں۔ انہوں نے گھریلو زندگی کے چھوٹے چھوٹے معاملات کو اتنی اہمیت دے رکھی ہے کہ انہیں مہدی افادی کی "نازنینان حرم" سے دل بہلانے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ مگر وہ کسی بھی اہم مضمون یا کتاب کا تذکرہ سُنتے ہیں تو اسے غور سے پڑھتے ہیں اور پھر ان کی رائے تقلیدی نہیں، بلکہ اوریجنل ہوتی ہے۔ ان کا ادبی ذوق پاکیزہ ہوتے ہوئے قدرے پُرانا ہے۔ نئے خیالات سے انہیں خدا واسطے کا بیر تو نہیں مگر وہ اس نئے پن کو پوری طرح ہضم نہیں کر پاتے۔ یوں وہ ادب میں تجربات کے قائل ہیں، مگر ان کا سفید پوش ذوق ذرا سی بھی گرد کو برداشت نہیں کر پاتا۔ وہ اسالیبِ فن میں رچاؤ اور زبان میں پختگی اور ہمواری ڈھونڈتے ہیں۔ وہ ادب کے ایک اخلاقی تصور کو مانتے ہیں۔ اس کی مقصدیت پر بھی انہیں اعتراض نہیں ہے مگر وہ بے محابا تجلّی کے بجائے حجاب اور جلوے کے بجائے نقاب کے زیادہ قائل ہیں۔ غزل کو وہ "اردو شاعری کی آبرو" سمجھتے ہیں مگر اس میں ہماری بے آبروئی کا جو سامان ہے، اس سے بھی چشم پوشی نہیں کرتے۔ وہ اچھی نظم پر وجد بھی کرتے ہیں مگر یہ "امتزاج" "مزاج" کے الفاظ ہیں، انہیں غزل کے اشعار سے ملتا ہے، وہ نظم سے نہیں۔ غالب کے اشعار سے انہوں نے بڑا کام لیا ہے۔ یہ غالب کی عظمت کی دلیل ہو یا نہ ہو، رشید صاحب کے عرفان کا ثبوت ضرور ہے۔ جدید دور میں اچھے شعر کا برمحل استعمال یا اس کے چراغ سے چراغ جلانا کم ہوگیا ہے۔ اس سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کی نظر ہمارے کلاسیکل سرمایے پر اتنی گہری نہیں ہے۔ رشید صاحب ان لوگوں میں سے تو نہیں ہیں جو شعر پڑھیں اور یہاں بھی تسلیم ہو جائیں۔ انہوں نے بار بار اس کا ذکر کیا ہے کہ وہ بعض اوقات پڑھنے میں شعر کو نثر بنا دیتے ہیں اور اچھا خاصا موزوں شعر ناموزوں معلوم ہوتا ہے، مگر وہ شعر کے جادو سے واقف ہیں اور اس کا جادو جگانے میں بھی کامیاب ہیں۔ وہ غالب، اقبال، حسرت، اصغر اور جگر کے بڑے قائل ہیں۔

رشید صاحب کے مضامین میں ترتیب و تنظیم کی کمی کا متعدد اشخاص نے ذکر کیا ہے۔ یہ بات ان کی زندگی میں بھی ہے۔ وہ اپنی موج کا مصرف جانتے ہیں کیونکہ

اس وقت وہ اپنے گھر کے باغ کی دیکھ بھال میں مصروف ہوتے ہیں۔ انہیں گلابوں سے عشق ہے، مگر ان کی شامیں اکثر دوستوں کے مجمعوں یا برج کی میز کی نذر ہو جاتی ہیں۔ انہوں نے اپنی ادبی صلاحیت کو دوستوں کی فرمائشوں پر بھی برباد کیا ہے۔ ڈاکٹر ضیاء الدین کے پروپیگنڈے، الیکشن کے مینی فیسٹو، یونیورسٹی کے معزز مہمانوں کے لئے سپاس نامے، سبھی کچھ لکھنے ہیں، مگر انہوں نے روزمرہ زندگی کو اتنا دلچسپ، اتنا نشہ آور، اتنا پُر سحر اور پُر کیف پایا ہے کہ ادب کا جادو بھی انہیں پوری طرح اپنا اسیر نہ کر سکا۔ وہ کسی کتاب کو پڑھتے ہیں تو اس کے خیالات سے مستفید ہونے کے لئے اتنا نہیں جتنا اپنے خیالات کو تب و تاب دینے کے لئے۔ دوسروں کی چنگاری صرف ان کی چنگاری کو ہوا دیتی ہے۔ مگر مضامین میں ترتیب و تنظیم کی بظاہر جو کمی ہے اس کا ایک جواز بھی ہے۔ اس کی ایک اور تنظیم ہے جو عام ترتیب سے زیادہ آزاد اور بے پروا، مگر اپنی جگہ پر پُر اثر اور کارآمد ہے۔ یعنی رشید صاحب کی زندگی ایک کتاب سے دوسری کتاب تک نہیں ہے، بلکہ یہ کتابیں ان کی شخصیت کے سمندر کا ایک چھینٹ ہیں۔ رشید صاحب کی کوئی کتاب باقاعدہ تحقیق یا تلاش کا نتیجہ نہیں ہے۔ لیکن ان کی ہر کتاب میں لکھے پتے کی باتیں ملتی ہیں۔ "طنزیات و مضحکات" ایک طرح آبِ حیات کی یاد دلاتی ہے۔ آبِ حیات کی ہر بات غلط ثابت ہو سکتی ہے مگر آبِ حیات سے کوئی ادب کا طالب علم بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح طنز و ظرافت کے موضوع پر اس سرسری نظر میں بھی ایسے گہرے اور بصیرت افروز تاثرات ملتے ہیں کہ ان کی اہمیت کبھی کم نہیں ہو سکتی۔ یہی حال "زبان اُردو پر ایک نظر" کا ہے جو دراصل ان کے ایک لیکچر کا عنوان ہے۔ اس میں اُردو زبان کی تاریخ نہیں ہے لیکن اس کے مزاج کا ایک حیرت انگیز احساس ہے۔ وہ بعض چونکانے والے فقرے لکھتے ہیں جن میں حقیقت کچھ سمٹ کر محدود ہو جاتی ہے، مثلاً حالی ماضی کے، اکبر حال کے اور اقبال مستقبل کے شاعر ہیں" یا مثلاً ان کا یہ جملہ کہ "کوئی شاعر بڑا نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ معقول آدمی نہ ہو" مگر ان میں حقیقت کی جو کرن ہے وہ بھی کم نظر فریب نہیں ہے۔

رشید صاحب نے یوں تو تنقیدی مضامین میں بھی بڑی خیال انگیز باتیں کہی ہیں، مگر دراصل وہ ایک مزاح نگار، طنز نگار اور انشا پرداز کی حیثیت سے اہمیت رکھتے ہیں۔ انہوں نے غالب، اقبال، اکبر، عبدالرحمٰن بجنوری، فانی بدایونی، جگر مراد آبادی پر جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان میں وزن سے زیادہ وقار ہے۔ مگر یہ وقار یونہی نہیں آیا ہے اس میں زندگی اور ادب کا قدر سے پرانا سہی مگر پھر بھی ایک سنجیدہ اور پاکیزہ شعور ملتا ہے۔ وہ بہت سے اچھے پہلوؤں پر نظر نہیں کر پاتے، مگر جن پہلوؤں پر ان کی نظر ہے وہ سطحی اور سستے نہیں، قابل قدر بلکہ قابلِ غور ہیں۔ وہ بہت سے قیمتی تجربات کو نہیں پرکھ پاتے مگر انہوں نے کسی گھٹیا یا مصنوعی یا نمائشی پہلو کی کبھی داد نہیں دی۔ ان کی تنقیدیں ڈاکٹر جانسن کی یاد دلاتی ہیں۔ یا تو یہ تاثرات ہیں یا فیصلے، مگر ان کے پیچھے ایک رچا ہوا اور پختہ شعور ضرور ملتا ہے۔

مگر رشید صاحب کا بڑا کارنامہ مضامینِ رشید، خنداں، گنج ہائے گراں مایہ اور ذاکر صاحب ہیں۔ پہلی دو کتابیں ان کے مزاحیہ مضامین پر مشتمل ہیں۔ موخر الذکر دونوں کتابوں میں شخصیتوں کے مرقعے ہیں۔ گنج ہائے گراں مایہ ان اشخاص کا تذکرہ ہے جو اپنی موت کے باوجود زندہ اور روشن ہیں اور ذاکر صاحب ڈاکٹر ذاکر حسین کی پُر سوز اور دل ربا شخصیت کا خاکہ ہے۔ رشید صاحب کے طنز و مزاح پر اظہارِ خیال کا یہ موقع نہیں اور نہ چند سطروں میں اس کے ساتھ انصاف ہو سکتا ہے، مگر اتنا کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ یہ صرف "خوانِ مسرت" نہیں، سامانِ بصیرت بھی ہے۔ یہ ہنسی کا پٹارہ نہیں ہے تبسم کا خزانہ ہے۔ رشید صاحب ہنسی ہنسی میں نہ صرف بہت کچھ کہہ جاتے ہیں بلکہ سوچنے کے لئے بھی بہت کچھ چھوڑ جاتے ہیں۔ وہ رعایتِ لفظی سے بڑا کام لیتے ہیں۔ ان کے فقروں میں صوتی حسن بھی ہے اور موسیقی بھی۔ وہ ایک پڑھے لکھے انسان کی زندگی کے نشیب و فراز پر لطیف تبصرے ہیں۔ ان میں کتنے ہی افسانوں کی کمزوریوں کا حسن اور کتنے ہی معمولی آدمیوں کی بڑی اور قابلِ قدر باتیں محفوظ ہو گئی ہیں۔ وہ قصے بھی سناتے ہیں۔ قولِ محال سے بھی کام لیتے ہیں۔ جاندار اور خیال انگیز تشبیہات کے چمن بھی آراستہ کرتے ہیں اور اپنے تخیل کی مدد سے زندگی کے گزرتے ہوئے لمحات کو ایک ابدی روشنی اور ایک سدا بہار رنگینی بخش دیتے ہیں، مگر زندگی کی وہ قدریں جن پر ان کا ایمان ہے گنج ہائے گراں مایہ میں اشاروں کے بجائے داستان بن کر آئی ہیں۔ ان کی انشا پردازی کا حسن جو ظرافت کی چاشنی کی وجہ سے مزاحیہ مضامین میں بعض اوقات نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے، گنج ہائے گراں مایہ

خود اس خوشی میں شریک کر لیتے ہیں مگر اپنی تکلیف اور دُکھ کا بار خود ہی مردانہ وار اٹھا لیتے ہیں، دوسروں کو یہاں تک کہ بیوی بچوں کو بھی اس میں شریک کرنا پسند نہیں کرتے۔ وہ سب کا بوجھ اٹھا لیتے ہیں مگر کسی پر بوجھ نہیں بننا چاہتے۔

ایک دفعہ وہ اور میں نواب بہتاری کے مہمان تھے۔ نواب صاحب اس زمانے میں حیدرآباد کے صدر اعظم تھے۔ حیدرآباد میں ایک اُردو کانفرنس تھی۔ ہم لوگ شاہ منزل میں ٹھہرائے گئے۔ ہر طرف آداب، تسلیمات، سیکرٹری، کلرک، چپراسی ہر اشارے پر موجود۔ نواب صاحب بہت مہربان، دوسرا یا تیسرا دن تھا۔ ایک دن صبح کو ناشتے کے بعد میں کچھ خاموش بیٹھا ہوا تھا۔ رشید صاحب بھی چپ تھے۔ کچھ دیر کے بعد پوچھنے لگے "بھئی یہ آج آپ مہاتما بدھ کی طرح سوچ میں کیوں بیٹھے ہیں؟" میں نے کہا، "سوچ رہا ہوں، بڑے پھنسے ہیں۔ ہم لوگ ٹھہرے چھ چھ پیسے والے آدمی۔ مگر آپ شوکیس میں سجا دئے گئے ہیں۔ چھ پیسے والے مال کو ڈانٹ دے دیں، کہہ دیا جائے تو کیا ہو؟" رشید صاحب کے چہرے پر جیسے نور دوڑ گیا، کہنے لگے "میں بھی یہی محسوس کر رہا تھا مگر جیسے رسم کئے ہوئے تھا۔ دیکھ رہا تھا پہلے کون ہارتا ہے۔" اور اس کے بعد ہم لوگ جلد سے جلد وہاں سے بھاگے اور مجھ سے زیادہ رشید صاحب خوش تھے۔ حیدرآباد کے اسٹیشن پر شوفر کو ٹپ کر کے ہم لوگوں نے ٹی اسٹال پر دو آنے پیالی والی چائے پی۔ مونگ پھلی والے سے مونگ پھلی خریدی۔ میں نے اخبار لیا۔ رشید صاحب نے اپنا بیگ کھول کر پاندان نکالا۔ پان بنایا اور ایک کو منہ میں ڈال کر بولے۔ "سرور صاحب اب جان میں جان آئی ہے۔ یہ سرکاری درباری لوگ نہ جانے کیسے اس قدر باقاعدہ اور مہذب زندگی بسر کر لیتے ہیں۔" میں نے کہا "رشید صاحب برنارڈ شا نے کہا ہے" بات کاٹ کر بولے "دیکھئے حضرت یہ شیکسپیئر پاسٹا کی بات اب علی گڑھ تک نہ ہو گی!" میں نے کہا "اچھا اقبال کے اشعار پڑھنے کی تو اجازت ہے؟" کہنے لگے "ہاں اس میں مضائقہ نہیں۔"

ایک دفعہ ہم دونوں نے جنوبی ہند پر پہلا اور غالباً آخری حملہ کیا۔ یعنی میسور گئے۔ دہلی سے ساتھ سفر طے ہوا تھا۔ سخت گرمی کا زمانہ تھا۔ میں نے لکھا کہ "یونیورسٹی والے ہوائی جہاز کا کرایہ دینے پر رضامند ہیں۔ کیوں نہ ہم لوگ ہوائی جہاز سے چلیں۔ اس لُو میں مرنے سے بچ جائیں گے۔" رشید صاحب کا جواب آیا کہ "ہوائی جہاز سے سفر نہیں ہو گا۔ سیکنڈ کلاس میں چلیں گے۔ ہو سکا تو میسور سے ساڑی اور وہاں کی مصنوعات خریدیں گے اور کچھ بچا لائیں گے۔ آج کل فضول خرچی قومی جرم ہے۔" غرض میں لُو میں مرنے کے لئے راضی ہو گیا کہ رشید صاحب ٹھکانے سے دفن کرا دیں گے اور پھر عمر بھر کے لئے بال بچوں کے خرچ کے کفیل بھی ہو جائیں گے۔ دہلی صبح پہنچا۔ دوپہر کو چلچلاتی دھوپ میں رشید صاحب آئے۔ شام کو ۴½ بجے ٹمپریچر کم از کم ۱۱۵ رہا ہو گا، ہم لوگ گرینڈ ٹرنک ایکسپریس میں بیٹھنے کے لئے روانہ ہوئے۔ سیکنڈ کلاس کے ٹکٹ نہ مل سکے تھے، اس لئے فرسٹ کلاس کا سفر تھا۔ رشید صاحب کے ساتھ ناشتے کا بہت سا سامان اور پانوں سے بھرا ہوا پاندان تھا۔ میرے ساتھ صرف ایک صراحی تھی۔ راستہ باوجود گرمی کے بڑے لطف سے کٹا۔ میں نے مدراس سے گھر خیریت کا تار دیا۔ رشید صاحب نے بھی میری نقل میں تار دیا۔ بنگلور پہنچے تو بڑا حسین موسم تھا۔ ہلکی ہلکی بارش، لطیف خنکی اور بڑا اُجلا اُجلا سا شہر۔ یونیورسٹی پہنچے، اُردو کے پروفیسر کے تقرر کا مسئلہ تھا۔ رشید صاحب نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ "حضرت امیدواروں سے سوالات وغیرہ آپ ہی کیجئے گا۔ آپ کے فیصلے کی میں تائید کر دوں گا۔" بنگلور سے فارغ ہو کر ہم لوگ ایک شاگرد کے ہمراہ میسور گئے۔ مجھے ٹیپو کے مزار اور دریائے کاویری کے دیکھنے کا اشتیاق تھا۔ وندرابن کے باغ کی سیر کا بھی ارمان تھا۔ شاگرد نے ازراہِ عقیدت میسور کے سب سے اچھے ہوٹل میں ٹھہرا دیا۔ وہاں کے ٹھاٹھ دیکھ کر ہم لوگ چوبیس گھنٹے میں گھبرا گئے۔ آخر اپنے شاگرد کے ایک دوست کے یہاں ٹھہرے۔ یہ بڑے اچھے ذوق کے آدمی ہیں اور میسور کے سربرآوردہ مسلمانوں میں سے ہیں۔ انگریزی اور اردو ادب دونوں سے گہرا شغف ہے۔ رشید صاحب کے اسلوبِ بیان کے دلدادہ اور ان کے غائبانہ عاشق۔ ان کے اصرار پر ہم لوگ اوٹی چلے مگر رشید صاحب بڑی مشکل سے راضی ہوئے تھے۔ حسبِ عادت جلد سے جلد گھر جانا چاہتے تھے۔ طے ہوا تھا کہ اس پروگرام میں صرف دو دن خرچ ہوں گے مگر چار دن لگ گئے۔ اوٹی پہنچے تو رشید صاحب عورتوں کی طرح خفا ہو گئے۔ اب نہ بات کرتے ہیں نہ کمرے سے نکلتے ہیں۔ جھنگی ہوتی کہیں

کیوں سپر ڈال دی اور کیوں پروگرام گڑبڑ کیا۔ میں نے کہا، رشید صاحب اتنی دور آکر بھی جنوبی ہند کی اس پری کے نظارے سے محروم رہ جانا بدذوقی ہے اور ایسے اچھے میزبانوں اور ساتھیوں کی موجودگی میں یہ بھلا کہ بیٹھ جانا آپ کو ہرگز زیب نہیں دیتا۔ خیر اس شرط پر راضی ہوئے کہ دوسرے دن ہی واپس ہوں گے۔ میسور پہنچے تو خریداری شروع کی۔ واپسی میں میں نے اس پر حساب لگایا تو معلوم ہوا کہ تقریباً پانچ سو روپے کرائے کے لئے لئے، رشید صاحب سوا پانچ سو خرچ کر چکے تھے اور میرے پاس کیا پاس سا ڑھے پانچ رہے تھے۔

رشید صاحب لڑنے والے آدمی نہیں، کوئی زیادتی کرے تو کڑھتے ہیں، جھگڑتے نہیں۔ اصولی بات ہو رہی ہو تو وہ مصلحت اور عافیت کا سہارا لیتے ہیں۔ علی گڑھ میں ایک چھوٹا سا معرکہ مجھے یاد ہے۔ میری سفارش پر سجاد انصاری کی کتاب "محشرِ خیال" ایم۔ اے کے نصاب میں داخل کی گئی تھی۔ سجاد انصاری کی انشا پردازی کے رشید صاحب بھی بہت قائل تھے۔ نصاب پر اتفاق سے مولانا عبدالماجد دریا بادی کی نظر پڑ گئی، جنہیں ہر "رعنائی خیال" کو "گناہ" ٹھہرانے میں ذرا بھی پس و پیش نہیں ہوتا۔ انہوں نے رشید صاحب کو خط لکھا کہ یہ کتاب جس میں خدا اور مذہب سے شوخیاں ہیں ہرگز مسلم یونیورسٹی کے نصاب میں نہ رکھنی چاہئے۔ رشید صاحب نے مولانا کا خط مجھے دکھا دیا اور خاموش ہو رہے۔ مولانا نے پھر "صدق" میں مضامین لکھنے شروع کئے۔ ہم لوگ پی گئے۔ آخر انہوں نے اپنا آخری حربہ استعمال کیا۔ مولانا صدر یار جنگ حبیب الرحمٰن شیروانی دینیات کی فیکلٹی کے ڈین تھے۔ یوں بھی یونیورسٹی میں ان کا بڑا اثر اور رسوخ تھا۔ انہوں نے مولانا عبدالماجد کی تحریک پر وائس چانسلر ابوبکر احمد حلیم صاحب کو ضابطے کا خط لکھا اور اس کتاب کے خارج کئے جانے پر زور دیا۔ حلیم صاحب نے شعبۂ اردو کا جلسہ بلایا اور یہ مشورہ دیا کہ کتاب نصاب سے خارج کر دی جائے۔ میں نے احتجاج کیا کہ شعبہ صرف ادبی اہمیت کو دیکھتا ہے۔ اگر مذہبی اور اخلاقی اعتبار سے نصاب کی کوئی کتاب خارج کرنی ہے تو اکزکٹو کونسل کو کرنا چاہئے۔ نصاب میں اہم اور نمائندہ اسالیب اور پہلو لئے جاتے ہیں۔ ان کے پڑھانے اور ماننے میں فرق ہے۔ فلسفے اور سیاست کے نصاب میں بھی ہم ہر مفکر اور مصنف کے نظریات پڑھاتے ہیں۔ یہ آزادئ فکر یونیورسٹی کی خصوصیت ہے۔ اس لئے شعبہ اس کتاب کو خارج نہیں کر سکتا۔ خلافِ توقع رشید صاحب نے فوراً سپر ڈال دی۔ کہنے لگے "سرور صاحب! جب کتاب رکھ نہیں سکتے تو پھر جانے دیجئے"۔ میں نے کہا "حضرت! یہ لوگ ہم سے کیوں نکلوانا چاہتے ہیں۔ خود یہ جرأت کیوں نہیں کرتے کہ اپنے مصالح کی بنا پر اکزکٹو کونسل میں قرارداد پاس کریں"۔ مگر رشید صاحب نہ مانے، مجھے ہی ماننا پڑا۔

رشید صاحب یوں تو اصولوں کے چکر میں نہیں پڑتے۔ مگر جہاں شعبے کی عزت کا سوال آتا ہے، وہاں وہ ضرور سینہ سپر ہو جاتے ہیں۔ ڈاکٹر ضیاء الدین نے نظام حیدرآباد کو علی گڑھ بلایا۔ ایڈریس لکھنے کی خدمت رشید صاحب کے سپرد ہوئی۔ رشید صاحب نے بڑے چاؤ سے ایڈریس لکھا اور مجھے بھی سنایا۔ میں نے کہا "دیکھ لیجئے گا، پسند نہ آئے گا"۔ بولے "کیوں؟" میں نے کہا "اس میں خوشامد کم ہے، ادبی رنگ زیادہ، ڈاکٹر صاحب کی سمجھ میں نہ آئے گا"۔ یہی ہوا ——— ایڈریس سُن کر کہنے لگے "کچھ جچا نہیں، پھر کوشش کیجئے"۔ رشید صاحب نے نظرثانی کی اور پھر پیش کیا۔ رشید صاحب نے لکھا تھا "مغلوں کے عہد نے ہندوستان کو تین تحفے دئے ——— تاج محل، غالب اور دولت آصفیہ"۔ اس پر ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ "نظام حیدرآباد کے سلسلے میں تاج محل کے ذکر کا کیا موقع ہے؟" غرض کئی دفعہ ایڈریس میں کانٹ چھانٹ ہوئی اور ڈاکٹر ضیاء الدین اور ان کے حواریوں کی جبیں پر شکن ہی رہی۔ آخر رشید صاحب نے کہا کہ "مجھ سے نہیں ہو سکتا۔ آپ کسی اور سے لکھوا لیجئے"۔ اس پر ڈاکٹر صاحب بہت چراغ پا ہوئے اور رشید صاحب کی غیبت میں کہنے لگے کہ "اگر ایسے شعبے کے لوگ ایک ایڈریس نہیں لکھ سکتے تو شعبے کی ضرورت ہی کیا ہے؟" جب رشید صاحب نے یہ سُنا تو کمال کر دیا۔ ایک صاحب کو لے کر ڈاکٹر صاحب سے دریافت کرنے گئے کہ "میں نے یہ الفاظ سُنے ہیں، کیا آپ نے کہے تھے؟" ڈاکٹر صاحب نہ معلوم کس عالم میں تھے۔ انہوں نے پھر خفگی ظاہر کی اور اقرار کیا۔ اس پر رشید صاحب کہنے لگے کہ "آپ مجھے جو چاہیں کہہ لیں لیکن شعبے کے متعلق اس قسم کے الفاظ میں نہیں سُن سکتا"۔ اس کے بعد آخر تک

رشید صاحب نے ڈاکٹر ضیاء الدین کو معاف نہ کیا۔ عرصے تک تو بات ہی نہ ہوتی تھی پھر رسمی مراسم ہو گئے مگر دل صاف نہ ہونا تھا نہ ہوا۔

ڈاکٹر عبدالحق صاحب نے بھی ایک دفعہ نہ معلوم کس ترنگ میں علی گڑھ کے شعبۂ اردو پر سخت اعتراضات کئے۔ رشید صاحب مولوی صاحب کا بڑا احترام کرتے تھے۔ مگر شعبے پر بے موقع اعتراضات سے انہیں بڑا رنج ہوا۔ انہوں نے مولوی صاحب سے بات چیت ترک کر دی۔ مولوی صاحب کو لوگوں نے بہکایا تھا۔ وہ خواہ مخواہ رشید صاحب سے ناخوش ہو گئے تھے۔ میں نے مولوی صاحب کو بہت سمجھایا مگر وہ نہ مانے۔ وہ خفا ہو جائیں تو پھر بخشتے نہیں۔ رشید صاحب کچھ عرصے تک رنجیدہ رہے مگر تقسیم کے بعد پھر انہوں نے مولوی صاحب کو لکھا کہ آپ چاہیں تو انجمن کا دفتر علی گڑھ لے آئیں۔ مولوی صاحب علی گڑھ آئے۔ جلسہ ہوا۔ نواب اسمٰعیل خان صاحب خود اس کے حق میں نہ تھے۔ غرض فیصلہ علی گڑھ کے لئے نہ ہوا مگر رشید صاحب نے اپنا فرض ادا کر دیا تھا۔ بزرگوں کی عزت اور ان کی خدمت کرنا کوئی رشید صاحب سے سیکھے۔

رشید صاحب کو جلسوں، کانفرنسوں، ادبی مجالس، مشاعروں سے بھی بالکل دلچسپی نہیں۔ اگر گرفتار ہو جائیں تو اس طرح پھڑپھڑاتے اور مضطرب ہوتے ہیں جیسے کوئی طائر دام میں پھنس گیا ہو۔ جلسے کے وقت پہنچتے ہیں اور ریل گاڑی سے بھاگ نکلتے ہیں۔ کبھی کبھی تو ایسا ہوا ہے کہ جس جلسے کا انہوں نے افتتاح کیا، اس کے صدر کی تقریر بھی سننے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ انہیں خود اپنے فرائض منصبی کے سلسلے میں کوئی مشاعرہ یا ادبی صحبت منعقد کرنی پڑے تو اور بات ہے۔ ویسے وہ ان چیزوں سے دور ہی رہتے ہیں۔ میں نے کبھی رشید صاحب کو بلند آواز سے داد دیتے یا شعر پر وجد کرتے نہیں دیکھا۔ ان اچھے شعر سے ان کے چہرے پر ایک انبساط ضرور کھیلنے لگتا ہے۔ شعر انہیں یاد نہیں رہتے۔ اچھا شعر ہوا تو یہی بہت ہے کہ انہیں شعر کا کوئی لفظ یا اس کی کوئی ترکیب یاد رہ گئی۔ ورنہ ایسے ویسے شعر سے تو وہ بالا بالا ہی گزر جاتے ہیں۔ انہیں مطالعے کا شوق ضرور ہے اور کسی کتاب یا مصنف کی تعریف کی جائے تو اس سے آشنا ہونا چاہتے ہیں مگر مصنف کے خیالات سے مستفید ہونے کے بجائے اس کی چنگاری سے اپنا چراغ جلاتے ہیں۔ وہ تصورات سے زیادہ تصویروں کو، اصولوں سے زیادہ آدمیوں کو اور علم سے زیادہ عمل کو دیکھتے ہیں۔ وہ جس سے جھلّا جائیں یا چڑ جائیں اس کا کام ضرور کر دیتے ہیں گو اسے کبھی معاف نہیں کرتے۔ وہ ضرورت مندی کی بڑی مدد کرتے ہیں اور بارہا ایسا ہوا ہے کہ اچھے خاصے کھاتے پیتے آدمیوں نے ان کو اپنی فرضی ضروریات ظاہر کر کے بیوقوف بنایا ہے، مگر وہ مدد کر کے کسی شکر یے یا احسان مندی کے منتظر نہیں رہتے۔ وہ نیکی کر کے دریا میں ڈال دینے کے قائل ہیں۔

رشید صاحب سے زیادہ طلبا کے ہمدرد کم نکلیں گے۔ وہ اچھے طلبا کی بڑی ہمت افزائی کرتے ہیں۔ وہ ذوق و شوق رکھتے ہیں۔ نظریے یا نصب العین سے سروکار نہیں رکھتے، مگر وہ طلبا کی مقبولیت حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ ایک دفعہ ہم لوگ علی گڑھ کی نمائش میں گھوم رہے تھے۔ خبر ملی کہ طلبا اور پولیس میں جھگڑا ہو گیا۔ دیکھتے دیکھتے طلبا کا ایک ہجوم جمع ہو گیا اور پولیس کی چوکی کی طرف بڑھنے لگا۔ پہلے تو ہم نے بھی طلبا کو روکنے کی کوشش کی مگر جب دیکھا کہ وہ اس وقت ہوش میں ہی اور کسی کی نہیں سنتے تو میں الگ کھڑا ہو گیا۔ مگر رشید صاحب نہ مانے۔ وہ ہجوم میں گھس گئے اور انہیں آگے بڑھنے سے روکنے لگے۔ کچھ لڑکے خاموش ہو گئے، مگر کچھ زور سے ان سے بحث کرنے لگے۔ اتنے میں رشید صاحب کو کسی نے ایک دھکا بھی دے دیا جو یقیناً غیر ارادی تھا، مگر وہ باز نہ آئے۔ آخر میں انہیں نکال کر لایا۔ راستے میں جب میں نے ان سے کہا کہ کیوں شہادت کے لئے کمربستہ ہو رہے تھے؟ فن کا تو آپ کے نزدیک تماشائی ہونا ہے۔ وہ معرکے میں مقصد نہیں لیتا، کہنے لگے "فن کار کو گولی مار دیجئے۔ میں معلم بھی تو ہوں۔ طلبا کو حماقت کرنے سے کیسے نہ روکوں؟" میں نے کہا اس کے لئے جی کی ضرورت ہے اور وہ آپ کے پاس نہیں ہے۔ یا پھر آپ کی آواز کسی سارجنٹ میجر کی سی ہونی چاہیے جس سے آپ [illegible] رشید صاحب کا غصہ اتر گیا۔ کہنے لگے "یہ کر بھی کیا ہی۔ باپ کے بغیر بھی گانا پڑتا ہے۔ علی گڑھ کی خاطر سب کچھ گوارا ہے۔"

[illegible] دور دور تک اس قسم کا کوئی اثر نہ ہو۔ اس معاشرے میں [illegible] رشید صاحب [illegible] ہے کہ عورتیں مردوں سے زیادہ ذہین بھی ہو سکتی ہیں۔ ان کا [illegible] مشکل سے مانیں گے۔ انہیں ہر اچھے شخص یا کام میں علی گڑھ کا فیضان ضرور نظر آتا ہے [illegible] "ہما دست" "ز منی تو" "ہمہ از دست" پر ضرور ایمان رکھتے ہیں۔ وہ مرنے والوں کی نکتہ چینی کو برا سمجھتے ہیں۔

محمد ہادی [illegible] ......

سمجھیا ہے جب عصمت کا مضمون " دوزخی " شائع ہوا تو میں نے بڑی تعریف کے ساتھ وہ رشید صاحب کو پڑھنے کے لئے دیا۔ رشید صاحب کو مضمون مطلق پسند نہ آیا۔ کہنے لگے کہ " یہ کیسی بہن ہے جو مرحوم بھائی کے متعلق اس طرح لکھتی ہے؟ " میں نے کہا " یہ اس فن کار کے قلم کا اعجاز ہے جو بہن ہونے کے ساتھ ساتھ بے لاگ مصوّر اور بے جھجک نقاد بھی ہے۔ " میں بحث کرتا رہا مگر رشید صاحب کو قائل نہ کر سکا۔ ڈاکٹر ضیاء الدین مرحوم سابق وائس چانسلر علی گڑھ یونیورسٹی کی سوانح عمری ' ضیا کی حیات ' کے نام سے شائع ہوئی۔ میں نے اس پر " اردو ادب " میں خاصی تفصیل سے ریویو کیا اور ڈاکٹر صاحب کی سیرت اور کارناموں پر بھی تنقیدی نظر ڈالی۔ رشید صاحب نے ریویو کی بڑی تعریف کی مگر اس کے لب و لہجے کو اس لئے کہیں کہیں نامناسب قرار دیا کہ مرنے کے بعد نکتہ چینی ختم ہو جانی چاہئے۔ اب اس کو کیا کیا جائے کہ بعض ناقدین کا خیال ہے کہ کسی شخص پر بھی تنقید اسی وقت ہو سکتی ہے جب وہ انتقال کر چکا ہو یعنی اس کی شخصیت کا رنگین نقاب نگاہوں کے سامنے نہ ہو۔

رشید صاحب سے میں نے " اردو ادب " کے لئے ایک مضمون کی فرمائش کی۔ جواب آیا کہ جس رسالے کا ایڈیٹر پورے رسالے کے مضامین اپنے قلم سے لکھ سکتا ہو اسے فرمائش کرنے کا کیا حق ہے۔ میں نے انہیں غیرت دلائی، خوشامد کی، دھمکیاں دیں لیکن کوئی اثر نہ ہوا۔ حسنِ اتفاق دیکھئے کہ ان کا ایک غیر مطبوعہ مضمون میرے پاس نکل آیا۔ غیر مطبوعہ اس لئے کہ یہ جگر صاحب کے نئے مجموعۂ کلام کے دیباچے کے طور پر لکھا گیا تھا۔ جگر صاحب کا نیا مجموعہ ان کے لاابالی پن کی وجہ سے اب تک نہ نکل سکا۔ میں نے بھی ایک مضمون لکھا تھا، اس کی نقل تو نہ ملی، ان کے مضمون کی نقل مل گئی۔ میری شرافت دیکھئے کہ میں نے انہیں اطلاع دے دی کہ وہ مضمون بقول کسے ' شائع ہونے جا رہا ہے۔ ' دوسرے دن الیس او۔ ایس آیا کہ مضمون نظرِ ثانی کے لئے بھیج دیا جائے۔ میں نے بھیج دیا۔ رسید آئی اور یہ مژدۂ جانفزا کہ تین چار دن میں ٹھیک ٹھاک کر کے بھیج دوں گا۔ میں منتظر رہا۔ کچھ دن بعد اطلاع ملی کہ وہ مضمون کچھ کا کچھ ہو گیا۔ اب عنقریب روانہ کیا جائے گا۔ اب مجھے یقین ہو گیا کہ مضمون مل ہی جائے گا۔ مگر دو تین دن کے بعد اطلاع ملی کہ وہ ایک دوسرے پرچے کو دے دیا گیا ہے۔ میں نے بہت بُرا مانا اور بڑی سخت شکایت کی، جواب ندارد۔ اس عرصے میں عشرۂ محرم بھی آیا اور گزر گیا۔ چند دن اور گزر نے کے بعد میں نے پھر اپنی آزردگی ظاہر کی۔ جواب ملا کہ " محرم ختم ہو گیا ——— اب ماتم موقوف کیجئے۔ " خط پڑھ کر ہنسی آ گئی اور میں نے صدقِ دل سے رشید صاحب کو معاف کر دیا۔

ایک دفعہ اردو کے سلسلے میں سمپورنانند جی سے ملنا پڑا۔ ذاکر صاحب وفد کے صدر تھے۔ یادداشت پہلے سے بھجوا دی گئی تھی۔ ہم لوگ پہنچے تو وزیرِ تعلیم بظاہر اخلاق مگر دراصل رکھائی سے پیش آئے۔ کہنے لگے کہ " یادداشت میں نے دیکھ لی ہے۔ کچھ اور کہنا ہو تو فرمایئے۔ " ذاکر صاحب نے ہم لوگوں کی طرف دیکھا۔ ہم نے دو چار باتیں کیں۔ پھر ڈاکٹر عابد نے مصرعہ اٹھایا مگر فضا کچھ ایسی سرد تھی کہ بات کرنے کو جی ہی نہیں چاہتا تھا۔ غرض مشکل سے دس منٹ کی سرسری سی بات چیت کے بعد ہم لوگ واپس ہوئے۔ مجھے سب سے زیادہ قلق اس بات کا تھا کہ وزیر موصوف نے ذاکر صاحب جیسے مستند ماہرِ تعلیم کی بھی قرارِ واقعی تواضع نہیں کی اور بات رسمی ہی رہی۔ گھر آ کر دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے رشید صاحب کو ایک لمبا سا خط لکھا جس میں اہلِ علم کی ناقدری اور اربابِ سیاست کی فرعونیت کا ذکر تھا۔ رشید صاحب نے پنسل سے جواب لکھا جس کا ایک جملہ مجھے اب تک یاد ہے " سرور صاحب! میں سمپورنانند کی بے حسی کو کیا دیکھوں، مجھے تو ذاکر جی کی دردمندی اور دلنوازی یاد ہے۔ " میں رشید صاحب سے متفق نہ ہو سکا مگر اس جذبے کا احترام کیسے نہ کرتا۔

ابھی حال کا واقعہ ہے کہ رشید صاحب نے مجھ سے کچھ پھولوں کے پودے لکھنؤ سے بھجوانے کی فرمائش کی۔ میں نے لکھا کہ " میں گل رُخوں کی یاد سے فرصت پاؤں تو پھولوں کی طرف بھی توجہ کروں۔ " رشید صاحب نے فوراً اپنی فرمائش واپس لے لی اور اس رعایتِ لفظی کی خوب داد دی۔ اچھے فقرے کا اثر رشید صاحب پر اچھے شعر کی طرح ہوتا ہے۔

رشید صاحب بڑے شریف آدمی ہیں اور ان میں شرافت کی سادہ کمزوریاں بھی ہیں۔ وہ سادہ لوح نہیں، دوسروں کی شرافت سے بقدرِ ضرورت فائدہ اٹھانا جانتے ہیں۔ وہ تصورات کے نہیں تصویروں کے، نظریات کے نہیں، نظر کے قائل ہیں۔ وہ کارناموں سے آدمیوں کو نہیں، آدمیوں سے کارناموں کو [illegible]۔ وہ جہاں بھی سچی لگن، جذبہ اور جوش دیکھتے ہیں تو اس کا احترام کرتے ہیں۔ وہ بیسویں صدی کے آغاز کی اس نسل سے تعلق رکھتے ہیں جو بزرگوں کا احترام

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

آ ئی گئی ہو گئی۔ اس واقعہ کے کچھ دنوں بعد میں شہر میں اپنے ایک عزیز کے یہاں گیا ہوا تھا۔ اور اس عزیز کے مکان کے سامنے پھاٹک پر میں کھڑا تھا کہ یہ نوجوان بھی سامنے ہی نظر آیا کیونکہ فاروقی صاحب کا گھر بھی وہاں سے بہت قریب تھا۔ میں مزاج کا بہت زود آشنا واقع ہوا ہوں۔ اس لئے فوراً میں نے مجنوں کو پکڑ لیا کو (یہ نوجوان مجنوں گورکھپوری تھا) اپنے مکان پر روز میرے یہاں آنے کی مستقل دعوت دے دی۔ میرے گھر اس سے پہلے کبھی چائے نہیں بنی تھی۔ مجنوں بچپن سے ہی چائے کے شوقین تھے۔ اور اب ہمارے گھر والوں کے لئے بھی چائے ایک جزوِ زندگی بن گئی۔ پیالے تک نہیں تھے ہم لوگ پھول کے لوٹوں میں ناشتے کے ساتھ چائے پیتے تھے۔ اور تین تین چار چار گھنٹوں تک ایک دوسرے کو اپنی یاد کے شعر سناتے تھے اور مل کر باہم گھومتے تھے۔ میں تو کئی برس پہلے بی اے پاس کر چکا تھا لیکن فاروقی صاحب کے ایما سے مجنوں انٹرنس پاس کرکے اپنے والد کی ایک بہت بڑی دکان سنبھالے ہوئے تھے۔ اس امر کا اظہار مجنوں کی پختہ دماغی کا روشن ثبوت ہے کہ میں نے ان ملاقاتوں میں پل بھر کو یہ محسوس نہیں کیا کہ شاعری اور ادب، سائنس، فلسفہ اور فنونِ لطیفہ کے نازک سے نازک نکات کو سمجھنے میں اور ان امور پر خود اعتمادی کے ساتھ گفتگو کرنے میں یہ نوجوان مجھ سے کسی طرح کم ہے۔ ان امور پر باتیں دیر دیر تک ہوتی تھیں اور یہ باتیں برابر کی ہوتی تھیں۔ یہ انٹرنس پاس نوجوان اور میں دونوں یہ محسوس کرتے تھے کہ پورے شہر میں حقیقی علمی مذاق رکھنے کی وجہ سے ہم لوگ اتنی جلد ایک دوسرے سے اس قدر قریب ہو گئے ہیں۔ ہم دونوں کی ایک دنیا بن گئی تھی۔ روز مجنوں میرے یہاں آتے تھے۔ روز چائے اور ناشتے کا دور چلتا تھا، درجنوں سگریٹ ہم لوگ پی جاتے تھے۔ میں پان کا عادی نہیں تھا۔ مجنوں کے لئے گھر میں سے پان بھی بن کر آ جاتے تھے۔ اور میر ایک دوسرے کو میر، غالب، آتش، ریاض اور کچھ فارسی شعراء کا کلام جو مجھے کم یاد تھا، لیکن مجنوں کو بہت یاد تھا ہم ―― دیر دیر تک سناتے تھے۔ آسی غازی پوری کے کلام کے بھی ہم دونوں عاشق تھے۔ جسے لذت لے لے کر ایک دوسرے کو سناتے تھے۔ اور جس پر دونوں مل کر تبصرے کیا کرتے تھے۔ کئی برس بعد ایسا ہوا کہ میں کانپور سناتن دھرم کالج میں پروفیسر ہو گیا اور مجنوں جو اب بی۔ اے پاس کر چکے تھے گورکھپور ہی میں تھے۔ ہم دونوں کے شعور اور وجدان کے باہمی ربط کا یہ کرشمہ تھا کہ بغیر ایک دوسرے کی خبر رکھے ہوئے ہم دونوں نے پچاس رباعیاں کہہ ڈالیں اور دونوں نے ایک دوسرے کو خط لکھا کہ آسی کی رباعیوں سے متاثر ہو کر یہ رباعیاں کہی گئی ہیں ―― ہم دونوں اب تک اس حسنِ اتفاق پر حیرت کرتے ہیں۔

پھر یورپ کی فلاسفی اور انگریزی ادب اور مذہب کی ماہیت اور کبھی کبھی سیاسی امور پر بھی ہماری باتیں شروع ہو جاتی تھیں۔ اس طرح کہ ختم ہونے میں نہیں آتی تھیں۔ شاید میں اور مجنوں ۱۹۲۳ء کے ان چند مہینوں کو اپنی زندگی کا بہترین زمانہ سمجھتے ہیں۔ آپ کو یہ بات یاد دلا کر پھر حیرت میں ڈال دوں کہ مجھ سے آٹھ برس چھوٹے ہوتے ہوئے اور رسمی تعلیم میں اتنا فرق ہوتے ہوئے یہ محض انٹرنس پاس نوجوان علمی میدان میں جو میرے دوش بدوش چلتا رہا تو اس کی ایک وجہ تھی اور وہ یہ تھی کہ عربی کی اچھی خاصی تعلیم اور فارسی کی بہت بلند اور مکمل تعلیم یہ نوجوان لڑکپن ہی میں حاصل کر چکا تھا چنانچہ اسکول میں خواہ اس کا درجہ دسواں ہی کیوں نہ ہو، اس کا دماغ ایک بہت پڑھا لکھا دماغ بن چکا تھا۔ فردوسی، عرفی، بیدل اور دیگر فارسی شعراء کے کلام کے حیاتیت مطالعہ نے مجنوں کے دل و دماغ پر جلا کر دی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جو ذہنی محسوسات میں نے مغربی ادب و فلسفہ سے حاصل کئے تھے، اس طرح جو ذہنی جلا حاصل کی تھی، وہ مجنوں نے عربی اور فارسی کے غائر مطالعہ سے حاصل کر لی تھی۔

۱۹۲۴ء میں پنڈت جواہر لال نہرو نے گورکھپور سے مستقل طور پر مجھے آل انڈیا کانگریس کے انڈر سیکرٹری کے منصب پر بلا لیا۔ کچھ دنوں بعد مجنوں کی [illegible] آ گئے اور وہاں [illegible] کالج میں نام لکھا کر میرے ساتھ ہی رہنے لگے۔ ہم دونوں [illegible] قریب تھا۔ کبھی کبھی دوسرے سینما گھروں میں بھی [illegible] جس مکان میں ہم دونوں رہتے تھے موتی محل سینما اس سے بہت [illegible] ایجاد نہیں ہوئی تھی۔ یہ دور خاموش چلتی پھرتی تصویروں کا [illegible] میں پلاٹ بہت کم اور معمولی خبر ہوتا تھا۔ اور ناس کر کچھ [illegible] ایسے دکھائے جاتے تھے جن میں SUSPENSE یعنی امید و بیم [illegible]

جو یہ جاننے کے لئے بے چین کر دے کہ اب کیا ہوگا۔ ایک خاص عنصر پلاٹ کا ہوتا تھا، کیونکہ وہ سب کے سب خاموش رہتے تھے۔ اس لئے ان فلموں میں خاص چیز رہ جاتی ہوئی "پیشانیاں" یا عنوانات ہوتے تھے جسے انگریزی میں CAPTION کہتے ہیں۔ یہ جملے یا فقرے بہت چابکدستی سے بنائے جاتے تھے ونثر کے ان معجزوں پر ہم دونوں وجد کرتے تھے۔ شاید ہم نے اپنی اپنی انشاپردازی میں ان "پیشانیوں" کا غیر شعوری طور پر اثر لیا ہے۔ یہ بات ہے اس وقت کی جب ہندوستانی فلم انڈسٹری بھی وجود میں نہیں آئی تھی۔ اور سیمیں پردوں پر یہ گونگی بولتی "پیشانیاں" ہم دونوں کے لئے انگریزی زبان کی نثر کا زندہ درس ہوتی تھیں۔ بڑی ڈرامائی کیفیت اور صفت ان "پیشانیوں" میں ہوتی تھی۔ اب کئی برسوں سے سینما دیکھنے کا شوق نہ مجھ میں رہ گیا نہ مجنوں میں۔ کبھی سینما کا ذکر چھڑتا ہے تو ہم دونوں یہ کہہ دیتے ہیں کہ ٹاکیز کے آنے کے بعد سے سینما سینما نہ رہا اور محض طفلانہ دماغ رکھنے والوں کی تفریح کی چیز ہو کر رہ گیا ہے۔

مجنوں نے کرسچین کالج میں سائنس کے مضامین لئے تھے۔ ان کے والد فاروق صاحب کو ریاضی اور سائنس کی دوسری شاخوں پر غیر معمولی عبور تھا۔ اور مجنوں بھی ادبی رجحانات کے ساتھ ساتھ سائنس کے بہت اچھے طالب علم تھے۔ الہ آباد میں میرے ساتھ قیام کے دوران میں ایک بار ایسا ہوا کہ میں پنڈت جواہر لال نہرو کے یہاں سے آسکر وائلڈ کا ڈرامہ SALOME اٹھا لایا۔ اور ٹالسٹائی کے ڈرامے بھی اٹھا لایا۔ میرے پڑھ چکنے کے بعد سرسری طور سے دونوں کتابیں مجنوں بھی دیکھ گئے اور نہایت تیز رفتاری کے ساتھ لیکن نہایت اچھوتے انداز میں SALOME کا اردو ترجمہ کر ڈالا۔ اور ٹالسٹائی کے ڈرامہ THE FIRST DISTILLER کا اردو ترجمہ ابوالخمر (پہلا کلوار) کے نام سے کر ڈالا۔ مجنوں کے پاس انہیں چھپوانے کے لئے روپے نہ تھے۔ میرے پاس کچھ فالتو روپے تھے جس سے یہ دونوں کتابیں بہت جلد چھپ گئیں۔ جب مجنوں کے پاس روپے ہوئے تو بغیر کسی یاد دہانی کے انہوں نے میرے روپے واپس کر دئیے۔ مجنوں میں جہاں دوسری بہت سی اعلیٰ صلاحیتیں ہیں، وہاں ایک غیر معمولی صلاحیت یہ بھی ہے کہ انگریزی الفاظ اور انگریزی فقروں کا نہایت برجستہ اور صحیح ترجمہ وہ کر سکتے ہیں۔ مجنوں کی عمر اس وقت مشکل سے انیس برس کی ہوگی، اور میں اس امر کا تصور نہیں کر سکتا کہ انیس برس کا لڑکا انگریزی شاعری، انگریزی نثر، سائنس اور فلسفہ اور جمالیات اور دیگر علوم کی انگریزی اصطلاحوں کا اتنا نپا تلا ترجمہ کر دے کہ آنکھیں کھل جائیں۔ مجنوں کی نثر اسی عمر میں اپنے سانچے ڈھال چکی ہے۔ توازن اور جملوں کی ایسی ساخت جس میں ایک لفظ بھی گھٹایا یا بڑھایا یا بدلا نہ جا سکے اور جنہیں دوسرے الفاظ و انداز میں ادا ہی نہ کیا جا سکے، ان تمام نکھری ہوئی صلاحیتوں کا ثبوت دینے لگی تھی۔ اگر مجنوں کی تصنیفات مختصر کتابوں کی شکل میں نہ ہوتیں اور اگر وہ ایک ایک موضوع پر چار چار پانچ پانچ سو صفحات اپنی نثر کے لکھتے تو ان کے ٹھوس کارنامے اردو میں وہی جگہ رکھتے جو انگریزی ادب میں شوئفٹ کے نثری کارناموں کو حاصل ہے۔ میں تو اب بھی یہی کہوں گا کہ انداز، دس بارہ سو صفحات کی نثر جو مجنوں نے ہمیں دی ہے، وہ اپنی حساس منطقیت اور زندہ عقلیت کے لحاظ سے اردو زبان میں اپنا ثانی نہیں رکھتی۔

یہ وہ زمانہ ہے جب میری عمر اٹھائیس برس کی تھی اور مجنوں کی عمر انیسویں بیسویں سال میں تھی۔ ہم لوگوں کا اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا ساتھ ساتھ رہتا تھا۔ ایک بار مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں نے یہ کہہ دیا کہ مسلمان صرف گوشت کھانا جانتا ہے۔ خاص کر ترکاری بنانا یا سبزیوں کی قدر کرنا اس قوم کو نہیں آتا۔ مجنوں جھلا اٹھے اور تیوری چڑھا کر مجھ سے کہا کہ "تم نے ترکاری کھائی بھی ہے"۔ مجنوں کا یہ بگڑنا مجھے اتنا پیارا لگا، اور اپنے اوپر یہ حملہ مجھے اتنا خوشگوار معلوم ہوا کہ میں اس بحث ہی سے بالکل بے نیاز ہو گیا۔ جب کئی برس بعد مجنوں نے گورکھپور میں اپنے گھر کی بنی ہوئی ترکاریاں مجھے کھلائیں تو یقین جانئے میرے چودہ طبق چمک گئے۔ اور مجنوں کا کئی برس پہلے کا بگڑنا یاد کر کے مجھے اور بھی خوشی ہوئی۔ اس یاد نے ان انتہائی لذیذ ترکاریوں کی لذت کو اور بھی بڑھا دیا۔ ایک چیز کی عادت البتہ میری صحبت سے مجنوں کے اندر پیدا ہو گئی، یعنی اچاروں کی عادت۔ اچار بھی اب مجنوں کے گھر اتنا اچھا پڑتا ہے کہ کھانے کے وقت ان اچاروں سے لیتی ہے۔

قیام الہ آباد کے اس دوران میں، میں اور مجنوں نئی کتابوں، فلسفہ کے نئے مدرسوں، مذہب کے گہرے نکات اور اس دور کے اردو ادب پر جی کھول کر باتیں کیا کرتے تھے۔ مجنوں باتوں باتوں میں اپنے بہت سے حالات بھی مجھے سنا دیا کرتے تھے۔ انیس بیس برس کی عمر ہی میں وہ درجن بھر عشق کر چکے تھے۔

ابھی سے بھی شراب پی چکے تھے۔ ایک ایک رات میں صرف ایک شبانہ محبت کی تکمیل میں محبوب کو نذر و نیاز، شراب اور شاندار دعوت کے سلسلے میں سو سو ڈیڑھ ڈیڑھ سو روپے اُٹھا چکے تھے۔ میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ یہ ایک نہیں آدھے تیتر کا لونڈا کتنا نڈر اور کس جیوٹ کا ہے۔ بدمعاشوں سے ان کو سابقے پڑ چکے تھے۔ اور بدمعاش محض اُن کے تیور سے سہم کر رہ گئے تھے۔

اب یہ بھی بتا دوں کہ ہم دونوں ایک دوسرے کی طرف اس لئے نہیں کھنچتے تھے کہ بنیادی طور پر ہم دونوں کا مزاج یکساں تھا۔ ہماری باہمی ہم آہنگی اور قربت اس وجہ سے تھی کہ مجنوں کی شخصیت میں غالب عنصر حساس عقلیت کا تھا۔ اور میرے اندر غالب عنصر ذہن کی وجدانیت اور وہ وجدانیت تھی جو بعد کو میری شاعری میں نمایاں ہوئی۔ میں ان کی چچی تلی باتوں پر فریفتہ تھا اور وہ میری باتوں کی اشاریت اور رمزیت کے شیدائی تھے۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے سیکھتے تھے۔ "نقوش" میں جو میرے خطوط شائع ہو چکے ہیں ان سے یہ پتہ چل گیا ہوگا کہ کئی برسوں سے میری زندگی ایک مستقل المیہ بن چکی تھی۔ مجنوں کی بے لوث اور پُر خلوص ہمدردی میرے لئے ایک بہت بڑا سہارا تھی۔ اُن کا دل بھی چوٹ کھایا ہوا تھا اور اس لئے جو بھیانک دنیا میرے اندر میری زندگی کو ایک جیتا پھرتا جہنم بنائے ہوئے تھی اس کا مجنوں کو پورا پورا احساس تھا۔ میں نے جو اپنے مزاج کو شاعرانہ اور وجدانی اور مجنوں کے مزاج کو عقلی اور منطقی کہا ہے، اگر یہ بات یہیں تک کہہ کر چھوڑ دی جائے تو ہم دونوں کے متعلق یہ بات یک طرفہ رائے ہوگی۔ اصل بات یوں ہے کہ مجنوں کے مزاج کا غالب عنصر عقلیت ہے لیکن ان کے مزاج کا ایک انفعالی عنصر بھی ہے جو وجدانیات و جمالیات کا شدید احساس کرتا ہے۔ مجنوں کے مزاج کا یہ عنصر یا اُس کی یہ رگ بہت حساس ہے۔ اسی سے وہ خود تو کیف با سوز و راز میں ڈوبے ہوئے اشعار نہیں کہتے۔ لیکن ایسے اشعار کو سُن کر ان پر حال و قال کا عالم طاری ہو جاتا تھا۔ میری شاعری میں غالباً وجدانی عنصر غالب ہے۔ اسے مجنوں اسی طرح محسوس کرتے تھے اور اس سے شاید اس درجہ متاثر و متکیف ہوتے تھے کہ باید و شاید۔

مجنوں کی انفعالی وجدانیت نے آسی غازی پوری اور میر پر اُن سے ایسے مضامین لکھوائے جن میں تنقید خود وجدان بن گئی ہے۔ اس طرف آگے چل کر کچھ اور اشارے کروں گا۔ لگے ہاتھوں اپنے متعلق بھی یہ عرض کر دوں کہ میرے مزاج میں وجدانی اور جمالیاتی احساس کا عنصر غالب عنصر ہے لیکن عقلیت کا عنصر بھی اس عنصر کے تحت بہت زندہ شکل میں موجود ہے یعنی میرے یہاں جس عنصر کو اولیت حاصل ہے، مجنوں کے یہاں وہ عنصر ایک امکان کی صورت میں یا نیم خوابیدہ عالم میں ہر وقت موجود رہا ہے۔ اس لئے اسے ان کے یہاں دوئمیت کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ اور عقلی حس جسے میرے یہاں دوئمیت حاصل ہے، مجنوں کے یہاں اولیت کا مرتبہ رکھتی ہے۔ بہرحال عقلیت و وجدانیت ہم دونوں میں ایک قدر مشترک کی طرح کارفرما رہی ہیں۔ اور ہم دونوں شاعری میں قریب قریب یکساں مذاق رکھتے ہوئے فلسفہ اور علوم میں بھی یکساں طور پر منہمک رہے ہیں۔

الٰہ آباد میں مجنوں کا قیام زیادہ دنوں تک نہیں رہ سکا۔ وہ سخت بیمار پڑ گئے اور مستقل طور پر کرسچین کالج کو چھوڑ کر پھر گورکھپور واپس چلے آئے۔ تین برس تک میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی میں اپنے منصب پر اس کے بعد کام کرتا رہا۔ اس دوران میں مجنوں نے گورکھپور میں "ایوان اشاعت" قائم کر لیا۔ اور رسالہ "ایوان" کا اجرا کیا۔ ان کے رنگارنگ ادبی کارناموں کی تخلیق اب باقاعدہ شروع ہوگئی۔ افسانے، ناول، بصیرت افروز تنقیدی مضامین، فلسفیانہ اور علمی تصنیفات، طویل ادبی بحثیں، کبھی کبھی نہایت چچی تلی شاعری، نظموں اور غزلوں کی شکل میں ان تمام میدانوں کو انہوں نے اپنی فکر اور تخلیقی قوت کی جولانگاہ بنا لیا۔ یہ تین چار برس کا زمانہ ان کی ادبی زندگی کا سب سے اُپجاؤ زمانہ رہا ہے۔ جو بعد کو بھی کئی برس تک رہ رہ کر ان سے بہت قابل قدر چیزیں لکھواتا رہا۔ اور جو اس وقت تک قائم رہا جب تک وہ "ایوان" نکالتے رہے۔ SALOME اور ابوالنحر کے بعد برنارڈ شا کے مشہور ناٹک BACK TO METHUSELAH سے ماخوذ "آغاز ہستی" افسانوں کے دو مجموعے "سمن پوش" اور "خواب و خیال" کئی برس پہلے کی تصنیف "زیدی کا حشر" نیا ناول "سوگوار شباب" بلند فلسفیانہ مقالہ "شوپنہار" "تاریخ جمالیات" "مریم مجدلین" بائرن کے منظوم ڈرامہ CAIN کا ترجمہ "قابیل" کے نام سے اور ان کے علاوہ سینکڑوں صفحات پر پھیلی ہوئی نہایت تربیت یافتہ تحریریں، بہت سے ادبی اور تنقیدی تبصرے، دس بارہ برس کے اندر یہ تمام پُر مغز، ٹھوس اور یادگار تصنیفیں مجنوں نے اردو دنیا کو دی ہیں۔

میں مجنوں سے اکثر کہا کرتا تھا کہ "تمہارے افسانوں میں بسا اوقات زمانہ کے خلاف ایک جھلاہٹ کا عنصر پیدا ہو جایا کرتا ہے۔" مجھے یہ بات پسند نہیں تھی۔ پریم چند کے افسانوں کا سوز و گداز اپنے افسانوی ادب میں پیدا کرو۔ اور ہندوستانی زندگی کی ناقابل فراموش سچی مصوری سے اپنے افسانوں کو سدا بہار بناؤ۔ میری تجویز کا بیج ایک زرخیز زمین میں دفن ہوا۔ اور سوگوار شباب نامی ناول کی شکل میں کچھ دنوں بعد بار آور ہوا۔ مجھے جاننے والوں میں بہتوں کو یہ نہیں معلوم کہ اب سے تیس برس پہلے چھ سات افسانے میں نے بھی لکھے تھے لیکن یہ میدان مجھ سے بہت جلد چھوٹ گیا۔ انہیں دنوں کی بات ہے کہ ایک بار کئی دنوں کے لئے مجنوں اور پریم چند دونوں میرے مہمان رہے۔ ایک دن صبح کو جب ہم تینوں سو کر اٹھے تو میں نے کہا کہ بھائی ایک پلاٹ میرے ذہن میں آیا ہے۔ خود اپنی زندگی کے واقعات سے متاثر ہو کر اور ٹینی سن کے منظوم افسانہ ENOC ARDEN اور ٹامس ہارڈی کے ناول TESS سے متاثر ہو کر آپ دونوں میں جو بھی چاہے اسے یہ پلاٹ نذر ہے۔ میں نے پلاٹ بیان کر دیا جو دونوں کے دلوں میں گھر کر گیا۔ پریم چند نے "آعبوشئ" کے نام سے ہندی کا جامہ اسے پہنا دیا اور مجنوں نے یہ افسانہ "کُنا" کے نام سے شائع کیا۔

مجنوں سے میری گفتگو جیسا کہ اب تک عرض کرتا آیا ہوں فلسفہ اور جمالیات کے موضوع پر نہایت انہماک سے اکثر ہوتی رہتی تھی۔ انہیں بحثوں کی تحریک سے غالباً مجنوں نے کچھ دنوں بعد شوپنہاور اور تاریخ جمالیات دو کتابیں شائع کیں۔ مجنوں کے افسانوں سے جو ذرا سی مجھ میں ناآسودگی تھی، اس کی بنا پر اُن سے میں اکثر کہا کرتا تھا کہ خلاقانہ اور دیانت دارانہ تنقیدی مضامین بھی ہم لوگوں کو لکھنا چاہئیں۔ یوں تو ان دنوں خط و کتابت کے علاوہ نثر قریب قریب لکھتا ہی نہیں تھا، لیکن مجنوں نے دو تین مجموعے تنقیدی مضامین کے شائع کئے جن کا ذکر پہلے کر چکا ہوں۔ مجنوں نہایت محبت سے کبھی کبھی یہ کہہ دیا کرتے ہیں کہ مجھے افسانوں کو چھوڑ کر تنقید کی طرف آنے کی ترغیب فراق نے دلائی۔ اس امر میں غالباً مجنوں کی نشو و نما میں میرا حصہ کچھ اسی طرح کا رہا ہے جیسے ورڈز ورتھ کی شاعری کی نشو و نما میں اس کے دوست کولرج کا حصہ رہا ہے۔

کوئی یہ نہ سمجھے کہ میں اور مجنوں علمی و ادبی امور میں ہمیشہ یکساں ردِ عمل ظاہر کرتے تھے۔ مثلاً میر کے بارے میں تو ہم دونوں کا ردِ عمل ایسا رہا ہے کہ ہمارے خیالات بالکل ہم آہنگ ہو گئے ہیں۔ لیکن میں سودا کی غزلوں کا بھی قائل رہا ہوں، مجنوں بالکل قائل نہیں رہے ہیں۔ اور یہ کہہ کر اکثر مجھے چھیڑتے رہتے ہیں کہ میاں تم سودا کو کیوں گھسیٹ لایا کرتے ہو۔ میں آتش کے کلام کے بہترین حصے پر مٹا ہوا ہوں۔ مجنوں کا کہنا ہے کہ آتش کے بڑے اشعار میں اکثر دوسرا مصرع پہلے مصرعے سے کچھ کم حیثیت کا ہوتا ہے۔ مجھے لکھنؤ اسکول کی شاعری عام طور پر کم پسند ہے۔ مجنوں کا کہنا ہے کہ دبستانِ دلی کی شاعری یکسر جذباتی ہے۔ اور گوشت کے ایک ایسے لوتھڑے کے مانند ہے جس میں ہڈی نہ ہو۔ مجنوں کی عقیدت اس خارجیت کو مناسب خراج پیش کرتی ہے جو لکھنؤ کی شاعری میں ملتی ہے۔ حسرت کی شاعری کے ہم دونوں دلدادہ ہیں لیکن اب میں مجنوں کی نسبت کسی قدر کم دلدادہ ہوں۔ اصغر کی شاعری کو میں جس بلند لہجے میں سراہتا تھا وہ مجنوں کے دل کو نہیں لگتی تھی۔ اگرچہ اصغر کی شاعری کی خوبیوں کا انہیں بھی اعتراف ہے۔ جوش کی شاعری میں جو زور و توانائی ہے اور جو رنگارنگی ہے میں اکثر اسے اچھالتا رہتا ہوں۔ لیکن مجنوں ذرا کم ہی قائل ہوتے رہے ہیں۔ انگریزی شاعری پر رائے زنی میں مجنوں شیلے کے ہم پرواز ہیں۔ اور میں ورڈز ورتھ کا ہم نوا رہوں۔ یہ ایک عجیب بات ہے۔ رموزِ ادب کو چیر جانے والی ذہنیت رکھتے ہوئے بھی مجنوں ورڈز ورتھ کے قائل نہیں ہوئے۔ شاید اس وجہ سے ہو کہ میں ہندو گھر میں پیدا ہوا اور مجنوں مسلمان گھر میں پیدا ہوئے۔ وہ مجرد اور معریٰ تخیل سے متاثر ہوتے ہیں جس کی بہترین مثال شیلے ہے۔ میں خاکی دنیا کی پاکی کا قائل ہوں۔ اور سفر سے زیادہ وطن یعنی آفاق کی وطنیت کے تصور کی طرف کھنچتا ہوں۔ اسی سے وہ کیٹس کے مداح تو ضرور ہیں، لیکن معتقد اتنے نہیں ہیں اور میرا ردِ عمل اعتقاد کی حد تک پہنچا ہوا ہے۔ مجنوں نے ایک نہایت بصیرت افروز اور متوازن کتابچہ اقبال پر لکھا تھا جو کئی برس پہلے شائع ہو چکا ہے۔ میں اس سے حرف بحرف متفق ہوں۔

میں اور مجنوں دونوں بہت دنوں تک لینن کی شخصیت اور اس کے کارناموں سے اپنے آپ کو ہم آہنگ نہیں پاتے تھے۔ جب اس کی وجہ ہم لوگ بیان کرتے ہیں تو ہم دونوں مزے لے لے کر خوب ہنستے ہیں۔ ہم دونوں کو بہت دنوں تک لینن کی تصویر ناپسند تھی۔ خاص طور پر اس کی داڑھی کی

نمائش شرافت۔ جب آدمی کا چہرہ پسند نہ آئے تو اس کا فلسفہ یا اس کے عمل کیونکر پسند آئیں۔ بعد کو یعنی ترقی پسند ادب کی تحریک شروع ہونے کے بعد ہی ہم دونوں کو اپنی اس دلچسپ حماقت کا احساس ہوا اور ہم دونوں لینن اور اشتراکیت سے اپنے آپ کو ہم آہنگ پانے لگے۔ خود میری شاعری کے متعلق بھی ادھر ایک زمانے سے مجنوں کے دل و دماغ میں کچھ سوالیہ نشانات بن جایا کرتے تھے۔ بات یہ تھی کہ وہ میری غزلیت کے جی جان سے دلدادہ تھے اور میری ایسی نظموں کی بھی قدر کرتے تھے جن میں غزلیت کا عنصر بہت غالب ہوتا تھا۔ جب میری نظموں میں اور میری غزلوں میں بھی کچھ ایسے عناصر نمایاں ہوئے جن میں تفکر یا مقصد کے پہلو ہوتے تھے اور جن میں ذاتی جذباتیت نسبتاً کم ہوتی تھی تو مجنوں ناآسودہ سے نظر آنے لگتے تھے۔ شاید انہوں نے میری شاعری کے نئے پہلوؤں سے اب کسی قدر مصالحت کر لی ہے۔ روپ کی رباعیاں اشاعت سے پہلے جب مجنوں نے سنیں تو وہ کچھ ناخوش سے نظر آئے۔ وہ رباعیوں کی روایت کے ساتھ اسے بغاوت سمجھتے تھے۔ شاید اب وہ انہیں ان کی مناسب جگہ دینے کو تیار ہیں۔ اگر زمانے نے فرصت دی تو دو چار سو ایسی متفکرانہ اور فلسفیانہ رباعیاں بھی مجنوں کی خدمت میں پیش کر سکوں گا کہ انہیں شکایت نہ رہے۔

ہاں تو اب میں الہ آباد یونیورسٹی میں انگریزی ادب کا معلم ہو گیا تھا اور اب تک اسی منصب پر ہوں۔ مجنوں انگریزی اور اردو میں ایم۔ اے کر کے سینٹ اینڈ ریوز کالج گورکھپور کے لیکچرار وغیرہ ہو چکے تھے اور اس طرح اب ہم دونوں بہت حد تک ہم مذاق ہونے کے ساتھ ساتھ ہم پیشہ بھی ہو چکے تھے اور یہ رشتہ اب تک قائم ہے۔ میرے طریقۂ تعلیم اور مجنوں کے طرز درس میں کافی فرق ہے۔ میرا ذہن غالباً درس و تدریس میں خلاقانہ اور طبع زادانہ ہے۔ میں کسی ادبی سبق کو پڑھانے یا ادبی مسئلہ کو سلجھانے میں تجربات زندگی کی اصطلاحوں میں بے لاگ مسلسل تقریر کرتا چلا جاتا ہوں اور مناسب محسوسات کا اظہار اپنے لفظوں میں کرتا ہوں .... مجنوں شاید اتنی تیزی سے اور بیک وقت اتنی باتیں کہنے کے عادی نہیں ہیں۔ وہ عقلی، منطقی اور لغوی مفہوم کو بہت باقاعدگی سے جچے تلے الفاظ میں بیان کر دیتے ہیں لیکن ان کے لیکچر اور ان کے لکھائے ہوئے نوٹ ہوتے ہیں بہت کارآمد اور عموماً بے حد مفید۔ بہت کوشش و انہماک کے ساتھ اور بہت مرکوز توجہ کے ساتھ وہ درجے کو ایسی باتیں بتاتے ہیں جن میں کوئی لفظ بدلا نہیں جا سکتا اور کوئی نقطہ بڑھایا گھٹایا بھی نہیں جا سکتا۔ یہ حسابی کتابی تدریس بہت معلمانہ اور پُر از معلومات ہوتی ہے۔ اس انداز تعلیم و تادیب میں اگرچہ کیفیت آوری کم ہوتی ہے لیکن روکھا پھیکا پن بالکل نہیں ہوتا۔ مجنوں درجے میں کہنے کی باتیں پہلے سے سوچ کر مرتب کر لیتے ہیں۔ میری باتوں میں آمد زیادہ ہوتی ہے اور وہ گویا اپنے آپ کو خود مرتب کرتی جاتی ہیں۔ میں کبھی کبھی مجنوں کو یہ کہہ کر چھیڑتا ہوں کہ تم تو اس شد و مد سے اپنے لیکچر کی تیاری کرتے ہو کہ اپنے پیشے کو جان کا جنجال بنا لیا ہے۔ پورے کالج پر بلکہ کالج کے پورے اسٹاف پر بھی مجنوں کا ایک رعب رہتا ہے۔ کچھ دنوں کے لئے مجنوں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں پروفیسر ہو کر چلے گئے تھے۔ میں نے مجنوں سے پوچھا کہ علی گڑھ سے چلے کیوں آئے۔ اس کے جواب میں مجنوں نے بڑی مزے دار بات کہی۔ کہنے لگے کہ بھائی جہاں خالی مسلمان ہی مسلمان رہتے ہوں وہاں کسی کو پڑھنے لکھنے سے کیا غرض۔ اگر مجنوں کا یہ کہنا غلط ہے تو یہ لطیفہ سنانے کا جواز میں یہی کہہ کر دے سکتا ہوں کہ "نقل کفر کفر نہ باشد۔"

مجنوں سے متعلق کچھ اور لطیفے پیش کرتا ہوں جو ان کی شخصیت پر روشنی ڈالتے ہیں۔ مرزا یگانہ کی شاعری کے مداح میں اور مجنوں دونوں رہے ہیں، بلکہ مجنوں نے تو اپنی تحریروں میں کئی موقعوں پر جی کھول کر ان کی شاعری کو سراہا ہے۔ چھ سات برس پہلے کی بات ہے کہ مرزا یگانہ کو مجنوں نے گورکھپور کے مشاعرے میں بلایا اور ان کا بہت پُرتپاک خیر مقدم کیا۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ مرزا یگانہ اپنا بہترین و بلند ترین دین اردو کو دے چکے تھے۔ اور اب بجائے یگانہ شاعری کے یگانہ آرٹ کے علمبردار ہو گئے تھے۔ جب مجنوں سے پوچھا گیا کہ یگانہ صاحب کے نئے کلام پر آپ کی کیا رائے ہے تو مجنوں نے کہا کہ اب ان کی شاعری کھول کر رہ گئی ہے۔ پڑھنے والے اس فقرے کا مطلب جو چاہیں لگائیں۔

ایک بار ایک صاحب نے جو میرے اور مجنوں دونوں کے معتقد و مداح تھے میری اور مجنوں کی دعوت اپنے یہاں کی۔ مجنوں جانا نہیں چاہتے تھے لیکن میرے اصرار سے راضی ہو گئے۔ جب دعوت کھا کے ہم لوگ پلٹے تو مجنوں نے مجھ سے اچانک طور پر یہ کہا کہ "یہ باتیں مجھے سخت ناپسند ہیں" میں نے پوچھا

تم لوگوں نے مچا رکھی ہے۔ اس کا مزہ تم لوگوں کو چکھا دیں گے"۔ لطف یہ تھا کہ مجنوں صاحب سب سے زیادہ شور مچا رہے تھے۔ جس کی اس غریب کو خبر نہ تھی۔

میرے اور مجنوں کے درمیان کئی بار معرکے بھی ہو گئے ہیں۔ ایک بار جب مجنوں گورکھپور رہتے تھے اور میں الٰہ آباد تو ڈاک پر بھی ہم لوگ ایک دوسرے سے خوب لڑے۔ منہ سے لڑنے تو منہ تھک جاتا لیکن دونوں کے قلم چلتے نہ تھکے۔ اور خوب چلی کئی ہم لوگ ایک دوسرے کو لکھتے رہے — دونوں کا غصہ جتنا بڑھتا جاتا تھا اتنی ہی باہمی محبت بھی عود کرتی چلی آتی تھی۔ اور دونوں اپنے غصہ بھرے خطوں میں لکھتے تھے کہ خیر دوستی اور تعلقات تو ختم نہیں ہو سکتے، لیکن یہ باتیں بہت بری ہیں۔ کئی خطوں کے بعد یہ لڑائی بند ہوئی۔ لیکن تحریری صلح کے ساتھ نہیں۔ بلکہ ہم دونوں خطوں کے ذریعے لڑ جھگڑ کر چپ ہو رہے۔ اس بات کے کئی مہینوں بعد مجنوں ایک دن اچانک میرے گھر الٰہ آباد وارد ہو گئے۔ میں غسل خانہ میں تھا۔ اور ان کے آنے کا شان و گمان بھی مجھے نہ تھا۔ وہ میرے ملازم کو چائے بنانے کا حکم دے رہے تھے۔ اور غسل خانہ میں ان کی آواز آ رہی تھی۔ میں جلدی نہا کے باہر نکل آیا۔ ہم دونوں دیوانے بغل گیر ہو بیٹھے۔ تھوڑی دیر تک خوب گزرتی رہی۔ پھر مجنوں نے سلسلۂ استفسار شروع کر دیا۔ یوں کہ جناب آپ نے مجھے میرے متعلق اپنے خطوط میں یہ باتیں کیوں لکھیں؟ میں نے جواب دیا کہ غصے میں اگر جھوٹ الزامات نہ لگائے جائیں تو غصہ کیسے قائم رہے اور غصے کا لطف کیسے آئے؟ اب باقاعدہ صلح ہو گئی۔

مجنوں کی شخصیت کئی لحاظ سے مجھ سے بہت مختلف ہے۔ انہیں سیر و سیاحت کا بڑا شوق ہے اور میرے لئے سفر سقر ہے۔ ہوٹلوں میں انہیں جنت کی بہار نظر آتی ہے اور مجھے وحشت ہوتی ہے۔ وہ گھر پر شراب پینے کے قائل نہیں۔ ہوٹل میں کھانا پینا گویا ان کی عمر بڑھا دیتا ہے۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو کہ اب تک ان کا اپنا کوئی گھر نہیں ہے۔ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ کنبے کے اور لوگوں سے الگ ہو کر رہنے کا، انہیں موقع نہیں ملا۔ اس لئے ہوٹل ان کے لئے ایک خوشگوار فرار کا موقع بن جاتا ہے۔ چائے کا انہیں بڑا شوق ہے اور انہیں کی وجہ سے چائے پینا میری عادت ہو گئی۔ وہ پان کے بھی رسیا ہیں جیسا میں پہلے بھی لکھ چکا۔ جب سے یہاں الٰہ آباد کبھی کبھی ان کا آنا ہوتا ہے تو وہ اپنا سب وقت مجھے نہیں دیتے۔ دو تین دن کے قیام میں بھی ان نئے تانگے کا بل بیسوں روپے تک پہنچ جاتا ہے۔ الٰہ آباد کی خاص ہستیوں سے وہ مل چکے ہیں۔ اور میرے یہاں آکر سب سے باقاعدہ جا کر ملاقات کرتے ہیں۔ میں اپنا تکیہ نہیں چھوڑتا، کیونکہ میں ایک بے دست و پا آدمی ہوں۔ پہلی ہی ملاقات میں مجنوں بڑے سے بڑے آدمی کو اپنا والہ و شیدا بنا لیتے ہیں۔ ڈاکٹر تارا چند۔ پنڈت جواہر لال نہرو۔ پروفیسر نعیم الرحمٰن مرحوم۔ پنڈت امرناتھ جھا۔ ان سب پر ان کی شخصیت کا جادو چل چکا ہے۔

جب جب میں گورکھپور جاتا ہوں تو مجنوں ہی کا مہمان ہوتا ہوں۔ گاڑی بہت صبح گورکھپور پہنچتی ہے۔ اپنے ملازموں اور بال بچوں کو وہ ہدایت کر دیتے ہیں کہ جب میں آؤں تو میری آسائش کا تمام انتظام وہ لوگ کر دیں۔ خود وہ دو گھنٹہ دن چڑھے اٹھتے ہیں۔ اور میں تمام ضروریات سے فارغ ہو کر بیوقوف بنا بیٹھا رہتا ہوں تب کہیں آپ اندر سے تشریف لاتے ہیں۔ لیکن اس میں مجنوں کا ذرا بھی قصور نہیں۔ میں تو اپنی بے خوابی شام ہی سے غرقِ جام کر دیتا ہوں۔ مجنوں کی صحت اس کی انہیں اجازت نہیں دیتی۔ جوانی میں تو وہ بوتلیں پی کر ہضم کر جاتے تھے، لیکن اب شراب ان سے نہیں چلتی۔ بے خوابی کے شکار وہ بھی ہیں اس لئے کہیں رات رہے ان کی آنکھ لگتی ہے۔

ہم دونوں کے درمیان کبھی کبھی مولانا ابوالکلام آزاد کے ترجمۂ قرآن کا ذکر بھی اٹھا ہے۔ اور ہم دونوں اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ مولانا نے قرآن کو اپنے ترجمے میں نذرِ نحت، نذرِ عقلیت اور نذرِ قواعد کر دیا ہے۔ اور روحِ قرآن تک نہیں پہنچ سکے ہیں ما سلام، اسلامیات سے بڑی چیز ہے۔ ایک بار میں نے مجنوں سے ایک ایسی بات کہی کہ اگر وہ بات میں کسی اور سے کہتا تو اس کی اندر کی سانس اندر اور باہر کی سانس باہر رہ جاتی، لیکن مجنوں نے فوراً مجھ سے اتفاق کیا۔ وہ بات یہ تھی کہ اردو کے بہت بڑے محسن ہوتے ہوئے بھی سرسید اردو کے سب سے بڑے دشمن تھے۔ آگے نہ پڑھئے۔ رک کر سوچئے کہ

میرا اور مجنوں کا مفہوم کیا تھا اب آپ سوچ چکے ہوں گے اور بات سمجھ میں نہ آئی ہو گی۔ ہم لوگوں کا مفہوم یہ تھا کہ اردو ادب کے کچھ حصوں میں ایک عالمگیر کیفیت، رمزیت، تحلیل قلب، سوز و گداز، جمالیاتی احساس اور وجدانی قدریں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہیں۔ سرسید نے ان تمام قدروں کو نذر تدبّر کر دیا، انہوں نے اردو کو نذر ملّت کر دیا۔ اور علی گڈھ کی فضا میں ایک صحافتی اور محض علمی و تاریخی ادب کے لئے قدر شناسی کا احساس کسی قدر رہ گیا۔ اردو ادب کا وہ حصہ جو حالی و قال سے لبریز ہے اسے سرسید کی سرپرستی نہیں ملی۔ صرف معاملت جس حصے میں ہے اسی حصے کو سرپرستی ملی۔ یہ امر واقعہ ہے کہ سرسید کے زمانے میں عام طور پر اردو ادب مائل بہ انحطاط تھا۔ لیکن ان کے زمانے میں غالب اور غالب کا ادب دونوں موجود تھے جنہیں سرسید نے نظر انداز کر دیا۔ کوئی چاہے تو سرسید کی بڑی شخصیت کا صحیح اندازہ لگا کر اس امر کا فیصلہ کرے کہ میر اور ان کے ہم نوا شعرائے غالب، مومن، مصحفی اور آتش کے کلام کو سرسید اپنے دل میں جگہ دینے کا مذاق رکھتے تھے یا نہیں۔ آج ترقی پسند ادب کی تحریک نے اس گتھی کو بہت کچھ سلجھا لیا ہے کہ ادب میں وجدانی کیفیت اور حال و قال یا جمالیاتی صفات کے ساتھ ساتھ پیام عمل اور قومی بیداری کی تحریکیں بھی شامل کی جا سکتی ہیں۔

مجنوں کے والد فاروق صاحب سائنسداں ہوتے ہوئے بھی کبھی کبھی شعر کہہ لیا کرتے تھے۔ انہوں نے اپنا تخلص دیوانہ رکھا تھا۔ مجنوں نے کیا عجب، اسی رعایت سے اپنے تخلص کا انتخاب کیا ہو۔ ایک بار مجنوں کے سب سے چھوٹے بھائی نے جس کی عمر مشکل سے اس وقت سولہ برس کی رہی ہوگی ایک صحبت میں اپنی غزل سنائی۔ شاید ابھی اس لڑکے نے اپنا کوئی تخلص نہیں رکھا تھا۔ لوگوں نے رائے دی کہ تم اپنا تخلص خبطی کر لو۔ خیر شاعری تو دیوانہ صاحب، مجنوں صاحب اور خبطی صاحب نے جاری نہیں رکھی۔ لیکن اس واقعہ نے ہمیں ایک لطیفہ ضرور دیا۔

مجنوں کی شخصیت پر میں جیسا کچھ لکھ سکتا تھا لکھ چکا۔ اگرچہ مجھ سے وہ کافی چھوٹے ہیں لیکن ادبی میدان میں مجھ پر انہیں اولیت حاصل ہے۔ اور وہ میرے سینئر ہیں۔ ان کی ذہنی و ادبی نشو و نما بہت تیز رفتار رہی ہے۔ میری بہت سست رفتار ——— جب مجنوں قریب ڈیڑھ ہزار صفحات لکھ کر اپنا قلم ڈال چکے تھے اس وقت لوگ مجھ سے روشناس ہوئے۔ لیکن اگرچہ مجنوں اب نسبتاً کم لکھتے ہیں پھر بھی ان کا ذہن شوقِ عمد بیدار ہے۔ آج بھی جب ان کے قلم سے کوئی چیز نکلتی ہے تو سب کی نگاہیں اٹھ جاتی ہیں۔

میں یہ لکھ چکا ہوں کہ مجنوں کو تنقید کی طرف مائل کرنے میں میں نے بھی حصہ لیا ہے۔ مجھے نثر نگاری کی طرف مائل کرنے میں مجنوں کی شخصیت بہت حد تک کارگر رہی ہے۔ میری نثر مجنوں کی نثر سے کافی مختلف قسم کی ہے۔ میں نے مجنوں کی نثر کو سوئفٹ کی نثر سے مشابہہ بتایا ہے لیکن شاید یہ محض ایک نیم صداقت ہے۔ مجنوں کی نثر ڈاکٹر جانسن کی اس نثر سے مشابہہ ہے جس میں عقل عام فطانت یا GENIUS کے مقامات تک پہنچ گئی ہے۔ اور جس کی بہترین مثال شیکسپیئر کے ڈراموں کی شرح میں جانسن نے پیش کی ہے۔ لیکن ڈاکٹر جانسن کی کتاب حیات شعرا میں جس طرح جانسن کہیں کہیں بہک گیا ہے، مجنوں اپنی تنقیدوں میں ایک جگہ بھی نہیں بہکے۔ عقلی تنقید کو مجنوں نے ایک تاثری صفت عطا کی ہے اور ان کے تنقیدی ادب کو ان کے تمام کارناموں میں قدر اول کی چیز تسلیم کیا جائے گا۔ میں خوش ہوں کہ اس طرف میں نے مجنوں کو راغب کر دیا۔

کئی لحاظ سے میں مجنوں کو اپنے آپ سے ایک بہتر انسان سمجھتا ہوں۔ وہ غلط باتوں پر جھلاہٹ کی حد سے آگے نہیں بڑھتے۔ لیکن غالب کی طرح یا میری طرح غیر مہذب الفاظ میں انہوں نے کبھی اظہار عتاب نہیں کیا۔ شاید یہ بہت سے لوگوں کو نہیں معلوم کہ بسا اوقات غالب شرمناک گالیاں بکنے کے بھی مرتکب ہو جاتے تھے۔ جس سے ان کی عظمت ہماری نظروں میں کسی طرح کم نہیں ہوتی۔ مجنوں کی شخصیت میں ایک باقاعدگی ہے جس کی میرے یہاں بہت کمی ہے۔ ایک امر میں مجنوں سے میرا کچھ اختلاف بھی ہے۔ بہت سے ہندوؤں کی تنگ نظری یا تعصب یا مسلم آزاری کا ذکر کرتے ہوئے مجنوں بسا اوقات ہندو قوم سے مایوس ہو جاتے ہیں۔ یہ مایوسی غالباً ان کی ایک مستقل کیفیت بن چکی ہے۔ میں بھی ہندوؤں کی بہت سی بدتمیزیوں، حماقتوں اور ذلالتوں کا شدید احساس رکھتا ہوں لیکن میرا عقیدہ یہ ہے کہ ہندو قوم نئے سرے سے مہذب

اور متمدن ہوگی۔ اور اپنی کئی لعنتوں سے آزاد ہو جائے گی۔ مجنوں بھی ہندؤوں سے مایوس ہوتے ہوئے غالباً بالکل مایوس نہیں ہوئے ہیں کاش ہند وقوم نئی تہذیب کو جلد اپنا سکے۔ آمین۔

مجنوں کے سر پر ابھی بفضلہ باپ کا سایہ ہے۔ وہ اپنے سب بھائیوں کے بڑے بھائی ہیں اور شاید ان کی تمام بہنوں میں صرف ایک بہن ان سے بڑی ہے۔ پروار کے تمام مرد عورتوں سے مجنوں کے تعلقات نہایت شگفتہ ہیں وہ ایک سعادت مند فرزند، محبت کرنے والے بھائی، پرخلوص شوہر اور پُر شفقت باپ ہیں۔ انتہائی سنجیدہ ہونے کے باوجود ان کی طبیعت میں کسی قدر شرارت آمیز ظرافت بھی ہے۔ ایک اور لطیفہ یاد آیا۔ الٰہ آباد کے ایک مشاعرے میں اتفاق سے مجھ سے ایک ہندو شاعر شریک ہوئے تھے۔ ان کی غزل میں بہت بھونی بھالی مگر مہنسانے والی باتیں موجود تھیں اور قریب قریب ہر شعر میں رب العالمین کا لفظ ضرور آتا تھا۔ اب مجنوں کا بالکل لڑکپن کا زمانہ تھا یعنی وہی زمانہ جب وہ میسمرے یا مریز کو ایلیٹ اسے میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ دو تین شعر سننے کے بعد مجنوں نے کہا کہ رب العالمین کے لفظ کو اگر آپ اپنا تخلص بنالیں تو بہت اچھا ہو۔

ہم دونوں کی دوستی کو اب قریب قریب تیس برس ہونے کو آئے مگر شروع ہی سے مجنوں کو میں احمد صدیق نہ کہہ کر ہمیشہ مجنوں کہہ کے مخاطب کرتا ہوں اور وہ مجھے ہمیشہ رگھوپت سہائے کہہ کر مخاطب کرتے ہیں ملاقات کے پہلے دن مجھے بحیثیت فراق کے کوئی نہیں جانتا تھا اور وہ مجنوں کے نام سے مشہور ہو چکے تھے۔ یا کم از کم ان کا عجیب و غریب لیکن نہایت مناسب تخلص گورکھپور میں تو مشہور ہو ہی چکا تھا۔

ڈاکٹر زورؔ

رفیعہ سلطانہ

کہتے ہیں اکبر آباد (آگرہ) کی سرزمین دو چیزوں کی وجہ سے مشہور ہوئی۔ ایک تاج محل، دوسرے غالب۔ میرے خیال میں آنے والے دنوں میں حیدر آباد بھی دو چیزوں کی بنا پر یاد کیا جائے گا۔ ایک اجنٹا ایلورا کے غار اور دوسرے ڈاکٹر زورؔ۔ جن میں سے ایک ہمارا تہذیبی ورثہ ہے اور دوسرا ادبی۔ موخر الذکر کی قدر و قیمت صرف اس سبب سے نہیں کہ انہوں نے ادب میں مفید اور بیش بہا اضافے کئے بلکہ اس لئے کہ انہوں نے قدیم دکنی دور کو جو صفحۂ قرطاس سے قریب قریب مٹ چکا تھا از سر نو زندہ کیا۔ اس سلسلے میں خود بھی کام کیا اور دوسروں سے بھی کام لیا۔ اگر زورؔ صاحب اس طرف توجہ نہ کرتے تو ولیؔ سے پہلے کا تقریباً ڈیڑھ سو برس کا وہ ادبی سرمایہ جو محمد قلی، وجہیؔ، ابن نشاطیؔ، غواصیؔ، رستمیؔ، خوشنود، طبعیؔ، خاورؔ، تاناشاہ، فیروزؔ، محمود جیسے اساتذۂ فن کے کارناموں سے درخشاں ہے آج گوشۂ گمنامی میں پڑا ہوتا۔ ان معنوں میں وہ اسم باسمّیٰ ثابت ہوئے۔

حضرت غوث اعظم "محی الدین" عبد القادر جیلانیؒ (جن کے نام پر ڈاکٹر زورؔ کا نام محی الدین رکھا گیا) کی وجہ تسمیہ کے متعلق ایک بڑی دلچسپ حکایت ان کی ایک قلمی سوانح میں لکھی ہے۔ حکایت یوں شروع ہوتی ہے کہ لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ آپ کا لقب "محی الدین" کیسے ہوا تو آپ جواب دیتے ہیں یہ سنہ ۵۱۱ھ جمعہ کے روز جس وقت میں سفر سے بغداد لوٹا تو ایک بیمار کو دیکھا جس کا رنگ متغیر اور بدن لاغر تھا۔ اس نے مجھے سلام کیا اور میرے پاس بیٹھنے کی خواہش کی۔ میں نے دیکھا کہ میرے قریب بیٹھتے ہی اس کا بدن موٹا، رنگ صاف اور صورت بہتر ہوگئی۔ میں اس سے ڈر گیا تو اس نے کہا "آپ مجھے نہیں جانتے؟ میں 'دین' ہوں۔ میں مرنے کے قریب تھا جب آپ نے دیکھا۔ اب خدائے تعالیٰ نے مجھے زندہ کیا اس لئے آپ محی الدین ہیں یعنی 'دین کو زندہ کرنے والے'۔"

میرے خیال میں ڈاکٹر زورؔ کے سوانح نگار کو اس قصّے کے لکھتے وقت ذرا سی تبدیلی کرنی پڑے گی اور "دین" کے بجائے "ادب" لکھنا پڑے گا۔ کیونکہ انہوں نے بھی قدیم اردو ادب کو موت کے منہ سے چھڑایا ہے اور دکن کے اردو ادیبوں اور شاعروں میں خود اعتمادی پیدا کی ہے۔ یہ انہی کی ذہانت اور کوشش کا طفیل ہے کہ آج دکن میں اردو ادب کا طوطی بولتا ہے شاید اسی مناسبت سے دکن کے مشہور رباعی گو اور صاحب عرفان شاعر حضرت امجدؔ نے اپنے قلم سے خوش خط لکھ کر ایک قطعہ دیا ہے جو اس وقت ان کے کتب خانے میں آویزاں ہے۔ وہ قطعہ یہ ہے:

ایں مسمّیٰ زندہ ماند ہمچو اسم
محیِ اُردو ہست محی الدین ما!

دوستاں را یاد داریم از وفا
ہست اے احمد ہمیں آئین ما!

اگر آپ ڈاکٹر صاحب سے ملنا چاہیں تو حیدرآباد میں ریزیڈنسی (؟) آباد کے اسٹیشن سے گذر کر آگے سہائی گوڑہ کے خوبصورت اور پرسکون محلے میں چلے جائیے وہاں لال رنگ کی ایک شاندار عمارت دکھائی دے گی جس پر لکھا ہوگا "رفعت منزل" یہ ڈاکٹر صاحب کے خسر نواب رفعت یار جنگ صوبہ دار اورنگ آباد کی تعمیر کردہ کوٹھی ہے۔ اس کے سامنے سڑک کے قریب ان کی دختر یعنی ڈاکٹر صاحب کی بیوی کی دو منزلہ کوٹھی ہے۔ کوٹھی میں داخل ہونے سے پہلے بغلی حصے میں دارالادبیات اردو کا شاندار کتب خانہ اور دفتر ملے گا جس پر گلابی رنگ کی استرکاری کی ہوئی ہے اور جس میں اردو کے ماضی و حال و مستقبل کا سارا ادب مطبوعہ و غیر مطبوعہ کتابوں، مسودوں، نقشوں اور نادر نسخوں سے ساتھ موجود ہے۔ سامنے باغ میں ڈاکٹر صاحب کے چار پانچ خوبصورت بچے آپ کے استقبال کو موجود رہیں گے۔ جن میں سے بڑے صاحب تو نہایت سنجیدگی سے رکیونکہ اس کم عمری میں وہ اپنے دادا کی درگاہ کے سجادہ نشین کے فرائض انجام دینے لگے ہیں) یا تو موٹر کی دیکھ بھال کرتے یا پھر باغبانی میں مشغول نظر آئیں گے۔

دوسرے بچے جن کی عمروں کی اوسط ۳ سے ۸ سال تک ہے، باغ میں تتلیاں پکڑتے یا پھول توڑتے نظر آئیں گے۔ ان میں سے ڈاکٹر صاحب کا منجھلا لڑکا "صفی الدین" جو ذہانت اور شکل میں ڈاکٹر صاحب کا چھوٹا نمونہ معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کی بھی ویسی ہی فراخ بڑی بڑی ذہین آنکھیں، سرخ و سفید رنگ، چوڑا ماتھا اور سر پر سیاہ و سرخ گھنگھریالے بال ہیں، سامنے آکر آپ سے پوچھے گا:

"آپ بابا سے ملنے آئے ہیں؟ چلئے اندر!"

اندر وسیع ڈرائنگ روم میں طلائی کام کی سرخ مخمل کی گدے والی کرسیاں اور قرون وسطیٰ کی مصوری کے شاہکار، مجسمے اور تصویریں آپ کو خاص انداز میں رکھی ملیں گی۔ ساتھ ہی بڑی قد آدم الماریوں میں صرف اردو ہی کی نہیں انگریزی اور فرانسیسی کی بھی قدیم اور دور حاضر کی مشہور تصانیف نظر آئیں گی لیکن ڈاکٹر صاحب یہاں نہیں ملیں گے، اس سے متصل چھوٹے کمرے میں جہاں ایک جھولنے والی کرسی، بڑی سی میز اور تخت بچھا ہوا ہوگا۔ ڈاکٹر صاحب سفید تن زیب کے کرتے اور چوڑے پائنچے کے پائجامے میں مسکراتی ہوئی آنکھوں سے آپ کا استقبال کریں گے۔ سامنے پاندان رکھا ہوگا جس میں سے ایک پان وہ چبا رہے ہوں گے اور دوسرے کی تیاری میں مشغول ہوں گے۔ پھر آپ سے پوچھیں گے:

"کیا منگواؤں چائے یا کافی؟"

چائے آنے کے بعد باتیں بھی ہوتی جائیں گی۔ اردو ادب کے متعلق کیسا ہی سوال کریں ڈاکٹر صاحب کے پاس اس کا جواب ایسا موجود رہے گا جس پر آپ کو شبہ ہوگا کہ انہوں نے اسے پہلے سے تیار کر رکھا تھا۔ پی ایچ ڈی کے سلسلے میں مجھے ایک مخطوطے کے سنہ تالیف کے بارے میں بہت پریشانی تھی۔ کیونکہ اس میں ایک جگہ کاتب نے سنہ ..۰ھ لکھا تھا اور مرتب نے سنہ ۹۵۰ھ درج کیا تھا۔ میرے نگران سروری صاحب نے اس کے سنہ کی تحقیق میرے ہی ذمہ کر دی۔ کیونکہ یہ بڑا اہم مخطوطہ تھا۔ میں ڈاکٹر صاحب کے پاس پہنچی۔ انہوں نے دو ہی سطریں پڑھی تھیں کہ کہہ دیا یہ ساتویں صدی ہجری کی تصنیف ہے۔ میں نے پوچھا: "کیسے؟" کہنے لگے "معلوم ہوتا ہے آپ نے پورا مخطوطہ نہیں پڑھا" (حالانکہ میں اسے تقریباً چاٹ گئی تھی) وہ کہنے لگے: "دیکھا نہیں اس میں مخدوم شرف الدین یحییٰ منیری کا ذکر ہے جو ساتویں صدی کے تھے"۔ میں ان کے استخراج کے طریقے پر حیران رہ گئی۔ سنا ہے جب انہوں نے دکن کے نامور بزرگ اور محمد قلی کے وزیر اعلیٰ میر محمد مومن کی حیات لکھی اس وقت بھی ایسے ہی تفحص اور تجسس سے کام لیا تھا اور قصبات اور دیہات میں گھوم کر کتبات اور اسی قسم کے آثار سے مدد لے کر ان کے حالات یکجا کئے تھے۔

ڈاکٹر صاحب کی گھر بلو نشستوں کی ایک اور بھی خصوصیت ہے۔ ملنے والوں میں اگر کوئی خاتون ہو تو وہ اس کمرے میں مسز زور اور بچوں کو بھی بلا لیتے ہیں۔ پھر گفتگو سنجیدہ ادبی موضوعوں سے ہٹ کر لباس اور زیور جیسے ہلکے پھلکے موضوعات کی طرف پلٹ جاتی ہے۔ یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے

کہ ڈاکٹر صاحب کا جمالیاتی ذوق کافی بلند ہے۔ مسز زور کہتی ہیں کہ خواتین کے لباس اور زیور کے متعلق وہ بڑے اچھے مشورے دیتے ہیں۔

یہ تو ڈاکٹر صاحب کی گھر کی جھلک تھی۔ اگر انہی کو آپ کچھ دیر بعد کالج میں جا کر دیکھیں تو اعلیٰ گبرڈین، اونی، سرج کے سوٹ اور شارک اسکن کے پینٹ اور بش شرٹ میں پہچاننا مشکل ہو جائے گا۔ اس وقت وہ فائیلوں کے انبار پر دستخط بھی کرتے جائیں گے، کالج کے انتظامی امور بھی طے کرتے جائیں گے اور ساتھ ہی اپنے کسی دوست مثلاً سروری صاحب (صدر شعبۂ اردو) یا ٹوپا صاحب (رجسٹرار جامعہ عثمانیہ) یا حمید صدیقی صاحب (صدر شعبۂ سیاسیات) یا نصیر الدین ہاشمی صاحب سے اردو کی کسی میٹنگ یا کسی بڑے جلسے یا مسئلے کے متعلق تبادلۂ خیال بھی کرتے جائیں گے۔ یہاں یہ ڈاکٹر صاحب ہی کی خصوصیت ہے کہ وہ بیک وقت کئی کام کر سکتے ہیں۔

ان سے ملنے اور گفتگو کرنے کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ گھٹی ہوئی فضا سے یکدم کھلے میدان میں آ گئے ہیں، جہاں ہر طرف پھول ہیں، رنگینی ہے، مسرت ہے، غم و فکر کا نام و نشان بھی نہیں۔ وہ خود کبھی پریشان نہیں ہوتے، دوسروں کو بھی پریشان نہیں کرتے۔ مجھے یاد ہے ایم۔ اے کے آخری سال میں میں اپنے مقالے کے مواد کے سلسلے میں کافی پریشان تھی۔ یوں بھی میری عادت ہے کہ چھوٹی سے چھوٹی بات سے بہت جلد پریشان ہو جاتی ہوں۔ ڈاکٹر صاحب مجھے ہمیشہ ڈھارس دیتے اور کہتے کہ "اتنی سی بات سے تم پریشان ہو جاتی ہو، زندگی میں تو اس سے سخت مرحلے آتے ہیں۔ انسان کو ہمیشہ ہنستے کھیلتے مشکلات کا مقابلہ کرنا چاہیے۔" دوسری ملاقات میں ایک چھوٹا سا چینی کا مجسمہ ایک ہنستے ہوئے آدمی کا لا دیا اور کہا کہ "اس سے ہنسنے کا سبق سیکھو اور اسے ہمیشہ میز پر رکھا کرو۔"

یہ عجیب بات ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو دیکھ کر اکثر ادبی شخصیتوں کی طرح مجنوں کی انگلیوں اور لیلیٰ کی پسلیوں کا خیال نہیں آتا۔ بلکہ ان کے سُرخ و سفید رنگ، سیاہ روشن چمکیلی آنکھوں اور بھرے بھرے جسم کو دیکھ کر کسی مشہور ٹانک کا اشتہار یاد آتا ہے جس پر لکھا ہوتا ہے۔ "استعمال کے بعد"۔۔۔۔ یہی وجہ ہے کہ اب تک نہ آنکھوں پر عینک چڑھی، نہ سر ہی گنجا ہوا۔ اگرچہ وہ اس وقت چالیس، پینتالیس سال کے لگ بھگ ہوں گے۔ لیکن جوانی کی بہار بڑھاپے کی خزاں میں تبدیل نہیں ہونے پائی۔ ڈاکٹر صاحب ابھی جوان ہیں، ان کی امیدیں ابھی جوان ہیں، ان کے حوصلے ابھی جوان ہیں اور ان کی جوانی نے اردو ادب کو جوان رکھا ہے۔ زندگی کے متعلق ان کا نقطۂ نظر رجائی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہیں زندگی کے ہر مرحلے میں کامیابی اور سربازی میں فتح ہوئی۔

بچپن ہی سے خوش قسمتی ان کے ہم رکاب رہی۔ انہوں نے حیدر آباد کے مشہور بزرگ سید شاہ ابوالبرکات غلام محمد زعم قادری الرفاعی کے یہاں جنم لیا جو دکن کے مشہور صوفی اور ولی سید شاہ علی ساکنڈے سلطان مشکل آسان قندھاری کی اولاد میں سے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کے والد بھی اپنے وقت کے زبردست ادیب اور شاعر تھے لیکن آخر عمر میں سب کچھ چھوڑ کر اہل اللہ بن گئے۔ ڈاکٹر صاحب بچپن ہی سے غیر معمولی ذہین تھے۔ سنہ ۱۹۲۷ء میں ایم۔ اے میں غیر معمولی امتیاز سے کامیاب ہوئے۔ اپنے مضامین اردو و فارسی میں اوّل آئے۔ اس اعزاز کی بنا پر یورپی تعلیم کا سرکاری وظیفہ ملا۔ لندن یونیورسٹی میں آریائی زبانوں کے تقابلی مطالعہ اور اردو پر کام کر کے پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ان کے اس مقالے کے متعلق ڈاکٹر ٹی گراہم بیلی صدر شعبۂ اردو لندن یونیورسٹی لکھتے ہیں:

> "مسٹر قادری کا مقالہ ادب کا گرانقدر کارنامہ ہے۔ یہ بڑی حد تک اچھی ہے۔ اس میں بہت سے ایسے ادیبوں کا تذکرہ ہے جن سے آج تک دنیا واقف نہیں تھی۔"

لطف یہ ہے کہ تین سال کا نصاب دو سال میں ختم کر لیا۔ اس ایک سال کو ضائع نہ کر کے پیرس کے صوتیاتی تحقیق کے ادارے میں شرکت کی اور وہاں دو سال رہ کر تجرباتی صوتیات پر کام کیا۔ اس کے نگران پروفیسر لائیڈ جیمز اور ڈوس بلاک تھے۔ یہ بھی ان کی ذہانت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور لکھا:

> "جب یہ کام تکمیل کو پہنچے گا تو علمِ زبان میں ایک گراں قدر اضافہ ثابت ہوگا۔"

پروفیسر آعابل ڈو پرنسپل اورینٹل سکول آف اسٹڈیز نے لکھا:

"انڈو آرین زبانوں کی تقابلی گرامر پر میں نے جو لیکچر دیئے تھے ان میں سید محی الدین قادری

حاضر رہے۔ میں نے دیکھا کہ وہ ایک ذہین طالب علم ہیں اور انہیں اس موضوع

سے بہت دلچسپی ہے۔"

پروفیسر سٹن حیدر آبادی طلبہ کے انگریز نگہبان کار کی رائے تھی:

"وہ ہمارے انتہائی ذہین طالب علموں میں سے ہیں اور ان کا کیرکٹر ایسا ہے کہ کوئی شخص

اس پر حرف نہیں رکھ سکتا۔"

ذہانت کے بعد ڈاکٹر صاحب کے کردار کا دوسرا نمایاں وصف جوش اور ولولہ ہے۔ وہ کبھی نہیں تھکتے۔ ناامیدی کے کیسے ہی خوفناک بادل ہوں وہ کبھی ہمت نہیں ہارتے۔ وہ اپنے طلبہ میں بھی یہی خصوصیات دیکھنا چاہتے ہیں۔ ادب پر ان کی نظر بہت گہری ہے۔ خصوصاً دکنی ادبیات میں ان کے مقابل کوئی نہیں ٹھہر سکتا۔ ادب ہی میں ان کے کارنامے قابل قدر نہیں زبان کی تحقیق و تدقیق میں بھی انہوں نے جو گراں بہا خدمات انجام دی ہیں وہ بھلائے جانے کے قابل نہیں۔ اب تک ان کی سو کے قریب کتابیں اور طویل مضامین چھپ چکے ہیں جن میں بعض کتابیں ایسی ہیں کہ ان کے کئی کئی ایڈیشن نکل چکے ہیں اور ہندوستان کی مختلف جامعات کے نصاب میں شامل ہیں۔

طلبہ کے لئے یہ اطلاع بھی شاید دلچسپ ہو کہ ڈاکٹر صاحب ہندوستان اور پاکستان کی تقریباً تمام یونیورسٹیوں میں اُردو کے ممتحن رہتے ہیں۔ یوں تو وہ سہل انگار ہیں اور کسی کا دل نہیں دُکھاتے لیکن ان کی مبادیٔ کا مہیا کافی سخت ہے اس لئے کہ ان کی نظر سے اردو ادب کا کوئی گوشہ چھپا ہوا نہیں۔ ادب کی جزوی تفصیلات سے بھی وہ باخبر رہتے ہیں اور طالب علم کسی صورت میں دھوکا نہیں دے سکتے جیسا کہ اکثر ممتحنین کے ساتھ ہوتا ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر مسعود حسن خاں نے پی ایچ ڈی کے لئے تاریخ زبان اردو پر جب مقالہ پیش کیا اور وہ چھپ گیا۔ اس میں ایک کھائی باقی تھی۔ انہوں نے اُردو کی ابتدا میں ہریانوی کو بڑا دخل دیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے فوراً ایک مدلل مضمون نقوش میں لکھ دیا۔ پچھلے سال بمبئی کے ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی نے ولی گجراتی پر ایک مقالہ لکھا اور اس کو گجراتی ثابت کرنے کی کوشش کی۔ ڈاکٹر صاحب نے ماہنامہ آجکل میں ایک دھرتے کا مضمون لکھ کر چھپوایا جس میں اس کی غلطی ثابت کی۔ اس ضمن میں یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ان میں عربوں کی طرح ممکن ہے یہ عرب خون کا اثر ہو کیونکہ ان کے آبا و اجداد عربستان سے آئے تھے، بڑی شدید عصبیت ہے۔ وہ دکن اور دکھنیوں کے خلاف ایک لفظ بھی سننے کو تیار نہیں۔ غالباً اسی محبت نے انہیں دکنی ادب کو زندہ کرنے اور مجلس اشاعت دکنی مخطوطات قائم کرنے پر اکسایا اور "سیر گولکنڈہ" اور "گولکنڈے کے ہیرے" جیسے افسانے لکھوائے جن کے لفظ لفظ میں دکن اور دکنیوں سے محبت کا اتھاہ سمندر کروٹیں لے رہا ہے۔

یادش بخیر ۱۹۴۱ء کا وہ زمانہ آنکھوں کے سامنے ہے جب ہم ایم اے میں پڑھتے تھے اور ڈاکٹر زور اور ڈاکٹر سید سجاد دہلوی جامعہ عثمانیہ میں اُردو کے پروفیسر تھے۔ اُردو زبان کی ابتدا کے بارے میں دونوں میں بہت اختلاف تھا۔ اور بڑا لطف آتا تھا۔ کچھ دیر نہ گزرتی کہ ڈاکٹر سجاد اپنے مخصوص نستعلیق دہلوی لہجے میں سمجھاتے "اردو کا مبدا گنگ و جمن کا دوآبہ ہے" کہ اس کے بعد ہی کے گھنٹے میں زور صاحب دبنگ آواز اور خالص دکنی لہجے میں گویا ہوتے۔ "اگر چہ اردو کی ابتدا پنجاب سے ہوئی ہے لیکن اس کو بڑھانے اور سنوارنے کا سہرا دکن کے سر ہے۔" یہ وہ زمانہ تھا جب دکن میں ملکی اور غیر ملکی کے نعرے زوروں پر تھے۔ حتیٰ کہ یونیورسٹی میں بھی ملکی اور غیر ملکی پروفیسروں کے جتھے بنے ہوئے تھے۔ میں نے سنا تھا اس سے قبل بابائے اردو (ڈاکٹر عبدالحق) اور نوجوان الہدٰی (ڈاکٹر زور) کے مابین وجہ اختلاف بھی یہی جھگڑا تھا۔ ورنہ دونوں ایک ہی شمع کے پروانے تھے۔

ان کا دشمن بھی اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ڈاکٹر زور کی شخصیت میں غیر معمولی مقناطیسیت ہے۔ بالکل وہی کیفیت جو شکسپیئر نے قلوپطرہ کے متعلق بتائی تھی کہ اس کے اطراف ایک قسم کا حلقۂ کشش (ZONE OF ENCHANTMENT) تھا۔ جو بھی اس حلقہ میں آتا مسحور ہوئے بغیر نہ رہتا۔

زور صاحب کی شخصیت بھی کچھ اسی قسم کی ہے۔ ان کے حلقۂ احباب میں مرد بھی ہیں اور خواتین بھی۔ مرحومہ بیگم زین یار جنگ پرنسپل کلیہ اناث، سکینہ بیگم رحمت اللہ دختر غدیو جنگ، محترمہ بیگم حسین علی خان ایم اے، محترمہ شاہجہان بیگم ایم اے، محترمہ جہاں بانو بیگم صدر شعبۂ اردو کلیہ اناث، محترمہ لطیف النساء بیگم، محترمہ بشیر النساء بیگم بشیر، محترمہ صغرا بیگم ہمایوں مرزا، زینت ساجدہ ایسی خواتین تھیں اور ہیں جن کے قلوب میں ڈاکٹر صاحب کی محبت اور احترام پایا جاتا ہے۔

یہ انہی کی شخصیت کا سحر تھا جس نے حیدر آباد کے امیر الامرا سالار جنگ مرحوم جیسے کفایت شعار اور بہزرس انسان کو اردو ادب کی اشاعت اور ترقی اور کتابوں کی فراہمی کے لئے لاکھوں روپے خرچ کرنے پر مجبور کیا اور حکومت حیدر آباد سے ادارۂ ادبیات اُردو کے لئے امداد حاصل کی۔

زور صاحب خود کہتے ہیں وہ اچھے مقرر نہیں۔ لیکن جب بھی جس وقت بھی انہیں بولنے پر مجبور کیا گیا ان کے پاس خیالات کا ذخیرہ نکلا۔

ڈاکٹر زور کی زندگی پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک شخصیت نہیں کئی شخصیتوں کا مجموعہ ہیں۔ صرف ادبی زندگی پر نظر ڈالی جائے تو نظر آتا ہے کہ وہ افسانہ نگار بھی ہیں، شاعر بھی، نقاد بھی اور محقق بھی۔ اگر تذکرہ نگاری میں کمال دکھایا ہے تو مضمون نگاری اور لسانیات کی طرف سے بھی آنکھیں نہیں موندیں ان سب چیزوں پر الگ الگ روشنی ڈالی جائے تو ہر ایک، بجائے خود ایک طویل مضمون بن سکتا ہے۔ ان سب میں صرف زور صاحب کی شاعری ہی ایسی چیز ہے جس پر کچھ کہنا مشکل ہے، کیونکہ ان کی شاعری سے زیادہ ان کا تخلص مشہور ہے۔ لکھنے کی ابتدا انہوں نے تنقید سے کی جو اردو میں اس وقت ایک نئی آواز تھی اور ایک باضابطہ فن کی حیثیت سے اس پر کسی نے کچھ نہیں لکھا تھا۔ تنقید میں ان کی مندرجہ ذیل کتابیں مشہور ہیں:

(۱) ۱۔ روحِ تنقید ۲۔ تنقیدی مقالات ۳۔ تین شاعر ۴۔ روحِ غالب ۵۔ ادبی تاثرات

ان میں سے پہلی تصنیف "روحِ تنقید" گو زمانۂ طالب علمی کی یادگار ہے لیکن اسی سے ان کی شہرت کا آغاز ہوا اور یہی اردو کی پہلی تنقیدی کتاب ہے جو یورپی طرزِ تنقید سے اہلِ اُردو کو روشناس کرانے کا باعث ہوئی۔

(۲) تاریخ ادب میں مشہور کتابیں یہ ہیں:

۱۔ اُردو شہ پارے ۲۔ اُردو کے اسالیب بیان ۳۔ عہدِ عثمانی میں اُردو کی ترقی ۴۔ داستانِ ادبِ حیدر آباد۔

(۳) سوانحی ادب میں قابلِ یادگار یہ ہیں:

۱۔ حیاتِ سلطان محمد قلی قطب شاہ ۲۔ میر محمد مومن ۳۔ سرگزشتِ غالب ۴۔ سرگزشتِ حاتم گارساں دتاسی۔

(۴) ادبی تحقیق پر ڈاکٹر صاحب نے بطورِ خاص توجہ دی ہے اور حسبِ ذیل کتب ان کی اعلیٰ تحقیق کی مظہر ہیں:

۱۔ تذکرۂ گلزارِ ابراہیم ۲۔ دیوانِ زادۂ حاتم ۳۔ مرقعِ سخن جلد اول و دوم ۴۔ متاعِ سخن ۵۔ کیفِ سخن ۶۔ بادۂ سخن ۷۔ فیضِ سخن ۸۔ رمزِ سخن۔
۹۔ مکتوباتِ شاد عظیم آبادی ۱۰۔ شادِ اقبال ۱۱۔ قصصِ خوب ترنگ (بزبانِ فرانسیسی) ۱۲۔ ارشاد نامہ ۱۳۔ ابراہیم نامہ ۱۴۔ کلیاتِ محمد قلی قطب شاہ۔

(۵) لسانیات جیسے مشکل موضوع پر سنیتی کمار چٹرجی اور گریرسن کے بعد ڈاکٹر صاحب ہی کے کارنامے سائنٹیفک مانے جاتے ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ ہندوستانی لسانیات ۲۔ ہندوستانی صوتیات (بزبانِ فرانسیسی) ۳۔ لسانیاتی مضامین کا مجموعہ (جو اس وقت زیرِ طبع ہے)

(۶) افسانوں کے مجموعے:

۱۔ سیرِ گولکنڈہ ۲۔ گولکنڈے کے ہیرے ۳۔ طلسمِ تقدیر

اس کے علاوہ انہوں نے ادارۂ ادبیاتِ اُردو کے مخطوطات کے دو کیٹلاگ بھی تذکرۂ مخطوطات کے نام سے شائع کئے ہیں جن میں اعلیٰ درجہ کی تحقیق و تفتیش ظاہر کی گئی ہے۔

ان تصانیف میں "اردو شہ پارے" ان معدودے چند کتابوں میں سے ہے جو صدیاں گزرنے کے بعد بھی باقی رہیں گی۔ اس میں قدیم دور کے شاعروں کی

حیات اور کارناموں پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ اس کے پیش کرنے کا طریقہ ان کا اپنا ہے۔ یوں تو زور صاحب نے دو تین دہائیاں قبل لکھنا شروع کیا لیکن ان کی تحریروں کی شوخی اور رنگینی نیز اسلوب کی جدت جدید دور کی یاد دلاتی ہے۔ "اردو شہ پارے" کے بعد "حیات محمد قلی قطب شاہ" ایسی تصنیف ہے جس سے خود مصنف کو بھی پیار ہے۔ یہ اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر سلطان محمد قلی قطب شاہ کی حیات ہے۔ صرف حیات ہی نہیں بلکہ اپنے دور کی مبسوط تاریخ بھی ہے جس میں قطب شاہی تمدن کی واضح تصویریں ہیں۔ کتب سوانح میں اس کو خاص اہمیت ہے۔ اس میں محمد قلی کے ذاتی حالات پیدائش، تعلیم، آغاز شباب، شباب کی بدمستیاں، جوانی و رعنائی حتیٰ کہ اس زمانے کی عیدوں اور تیوہاروں پر بڑی واضح تفصیلیں ملتی ہیں۔ ساتھ ہی کلام پر بھی تنقیدی نظر ڈالی ہے۔ یہ ڈاکٹر صاحب کا بڑا اہم کارنامہ ہے۔ ان کی دوسری تصنیف "حیات میر محمد مومن" بھی اس سے کم پایہ کی نہیں۔ میر محمد مومن قطب شاہی عہد کے ایک وزیر، فارسی کے مشہور شاعر اور مذہب امامیہ کے مبلغ تھے۔ اس کا انداز بیان بھی بڑا دلنشین ہے۔

لیکن ڈاکٹر صاحب کی ادبی زندگی کا ایک پہلو جو لوگوں کی نظروں سے اوجھل رہا، درحقیقت بڑا درخشاں ہے۔ وہ ہے ان کی افسانہ نگاری۔ زور صاحب کے علمی، ادبی اور تحقیقی کارناموں نے ان کی افسانہ نگاری کو پس پشت ڈال دیا ہے۔ حالانکہ ان کے افسانوں میں بڑا سحر ہے اور وہی حسن ہے جو اقبال کی مسجد قرطبہ والی نظم میں موجود ہے۔ یعنی اس میں حقیقت، تخیل اور فلسفہ کا بڑا دلکش امتزاج ہے۔ خصوصاً سیر گولکنڈہ کے افسانے "چاند کی رقاصہ"، "اورنگ زیب"، "تانا شاہ"، "نمی ساونلی"، "سہ وصحرا"، "ملک خوشنود" اردو زبان کے بے مثال افسانے ہیں۔ اگر زور صاحب کچھ اور نہ لکھتے تب بھی یہ کتابیں ان کا نام زندہ رکھنے کے لئے کافی تھیں۔ ان کی بڑی خوبی یہ ہے کہ انہیں پڑھ کر گولکنڈے کے حکمرانوں، امیروں اور عام باشندوں سے غائبانہ محبت پیدا ہو جاتی ہے۔ ساتھ ہی اس دور کی تہذیب و تمدن اور معاشرت کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ یہ بڑے فن کار ہی کا کام ہے کہ وہ ناظر کے جذبات کو بھی اپنے جذبات میں شریک کر لیتا ہے۔ تخلیقی ادب کی کم مائیگی دیکھتے ہوئے مجھے افسوس ہوتا ہے کہ زور صاحب نے ناحق اچھی اور تخلیقی ادب کی لائن چھوڑ کر تنقید، تحقیق اور تاریخ میں اپنے کو الجھا لیا۔ کیونکہ ان کا قلم انسانی جذبات اور نفسیات کے اظہار کا خوب ملکہ رکھتا ہے۔ ان کے افسانوں کے مجموعے سیر گولکنڈہ کو پڑھ کر حضرت امجد اتنے متاثر ہوئے کہ بہت ہی جلی حروف میں ایک وصلی پر یہ قطعہ لکھ کر روانہ کیا جو ان کے کتب خانے کے ایک خوبصورت فریم میں آویزاں ہے :-

دکھلائیے گا عہد الٰہی کے مناظر   تا مدح کریں آپ کی ہم اور زیادہ
ہے زور کی تحریر میں کیا زور خداداد   اللہ کرے زور قلم اور زیادہ

ان کی اس فنکاری کے باوجود ان کی زندگی فن کاروں کی سی غیر متوازن نہیں جیسا کہ "میراجی"، فراق وغیرہ کے متعلق سننے میں آتا ہے۔ وہ بڑی اپٹوڈیٹ اور معتدل زندگی بسر کرتے ہیں اور مشرقی و مغربی دونوں طرز زندگی سے مانوس ہیں۔ جہاں آپ انہیں سوٹ بوٹ میں ملبوس کلب میں باتیں کرتے دیکھیں گے وہیں وہ شیروانی اور رام پوری ٹوپی میں اپنے والد کی خانقاہ میں قوالی یا عرس کا اہتمام کرتے ہوئے بھی ملیں گے۔ ان کی ان تمام علمی سرگرمیوں کو دیکھنے سے خیال ہوتا ہے کہ شاید یہ میر کی طرح خلوت پسند آدمی ہوں گے۔ کیونکہ جو شخص بیس پچیس سال کی مدت میں تیس چالیس کتابیں لکھ سکتا ہے اسے سوائے لکھنے کے اور کسی طرف توجہ کرنے کی فرصت نہ ہوگی لیکن ایسا نہیں، وہ "مجلسی آدمی" ہیں۔ ان کی گفتگو بڑی دلچسپ اور پرلطف ہوتی ہے۔ موقع بموقع وہ اشعار کا بھی استعمال کرتے ہیں۔ حاضر دماغی میں وہ اپنا جواب نہیں رکھتے۔ ان میں "جرأت رندانہ" کی بھی کمی نہیں۔ ساتھ ہی وہ بلا کے خود اعتماد ہیں اور صرف "نظمے اور سخنے" ہی اردو ادب کی خدمت میں مشغول نہیں عملاً بھی اس کی ترقی میں لگے ہوئے ہیں۔ مثلاً ادارۂ ادبیات اردو کا قیام ان ہی کا کارنامہ ہے۔ جامعہ عثمانیہ کے فارغ التحصیل طلبہ کی طرف سے ایک مجلہ نکالنے کا خیال ان ہی کا تھا اور وہی اس کے پہلے مدیر بھی قرار پائے۔ مجلس اشاعت دکنی مخطوطات انہیں کی تحریک پر سالار جنگ نے بنائی اور ہزاروں کا گراں قدر عطیہ دیا۔ اس انجمن کے تحت دکنی اور قدیم مصنفین کے غیر مطبوعہ کارناموں کو منظر عام پر لایا گیا۔ ڈاکٹر زور نے کلیات قطب شاہ، ارشاد نامہ (اردو کے قدیم صوفی شاعر برہان الدین جانم کی طویل مثنوی)،

اور ابراہیم نامہ (بیجاپور کے شاعر عبدل کی مثنوی) اسی کی طرف سے چھاپی۔ ہندوستان کی لسانیاتی تجزیہ کی کمیٹی کی مجلسِ عاملہ کے بھی ممبر رہے۔

اب ایک نیا کام شروع کیا ہے جو ان ہی کے دماغ کی اپج ہے اس لئے وہی اس کے نائب صدر بھی ہیں۔ یہ کمیٹی قدیم اردو یعنی دکھنی کتابوں کو دیوناگری رسم الخط میں چھاپ رہی ہے۔ اس کام میں یہاں کی ہندی پرچار سبھا کی طرف سے بھی تعاون ہو رہا ہے۔ ان مصروفیات اور رچاد رگھاٹ کالج کی پرنسپلی اور اردو کی جماعتوں خاص کر پی ایچ ڈی کی تعلیم اور نگرانی کے ساتھ وہ اردو انسائیکلوپیڈیا کی تدوین جیسے اہم کام سے بھی غافل نہیں۔

غالباً ان ہی خدمات کے مدِ نظر حکومت نے انہیں ایک بڑا اعزاز بخشا ہے یعنی وہ انڈین نیشنل اکاڈمی آف لیٹرز (ساہتیہ اکیڈمی) کے شعبہ اردو کے مشیر چنے گئے ہیں جس کے صدر خود پنڈت نہرو ہیں۔ میری نظر میں یہ اعزاز ڈاکٹر زور کی خدمات کا بہت بڑا اعتراف ہے۔

ایک مرتبہ میں نے پوچھا آپ کو اتنے کام کرنے کا وقت کیونکر مل سکا تو وہ یہ شعر پڑھ کر چپ ہو گئے:

مانندِ عمر صرفِ رہِ یار کردہ ایم
کارے کہ کردہ ایم ہمیں کار کردہ ایم

اتنا لکھنے کے بعد میں سوچتی ہوں کہ یہ تو میں نے سب ان کے محاسن ہی دکھائے ہیں جو بقول کسے "کتابِ مناقب" اور قصیدۂ منثور" ہو گیا لیکن جیسا کہ ان ہی کے ایک شاگرد مسکین نے ان پر مضمون لکھتے وقت اعتراف کیا تھا کہ انہیں ان کی ذات میں کوئی برائی کا پہلو نظر نہیں آیا۔ میں بھی سوچتی ہوں تو یہ پہلو تشنہ نظر آتا ہے۔ اور صرف ایک برائی نظر آتی ہے وہ یہ کہ وہ کسی سے "برائی" اور کسی کی مخالفت نہیں کر سکتے۔ اپنے بڑے سے بڑے دشمن کی بھی ——— ممکن ہے یہ ان کی بزدلی ہو یا پھر مشائخ اور صوفی گھرانے کی تربیت کا اثر جہاں کا پہلا قرینہ دل کی صفائی ہوتا ہے۔

مرزا جعفر علی خاں اثر

شیخ ممتاز حسین جونپوری

کچھ عرصہ ہوا میرے ایک ایرانی دوست نے جو یورپ کی سیاحت کے بعد ان دنوں تہران میں مقیم ہیں۔ مرزا جعفر علی اثر کو دیکھ کر کہا تھا کہ ان کے چہرے کی ساخت ہو بہو ایرانی ہے۔ بات گئی گزری ہو گئی تھی۔ مگر آج جب اثر کی شخصیت کا خاکہ کھینچنے بیٹھا اور اس میں رنگ بھرنے کی ضرورت ہوئی تو ان کی گوناگوں اور بوقلموں شخصیت کے جلوے قوس قزح کے طرح طرح کے رنگوں کے مانند سامنے گویا رقصاں نظر آ رہے ہیں۔ بقول انشا

بولے ہے یہی خامہ کہ کس کس کو میں باندھوں؛
بادل سے چلے آتے ہیں مضموں مرے آگے

اثر صاحب کی ظاہری شخصیت کی عکاسی کے لئے یہی کہہ دینا کافی ہے کہ گورا رنگ، ایرانی نما صورت سرو چمن کی طرح چھریرا بدن، نرگسی آنکھیں، کتابی چہرہ، باتیں کرنے میں لبوں پر پھولوں کی سی مسکراہٹ، عموماً شیروانی اور حسب ضرورت انگریزی لباس میں ملبوس، خلق و مروت میں شاہکار، لکھنؤ کی پرانی وضعداری کی یادگار، مزاج میں حد درجہ انکسار، طبیعت میں مزاح اور سنجیدگی کا خاندانی حکیمانہ امتزاج۔ ملنے جلنے میں بے تکلف، نہ بناوٹ نہ غرور۔ جس طرح مقیاس الحرارت (تھرمامیٹر) کد و کاوش سے تیار ہوتا ہے۔ اسی طرح اثر کے بزرگوں نے جو حکیموں کے مشہور خاندان کی یادگار چلے آتے ہیں، ہر صحبت میں بٹھا کر، ہر رنگ میں ڈبو کر اور نچوڑ کر انہیں ایک رچی ہوئی معتدل زندگی کا نمونہ بنا دیا ہے۔ بادل کی طرح یہ گھاٹ گھاٹ کا پانی پیئے ہوئے ہیں۔ یوں بظاہر خشک مزاج سے ہیں، مگر محبت کا رنگ چوکھا کرنے کے لئے نچوڑ کر دیکھئے تو ان کی زندگی کے جوہر بوئے گل کی طرح چمن چمن پھیلنے لگتے ہیں۔

پرانے زمانے کے لکھنؤ نے دنیا کی تہذیب و تمدن میں اثر کے آباد اجداد کے ہم وطن ایرانیوں کا کلچر پیدا کرنے میں بڑا حصہ لیا ہے۔ پہلے زمانے میں مختلف قسم کے سبق آموز ظاہری و باطنی اثرات و عوامل سے شخصیت اور کردار کی تعمیر کی جاتی تھی۔ اب لکھنؤ کی بربادی کے بعد ۱۲۴ سال کے دورِ شاہانِ اودھ کی ریاضت کے مٹے مٹائے نقوش کا دھندلا سا نشان ایک ڈوبتے ہوئے سورج کی کرنوں میں ہمیں دکھائی دیتا ہے۔ اس قدیم تہذیب و تربیت کو قوسِ قزح کے سے رنگوں میں جلوہ ریز دیکھنا ہو تو ۱۲ جولائی ۱۸۸۶ء کے مسعود زمانے میں پیدا ہونے والے اثر کو دیکھ لیجئے۔ جو بزم لکھنؤ میں ۹۹ سال سے جلنے والی آخری شمع ہیں۔

میرے مذکورالصدر ایرانی دوست کو یہ معلوم نہ تھا کہ اثر کے مورث اعلیٰ ایران سے ہندوستان آئے تھے اور وہ ایرانی نژاد ہی ہیں لیکن

اس نے انہیں دیکھ کر جو اندازہ قائم کیا، وہ غلط نہیں تھا۔ ان کے جد امجد حکیم مرزا محمد شفیع اصفہان سے اکبر آباد آئے تھے۔ جہاں وہ اپنی حکمت و حذاقت کے جوہر لٹاتے اور اپنی مسیحائی کا اعجاز دکھاتے تھے کہ اودھ کی سلطنت نے ان کے کمالات کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا اور بڑھ کے آواز دی ۔

گل پھینکے ہے غیروں کی طرف بلکہ ثمر بھی

اے خانہ برانداز چمن کچھ تو ادھر بھی

حکیم صاحب یہ تمنا فرائی دیکھ کر اودھ کے نواب وزیر شجاع الدولہ کے دربار کی زینت بن گئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اپنی ماں سے روٹھ کر نواب آصف الدولہ وزیر اودھ نے ۱۷۷۵ء میں لکھنؤ کو بسانے کی دل میں ٹھان لی۔ اور طرح طرح سے دلّی اور بیجاپور دکن سے باکمالوں کو توڑ توڑ کر لکھنؤ کے شطرنجی بساط پر جمانا شروع کیا۔ شاعروں میں سودا اور میر تقی میر آئے۔ خوشنویسوں میں حافظ اللہ اور نعمت اللہ یہاں پہنچے۔ تاریخ کے صفحات وجد کرتے ہیں کہ کس کس حکمت عملی سے لکھنؤ کو باکمالوں کی راجدھانی بنایا گیا تھا۔ باکمال طبیب رہے جاتے تھے۔ سو ان کی کمی اس طرح پوری ہوگئی کہ عاشق مزاج آصف الدولہ بیمار پڑے خوشا اقبال رنجوری کہ ان کی نظر انتخاب اثر کے ان ہی جد اعلیٰ پر پڑی اور وہ آصفی چتر کے آبدار موتی بن گئے۔ ان کا خاندان یہیں بس گیا۔ حکیم مرزا محمد شفیع کے بیٹے حکیم مرزا محمد مسیح متخلص بہ زرّہ کربلا چلے گئے۔ اور ان کو مرنے کے بعد بھی وہ سعادت اور عزت نصیب ہوئی کہ کربلا کے روضہ کے تحت محراب قبہ میں دفن ہوئے۔ مگر ان کے بیٹے حکیم مرزا علی خاں لکھنؤ چلے آئے اور حکیم الملک کا خطاب پایا۔ اس سلسلۂ حکما کی آخری کڑی اثر کے والد ماجد حکیم مرزا افضل حسین خاں تھے جو راقم الحروف کے بھی کرم فرما تھے۔ اس وجہ سے جو کچھ جناب اثر کی شخصیت کے بارے میں یہاں سپرد قلم کیا جا رہا ہے وہ براہ راست علم واطلاع کا نتیجہ ہے۔

اثر کی خاندانی شخصیت کا یہ وقار ہے کہ علامہ تفضل حسین خاں ساجد عالم و دوراں جن کے کمالات علمی و سیاسی پر اودھ کی تاریخ گواہ ہے، اسی خاندان کے سلسلے کی ایک زرّیں کڑی ہے۔ اس لئے اگر اثر کی شخصیت کے تمام اجزا کو الگ کر کے بھی دیکھا جائے تو تنہا خاندانی وقار ہی ان کی عظمت و برتری کی بڑی ضمانت ہے۔ اثر صحیح معنوں میں اس وقار کے وارث اور سچے امین ہیں۔

غدر کے بعد لکھنؤ کے شرفا اور باکمالوں پر تباہی کا پہاڑ ٹوٹ کر گر پڑا۔ کچھ لوگ تو اسی کے نیچے دب کے رہ گئے۔ کچھ دور بھاگ کر چلے گئے۔ وہ لوابوں کی ڈیوڑھیاں جہاں باکمالوں کے جمگھٹے رہتے تھے۔ ان کو اثر نے سنسان دیکھا۔ لکھنؤ کے بقیہ دار انگریزی تعلیم سے کنارہ کش تھے۔ اور بڑا مشغلہ تیتر بازی اور کنکوّے لڑانے والوں کی صحبتیں تھیں۔ ماحول کا پورا پورا تجربہ حاصل کرنے کے لئے اثر کے والد ماجد نے ان کو ہر صحبت میں بٹھایا۔ مجھے خود اثر کا کنکوے لڑانا یاد ہے۔ اثر نے بنتے ہوئے ملکہ کو دیکھا۔ اور وہ بھرے بھیجے اور صفوں کو مجاہدانہ شان سے چیرتے ہوئے کنکوے کے اُبھکے اور پیچ کو پھینک اور کنکوّے کو پھاڑ خاندانی اقتدار اور شخصیت کو عزت کی سطح پر برقرار رکھنے کے لئے رسم و رواج اور خاندانی نوابی کی قیود کو توڑنے چلے گئے۔ ۱۹۰۶ء میں انہوں نے بی اے پاس کیا اور ۱۹۰۹ء میں ڈپٹی کلکٹری کے عہدے پر فائز ہوئے۔ عہدے کی شخصیت اور حاکمانہ عزت و آبرو کے بل پر دوسروں کے دلوں میں جبراً اپنی عظمت کی دھاک بٹھانا اور چیز ہے جو سبھی بدنصیب اور دل فریب حکام کو نصیب ہوتا ہے۔ لیکن یہ کوئی شخصیت یا شخصیت نہیں عزت میں عزت نہیں۔ آئیے اس سے الگ ہو کر اثر کے اقتدار شخصیت اور ہر دلعزیزی کا ایک سبق آموز منظر دکھائیں جس میں شاہانِ اودھ کے سلوک رعایا پروری، ترحم، ہندو مسلم اتحاد، حمیت اور بے تعصبی کے وہ ریا جوہر اس طرح جھلک رہے ہیں جیسے خاک میں دبے موتی اور دو ہفانوں کی چوپال میں دبی ہوئی آگ۔

اثر بہ حیثیت ڈپٹی کلکٹر ہردوئی کے ضلع میں پہنچے اور دورے پر نکلے۔ تحصیل شاہ آباد میں پالی کے قریب تمام حکام کے قیام کے لئے ایک ایک مقررہ باغ ہے۔ چنانچہ اسی میں ان کا خیمہ بھی لگایا جانے لگا۔ جب چودھری فتح سنگھ تعلقدار کے ورثا کو معلوم ہوا کہ لکھنؤ کے رہنے والے یعنی مرزا جعفر علی خاں اثر یہاں آنے والے ہیں تو انہوں نے ان کے قیام کے لئے وہ باغ تجویز کیا جس میں عہد شاہی میں ایک کمیدان ایک بڑی فوج لے کر

اُن سے اور مال گزاری کے بقایا کی علت میں سارے قصبے کو توپ اور گولوں سے اُڑا دینے پر مامور ہوئے تھے۔ مگر اسی قصبے میں لکھنؤ کے ایک غریب کہار کی لڑکی بیاہی ہوئی تھی جس کے جہیز کا ساز و سامان انہیں کمیدان نے پورا کیا تھا۔ کنوئیں پر وہ لڑکی پانی بھرنے آئی تو اس نے کمیدان کے فیل بان سے جو ہاتھی کو نہلا رہا تھا، پوچھا کہ کیا کاکا بھی آئے ہیں۔ پہلے زمانے کا دستور تھا اور اب بھی یہ رواج کچھ کچھ باقی ہے کہ گاؤں گراؤں میں ہندوؤں کے لڑکے لڑکیاں مسلمان بزرگوں سے اور مسلمانوں کے لڑکے لڑکیاں ہندو بزرگوں سے کسی نہ کسی رشتے سے خطاب کرتی ہیں۔ چنانچہ جب کمیدان کو لکھنؤ کے کہار کی لڑکی نے کاکا کے لفظ سے یاد کیا اور کمیدان کو اس کی خبر ہوئی تو دل بھر آیا اور انہوں نے بادشاہ کو ایک عرضی بھیجی کہ جو سزا تجویز ہو، وہ بھگتنے کے لئے کمیدان تیار ہے۔ مگر اس گاؤں پر گولہ باری کی حمیت نہیں جس میں لکھنؤ کی ممنونِ احسان ایک ہندو لڑکی بیاہی ہے۔ بادشاہ پر اس شرافتِ نفس کا یہ اثر پڑا کہ سارے علاقے کی مال گزاری بفرمانِ شاہی معاف ہوگئی۔ (اثر کے وقت تک یہ معافی چلی آتی تھی) یہ اقتدار شخصیت جس کا تہیہ مقدم ایک ہندو تعلقہ دار کے ورثا کی طرف سے ہوا اثر کی ذاتی جاذبیت اور کشش کی ایک مثال ہے۔ جس میں ان کے عہدے اور منصب کو کوئی دخل نہیں تھا۔ اس کے جواب میں اثر نے جو احترام ان لوگوں کا کیا، وہ شرافت، خلوص اور حسنِ اخلاق کی ایک لمبی داستان ہے۔

اب اسی اقتدار شخصیت کا ذاتی پہلو ایک دوسری مثال میں دیکھئے۔ اثر جب اناؤ میں تبدیل ہو کر گئے تو راجہ بینی مادھو سنگھ کے ورثا میں ایک غریب زمیندار زندہ تھا جس کے پاس کچھ تھوڑی سی سیر یا باصطلاح زمینداری ما تحت الملکیت جائداد باقی رہ گئی تھی۔ اور اب وہ بھی مہاجن کے قرضے کی وجہ سے ہاتھ سے نکل جانے والی تھی۔ یہ راجہ بینی مادھو سنگھ وہی ہیں جو غدر کے زمانے میں جب سلطان عالم واجد علی شاہ آخری تاجدار اودھ کو اسیر سلطانی کر کے انگریز مٹیا برج (کلکتہ) لے گئے اور شہزادہ برجیس قدر اپنی جان اور عزت بچانے کے لئے نیپال بھاگ کر جانے لگے تو راجہ برہنہ تلوار ہاتھ میں لئے برجیس قدر کے ساتھ ساتھ سپاہیوں کی جمعیت لئے انہیں نیپال پہنچا آئے تھے۔ واپسی پر انگریزوں نے ان کا سارا علاقہ ضبط کر لیا اور ان کو اس شریفانہ سلوک کی پاداش میں پھانسی دے دی تھی۔ غیر راجہ بینی مادھو سنگھ کے اس وارث زمیندار پر نالش کر دی گئی۔ اثر صاحب کے سامنے مقدمہ آیا۔ بجائے اس کے کہ وہ اپنے اقتدار اور اختیارات سے کام لیتے، انہوں نے بڑی ایمانداری، نرمی اور خوش اسلوبی سے مدعی کو سمجھایا۔ اور اس کا یہ اثر ہوا کہ مدعی ان کی بات مان گیا۔ قرضہ کی قسط مقرر ہوگئی۔ اور غریب ہندو زمیندار کا آزوقہ بچ گیا۔ اس طرزِ عمل اور سلوک سے اس زمیندار کے دل میں اثر صاحب کی اتنی قدر و منزلت بڑھی کہ جس ضلع میں اثر صاحب تبدیل ہو کر گئے۔ ان کی احسان مندی اور قدر دانی کے اعتراف کے لئے وہ تا عمر حیات ان کی زیارت کے لئے حاضر ہوتا رہا۔

ادبی دنیا اور شعر و شاعری میں اثر کی شخصیت نہ صرف لکھنؤ بلکہ تمام ہندوستان اور پاکستان میں مسلّم ہے۔ اور عروض و فنون، ادب و محاورات کی معلومات میں وہ منفرد ہیں۔ اس موقع پر مجھے ان کے کلام پر کچھ نہ کچھ ضرور لکھنا چاہئے تھا۔ تاکہ ان کی علمی اور ادبی کاوشوں کے کچھ نقوش اُبھر سکیں۔ لیکن اس موضوع پر بحث و تبصرہ مدیرِ نقوش کی طرف سے علی الاعلان ممنوع قرار دے دیا گیا ہے۔ جس طرح فسادات اور بلوے کے اندیشے سے دفعہ ۱۴۴ نافذ کی جاتی ہے۔ گویا اسی طرح شاعری کا ذکر بھی شخصیت کے ذیل میں ممنوع قرار دے دیا گیا ہے اور یہ ایک لحاظ سے بہتر ہوا۔ ورنہ شاعری اور عاشقی جیسے کی کا دوسرا نام ہے۔

لیکن ~ ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو   بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

شعر نہ سنایا جائے اور اس پر تبصرہ بھی نہ کیا جائے مگر اتنا کہنے میں تو میرے مضمون کا اس دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی میں چالان نہ ہو سکے گا کہ پرستارانِ اردو میں اثر وہ منفرد شخصیت ہیں جس نے ہر صنفِ نظم میں ہزاروں لاکھوں شعر کہے اور سینکڑوں تنقیدی مضامین اردو کی حمایت اور اس کی قدرتی شان و شوکت کی بقا کے لئے لکھے۔ مسلسل ۵۰ سال سے ان کا یہ جہاد جاری ہے۔ اور اس میں انہوں نے اپنا خون پسینہ ایک کر دیا ہے۔ "اثرستان" اور "بہاراں" کی طرح کے دیوان اور تنقیدی مضامین سے قطع نظر زمانۂ حال کے موافق اثر دنیا کی مختلف زبانوں کے شاعرانہ خیالات کو اردو کے قالب اور لکھنؤ کی ٹکسالی زبان کے سانچے میں ڈھال چکے۔ ان میں سے کچھ چھپ گئے اور بڑا ذخیرہ گنج گرانمایہ کی طرح ابھی چھپا نہیں چھپا ہوا ہے۔

ہندوستان میں اردو زبان کے مستند مرکز دلی اور لکھنؤ مانے گئے ہیں۔ اور لکھنؤ میں بھی محلہ کٹرہ ابوتراب خاں جہاں اثر پیدا ہوئے، بڑے بوڑھے پردہ ان پڑھے اور اپنے

بزرگوں کی آغوش میں زبان و محاورات کی لوریوں میں پلے۔ یہ ثقافت کا مخزن تھا۔ جیسا کہ وہ خود فرماتے ہیں ؎

ثقافت کٹرہ کہہ کر لوگ ہم کو یاد کرتے ہیں　　سند خود لکھنؤ میں بھی تھا معیارِ زباں اپنا

اثرؔ انگریزی زبان کے بڑے ماہر ہیں اور کتب بینی اور تراجم کی مشق نے ان کی تبحر و قادر الکلامی میں چار چاند لگا دیئے ہیں۔ سنجیدہ مزاج کا حصہ جوان کو اپنے والد ماجد کے پند نصیحت اور خوش طبعی اور خوش مزاجی سے حاصل ہوا وہ ان کی روزمرہ زندگی اور لطفِ کلام کا جزو بن گیا ہے۔ ایک بار ان کی عدالت میں ایک صاحب نے باپ کے بجائے "نادر" بار بار استعمال کیا۔ اور تمام لوگ اور یہ خود بے لطفی محسوس کرنے لگے تو بجائے غصہ کرنے اور تحکمانہ انداز صرف کرنے کے بڑے خوشگوار عنوان سے اثرؔ نے ان سے فرمایا کہ "باپ کہتے آپ کو کیوں شرم آتی ہے"۔

اثرؔ کو نظم و نثر پر یکساں قدرت ہے۔ اور اس حیثیت سے ان کی بلند پایہ شخصیت جدید تخیل کی علمبردار اور قدیم طرزِ ادب کے محافظ کی حیثیت سے شہرتِ دوام اکر ایک خاص متاثر کرنے والی شخصیت بن گئی ہے۔

اثرؔ کی شخصیت ان کے کمالات ذہنی کو قطع نظر کر کے ایسے کردار و سیرت کا مجموعہ ہے جس کے لئے اخلاق کی کتابیں اور معاشرتی مواعظ اور ہر شرافت پسند نفس اور خاندان خواہاں ہے۔ سادہ دلی، نیک باطنی، ایمانداری، وضعداری، مہمان نوازی، عالی ظرفی، صاف طبعی، آزادہ روی کی ہزارہا مثالیں اثرؔ کی زندگی کی آئینہ دار ہیں۔ ہر ایک بات ان کی شخصیت کا ایک الگ باب ہے۔ اثرؔ مذہب کے پابند مگر تعصب و تنگ نظری سے دور ہیں۔ مسلمان تو مسلمان ہندو کو بھی اثرؔ نے ہمیشہ مذہبی جذبات سے الگ ہو کر دیکھا۔ ان کے اس شعر کے آئینے میں ان کے اس کردار کی صورت بالکل صاف صاف نظر آتی ہے۔

نہ تو ہندو کبھی دیکھا نہ مسلماں دیکھا　　میں نے انساں کی نظر سے سوئے انساں دیکھا

اگر یہ شعر ان کے سیرت و کردار کی صحیح تصویر نہ ہوتا اور یہ اپنے اعزا و ہم قوموں کو ملازمت میں آگے بڑھاتے، ایمانداری کا دامن ہاتھ سے کھو بیٹھتے تو عمر بھر یہ کھٹکا لگا رہتا کہ ان کی سیرت کے اجلے دامن پر یہ شعر داغ معصیت بن کر کردار کی حرف گیری کرتا رہے گا۔

کوئی مثال ایسی نہیں ملتی کہ اپنے مندرجہ ذیل شعر کی صحیح ترجمانی سے وہ چوک گئے ہوں

ہم دل میں کسی سے کبھی کینہ نہیں رکھتے　　یہ شیوۂ رندانِ مے آشام نہیں ہے

جس طرح رندانِ مے آشام کا دل بے کینہ ہوتا ہے اس طرح ایسا پاک نفس جس نے پینا کیسا شراب چھوئی بھی نہ ہو استعارے کے لئے اس سے زیادہ موثر مثال تو وہ اپنے کردار کو سمجھانے کے لئے نہ پیش کر سکتا تھا نہ ملی۔

اثرؔ صاحب کی داد و دہش و کنبہ پروری کی خاموش زندگی کا آئینہ دار ان کا یہ شعر ہے۔ اپنی تعریف وہ خود کیا کرتے مگر ان کے سچے جذبات کی اس میں پوری پوری جلوہ گری ہے جو عمومیت کا رنگ لئے ہے:

اسی شخص کو میں نے انسان جانا　　جو احسان کر کے نہ احسان جانا

اسی طرح لطور اختصار انہیں کا شعر ان کی شخصیت سازی کے ہر کردار کے سند میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

مرزا جعفر علی خاں نے ڈپٹی کمشنری کے عہدے سے پنشن لی۔ کشمیر میں دنیا اور کچھ دنوں وزیر اعظم رہے اور باوجود اس کے کہ ان کے لئے یہ توقع تھا کہ جتنے چاہتے وزارتِ عظمیٰ پر فائز رہتے مگر اپنی آن بان قائم رکھنے کے لئے انہوں نے کشمیر کی وزارت پر رہنا پسند نہ کیا اور کشمیر سے روانگی کے وقت یہ شعر ارشاد فرمایا

متاعِ عیش پہ قرباں کیا نہ عزت کو　　ہزار شکر رہا پاسِ آبرو باقی

اثرؔ صاحب کے سیرت و کردار کے بنانے والے بے شمار واقعات ہیں جن میں سے ہر ایک پر تھوڑا تھوڑا لکھا جائے تو ایک طویل داستان ہو جائے گی۔ اس لئے صرف اتنی باتیں چن کر پیش کر دی گئی ہیں جو ان کی شخصیت کا اہم جزو ہیں۔

جگر صاحب

رشید احمد صدیقی

بالکل یاد نہیں آتا جگر صاحب سے پہلے پہل کب کہاں اور کیسے ملاقات ہوئی۔ ممکن ہے الٰہ آباد میں ہوئی ہو جہاں اصغر صاحب مرحوم ہندوستانی اکیڈمی (یو۔پی) میں صیغۂ اردو کے مشیر ادبی تھے۔ کسی کام سے الٰہ آباد جانا ہوتا تو میرا قیام اصغر صاحب کے ہاں ہوتا۔ یہ زمانہ اور اس کے بعد کا کافی زمانہ ایسا تھا جب جگر صاحب پر شراب کا بڑا تسلط تھا۔ رفتہ رفتہ مجھ سے اتنی رسم و راہ ہو گئی کہ جگر صاحب جب کبھی علی گڑھ تشریف لاتے تو میرے ہاں ٹھہرتے۔ یہاں تک کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے بڑے عزیز اور محترم دوست بن گئے۔

الٰہ آباد میں اصغر صاحب کے سامنے جگر صاحب اس طرح خاموش، مؤدب اور آنکھیں نیچی کئے ہوئے بیٹھتے کہ ان سے گفتگو بھی کی جاتی تو صرف ہاں، نہیں میں مشکل سے جواب دیتے اور پھر سر جھکا لیتے۔ اصغر صاحب مجھ سے بڑی محبت کرتے تھے۔ ان کے ہاں پہنچ جاتا تو وہ ایسے خوش ہوتے جیسے ان کا رُواں رُواں مسکرانے لگا ہو۔ ان کے اس طرح خوش ہونے سے مجھ پر آسودگی اور عفو کی ایسی کیفیت طاری ہوتی جیسے میں ان تمام لوگوں کا قصور معاف کرنے لگا ہوں جنھوں نے میرے ساتھ ظلم و زیادتی کی تھی۔

کبھی کبھی وہیں جگر صاحب مل جاتے۔ ان کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا جیسے وہ خود نہ آئے ہوں بلکہ کسی نے پہنچا دیا ہو اور اس کے منتظر ہوں کہ موقع ملے تو پھر اپنی مہم پر چلے جائیں۔ ان کے مواجہ میں اصغر صاحب مجھ سے تفصیل سے گفتگو نہ کرتے۔ میں بھی کوئی ذکر نہ چھیڑتا۔ ہم دونوں بیٹھے ہوتے تو جگر صاحب اُٹھ کر چلے جاتے۔

اصغر صاحب، جگر صاحب کو زیادہ خاموش پاتے، کنایا ہوا دیکھتے تو کبھی کبھی مسکرا کر یہ فقرہ ان کو سنا دیتے "چاہے جہاں پھر و لوٹ کر یہیں آنا پڑے گا"۔ اس کے بعد مجھ سے مخاطب ہو کر ہنسنا بولنا شروع کر دیتے۔ ایک دفعہ میں نے پوچھا "اصغر صاحب کہاں آنا پڑے گا، بیچارے آ تو جاتے ہیں"۔ اصغر صاحب میری طرف دیکھ کر مسکرائے۔ ان کی آنکھیں ان سے زیادہ مسکراتی تھیں۔ پھر بولے "ابھی کہاں آئے ہیں، ابھی تو لائے جاتے ہیں"۔ ایک دفعہ الٰہ آباد پہنچا تو اصغر صاحب کے ہاں جگر صاحب پھر اسی حال میں ملے۔ کھانے کا وقت آیا تو میں اور اصغر صاحب کھانے کے کمرہ کی طرف چلے۔ جگر صاحب نے شرکت سے معذوری کا اظہار کیا۔ اصغر صاحب اس دن کچھ بدحظ سے معلوم ہوتے تھے۔ چلتے چلتے کھڑے ہو گئے اور جگر صاحب کو مخاطب کر کے بولے "یہ سب تمھارے سفر نہیں سُنتے تمھارا گوشت کھاتے ہیں"! اصغر صاحب کی آزردگی

پر کسی قدر بے بسی کا رنگ چھانے لگا تھا۔

میں نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا اور کھانے کے کمرہ میں داخل ہوا۔ اصغر صاحب کھانے کی طرف متوجہ ہوئے تو میں نے کہا اصغر صاحب آپ تو لکھنؤ کی شاعری کے تشبیہ استعاروں کے کبھی شیدائی نہ تھے۔ یہ گوشت کا کیا قصہ ہے؟ کھانے سے ہاتھ روک لیا۔ کچھ خشمگین لیکن زیادہ حزین لہجہ میں بولے رشید صاحب آپ کو کیا معلوم یہاں ایسے بےرحم لوگ بھی ہیں جو ان کو جہاں چاہتے ہیں پکڑ لیتے ہیں اور یہ تو اسپرٹ ہوتی ہے نہ وہ پلا پلا کر ان سے شعر سنتے ہیں اور جب یہ ادھ موئے ہو جاتے ہیں تو یکے پر لاد پھاند کر یہاں پہنچا دیتے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ اصغر صاحب بے کیف ہو گئے ہیں اور کھانے سے بھی ہاتھ کھینچ لیا ہے۔

میں نے پوچھا "اصغر صاحب آپ نماز تو پڑھتے ہیں؟" بولے "ہاں" میں نے کہا "... صاحب تو آپ کو صاحب کشف و کرامات بھی بتاتے ہیں" بولے "بھی تو پھر!" میں نے عرض کیا "... صاحب نے آپ کا ایک شعر سن کر آپ کو مستجاب الدعوات بھی قرار دیا تھا" بولے "آپ بھی تو کچھ کہیئے" میں نے کہا "آپ اللہ سے دعا کیوں نہیں مانگتے کہ جگر صاحب کا گوشت کھانے والے وحشیہ بن ہو جائیں" اصغر صاحب ہنس پڑے اور ہم دونوں کھانے میں مصروف ہو گئے! کھانا کھلانے پر جو ملازم مامور تھا اس سے پوچھتے جاتے تھے یہ کھانا یا وہ کھانا جگر صاحب کے لئے رکھ دیا ہے یا نہیں۔ اس سے اطمینان نہیں ہوتا تھا تو ڈونگے اور پلیٹ سے نکال کر علیحدہ پلیٹوں میں رکھتے جاتے اور کہتے "یہ سب جگر صاحب کے لئے ہے۔ بغیر کھانا کھلائے ان کو باہر نہ جانے دینا؟"

میرے گھر کا ہر چھوٹا بڑا جگر صاحب کو بہت عزیز رکھتا تھا۔ یونیورسٹی اور شہر میں بھی جگر صاحب محبوب و مقبول تھے۔ اس زمانہ میں بھی شراب کا بڑا زور تھا۔ اکثر غافل اور بدمست شہر سے لائے جاتے۔ یونیورسٹی کے اندر کوئی نہ کوئی طالب علم مل جاتا جو ان کو میرے ہاں لاتا۔ میں گھر پر نہ موجود ہوتا تو وہ کمرہ میں پہنچا کر دیکھ بھال میں مصروف ہو جاتا۔

یہ طالب علم جگر صاحب کی نرسنگ اس طور پر کرتے جیسے کوئی اپنے باپ یا بھائی کی خدمت کر رہا ہو یا کوئی نرس سرسام میں مبتلا مریض کی نرسنگ کرتی ہو۔ اور یہ اس زمانہ کی بات ہے جب جگر صاحب اور یہ طالب علم دونوں اپنی اپنی جگہ پر ان بانکوں سے کم نہ تھے جن کے قصے تاریخوں اور داستانوں میں ہم پڑھتے آئے ہیں۔

میں آ جاتا تو طالب علم چلے جاتے اور معلوم نہیں کیوں اور کیسے جگر صاحب خاموش اور مؤدب ہو جاتے۔ لیکن ان کو دیکھنے سے معلوم ہوتا تھا جیسے رہ رہ کر سمندر کی تہ سے کوئی طاقتور موج اُبل کر باہر آنے والی ہو لیکن سطح کے قریب پہنچ کر یک بیک زور ختم کر کے واپس چلی جاتی ہو۔

یہ باتیں میں اس لئے نہیں بیان کر رہا ہوں کہ اس میں میری بڑائی نکلتی ہے۔ میری یہ نیت ہوتی تو میں اتنا بے وقوف نہیں ہوں کہ اس بھونڈے طریقہ سے اس کی نمائش کرتا۔ جگر صاحب سے مجھے بھی تو شکایت ہے کہ وہ میرے سامنے مؤدب کیوں ہو جاتے ہیں۔ مجھے ایسے آدمی سے ملنے میں بڑی اُلجھن ہوتی ہے جو مجھے ہر وقت گارڈ آف آنر دیتا رہے اور اس سے بھی کچھ کم کوفت اس وقت نہیں ہوتی جب کوئی شخص میرے سامنے مجھ سے زیادہ مسخرا بننے کی کوشش کرتا ہے!

جگر صاحب اپنے حلقہ کے لوگوں میں بیٹھے ہوتے ہیں تو بہت خوش اور بے تکلف ہوتے ہیں۔ ایسے میں جگر صاحب کے پاس جانے سے پرہیز کرتا ہوں۔ لیکن اتفاق یا ضرورت سے پہنچ جاؤں تو وہ اس طرح خاموش اور سنجیدہ ہو جائیں گے جیسے مکتب کے چھوٹے بچے ہنس بول یا اودھم مچا رہے ہوں اور دفعتاً مولوی صاحب نمودار ہو جائیں!

جگر صاحب یقیناً مجھ سے بہتر انسان ہیں۔ وہ مجھ سے مساوات برتیں، میری عیادت کریں، مجھ سے خدمت لیں۔ مجھ سے جھگڑیں یا مذاق کریں یہ ساری باتیں سمجھ میں آتی ہیں لیکن وہ مجھے حربن شریفین قسم کا مولوی یا کسی اُردو اخبار کا آبرو باختہ اڈیٹر یا برطانوی عہد کا تھانیدار سمجھیں یہ میرے لئے

ڈوب مرنے کی بات تو ہے ہی خود جگر صاحب کے لئے کوئی فخر کی بات نہیں ہے۔

میرا خیال ہے کہ اُن کے ہاں میرا جو رکھ رکھاؤ ہے وہ غالباً اس تعلق سے ہے جو مجھے اصغر صاحب سے یا اصغر صاحب کو مجھ سے تھا۔ اس طرح کی باتوں کا جگر صاحب بڑا لحاظ کرتے ہیں۔ وضعداری شریفوں کی پرانی کمزوری ہے!

ایک دفعہ خبر آئی کہ جگر صاحب شراب سے تائب ہو گئے۔ یقین نہ آیا کہ ایسا ہوا ہو گا۔ سمجھتا تھا کہ آج نہیں کل یہ خبر آئے گی کہ پھر سے شروع کر دی۔ بری عادتیں اس آسانی سے نہیں چھوٹتیں جس آسانی سے اچھی عادتیں چھوٹ جاتی ہیں۔ سوچتا یہ تھا کہ جب میں اپنی معمولی بری عادتیں چھوڑ دینے پر قادر نہیں ہوں تو جگر صاحب شراب کیسے چھوڑ دیں گے جس میں وہ اس طرح ڈوبے ہوئے تھے جس طرح شاید جوش گریہ میں غالب کا دل ڈوبی ہوئی اسامی تھا!

جگر صاحب شراب سے کیوں اور کیسے تائب ہوئے اس کا مجھے علم نہیں۔ اس بارہ میں اُن سے کبھی ذکر نہ آیا۔ اتنا البتہ جانتا ہوں کہ ان پر شراب کا کتنا ہی غلبہ کیوں نہ ہوتا اُن سے کوئی ایسی حرکت سرزد نہ ہوتی جسے مبتذل کہہ سکیں۔ ان کی زبان سے سخیف کلمات نہیں نکلتے تھے۔ وہ کبھی وشتے پرشتے رند مچاتے نہیں پائے گئے۔ مجھے تو اکثر محسوس ہوا جیسے کیف سرخوشی بخشنے کے بجائے شراب ان کو انتہائی درد و کرب میں مبتلا کر دیتی ہو۔ اُن پر تھوڑی شراب بھی بہت اثر کرتی تھی۔

ممکن ہے اس کا سبب یہ ہو کہ ان کے اعصاب بڑے ذکی الحس ہیں اور تھوڑی سی تحریک بھی بہت ہو جاتی ہو۔ شاعری میں بھی اُن کا یہی حال ہے جیسے خیال یا جذبہ برقی رو بن کر ان کے جسم و جان کو جھنجھنا دیتا ہو۔ کچھ دنوں سے اُن کے کلام میں یہ بات بظاہر کم ہو گئی ہے لیکن غور کرنے پر محسوس ہوتا ہے کہ جو بات کہی گئی ہے اس میں تاثرات کی شدت ہے لیکن ان کو پیش کیا گیا ہے زیادہ مدھم آواز اور انداز میں۔

جگر صاحب کی شاعری میں ایک بات یاد رکھنے کی ہے کہ اصلاً وہ دور دو دہجوری کے شاعر ہیں۔ ان کی شاعری کی رفتار اور سمت کا مطالعہ کیا جائے تو آسانی سے معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ فراق کے شاعر ہیں وصال کے نہیں۔ اُن کا محبوب سے رشتہ کا انداز CENTRIFUGAL امرکزگریز ہے۔ یہی سبب ہے کہ جگر صاحب کی شاعری میں محبوب کی عفت میں کہیں کوئی مثال نظر نہیں آتا اور ان کا کلام اُس آلودگی اور بے راہ روی سے پاک ہے جو ہماری شاعری اور سوسائٹی میں آج کل نظر آتی ہے۔ میرا کچھ ایسا خیال ہے کہ جو شاعر ذہن و فکر کے اعتبار سے محبوب سے قریب سے قریب اور جسم و جان کے اعتبار سے دُور سے دُور ہو وہ اس شاعر سے بالعموم بہتر و برتر ہو گا جس کی پوزیشن اس کی بالکل برعکس ہو۔ جگر کے نقادوں کو یہ نکتہ مدنظر رکھنا چاہیئے۔

شراب چھوڑنے کے بعد جگر صاحب طرح طرح کی مصیبتوں میں مبتلا ہو گئے۔ یہ زمانہ ان پر بڑا سخت گزرا۔ صحت خراب ہو گئی طرح طرح کی ذمہ داریوں نے آگھیرا۔ مالی حالت ناگفتہ بہ ہو گئی۔ جگر صاحب نے جس پامردی سے ان مصیبتوں کو جھیلا وہ جگر صاحب کا حصہ ہے۔ کتنے اور کیسے کیسے "روز ابر و شب ماہتاب" آئے ہوں گے اور جگر صاحب پر سے گزر گئے ہوں گے اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

جگر صاحب بڑے مذہبی آدمی ہیں۔ مذہبی لوگوں کے بارہ میں میرا تجربہ کچھ اچھا نہیں ہے میں نے اکثر ایسے لوگوں کو مذہب میں مبتلا پایا جن میں خاصی اخلاقی کمزوریاں ملتی تھیں۔ یہ لوگ خدا کو اس منطق سے قائل کرتے رہتے ہیں کہ میں جتنی شادیاں کرتا اور طلاق دیتا ہوں اتنی ہی زائد رکعتیں نماز کی بھی تو پڑھ لیتا ہوں" وہ سمجھتے ہیں کہ جس طرح امریکہ ہر چیز کی قیمت ڈالر میں وصول کرتا ہے اللہ تعالیٰ ان کے گناہوں کا کفارہ نفلوں میں قبول کر لیتا ہے۔

مذہب بڑی سخت اور بڑی قابلِ قدر آزمائش ہے۔ بالخصوص مسلمانوں کا مذہب۔ جس طرح کے مذہبی لوگ میرے پیش نظر ہیں وہ اس در...

ملہ اس سے کوئی صاحب یہ نہ سمجھیں کہ میرا مطلب شراب کی فضیلت جتانا ہے۔ یہاں شراب کے چھوڑنے اور مصیبتوں کے آنے میں سبب اور مسبب کا رشتہ نہیں ہے۔ (رشید صدیقی)

بے وقوف ہوتے ہیں کہ اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ جب وہ اپنے اردگرد کے معمولی سوجھ بوجھ کے لوگوں کو دھوکا نہیں دے سکتے تو وہ خدا کو کیونکر دھوکا دیں گے جس کی صفات کا ان کو علم ہے۔ یقین ہو یا نہ ہو۔ ان کو یہ بھی نہیں معلوم کہ خدا نے اپنے سارے اختیارات اُن بندوں کو ہمیشہ کے لئے منتقل کر دئے ہیں جن کا وہ حق مارتے رہتے ہیں۔ ایسے معاملات میں وہ خدا کے ہاں غلطی عرضیاں بھیجتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اُن سب کو پڑھے بغیر عدالتِ مجاز کو واپس کر دیتا ہے۔

ان میں بعض ایسے معصوم بھی ملیں گے جو اس کوشش میں رہتے ہیں کہ خدا کو نہ سہی اُن فرشتوں ہی کو دھوکا دے کر کاربراری کر لیں جو ان کا اعمالنامہ مرتّب کرنے کے لئے کاندھوں پر بٹھا دیئے گئے ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ آخرت میں پٹواری کے اندراجات کی بنا پر مقدمہ جیت لیں گے!

جگر صاحب ان معنوں میں مذہبی آدمی ہیں کہ وہ اللہ رسول اور انسان کے حقوق پہچانتے ہیں اور اس کا لحاظ رکھتے ہیں کہ جس کا جو حق ہو اُسے پہنچ جائے۔ وہ نفع کے ضرر اور ضرر کے نفع کو جانتے ہیں۔ اُن میں جہاں یہ ہے وہ پرائی چیز کو اپنانے کے درپے نہیں ہوتے ان میں غیرت اور حمیت ہے۔ ظلم اور زیادتی اپنے پر ہو تو جھیل جائیں گے دوسرے پر ہو تو اس کی حمایت میں اپنے کو خطرہ میں ڈال دیں گے۔ اُن کے یہ جوہر تقسیم ملک کی ہلاکتوں میں کھلے۔ تفصیل میں طوالت ہے۔

جگر صاحب عالم فاضل نہیں ہیں۔ مذہب ہو، سیاست ہو، شعر و ادب ہو، ان پر ان کی گفتگو منطقیانہ یا فلسفیانہ نہ ہوگی۔ ان کا احساس جتنا سریع اور شدید ہے اتنا ان کا مطالعہ وسیع نہیں ہے۔ وہ خود اپنی شاعری کے بارہ میں تفصیل سے گفتگو نہیں کر پاتے۔ وہ اپنی شاعری سے باہر نکل کر کسی اور کی شاعری پر غور کرنا نہیں چاہتے۔ شاید غور کر بھی نہیں سکتے۔ جس کے جذبات تند و تیز ہوں، وہ غور کرنے کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ جگر صاحب اقبال کی شاعری کے کچھ ایسے قائل نہیں ہیں۔ فانی بھی نہ تھے۔ دونوں کا یہ کہنا ہے کہ شاعری میں فکر و فلسفہ کیسا؟ حالانکہ دونوں بالخصوص جگر صاحب جب حسن و جمال سے بلند ہوتے ہیں اقبال کے قریب ہو جاتے ہیں۔ لیکن جگر صاحب شعر و شاعری کے بارہ میں جو کچھ کہتے ہیں وسعت اور وزن سے قطع نظر اس میں خلوص کی پاکیزگی اور یقین کی جھلک ملتی ہے۔

میں نے جگر صاحب کو تقریباً ہر حال اور ہر صحبت میں دیکھا ہے۔ خوبصورت نوجوان آزاد منش عورتوں میں، ان بہن بیٹیوں میں، عمائد اور اکابر کی موجودگی میں، طلبا، اساتذہ اور دوسرے سنجیدہ اور ثقہ حلقوں میں۔ گفتار و کردار کے اعتبار سے میں نے ان کو کہیں قابلِ گرفت نہ پایا۔ عورتوں کی موجودگی میں جگر صاحب عفیف و شفیق نظر آئیں گے۔ ان کی زبان سے کوئی ہلکی بات نہ نکلے گی اور نگاہ کبھی بے باک اور بے محابانہ ہوگی۔ عورتوں کی موجودگی سے قطع نظر بے تکلّف دوستوں میں میں نے کبھی یہ نہ دیکھا کہ جگر صاحب نے بے خیالی میں یا تفریحاً کوئی ایسا جملہ کہا ہو جس میں عورتوں سے تفریح یا عورتوں کی تضحیک کا پہلو نکلتا ہو۔ کم سے کم میری جان پہچان کا کوئی اُردو شاعر ایسا نہیں ہے سوا فانی مرحوم کے جو اس بارہ خاص میں جگر صاحب کا مقابلہ کر سکے۔

رؤسا اور امرا کے سامنے جگر صاحب حتی الوسع اپنا اور ان کا دونوں کا رکھ رکھاؤ ملحوظ رکھتے ہیں۔ لیکن اس طرح کی صحبتوں میں جگر صاحب کی طرف سے میں ہمیشہ متردد رہا۔ اس لئے کہ معمولی آدمیوں کی بدتمیزی وہ بالعموم نظر انداز کر دیتے ہیں لیکن کسی بڑے آدمی سے ذرا بھی کوئی ناروا حرکت سرزد ہو جائے تو جگر صاحب بغیر کچھ کہے یا کئے نہ رہیں گے۔ چاہے اس کا انجام کچھ ہی ہو۔ بھوپال کے نوابزادہ رشید الظفر صاحب زمانۂ طالب علمی سے جگر صاحب کی بڑی عزت کرتے ہیں۔ ایک زمانہ میں انھوں نے جگر صاحب کا وظیفہ مقرر کر دیا تھا۔ اور کسی طرح کی کوئی پابندی نہیں عائد کی تھی کہ وہ کیا کریں یا کہاں رہیں۔ اس زمانہ میں والیان ریاست میں سے اکثر یہ چاہتے تھے کہ جگر صاحب ان سے وابستہ ہو جائیں۔ ان میں سے ایک جو بہت بڑی ریاست کے چشم و چراغ تھے اس کے درپے ہوئے کہ جگر صاحب حسن معاوضہ اور شرط پر چاہیں ان

بچے جو علیمین شامل ہو جائیں۔ طرح طرح سے ڈورے ڈالے گئے۔ جگر صاحب کی مالی حالت خراب تھی۔ بھوپال کے وظیفہ سے بس بسر اوقات ہو جاتی تھی۔ جگر صاحب اس آفر کو خوش اسلوبی سے ٹالتے رہے۔ ایک دن ایسا اتفاق ہوا کہ رئیس نے جگر صاحب سے برملا اپنی خواہش کا اظہار کر دیا۔ جگر صاحب نے بات ٹالنی چاہی، لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ اصرار بڑھا اور اصرار میں کچھ رنگ امارت کا بھی جھلکا۔ جگر صاحب بے قابو ہو گئے۔ بولے "جناب آپ مجھے داموں خریدنا چاہتے ہیں۔ میں تو رشید الظفر خان کے ہاتھوں بک چکا ہوں!" حاضرین سناٹے میں آ گئے اور جگر صاحب گھر آ گئے۔

جگر صاحب میں مروت اور وضعداری بہت ہے۔ جس سے رسم و راہ ہو جائے اس کے لئے وہ تمام آداب برتتے ہیں جو شریفوں میں قدیم سے چلے آتے ہیں۔ اس سلسلہ میں انھوں نے بڑے دھوکے کھائے اور نقصان اٹھائے۔ جگر صاحب کا شمار کھانے پینے لوگوں میں نہیں ہے۔ مدتوں بڑی تنگی ترشی سے بسر ہوئی ہے۔ اب بھی خرچ آمدنی سے بہت زیادہ ہے لیکن انھوں نے اپنی تنگدستی کا اظہار کبھی کسی سے نہیں کیا۔ مہمان کا خیر مقدم اس طرح کرتے ہیں جیسے ان کے گھر خیر و برکت کا نزول ہو رہا ہو۔ تکریم و تواضع میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھتے۔ کپڑے اچھے پہنتے ہیں۔ سامان قیمتی رکھتے ہیں جس کو ہمیشہ کوئی نہ کوئی مانگ لیتا ہے یا چرا لیتا ہے ورنہ خود کہیں کھو آتے ہیں!

جگر صاحب جب کبھی میرے ہاں آئے میں نے یہ سوال کیا "جگر صاحب سفر میں کیا کھو آئے؟" اور تقریباً ہمیشہ یہی معلوم ہوا کہ کچھ نہ کچھ کہیں نہ کہیں چھوڑ آئے۔ ایک دفعہ مشاعرہ میں جو کچھ ملا تھا اسے جیب میں رکھ لیا تھا۔ جن کے ہاں ٹھہرے تھے انھوں نے جگر صاحب کی دیکھ بھال کے لئے اپنے کسی عزیز کو مقرر کر دیا تھا۔ انھوں نے جگر صاحب کی بڑی خدمت کی، ہر وقت موجود رہتے اور اظہار عقیدت کرتے۔ جگر صاحب کو غافل سمجھ کر انھوں نے سارے روپے نکال لئے۔ جگر صاحب کہتے تھے کہ وہ یہ سب دیکھ رہے تھے لیکن چپ رہے۔ میں نے پوچھا کیوں؟ بولے "یہ واقعہ ایسے وقت ہوا جب میں جانے کے قیام سے رخصت ہو کر اسٹیشن آ رہا تھا۔ بہت سے لوگ موجود تھے۔ کچھ اچھا نہ معلوم ہوا کہ وہاں اس چوری کا اعلان کروں اور کسی شریف آدمی کو رسوا کر دوں"۔

جگر صاحب جس کے مہمان ہوتے ہیں اس پر بہت کچھ اپنا ہی صرف کر دیتے ہیں۔ میں نے غصہ میں ان کو آپے سے باہر ہوتے نہ دیکھا، حکم چلاتے نہ پایا۔ اپنی بڑائی کبھی ان کی زبان پر نہ آئی دوسروں کے عیب انھوں نے کبھی نہیں ڈھونڈے نہ کبھی ان کی تشہیر کی۔ ایسے لوگ کم ہیں جو اپنی بڑائی جتانے کے لئے ایسا نہ کرتے ہوں! جگر صاحب کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ عام شعرا کی مانند اس تاک میں نہیں رہتے کہ کوئی غریب اور شریف مل جائے تو اپنے اشعار سنا سنا کر اسے ادھ موا کر دیں!

جگر صاحب کو معصوم بچوں سے کھیلتے ہوئے کم لوگوں نے دیکھا ہوگا۔ بالخصوص ایسے حال میں کہ جگر صاحب کو نہ معلوم ہو کہ انھیں کوئی دیکھ رہا ہے۔ بچے سے کہیں زیادہ معصوم وہ خود نظر آتے ہیں۔ وہ اتنے خوش اور شگفتہ معلوم ہوں گے جیسے ان کے سر پہ آسمان نہ ہو۔ جگر صاحب کا چہرہ بشرہ ایسا نہیں ہے کہ کوئی بچہ ان کے سامنے بے تکلف ہو سکے۔ اس کی کمی جگر صاحب طرح طرح سے پوری کرتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو بچہ کا کھلونا بنا دیتے ہیں۔ ایسا کھلونا جس کو بچہ نہ کھیلے تو کھلونا خود کھیلنے لگے۔ وہ بچوں سے مصافحہ معانقہ یا چوما چاٹی نہیں کرتے نہ دعائیں دیتے ہیں نہ تلقین کرتے ہیں۔ نہ آئندہ ملک و ملت کی خدمت یا خواری کے لئے تیار کرتے ہیں۔ وہ اس کے سامنے اپنی شاعری بھول جاتے ہیں، اپنی عمر، صحت، حلیہ، زبوں حالی سب فراموش کر دیتے ہیں۔ بس طرح طرح سے خوش ہوتے ہیں اور بچہ کو خوش کرنا چاہتے ہیں۔ بچے خدا کا مصرعہ طرح ہوتے ہیں جن پر خدا طرح طرح سے طبع آزمائی کرتا ہے!

میں نے بعض مشہور مستند اور عمر رسیدہ شعرا کو دیکھا ہے جو دوسرے شاعر کی برائی بیان کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ مشاعرہ میں شاعر اپنا کلام سنا

وہاں ہے اور یہ بیٹھے اس پر بازاری فقرے چست کر رہے ہیں اور آس پاس کے نالائقوں سے اپنی اس خفیف الحرکتی کی داد لیتے جا رہے ہیں - اس طرح کی بے ہودگی کسی اور میں ہو تو ہو مشاعرہ میں ہرگز نہ ہونی چاہیئے۔

اس طرح کی حرکت شاعری نہیں کرتے وہ لوگ بھی کرتے ہیں جو شعر و ادب کے پارکھ سمجھے جاتے ہیں اور جنھوں نے عمر کا بیشتر حصہ شعر و ادب کی خدمت میں گزارا ہے ۔ بس یہ گوارا نہیں کہ اُن کے ہوتے دوسرا کیوں !

بعض شعراً ، بعض اشعار اور بعض مواقع ضرور ایسے ہوتے ہیں جب پھبتی یا فقرے بے اختیار زبان پر آجاتے ہیں ۔ اسے دنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکتی ۔ یہ فقرے اور پھبتی کبھی کبھی وہ مزا دے جاتے ہیں جو اچھے اچھے اشعار نہیں دے پاتے لیکن اس طرح کے فقرے اور پھبتی کہنے کا حق مشاعرہ میں سامعین کو حاصل ہے خود شعرا کو نہیں ۔

مشاعروں میں اب یہ بات عام ہو گئی ہے بالخصوص دہلی کے پبلک مشاعروں میں ۔ آج کل شاید ہی کوئی اور تقریب ایسی ہوتی ہو جہاں بے ہودگی اور آبرو ریزی کے ایسے مناظر دیکھے جاتے ہوں جیسے دلّی کے اس طرح کے مشاعروں میں ۔ عام مجمع میں جہاں شریف خواتین ، ذمہ دار حکام ، پیشوایانِ ملک و قوم ، غیر ممالک کے اکابر ، ناسمجھ لڑکے لڑکیاں موجود ہوں وہاں شعرا کا جو قوم کا ناموس ہوتے ہیں فخریہ اور علانیہ شراب پی پی کر اس طرح کی نالائقی دکھانا بڑے رنج اور شرم کی بات ہے ۔

مجھے تو کبھی کبھی اس کا اندیشہ ہونے لگتا ہے کہ شاید وہ دن بھی دور نہیں جب دلّی کا کوئی منچلا سرمایہ دار شاعروں کی کوئی سرکس کمپنی بنائے اور امریکن فری اسٹائل میں ان کے کرتب اور کرتوت شہر شہر دکھاتا پھرے !

خلوت ہو یا جلوت جگر صاحب کو میں نے ساتھی شعرا کے کلام پر کبھی حاشیہ آرائی کرتے نہیں پایا ۔ مشاعرہ میں اُن کی طرح سنجیدہ اور خاموش بیٹھنے والا شاعر شاید ہی کوئی اور ہو ۔ اُن کی زبان سے کوئی فقرہ کبھی نکلے گا بھی تو تحسین اور ہمت افزائی کا ۔ یہاں مجھے ثاقب اور صفی مرحومین بے اختیار یاد آتے ہیں ۔ لکھنؤ کے یہ باکمال شعرا مشاعرہ میں جس ادب و احترام سے بیٹھتے اور مناسب مواقع پر تحسین کے کلمات جس شریفانہ انداز سے کہتے وہ اب کہیں نہیں نظر آتا ۔

یہ مشاعرہ میں شروع سے آخر تک دو زانو نیچی نظر کئے ہوئے بیٹھے رہتے خواہ مشاعرہ کتنی ہی دیر میں کیوں نہ ختم ہوتا ۔ کبھی چائے ، پان یا پانی کی فرمائش نہ کرتے ۔ کوئی پیش کر دیتا تو بڑی فروتنی سے قبول کر لیتے یا عذر کر دیتے ۔ ان لوگوں نے ایسے مشاعروں میں بھی شرکت کی جہاں مخالف کیمپ کے شعرا اور اُن کے حمایتی موجود ہوتے اور اس کا اندیشہ رہتا کہ کہیں کوئی ناملائم فقرہ نہ کہہ دے لیکن آج تک کوئی ناگواری پیش نہ آئی ۔ مخالفین کا کلام یہ دونوں بڑے شوق اور شائستگی سے سنتے اور داد دیتے تھے ۔

ثاقب صاحب کو علی گڑھ سے بڑی اُلفت تھی ۔ کوئی بڑی ہی مجبوری ہوتی تو خیر ورنہ یہاں کے مشاعروں میں ضرور شرکت کرتے ۔ میری طالب علمی کا زمانہ تھا ، ثاقب صاحب [illegible] کی بارک کے ایک کمرہ میں ٹھہرے ہوئے تھے ۔ دن بھر کا سفر کر کے آئے تھے ۔ طبیعت ناساز تھی ، رات کو مشاعرہ تھا ۔ میں نے عرض کیا آپ آرام فرما لیں وقت آنے پر میں حاضر ہو جاؤں گا اور آپ کو لے چلوں گا ۔ فرمایا " میاں نہیں ، یہ آدابِ مشاعرہ کے خلاف ہے کہ جب جس کا جی چاہے آجائے اور جب جی چاہے چلا جائے ۔ میں آپ کے ساتھ ابھی چلتا ہوں "

اس مشاعرہ میں ثاقب صاحب کے دو اشعار علی گڑھ میں بہت مقبول ہوئے ۔ جیسے آج کل رات کو سینما ہوا اور صبح اس کے مقبول فلمی گانے یا دُھنیں بچّہ بچّہ کی زبان پر آگئیں ۔ اُس زمانے میں علی گڑھ کے مشاعروں کا یہی حال تھا ، اچھے اشعار ہر چھوٹے بڑے کی زبان پر رواں ہو جاتے تھے ، ثاقب صاحب کے وہ دو اشعار یہ تھے ۔ ؎

باغباں نے آگ دی جب آشیانہ کو مرے   جن پہ تکیہ تھا وہی پتّے ہوا دینے لگے !

ہے روشنی قفس میں مگر سوجھتا نہیں   ابرِ سیاہ جانب کہسار دیکھ کر!

جگر صاحب میرے ہاں تشریف لاتے ہیں تو چند باتوں کا میں خاص طور پر خیال رکھتا ہوں۔

اوّل یہ کہ جگر صاحب کی صحت اچھی نہ ہوگی۔ اس لئے اپنے عزیز ترین ڈاکٹروں کو بلواتا ہوں جو ان کا کمل معائنہ کرتے ہیں۔ وہ دوا اور غذا تجویز کریں گے، پرہیز بتائیں گے اور دوسرے مشورے دیں گے۔ میں ان سب پر جگر صاحب سے عمل کراؤں گا۔

دوسرے یہ کہ جگر صاحب معلوم نہیں کہاں کہاں کا اور کتنے دنوں کا چکر لگاتے ہوئے آتے ہیں۔ ان کے ساتھ میلے کپڑے چادر غلاف تولئے کا انبار ہوتا ہے۔ دھوبی بلوا کر یہ کپڑے اس کے حوالہ کر دوں گا۔

تیسرے یہ کہ جگر صاحب کا خط بڑھا ہوگا۔ اس کے لئے نائی بلاؤں گا تاکہ وہ جگر صاحب کو نوک پلک سے درست کر دے۔

چوتھے یہ کہ اس بات کا انتظام کروں گا کہ جگر صاحب کے عشاق ان کو علی گڑھ میں گھیٹنے نہ پھریں۔ اور میرے ہاں نہ اپنا کلام ان کو سنائیں نہ ان کا کلام خود سنیں۔

پانچویں یہ کہ جگر صاحب کے پاس جو نقدی ہوتی ہے اسے ضبط کر لیتا ہوں تاکہ وہ علی گڑھ میں روپے اس طرح نہ خرچ کریں جس طرح بعض حکومتیں دوسری حکومتوں پر خرچ کرتی ہیں۔

چھٹے یہ کہ جگر صاحب رخصت ہونے لگتے ہیں تو میں خدا حافظ کہنے کے لئے نہیں موجود ہوتا اس لئے کہ جگر صاحب کچھ اس گداز قلب کے ساتھ رخصت ہوتے ہیں جیسے نہ ان کو میری زندگی کا بھروسہ ہے نہ اپنی زندگی کا اور اس طرح سے رخصت ہونا یا رخصت کرنا میرے بس کی بات نہیں!

ابوالاثر حفیظ جالندھری

عزیز ملک

یہ ہے ہمارے شعر و ادب کا اُمّی سخنور ـــــ ابوالاثر حفیظ ـــــ سوکھا سا اکہرا بدن، لیکن طبعاً سخت جان و سخت گیر اور نسلی اعتبار سے اچھوتی صفات کا مکمل نمونہ ـــــ

وہ اس صدی کے ابتدائی سال یعنی سنہ ۱۹۰۰ء میں ۱۴ جنوری کو جالندھر میں پیدا ہوا تھا۔ اس کا گھرانا متوسط حال، معزز اور متدین افراد پر مشتمل تھا۔ والد مرحوم شمس الدین، حافظِ قرآن تھے اور فوج کو وردیاں مہیا کرنے کا دھندا کرتے تھے۔ حفیظ نے ہوش کی آنکھیں کھولیں تو مسجد میں پہلے قرآن مجید پڑھا۔ پھر مختلف مقامی اسکولوں میں مروجہ تعلیم حاصل کی لیکن بس اتنی کہ ساتویں جماعت سے بھاگ نکلا۔ کیونکہ اس کو نوعمری ہی میں شعر کی لگن لگ گئی تھی والدین نے اس شغل سے باز رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ مارا پیٹا بھی، لیکن شعر کی چاٹ ایک بار لگ جائے تو مشکل ہی سے چھوٹتی ہے۔ اس نے سرزنش کے باوجود شاعری کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا اور ایک راہ قائم کر کے اس پر مستعدی سے گامزن ہو گیا۔ اور ابھی تک اسی ڈگر پر رواں ہے۔ چلا جا رہا ہے مگر والہانہ ـــــ

کوئی چالیس برس اُدھر کی بات ہے جب وہ ادبی اُفق پر صبح کے ستارے کی طرح نمودار ہوا اور اس نے دیکھتے دیکھتے ہونہار باغبان کی طرح گلشنِ شعر کو خوش رنگ اور دلآویز کیاریوں سے سجا دیا اور پورے کمالِ فن کے ساتھ شاعری کو مصوری اور موسیقی میں سمو کر ایک انوکھے امتزاج کا رنگ بخشا اور اہلِ ذوق و ادب کے ذہن و ضمیر پر مسلط کر دیا۔ اس کی بھرپور قوتِ گویائی نے سب کی شہنائیاں گنگ کر دیں۔ گذشتہ ربع صدی کے عرصہ میں کتنی ہی شعر و سخن کی محفلیں ہوں گی جو اس نے اپنے سحرِ کلام کی بدولت اُلٹ کر رکھ دیں۔ وہ محفلیں جہاں سامعین اس کی جنبشِ لب کے منتظر رہا کرتے ہیں۔

اس نے شعر کے روایتی انداز سے ہٹ کر اپنا سفر اختیار کیا۔ غزل، گیت، ترانے، نغمے اور منظر پر نظموں میں نئے نئے تجربات کئے۔ یہ ساری تگ و دو دراصل اس کے باطنی اضطراب کی مظہر ہے جو اسے بالآخر شاہنامۂ اسلام کی منزل تک لے آئی۔ وہ خود کہتا ہے:

راہ پر آ ہی گئی گردشِ ایام آخر
ہو گیا روئے سفر سوئے مدینہ میرا

معجزہ جس نے نہ دیکھا ہو وہ مجھ کو دیکھے
کس طرح ڈوب کے اُبھرا ہے سفینہ میرا

لیکن اس مقام تک پہنچنے میں اسے کن کن مراحل سے گذرنا پڑا۔ یہ داستان بہت طولانی ہے۔ ربع صدی پہلے کی بات ہے جب وہ لاہور میں تانگہ پار اور ایک ایسی ادبی مشقت گاہ کا مزدور تھا جہاں شعر کا دامن گزوں سے ناپ کر اس کی مزدوری چکائی جاتی تھی۔ اور اسے معاش کی اُلجھنوں سے بہت کم فراغت نصیب ہوتی تھی ــــــ

اک طرف فکرِ سخن تھی، اک طرف فکرِ معاش،
اس تصادم سے ہوا تھا شیشۂ دل پاش پاش

یہی لیل و نہار تھے جب وہ ادبی مجلسوں میں اپنی دھاک بٹھا رہا تھا۔ مشاعروں میں بڑی واہ واہ ہوتی او۔ وہ بار بار پڑھوایا جاتا۔ یہ قصہ ہے جب کہ آتش جوان تھا (تقاضے تو اس عمر میں بھی اس کے تعاقب میں رہتے ہیں) ان مشاعروں میں پڑھ پڑھا کر جب وہ فن خانہ برآمد ہوتا تو اس کے جیب و داماں داد سے پُر ہوتے لیکن دام و درم سے یکسر خالی ـــــ داد سے نفس کی تشنگی سیراب ہو سکتی ہے، پیٹ کا دوزخ نہیں بھر سکتا۔ ایسے میں اس کے لئے مزدوری کرنے کے سوا کچھ چارا نہ ہوتا اور وہ لاہور میں اکثر شام کے بعد اپنے گھر سے کھدر کی فتوحی اور نیچے نیلا تہ بند باندھ کر نکلا کرتا اور ریلوے سٹیشن سے باہر قلیوں کے ساتھ باضابطہ مشقت میں شریک ہو جاتا ـــــ

ع دید کے قابل ہوا کرتے تھے میرے شاہکار

اس کی زندگی کے سونے کو کندن بن کر دمکنے میں ابھی بہت سی بھٹیوں سے گذرنا تھا اور اس کی غمزدہ ماں کے دل سے نکلی ہوئی اس دُعا کو بابِ قبول تک پہنچنے میں کچھ مہلت درکار تھی کہ "میرا بیٹا حفیظ ایک دن بہت بڑا آدمی بننے والا ہے۔"

اسی دور کے متصل ایک وقفہ آیا جب اس نے فکر و نظر کی تمام راہیں بند کر کے اندوہِ معاش سے بے نیاز ایک گوشے میں بیٹھ کر شاہنامہ اسلام کی پہلی جلد مکمل کر ڈالی اور اسے خود ہی شائع بھی کیا۔

پاکستان میں قومی شاعر کا مقام تو اسے اب حاصل ہوا ہے۔ ان دنوں بھی اس کی شخصیت شاعرِ اسلام کی حیثیت سے کس قدر مسلّم ہوتی جا رہی تھی۔ اس کا اندازہ ایک واقعہ سے ہو سکتا ہے۔

جس دن لاہور میں رسوائے عالم راجپال کو شانِ رسولؐ میں گستاخی کے بدلے قتل کیا گیا، حفیظ اسی شام کسی کام سے جالندھر جا رہا تھا۔ جب گاڑی امرتسر سٹیشن پر رُکی تو ہندو سکھوں کے مشتعل ہجوم نے ڈبوں میں اِدھر اُدھر جھانکنا شروع کیا۔ ایک مہاسبھائی نے حفیظ کو پہچان کر اپنے حلیفوں کو پکارا۔ "بھائیو اِدھر آؤ شکار مل گیا۔" یہ اشارہ اس امر کا تھا کہ ایک مشہور مسلمان تشدد کا نشانہ بن سکتا ہے بے دریغ چلے آؤ۔ چنانچہ بے شمار ہندو اور سکھ یمین و یسار سے اُمڈ آئے اور دربارِ رسالت کا مدح خواں بے طرح پیٹا جانے لگا۔ اس کی پیشانی پر شدید زخم آیا۔ یہ سب کچھ اتنی عجلت میں ہوا کہ دوسرے ہم سفروں کی سمجھ میں بھی نہ آیا کہ کیا ہوا ہے اور کیوں ہوا ہے۔ اس ضربتِ کاری کا نشان حُبِّ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سند بن کر آج بھی اس کی پیشانی میں جگمگا رہا ہے گویا ؎

حفیظ بے نوا بھی ہے گدائے کوچۂ الفت
عقیدت کی جبیں تیری مروت سے ہے نورانی

یہی وہ دور تھا جب مشاعروں کے علاوہ ملک بھر کے طول و عرض کے ہر چھوٹے بڑے مذہبی جلسے میں اس کی شرکت ضروری سمجھی جانے لگی تھی اور لوگ گھنٹوں ان بزم آرائیوں میں مسلسل مسحور اور گوش بر آواز رہتے تھے۔ رفتہ رفتہ اس کی شہرت نزدیک و دور پہنچنے لگی اور وہ دیس مقبولیت

حاصل کرتا گیا ――

عرصہ ہوا بنارس میں 'مسلم ایجوکیشنل کانفرنس' کے اجلاس میں کوئی اختلافی مسئلہ نزاع کا سبب بن گیا اور ہنگامہ برپا ہوگیا۔ پنڈال کی فضا میں گنڈاسوں کے لٹھ لہرانے لگے۔ اس شوریدہ ہنگام کو بہت سے نعت خوانوں اور مقرروں نے قابو میں لانے کی کوشش کی لیکن بے سود جب یہ جوش وخروش کسی عنوان تھمنے میں نہ آیا تو نواب صدر یار جنگ بہادر، بابا خلیل داس چترویدی اور حبیب الرحمٰن خان شیروانی نے ملتجی نظروں سے حفیظ کو دیکھا کہ اگر کچھ کر سکو تو کرو۔ اس وقت تا حدِ نظر انسانوں کا ہجوم ہلڑ مچا رہا تھا۔ لیکن اس قبیل کی بیرنگیوں میں نیرنگ کا اعجاز دکھانا حفیظ کے کلام کا ادنیٰ کرشمہ ہے۔ وہ اُٹھا۔ ادھر فضا میں "سلام اے آمنہؓ کے لال اے محبوبِ سبحانی" کی صدا گونجی اُدھر پنڈال میں سکوت کا عالم طاری ہوگیا اور لوگ آرام سے بیٹھ گئے ―― سر راس مسعود نے جو اس کانفرنس کے منتخب صدر تھے بڑھ کر حفیظ کی پیشانی چوم لی اور بغل گیر کرتے ہوئے کہا۔ "حفیظ یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں۔ یہ منظر تو معجزاتِ نبوی کا بقیہ معلوم ہوتا ہے"۔ یہ اس کے لحنِ داؤدی کا کرشمہ ہے یا شاید اس کے سخن کا بین السطور تاثر ―― بہر حال کوئی شعبدہ ضرور ہے جس کا فیصلہ وقت کرے گا۔ یہ موقعہ اس تفصیل کا نہیں ہے۔ اس مضمون میں مجھے صرف اس کی شخصیت پر کچھ عرض کرنا ہے۔ یہ میں کسی اندیشۂ تردید کے بغیر کہہ سکتا ہوں کہ ہمارے ملک میں اور بھارت کے مسلمانوں میں جہاں کہیں وہ آباد ہیں اور اردو وہاں بولی اور سمجھی جاتی ہے حفیظ ہی ایسا زندہ شاعر ہے جس کو مرد، عورتیں اور بچے کسی نہ کسی طرح پہچانتے ہیں اور اس امر میں خواص و عوام کی تخصیص نہیں ہے۔ پردہ دار گھروں میں تلاوتِ قرآن مجید کے بعد شاہنامۂ اسلام کا ورد ہوتا ہے اور بوڑھے، بچے، جوان سب کے سب حفیظ کے لئے دعائیں کہتے ہیں۔ کسی شاعر کو اپنی زندگی میں اس رنگ سے قبولیت نصیب نہیں ہوئی۔ اس کے علاوہ حفیظ کو یہ خصوصیت بھی حاصل ہے کہ لوگ اسے ذاتی طور پر جانتے ہیں۔ وہ اس قدر ہر دلعزیزی حاصل کر چکا ہے کہ جدھر سے بھی گذر جاتا ہے اس پر انگلیاں اٹھائی جاتی ہیں۔ راہ گیر آتے ایک نظر دیکھنے کے لئے ٹھہر جاتے ہیں اور بعض عقیدت مند آگے بڑھ کر مصافحہ اور معانقہ بھی کر لیتے ہیں۔ اس لحاظ سے بھی عصرِ حاضر کے کسی شاعر کو یہ سعادت میسّر نہیں کہ اس کا کلام بیک وقت واعظوں، نعت خوانوں اور سیاسی لیڈروں کی زبانوں پر ہو۔ ریڈیو پر اس کے زمزمے رات دن انگڑائیاں لیں۔ طلبا مدرسوں میں اسے پڑھتے ہوں اور اس کا کلام گداگروں تک کے لئے کشکول کا کام دے ―― یہ اور بات ہے کہ ابھی تک شہروں میں اس کے جلوس نہیں نکالے گئے۔ اگرچہ کبھی کبھی اس کا دل چاہتا تو ہوگا کہ اسے بھی پھولوں کے ہار پہنائے جائیں۔ کیونکہ اس نے بھی بڑے بڑے معرکے جیتے ہیں۔

اس میں کلام نہیں کہ وہ فطرتاً عوامی شاعر ہے اور ابتدا ہی سے عوامی احساس اس کے قلب و نظر کا موضوع رہا ہے اور اب بھی ہے لیکن میں کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ شعر کہتے کہتے ڈپٹی کلکٹر ہو جانا روایات میں سننے آئے تھے مگر حفیظ نے محض اپنی شاعرانہ شخصیت کے سبب اس سے اونچے معیار کے عہدوں کو پالیا اور یوں اس کا دائرۂ اثر عوام سے گذر کر طبقۂ خواص تک بھی پہنچ گیا۔ وہ کسی احساسِ کمتری کے بغیر جس وقت چاہے اکابرِ سیاست و تدبیر، اہلِ شمشیر اور عمائدینِ سلطنت سے بلا روک ٹوک مل لیتا ہے۔ اس کے باوصف کہ طبقاتی کشمکش میں وہ عوام کا رہنما ہے۔ اونچے طبقہ میں بھی اس کی شخصیت بڑی محبوب ہے۔ مئی ۱۹۵۰ء میں اس کے جشنِ پنجاہ سالگی کے موقعہ پر اونچے طبقہ کے بیشتر افراد نے دستِ تعاون بڑھا کر اس کی واقعی عظمت کا اعتراف کیا تھا۔

غالباً اسی غیر معمولی ہر دلعزیزی کی وجہ سے وہ ہم عصر شعرا میں معتوب ہے اور اس کی شخصیت ہر گام پر ملامت کا نشانہ بنائی جاتی ہے تنقید کا مفہوم حسد اور غیبت سے ورا ہے۔ لیکن چند ہم عصر بزرگ جہاں بھی باہم مل بیٹھتے ہیں حفیظ کی ذات گفتگو کا موضوع بن جاتی ہے۔ شاید وہ اپنے ہم پیشہ بھائیوں کے ذہن و ضمیر پر کابوس کی طرح سوار ہے۔ کبھی تو کوئی مدعی بھری محفل میں اس کا منہ چڑانے کے لئے مسخرہ بن کر نے اور سوانگ بھرنے پر اُتر آتا ہے تو ہم یہ سمجھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ اختلاف کی صورت میں تضحیک کا پہلو نکال لانا اعترافِ شکست نہیں تو کیا ہے۔

لیکن یہ اپنے اپنے ظرف کی بات ہے حفیظ دشمنی کی کیفیت اور کمیت کا پیمانہ تھوڑے بہت امتیاز کے ساتھ ہم عصر شعرا میں ہر جگہ پایا جاتا ہے۔ مگر ان لوگوں کی بھی کمی نہیں جو اس کے مقام کو سمجھتے ہیں۔ گذشتہ مارچ میں جب بیگم حفیظ کا انتقال ہوا تو بھارتی اخبارات میں خود حفیظ کی اپنی رحلت کی غلط خبر شائع ہو گئی۔ اس دن حضرت جوش ملیح آبادی جالندھر آئے ہوئے تھے۔ خبر پڑھی تو بے حد ملول ہوئے اور دیر تک حفیظ کو یاد کر کے زار زار روتے رہے اور احباب کے ہمراہ اس مکان کو بھی دیکھنے گئے جہاں حفیظ جالندھر میں رہا کرتا تھا۔

ہم عصر شعراء کے علاوہ بعض دوسرے لوگ بھی ہیں جن کا کام شب و روز مخالفت کی آگ میں جلنا ہے۔ ان حضرات نے حفیظ سے مخاصمت کا کوئی نہ کوئی فرضی عنوان پیدا کر لیا ہے اور قلعہ بند ہو کر تیر آزمائی میں مصروف ہیں اور موقع ملے تو اس پر رکیک تریں حملے کرنے سے بھی نہیں چوکتے۔ لیکن ایسے موقعوں پر حفیظ کی عالی ظرفی اور فراخ حوصلگی اپنے عروج پر ہوتی ہے۔ بہت دنوں کی بات ہے۔ ایک شام میں حفیظ کے ساتھ سیر میں شریک تھا۔ اس دن ایک کم نہاد شخص نے کسی معاملہ میں صریح بدزبانی کے علاوہ گالی گلوچ بھی کی تھی۔ دوران گفتگو میں میں نے اس شخص سے انتقام لینے کی ایک تجویز کا ذکر کیا۔ حفیظ نے میری طرف دیکھا اور کہا "عزیز! بھلائی کرنا سیکھو۔ کینہ پروری شیوۂ مردانگی نہیں ہے"

حفیظ کی شخصیت کا ایک اور پہلو اس کے داخلی افکار ہیں۔ لوگوں نے اسے ادبی اور مذہبی اجتماعات میں صرف نظمیں پڑھتے، لطیفے اور چٹکلے کہتے سنا ہے۔ وہ اپنے سیلاب میں بالعموم سب کو بہائے جاتا ہے۔ لوگ واہ واہ کہتے اور مسحور ہوتے ہیں۔ لیکن کوئی نہیں جانتا کہ اس کے قلب و روح پر کیا بیت رہی ہے۔ بعض مادی آسائشوں کے باوجود اس کی داخلی زندگی مصائب، درد و کرب اور پریشان حالی کا مرقع ہے۔ وہ اس بھری دنیا میں تنہا ہے اور ابتدا سے تنہا ہی چلتا رہا ہے۔ ایک بڑے کنبے کا وہ کفیل ہے۔ اس کے خاندان کے مرد افراد لقمۂ اجل ہو چکے۔ سب سے بڑی ضرب اس پر تقسیم کے وقت پڑی ہے کہ جب اس کے کنبے کے ارکان میں سے ذکور قتل کر ڈالے گئے۔ خود اس کے کوئی اولاد نرینہ نہیں ہے۔ اس کی ایک بیٹی صرع جیسے عسیر العلاج مرض میں گذشتہ کئی برس سے مبتلا ہے۔ اس کے اپنے نصیبوں میں بھی روگ کا بجوگ پڑا ہے اور وہ مستقل بے خوابی، تبخیر اور امراض معدہ کے علاوہ بعض روحانی آلام کا بھی شکار ہے۔ لیکن وہ بیماریوں اور افکار پر قابو پانے، اپنی پریشانیوں کو دل ہی دل میں سمیٹ لینے کی پوری قدرت رکھتا ہے اور اپنی بے پناہ قوتِ ارادی کے بل پر روزمرّہ کے التزام میں فرق نہیں آنے دیتا۔ وہ اپنے بیماروں کا تیمار دار ہے، مطالعہ بھی کرتا ہے، فکرِ سخن کے لئے بھی وقت نکال لیتا ہے اور مشاعرے بھی پڑھتا ہے۔ اپنی کتابوں کا آپ ہی ناشر ہے۔ بعض ان ایماندار کتب فروشوں سے مقدمات بھی لڑتا ہے جو اس کی مصروفیات سے فائدہ اٹھا کر اس کی کتابیں چوری چھپے چھاپ لیتے ہیں اور کھلے بندوں بیچتے ہیں۔ ملک و ملت کو اس کی خدمات درکار ہوں تو وہ ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک مہینوں طوفانی دورے پر رہتا ہے۔ اجتماعات کو شب و روز خطاب کرتا پھرتا ہے۔ شاید اس کے پاؤں میں حلقہ پڑا ہے کہ

ع مانعِ دشت نوردی کوئی تدبیر نہیں

وہ اپنے مستقر میں ہو تو دن رات دوستوں اور ملنے والوں کا ہجوم رہتا ہے۔ عقیدت مند، اغراض کے بندے، اثر و رسوخ سے فائدہ اٹھانے والے، سفارش کے طالب، مشاعرہ باز، اخباروں اور رسائل کے نمائندے۔ ہر قسم کے لوگ اس سے ملنے آتے ہیں۔ گھر کے ایک مختصر سے کمرے میں اس کی فرشی نشست رہتی ہے۔ ملنے جلنے والے قریب ہی کرسیوں یا فرش پر اس کے ساتھ بیٹھے ہوتے ہیں۔ بھانت بھانت کی باتیں ہوتی ہیں، شعر و سخن سے سیاست اور دیر سے حرم تک سبھی قسم کی باتیں — کسی دن فکرِ سخن کا موقعہ ہو جاتا ہے تو دن بھر اسی خیال میں مگن رہتا ہے۔ شعر کے معاملہ میں اس سے زیادہ محتاط کوئی دوسرا نہ ہوگا۔ وہ عروسِ سخن کو سنوارنے اور نکھارنے میں بے حد محنت کا قائل ہے اور فن کو صرف الہام تک محدود نہیں سمجھتا۔ کسی دن قرآن مجید کی تلاوت کرتا ہے تو سحر سے شام کر دیتا ہے۔ پڑھتا اور فکر و تدبر کرتا ہے۔ ہفتہ میں ایک یا کبھی دو بار خطوط کا جواب لکھنے کی نوبت آجاتی ہے تو ایسے خطوط کا انبار کھل جاتا ہے۔ وہ یکے بعد دیگرے قلم برداشتہ جواب لکھتا جاتا ہے۔ ایک دن میں نے کہا، آپ

خطوط کے جواب میں بالکل اہتمام نہیں برتتے، حالانکہ خطوط بھی ادبی سرمایہ بن سکتے ہیں۔ جواب میں کہا "تم یہ چاہتے ہو کہ میں بھی تصنع سے کام لوں اور خطوط کو عبارت آرائی کی نذر کر دوں"۔

بالعموم عصر کے بعد سیر کے لئے نکلتا ہے اکثر پیدل اور شاذ و نادر موٹر پر، کوئی دوست بھی ہمراہ ہوتا ہے لمبی سیر اس کا محبوب مشغلہ ہے۔ چلنا چلنا چلتے جانا، اثنائے راہ کسی ریستوران میں لسی یا شربت پینے کے لئے ٹھہر جاتا ہے اور کبھی سر بازار چاٹ، دہی پکوڑے وغیرہ کھانے کے لئے کھڑا ہو جاتا ہے اور اسے معیوب نہیں سمجھتا۔

سیر سے واپسی پر ناشپاتی، مزوری اور نواسوں کے لئے ایک آدھ کھلونا ضرور خریدے گا اور رشتہ داروں سے ملاقات کرتا ہوا نکلے گا۔ دوستوں کے گھروں پر دستک دینا اور ان کی خیریت پوچھنا اس کے مذہب میں داخل ہے۔ اگرچہ اس کے دوستوں کا حلقہ دن بدن بے حد مختصر ہوتا جا رہا ہے، تاہم ان میں سے ہر ایک اس کو عزیز ہے۔ زبانی ہی زبانی نہیں بلکہ کسی ضرورت مند دوست کی دامے درمے مدد بھی کر دیتا ہے۔ اس عمل سے بڑھے کے ساتھ اس کی روح بھی سبک ہو جاتی ہے۔ اس مسرت کی وجہ سے جو نیکی کا حسین ثمر ہے، یہ نوازشیں کم و بیش اس نے اپنے ان تمام کرم فرماؤں سے کی ہیں جو آج اس کی جان کے لاگو بنے ہوئے ہیں ؎

صبح دم اپنی اپنی راہ لگے — شمع کے جاں نثار پروانے

یہ عجیب اتفاق ہے کہ جس حریف بے زبان کو وہ لذت گفتار سے آشنا کرتا ہے، اسی کے قلم کی خنجر آزمائی سے اس کی اپنی ذات محفوظ نہیں رہتی لیکن جب سانپ اسے ڈس جاتا ہے تو وہ یہ کہہ کر خاموش ہو جاتا ہے ؎

نہیں عتابِ زمانہ خطاب کے قابل — ترا جواب یہی ہے کہ مسکرائے جا

اس کی زبان پر بہر عنوان دوستوں کا ذکر رہتا ہے۔ لیکن دشمنوں کے بہم کچوکے کھانے کے باوجود وہ کوئی جملہ برسبیل شکایت بھی نوک زبان پر نہیں لاتا۔

طبعاً اس کی نس نس میں شرارے بھرے ہوئے ہیں۔ اس کا ہیولیٰ طنز کے خمیر سے تیار ہوا ہے۔ اس کے کلام سے قطع نظر صرف اس کا وجود بھی سوسائٹی پر کامیاب طنز معلوم ہوتا ہے۔ چونکہ وہ ماحول کے تاثرات سے الگ ہو کر نہیں سوچتا اور نہ کچھ کہتا ہے۔ اس لئے اس کی آواز میں عوام کا درد اور چیخ و پکار برابر سنائی دیتی ہے اور اب تو دن بدن اس کے طنز کے نشتروں کا گھاؤ پہلے سے زیادہ گہرا ہوتا جا رہا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ جن تلخیوں کو اس نے عمر بھر جرعہ جرعہ پیا ہے اب دریا دریا بہہ نکلی ہیں۔ اس کی تند و تیز گفتگو جس میں اس کی بے پناہ جرأت اور بے باکی بھی شامل ہے مئے دو آتشہ کی مثال ہے اور اپنا مثالی مقام رکھتی ہے۔ وہ جب اپنی کہنے پر آتا ہے تو بے نیاز نتائج ہو کر کہہ جاتا ہے۔ ایسے موقعوں پر وہ سر کو والہانہ جنبش دے کر سیدھے ہاتھ کی انگشت شہادت کو ہوا میں لہراتے ہوئے عینک کے گوشے سے سامعین پر معنی خیز نظر ڈالتا ہے اور ایسا تیر مارتا ہے کہ ہائے ہائے ——!

طنز کا تلخ آب (اگرچہ تلخابۂ شیریں ہی ہو) اس کی زندگی کے دھارے سے یوں گھل مل رہا ہے کہ وہ کوشش کے باوصف طبیعت کی فطری افتاد پر قابو نہیں پا سکتا۔ اسے غصہ آتا ہے تو آتا چلا جاتا ہے۔ ایسے میں اکثر و بیشتر اپنے دوستوں اور گھر والوں پر بھی گرجتا برستا ہے۔ لیکن سب جانتے ہیں کہ اس کی یہ کیفیت وقتی و آنی ہے اور اس کے بعد پھر وہی ادائے محبوبی!

بارہا ایسا ہوا ہے کہ وہ دوستوں سے محوِ کلام ہے۔ دفعتاً اس کے خیال کے پردوں پر کوئی اندوہگیں یاد پری بن کر جھلملائے گی اور اس کے ہونٹوں پر پھیلا ہوا تبسم یک بارگی دم توڑ دے گا۔ افسردگی اس کے چہرے پر پارہ پارہ ہو کر بکھر جائے گی اور اس کی تیز بیں نگاہیں دور بہت دور فضا کی پہنائیوں میں تیرنے لگیں گی۔ پھر وہ جب داخلی ہیجان کے تلاطم سے ابھرے گا تو کوئی شعر یا نغمہ اس کے لبوں پر تھرتھراتا ہوگا ؎

اے مرے آقا مبرہ از خطا تو ہے کہیں — بخش دینا کام کس کا ہے خدا تو ہے کہیں

منزلِ مقصد نہیں ملتی تو اب میں کیا کروں   راہ تیری ہے کہ میری راہنما تو ہے کہ میں

کرب کو کم کرنے کے لئے وہ ہمیشہ نغمات کی شیریں اثری سے کام لیتا ہے۔ عرصہ ہوا ایک رات شانے کے درد سے بیتاب ہو کر اس نے ہسپتال کی فضا میں گیتوں کا رس بکھیر کر اپنے ساتھ وارڈ کے دوسرے مریضوں کو بھی بیدار کر دیا تھا۔ لیکن اس حال میں اس کی نوا تلخ نہیں ہوتی بلکہ اس کے گیتوں میں ایمان کی حلاوت نظر آتی ہے۔ مثلاً ——

راہ میں حائل کوہِ سینا   جس کی چوٹی پہلا زینہ
دل آئینہ ہے تو تجھ پہ   جھلکیں گے انوارِ مدینہ
تجلیوں میں مستور   مسافر —— تیری منزل دور

یا وہ وارداتِ قلب ہوتے ہیں جن کی جھلکیں اس کے سارے ملی کلام میں موجود ہیں۔ جس کا مقصود اس کے سوا کچھ نہیں کہ بمصطفٰے برساں خویش را۔ اسی جذبے کے تحت وہ چھپ چھپ کر نمازیں بھی پڑھ لیتا ہے اور اس کی سحر خیزی میں اوراد و وظائف کی ہم آہنگی بھی شامل ہے۔

[illegible]

[illegible]

(٨)

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

اگرچہ ہماری والدہ کے عزیز و اقارب سب مر چکے تھے۔ شوہر کا سایہ بھی سر پہ باقی نہیں رہا تھا۔ سب بچے جا کر ہم اکیلے رہ گئے تھے۔ مگر نہ معلوم ہماری ان اتی جان میں تعلیم کا شوق کہاں سے اور کس طرح پیدا ہو گیا تھا کہ ہم سے بارہا فرماتیں:

"بیٹا، اگر جینا ہو تو کچھ ہو کر جیو ورنہ مر جاؤ۔"

ماں علم کی دلدادہ ہم کھیل پر آمادہ۔ ان کو علم سے محبت ہم کو پڑھنے سے وحشت ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ غرض اسی طرح جان چرا چرا کر مار کھا کر خانگی طور پر قرآن مجید اور اردو کی دو ایک کتابیں الٹی سیدھی ختم کر لیں۔

جب مدرسے میں شریک ہوئے ان جیسے بہانوں کی چنداں ضرورت نہ پڑی۔ کتابوں کا بستہ بغل میں دبا کر شوقین بچے کی طرح گھر سے نکل جاتے۔ باغوں اور جنگلوں کی سیر کیا کرتے اور پھر عصر کے وقت اسی طرح بستہ بغل میں لئے ہوئے گھر واپس آ جاتے۔ آخر ایک دن ہماری والدہ کو ہماری آوارہ گردی کا پتہ چل ہی گیا۔

ایک روز ہمارے دروازے کے سامنے سے کہاروں کے کندھوں پر پالکی میں کوئی امیر سوار جا رہے تھے۔ پالکی پکڑے ہوئے ایک آدمی بھی ساتھ ساتھ دوڑ رہا تھا۔ والدہ نے ہم کو بلا کر دکھایا اور کہا دیکھو اور اچھی طرح سمجھو۔ ایک آدمی سوار ہے۔ ایک پیدل پاؤں پالکی کے ساتھ ساتھ دوڑ رہا ہے۔ بتاؤ ان دونوں میں سے تم کو کس کی زندگی پسند ہے۔ ہم نے کہا پالکی سوار کی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ والدہ نے کہا ایسی زندگی تو بغیر علم کے کسی کو نصیب نہیں ہو سکتی۔ اگر نہ پڑھو گے تو تم کو بھی اسی دوسرے آدمی کی طرح پالکی کے ساتھ دوڑنا پڑے گا۔ وقت کی بات گفتگو کا اثر، اس بیش بہا مثال سے ہم بہت سہم گئے۔ اور آیندہ کھیلنے سے توبہ کر کے پڑھنے لکھنے کا عہد کر لیا ؎

دل پہ لگی جا کے ہتھوڑے کی طرح — کہنے کو ظاہر میں وہ ایک بات تھی
کر دیا دم بھر میں ادھر سے ادھر — بات تھی یا کوئی کرامات تھی

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پھر مدرسہ نظامیہ میں داخل ہوئے۔ قیام بھی مدرسہ کے بورڈنگ میں تھا۔ قیام کے آخری زمانے میں ہم نے پڑھنا لکھنا بالکل چھوڑ دیا تھا۔ "خفتن و خوردن" وہی مصداق خوب از بر تھے۔ آخر مہتمم صاحب مدرسہ کو ہماری بے مہاری کی خبر ہو گئی۔ اگرچہ مدرسے کے قاعدے کے اعتبار سے ہمارا حصہ فوراً بند ہو جانا چاہئے تھا۔ مگر مہتمم صاحب ہماری رو براہ ہونے کی امید پر کچھ دنوں ٹالتے رہے۔ آخر ایک دن مدرسے کے بڑے ہال کے سامنے ہم کو روک کر پوچھ ہی بیٹھے کہ تم نے پڑھنا کیوں چھوڑ دیا۔ ہم نے کہا کس سے پڑھیں۔ مہتمم صاحب نے کہا تمہارے پڑھنے کے لئے استاد نہیں ہیں۔ ہم نے کہا ان معمولی استادوں سے ہم نہیں پڑھ سکتے۔ مہتمم صاحب نے کہا پھر کس سے پڑھو گے؟ ہم نے کہا مولوی عبدالوہاب بہاری سے۔ مہتمم صاحب نے کہا تمہارے لئے اتنی بڑی ماہوار کا استاد تو نہیں رکھا جا سکتا۔ ہم نے کہا تو پھر ہم بھی نہیں پڑھ سکتے۔ ہمارے اس جواب پر مہتمم صاحب کو سخت غصہ آیا۔ اور جھلا کر ہم کو پکڑنے اور مارنے کے لئے لپکے۔

ہم تقریباً ۱۳۱۶ھ میں مدرسہ نظامیہ کے وظیفہ خواروں میں شریک ہوئے، وہاں قطبی تک تعلیم پا کر چھوڑ دیا۔ اب تک والدہ مرحوم کے پس انداز اور ان کے چھوڑے ہوئے مکانات بیچ بیچ کر زندگی بسر کرتے تھے۔ دو روپے ماہوار پر ایک لڑکی کو پڑھانے کے لئے چار میل جایا کرتے۔ سترہ اٹھارہ سال کی عمر میں شیخ میران صاحب کی لڑکی سے پہلی شادی ہوئی جس سے ایک لڑکی اعظم النساء پیدا ہوئی۔ اس کے دو سال کے بعد کسی خانگی وجہ سے ماں سے بگڑ کر ہم بنگلور چلے گئے۔

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نئے ملک میں کہیں ٹھیرنے کو جگہ نہ ملی۔ مجبوراً گورنمنٹ کے عیسائی مشن میں اتر پڑے۔ مشن اسکول میں تعلیم بھی دیا کرتے تھے۔ نئے کرسچنوں اور پادریوں سے دن رات مذہبی گفتگو رہا کرتی تھی۔ پادری صاحب اتوار کے دن جب بستی میں وعظ کرنے کے لئے جاتے ہم بھی ان کے ساتھ جایا کرتے تھے۔ بڑا لطف تو یہ تھا، ایک طرف پادری صاحب کھڑے ہوئے عیسوی راگنی بجاتے۔ دوسری طرف ان کے مقابل ہم دین محمدی کی تبلیغ کیا کرتے تھے۔ کام

ختم کرکے ہم دونوں پھر ایک ساتھ گاڑی میں سوار ہوکر مشن کو واپس آتے۔ ہماری اس طرز روش سے سارے مسلمان بنگلور میں متحیر تھے۔ کوئی ہم کو عیسائی کوئی محمدی سمجھتا۔......

...... پریشانی کی حالت میں ایک جنٹلمین امیر عبداللطیف صاحب کے گھر پہنچے۔ انہوں نے قصیدہ سن کر بڑی تعریف فرمائی۔ ہماری دعوت کی، کچھ روپے بھی دیئے۔ اور ایک سفارشی چٹھی ایک پارسی ڈاکٹر کے نام لکھی جس کا مضمون یہ تھا

"آپ کو اپنی تعلیم کے لئے ایک مدرس کی ضرورت تھی۔ حامل ہذا آپ کو اچھی طرح تعلیم دے سکیں گے۔"

ہم دوسرے دن پتہ پوچھتے اپنے پھٹے پرانے لباس میں ڈاکٹر صاحب کے مکان پر پہنچے۔ عالی شان مکان کی شان دیکھ کر باہر ہی ٹھٹک کر رہ گئے۔ اتفاق کی بات اس وقت ڈاکٹر صاحب باہر چمن کی روشوں میں سگار کے کش لگاتے ہوئے ٹہل رہے تھے۔ ہم کو دروازے پر کھڑا دیکھ کر پوچھا "ول تم کون ہے؟" ہم نے جواب دینے کی جگہ گھبرا کر چٹھی ہاتھ میں دے دی۔ ڈاکٹر صاحب نے لفافہ کھول کر چٹھی پڑھی۔ چٹھی پڑھتے ہوئے کبھی سر سے پاؤں تک ہم کو دیکھتے کبھی بھویں چڑھا چڑھا کر چٹھی پڑھتے۔ ہم اس وقت ایش و بروت سے بھی معرّا تھے۔ آخر ڈاکٹر صاحب سنبھل نہ سکے۔ نہایت خشم ناک لہجے میں گرم ہوکر فرمایا "تم ہم ساٹھ برس کے بڈھے کو تعلیم دے گا" ہم نے کچھ جواب نہ دیا۔ پھر ڈاکٹر صاحب نہایت سختی سے ہمارا ہاتھ پکڑے ہوئے اندر لے گئے۔ مکان اگرچہ حقیقت میں جنت کا نمونہ تھا۔ مگر ہمارے لئے تو جہنم سے بدتر تھا۔ ہم کو لے جا کر کتب خانہ میں بٹھایا "کلیات قاآنی" نکال لائے۔ اور ایک قصیدہ پڑھنے کا حکم دیا۔ دو چار شعر پڑھ دیئے، حکم ہوا اس کی تقطیع کرو۔ ہم نے تقطیع کر دی حکم ہوا کہ بحر کا نام بتاؤ۔ اب تو ہم بھی غوطے کھا گئے۔ یکایک دیکھا کہ کتاب کے حاشیہ پر کچھ انگریزی میں لکھا ہوا ہے۔ ہم نے ایک ایک حرف پڑھ کر سب کو جوڑ کر "بحر اخرب" کہہ دیا۔ ڈاکٹر صاحب بہت خوش ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ انگریزی زبان میں اپنی لیڈی صاحبہ سے بھی ہماری بہت تعریف کی کیونکہ اثنائے گفتگو میں لیڈی صاحبہ مسکرا کر محبت اور قدردانی کی گرم جوش نگاہوں سے ہم کو دیکھ رہی تھیں۔

نگہے نیاز بود و درنخنتہ باز بود

شاہ نامہ پڑھانے کے لئے ہم کو اپنا منشی مقرر کر لیا

پھر عبداللطیف صاحب کے توسط سے ناظم تعلیمات بنگلور کے پاس پہنچ گئے۔ اور اسی دن سٹی اسکول میں بالفعل پندرہ روپے ماہوار کے مدرس ہوگئے۔ ہم دو مہینے تک سٹی ہائی سکول میں مدرسی کرتے رہے۔ کئی انسپکٹر تعلیمات اور پرنسپل ہمارے شاگرد ہوگئے۔ رہنے کو مدرسہ ہی کا دلچسپ اور پرفضا مکان، پڑھنے کے لئے مدرسہ کا سارا کتب خانہ، خدمت کے لئے مدرسہ کے طلبا، کھانے کے لئے قدردانوں کی ضیافتیں، دل بہلانے کے لئے دوستوں کے ساتھ باغوں کی تفریحیں، رقص و سرود کے جلسے، غرض وہ تمام سامان جو دنیوی مسرت کو مکمل کر سکتا ہے وہاں پردیس میں خدائے تعالیٰ نے ہمارے لئے فراہم کر دیا تھا.........

اس طرح تین چار مہینے بنگلور میں گزار کر ماں کی وجہ سے پھر حیدرآباد واپس ہوئے۔

یہاں آکر چند مہینوں کے بعد مولوی عزیز مرزا صاحب بی۔ اے کی علمی قدردانی کی شہرت سن کر ایک دن ان کے مکان پر پہنچ گئے اور رباعیاتِ امجدؔ کی ایک جلد پیش کر دی۔ مولوی عزیز مرزا ہمارے حال پر بہت مہربان ہوگئے۔ اور وہ ہمیشہ قدردانی فرماتے رہے۔ آپ ہی کی سفارش سے ابتداً ہم مدرسہ دارالعلوم میں بیس روپے ماہوار پر مدرس ہوگئے۔

ہمارا مکان موسیٰ ندی سے کوئی ساٹھ گز کے فاصلے پر تھا۔ سلخ شعبان سنہ ۱۳۲۶ھ کی شام ہی سے رود موسیٰ لبریز ہوکر اپنے دونوں ساحلوں کی طرف سیل بلا کی طرح بڑھ رہی تھی۔ رات کے دس بجے تک تو بڑھتے ہوئے پانی نے غنیم کی فوج کی طرح چاروں طرف سے محاصرہ کر لیا تھا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد قبلہ رخ کی دیوار شق ہوئی کمرے کے حال میں پانی آگیا۔ ہم ادھر سے بھاگ کر دوسری طرف جا بیٹھے۔ ادھر بھی دم لینے نہ پائے کہ صحن کا پانی دروازے

[illegible]

[illegible]

[illegible]

([illegible])

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

ماہوار تنخواہ تھی۔ پھر سیکنڈ گریڈ (۱۰۰ تا ۱۷۰) اس کے بعد فرسٹ گریڈ (۱۸۰ تا ۳۰۰) پر ترقی ملی اور ملازمت کے آخری زمانہ میں (۲۵۰ تا ۶۰۰) کے مددگار ہو گئے تھے۔ چار سو سے زیادہ ماہوار پر آپ کو وظیفہ ملا۔ آپ کے افسر ہمیشہ آپ کا ادب کرتے تھے۔ کیونکہ آپ کی شخصیت مشہور اور معروف ہوتی جا رہی تھی۔

سیلاب رود موسیٰ کی تباہی کے کئی سال بعد تک آپ نے دوسرا بیاہ نہیں کیا۔ اس کے بعد مولانا سید نادر الدین صاحب کی دختر جمال النساء بیگم سے آپ کا عقد ہوا۔ امجد صاحب کی یہ بی بی اپنی روحانی قوت میں امجد صاحب سے ترقی کر گئی۔ ان کے مشاہدات اور مکاشفات "جمال امجد" میں صاحبان بصیرت کے لئے ایک درس رکھتے ہیں جن کی صراحت یہاں غیر ضروری ہے۔

میاں بی بی کی زندگی بڑی پر لطف گزرتی رہی۔ جس کی تفصیل خود امجد صاحب نے "جمال امجد" میں کر دی ہے۔ اس کی پوری تفصیل کا تو یہ موقع نہیں ہے۔ البتہ چند سطور پیش کی جاتی ہیں:-

"شادی کے پانچ چھ برس بعد ہماری کسی خاص کوشش اور محنت کے بغیر ہماری زندگی کا دور بدلنے لگا۔ وقت آ گیا۔ رحمتِ الٰہی کے دروازے آہستہ آہستہ کھلنے لگے۔ خدا رسول کی محبت کے آثار سلمیٰ (جمال النساء بیگم کو امجد صاحب نے سلمیٰ کا لقب دیا تھا) کے اوضاع و اطوار سے ظاہر ہونے لگے۔ ہماری حیرانی ان کی مسرت کا سبب، ہمارا تعجب ان کے انبساط کا موجب ہوتا تھا۔ کیونکہ وہ لطائف و نکات جو کبھی اور کسی وقت خود ہمارے وہم و خیال میں بھی نہ آتے تھے ان کی زبان سے بلا تکلف ادا ہوتے تھے۔ کبھی کبھی پکانے کے لئے بھی وقت نہ ملتا۔ بازار سے روٹی لا کر کھا لیتے۔ اکل و شرب کی تمام لذتیں روحانی اور مذہبی مسرتوں پر قربان تھیں۔ کبھی کبھی ادھر سالن چولھے پر چڑھا ہوتا ادھر کوئی بحث چھڑ جاتی۔ سالن اپنے آپ پک پک کر ٹھنڈا بھی ہو جاتا۔ مگر یہاں سلسلۂ گفتگو ختم ہی نہ ہونے پاتا۔ ہمارے گھر میں ہمیشہ ایک ہی سالن پکا کرتا تھا۔ کبھی کبھی تو ایک ہی سالن دو دو تین تین دن تک برابر کھاتے رہتے۔ لذت میں کوئی فرق نہ آتا۔ ہر لقمہ پہلے لقمے سے لذت میں ترقی کرتا جاتا تھا۔ خانۂ خدا کے زیر سایہ صابر منزل کے چھوٹے اور پر فضا چمن میں ہم دونوں کی پر لطف زندگی بسر ہوتی تھی۔"

امجد صاحب کی زندگی کے کئی سال جمال النساء بیگم سلمیٰ کے ساتھ ہنسی خوشی بسر ہوئے۔ دونوں مل کر حج کو گئے "حج امجد" میں امجد صاحب نے دلچسپ اور دلکش انداز میں اپنے سفر حج کا حال لکھا ہے۔ واپسی حج کے کچھ عرصہ بعد جمال النساء کا انتقال ہو گیا۔ یہ انتقال امجد کی زندگی کا نہایت اہم اور پر درد واقعہ تھا۔ موسیٰ ندی کے سیلاب کی طرح ہی یہ واقعہ امجد صاحب کے لئے اندوہناک اور پُر الم ہوا۔ عرصہ تک امجد صاحب نہایت رنجیدہ رہے۔ آخر دوستوں نے ایک شادی کر دی۔ مگر امجد صاحب کی نفاست پسند طبیعت نے اس بی بی کے ساتھ زندگی بسر کرنا گوارا نہیں کیا۔ ان کو روزِ اوّل ہی طلاق دے دی گئی۔ اور کچھ عرصے کے بعد چوتھی بی بی سے عقد کیا جو اس وقت آپ کی شریک حیات ہیں۔

امجد صاحب کی خانگی زندگی کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس میں شروع سے اب تک بہت کم فرق ہوا ہے۔ جو لباس و خوراک اور جس وضع کا آپ پہلے بیس روپیہ ماہوار کے وقت استعمال کرتے تھے وہی چھ سو روپیہ کی ماہوار کے وقت استعمال کرتے تھے۔ اور اب بھی کرتے ہیں۔ سفید یا خاکستری رنگ کی شیروانی اور ترکی کلاہ استعمال ہوتا تھا۔ حج کے بعد کپڑے کی عربی کلاہ استعمال کرتے ہیں۔ حیدرآبادی دوہرا پاجامہ باہر جاتے وقت استعمال کرتے ہیں۔ مکان میں تہبند کا اور قمیص کا استعمال ہوتا ہے۔ چوڑا دے کا جوتا پہنتے ہیں۔

امجد صاحب نہایت سادگی پسند ہیں۔ کھانے پینے، رہنے سہنے، پہننے اوڑھنے میں انتہائی سادگی ہوتی ہے۔ جو مل جائے وہ پہننا آپ کی عادت ہے۔ ضروریات زندگی کی ہر چیز اکثر خود خریدتے ہیں۔ لباس اور کھانے پینے کے بعد آپ کی خانگی زندگی یا گھریلو معاشرت کا مختصر تذکرہ ضروری ہے۔

ہم کو جمال النسأ بیگم مرحومہ کے زمانے میں قریب سے امجد صاحب کی گھریلو زندگی دیکھنے کا موقع نہیں ملا۔ مگر موجودہ رفیق حیات کے ساتھ آپ کی مثالی زندگی کا نقشہ ہمارا دیکھا بھالا ہے۔ اس کو دیکھ کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ دونوں کی زندگی خوش و خرم طور پر بسر ہوتی ہے۔ اگرچہ آپ کی رفیق حیات تعلیم یافتہ نہیں ہیں اور عمر کے لحاظ سے بھی وہ آپ سے بہت چھوٹی ہیں۔ مگر ان کی سلیقہ شعاری اور شوہر کی طبیعت میں خود کو ڈھالنے کے باعث دونوں مسرت آمیز زندگی گزارتے ہیں۔ دونوں میں انسیت ہے۔ محبت ہے۔ خلوص ہے۔ شوہر بی بی کی رعایت اور ناز برداری کرتے ہیں تو بی بی شوہر کی اطاعت اور فرمانبرداری کو افضل سمجھتی ہیں۔ جہاں تک ہم کو معلوم ہے کبھی دونوں میں اختلاف نہیں ہوتا۔ اگر کوئی نامناسب بات ہو جائے تو دونوں چشم پوشی کرتے ہیں۔ امجد صاحب نے اپنی بی بی کو قانون اسلامی کے مطابق آزادی دے رکھی ہے۔ امجد صاحب کے بعض خاص خاص دوستوں سے وہ پردہ نہیں کرتیں۔ ہر وقت ان سے بات چیت کی پوری اجازت ہے۔ پہننے اوڑھنے اور آرائش میں آزادی ہے۔ جانے آنے میں پابندی نہیں۔ حسب استطاعت ان کی فرمائش کی تکمیل کرتے ہیں۔ ان کی ضروریات کی چیزیں بخوشی فراہم کی جاتی ہیں۔ نرمی، شفقت اور ملائمت سے گفتگو فرماتے ہیں۔ خوش مذاقی، خوش طبعی بھی ہوتی ہے۔ کبھی خانہ داری کے کاموں میں مدد دیتے ہیں۔ دونوں مل کر پکاتے ہیں۔ اسی طرح بی بی بھی آپ کی راحت، آرام اور آسائش کا پورا خیال رکھتی ہیں۔ فرمائش نہیں کرتیں۔ سکھ چین سے زندگی بسر کرنا دونوں کا معمول ہے۔ غرض دونوں کی زندگی کا مطالعہ کیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ امجد صاحب خوش قسمت ہیں کہ آپ کی منزلی زندگی نہ صرف آرام اور آسائش میں بسر ہوتی ہے بلکہ قابل رشک معلوم ہوتی ہے۔ ورنہ اکثر ادیبوں اور شاعروں کو اپنی شریک حیات سے کوفت اور تکلیف ہوتی ہے۔ راحت اور چین نہیں ملتا۔

امجد صاحب اگرچہ ایک عرصے تک تنگ دست رہے۔ مگر وہ خود دار شخص ہیں۔ کسی کا احسان گوارا نہیں کرتے۔ خود ہر قسم کا ایثار کرتے ہیں۔ ساتھ ساتھ خاکساری اور فروتنی بھی ہے۔ آپ کے یہاں حیدرآباد کی بڑی بڑی شخصیتیں مثلاً سر امین جنگ مرحوم، سر اکبر حیدری، مہدی یار جنگ مرحوم وغیرہ بھی آتے رہے ہیں اور چھوٹے آدمی بھی۔ آپ دونوں سے اخلاق اور مروت سے پیش آتے ہیں۔ بڑی شخصیت سے مرعوب نہیں ہوتے۔ ان کی بے جا عزت نہیں کرتے اور چھوٹی شخصیت کی توہین روا نہیں رکھتے۔

آپ بڑے مہمان نواز ہیں بعینہٖ مہمانداری کرتے ہیں۔ جو خود کھاتے ہیں وہی مہمان کو کھلاتے ہیں۔ اس میں چھوٹے بڑے کا امتیاز نہیں ہے۔ عام طور سے آپ کسی کے یہاں نہیں جاتے۔ مگر جب تعلقات ہو جاتے ہیں تو ان سے ترکِ تعلق پسند نہیں کرتے۔ حتی الامکان سابقہ تعلقات کو قائم رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ تواضع اور انکساری کی صفت امجد صاحب کے خاص جوہر ہیں۔ غریبوں سے خندہ پیشانی سے ملنا ان کی دست گیری کرنا آپ کا معمول ہے۔ مجلس میں صدر پر بیٹھنا یا صدر بننا پسند نہیں کرتے۔

امجد صاحب کے ملنے والوں کا دائرہ نہایت وسیع ہے۔ دونوں صنف اور ہر طبقہ کے لوگ آتے ہیں اور ان میں جہاں اعلیٰ عہدہ دار، جاگیردار، وکلاء تجارت پیشہ ہیں، وہاں اہلکار، جز معاش بلکہ مفلس بھی ہوتے ہیں۔ آپ کا ہر ملنے والا یہ خیال کرتا ہے کہ میں ہی زیادہ دوست ہوں۔

امجد صاحب نہایت نرم دل ہیں۔ دوسروں کی تکلیف کو دیکھ کر خود بے چین ہو جاتے ہیں۔ اور جہاں تک ہو سکے مدد سے دریغ نہیں کرتے۔ کوئی حاجت مند آپ کے گھر سے محروم نہیں جاتا۔

تعصب آپ میں نہیں ہے۔ ہر قوم و ملت کے آدمی سے یکساں خلوص اور محبت سے پیش آتے ہیں۔

نام و نمود کی خواہش نہیں ہے۔ آپ کی تصانیف، نظم و نثر کی وجہ سے جو شہرت ہے اس سے آپ مستغنی نہیں ہے۔ دنیاوی جاہ و مال کی کبھی ہوس نہیں کی۔ اور اگر آپ اس کی خواہش کرتے تو کم از کم ہزاروں روپیہ کا گریڈ ملنا آسان تھا۔ کیونکہ سر اکبر حیدری جیسا شخص آپ کی خاطرداری کرتا تھا۔ اور آپ کی خواہش کی تکمیل ضروری تصور کرتا تھا۔ مگر آپ نے اس کو پسند نہیں کیا۔

مروت بھی آپ کا ایک خاص جوہر ہے۔ وقت بے وقت لوگ آتے ہیں اور فضول باتوں میں وقت ضائع کرتے ہیں۔ مگر آپ سے محض دلآزاری

کے خیال سے یہ نہیں ہوتا کہ اٹھ کر چلے جائیں۔

امجد صاحب عورتوں کے بڑے حامی ہیں، آپ کے پاس اپنا دکھ درد رکھنے والی بیسیوں عورتیں اکثر آتی ہیں اور آپ ان کی ہر طرح مدد فرماتے ہیں جہاں بی بی کی زندگی کو خوش گوار بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔

امجد صاحب ایک فقیر منش اور صوفی ہیں۔ خاص خاص لوگوں کو مرید کرتے ہیں۔ مگر عام طور پر ہمارے یہاں کے مشائخ طریقت اور مرشد اور مرید کا جو طریقہ ہے اور مرشد اپنے مرید سے جس طرح پیش آتے ہیں، مشائخین طریقت کا جو عام طریقہ اور رواج نظر آتا ہے وہ یہاں مفقود ہے۔

امجد صاحب سنیما بھی دیکھا کرتے ہیں۔ اکثر المیہ اور دردناک منظر دیکھتے اور اس سے متاثر ہوتے ہیں۔ مجلس سماع سے بھی خاص لگاؤ ہے۔ مجلس سماع میں آپ تڑپتے اور لوٹتے نہیں۔ البتہ رو لیا کرتے ہیں۔ بعض طوائفیں خصوصیت سے آپ کو آپ کا کلام گا کر سناتی ہیں۔

کسی شخص کی زندگی پر نظر ڈالنے کے لئے اس کے ماحول اور گرد و پیش کا جائزہ لینا ضروری ہے۔

آج سے نصف صدی پہلے کلکتہ، بمبئی اور مدراس کی یونی ورسٹیاں قائم ہوئے عرصہ ہو چکا تھا۔ اور ان جامعات سے مرد تو مرد خواتین بھی اعلیٰ ڈگریاں لے کر میدانِ عمل میں بازی لگا رہی تھیں۔ مگر حیدرآباد پر جمود طاری تھا۔ مغربی علوم سے کچھ زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ مشرقی علوم کی طرف لوگوں کی طبیعتیں مائل تھیں۔ قدیم علماء شائقین علم کو اپنے مکانوں میں مفت درس دیتے تھے۔ ان کے گھر تشنگانِ علم کے لئے آبِ حیات بنے ہوئے تھے۔ شاعری کا بول بالا تھا۔ ایک طرف حضرتِ فیض کے شاگرد اپنے استاد کی میراث تقسیم کر رہے تھے۔ تو دوسری طرف داغ کی محفل آراستہ تھی۔ سرشار، ترکی، گرامی، ظہیر، حبیب کنتوری وغیرہ شمالی ہند سے آکر حیدرآباد کی فضا کو شعر و سخن سے گرما رہے تھے۔ مگر شاعری کا رنگ وہی قدیم تھا۔ گل و بلبل، شاہد و ساقی کی داستان شعراء کا موضوع بنا ہوا تھا۔ داغ نے غزل کے رنگ کو بدل دیا تھا۔

معاشرت میں اگرچہ مغربی طرز کی آمیزش ہو چکی تھی۔ مگر مشرقیت کو غلبہ تھا۔ عام طور سے متوسط بلکہ اعلیٰ طبقہ کی اکثریت کا رجحان مشرقی نہج پر تھا۔ رہنے سہنے، کھانے پینے، پہننے اوڑھنے میں مشرقی تہذیب، مشرقی معاشرت کی جھلک نمایاں تھی۔ مذہب سے زیادہ دلچسپی تھی مشائخ عظام نے اپنے سلسلوں کے مطابق پیری مریدی کی بساط بچھا رکھی تھی۔ یہ تھا وہ ماحول جس میں امجد صاحب نے پرورش پائی اور اپنی زندگی کا بڑا حصہ بسر کیا ہے۔ اس کے بعد وہ زمانہ آتا ہے جبکہ حیدرآبادی تہذیب مغربی تہذیب سے بدلنے لگی۔ رسم و رواج، کھانے پینے، رہنے سہنے میں مغربی اثرات نمایاں ہونے لگے۔ اس ماحول کے مدنظر امجد صاحب کی زندگی کا جائزہ لیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ امجد صاحب ماحول سے متاثر ہوئے ہیں۔

امجد صاحب کی زندگی کا تجزیہ کیا جائے تو ہمیں تین امور مابہ الامتیاز نظر آتے ہیں۔ اولاً تنگ دستی اور غربت۔ ہم بیان کر چکے ہیں کہ آپ کی پرورش کی کفیل بیوہ ماں تھیں۔ کوئی ذریعۂ آمدنی نہیں تھا۔ پھر مدرسہ نظامیہ میں غریب طالب علموں کی طرح آپ کی زندگی بسر ہوئی۔ اور جب مستقل ملازمت ملی تو بیس روپے کی۔ اگرچہ اس زمانہ کے بیس روپے آج کل کے سو روپے سے زیادہ حیثیت رکھتے تھے۔ مگر کھانے والوں کی تعداد کے لحاظ سے کبھی راحت حاصل نہیں ہوئی۔ ایک زمانہ وہ بھی گزرا کہ عرفت چنے کھا کر آپ نے بسر کیا۔ اور کبھی یہ بھی ہوا کہ گھر میں جو سالن پکتا وہ مہمان یا خوشدامن اور سالے سالی کے آگے رکھ دیا جاتا اور امجد اور ان کی بی بی بغیر سالن کے کھاتے۔ اگرچہ وظیفہ کے کچھ عرصہ پہلے سب منتظم اور پھر مددگار بن گئے تھے۔ ماہوار تنخواہ ڈھائی تین سو بلکہ چار سو تھی مگر جو زمانہ تنگ دستی میں بسر ہوا تھا اس کی یاد فراموش نہیں ہو سکتی تھی۔

دوسری چیز غم و الم، یاس و حسرت ہے۔ طغیانی رود موسیٰ میں گھر بار کے ساتھ مشفق ماں، بی بی اور چار سال کی لڑکی موجوں کی نذر ہو گئیں۔ سارا کنبہ آنکھوں کے سامنے ڈوب گیا۔ ...... پھر ایک عرصے کے بعد قابل اور لائق بی بی جمال النساء کا ساتھ ہوا، اور چند سال کے بعد اُن کی موت نے پھر غم و الم کو تازہ کر دیا۔ دخترِ اعظم النساء کے انتقال کے بعد کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ اس طرح امجد کی زندگی رنج و الم، یاس و حرماں کا ایک مجسمہ بن گئی۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

ہوگیا ـــــــ شاعر جانے کی یہ بڑی کمزوری ہے۔ کہ اُسے روٹی نہ ملے تو گذارہ کر لیتا ہے۔ لیکن شعروں کی داد نہ ملے تو جیتے جی مر جاتا ہے اور جب بلا وجہ داد ملے۔ تو تعارف چھوڑ دوستیاں تک ہو جاتی ہیں۔

دوسری جھجک ایک اور بھی تھی۔ کہ مجھے آج تک پرنسپلوں سے ملتے، ڈر لگتا ہے۔ میرے ایک اور کرم فرما بھی ایک کالج کے پرنسپل ہیں۔ اُن سے بھی مجھے ملتے ہوئے ڈر ہی لگتا ہے۔ حالانکہ وہ بڑے نیک اور مستعلیق قسم کے بزرگ ہیں۔ میرے تو ذہن میں یہ بات گھسی ہوئی ہے۔ کہ سب کے سب پرنسپل ہر ایک سے طالب علم ہی سمجھ کر پیش آتے ہیں۔ حالانکہ اِس طالب علم کے ساتھ کبھی کسی پرنسپل نے طالب علم سمجھ کر روکھائی سے بات نہیں کی۔

آخر ایک موقع ایسا آیا۔ کہ مجھے سید صاحب کی ضرورت پڑ گئی۔ اور میں تمام آبرومندانہ تعارف کے آداب بھول کر انہیں خط لکھنے بیٹھ گیا۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے۔ جب میں نقوش کی ادارتی ذمہ داریوں میں نیا نیا پھنسا تھا۔ اور مجھے اِس گھٹیا منصب کے اسرار و رموز اور نزاکتوں کا قطعی احساس نہ تھا۔ مجھے یہ بھی علم نہ تھا۔ کہ اس باب میں میری کون مدد کرے گا۔ اور کون ٹانگ گھسیٹے گا۔ مدیرانہ فرائض کو میں نے گھٹیا منصب اس لئے کہا ہے۔ کہ آج کوئی بھی خوددار انسان کسی اچھے رسالے کا مدیر نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ بیشتر لکھنے والے پارٹی بازیوں کا شکار رہیں۔ (ادب اور پارٹی بازی، سبحان اللہ) خدانخواستہ کوئی مدیر اگر کسی لکھنے والے سے سلام دعا کرتا ہوا پکڑا جائے۔ تو سمجھئے۔ اُس ادیب کے جتنے مخالف ہیں۔ وہ سب دفعتہً مدیر کے پیچھے ہی آ گئے۔ نقوش کی ادارت سے پہلے میں بہت اترایا کرتا تھا۔ کہ میرے تمام لکھنے والوں سے دوستانہ اور برادرانہ تعلقات ہیں۔ لیکن آج اس دعوے پر خود شرمسار ہوں ـــــــ اوہ! ـــــــ میں نے خواہ مخواہ یہ تکلیف دہ مسئلہ چھیڑ دیا۔ عرض یہ کرنا تھا۔ کہ میں اپنے ہاں کے ادبی ماحول کی نزاکتوں سے کچھ بیگانہ ہی تھا۔ بڑی سوچ بچار کے بعد میں نے ڈاکٹر تاثیر (مرحوم) اور عابد صاحب کو خط لکھے۔ کہ میں بعض معاملات میں آپ سے مشورہ لینا چاہتا ہوں۔ مجھے کوئی وقت دیں۔

ان حضرات کو میں نے یہ اہمیت اس لئے دی تھی۔ کہ یہی حضرات یہاں کے ادبی ماحول کے باوا آدم تھے۔ تاثیر صاحب نے خط کا جواب ہی نہ دیا۔ عابد صاحب نے فوراً لکھا: "آپ جب آنا چاہیں، تشریف لائیں۔ میں آپ سے ہر وقت ملنے کو تیار رہوں۔"

یہاں اگر میں نے تاثیر صاحب کا ذکر یونہی چھوڑ دیا۔ تو شاید میں مرحوم کے ساتھ انصاف نہیں کروں گا۔ اس لئے کہ میرے خط لکھنے کے کوئی ڈیڑھ ماہ بعد اُن کا پیغام یہ آیا تھا: "آپ نے بڑا اچھا کیا کہ ترقی پسندوں کے چنگل سے نکلے۔ اور اب آپ خالصتاً ادبی اقدار کے ماتحت پرچہ نکالیں گے۔ اگر اس سلسلے میں میری خدمات کی ضرورت ہو۔ تو وہ بلا معاوضہ حاضر ہیں ـــــــ کسی دن گھر پر آیئے۔ تاکہ کچھ کھانے پینے کا شغل رہے۔"

جو صاحب یہ پیغام لانے تھے۔ میں نے اُن سے ڈاکٹر صاحب کی اِن عنایات کا شکریہ ادا کر کے یہ عرض کیا تھا۔ کہ نوبت صرف کھانے تک ہی رہے۔

وہ صاحب تو ہنستے ہنستے چلے گئے۔ لیکن میں اُن کے ہاں نہ جا سکا۔ ایک تو یوں کہ اِس واقعہ کے کچھ ہی دنوں کے بعد اُن کا اچانک انتقال ہوگیا۔ دوسرے مجھے یہ وہم ہونے لگا تھا۔ کہ ممکن ہے تاثیر صاحب جو مشورہ مجھے دیں، وہ میرے لئے قابلِ قبول نہ ہو۔ میں جب بھی اُن کے ہاں جانے کے لئے تیار ہوتا تھا۔ تو مجھے اُن کا یہ فقرہ یاد آ جاتا تھا: "آپ نے بڑا اچھا کیا۔ کہ ترقی پسندوں کے چنگل سے نکلے۔" اور یہ فقرہ مجھے یاد اس لئے آ جاتا تھا۔ کہ بعض اختلافی امور کے باوجود میں یہ سمجھتا تھا۔ کہ آج بھی جو ہمارے ادب میں بہار اور تازگی سی ہے۔ وہ کچھ انہی "سرپھروں" کی رہینِ منت ہے۔ ورنہ ادب ایک ہی ڈگر پر چل چل کر اپنی ساری دلکشی کھو بیٹھتا ـــــــ اگر مجھے علم ہوتا۔ کہ اُن کا یوں انتقال ہو جائے گا۔ تو میں اپنے تمام اوہام اور کمزوریوں کو بالائے طاق رکھ کر اُن سے ضرور ملتا۔ افسوس کہ مجھے اُن کے جنازہ میں شریک ہونے کا موقع تو ملا۔ لیکن اُن سے ہم کلام ہونے کی نوبت نہ آ سکی۔

عابد صاحب کے متعلق میں نے یہ سن رکھا تھا۔ کہ وہ دل کے بڑے کھرے ہیں دوستوں کے دوست اور دشمنوں کے دشمن ہیں۔ اِس لئے اُن کی

تعریف کو حسب حال پایا کر ان سے ملنا ضروری سمجھا۔

جب میں نے انھیں قریب سے دیکھا۔ تو مندرجہ بالا فقرے میں قدرے اختلاف پایا۔ یہ دشمنوں کے پکے دشمن اور دوستوں کے دوست نکلے۔ اگر طبیعاً چند باتیں نہ ہوتے تو دوستوں کے پکے ہی دوست ہوتے۔ آناً فاناً ناراض ہو جاتے ہیں اور چشم زدن میں راضی بھی ہو جاتے ہیں۔ بعض اوقات ناراضی دشمنی کی حد تک جا پہنچتی ہے۔ اگر غلط فہمی دور ہو جائے۔ تو وہی یاری ہوگی۔ وہی مزے مزے کی حکایتیں ہوں گی۔ اور وہ تمام گفتہ اور ناگفتہ باتیں ہوں گی۔ جو صرف آپ کو انہی میں ملیں گی۔ اس لئے کہ ان میں جھوٹا تفاخر نام کو نہیں۔ یہ اتنے اور بے جل ہیں کہ اپنی ادبی جھلکی میں نقطۂ آخر پر ہیں۔ یوں تو یہ بعضوں کو بڑے مغرور اور خود سر معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن واقعہ اس کے برعکس ہے۔ جنھوں نے انھیں دور سے دیکھا۔ ان کے لئے یہ مغرور اور خود سر ہیں۔ جو ان کے قریب آ کے بیٹھ گئے۔ وہ ان کے خلوص اور برابری کی اپنایت محسوس کرنے لگے۔ یقین کیجئے ایسے لوگ اب خال خال ہی رہ گئے ہیں جو دنیا کے ہر موضوع پر چپی تلی باتیں کر سکتے ہوں۔ اردو ادب کے تو تمام پہلوؤں پر یوں بولتے چلے جاتے ہیں۔ جیسے سب کچھ ازبر ہو۔ فارسی بھی اردو ہی کی طرح ان کی اپنی زبان معلوم ہوتی ہے۔ اس پر ان کا لہجہ اور الفاظ کے صحیح چناؤ کے ساتھ مطلب کی تہ تک مخاطب کو پہنچا دینا۔ ہر کسی کو کہاں نصیب ہوتا ہے۔ میں نے ان سے کبھی بحث ہی نہیں کی۔ اس لئے کہ بحث بھی ایک فن ہے جو ریاضت ہی سے آتا ہے۔ پھر بھی کسی بات پر لقمہ دے کر وہ وہ لطف اندوز ہوا ہوں۔ کہ کچھ نہ پوچھئے۔ بسا اوقات ان سے باتیں کرنے کے بعد مجھ پر ایک سرشاری کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ اور یوں محسوس ہوا۔ جیسے میں نے ادب کی کئی پوتھیاں پڑھ رکھی ہوں۔

میری ان سے پہلی باقاعدہ ملاقات غالباً ۱۹۵۱ء میں ہوئی تھی۔

لیکن میں آپ کو اس سے پہلے کے حالات بھی بتاؤں گا۔ تاکہ آپ کو یقین آ سکے کہ ان میں سے کوئی بات بھی سچی نہیں ہے۔ اگر ان میں کوئی بات سچی نظر آئے۔ تو اس میں میرا کوئی اعجاز نہ ہوگا۔ بلکہ یہ سمجھ لیجئے گا۔ کہ میں نے یہ باتیں مستعار لی تھیں۔ جو یہ مضمون لکھنے کے بعد سب کو نام بنام لوٹا دوں گا۔

یہاں ایک بات تو یہ سمجھ میں آتی ہے۔ کہ میرے سے ان حکایتوں ہی کو نہ دہرایا جائے۔ جن پر پرائے مال کا شبہ تک ہو۔ بہت ممکن ہے کل کلاں کو سب یہ کہہ دیں۔ کہ ہم نے فلاں بات یوں تو نہیں بتائی تھی۔ بلکہ یوں بتائی تھی۔ اس اعتبار سے میں اپنی جھوٹی باتوں کو دوسروں کی سچی باتوں پر یوں ترجیح دینا چاہتا ہوں۔ کہ جو کچھ اپنا مشاہدہ ہے۔ صرف اسی پر اکتفا کروں۔ تاکہ سینہ تان کر یہ کہہ سکوں۔ کہ میں نے جو کچھ لکھا ہے۔ وہ میرا مشاہدہ ہے۔ اگر میں نے اپنے مشاہدے کے سلسلے میں کہیں ٹھوکر کھائی ہو۔ تو اس کی معذرت قارئین سے بھی چاہوں گا اور عابد صاحب سے بھی۔

کل ہی کا ذکر ہے کہ جب میں نے ریڈیو کا بٹن گھمایا۔ تو چھوٹتے ہی سید صاحب کی فنِ موسیقی پر تقریر سننے میں آئی۔ عرصہ ہوا۔ ان کا اسی موضوع پر ایک مقالہ پہلے بھی یونیورسٹی ہال میں سن چکا تھا۔ اور میں نے اس مقالے کے دوران میں جمائیاں لے لے کر اپنا ستیاناس کر لیا تھا۔ مجھے سرے سے موسیقی ہی سے کوئی دلچسپی نہیں۔ فنِ موسیقی سے خاک ہوگی۔ کل جو ان کی اسی موضوع پر تقریر سنی۔ تو وہی پرانا نقشہ آنکھوں کے سامنے ایک بار پھر گھوم گیا۔ اور مجھے وہ بات بھی یاد آ گئی۔ جب میں نے واپسی پر اپنے ساتھی سے کہا تھا۔ کہ میں جب عابد صاحب کی تقریر سن رہا تھا۔ تو یوں محسوس ہوا۔ جیسے اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کر رہا ہوں ——— کل پھر میں نے فنِ موسیقی پر ہی ان کی پوری تقریر سنی۔ اور اب تو ان کی خاطر ان کی ساری تقریریں سننی پڑیں گی خواہ وہ بھیڑ بکریاں پالنے کے متعلق ہی کیوں نہ ہوں ——— برا ہو تعلقِ خاطر کا۔

آج سے بارہ تیرہ برس پہلے میں نے ان کا پیرالوئی کی ایفراڈائٹ کا ترجمہ "داستان" کے نام سے پڑھا تھا۔ اور بے حد متاثر ہوا تھا۔ اور اسی وقت یہ اندازہ لگا لیا تھا۔ کہ اس کا مترجم کوئی بڑا زندہ دل قسم کا انسان ہوگا۔ جس نے اس انداز کی رنگین کتاب کا ترجمہ اس ٹھاٹھ

سے کیا۔ اگر وہ کتاب فرانسیسی ادب میں بڑا نمایاں مقام رکھتی ہے۔ تو انھوں نے اُس کا ترجمہ بھی اس شان سے کیا کہ میں نے اُردو میں اس پائے کے ترجمے نہیں دیکھے۔

مجھے ان سے یہ شکایت رہی ہے کہ اتنی ٹھوس علمی شخصیت ہونے کے باوجود انھوں نے اب تک کوئی قابلِ ذکر ادبی کام نہیں کیا۔ یہ فضیلت صرف انھی میں نہیں ہے۔ بلکہ یہاں کی اور بھی کئی بڑی بڑی شخصیتوں میں تھی اور ہے۔ اگر میں اس سلسلے میں ڈاکٹر تاثیر (بعض زندہ کرمفرماؤں کا نام لیتے ہوئے ڈر لگتا ہے) کا نام لوں۔ تو میرے دوست مجھے معاف فرمائیں گے۔ اس لئے کہ یہاں تو میں نے اپنے اُس دُکھ کا اظہار کیا ہے۔ جو مجھے ان حضرات کی ادب سے بے توجہی برتنے کے سلسلے میں ہوا ہے۔ اس کی وجوہ کچھ ہوں۔ بہرحال یہ لوگ اگر سنجیدگی سے اُردو ادب کے لئے کچھ کرنا چاہتے۔ تو اُردو ادب اپنے ان محسنوں کو کبھی نہ بھولتا۔ دیکھئے آج تاثیر ہم میں موجود نہیں ہیں۔ اور ان کی کوئی ایسی معرکے کی تصنیف بھی موجود نہیں ہے۔ جو تاثیر کو صدیوں زندہ رکھ سکے۔ اگر وہ پوری یکسوئی کے ساتھ کچھ لکھ جاتے۔ تو یقین کیجئے۔ اُن کی لکھی ہوئی چیز یا کبھی نہیں مر سکتی تھیں۔ خدانخواستہ اگر آج عابد صاحب بھی ہم میں سے اُٹھ جائیں تو لوگ انھیں کے برس تک یاد رکھیں گے؟ اور ان کے علم و فضل سے لوگوں کو کتنا فیض پہنچا؟ اِن کے پاس بیٹھئے تو یہ علم و فضل کے خزانے کھول کے رکھ دیں گے۔ اور جب ہم انھی چیزوں کو کتابی صورت میں ڈھونڈھنا چاہیں گے۔ تو ہمیں مایوسی ہوتی ہے۔

آجکل اس کمی کا احساس عابد صاحب کو بھی ہوا ہے۔ وہ احساس غالباً اس لئے بھی ہے۔ کہ یہ بہت بیمار رہے ہیں اور رہیں۔ سوچتے ہوں گے۔ اگر یونہی چل بسے، تو کیا ہوگا۔ بہت ممکن ہے وہ اب صحت یاب ہونے پر کچھ کریں۔ میں تو ان کی زندگی کی دعا صرف اسی لئے مانگتا رہتا ہوں۔

یہاں لطیفے کی ایک بات یہ بھی سن لیں۔

یہ مجھ سے اکثر کہا کرتے ہیں "طفیل تم جو اپنی تمام صلاحیتیں اور روپیہ نقوش کے یہ بیہر گرانڈیل نمبر چھاپ کر ضائع کیا کرتے ہو اسے فی الفور ختم کر دو۔ اور کوئی ایسا کام کرو۔ جو تمہیں زندہ جاوید بنا دے۔ مثلاً چار ہزار صفحوں کی تاریخ ادبِ اُردو چھاپو۔ تمام بڑے بڑے شعرا پر بڑے معرکے کے مضامین کوئی دو ہزار صفحوں پر چھاپو۔ تمام مثنویوں کو ایڈٹ کر کے یا کرا کے ان کے بسیط مقدمات کے ساتھ ایک جگہ چھاپو۔ اور یہ بھی بتاؤ۔ کہ ان مثنویوں کا تاریخی پس منظر یہ تھا۔ یہ تم کیا کر رہے ہو کہ ہر مہینے اتنا لحیم شحیم نمبر چھاپ دیتے ہو۔ خدارا کوئی کام کرو" ——— عابد صاحب نے مجھ سے جو کچھ کہا۔ میں وہ سب کرنے کی کوشش کروں گا (خدا مجھے اس کی توفیق بھی دے) لیکن میں بھی ان سے یہ کہتا ہوں ——— خدارا کوئی کام کریں!

یوں تو انھوں نے کئی مشاعروں اور ادبی نشستوں کی صدارت کی ہوگی۔ لیکن ایک مرتبہ جو انھوں نے ایک مشاعرے کی صدارت کی تو مزا ہی آگیا۔ اُس مشاعرے میں بڑے بڑے اساتذہ کے ساتھ ایک نئی اُبھرتی ہوئی شاعرہ کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ جو بلاشبہ اُس وقت اور اُس عمر میں بھی اچھے شعر کہتی تھیں۔ اس پر مستزاد، اُن کا ترنم، چند ہی روز پہلے لاہور ہی میں پڑھ کر اتنی داد وصول کر چکی تھیں۔ کہ آج غالب بھی زندہ ہو کر آجاتے۔ تو انھیں بھی اتنی داد نصیب نہ ہوتی۔ یہی وجہ تھی کہ ہال کے باہر یا علی کے نعرے لگ رہے تھے۔ ہجوم نے ہال کے تمام شیشے توڑ ڈالے۔ حتیٰ کہ دروازوں کی چولیں تک ہوا ہو چکی تھیں۔ جب عابد صاحب نے یہ صورتِ حال دیکھی۔ تو انھوں نے منتظمین کی حالتِ زار کا اندازہ کر کے جیسے شہنشاہ جہانگیر کے سے انداز میں فرمایا (جو میں نے پکار نامی فلم میں دیکھا تھا) ہال کے تمام دروازے کھول دیئے جائیں۔ جب اس پر بھی کارکن ٹس سے مس نہ ہوئے۔ تو کرسیِ صدارت سے ایک بار پھر اعلان ہوا "میں کہتا ہوں۔ تمام دروازے کھول دیئے جائیں" چنانچہ تمام دروازے کھول دیئے گئے۔ چونکہ بیشتر لوگ بلا ٹکٹ آئے تھے۔ اس لئے اس مُوڈ میں تھے۔ کہ سب کو ہوٹ کریں گے۔ بڑے بڑے شاعر ہوٹ

ہوئے۔ لیکن جب محترمہ کی باری آئی تو انھیں متوقع داد ملی۔ اُن کے بعد چند ایک اساتذہ کرام کو محض احتراماً سُن کر پھر بہ اصرار کہ محترمہ ہی پڑھیں۔ اُس وقت ماحول ایسا تھا کہ ایک دَور اور ہوتا۔ لیکن لوگوں کے بے جا بڑھتے ہوئے اصرار نے عابد صاحب سے یہ کہلوا دیا کہ اگر آپ لوگ ایسے ایسے اساتذہ کے بعد بھی محترمہ ہی کے کلام کی فرمائش کریں گے۔ تو میں مشاعرہ برخاست کر دوں گا۔ جب اِس دھمکی پر بھی سامعین کا مطالبہ جُوں کا توں رہا تو اِن کی طرف سے مشاعرہ شروع ہونے کے کوئی ڈیڑھ گھنٹہ بعد ہی یہ اعلان کر دیا گیا۔ کہ میں مشاعرے کے برخاست ہونے کا اعلان کرتا ہوں۔

مشاعرے کے دو تین روز بعد جب میری سیّد صاحب سے ملاقات ہوئی۔ تو انھوں نے خود اُس مشاعرے کا ذکر کیا اور کہا: بچّی بے شک اچھے شعر پڑھتی اور کہتی ہے۔ لیکن اِس کا یہ مطلب نہیں ہے۔ کہ ہم سامعین کو اِس کی اجازت دے دیں۔ کہ وہ اساتذہ کی تذلیل پر اُتر آئیں۔

اِسی طرح کا ایک واقعہ اور بھی ہے۔

میرے ایک کرمفرما دوست نے عابد صاحب کی صدارت میں ایک مشاعرہ اور کرایا تھا۔ اور میری یہ ڈیوٹی لگادی کہ گیٹ پر کھڑا رہوں تاکہ جو شاعر ایک بار ہال میں آجائے۔ وہ باہر نہ نکلنے پائے۔ ابھی مشاعرہ شروع ہی ہوا تھا۔ کہ ایک صاحب بھاگے ہوئے آئے اور کہا: "یار عابد صاحب تو مشاعرہ ختم کرنے والے ہیں"۔ یاد رکھیئے کہ ابھی مشاعرہ شروع ہوئے پون گھنٹہ ہی ہوا تھا۔ میں بھی اِس صورتِ حال سے گھبرا سا گیا۔ چنانچہ ایک چھوٹا سا پرزہ لکھ کر ان کی خدمت میں پیش کیا کہ "اس مشاعرے کو ذرا اور چلایئے۔ تاکہ مشاعرہ مشاعری بن کر نہ رہ جائے۔ اور اگر آپ کو جلدی ہو۔ تو اپنا قائم مقام صدر شوکت صاحب کو بنا دیں"۔ میں نے محسوس کیا کہ میری اِس بے جا مداخلت پر بڑے جھلّائے۔ لیکن انھیں میری خاطر منظور تھی۔ اس لیے بادلِ نخواستہ اعلان کر دیا: "چونکہ مجھے جلدی ہے۔ اِس لئے میں شوکت تھانوی صاحب سے کہوں گا۔ کہ وہ کرسیٔ صدارت پر براجمان ہوں۔ اِس پون گھنٹے کی صدارت میں بات صرف اتنی ہوئی تھی۔ کہ شاعر شعر پڑھ رہا تھا۔ اور سامعین میں سے کچھ ہنسی اُڑا رہے تھے اور کچھ مرغوں کی طرح اذانیں دے رہے تھے ـــــــ اس کے بعد شوکت صاحب نے کچھ سامعین کے ساتھ مل کر اور کچھ انھیں اپنے ساتھ ملا کر مشاعرے کو اس انداز سے چلایا کہ خاصا کامیاب رہا ـــــــ عابد صاحب کی خدمت میں میری گذارش یہ ہے۔ کہ وہ کسی مشاعرے کی صدارت نہ کیا کریں۔ اس لیئے کہ وہ اس دَور میں بھی مہذّب اور باسلیقہ سامعین کی توقع لے کر آتے ہیں۔ اور جب ماحول اس کے برعکس پاتے ہیں۔ تو پرنسپل بن جاتے ہیں۔

ان کی زندگی میں چند ایک واقعات ایسے بھی آئے جنھوں نے ان کی زندگی کے رُخ ہی کو موڑ دیا۔ ان میں ایک دوسری شادی کا قصّہ ہے اور ایک کالج کے ٹرسٹ سے تنازعہ، اِن دونوں جھگڑوں کا معاملہ عدالت کے رُوبرو ہے۔ اِس لئے اِس پر اپنی طرف سے کسی قسم کا اظہارِ خیال کرنا مناسب نہ ہوگا۔ پھر بھی وہ باتیں کہہ لینے میں کچھ ہرج نہیں ہے۔ جو بے ضرر ہوں۔ میرا خیال ہے کہ شادی کے معاملات کو بالکل نہ چھیڑا جائے۔ اس لئے کہ وہ دل کے معاملات تھے۔ جو اب عدالت کے معاملات بن گئے ہیں۔

کالج کے ٹرسٹیوں سے جب یہ جھگڑا اچلا۔ تو یہ اختلاجِ قلب میں بُری طرح مبتلا تھے۔ حالات یکسر ان کے خلاف تھے۔ اور یہ خود اتنے بیمار تھے۔ کہ زندگی اور موت میں صرف دو چار ہی قدم کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ انھیں پہروں اپنا ہوش نہ رہا۔ لیکن ان دِنوں بھی ان کے دم خم دیکھنے والے تھے۔ ذرا بھی تو پریشان نہ تھے۔ ان کی جگہ کوئی اور ہوتا۔ تو وہ مرنے سے پہلے ہی مر جاتا۔ لیکن یہ صرف اُنھی پریشانیوں کی وجہ سے نہ مر سکے۔

ویسے آجکل یہ بھی کہتے رہتے ہیں۔ کہ مرنے والا ہوں۔ فلاں کتاب کا ڈھانچہ ذہن میں ہے۔ فلاں کام کرنا ہے۔ چاہتا ہوں کہ مرنے سے پہلے کر جاؤں۔ لہٰذا تم وعدہ کرو۔ کہ میرے مرنے کے بعد میرے تمام مضامین اکٹھے کرو گے۔ اور چھاپو گے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ مر جائیں لیکن جو

کام یہ کرنا چاہتے ہیں۔ اور سب سے شاید ان سے بہتر کوئی نہ کر سکے۔ وہ اگر کر گئے۔ تو کوئی لاکھ زور لگائے۔ یہ کبھی نہیں مریں گے۔ اور اب بھی مجھے ان کی موت میں کچھ شک ہی ہے۔

یوں تو یہ شیعہ ہیں۔ لیکن ذرا اونی سے۔ بیٹھے بیٹھے اپنے شیعہ دوستوں سے پوچھیں گے۔ کہ بھئی سناؤ۔ تبرّے کے قائل ہو یا نہیں۔ اگر وہ انکار کرے تو یہ کہیں گے۔ تو پھر آپ کیسے شیعہ ہیں۔ صحیح قسم کا شیعہ تو وہ ہے۔ جو تبرّے کو اپنا ایمان سمجھتا ہو۔ اگر کوئی شامت اعمال سے یہ کہہ دے کہ ہاں میں تو تبرّے کا قائل ہوں۔ تو سنی دوستوں سے مخاطب ہو کر فرمائیں گے۔ بھئی یہ لعین (اور لعین کا لفظ بڑے پیار میں کہیں گے) حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ، اور حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو گالیاں دیتا ہے۔ اور اسے شرم نہیں آتی۔ بھلا سوچو تو گالی دینا بھی کوئی اچھا کام ہو سکتا ہے ——— مطلب یہ ہے۔ کہ ان کے ہاں تنگ نظری کو کوئی دخل نہیں۔ ایسے نازک معاملات میں بھی دل لگی سے باز نہیں آتے۔

ایک بار انھوں نے یہ بھی فرمایا۔ کہ میں نے سنا ہے۔ کل رات فلاں مجتہد صاحب امام حسینؑ کی سیرت پر روشنی ڈال رہے تھے۔ اور مجمع زار زار رو رہا تھا کہ مجتہد صاحب نے ایک دم رک کر یہ فرمایا۔ حضرات قبل اس کے کہ میں حضرت امام حسین کی سیرت پر مزید روشنی ڈالوں۔ آپ ایک خوشخبری سن لیں۔ کہ پاکستان کرکٹ کا میچ جیت گیا ہے ——— اس لطیفے پر حاضرین کا ہنستے ہنستے وہ برا حال ہوا ہے۔ کہ سماں دیکھنے ہی والا تھا۔

یہ بلا کے زندہ دل ہیں۔ لسان ایسے کہ بڑے بڑے ان کے سامنے نہیں ٹھہر سکتے۔ یہ ذہنی طور پر گھٹک قسم کے انسان نہیں ہیں۔ بلکہ بڑے صاف ذہن کے مالک ہیں۔ جذباتی ضرور ہیں۔ وہ بھی اس حد تک کہ منٹ میں راضی اور منٹ میں ناراض۔

بڑوں کو یہ کچھ نہیں سمجھتے۔ لیکن بچوں کو اپنا مشیر بھی بنا لیتے ہیں۔ باتیں بڑے تیقن کے ساتھ کرتے ہیں۔ اور بچہ سمجھ کر چھوٹے بڑوں کی باتیں سنتے ہیں۔ ایکدم ہر ایک پر اعتماد کر لیتے ہیں۔ لیکن خود دوسروں کے سامنے ڈٹ جاتے ہیں۔

ہنگامہ آرائی ان کی طبیعت کا خاصہ ہے۔ ہر دور میں کسی نہ کسی ہنگامہ کی سرپرستی کرتے ہی رہے ہیں۔ یہ بھی ایک طرح سے ان کی طبیعت کے کھرے پن کی نشانی ہے۔ کہ جس چیز کو حق پر سمجھا۔ اس کی حمایت میں سر دھڑ کی بازی لگا دی۔ اور جس بات کو غلط سمجھا۔ اسے زندگی اور موت کا سوال بنا ڈالا۔

عابد صاحب نے زندگی کی تمام ناکامیوں اور تمام الجھنوں کا اس پامردی سے مقابلہ کیا ہے۔ کہ مجھے ان پر رشک آیا ہے۔

انھوں نے اپنی خوشیوں اور مسرتوں کو جب اپنے ہاں سے خود دھتکارا ہے تو افسوس بھی ہوا ہے۔

لیجئے عابد صاحب، آپ کے حکم کی تعمیل ہو گئی۔ مگر کیوں کر ہوئی۔ یہ نہ پوچھیے۔ اتنے بڑے فقرنے میرے ذہن میں گھس کر دماغ کی ساری چیزوں کو بے جگہ کر دیا ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے برتن میں جامنوں کو ڈال کر بڑے زوروں سے ہلایا گیا ہو۔ ان حالات میں میری تو دعا یہ ہے کہ یہ مضمون آپ کی نظر ہی سے نہ گذرے۔ لیکن ایسا ہو گا نہیں، اس لئے کہ میری دعائیں پہلے کونسی قبول ہوئی ہیں جو یہ ہو گی۔ قارئین کے سامنے اس مضمون کو پیش کرتے ہوئے اس لئے جھجک نہیں ہے۔ کہ وہ اچھے برے مضامین پڑھنے کے عادی ہو ہی جاتے ہیں۔

ذکر اپنے تصور کا کر رہا ہوں"

"جب تو میں ان سے ضرور ملوں گا!"

"میں آپ کو ایسی رائے نہیں دوں گا جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں انہیں دیکھ کر یا پہلی بار ان سے مل کر کوئی شخص بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ نحیف و نزار آدمی عالم و فاضل ہونے کی حیثیت ہی سے نہیں، ایک انسان ہونے کی حیثیت سے بھی بہت بڑا ہے ـــ آپ ان سے مل کر بھی ان سے متاثر رہتے ہیں۔ اور یہ کوئی مبالغہ نہیں۔ عام طور پر جب آپ کسی اہم آدمی سے ملاقات کرتے ہیں تو پہلے پہل بہت متعدد سنجیدگی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اور پھر آہستہ آہستہ چند ملاقاتوں کے بعد کہیں جا کر ذرا بے تکلف ہوتے ہیں مگر یہاں معاملہ اس کے برعکس ہے۔ آپ جب ان سے ملیں گے تو ـــ وہ آپ کو ایک بالکل عام آدمی نظر آئیں گے ـــ اور آپ ان سے بلا تکلف سب کچھ کہہ دیں گے۔ لیکن چند ملاقاتوں کے بعد جب ان کی خدمت میں حاضر ہوں گے ـــ تو بقول جگر مراد آبادی کے

ہر بیٹھ با ادب ہو کر تو اٹھ باخبر ہو کر

آپ محسوس کریں گے کہ یہ شخص تو علم کا بحر ناپیدا کنار ہے اور شاید ہی کوئی ایسی کتاب ہوگی جو ان کی نظروں سے نہ گزر چکی ہو۔"

"خوب! ایسی ہستی سے نہ ملنا تو صریحاً بدنصیبی ہے!"

"میں نے جب انہیں پہلی مرتبہ دیکھا تو یہ پنجاب یونیورسٹی میں لائبریرین تھے ـــ کتابوں کی ایک الماری کے پیچھے، مجھے ایک بے آب و رنگ نحیف سا، خشک سا چہرہ دکھائی دیا اور میرے دل میں خیال گزرا کہ یہ بوڑھا شخص گزرے زمانے کی کوئی شے ہے جسے کسی عجائب گھر سے اٹھا کر یہاں رکھ دیا گیا ہے تاکہ ان لوگوں کے کام آئے جو آثار قدیمہ پر ریسرچ کر رہے ہیں۔"

"واقعی!"

"ممکن ہے یہ لفظ کہنے کو تو میں نے کہہ دیئے ہیں مگر میرے ذہن پر ایک لرزش سی طاری ہو گئی ہے۔ آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ مجھے ان کی ذات سے کتنی گہری عقیدت ہے اور میں ان کا کس قدر احترام کرتا ہوں، دوسری مرتبہ جب میں نے انہیں دیکھا تو وہ حافظ محمود شیرانی کے مکان کی سیڑھیوں پر چڑھ رہے تھے اور میں اتر رہا تھا۔ یوں سمجھئے جس قد و قامت کے یہ خود تھے اسی قد و قامت کی کتاب ان کی بغل میں تھی ـــ میں ایک لمحے کے لئے ٹھٹک کر رہ گیا۔ کتاب انہوں نے اٹھا رکھی ہے یا کتاب نے ان کا وزن اٹھا رکھا ہے۔ میرا جی چاہا کہ ان کی مدد کروں۔"

"اور آپ نے کی؟"

"اس کا موقع ہی نہیں ملا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی دیکھتے اوپر چلے گئے اوپر سے حافظ شیرانی کی آواز آئی "آیئے"۔ اس آواز میں محبت کی گرم جوشی اور ملاقات کا فراواں اشتیاق تھا۔ میں سب کچھ اس کے بعد دوبارہ اوپر گیا تو سوچا اختر شیرانی کے کمرے میں جانے سے پہلے ذرا اس عجیب و غریب آدمی کو دیکھ لوں کہ کیا کر رہا ہے اور میں نے ـــ"

"ہاں ہاں کہو!"

"آپ جانتے ہیں میں اختر مرحوم کو اپنی نظمیں دکھایا کرتا تھا۔ اس زمانے میں اسلامیہ کالج میں پڑھتا تھا اور قریب قریب ہر روز کالج سے بھاگ کر اختر مرحوم کے یہاں پہنچ جاتا تھا۔ محمود شیرانی ان کے والد تھے اور یہ بات ہے کہ جتنی محبت مجھے اختر شیرانی سے تھی اسی قدر ان کے والد گرامی سے خوف آتا تھا ـــ اس کی وجہ غالباً یہ ہو گی کہ اختر بھی ان سے خوف زدہ رہتے تھے۔ حافظ شیرانی کے متعلق یہ بات بھی مشہور تھی کہ جہاں تک علم و فضل کا تعلق ہے حافظ سارے ہندوستان میں لاثانی ہیں ـــ تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ اس عجیب و غریب آدمی کو دیکھنا چاہتا تھا کہ حافظ صاحب کے پاس کیا کر رہا ہے۔ میں اختر شیرانی کے کمرے میں جانے کی بجائے حافظ صاحب کے کمرے کے دروازے پر رک گیا اور اندر نظر ڈالی۔ دیکھتا کیا ہوں کہ حافظ صاحب ہمہ تن توجہ بنے اس نو وارد کی گفتگو سن رہے ہیں ـــ یہ میری ان سے دوسری خاموش ملاقات تھی۔ اس کے بعد میں نے مدت تک انہیں کہیں نہیں دیکھا۔ پھر ایک دن اتفاق سے انہیں دیکھ لیا۔ شاید یونیورسٹی لائبریری میں ـــ ان کے سامنے دو طالب علم بیٹھے تھے۔ ان طالب علموں کو مخاطب کر کے جو کچھ وہ کہہ رہے تھے وہ اب تک میرے کانوں میں گونج رہا ہے۔ وہ کہہ رہے تھے۔

"زندگی بغیر کسی نصب العین کے بیکار ہے۔ زندگی جس قدر وسیع اور بلند ہوگی، نصب العین اسی قدر ارفع اور اعلیٰ ہوگا۔ مجھے ان لوگوں پر افسوس ہوتا ہے جو بغیر کسی آئیڈیل کے زندگی بسر کرکے مر جاتے ہیں۔ جب کوئی اعلیٰ نصب العین پیشِ نظر ہو تو انسان کے سینے میں وہ حرارت پیدا ہی نہیں ہو سکتی جو اسے مسلسل مصائب برداشت کرنے کا حوصلہ عطا کرتی ہے۔ علم حاصل کرنا اور اس میں وسیع درجہ حاصل کرنا بھی ایک بہت بڑا نصب العین ہے۔"

"یہ الفاظ سن کر پہلی مرتبہ میرے ذہن میں یہ خیال پیدا ہوا کہ یہ معمولی آدمی ہرگز نہیں ہو سکتا۔"

"ایسے الفاظ معمولی انسان کہہ ہی نہیں سکتا۔!"

ان کے الفاظ — ہاں تو آپ کچھ اور سننا پسند کریں گے۔ ایک سنٹ ٹھہریئے۔ ابھی حاضر ہوتا ہوں۔ یہ ننھی کاپی جو آپ اس وقت میرے ہاتھوں میں دیکھ رہے ہیں، مجھے بہت عزیز ہے — اور کیوں عزیز ہے اس کی وجہ ابھی آپ کو معلوم ہو جائے گی! سنئے: کہیں کہیں سے پڑھتا ہوں!

حافظ محمود شیرانی بلا کے کام کرنے والے تھے۔ ہر روز کم از کم دس گھنٹے مطالعے کے لئے وقف کر دیتے تھے ان سے میں نے ایک ایسا سبق سیکھا ہے جسے میں کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ وہ کہا کرتے تھے ہنگامہ خیزی ایک اوسط درجے کی چیز ہے اور یہی حالت نمود و نمائش کی بھی ہے۔ اصل مقصد خاموشی کے ساتھ کام کرنا ہے۔ دروازہ بند کرکے کام کرو۔ ایک سکالر کا یہی فرض ہے اور یہی فرض ہونا چاہئے۔"

اور سنئے!

"میں اس ادارے سے وابستہ ہوں جس کی روایات کا تقاضا یہ ہے کہ آدمی ہنگامہ خیزی اور نمود و نمائش سے بالکل الگ رہے۔ دوسروں کے لئے مواد جمع کرے۔ ہم لوگ انشا پرداز نہیں ریسرچ کرنے والے ہیں ہمارا کام یہ ہے کہ ریسرچ کرکے مختلف موضوعات پر بنیادی معلومات فراہم کریں اور یہ معلومات انشا پردازوں کے حوالے کر دیں تاکہ وہ انہیں استعمال کریں۔ کام کرتے وقت شہرت کا خیال دل سے نکال دینا چاہئے ورنہ وہ سپرٹ سلامت نہیں رہ سکتی جس کا دوسرا نام فرض کا احساس ہے۔"

اگر آپ فرمائیں تو چند سطریں اور سنا دوں۔

"ادب کا سرچشمہ اصل میں دردمندی ہے۔ جب تک سینے کی گہرائیوں میں درد پیدا نہ ہو احساسات میں خلوص پیدا ہو ہی نہیں سکتا۔ خلوص ہی ادب کی جان ہے۔ دوسروں کے جذبات کو سمجھنا اور ہمدردی کے ساتھ سمجھنا ہمدردی ہی کا نتیجہ ہے۔ ایک ادیب کو سب سے پہلے ایک دلِ دردمند چاہئے۔"

صرف دو تین سطریں اور

"مقاصد عظیم، شوق بے نہایت، دلِ دردمند، کتابوں کی ایک مکمل لائبریری — یہ چیزیں میسر ہو جائیں تو ادارہ کیا چاہئے۔ بدقسمتی یہ ہے کہ موجودہ معاشرے میں یہ چیزیں میسر نہیں آ سکتیں۔ ہمیں زندہ رہنے کے لئے لغو اور بیہودہ قسم کی تگ و دو کرنا پڑتی ہے۔ انسانی زندگی کا یہ ایک بہت بڑا المیہ ہے۔"

"یہ انہی کے الفاظ ہیں؟"

"ظاہر ہے۔ میں جب بھی ان سے ملاقات کرتا ہوں گھر آ کر ان کے چند الفاظ لکھ لیتا ہوں"

"خوب آپ تو باسویل بننے کی کوشش کر رہے ہیں!"

"میں اور باسویل — جی نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ان کی شخصیت علم و فضل کے اعتبار سے کسی طرح بھی ڈاکٹر جانسن سے کم نہیں — مگر باسویل

کون جانے گا یا کون جانے !"

"ان کو صاحب — یہ بھی کون۔ آپ نے ابھی تک بتایا نہیں۔ کمال کرتے ہیں آپ بھی۔"

"تو کیا آپ کا خیال ہے میں آپ کو ان کا نام نہیں بتاؤں گا بلکہ میں تو یہ سوچ رہا ہوں کہ یہاں سے اٹھ کر انہیں کے پاس جائیں گے۔"

"چلئے نا پھر"

"اگر آپ اجازت دیں تو ذرا اس شخصیت کا پس منظر بتا دوں۔ ملاقات اس وقت بہتر ہو گی جب آپ بھی میری طرح ان کے متعلق کچھ جانتے ہوں ابھی چلتے ہیں چند لمحوں میں ۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ ان کے بارے میں دو ایک باتیں بتاؤں آپ کو۔ اب یہی دیکھئے۔ آپ ان سے ملنے کے لئے بیتاب ہو گئے ہیں اور چاہتے ہیں کہ جلد سے جلد ان کے پاس پہنچا جائے مگر ان کی طبیعت میں اس قسم کی بے چینی اور اضطراب کا گزر ممکن ہی نہیں جس شخص نے پنجاب یونیورسٹی کی لائبریری میں سالہا سال تک قلمی کتابوں کی ورق گردانی کی ہے اور ایک ایک کتاب کے بیسیوں نسخے پڑھ ڈالے ہیں اس شخص کے تحمل کا اندازہ کرنا کوئی آسان کام نہیں اسی چیز نے ان کو اصول اور ضابطے کا اس قدر پابند بنا دیا ہے کہ وہ ذرا سی بے ضابطگی بھی دیکھ نہیں سکتے۔ نہ خود بے ضابطگی کرتے ہیں اور نہ دوسروں کو کرنے کی اجازت دیتے ہیں۔ ایک ننھا سا واقعہ سناتا ہوں۔ ایک دن میری موجودگی میں وہ اپنے شاگردوں کی درخواستیں دیکھ رہے تھے۔ ایک درخواست پر دستخط کر کے انہوں نے اس درخواست والے شاگرد کو اندر طلب کیا مگر یک لخت خیال آیا کہ اس درخواست سے پہلے، ابھی ایک اور درخواست مل چکی ہے۔ 'دستخط شدہ درخواست' والا شاگرد آیا تو کمرے کے باہر بھیج دیا کہ چند منٹ انتظار کرو اور پھر اس شاگرد کی درخواست پر غور کرنے لگے جو پہلے پہنچ چکی تھی — یہ ہے اصول اور ضابطے کی پابندی کا عالم مگر دوسری طرف وہ مطمئن ہونا بھی نہیں جانتے !"

"کیا مطلب ؟"

"ان کی فطرت کا ایک خاص پہلو یہ بھی ہے کہ وہ عموماً غیر مطمئن بھی رہتے ہیں — مثلاً اگر آپ حسنِ اتفاق سے یا سوءِ اتفاق سے کسی ادبی رسالے کے ایڈیٹر ہیں اور ان کی خدمت میں جا کر مضمون طلب کرتے ہیں تو وہ پہلے بڑے عاجزانہ لہجے میں معذرت طلب کریں گے۔ اگر آپ ڈھیٹ ہیں اور ظاہر ہے ایک ایڈیٹر ڈھیٹ نہیں ہو گا تو دنیا میں اور کون ہو سکتا ہے اچھا تو آپ ڈھیٹ بنے اصرار کرتے رہے تو وہ وعدہ کریں گے اور اپنے سامنے رکھی ہوئی ڈائری میں آپ کے رسالے کا نام لکھ دیں گے اور وہ تاریخ بھی بتا دیں گے جس دن آپ کو مضمون مل جائے گا — مضمون آپ کو مقررہ تاریخ پر مل جائے گا مگر بھائی صاحب ! یہ سمجھ لیجئے آپ کی آزمائش کا وقت آ پہنچا ہے۔"

"مضمون مل جائے تو پھر آزمائش کے کیا معنی۔ میں نے تو یہ سن رکھا ہے کہ ادیب حضرات وعدہ کرتے وقت تو بڑی دریا دلی کا ثبوت دیتے ہیں مگر ان سے مضمون حاصل کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔"

"یہاں یہ معاملہ نہیں ہے آپ کو مضمون مل جائے گا اور اس کے ساتھ آپ کو یہ خوشخبری بھی سنا دی جائے گی کہ مضمون کی کاپیاں اور پروف وہ خود پڑھیں گے۔ آپ نہیں جانتے اوارقِ ذوالفقار میں سب سے کٹھن مرحلہ کاپیاں اور پروف پڑھنا ہوتا ہے۔"

"اور یہاں مضمون نگار ایڈیٹر کو اس مصیبت سے بھی نجات دلا رہے ہیں۔"

"جی ہاں۔ اب ذرا سنیئے ! جب کاتب ان کا مضمون لکھ لے گا تو کتابت شدہ اوراق آپ ان کی خدمت میں بھیج دیں گے — دو تین دن کے بعد چپڑاسی یہ اوراق آپ کو پہنچا دے گا اور اس کے ساتھ ہی یہ چھوٹا سا رقعہ بھی ہو گا جس میں لکھا ہو گا۔ مضمون میں ذرا تبدیلی کر دی ہے۔ کاتب سے درست کروا لیجئے۔ اب اس ذرا تبدیلی کی کیفیت یہ ہے کہ ہر پانچ سات سطروں کے بعد ایک نئی سطر لکھ دی گئی ہے اور یہی نہیں بلکہ حواشی بھی پُر ہیں اور لطف یہ کہ یہ سب کچھ سرخ سیاہی سے کیا جائے گا۔"

"وہ کیوں ؟"

"شاید اس خیال سے کہ بقول اقبال کے 'معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود'۔ اب یہ الگ بات ہے کہ اس قسم کے معجزۂ فن سے آپ اور کاتب دونوں کا خون کھولنے لگے۔ یہ معاملہ یہیں ختم ہو سکتا اور آگے بڑھے گا اور وہ اس طرح کہ آپ کے محترم جب پروف دیکھیں گے تو ان کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا جائے گا۔ آپ سر پیٹ چکے ہیں، کاتب سر پیٹ چکے اور اب سنگ ساز کے سر پیٹنے کی باری ہے۔"

"کیا وہ اپنی تحریر پر مطمئن نہیں ہوتے"؟

"میرا خیال ہے وہ اپنی تحریر پر اس وقت تک مطمئن نہیں ہوتے جب تک وہ چھپ کر سامنے نہ آجائے۔ بلکہ اس وقت بھی شاید ہی مطمئن ہوتے ہوں۔ اگر ان کا بس چلے تو وہ اس تحریر کی پھر کتابت کروائیں گے اور اپنے نوٹس بین میں از سرِ نو سرخ سیاہی بھریں گے۔"

"بڑی مزے دار آدمی ——— نام کیا ہے؟"

"نام ——— بتاتا ہوں۔ محقق کہتا ہی!"

"کیا ——— یہ نام تو میں نے آج تک نہیں سنا۔"

"اگر آپ نے مرحوم اختر شیرانی کا پرچہ 'رومان' دیکھا ہوتا تو آپ اس نام سے ناواقف نہ ہوتے۔ اس نام سے 'رومان' میں تسلسل سے مضامین شائع ہوتا تھا۔"

"مگر آپ تو کہتے تھے یہ شخص بہت بڑا عالم اور محقق ہے۔"

"کہتا تھا نہیں۔ کہتا ہوں ——— ان کے پائے کے محقق تو صغیر میں بہت کم ہوں گے۔"

"تو یہ نام کیا ہوا ——— محقق کہتانی۔"

"تو پھر سید زبیر ایم اے سمجھ لیجئے!"

"آخر یہ کیا مذاق ہے بھئی؟"

"پندرہ بیس سال گزرے سید زبیر ایم اے کے سیاسی مضامین 'انقلاب' مرحوم میں چھپ کر بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ بعض لوگ انہیں جنیدثانی کے نام سے بھی جانتے ہیں۔"

"سبحان اللہ! بس بھئی اب کوئی اور نام نہ بتانا۔"

"ان کا ایک نام اور بھی ہے۔ وہ ابھی عرض کرتا ہوں ——— وہ نام جو آج سے پوری نصف صدی پہلے رکھا گیا تھا۔ یہ صاحب ۱۹۰۱ء میں ایک ایسی جگہ پیدا ہوئے تھے جو صوبہ سرحد کا ایک گوشہ ہے۔ اسے منگور کہتے ہیں۔ یہ تحصیل مانسہرہ کا ایک بلند مقام ہے۔ ان کے والد ایک مشہور عالم اور فقیہہ تھے اور سادات کے ایک مشہور سلسلے سے متعلق تھے۔ یہ لڑکپن تک انہوں نے گھر ہی میں تعلیم پائی اور اپنے فاضل والد کی وساطت سے عربی اور فارسی کی کتابوں سے روشناس ہوئے۔ پھر لاہور آگئے اور بہت کم مدت میں علم کے انتہائی مراحل سے گزر گئے۔ علم و ادب کے حصول کے ساتھ ساتھ بقدرِ استطاعت سیاسی کاموں میں بھی حصہ لیتے رہے۔ مولانا محمد علی کے ساتھ مل کر تحریک خلافت میں خاص طور پر حصہ لیا اور چونکہ سینے میں آزادی کی سچی تڑپ موجود تھی اس لئے وقتاً فوقتاً ہر اس تحریک کے ساتھ مخلصانہ تعاون کیا جو برطانوی سامراج کو ختم کرنے کے لئے اٹھی میرا خیال ہے کہ اگر اس زمانے میں انہیں حافظ شیرانی اور علامہ ڈاکٹر محمد شفیع کی صحبت نصیب نہ ہوتی تو ان کا اصل مقام یونیورسٹی لائبریری کی بجائے جیل خانے کی کوٹھڑی ہوتی۔ ان دونوں بزرگوں نے ہمارے محترم کے آتشیں رجحانات کا دھارا اپنی استادانہ شفقتوں کے زیرِ اثر، علمی مشاغل کی طرف پھیر دیا اور وہ لائبریری میں اپنے وقت کا بیشتر حصہ کتابوں کی صحبت میں گزارنے لگے۔ مگر جب دل کی گہرائیوں میں ایک مرتبہ آگ شعلہ زن ہو جاتی ہے تو اس کی حرارت کوئی اور رنگ اختیار کر لیتی ہے۔ مکمل طور پر ٹھنڈی نہیں ہو سکتی۔ میں سمجھتا ہوں محقق کہستانی کے سینے کی حرارت نقرِ غیور، بلند آہنگ خطابت اور تب و تابِ جاودانہ میں تبدیل ہو گئی ہے۔ ان کی فطری ناصبوری اسی حریت پرستانہ جذبے کا منطقی ردِعمل ہے۔ جب کبھی وہ تحریک خلافت کے زمانے کا ذکر کرتے ہیں تو ان کی کمزور و ضعیف آواز میں ایک طوفانی قوت پیدا ہو جاتی ہے اور میں حیران ہوتا ہوں کہ اس تپتے دبلے سے انسان میں یہ بجلی کی کڑک اور بادل کی گرج کہاں سے آگئی ہے۔ یہ لاغر و نحیف جسم کتنا بڑا طوفان اپنے سینے میں چھپائے پھر رہا ہے۔"

"یہ سب کچھ درست ——— مگر نام؟"

"میں چاہتا تھا کہ جس شخص سے آج آپ کی ملاقات کرا رہا ہوں اس کی شخصیت کا ذرا نفسیاتی پس منظر آپ پر واضح کر دوں!"

"وہ تو آپ نے واضح کر دیا تھا۔ اب چلئے!"

"ابھی کہاں واضح کیا ہے۔ دو چار لمحوں کے لئے رک جایئے اور سنئے! ان کا انداز فکر عام اہل قلم سے بہت مختلف ہے۔ اپنی تحریروں میں واقعات کی صداقت پر سب سے زیادہ زور دیتے ہیں۔ کسی چیز کو ادھوری چھوڑ دینا جانتے ہی نہیں۔ محنت شاقہ ان کی فطرت ثانیہ بن چکی ہے۔ میں نے ابھی بتایا تھا کہ دروازے بند کر کے کام کرنا انہوں نے حافظ محمود شیرانی سے سیکھا ہے مگر شیرانی مرحوم سے صرف یہی نہیں کچھ اور بھی سیکھا ہے اور وہ درویشانہ خصوصیت۔ شیرانی مرحوم نے بہت کچھ کمایا، گئے ملائے قلمی کتابیں اور نوادر خریدتے رہے مگر جب تک لاہور میں رہے کرایے کے ایک نہایت معمولی مکان میں رہے۔ یہی حال ہمارے مخدوم کا بھی ہے۔ آپ خود دیکھ لیں گے کہ کس جگہ رہتے ہیں۔ یہ ان کی شانِ استغنا، درویشی اور بے نیازی کا نتیجہ ہے۔ ہاں ایک بات اور عرض کر دوں۔ جن لوگوں نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ خشک کتابوں کے مطالعے میں گزارا ہو اور دنیاوی جاہ و جلال سے بے نیاز ہوں وہ عموماً "تُنکی" ہوتے ہیں۔ بہت کم آمیز اور کم گو ہوتے ہیں مگر قلمی کتابوں کی بوسیدگی نے ان کی فطری خوش مزاجی پر قطعاً کوئی اثر نہیں ڈالا۔ جب بھی کسی سے ملتے ہیں نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ ملتے ہیں اور ان سے جو کچھ پوچھا جائے گا اس کی پوری پوری وضاحت کریں گے۔ طالب علموں کے لئے ان کی ذاتِ گرامی ایک قسم کا ادارہ بن کر رہ گئی ہے۔ طالب علموں کے لئے ہر وقت ان کے اپنے کمرے کے دروازے بھی کھلے ہیں اور گھر کے دروازے بھی۔"

"دیکھئے حضرت! اب میں اور کچھ نہیں سنوں گا۔ خاموشی سے اٹھ بیٹھئے اور مجھے ساتھ لے چلئے!"

"میں اس کے لئے بالکل آمادہ ہوں۔ مگر پہلے آپ کو بتا تو دوں۔ ہمیں جانا کہاں ہے"

"اس کی کیا ضرورت ہے!"

"بہت عجیب جگہ پر رہتے ہیں۔ دیکھئے! ہم سب سے پہلے ایک ایسے بازار میں پہنچیں گے جسے لاہور کے گندے حصے میں خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس بازار کی فضا دو چیزوں سے ہمیشہ دبی رہتی ہے۔ ایک چیز تو ہے پوریوں اور تمباکو کی مشترکہ خوشبو یا بو اور دوسری چیز ہے پرانے گھسے پٹے ریکارڈوں کی سمع خراش آواز۔ آپ جیسے ہی وہاں قدم رکھیں گے پانچ سو سال کے پرانے ریکارڈوں کی آواز لاؤڈ سپیکر کے بازوؤں پہ تیرتی ہوئی آپ کے کانوں میں گھس پڑے گی۔ لطف کی بات یہ ہے کہ یہ آواز یا شور ایک ریکارڈ کا نہیں کئی ریکارڈوں کا ہوگا۔ آپ ذرا آگے بڑھیں گے تو دائیں طرف ایک تمباکو بیچنے والے کی دکان کے ساتھ ایک چھوٹا سا خلا نظر آئے گا جس میں ایک نل بھی دکھائی دے گا۔ میری کوشش یہ ہوگی کہ اس وقت آپ کو خلا کے اوپر والی بالکنی کی طرف دیکھنے نہ دوں۔ وہاں گندے اور بدنما پردے لٹک رہے ہیں اور میں نہیں چاہتا کہ آپ میرے ممدوح اور مخدوم کے مکان کے بارے میں کوئی ناخوشگوار رائے قائم کریں یا یہ سوچنے لگیں کہ یہاں رہنے والے صاحب کنجوس ہیں۔ اچھا تو صاحب میں آپ کا ہاتھ پکڑ کر اس نل والے خلا کی طرف قدم اٹھاؤں گا۔ آپ حیران ہو کر دیکھیں گے کہ یہ شخص کسی مکان میں داخل ہو رہا ہے یا کسی غار میں اتر رہا ہے۔ آپ کو صبر سے کام لینا ہوگا۔ یہ میرے مخدوم کے مکان کا نچلا حصہ ہے۔ آپ میرے پیچھے پیچھے آئیے کیونکہ دو شخص ایک ساتھ اس "[illegible]" سے گزر نہیں سکتے۔ نل سے کچھ دور، سیڑھیوں کے پاس ایک سائیکل پڑی ہوگی۔ ہم بچ بچا کر سیڑھیوں پر قدم رکھیں گے۔ نوکر کی اطلاع دینے کا مرحلہ جب ختم ہو جائے گا تو ہم اوپر جائیں گے۔ پہلے ایک چھوٹا سا کمرہ نظر آئے گا۔ جہاں ہر طرف کتابیں بکھری پڑی ہوں گی فرش پر اُجلی دری بچھی ہوگی — آگے چلیں گے تو ایک اور چھوٹا سا کمرہ نظر آئے گا۔ یہاں کتابوں اور الماریوں کے سوا اور کچھ بھی نظر نہیں آئیگا ہم ایک صوفے پر بیٹھ جائیں گے۔ میں جانتا ہوں اس وقت آپ کے ذہن میں کیا خیال آئے گا۔ آپ پوچھیں گے نہیں مگر سوچیں گے ضرور کہ یہ تمہارے مخدوم کا ڈرائنگ روم ہے یا کسی معمولی کلرک کا کمرہ — خیر آپ سوچتے رہیں گے اور میں آپ کو بتاؤں گا کہ آپ کے ساتھ یہ جو الماری پڑی ہے اس میں میرے ممدوح کی زندگی بھر کا اثاثہ محفوظ ہے۔ ولی دکنی سے لے کر علامہ اقبال تک ہر بڑے اور نمایاں شاعر کے متعلق ہزاروں صفحات الگ الگ فائل میں موجود ہیں۔ خدا جانے یہ کتابیں کب مکمل ہوں گی اور کب چھپیں گی گوناگوں مصروفیات نے ان کے ایک ایک لمحے پر قبضہ کر رکھا ہے۔ پھر بھی وہ وقت نکال کر اردو کے کلاسیکی مصنفوں پر پوری طرح دلجمعی کے ساتھ کام کرتے رہتے ہیں — اسی الماری میں بے شمار مضامین کے غیر مکمل مسودات بھی موجود ہیں جو اگر مکمل ہو کر چھپ جائیں تو ہماری زبان و ادب میں ایک بیش بہا اضافہ ہو جائے۔ پھر آپ کو بتاؤں گا کہ یہ نیلا پردہ جو ہمارے پاس دروازے پر لٹک رہا ہے — ابھی حرکت کرے گا اور اس کے ساتھ ہی ایک نہایت نحیف و نزار جسم آنکھوں اور ہونٹوں پر مسکراہٹ کی ایک باریک سی لکیر لئے ذرا جھکے ہوئے اور بائیں کان کے اوپر ہاتھ رکھے ہوئے یہاں آ جائیں گے۔ اور میں کہوں گا۔

"آپ سے ملئے — آپ ہیں یونیورسٹی اورینٹل کالج کے پرنسپل ڈاکٹر سید عبداللہ، ایم اے، ڈی لٹ"

مولانا صلاح الدین احمد

وزیر آغا

ایک چینی مصنف کا قول ہے کہ مکمل شخصیت، خواب پرستی حقیقت پسندی اور احساسِ مزاح کے حسین امتزاج کے سوا اور کچھ نہیں۔ یہ قول مولانا صلاح الدین احمد کی شخصیت پر بڑی حد تک صادق آتا ہے۔

۱۹۴۷ء کے فسادات میں جب مولانا کا آبائی مسکن ان کا بے حد قیمتی کتب خانہ اور گھر کا دوسرا سامان نذرِ آتش ہوگیا تو مولانا نے مسکرا کر کہا تھا ؎

تنم بسوخت، دلم سوخت، استخوانم سوخت
تمام سوختم و ذوقِ سوختن باقیست

اور یہ کہہ کر انہوں نے قطعاً غیر شعوری طور پر یہ ثابت کر دیا تھا کہ ان میں ایک مکمل شخصیت کے تمام ضروری عناصر موجود ہیں —— سنگین حقائق کا احساس، غم کو خندۂ استہزا میں اڑا دینے کی روش اور دور دھندلکوں میں ایک انجانی پُراسرار منزل کی طرف مسلسل پیش قدمی —— آج اس واقعہ کو تقریباً آٹھ برس ہو چکے ہیں لیکن پیہم مصائب اور مسلسل آفات کے باوجود مولانا صلاح الدین احمد کا یہ "ذوقِ سوختن" کم ہونے کی بجائے فزوں تر ہے۔ ہر صبح وہ ایک تازہ عزم کے ساتھ زندگی کا سامنا کرتے ہیں۔ دن بھر مصائب کی چکی میں پستے ہیں لیکن ہر شام وہ ان مصائب پر ایک فلک شگاف قہقہہ لگاتے ہیں اور اپنے ان خوابوں میں کھو جاتے ہیں جن کی تعبیر ان کی زندگی کا منتہا ہے۔

مولانا موصوف کے یہ "خواب" ان کے رفیق و غم گسار ہیں اور وہ اکثر و بیشتر زندگی کی کرخت سنجیدگی کو ان خوابوں کی ملائمت سے قابلِ برداشت بنانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ لیکن مولانا کے ان خوابوں کی نوعیت شخصی یا ذاتی نہیں۔ وہ ایک عام انسان کی طرح جاہ و حشمت، دولت و ثروت اور قوت و شہرت کے خواب نہیں دیکھتے۔ ان باتوں سے وہ کافی بلند ہیں۔ ان کے خوابوں کا منتہا تو "مسرت کی تقسیم" ہے۔ شاید اگر وہ لیڈر ہوتے تو ملک کے باشندوں کی مادی ترقی کے لئے اپنی زندگی وقف کر دیتے۔ یا اگر مہاتما یا صوفی ہوتے تو عوام کی روحانی بلندی کے لئے سدا کوشاں رہتے۔ لیکن اب کہ انہوں نے فن کار کا لباس منتخب کیا ہے تو ان کی نظریں بھی اپنی زبان و ادب کی ترویج و ارتقا پر مرکوز ہیں اور وہ اسی راہ پر گام زن ہو کر مسرت و بہجت کی تقسیم کے آرزو مند ہیں۔

زندگی میں مسرت کی فراوانی نہیں۔ اس کے حصول کے لئے انسان کو بہرحال کافی تگ و دو کرنا پڑتی ہے۔ ہم محبت، آرٹ، نیچر اور گھر میں اس کی

تلاش کرتے ہیں لیکن آپ مولانا سے ملئے اور چند ہی لمحوں کے بعد آپ کو اس بات کا احساس ہوگا کہ آپ خوش ہیں۔ آپ بتا نہیں سکیں گے کہ کس پُراسرار طریق سے مسرت کا یہ خزانہ آپ تک پہنچا ہے۔ آپ کو صرف اس قدر یاد ہوگا کہ آپ کمرے میں داخل ہوئے تو ایک مسرور چہرے نے آپ کا استقبال کیا۔ ایک مضبوط ہاتھ نے جلدی سے قلم کو میز پر رکھ کر آپ کا ہاتھ دبایا اور دو مسرت سے چھلکتی ہوئی آنکھوں نے آن واحد میں آپ کا احاطہ کرلیا۔ اور آپ کو محسوس ہوا کہ مسرت ایک برقی رو کی طرح آپ کی رگ رگ میں دوڑتی چلی گئی۔ اس کے بعد باتیں شروع ہوئیں تو مولانا نے اس خلوص سے آپ کے معاملات میں دلچسپی لی کہ آپ نے اپنی ساری سرگزشت بلاتکلف سنا دی۔ ادھر سے غم گساری ہمدردی اور خلوص نے آپ کے ایک ایک لفظ کا خیر مقدم کیا اور جب دو تین گھنٹوں کے بعد آپ نے بمشکل رخصت حاصل کی اور کمرے سے باہر نکلے تو آپ کو محسوس ہوا کہ آپ کے سینے پر ایک بوجھ تھا کہ اتر گیا ہے اور آپ خود کو تازہ دم اور سُبک تر محسوس کر رہے ہیں۔

مولانا اپنی فطرت کے ہاتھوں مجبور ہیں ورنہ اس طریق کار نے خود مولانا کو کئی بار مشکل میں بھی ڈالا ہے۔ ان کا حلقۂ احباب بڑا وسیع ہے اور اس میں زندگی کے ہر شعبہ سے متعلق لوگ شامل ہیں۔ چنانچہ کئی بار ایسا اتفاق ہوا کہ مولانا اپنا قلم ہاتھ میں لئے جلدی جلدی کوئی مقالہ ختم کرنے کی دھن میں ہیں شاید انہیں شام کو ریڈیو پر کوئی مقالہ پڑھنا ہے یا شاید کسی علمی و ادبی مجلس کے سیکرٹری نے انہیں ابھی ابھی ٹیلیفون پر بتایا ہے کہ شام کی مجلس میں ان کا مضمون ہوگا کہ اچانک بڑے زور سے دفتر کا دروازہ کھلتا ہے اور ایک نوئی ہیکل نوجوان "السلام علیکم" کا نعرہ لگا کر داخل ہو جاتے ہیں اور اس سے قبل کہ مولانا صورت حال کی نزاکت سے انہیں آگاہ کر سکیں وہ جیب سے کاغذات کا ایک پلندہ نکال کر ان کے سامنے رکھ دیتے ہیں اور مسکرا کر کہتے ہیں "مولانا آپ کو زحمت تو ہوگی لیکن انگریزی کے اس مسودہ کو ذرا دیکھ دیجئے۔ آج چار بجے تک مجھے یہ مسودہ پیش کر دینا چاہئے۔" اور پھر دو بارک کر کہتے ہیں "مولانا یہ وہی ہونے کے پرمٹ کے متعلق ہے نا جس کا پچھلے موسم گرما میں ذکر ہوا تھا۔" اب یہ بات تو معلوم نہیں کہ مولانا کو پچھلے موسم گرما کی ایک گرم شام کا یہ "خطرناک" فیصلہ یاد ہو لیکن یہ حقیقت ہے کہ وہ اپنا کام چھوڑ کر مسودے کی نوک پلک سنوارنے لگتے ہیں۔ نو وارد کی چائے پیسٹری سے تواضع کرتے ہیں، ان کے سیاسی نوعیت کے سوالوں کا جواب دیتے جاتے ہیں۔ ان کی نحفی کی کھانسی کے لئے کوئی نسخہ تجویز کرتے ہیں اور جب گھنٹہ بھر کے بعد یہ صاحب "تھینک یو مولانا" کہہ کر اٹھ جاتے ہیں تو میز کی دراز سے دوبارہ اپنے مضمون کا مسودہ نکالتے ہیں اور دماغ پر زور دے کر یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ مقالہ نذیر احمد کے کرداروں سے متعلق تھا یا ہونے کے پرمٹ سے متعلق۔

مولانا کو تقریباً ہر روز اسی قبیل کے چند ایک "حادثات" سے نبرد آزما ہونا پڑتا ہے۔ لیکن وہ بہت کم دوسروں کے سامنے ان کا ذکر کرتے ہیں چنانچہ اگر اتفاق سے آپ نے خود کوئی ایسا واقعہ دیکھ لیا تو آپ کے ذہن میں رہ گیا ورنہ مولانا کے لئے یہ "حادثات" کسی انوکھی کیفیت کے حامل نہیں ہوتے۔ اس ضمن میں ایک واقعہ مجھے بھی یاد آ گیا۔ کوئی دو برس کی بات ہے۔ ایک روز میں مولانا کے پاس دفتر میں بیٹھا تھا اور مولانا کسی ادبی موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کر رہے تھے۔ غالباً غالب کے معاصرین زیر بحث تھے۔ اتنے میں آہستگی سے دروازہ کھلا اور ایک سفید ریش بزرگ ہوئے ہوئے بڑھتے چلے آئے۔ مولانا نے حسب معمول بڑے پُرتپاک انداز سے ان کا خیر مقدم کیا۔ بیٹھنے کے لئے کرسی پیش کی۔ حال احوال پوچھا اور پھر مجھ سے باتوں میں مصروف ہوگئے۔ یہ سفید ریش بزرگ پہلے تو کچھ دیر غالب کے معاصرین کے بارے میں مولانا کی باتیں نہایت توجہ سے سنتے رہے اور پھر جو گفتگو میں ایک چھوٹا سا وقفہ آیا تو فوراً مولانا کو مخاطب کر کے کہنے لگے "وہ مولانا صاحب آپ نے آج کا اخبار دیکھا ہے؟" میں نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔ مولانا بھی حیران تھے کہ آج ہی کے اخبار میں غالب کے معاصرین کس طرح زیر بحث آ گئے کہ یہ بزرگ کہنے لگے۔ "وہ اخبار میں ایک چھوٹی سی خبر تھی کہ احمد آباد میں ایک لڑکی لڑکا بن گئی ہے آپ کی نظر سے یہ خبر ضرور گزری ہوگی۔ کہاں تک سچ ہو سکتا ہے یہ واقعہ؟" اس روز یہ بزرگ کوئی دو گھنٹے تشریف فرما رہے۔ اور اس دوران میں انہوں نے اس مخصوص واقعہ سے لے کر نجومیوں کی کرامات، پیروں کے معجزوں اور مافوق الفطرت عناصر تک تقریباً ہر موضوع پر اپنے قیمتی خیالات کا اظہار کیا اور یوں مولانا کے "حقیر ذخیرۂ علم" میں اضافہ کر کے تشریف لے گئے۔

یہ اصحاب تو خیر وہ لوگ ہیں جن سے مولانا کی محض علیک سلیک ہے ورنہ مولانا کے اصلی کرم فرما وہ ہیں جنہیں ان کے دوست ہونے کا فخر حاصل ہے۔ مجھے مولانا کے ودستوں سے کوئی پرخاش نہیں۔ میں خود اسی زمرے میں شامل ہوں لیکن ایسے "احباب" کا ذکر آ ہی جاتا ہے جو مولانا کی فطری شرافت سے فائدہ اٹھا کر صرف اپنے خالی وقت کو بخیر و خوبی بسر کرنے کا تدارک کر لیتے ہیں بلکہ بعض اوقات دس گھنٹوں کی "مصاحبت" کے دوران میں مولانا ہی کے ساتھ چائے پیتے اور ان ہی کے کھانے سے کچھ نوالے بھی چکھ لیتے ہیں۔ ان احباب میں سے ایک صاحب کا تذکرہ خاص طور پر ضروری ہے۔ یہ پتلے دبلے آدمی ہیں۔ سگریٹ بے تحاشہ پیتے ہیں۔ ہر گھنٹہ آدھ گھنٹے کے بعد اٹھ کھڑے ہوتے ہیں "اچھا مولانا رخصت، فی امان اللہ!" لیکن اس کے بعد پھر کرسی پر دراز ہو جاتے ہیں۔ اور باتوں کا سلسلہ شروع کر دیتے ہیں تا آنکہ گھنٹہ بھر کے بعد اچانک کھڑے ہو کر ایک بار پھر مولانا سے مصافحہ کرتے ہیں اور پھر کرسی پر بیٹھ جاتے ہیں۔ مولانا ان کی حرکات سے پریشان نہیں ہوتے کیونکہ انہیں معلوم ہے کہ یہ صاحب جب پانچویں بار کرسی سے اٹھیں گے تو یقیناً چلے جائیں گے۔ ایک بار مولانا کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب یہ صاحب چوتھی بار مصافحہ کرنے کے بعد واقعتاً اٹھ کر باہر چلے گئے اور ابھی مولانا انقلاب زمانہ کے اس مسئلہ پر سوچ ہی رہے تھے کہ دروازہ کھول کر پھر اندر آ گئے۔ کہنے لگے "مولانا ایک منٹ اور ضائع کروں گا۔ ایک چھوٹی سی بات رہ گئی تھی ـــــ" ایک گھنٹہ کے بعد جب وہ پھر مولانا سے رخصت ہو کر نکلے تو مولانا یقین کے ساتھ کہہ سکتے تھے کہ اب یہ لوٹ کر نہیں آئیں گے۔

میں نے نسبتاً تفصیل سے ان واقعات کا تذکرہ اس لئے کیا ہے کہ یہ مولانا کے کردار کے ایک اہم پہلو پر روشنی ڈالتے ہیں۔ یعنی ان کی تحمل مزاجی اور ہر کس و ناکس سے ایک سمجھوتہ کر لینے کی صلاحیت پر۔ اور حقیقت یہ ہے کہ جس صبر و تحمل سے وہ اپنے احباب کی بعض حرکات کو برداشت کرتے ہیں کچھ اسی صبر و اطمینان سے وہ وسیع تر زندگی کے دوسرے معاملات سے بھی نبرد آزما ہوتے ہیں۔ میں نے پچھلے دس بارہ برس میں انہیں کئی ایک شدید الجھنوں میں گرفتار دیکھا ہے، لیکن یہ کبھی نہیں دیکھا کہ خارجی حالات و واقعات نے انہیں کوئی گہرا چرکا لگایا ہو۔ وجہ اس کی محض یہ ہے کہ وہ غم، الجھن یا صدمے سے فوراً ایک طرح کا سمجھوتہ COMPROMISE کر لیتے ہیں۔ یہ نہیں کہ ان پر اتنی مشکلیں پڑتی ہیں کہ از خود آسان ہو جاتی ہیں۔ مشکلیں تو بہر صورت ان پر پڑتی ہی رہتی ہیں لیکن مولانا خود ان مشکلات کی عارضی اور ہنگامی حیثیت کے پیش نظر ان سے بے نیاز ہی رہتے ہیں۔ چنانچہ میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ اگرچہ وہ خود اپنی حالت کو سنوارنے یا خود کو کسی شدید الجھن سے نکالنے کی شعوری کاوش نہیں کرتے تاہم ان کی بے نیازی ان کے بہت سے مسائل کو حل بھی کر دیتی ہے۔ وہ مثل کہ "آرزو تمہارے سائے کی طرح ہے، اگر اس سے منہ موڑ لو تو یہ تمہارا پیچھا کرے گی"۔ مولانا کے سلسلے میں بالکل صحیح ثابت ہوئی ہے۔

جیسا کہ میں نے ابھی ابھی عرض کیا مولانا صلاح الدین احمد ہر شے سے سمجھوتہ کرنے کی طرف ہر دم مائل رہتے ہیں۔ لیکن ان کے سمجھوتے کا افق اتنا وسیع ہے اور ان کی وسیع القلبی کا یہ عالم ہے کہ وہ افراد کے علاوہ زندگی کے تلخ واقعات اور آلام و مصائب کے ایام کا بھی ہنسی خوشی خیر مقدم کرتے ہیں۔ یوں دیکھئے تو ہر شخص زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر حالات و واقعات سے ضرور کوئی سمجھوتہ کرتا ہے۔ لیکن اس سمجھوتہ کی دو اقسام ہیں اور یہ سمجھوتہ کرنے والے کے کردار پر منحصر ہے کہ اس نے کون سی نہج اختیار کی۔ بعض لوگ منفی انداز نظر کے تحت اسی طرح سوچتے ہیں کہ زندگی مسرت سے تہی ہے۔ پس انہیں تلخ اور غم ناک واقعات کو بہر حال برداشت کر لینا چاہئے۔ ایسے لوگوں کے برعکس مولانا کا انداز نظر مثبت ہے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ ہر شے، ہر نظریے اور ہر کیفیت میں نہ صرف کوئی نہ کوئی سچائی کا عنصر پنہاں ہوتا ہے۔ بلکہ دنیا کا تلخ سے تلخ واقعہ بھی کوئی نہ کوئی افادی پہلو ضرور رکھتا ہے اور اجتماعی مفاد میں اضافہ کرتا ہے۔ انسان کا کام یہ ہے کہ وہ فرد، نظریے یا واقعے کے ساتھ خود کو اس انداز سے ہم آہنگ کر لے کہ اسے تصویر کا دوسرا رخ اپنی پوری تابانی کے ساتھ نظر آ جائے چنانچہ میں نے دیکھا ہے کہ زندگی میں بھی اور ادبی تنقید کے دوران میں بھی مولانا نے دوسرے کے خیالات یا ادبی نظریات کو انتہائی ہمدردی سے دیکھا اور اس "سچائی" کے عنصر کو تلاش کرنے کی کوشش کی جو فرد کے نظریے کی کسی نہ کسی تہہ میں ضرور موجود تھا۔ عام زندگی میں بھی مولانا کو میں نے بہت کم نظریاتی بحث میں الجھتے دیکھا ہے۔ وہ مخالف کے نقطۂ نظر کو ہمیشہ ہمدردی سے دیکھتے ہیں۔ اور اگر اس نقطۂ نظر کے بعض پہلوؤں سے اختلاف بھی کرتے ہیں تو اس تحمل اور ملائمت کے ساتھ کہ مخالف ردعمل پر آمادہ نہیں ہوتا۔ عام ادبی تنقید میں بھی مولانا نے یہی روش اختیار کی ہے۔ اور بعض لوگ جو وا کرنے

اور وارتسمنے ہی کو ادبی تنقید کا مابہ الامتیاز قرار دیتے ہیں۔ مولانا کے اس مخصوص اندازِ تنقید کو "مدلل مداحی" کے سوا اور کوئی نام نہیں دیتے۔ حق یہ ہے کہ تنقید کے دوران میں مولانا کی یہ تعریف محض برائے تعریف نہیں ہوتی بلکہ اس کے پس پشت دلائل کا ایک مضبوط سلسلہ موجود ہوتا ہے۔ مزید برآں اس تعریف کی اساس اس "تجسس" پر استوار ہوتی ہے جس کے سہارے وہ دوسرے کے نظریات و تجربات میں سچائی کے عناصر دریافت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

مولانا صلاح الدین احمد کی ادبی تنقید کے بارے میں یہ بات محض ضمناً زیر بحث آگئی ورنہ دراصل موجودہ مطالعہ کی حدود اس قسم کے جملۂ معترضہ کی اجازت نہیں دیتیں۔ مولانا کی شخصیت کے بارے میں ایک اور قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ ان کی زندگی میں بیک وقت "بے قاعدگی" اور "باقاعدگی" کے عناصر موجود ہیں۔ "بے قاعدگی" کے عناصر کو تو مولانا خود بھی بڑی معصومیت سے تسلیم کرتے ہیں مگر شاید "باقاعدگی" کے متعلق میرے الفاظ پڑھ کر وہ چونک اٹھیں۔ لیکن میں ابھی عرض کروں گا کہ میں نے یہ بات کیوں کہی۔

مولانا کی زندگی میں "بے قاعدگی" کی تلاش کچھ زیادہ مشکل بات نہیں۔ وہ تقریباً پچیس برس سے "ادبی دنیا" کے مالک اور تقریباً بیس برس سے اس کے ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں لیکن شاید انہوں نے کبھی بھی "ادبی دنیا" کے سلسلے میں پورے طور سے باقاعدگی پیدا کرنے میں کامیابی حاصل نہیں کی۔ اگر وہ چاہتے تو "ہمایوں" کی طرح "ادبی دنیا" بھی ہر مہینہ کی پہلی تاریخ کو منصۂ شہود پر آتا لیکن شاید ان کی فطری بے نیازی ایسی قیود کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ چنانچہ "ادبی دنیا" ہمیشہ ہی کچھ تاخیر سے برآمد ہوتا ہے۔ پھر بیچ میں کافی لمبے وقفے بھی آئے۔ کچھ عرصہ بند بھی رہا۔ پھر لڑکھڑاتا ہوا نکلا اور آج کل پھر ایک بحران میں مبتلا ہے۔ "ادبی دنیا" کی بے قاعدگی سے قطع نظر خود مولانا نے دفتری قواعد و ضوابط میں بھی کافی لچک پیدا کی ہے۔ مضامین نظم و نثر میز کی درازوں، بڑے کاغذی تھیلوں اور کبھی کبھی "بوروں" میں بھی پہنچ جاتے ہیں۔ وہاں یہ اکیلے نہیں ہوتے بلکہ دوستوں کے خطوط، بیرونی ممالک کے اشتہار، بنک کی رسیدیں، پرانے اخبارات کے تراشے اور نہ جانے کون کون سی چیزیں ان کے ساتھ "مصروفِ گفتگو" رہتی ہیں۔ چنانچہ اگر مولانا کو کسی خاص مسودے کی ضرورت پیش آجائے تو پھر اس کو ڈھونڈ نکالنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہوتا۔ ابھی پچھلے دنوں کی بات ہے کہ مولانا کو ایک ایسا مسودہ درکار تھا جو مسودوں کے اس "گودام" میں کہیں پڑا تھا۔ مولانا نے اس مسودہ کو آخر کار ڈھونڈ تو نکالا لیکن اس پر کتنا وقت صرف ہوا اور اس سلسلے میں کن کن مصیبتوں کا سامنا ہوا یہ ایک لمبی کہانی ہے۔

لیکن مولانا کی اس بے قاعدگی کے پس منظر میں ایک باقاعدہ انسان کے نقوش بھی صاف نظر آتے ہیں اور یہ خیال تقویت اختیار کرنے لگتا ہے کہ مولانا کی یہ "بے قاعدگی" محض اتفاقیہ ہے۔ مثلاً یہی دیکھئے کہ پچھلے تیس برس سے مولانا نے صبح کی سیر میں ناغہ نہیں کیا۔ وہ بہت سویرے بستر سے نکل آتے ہیں۔ اور ایک چھتری ہاتھ میں لے کر سیر کو چلے جاتے ہیں۔ واپسی پر کسی غیر معروف سی برلبِ سڑک چائے کی دکان سے گرم گرم چائے کی ایک پیالی پیتے ہیں۔ گھر پہنچ کر سرد پانی سے نہاتے ہیں۔ کپڑے تبدیل کرتے ہیں اور پورے نو بجے دفتر پہنچ جاتے ہیں۔ دوپہر کا کھانا بازار سے منگواتے اور دفتر ہی میں کھاتے ہیں۔ اس کھانے میں بھی کبھی تبدیلی نہیں دیکھی گئی .... دو توس، دو کباب اور ایک ٹماٹر جس کے فوراً بعد وہ چائے کی ایک گرم پیالی پی لیتے ہیں (چائے وہ دن میں چھ بار پیتے ہیں) شام کو آٹھ بجے دفتر سے نکلتے ہیں اور سیدھے گھر چلے جاتے ہیں۔ اس دوران میں بجز کسی میٹنگ یا جلسہ کے اور انہیں کہیں جانے کا اتفاق نہیں ہوتا۔ میں جب ۱۹۴۷ء میں ان سے پہلی بار ملا تو ان کا یہی قاعدہ دیکھا اور آج ۱۹۵۷ء کے اختتام پر بھی وہ اسی ڈگر پر رواں ہیں۔

بظاہر ان کے کام کرنے کے طریق میں کچھ "بے قاعدگی" ضرور نظر آتی ہے لیکن یہاں بھی بنیادی طور پر وہ بڑے "باقاعدہ" ہیں۔ مثلاً اگر انہیں ریڈیو سٹیشن پہنچ کر کسی خاص تاریخ کو اتنے بج کر اتنے منٹ پر کوئی مضمون پڑھنا ہے تو ریڈیو والے اپنے طریق کار سے مجبور ہو کر انہیں دو تین ہفتے پہلے ہی مطلع کر دیتے ہیں اور پھر غالباً ہر ہفتہ یاددہانی بھی کراتے رہتے ہیں۔ لیکن مولانا ان یاددہانیوں سے بے نیاز دوسرے کاموں میں مصروف رہتے ہیں۔ تاآنکہ آخری دن آجاتا ہے۔ اسی روز ریڈیو والے انتہائی پریشانی میں انہیں ٹیلیفون کر رہے ہوتے ہیں اور مولانا نے ابھی مضمون کے لئے کاغذ بھی نکال کر میز پر نہیں رکھا ہوتا۔ تب وہ کاغذ نکالتے ہیں۔ قلم ہاتھ میں لیتے ہیں۔ اور قلم اور وقت کے مابین ایک "جنگ" شروع ہو جاتی ہے .... قلم لکھ رہا ہے،

[illegible]

(چودھری) محمد علی ردولوی

بیگم اخلاق حسین

میرے کرم فرما محمد طفیل صاحب (ایڈیٹر نقوش) کی فرمائش ہے کہ چودھری محمد علی صاحب پر میں مضمون لکھوں۔ انکار کیسے کردوں، اس لئے کہ بقول طفیل صاحب کے مجھ سے زیادہ ان کو یہاں کوئی اور جانتا نہیں ہے۔ اور اگر لکھوں تو وہ باپ ہیں بیٹی۔ پہلے تو ڈر یہ لگتا ہے کہ محبت کہیں صحت سے ہٹا نہ دے۔ دوسرے ان کی وہ خصوصیات جن سے ان کی زندگی ایک اپنا خاص انداز لئے ہوئے رنگین رہی کیسے لکھوں۔ دنیا کہے گی، اور خود چودھری صاحب بھی سوچیں گے کہ ہاں حفظِ مراتب کو قائم رکھنا بالکل بھول ہی گئی۔ بہرحال طفیل صاحب کا کہنا ٹالا نہیں جا سکتا ہے۔ کوشش کرتی ہوں کہ چودھری صاحب کو تھوڑا بہت انہی کے رنگ میں دکھا سکوں۔

چودھری محمد علی صاحب۔ قصبہ ردولی ضلع بارہ بنکی (یوپی) کے رہنے والے ہیں۔ ان کے والد چودھری احسان رسول صاحب ردولی میں تعلقہ دار تھے۔ طبیعتاً بڑے شوقین، رنگین مزاج، صورت شکل کے بڑے حسین اور وجیہہ آدمی تھے۔ پھولوں کا گہنا فیض آباد سے آتا تھا اور دن رات طبلے ٹھنکا کرتے تھے۔ ۲۸ سال کی عمر میں انتقال کر گئے۔ اس وقت چودھری صاحب کی عمر ڈھائی تین سال کی تھی۔ چونکہ تعلقہ کے وارث بھی ایک فرزند تھے اس لئے علاقہ کورٹ آف وارڈس کے سپرد ہو گیا۔ چودھری صاحب کی تعلیم اور تھوڑی بہت جو ہو سکتی تھی تربیت کی بھی ذمہ داری ایک انگریز منیجر تھا اس کے ذمہ ہو گئی۔ پانچ چھ سال تک چودھری صاحب گھر پر رہے۔ بیوہ عورت کے اکلوتے لڑکے ہونے کی وجہ سے بڑی نازبرداریاں ان کی ہوئیں۔ صورت چودھری محمد علی صاحب کی بھی بہت غیر معمولی اچھی تھی اور بہت ہی غیر معمولی دماغ اور ذہانت پانے کی وجہ سے ہر جا و بے جا خواہش اپنی آسانی سے پوری کر لیتے تھے۔ جب اسکول گئے تو لکھنؤ کا ون تعلقہ دار کالج میں بھی باوجود نئی شرارتیں ایجاد کرنے کے چودھری صاحب اپنے پرنسپل اور استادوں کے بڑے چہیتے تھے۔ ایک مرتبہ لکھنؤ میں دربار ہوا۔ اس موقع پر تمام یوپی کے تعلقہ دار اکٹھے تھے۔ وہاں دستور یہ تھا کہ ہر تعلقہ دار حسب حیثیت اشرفیاں ہاتھوں پر رکھ کر گورنر صاحب کے سامنے نذر دکھانے جاتے۔ وہ اس پر ہاتھ رکھ دیتا تھا یہ لوگ واپس لے آتے تھے۔ چودھری صاحب کی عمر اس وقت دس سال سے زیادہ نہ رہی ہوگی۔ یہ بھی گئے اور اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔ دیکھا کہ تمام تعلقہ دار جن میں زیادہ تر مسن اور سن رسیدہ تھے۔ اُٹھ اُٹھ کر نذریں پیش کر رہے ہیں۔ چونکے کہ میں تو لایا نہیں! سوچنے لگے کہ کیا ترکیب کرنا چاہئے۔ آخر دماغ نے کام کیا اور اپنے پاس والے ایک بزرگ تعلقہ دار جو طبیعتاً عمدہ نہ تھے اور جن کو محمد علی صاحب نے بھانپ بھی لیا تھا کہ اگر ان سے اشرفیاں عاریتاً مانگی گئیں تو یہ دیں گے نہیں۔ لہٰذا جیسے ہی وہ نذر دکھا کر آکر بیٹھے اور ان

کے جانے کی باری آئی فوراً اٹھ کر کہنے لگے: بھوں آپ نے کتنی اشرفیاں نذر دکھائیں؟ انہوں نے ہاتھ کھول دیا۔ چودھری صاحب نے فوراً وہ سب اشرفیاں اٹھالیں اور کہا میں لانا بھول گیا، ابھی آپ کو واپس لاکر دے دوں گا۔ وہ بزرگ کچھ تعجب کہ نو دس سال کے لڑکے نے عجب بے وقوف بنایا مگر کرتے کیا۔ گھور گھور کر دیکھتے رہے۔ جب چودھری صاحب واپس آئے تو ان کا بہت بہت شکریہ ادا کیا اور اشرفیاں واپس کر دیں۔ وہ مرشد سے رسیدہ آدمی ہکا بکا۔ کہنے لگے، صاحبزادے! ماشاء اللہ اس عمر میں اتنی برجستہ سمجھداری! خدا نظر بد سے بچائے! پھر ان سے اور چودھری صاحب سے ہمیشہ دوستی کا سا انداز قائم ہو گیا۔ وہ ان کی قدر کرتے رہتے۔

اسکول کالج میں زیادہ نہ پڑھ سکے۔ صرف انٹرنس تک پہنچے تھے کہ ماں کو اور خود چودھری صاحب کو بھی شادی کی جلدی پڑ گئی۔ کورٹ آف وارڈس کے منیجر کی رائے نہیں تھی لیکن ان لوگوں نے اس سے چھپا کر ایک روز بارہ بجے دن کو نکاح کر لیا۔ بعد میں منیجر نے بہت شور مچایا مگر تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ کرتا کیا۔ چپ ہو رہا۔

شادی کے کوئی آٹھ سال کے بعد جب کہ چودھری صاحب کی عمر کوئی ۲۵ سال کی رہی ہوگی، علاقہ کورٹ آف وارڈس سے چھوٹا۔ اس وقت گھر میں پانچ بچے بھی ہو چکے تھے۔

چودھری محمد علی صاحب بڑے نفیس مزاج، بہت بامذاق، خوش دل، خوش گفتار اور جوانی میں نیز بڑھاپے میں بھی بہت خوش لباس، خوش وضع اور بہت ہی خوبصورت اور متین آدمی سمجھے جاتے تھے۔ سوشل اتنے تھے کہ یوپی کا شاید ہی کوئی ایسا شخص ہو جو چودھری صاحب کو نہ جانتا ہو۔ دوستوں سے دوستی نباہنا اور ان کو ان کے پیٹھ پیچھے بھی دل سے چاہنا ان کا خاص حصہ ہے۔ جو دوست ان کے مر گئے ہیں آج تک ان کے لئے اس طرح روتے ہیں جیسے کوئی اپنے عزیز قریب کے لئے روتا ہے۔

علمی شوق اور مشاغل بھی اس حد تک تھے کہ گھر پر سوائے پڑھنے لکھنے کے اور کام ہی کیا تھا۔ نوکری کبھی کی نہیں۔ ایک مرتبہ جوانی میں شوقیہ بنک میں نوکری کی تھی مگر وہ گاڑی چلی نہیں۔ طبیعت کے خلاف حساب کتاب کا کام، اور کسی کی پابندی یہ ان کے ضمیر ہی میں نہ تھا۔ بیزار ہو گئے۔ چھوڑ کر گھر چلے آئے۔ کتابیں ہزاروں روپوں کی منگا کر پڑھ ڈالیں۔ عربی، فارسی، انگریزی، ہندی کوئی زبان اور مضمون ایسا نہیں ہے جس میں چودھری صاحب نے خاص قابلیت نہ پیدا کی ہو۔ علمی مباحث بڑے بڑے انگریزی داں اور بڑے بڑے عربی داں علماء سے برابر کے ہوتے تھے اور اکثر چودھری صاحب صحیح ہوتے ڈاکٹری میں بھی بہت زیادہ دخل ہے۔ اکثر امراض میں جہاں بڑے بڑے ڈاکٹر رائے قائم کرنے سے قاصر رہتے، چودھری صاحب فوراً صحیح رائے قائم کر کے تشخیص مرض کر دیتے۔ کتابیں جتنی پڑھتے تھے زیادہ تر ان کو یاد رہ جاتی تھیں۔ ذہانت اور یادداشت کی یہ کیفیت تھی کہ ایک مرتبہ کہیں مشاعرے میں گئے، وہاں جتنے شعر ان کو اچھے لگے وہ سنتے گئے اور رومال اور کمر بند میں گرہ لگاتے گئے۔ گھر واپس آئے تو گرہ کھولتے گئے اور اشعار لکھتے گئے۔

گانے کا، اشعار کا اور دوسرے ادبی مضامین کا مذاق (Taste) ان کا اتنا عمدہ تھا اور اب بھی ہے کہ لوگوں کو اشتیاق رہتا تھا کہ چودھری محمد علی سے ایک بار مل لیں۔ باتیں ایسی عمدہ کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ ملنے کے بعد کوئی کبھی ان کو بھول نہیں سکتا ہے۔ خصوصاً پڑھی لکھی عورتیں جب مل جاتی تھیں تب تو چودھری صاحب ہنستا پھول ہنسنی کلی ہو جاتے تھے اور ایسی دلآویز، دلچسپ اور رنگ برنگی باتیں کرتے تھے کہ مرد تو مرد، لڑکیاں، بڈھی، جوان عورتیں سب لوٹ پوٹ ہو جاتی تھیں اور چودھری صاحب کا کلمہ پڑھنے لگتی تھیں۔ ہم لوگ اکثر ردولی سے لکھنؤ جاتے اور دو دو مہینے رہتے۔ وہاں سب سے ملنا جلنا رہتا۔ ایک مرتبہ چودھری صاحب نے اپنے استاد کی لڑکی کو جو ۳۲ سال کی رہی ہوگی، کھانے پر بلایا اور بڑی تعریفیں کیں کہ بڑی خوبصورت ہے، پڑھی لکھی ہے، وغیرہ وغیرہ۔ کھانے پر وہ آئیں۔ ہم لوگ ملے۔ کوئی خاص بات نظر نہیں آئی۔ بعد میں ذکر چلا تو ہم سب نے یک زبان ہو کر کہا کہ خوبصورت تو وہ بالکل [illegible] عمر بھی خاصی ہے۔ تو بہت تنبیہاً ہم سب کی طرف دیکھا اور مسکرا کر کہنے لگے کہ "تم عورتیں بھی کسی دوسری عورت کو [illegible] اور نہ ہی تم سے دوسری عورت کی تعریف ہوتی ہے۔ ہمیشہ یہ چاہتی ہو کہ دس برس تم سے بڑی نکلے اور کہیں آنکھ ناک میں کوئی کمی ضرور ہو!"

جس کو کوئی بتیس سال ہو گئے ہوں گے۔ میرے کبھی سانس پھولنے کی کیفیت تک نہیں ہوئی۔ خود ان کی صحت بہت عمدہ رہی کبھی بیمار نہیں ہوئے کھانا تمام زندگی عمدہ، مقوی اور ہلکا کھاتے رہتے، اور پورا پیٹ بھر کر کبھی نہیں کھایا۔

گاؤں کے اسامیوں کے لئے مطب ہر وقت کھلا رہتا تھا۔ چاہے کوئی دوپہر کو ان کے آرام کے وقت آئے جب بھی فوراً اس کو بلا کر دوا دیتے اور تسلی و تشفی سے بھی مطمئن کرتے۔ اکثر جب گاؤں تفریحاً جاتے تو کسی نالی اندر نہ جاتے۔ عورتوں کے لئے نگینے موتیوں کی لڑیاں رنگے ہیں پہننے کا زیور) اور بچوں کے لئے مٹھائی کے کھلونے لے کر جاتے تھے۔ کبھی لکھنؤ میں اگر اس قسم کے اچھے زیور مل جاتے تو لڑکیوں اور عورتوں کے لئے ضرور لاتے تھے۔ وہ روزانہ باشا کرتے تھے۔ ہر ایک سے بڑی دلداری کی بات کرتے۔ ان کے لڑائی جھگڑے اور معاملات بڑے انصاف اور سمجھداری سے سلجھاتے تھے۔ چودھری صاحب ہیں دوسروں کے چھوٹے سے چھوٹے جذبات بھی پورے طور سے سمجھ لینے کی پوری اہلیت ہے۔

میری والدہ مرحومہ سے ان کو بہت محبت تھی۔ ہر طرح کا خیال کیا۔ بڑی خدمت بڑا علاج کیا کیونکہ وہ زیادہ تر بیمار رہتی تھیں، لیکن عورت کے معاملہ میں چودھری صاحب کی کچھ ایسی مجبوریاں رہیں کہ تکلیفیں بھی ان کو کافی پہنچ گئیں۔ سنہ ۱۹۳۰ء میں میری والدہ مرحومہ حج کو جانے والی تھیں، چودھری صاحب کو کبھی سوتے جاگتے اس کا خیال نہیں آتا تھا کہ وہ بھی حج کو جائیں۔ خود میری والدہ کے جانے کے خلاف تھے۔ کہا کرتے تھے کہ حج کے سفر کی صعوبات تم برداشت نہ کر سکو گی۔ مر جاؤ گی۔ لیکن میری والدہ کو حج اور مدینہ منورہ کی ایسی لو لگی تھی کہ انہوں نے چودھری صاحب کی بات نہ مانی اور حج کے لئے روانہ ہو گئیں۔ اُدھر والدہ مرحومہ کا حج کے لئے جانا اِدھر چودھری صاحب کی بے چینی ناقابل برداشت ہو گئی۔ آخر کار بمبئی سے حاجیوں کا جہاز روانہ ہونے سے دو دن پہلے تار دیا کہ میں بھی آ رہا ہوں جہاز میں سیٹ بک کرا لو۔ اور صرف دو جوڑے کپڑے لے کر وہ بھی بے جوڑ کپڑے، بیوی کے پیچھے روانہ ہو گئے۔ وہاں جہاز میں سیٹیں سب بک ہو چکی تھیں، ایک بھی نہ تھی۔ لیکن آخر وقت کوئی اور محمد علی تھے جنہوں نے اپنے لئے سیٹ ریزرو کروائی تھی اور وہ کسی وجہ سے نہ پہنچ سکے، وہ ان کو مل گئی ——— گئے ——— حج کیا اور بڑے دل سے کیا ——— آج تک مدینہ منورہ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر زار و قطار روتے ہیں اور کہتے ہیں کہ "بیوی کے طفیل میں حج نصیب ہو گیا"۔ بظاہر مذہباً میری والدہ سُنّی تھیں اور والد شیعہ، لیکن دراصل دونوں مسلمان کے جا سکتے تھے اور ہیں سُنّی شیعہ کوئی نہیں رہے۔ چودھری صاحب کے مذہب پر یو۔ پی میں بڑی چہ میگوئیاں ہوئیں کہ شیعہ ہیں یا سُنّی ——— جس کے بعد انہوں نے "میرا مذہب" ایک کتاب تھوڑے دن ہوئے لکھ کر شائع کروائی ہے اور جس کی سات آٹھ جلدیں میرے پاس اس وقت پڑی بھی ہیں۔ اس میں انہوں نے اپنے مذہب کے متعلق اظہار کیا ہے۔ میری والدہ حج سے پلٹ کر ایک ماہ تک صاحبِ فراش رہیں اور پھر وہی ہوا جو چودھری صاحب فرماتے تھے۔ یعنی صعوبات سفر برداشت نہ کر سکیں اور آخر کار ہمیشہ کے لئے اس دنیا سے نجات پا گئیں۔

چودھری صاحب اکیلے کب رہ سکتے تھے۔ تھوڑے دنوں مرحومہ بیوی کا ذکر کر کر کے دن گذارے۔ ارادے بھی بظاہر یہی تھے کہ اب دوسری شادی نہ کریں گے۔ لیکن بقول مصنف "زہرِ عشق" کے: ع عمر بھر کون کس کو روتا ہے؟ جی نہ مانا اور نکاح کر ہی لیا ——— اب اس کو بھی بڑی محبت اور رواداری سے رکھتے ہیں اور شاید اس حد تک کہ اگر وہ کھانا نہ دینا چاہے تو یہ کھانا بھی نہ کھائیں۔ آخر پچاس ساٹھ سال کا محبوب حُقّہ! وہی حُقّہ جس سے ان کا دماغ معطر تھا اور جس کے ذکر سے لوگوں کی گفتگو اکثر رنگین رہتی تھی، ختم ہو گیا۔ بیوی کی ضروریات پوری کرنا تھیں۔ حُقّہ چھوڑ دیا۔

بلڈ پریشر ان کے تباہی۔ حُقّہ چھوٹا، تفکرات بڑھے، تکلیفیں بڑھیں۔ جنوری سنہ ۱۹۵۵ء کے قریب فالج گرا۔ اب پہلے سے بہتر ہیں مگر وہ کہاں ——— باتیں البتہ اب بھی وہی ہیں بشرطیکہ پرانے احباب یا ہم لوگوں میں سے کوئی موجود ہو ———

ع پھر دیکھئے اندازِ گل افشانیٔ گفتار!

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

زیر اثر ڈھلنے والی اور آئے دن بننے بگڑنے والی ہے۔ میں نے اوپر اسے فطری چھاپ اس لئے بتایا تھا کہ اس کی تعمیر میں بیک وقت دو قوتیں کارفرما ہوتی ہیں۔ ایک جبلت جو خود ایک طرح کی بچگانہ اور فطری چھاپ ہے۔ دوسرے خارجی حالات۔ اوّل اوّل انسان جبلت کی چھاپ لئے پیدا ہوتا ہے لیکن جب وہ بڑا ہو کر شعور کی طرف قدم بڑھاتا ہے تو اس کی جبلی چھاپ دھندلا جاتی ہے اور گرد و پیش کے مخصوص حالات کی چھاپ لگ جاتی ہے۔ جب حالات بدلتے ہیں تو بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ ساتھ یہ چھاپ بھی بدل جاتی ہے۔ اس لئے کسی شخصیت کے خط و خال اجاگر کرنے کے لئے اس کے بنتے بگڑتے بدلنے والے پہلوؤں کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ دوسرے شخصیت کے بے نقاب ہونے کی بہت سی راہیں ہیں۔ بہت سے دروازے ہیں جن سے شخصیت جھانکتی ہے۔ ان میں سے کچھ سیدھی، صاف اور کشادہ ہیں، کچھ ٹیڑھی میڑھی اور تنگ و تاریک ہیں۔ عام طور سے لوگ سیدھی اور کشادہ راہوں سے شخصیت کا مشاہدہ کرتے ہیں لیکن شخصیت کی جھلک تیرہ و تار راہوں سے دکھائی دیتی ہے۔ چور دروازے اس کے مشاہدے کے لئے زیادہ موزوں ہیں۔ ان چور دروازوں تک رسائی آسان نہیں۔ ایک ادیب اور شاعر کی شخصیت کے لئے اس کی تحریریں اور اس کا کلام کبھی چور دروازے کا کام دیتا ہے۔ ایک شاعر کا کلام اس کی شخصیت کا آئینہ ہوتا ہے جس میں وہ اصلی خط و خال کے ساتھ نظر آتا ہے۔ بہت سے نقادوں نے اسلوب بیان کو ادیب کی شخصیت قرار دیا ہے۔ اسلوب ہو یا مواد دونوں میں ادیب کی شخصیت جھلکتی ہے۔ شعر اگر آپ بیتی ہے تو شاعر کی شخصیت کے مطالعہ کے لئے اس سے اچھا اور قابلِ اعتماد مواد اور کہیں نہیں مل سکتا۔ شعر کے انتخاب سے اگر دل کا معاملہ کھل سکتا ہے اور رسوائی کا سامان بہم پہنچ سکتا ہے۔ بقول شاعر ؎

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ　　　شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

تو شعر کہنے سے شاعر کی تشہیر تک ہو سکتی ہے۔

اوّل اوّل عندلیب شادانی کی شخصیت کے مطالعے کا موقع مجھے ان کے چیدہ چیدہ اشعار اور سچی کہانیوں کے ذریعے ملا جو رسالہ "ساقی" میں "پریم پجاری" کے نام سے شائع ہوا کرتی تھیں۔ شادانی نے پریم پجاری کا پردہ، جس سے خود ان کی شخصیت کا ایک پہلو نمایاں ہوتا ہے، شاید اس لئے اختیار کیا تھا کہ ان کہانیوں میں صحیح اور سچے واقعات بیان ہوتے تھے اور شادانی اپنے دل کا معاملہ کسی پر کھولنا نہیں چاہتے تھے۔ شادانی کی شاعری کو بھی سچی کہانی ہی سمجھئے کہانی میں جو روداد بے پردہ بیان کی گئی ہے یہاں اس پر شعر کے ابہام کا ہلکا سا پردہ پڑا ہوا ہے۔ شادانی نے کہیں لکھا ہے کہ میں دل کی باتوں کے سوا دوسرے مضامین کو غزل میں داخل کرنے کا حامی نہیں۔ گزشتہ دس برس میں میں نے تقریباً تین سو غزل کے شعر کہے ہیں۔ ان میں سے کوئی ایک شعر بھی ایسا نہیں جسے آپ بیتی نہ کہہ سکیں۔ شادانی نے جو کچھ لکھا ہے وہ سبھی آپ بیتی ہے۔ ان کی کہانیاں تو آپ بیتیاں ہیں ہی، ان کی غزلیں اور نظمیں بھی آپ بیتی ہیں اور ان کی تنقیدیں بھی آپ بیتی کی حیثیت رکھتی ہیں، جو کسی شخصی جذبے یا انفرادی تاثر کے ماتحت لکھی گئی ہیں۔ اگر ان سب پر یکجائی نظر ڈالی جائے تو شادانی کی شخصیت کا ایک اہم پہلو نمایاں ہو کر سامنے آتا ہے جسے میں ان کی شخصیت کی بنیاد سمجھتا ہوں۔ ان کی شخصیت کے دوسرے پہلو صرف اسی ایک پہلو پر قائم ہیں۔ یہ شاید شخصیت کا وہ جبلی پہلو ہے جسے گرد و پیش کے حالات نے اور زیادہ پختہ کر دیا ہے۔

شادانی کے یہاں "انا" کی بڑی اہمیت ہے نفسیات میں ایسے شخص کو انانی (Egoist) کہتے ہیں۔ جدید نفسیات نے انانیت کی بہت سی شاخیں بنائی ہیں جن میں سے ایک خود پرستی بھی ہے جو انانیت کی ایک بڑھی ہوئی لے ہے۔ ہمارے ادب کی بعض بڑی شخصیتیں خود پرستی کی حد تک انانی تھیں۔ غالب بھی انہی میں سے ہیں اور میں اپنے ایک مضمون میں غالب کی شخصیت کے اس پہلو پر کسی قدر تفصیل سے بحث کر چکا ہوں۔ غالب کے یہاں انانیت سے خود بینی پیدا ہوئی اور خود بینی سے خودداری۔ خودداری نے آزادہ روی کو جنم دیا اور آزادہ روی نے انہیں کائنات کی سیر کرائی لیکن شادانی کے یہاں انانیت خود بینی اور خودداری سے آگے نہ بڑھی۔ وہ مطالعۂ نفس میں گھٹ کر رہ گئی۔ اس اعتبار سے شادانی دروں بیں ([illegible]) معلوم ہوتے ہیں

ان کی شخصیت کے اس پہلو کی جھلک ہم ان کی کہانیوں میں بھی دیکھ سکتے ہیں اور ان کے کلام میں بھی۔ ان کی کہانیاں ان کی زندگی کے واقعات ہیں اور ان کے اشعار ذاتی تجربات۔ ان واقعات و تجربات میں ان کی ذات کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ وہ خود اس داستان کے ہیرو ہیں۔ باقی دوسرے کردار ہیرو کی شخصیت کے کسی نہ کسی پہلو کو روشن کرتے ہیں۔ شادانی کے کلام میں جو نشاطی رنگ جھلکتا ہے وہ اسی دروں بینی کی پیداوار ہے۔ شادانی نے آنکھ کھول کر کبھی آس پاس کی زندگی پر نظر نہیں ڈالی۔ وہ اپنے دل سے پھوٹنے والی خوشیوں اور مسرتوں میں ایسے گمن رہے کہ گرد و پیش کی چیخیں ان کے کانوں تک نہ پہنچیں۔ ان کی زندگی کے دو باب ہیں جن کا ذکر انہوں نے اپنے اس شعر میں کیا ہے ؎

گذاری تھیں خوشی کی چند گھڑیاں!

انہی کی یاد میری زندگی ہے

جب تک وہ خوشی سے ہمکنار رہے مسرت کی پھواریں ان کے دل سے چھوٹتی رہیں اور جب خوشی کی گھڑیاں گذر گئیں تو ان کی یاد دل میں چٹکیاں لینے لگی۔ دوسروں کے درد سے متاثر ہونے کا موقع انہیں کہاں ملا اور ان کے دل کے تاروں کو غم و اندوہ کے مضراب نے کب چھیڑا؟

شادانی نے اردو کے جدید شعراء کے کلام پر کچھ اعتراضات کئے ہیں اور اس میں فنی غلطیاں نکالی ہیں اس سے بھی ان کی انفرادیت پسند شخصیت کی جھلک نظر آتی ہے۔ انہوں نے اردو کے ان اساتذہ کے کلام کا مطالعہ انفرادی نقطۂ نگاہ سے کیا۔ اسے ذاتی معیاروں پر پرکھ کر دیکھا۔ اور جب انہیں شاعر کی زندگی اور اس کے کلام میں تضاد نظر آیا تو وہ شاعر کو رسم پرست اور اس کے کلام کو رواجی کہنے لگے۔ اگر وہ انفرادیت کے تنگ دائرے سے باہر نکل کر دیکھتے اور آفاقی یا خارجی نقطۂ نگاہ پیدا کرتے تو وہ ان شعراء کے کلام کو صرف ان کی زندگی پر منطبق کرنے کی کوشش نہ کرتے۔ اس میں انہیں گرد و پیش کی تصویر نظر آتی اور وہ ان کی آواز کو کائنات کے دکھی دلوں کی صدائے بازگشت سمجھ کر اس پر معترض نہ ہوتے۔

شادانی سے میری پہلی ملاقات سنہ ۴۶ء میں بریلی میں ہوئی۔ میں اس زمانے میں ایک مقامی کالج میں اردو کا استاد تھا۔ شادانی موسم خزاں کی چھٹیاں بریلی میں اپنی بیگم کے پاس گذار رہے تھے جو اس وقت گورنمنٹ گرلز کالج کی پرنسپل تھیں۔ ایک روز میرے ایک رفیق چودھری عبدالمجید، جو شادانی کے رفیق درس رہ چکے تھے، میرے پاس آئے اور کہنے لگے "چلو شادانی سے مل آئیں"۔ میں نے شروع میں انکار کیا لیکن جب انہوں نے یہ بتایا کہ شادانی کے شعر پڑھنے کا انداز بڑا ہی دل کش ہے تمہیں ان کا کلام اسی دل کش انداز میں سنوائیں گے، تو میں آمادہ ہو گیا۔ اور ہم دو چار احباب شادانی سے ملنے بیگم شادانی کی قیام گاہ پر پہنچے۔ میں نے شادانی کی کہانیوں اور عاشقانہ اشعار کو پڑھ کر ان کی ایک ذہنی تصویر بنا رکھی تھی۔ جب شادانی مسکراتے ہوئے باہر آئے تو مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ ان کی صورت میری ذہنی تصویر کے مطابق ہے۔ وہی دراز قد، چھریرا بدن، بڑی بڑی روشن آنکھیں، اونچی پیشانی، مسکراتا ہوا حسین چہرہ اور پر ترنم آواز۔ مختصر تعارف کے بعد شعر سنانے کی فرمائش ہوئی اور جب انہوں نے اپنی رسیلی آواز میں اپنے چٹیلے شعر سنانے شروع کئے تو مجھ پر ایک عجیب و جد آفریں کیفیت طاری ہو گئی اور ایسا محسوس ہوا کہ کوئی میرے کانوں میں رس گھول رہا ہے۔ یہ مبالغہ نہیں سخن سرائی نہیں۔ ایک تاثر کا صحیح اور سچا بیان ہے۔ شعر کے بارے میں میرا معیار ذرا سخت قسم کا ہے۔ بہت کم میں کسی شعر کو داد کے قابل سمجھتا ہوں۔ اب یہ شادانی کی شخصیت کا اثر سمجھئے یا ان کی دل کش پر ترنم آواز کا یا غالب کے الفاظ میں تقریر کی لذت کا۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ ان کے بعض شعروں کی میں نے خوب دل کھول کر داد دی۔ میں نے محسوس کیا کہ ان میں میرے دل کی بات کہی گئی ہے۔

اس مختصر ملاقات کے بعد جب میں گھر واپس آیا تو شادانی کے متعلق ایک نقش ابھرا ابھرا سا میرے ذہن میں تھا کہ وہ مجسم شعر و نغمہ ہیں اور بقول شخصے جلال ہمی کوئی حسین عورت ہے وہ ان کی رشتہ دار ہے۔ اس کے بعد بریلی ہی میں دو چار ملاقاتیں اور ہوئیں جن میں میں نے انہیں بہت ہی خوش باش،

ظرافت، نکتہ رسی اور بذلہ سنج پایا۔ ان کی زبان سے ڈھلے ڈھلائے شعر بھی سُنے، ان کی خوش گفتاری کا لطف بھی لیا، اور ان کے چٹکلوں اور لطیفوں سے حظ بھی حاصل کیا۔ شادانی بڑے نکتہ رس اور خوش گفتار ہیں۔ جب وہ گفتگو کرتے ہیں تو ایک سماں باندھ دیتے ہیں۔ قیام بریلی کے زمانہ میں انہوں نے انگلستان کے کچھ دلچسپ واقعات مجھے اپنے مخصوص انداز میں سُنائے۔ میں ان سے اس درجہ متاثر ہوا کہ میں نے اسی وقت ان سے درخواست کی کہ آپ ان کو قلم بند کرکے شائع فرما دیں۔ یہ یقیناً ان کے اندازِ بیان کی سحر آفرینی کا اثر تھا۔

اس کے بعد شادانی ڈھاکے چلے آئے اور میں میرٹھ چلا گیا۔ ۱۹۴۷ء تک ان سے رسمی خط و کتابت رہی۔ قیام پاکستان کے بعد مغربی یو۔پی میں ایک بھونچال آیا جس نے زندگی کی طنابیں تک اکھاڑ پھینکیں۔ بہت سے نشیب و فراز دیکھنے کے بعد ۱۹۵۰ء میں ڈھاکے آگیا۔ اس زمانہ سے میں شادانی کو بہت قریب سے دیکھ رہا ہوں اور ان کی دلچسپ لیکن سادہ شخصیت کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ میں نے ان کی شخصیت کو دلچسپ اس لئے کہا کہ وہ بڑی مسحور کن اور حسین شخصیت ہے اور سادہ اس لئے کہ وہ سیدھے اور یک رنگ خطوط سے بنی ہے۔ اس میں نہ ٹیڑھے میڑھے خطوط ہیں اور نہ نفسیاتی گرہیں۔ اس لئے اس کا مطالعہ بہت آسان ہے۔ میں نے پورے چار سال اس کا مطالعہ کیا ہے۔ شادانی کو سمجھنے کے لئے صرف چار روز کافی ہیں۔ میں شادانی کی شخصیت کو انوکھی شخصیت نہیں سمجھتا۔ ہمارے ادب میں انوکھی شخصیتوں کی کمی ہے اور شاید اسی لئے اردو میں کوئی بڑا کارنامہ وجود میں نہ آسکا۔ بڑے کارناموں کی تخلیق سادہ قسم کی شخصیت نہیں کرسکتی۔ اس کے لئے گرہ در گرہ پیچیدہ شخصیت کی ضرورت ہے۔

شادانی حسن پرست ہیں۔ اس حسن پرستی کا اثر ان کی زندگی کے ہر شعبہ پر پڑا ہے۔ وہ صاف ستھرا اور پاکیزہ لباس پہنتے ہیں۔ ان کے ہر کام میں ستھراپن ہے۔ ان کی تحریر حسین و جمیل ہوتی ہے۔ صاف اور بے داغ کاغذ پر موتی سے ٹانکتے چلے جاتے ہیں۔ عبارت لکھنے کا انداز بھی سلیقہ مندانہ ہوتا ہے۔ شاید یہ اسی حسن پرستی اور جمالیاتی نقطۂ نگاہ کا اثر ہے کہ وہ پان اور سگرٹ دونوں سے بیزار ہیں۔ ہماری مشرقی تہذیب میں برگِ سبز تحفۂ درویش کی حیثیت رکھتا ہے اور سگرٹ جدید مغربی تہذیب کی مئے دو آتشہ ہے۔ لیکن شادانی اپنے حسنِ ذوق کے باعث نئی اور پرانی تہذیب کی ان برکتوں سے محروم ہیں۔

شادانی کی حسن پرستی ان کی انفرادیت پسندی کی پیداوار ہے۔ اس لئے اس میں آفاقیت پیدا نہ ہوسکی۔ ان کا عشق بڑا ہی محدود قسم کا ہے ان کے یہاں حسن چاہے جانے کے لئے نہیں، اپنانے کے لئے ہے۔ بڑے فنکاروں نے حسن سے اپنے تخیل میں رنگ بھرا، رعنائیِ خیال اور رنگینیِ بیان کا اکتساب کیا۔ شادانی انانیت پسند ہیں۔ وہ مانگنے کے قائل نہیں قبضہ کرنا جانتے ہیں۔ یہ ان کے اس نقطۂ نگاہ کا اثر ہے کہ وہ حسن کے جس منظر کو اپنا نہیں سکتے اور اس پر قبضہ جمانا ان کے اختیار سے باہر ہے اس میں انہیں حسن نظر نہیں آتا۔ وہ پھول کی نرم و گداز پتیوں اور اس کی مست کن مہک پر اکتفا نہیں کرتے۔ اسے شاخ سے توڑ لینا چاہتے ہیں۔ اس سے ان کے ادبی نظریوں پر کچھ اچھا اثر نہیں پڑا۔ ان میں شکست و ریخت اور تخریب کا ذوق زور پکڑ گیا اور تعمیر کی جگہ تشہیر نے لے لی۔

وہ صرف محبت نہیں کرتے، نفرت کرنا بھی جانتے ہیں۔ اس لحاظ سے ان کی شخصیت یک رُخی نہیں جو نفرت نہیں کرسکتا وہ محبت بھی نہیں کرسکتا۔ لیکن ان کی محبت ان کی نفرت سے بڑھی ہوئی ہے۔ ان کے احباب، رفقا اور عام شناسا اکثر ان کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہیں کہ وہ کسی کو نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ میں اسے کمزوری اس لئے کہتا ہوں کہ ان کے اس طرزِ عمل سے ان کو نہ سہی، ان کے اصولوں کو جو انہیں عزیز ہیں نقصان پہنچ جاتا ہے۔ ان کی شخصیت میں محبت اور نفرت کے عدم توازن سے ان میں کچھ اور کمزوریاں بھی پیدا ہوگئی ہیں۔ وہ ہر شخص سے دل کھول کر ملتے ہیں اور محبت سے ابتدا کرتے ہیں۔ اس لئے خود غرض اور مطلب پرست لوگ جھوٹی محبت جتا کر انہیں اپنا گرویدہ بنا لیتے ہیں۔ شادانی اپنی نیک نیتی اور سادگی کی بنا پر، جو ان کی محبت کی پیداوار ہے، خود غرض لوگوں کے دل میں جھانک کر نہیں دیکھ سکتے۔ وہ بڑے دقیقہ رس اور ذہین ہیں لیکن ان کی فطرت معصوم ہے۔ کبھی کبھی اصل اور نقل میں وہ فرق نہیں کر پاتے۔ ظاہر پر فریفتہ ہو کر غلط فہمی کا

شکار ہو جاتے ہیں اور حقیقت بہت بعد میں ان پر آشکار ہوتی ہے۔ ان کے ایک رفیق اور منہ چڑھے شاگرد نے پورے دو سال تک انہیں اس فریب میں مبتلا رکھا کہ وہ ان کی حسب ہدایت کام کر رہا ہے۔ اور بالکل آخر میں اس کا انکشاف ہوا کہ انہیں فریب دیا جا رہا تھا۔

ڈھاکے میں وہ گذشتہ ستائیس سال سے ہیں۔ اور اپنی باغ و بہار طبیعت، علمیت، نیز معاشرے میں اپنے مقام عالی کی وجہ سے وہ یہاں کے اوپر کے طبقے میں اثر و نفوذ رکھتے ہیں اور درمیانی طبقے میں بھی ہر دل عزیز اور مقبول ہیں۔ اسی لئے اہل غرض بڑی تعداد میں ان کو گھیرے رکھتے ہیں۔ اور صبح سے لے کر شام تک ایک تانتا سا بندھا رہتا ہے۔ وہ ان سب کے اٹکے ہوئے کام نکالتے ہیں۔ یونیورسٹی کے حلقے میں بھی ان کا رسوخ بڑھا ہوا ہے۔ جب میں ڈھاکے آیا تھا اس وقت وہ شعبۂ فنون (فیکلٹی آف آرٹس) کے ڈین تھے۔ اور آج کل بھی ڈین ہیں۔ ان کی رائے وزن رکھتی ہے۔ اکثر اہم معاملات ان کے مشورے سے طے پاتے ہیں۔ وہ اپنے اس موقف سے اپنی ذات کو شاید ہی کوئی فائدہ پہنچاتے ہوں۔ دوسروں کو فائدہ پہنچانے میں وہ کبھی دریغ نہیں کرتے۔ اس شہرت اور عزت سے فائدہ تو بڑی بات ہے اُلٹا ان کا زیان ہوا ہے۔ کسی زمانے میں دل لگا کر وہ ٹھوس علمی کام کیا کرتے تھے۔ بعض مفید تصانیف کا انہوں نے ڈول ڈال رکھا تھا۔ لیکن اب ان کے مشاغل اتنے بڑھ گئے ہیں کہ وہ کسی علمی کام کے لئے وقت نہیں نکال سکتے۔ جسے اپنی غیر معمولی ذہنی صلاحیتوں سے کام لے کر علم و ادب اور فن کی خدمت کرنی چاہئے تھی، وہ اپنی اخلاقی بلندی سے مجبور ہو کر غرض مندوں کی کار برآری کر رہا ہے۔ علم کی دیوی کی طرف سے جو وہ بے اعتنائی برت رہے ہیں، وہ شاید کبھی معاف نہ کرے گی۔ اس سے بڑھ کر ایک اور نقصان بھی ہوا جس کا تعلق شادانی کی شخصیت کی تعمیر سے ہے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ ہمارے معاشرے میں کام نکالنے کی صرف ایک صورت ہے جسے تملق، چاپلوسی، مداہنہ وغیرہ الفاظ سے یاد کیا جاتا ہے۔ شادانی کے گرد و پیش جن غرض مندوں کا جمگھٹا رہتا ہے، وہ فریب فریب سبھی اس چلتے ہوئے ہتھیار سے کام لیتے ہیں اور مصاحبوں کی طرح جا و بے جا ان کی تعریف کرتے ہیں۔ آپ نے فلاں نظم خوب کہی۔ فلاں شعر پر آپ نے جو تنقید کی ہے، اس کا جواب نہیں ہو سکتا۔ آپ پاکستان کے نئے اور پرانے شاعروں میں سب سے اونچے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ اگرچہ شادانی بڑی سوجھ بوجھ کے مالک ہیں۔ اور ان کو شیشے میں اتارنا آسان نہیں۔ لیکن اس منزل سے کوئی "سفری" اپنا سامان سلامت نہ لے جا سکا۔ ان تعریفوں کا شادانی پر غیر شعوری طور سے اثر ہوتا ہے اور میں دیکھ رہا ہوں کہ بعض اصول کے معاملے میں وہ ذرا کٹر ہوتے جا رہے ہیں۔

کل تک وہ بے رحم قسم کے نقاد تھے۔ انہوں نے اکثر بڑے شاعروں کے کلام پر جراحانہ "تنقیدیں" لکھیں اور آج بھی وہ یہ کہتے ہیں کہ ہم بخشنا نہیں جانتے۔ لیکن اخلاقی وسعت اور ذہن و فکر کی "تابناکیوں" کے باوجود وہ اپنے کلام اور طرز عمل پر کسی قسم کی تنقید گوارا نہیں کرتے۔ مجھ سے بار بار وہ یہی کہتے ہیں کہ میں جائز تنقید سے ناخوش نہیں ہوتا۔ شاید وہ ٹھیک ہی کہتے ہیں، جرح و تنقید سے وہ ناخوش نہیں ہوتے۔ وہ اتنے وسیع الاخلاق ہیں کہ ان کی ناخوشی کوئی معنی نہیں رکھتی۔ لیکن انہیں تنقید گوارا نہیں یہ بھی درست ہے۔ یا تو وہ اس تنقید کو جائز نہیں سمجھتے، یا دل کے کسی گوشے میں ان کی ناخوشی دب کر رہ جاتی ہے جسے وہ اُبھرنے نہیں دیتے۔ جس زمانے میں انہوں نے "خاور" کے نام سے ایک اردو ماہنامہ ڈھاکے سے نکالا، چاپلوس قسم کے لوگوں کی ان پر یورش تھی۔ تقاضا کر کے انہوں نے "خاور" کے لئے مجھ سے ایک مضمون لیا۔ "اردو" حالی نمبر کے لئے میں نے ایک مقالہ لکھا تھا۔ ان کے ایک شاگرد نے ان سے جا کر کہا کہ حالی پر میں نے جو مقالہ لکھا ہے وہ زیادہ بہتر ہے۔ "خاور" کے لئے اسے حاصل کرنا چاہئے۔ شادانی نے اسی وقت مجھے ایک پرچہ لکھا اور اس میں اس امر کی شکایت کی کہ جو چیز بہتر ہے وہ "خاور" کو نہیں دی گئی ہے۔ بمشکل انہیں یقین دلایا کہ "خاور" کو جو چیز دی گئی ہے، وہ بھی اسی درجے کی ہے۔ اس کے بعد پرچہ چھپ کر آیا تو انہوں نے اس کی بابت میری رائے دریافت کی۔ میں نے اس نٹ کی طرح، جو اپنے رفیق کو بانس پر پیٹ کے بل ناچتے اور کرتب دکھاتے دیکھ کر نیچے سے ڈھول پیٹ کر کہتا ہے "کسر رہ گئی! کسر رہ گئی!" کہا۔ پرچہ ابھی معیار کو نہیں پہنچا۔ اور ساتھ ہی ایک مقالے پر دبے دبے لفظوں میں کچھ اعتراض بھی کیا۔ شادانی یک بیک بگڑ گئے اور کہنے لگے یہ معلوم نہیں لوگوں کا معیار کیا ہے۔ مجھ سے یہ کہتے ہیں کہ سبزواری نے کیا لکھا ہے! اس کا

سرِ بزم نہ پیرہ" میں یہ سن کر خاموش ہو گیا۔

مجھے یقین ہے کہ بعض معاملات میں ان کا تشدد ابھی حال کی پیداوار ہے اور اس کی تربیت میں تملق پسندوں کی بے جا ستائش کا بڑا حصہ ہے۔ اگر ان کے کسی اصول پر نکتہ چینی کی جائے تو وہ اس کی اچھی سی نفسیاتی وجہ نکال لیتے ہیں اور اعتراض کی معقولیت اس طرح بڑی آسانی سے نظر انداز ہو جاتی ہے۔ کوئی دو سال ہوئے ان کا مجموعۂ کلام "نشاطِ رفتہ" بڑی آب و تاب کے ساتھ شائع ہوا۔ اس پر مختلف ادبی حلقوں کی طرف سے تبصرے ہوئے۔ آل احمد سرور اور نیاز فتح پوری نے دھیمے دھیمے لہجے میں اعتراضات کئے۔ لیکن بزرگ محترم آثر لکھنوی نے تو بلند آہنگ تنقید لکھی جس میں وہی مدرسانہ انداز اختیار کیا گیا تھا جو کبھی شادانی عصرِ حاضر کے شعراء کے کلام پر تنقید کرتے ہوئے اختیار کر چکے تھے۔ شادانی نے اس تنقید کو پسند نہیں کیا اور اس کی وجہ یہ بتائی کہ یہ سب نقاد ان سے ناخوش ہیں۔ ان سے ذاتی عداوت اور کاوش رکھتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ ایک زمانہ میں ان کے محبوب شعراء کے کلام کو اپنے بے پناہ اعتراضات کا نشانہ بنا کر ان کے شیشۂ عقیدت کو پاش پاش کر چکے ہیں۔ انہوں نے ایک اعتراض کا جواب دیتے ہوئے یہاں تک لکھا کہ "معترضین کی ناواقفیت یا غلط فہمی جذبۂ انتقام سے قطع نظر اعتراضات کا باعث ہوئی ہے۔" ایک موقع پر ایک نوشق نے ایک تبصرے کے سلسلے میں میرے ایک مضمون کو ہدفِ مطاعن بنایا۔ اس پر شادانی کے محترم بزرگ مولانا حامد حسن قادری نے ان کے ایک عزیز شاگرد کی وساطت سے انہیں ان مطاعن کی طرف توجہ دلائی۔ شادانی نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ اس میں ایک نفسیاتی نکتہ ہے۔ اس نوشق نے قادری صاحب کے متعلق اپنے تبصرے میں کچھ چبھتی ہوئی باتیں کہی ہیں اس لئے وہ ناخوش ہو کر جذبۂ انتقام کے ماتحت یہ لکھ رہے ہیں۔

شادانی کسی زمانے میں مطالعہ کے بڑے دلدادہ تھے۔ علم کی تحصیل میں انہوں نے جو ریاض کیا ہے وہ بیان سے باہر ہے۔ حال میں ان کی کاوش اور علمی ریاض کے چند نمونے میں نے دیکھے۔ ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ جس زمانے میں علم کی دیوی کے پجاری تھے اور ان پر کام کرنے کی دُھن سوار تھی۔ وہ تمام رات آنکھوں ہی آنکھوں میں گذار دیتے تھے۔ آج بھی ان کا شوق اتنا ہی تیز ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ان کی توجہ بٹ گئی ہے۔ اب معاشرے میں ان کے مقام نے ان کو سیاسی جوڑ توڑ پر مجبور کر دیا ہے۔ اس سے پہلے ان کا ذہن صرف علمی و ادبی مسائل کی نبرد گاہ تھا۔ آج وہ سیاست کی بساط بھی ہے۔ لیکن سرسوتی دیوی سے ان کا ناطہ بالکل منقطع نہیں ہوا۔ میں جب ان کے پاس جاتا ہوں تو گھنٹوں علمی مسائل پر گفتگو کرتے رہتے ہیں اور اٹھنے کا نام نہیں لیتے۔ یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک کوئی یاد نہیں دلاتا کہ آپ کے کھانے کا وقت ہو گیا ہے یا فلاں میٹنگ میں آپ کو شرکت کرنی ہے۔

شادانی کا حافظہ بلا کا ہے۔ انہیں بڑی پرانی پرانی باتیں یاد ہیں اور وہ انہیں اس طرح سناتے ہیں گویا یہ کل کا واقعہ ہے۔ ان کی طبیعت کو شعر سے خاص مناسبت ہے۔ فی البدیہہ شعر کہتے ہیں۔ دوسروں کے اشعار بھی بڑی تعداد میں ازبر ہیں۔ طبیعت شگفتہ پھول ہے اس لئے لطیفے اور چٹکلے خوب مزے لے لے کر بیان کرتے ہیں۔ خدا جانے یہ لطیفے انہیں سن کر یاد ہو گئے یا خود ان کے زرخیز دماغ کی پیداوار ہیں۔ وہ خود یہ کہتے ہیں کہ یہ لطیفے ان کے دماغ میں محفوظ ہیں۔ ان کی مخصوص مجلسیں بڑی پُربہار ہوتی ہیں جہاں ان کی طبعی ظرافت کی پھواریں چھوٹتی رہتی ہیں۔ ان کی مجلس سے اکتا کر کبھی کوئی نہیں اٹھتا۔

کھانے کا میں نے اوپر کہیں ذکر کیا تھا۔ کھانے کے بارے میں وہ شاید حضرت مسیح کے اس مقولے پر عمل کرتے ہیں کہ انسان صرف کھانے سے زندہ نہیں رہتا۔ وہ بہت کم مقدار میں کھاتے ہیں اور جو کچھ کھاتے ہیں وہ بہت ہی سادہ اور ہلکا ہوتا ہے۔ مجھے ان کی یہ ادا بہت پسند ہے کہ وہ کسی چیز کے پابند نہیں۔ پان، سگرٹ، حقہ وغیرہ کا ذکر میں اوپر کر چکا ہوں۔ وہ ڈھاکے میں رہتے ہوئے بھی جہاں کی آب و ہوا مرطوب ہے، چائے نہیں پیتے۔ انہیں صرف کام کی دُھن ہے۔ جب وہ کام کرنے بیٹھتے ہیں تو دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر اور جب تک مکمل

نہیں کر لیتے اُٹھنے کا نام نہیں لیتے۔ جب وہ دوپہر کا کھانا کھائے بغیر گھر سے نکل کھڑے ہوتے ہیں تو شام کو واپس آکر کھاتے ہیں۔ اور اکثر یہی ہوتا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ بغیر کچھ کھائے پیئے مشین کی طرح کیسے کام کر لیتے ہیں۔ انہیں مدت سے نزلہ کی شکایت ہے۔ باری باری سے اس کے دورے سے پڑتے ہیں جس کی وجہ سے کبھی کبھی وہ صاحبِ فراش ہو جاتے ہیں۔ میں نے اس زمانہ میں بھی انہیں اسی انہماک، شوق اور تن دہی سے کام کرتے دیکھا ہے۔

انہیں کسی کھیل سے دلچسپی نہیں جسمانی ہو یا ذہنی۔ جس طرح ایک ماہر سازندے کی ساری جسمانی طاقت کھنچ کر اس کی انگلیوں میں آ جاتی ہے، جن سے وہ ساز کے تاروں کو چھیڑتا ہے۔ اسی طرح شادانی کی ساری دلچسپیاں ان کی آنکھوں میں جمع ہو گئی ہیں۔ وہ اپنی آنکھوں سے "لاتعداد ذوق" کام لیتے ہیں۔ کبھی کبھی سینما بھی دیکھتے ہیں۔ لیکن اس وقت جب کوئی اچھی تصویر ہو اور کوئی صاحبِ نظر دیکھ کر اس کی تعریف کرے۔ ان کی سب سے بڑی دلچسپی حسن کاری ہے اور ان کا سب سے بڑا کام احساسِ فرض۔ لیکن ان کی حسن کاری کی حدود ہیں اور ان کے احساسِ فرض کی بھی۔ کسی کو سامنے بٹھا کر حسین شعر کہنا ان کا حاصلِ زندگی ہے اور پورے احساس کے ساتھ اپنے فرائض انجام دینا ان کی زندگی ہے، اور ان کی شخصیت ان کے حاصلِ زندگی اور زندگی کا حاصل جمع۔ غالب نے یہ شعر اپنے متعلق کہا تھا۔ لیکن یہ شادانی کی زندگی اور شخصیت پر زیادہ صحیح اور پورا اُترتا ہے ؎

هزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

ڈاکٹر شوکت سبزواریؒ

سید شکور عظیم

شوکت صاحب کے متعلق بہت سی رائیں ہیں۔ وہ تنک مزاج ہیں۔ کٹر قسم کے مولوی ہیں۔ رجعت پسند ہیں۔ ترقی پسندوں کے بہت زیادہ خلاف ہیں۔ بڑے ہٹ دھرم ہیں۔ اپنی بات کے آگے کسی کی نہیں سنتے۔ بڑے نازک مزاج ہیں۔ کسی کی ذرا سی تنقید بھی گوارا نہیں کرتے۔ اپنی ادبیت کے زعم میں کسی دوسرے کو کچھ نہیں سمجھتے۔ بہت سے ادباء پر جہالت کا الزام فوراً عائد کر دیتے ہیں۔ قابل عزت انسان نہیں ہیں۔ بہت کنجوس ہیں ——— اور یہ بھی کہ وہ بہت بلند آدمی ہیں۔ قابل عزت انسان ہیں۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔ وہ بڑے قابل شخص ہیں۔ انہیں مشرقی و مغربی ادب پر عبور حاصل ہے۔ ڈھاکہ میں صرف وہی ایک قابل آدمی ہیں۔ ڈھاکہ میں اُن کی حیثیت اندھوں میں کانے راجہ کی سی ہے ——— ارے صاحب! کانے راجہ بھی تو نہیں، وہ ایک بلند پایہ ادیب ہیں مگر بلند پایہ انسان نہیں .... وغیرہ وغیرہ۔

شروع شروع میں میں نے ان بہت سی راؤں میں سے کسی سے اتفاق کیا، کسی سے اختلاف۔ اقبال عظیم صاحب کا یہ جملہ "ڈھاکہ میں صرف وہی ایک قابل آدمی ہیں" مجھے ماننے میں تامل ہوا۔ پھر حلقۂ اربابِ ذوق میں ان کا ایک مضمون "دہلی اور لکھنؤ کی زبان" پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ لکھنؤ کی شاعری کا جائزہ اُنہوں نے ہمدردی سے نہیں لیا تھا اور میر و مصحفی کو اردو کا معلم قرار دیا تھا۔ بعد میں اس موضوع پر اثر لکھنوی سے ان کی بحث کافی عرصہ تک جاری رہی۔ بعض بعض مقامات پر واقعی ان کی تحریر میں جانبداری تو نہیں، ہٹ دھرمی کے آثار ضرور ملتے تھے اور میں نے بھی پہلے گروہ کی باتوں پر آمنا و صدقنا کہنا مناسب سمجھا۔

میں نے یونیورسٹی میں داخلہ لیا تو شوکت صاحب کے متعلق جو میری رائے تھی اسی کی وجہ سے میں ان کے شروع کے دو تین کلاسوں میں شریک نہیں ہوا۔ "منہ تنہہ بھلا کیا خاک پڑھاتے ہونگے، دُھن ہی جلانے والی باتیں ہونگی" اور میرے دو دوستوں نے بھی میری رائے سے اتفاق کیا، لیکن آخر کب تک ——— جانا ہی پڑا، اگر با دلِ ناخواستہ۔ اور پھر ہمُندر میں رہ کر مگرمچھ سے بیر ویسے بھی ممکن نہیں ہوتا۔ ایم اے کا کلاس ایک تو ویسے ہی چھوٹا ہوتا ہے۔ ذرا سا کمرہ تھا جس میں صرف دو بنچیں تھیں۔ اگلی بنچ پر صرف تین لڑکے تھے۔ کافی جگہ تھی مگر میں اپنے جذبات کو نہ دبا سکا۔ اور پیچھے جا کر بیٹھا۔ لسانیات کا موضوع ایک تو ویسے ہی خشک، اور پھر شوکت صاحب سے پڑھانے والے ——— بس ہو چکی نماز، مصلّٰی اٹھائیے والا مصرع زیرِ لب گنگناتا رہا۔

شوکت صاحب نے لکچر دینا شروع کیا تو میرے ذہن نے ناگواری کے ساتھ اس کو رد کرنا شروع کیا اور منہ بنانے لگا جس پر دو ایک لڑکے مسکرائے ——— مگر ان کی باتوں میں کچھ ایسی کشش تھی کہ میں باوجود کوشش کے بھی ان کے لکچر کو غور سے سنتا رہا اور شوکت صاحب جو بظاہر بڑے سنجیدہ اور متعطع نظر آتے تھے، صورت دیکھ کر ہی ڈر لگتا تھا، ہر وقت

لہ ڈاکٹر [illegible] شوکت سبزواری صاحب [illegible] کیا جاتا ہے۔

سو کھا سا تنا ہُوا چہرہ، سنجیدہ، متین اور بُردبار کہ بات کرنے کی جرأت نہ ہو سکے۔ کلاس میں باغ و بہار بنے ہُوئے تھے اور مَیں لاکھ نفرت کے باوجود اُن کی باتوں کو دلچسپی سے سُننے پر مجبور ہو گیا۔ موضوع کی خشکی کے باوجود شوکت صاحب نے اس میں جان ڈال دی تھی، اور اسی پر نہیں بلکہ اُنہوں نے بیچ میں رُک کر کہا: "اس بات پر مجھے ایک لطیفہ یاد آگیا ہے۔ میں بھی ہر دلچسپی سے پڑھانے کا قائل ہُوں (اور پھر مَیں نے مُنہ بنا کر اپنے پاس بیٹھے ہُوئے لڑکے سے کہا یہ سب سستی شہرت اور مقبولیت حاصل کرنے کے گُر ہیں) لطیفہ تھا تو بہت معمولی مگر اُنہوں نے جس انداز سے سُنایا وہ بذاتِ خود بڑا قہقہہ آور تھا۔ پہلے مجھے یہ بھی شُبہ تھا کہ ان حضرت نے اگر لطیفہ سُنایا تو ان کے سُوکھے سے چہرے کے سامنے جس پر خشونت سی برستی ہے بھلا کون ہنسنے کی جرأت کرے گا۔ لیکن جب وہ سُنا کر خُود بھی بے تکلفی سے ہنسے تو ہم سب لوگ بھی بے اختیار ہنس پڑے۔ اور مَیں نے صرف ایک لمحہ کے لئے سوچا کہ جیسے میں خذف سمجھتا تھا وہ تو صدف نکلا۔ مگر میں اتنی جلدی ہار ماننے والا نہیں تھا۔ کلاس کے بعد مَیں نے لاپروائی سے کہا: "ہاں نہیں پڑھاتے" اور شوکت صاحب کے ایک معتقد اور دوست پروفیسر طاہر فاروقی صاحب نے کہا کہ "شوکت صاحب محنت سے پڑھاتے ہیں"۔ اور رفتہ رفتہ میرا یہ حال ہُوا کہ میں نے ان کا کوئی کلاس نہیں چھوڑا۔ اور ایک دفعہ اُنہیں خود بھی حیرت ہُوئی کہ میرے لکچر سب سے زیادہ تھے!

لیکن انہیں شوکت صاحب کو کسی جلسہ میں دیکھئے تو مخالفین کی ایسی دھجیاں اُڑاتے اور وہ خبر لیتے ہیں کہ تو بہ بھلی! حلقۂ اربابِ ذوق میں ان کی تنقید میں اکثر شدت پیدا ہو کر تلخی آجاتی ہے اور اس کی وجہ جہاں تک میری فہم ناقص میں آسکی ہے وہ کسی سستی قسم کی کوشش کے قائل نہیں ہیں۔ کوئی معمولی سی نظم یا غزل دیکھ کر اُن کی آنکھیں سہتی نظر آتی ہیں۔ "شعر گفتن چہ ضرور" اور وہ اکثر تعریف میں اس حد تک بھی بڑھ جاتے ہیں کہ ایسا تو میں بھی نہیں کہہ سکتا تھا۔ عام طور پر وہ کسی کی پیٹھ ٹھونک کر کہنے کے عادی نہیں ہیں کہ "ابھی کم عمر ہی کیا ہے۔ بچہ ہے۔ کچھ دنوں میں اچھا کہنے لگے گا" لیکن یہ حقیقت پھر بھی اپنی جگہ پر ہے کہ وہ کسی کو ہمدردی کی نگاہ سے نہیں دیکھتے اور میں صاف صاف ہی کیوں اقرار نہ کر لوں کہ شوکت صاحب سے میری سرگشتگی کا سبب اسی حلقۂ اربابِ ذوق میں میرے ایک مقالہ پر ان کی بہت کڑی تنقید تھی جو مجھے فطرتاً ناگوار معلوم ہُوئی تھی اور اسی وقت سے غالباً میرے خیالات ان کے متعلق بہت خراب ہو گئے تھے۔ حالانکہ میں آج سوچتا ہوں تو اُن کی سخت اور کڑی تنقید مجھے اپنے حق میں رحمت معلوم ہوتی ہے۔ مجھے حلقہ میں کچھ پڑھنا تھا۔ میں کسی نئے موضوع پر لکھنا چاہتا تھا اور اس نئے موضوع کی تلاش میں بھٹک گیا اور اپنے مقالہ کا عنوان "اکبر کی عامیانہ شاعری" رکھا جس پر اتنی لے دے ہُوئی کہ پھر مجھے اسے کہیں شائع کرنے کی جرأت بھی نہ ہو سکی۔ اس کے بعد میرے خیالات بدلے۔ مَیں نے سوچا کہ میں بالکل غلط راہ پر جا نکلا تھا اور تخریبی تنقید کی طرف قدم اُٹھا رہا تھا۔ اگر ذرا بھی ہمت افزائی ہوتی تو کلیم الدین احمد کے شاگردوں کی فہرست میں میرا نام بھی داخل ہو جاتا۔

شوکت صاحب سے صرف کلاس تک دلچسپی رہی اور اس کے بعد ہم لوگ انہیں زاہد خشک سمجھتے رہے۔ ایک دفعہ ان کے گھر پر جانے کا اتفاق ہُوا (اگرچہ وہ ہمارے گھر سے بالکل قریب ہی رہتے تھے مگر دو سال سے واقفیت کے باوجود میں ان کے یہاں کبھی نہ گیا تھا) شوکت صاحب خود دروازہ کھولنے تشریف لائے اور کافی محبت، شفقت اور خلوص سے ہم لوگوں کو بٹھایا۔ میرے ایک دوست ان سے کچھ پوچھنے گئے تھے۔ اُنہوں نے بڑی شفقت کے ساتھ سمجھانا شروع کیا اور اس خوبی سے سمجھایا کہ لسانیات کا ایک مسئلہ آسانی سے حل ہو گیا۔ اس کے علاوہ کافی دیر تک بڑی مزے دار قسم کی گفتگو کرتے رہے۔ اور ہم لوگ اُن کی بڑائی اور عظمت کے قائل ہو کر اُٹھے۔

باتیں کرنے میں شوکت صاحب کو بڑا کمال حاصل ہے۔ جس موضوع پر بولنے میں آتے ہیں اس کا کوئی گوشہ تشنہ نہیں چھوڑتے اور بہت شستہ اور دلچسپ قسم کا تبصرہ کر دیتے ہیں۔ باتوں میں ایسی کشش ہوتی ہے کہ سُننے والا کبھی اُکتاتا نہیں، اور ہمہ تن گوش ہو کر سُنتا رہتا ہے۔ اور شوکت صاحب بھی اپنی باتوں میں ایسے محو ہوتے ہیں کہ وقت کا بالکل خیال نہیں کرتے۔ اس دن ہم لوگ ان کے یہاں سے ساڑھے دس بجے واپس آئے۔

اس کے بعد تو پھر اکثر ان کے یہاں جانا ہُوا۔ جہاں ذرا سی مشکل پیش آئی اور شوکت صاحب کے یہاں پہنچ گئے۔ اور اُن کے خلوص اور سادگی نے ہم لوگوں میں بھی جرأت پیدا کر دی تھی کہ "کر چلئے تو مارا گستاخ کرد" پڑھتے ہُوئے وقت ناوقت جب چاہا جا کے دستک دے دی۔ اُنہیں بھی ہم لوگوں کی بے وقت آمد کبھی ناگوار نہ گزری۔ اگر طبیعت خراب ہے تو جب بھی محبت سے بٹھا کر گفتگو کریں گے۔ آپ لاکھ انکار کیجئے گا کہ صاحب آپ کی طبیعت ناساز ہے پھر کبھی سہی، مگر وہ آپ کو بغیر کچھ بتلائے جانے نہ دیں گے۔

اسی طرح کا ایک واقعہ مجھے یاد آگیا۔ میرا ایم۔ اے فائنل کا امتحان ہو رہا تھا اور مجھے کوئی بہت ضروری بات دریافت کرنی تھی۔ گو رات کے ساڑھے نو بج چکے تھے۔ کسی شریف آدمی کے یہاں جانے کا وقت نہ تھا اور پھر ڈھاکہ ایسے شہر میں جہاں آٹھ ہی بجے سے شہر خموشاں معلوم ہونے لگتا ہے۔ سب دوکانیں اور بازار بند، سڑکیں سنسان۔ لیکن سخن گسترانہ بات یہ پڑ گئی تھی کہ دوسرے دن غالباً صبح کو پرچہ تھا۔ کچھ جھجکتے اور ٹھٹکتے ہوئے دروازہ کھٹکھٹایا۔ ان کے صاحبزادے باہر آئے، پوچھنے پر معلوم ہوا کہ موجود ہیں۔ باہر والا کمرہ کھلوا دیا۔ شوکت صاحب کا یہی کمرہ ان کے ڈرائنگ روم کا کام بھی دیتا ہے اور ریڈنگ روم کا بھی۔ یہ دراصل ایک بڑا کمرہ تھا جس کو پارٹیشن کر کے دو ٹکڑے بنا لئے گئے ہیں۔ داخل ہوتے ہی داہنی طرف کونے میں ایک تخت بچھا ہے (ڈھاکہ میں مسہری اور پلنگ وغیرہ کا رواج بہت کم ہے سب لوگ زیادہ تر تخت استعمال کرتے ہیں اور یا زمین پر سوتے ہیں۔ کمروں کے فرش یہاں پختہ بنے ہوتے ہیں جس لئے زیادہ تر لوگ زمین پر ہی سوتے ہیں) سامنے بیت کا ایک کوچ پڑا ہوا ہے (بیت کی صنعت مشرقی پاکستان کی خاص چیز ہے۔ بیت کی کرسیاں اور بکس وغیرہ بڑے خوبصورت بنتے ہیں اور یہاں زیادہ تر گھروں میں ان کا ہی رواج ہے) بیچ میں ایک میز اور دوسری طرف تخت سے ذرا ہٹ کر دو کرسیاں۔ دائیں طرف کونے میں ریڈیو اور اس کے پاس ہی دوسری میز پر ٹیبل فین۔ شوکت صاحب بالعموم کافی رات تک اس کمرہ میں بیٹھے ہوئے پڑھتے رہتے ہیں۔ خلاف معمول ان کو وہاں نہ دیکھ کر میرا ماتھا ٹھنکا۔ مگر وہ خود ہی باہر آگئے۔ چہرہ پر ناگواری کے اثرات مطلقاً نہ تھے ہاں پژمردگی ضرور تھی۔ سردی بھی نہیں۔ معلوم ہوا طبیعت کچھ سست تھی سونے کے لئے لیٹ گئے تھے۔ یہ سن کر مجھے حد درجہ ندامت ہوئی میں نے معذرت کر کے اٹھنا چاہا مگر شوکت صاحب نے اصرار کر کے روکا کہ جب آئے ہو تو پوچھتے ہی جاؤ۔ میں نے بات کو مختصر کرنے کے لئے ایک معمولی سا سوال کیا۔ شوکت صاحب نے بغیر کسی اکتاہٹ، جھنجھلاہٹ اور ناگواری کے اپنے مخصوص انداز میں بتانا شروع کیا اور نہ صرف یہ بلکہ اٹھ کر الماری سے نکال کر اس موضوع پر پڑھنے کو مواد بھی دیا۔ اور اس دن سے میں ان کی بلند شخصیت کا قائل ہو گیا۔

ان کے متعلق یہ بھی مشہور ہے کہ وہ اپنی کتابیں کسی کو نہیں دیتے۔ اور واقعی وہ کتابوں کو اتنی احتیاط سے رکھتے ہیں کہ کوئی کیا رکھے گا۔ ہر رسالے کی ایک ایک سال کی جلدیں بندھی ہوئی رکھی ہیں۔ اس کے علاوہ قریب قریب سبھی کتابوں کی جلدیں بندھی ہوئی ہیں۔ ان کی الماری ایک دلہن کی طرح سنوری ہوئی رہتی ہے۔ شوکت صاحب کی کتاب کوئی خراب کر دے یا کھو دے تو ان کو واقعتاً بہت سخت افسوس ہوتا ہے۔ مگر اپنی مروت میں بہت کم انکار کرتے ہیں اور دوسروں کو پڑھنے کے لئے کتابیں دے دیتے ہیں۔ حالانکہ کتاب کسی کو دیتے ہوئے ان کے دل پر جو گذرتی ہے وہ وہی بہتر جان سکتے ہیں۔

شوکت صاحب کی شخصیت کچھ ایسی پیچیدہ قسم کی ہے کہ انہیں آسانی سے کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ اسی لئے ان کے متعلق سطحی قسم کی رائے رکھنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ان کے سنجیدہ اور کرخت چہرے کے پیچھے شفقت اور ہمدردی کا جو دریا موجیں مارتا ہے اسے دیکھنا ہر شخص کے بس کا کام بھی نہیں۔ اور پھر کنارے سے کبھی اندازہ طغیانی نہیں ہوتا جب تک اس دریا میں کوئی ڈوب کے موجوں کے تھپیڑے نہ کھائے اس وقت تک اس کی تہہ تک پہنچنا ناممکن ہے۔

مگر جن لوگوں نے شوکت صاحب کو قریب سے دیکھا ہے ان کی رائے اس عام رائے سے بہت زیادہ مختلف ہے۔ شوکت صاحب کے متعلق کچھ سن کر اور ان کی سیدھی سادی وضع قطع دیکھ کر عام طور پر لوگ اس رائے پر صاد کر دیتے ہیں۔ مگر حقیقت کچھ اور ہی ہوتی ہے۔ مولویانہ وضع قطع اور عربی کے وسیع مطالعے کے باوجود شوکت صاحب بہت ہی آزاد خیال واقع ہوئے ہیں۔ یوں وہ نماز بھی پابندی سے پڑھتے ہیں، روزے بھی رکھتے ہیں اور اس بڑھاپے میں تراویح بھی بہت پابندی سے پڑھتے ہیں جبکہ ہم نوجوانوں کا یہ حال ہے کہ آدھی بھی کھڑے ہو کر نہیں پڑھ سکتے اور پھر اس پر داڑھی مستزاد۔ اسی وجہ سے لوگوں نے ان پر مولوی ہونے کا الزام لگایا۔ لیکن اس "ملائیت اور مولویت" سے شوکت صاحب کو حد درجہ چڑ ہے۔ مذہب کو ان کی زندگی میں بڑا دخل ہے اور وہ صوم و صلوٰۃ کے پابند بھی ضرور ہیں مگر زمانہ کے ساتھ چلتے ہیں اور اس کے تقاضوں سے واقف ہیں۔ اسی وجہ سے انہوں نے اپنے گھر والوں کو آزادی دے رکھی ہے اور کوئی پردہ کا پابند نہیں ہے۔ ان کی مولویانہ وضع قطع کی وجہ سے لوگ ان کی اس بات کو پسند نہیں کرتے اور اسی وجہ سے اکثر غلط رائے قائم کر لیتے ہیں۔

شوکت صاحب سے آپ ملنے جائیے تو وہ تپاک اور خلوص سے ضرور ملتے ہیں مگر بے جا تکلفات سے کام نہیں لیتے کہ آپ پہنچے اور انہوں نے نوکر کو بلا کر چائے کا انتظام کرنے کو کہا۔ کسی بے جا تکلف اور تصنع کے وہ بالکل قائل نہیں حتیٰ کہ ادب تک میں سادگی کو ضروری قرار دیتے ہیں اور اسی وجہ سے

لکھنؤ کی شاعری سے منحرف ہیں کہ بقول ان کے "آتش نے شاعری کو مرصع سازی سے تعبیر کیا ہے" اسی وجہ سے لوگ انہیں کنجوس کہتے ہیں۔ ایک تو ماشاءاللہ ان کا کافی بڑا خاندان ہے۔ ایک نہیں دو دو گھروں کا انتظام (انہوں نے دو شادیاں کی ہیں اور دونوں بحیات ہیں) تو ظاہر ہے کہ اتنی ذمہ داریوں کے بعد انہیں یہ بھی نہیں اتنی فرصت اور فراغت کیسے کہ ہر آنے ملنے کی تواضع کریں۔ اگر اسی کا نام سخاوت ہے کہ ہر آنے والے کے سامنے کچھ نہ کچھ کھانے کی چیز ضرور رکھی جائے تو شوکت صاحب اس معیار پر پورے نہیں اترتے اور یقیناً وہ بہت بڑے کنجوس ہیں ——— اور اگر یہ بات نہیں تو میں نے ان کے بچوں کو اچھے سے اچھا کپڑا پہنتے اور پہنتے دیکھا ہے۔ ان کی کتابیں اور کتابوں کی ظاہری آرائش سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ کتابوں پر یقیناً کافی روپیہ خرچ کرتے ہیں۔ اس سے زیادہ لوگ یونیورسٹی کے ایک لیکچرار سے کیا امید رکھ سکتے ہیں؟

شوکت صاحب کو بعض عوارضات نے قبل از وقت بڑھا بنا دیا ہے۔ حالانکہ وہ روزانہ علی الصباح ڈاکٹر کی ہدایات کے مطابق کافی دور تک ٹہلنے کے لئے جاتے ہیں مگر ان کی تندرستی پر یقیناً کافی اثر پڑا۔ اور وہ سینتالیس سال کی عمر میں کافی معمر لگتے ہیں۔ پھر بھی بظاہر ان کی صحت اب بھی قابل رشک معلوم ہوتی ہے۔ بھرا بھرا وجیہہ چہرہ، خوب چوڑا چکلا سینہ، میانہ قد، بھاری بھرکم، ذہین آنکھیں، جو عینک کے شیشے کے اندر بڑی بھیانک معلوم ہوتی ہیں، فراخ پیشانی، گندمی رنگ، سر چھوٹے چھوٹے بال ایسے نہیں جن میں کنگھا نہ کیا جا سکے۔ تنگ کھرے ہونے کی وجہ سے شوکت صاحب کے ادیب ہونے کی چغلی کھاتے ہیں۔ اور اگر کچھ بڑے ہونے تو یقیناً پیشانی اور آنکھوں پر پڑے رہتے۔ چھوٹی سی کھچڑی داڑھی جو ہر وقت ان کے چہرہ کو باوقار بھی بناتی ہے اور کچھ کرخت سا بھی۔ ٹوپی بہت کم پہنتے ہیں۔ سیدھے کرتا پاس در رہائش ہر چیز مشرقی ہے اور وہ بڑے بحیثیت مشرقی ہیں۔ روایات کے پرستار۔ سفید کرتا، سفید علیگڑھ کٹ پاجامہ پاؤں میں شوز اور سردی ہو یا گرمی اسی کی مناسبت سے ہمیشہ شیروانی۔ بغیر شیروانی پہنے گھر سے بہت کم باہر نکلتے ہیں۔ ایک زمانہ میں زبان کا جھگڑا اپیل رہا تھا اور لڑکے یونیورسٹی میں کسی کو داخل نہ ہونے دیتے تھے۔ میں نے بہت سے اساتذہ کو دیکھا جو ہمیشہ شیروانی پہن کر آتے تھے مگر اس ڈر کی وجہ سے لباس بدل کر آئے۔ کیونکہ شیروانی اردو داں ہونے کا بڑا ثبوت تھی۔ مگر یہ جاننے کے باوجود بھی شوکت صاحب ہمیشہ شیروانی ہی پہن کر یونیورسٹی جاتے۔

زبان کا ذکر آ گیا تو اتنی بات اور سن لیجئے کہ شوکت صاحب تعصب کی حد تک اردو سے محبت کرتے ہیں اور کسی حالت میں بھی بنگلہ کے مطالبہ کو تسلیم کرنے کو تیار نہیں۔ بابائے اردو نے ان کے زبان کے معاملہ میں لڑنے کو جہاد سے تعبیر کیا ہے اور میرے خیال میں بہت صحیح اندازہ لگایا ہے جب کبھی اس کا ذکر چھڑ جاتا ہے تو شوکت صاحب بڑے بڑوں کو آڑے ہاتھوں لیتے ہیں۔ اس زمانہ میں جو لڑکے زبان کے سلسلہ میں مارے گئے تھے، بنگالی لڑکوں نے ان کے لئے چندہ جمع کیا اور شوکت صاحب سے بھی مانگا مگر انہوں نے سب کو بری طرح لتاڑا اور ایک پیسہ نہیں دیا۔

یوں تو شوکت صاحب لباس میں کافی اہتمام کرتے ہیں مگر بالعموم اس کی طرف سے لاپرواہ رہتے ہیں۔ اکثر شیروانی کے سب بٹن نہیں ——— کبھی شیروانی کمی ان کی ہو گئی ہے تو یوں ہی سہی۔ وہی پہن کر یونیورسٹی چلے آئیں گے۔ بنیان پہنے بہت دن گذر چکے ہیں اور وہ کافی میلی ہو گئی ہے مگر اتارنے کی مہلت یا فرصت کسے ہے۔ یا جوتے پر غالباً جب سے خریدا گیا اس کے بعد سے پالش نہیں ہوئی۔ بحیثیت مجموعی ان کی شخصیت میں پوری ادبیت جھلکتی ہے۔

گھر پر ہمیشہ وہ تہمد اور بنیان پہنتے ہیں۔ کوئی بھی ملنے آئے اسی حال میں بلا جھجک بلا لیتے ہیں۔ ان کا تہمد بھی بنیان کی طرح کافی میلا ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ سردی میں بھی وہ چادر لحاف سے کواڑ بند کر کے اپنی اسی وضع اسی انداز میں بیٹھتے ہیں۔

شوکت صاحب زود رنج بھی بہت زیادہ ہیں۔ اکثر چھوٹی چھوٹی باتوں پر دوسروں سے خفا ہو جاتے ہیں کسی کے متعلق اگر ایک دفعہ رائے قائم کر لیتے ہیں تو پھر وہ مشکل ہی سے بدلتی ہے۔ اس لئے ان سے جن جن لوگوں کا سابقہ پڑتا ہے وہ ہمیشہ کوشش کرتے ہیں کہ کوئی بات شوکت صاحب کی طبیعت کے خلاف نہ ہو جائے۔

شوکت صاحب کی یادداشت بھی قابل رشک ہے۔ آپ کوئی بھی موضوع چھیڑ دیجئے وہ ایسے باتیں کرنا شروع کریں گے کہ معلوم ہوگا بحر ذخار موجیں مار رہا ہے۔ میں نے یہ محض تشبیہاً نہیں کہا بلکہ سچ مچ ان کا یہی حال ہے فلسفہ، منطق، لسانیات، عربی، فارسی، اردو، انگریزی، ہندی، سنسکرت

اور تاؤن ہر موضوع پر ان کی معلومات بہت وسیع ہیں۔ ان میں سے کسی چھوٹے سے چھوٹے پہلو پر گفتگو کیجیے تو وہ تفصیلات ایسے بتانا شروع کر دیں گے گویا اس خاص موضوع کو انہوں نے امتحان کی تیاری کے لیے پڑھا ہے اور حوالے تو اتنے صحیح دیتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ مثلاً بات کے دوران میں کہیں گے جون ۱۹۳۰ء کے نگار میں فلاں صاحب نے یہ جملہ لکھا ہے۔ اب آپ جون ۱۹۳۰ء کے نگار کی فائیل نکال کر دیکھ لیجیے گا اور تفاوت نہ پائیے گا۔

ایسے ہی شعر کا مطلب سمجھانے میں بھی شوکت صاحب کو کبھی کوئی دقت نہیں ہوتی۔ ایسا اکثر ہوا ہے کہ ولی دکنی کے پرانے زمانہ کے اشعار جن میں درجن اور اتنا ایسے الفاظ ہوتے ہیں یا سودا کے مشکل قصائد جن کا مطلب کوئی دوسرا نہیں سمجھا سکتا۔ شوکت صاحب اتنی آسانی سے بغیر لغت دیکھے سمجھا دیتے ہیں کہ لوگ انگشت بدنداں رہ جاتے ہیں۔ حالانکہ یونیورسٹی میں نظم پڑھانا ان کے مضامین میں نہیں ہے۔ وہ تاریخ ادب اور لسانیات کے پروفیسر ہیں۔ مگر کوئی بھی موضوع ہو ان کی معلومات کو آپ اپ ٹو ڈیٹ پائیے گا۔

اگرچہ شوکت صاحب اب کہتے ہیں کہ ان کا حافظہ کمزور ہو گیا ہے اور وہ سب باتیں یاد نہیں رکھ سکتے ہیں۔ مگر میرا خیال ہے کہ ان کا حافظہ اب بھی ہم جیسے ہزاروں نوجوانوں سے بہتر ہے۔

[illegible]

(لمه)

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

منٹو ماموں

حامد جلال

منٹو میرے ماموں ہیں اور میں انہیں خالص پنجابی انداز میں سعادت ماما جی کہتا ہوں کیونکہ ہم آپس میں ہمیشہ پنجابی میں باتیں کرتے ہیں اور یہی ہمارے گھر کی بول چال کی زبان ہے۔ وہ صرف اپنے بچوں سے اردو میں بات کرتے ہیں لیکن اردو بولتے ہوئے انہیں سخت تکلف ہوتا ہے اور وہ اردو بولنے سے اتنا ہی گریز کرتے ہیں جتنا پنجابی میں لکھنے پڑھنے سے۔

یہ تو ہمارے رشتے ہی سے ظاہر ہے کہ میرا بھی منٹو ہونا ضروری نہیں ہے اور میں منٹو ہوں بھی نہیں۔ یہ سن کر منٹو ماموں کو شاید دھکا سا لگے، حالانکہ انہوں نے بڑی فراخ دلی سے اعتراف کر لیا ہے کہ ان کے تمام اعزا منٹو نہیں ہو سکتے۔ میرا بھی منٹو نہ ہونا ان کی سمجھ میں آ سکتا ہے اور اسے غالباً وہ معاف بھی کر دیں لیکن اپنے منٹو ہونے کے برملا اعلان پر تو میری شامت ہی آ جائے گی۔

حقیقت یہ ہے کہ میں منٹو ہوتا تب بھی اپنے نام کے ساتھ منٹو ہرگز نہ لکھتا کیونکہ یہ اب کوئی خاندانی نام نہیں رہ گیا بلکہ ایک فردِ واحد کی ملکیت بن چکا ہے۔ منٹو کا لفظ اب ایک اہم صفت بن گیا ہے جو صرف ایک خاص ادبی رجحان یا شخصیت کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے اور میں اسی شخصیت پر کچھ روشنی ڈال سکتا ہوں۔ سعادت حسن اور منٹو دو الگ الگ شخصیتیں ہیں لیکن ان دونوں کا فرق اور ان کی علیحدہ علیحدہ امتیازی خصوصیتیں بیان کرنا ایک انتہائی دشوار کام ہے۔ سعادت حسن ۱۱ مئی ۱۹۱۲ء کو سمبرالہ میں (جو موجودہ مشرقی پنجاب میں واقع ہے۔) پیدا ہوئے اور منٹو کو خود انہوں نے اپنی ابتدائی تعلیم کے آخری دور میں جنم دیا۔

ان کی منٹوئیت کی بلند آہنگی کا آغاز کب ہوا اس کی بالکل صحیح تاریخ تو میں نہیں بیان کر سکتا لیکن ایک واقعہ سے کچھ اندازہ ضرور لگایا جا سکتا ہے کہ اس نے شروع شروع میں کس طرح ظاہر ہونا شروع کیا۔ یہ اس زمانے کا واقعہ ہے جب انہوں نے اپنی زندگی کی بیس منزلیں بھی طے نہیں کی تھیں۔ ان دنوں ہر جگہ [illegible] کا چرچا تھا جنہوں نے آنکھوں پر پٹیاں بندھی ہونے کے باوجود پکیڈلی میں کار چلا کر لندن میں سنسنی دوڑا دی تھی۔ اس کے کچھ دنوں بعد ہی امرتسر میں ایک شخص آیا جس کا نام غالباً اللہ رکھا تھا۔ اس کا دعویٰ تھا کہ وہ ماسٹر خدا بخش کا استاد تھا اور دہکتے ہوئے انگاروں پر چل سکتا تھا۔ اسے انگاروں پر صحیح سلامت چلتا دیکھنے کے لئے لوگ ٹوٹے پڑتے تھے۔ ایک روز اس نے ایک نئی بات کی۔ اس نے اعلان کیا کہ کسی شخص کو اگر خدا اور مذہب پر اعتقاد ہو تو وہ بھی دہکتے ہوئے انگاروں پر چل سکتا ہے، اس کا بال بھی بیکا نہیں ہوگا۔ مجمع نے ایک نظر انگاروں کو دیکھا اور معاً کچھ پیچھے ہٹ گیا جیسے ہر شخص کو یہ ڈر تھا کہ ماسٹر اللہ رکھا اسی کو اپنے ساتھ آگ پر چلنے کو مجبور کر دے گا۔ اس نے ایک بار پھر آواز لگائی اور پہلے کی طرح وہ بھی فضا میں کھو گئی۔ مجمع پر بدستور مکمل سکوت طاری تھا۔ ہر شخص دم بخود بیٹھا تھا۔ اچانک ایک نوجوان مجمع کو چیرتا ہوا آگے آیا۔ شاید وہ اس بات کا یقین کر لینا چاہتا تھا کہ کوئی اور تو آگ پر چلنے کی ہمت نہیں کرتا اور وہ اسی لئے رکا ہوا تھا۔ ہر شخص زیرِ لب اپنی سی کہہ رہا تھا۔ ماسٹر اللہ رکھا کی ہدایت کے مطابق دبلے پتلے نوجوان نے اپنے جوتے اور موزے اتار ڈالے اور پاجامے کے پائنچے چڑھا لئے۔ پھر آدھ [illegible] اپنے انگوٹھے انگاروں کی طرف کر کے کلمہ پڑھ اور دیکھے

ساتھ اچانک مجمع پر سوچ بھی نہیں چکا تھا۔ یہ سب کیا ہو رہا ہے کہ نوجوان ماشاءاللہ کہ کمانے ساتھ انگاروں پہ سے گزر بھی چکا تھا۔ وہ ہکا بکا ہو کر اپنے تلوے دیکھ رہا تھا جیسے [illegible] سوزش کا نام و نشان تک نہ تھا۔ دوسری طرف مجمع نے تالیاں بجا بجا کر آسمان سر پر اٹھا لیا۔

مجمع عام میں سعادت حسن کی تحسین و ستائش کا یہ پہلا موقع تھا۔ جو ان کی زندگی میں آیا۔ کہنے کا یہ کوئی بہت اچھا آغاز نہیں تھا کیونکہ منٹو صاحب اس کے بعد ہمیشہ انگاروں پر چلتے رہے۔ ان کی مدح و ستائش بھی کی گئی ہے اور کافی کی گئی ہے لیکن آگ سے [illegible] سے انہیں مفر نہیں تھا جب انہیں [illegible] ہے کہ اس آگ کے شعلے نہیں اپنی لپیٹ میں لے لیں اور ان سے [illegible] وہ شعلوں میں لپٹے ہیں اور اس پر پوری قوت بھی صرف نہیں کرتے کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ وہ بھی بجائے خود آگ پر چلنے کا ایک حصہ ہے۔ میں ان کی کوشش کو ادھوری اس لئے سمجھتا ہوں کہ منٹو صاحب کا خیال ہے کہ ایک مصنف اور مفکر و شخصیت کی حیثیت سے آگ پر چلنا بھی ان کی زندگی کا ایک حصہ ہے۔ غیر شعوری طور پر منٹو صاحب کا یہ خیال ہے کہ وہ اگر ایسے کرتب نہ دکھائیں جو دیکھنے میں غیر معمولی اور خطرناک ہوں جیسے آگ پر چلنا تو ان کی تحسین و تعریف ہی نہ کی جائے گی۔

مجھے اس کے کہنے سے بھی گریز نہ ہوگا کہ ان کی غیر شعوری خواہش ہی وہ اہم عنصر ہے جس کی مدد سے ان کی شخصیت سے ان کے بلند مرتبہ تک رسائی ممکن ہے۔ لیکن مجھ کو یہ بھی معلوم ہے کہ ایسے موڑ نکلنے کی طرح ان کی شخصیت کے کئی اور رخ ہیں اور ہر رخ کو سمجھنے کے لئے ایک نئے اہم [illegible] کی ضرورت ہوتی ہے۔ ممکن ہے کوئی ماہر نفسیات جانفشانی سے کام لے کر منٹو صاحب کی شخصیت کے ہر پہلو کو الگ الگ کر کے ان کی جامع فہرست تیار کر سکے۔ اور ان سب کی علیحدہ علیحدہ امتیازی خصوصیات بیان کر سکے لیکن یہ کام میرے بس کا نہیں ہے۔ جب میں ان کے ماضی پر نظر ڈالتا ہوں جسے مجھے ان کے ساتھ رہ کر دیکھنے کا موقع ملا ہے تو مجھے وہ نلکی نما کھلونا یاد آ جاتا ہے جس میں رنگین شیشوں کے ٹکڑوں کے عکس سے بڑی خوبصورت صورتیں نظر آتی ہیں اور نلکی کو ذرا سی حرکت دے دی جائے تو تمام صورتیں ایکا یک بدل جاتی ہیں۔ ان کی ادبی سرگرمیاں، ان کی خانگی زندگی اور ان کی بادہ نوشی شیشے کے ٹکڑوں کے مختلف پہلو ہیں۔ جن کا رنگ روشنی کے رخ کے مطابق بدلتا رہتا ہے۔

اس خاکے میں منٹو صاحب کی پوری تصویر پیش کرنا انتہائی مشکل ہے۔ جتنا شیشے کے ٹکڑوں کی نلکی میں پیدا ہونے والی تمام شکلوں کا ہو بہو عکس تیار کرنا۔ اس لئے میں منٹو کی نلکی آہستہ آہستہ گھماتا جاؤں گا اور میرے ذہن پر جتنے عکس پڑیں گے ان کی تشریح کرتا جاؤں گا۔

ان کا پہلا عکس جو آج تک میرے ذہن میں پوری طرح محفوظ ہے اسی زمانے کا ہے جب وہ آگ پر چلے تھے۔ وہ اپنے مطالعے کے کمرے میں لکھنے کی میز پر بیٹھے ہوئے ہیں جو چیز سب سے نمایاں ہے وہ پیتل کی ایک بڑی سی دوات ہے جو مور کی شکل سے مشابہ ہے۔ وہ مجھ سے کچھ سرگوشی کرتے ہیں۔ میں باہر چلا جاتا ہوں۔ کچھ دیر بعد واپس آتا ہوں تاکہ ان کے لنگوٹیے یار حسب معمول جمع ہو لیں۔ وہ میرا تعارف اپنے بعض نئے دوستوں سے کراتے ہیں جنہوں نے اس سے پہلے میری صورت تک نہیں دیکھی تھی۔ وہ اپنے احباب سے بتاتے ہیں کہ میں ابھی ابھی لاہور سے آیا ہوں۔ پھر مجھ سے بڑی تشویش کے ساتھ پوچھتے ہیں کہ تاج محل کے متعلق لاہور میں کوئی مزید اطلاع موصول ہوئی یا نہیں۔ اس وقت میری عمر دس برس بھی نہیں تھی لیکن کچھ دیر پہلے مجھے اچھی طرح سکھا پڑھا دیا گیا تھا۔ اس لئے میں اپنی صورت جتنی بھی سنجیدہ بنا سکتا تھا۔ بنا کر جواب دیتا۔ جی ہاں یہ خبر درست ہے۔ یہ خبر لاہور میں بچے بچے کی زبان پر ہے کہ تاج محل امریکہ والوں کے ہاتھوں بیچ دیا گیا ہے۔ منٹو صاحب اور ان کے ساتھ ہو لڑکوں اور دوں کو یقین ہو جاتا کہ انگریزوں نے تاج محل امریکہ والوں کے ہاتھوں بیچ دیا جو اسے نیویارک لے جانے کے لئے بڑی بڑی مشینیں لا رہے ہیں۔ دوسرے ہی روز یہ افواہ امرتسر کے بازاروں میں پھیل جاتی اس پر چہ میگوئیاں شروع ہو جاتیں اور منٹو صاحب اپنے مطالعے کے کمرے میں بیٹھے دل ہی دل میں ہنستے رہتے۔

منٹو صاحب کو ان دنوں اس طرح کی افواہیں پھیلانے کا بے انتہا شوق تھا۔ ان کی پھیلائی ہوئی ہر افواہ ان کی جدت پسندی اور ان کے تخلیقی جوہر کا ثبوت ہوتی۔ ان کا ایک محبوب مشغلہ یہ بھی تھا کہ وہ اپنے دوستوں سے مل کر ان سے عجیب و غریب باتیں کہتے اور انہیں منوانے کی کوشش کرتے۔ مثلاً انہوں نے ایک بات یہ کہی تھی کہ ان کا فونٹن پین گدھے کے سینگ کا بنا ہوا ہے۔ وہ امرتسر کے نوجوان دانشوروں کے ایک گروہ کے لیڈر تھے اور انہیں عام ہمعصروں سے ممتاز کرنے کے لئے انہوں نے نئے نئے محاورے اور فقرے وضع کر رکھے تھے۔

گزشتہ بیس برس میں ان کی دو اصطلاحیں "کباب" اور "فراڈ" خاص طور پر رائج اور مقبول ہوئی ہیں۔ آج کل بہت سے لوگ بول چال میں "فراڈ" اسی روانی اور بے تکلفی سے استعمال کرتے ہیں گویا وہ اردو یا پنجابی کا کوئی لفظ ہو۔ منٹو ماموں "فراڈ" کسی فعل کے لئے نہیں بلکہ کسی کی شخصیت بیان کرنے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ کوئی شخص ان کا وقت پر ساتھ نہ دے سکا، ان کی جھنجھلاہٹ کا باعث ہوا تو منٹو ماموں کے قول مطابق اس نے انہیں کباب بنا دیا ہے۔ ان کی بول چال کا انداز ان کے حلقے کے باہر کے لوگوں کے لئے دلچسپ ہونے کے ساتھ ہی ان میں الجھن بھی پیدا کر دیتا تھا۔ کسی شخص سے اپنی قمیص یا پتلون کے متعلق رائے دریافت کرنا چاہتے تو اس سے سوال کرتے "اس قمیص کے متعلق تمہارا ری ایکشن کیا ہے؟" یا "اس قلم کے متعلق تمہاری تھیوری کیا ہے؟" اس طرح کی باتوں کی اصل محرک ان کی خواہش ہوتی تھی کہ ان میں تنوع ہو۔ وہ تمام روایتوں سے آزاد ہوں اور کسی چیز کے لئے کسی کے مرہونِ احسان نہ ہوں۔ ان کے جامع الفاظ میں ان کی صرف یہ خواہش ہوتی تھی کہ وہ منٹو کے سوا کچھ نہ ہوں۔

انہوں نے شراب نوشی بھی غالباً اسی لئے شروع کی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ انہوں نے سب سے پہلے شراب صرف اس لئے پی ہو کہ وہ اپنے دوستوں سے مختلف رہنے میں سبقت لے جائیں۔ یہ ایک عجیب و غریب دور اور اپنی نوعیت کے اعتبار سے استثنائی تھی۔ اس کا مقصد دوسروں سے آگے بڑھنا نہیں بلکہ اس کی تہہ میں صرف یہ جذبہ کارفرما تھا کہ وہ نہ صرف اپنے احباب بلکہ امرتسر کے تمام دوسرے شہریوں تک سے ممتاز رہیں۔

میں امرتسر کبھی کبھی جاتا تھا۔ اس لئے اس دور کو قریب سے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ لیکن میں وہاں اگر جلد جلد بھی جاتا رہتا یا منٹو ماموں وقتاً فوقتاً لاہور آتے تب بھی مجھے ان کی تمام سرگرمیوں کا علم نہیں ہو سکتا تھا۔ کیونکہ ہماری عمر کا تفاوت ہمارے درمیان حائل تھا۔ پھر وہ بمبئی چلے گئے اور ہم ایک دوسرے سے زیادہ دور ہو گئے۔ ہماری کئی سال تک ملاقات نہیں ہوئی۔ اپنے افسانوں کے پہلے مجموعے "منٹو کے افسانے" کی اشاعت کے سلسلہ میں وہ دسمبر ۱۹۴۰ء میں بمبئی سے لاہور آئے اس کے گرد پوش کے متعلق انہوں نے ناشر کو میرے سامنے ہدایات دیں۔ انہوں نے کہا کہ گرد پوش پر ان کا خاکہ ایسا بنایا جائے جو پورے صفحے پر چھا جائے۔ ان کے کالر کھلے ہوئے اور ان کی گردن ننگی ہوئی ہو تاکہ اس سے کشش اور زنگ بر ظاہر ہو۔ انہوں نے ناشر کو یہ ہدایت خاص طور پر دی کہ خاکہ ایسا بنایا جائے کہ لوگ مشتعل ہو کر انہیں گالیاں دینے لگیں۔

معلوم نہیں انہوں نے یہ باتیں اپنے پبلشر کو مرعوب کرنے کے لئے کہیں یا مصنف اور قاری کے تعلقات کے متعلق ان کا نظریہ ہی یہی تھا۔ ذاتی طور پر میرا خیال ہے کہ انہوں نے یہ باتیں عمداً نہیں کہی تھیں اور وہ منٹو ماموں کو شاید اب یاد بھی نہ ہوں لیکن ان کا یہ قول ان کی شخصیت کا راز سمجھنے میں بہت معاون ہو سکتا ہے۔

ان کا منشا شاید یہ تھا کہ وہ پبلشر کے ذہن میں یہ بات بٹھا دینا چاہتے تھے کہ لوگ منٹو کو عام آدمیوں کے معیار سے نہیں جانچنا چاہئے لیکن میری رائے میں اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ تھی کہ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ منٹو ماموں اپنی شخصیت کو اپنی ادبی تخلیق کا جزو لاینفک بنا دینا چاہتے تھے کیونکہ انہیں یقین ہو گیا تھا کہ اصل چیز یہ نہیں ہے۔ کہ کیا کہا گیا ہے بلکہ یہ ہے کہ کس نے کہا ہے۔ آسکر وائلڈ اور برنارڈ شا کی مثالیں ان کے سامنے ہیں جن کی شخصیت کی شہرت بار بار ان کی ادبی تخلیقات کے ہم پلہ ہے۔ منٹو ماموں اردو کے غالباً پہلے ادیب ہیں جنہوں نے اپنی کتاب کے گرد پوش پر اپنی تصویر بنوائی ہے گویا کہ وہ کہنا چاہتے ہیں کہ میں اپنے افسانوں ہی کا نہیں منٹو کی شخصیت کا بھی مالک ہوں۔

وہ چاہتے تھے کہ لوگ "منٹو کے افسانے" کا گرد پوش دیکھتے ہی انہیں گالیاں دینے لگیں لیکن میرے خیال میں گالی انہیں کسی نے بھی نہیں دی۔ گرد پوش کا ڈیزائن مشہور فلم اسٹار ایم اسماعیل نے بنایا تھا۔ اور بعد میں ان کی تمنا کے مطابق نہ صرف انہیں گالیاں دی گئیں بلکہ انہیں اپنی تمنا سے بھی زیادہ گالیاں کھانی پڑیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس وقت تک جب تک وہ سعادت حسن ہی تھے اور محض منٹو نہیں بن گئے تھے۔ خود سعادت حسن نے جو اپنی تخلیقات کو اتنی ہی گالیاں دی ہوں گی جتنی کسی اور نے۔ تخلیق کی ذمہ داری ان پر ضرور تھی لیکن ایک لحاظ سے وہ معذور بھی ہیں۔ کیونکہ انہوں نے اپنے آپ کو ایک میلیاں تصور کیا تھا۔ لیکن ان کی تخلیق مسٹر ہائڈ جیکل سٹیون کے سانچے میں ڈھل گئی۔

یہ ہمزاد ــــــ اور موجودہ سیاق و سباق میں اسے ہمزاد ہی سے موسوم کیا جا سکتا ہے۔ کئی سال سے آپے سے باہر ہو کر دندناتا پھر رہا ہے۔ لیکن اسے مطیع کرنے میں انہیں کوئی خاص کامیابی حاصل نہیں ہو سکی کیونکہ خود انہیں شراب نے مغلوب کر رکھا ہے۔ مثال کے طور پر میں ایک واقعہ بیان کروں گا جس کا تعلق شراب کے صرف چند قطروں سے ہے۔

اگست ۱۹۵۴ء میں منٹو ماموں شدید یرقان میں مبتلا ہو گئے اور انہیں میو ہسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ ڈاکٹروں نے انہیں دیکھتے ہی کہہ دیا کہ انہیں جگر کا ایک
مہلک عارضہ ہے اور ایسا مریض ایک ہزار میں ایک بھی مشکل سے بچتا ہے۔ میں مری گیا ہوا تھا اور جس روز آنے والا تھا اسی دن مجھے تار ملا کہ ان کی حالت بہت خراب
ہے۔ راولپنڈی پہنچ کر میں نے لاہور ٹیلیفون کیا تھا تو مجھے بتایا گیا کہ ڈاکٹروں نے جواب دے دیا ہے۔ وہ مجھے بار بار بلاتے ہیں لیکن ان کی حالت ایسی ہے کہ شاید
میں ان کا دیدار بھی نہ کر سکوں۔ مجھے کئی سال سے ڈر تھا کہ ان کا یہی انجام ہونا ہے لیکن اب اسے قریب دیکھ کر مجھے حد سے زیادہ صدمہ پہنچا یہ سن کر مجھے اور بھی
اذیت ہو رہی تھی کہ وہ مجھے بار بار بلاتے ہیں۔ منٹو کے ساتھ میرے اتحاد سعادت بھی نزع کے عالم میں مجھے یہ سوچ کر جیسے میرے تمام احساسات سن ہو گئے رات بھر کا سفر
کرنے کے بعد لاہور پہنچا پیارا معلوم ہوتا تھا کیونکہ ڈاکٹر کہہ چکے تھے کہ وہ صرف چند گھنٹوں کے مہمان ہیں

ان سطروں کو پڑھنے والے سوچتے ہوں گے کہ شراب سے متعلق ایک واقعہ کا ذکر کرنے کے لئے میں کتنی تمہید بیان کروں گا لیکن میں اس واقعہ کو فوراً نہیں بیان
کروں گا کیونکہ اس سے پہلے میں منٹو ماموں کی شخصیت کے چند دلچسپ پہلو بیان کرنا چاہتا ہوں جو ان کی زندگی سے مایوسی کے عالم میں بے ساختہ یاد رہے تھے

مجھے ان کا ایک سفر یاد آ گیا۔ ہم دونوں لاہور سے ایک ساتھ روانہ ہوتے انہیں بمبئی جانا تھا اور مجھے صرف دہلی تک۔ ان کے سامان میں کم سے کم ایک درجن
جوتے اور کافی جوتیاں تھیں جنہیں وہ لاہور سے ضرور خریدتے اور بمبئی جا کر اپنے فلمی دوستوں کو دیا کرتے۔ جوتوں کا شوق انہیں خبط کی حد تک ہے۔ وہ نہ صرف
خود انتہائی قیمتی جوتے سینڈلیں اور جوتیاں پہنتے ہیں۔ بلکہ انہیں دوسروں کو تحفتاً دینے میں بھی ان کو خاص لطف آتا ہے۔ جوتے ہمیشہ ہماری گفتگو کا موضوع
ہوتے ہیں جب بھی بمبئی جاتا مجھے پہلے سے ہی یقین ہوتا تھا کہ وہ مجھے لینے کے لئے جوتے پہن کر آئیں گے جنہیں دیکھ کر میں ان سے ملتے ہی لیتا تھا لیکن ان پر تبادلہ
خیال ٹیکسی یا گاڑی پر سوار ہونے تک ملتوی رہتا جس پر بیٹھنے کے بعد اپنی ایک ٹانگ دوسری ٹانگ پر رکھ لیتے اور جوتے اچھی طرح نظر آنے لگتے۔ وہ بہت ہلکے
پھلکے جوتے پہنتے ہیں۔ کیونکہ ان کے پیر بڑے نازک پتلے پتلے بلکہ تقریباً نسوانی ہیں۔ مجھے تو یاد نہیں آتا کہ میں نے اپنے لئے خود کبھی کوئی سینڈل خریدی ہو ہر سال کم ہوں
میں ایک دو جوڑی سینڈلیں کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے وہ مجھے ضرور دے دیتے ہیں۔ اس کا سلسلہ منٹو ماموں نے اس زمانے میں بھی جاری رکھا جب وہ
شدید مالی پریشانیوں میں مبتلا رہے اور جب وہ شراب کے سوا دنیا و مافیہا سے مکمل طور پر بے نیاز رہے۔ کبھی کبھی تو میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ شراب کے بعد ان کو
زندگی میں صرف جوتوں سے سب سے زیادہ دلچسپی ہے۔ مجھے جو سینڈل ان سے پچھلی بار ملی ہے اسے میں نے صرف چند ریزر بلیڈ کے عوض حاصل کیا ہے۔

انہیں ریزر بلیڈ کی کمی کی ہمیشہ شکایت رہتی ہے کیونکہ یہ ایک ایسی چیز ہے جسے خریدنا چنداں دشوار نہیں ہے ان سے کہہ دیا جائے کہ فلاں چیز بازار سے
غائب ہو کر منافع خوروں کے تہہ خانوں میں پہنچ گئی ہے تو ان کی آنکھوں میں ذرا چمک پیدا ہو جائے گی اور وہ چیلنج قبول کر کے کالے بازار کا چکر لگانا شروع کر
دیں گے۔ بالخصوص جب ان میں بمبئی کے دوران قیام میں بدرجہ اتم پائی جاتی تھی جہاں ان کی آمدنی کافی تھی۔ اور میرا خیال تھا کہ کسی چیز کی انہیں جس قدر زیادہ قیمت
ادا کرنا ہوتی تھی انہیں اطمینان حاصل ہوتا تھا گزشتہ جنگ عظیم کے زمانے میں پارکر اور شیفر کی سنہری ہاور دوسری کیپ کے قلم پہلی بار ہندوستان آئے تو منٹو ماموں
نے ان کی خوب خریداری کی۔ انہوں نے ایک ایک قلم کے لئے ڈیڑھ سو روپے تک قیمت ادا کی اور کم سے کم دس قلم خریدے ہوں گے لیکن اپنے پاس صرف
ایک قلم رکھ کر باقی سب کے سب دوسروں کو دے دیئے انکی افادیت کے بجائے انکی ذات ان کیلئے کشش کی سب سے بڑی وجہ تھی کیونکہ قلم وہ کبھی کبھی استعمال کرتے ہیں۔ ریڈیائی ڈرامے یا
فلمی منظر لکھنے کیلئے وہ ہمیشہ اپنا ٹائپ رائٹر استعمال کرتے ہیں کیونکہ اس کی رفتار سست ہوتی ہے اور ٹائپ کرتے وقت انہیں سوچنے کی مہلت بھی مل جاتی ہے لیکن افسانے اور دوسرے مضامین لکھنے کے
لئے وہ تیز رو پنسل کو ترجیح دیتے ہیں تاکہ ان کا ہاتھ ان کے خیالات کی رفتار کے ساتھ چل سکے۔ وہ افسانہ لکھنے بیٹھ جاتے ہیں تو پھر وہ اسے مکمل ہی کر کے اٹھتے
ہیں۔ کمرے میں بچے شور مچا مچا کر کھیل رہے ہوں اور ان کا قلم چل نکلے تو پھر اس کا رکنا ناممکن ہے۔ کمرے میں کچھ لوگ بیٹھ کر باتیں کر رہے ہوں منٹو ماموں
نہ صرف ان کی باتیں سنتے رہتے ہیں بلکہ خود اس میں شریک ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن اس سے بھی ان کی افسانہ نگاری میں کوئی خلل نہیں پڑتا

انہوں نے شراب نوشی کی انتہا کر کے اپنی موت کو دعوت کیوں دی؟ یہ سوال اس رات راولپنڈی سے لاہور آتے ہوئے میرے ذہن میں بار بار آ رہا تھا
رنجیدہ ہونے کے بجائے مجھے غصہ آ رہا تھا۔ یہ انتہا پسندی اپنے اہل و عیال کی محبت اور شراب کی مقناطیسیت میں کشمکش عرصے سے جاری تھی اور میدان بالآخر شراب

کے اندر ہی تھا۔ مجھے شک تھا کہ چند ہفتوں سے وہ خودکشی کے اسی مقصد سے اپنا دل بہلا رہے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ فرار کا یہ آسان ترین راستہ تھا یا پھر وہ اپنے خاندان والوں کو منغص کرنا چاہتے تھے جنہوں نے ان سے مایوس ہو کر انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ میں وقت پر نہیں پہنچ سکوں گا کیونکہ مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ وہ بیہوش ہو چکے ہیں اور ان کے پھیپھڑوں میں آکسیجن پہنچائی جا رہی تھی۔

میں سوچ رہا تھا کہ آج بمبئی کے اس منجم کو بھی شکست ہو جائے گی جس نے منٹو ماموں کی غیر معمولی درازیٔ عمر کی پیش گوئی کی تھی۔ افسوس کا یہ قول صحیح ثابت ہو چکا تھا کہ ان کے اچھے دن نہیں آنے والے۔ یہ ۱۹۴۲ء کی بات ہے جب منٹو ماموں فلمی دنیا میں پورے عروج پر پہنچ چکے تھے اور ان کی آمدنی بہت اچھی تھی لیکن فلمی صنعت میں کساد بازاری کی وجہ سے غالباً فوراً ہی ان کی آمدنی گھٹنے بھی لگی تھی۔ تقسیم کے بعد ہجرت کر کے پاکستان آنے پر ان کی حالت اور بھی خراب ہو گئی۔ منجم نے انہیں آگاہ کر دیا تھا کہ ان کا [illegible] یا اسی قسم کی کوئی چیز منحوس برج میں داخل ہونے والی ہے اور حالات ٹھیک ہونے کے لئے انہیں سات سال تک بدحالی کا سامنا کرنا ہوگا۔ ان کی موت قریب دیکھ کر میں نے منجم کی پیش گوئی کا ایک نیا مفہوم نکال لیا تھا یعنی ان کی بدحالی کے سات سال ان کی جسمانی موت کے ساتھ ختم ہو جائیں گے لیکن ایک ادیب کی حیثیت سے وہ اس کے بعد بھی عرصے تک زندہ رہیں گے

میں ہسپتال پہنچا تو اپنا دل کافی کڑا کر چکا تھا اور خبر بد سننے کے لئے تیار ہو چکا تھا۔ وہاں مجھے اعزا کا ایک جم غفیر ملا۔ ہر شخص کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور مجھ سے بتلایا گیا کہ وہ ابھی تک زندہ ہیں لیکن میں کسی سے کوئی سوال نہیں کر سکا کیونکہ شدت جذبات سے میرا دم گھٹ رہا تھا۔ ان کا پلنگ بالکل دروازے سے ملا ہوا تھا اور میں ان کی پائنتی جا کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے جو کچھ دیکھا اس کا نقش میرے ذہن سے کبھی محو نہیں ہو سکے گا۔

بستر پر ایک آدمی کا ڈھانچہ پڑا ہوا تھا۔ ان کے چہرے پر صابن کی موٹی تہہ تھی اور وہ بڑی بڑی زرد اور یرقان زدہ آنکھیں نمایاں طور پر نظر آ رہی تھیں جو بال ابھی ان کے چہرے پر صابن میں چھپا ہوا تھا اور جو شخص ان کے چہرے پر جھکا ہوا تھا وہ ڈاکٹر نہیں بلکہ ہسپتال کا حجام تھا جو یہ سننے کی کوشش کر رہا تھا کہ مریض اپنی انتہائی نحیف آواز میں اس سے کیا کہہ رہا تھا۔ منٹو ماموں بڑی کوشش سے اپنا کانپتا ہوا ہاتھ اپنی ٹھوڑی تک لے گئے اور اپنی انگلیاں اس کے اوپر پھیریں تب جا کے حجام سمجھ سکا کہ ان کا منشا کیا ہے۔ اس نے اپنا شیونگ برش اٹھاتے ہوئے کہا کہ صاحب کہتے ہیں کہ داڑھی ٹھیک نہیں بنی، ابھی کھردرا پن باقی ہے۔ میں منٹو ماموں سے کچھ اور قریب ہو گیا لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس وقت مجھے ہنسنا چاہیئے یا رونا۔ ان کو یقین نہ تھا کہ وہ ایک گھنٹہ بھی جی سکیں گے یا نہیں مگر پھر بھی انہیں اصرار تھا کہ داڑھی ایسی بنائی جائے کہ کھردرا پن ذرا بھی باقی نہ رہ جائے۔ یہ منظر منٹو کی کسی کہانی کا انجام معلوم ہوتا تھا

اس کے بعد میں نے ڈاکٹروں سے ملاقات کی وہ اپنے سر ہلا کر اپنی مایوسی کا اظہار کر کے رہ گئے۔ منٹو ماموں کی حالت روز بروز سدھرتی گئی لیکن مزید دو ہفتے تک ڈاکٹر اپنی رائے بدلنے پر تیار نہ ہوئے۔ ان کا کہنا تھا کہ ایسے مریض کو شاید ہی کبھی صحت ہوتی ہو۔ ان کے خون کی طرح طرح سے آزمائش کی جاتی اور ہر بار ایسا نتیجہ نکلتا جو ڈاکٹروں کے اندیشوں کے مطابق ہوتا۔ ڈاکٹر اتنے مایوس ہو چکے تھے کہ انہوں نے ان کی شراب بھی فوراً بند نہیں کی۔ ان کا جسمانی نظام شراب کا اس قدر عادی ہو چکا تھا کہ اس حالت میں بھی ڈاکٹروں نے ان کو دن میں دو تین بار شراب کے چند قطرے پی لینے کی اجازت دے دی تھی۔

مری سے میری واپسی کے بعد ایک روز ایک عجیب واقعہ پیش آیا جس سے ہر طرف کھلبلی سی مچ گئی۔ منٹو ماموں کے بستر کے قریب میز پر پانی ملی ہوئی شراب کا ایک گلاس رکھا تھا جو نہ جانے کہاں غائب ہو گیا۔ معلوم نہیں کسی نے غلطی سے اسے پھینک دیا تھا یا ہسپتال کا کوئی ملازم موقع پا کر اسے پی گیا تھا۔ منٹو ماموں اس حال میں پڑے رہتے تھے کہ ان پر کسی کو بھول کر بھی شک نہیں ہو سکتا تھا۔ زیادہ تر وہ سکتے کے عالم میں پڑے رہتے اور جب وہ ہوش میں آتے تھے۔ تو ان میں اتنی بھی طاقت نہ ہوتی تھی کہ وہ خود اپنے ہاتھوں میں سگرٹ لے کر بھی پی سکیں۔ شام کو جب شراب کی مقررہ خوراک کا وقت آیا تو بڑی مشکل سے اشاروں اور سرگوشی کے ذریعہ انہوں یاد دہانی کی کوشش کی۔ یہ سننے کیلئے کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں نوکر اپنا منہ ان کے قریب لے گیا تو شراب کی ہلکی سی بو معلوم ہوئی۔ انہوں نے بڑی مشکل سے اقبال کیا کہ وہ شراب پہلے ہی پی چکے ہیں ان سے پوچھا گیا کہ انہیں شراب دی کس نے تھی؟ اور یہ معلوم کر کے ہماری حیرت کی کوئی حد نہ رہی کہ ان کی انگلیوں میں اگرچہ اتنا بھی دم نہیں تھا کہ وہ چند سیکنڈ سے زیادہ ایک سگرٹ بھی پکڑ سکیں لیکن شراب کے لئے وہ اپنی کہنی کے سہارے اٹھ بیٹھے تھے اور گلاس کو بستے

ایک نرس نے لاپرواہی سے وہاں وقت سے پہلے ہی رکھ دیا تھا اٹھا کر — غالب کہہ گئے تھے اور بڑی احتیاط سے پھر وہیں رکھ دیا تھا۔

یہ واقعہ ان کی حیرت انگیز قوت ارادی کا مظہر تھا لیکن اس سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ وہ اپنے مرض کے خلاف جدوجہد نہیں کر رہے تھے بلکہ اس کی مدد کر رہے تھے ڈاکٹر بالکل ناامید ہو چکے تھے۔ چند روز سے ان کی حالت اور بھی بگڑ چکی تھی کیونکہ ان کے چند ہمدرد دوستوں نے انہیں نظروں سے وہسکی پہنچا دی تھی۔ اس واقعہ کے بعد ڈاکٹروں نے انتہائی سختی برتنی شروع کر دی اور ان کی شراب بالکل ہی بند کر دی گئی۔

اس کا نتیجہ وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ انہیں طرح طرح کے وہم ہونے لگے اور انہوں نے بہکی بہکی باتیں شروع کر دیں۔ ایک بار اس سے پہلے بھی ایسا ہی وہم ہو چکا تھا۔ وہ رات کو اپنے بستر سے اٹھ بیٹھتے اور خیالی شکلیں دیکھ کر ان سے باتیں شروع کر دیتے۔ یہ دیکھ کر ہمارے ہوش و حواس بھی جاتے رہے اور ایسا معلوم ہونے لگا کہ ان کا دماغی توازن ہی درہم برہم ہو گیا۔ میں جب ان کے پاس پہنچا تو وہ اصرار کر رہے تھے کہ ان کی بیوی اس مچھلی کو تل دیں جو ان کے اینگلو پاکستانی ہمسائے نے انہیں بھیجی تھی۔ مجھے دیکھ کر انہوں نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے فلیٹ سے باہر لے کر چلے گئے۔ وہ اینگلو پاکستانی ہمسائے کو زور زور سے پکارنے لگے اور میں بڑی مشکل سے انہیں سمجھا بجھا کر اندر لے گیا۔ چند منٹ تک تو میری سمجھ میں نہ آیا کہ میں کیا کروں اور منہ ہی منہ میں ان کے سوالات کے جواب دیتا رہا۔ وہ باتیں تو بالکل عام آدمیوں کی طرح کر رہے تھے لیکن ان کی گفتگو کا موضوع غلط تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ میں ان کے ساتھ دوسرے ہمسائے کے گھر جاؤں جہاں ان کے وہم کے مطابق چند لڑکیاں گانا گا رہی تھیں۔ وہ ان کا پنجابی گانا سننا چاہتے تھے۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ وہ کیا گا رہی ہیں۔

میں نے ان کی ذہانت پر بھروسہ کرتے ہوئے آخر کار ایک خطرہ مول لینے کا فیصلہ کیا۔ اور کچھ سوچے سمجھے بغیر ان سے کہہ دیا۔ یہ سب محض آپ کا وہم ہے۔ ورنہ جس اینگلو پاکستانی دوست کے متعلق ان کا خیال ہے کہ اس نے ان کے لئے مچھلی بھیجی ہے اس کے بال بچے کوئی چھ مہینے سے ناگپور جا چکے ہیں اور اب وہ لاہور میں نہیں ہے۔ نہ آس پاس کوئی گا رہا ہے اور رات کے سناٹے میں صرف ہماری آواز آ رہی ہے۔ چند لمحوں تک توقف کے بعد انہوں نے کہا کہ پھر تمہارا کیا خیال ہے کہ اس [illegible] بھی نہیں چہچہا رہی ہیں۔ جب اس کا بھی جواب میں نے نفی میں دیا تو وہ بولے کہ لڑکیوں کے گلے کی آواز اب بھی آ رہی ہے۔ میں گانا لکھوا لوں گا۔ وہ ایک منٹ تک کچھ لکھتے رہے۔ جب میں نے اصرار کیا کہ اس طرح کا کوئی گانا سنائی نہیں دیتا تو انہوں نے اپنی بیوی اور دوسرے افراد سے جو بیٹھک میں آ گئے تھے دریافت کیا کہ وہ بھی گانا سن رہے ہیں یا نہیں۔ ان کا جواب بھی نفی میں پانے کے بعد انہوں نے لکھنا تو چھوڑ دیا لیکن اس پر بدستور اصرار کرتے رہے کہ گانے کی آواز اسی طرح آ رہی ہے۔ رفتہ رفتہ وہ وہم اور حقیقت میں تمیز کرنے لگے اور بادل ناخواستہ اپنے بستر پر چلے گئے لیکن واپسی سے پہلے پڑوسی کی بھیجی ہوئی عمدہ مچھلی پر شدت سے افسوس ظاہر کرتے رہے۔

مجھے اچھی طرح تو یاد نہیں کہ پہلی بار ان کے وہم میں مبتلا ہونے اور بہکی بہکی باتیں کرنے کا سبب کیا تھا لیکن میرے خیال میں اس کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے کھانا اور پینا دونوں یک بیک بند کر دیا تھا۔ ہسپتال میں ان پر جو حملہ ہوا وہ پہلی بار سے زیادہ شدید تھا اور اس کا اثر ایک ہفتے تک رہا۔ اس دوران میں زیادہ انہیں یہی وہم رہتا تھا کہ وہ بمبئی میں ہیں جہاں انہوں نے اپنی زندگی کے سب سے زیادہ پُرمسرت دن گزارے تھے۔ میں ان سے بار بار کہتا کہ وہ بمبئی میں نہیں لاہور میں ہیں لیکن انہیں اس کا یقین ہی نہ آتا تھا۔ غالباً وہ اس پر یقین کرنا ہی نہیں چاہتے تھے کیونکہ تقسیم کے بعد لاہور میں ان کی زندگی بڑی تلخ ہو گئی تھی۔ ہسپتال میں ان کو بڑے بڑے عجیب وہم ہوتے تھے۔ ایک دن انہوں نے ایک اخبار سے مجھے ایک خیالی خبر پڑھ کر سنائی ——— "اطلاع ملی ہے کہ پولیس نے شراب کی ایک دکان پر کامیاب چھاپہ مار کر چھ خالی بوتلوں، آتشیں کے بائیس پیپوں اور ایک رقاصہ کو گرفتار کر لیا ہے۔" ——— اس کا میں نے یہ مطلب نکالا کہ وہ خیال ہی خیال میں مسرت کش گرد و پیش کی مذمت کر رہے ہیں۔

اپنی علالت کے انتہائی خطرناک دور سے وہ بڑی جرأت اور تحمل کے ساتھ گزر رہے تھے۔ لیکن جیسے جیسے ان کی حالت روبہ اصلاح ہوتی گئی ان میں تنک مزاجی اور چڑچڑاپن آ گیا۔ وہ ہر ایسی بات کرنا چاہتے تھے جو ان کے لئے ممنوع تھی۔ انہیں ہر ایسی چیز کھانے یا پینے پر اصرار تھا جو انہیں چند گھنٹوں کے اندر موت کی آغوش میں سلا سکتی تھی۔ وہ اپنے پلنگ سے اٹھ کر چلنا چاہتے تھے۔ کیونکہ ڈاکٹر کہہ چکا تھا کہ تقریباً ایک مہینے تک انہیں چلنے پھرنے کا تصور بھی نہیں کرنا چاہیے لیکن۔ چلنے پھرنے

کی خواہش اتنی زبردست تھی کہ وہ اسے ضبط نہیں کر سکتے تھے۔ وہ اپنے کارناموں سے وارڈ میں کھلبلی سی لہر دوڑا دینا چاہتے تھے وہ ثابت کر دینا چاہتے تھے کہ اس حالت میں بھی وہ بخوبی چل پھر سکتے ہیں۔ ایک بار وہ سب کی نظر بچا کر اٹھ کھڑے ہوئے لیکن اس حالت میں چلنا بالکل ایسا تھا جیسے وہ مکھن کے بنے ہوئے پیروں سے دہکتے ہوئے سرخ انگاروں پر چلنے کی کوشش کر رہے ہوں اور تھوڑا ہی سا زمین پر پیر رکھتے ہی وہ ڈھیر ہو گئے اور ان کا ہڈیوں کا ڈھانچہ فرش پر گر گیا لیکن خوش قسمتی سے زخم بالکل معمولی سے آئے۔

ان کی ضد کا یہ صرف ایک نتیجہ تھا۔ ان کی شب و روز نگرانی کی ضرورت تھی کیونکہ یہ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ کیا کر گزریں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کی آنکھوں اور ان کے دماغ کو دہکتے ہوئے انگاروں کی جستجو تھی تاکہ وہ ان پر پابرہنہ چل سکیں۔ ان کا چڑچڑا پن بڑھتا ہی چلا جا رہا تھا جیسے وہ دوستوں اور اپنے عزیزوں سے اپنے رو بصحت ہونے کا انتقام لے رہے ہوں۔ ان کا طرزِ عمل بسا اوقات ایسا ہوتا جو مجھے بھی برداشتہ خاطر کر دیتا تھا اور یہ دیکھ کر ان کے درجنوں دوستوں اور مداحوں کو بھی سخت حیرت ہوتی تھی جو ان کی عیادت کے لئے آیا کرتے تھے۔ بعض لوگ چاہتے تھے کہ انہیں کسی اور ہسپتال میں منتقل کر دیا جائے کیونکہ اسی ہسپتال میں چند سال قبل اختر شیرانی کی آنکھیں بند ہوئی تھیں۔ کچھ لوگ تو سرے سے وارڈ ہی بدل دینے کی رائے دیتے تھے کیونکہ اسی وارڈ میں منٹو ماموں کے دیرینہ دوست مولانا باری نے دم توڑا تھا۔ میری دل برداشتگی کا سب سے بڑا سبب میرا یہ اندیشہ تھا کہ انہوں نے شراب نوشی پھر شروع کر دی تو ان کو موت کے منہ سے نکالنے کی یہ تمام جدوجہد اکارت جائے گی۔ اس کی مجھے کوئی خاص امید تو نہ تھی لیکن میں بالکل مایوس بھی نہیں ہوا تھا اور صرف چند مہینوں کے اندر ان کے تمام نام نہاد دوستوں نے ان کو قائل کر دیا کہ وہ اتنے مہلک مرض میں مبتلا ہی نہیں ہوئے تھے یا ان کی حالت اتنی خراب ہو گئی تھی کہ ان کے بچنے کی کوئی امید باقی نہیں رہ گئی تھی۔ اور منٹو ماموں دوبارہ شراب پینے لگے۔

اپنی شفایابی کے بعد انہوں نے پہلی بار شراب پی تو مجھے اس کا فوراً پتہ چل گیا حالانکہ وہ شد و مد سے انکار کرتے رہے۔ یہ بھی ان کی ایک پرانی عادت ہے۔ وہ وسکی یا جن کا ایک جام بھی پی لیں تو ان کا چہرہ اس کی غمازی کر دیتا ہے لیکن وہ اس خود فریبی میں مبتلا ہیں کہ وہ شراب پی کر کبھی نہیں بہکتے۔ ان کی اس جسمانی معذوری کا ان کے سامنے مبہم سا بھی اشارہ کر دیا جائے تو ان کے پندار کو ٹھیس لگ جاتی ہے۔ کاش وہ محسوس کر سکتے کہ شراب ان کے لئے کتنی مضر ثابت ہو رہی ہے۔ بلکہ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ ان کی صحت کے مقابلے میں ان کی شخصیت کو اس نے کہیں زیادہ برباد کیا ہے۔

سات آٹھ برس بھی نہیں ہوئے جب میں ان کی خانگی زندگی دیکھ کر رشک کیا کرتا تھا۔ کتنے سکون اور چین سے شاید ہی کسی کے دن بسر ہوتے ہوں۔ ان کے ساتھ کھانے کی میز پر بیٹھ کر یہ احساس بھی نہیں ہوتا تھا کہ میز پر کیا ہے کیا نہیں ہے کیونکہ اس کی سب سے بڑی کشش ان کی بذلہ سنجی اور ساتھ بیٹھ کر کھانا کھانے والے اعزا احباب کے قہقہوں میں ہوتی تھی۔ بمبئی میں ان کے پاس جو فلیٹ تھا وہ نہ تو بہت بڑا تھا نہ بہت چھوٹا۔ لیکن اس میں مہمانوں کا ہمیشہ ہجوم ہوتا کیونکہ وہ ان کی دل کھول کر خاطر مدارات کرتے تھے۔ مسہریوں کی تعداد سے اگر مہمان زیادہ ہو جاتے تو منٹو ماموں فرش پر اپنا بستر سب سے پہلے بچھا دیتے۔ کبھی کبھی تو مہمانوں کی اتنی کثرت ہوتی کہ فرش پر بھی جگہ باقی نہ رہتی اور منٹو ماموں رات لکڑی کے ان تختوں پر گزار دیتے جو بیت الخلا کے راستے میں چھت کے نیچے لگے ہوئے تھے۔ منٹو ماموں اپنے اس ایثار کا کسی سے ذکر تک نہ کرتے نہ ان کی صابر بیوی کی زبان پر کبھی حرفِ شکایت آتا۔ یہ تمام انتظام اس خوش اسلوبی سے کیا جاتا کہ ہر شخص اسے بے چوں و چرا قبول کر لیتا۔

ان کی نئی شخصیت کو سب سے پہلے میں نے کھانے کی میز پر بے نقاب دیکھا۔ وہ شام کو تھوڑی شراب پیتے تھے اور رات کے کھانے کے وقت تک بہکنے لگتے تھے اور دوسروں کے لئے تکلیف دہ ہونے لگتے بلکہ آمادۂ پیکار تک ہو جاتے۔ شاید ہی کوئی ایسی شام گزرتی کہ ہم میں چھوٹی چھوٹی باتوں پر نوک جھوک نہ ہوتی اور ہم ایک دوسرے سے خفا نہ ہو جاتے۔ ان سے میرا یہ مطالبہ شاید واجب بھی نہیں تھا کہ وہ مخمور ہونے کے بعد بھی آپے سے باہر نہ ہوں۔ [illegible] جا کر شام کا تصور ہی میرے لئے مہیب ہو جاتا تھا کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ میں یہ برداشت نہیں کر سکوں گا کہ شراب سے [illegible] شخصیت منٹو ماموں کا بہروپ بھرے۔ اس کا صرف یہی علاج تھا کہ میں ان سے شام کے وقت ملاقات سے گریز کروں اور میں کرتا بھی یہی تھا۔

پاکستان بننے کے بعد ہم لاہور میں قریب قریب ایک ہی مکان میں رہنے لگے وہ پہلی منزل پر رہتے ہیں اور میں دوسری منزل پر۔ ہمارے فلیٹ ایک راستے

[illegible]

وہ جب دوستوں سے اپنے کھیل میں شریک ہونے کی دعوت دیتے ہیں، تو ان کی خواہش کبھی مسترد نہیں کرتا۔ محلے کے بڑے بوڑھے کسی بات کے لئے اشارہ بھی کر دیں تو وہ پوری ہو جاتی ہے۔ وہ عورتوں کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا بلکہ اس کے کان میں اگر بھنک بھی پڑ جائے کہ کوئی شخص محلے کی کسی لڑکی کو بدنگاہ کر سکتا بھی دیتا ہے تو اس کی خیر نہیں ہوتی۔

منٹو کے گھر میں مسرت و شادمانی کا دور ہمیشہ عارضی ہوتا ہے ان کے جسم و جان میں توانائی جیسے ہی عود کر آتی ہے اور ان کے خاندان والوں کے دل میں یہ امید پیدا ہونے لگتی ہے کہ یہ توانائی تو بکو دوام بخشنے پر صرف کی جائے تو وہ اپنے آپ کو دوبارہ غرق مے ناب کر دیتے ہیں۔

ان کی توبہ کے ٹوٹنے کے ذمہ دار عموماً ان کے ہم نشین ہوتے ہیں میں نے یہاں دوست کا لفظ عمداً استعمال نہیں کیا کیونکہ ان کے دوستوں اور انھیں دوستی کا فریب دینے والوں میں بڑا فرق ہے۔ ان کے دوست ان سے ہمیشہ دور ہی دور رہتے ہیں۔ کیونکہ شراب نوشی کو وہ پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھتے اور ان کے دوسرے معاملات میں بھی آزادی سے اظہار خیال میں اور بے کم و کاست اپنے دل کی بات کہہ دیتے ہیں لیکن منٹو ایسے لوگوں کی رفاقت کو ترجیح دیتے ہیں جو وقتاً فوقتاً انھیں یقین دلاتے رہیں کہ وہ بہت بڑے ادیب ہیں اور ان کی شخصیت اتنی عظیم ہے کہ وہ جگر کے مہلک امراض سے بھی متاثر نہیں ہو سکے۔ ان نام نہاد دوستوں نے انھیں کافی خراب کیا ہے۔ وہ ہر وقت منٹو کے گرد جمع رہتے ہیں ان کا جی چاہتا ہے تو وہ آسانی سے انہیں خمار ریختہ یا اُلو زمین کر دیتے اگر وہ ان سے کرسی پر کھڑے ہو جانے کو بھی کہیں تو وہ اس کے لئے کسی پس و پیش کے بغیر تیار ہو جاتے ہیں

پاکستان کی کرکٹ ٹیم ہندوستان کا دورہ کر کے واپس آئی تو بعض کھلاڑی جن میں وقار حسن اور محمود حسین بھی شامل تھے، مجھ سے ملنے کے لئے آئے۔ منٹو ماموں کو نہ جانے کیسے اس کی اطلاع مل گئی۔ اس زمانے میں انھوں نے اپنا حال ایسا بنا رکھا تھا کہ وہ میرے فلیٹ میں نہیں آتے تھے لیکن کرکٹ کے کھلاڑیوں سے ملنے کے لئے چلے آئے تعارف کے بعد وہ وہیں بیٹھ گئے اور کرکٹ کے کھلاڑی اپنے دورے کے تاثرات بیان کرنے لگے لیکن منٹو ماموں کب تک خاموش بیٹھتے۔ وہ آگے کی ایک کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے اور انھیں کے برابر کرکٹ کے کھلاڑیوں کی کرسیاں تھیں۔ وہ مشکل سے پانچ منٹ بیٹھے ہوں گے کہ اپنی کرسی سے اٹھ کر کمرے کے وسط میں قالین پر بیٹھ گئے۔ انھوں نے محمود حسین کو بات کرتے کرتے روک دیا ان کا جملہ بھی پورا نہ ہونے پایا تھا کہ انھوں نے کہنا شروع کر دیا۔ مجھے معلوم ہے تم تیز باؤلر فراڈ ہوتے ہیں۔ اچھا بتاؤ تو تم گیند کو کس طرح لیپ کرتے ہو۔ وقار حسن کو بھی منٹو ماموں سے بتانا پڑا کہ وہ اپنے "فراڈ اسٹروک" کس طرح لگاتے ہیں۔ اس کے بعد منٹو ماموں نے کسی اور کو نہیں بولنے دیا اور بہت سے لوگ جو ہندوستان کے دورے کا حال خود پاکستان کے کھلاڑیوں سے سننا چاہتے تھے پیچ و تاب کھا کر رہ گئے۔

ہر محفل میں تمام نظروں اور ہر شخص کی توجہ کا مرکز بننے کی خواہش ان کے دل میں غالباً اس لئے پیدا ہوئی ہے کہ گذشتہ چند سال میں ان کے گھر، ان کے اعزا اور ان کے دوستوں میں ان کا وقار بہت گر گیا ہے اس سے انھیں شدید صدمہ پہنچا ہے اس کا اپنی زبان سے اعتراف تو وہ شاید کبھی نہ کریں۔ وہ محبت و اخلاص کے بھوکے ہیں اور جب وہ اس سے محروم رہتے ہیں تو دوسروں کی توجہ اپنی جانب مبذول کرانے کی کوشش وہ خود ہی کرنے لگتے ہیں۔ اسے حقیقی جذبات کا نعم البدل تو نہیں کہا جا سکتا لیکن کم نظر اندازی سے پھر بھی بہتر ہے۔ منٹو نے اپنے اعزا اور سچے دوستوں سے اپنی زندگی کے پرمسرت دور میں بے لوث اور بے دریغ محبت کی تھی۔ ان کے اعزا اور احباب کے دل آج بھی ان کے لئے اسی محبت و اخلاص سے معمور ہیں لیکن وہ صرف اتنا چاہتے ہیں کہ اس کا اظہار جس شخص سے کریں وہ بہروپئے کی بجائے ایک حقیقی انسان ہو۔ لیکن منٹو ماموں کا ان سے یہ مطالبہ معلوم ہوتا ہے کہ سعادت حسن سے محبت کرو لیکن منٹو کو بھول جاؤ اور در گزر کرو یہ مطالبہ بالکل ہی ناقابل قبول نہیں ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ تجربے نے ثابت کر دیا ہے کہ سعادت حسن کی تکمیل ہمیشہ منٹو کے ہاتھوں میں رہتی ہے

منٹو ماموں کو اس حقیقت کا خود بھی علم ہے کہ ان کی خود ساختہ شخصیت کی رد شناختیں ہیں اس کا علم مجھے جن حالات میں ہوا وہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہیں۔ ایک بار منٹو کی نانا اور سادک دار جانے مجھے دعوت دی کہ میں ایک کہانی کے متعلق اپنی رائے ظاہر کروں کہانی تو بڑی مرثیہ اور عمدہ تھی لیکن ہیرو ہونے کے باوجود منٹو کا جو کردار دکھایا گیا تھا اس سے زیادہ آب و تاب ایک خدائی اور ظالم انسان کی شخصیت میں تھی۔ میں نے بار بار زور دیا کہ دوسرے کردار کی اہمیت کم کر دی جائے لیکن منٹو ماموں کسی کام سے اٹھ کر تھوڑی دیر کے لئے باہر گئے تو اشوک کمار نے مجھ سے سرگوشی کے انداز میں کہا کیوں بیکار رہے تم ہیں معلوم نہیں دوسرا کردار منٹو نے خود اپنے لئے لکھا ہے۔ لیکن اس کے باوجود میں اپنی بات پر اڑا رہا میں اسی صفائی اور نرمی سے گفتگو کر رہا تھا جو اس فلمی کہانی ہے۔ رہے لکھتے وقت منٹو ماموں نے اس کا ایک

[illegible]

[illegible]

حصّہ چہارم

سکول کے زمانے میں ہی کرشن چندر کو کتابوں کے پڑھنے کا شوق پیدا ہوا۔ سب سے پہلے "الف لیلیٰ" پڑھی، پھر "فسانۂ آزاد" - پھر پریم چند کی کہانیاں۔ ٹیگور کے ناول انہوں نے دسویں جماعت سے پہلے ہی پڑھ ڈالے۔

جب وہ پڑھتے تھے تو کھانا پینا اور کسی سے بات تک کرنا بھول جاتے تھے۔ والدہ اگر بلاتیں تو وہ جواب تک نہ دیتے۔ والدہ باورچی خانے سے غصّے سے بھری ہوئی نکلتیں، کتاب ہاتھ سے چھین کر پھینک دیتیں اور کھانے کے لئے کہتیں۔ بہرحال کرشن چندر کو والدہ کا کہنا ماننا پڑتا اور کھانا کھا لیتے۔ کتنی بار والدہ نے والد صاحب سے شکایت کی کہ انہیں کتابیں نہ پڑھنے دیا کریں۔ صحت خراب ہو جائے گی، آنکھیں کمزور ہو جاتی ہیں اور آدمی کسی کام کا نہیں رہتا۔ لیکن والد محترم کچھ نہ کہتے۔ بس ایک چُپ، ایک لمبی خاموشی! اور والدہ بڑبڑاتی ہوئی خاموش ہو جاتیں۔

کرشن چندر کا پہلا مضمون مزاحیہ تھا جو انہوں نے میٹرک کے زمانے میں اپنے فارسی کے ٹیچر پر لکھا تھا، جو ہفتہ وار پرچے "ریاست" میں چھپا۔ یہ ان کی پہلی کوشش تھی جو ان کے دوستوں نے کافی پسند کی۔ کالج کے زمانے میں وہ زیادہ تر انگریزی میں لکھتے رہے اور اپنے کالج کے میگزین سیکشن کے ایڈیٹر رہے۔ کالج کے زمانے میں انہوں نے کھیل کود میں حصّہ لینا چھوڑ دیا اور فارغ اوقات میں کالج سے باہر کی دنیا میں زیادہ دلچسپی لی۔ جب کرشن چندر ایف ایس سی میڈیکل میں پڑھتے تھے ان دنوں وہ گوردت بھون میں رہتے تھے۔ یہیں پر بھگت سنگھ کے ساتھیوں سے ان کا تعارف ہوا اور جب بھگت سنگھ اور اس کا گروہ پکڑا گیا تو کرشن چندر کو بھی پولیس پکڑ کر لے گئی اور کرشن چندر تقریباً ایک ماہ تک لاہور کے قلعے میں نظر بند رہے۔ تفتیش کے بعد کرشن چندر کو رہا کر دیا گیا، شاید انہی دنوں ان کا سیاسی نظریہ بننے لگا تھا۔ کیونکہ انہوں نے کالج کی زندگی کو زیادہ اہمیت نہ دی۔ ڈگری حاصل کرنا تو ٹھیک بات تھی لیکن زندگی کا مقصد محض ڈگری حاصل کرنا نہیں تھا۔ وہ کالج کے کورسوں کو بہت کم پڑھتے تھے۔ زیادہ وقت ناولوں اور کتابوں کے پڑھنے میں صرف ہوتا تھا یا طلبا کی تحریک میں حصّہ لینا شروع کر دیا تھا۔ کرشن چندر نے فارمن کرسچین کالج سے انگلش کا ایم اے کیا پھر ایل ایل بی کی ڈگری لی۔ ان چار سالوں میں کرشن چندر نے مختلف شعبوں میں کام کیا۔ سیاست میں ان کی دلچسپی بڑھنے لگی۔ ایل ایل بی کے دنوں میں سوشلسٹ پارٹی کے نزدیک ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ ایک بار کرشن چندر جھنگیوں کی دہلی انجمن کے صدر چُنے گئے۔ انہی دنوں کرشن چندر نے کہانیاں لکھنی شروع کیں۔ "یرقان"، "انگور" اور "طلسمِ خیال" کا مجموعہ انہی دنوں چھپا۔ طنزیہ اور مزاحیہ انداز میں مضمون لکھے۔ پھر "دو فرلانگ لمبی سڑک" ایسی معرکۃ الآرا کہانی لکھی جس نے اردو افسانے میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔ لیکن اس عرصے میں کرشن چندر سیاست کی گتھیوں کو بھی سلجھاتے رہے۔ وہ تقریباً ہر روز جھنگیوں کی چالوں میں جاتے تھے، لیکچر دیتے تھے، میٹنگ آرگنائز کرتے تھے۔ پنجاب کے لیڈروں سے بات چیت کرتے تھے۔ جب تک وہ یہ طے نہ کر پائے تھے کہ انہیں کیا بننا ہے۔ کیا انہیں پروفیسر بننا چاہیئے یا ایک سیاست دان۔ چالوں کے گرد چکر لگاتے ہوئے، لیڈروں سے ملتے ہوئے، کہانیاں لکھتے ہوئے انہیں یہ طے کرنا تھا کہ کالج کی زندگی کے بعد انہیں کیا کرنا تھا۔ ان دنوں وہ ہندو ہوٹل میں رہتے تھے۔ یہاں پر کنہیا لعل کپور، اشک اور بیدی سے ملاقات ہوئی، ادب میں آنا شروع کیا۔ ہمایوں نے کرشن چندر کے مضمون کی بہت تعریف کی۔ ہندوستان کے مختلف رسالوں سے افسانوں کی مانگیں آنے لگیں۔ اور "ادبی دنیا" کے ایڈیٹر صلاح الدین احمد نے ان کے افسانوں کا جائزہ لیتے ہوئے ان کی ہمت افزائی کی۔ کرشن چندر کی زندگی کا یہ دور الجھنوں سے بھرپور تھا۔ دماغ میں کشمکش تھی، کیا انہیں سیاست دان بننا چاہیئے یا محض ایک ادیب۔ اور آخرکار انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنی ساری زندگی ادب کی نذر کریں گے۔ یہ فیصلہ ایک نیک فال تھا، کیونکہ ان کی طبیعت کا رجحان بھی یہی تھا۔ محض لیڈری ان کے بس کی بات نہ تھی۔

اور جب کرشن چندر یہ فیصلہ کر چکے تو انہوں نے متواتر افسانے لکھنے شروع کر دیئے، ایک افسانہ کے بعد دوسرا افسانہ، پھر تیسرا۔ ایک کتاب کے بعد دوسری کتاب پھر تیسری۔ اور پھر ایک دن آیا کہ وہ ہندوستان کے سب سے بڑے افسانہ نگار بن گئے۔ اس میں شک نہیں کہ انہوں نے بے حد محنت کی اور کبھی بھی آرام نہ کرتے تھے، وقت کبھی ضائع نہ کرتے تھے۔ کتابیں پڑھنا یا لکھنا ان کا محبوب مشغلہ بن گیا اور ان کی شہرت ملک کے کونے کونے میں پھیل گئی۔ جب کرشن چندر محض ایک ذہین طالب علم تھے میں ان کے ساتھ تھا، جب انہوں نے لیڈر بننے کی کوشش کی میں ان کے ساتھ تھا، جب وہ ایک مشہور افسانہ نگار بن گئے میں ان کے ساتھ تھا لیکن میں نے ان کے رویے میں کوئی فرق نہ دیکھا، ان تمام باتوں میں ان کے attitude میں کوئی فرق نہ

گیا۔ وہی ہنستا ہوا چہرہ، زبان میں وہی حلاوت اور مٹھاس، چہرے پر وہی شگفتگی اور زندگی سے اُتنا ہی پیار، رگوں پر بھی اتنا ہی بھروسہ اور اُتنا ہی اعتماد۔

پڑھنے والے انہیں کتنا چاہتے ہیں، اُن سے کتنا پیار کرتے ہیں، پڑھنے والوں کے دلوں میں کرشن چندر کی کتنی قدر و منزلت ہے، اس کا مجھے احساس نہ تھا شاید انہوں نے اس کا احساس دلانے کی کبھی کوشش نہ کی اور میں انہیں صرف ایک مشفق اور مہربان بھائی سمجھتا رہا۔

لیکن اس عرصہ میں ایک عجیب واقعہ ہوا۔ جس کا ذکر میں یہاں کرنا چاہتا ہوں۔ میں دہلی کے ایک کالج میں ایم اے کی تعلیم پا رہا تھا اور اپنی کلاس میں کرشن چندر کی نئی کتاب "نظارے" کی ورق گردانی کر رہا تھا کہ ایک طالب علم میرے قریب آیا۔ اس نے یہ کتاب مجھ سے لی۔ کرشن چندر کی تصویر جو اس میں شامل تھی، دیکھ کر کہنے لگا "آپ انہیں جانتے ہیں؟"

"جی ہاں!"

"کہاں رہتے ہیں کرشن چندر؟"

"کیا بات ہے؟"

"میں اُن سے ملنا چاہتا ہوں"

"میں آپ کو اُن سے ملا دوں گا"

"آپ کیسے ملا دیں گے؟"

"میں انہیں جانتا ہوں"

"کیسے؟"

"میں اُن کے ساتھ رہتا ہوں"

"کیوں؟"

اس کیوں کا جواب میرے پاس نہ تھا۔ میں ذرا خاموش ہو گیا۔

"آپ انہیں کیسے جانتے ہیں؟"

"میں اُن کا بھائی ہوں"۔ یہ ٹھیک بھی تھا۔ اُن دنوں میں کرشن چندر کا محض بھائی تھا۔ افسانہ نگار نہ تھا۔

"آپ واقعی اُن کے بھائی ہیں؟" اُس نے حیرت سے پوچھا۔ جیسے کرشن چندر کا کوئی بھائی نہیں ہو سکتا۔

"آپ کو یقین نہیں آتا" میں نے چڑ کر کہا۔

"آپ اُن کے سگے بھائی ہیں؟" اُس نے پھر لفظ "سگے" پر زور دیتے ہوئے کہا۔

میں نے کہا "ہاں"۔

اُس کا چہرہ اُتر گیا۔ اُس نے شاید یوں کبھی نہ سوچا تھا۔

طالب علم کی یہ کیفیت دیکھ کر مجھے بے حد صدمہ ہوا۔ میں نے دل ہی دل میں اپنے آپ کو کوسا۔ میں نے سوچا۔ مجھے کرشن چندر کے متعلق اس طالب علم کو کچھ نہ بتانا چاہیے تھا۔ نہ جانے یہ کرشن چندر کو کیا سمجھتا ہے۔ شاید وہ کرشن چندر کو کوئی آفاقی شخصیت سمجھتا تھا۔ شاید وہ یہ سمجھتا تھا کہ کرشن چندر زمین پر نہیں رہتا، آسمان پر رہتا ہے یا کشمیر کے مرغزاروں میں رہتا ہے۔ شاید کرشن چندر کا کوئی بھائی نہیں ہو سکتا اُس کی کوئی ماں، باپ، اور دیگر رشتہ دار نہیں ہو سکتے۔ شاید کرشن چندر کچھ نہیں کھاتا، وہ صرف افسانے لکھتا ہے۔ طالب علم یہ سن کر آگے بڑھ گیا۔ اُس نے کرشن چندر سے ملنے کی کوئی خواہش ظاہر نہ کی۔ اُس کے خوابوں کو شدید جھٹکا لگا تھا۔

اُس دن سے میں نے یہ قسم کھائی کہ میں اب دوبارہ کسی کے سامنے اپنے آپ کو کرشن چندر کا بھائی نہ کہوں گا۔ کرشن چندر جو عوام میں اتنا محبوب ہے۔ شاید لوگ اُسے یوں دیکھنا پسند نہیں کرتے تھے۔ اس واقعے کے بعد میں نے آج تک کسی شخص کو یوں نہ کہا کہ میں کرشن چندر کا بھائی ہوں۔

کرشن چندر بے حد نارمل قسم کے انسان ہیں۔ اُن سے مل کر آپ اُن کی ادبی شخصیت کے کبھی قائل نہ ہوں گے۔ کیونکہ آپ پر کبھی رُعب نہ جمائیں گے۔ وہ آپ کی باتیں سُنیں گے۔ آپ کے نظریے کی جان پہچان کریں گے۔ وہ اپنے افسانوں کے بارے میں آپ کی رائے چاہے وہ اچھی ہو یا بُری ہو۔ بڑی خندہ پیشانی سے سُن کر برداشت کریں گے۔ میرا مادہ کرشن چندر میں سب سے زیادہ ہے۔ میں نے آج تک انہیں خفا ہوتے نہیں دیکھا۔ کبھی کبھی تو میں سوچتا ہوں کہ کرشن چندر کے پاس اتنی قوت برداشت کہاں سے آئی۔ زندگی میں انہیں ان مشکلات کا سامنا کرنا پڑا لیکن وہ زندگی سے لڑتے رہے۔ حرفِ شکایت اُن کے لبوں پر کبھی نہ آیا۔ زندگی میں تلخی جو کبھی زہر کا روپ دھارن کر لیتی ہے۔ اُن کی گھریلو زندگی میں اس کا اظہار کبھی نہ ہُوا۔

یہ عجیب ہے کہ انہوں نے زندگی میں ناکامیوں کا مُنہ بہت کم دیکھا۔ لیکن اپنی شہرت حاصل کرنے کے بعد دماغی توازن کبھی نہ کھویا۔ ہر چھوٹے اور بڑے ادیب کی عزت کی۔ اپنی بساط کے مطابق ہر ادیب کی ہمت افزائی کی اُسے آگے بڑھنے کی تلقین کی۔ اُسے مشورہ دیا۔ اُسے اچھی صلاح دی۔ روپوں سے مدد کی۔ میں نے آج تک کرشن چندر کی زبان سے کسی ادیب کے خلاف کچھ نہیں سُنا۔ حسد کا جذبہ اُن میں نہیں ہے وہ زندگی میں صرف خود ہی آگے بڑھنا نہیں چاہتے بلکہ آدمیوں کے قافلے کو اپنے ساتھ لے کر آگے بڑھنا چاہتے ہیں۔

جب کرشن چندر آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن پر نوکر ہوئے تو اس نوکری کو پاکر انہیں خوشی نہ ہوئی۔ اور اس بات کا ذکر انہوں نے ایک کتاب کے انتساب میں کیا جس میں یہ لکھا: "اُس کرشن چندر کے نام جس نے ایک حسین صبح کو اپنا گلہ گھونٹ لیا۔" یہ وہ صبح تھی جب انہوں نے آل انڈیا ریڈیو پر نوکری کرنی منظور کر لی تھی۔ دراصل وہ یہ چاہتے تھے کہ محض لکھ کر اپنا اور باقی کنبے کا پیٹ پال سکیں۔ لیکن ہندوستان میں ایک ادیب کے لئے ناممکن ہے کہ وہ صرف کتابوں کی آمدنی پر ایک صحت مند زندگی گذار سکے۔

انہیں اپنی شخصی آزادی کے کھونے کا رنج تھا۔ شاید وہ سمجھتے تھے کہ سرکار کی نوکری کرنے کے بعد وہ آزادی سے لکھ نہ سکیں گے لیکن آل انڈیا ریڈیو کی نوکری کرتے ہوئے بھی انہوں نے ترقی پسند افسانے اور ڈرامے لکھے۔ "سرائے کے باہر" اسی نوکری کے دوران میں لکھا گیا۔ دلی ریڈیو اسٹیشن پر ادیبوں کا جمگھٹا لگا رہتا تھا۔ یہیں پر میری پہلی بار منٹو، راشد، میراجی، احمد ندیم قاسمی، اوپندر ناتھ اشک، شمشیر سنگھ نرالا، شاہد احمد دہلوی، چراغ حسن حسرت، ڈاکٹر تاثیر اور دیگر احباب سے ملاقات ہوئی۔

کرشن چندر کا گھر اُن دنوں ادیبوں کا مسکن بنا ہُوا تھا۔ تقریباً ہر ادیب سے ملاقات ہو جاتی۔ اگر گھر پہ نہیں تو ریڈیو اسٹیشن پر۔ اُن دنوں اوپندر ناتھ اشک اور منٹو کی خوب لگتی تھی لیکن کوئی حاسدانہ جذبہ نہ تھا۔ اُن دنوں آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن دلی سے بہترین ڈرامے نشر کئے گئے۔ کرشن چندر ڈرامہ سیکشن کے انچارج تھے۔ اگر اشک ایک ڈرامہ لکھ کر لاتے تو منٹو دو ڈرامے لکھ کر لاتے۔ اُن دنوں خوب بحثیں ہُوا کرتی تھیں۔ ادیب آپس میں مل بیٹھ کر خوش ہوتے تھے۔ تخلیقی کام میں ایک دُوسرے کی مدد کرتے تھے۔ ایک دُوسرے سے پیار کرتے تھے۔ ایک دُوسرے کو گھر پہ بُلاتے تھے۔ اکٹھے ملتے تھے، کھاتے تھے، پیتے تھے، ہنستے تھے اور لکھتے تھے۔ اور بے حد خوبصورت چیزوں کی تخلیق کرتے تھے۔ اُن دنوں تمام ادیبوں میں بھائی چارے کا شدید احساس تھا۔

میں نے اس قسم کا ادبی دور کبھی نہیں دیکھا۔ ادیبوں کو اس طرح خوش رہتے ہُوئے کبھی نہیں دیکھا۔ اُن دنوں اُردو افسانہ اپنی بلوغ کو پہنچ چکا تھا۔ ہر ادیب ایک دُوسرے سے اچھا لکھنے کی کوشش کرتا تھا اور ہر اچھے افسانے کی تعریف کرتا تھا چاہے وہ اپنا ہو یا کسی اور کا۔ اُنہی دنوں کرشن چندر کے گھر میں نئے ادیبوں نے آنا شروع کیا۔ عسکری آتے تھے، نہایت خاموش اور متین اور سنجیدہ۔ ان باتیں کر کے واپس چلے جاتے۔

کرشن چندر دلی سے لکھنؤ گئے اور اُس کے بعد ڈبلیو زیڈ احمد نے انہیں شالیمار میں بلا لیا۔ سرکاری ملازمت ترک کرنے کے بعد انہیں ذہنی تسکین ضرور ملی۔ ریڈیو پر کافی کام کرنا پڑتا تھا۔ لیکن ریڈیو پر کرشن چندر کو ہر قسم کی سہولتیں میسر تھیں۔ اعلیٰ افسر اُن کی عزت کرتے تھے۔ بخاری اکرم ناتھ چب

وقت پینے آپ کو کبھی پیچھے نہ رکھا۔ ترقی پسند انجمن کی میٹنگوں میں باقاعدہ آتے رہے۔ افسانے پڑھتے اور اپنے افسانوں پر تنقید سنتے تھے۔ پھر انہی دنوں SOUTH کا دورہ کیا اور واپس آکر "صبح ہوتی ہے" ایک رپورتاژ لکھا۔

کرشن چندر کے کردار میں ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ دوسروں پر چھا جانے کی کبھی کوشش نہیں کرتے۔ میٹنگ میں آکر سب سے پیچھے بیٹھ جائیں گے۔ اور جان بوجھ کر تقریر نہیں کریں گے۔ کوئی بلائے گا تو ضرور اپنی رائے کا اظہار کریں گے۔ وہ ایک نہایت ہی نارمل زندگی بسر کرتے ہیں' ایک عام انسان ایسی زندگی' جیسے اپنے گھر سے محبت ہے۔ بیوی سے محبت ہے، بھائیوں سے پیار ہے۔ دوستوں میں مل بیٹھ کر خوش ہوتے ہیں۔ زندگی کی جتنی اچھائیاں ہیں' انہیں اپنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ زندگی میں بے راہ روی اختیار کرنے کے قائل نہیں۔ بہت سے ادیبوں کی طرح لمبے بال نہیں رکھتے۔ گندے اور میلے کپڑے پہننے کے عادی نہیں۔

تھوڑی بہت شراب پی لیتے ہیں' شراب پی کر بہکتے نہیں۔ بلکہ زیادہ سنجیدہ ہو جاتے ہیں۔

آج کل وہ بمبئی کے مضافات ورسوا میں قیام پذیر ہیں۔ ایک نہایت ہی شاندار کوٹھی' باہر سے شاندار لیکن اندر سے نہایت عامیانہ۔ جس کے اندر ایک عام آدمی رہتا ہے جس کے خیال اونچے ہیں' جس کا ادب قد آور ہے۔ جس کی ادبی شخصیت اس کی ذاتی شخصیت سے بہت بلند تر ہے۔ اس کے ٹھاٹھ سے اس کے رہنے سہنے میں' اس کی بات چیت میں کوئی اچنبھے والی بات نہیں اور نہ ہی وہ جان بوجھ کر کوئی ایسی بات کرتا ہے کہ دیکھنے والا اس کی طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگے۔ وہ چپکے سے مسکراتے ہوئے آپ کے سامنے سے گذر جاتے ہیں۔ اتنی شہرت حاصل کرنے کے بعد ان کی ذات میں گھمنڈ کا شائبہ تک نہیں۔ مجھ سے اکثر کہتے رہتے ہیں "مجھے لوگوں نے بہت کچھ دیا۔ مجھے شہرت دی، میرے ادب کے وہ پرستار ہیں اور مجھے روپے بھی کم نہیں دیئے۔" جتنے روپے کرشن چندر نے اپنی کتابوں سے کمائے ہیں، شاید ہی کسی ہندوستانی ادیب نے ادب کے ذریعے کمائے ہوں۔ لیکن جمع کرنے کی ان کی عادت نہیں۔ جب کبھی وہ عوام کا ذکر کرتے ہیں تو ان کی آنکھیں چمکنے لگتی ہیں۔ انہیں عام لوگوں سے بے انتہا محبت ہے۔ شاید اسی وجہ سے عوام ان سے اتنی محبت کرتے ہیں۔ اور وہ فخر و محبت سے اپنا سر بلند کر لیتے ہیں کہ میں اکیلا نہیں ہوں۔ میرے ساتھ میرے عوام ہیں — جن کے لئے میں ادب تخلیق کرتا ہوں۔

کرشن چندر کی کامیابی کے دو راز ہیں۔ پہلی بات یہ کہ وہ کام کرنے سے کبھی نہیں ہچکچاتے۔ اگر وہ لکھیں گے نہیں تو پڑھیں گے — بیکار وقت ضائع نہیں کرتے۔ اگر ان دو چیزوں سے فرصت مل جائے تو باقی وقت سوشل کاموں میں صرف کریں گے۔ کام کرنے کی بے پناہ قوت ان میں ہے بلکہ میں اگر یہ کہوں کہ تخلیقی کام سے انہیں انتہائی محبت ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ میں نے زندگی میں انہیں بیکار بیٹھتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا۔

اور ساتھ ہی انہیں اپنی ذات پر بھروسہ ہے' اپنے لوگوں پر بھروسہ ہے اور یہی دو چیزیں ان سے لازوال افسانے لکھوانے کی محرک ہیں۔ کام کی صلاحیت اور لگن۔ زندگی سے پیار۔ بیکار وقت ضائع نہ کرنا' یہ چیزیں ہم آدمیوں کو ان سے سیکھنا چاہئیں۔ یہی ان کی کامیابی کا سب سے بڑا راز ہے۔

ایک بات کے بارے میں میں کچھ نہ کہوں گا۔ وہ ہے ان کا عشق۔ زندگی میں ہر شخص نے عشق کیا ہے۔ کرشن چندر نے بھی عشق کئے ہیں' اور اس موذی مرض کا تقریباً ہر شخص شکار ہوا ہے' بڑے بڑے ادیبوں نے بڑے بڑے عشق کئے ہیں اور کرشن چندر نے بھی ———— یہ راہ کچھ ایسی ہے کہ بڑے فن کار بھی بھٹک جاتے ہیں کیونکہ یہ دل کا معاملہ ہے۔ عشق کے کوئی خاص اصول نہیں ہوتے۔ کوئی فارمولا نہیں ہوتا کہ انسان سوچ سمجھ کر چلے۔

کرشن چندر عشق کرتے ہیں لیکن جلدی راہ راست پر آجاتے ہیں۔ ان کا دل بہت بڑا ہے اور چونکہ انہیں معلوم ہے کہ زندگی میں انہیں کیا کرنا ہے اس لئے وہ عشق و محبت کو سب سے افضل چیز قرار نہیں دیتے۔ اسے ہمیشہ Secondary Position دی۔ میں اس مسئلے پر زیادہ روشنی نہیں ڈالوں گا' کیونکہ اس میں کسی کا بس نہیں۔

آخیر میں صرف یہ عرض کروں گا کہ گو کرشن چندر قد آور ادب کی تخلیق کرتے ہیں اور ان کا شمار دنیا کے چوٹی کے ادیبوں میں سے ہے۔ لیکن ان کی نجی زندگی ایک عام انسان کی طرح ہے ——۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

ނިމުނީ

[illegible]

—— "یہ کیا حماقت ہے"

—— "بھئی ذرا جلدی بال اُگالو، میں تو تمہیں دیکھ کر وحشت ہوتی ہے۔"

مجھے غصہ تو آیا کہ "بال اگالو" گویا کہ ہمارا سر نہ ہوا آلوؤں کا کھیت ہو گیا۔ مگر کرتے کیا.....

اس زمانے میں لکھنؤ میں نمائش لگی ہوئی تھی۔ ہم لوگ نمائش دیکھنے گئے۔ شاہد، عصمت، بھائی صاحب اور ایک آدھ اور عزیز۔ عصمت اور شاہد ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ نہ معلوم مجھے کیوں یوں محسوس ہوا جیسے عصمت دانستہ ایک قدم پیچھے رہنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ اس وقت یہ خیال میرے ذہن میں بہت مبہم تھا۔ لیکن اب میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ عصمت شاہد سے بہت بڑی ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ انہوں نے ہمیشہ اپنے آپ کو چھوٹا بنا کر دوسروں کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کی۔ اپنی اس کوشش میں وہ کہاں تک کامیاب ہوئیں، اس کے متعلق میں کیا عرض کر سکتا ہوں۔۔

ہاں تو نمائش میں بھائی صاحب کے ایک دوست بھی مل گئے۔ شاہد اور عصمت کو دیکھ کر کہنے لگے "قد و قامت کے لحاظ سے جوڑ برابر کا نہیں"۔ انہوں نے محض ظاہر دیکھ کر یہ فیصلہ کیا تھا ویسے اگر قد و قامت کا لفظ ہٹا دیا جائے تو بات زیادہ سچی ہو جائے گی۔ تسلسل اور برسوں کی ترتیب نے امحال نجات حاصل کرتے ہوئے ایک بات اور کہتا چلوں ضروری سمجھتا ہوں۔ ۱۹۴۶ء میں اتفاقاً میری نظر عصمت کی ڈائری پر پڑ گئی۔ اس ڈائری کو پڑھنے کے بعد ان کی فطرت کی چھپی ہوئی سلطنتیں میرے سامنے کچھ اس طرح آگئیں کہ میں نے اپنا سر جھکا دیا —— ایک جگہ لکھا تھا:

میں نے اونچی ایڑی کی سینڈلیں اس لئے پہننا چھوڑ دیں کہ میرے اور شاہد لطیف کے قدوں کا باہمی فرق کم ہو جائے اور وہ بڑے معلوم ہونے لگیں —— میں نے لکھنا کم کر دیا تاکہ میری شہرت سے وہ احساس کمتری میں مبتلا نہ ہوں —— میں نے اچھے لباس پہننے چھوڑ دئے تاکہ لوگوں کی نظریں مجھ پر کم پڑیں۔"

یہ ہے حقیقی عصمت چغتائی کا ایک عکس۔ اس کی روح کی ایک جھلک۔ مولانا صلاح الدین نے کہیں لکھا ہے کہ آنے والی نسلوں کی مائیں بہنیں عصمت کے کرداروں کو اپنے پہلو میں مچلتا ہوا محسوس کریں گی" —— یہ بڑی سچی بات ہے۔ عصمت نے بے باک افسانے لکھے۔ روایتی اخلاق کو ٹھکرایا۔ لیکن اس ایثار پیشگی کی مثال کہیں اور مشکل ہی سے ملے گی۔

بڑی شخصیتوں کی قلمی تصویریں بنانا اس لئے اور بھی مشکل ہے کہ بات سے بات نکلتی آتی ہے اور ترتیب باقی نہیں رہتی ——

—— تو عصمت دس پندرہ دن لکھنؤ رہ کر بمبئی واپس چلی گئیں —— میں عارضی طور پر انہیں بھول گیا اور اپنے میٹرک کے امتحان کی تیاری میں اُلجھ گیا۔ جب امتحان ختم ہوا، اور سر پر بال اُگ آئے تو شاہد بھائی اور عصمت بھابی یاد آئیں —— ویسے بھی بمبئی میرے خوابوں کی سرزمین تھی۔ چند سال پہلے گھر کا ایک نوکر اچانک بھاگ گیا، اور دو تین سال کے بعد جب لوٹا تو حلیہ ہی بدل گیا تھا۔ سفید پتلون، ریشمی قمیض، اس میں سونے کے بٹن، بیڑی کے بجائے سگریٹ، ہاتھ میں گھڑی —— میں نے پوچھا "یہ سب کیا؟" کہنے لگا "بھیا بمبئی کا فیض ہے" —— غرضیکہ میں بمبئی کے فیض کا قائل بھی تھا، اور اس فیض کے حاصل کرنے کا متمنی بھی۔ عصمت بھابی اور شاہد کا تو بہانہ تھا۔ مقصد تو بمبئی جانا تھا۔ امتحان سے فارغ ہوتے ہی میں نے اپنے ارادے کا اعلان کر دیا۔ بھائی صاحب نے شروع میں مخالفت کی لیکن پھر مان گئے۔ چنانچہ میں لکھنؤ سے بمبئی کے لئے روانہ ہو گیا —— پہاڑ جیسا سفر اللہ اللہ کر کے ختم ہوا۔ وکٹوریہ ٹرمینس سے دوسری گاڑی میں بیٹھ کر ملاڈ پہنچا۔ ایک قلی سے پوچھا —— "عصمت چغتائی کو جانتے ہو" —— "آں —" اس نے "آں" کچھ اس طرح کہا کہ اس کا قطعی مطلب یہ تھا کہ نہیں۔ پھر میں نے پوچھا "شاہد لطیف کو جانتے ہو؟ نیا سنسار، قسمت کے انہوں نے ڈائیلاگ لکھے ہیں، بہت مشہور آدمی ہیں۔ اور عصمت بہت بڑی ادیبہ ہیں" قلی مجھے حیرت سے دیکھتا رہا اور پھر بولا —— "نکو جانے" —— یقین جانئے قلی پہ بہت غصہ آیا کہ اتنی مشہور ادیبہ اور جوبلی منانے والے فلم کے ڈائیلاگ رائٹر کا نام تک نہیں معلوم —— اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس وقت "ادیب" کا کیا تصور میرے ذہن میں ہوگا۔ بہرحال میں نے قلی سے کہا "سامان اٹھاؤ"۔ اس زمانے میں شاہد اور عصمت وقری بلڈنگ میں

رہتے تھے۔ شاید بمبئی ٹاکیز سے الگ ہو چکے تھے۔ فلستان کی داغ بیل ڈالی جارہی تھی۔ اور عصمت اس وقت تک انسپکٹرس آف سکولز تھیں لیکن وقتر نہیں جارہی تھیں ——— کچھ دنوں کے بعد انہیں ماں بننا تھا۔ اپنی زندگی کے ہر گوشے میں عصمت نے تخلیق کو ایک عظمت عطا کی ہے ——— ان کی توت تخلیق کے لئے کوئی ایک میڈیم کافی نہیں ہے۔ افسانے، ڈرامے، ناول، نظم ——— عصمت اس زمانے میں "ٹیڑھی لکیر" لکھ رہی تھیں۔ ان کا املا بہت خراب ہے۔ انہیں ذرا سا موقع ملے تو وہ نظام کو "ز" سے لکھ دیں۔ عصمت بھابی بولتی جاتی ہیں اور میں لکھتا جاتا۔ اس سے پہلے مجھے بس یہ معلوم تھا کہ وہ بہت بڑی لکھنے والی ہیں۔ میں ان کی شہرت سے بہت مرعوب تھا، لیکن کبھی ان کی کوئی چیز پڑھی نہ تھی۔ "ٹیڑھی لکیر" میں مجھے بہت مزہ آیا۔ مزہ میں نے اس لئے کہا کہ اس وقت میں اس ناول کی ادبی قدر و قیمت کو کیا سمجھ سکتا تھا۔ لیکن بہی منزل میں باتیں ایسی تھیں کہ محسوس ہوتا تھا کہ "نھی" کے دماغ میں اٹھنے والے مختلف النوع سوالات جیسے میرے اپنے ذہن میں گونج رہے ہیں۔ بعض باتیں ایسی ہوتیں کہ کبھی کبھی تو میرے کانوں کی لَویں تک سُرخ ہو جاتیں ——— "توبہ توبہ! یہ لڑکیاں اپنے ہوسٹل میں کیا کرتی ہیں ———"

عصمت ان دنوں مجھے اچھی لگتی تھیں۔ ان کے چہرے کے گرد ایک ہالہ سا نظر آتا۔ جو تخلیق کے ساتھ لازم و ملزوم ہے۔ وہ دھیمے دھیمے قدموں سے چلتیں اور بڑی پُر وقار معلوم ہوتیں۔ وہ خود جس وقت لکھتی ہیں تو اوندھی لیٹ کر۔ ان کا چہرہ کاغذ سے اتنا قریب ہوتا جیسے کاغذ اور عصمت کا کوئی گہرا تعلق ہے۔ نوکر بھاگ گیا تھا۔ عصمت کھانا خود پکاتی تھیں۔ انہیں کھانا پکانے کا بہت شوق ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ کبھی کوئی چیز سلیقے سے نہ پکا سکیں۔ ہاں کھانا اپنی مرضی سے، جو پک جائے تو اس کا کرم۔ میں بھی حسب توفیق عصمت کی مدد کرتا۔ آٹا گوندھتا۔ آٹا ہمیشہ بہت ڈھیلا ڈھیلا رہتا کہ مشکل ہی سے روٹی پک پاتی ...... ایک رات عصمت بھابی کا پاؤں پھسل گیا۔ اور ان کی تخلیق مکمل نہ ہو سکی۔ وہ شاہکار جسے وہ فن کے سانچوں میں ڈھال رہی تھیں خوابوں کی طرح بکھر گیا، ٹوٹ گیا۔

بمبئی میں کوئی دو مہینے رہا، لیکن یہ شہر لکھنؤ کی طرح میرا دوست نہ بن سکا۔ ہمیشہ مجھے اپنے سے بڑا معلوم ہوا، اس سے ملتے ہوئے مجھے جھجک محسوس ہوتی رہی اور پھر میں لکھنؤ واپس آگیا ——— مجھے اپنے ہائی اسکول کا نتیجہ بمبئی میں تار کے ذریعے معلوم ہوا لیکن اس کا اس خاکے سے کیا تعلق ؟

دوسری مرتبہ ۱۹۴۸ء میں میں بمبئی گیا۔ اور اس مرتبہ میں نے عصمت بھابی کا زیادہ قریب سے مطالعہ کیا۔ کیونکہ پہلی مرتبہ بمبئی سے واپس آنے کے بعد میں نے اُن کے افسانوں کو پڑھا، ان کی تخلیقات غور اور توجہ سے دیکھیں ——— ان تحریروں میں کہیں کہیں ان کی جھلک بھی نظر آتی۔ مگر ان کے افسانوں کو آپ بیتی نہیں کہا جا سکتا۔ ان کا مشاہدہ بہت تیز ہے۔ زندگی کے نہ معلوم کتنے چھوٹے چھوٹے واقعات اور نہ معلوم کتنے چھوٹے بڑے کردار ان انہوں نے افسانوں میں ڈھال دیا ——— بہت سی چھوٹی چھوٹی باتیں، بیتے ہوئے واقعات یاد آرہے ہیں، مگر میں ان سے دامن چھڑا کر عصمت بھابی کی کچھ اور عادتوں کا ذکر کر دوں۔ اب رہا ان کے ذہن میں اُترنے کا سوال تو یہ بات میرے بس کی نہیں، وہ اتنی چھوٹی کہاں کہ میری گرفت میں آجائیں۔ ان کا ہر ارادہ، ہر خیال ذہن کی وسیع وادیوں کا مسافر ہے، اور ہونٹوں پر تو ہمیشہ سادہ و پُرکار مسکراہٹ رہتی ہے ——— بہت گہرا کُنواں، ان کے غموں تک کس کی پہنچ !

عصمت بھابی طبیعت کی بہت فیاض ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ بہت اچھی ماں ہیں۔ اپنی بچیوں سے انہیں بے حد محبت ہے۔ شاہد کو کسی زمانے میں ان سے گلہ تھا، معلوم نہیں اب بھی ہے یا نہیں کہ ان میں لڑکا پیدا کرنے کی صلاحیت نہیں ہے۔ شاید یہی وہ شکوہ ہے جو "سونے کم ندی" کی شکل میں اُبھر آیا ——— لڑکا پیدا ہوتا ہے تو یوں روتا ہے کہ "میا نومیا نو" گویا ماں باپ کو یقین دلاتا ہے کہ گھبرا مت میں یہاں بہت کچھ لے کر آؤں گا۔ لڑکی پیدا ہوتے ہی یوں روتی ہے کہ "جُواں جُواں" یعنی دولت وہاں لے جاؤں گی۔ بچیاں تو ایک بوجھ ہیں۔ جہیز، داماد، برات، دولہا، دولہا کے نخرے۔ لیکن یہ ردّ عمل عصمت کی زندگی میں نہیں ہے۔ ان کے عمل میں کوئی تلخی نہیں، اور ان کی محبت محدود نہیں ہے۔ وہ اپنی بچیوں سے ہی محبت نہیں کرتیں۔ اپنے اور شاہد کے رشتہ داروں کا بھی خیال رکھتی ہیں بلکہ ان کی مدد بھی کرتی ہیں۔ دوستوں اور جان پہچان والوں کے لئے عصمت

کیا نہیں کرسکتیں۔ شاہد کے پاس مکان نہ تھا اسے اکبر منزل کا فلیٹ دے دیا۔ بہنوئی کا انتقال ہوا تو بہن اور بھانجوں کو ساتھ رکھ لیا اور سارا بار اٹھایا۔

عصمت کا ہاتھ بہت کھلا ہوا ہے۔ روپے کو واقعی ہاتھ کا میل سمجھتی ہیں۔ دل کے حوصلے کا یہ عالم ہے کہ جب کبھی میں نے ان سے پیسے مانگے انہوں نے کہا جاؤ الماری میں سے لے لو۔ یہ کہہ کر وہ کنجی ڈھونڈنا شروع کر دیتیں۔ الماری کی کنجی ڈھونڈنا ہوتے ہوئے ہیرا لانا ہوتا تھا۔ ڈھونڈتے رہتے کبھی کھانے کی میز پر ملتی۔ کبھی غسل خانے میں۔ کبھی کسی کتاب کے اندر۔ کنجی میرے حوالے کر دیتیں۔ اور مجھے جتنے پیسوں کی ضرورت ہوتی لے لیتا۔ انہوں نے کبھی یہ نہیں پوچھا کہ تم نے کتنے پیسے لئے اور ان کا کیا کیا؟ عصمت پان کھانے کی خاصی شوقین ہیں۔ لیکن ان کا پاندان دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ کبھی پان میں سوکھا کتھا استعمال کیا جاتا ہے۔ کبھی چھالیہ غائب۔ چھالیہ ہیں تو سروتہ نہیں ملتا۔ سروتہ مل گیا تو چھوٹی غائب ہو گئی۔ یہ بے ترتیبی تو عصمت بھابی کا حصہ ہے۔ ترتیب اور بے ترتیبی کا امتزاج کچھ عجیب و غریب سا ہے۔ گھر کی صفائی چیزوں کی دیکھ بھال کے بارے میں بہت ہی موڈی ہیں۔ صفائی پر آئیں تو ایک دن میں دھنئے کی طرح گھر کو دھنک کر رکھ دیں۔ پرانی چیزیں اٹھا کر پھینک دیں۔ —"اب ہم رفت۔ آں ہم رفتہ"— اور پھر دس پندرہ دن میں حالات حسب سابق ہو جاتے۔ — دس پندرہ جوڑی جوتے۔ ایک کمرے سے جوتے پہن کر دوسرے کمرے تک گئیں اور وہیں اتار کر بھول گئیں۔ پھر گئیں دوسرا سینڈل پہن آئیں کھانے کی میز کے پاس چھوڑ دیا۔ تیسرا سینڈل باورچی خانے کے قریب۔ چوتھا غسل خانے میں۔ اور یونہی صبح سے شام تک جوتے ہر طرف پھیل جاتے۔ جنہیں توکر سجا سجا کر رکھتے رکھتے تنگ آ جاتے۔ لباس کی طرف سے بے پروا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کے پاس اچھے لباس نہیں۔ وارڈ روب کھولی جائے تو بہترین ساریاں ہینگر پر ٹنگی ہوئی ملیں گی مگر ان میں سے شاید ہی کسی پر استری ہو۔ عصمت کو چیزیں خریدنے کا بہت شوق ہے۔ لیکن چیزوں کے بارے میں ان کی پسندیدگی استوار نہیں ہوتی۔ جس طرح ایک بچہ نیا کھلونا خرید کر خوش ہوتا ہے دو چار روز اس سے کھیلتا ہے اور پھر گھر کے کسی کونے کھدرے میں ڈال دیتا ہے۔ بالکل یہی حال ان کا ہے۔ آج کاج کل طلاق۔ غالباً ۱۹۴۷ء کی بات ہے۔ شاہد اور عصمت دونوں بے کار تھے۔ اتنے فالتو پیسے بھی نہ تھے کہ ہزار پندرہ سو کی کوئی چیز محض اس لئے خرید لی جائے کہ وہ اچھی ہے اور خریدنے کو دل چاہتا ہے۔ عصمت کو فری جی ڈیئر خریدنے کا شوق چرایا۔ باوجود سب کے منع کرنے کے خرید لیا گیا۔ اب سوال یہ تھا کہ اس میں رکھا کیا جائے، چنانچہ بڑے خلوص سے انہوں نے فری جی ڈیئر کو سجانے کی تیاری شروع کر دی۔ شہد، جیم، مکھن، جیلی، پنیر، ترکاریاں، انڈے، اچار، اور پھر گوشت۔ لیکن جگہ پھر بھی بچی تو ترکاریاں اور پیاز بھر دی۔ چند دنوں تک فری جی ڈیئر کی ہر صبح اٹھ کر صفائی کرتیں، چیزوں کو سجاتیں اور پھر بڑے پیار سے دیکھتیں۔ جیسے کوئی بانجھ آیا ماں کے خوبصورت بچے کو دیکھتی ہے۔ اور پھر چند دن دیکھنے کے بعد اس سے بالکل بے نیاز ہو جاتی ہے۔ عصمت نے بھی بالکل یہی کیا۔ چند دن بعد وہ فری جی ڈیئر سے اس طرح بے نیاز ہو گئیں جیسے اس قسم کی چیز گھر میں کوئی ہے ہی نہیں۔

لڑنے کا انہیں کوئی خاص شوق نہیں۔ لیکن لڑنے پر آئیں یا بحث پر تل جائیں تو بہت سارے حربے استعمال کر ڈالتی ہیں۔ بات کا جواب اس طرح دیتی ہیں کہ آدمی سوچتا رہ جاتا ہے کہ وہ کہے تو کیا کہے۔ ایک مرتبہ شاہد اور عصمت کی خوب بحث ہوئی۔ دونوں ہی کہتے تھے کہ اب یہ بیل منڈھے نہیں چڑھے گی۔ ...... میں نے اس پر عصمت بھابی سے کہا کہ چھوڑیئے، درگذر کیجئے، بات کیوں بڑھاتی ہیں۔ کہنے لگیں "اگر ایک مرتبہ غلطی سے جلتے ہوئے کوئلے پر ہاتھ پڑ جائے تو کیا تمہارے کہنے کے مطابق ہاتھ نہ ہٹایا جائے؟" (جلتے ہوئے کوئلے سے مراد شاہد تھے) اس بات کا میرے پاس کیا جواب تھا سوائے خاموشی کے ...... انتظار کرتا رہا کہ وہ جلتے ہوئے کوئلے سے ہاتھ ہٹائیں مگر انہوں نے جب دو تین دن نہیں بلکہ پورے دو مہینے تک اپنا ہاتھ نہیں ہٹایا تو میں نے یہی سمجھا اور ٹھیک ہی سمجھا کہ عصمت کا عمل کچھ عجیب سا ہوتا ہے۔ ایسا عجیب جس کے متعلق پہلے سے کچھ نہیں کہا جا سکتا ——

جن دنوں وہ اکبر منزل شیواجی پارک میں رہتی تھیں شاہد لطیف "نوبگ پکچرز" پونہ میں نوکر تھے۔ غالباً "سمراٹ چندر گپت" کے مکالمے لکھ رہے تھے۔ عصمت سے ان کے تعلقات اس زمانے میں کچھ کشیدہ تھے۔ کشیدگی کا ردّ عمل تو کچھ اور ہی ہونا چاہئے تھا۔ لیکن ان کی عملی ہمدردی شاہد کے ساتھ تھی۔ ان کی زبان شاہد سے لڑتی تھی اور ان کا قلم شاہد کے لئے کام کرتا تھا۔ اسی زمانے میں انہوں نے اپنے بھائی عظیم بیگ چغتائی کی تین کہانیوں

[illegible]

[illegible] ——————

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

یہ میری راجندر سنگھ بیدی سے پہلی ملاقات تھی۔

اُسی سال کرسمس کے دنوں میں مجھے ایک دفعہ جنرل پوسٹ آفس میں جانے کا اتفاق ہوا۔ میں نے دیکھا کہ ایک کھڑکی کے پیچھے راجندر سنگھ بیدی بیٹھا ہوا بجلی کی سی تیزی سے خطوط اور لفافوں پر مُہریں لگا رہا ہے۔ ایک لفافہ۔ دوسرا لفافہ۔ تیسرا لفافہ۔ ... چوتھا لفافہ ..... لفافوں کا سلسلہ ہے۔ کہ ختم ہونے میں نہیں آتا۔ کبھی کبھار وہ دائیں طرف لگی ہوئی گھڑی پر اُچٹتی نظر ڈال لیتا ہے۔ اور پھر اُسی برق رفتاری سے مُہریں لگانے لگتا ہے۔ یہ منظر دیکھ کر میرا دل بیٹھ گیا۔ ایک آدھ بار سوچا۔ کہ اُس کے قریب جاؤں۔ لیکن ہمت نہ ہوئی۔ ..... راجندر سنگھ بیدی ایک کافی لمبے عرصے تک ڈاک خانے میں مُہریں لگاتا رہا۔ اور ساتھ ساتھ اردو افسانہ پر اپنی عظمت کی مُہریں ثبت کرتا رہا۔ اور اُس کے علاوہ اُس کے بیشتر احباب کفِ افسوس ملتے رہے۔ کہ قدرت نے اُس کے ساتھ کتنا خوفناک مذاق کیا ہے۔

سنہ ۱۹۴۰ء میں جون کی ایک شام کو مہندر ناتھ میرے گھر آیا۔ اور بڑے اُداس لہجے میں کہنے لگا۔ جب سے بیدی کا تبادلہ لاہور چھاؤنی ہوا ہے۔ اُس سے ملاقات نہیں ہوئی۔ چلو آج بیدی کے پاس چلتے ہیں۔" مہندر ناتھ کی بیدی سے اس ناگہانی عقیدت کا راز میری سمجھ میں نہ آیا۔ کیونکہ اکثر میں اور مہندر۔ کرشن چندر کو چڑانے کے لئے بیدی کی بُرائی کیا کرتے تھے۔ کرشن چندر پلنگ پر لیٹے ہوئے ہوتے۔ مہندر اور میں فرش پر۔ ہم دونوں میں سے کوئی بیدی کو زیرِ بحث لے آتا۔

مہندر۔ یار یہ بیدی بالکل فراڈ (FRAUD) ہے۔ پنجاب کا سب سے بڑا فراڈ۔ خدا جانے لوگ اِسے افسانہ نویس کیوں سمجھتے ہیں۔

میں۔ لوگ تو بالکل جاہل ہیں۔ مہندر۔ اور پھر اتنے جاہل بھی نہیں۔ دراصل وہ بیدی کو بناتے ہیں۔ کہ اے بھئی تُو بھی افسانہ نویس ہے۔

کرشن چندر۔ شیطان! کیا بک رہا ہے۔ بیدی کی عظمت میں شک کرنا کفر ہے۔

میں۔ اور بیدی پر ایمان لانا ذہنی دیوالیہ پن ہے۔

مہندر۔ کتنا اُلجھا ہُوا اسلوب بیان ہے بیدی کا۔

میں۔ بالکل۔ جیسے جیسے۔

مہندر۔ ہاں ہاں جیسے۔

میں۔ جیسے گیسوں (بالوں) میں کنگھی کرتے وقت کنگھی اُلجھ کر رہ جائے۔

کرشن چندر۔ بکو اس مت کرو۔ جس چیز کا علم نہ ہو۔ اُس کے متعلق فتوے مت دیا کرو۔

مہندر۔ کرشن جی۔ آپ تو خواہ مخواہ بیدی کی طرفداری کر رہے ہیں۔ میں کہتا ہوں۔ جیسے افسانے بیدی لکھتا ہے۔ اُس سے بہتر میں افسانے لکھ سکتا ہوں۔

کرشن چندر۔ لکھ سکتے ہو۔ تو لکھتے کیوں نہیں۔ بیدی نے تمہیں منع کیا ہے کیا؟

مہندر ناتھ نے اُس وقت تک لکھنا شروع نہیں کیا تھا۔ اور یہ حقیقت ہے۔ کہ بیدی سے بہتر افسانے لکھنے کے رقیبانہ جذبہ نے مہندر ناتھ کو افسانہ نویس بنا دیا۔ اور جب مہندر نے شروع شروع میں افسانے لکھے۔ تو اُسے بیدی پر ایمان لانا ہی پڑا۔

چنانچہ میں اور مہندر نے فیصلہ کیا۔ کہ آج بیدی کے ہاں ایک دلچسپ شام گزاری جائے۔ چھ بجے کے قریب ہم لاہور چھاؤنی میں بیدی کے مکان پر پہنچے۔ پتہ چلا کہ بیدی صاحب ابھی ڈاک خانے سے واپس نہیں آئے۔ ڈاک خانے گئے۔ بیدی نے نہایت لجاجت سے کہا۔ آج کام کچھ زیادہ ہے۔ ساڑھے چھ بجے سے پہلے فارغ نہ ہو سکوں گا۔ ہم دونوں اُس کے گھر پر انتظار کرتے رہے۔ پونے سات بجے بیدی ڈاک خانے سے لوٹا۔ ہم اُسے لعن طعن کرنے لگے۔ ڈاک خانے کی ملازمت میں کیا رکھا ہے۔ اِسے ترک کیوں نہیں کرتے۔ کب تک

(ADVENTURES)

تقسیم ہند کے بعد بیدی لاپتہ ہوگیا۔ اور پھر یکلخت ریڈیو کشمیر کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے نمودار ہؤا۔ چند ماہ کے بعد۔ اُس نے ریڈیو کی ملازمت ترک کر دی اور بمبئی چلا گیا۔ جہاں وہ اُس وقت سے اب تک ایک کامیاب افسانہ نویس اور مکالمہ نویس کے فرائض انجام دے رہا ہے۔

میں بیدی کی شخصیت کے متعلق کچھ لکھنا چاہتا تھا۔ لیکن میں نے بیدی کی زندگی کے اہم واقعات قلمبند کر دیئے۔ در اصل بیدی کی زندگی کا اُس کی شخصیت سے بہت گہرا تعلق ہے۔ ایک لحاظ سے دیکھا جائے۔ تو بیدی کی دو زندگیاں اور دو شخصیتیں ہیں۔ ایک وہ جس کا تعلق اُس بیدی سے ہے جو ڈاک خانے میں ملازم ہؤا کرتا تھا۔ اور دوسری وہ جو اُس وقت معرضِ وجود میں آئی جب بیدی نے "چرا کا رسے کن عاقل" کے مقولے پر عمل کرتے ہوئے ڈاک خانے کی ملازمت ترک کر دی۔

اِس دوسری شخصیت کی نشو و نما زیادہ تر دہلی میں ہوئی۔ چنانچہ جنگ کے ختم ہونے کے بعد جب بیدی دہلی سے لاہور آیا۔ تو ماضی اور حال کے بیدی میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ اب وہ بڑے بڑوں کے کان کاٹتا تھا۔ دلچسپ چوٹیں کرتا تھا چست فقرے کستا تھا۔ اور اُس کے دوست اُس کی باتیں سُن کر دل ہی دل میں حیران ہوتے تھے۔ کہ

بات تک کرنی نہ آتی تھی انہیں
یہ ہمارے سامنے کی بات ہے

جھجک بی اب مرکھپ گئے ہیں تبدیل ہو چکی تھی۔ احساس کمتری کی جگہ خود اعتمادی نے لے لی تھی۔ اب بیدی سے بات کرتے ڈر لگتا تھا کہ اگر ذرا کہیں لغزش ہوئی۔ تو بیدی کبھی معاف نہیں کرے گا۔ اپنی گفتگو میں وہ موپاساں۔ چیخوف۔ مانجل شولوکوف۔ ایلیا اہرن برگ کا ذکر اِس انداز میں کرتا تھا۔ جیسے یہ سب اُس کے بڑے اچھے ذاتی احباب ہوں!۔

اُن دنوں اُس کا محبوب شغل اُن سب دوستوں سے انتقام لینا تھا۔ جو اُسے کبھی تر اتنا بنایا کرتے تھے۔

کسی نے کنہیا لال کپور کا ذکر کیا۔ بیدی نے جھٹ پھبتی کسی "کپور کے متعلق ہی کسی نے کہا ہے۔ کپور رے کپور تیری کون سی کل سیدھی"

کسی نے ایک مشہور ادیب کی بات چھیڑی۔ بیدی نے برجستہ کہا "ہاں اُس بیچارے نے ہاتھ پاؤں تو بہت مارے۔ لیکن ابھی تک بات بنی نہیں"

کسی اور نے کہا "فلاں شخص نے بڑا اچھا افسانہ لکھا ہے"۔ بیدی نے تبصرہ کیا "اُس کا افسانہ واقعی اچھا کہلاتا۔ اگر اُس سے پیشتر وہی افسانہ موپاساں نے نہ لکھا ہوتا"

بیدی کی غیر معمولی ذہانت کے جوہر اُسی زمانے میں کھلے۔ انہی دنوں کی بات ہے۔ کہ ایک بار اُس نے مجھ پر چوٹ کرتے ہوئے پوچھا "کپور صاحب کارٹون اور کیری کیچر (CARICATURE) میں کیا فرق ہے۔ مثال دے کر واضح کیجئے"۔

میں نے مذاقاً کہا "بیدی صاحب۔ میں قدرت کا سب سے بڑا کارٹون ہوں۔ اور آپ آج سے چند سال پہلے قدرت کے سب سے بڑے کیری کیچر تھے"۔

ہنس کر کہنے لگا "پہلی بات تو بالکل صحیح ہے۔ لیکن دوسری محل نظر ہے"۔

ایک بار اُس نے میرے ہاتھ میں "فرہنگ عامرہ" کا نسخہ دیکھ کر کہا "اگر آپ سمجھتے ہیں۔ کہ اس کے مطالعہ کے بعد آپ صحیح اُردو لکھنے لگیں گے۔ تو ایں خیال است و محال است و جنوں۔ کیونکہ آپ کی اُردو صحیح اُردو تو کجا صحیح پنجابی بھی نہیں ہوتی"!

سب سے دلچسپ چوٹ اُس نے ایک دفعہ ایک پرائیویٹ محفل میں کی۔ کسی نے پطرس کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔ "کاش وہ "پطرس کے مضامین" کے بعد لکھنا ترک نہ کر دیتے"۔ بیدی نے نہایت معصوم بن کر کہا "میں پطرس کی دیانتداری کا معترف

ہوں ۔ اُس نے محسوس کیا کہ وہ پطرس کے مضامین ' ایسی یا اُس سے بہتر کتاب نہیں لکھ سکے گا ۔ چنانچہ اُس نے لکھنا ترک کر دیا ۔ کنہیالال کپور کی طرح نہیں کہ ذیبٹ بن کر لکھے چلا جاتا ہے ۔ حالانکہ تمام سمجھدار لوگ اس سے عاجز آچکے ہیں "

فطرتاً بیدی بڑا حساس واقع ہوا ہے ۔ اُسے ہر ستم زدہ سے آن واحد میں ہمدردی یا محبت ہو جاتی ہے ۔ وہ شخص دیویندر ستیارتھی ہو ۔ (زمانہ ماضی کا دیویندر ستیارتھی) راما نند ساگر ہو (سن پچاس کا راما نند ساگر) بلونت سنگھ ہو ۔ یا بلونت کارگی (پنجابی ڈراماٹسٹ) ہو ۔ بیدی اُس کے آنسو پونچھنے کے لئے اس ناخدا سے تیار ہو جاتا ہے ۔ جیسے وہ اس فرض کو انجام دینے کے لئے مدت سے چشم براہ تھا ۔ وہ اپنا بیش قیمت وقت اُن کی دلجوئی اور خاطرداری میں صرف کرکے ایک عجیب روحانی مسرت محسوس کرتا ہے "گرنے ہوؤں کو تھام لینا" اُس کے کردار کی سب سے بڑی خوبی ہے ۔ مہمان نوازی میں اس کا مقابلہ کوئی عربی یا عجمی کر سکتا ہے ۔ معمولی سے معمولی واقف کار اُس سے ملنے آئے ۔ تو یہ کیفیت ہوتی ہے ۔ جیسے بیدی محسوس کر رہا ہو کہ ع

بن گیا اُس مرا خیام کا گھر آج کی رات

لطیفہ گوئی اور بذلہ سنجی سے بیدی کو والہانہ اُنس ہے ۔ خاص کر جب وہ اپندر ناتھ اشک سے ملتا ہے ۔ تو سب سے پہلی فرمائش یہ کرتا ہے "کوئی نیا چٹکلہ سناؤ" ۔ اشک کی عادت ہے کہ چٹکلہ سنانے کے فوراً بعد ایک فلک شگاف قہقہہ بلند کرے گا ۔ اور بیدی چٹکلے پر ہنسنے کی بجائے اشک پر ہنسنا شروع کر دیگا ۔

بیدی کی شروع سے خواہش رہی ہے کہ اُس کا نام ایک ہی سانس میں کرشن چندر کے ساتھ لیا جائے ۔ شروع شروع میں جب نقادوں نے کرشن چندر کے نام کو بہت اُچھالا ۔ اور بیدی کی طرف نسبتاً بہت کم توجہ دی ۔ تو اُسے نقادوں کی ذہانت پر شک ہونے لگا ۔ لیکن کچھ عرصہ بعد جب ہر کہ و مہ نے بیدی کا لوہا مان لیا ۔ تو اُسے اطمینان ہوا ۔ کرشن چندر غالباً بیدی کے سب سے پہلے اور سب سے بڑے مداح ہیں ۔ مجھے یاد ہے کہ "نئے زاویئے" کی جلد ۲ میں انہوں نے بیدی کا افسانہ "گرہن" سر فہرست رکھا تھا ۔ اُس وقت بعض لوگوں نے جو بیدی سے جلتے تھے ۔ اعتراض کیا ۔ کہ بیدی کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دی گئی ہے ۔ کرشن چندر نے ان لوگوں سے کہا تھا "میں سمجھتا ہوں کہ اگر نئے زاویئے میں اس افسانے کے سوا اور کچھ بھی نہ ہوتا ۔ تب بھی یہ ایک نمائندہ اور جاندار مجموعہ ہوتا "

بیدی اُس وقت ترقی پسند تھا ۔ جب لوگ ترقی پسندی کا مفہوم بھی اچھی طرح نہیں سمجھ سکے تھے ۔ وہ خود نچلے طبقہ میں پیدا ہوا اور اُسے اس طبقہ سے محض ہمدردی نہیں ۔ بلکہ عشق ہے ۔ اُس نے ہمیشہ اس طبقہ کی نمائندگی کی ہے ۔ اور اس کامیابی سے کی ہے کہ آنے والے دور میں اگر بیدی کو ہندوستان کا گورکی سمجھ لیا جائے ۔ تو بہت کم لوگوں کو تعجب ہوگا ۔

چھٹ پنے میں بیدی نے حالی کا مشہور شعر سنا تھا ۔ —

فرشتے سے بہتر ہے انسان ہونا
مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ

اُسی وقت سے اُس نے یہ فیصلہ کیا تھا ۔ کہ وہ ہر قیمت پر انسان ہونے کی کوشش کریگا ۔ آج جب کہ وہ زندگی کی چالیس بہاریں دیکھ چکا ہے ، وہ فخر سے کہہ سکتا ہے "انسان بننے کے لئے جو محنت کرنی پڑتی ہے ، اُس سے میں نے کبھی گریز نہیں کیا ۔ چاہے میں مکمل انسان ہوں یا نہیں اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں ۔ کہ جتنی انسانیت مجھ میں ہے ۔ اُس سے زیادہ بہت کم ادباء میں ہوگی "

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

تھے ساری خاک ہو گئیں ——— ابھی سوچنے اور کڑھنے کا سلسلہ جاری تھا کہ ندیم کا رجسٹرڈ خط آ دھمکا۔ نہ صرف بڑی محبت سے ہمیں مشورہ دیا تھا بلکہ ہمارے خط بھی واپس کر دیئے تھے۔ ہم نے مارے حیرت کے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اپنے خطوں کو دیکھا کہ کیا واقعی یہ وہی خط ہیں۔ کیا واقعی کوئی دوسرا شخص ان خطوں کو بغیر مانگے واپس کر سکتا تھا۔ کیا واقعی ہماری اس عظیم بے وقوفی سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتا تھا ———

مگر اب جبکہ میں سات سال سے ندیم کے بالکل قریب ہوں تو مجھے خطوں کی واپسی کا قصہ بالکل مضحکہ خیز لگتا ہے۔ یہ بات تو بڑی معمولی تھی۔ ندیم تو نہ جانے لوگوں سے اپنے کتنے واقعات پر پردہ ڈالے اس طرح پھرتے ہیں جیسے کوئی بات ہی نہیں۔

ندیم ۲۰ نومبر ۱۹۱۶ء میں پیدا ہوئے۔ بچپن میں والد کا انتقال ہو گیا اور زندگی بڑی بے دردی سے گذرنے لگی۔ وجہ یہ تھی کہ ندیم کے والد مرحوم خدا کی محبت میں اس قدر سرشار تھے کہ دنیاوی نعمتوں کی کبھی پروا نہ کی۔ چند بیگھے زمین سے پیدا ہونے والی گندم اور ماں کی محبت لے دے کے یہی دو سہارے تھے جن پر ندیم کی زندگی کا انحصار تھا۔ وہ گئی تعلیم وغیرہ تو اس کا کوسوں پتہ نہ تھا۔ مشفق ماں اپنی تینوں یتیم اولادوں کے لئے ہر دم فکر مند سے لرزا کرتیں۔ مگر جب تعلیم کا زمانہ آیا تو ندیم کے ایک چچا نے جو گورنمنٹ کے ایک اچھے خاصے عہدے پر فائز تھے، ندیم اور ان کے بڑے بھائی محمد بخش کو اپنے پاس بلا لیا۔ مگر یہ عجیب بات ہے کہ افلاس میں پلا ہوا بچہ کو ٹھی، کار اور چچا چچی کی بے انتہا محبت کے باوجود خود کو عیش میں نہ ڈبو سکا بلکہ وہ ہر وقت لکھنے پڑھنے اور شاندار مستقبل کو خوش آمدید کہنے کی تیاریاں کرتا رہا۔ ندیم نے جب بی۔ اے میں کامیابی حاصل کی تو اس وقت تک چچا کا سایہ بھی سر سے اٹھ گیا تھا۔ اور اس کے بعد انتہائی جدوجہد کے باوجود وہ آگے تعلیم جاری نہ رکھ سکے ——— یہی بات تو یہ ہے کہ آج ندیم جو کچھ ہیں اس میں ان کے چچا کی تعلیم و تربیت کا بڑا ہاتھ ہے۔ یہ یقینی بات تھی کہ جب اس یتیم بچے کو کوئی بھی سہارا نہ ملتا تو پھر وہ جانے کیا سے کیا بن جاتا۔ چچا کے اس عظیم سہارے کے باوجود وہ کون سا ایسا دکھ تھا جو انہوں نے نہ سہا ہو۔ وہ کون سی ایذا تھی جو پرایوں نے نہ بخشی ہو۔ میرا یقین ہے کہ ندیم کو ان ہی چیزوں نے صحیح معنوں میں ندیم بنا دیا۔ چوبیس پچیس سال کی عمر تک انتہائی بے دردیاں جھیلنے کے باوجود وہ بد خو انسان نہ بن سکے۔ بڑے انسانوں کے ساتھ ساتھ انہیں چھوٹے انسانوں سے بھی سابقہ پڑتا رہا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ انسان کی عظمت کے بے حد قائل ہیں۔ انہیں رسائیوں کی کوئی نہ کوئی وجہ تلاش کر کے وہ سب کو معاف کر دینے کے عادی ہیں۔ ان میں ایک لمحے کو بھی منتقمانہ جذبات پیدا نہ ہوئے۔ اس کے ساتھ ہی وہ یہ بھی پسند نہیں کرتے کہ ایسے لوگوں سے جنہوں نے اپنی باتوں یا حرکتوں سے نہیں دکھ پہنچائے ہیں، خود دل بیٹھیں۔ لیکن اگر ایسے لوگوں کو ندیم سے کوئی کام پڑ جائے تو وہ ان کے کام کو اپنے تمام ضروری کاموں پر ترجیح دیں گے اور ان سے ملیں گے بھی اس طرح جیسے وہ سب کچھ بھول چکے ہیں ——— سچ کیوں نہ کہا جائے کہ میں نے اکثر ندیم کے دل میں منتقمانہ جذبات پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ وجہ یہ تھی کہ بعض مشفقوں نے نہ جانے کن جذبات کی بنا پر ندیم کے ساتھ ہم دونوں بہنوں کو بھی بدظن کرنا چاہا۔ غصے اور افسوس کی وجہ سے ہم آپے سے باہر ہو گئے مگر ندیم جو اپنی اکلوتی بہن سعیدہ کی طرح نہیں چاہتے ہیں، ذرا بھی آپے سے باہر نہ ہوئے۔ غصہ بھی کیا، رنجیدہ بھی ہوئے مگر ایسی باتوں کا جواب دینے کو تیار نہیں ہوئے بلکہ الٹا کہا "پھر ہم میں اور ان میں فرق ہی کیا رہ جائے گا، یعنی میں بھی ایسی حرکتیں کروں؟" ——— اور مجھے واقعی ان پر غصہ آ جاتا ہے۔ کتنی بار سنجیدگی سے سوچا کہ یہ شخص بنتا ہے، خواہ مخواہ خود کو عظمتوں کا پوٹ ثابت کرتا ہے۔ یہ سب جھوٹ ہے۔ مگر پھر اپنے خیال پر خود ہی شرمندہ ہونا پڑتا ——— بھلا کوئی شخص خود کو ساری زندگی کیسے چھپائے رکھ سکتا ہے۔ یہ کام تو اتنا ہی مشکل ہے جتنا کہ کچھ کو چھوڑ کر باقی تمام بچوں کے لئے صحیح صحیح فاف بول دینا۔ دراں صحیح نہ بولنے والوں میں میرے شوہر ظہیر بابر صاحب بھی شامل ہیں۔

اب اس سے آپ یہ نہ سمجھ لیں کہ بیچارے ندیم کس قدر بغیر دل گردے کے آدمی ہیں۔ نہ کسی موقعہ پر غصہ آئے اور نہ منتقمانہ جذبات پیدا ہوں۔ سو عرض ہے کہ منتقمانہ جذبات پیدا ہوتے ہیں اور بڑی شدت سے مگر صرف بڑی بڑی طاقتوں کے خلاف، اور ان جذبات

کی تسکین کو اپنا پہلا اور سب سے بہترین فرض سمجھتے ہیں ۔ انفرادی چھوٹی چھوٹی نیچی حرکتوں پر تو وہ افسوس کے ساتھ خاموشی کو بہتر سمجھتے ہیں ۔

ندیم نے عمر کا خاصا حصہ تنگ حالی اور پریشانیوں میں گذارا مگر کبھی تنگدل نہ ہوئے ۔ جو بھی پاس ہوا وہ اندھا دھند اپنے اوپر یا جو بھی ضرورتمند
ہو اس پر خرچ کر دیا اور پھر جب یہ خیال آیا کہ صبح جائے بھی ملے گی یا نہیں تو اس طرح پوری قوت سے ہنسیں گے جیسے کوئی بڑے مزے کا لطیفہ
ہاتھ آگیا ہو ۔ میرا خیال ہے کہ ان کی تنگدستی کی اصل وجہ یہی حد سے بڑھی ہوئی فراخدلی ہے ۔ ورنہ تعلیم کے بعد ایسا تو کبھی بھی نہ ہوا کہ ندیم نے
گذارا کرنے کے لائق روپیہ نہ پیدا کر لیا ہو ۔ اور آج بھی جبکہ وہ چھ سات سو روپے کما لیتے ہیں تب بھی تنگ حال ہیں ۔ اس فراخدلی کے سلسلے
میں انہیں کوئی نہیں سمجھا سکتا ۔ اگر کوئی سمجھائے تو سخت بددل اور رنجیدہ ہو جاتے ہیں ۔ زیادہ قریبی لوگوں سے بڑے پیار کے ساتھ لڑ بھی لیتے
ہیں ۔

بچپن میں ندیم بے حد شریر تھے ۔ بڑی سے بڑی شرارت کرنے سے نہ چوکتے ۔ ایک بار ندیم کے بڑے بھائی محمد بخش اور چچازاد بھائی حیات مرحوم
کہیں سے ایک کتاب مار لائے جس کا نام تھا "کالا جادو" ۔ کتاب سخت جادوئی اور دلچسپ تھی ۔ دونوں نے اس خیال سے کتاب کو چھپا چھپا کر پڑھا
کہ کہیں بیچ ہی سے ندیم نہ اچک لے ۔ ندیم بچپن ہی سے کتابوں کے مطالعے سے بڑا شغف رکھتے تھے ، اس لئے پہلے تو شرافت سے کتاب مانگی
اور پھر جب ملنے کی کوئی امید نہ رہی تو حضرت چھت پر چڑھ گئے ۔ حیات اور محمد بخش بھائی یہ سمجھ کر کہ بلا ٹلی بڑے آرام سے صحن میں بیٹھ کر
اس پُراسرار کتاب کی باتیں کرنے لگے کہ اچانک آسمان سے بالکل جادوئی قسم کی بارش ہونے لگی ۔ ذرا دیر بعد معلوم ہوا کہ ندیم انہیں سزا
دینے کے لئے اوپر سے شاشی ان کا مصدر گرداں رہے ہیں ۔ ظاہر ہے کہ دونوں بھائی ان چھوٹے موٹے بھاری سے کچھ بڑے تھے اس لئے
اچھی طرح پٹائی کی ۔ بڑے بھائی ان کی شرارتوں سے اس قدر تنگ رہتے کہ نہ تو ان حضرت سے دوستی کرتے نہ اپنی کھانے پینے کی چیز دیتے
اور مارنے الگ ۔ ندیم شریر تو تھے مگر مار پیٹ میں تیز نہ تھے ۔ بس یوں ہی دھمکیاں دے کر رہ جاتے ۔ بھائی محمد بخش بیری پر چڑھ کر مزے
مزے سے بیر کھاتے اور یہ نیچے کھڑے پہلے تو بیر مانگتے اور پھر گٹھلیاں مارنے کی سوچتے ۔ روز بیروں کے لئے ترستے مگر درختوں پر چڑھنے
کے خیال سے جان سر کتی ۔ شرارتوں کا یہ سلسلہ آج تک قائم ہے ۔ والدہ اور سب بہنیں اب تک انہیں مارنے کو بھاگتی ہیں اور وہ اپنے کمرے میں
بند ہو کر پناہ لیتے ہیں ۔ ویسے جہاں وہ بے تکلف نہ ہوں بے حد سنجیدہ رہتے ہیں ۔ بے تکلف محفلوں میں خوب چہکتے ہیں ۔ پچاسوں لطیفے یاد
ہیں ۔ اگر وقت بے وقت لطیفوں کا اسٹاک ختم ہونے لگے تو فی البدیہہ لطیفہ گھڑ لینے کا بھی ملکہ حاصل ہے ۔
گھریلو زندگی میں وہ بے حد چھوٹے اور شریر بچے نظر آتے ہیں ۔ والدہ سے لے کر دو سال کے معصوم بچوں کو بھی چھیڑ دیتے ہیں ۔ میری سات سالہ
بھانجی صبوحی کی گڑیا کو دیکھتے ہی کوسنے لگتے ہیں ، " اللہ کرے مر جائے صبوحی کی گڑیا " اور صبوحی منہ پھاڑ پھاڑ کر رونے لگتی ہے ۔ ہنسنے
میں ندیم بے تحاشہ فراخدل ہیں ۔ اس کے باوجود میں نے آج تک انہیں بلند قہقہے لگاتے نہیں سنا ۔ وہ کچھ عجیب سے ہنستے ہیں ۔ ان
کی ہنسی واقعی بہت خوبصورت ہے ۔ ہنستے ہوئے ان کے چھوٹے مگر ذرا چوڑے چوڑے دانت صاف نظر آتے ہیں ، ہر دانت کے بیچ میں کھڑکی
ہے جس سے ان کی ہنسی معصوم بھی لگتی ہے ۔
ندیم لوگوں کی مضحکہ خیز حرکتوں اور باتوں کا مذاق اڑانے میں واقعی بڑے حضرت ہیں ۔ مجال ہے کہ کوئی مضحکہ خیز بات یا حرکت ان کی نظر
سے بچ جائے ۔ ظاہر ہے کہ سامنے تو شرافت سے بیٹھے دیکھتے اور سنتے رہیں گے مگر ہٹے نہیں کہ قیامت آئی ۔ ندیم میں ایک اور کچھ دلچسپ اور کچھ
عجیب سی بات ہے ۔ اور وہ یہ کہ اگر انہیں کوئی عجیب صورت یا جثہ کا انسان نظر آ جائے تو اس پر انہیں بہت ہنسی آتی ہے ۔ یہ سین بھی بڑا
دلچسپ ہوتا ہے جب ندیم اس شخص کا حلیہ بتاتے ہیں تو ہاتھوں اور باتوں دونوں کو استعمال کرتے ہیں اور آوازوں سے بھی حلیہ بتانے کی
کوشش فرماتے ہیں ۔ میں نے اکثر ان کو اس حرکت پر ٹوکا ہے ۔

" لالہ تمہاری یہ کیا عادت ہے کہ انسان کے جسم و جثے کا مذاق اُڑاتے ہو؟"

" بس یار ایسے لوگوں کو دیکھ کر مجھے گدگدی ہونے لگتی ہے۔ اس میں میری کوئی بُری نیت نہیں ہوتی" اور بغیر کسی شرمندگی کے میرے چار فٹ گیارہ انچ جسم کا مذاق اڑا کر مجھے بھاگنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں شاید ندیم پکڑے بھی جاتے مگر صاف بچ گئے۔ ہوا یوں کہ میں ظہیر بابر صاحب اور ندیم بھائی محمد بخش کو خوش آمدید کہنے اسٹیشن پہنچے۔ بھائی چونکہ انگلینڈ سے واپس آ رہے تھے اور وہ بھی مدتوں کے بعد اس لئے ہم سب سخت بے چین تھے کہ بس کسی طرح ٹرین آ بھی چکے مگر ٹرین آدھ گھنٹہ لیٹ تھی۔ ظاہر ہے کہ پھر ادھر اُدھر متوجہ ہو کر وقت گزارنا تھا۔ اور میں وقت گزار رہی تھی کہ مجھے ایک بے حد تو ند یل لمبی ٹھوڑی اور چھجے جیسی پیشانی والے صاحب نظر آئے۔ مجھے جانے کیا ہوا کہ ندیم کو دکھا دیا۔ بس جناب نے ہنس ہنس کر ان کے حلیے کی نقل کرنا شروع کر دی اور ابھی یہ سلسلہ جاری تھا کہ وہی صاحب اچانک ہمارے سروں پر نازل ہو گئے۔ ندیم نے جلدی سے خود کو سنبھالا۔ ارکے حیرت سے ان کی طرف یوں دیکھا جیسے کہہ رہے ہوں " یار مجھے مار نامت" مگر وہ صاحب بڑی عقیدت سے ہاتھ ملاتے ہوئے یہ بتا کر چلے گئے کہ " میں آپ کا ایک عقیدت مند ہوں آپ کو دیکھ کر بے حد مسرت ہوئی"۔ کاش ان صاحب نے دیکھ لیا ہوتا کہ جس سے عقیدت ہے وہ کیا کر رہا تھا۔ ویسے وہ کسی لنگڑے کانے یا لولے کا مذاق نہیں کریں گے۔ بلکہ جو مذاق کرے گا اسے ڈانٹ دیں گے۔

ندیم کے آپ نے بہت سے فوٹو دیکھے ہوں گے۔ آپ کو وہ گئے بھی خاصے خوبصورت ہوں گے۔ مگر میں آپ کو سچ بتا دوں کہ ندیم اتنے خوبصورت نہیں۔ ان کے خوبصورت گھنگھریالے بالوں اور ہونٹوں کی وجہ سے کیمرہ ان پہ مہربان رہتا ہے۔ گندمی رنگ، موٹی ناک، نہ دُبلے نہ موٹے، پانچ فٹ آٹھ انچ کے انسان ہیں۔ ایک رخسار سے ذرا نیچے چاقو کے زخم کا گہرا نشان ہے۔ (یہ نشان بڑے بھائی سے ایک گنڈیری چھیننے کا خمیازہ ہے) مگر عجیب بات ہے کہ یہ زخم کا نشان ان کے چہرے پر بُرا نہیں لگتا۔ بس ہم تو یہ جانتے ہیں کہ بعض لوگوں کے ہنستے ہوئے گالوں میں ننھے منے گڑھے پڑتے ہیں۔ ندیم کے رخسار پر ایک طویل و عریض گڑھا ہر دم پڑا رہتا ہے (یہ بھلا کن خوش نصیبوں کو نصیب ہو سکتا ہے) اس لئے میرا خیال ہے کہ انکے دیکھنے والوں کو کبھی پلاسٹک سرجری کا خیال نہ آتا ہو گا۔ ندیم کی آنکھیں بڑی عجیب سی ہیں۔ بادامی رنگ کی آنکھیں جن میں ذہانت کے ساتھ ایسی بھرپور معصومیت ہے جو میں نے بہت کم لوگوں کی آنکھوں میں دیکھی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر ان کی ایسی آنکھیں نہ ہوتیں تو وہ یہ سے ندیم نہ ہوتے۔ وہ تو کوئی اور ہی ندیم ہوتا یہ تو وہ ندیم ہے جس سے اس کے صرف جاننے والے تک محبت کرتے ہیں، جس سے کبھی کوئی بھولے بھٹکے دشمنی باندھتے باندھتے دوستی کا ہاتھ بڑھا دیتا ہے، اور اختر شیرانی مرحوم، شراب کے رسیا، پیئے ہوئے کسی کا احترام نہ کرنے والے، ندیم کے اُستاد، ندیم کی موجودگی میں ندیم سے چھُپ کر پیتے۔ میرا خیال ہے کہ یہ ندیم کی آنکھوں کا کرشمہ تھا۔ اور یہ بھی ان کی آنکھوں ہی کا قصور ہے کہ جتنی بھی لڑکیاں عقیدت کی وجہ سے ملتی ہیں وہ پہلی ہی ملاقات میں لالہ اور بھائی کے خطاب سے نوازی جاتی ہیں۔

نظموں والی صبوحی کے علاوہ میں نے ندیم کا کوئی اسکینڈل نہیں سُنا اور نہ کوئی چونکا دینے والی بات دیکھی۔ میں نے ہزاروں بار انہیں کریدا کہ یہ صبوحی کون تھی، کیا تھی، کیا واقعی تم اس سے محبت کرتے تھے؟ مگر ندیم آج تک کچھ نہ پھوٹے۔ نہ تو وہ ہاں کرتے ہیں اور نہ نہیں۔ ہمیشہ ایک ہی بات فرماتے ہیں " بکواس نہ کرو ورنہ پیٹوں گا"۔ ندیم مجھ سے اور ہاجرہ سے بے حد محبت کرنے کے باوجود آج تک اس سلسلے میں کچھ نہ بتا سکے مگر مجھے یقین ہے کہ یہ قصہ ضرور سچ ہو گا کیونکہ جب ندیم کو چھیڑو تو وہ حضرت کنی کاٹنے لگتے ہیں۔ زیادہ ستاؤ تو ایسی نظروں سے دیکھنے لگتے ہیں جیسے کہہ رہے ہوں کہ اچھا تو پھر تمہارا اجارہ ہے، کی تھی محبت!

پڑھنے لکھنے سے ندیم کو عشق ہے۔ رات کے بارہ بارہ بجے تک مطالعہ کرنا یا پھر لکھنا ان کا سب سے محبوب مشغلہ ہے۔ اگر خدانخواستہ وہ چند دن نہ لکھ پڑھ سکیں تو سخت بیزار ہو جاتے ہیں۔ اب تک انہوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ ماشاءاللہ اچھا خاصا ضخیم ذخیرہ ہے۔ اس پر ایک لطیفہ یاد آ گیا جو خود ندیم نے بے حد محظوظ ہوتے ہوئے مجھے سنایا ——— اس لطیفے کے مصنف راجہ مہدی علی خاں ہیں۔ راجہ مہدی کہتے ہیں کہ ایک بار میں کسی کو " رسید" کرنے

لاہور ریلوے اسٹیشن گیا۔ وہاں کیا دیکھتا ہوں کہ لاہور کے سارے پبلشرز اور ایڈیٹرز موجود ہیں۔ پوچھا کہ بھائی یہ کس کا استقبال کرنے آئے ہو۔ انہوں نے بتایا کہ ندیم صاحب کے افسانوں اور نظموں کی بلٹیاں اسی ٹرین سے آ رہی ہیں، وہی چھڑانے آئے ہیں۔

اس کے باوجود جب ندیم سے پوچھو کہ کہو لالہ کچھ لکھ رہے ہو تو فوراً منہ بسور لیں گے۔

"کیا یار! ایک ہفتے سے کچھ نہیں لکھا۔ بس چند شعر لکھ سکا ہوں، ایک کہانی شروع کی تھی اور بس۔ کاش مجھے ہر طرف سے سکون ہوتا، یہ پیٹ کے کمانے کی فکریں نہ ہوتیں۔ یہ خواہ مخواہ بھرتی کا کام نہ کرنا پڑتا تو پھر میں واقعی کچھ لکھتا ـــــ یہ کچھ لکھنے کی بھوک کا غم ہے جو انہیں اکثر ستایا کرتا ہے۔

ندیم نے محکمۂ آبکاری سے لے کر بیکاری تک کو بھگتا ہے۔ مگر کبھی خودداری کو چوٹ نہ لگنے دی۔ ایک بار ندیم کے ـــــ ایک بدمزاج افسر کو کسی بات پر غصہ آگیا، اور اس نے ندیم کی طرف جلتی ہوئی سگریٹ کھینچ ماری، ندیم نے جواباً دوات اس کے منہ پر دے ماری جو اتفاق سے دیوار پر جا لگی ـــــ یہ اس زمانے کی بات ہے جب ندیم نے تعلیم کے بعد پہلی باقاعدہ ملازمت کی تھی۔ ندیم محکمۂ آبکاری میں رہنے کے باوجود کبھی شراب نہ پی سکے۔ ٹانگوں میں ملی ہوئی جتنی شراب پی ہو خیر سے اس کا کوئی حساب نہیں مگر یہ حقیقت ہے کہ ویسے انہوں نے کبھی نہیں پی لیکن یہ عجیب بات ہے وہ نہ تو شراب کو برا سمجھتے ہیں اور نہ پینے والوں سے منہ بناتے ہیں۔ کوئی ان کے سامنے پیتا بھی ہے تو وہ ذرا مخل نہ ہوں گے۔ بلکہ انہوں نے تو اپنے کئی دوستوں کو اپنے سامنے پینے دی۔

ندیم نے اسکول اور کالج کے زمانے میں ہر کھیل کھیلا مگر کسی میں بھی کوئی قابل ذکر کارنامہ انجام نہ دیا۔ تاش اور کیرم کے سوا کسی کھیل میں کامیاب نہیں۔ کرکٹ میچ کی کمنٹری ریڈیو پر سنیں گے اور اچھل اچھل پڑیں گے۔ اگر کہو کہ لالہ ذرا تم بھی کرکٹ کھیلا کرو، تو انہیں فوراً صفر پر آؤٹ ہونے کا خطرہ ستانے لگے گا۔ کھیلنے کو سب کھیل جی جان سے کھیلیں گے۔ لیکن اگر ہار جائیں تو پھر منہ اتر جاتا ہے۔ اور اگر ہرانے والا خوشی کا اظہار کرے تو ندیم اس کی طرح طرح کی نقلیں کریں گے اور دو ایک گھونسے بھی جڑ دیں گے۔ مگر یہ سب کچھ گھر میں کرتے ہیں۔

بزرگوں کے سلسلے میں ندیم بے حد سعادت مند ثابت ہوئے ہیں۔ گھریلو معاملات میں ان کی جا و بے جا سن کر سر جھکا دیں گے۔ باہر کی دنیا میں بھی بزرگوں کا احترام حد سے بڑھا ہوا ہے۔ مگر جب کوئی اصولی بات آ جائے تو پھر کیا مجال ہے جو ندیم چپ ہو رہیں، سنبھل سنبھل کر اچھے الفاظ میں اپنی بات کہہ کر رہیں گے۔ یہی بزرگوں والی سعادت مندی بیوی کے ساتھ بھی برتتے ہیں۔ گھریلو معاملات میں اس کی ساری جا و بے جا سنتے رہیں گے لیکن اگر اتفاق سے وہ ان کے پڑھنے لکھنے میں مداخلت کرے تو فٹافٹ سمجھا دیں گے کہ یہ معاملہ غلط ہے ـــــ ندیم کی شادی ان کی والدہ کی پسند سے دیہات میں ہوئی ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ اپنی بیوی سے عشق نہیں کرتے تو نفرت بھی نہیں کرتے، خاصی گذر رہی ہے۔ بیوی کی دلجوئی بسا اوقات بڑھ چڑھ کر کرتے ہیں۔ ان کی دو پیاری پیاری بچیاں ہیں جن پر وہ جان چھڑکتے ہیں۔ مگر یہ مزے کی بات ہے کہ وہ روایتی ابا بالکل نہیں لگتے، اور اپنی بچیوں سے شرارتیں کرنے سے بھی نہیں چوکتے ـــــ لیکن ایسی شرارتیں جن سے بچے خوش ہوں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ بچے ان سے بہت جلدی ہل جاتے ہیں۔ دوستوں سے لے کر بہنوں تک کے بچے، انہیں دیکھ کر کھل جاتے ہیں، اور انہیں یاد رکھتے ہیں۔

ندیم کی بیوی، بس برائے نام پڑھی لکھی ہیں۔ اپنے میاں کو "سرتاج من سلامت" کے القاب سے ٹوٹا پھوٹا خط لکھ لیتی ہیں۔ دیکھنے والوں کے لئے ندیم کی زندگی کا یہ ایک بڑا ہی دردناک پہلو ہے کہ ان کی بیوی یہ تک نہیں جانتیں کہ ان کا شوہر کیا ہے ـــــ ندیم جب جیل میں تھے۔ تو ان کی بیوی ان سے مل کر آئیں۔ کافی جھلائی ہوئی تھیں۔ کہنے لگیں "جانے کیا کرتے ہیں۔ کہیں نوکری تک نہیں ملی آج تک ـــــ میرے ابا جی سے آج بھی کہیں تو وہ سفارش کرکے سپاہی بھرتی کرا دیں، پھر کس کی مجال جو جیل بھیجے اور گاؤں میں بدنامی ہو ـــــ اس دن میں نے محسوس کیا کہ ندیم کی زندگی کا یہ پہلو کتنا دردناک ہے ـــــ لیکن ندیم کو اس درد کا احساس بھی ہے یا نہیں، اسے وہ ظاہر نہیں ہونے دیتے ـــــ وہ اپنے تازہ کہے ہوئے اشعار گھر بھر کے سامنے سناتے ہیں اور ان کی بیوی بڑے انہماک سے علاوہ پکانے میں مصروف ہوتی ہیں ـــــ

حلوے کی بات پر یاد آیا کہ ندیم حلوے کو بے حد پسند کرتے ہیں۔ ان کی حلوہ خوری دیکھ کر مجھے یہ شبہ ہوتا ہے کہ یہ حضرت بھی حلوے کے ڈھیروں پر قناعت کرنے والے مولویوں ہی کی کوئی شاخ ہیں۔ جب وہ گھر بیٹھے بڑے مزے سے گپیں مار رہے ہوتے ہیں تو مجھے یقین ہوتا ہے کہ وہ تھوڑی دیر بعد حلوہ پکانے کو ضرور کہیں گے۔ آگ بجھ چکی، نوکر باہر سودا سلف کرنے کو گیا ہوا ہے۔ اور ندیم کے پیٹ میں ہوک سی اٹھے گی "بلو! حلوہ پکا دو" حلوہ ان کے خیال میں بہت سے امراض کا علاج بھی ہے۔ مثلاً زکام ہو گیا ہے اور منہ بنائے بستر پر پڑے ہیں، ان سے پوچھا جائے کہ لالہ جوشاندہ پیو گے، تو فوراً فرمائیں گے، "نہ بلو گرم گرم جوشاندے کا مقصد حلق کو سینک پہنچانا ہے نا، سو یہ مقصد حلوے سے بھی پورا ہو سکتا ہے۔ ذرا سا حلوہ پکا دو۔"

امراض کے علاوہ غمِ دوراں کا علاج بھی یہی کیفیت حلوہ ہے۔ کتنے ہی اداس کیوں نہ ہوں، اگر کسی نبض شناس نے حلوے کا نام لے دیا تو چہرے پر رونق آ گئی، دم کے دم میں دنیا کے غموں پر لعنت بھیجدی، اور اپنے حساب عیش میں مصروف ہو گئے یعنی حلوہ کھانے لگے ——— ایک بات چپکے سے کہہ دوں کہ اچھا کھانے اور میٹھا کھانے کا ہوکا تو بہت ہے، مگر کھاتے نازنینوں کی طرح تھوڑا سا ہیں۔

ندیم کی بیماریاں بھی عجیب ہوتی ہیں۔ ایک ذرا سا زکام ہو جائے تو غضب ہو جاتا ہے، منہ نہیں دھلے گا، کپڑے میلے، بال سر سے دو دو انچ اٹھے ہوئے، گھر کے سب افراد جمع ہیں، اور حضرت کروٹ لئے پڑے ہیں۔ باورچی خانے میں حلوہ بن رہا ہے۔ پاؤں دب رہے ہیں، سر میں چمپی ہو رہی ہے، اور حضرت یوں پڑے ہیں جیسے واقعی شدید بیمار ہوں۔ میں مال پارک سے اطلاع سن کر جاتی ہوں، اپیل روڈ سے ہاجرہ کو ساتھ لیتی ہوں، ہم دونوں انتہائی سنجیدہ ہوتے ہیں، بلکہ رنجیدہ سے۔ راستے بھر آپس میں ان کے بارے میں دعائیہ باتیں کرتے جاتے ہیں۔ ان کی بیماری کے خوف سے رقت طاری ہے۔ گھر پہنچ کر معاملہ فوراً تاڑ لیتے ہیں۔ اور سوال کرتے ہیں "لالہ بن رہے ہو؟" اور لالہ صاحب بے ساختہ ہنسنے لگتے ہیں۔ اور سنجیدہ ہونے کی کوشش میں ہونٹ کپکپاتے ہیں آنکھیں نکالتے ہیں "بکواس نہ کر بلو!" اور ہم پروا کئے بغیر چھوٹی بہنوں سے پوچھتے ہیں "حلوہ بنا لیا ہے یا نہیں، بھلا یہ بیماری اس طرح ٹھیک ہو گی" اور واقعی جب گرما گرم تر تراتا ہوا حلوہ اور چائے آتی ہے تو ندیم بالکل ٹھیک ہو جاتے ہیں ———

یہ حلوہ بھی ان کا پرانا مرض ہے۔ دیہات میں سب سے بڑی خاطر حلوہ ہے، ندیم کی امی کو اپنے یتیم بچوں پر جب انتہائی پیار آتا تو وہ انہیں حلوہ بنا کر کھلاتیں، جب بنیاد یہاں سے پڑی ہو تو پھر معاملہ کہاں تک نہیں پہنچے گا۔ اب تو حلوہ بہنوں کی محبت کی کسوٹی تک بن گیا ہے۔ ندیم کی عادت ہے کہ ہفتے میں ایک ایک بار، اپنی تینوں بیاہی ہوئی بہنوں کے گھر ضرور جاتے ہیں، عائشہ بہن، اور ہیں عام طور سے حلوہ کھلاتے ہیں ——— ہاجرہ سدا کی کاہل شخص، اس سے بھلا زبان کے ساتھ ہاتھ بھی ہلتے ہیں ——— سو ندیم کہا کرتے ہیں، "بھئی خدیجہ یہ ہاجی تو بڑی کنجوس ہے، اسے اب مجھ سے محبت نہیں رہی۔"

اب حلوے کا قصہ شبِ ہجراں اور زلفِ دوست کی طرح طویل ہوا ہی ہے تو ایک اور قصہ سنتے چلئے۔ یہ اس زمانے کی بات ہے، جب یہ دونوں بھائی تعلیم ختم کر کے لاہور کے پردیس میں نوکری کی تلاش میں سرگرداں تھے ——— ندیم نے کچھ مسودات ٹائپ کر کے پانچ روپے کمائے تھے۔ اور دونوں بھائی اس دن بہت خوش خوش تھے ——— سوجی اور چینی کے لانے کے لئے بھاٹی گیٹ (جہاں وہ مقیم تھے) کی طرف رواں تھے، اور حلوہ بنانے کی سوچ رہے تھے۔ اتنے میں ایک پٹھے حالوں مزدور سر پر چیڑ کی ایک میز لئے قریب سے گزرا۔ ندیم نے سوچا، اگر اپنے ہاتھ کا پکایا ہوا حلوہ میز پر رکھ کر کھایا جائے تو لطف دوگنا ہو جائے گا ——— آپ نے میز کی قیمت پوچھی، مزدور نے کہا پانچ روپے، آپ کو غصہ آ گیا بولے ایک روپے میں دو گے ——— اور اس نے کہا لے لو۔ بھائی محمد بخش پر بجلی گر پڑی، کل پانچ روپلی تو کمائے، جس میں سے تھوڑی خریداری ہو گئی ——— اور اب میز کا ایک روپیہ، دراصل اس میز سے اب دونوں ہی چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے تھے ——— ندیم نے کہا، نہیں ہم ایک روپے کی نہیں لیں گے بارہ آنے میں عام ملتی ہیں ——— اس نے کہا اچھا بارہ آنے سہی۔ ندیم نے کہا۔ اچھا تو میز بھاٹی دروازہ میں ہمارے گھر تک پہنچا دو۔ اور اس نے میز گھر تک پہنچا دی ——— ہرچہ بادا باد کہہ کر ندیم حلوہ بنانے بیٹھے۔ ترکیب دونوں میں سے ایک کو نہ آتی تھی۔ گھی ڈال کر سوجی

ڈالی اور چینی جھونک دی، اپنے حساب سے پانی ڈالا، ساری گٹھلیاں بن گئیں ——— اب لاکھ گھونٹ رہے ہیں مگر سوجی چمچے سے چھٹتی ہی نہیں۔ پھر بھائی محمد بخش نے پانی ڈالنے کی سوچی، اور لوٹا بھر پانی جھونک دیا ——— لالہ کہتے ہیں، وہ ایسا بدصورت علوہ تھا کہ ہیولیٰ آدم سے ملتا کر اب تک کسی نے نہ پکایا ہوگا اور بھاٹی گیٹ کی نالیوں میں کئی دن تک اور دور دور تک یہ علوہ جما رہا۔ لیکن ایک معتبر راوی کا بیان ہے کہ ندیم نے اس میں سے کافی علوہ اپنی تازہ خریدی ہوئی میز پر رکھ کر کھانے کے بعد بقیہ نالی میں اونڈھایا تھا ——— اب جھوٹ سچ تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔

ندیم کو پڑھتے پڑھتے سونے کی عادت ہے ——— سوتے میں کراہتے ہیں۔ شاید خواب دیکھتے ہیں ——— جو انہیں ذرا بھی یاد نہیں رہتے ——— صبح کافی دیر سے سو کر اٹھیں گے اور پھر اخبار لے کر بے حد سنجیدگی سے اپنے بستر پر اکڑوں بیٹھ جائیں گے۔ اگر اس دوران میں کوئی بدنصیب ان سے بولے تو بڑی بے بسی سے کہیں گے "دیکھو مجھے ستاؤ نہیں" اور پھر اسی عالم میں سگریٹ پھینک کر حوائج ضروری کی خاطر سیڑھیاں چڑھتے چلے جائیں گے ——— اب اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ خدانخواستہ علوے کھا کھا کر ان کا معدہ بیمار ہو گیا ہے، قطعی نہیں، ماشاءاللہ ایسا تو مند معدہ ہے کہ انشاءاللہ سو برس ابھی اور حلوے کھائیں گے۔

لیکن معدے کی تندرستی ان کے پورے جسم کی تندرستی کی ضامن نہیں ——— اکثر بیمار پڑتے ہیں۔ ایک کان مدتوں سے خراب ہے، ڈاکٹر ایک بہت بڑے آپریشن کا مشورہ دیتے ہیں، لیکن وہ راضی نہیں ہوتے۔ اس لیے اکثر کان کے شدید درد میں مبتلا ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود کان کو چھیڑنے سے باز نہیں آتے ——— اس کان کے علاوہ کئی بار سنجیدگی سے کافی کافی عرصہ بیمار رہے ہیں ——— مگر کبھی میں نے ان کے منہ سے موت، میرے منہ میں خاک کے بارے میں نہیں سنا۔

ندیم کو میں نے اس سات سال کے عرصے میں آج تک کبھی ناامید نہیں دیکھا۔ وہ مایوس ہونا جانتے ہی نہیں ——— اُمید اور یقین سے اس قدر بھرپور انسان میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ ندیم کے چچازاد بھائی حیات کو دِق ہو گئی تھی وہ علاج کی غرض سے لاہور ہمارے گھر میں مقیم تھے۔ ندیم ان سے بے حد محبت کرتے تھے۔ ڈاکٹروں کی مایوسی کے باوجود ندیم کو ان کے تندرست ہو جانے کی پوری اُمید تھی۔ جس دن حیات کا نیا علاج شروع ہونا تھا، اس دن وہ ایک مشاعرے کے سلسلے میں باہر چلے گئے۔ ہم لوگ مریض کے چہرے کی کیفیات دیکھ کر اُمید کر رہے تھے کہ وہ دوچار دن سے زیادہ نہیں جئیں گے، لیکن جب ندیم سے اس خدشے کا ذکر کیا تو وہ بالکل یقین نہیں کر سکے۔ وہی ہوا ایک رات باہر گذار کر جب وہ گھر پہنچے تو حیات بھائی چل بسے۔ ندیم کا دکھ ناقابلِ بیان تھا مگر پھر بھی میں نے ان کے منہ سے دنیا کی بے ثباتی کا تذکرہ نہیں سنا۔

ندیم کو زندگی سے بے انتہا لامحدود محبت ہے۔ وہ ایک ایک لمحے کو کام میں لاتے ہیں اور مسلسل جدوجہد کرتے ہیں۔ انہیں ایسے لوگوں سے چڑ ہے جو خواہ مخواہ دکھ پال کر حسرت ناک زندگی گذارتے ہیں اور دوسروں کی ہمدردیاں بٹورنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ دکھ کو سامنے دیکھ کر اس کے ڈیل ڈول کے مطابق اس کا سواگت کرتے ہیں، منہ بناتے ہیں، ٹھنڈی آہیں بھرتے ہیں، سگرٹوں پر سگرٹ پیتے ہیں۔ اوندھے لیٹتے ہیں، اکڑوں بیٹھے جھومتے ہیں، کبھی کبھی آنکھیں بھی ملتے ہیں۔ اور پھر آہستہ آہستہ نہیں بلکہ تیزی سے اس کیفیت سے نکل جاتے ہیں ——— شاید یہی وجہ ہے کہ میں نے ان میں ڈھونڈے سے بھی کوئی نفسیاتی اُلجھن نہ پائی۔

ندیم بہت نرم دل ہیں۔ اگر ذرا گہری چوٹ لگے تو رو پڑتے ہیں اور رونے سے قطعی نہیں شرماتے، آنسوؤں کو دل کا وضو سمجھتے ہیں۔ میں نے ان کو کئی بار دوسروں تک کے لئے روتے دیکھا ہے۔ وہ عینک اُتار کر بازو میں منہ چھپا کر کروٹ سے لیٹ جائیں تو سمجھ لیجئے کہ رو رہے ہیں۔ لیکن اگر اس وقت کوئی مزیدار بات کہہ دے تو فوراً ہنسنے بھی لگتے ہیں۔ ہنسی ان کو کس قدر عزیز ہے!

ندیم زیادہ تر سوٹ۔ یا قمیص پتلون پہنتے ہیں۔ پہنتے بھی سلیقے سے ہیں۔ پہن اوڑھ کر خاصے پیارے لگتے ہیں۔ اپنے گاؤں جاتے ہیں تو

وہاں کا خاص لباس، چادر، چولا اور بڑا سا پگڑ پہنتے ہیں۔ فارغ بخاری نے بالکل سچ کہا تھا کہ بالکل پٹواری لگتے ہیں۔ کبھی کبھی شلوار قمیص بھی پہن لیتے ہیں۔ اللہ! کیا رُوپ نکالتے ہیں۔ اور کیا چال ہوتی ہے ان کی — بالکل سپرڈ سپرڈ! ایک بار ندیم رات کو پھل خریدنے نکلے۔ شلوار قمیص پہنے بیٹھے تھے وہی پہنے چل پڑے۔ خدا جانے میری اور ہاجرہ کی کیا کمبختی آئی کہ انہیں پھل خریدنے کے سلسلے میں سخت پھوہڑ ثابت کرتے ہوئے خود بھی ساتھ ہو لیے۔ آگے آگے ندیم۔ پیچھے پیچھے ہم دونوں۔ سڑک کی گہما گہمی ایک طرف اور ندیم کی چال ایک طرف۔ ہم نے غور سے ندیم کی چال دیکھی تو میں منمنائی "ہائے بھیا کی چال کیسی ہے ہاجرہ!" اور ہاجرہ نے کہا صبر کرو، خدیجہ! اب ہو ہی کیا سکتا ہے، اپنا بھائی ہے برداشت کرو۔ مگر اب مدت ہوئی ہمارے اصرار پر انہوں نے شلوار پہننا چھوڑ دی ہے۔ مگر اب بھی کبھی کبھی ان کے کلیجے میں ہوک سی اُٹھتی ہے۔ بہنوں سے شلوار مانگتے ہیں کہ دے دو ایک گھنٹے پہن لوں مگر کیا مجال جو کوئی ان کی یہ آرزو پوری کر دے۔ ان کی اپنی بے چاری شلواریں تو جانے کب کی، پوتڑوں گھبوڑوں میں تبدیل ہو کر دم دے بیٹھیں ہیں — شلوار میں ان کی چال کتنی بے ڈھنگی ہو جاتی ہے کہ بس کیا بتاؤں۔

اچھے کپڑوں پر ہمیشہ جان دیتے ہیں۔ اور اچھے کپڑوں کا اندازہ قیمت سے لگاتے ہیں۔ اپنے لئے جوتا، کنگھا، برش، بلیڈ، ریزر، تیل یا اس قسم کی جو چیز بھی لائیں گے قیمتی سے قیمتی۔

ندیم جس جگہ رہیں گے اسے صاف ستھرا رکھیں گے۔ ان کے کمرے میں ہر چیز سلیقے سے اپنی جگہ رہے گی۔ لکھتے پڑھتے وقت کاغذ اور کتابیں ادھر اُدھر بکھرائیں گے لیکن جب کام ختم کر کے اُٹھیں گے ہر چیز اپنی جگہ پر جما دیں گے — خود بھی چال ہے جو میلے کپڑوں میں یا بغیر شیو کے ایک دن گذاریں۔ اگر ان کے ان کاموں میں کوئی مدد کر دے تو سبحان اللہ اس سے بڑھ کر ان کا چہیتا اور کوئی نہیں۔ اور اگر نہ کرے تو خود ہی یہ سب کام سرانجام دے لیں گے۔

ان کے دوستوں کا حلقہ بہت وسیع ہے۔ مجھے یاد ہے کہ جب تک میری شادی نہیں ہوئی تھی، میں ندیم کے لئے بے شمار ملاقاتیوں کی وجہ سے بہت پریشانی محسوس کرتی تھی، رات دن، اطلاعی گھنٹی کی آواز سے کان پک گئے تھے۔ حد تو یہ ہے کہ رات کے تین چار بجے بھی ملاقاتی پہنچ جاتے تھے۔ ان میں سب سے قابلِ ذکر ملاقاتی پولیس تھی، ندیم بیٹھے نظم یا افسانہ تحریر فرما رہے ہیں۔ گھنٹی بجی اور سب خاک میں مل گیا۔ گھنٹہ دو گھنٹے بعد آئے، پھر لکھنے بیٹھے۔ پھر گھنٹی بج اٹھی — ہم سب عاجز تھے۔ بہت دفعہ کہا کہ لالہ! اوقاتِ ملاقات کا بورڈ باہر لگا دو، مگر زمانے، ٹھیک کرنے نے تو اپنی شادی کی (تاکہ اس گھر سے دفع ہو جاؤں) یا لالہ کی نوکری کی دعائیں مانگا کرتی۔

نوکری کا ذکر آیا ہے تو کہہ دوں، نوکری ندیم کے مزاج کو راس نہیں۔ وہ آزاد رہ کر کمانا چاہتے ہیں۔ کتنی ہی بار نوکری کی اور پھر بھاگ کھڑے ہوئے۔ وہ کہتے ہیں، نوکری کی گھس گھس میں آدمی اچھی طرح تخلیقی کام نہیں کر سکتا۔ اب امروز کی ادارت میں بندھ کر بھی اس دُکھ میں مبتلا ہیں۔ مگر یہ صحافت تو بڑوں بڑوں کو نگل چکی ہے — یہ تو وہی روائتی کمبل ہے جسے انسان چھوڑنا چاہتا ہے مگر وہ انسان کو نہیں چھوڑتا۔

ندیم عورت کا بڑا احترام کرتے ہیں، خدا جانے اس احترام میں عورت کی قوتوں کو تسلیم کرنے کا جذبہ ہے یا عورت کی مظلومیت سے ہمدردی۔ میں نے ان کی زبان سے کسی دُور قریب کی عورت کے بارے میں کوئی گری ہوئی بات نہیں سنی۔ یہ عورت کا عبادت کی حد تک احترام کہاں سے آیا؟ چاہے ندیم اعتراف کریں یا نہ کریں، یہ عنفوانِ شباب کی کوئی عورت ہے جس نے انہیں اتنا پختہ ایمان بخشا ہے، عورت کسی روپ میں بھی ہو، بیوی، بہن، ماں یا دوست، وہ اسے رگِ جاں سے زیادہ عزیز اور محترم رکھتے ہیں۔

بہنوں سے انہیں غیر معمولی محبت ہے۔ ہزاروں مصیبتوں میں مبتلا ہوں، سب کا پرانے روایتی بھائی کی طرح خیال رکھتے ہیں۔ ہر ایک کے حقیر سے حقیر کام کو تیار۔ سعیدہ آپا ان کی بڑی بہن ہیں، اس کے باوجود جب وہ گاؤں جاتے ہیں تو بہن کا حق لے کر جاتے ہیں۔ چاہے بیمار ہوں، چاہے بیکار، چاہے قرض میں — بہنوں کو ذرا اُداس پائیں تو فوراً بہنوئیوں پر شک کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ اپنے اکلوتے بھانجے ظہیر کو میری وجہ سے بارہا بہنوئی سمجھ کر منہ پھلا یا ہے — لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ بہنوں میں ترجیح کسی کو دینے پر راضی نہیں۔ تسنیم سلیم چھتاری ان کی بڑی عزیز

اور پیاری بہن ہیں۔ ایک بار ان سے ایک ننھی سی غلط فہمی کی وجہ سے ناجرہ نے تھوڑا دکھ محسوس کیا، اور اس کا ندیم سے ذکر کر دیا، ندیم بہت اداس ہو گئے اور صاف کہہ دیا کہ میں تسنیم کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں سنوں گا، اور نہ تسنیم سے تم لوگوں کے بارے میں۔ تسنیم مجھے بہت عزیز ہے!" وہ دن اور آج کا دن کسی کی ہمت نہیں کہ کوئی کسی بہن کی شکایت لا سکے۔ یہ ندیم کی شخصیت کا جادو ہے، کہ وہ اپنے محبت کرنے والوں سے جو چاہتے ہیں کروا لیتے ہیں۔ جو چاہتے ہیں وہ حاصل کر لیتے ہیں۔

اس چاہنے کی بات پہ مجھے ندیم کی ایک اور مزیدار بات یاد آگئی۔ یہ دس سال پہلے کی بات ہے ندیم یہ روڈ پہ اپنے عزیز دوست حمید اللہ خاں نیازی (جن کے نام رحیم معنون ہے اور جو پنجاب پولیس کے بڑے افسر ہیں) کے ساتھ رہتے تھے۔ ایک دفعہ حمید صاحب اپنے گھر سے آئے تو ہاتھ کا بنا ہوا بڑا خوبصورت کمربند بھی لائے۔ صبح جب انہوں نے شلوار میں ڈالنے کو کمربند نکالا تو ندیم کو پہلی ہی نظر میں بھا گیا۔ کہنے لگے "خان جی یہ کمربند مجھے دے دو" "خان جی نہ جانے کس موڈ میں تھے۔ بولے" نہیں ملے گا" ندیم نے دوسرے دن صندوق میں سے کمربند چرا لیا اور بکس کے پیچھے چھپا دیا۔ خان جی نوکر پر بہت چلائے بیچارے۔ مگر اس نے لیا ہوتا تو بتاتا ——— ندیم بھی کمربند چھپا کر بھول گئے۔ ایک دن نوکر نے بکس ہٹا کر صفائی کی تو مل گیا اور دوبارہ خان جی کی شلوار کے حق میں ضبط ہو گیا ——— ندیم نے پھر موقع پاکر اڑا دیا۔ اور اب کی اپنی شلوار کے علاوہ کہیں نہیں چھپایا ——— ایک زمانے کے بعد جب دونوں یہ قصہ بھول گئے تو ایک بار ندیم نے ان کے سامنے کمربند ایک شلوار میں ڈالا اور خان جی فوراً پہچان گئے۔ پھر چھن گیا لیکن آخر کو بازی ندیم کے ہاتھ رہی ——— یہ ایک کمربند کا قصہ تھا، جو ندیم کو بھا گیا اور جسے وہ حاصل کر کے رہے، مگر، انہیں تو جس کی بھی کوئی چیز پسند آجائے لے کر چھوڑتے ہیں ——— خصوصاً وہ بے تکلف دوست جو انہیں تنگ کرنے کو انکار کر دیں۔ ہم بہنوں سے کاغذ قلم، کتابیں جھپٹ لینا تو ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ اور بہنوئیوں کے رومال اور ٹائیاں ——— عید بقر عید کو سب سے پہلے بن ٹھن کر نیاز اور پھر چھوٹی بہنوں سے لے کر بچوں تک سے عیدی وصول کر لیتے ہیں اور پھر ایسے خوش ہوتے ہیں جیسے زندگی کی معراج حاصل ہو گئی ہو۔

ندیم کی زندگی کا سب سے محترم پہلو ماں سے بے پناہ اُلفت ہے۔ ان کی ماں بچوں کی محبت میں سرشار، بیمار، ضعیف خاتون ہیں۔ وہ اب بھی شہر کی دلچسپیوں سے چونک کر ماں کی طرف بھاگتے ہیں تو ایک ننھے سے بچے معلوم ہوتے ہیں۔ ان کی زندگی کی سب سے بڑی آرزو یہ ہے کہ ان کی ماں ہر وقت ان کے پاس ہوں، لیکن نہ تو ندیم کی زندگی کا ڈھب ایسا ہے کہ وہ تمام زندگی اٹک میں بسر کر دیں، اور نہ والدہ اپنے بزرگوں کی زمین اور مرحوم شوہر کا گھر چھوڑ سکتی ہیں۔

ماں کے لئے ان کی یہ تڑپ دیکھ کر میں اس وقت بہت حیران ہوتی ہوں جب میرا ننھا سا بچہ کھیل میں مصروف ہو کر میری گود میں آنا بھی پسند نہیں کرتا ——— زندگی کی اتنی مصروفیتوں میں ماں کا اتنا خیال کچھ عجیب سا معلوم ہوتا ہے۔ ندیم کہتے ہیں "اس میں عجیب بات کیا ہے؟ میری ماں کے برابر کون ماں اپنے بچوں کے لئے دکھ جھیل سکتی ہے ——— میری ماں خود روکھی روٹی کھا لیتی تھی، اور ہمارے لئے گوشت یا پیاز مہیا کرتی تھی۔ ماں نے ہمیں کتنی مصیبت سے گاؤں کے پرائمری اسکول میں پڑھایا، درختوں کی گوند اور توے کی کالک اکٹھا کر کے وہ ہمارے لئے روشنائی تیار کرتی، ایک پنسل خریدنے کے لئے وہ کتنے دکھ جھیلتی۔ کیا کوئی ماں اس طرح کر سکتی ہے؟" ندیم کی اس جذباتیت کا کیا جواب، ماں بن کر کہتی ہوں سب مائیں یہ کرتی ہیں۔ مگر کتنے بچے اتنی بے پایاں احسان مندی کے قائل ہوتے ہیں؟ ندیم قائل ہیں۔ انہوں نے برسوں تک ماں کے ساتھ بیٹھ کر اناج پسوایا ہے، ان کے لئے سوکھی لکڑیاں چن لائے ہیں۔ اور جمعہ جمعہ ان کے کپڑے اپنے ہاتھوں سے دھوئے ہیں۔ اور جب مزید تعلیم کے لئے اپنے مہربان چچا، اور شریف النفس چچی، کے پاس چلے گئے تو راتوں کو بستر میں چھپ چھپ کر ماں کے یہ سب کام نہ کر سکنے پر آنسو بہاتے ——— اور آج بھی جب وہ ان باتوں کا تذکرہ کرتے ہیں تو ان کی آنکھیں پُرآب ہو جاتی ہیں۔ اور جب انہیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی ماں خوش نہیں تو ان کا ذہنی نظام درہم برہم ہو جاتا ہے۔

وہ عالموں، مبلغوں، پیروں کے خاندان کے ایک فرد ہیں، لیکن خود فطرتاً کسان ہیں۔۔۔ انہیں زمین سے محبت ہے۔ وہ آسمان پر جانے کے خواہشمند نہیں، انہیں تو اپنی زمین سے عشق ہے، وہ اسی کو بنانا سنوارنا چاہتے ہیں ——— وہ کہتے ہیں کہ مجھے اس زمین کے ذرّے ذرّے سے محبت ہے، اس کے ہر ذی نفس سے عشق ہے۔۔۔ زمین تو میری ماں کی طرح پیاری ہے، جو اپنے سینے پھڑواتی ہے اور اپنے بچوں کو دنیا کی ہر دولت بخش دیتی ہے۔

یہ ہے ندیم کی نجی زندگی ——— ندیم جس کے قدم اس زمین پر مضبوطی سے جمے ہوئے ہیں۔ جو برداشت کرتا ہے، نباہتا ہے اور جی جان سے محبت کرتا ہے۔ جو فیصلہ کرکے بھاگتا نہیں۔ جو ہر مخالف ہواؤں کے مقابلے میں بغیر جھکے ہٹے، بغیر روئے دھوئے ڈٹے رہنے کی قوت ہے۔ جو قدیم اور جدید کے امتزاج کا سب سے خوبصورت نمونہ ہے۔

ندیم شرافت اور محبت سے بھرپور ایک روائتی انسان ہے۔ جو آج کے کرم خوردہ نظام میں مفقود ہے، لیکن جسے ایک سنہرا انسانی مستقبل اپنی گود میں پال رہا ہے۔

خواجہ احمد عبّاس

صالحہ عابد حسین

کھلتا ہوا گندمی رنگ، چھوٹی چھوٹی سیاہ، تیز و ذہین آنکھیں، ذرا موٹی ناک، معمولی ہونٹ دہن، کشادہ پیشانی جس کو بالوں کی بے وقت مفارقت نے اور زیادہ وسیع کر دیا ہے۔ گنجا سر جس کے چاروں طرف کی بالوں کی جھالر میں سیاہی سے زیادہ سفیدی جھلکتی ہے۔ چھوٹی چھوٹی مونچھیں جن کی سیاہی کو سفیدی روز بروز مغلوب کر رہی ہے، گول ڈبل، اوسط سے کچھ چھوٹا قد، چہرے پر متانت و غور و فکر کے آثار..... یہ ہے عباس ——— خواجہ احمد عباس۔ جرنلسٹ اور ادیب، فلم اسٹوری رائٹر اور فلم ڈائرکٹر اور پروڈیوسر، مقرر اور مصنف۔ جو مقبول و ہر دل عزیز بھی ہے اور مطعون بھی، مشہور بھی ہے اور بدنام بھی۔ جو ترقی پسند ہوتے ہوئے ترقی پسندوں پر سخت سے سخت نکتہ چینی سے نہیں چوکتا۔ جو نیشنلسٹ ہونے کے باوجود قومی حکومت پر کڑی تنقید کرتا ہے، جو جواہر لال کا معتقد اور دلدادہ ہوتے ہوئے ان پر اعتراض بھی کرتا رہتا ہے۔ جس سے اپنے بھی خفا ہیں اور بیگانے بھی ناخوش مگر دونوں کو اس کی قدر کرنی پڑتی ہے۔

عباس کی عمر کا اکثر لوگ بڑا غلط اندازہ کرتے ہیں۔ اس کے سفید بال، گنجا سر اور بڈھوں جیسا تدبر لوگوں کو غلط فہمی میں مبتلا کر دیتا ہے لیکن اس کی آنکھوں کی چمک، شرمیلی مسکراہٹ اور بچوں کی سی معصوم ہنسی اس راز کو فاش کر دیتی ہے کہ اس کی عمر اس سے کہیں کم ہے جتنی نظر آتی ہے حقیقت یہ ہے قوم کے درد، ملک کی محبت اور اس کی خدمت کی لگن نے اسے چالیس سال کی عمر میں بوڑھا بنا دیا ہے۔

عباس مولانا الطاف حسین حالی کا قریبی رشتہ دار ہے۔ اس کے نانا خواجہ سجاد حسین حالی کے چھوٹے بیٹے تھے اور اس کے والد خواجہ غلام السبطین کا بھی حالی سے قریبی رشتہ تھا۔ حالی کی وفات سے چند ماہ پیشتر ۷ جون ۱۹۱۴ء کو سارے خاندان کے ارمانوں کے سائے میں اس بچے نے جنم لیا اور اس کا نام دادا کے نام پر عباس رکھا گیا۔ خاندان میں لڑکوں کی کمی تھی اور اپنی ننھیال میں تو وہ اکلوتا ہی لڑکا تھا اس لئے ظاہر ہے کہ اس کی پرورش بڑے ناز و نعم میں ہوئی۔ عورتیں بہت چاؤ چونچلے کرتیں اور مرد بھی لاڈ پیار بہت کرتے تھے۔ البتہ خواجہ غلام السبطین بڑے معیار پرست، بااصول اور ایک حد تک سخت گیر انسان تھے۔ ان کی زندگی اسلامی تعلیمات اور اخلاقی بلندیوں کا ایک مرقع تھی جس میں دردِ دل کی انمول نعمت نے اور خدمت کی سچی لگن نے بڑی دلکشی پیدا کر دی تھی۔ اسلام سے انہیں والہانہ عشق تھا اور ان کی تمنا اور کوشش تھی کہ ان کے خاندان کے سب بچے اسلام کے سچے جاں نثار اور اسلام کی اصلی روح سے آشنا ہوں۔ وہ خاندان کے، بلکہ شہر بھر کے افراد سے بہت محبت کرتے اور

ان کی ہمدردی کے لئے تیار رہتے تھے لیکن رسمی محبت کا اظہار کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ خاندان کے لڑکوں کے ساتھ ان کا رویہ ذرا سخت رہتا تھا۔ مگر لڑکیوں سے بڑی نرمی اور محبت سے پیش آتے تھے۔ اخلاقی لحاظ سے ذرا سی لغزش کو وہ برداشت نہ کر سکتے تھے اور نوجوانوں کی سرکشی اور خود سری بھی انہیں پسند نہ تھی۔ اپنے اکلوتے بیٹے کو وہ بہت چاہتے تھے اس لئے اس میں ان سب اصولوں اور خیالات کا عکس دیکھنا چاہتے تھے جو خود ان کے تھے۔ عباس کی والدہ اپنے دادا کی طرح کہ سخن بھی تھیں اور دردمند دل بھی رکھتی تھیں۔ ان کے دل میں اپنے بچوں کی محبت کا جذبہ بے پناہ شدید اور گہرا تھا خصوصاً بیٹے سے بڑا عشق تھا۔ غرض ناز و نعم، محبت و شفقت، دلداری و ناز برداری اور ساتھ ساتھ اصول پرستی و سخت گیری کے اس گہوارے میں پل کر عباس بڑھا۔ اس کے مزاج میں بچپن کی اسی کشمکش کا عکس اور ماں اور باپ دونوں کی صفات کا پرتو ملتا ہے۔ وہ اپنے باپ کی مستقل مزاجی، خودداری اور اپنے مقصد کے لئے جان تک کی پروا نہ کرنے والی صفات رکھتا ہے اور ماں کے نرم و نازک دل اور گہری جذباتی محبت بھی اس کے اندر موجود ہے جسے وہ ہمیشہ چھپانے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔

عباس کی ابتدائی تعلیم اس کے نانا کے قائم کردہ حالی مسلم ہائی سکول میں ہوئی۔ ابتدا ہی سے اسکول میں اس کی ذہانت کو مان لیا گیا تھا لیکن جوں جوں وہ بڑا ہوتا گیا بزرگوں اور استادوں کو یہ اندازہ ہونے لگا کہ وہ عام بچوں سے مختلف ہے۔ نہ تو وہ روایاتی "شریف" بچوں کی طرح اطاعت شعار فرماں بردار اور حلیم ہے اور نہ عام بچوں کی طرح چالباز، حیلہ ساز اور دروغ گو۔ وہ ان کا ہر کہنا سر جھکا کر نہیں مانتا مگر ساتھ ہی سزا یا تنبیہ سے بچنے کے لئے جھوٹے بہانے نہیں بناتا ہے۔ سزا کو ضبط اور خودداری کے ساتھ سہتا ہے مگر اس وقت آنکھوں سے بغاوت کے جذبات صاف جھلک اٹھتے ہیں۔

اس اسکول میں اس زمانے میں بچے تعلیمی ڈھنگ کے مطابق زیادہ زور لکھنے پڑھنے پر ہی دیا جاتا تھا۔ پھر بھی جب کبھی موقع نکلتا، جلسے وغیرہ ہوتے تو عباس اس میں نمایاں حصہ لیتا تھا۔ اس کے خاندان میں ایک علمی فضا اور ادبی ماحول موجود تھا جس کی وجہ سے بچوں میں بھی یہ شوق ابھرتا تھا کہ وہ کچھ اس قسم کے کام کریں۔ چنانچہ بچوں کی لائبریری، ادبی انجمن کا قیام اور ڈرامائی سوسائٹی ان کے کارنامے تھے جن میں ان کے بزرگ ان کے معاون اور رہنما ہوتے تھے۔ ادبی انجمن میں خاندان بھر کے بچے جمع ہو کر مضمون اور کہانیاں پڑھتے، تقریریں کرتے اور اقبال و غالب کی چیزیں سنایا کرتے تھے۔ اس انجمن کا سب سے پرجوش کارکن عباس تھا۔ ان جلسوں میں جو سب سے کم عمر، سب سے کوتاہ قد اور سب سے زیادہ لڑنے اور چیخنے والا مقرر نظر آئے، سمجھ جائیے کہ عباس کے سوا اور کوئی نہیں۔ ڈراموں میں عباس اور اس کے رشتے کے دوسرے بھائیوں کو بہت انہماک تھا لڑکیاں بزرگوں کے حکم سے اس سے دور ہی رہتی تھیں۔ یہ سوسائٹی مختلف چھوٹے چھوٹے ڈرامے اسٹیج کیا کرتی تھی جس میں کبھی انگریزی سے ترجمہ کئے ہوئے ڈرامے ہوتے اور زیادہ تر آغا حشر کے ڈراموں کا اختصار۔ مجھے یاد ہے کہ اس طرح کے کسی ڈراما میں عباس ایک جاں باز مجاہد بنا تھا جس نے ایک ظالم عیسائی بادشاہ کے استبداد کے سامنے سر جھکانا منظور نہیں کیا اور اس کی پاداش میں پہلے اپنی بہن کی جان نچھاور کی اور پھر خود "کلمۃ الحق" بلند کرتا ہوا دار پر چڑھ گیا۔

۱۹۲۶ء میں عباس پانی پت سے مڈل پاس کر کے علی گڑھ یونیورسٹی اسکول میں آ کر داخل ہو گیا اور دو سال بعد اعلیٰ نمبروں پر میٹرک پاس کر کے کالج میں آ گیا۔ یہ چھوٹا سا دبلا پتلا چودہ سال کا لڑکا جب کالج میں داخل ہوا تو سینئر لڑکوں کو ایک دلچسپ مشغلہ ہاتھ لگا اور وہ اسے ستانے اور چھیڑنے پر تل گئے۔ عباس کا پیار کا نام "اچھو" تھا۔ آج اسے اپنے اس نام سے جتنا پیار ہے اس وقت اتنا ہی وہ اس سے چڑتا تھا۔ کسی طرح یہ نام کالج میں مشہور ہو گیا اور لڑکے اسے "اچھو اچھو" کہہ کر چھیڑتے اور وہ روتا بسورتا گھر آ کر اپنی نچی سے شکایت کرتا جو اسے سینے سے لگا کر سمجھاتیں اور تسلی دلاسا دیتی تھیں۔ لیکن وہ بہت جلد اس منزل سے نکل آیا۔ اس کی ذہانت، تقریری قابلیت اور تحریری صلاحیت جلد ہی لوگوں پر ظاہر ہو گئی اور دو سال کے اندر اندر اس کا سکہ بیٹھ گیا۔ اب کسی کی ہمت نہ تھی کہ اس کے عجیب نام، چھوٹے قد یا نوعمری کا مذاق اڑائے۔ اس کے گرد اپنے ہم خیال

ہم مذاق، جوشیلے اور با ذوق قوم پرست طالب علموں کا ایک حلقہ قائم ہو گیا جو اس وقت کالج کا سب سے اہم حلقہ سمجھا جاتا تھا۔ عباس کے والد اور نانا پکے مسلم لیگی تھے مگر عباس نے سیاسی خیالات میں ان کا بالکل اثر قبول نہیں کیا بلکہ اپنے بڑے بھائی خواجہ غلام السیدین اور ان کے بعض قوم پرست دوستوں کے خیالات سے متاثر ہوا اور پندرہ سولہ سال کی عمر ہی سے وہ نیشنلسٹ نوجوانوں میں گنا جانے لگا۔ عمر کے ساتھ ساتھ اس کی نڈرتا اور جوش بڑھتا گیا۔ وہ بے دھڑک تقریریں کرتا، مضمون لکھتا اور آپس کی گفتگو میں حکومت وقت پر سخت اعتراض جڑتا۔ نوجوانی کے جوش نے کبھی یہ نہ سوچنے دیا کہ ایک کم سن نوجوان کے دنیا کی سب سے بڑی حکومت سے ٹکر لینے کی خواہش کا کیا انجام ہو سکتا ہے؟ چنانچہ طالب علمی کے زمانے ہی میں اس پر خفیہ پولیس کی نگرانی رہنے لگی اور وہ جہاں جاتا ایک خفیہ پولیس کا آدمی اس کے ساتھ لگا رہتا تھا۔ عباس کو اس کی ذرا سی پروا نہ تھی۔ البتہ اس کے والد اور نانا کو بڑی فکر تھی۔ ان کو اس کا بھی افسوس تھا کہ عباس سیاسی طور پر دوسری جماعت کا ہمدرد ہے اور اس کی فکر بھی تھی کہ اس ذہین و قابل نوجوان کا مستقبل کیا ہو گا جس سے انہوں نے بڑی بڑی توقعات وابستہ کر رکھی تھیں؟ لیکن اس کے والد بڑے اصول پرست ہونے کے باوجود جبر کرنے کے قائل نہ تھے اور سمجھانے بجھانے کے سوا انہوں نے اسے مجبور کرنے کی کوشش نہیں کی۔

۱۹۳۳ء میں عباس نے فسٹ ڈویژن میں علی گڑھ یونیورسٹی سے بی۔ اے پاس کر لیا۔ وہ اس وقت پورے انیس سال کا بھی نہ تھا مگر ارادہ یہ کر رکھا تھا کہ کسی اخبار میں نوکری کرے۔ لیکن اس کے بزرگ اس کم عمری میں اس کے نوکری کرنے کے خلاف تھے۔ یوں بھی ان لوگوں کا خیال تھا کہ وہ ابھی بچہ ہے اور اس عمر کا فیصلہ دیرپا نہیں ہوتا۔ چند سال اور تعلیم حاصل کرنے تو شاید اپنا نیک و بد سوچنے کی عقل آ جائے۔ لوگوں کے سمجھانے بجھانے سے عباس نے ایل۔ ایل۔ بی میں داخلہ لے لیا مگر اس نے ایک لمحہ کے لئے بھی یہ نہ سوچا کہ وہ وکالت کا پیشہ اختیار کرے گا۔ اس زمانے میں یونیورسٹی کی بڑی تعطیل میں وہ دہلی جا کر رہتا جہاں اس کے والد ملازم تھے اور مختلف اخباروں میں سیکھنے کے طور پر کام کرتا رہا۔ شروع ہی سے اس کا رجحان جرنلزم کی طرف تھا اور اسی پیشے کو وہ آئندہ اختیار کرنا چاہتا تھا۔ بہت نو عمری سے اس نے رسالوں اور اخباروں میں مضمون لکھنے شروع کر دئیے تھے جن میں سے اکثر وہ فرضی نام سے چھپوایا کرتا تھا۔ شاید اس لئے کہ اسے اندیشہ تھا کہ اس کی عمر دیکھتے ہوئے ایڈیٹر اسے ایسے اہم مسائل پر قلم فرسائی کرنے کے قابل نہ سمجھیں جن پر وہ لکھا کرتا تھا۔ مثلاً پردہ یا قومی و ملکی مسائل وغیرہ۔

عباس نے ۱۹۳۵ء میں وکالت کا امتحان بھی پاس کر لیا لیکن اس کی رائے میں تبدیلی نہ آئی۔ اس کے والد اس کے جرنلزم کا پیشہ اختیار کرنے کے خلاف تھے اس لئے نہ ان کا خیال تھا کہ اس کام میں سچائی، بہادری اور بے خوفی سے حق بات کہنے کا نتیجہ اکثر قید و بند کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا اور یہ وہ جانتے تھے کہ عباس نڈر اور سچا ہے اور خود ان کی دلی تمنا تھی کہ وہ ہمیشہ ایسا رہے مگر باپ کی محبت انہیں مجبور کرتی تھی کہ وہ اسے کسی کم پُرخطر راستے پر ڈالیں۔ اس کی والدہ اپنی ممتا سے مجبور اسے اپنے سے ہزار میل دور بمبئی بھیجنے پر کسی طرح تیار نہ تھیں، اور یوں بھی وہ اس کی آئندہ زندگی کے متعلق جو خواب دیکھ رہی تھیں وہ اس کے موجودہ فیصلے میں پورے ہوتے نظر نہ آتے تھے لیکن عباس کی ضد اور خوشی پر باپ کی تمنا اور ماں کی ممتا کو ہار ماننی پڑی اور عباس نے بمبئی جا کر بریلوی صاحب مرحوم کے ساتھ "بمبئی کرانکل" میں سب ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کرنا شروع کر دیا۔ عباس کے "اونچے" مستقبل سے جس کے معنی اس وقت اونچی سرکاری نوکری اور بہت سے پیسے کمانے کی صلاحیت سمجھے جاتے تھے، لوگ مایوس ہو گئے۔ اور بعض لوگ جو اس سے قریبی رشتے کے خواہش مند تھے اس سے مایوس ہو کر روگرداں ہو گئے۔ مگر عباس کو ایک لمحے کے لئے اس کا افسوس نہ ہوا۔ عباس نے اپنی شریکِ زندگی کا جو تصور قائم کیا تھا وہ ایک ایسی عورت کا تھا جو اسی کی طرح قوم پرست، جفاکش اور اس کے کندھے سے کندھا ملا کر چلنے والی تھی جسے زندگی کی سختیاں اور مشکلات ہرا نہ سکیں۔

"بمبئی کرانکل" میں عباس نے تقریباً نو دس سال تک باقاعدہ کام کیا۔ یہی زمانہ تھا جب اس کی صحافتی اور ادبی صلاحیتوں کو پورا پورا ابھرنے اور پھلنے پھولنے کا موقع ملا۔ اس زمانے میں اس نے بہت سے مضامین اور افسانے لکھے اور وہ مقبول افسانہ نگار اور محبوب جرنلسٹ بن گیا۔

جیسا کہ ہم نے پہلے کہا وہ پکا نیشنلسٹ اور آزادی کا پرجوش حامی تھا اور اس کی تحریروں میں یہ رنگ پوری طرح ظاہر ہے۔ اس کے اخباری آرٹیکل بھی اسی طرز کے ہوتے تھے۔ بدیسی حکومت اس سے خار کھاتی تھی اور اسے جیل خانے میں ڈالنے سے بھی دریغ نہ کرتی۔ خود عباس کو نہ صرف یہ کہ قید سے خوف نہ تھا بلکہ خواہش تھی کہ ملک کے لئے یہ قربانی دے سکے لیکن اپنے اصول پرست باپ کی محبت اور عاشق زار ماں کی ممتا نے اسے شعوری یا غیر شعوری طور پر اتنا محتاط رکھا کہ وہ اس منزل سے بچ گیا۔

عباس کی سب سے پہلی تصنیف "محمد علی" سنہ ۳۲ء میں شائع ہوئی۔ یہ مولانا محمد علی کی مختصر سوانح حیات تھی۔ محمد علی عباس کے نوجوانی کے ہیرو تھے۔ اور اس نے اس چھوٹی سی کتاب میں ان کی جن صفات کو پورے جوش اور عقیدت سے بیان کیا ہے وہ وہی ہیں جن کا عکس کسی نہ کسی حد تک خود عباس میں کے اندر نظر آتا ہے۔ اس کا پہلا افسانوی مجموعہ "ایک لڑکی" تھا جس کے ایک افسانہ میں پردے کی سخت مخالفت کی گئی تھی۔ قدامت پرست حلقے میں اس کی بڑی مخالفت ہوئی۔ خود اس کے والد کو یہ افسانہ پڑھ کر بہت افسوس ہوا مگر عباس مجبور تھا۔ جس بات کو وہ حق سمجھے اسے کہنے سے باز نہیں رہ سکتا۔ اس کے بعد سے اب تک عباس کے بہت سے افسانوں کے مجموعے (زعفران کے پھول، پاؤں میں پھول، اندھیرا اجالا، کہتے ہیں جس کو عشق) اور کئی ڈرامے (زبیدہ، یہ امرت ہے، چودہ گولیاں) اور مسافر کی ڈائری (سفرنامہ) اردو میں شائع ہو چکے ہیں۔ مگر وہ صرف اردو کا نہیں انگریزی کا بھی ادیب ہے اور بڑی بے تکلف اور رواں زبان لکھتا ہے۔ انگریزی میں اس کی کئی کتابیں شائع ہو کر مقبول ہو چکی ہیں۔ اس کے علاوہ اس کی متعدد چیزوں کے ہندوستان کی بہت سی زبانوں میں ترجمے ہوئے ہیں۔ مغربی زبانوں میں بھی (علاوہ انگریزی کے) روسی، چیک اور جرمن زبان میں اس کی کتابیں چھپی ہیں۔ چند برس ہوئے اس نے ایک ناول اردو اور انگریزی میں "انقلاب" کے نام سے لکھنا شروع کیا تھا۔ اب وہ مکمل ہو چکا ہے مگر ابھی تک اردو یا انگریزی میں نہیں چھپ سکا البتہ جرمن زبان میں ترجمہ ہو کر عنقریب شائع ہونے والا ہے اور حال کی اطلاع یہ ہے کہ روسی زبان میں بھی شائع ہونے والا ہے۔ عباس بہت سی کتابوں کا مصنف ہے لیکن ان میں کسی مستقل تصنیف کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ یہ متفرق افسانوں، ڈراموں اور مضامین کے مجموعے ہیں یا سفرنامے۔ اس کا ناول ابھی تک اردو داں طبقے تک نہیں پہنچا ہے اور اب تو فلمی مصروفیات نے اس کا وقت اس طرح گھیر لیا ہے کہ آئندہ کے لئے یہ امید پیدا نہیں ہوتی کہ وہ بیٹھ کر دل جمعی سے تصنیف و تالیف کا کام کر سکے گا۔

عباس کو بچپن سے سفر کا شوق تھا۔ پانی پت سے باہر کہیں جانا ہوتا تو شوق اور خوشی سے بے خود ہو جاتا۔ دلی، علی گڈھ، بمبئی اور ہندوستان کے دوسرے شہر سیاحت کی اس پیاس کو بجھا نہ سکے۔ سنہ ۳۴ء میں علی گڈھ کالج کے لڑکوں کی ایک جماعت افغانستان گئی۔ عباس نے بہت چاہا کہ اسے بھی پاسپورٹ مل جائے مگر بدیسی حکومت نے ایسے "باغی" نوجوان کو باہر جانے نہ دیا۔ عباس کو بڑی مایوسی ہوئی مگر ہمت نہ ہاری۔ بمبئی آکر بھی یہ کوشش جاری رکھی کہ اسے باہر جانے کے لئے پاسپورٹ مل جائے۔ آخر سنہ ۳۸ء میں اس کی یہ آرزو پوری ہوئی بمبئی کی نئی کانگرس وزارت کی بدولت اسے دنیا کے سفر کی اجازت مل گئی۔ روپیہ کا مسئلہ بھی خاصا دشوار تھا۔ نہ عباس کے پاس کچھ تھا نہ اس کے والد کے پاس اتنا سرمایہ کہ آسانی سے اس خرچ کو برداشت کر سکتے۔ بہرحال اس نے کچھ عزیزوں دوستوں سے قرض لیا، کچھ والد نے مدد کی، کچھ خود جمع کیا اور چند ہزار روپے فراہم کر کے سفر پر روانہ ہو گیا۔ وہ بے حد خراج ہونے کے ساتھ ساتھ جفاکش بھی ہے اور ہر قسم کی تنگی اور سختی سہہ سکتا ہے۔ اسی لئے وہ اتنے تھوڑے روپے سے ساری دنیا کو دیکھنے کا عزم لے کر نکلا اور پانچ مہینے میں قریب قریب ساری دنیا کا ایک چکر لگا کر اور سترہ ملکوں میں رہ کر جن میں چین، جاپان، امریکہ، کینیڈا، یورپ کے مختلف ممالک اور ایشیا کے اسلامی ملک بھی شامل تھے، واپس آیا۔ اس نے اپنے اس سفر کے حالات و تجربات اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں لکھے ہیں۔ "مسافر کی ڈائری" چھپ

نہیں کر سکتا تھا اور وہ اکیلا نہ تھا۔ غرض وہ اس سارے زمانے میں وہیں رہا، کھلے بندوں رہا، اپنے اہل خاندان کے ساتھ رہا جو پانی پت سے کسی طرح جان و آبرو بچا کر بمبئی پہنچ گئے تھے۔ خطرے آتے رہے اور ٹلتے رہے اور خدا کی مہربانی سے عباس کا یا اس کے کسی عزیز یا ساتھی کا بال تک بیکا نہ ہوا۔

عباس نے اس زمانے میں کئی ڈرامے ایسے لکھے جن کا مقصد امن و شانتی کی فضا پیدا کرنا اور انسانیت و محبت کی برادری کے خیالات کو پھیلانا تھا۔ یہ ڈرامے بمبئی میں جگہ جگہ اسٹیج کئے گئے اور انہوں نے بڑا گہرا اثر ڈالا۔ اس نے متعدد افسانے بھی فسادات کے موضوع پر لکھے جو ہندوستان اور پاکستان کے رسالوں میں چھپے۔ ان میں ایک افسانہ "سردارجی" تھا۔ جس کا پلاٹ صرف اتنا تھا کہ دہلی میں ایک مسلمان کو ایک سکھ بڈھا اپنی جان پر کھیل کر بچاتا ہے۔ اس افسانے میں حقیقت کا عنصر غالب تھا۔ یہ واقعہ اس کے ایک قریبی عزیز کو پیش آیا تھا جسے عباس نے افسانوی رنگ آمیزی کے ساتھ پیش کیا تھا۔ اس کا مقصد یہ دکھانا تھا کہ ہر مذہب و قوم میں نیک اور رحم دل اور خدا ترس لوگ ہوتے ہیں جو اپنی جان پر کھیل کر دوسروں کی مدد کر سکتے ہیں۔ عباس خود مسلمان ہے اس لئے قدرتی طور پر مسلمانوں پر اس نے زیادہ سخت تنقید کی تھی لیکن ستم ظریفی کی بات یہ کہ یہ افسانہ اچھا خاصا ایک ہنگامہ بن گیا۔ ہندی رسالے "مایا" نے اسے شائع کیا تو کچھ سکھ حضرات نے ایما سے اس رسالے اور مصنف دونوں پر مقدمہ دائر کر دیا گیا کہ اس کا مقصد سکھوں کو ذلیل کرنا اور آپس میں نفرت و عداوت کے جذبات بھڑکانا ہے۔ دوسری طرف پاکستان کے بعض رسالوں نے اسے شائع کیا تو لوگوں نے اسے مسلمانوں کے خلاف قرار دیا اور مسلمان دشمنی سے تعبیر کیا۔ اس زمانے میں دونوں طرف کے بعض اخبار و رسالوں نے کچھ بے خبری اور کچھ تعصب سے ایسی ایسی بے پر کی اڑائیں، وہ وہ باتیں عباس کے بارے میں لکھیں جو کہ سر تا پیر [illegible]۔ کئی مہینے تک یہ مقدمہ چلتا رہا اور اس سلسلے میں متعدد ہندی اردو کے اخبارات [illegible] نے اسے شائع کیا۔ آخر کار یہ مقدمہ گورنمنٹ نے واپس لے لیا۔ لیکن اس دوران میں اس افسانے کی اتنی اشاعت اور عباس کی اتنی شہرت ہو چکی ہوگی جو اور کسی طرح ممکن نہ تھی۔

فسادات پر اردو میں ہر انسان دوست ادیب اور شاعر نے کچھ نہ کچھ اپنے اپنے انداز میں لکھا ہے اور انسانیت کو فنا ہونے سے بچانے اور امن و محبت کی فضا پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ رامانند ساگر نے اسی موضوع پر ایک ناول "اور انسان مر گیا" کے نام سے لکھا جس کا مقدمہ عباس سے لکھوایا۔ عباس فسادات کے دوران میں اسی مسئلے پر غور کرتا رہا تھا کہ اس خون خرابے اور شیطانی حرکات کی جو لوگوں نے اس دوران میں کیں، آخر کیا وجہ ہے؟ وہ یہ تو مانتا تھا کہ بدیسی حکومت آپس میں لڑوا کر اپنا اقتدار قائم رکھنا چاہتی تھی مگر یہ نہیں مانتا تھا کہ ان فسادات کے سلسلے میں جرائم کرنے والے خود معصوم ہیں۔ وہ سوچتا تھا کہ جب تک ہماری قوم میں خود یہ جراثیم موجود نہیں تھے کوئی خارجی پیر ایسا مہلک اثر نہیں ڈال سکتی تھی۔ اس ناول کے مقدمہ میں اس نے اپنے اسی خیال کو ظاہر کیا اور لکھا کہ لوگ خود اپنے گناہ سے یہ کہہ کر نہیں بچ سکتے کہ کسی دوسری طاقت نے ہمیں یہ کرنے پر مجبور کیا تھا۔ بات بظاہر معمولی تھی اور عام طور پر لوگ اس رائے سے متفق نظر آتے تھے لیکن اس وقت اس مقدمہ پر ترقی پسند حلقے سے اس کے خلاف ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ یہ وہ دور تھا جب ہندوستانی کمیونسٹ اور ان کی ہم خیال پارٹیاں انتہا پسندی کی طرف مائل تھیں۔ ترقی پسند تحریک کے بہت سے ذمہ دار لیڈر جیل کی ہوا کھا رہے تھے اور تحریک کچھ نئے، جوشیلے اور انتہا پسند نوجوانوں کے ہاتھ میں آگئی تھی۔ ہر شخص پر جو ان کے اصول سے ذرا ادھر یا ادھر ہٹتا تھا رجعت پرستی اور بورژوائی ہونے کا الزام عائد کر کے سخت احتساب کیا جاتا تھا۔ عباس ابتدا سے ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہا تھا۔ وہ کمیونسٹ نہ تھا مگر ان کا دوست، ہمدرد اور بہی خواہ ہمیشہ رہا۔ وہ ان پر نکتہ چینی کرتا تھا مگر دوستانہ۔ اور اس کے سب ساتھی اس کے خلوص اور حق گوئی کو جانتے اور قدر کرتے تھے۔ لیکن اس وقت زمانے کا رخ ہی اور تھا۔ عباس پر بڑی بڑی سخت تنقیدیں کی گئیں۔ معقول قسم کے اعتراض ذمہ دار اور معقول لوگوں کے تھے لیکن اس وقت تو ہر کوئی پورے جوش سے اس کی مخالفت کر کے اپنے "ترقی پسند" ہونے کا ثبوت دینے پر تل گیا تھا۔ لہٰذا کوئی ممکن اور ناممکن الزام ایسا نہ تھا جو اس پر نہ لگایا گیا ہو۔ اس کو انگریزوں کا پٹھو، رجعت پرست، کانگریس کا گماشتہ، عوام کا دشمن سبھی کچھ تو کہا گیا۔ الزام کے اور اس کے

خاندان والوں کے کیریکٹر تک پر حملہ کرنے اور گندگی اچھالنے سے لوگ دم چڑھ گئے۔ عباس شروع میں ان ادبی جلسوں میں بحث مباحثہ کر کے اور اپنی اونچی آواز سے دوسروں کی آوازوں کو دبانے اور سمجھانے کی کوشش کرتا رہا۔ اسے حیرت تھی کہ اس نے کون سی ایسی بات کہہ دی ہے کہ ؎

اعتراضوں کا زمانے کے ہے ساقی پر نچوڑ
شاعر اب ساری خدائی میں ہے کیا ایک ہی شخص!

لیکن اس نے یہ نہیں مانا کہ وہ غلطی پر ہے۔ عباس کی حمایت میں اس وقت کوئی اگر منہ کھولنے کی جرأت کرتا تو فوراً اس پر بھی یہ سب الزام عائد کئے جاتے تھے لیکن رفتہ رفتہ طوفان دھیما پڑا، مخالفت، دل آزاری و بدگمانی کے بادل چھٹنے لگے۔ سیاسی پالیسی بدلنے کے ساتھ ساتھ عباس کا خلوص اور نیک نیتی پھر تسلیم کر لی گئی اور اب پھر عام طور پر اسے عوام دوست اور ترقی پسند سمجھا جانے لگا ہے۔

عباس کے ذہن میں عرصے سے ایک آسان ہندی کا رسالہ جاری کرنے کی خواہش تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ شیریں، سہل اور رسیلی اُردو اور ہندی میں ایک عمدہ رسالہ نکالا جائے۔ آخر ——— "سرگم" کے نام سے یہ رسالہ نکلا جو ادب، آرٹ، شاعری، فلم اور ڈراما کا معجونِ مرکب تھا۔ یہ رسالہ خاص طور پر جنوبی ہند میں بہت مقبول ہوا اور اس نے مداحوں کا خاصا وسیع حلقہ پیدا کر لیا۔ عباس کے مضامین اور افسانے و سوال جواب، کرشن چندر کا ناول اور بعض دوسرے مشہور ادیبوں کی چیزیں اس میں شائع ہوتی تھیں۔ مالی لحاظ سے وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ ایک زبوں بھی اُردو ہندی کے جریدے کب اپنا بار خود اٹھا سکے ہیں اور پھر عباس کی کاروبار سے ناواقفیت اور ہر کس و ناکس پر بھروسا کرنے کی عادت نے بہت جلد اسے بٹھا دیا۔ وہ جو کچھ کماتا "سرگم" میں جھونکتا رہا لیکن ساری کوششوں کے باوجود وہ اس کے بار کو نہ اٹھا سکا اور آخر کار اسے ——— "سرگم" بند کرنا پڑا۔ صحافت کی خدمت کرنے والے جانتے ہیں کہ اپنے رسالے سے مدیر کو کس قدر لگاؤ ہوتا ہے۔ عباس نے "سرگم" بند کیا تو اسے ایسا صدمہ ہوا جیسے کسی باپ کو اپنے ہونہار بچے کے دفن کرتے وقت ہوتا ہے لیکن وہ غم کو پالنے کا عادی نہیں اور نہ ہار مانتا ہے۔ فوراً اس کے دماغ نے ایک نئی اسکیم کو جنم دیا اور اس نے "نیا سنسار" نامی ایک فلم کمپنی بنا ڈالی۔ اس سے پہلے اس کی لکھی ہوئی کہانی "آوارہ" خاصی قبول ہو چکی تھی۔ اس کمپنی نے اب تک تین فلم "انہونی" "راہی" اور "منا" بنائے ہیں۔ یہ فلم ایک لحاظ سے بہت کامیاب ہیں۔ اس لئے کہ اپنی بعض خامیوں کے باوجود خوش مذاق اور سمجھدار طبقے میں انہیں بہت پسند کیا گیا لیکن ان کو بھی وہ قبولیت حاصل نہ ہو سکی جو کاروباری لحاظ سے ضروری ہے۔ کچھ ان فلموں کا معیار دوسرے عام پسند فلموں سے مختلف ہے اور کچھ عباس کاروبار سے ناواقفِ محض ہے اور آج وہ اتنی فلمیں بنانے کے باوجود قلاش ہے مگر اس کو نہ اس کا رنج ہے نہ اس سے مایوسی، وہ اب بھی کئی فلمیں بنانے کے خیال میں لگا ہوا ہے۔

سنہ ۱۹۵۱ء میں نئے چین کی سالگرہ میں شرکت کرنے کے لئے چینی حکومت کے بلاوے پر ایک ڈیلی گیشن ہندوستان سے چین گیا۔ اس میں احمد عباس کو بھی مدعو کیا گیا تھا لیکن لطف کی بات یہ ہے کہ جس طرح بدیسی حکومت عباس کو دوسرے ملکوں میں بھیجنے سے ڈرتی تھی، اپنی قومی حکومت بھی (جس قوم کی خدمت وہ دس سال کی عمر سے کر رہا ہے) اسے "مشکوک" آدمی ہی سمجھتی ہے۔ اسے پاسپورٹ ملنے میں سخت مشکل کا سامنا ہوا اور اتنی دیر لگ گئی کہ ڈیلی گیشن روانہ ہو گیا۔ پھر دو تین ہی دن بعد چینی حکومت کے اصرار اور پنڈت نہرو کے ایما پر عباس کو فوراً پاسپورٹ بھی دیا گیا اور اسے خاص اہتمام کے ساتھ چینی سرحد تک پہنچایا گیا جہاں چینی اسپیشل ٹرین نے اور چینی ہوائی جہاز نے جس میں یہ اکیلا مسافر تھا، اسے عین سالگرہ کے دن پیکن پہنچا دیا۔ حسبِ عادت عباس نے نئے چین کو بہت غور سے دیکھا۔ بہت سے لوگوں سے ملا۔ وہاں کے حالات معلوم کئے، چینیوں سے دوستیاں کیں اور اپنے لکھنے کے لئے نیا مواد اور نئے منصوبے لے کر ہندوستان واپس آیا تو اس کی زبان چین کی تعریف کرتے نہ تھکتی تھی۔ اس سفر سے اس نے اور جو کچھ بھی

نہ نفیس کھانوں کا شوق ہے اور نہ عیش و آرام کا۔ لیکن اس کے باوجود اس کے پاس پیسہ نہیں رہتا۔ اول تو وہ دوسروں کی پریشانی اور تکلیف نہیں دیکھ سکتا۔ دوسرے چال باز اور زمانہ ساز دوست بڑی آسانی سے اس سے سینکڑوں روپے اینٹھ سکتے ہیں جب کہ گھر کی اشد ضرورت کے لئے دس بیس خرچ کرنے میں وہ سوچ بچار کر رہا ہے۔ پھر بڑا کام جس زمانے میں وہ کرتا ہے۔ اسے مالی نقصان سے اکثر گھاٹا ہوتا ہے اور اس کی کمائی کا بیشتر حصہ اس میں جھونک دیا جاتا ہے۔ تحفے لانے اور دینے کا بے انتہا شوق ہے۔ سب ضرورتوں پر ہمیں کچھ بھی خرچ نہ کر رہا ہو اس وقت بھی وہ کہیں جائے تو وہاں سے سینکڑوں کے تحفے لے آتا ہے۔ پھر یہ تحفے مخصوص لوگوں کے لئے نہیں۔ چیزیں رکھی ہیں۔ اس کے دوست، آشنا، ملنے جلنے والے آتے ہیں، جس کو جو پسند آیا اٹھا کر لے گیا۔ میاں عباس بہت خوش ہیں کہ ان کی لائی ہوئی چیزوں کی تعریف ہو رہی ہے۔ کسی نے کہہ دیا کہ یہ کیا طریقہ ہے چیزیں برباد کرنے کا تو وہ برہم ہو جائے گا۔ وہ پھٹے کپڑے اور پرانا جوتا پہنے پھرا ہو اس لئے کہ ان کاموں کے لئے اس کے پاس پیسے بہت کم نکلتے ہیں، مگر کوئی فرمائش کرے تو جھٹ سینما دکھانے لے جائے گا۔ بچوں کو آئس کریم کھلانے ہی میں کہیں نہیں روپے خرچ کر دے گا۔ بے دھڑک قرض لیتا ہے جس کے ادا کرنے کی فکر میں خواب و خور حرام کر لیتا ہے اور دن رات کام کرتا ہے۔ بے تحاشا قرض دیتا ہے جس کے واپس لینے کا خود اسے تو کبھی خیال آتا ہی نہیں اگر کوئی دوسرا بھی توجہ دلائے تو بگڑ جاتا ہے اور لینے والے کو بھی بہت کم اسے واپس کرنے کا دھیان آتا ہے۔ اس کے پاس ٹیکسی کے کرائے کے پیسے نہ ہوں گے اور وہ کلکتہ، چین یا روس جانے کا پروگرام بنا رہا ہو گا۔ بنک میں ہزار پانسو جمع نہ ہو لیکن لاکھوں کی فلمیں بن رہی ہوں گی۔ ہر کا خط بھیجنے میں بخل کرے گا اور پچاس کا تحفہ آسانی اور خوشی سے نذر کر دے گا۔ وہ روپیہ کمانا جانتا ہے مگر نہ ڈھنگ سے خرچ کرنا جانتا ہے نہ اس کا رکھنا۔ اس کے پاس اپنا گھر نہیں، اپنی موٹر نہیں، گھر میں عمدہ ساز و سامان نہیں۔ اپنے [illegible] کافی کپڑے نہیں، بیوی کے پاس زر و زیور نہیں۔ صرف ایک چیز ہے جس کے جمع کرنے کا عباس کو انتہا سے زیادہ شوق ہے اور وہ ہیں کتابیں۔ کوئی اچھی کتاب دنیا کے کسی کونے میں چھپے، کسی قیمت کی ہو عباس جب تک اسے منگا نہ لے گا اسے چین نہ آئے گا۔ اگرچہ اس کی ان [illegible] کتابوں کو اس کے "کرم فرما" نہیں چھوڑتے ——— اس لئے ——— کہ اس کا اصول ہے کہ اس کے گھر کی ہر چیز دوسروں کی بھی ہے۔ "مجھے تو نجی ہی چیزیں رکھنے سے نفرت ہے۔ جس کو ضرورت ہو وہ لے جائے" اور اس کی ہزاروں کتابیں اسی طرح ضائع ہو چکی ہیں لیکن اب بھی جو چیز اس کے گھر میں نظر آتی ہے وہ کتابیں ہیں۔ عباس کو اپنے اور بیوی کے لئے گھر کی ضرورت نہیں۔ لیکن ان کتابوں کی خاطر اسے گھر ——— خاصا بڑا گھر ——— لینا پڑتا ہے۔ اس لئے کہ اس کو تو ہر شخص ساتھ رکھنے پر تیار ہو جاتا ہے لیکن ان بیسیوں الماریوں اور ہزاروں کتابوں رسالوں کے ڈھیر کی مہمان داری کون کرے؟

عباس ذہین ہوتے ہوئے بھی خطرناک حد تک سادہ لوح ہے۔ دنیاوی چال فریب سے ناواقف محض۔ اسے بڑی آسانی سے لوگ اپنے فریب کے جال میں پھنسا لیتے ہیں۔ مردم شناسی کا مادہ اس میں بہت کم ہے اور لوگوں کی ظاہری محبت و خلوص اور ہمدردی سے بڑی جلدی متاثر ہو جاتا ہے پھر جب آخر کار دھوکے بازوں کے دھوکے سے آگاہ بھی ہو جائے تو مروت کے باعث اس سے نکلنے کی کوشش نہیں کرتا۔ اس پر جب کسی ایسے ابن الوقت "دوست" یا "کرم فرما" کا حال کھلتا ہے تو مدتوں اس کا غم کرتا ہے لیکن پھر اسے معاف بھی کر دیتا ہے۔

عباس بڑا جذباتی، نرم دل اور حساس ہے مگر اپنے کو بہت سخت دل اور جذباتی محبت سے بیگانہ سمجھتا ہے۔ اظہارِ محبت و تحسین سے بہت گھبراتا ہے اور اسے "FUSS" کہتا ہے اور مذاق اڑاتا ہے۔ گھر پر اس کی ذرا سی خاطر یا خیال کیجئے تو وہ بجائے خوش ہونے کے الٹا جھنجلائے گا۔ اور ڈانٹے گا کہ "مجھے یہ نخرے نہیں بھاتے"۔ لیکن اصل میں وہ محبت و مدح سے بہت متاثر ہوتا ہے بشرطیکہ اس کا کرنے والا اس کے مزاج کے انداز کو جانتا ہے۔ اس میں بچپن سے احساسِ کمتری کا ایک چھپا ہوا مادہ ہے اور اس لئے زمانہ ساز اور چال باز دوستوں کے بناوٹی خلوص، مداحوں کی مدح سرائی اور بینت کی جذباتیت، اس کے دل کی گہرائیوں میں برتری کے احساس کو ابھارتی اور اسے تسکین دیتی ہے۔ وہ اس قسم کے نمائشی خلوص کو سچا خلوص سمجھ لیتا ہے۔ اس کی اسی سادہ لوحی کی بدولت دوسروں نے بڑے بڑے فائدے اور عباس نے بڑے بڑے نقصان اٹھائے ہیں۔ بدنامی، دکھ اور غم سہا ہے عباس

فرشتہ نہیں انسان ہے۔ اس میں بہت سی خامیاں ہیں۔ اس سے لغزش بھی ہو سکتی ہے لیکن وہ جہاں دوسروں کی غلطیوں کو آسانی سے معاف کر سکتا ہے اپنی کسی لغزش کو معاف کرنا اس کے لئے بڑا کٹھن ہے اور اس کی گہری ندامت اور کڑا احتساب نفس اور دلی رنج اس کے قصور کو دھو سکتا ہے۔

عباس بظاہر گھر اور خاندان کے حالات سے بیگانہ، بےپروا اور سخت دل انسان نظر آتا ہے لیکن جن لوگوں نے اسے اپنے والد کی آخری بیماری میں خدمت کرتے دیکھا ہے، اسے سالہا سال اپنی والدہ کی تکلیف میں ان کے ساتھ راتوں کو جاگتے اور ان کے دکھ پر اپنا دل خون کرتے پایا ہے، اپنے بھائی کی بیماری میں ساری ساری رات جاگ کر اور سارے کام کاج چھوڑ کر تیمارداری میں محو پایا ہے، جنہوں نے اسے اپنی بیوی کی بیماری میں خواب و خور حرام کر کے آٹھ آٹھ دن پلنگ کی پٹی سے لگے دیکھا ہے وہ جانتے ہیں کہ اس "سخت دل" عباس کے ظاہری خول کے پیچھے ایک بہت نرم و نازک کھال ہے۔ اس کے دل میں صرف انسانیت کی اور ملک و قوم کی محبت ہی نہیں، صرف ادب و آرٹ کی خدمت کی لگن ہی نہیں بلکہ دوستوں اور عزیزوں کی محبت، بیوی کا گھر، پیار اور ماں سب سے سچا لگاؤ موجود ہے البتہ اس کا اظہار ہر وقت نہیں بلکہ کسی ایسے ہی سخت وقت پر ہوتا ہے۔

عباس کے اپنے کوئی بچہ نہیں لیکن بچوں سے اسے بڑی محبت اور دلچسپی ہے۔ وہ ان میں مل کر خود بھی بچہ بن جاتا ہے اور ایسی حرکتیں کرتا ہے کہ بچے اسے بالکل اپنا ہم سن دوست سمجھ لیتے ہیں۔ صرف بچوں پر ہی منحصر نہیں نوعمر لڑکے لڑکیوں سے بھی وہ چند منٹ میں بے تکلف ہو سکتا ہے۔ وہ ان سے مذاق کرے گا، ڈانٹے گا، بحث مباحثہ کرے گا اور چیخے چلائے گا۔ بالکل اس طرح جیسے اپنی عزیز لڑکیوں لڑکوں کو کرتا ہے۔ اس کی یہ طفلانہ حرکتیں اور بے تکلفانہ انداز اسے بچوں اور نوجوانوں میں یکساں محبوب بنا دیتے ہیں۔ یوں بھی عباس جس محفل میں پہنچ جائے اس پر عام طور پر چھا جاتا ہے۔

عباس پردے کا سخت مخالف ہے لیکن اسے عورتوں کے ننگے لباسوں، کھلے سر اور شوخ سنگاروں سے اس سے زیادہ نفرت ہے۔ وہ عورت کو مرد کے مساوی درجہ دیتا ہے مگر سوسائٹی کی شوخ و شنگ نمائش کی دلدادہ عورتوں کو کبھی عزت کی نظر سے نہیں دیکھ سکتا۔

وہ بڑے سے بڑے خطرے کا مقابلہ کر سکتا ہے مگر بلی اور چوہے سے ڈر جاتا ہے۔ کھلی ہوئی ٹھنڈی ہوا سے ڈرتا ہے اور بادل کی گرج سے گھبراتا ہے۔ بڑے سے بڑے آدمیوں کے رعب میں نہیں آتا، بڑے سے بڑے بزرگ کا کہنا ٹال سکتا ہے لیکن کوئی کمسن بچہ، کوئی الھڑ لڑکی بڑی آسانی سے اس سے اپنی بات منوا سکتی اور اپنا رعب جما سکتی ہے۔

عباس میں بہت سی کمزوریاں ہیں لیکن یہ سب وہ ہیں جن سے زیادہ تر اسے خود تکلیف اور نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ اس میں خودسری ہے، ضد ہے، ہٹ دھرمی ہے مگر اس لئے کہ وہ اپنی ذات کو قوم اور ملک، ادب اور آرٹ کی خدمت کے لئے مٹا دینا چاہتا ہے۔ اس کے چاہنے والے اسے سوچ سمجھ کر، دیکھ بھال کر، اونچ نیچ کا خیال کر کے کام کرنے کا مشورہ دیتے ہیں اور جب وہ ان کی نہیں سنتا تو اس سے ناراض ہو جاتے ہیں۔ اس کی بے اصولی سے اور لاابالی حرکتوں سے کڑھتے ہیں لیکن عباس کی محبت کو دل سے کم نہیں کر سکتے۔ اس کی شخصیت میں کچھ ایسی کشش، اس کے تبسم میں کچھ ایسا جادو، اس کی نگاہوں میں ایسا اثر اور اس کی باتوں میں خلوص اور سچائی کی ایسی بو باس ہے کہ لوگ اسے چاہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

ممتاز مفتی

مسعود قریشی

"او نئیں جی۔ ایہہ گل نئیں"

دیکھئے صاحب اس جملے پر بدکئے نہیں۔ مفتی کا اس جملے سے یہ مطلب نہیں کہ وہ آپ کی بات کو لغو سمجھتا ہے۔ اور آپ سے متفق نہیں۔ یہ تو محض اس کا انداز تخاطب ہے۔ آخر مخاطب کرنے کے لئے کوئی مجہول جملہ تو کہا ہی جاتا ہے نا۔ "دیکھئے صاحب" "سنئے صاحب" "میں کہتا ہوں" یا کچھ اور۔ بس مفتی کا بھی یہ اسی قسم کا تخاطبیہ جملہ ہے۔ ویسے میں آپ سے متفق ہوں کہ تخاطبیہ جملے کے طور پر یہ الفاظ کچھ زیادہ موزوں نہیں۔ بلکہ زیادہ موزوں نہیں کیا بالکل ناموزوں ہیں۔ خواہ مخواہ دوسرا آدمی چڑ جاتا ہے۔ ایک قسم کی ضد پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن اگر آپ مفتی کو جانتے ہیں تو یہ ضد پیدا ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور اگر آپ کی پہلی ملاقات ہے تو اس کی شخصیت اور گفتگو میں اپنانے کے لئے کئی اور پہلو موجود ہیں۔ اب آپ سے کیا چھپاؤں۔ پہلی ملاقات ہے تو اس کی شخصیت ہیں اس سے یہ جملہ سن کر مجھے خود بڑا غصہ آیا تھا۔ دیکھئے نا پہلی ملاقات میں تو انسان ملاقاتی سے ہر ممکن طور پہ متفق ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ ابھی کل کی بات ہے میری موجودگی میں دو دوستوں کا تعارف ہوا۔ اور وہ دونوں شرفا کی طرح ایک دوسرے کو اپنانے کے لئے ہر بات میں متفق ہونے کی کوشش میں مصروف ہو گئے۔ بات چیت کا انداز کچھ مذاقی سا تھا۔ چنانچہ ایک صاحب جو کافی بڑے افسر تھے اور اس لئے بلا کسی خطرے کے اپنی نالائقی کی داستانیں سنا سکتے تھے۔ کہنے لگے کہ وہ میٹرک میں تین دفعہ فیل ہوئے۔ دوسرے صاحب شومئی قسمت سے کلرک قسم کی چیز تھے۔ اس لئے ان پر واجب تھا کہ اپنی واقعی یا مفروضہ ذہانت کے قصے سنانے۔ اور وہ شاید ابھی کرتے تھے۔ لیکن پہلی ملاقات کا سوال تھا۔ شرافت کا تقاضا تھا کہ اتفاق کی راہ نکالی جائے۔ چنانچہ انہوں نے بھی کہا کہ وہ نویں جماعت میں چار دفعہ فیل ہوئے تھے۔ دونوں میں یہ بات بھی مشترکہ نکلی کہ بچپن میں کافی غربت میں زندگی گزری تھی۔ سکول سے عموماً ناغہ کیا کرتے تھے۔ استادوں کا ادب بالکل نہیں کرتے تھے۔ اور دونوں کی والدہ وفات پا چکی تھیں۔ افسر حضرت نے یہ بھی کہہ دیا کہ ان کے والد کی حال ہی میں وفات ہوئی ہے۔ دوسرے صاحب تھوڑی دیر کے لئے ٹھٹکے اور پھر نیچی نظروں سے فرمانے لگے "میرا والد بھی کئی بیماریوں میں مبتلا ہے اور چند ہی دنوں میں وفات پانے والا ہے۔"

دیکھئے نا پہلی ملاقات میں شریف لوگ تو اتفاق رائے کے لئے اس حد تک پہنچ جاتے ہیں۔ اور ایک یہ مفتی ہے کہ پہلی ہی ملاقات میں "او نئیں جی ایہہ گل نئیں" کا ٹھیٹھ پنجابی لٹھ مارتا ہے۔ چنانچہ پہلی ملاقات پر مجھے بھی بڑا غصہ آیا۔ لیکن مروت کی وجہ سے پی گیا۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ مروت کی ایک ہی نشانی ہے۔

کوئی کچھ کہے، کچھ کرے۔ بس خاموش رہو۔ لیکن جلد ہی مجھے اپنے غصے پر ہنسی آنے لگی۔ وجہ یہ کہ مفتی اپنے اس جملے کے باوجود مجھ سے اختلاف نہیں کرتا۔
دراصل قصہ یوں ہے کہ مفتی لاشعور کا دیوانہ ہے، اور اگر وہ بے شعور نہیں تو کم از کم اسے اتنی اہمیت نہیں دیتا۔ اس کے خیال میں بات کا اصل مطلب ظاہر الفاظ سے ہٹ کر ہوتا ہے۔ اور وہ یہ سمجھتا ہے کہ باقی لوگ بھی اس حقیقت کو سمجھتے ہوں گے۔ وہ کہی سے زیادہ "ان کہی" پر توجہ دیتا ہے۔ جب آپ اس سے بات کریں تو وہ عذر اس بات پر نہیں کرے گا جو آپ لفظوں کے قالب میں اس تک پہنچانے کی کوشش کر رہے ہیں بلکہ اس کی توجہ اس حصے پر ہوگی جو آپ حذف کر رہے ہیں۔ بات تو عجیب سی ہے لیکن حیرت ہے کہ اس کے باوجود اسے سمجھدار انسان کہا جا سکتا ہے۔
یہی حال اس کے افسانوں کے کرداروں کا ہے "آپا" تو آپ نے پڑھا ہی ہوگا۔ جی ہاں بڑی ہی پیاری کہانی ہے۔ سات زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ ویسے یہ سن کر آپ کو حیرت ہوگی کہ مفتی اسے اپنی بہترین کہانیوں میں شمار نہیں کرتا۔ اس بات میں تو وہ بالکل یوسف ظفر ہے۔ دونوں کو اپنی بہترین تخلیقات ہمیشہ بھول جاتی ہیں، اور اگر یاد ہیں تو وہ انہیں بہترین نہیں سمجھتے۔ یہ نقص صرف ان دو ادیبوں میں ہی نہیں بلکہ دنیا کے تقریباً ہر بڑے ادیب میں ہوتا ہے۔ شاید اس لئے کہ اپنی تمام تخلیقات میں انہیں تخیل اور جذبے کی وہ عظمت نظر آتی ہے جو ان کے ذہن میں تھی۔ لیکن لفظوں میں نہ ڈھل پائی اور قاری تک نہ پہنچ سکی۔ ہاں تو میں "آپا" کا ذکر کر رہا تھا۔ اس میں ایک کردار ہے "بھائی جان" وہ باتیں تو کرتے ہیں "بدو" سے لیکن مخاطب ہوتی ہے "آپا" بات تو کر رہے ہیں کھلونوں اور کریم کی اور مقصد ہے بازی محبت کا۔ حیرت یہ ہے کہ اس کی کہانیوں میں یہ انداز بہت بھلا معلوم ہوتا ہے۔ کرداروں کی اصل شخصیت پڑھنے والے پر آئینہ ہو جاتی ہے۔ لیکن گفتگو میں مفتی کا یہ انداز پوری طرح اپناتا نہیں۔ شاید اس لئے کہ باتوں میں مفتی خلوص سے بات کہنے کی بجائے SMART ہونے کی کوشش میں مصروف نظر آتا ہے اور SMART نظر آنے کی کوشش کرنے والے مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتے شاید اس لئے کہ میں خود اس کوشش میں عموماً ناکام رہتا ہوں!
افسانہ نگار مفتی نے تو جب سے ہوش سنبھالا، رسالوں، کتابوں کے ذریعے ملاقات رہی۔ شعور و لاشعور کی بھول بھلیاں تو نہ ہم اس وقت سمجھتے تھے نہ اب لیکن اس کے افسانے پڑھنے میں لطف بہت آتا تھا۔ عام افسانہ، ان کی عام باتیں، اور ان عام باتوں میں عام معنوں سے ہٹے ہوئے معنی، ڈھکے چھپے پہلو۔ اس کی ایک کہانی "نفرت" نہیں پڑھی آپ نے بھی۔ "ان کہی" میں ہے وہ کہانی۔ خیر میں سناتا ہوں۔ ایک گاڑی میں دو لڑکیاں سفر کر رہی ہیں ایک نازلی، حسین، شوخ، پردے سے نفرت کرتی ہے اور زرد رنگ سے عشق۔ دوسری لڑکی نجمہ، نازلی کی بھاوج اور اس کی سہیلی ہے۔ گاڑی ایک سٹیشن پر رکی

"لا حول ولا قوۃ"

میں نے نازلی کو لا حول پڑھتے سنا۔ دیکھا تو اس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا۔

"کیا ہے؟" میں نے پوچھا

اس نے انگلی سے پلیٹ فارم پر ایک بنچ کی طرف اشارہ کیا۔ بنچ پر بجلی کی روشنی کے نیچے دو نوجوان کھانا کھا رہے تھے۔

"توبہ۔ جانگلی معلوم ہوتا ہے۔ کیسے بھدے اعضاً ہیں" نازلی نے جھرجھری لی اور منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

"تم خواہ مخواہ کیوں پریشان ہو رہی ہو۔ جانگلی ہے تو پڑا ہوا کرے" میں نے کہا

"اسے کھاتے ہوئے تو دیکھنا۔ توبہ ہے" نازلی نے یوں کہا جیسے اپنے آپ سے کہہ رہی ہو

اس کا چہرہ ہلدی کی طرح زرد تھا۔ ہونٹ نفرت سے بھنچے ہوئے تھے۔

"توبہ" نازلی نے نحیف آواز میں کہا "اس کا بس چلے تو کچا ہی کھا جائے۔ کوئی مردم خور معلوم ہوتا ہے" ——

"مگر تم نے شادی سے انکار کیوں کیا؟" جانگلی کا ساتھی کہہ رہا تھا۔

بس اس لئے کہ مجھے بے پردگی سے سخت نفرت ہے (اور وہ پردہ نہیں کرتی تھی) آج کل کلباؤ سنگار مجھے قطعی پسند نہیں۔ آج کل

تو عورتیں یوں برقع اٹھائے پھرتی ہیں جیسے جنگل میں شکاری بندوقیں۔ ہاں، وہ لڑکی زرد دوپٹہ پہن سکتی ہے میں اسے اپنی بیوی نہیں بنا سکتا۔ مجھے زرد رنگ سے چڑ ہے۔"

اس شکوے سے آپ یہی سمجھے ہوں گے کہ نازلی کو اس گنوار سے شدید نفرت اور وحشت تھی، اور اس کی باتوں سے یہ نفرت شدید تر ہو گئی۔ لیکن نہیں صاحب۔ مفتی کے فلسفۂ زندگی میں الفاظ اور حرکات کا وہ مطلب ہرگز نہیں جو ظاہر کیا جا رہا ہو۔ بلکہ وہ جو چھپانے کی کوشش ہو رہی ہے۔ چنانچہ اصل کیفیت نازلی کے گھر پہنچنے پر کھلتی ہے۔

اگلے دن دوپہر کے قریب مظفر بھائی (نازلی کے شوہر) میرے دفتر کے کمرے میں تشریف لائے۔ ان کے چہرے پر پریشانی اور تشویش کے آثار تھے۔ کہنے لگے

"بھئی نازلی کو کیا ہو گیا ہے۔ کہیں مجھ سے ناراض تو نہیں؟"

"مجھے تو معلوم نہیں۔"

"خدا جانے کیا بات ہے۔ اس میں وہ پہلی سی بات ہی نہیں۔ آج صبح سے ہر بات کے جواب میں نہایت فرمانبرداری سے "جی ہاں، جی ہاں" ہو رہی ہے۔ نازلی اور جی ہاں۔ میں سمجھا مجھ سے ناراض ہے شاید۔"

"ویسے ہی طبیعت ناساز ہو گی۔"

"اگر طبیعت ناساز ہوتی تو کیا وہ باورچی خانے میں بیٹھی کام کرتی ہوتی۔ وہ تو صبح سے باورچی خانے میں حشمت کے پاس بیٹھی ہے۔ کہتی ہے میں کھانا پکانا سیکھوں گی۔"

دو قدم چل کر وہ رک گئے

"اور مزے کی بات تو میں تمہیں بتانا ہی بھول گیا۔ جانتی ہو نا اسے زرد رنگ سے کتنا پیار ہے۔ میں نے اس مرتبہ ایک نہایت خوبصورت زرد دوپٹہ اس کے لئے خریدا تھا۔ خیال تھا وہ دیکھ کر خوشی سے ناچے گی۔ مگر اس نے اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ وہیں کھونٹی سے لٹک رہا ہے۔"

(نفرت ——— ان کہی)

دیکھا آپ نے۔ یہ وہ دنیا ہے مفتی کے ہاں عام الفاظ اور حرکات کے برعکس معنی پہن لیتے ہیں۔ ان دنوں ہم سب دوست نہ صرف فرداً فرداً اس کے افسانے پڑھتے بلکہ چسکے کے لئے باجماعت اس کی تلاوت کرتے۔ فرائڈ کا نام ہم نے بنا بنا سنا تھا۔ ہمارے ایک دوست حبیب اللہ بیگ نے چسکے کے لئے ہیولاک ایلس کی کئی ہسٹریاں بھی پڑھی تھیں۔ چنانچہ سب لوگوں کا خیال تھا کہ مفتی بھی ایسی ہی کئی ہسٹریاں سامنے رکھ کر کہانی کے تانے بانے بنتا ہے۔ اس عمر میں یہ گمان کیسے گزرتا کہ یہ انوکھے بھید کسی شخص کے اپنے مشاہدے یا تجربے کا نتیجہ ہو سکتے ہیں۔ اگر ہو سکتے تو ہمارے نہ ہوتے۔ اور چونکہ ہمارے نہیں تھے لہٰذا لازم تھا کہ کتابوں سے لئے گئے ہیں۔ اس وقت ان باتوں پر ہنسی آتی تھی۔ آج کل حقیقی زندگی میں جب لوگوں کے الفاظ اور حرکات کے خول سے متضاد حقیقت کھلتی ہے تو اس ہنسی پر ہنسی آتی ہے۔

پہلی دفعہ، جیسے شخص سے جس نے گوشت پوست کے مفتی کو دیکھا تھا پشاور میں ملاقات ہوئی۔ اچھی بھلی شکل صورت اور رنگ روپ (مفتی کی نہیں اس کی) اچھا بھلا نام۔ جلیل۔ لیکن ساتھ کریر کی دم لگاتے ہیں جس کی نسلی وجہ تو جو ہو سو ہو جمالیاتی وجہ آج تک سمجھ میں نہ آ سکی۔ ویسے کچھ ہو گی ضرور ورنہ کون بھلا آدمی محض نسلی بنا پر کریر جیسا دم چھلا چپکائے رہے گا! پشاور کے گرین ہوٹل میں بیٹھے گپ بازی کر رہے تھے۔ بے سلسلہ باتیں۔ سیاست کی۔ ادب کی۔ جانوروں کی۔ جانے کیسے مفتی کا ذکر آ گیا۔ کہنے لگا

"یار بڑا دلچسپ آدمی ہے۔"

[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]

زمانے میں مفتی سب سے زیادہ خوش پوش آدمی سمجھا جاتا تھا۔ لڑکے اس کی تقلید کرتے تھے اور وہ سرے ماسٹر نقلید۔ یہ بھی ہاشمی سے معلوم ہوا کہ مفتی تھا بہت سخت گیر۔ بہت مارتا تھا۔ لیکن پڑھانے کا طریقہ بھی انوکھا تھا۔ انجام یہ کہ سب لڑکے اس سے ڈرتے تھے۔ درمیانہ قسم کے اور ہونہار طالب علم تو بہت پسند کرتے تھے۔ ہاں ازلی نالائق محض ڈرتے تھے۔ اور کو سنتے۔ مفتی سے جب میں نے ہاشمی کی اس گفتگو کا ذکر کیا تو کہنے لگا

"اونہیں جی۔ وقت وقت کی بات ہوتی ہے۔ وہ دن ظاہری بناؤ سنگار کے تھے۔ ہر شخص کی زندگی میں ایک دن ایسا آتا ہے جب وہ اس حقیقت کو پالیتا ہے کہ بھدے کپڑے بھی اسی قدر جاذبِ توجہ ہیں جس قدر بھڑکیلے۔ مطلب تو توجہ حاصل کرنے سے ہے نا۔"

آخری فقرے پر ہنسنے کی اتنی واضح کوشش تھی کہ مجھے بھی ہنسی آگئی اور اس نے بھی دانت نکال دیئے۔

اچھا یہ بات مفتی میں کمال ہے۔ بلکہ اب تو اس کی فطرت کا جزو بن چکی ہے کہ بات ہو یا افسانہ روایت سے بغاوت ضرور کرے گا۔ ایسی بات کہنے میں تو اسے خاص لطف آتا ہے جو غیر متوقع ہو۔ ایک روز ہمارے ایک نیک پاک دوست محمد عمر نے مفتی سے گلہ کیا کہ تم جگہ جگہ مجھے بدنام کیوں کر رہے ہو۔

"یار بڑا بے وقوف ہے تو" مفتی صاحب چہکے

"ورنہ درہم ..." عمر غصے میں ہو تا گیا۔ مطلب یہ تھا کہ

"اس میں بے وقوفی کی کون سی بات ہے۔ سیدھی طرح جواب دو میری بات کا۔"

"کیا تمہارا خیال ہے میں تمہارا ایسا ہی دشمن ہوں کہ تمہاری نیکی کی تشہیر کرتا پھروں۔"

"اس میں دشمنی کی کیا بات ہوئی؟"

"دشمنی نہیں تو اور کیا ہے۔ اگر تمہارے دوستوں کو معلوم ہو گیا کہ تم واقعی نیک ہو تو کسی کو تمہاری شخصیت میں دلچسپی نہ رہے گی۔ سارا رعب جاتا رہے گا تمہارا۔ اور پھر میری بھی تو سخت بدنامی ہے :"

"یہ کیا واہی تباہی بک رہے ہو۔ بدنامی کیسی؟"

"لوگ کہیں گے مفتی اتنا گھٹیا ہو گیا ہے ایسے یار بناتا ہے جنہیں نیکی کے علاوہ کوئی کام ہی نہیں۔"

قہقہہ پڑا اور عمر صاحب کا غصہ اور گلہ اس میں دب کر رہ گیا۔

اپنے افسانوں میں بھی انوکھی بات سننے انداز میں کہنے کی دھن میں وہ لاشعور کے طلسمات میں غوطہ زن ہوا کردار تو اس کے بھی عام انسان تھے۔ بہی اسمارائیں، بہی سمیع، بہی آپاجان، یہی بھائی جان۔ وہی سیدھے سادے واقعات جو ہماری آپ کی دنیا میں غوطہ زن ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن ان عام لوگوں کے عام واقعات میں مفتی وہ پہلو دیکھتا ہے جو ہم آپ نہیں دیکھتے۔ اور وہ انہیں اپنے مخصوص انداز میں بیان کرتا ہے۔ نقطۂ نگاہ کا یہ عجیب اور اظہار کا انوکھا پن۔ مفتی کی باتوں کی بھی خصوصیت ہے اور افسانوں کی بھی۔

بیٹھے بٹھائے جب مفتی آپ کی بات کو سیدھی سادی بات کو "اونہیں جی" کی کند چھری سے کاٹے تو سمجھ لیجئے کہ میاں ممتاز مفتی بات کا کوئی انوکھا پہلو پیش کرنے کی تمہید کر چکے ہیں۔ دیکھئے یہ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ اس کی بات مانیں نہ مانیں۔ اس پر عمل کریں نہ کریں۔ اس کی دلچسپی کے طلسم سے نہیں بچ سکتے۔

اس سے بھی زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر آپ اس کی عجیب باتوں کو حقیقت کے روپ میں بھی دیکھ لیں گے۔ چاہے اس بات نے مفتی بھر کے لئے ہی حقیقت کا روپ محض آپ کو پریشان کرنے کے لئے دھار لیا ہو۔ اس کا ایک افسانہ ہے۔ نام مجھے یاد نہیں۔ شاید آپ کو یاد آجائے۔ قصہ کچھ یوں ہے کہ ایک نوجوان لڑکا محلے کی ایک نوجوان لڑکی سے عشق کرتا ہے۔ لڑکے کے کمرے کی کھڑکی ملاقات کا ذریعہ بنتی ہے! افسانے

میں اس لڑکے کی شادی لڑکی سے ہو جاتی ہے۔ (آج کل تو عام زندگی میں بھی یہی کچھ ہوتا ہے) ازدواجی زندگی میں تلخیاں آتی ہیں، لڑائی جھگڑے ہوتے ہیں، محبت سست کہا جاتا ہے۔ بات چیت کا رشتہ ٹوٹ جاتا ہے۔ پھر آدھی رات کے قریب کمرے کی اس کھڑکی پر آہستہ سے دستک ہوتی ہے۔ لڑکی خوف سے دبی آواز میں پوچھتی ہے —

"کون؟"

"میں ہوں انور!" جذبات سے بھری آواز آتی ہے۔

کھڑکی آہستہ سے کھلتی ہے۔ لڑکا جوتے بغل میں دبائے ذرا سہما ہوا ہوئے داخل ہوتا ہے۔ کھڑکی آہستہ سے بند ہو جاتی ہے۔

رات بھر سرگوشیاں ہوتی ہیں۔ ملبوس سرسراتے ہیں اور اگلے روز پھر زندگی کا دھارا سکون سے بہنے لگتا ہے۔

بڑی عجیب بات ہے۔ ہے نا۔ یہ عجیب آپ کو مفتی کی کہانیوں اور باتوں میں عموماً ملے گا۔ یہ عجیب ہی مفتی ہے۔ ویسے اس سلسلے میں آپ کو ایک واقعہ سنا دوں۔ میرے اپنے ایک دوست نے سچ مچ ایسی ہی ایک کھڑکی بنا رکھی ہے۔ یہ کھڑکی ہے ٹیلیفون۔ اپنی ہی بیوی سے ٹیلیفون پر عشق و محبت کی باتیں کی جاتی ہیں۔ اور کسی ریستوران میں ملنے اور چائے پینے کے وعدے وعید ہوتے ہیں۔ شادی کو تیرہ برس ہو چکے ہیں اور ماشاءاللہ تین بچے بھی ہیں۔ یقین نہیں آ رہا آپ کو۔ مجھے خود مفتی کے اس افسانے اور اپنے دوست کے اس واقعہ پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ آپ بھی یقین نہ کیجئے۔ جب تک کوئی ایسا ہی واقعہ آپ کے ساتھ یا آپ کے دوستوں کے ساتھ نہ ہو گزرے۔ یہ آپ خاطر جمع رکھیئے کہ ایسا واقعہ ہو گا ضرور۔ میں نے کہا نا کہ حقیقتوں نے مفتی کی عجیب باتیں سچ کر دکھانے کے لئے اس سے سازش کر رکھی ہے۔

مفتی کی افسانہ نگاری کی ابتدا کا واقعہ بھی عجیب ہے۔ انگریزی کا اچھا ماہر نہیں ہے۔ لیکن اردو جاننے کا اس کو بالکل دعویٰ نہیں۔ یہ واقعہ ۱۹۳۶ء کا ہے۔ محمود ہاشمی نے ہی بتایا تھا آدمی گپ باز ہے اس لئے آپ کو سنانے سے پہلے میں نے اس کی تصدیق مفتی سے کر لی ہے۔ ملتان میں مفتی سکول ماسٹر تھا۔ اور راشد وہیں کلرک۔ ایک ریاستی صاحب ایک رسالہ "نخلستان" کی ادارت کرتے تھے۔ وہ بیمار پڑ گئے تو راشد سے ایڈیٹر کا کام کرنے کے لئے کہہ گئے۔ مواد کچھ کم تھا۔ راشد نے مفتی سے کوئی انگریزی مضمون ترجمہ کرنے کے لئے کہا۔ مفتی صاحب نے ایک مزاحیہ مضمون انگریزی میں لکھا اور پھر راشد کے ارشاد کے مطابق اس کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا۔ یہ ایک ہندوستانی فلم "شیلی دلہن" پر طنزیہ مضمون تھا۔ راشد نے مضمون پسند کیا۔ ہاشمی کہتا ہے کہ اس مضمون کا اتنا چرچا ہوا کہ جب ہاشمی نے افسانہ نگاری شروع کی تو پہلا افسانہ "نخلستان" کو ہی بھیجا۔ کچھ تعریفی خطوط بھی آئے۔ اور لکھنے کی فرمائش ہوئی۔ اس دفعہ ترجمے کی بیخ نہیں تھی۔ اس لئے اردو میں کہانی لکھی گئی اور "ادبی دنیا" کے سالنامے میں چھپی۔ یہیں سے مفتی کی افسانہ نگاری کی ابتدا ہوئی جو آج سترہ سال بعد بھی عروج پر ہے۔ اس شہرت بلکہ دھاک کے بعد بھی وہ اپنے آپ کو زبان و بیان کا خدا یا فن کا دیوتا نہیں گردانتا۔ اردو بولنے والوں کے ساتھ بھی پنجابی میں بات کرتا ہے۔ کہتا ہے مجھے زبان پر قدرت نہیں۔ اور یہ کہنے کے باوجود اظہار کے لطیف اور نازک پہلو پیش کرتا ہے۔ اس کا انداز منفرد ہے کہ کسی افسانے سے بھی ایک ٹکڑا اٹھا کر پڑھ دیکھئے۔ یقینی طور پر یہ کہا جا سکے گا کہ یہ مفتی کا ہے یا نہیں۔ اردو کے شاعروں اور مزاح نگاروں میں تو چند ہلکا اور گہرا اسلوب کی یہ انفرادیت حاصل ہے لیکن افسانہ نگاروں میں مفتی کے سوا کسی کو یہ امتیاز حاصل نہیں۔

"اگر شیخ اجمل حسین کو بے تحاشہ ہنسنے کی عادت نہ ہوتی۔ اگر خدا بخش کو صمد و کبابیے کے ہاتھ کے بنے ہوئے کباب کھانے کی لت نہ پڑتی اگر اسلم کو مس انگلی کی محبت کا عارضہ اور مجھے چغتائی کے خطوط کا جنون نہ ہوتا تو یہ آپ بیتی کبھی معرض وجود میں نہ آتی۔"

"اس واقعہ کو عمل میں لانے کے لئے فطرت کو کیا کیا کرنا پڑا۔ اور پھر جمیل اسلم خدا بخش اور میرے علاوہ ربڑ کی گڑیا کی طرح چیختی ہوئی بڑھیا۔ اس کی پوتی جنا جسے فطرت نے چغتائی کے کسی عمل سے متاثر ہو کر بنایا تھا۔ اور بالآخر ہمارا نوکر بدھو جو برائے نام بدھو نہ تھا۔"

"اے ہے لڑکی سر پہ دوپٹہ لے لے۔ ربڑ کی گڑیا چیختی اور ہمیں شدت سے اس بات کا احساس ہوتا کہ کہیں پاس ہی ایک لڑکی

موجود ہے جس کے سر سے ریشمی آنچل پھسل پھسل جاتا ہے۔

"اے ہے بیٹا منفعل کے بیٹھ۔ تجھے اپنا ہوش بھی نہیں۔" اور ہمیں احساس ہوتا کہ وہ لڑکی عمر کے اس حصے سے گزر رہی ہے جب اپنا ہوش بھی نہیں ہوتا۔

وہ رٹے کی گڑیا چھتی اور چمیلی خواہ مخواہ شرماتا۔ اسلم کے دل میں انگلی کی یاد تازہ ہو جاتی۔ خدا بخش تنہ بند جھاڑ کے کہتا۔ یار بڑے گرم مصالحے تلنے لگا ہے عمدو کبابوں میں۔ گرمی ہو گئی ہے کچھ کچھ۔ اور میرے دل میں مینا بدوش کا چغتائی کا عمل ابھرتا۔"

(اوئی اللہ)

دیکھا آپ نے۔ ایسے ہو سکتا ہے کہ آپ یہ تحریر کہیں دیکھیں اور نہ پہچان پائیں۔ کہ یہ ممتاز مفتی ہے۔ بالکل ویسے ہی جیسے آپ خاکستری ہوتے ہوئے بال۔ دھنسی ہوئی آنکھیں۔ جھریوں والا لمبوترا چہرہ اور شکنوں بھرے لباس والے اسسٹنٹ انفرمیشن آفیسر کو دیکھتے ہی پہچان جاتے ہیں کہ یہ ممتاز مفتی ہے۔ ابھی پچھلے دنوں اس نے ایک نیا افسانہ ہیین بازار پر لکھا ہے۔

"ہیین بازار سے کہیں آپ یہ نہ سمجھ بیٹھیں کہ اسے ہیین سے تعلق ہے۔ اگرچہ وہاں ہیین کے سنبو سے بنتے ہیں اور شہر بھر میں مشہور ہیں لیکن اس بازار کا نام نے سن تھا جو بگڑ کر ہیین ہو گیا۔

ہیین بازار کی سب سے بڑی نشانی یہ ہے کہ سرگرم خرید و فروخت ہونے کے باوجود وہاں سرشام سے دیکھنے میں آتی ہے، یوں محسوس ہوتا ہے جیسے خریدار کو خرید سے دلچسپی نہیں۔ اور دکاندار فروخت کی تگ و دو سے بے نیاز ہیں۔ وہاں کے دکاندار کے انداز سے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ بذات خود خریدار ہو۔ گاہک کی توجہ اس شے پر مرکوز نہیں رہتی جس کا وہ خریدار ہوتا ہے۔ وہاں کے بھکاریوں میں ایک احساس فراغت ہوتا ہے۔ وہاں کے مزدور کی پھٹی ٹوپی سر پر اس انداز سے دھری ہوتی ہے جیسے کسی نواب کی کلاہ ہو"

"وہاں کے کم سن آوارہ لڑکوں کی آنکھ میں بلوغت کی جھپک ہوتی ہے۔ چلتے چلتے سپاہیوں کی چال ڈھال سے فرائض نہیں بلکہ حقوق کی جھلک مترشح ہوتی ہے۔ وہاں نوجوان آرزو کرتے ہیں کہ پختہ کار ہوتے، اور پختہ کار خواہش کرتے ہیں کہ جوان ہوتے۔ بوڑھے لاحول پڑھنے کے لئے آتے ہیں۔ وہ ہیین بازار......"

میرے تجربے میں مفتی پہلا افسانہ نگار ہے جو اپنے علاوہ دوسرے افسانہ نگاروں کا بھی معتقد ہے۔ خاص طور پر منٹو کا۔ ابھی پچھلے دنوں جب منٹو پر عریانی کے الزام میں کراچی میں مقدمہ چلا تو مفتی کو بہت غصہ آیا۔

"میں مضمون لکھ رہا ہوں"

"کس بات پر؟" میں نے پوچھا

"بات کیا یار مسعود ادب کے معاملے میں یہ حکومت بھی کمال ہے۔ بھئی آخر کیا ہو گیا جو دو لفظ لکھ دئے اس نے۔ خواہ مخواہ مقدمے بازی"

"یہ کس کی حمایت میں تقریر شروع کی ہوئی ہے؟"

"او نہیں جی، حمایت وِمایت نہیں۔ وہ تو حرامی جو ہے سو ہے۔ لیکن انہیں بھی تو دیکھو۔ میں ان سے پوچھتا ہوں کہ اپنے درزیوں کے خلاف کیوں مقدمہ نہیں چلاتے جن کی ساری دکانداری ہی اس بات پر ہے کہ لباس کے ایسے ڈیزائن نکالیں جن سے عورت کی ہر چھپانے کی چیز ملبوس ہو کر نمایاں تر ہو جائے۔ تاجروں پر کیوں مقدمے نہیں چلتے کہ یہ من کی پیاس، آنکھ کا فتنہ اور تیری میری مرضی کیا نام ہوتے کپڑوں کے۔ ان کی تو سرپرستی ہو گی۔ اور جہاں ادیب نے کوئی بات کہی مقدمے بازی شروع ہو گئی۔ واہیات بات ہے یار"

"لیکن یہ منٹو بھی تو باز نہیں آتا۔ بھئی کیا ضرور ہے جو دو چار فقرے ایسے لکھ دے کہ گرفت ہو سکے۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]

"[illegible]"

"[illegible]"

"[illegible]"

"[illegible]"

"[illegible]"

"[illegible]"

"[illegible]"

"[illegible]"

[illegible]

[illegible]

[illegible] ———— [illegible]

چونکا بھی کر دیا۔ اس کے بعد پے در پے اپنی کی کئی کہانیاں چھپیں۔ ان سب کا کچھ ایسا ہی انداز تھا۔ وہی اَن ہونا را، خوابناک سا ماحول تھا۔ ایسا ماحول جو اس مادی حقیقی دنیا سے منسلک ہونے کے باوجود بھی کچھ ماورا سا تھا۔ اور جب کبھی اپنی کی کوئی کہانی چھپتی تو "ساقی" کے صفحے کے صفحے انگریزی رسم الخط سے پُر نظر آتے۔ ان کہانیوں کے عنوان بھی کچھ ایسے سے تھے جیسے لفظوں سے اندھ کئے گئے ہوں، اور پڑھنے والے سوچنے لگتے یہ لکھنے والی کون ہے جس کی کہانیوں کے ماحول کا ایک سرا غالب اور فیض کی شاعری سے ملا ہے اور دوسرا سرا بادلوں میں گم ہو کر رہ گیا ہے —— پھر کچھ عرصہ بعد اپنی نے اپنے پڑھنے والوں کے لئے اس معمے کو ذرا سہل بنا دیا۔ اس نے اپنی کہانیوں سے انگریزی رسم الخط نکال پھینکا، اور اس کے بجائے اردو رسم الخط میں، یا پھر اردو کے جامے میں اپنے تاثرات، اور احساسات کو ڈھال کر پیش کرنا شروع کر دیا۔ یہ بھی اردو افسانہ نگاروں میں ایک نیا تجربہ تھا۔ اس نے ایک عرصے تک اردو پڑھنے والوں کو حیرت میں رکھا اور میرا خیال ہے کہ موجودہ دور کے لاتعداد نو عمر افسانہ نگاروں کو جن کے نام آج کل رسالوں کی فہرستوں میں نظر آتے ہیں، اس تجربے نے ایک بہت بڑی حد تک متاثر کیا ہے!

بنیادی طور پر اپنی افسانہ نگار ہے۔ لیکن اس نے دو کامیاب ناول بھی لکھے ہیں۔ وہ کلاسیکی اور نیم کلاسیکی موسیقی سے بھی واقف ہے اور اس کو پینٹنگ سے بھی گہرا شغف ہے۔ یوں وہ اپنے تخیل کو فنونِ لطیفہ کے مختلف شعبوں پر وارد کرنے کی اہل ہے! لیکن ان سب مختلف الانواع تجربوں میں اس کی ذاتی شخصیت کو بھی ایک واضح اور داخلی حیثیت حاصل ہے۔

اپنی چیزوں کی ظاہری ہیئت کو دیکھنے کے علاوہ ان کی ماہیت کو داخلی طور پر محسوس کرنے کی عادی ہے۔ شاید اس کی قوتِ باصرہ اور قوتِ سامعہ دونوں بہت غیر معمولی طور پر حساس واقع ہوئی ہیں۔ ایک طرف تو اس کی قوتِ باصرہ رنگوں اور شکلوں اور خطوط کی کیفیت اور ہم آہنگی کو اپنے میں جذب کرنے پر تلی رہتی ہے۔ دوسری طرف اس کی قوتِ سامعہ آوازوں کی کیفیت اور زیر و بم اور داخلی موسیقی پر مرکوز رہتی ہے اور اس کے اپنے محسوسات نہ جانے ان رنگوں اور آوازوں کے سہارے کہاں سے کہاں نکل جاتے ہیں اور ایک طرح کی چکا چوند کیفیت اس کی ادبی اور فنی کاوشوں میں جھلک آتی ہے۔

تاریخی اعتبار سے اپنی ہمارے موجودہ دور کی پیداوار ہے۔ اس نے ڈیرہ دون اور لکھنؤ کے سکولوں میں اولین تربیت پائی۔ پھر لکھنؤ کے مشہور ازابیلا تھوبرن کالج سے بی اے پاس کیا اور پھر اعلیٰ تعلیم کے لئے لکھنؤ یونیورسٹی میں داخل ہو گئی۔ اس نے آنکھ کھولتے ہی اپنے اردگرد اودھ کے اس مخصوص ماحول کو دیکھا جو اپنی جگہ ایک منفرد حیثیت رکھتا تھا۔ جس دور میں اپنی نے نشوونما پائی اس میں ایک طرف تو دلی کی تہذیب تھی جو دم توڑ رہی تھی، جہاں اب شریف مسلمانوں کے زیادہ تر خاندان چند پرانے مگر تاریک تنگ محلوں میں محبوس ہو کر رہ گئے تھے، اور ان کے اردگرد ایک نئی دلی پیدا ہو رہی تھی جس میں نودولتیے ٹھیکیدار تھے، یا وہ مختلف صوبوں اور علاقوں سے برآمد کئے ہوئے سرکاری ملازم تھے جو برسوں دلی میں زندگی بسر کرنے کے بعد بھی اپنی اپنی علاقائی بندشوں میں جکڑے رہتے تھے اور اس پرانی دلی کے جغرافیے اور معاشرت سے بے خبر اپنی تمام زندگیاں گذار دیتے تھے یا پھر دوسری طرف، اسی دور میں بمبئی اور کلکتہ جیسے کاروباری شہر تھے جن میں زندگی ایک بے پناہ، دم گھونٹ دینے والی رفتار سے بہتی تھی، اور جہاں لوگ دن رات ایک ختم نہ ہونے والی دوڑ میں شریک رہتے تھے —— لیکن اسی دور کا لکھنؤ، تعلقہ داروں کا لکھنؤ، ایک خاص حیثیت کا مالک تھا اس ماحول میں وہ کاروباری یا نودولتی ذہنیت نہ تھی بلکہ ایک قسم کا ٹھہراؤ تھا۔ ایک بھاری بھرکم پن تھا جو بہت سے شعبوں کو بہت سی Traditions کو اپنی جگہ مستحکم رکھتا تھا، شاید اس استحکام اور ٹھہراؤ کی پشت پر تعلقہ داروں کی مالی آسودگی تھی۔ یہ تعلقہ دار مسلمان حکمرانوں کی تہذیب، تمدن اور زبان سے بے حد متاثر تھے اور اپنی نے ہوش سنبھالتے ہی اپنے کو اس ماحول میں پایا، اور اس لئے اس کو اپنے اردگرد زندگی میں وہ جمود اور گھٹن محسوس نہ ہوئی جو اور علاقوں کے نوجوان لکھنے والوں کو محسوس ہوتی تھی۔

بہت سے لوگ اپنی کو رجعت پسند کہتے ہیں۔ عصمت چغتائی نے بھی ایک مرتبہ اپنی کی شخصیت پر یہی الزام لگایا تھا۔ لیکن اگر آپ اپنی سے ملیں تو

وہ اس قسم کے الزام کو شدومد کے ساتھ رد کرنے کی کوشش کرے گی۔ وہ کہتی ہے کہ وہ تو محض اس تمدن اور ماحول کی ترجمانی کرنے کی کوشش کرتی ہے جو اس سپیریل سوسائٹی کے لکھنؤ کے تمدن کو سنبھالے ہوئے تھا، جس نے آئی ٹی کالج کو مڑکر دیکھا اور ایک طرح کی سنجیدہ مزاجی پیدا کر دی تھی، جو دوسرے کالجوں کی لڑکیوں میں مفقود تھی، اور جس نے لکھنؤ یونیورسٹی کے بابت سے لڑکوں کو ترقی پسند اور انقلابی بنا دیا تھا —— اس لئے وہ رجعت پسند نہیں ہے۔ اب پتہ نہیں کہ کون سی بات ٹھیک ہے، کون سی غلط، عوام کی لٹھیا کس پر ہے یا عینی ——!

جب عینی کا ناول "میرے بھی صنم خانے" چھپا تو اس کو سب سے زیادہ دلچسپی اس بات کی ہوئی کہ اس نے لکھنؤ کے اس مخصوص ماحول کو کیسے پیش کر دیا ہے۔ جو لوگ عینی کو جانتے تھے انہوں نے اس کے ناول کے کرداروں کے روپ میں فوراً ان ہستیوں کو پہچان لیا جو حقیقی تھیں اور اس پر دے بیچانے پر اس قسم کے ادبی تجربے پر عینی کو ایک عجیب مسرت محسوس ہوئی ہوگی۔ بہر حال زمانے کے بعد کوئی تین سال ہوئے عینی نے ایک اور ناول لکھا "سفینۂ غمِ دل"۔ مجھے وہ زمانہ اچھی طرح یاد ہے، جب عینی یہ ناول لکھنے میں مصروف تھی۔ اس کے لکھنے کی رفتار ہمیشہ بہت تیز ہوتی ہے، وہ ایک وقت میں بہت لکھ ڈالتی ہے۔ ایک روز اس نے مجھ کو اپنے ناول کے مسودے میں سے وہ حصہ دکھایا جس میں اس نے اپنے ان تاثرات کو بیان کیا ہے جو اس کے دل میں اپنے باپ کی موت سے پیدا ہوئے تھے، اور مجھ کو بے ساختہ غیر شعوری طور پر ۱۹۴۳ء کی وہ صبح یاد آ گئی جب میں نے لکھنؤ میں سجاد حیدر یلدرم صاحب کے انتقال کی خبر سنی تھی اور میں ایک دوست کے ہمراہ ان کے گھر گیا تھا۔ مجھے اس صبح کی بہت سی باتیں تفصیل کے ساتھ یاد نہیں لیکن ایک مجموعی تاثر جو اب بھی میرے ذہن میں محفوظ ہے، اس تصویر سے بہت قریب ہے جو عینی نے اپنے ناول میں کھینچی ہے۔ اس صبح کو لکھنؤ کی فیض آباد روڈ کے اس بنگلے میں لوگوں کا کافی ہجوم تھا لیکن پھر بھی فضا میں ایک سناٹے کی سی کیفیت تھی جس کو انسان اس گھر میں قدم رکھتے ہی محسوس کر سکتا تھا۔ اس وقت میں عینی سے بہت ہی سرسری طور پر واقف تھا، بلکہ تقریباً ناواقف تھا لیکن جب میں نے "سفینۂ غمِ دل" میں یہ حصہ پڑھا تو مجھ کو اب سے برسوں پہلے کے لکھنؤ کی وہ صبح بے ساختہ یاد آ گئی۔

یہاں پر ایک ایسا سوال پیدا ہوتا ہے جو مجھ سے اکثر ان لوگوں نے پوچھا ہے جو عینی سے ذاتی طور پر واقف نہیں۔ "عینی کی شخصیت کو اس کی اپنی کہانی میں کیا حیثیت حاصل ہے؟" عام طور پر لوگ، جب کسی نوجوان خاتون کے افسانوں کو پڑھتے ہیں تو ان کو فوراً یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ ان کہانیوں کے "واحد متکلم" میں یا کسی اور بنیادی کردار میں لکھنے والی کی اپنی شخصیت پوشیدہ ہے۔ نہ جانے کیوں، مرد افسانہ نگاروں کی کہانیاں پڑھ کر کبھی بھی اس قسم کا کوئی رد عمل پیدا نہیں ہوتا۔ اس کو آپ ہماری برتر نسل کی کہیے یا نفسیاتی کمزوری۔ لیکن واقعہ یہی ہے۔ کہ جب کوئی دلچسپ قسم کا نسوانی کردار کسی خاتون افسانہ نگار کی کہانیوں میں نظر آیا اور فوراً یہ نتیجہ اخذ کر لیا کہ دراصل یہ مصنفہ کا اپنا اصلی روپ ہے۔ گویا لکھنے والی کی شخصیت ہی ایک ایسا راز ہے جو داستان کے جاسے ہیں تو اُبا گر ہو جاتا ہے لیکن ویسے مخفی ہی رہتا ہے!

واقعہ یہ ہے کہ اگر آپ عینی کے کرداروں کا تجزیہ کریں تو آپ کو ان میں بہت سی ہستیاں نظر آئیں گی۔ وہ احول نظر آئے گا جس میں وہ خود پلی بڑھی ہے۔ کالجوں کا ماحول اور جغرافیہ بالکل آئی ٹی کالج سے مماثل نظر آئے گا، سڑکوں اور عمارتوں اور بنگلوں کے نام بھی صورت سے نظر آئیں گے ——
لیکن بس یہاں تک پہنچ کر عینی کی اپنی شخصیت اس تمام ماحول اور فضا کا ایک جزو بن کر رہ جاتی ہے۔ وہ کہیں بھی مجسم طور پر خود کو اپنے کرداروں میں مخلوط نہیں ہونے دیتی۔ وہ ان کو اپنی ذات سے ضرور متاثر ہونے دیتی ہے لیکن اس حد سے آگے۔ وہ ان کو اپنے طور پر مختلف ارتقائی منزلوں سے گذرنے کا موقع دیتی ہے اور پھر وہ کردار محض فنی تقاضوں کے مطابق نشوونما پاتے ہیں۔ جو لوگ عینی سے اچھی طرح واقف ہیں ان کو عینی کے افسانوں میں کبھی کبھار کسی منظر میں، کسی منظر کشی میں، کسی دلچسپ واقعے میں عینی کی ایک ہلکی سی جھلک نظر آ جاتی ہے۔ لیکن محض ایک جھلک ہی ملنے کے لئے اور پھر یہ جھلک بھی اس پورے ماحول، وسیع فضا کا ایک حصہ بن کر رہ جاتی ہے۔

ایک عنصر ایسا ہی ہے جو عینی کے ادب میں اور اس کی اپنی ذات میں یکساں طور پر نظر آتا ہے۔ وہ ہے اس کا فنی خلوص! وہ ہر چیز کو اس خلوص کی

کسوٹی پر پرکھتی ہے، اگر وہ اس کے معیار پر پوری اترتی ہے تو وہ اس کو قبول کر لیتی ہے، ورنہ اس کی طرف سے منہ موڑ لیتی ہے، اور پھر کسی بھی قیمت پر اس کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتی۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ سینکڑوں لوگوں سے مل چکنے کے باوجود اور پارٹیوں اور ہنگاموں سے پُر زندگی کی قربت کے باوجود اس کا اپنا حلقۂ احباب بہت مخصوص ہے۔ ایسے لوگوں کو جو اُن خلوص کے معیار پر پورے نہیں اترتے وہ قطعی ناقابلِ برداشت اور "بور" سمجھتی ہے۔ اور "بور" لوگوں سے بجز سوشل قسم کی ملاقاتوں کے بجائے ایک قسم کی سست الوجودی کی زندگی کو زیادہ پسند کرتی ہے۔ اس کے گھر میں جہاں اس کی کتابوں کے انبار ہیں، اس کا پیانو ہے، کملا اور مجیر نگر، Paintings ہیں۔ اپنے گروہ میں ایسے وہ گھنٹوں باتیں کرنے سے بھی نہیں تھکتی۔ میں نے اس کو ایک وقت میں مختلف النوع موضوعات پر کئی کئی لوگوں سے بحث کرتے دیکھا ہے۔

ادیبوں اور ادبی معیاروں کے سلسلے میں بھی وہ اپنی ذاتی پسندیدگی اور ناپسندیدگی کو بہت اہمیت دیتی ہے۔ مثلاً اگر اس کو معلوم ہے کہ ایک شہرت یافتہ ادیب اپنی بیوی سے اچھا سلوک نہیں کرتا تو وہ اس کے ادبی کارناموں کو کبھی بھی سراہنے کے لئے تیار نہ ہوگی۔ اسی بنا پر اس کے حلقۂ احباب میں ادیب بہت کم ہیں، اور جو ہیں بھی وہ اپنی ادبی شخصیت کی بنا پر نہیں بلکہ اپنی ذاتی شخصیت کی بنا پر اس سے رابطہ بڑھا سکے ہیں۔ زبردستی کی "ادبی" گفتگو سے بھی اپنی بہت گھبراتی ہے۔ مثلاً اگر کوئی اس سے یونہی طور پر پوچھ لے کہ وہ "آج کل کیا لکھ رہی ہے؟" تو سخت کوفت محسوس کرتی ہے اور کہتی ہے کہ بقول شخصے یہ سوال ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ جیسے دو باورچی ایک دوسرے سے ملنے پر پوچھیں "آج تم کیا پکا رہے ہو؟"

خونیں جنگوں اور ایٹم بم سے پیدا کئے ہوئے اس تمدن کو وہ بہت دو بھر سمجھتی ہے۔ موجودہ نسل کی "مغربیت زدگی" سے بڑی گھبراتی ہے — کاک ٹیل پارٹیوں میں بیٹھ کر وہ سوچتی ہے کہ یہ سب لوگ جو ناچ رہے ہیں، دراصل اپنی حقیقت سے، اپنے مرکز سے، اپنے محور سے کتنے دور ہٹ گئے ہیں۔ یہ سب باتیں اپنی جگہ ٹھیک ہیں۔ لیکن یہ ماحول، یہ فضا ان باتوں کے لئے موزوں نہیں، اور وہ سوچتی ہے کہ شاید یہ لوگ اب اپنے مرکز سے اتنے دور نکل آئے ہیں کہ ان کی زندگیاں ایک قسم کے کلچرل خلاء میں بسر ہونے لگی ہیں، اور اس خلا کو پُر کرنے کی کوشش میں انہوں نے "جاز میوزک" اور رمبا اور سامبا میں دلچسپی لینی شروع کر دی ہے۔ نئی نئی پیدا کی ہوئی دولت کی نمائش کرنی سیکھ لی ہے — لیکن ان کی یہ کوششیں رائیگاں جاتی ہیں۔ اور وہ سب اور بھی زیادہ بے بس اور قابلِ رحم نظر آنے لگتے ہیں اور اپنی زندگیوں کے Tempo میں کچھ اور اضافہ کر دیتے ہیں! — اور نہ جانے اب یہ Tempo کہاں جا کر ٹوٹے گا؟ — شاید یہی وجہ ہے کہ پریوں کی کہانیوں کی سنڈریلا کی طرح آپی کو بھی یہ احساس ہونے لگا ہے کہ وہ اپنا شیشے کا سلیپر کہیں کھو بیٹھی ہے — اور نہ جانے اس کی طرح موجودہ دور کے اور کتنے نوجوانوں، ادیبوں، شاعروں، افسانہ نگاروں اور آرٹسٹوں کو ایک شیشے کے سلیپر کی تلاش ہے!

فٹ نوٹ

(از قرۃ العین حیدر)

آج صبح صبح ہماری پیاری بہن نفیس کا فون آیا کہ بھئی تمہارے متعلق وہ مشہور و معروف مضمون تیار ہے۔ ایک لمحے کے لئے دل ڈوب سا گیا۔ پھر دفعتاً یاد آیا کہ مضمون بہت اہم ہستیوں پر لکھے جاتے ہیں۔ ثانیاً الذکر کچھ عجیب آسمانی خوشی سی محسوس ہوئی۔ قصہ یوں ہوا کہ نفیس کے میاں جو ہیں، لفٹیننٹ کمانڈر عسکری ان کا نام ہے اور آپ کچھ ادب وغیرہ سے شغل کرتے ہیں اور دوسرے سارے نہایت قابل اور جہاندیدہ لوگوں کی طرح یہ بھی INCOGNITO رہنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ تو آپ نے گویا ایک مضمون اس خاکسار کے بارے میں رقم فرمایا۔ (یہ ایک اور عسکری ہیں، ذ ...

COMMANDMENT

ہم لوگوں کی اسی PITCH پر گزری ہے (کرکٹ کا PITCH نہیں) باوجودیکہ ہماری زندگیوں میں تقسیمِ ہند کے کارن واقعتہً بڑا زبردست انقلاب آ چکا ہے۔ اور بہرصورت اب اس تبدیلی کی عادت بھی ہو گئی ہے۔ ایک چیز ہم دوسروں میں ہمیشہ تلاش کرتے رہتے ہیں۔ شدید ذہانت اور شدید مزاحیہ حس۔ فی الحال یہاں دونوں چیزوں کا تقریباً فقدان ہے۔ غالباً ہماری اپنی "خصوصیات" بھی زیادہ لوگوں کے پلّے نہیں پڑتیں۔ (یہ انکشاف بھی اسی کینیڈا والے بھائی نے کیا تھا۔ اور اس لئے وہ دوسرے لمحے گھاس پر سے اٹھ کر کینیڈا چلا گیا)

میری بہن عزیز ترین سہیلیاں جو مجھے سگی بہنوں کی طرح عزیز ہیں اور جن کے ساتھ میں نے بہت بچپنے سے لے کر "سٹینڈ ٹک" کا ایک ایک لمحہ اکٹھے بتایا تھا۔ ہندوستان میں ہیں۔ ان کے علاوہ دوسری سہیلیوں کی ایک بہت بڑی فوج بھی تقریباً ساری کی ساری وطنِ مرحوم ہی میں رہ گئی۔

سہیلیوں سے قطع نظر ہم سب ماشاء اللہ سے اٹھارہ انیس فرسٹ کزن ہیں سیکنڈ تھرڈ فورتھ ففتھ (سلسلہ چینیوں کی طرح آٹھویں کزن تک پہنچتا ہے) ان کے علاوہ خدا نظرِ بد سے بچائے، ان سب میں جو ہمارا اپنا ایج گروپ ہے وہ اللہ کے فضل سے ایک ہی مدرسۂ فکر سے تعلق رکھتا ہے۔ الموڑے میں ہمارے منجھلے چچا جان کا مکان "بیکٹ ہاؤس" تھا، گرمیوں کے زمانے میں اس میں مستقل اُودھم کی وجہ سے ایک زلزلہ سا آیا رہتا۔ شاہجہان پور میں سب سے بڑے چچا جان کی کوٹھی کے باغ کے پیچھے سے ریل گذرتی تھی۔ ہم لوگ ٹرین آنے سے چند منٹ پہلے پٹری پر جا کر پتھر رکھ آتے اور پھر جھنوں میں چھپ کر انتظار کرتے کہ اب ٹرین پٹری سے اُترے گی۔ بالکل دہشت پسندوں کا گروہ تھا۔ اب خیال آتا ہے کہ اگر واقعی کبھی ایسا ہو گیا ہوتا تو کیا ہوتا۔ غالباً سب کو جیل خانے بھیجا جاتا۔

یہ سب بڑے ہوئے تو اسے لیجئے۔ ایک سے ایک عالم فاضل چلا آ رہا ہے۔ دو بہنوں نے یونیورسٹی کے سارے ریکارڈ توڑ ڈالے [illegible] ننھیال میں جو بہن بھائی ہیں ان کا بھی یہی سلسلہ ہے۔ ایک نوجوان خاتون نے مانچسٹر یونیورسٹی میں ٹیکسٹائل ٹیکنولوجی کی ڈگری لی۔ ایک بزرگوار بہت بڑے سیاست داں بن گئے۔

بہت کم کنبوں میں اتنا زیادہ "قبیلے کا احساس" ہوتا ہے۔ اس کی وجہ غالباً وہی تربیت اور وہ مخصوص تہذیبی پس منظر ہے جس کا ذکر میں نے "پلیم" کے متعلق مضمون میں کیا ہے۔ ہمارا کنبہ اب بہت دور دور بکھر چکا ہے۔ کچھ افراد سان فرانسسکو میں ہیں۔ کچھ لندن میں۔ بہت سے اپنے آبائی وطن ہندوستان ہی میں رہتے ہیں۔

بعض دفعہ مجھے خیال آتا ہے۔ بھانت بھانت کی جگہوں پر رہے۔ بھانت بھانت کے انسانوں سے ملے۔ بھانت بھانت کی مصروفیتیں رہیں بچپن رنگا رنگ مناظر سے پُر رہا۔ اُتر پردیش کے ہرے بھرے ضلع، ترائی کے جنگل، ہمالیہ کی چوٹیوں پر بسنے والی معروف اور غیر معروف بستیاں، سب سے پہلی یاد جو ہے وہ جہاز کے سفر کی ہے، کہ بس تیرتے ہوئے چلے جا رہے ہیں۔ بمبئی، کلکتہ، جنوبی ہند کی بندرگاہیں، ایران کے ساحل، کربلائے معلّٰی، قاہرہ... نرکی مستقل اِدھر سے اُدھر گھوم رہے ہیں۔

پہلی کہانی عمر چھ سال لکھی۔ (ہاں صاحب! کیا بات ہے، ہونہار بروا ———) کہانی کچھ یوں تھی کہ "کاٹھ گودام کا اسٹیشن تھا۔ رات کے بارہ بجے تھے۔ قلی لالٹینیں لئے اِدھر اُدھر دوڑتے پھرتے تھے۔ جگنو کی قطاروں کی طرح ٹرین آتی دکھلائی پڑی" وغیرہ وغیرہ۔ ماشاء اللہ کس قدر شاعرانہ تخیل تھا یعنی غور کیجئے کہ جگنوؤں کی قطاریں۔

پھر مدتوں تک گڑیوں کا بہت سخت سلسلہ رہا۔ گڑیاں ہی گڑیاں۔ ان کے لئے باقاعدہ اسکول کھولا گیا تھا۔ ایک جرمن سہیلی نے بہت سمجھا بجھا کر آمادہ کیا کہ "لیڈی بلنڈا" سے اس کے گڈے کا بیاہ کر دیا جائے۔ آئیڈیا کچھ اچھا نہیں مگر اس کی دل شکنی کے خیال سے مان گئے عین برات

ل‍ہ لکھنؤ کی مشہور جیپال سسٹرز۔ شکنتلا قدوائی، کملا جیپال، وِملا سال۔

کے وقت جرمن لڑکی جو تھی اس نے کسی بات پر بگڑ کر کہہ دیا کہ بہر حال میرا گڈا خالص جرمن ہے سیدھا برلن سے آرہا ہے، تمہاری "لیڈی ہیلنڈا" گو بلونڈ ہے مگر تمہاری گڑیا ہے، لہٰذا ہندوستانی ہے۔ اس قدر غصہ آیا کہ فوراً برات واپس لوٹا دی گئی۔ عرصے تک شدید اینٹی جرمن جذبات دل میں موجزن رہے۔

اسپورٹس اور ریاضی سے جان نکلتی تھی۔ اسکول اور کالج میں کبھی جو باسکٹ بال کھیل کر دیا ہو ——— فساد کرانے میں بڑا لطف آتا تھا۔ بیک وقت دونوں پارٹیوں میں شامل ہیں اور فساد کرا رہے ہیں۔ بعد میں خود ہی صلح کرا دی۔ اس وجہ سے کالج کی سیاسیات میں ہم کو بہت ہی اہم مقام حاصل تھا۔ اب یہاں پہ یہ عرض کرنا ہے کہ سب سے بڑی ٹریجڈی جو ہوئی وہ یہ تھی کہ اسی شغل ہنگامے کے چکر میں بغیر سوچے سمجھے جو کہانیاں وغیرہ کالج کے رسالوں کے لئے لکھتے تھے، وہ ادبی رسالوں میں چھپوا دیں۔ یہ ایسی ایکبڑٹی ہوئی جسے آج تک بھگتنا پڑ رہا ہے۔ کوئی عقلمند آدمی انگریزی میں کہہ گیا ہے۔

Literary sins Have very Long shadows

بہت ہی حسب حال مقولہ ہے۔ یعنی یہ کہ اب بیٹھے اس قسم کا روح افزا تبصرہ سن رہے ہیں:۔

ایک خاتون ہماری ایک کتاب کی ورق گردانی کرکے نہایت اطمینان سے بولیں "آپ انگریزی بہت اچھی لکھتی ہیں!!" اور اس روز تو مجھے بہت ہی کوفت ہوئی جب میں نے کرشن چندر صاحب کی رحمن کی میرے دل میں بڑی عزت ہے۔ یہ رائے پڑھی کہ "میرے کمی صنم خانے" میں سوائے پارٹیوں کے تذکرے کے اور کچھ نہیں ہے۔ اے لیجئے یہاں ہم نے تو اپنی طرف سے ایک عظیم انسانی ٹریجڈی کی داستان قلمبند کی تھی۔ کرشن چندر صاحب نے کے ایک جملے میں نہایت خوش اسلوبی سے قصہ مختصر کر دیا۔ اب آپ ہی بتلائیے کہ کیا کیا جائے۔

اپنے اور اپنے قبیلے کے متعلق اس "فٹ نوٹ" کا اضافہ کرنے کے ساتھ میں یہ بھی عرض کر دوں کہ یہ واضح رہے کہ ہم لوگ بر خود غلط نہیں ہیں۔ ہمارے یہاں اکثر و بیشتر لوگوں کو اپنے متعلق بڑی غلط قسم کی اہمیت کا احساس ہے۔ ہمارا جو معاشرہ ہے، جس طرح ہمارے ذہنوں کی تشکیل کی جاتی ہے اور جو ہمارے یہاں کے موجودہ حالات ہیں، ان کی وجہ سے لوگ یا تو احساسِ برتری کا شکار ہیں اور یا احساسِ کمتری میں مبتلا ہیں۔ ہر فرد کسی نہ کسی طرح کے complex میں گھرا ہوا ہے۔ NORMAL کوئی بھی نہیں رہنا چاہتا۔ اور میں ان لوگوں کو بہت قابلِ قدر سمجھتی ہوں جو ہر ماحول اور ہر موقع پر نارمل رہتے ہیں۔

رہی ہماری "شخصیت"۔ تو بھئی یہ تو ایک بڑا جید قسم کا خوفناک لفظ ہے شخصیت مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور بیگم رعنا لیاقت علی خان کی ہوتی ہے۔ ہم اور ہماری "شخصیت" ——— یہ کیا مسخرہ پن ہے!

دیوندر ستیارتھی

پرکاش پنڈت

سینما + کیمرہ + داڑھی = دیوندر ستیارتھی +

دیوندر ستیارتھی کے بارے میں کچھ لکھنا الجبرے کے کسی پرپیچ سوال کو حل کرنے سے کم مشکل کام نہیں۔ بلکہ میرا خیال تو یہ ہے کہ الجبرے، ریاضی یا جیومیٹری کے سوال کے بجائے دیوندر ستیارتھی جلی حروف میں لکھا ہوا ایک ایسا سوالیہ نشان ہے جو نظر آتا ہے اور نہیں آتا اور جس کا اُور چھور پانا خود دیوندر ستیارتھی کے بس کی بات نہیں اور اسی لئے دیوندر ستیارتھی کے بارے میں کچھ لکھنے سے پہلے میں سوچ رہا ہوں کہ اس کا آغاز کہاں سے کروں اور اس کا چھور کہاں ہوگا، اور سب سے اہم بات یہ کہ اس میں صداقت کہاں تک ہوگی؟

غالباً یہ ۱۹۴۷ء کی کسی شام کا ذکر ہے کہ میں اور رامانند ساگر سینما دیکھنے کے ارادے سے لپک جھپک نسبت روڈ لاہور پر چلے جا رہے تھے اور وقت کی کمی کے باعث اس وقت کسی قسم کی مداخلت گوارا نہ کر سکتے تھے کہ ناگاہ سڑک کی دوسری جانب سے کسی نے اونچے سُروں میں ساگر کو آواز دی ——— سڑک کی دوسری جانب چھ فٹ قد کا سادھو نما ایک لحیم و شحیم شخص جس کی داڑھی، جٹاؤں اور چہرے کے خط و خال سے ٹیگور خاندان کے کسی فرد کا دھوکا ہوتا تھا۔ لمبا کھلا کوٹ پہنے، کندھے سے کیمرہ لٹکائے اور بغل میں پھولے ہوئے پیٹ کا بڑا چرمی تھیلا دبائے کھڑا تھا۔ میں سمجھا ساگر کا کوئی خاندانی گورو ہوگا اور میں نے ساگر کو ٹال لینے کے لئے کہا لیکن دوسرے ہی لمحے وہ بزرگ سڑک پار کر کے ہمارے پاس آ پہنچے اور ساگر کے تعارف کرانے پر پتہ چلا کہ سادھو، خاندانی گورو یا کیمرہ مین کے بجائے وہ دیوندر ستیارتھی تھا یعنی ٹلنے والی آسانی نہیں تھی۔

اور واقعی دیوندر ستیارتھی رات کے دس بجے تک نہیں ٹلا۔ سینما کا پروگرام اس کی وجہ سے منسوخ ہوا۔ بنگالی رس گلوں اور مدراسی توشوں کا پروگرام اس کی وجہ سے شروع ہوا۔ نسبت روڈ سے لارنس باغ تک پیدل چل کر اس کی وجہ سے صحت بنائی گئی اور تاروں کی چھاؤں میں بیٹھ کر گومتی اور سابرمتی کے قصے اور اس کے تین طبع زاد افسانے بھی اسی کی وجہ سے سنے گئے۔ اس سے پہلے ستیارتھی کی ہوشنانے کی بیماری کے بارے میں بہت لطیفے سن چکا تھا اور انہیں صرف لطیفے سمجھتا تھا۔ آخر افسانہ کوئی بیڑی سگریٹ تو ہے نہیں کہ راہ میں کوئی آپ سے ملے اور افسانہ پلا کر چلتا بنے، لیکن اس روز میں خود حیران تھا اور دس سال گزرنے کے بعد آج بھی حیران ہوں کہ وہ کون سی چیز ہے جو ستیارتھی کے سامنے بھلے ایسے منہ پھٹ آدمی کو بھی سعادت مند اور فرمانبردار بنا دیتی ہے۔ اس کی شخصیت میں اچھے بھلے معقول آدمی کو کاٹھ کا اُلّو بنانے کا کون سا جادو ہے جو سر چڑھ کر بولتا ہے اور مقابل گنگ ہو کر

رہ جاتا ہے۔

اس دن کے بعد ستیارتھی سے اکثر میری ملاقاتیں ہونے لگیں۔ بہ الفاظ دیگر مجھے اس کے اکثر افسانے سننے کی سعادت نصیب ہونے لگی۔ میں ان دنوں شاہ عالمی دروازے کے اندر ایک پیچ در پیچ گلی میں رہتا تھا اور ستیارتھی وہاں سے تقریباً ڈھائی میل دور سنت نگر میں۔ سنت نگر میں کنہیا لال کپور، ہنس راج رہبر اور فکر تونسوی بھی رہتے تھے۔ ظاہر ہے ان لوگوں کو ستیارتھی کے افسانے سننے کی اس درجہ سعادت نصیب ہو چکی تھی اور ستیارتھی کی طلسمی شخصیت سے وہ بھی اس درجہ خوف زدہ تھے کہ بعض اوقات ستیارتھی کو دروازے پر ہی کہلوا دیا جاتا کہ کپور صاحب یا رہبر صاحب یا فکر صاحب گھر پر نہیں ہیں۔ لہٰذا ستیارتھی نے دوسرے چوتھے علی الصبح ڈھائی میل کی سیر کرنی شروع کر دی اور میرے منہ پر سے لحاف اٹھا کر یہ مژدہ جانفزا سنانا شروع کر دیا۔

"چڑیاں چہچہا رہی ہیں اور تم سو رہے ہو۔ جاگو پیارے پنڈت! جاگو بھئی!"

ایک ایسے شخص پر جو صبح نو بجے سے پہلے کروٹ نہ لیتا ہو، پانچ چھ بجے ہی یہ انکشاف کر دینا کہ چڑیاں چہچہا رہی ہیں، کس قدر پُرلطف نتائج کا حامل ہو سکتا ہے اسے کچھ وہی خوش نصیب سمجھ سکتے ہیں جن پر ایسی واردات گزری ہو۔ لیکن مجھے خود حیرت ہوتی کہ کس طرح چند دنوں کے بعد ہی چڑیوں کے ساتھ ہی میں بھی چہچہانے لگتا تھا اور اپنی ناقص عقل کے مطابق ستیارتھی کی نئی کہانی میں ترمیم و اضافے کرتا تھا۔ ستیارتھی کے کہنے کی دیر ہوتی تھی اور میں دفتر میں بیماری کی عرضی بھیج دیتا تھا۔ ستیارتھی کے کہنے کی دیر ہوتی تھی اور میں منہ ہاتھ دھوئے بغیر کہیں بھی چھ میل پیدل چلنے پر تیار ہو جاتا تھا اور کسی بھی ضروری کام کے لئے بچا کر رکھے ہوئے پیسوں سے اسے لاطینی لوک گیتوں کی کتاب خرید دیتا تھا۔

بے تکلفی بڑھی تو سب سے پہلا سوال جو میں نے کیا وہ ستیارتھی کی داڑھی سے متعلق تھا۔ "یہ کیا بوجھ اٹھائے پھرتے ہو؟" میں نے اس کی نورانی داڑھی میں انگلیوں سے کنگھی کرتے ہوئے کہا "جوانی میں ہی خود کو بوڑھا بنا کر پیش کرنے سے تمہارے اندر کا مرد تم سے کچھ نہیں کہتا؟"

"کہتا ہے۔" ستیارتھی نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر زور زور سے جھنجھوڑتے، مروڑتے، توڑتے ہوئے کہا "لیکن میرے اندر کا مرد آرٹسٹ بھی ہے۔"

"پھر تو اور بھی مصیبت ہوگی۔"

"آرٹسٹ کھانے کو مانگتا ہے۔" ستیارتھی نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا "میری جیب میں ایک پیسہ نہیں تھا لیکن میں نے پورے ہندوستان کا دورہ کیا۔ اسی داڑھی کی بدولت میں نے بھیل دوشیزاؤں کے جھرمٹ میں بیٹھ کر ان کے لوک گیت سنے۔ اسی داڑھی کی بدولت دونوں ہاتھوں سے یاتریوں کو لوٹنے والے ہردوار کے پنڈتوں نے میرے پاؤں چھوئے۔ سری نگر میں بانجھ عورتوں نے مجھ سے اولاد مانگی اور مجھے بنگال تک جانے کا کرایہ دیا —— آؤ تمہیں ایک تماشہ دکھاؤں۔"

تماشہ یہ تھا کہ ہم سے تھوڑی دور سڑک پر ایک بوڑھا بیٹھا بھٹے بھون رہا تھا۔ ستیارتھی مجھے اس کے پاس لے گیا اور خود اسی کی طرح آلتی پالتی مار کے اس کے پاس بیٹھ گیا۔

"کیوں بھائی!" ستیارتھی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اپنی ملائم دلکش آواز میں کہا "کیسے دیتے ہو بھٹے؟"

بھٹے والے نے چونک کر ستیارتھی کی طرف دیکھا اور ایک دم ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ پھر اس نے چھ سات عمدہ بھٹے ستیارتھی کی طرف بڑھائے اور بولا "آپ مہاتماؤں سے ہم غریب لوگ کیا لیں گے؟ بس اتنی کرپا ہو جائے، کوئی ورا بتا دیجئے۔ بیٹی بیاہنے جوگ ہے۔"

ستیارتھی نے قہقہہ لگا کر کہا "بھائی میں ورا بتانے والا مہاتما نہیں ہوں تم اپنے بھٹے واپس لے لو۔"

ستیارتھی نے ورے کا نمبر نہیں بتایا پھر بھی بھٹے والے نے بھٹے واپس نہیں لئے اور ستیارتھی کے پاؤں چھو چھو کر برا بھلا منہ سے نکالنے کی معافی مانگتا رہا۔

وہ بھٹے بھوننے والا ہو یا صوبے کا وزیرِ اعلیٰ ستیارتھی کی داڑھی ہر جگہ ستیارتھی کے آڑے آتی ہے۔ آپ دل میں لاکھ فیصلہ کر لیجئے کہ ستیارتھی کا کوئی کام ہرگز ہرگز نہیں کریں گے۔ اس کے آنے پر کوئی بہانہ کر کے گھر سے کھسک جائیں گے لیکن جب ستیارتھی آپ کے گھر آئے گا تو نہ صرف آپ کبھی ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھیں گے بلکہ آپ کو خدا کی قدرت بھی نظر آئے گی۔

داڑھی کے علاوہ ستیارتھی کی وضع قطع بھی کام نکالنے میں یدِ طولیٰ کا درجہ رکھتی ہے اور جہاں تک اس کی شیریں اور ریشمیں آواز کا تعلق ہے اس کا تو جواب ہی نہیں۔ ذرا اندازہ لگائیے کہ ستیارتھی لاہور ریلوے اسٹیشن کے کسی پلیٹ فارم پر کھڑا کسی رسالے کی ورق گردانی کر رہا ہے کہ ٹکٹ چیکر اس سے ٹکٹ مانگتا ہے۔ ٹکٹ کے بجائے ستیارتھی اس رسالے میں چھپی ہوئی اپنی تصویر اسے دکھاتا ہے اور انگریزی میں کہتا ہے کہ وہ اس رسالے کو خریدنا چاہتا ہے لیکن اس کے پاس بارہ آنے نہیں۔ کیا ایک ادیب کے لئے وہ اپنی نیک کمائی میں سے بارہ آنے نہیں نکال سکتا؟

ٹکٹ چیکر حیرت و استعجاب سے اس مردِ ملنگ کی طرف دیکھتا ہے۔ ٹکٹ مانگنا بھول جاتا ہے اور نہ صرف بڑے خلوص سے ستیارتھی کو بارہ آنے پیش کرتا ہے بلکہ بلا ٹکٹ سفر کرنے والوں کے لئے اس شاندار موقع سے فائدہ اٹھانے کا موقع بھی فراہم کر دیتا ہے۔

یہ اور اس قسم کی تمام باتیں آج سے دس بارہ سال پہلے کی باتیں ہیں جب ستیارتھی پورے ہندوستان کی صحرانوردی کے بعد لاہور میں آکر مقیم ہو گیا تھا۔ سوائے مضامین کے تھوڑے سے معاوضے کے اس کی کوئی آمدنی نہ تھی اور اس کی بیوی اپنے ہاتھوں کی محنت سے گھر کا پورا پورا کرتی تھی۔ شوہر اور وہ بھی ستیارتھی ایسے الکھ نرنجن شوہر کو برداشت کرنا جو گلنے کے کسی چوراہے میں ایک منٹ کے لئے اسے کھڑا کر کے چھ دن بعد اسے ڈھونڈنے نکلا۔ جو مضامین کا معاوضہ ملنے پر راشن کے بجائے تصویروں کے فلم خرید لیتا تھا۔ گھر میں ناشتے کا سامان نہ ہونے پر خود ناشتہ کرنے کسی دوست کے یہاں چلا جاتا تھا اور وہیں سے جھومر ناچ کے گروپ فوٹو لینے لائل پور جا پہنچتا تھا ——— صرف ستیارتھی کی بردبار بیوی ہی کے بس کی بات تھی۔ ورنہ اس کی جگہ جھومر ناچ کے گروپ فوٹو کی کوئی عورت ہوتی تو ادیب کے بجائے آج ستیارتھی بڑھئی کا کام کر کے کنبے کا پیٹ پال رہا ہوتا۔

لیکن نہیں، میرا یہ اندازہ صحیح نہیں ہے۔ ستیارتھی کو اگر بڑھئی بننا ہوتا تو پٹیالہ ریاست کے اپنے گاؤں سے وہ کبھی باہر نہ نکلتا۔ حصولِ تعلیم کے جو مواقع اسے ملے تھے انہیں یک قلم ترک کر کے خانہ بدوشی اختیار نہ کرتا۔ بچپن ہی سے اس نے ایک حساس دل پایا تھا۔ پہروں کنوئیں کی منڈیر پر بیٹھ کر اس نے رہٹ کی اداس رون رون سنی۔ پنہارنوں کی پازیب کی متوازن اور [illegible] جھنکاروں سے اس نے ان کے دکھوں سکھوں کو ٹٹولا اور کھلے نیلے آسمان میں آزادانہ اڑانیں بھرتی ہوئی کبوتریوں کی پرواز کو سمجھنے کی کوشش کی اور ایک دن ——— پُراسرار فطرت اور پُراسرار انسان کو سمجھنے اور پانے کی شدید خواہش اسے گھر سے لے اڑی۔ آسام کی گھاٹیوں سے لے کر وہ کولمبو کے ناریل کے جھنڈوں تک پہنچا۔ کشمیر کے زعفران زاروں سے لے کر زلفِ بنگال تک کی سیر کی اور اردو ادب کو ہندوستان کی مختلف زبانوں اور بولیوں کے ہزاروں لوک گیتوں سے روشناس کرایا۔ لوک گیتوں کو ادب کا ایک حصہ بنانے اور ان کے ذریعے مختلف قوموں کے کلچر کو ایک لڑی میں پرونے کا جو نمایاں کام ستیارتھی نے سرانجام دیا ہے اور اس کے لئے جو جو صعوبتیں اٹھائی ہیں اردو ادب کی تاریخ اسے کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔

"ان گیتوں کی کھوج میں میں قلندر کی طرح ایک صوبے سے دوسرے صوبے تک گھوما ہوں۔ بھک منگوں کی طرح اپنا کشکول لے کر ہر اس شخص کے پاس گیا ہوں جو اس میں لوک گیت کی چٹکی ڈال سکتا تھا۔ میں نے جواہرات کی مانند ان گیتوں کی قدر کی، قیمتی پتھروں کی طرح انہیں سینے سے لگایا۔ کاش تم اس بات کا اندازہ لگا سکتے کہ ان گیتوں کی خاطر میں نے کس کس کے ناز اٹھائے۔ سانولی سلونی بنگالنوں کے ناز، خوددار گڑھوالنوں کے ناز، ہرنیوں کی مانند ہمالہ کی وادیوں میں چوکڑیاں بھرنے والی نیپالنوں کے ناز...... ذرا سی بات پر چمک کر راہگیروں پر خونی وار کرنے والی پٹھانیوں

گے ناز...... ڈھول کی بھاری بھرکم آواز، بانسری کی مہین اور سریلی تان اور گھنگھروؤں کی سحر آفریں جھنکار میں اونچ نیچ، ذات پات، ہندو مسلمان کے تنفرات سرے ہی نہیں ہو جاتے، ہمیشہ کے لئے فنا بھی ہو جاتے ہیں۔ آزادی کا نغمہ سننے پر غلامی کی زنجیریں ڈھیلی ہی نہیں ہوتیں ٹوٹ بھی جاتی ہیں۔ لوک گیت تو قوم کا دفینہ ہیں اے دوست!"

چنانچہ لوک گیتوں کا یہ رسیا قوم کا دفینہ مستعار لے کر جب لاہور پہنچا تو اس کے بڑے بڑے تھیلے اور اس کے کیمرے کی بند آنکھ میں ہندوستان کی پچپن ہزار زبانوں کے ڈھائی لاکھ لوک گیت اور لوک ناچ محفوظ تھے۔ پنجاب کا گدھا اور جھومر، بنارس اور جونپور کی آلہے، اودھی دادرے اور روپے، راجپوتانے کے جنگی ترانے اور ٹکوا، کشمیر کے خوشبو میں بسے ہوئے نغمے ———— ولیس بدیس کے دل کی دھڑکنیں اس تھیلے اور اس بند آنکھ میں محفوظ تھیں اور جب وہ تھیلا کھلا اور ستھوچی کی آنکھ کی طرح کیمرے کی بند آنکھ کھلی تو مغربی تہذیب کے پروردہ ادیبوں نے چونک کر اپنے ہندوستان کی طرف دیکھا جس کی لمبی داڑھی میں بیکانیر کی ریت بھری ہوئی تھی، جس کا لمبا کھلا کوٹ ننگی ساحلی ہواؤں سے نم آلود تھا اور جس کے ساتھ اس کی کمزور و نحیف بیوی تھی جس کے مدقوق چہرے پر بارہ برس کی کٹھن منزلیں اور ان گنت فاقے کندہ تھے۔

لاہور میں بھی کٹھن منزلوں اور مسلسل فاقوں نے ستیارتھی کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ اس کی ننھی بچی کو تپا اور اس کی بیوی شانتی سدھا ستیارتھی کے چہرے اور اس کے ہاتھوں کی طرف دیکھتی رہی لیکن یہ درویش صفت انسان اپنے حال میں گم رہا۔ ایک عجیب لگن کے ماتحت دن رات لوک گیتوں پر کام کرتا رہا۔ دن رات نائٹرانی خاکے لکھتا رہا اور لکھ لکھ کر دوستوں کو سناتا رہا اور بلا تمیز عمر ان سے زبان و بیان کی غلطیاں درست کرواکے انہیں شائع کرواتا رہا۔ دوست اس کے مضامین اور افسانے سن سن کر عاجز آگئے اس سے کنی کترانے اور اس کو ٹالنے لگے لیکن ستیارتھی ٹلنے والی آسامی نہ تھی ———— "عجیب آدمی ہو" وہ مخاطب کی دکھتی رگ پر انگلی رکھتا۔ "لوک گیتوں کو دھتکار رہے ہو۔ میں نے بارہ برس تک انہیں سنا ہے اور تم بارہ منٹ تک سننے کے لئے بھی آمادہ نہیں۔"

لوک گیتوں کو جمع کرنے میں ستیارتھی نے جتنی محنت کی ہے اس سے کہیں زیادہ محنت وہ بند کمرے میں بیٹھ کر کہانی یا مضمون لکھنے وقت کرتا ہے بلکہ اس سلسلے کی اس کی محنت کا آغاز بہت پہلے شروع ہو جاتا ہے۔ افسانے یا مضمون کا موضوع سوجھتے ہی وہ ہر دوست، ہر ملاقاتی یہاں تک کہ طویلے میں بندھے ہوئے گھوڑے تک کو سناتا ہے۔ ان کے مشوروں سے ذہن ہی ذہن میں اس میں رد و بدل کرتا ہے اور پھر تنگ سطروں کے کاغذ پر باریک اور نوک پلک سے درست حروف میں اس طرح اسے اتارتا ہے اور غلط الفاظ کو کاٹنے کے بجائے یوں بلیڈ سے کھرچ کھرچ کر ان پر نئے الفاظ بٹھاتا ہے گویا سنار بیٹھا انگوٹھی میں نگینے جڑ رہا ہو ———— لیکن جتنی محنت سے وہ انگوٹھی میں نگینے جڑتا ہے اتنی ہی دریا دلی کے ساتھ وہ کم از کم دس دوستوں سے ان نگینوں کو تڑواتا ہے اور ہر دوست کے سامنے نئے سرے سے لکھا ہوا مسودہ رکھتا ہے۔ وجہ کچھ بھی ہو ستیارتھی اپنی ہر تخلیق کے دوران میں عجیب دردِ زہ میں مبتلا رہتا ہے اور چیخ چیخ کر لوگوں کو اپنی روئیداد سناتا رہتا ہے۔

سنہ ۱۹۴۶ء میں سنانے کا یہ مریض لاہور چھوڑ کر دلی میں جا بسا۔ سنت نگر والا اپنا مکان مجھے دلواتے ہوئے اس نے مالک مکان سے کہا "ان سے آپ کو باقاعدہ کرایہ ملے گا ———— اس کا ذمہ میں لیتا ہوں۔"

جس پر مجھے یاد ہے مالک مکان نے تمسخر آمیز نظروں سے ستیارتھی کی طرف دیکھا تھا اور گھاٹ گھاٹ کا پانی پئے ہوئے ستیارتھی نے مالک مکان کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا تھا "گھبرائیے نہیں میرا تین مہینے کا واجب الادا کرایہ آپ کو اگلے مہینے ضرور مل جائے گا ———— اب میں برسرِ روزگار ہوں۔"

مسلسل فاقہ کشی کی زندگی اور بیوی اور بچی کی تکالیف کے خیال نے بالآخر ستیارتھی کے ہتھیار ڈھیلے کر دئے اور اس نے دلی کے ایک سرکاری اخبار میں پناہ لی اور پھر ہندی کے بقراط ادیبوں کی شدید مخالفت کے باوجود داڑھی کے بل بوتے پر جست لگا کر وہ ہندی "آج کل" کا

چیف ایڈیٹر بن گیا اور آج بھی اسی عہدے پر فائز ہے۔

تقسیمِ ہند کے بعد دِلّی میں جب ستیارتھی سے میری ملاقات ہوئی تو اس کا چرمی تھیلا اسی طرح پھولا ہوا تھا۔ اس کا کیمرہ اسی طرح اس کے کندھے سے لٹک رہا تھا۔ اس کی داڑھی اور اس کی سُنانے کی بیماری بدستور تھی البتہ بیماروں کو اس نے رشوت دینی شروع کر دی تھی۔ وہ انہیں اپنی دس ہزار کی گاڑی میں بٹھا کر کناٹ پلیس کی سیر کراتا تھا۔ ہوٹل میں یا اپنے دفتر میں چائے اور بنگالی رس گلوں سے ان کی تواضع کرتا تھا اور ان کے یہاں جانے کے بجائے انہیں اپنے گھر لے جا کر کھانا کھلاتا تھا اور بیوی کا خوش و خرم چہرہ دکھاتا تھا۔ تان اگرچہ کچھ نہ کچھ سُنانے پر ہی ٹوٹتی تھی لیکن اب سُننے والے کے دل میں غصّے کے بجائے اس کے تئیں ہمدردی پیدا ہو جاتی تھی۔

آج وہ پُرتکلف زندگی بسر کر رہا ہے لیکن وہ خوش نہیں۔ آج وہ ہندی، اُردو، پنجابی اور انگریزی کی درجن سے زیادہ کتابوں کا مصنف ہے لیکن وہ خوش نہیں اور اس لئے خوش نہیں کہ جن تلوں سے وہ بڑی محنت سے تیل نکالتا تھا آج وہ تل از خود تیل اُگل دیتے ہیں۔ وہ انہیں کچھ کھلاتا پلاتا ہے تو وہ سمجھتے ہیں کہ ستیارتھی اپنا پُرانا قرض چکا رہا ہے، اور وہ اس لئے بھی خوش نہیں کہ کسی سے ترجمہ و اضافہ کرائے بغیر اسے اپنی کہانیاں اور مضامین شائع کرانے پڑتے ہیں۔

کل ایک تشویش ناک خبر کی تصدیق کے لئے میں نے ستیارتھی کو فون کیا۔

"ہاں!" اس کی نرم و گداز آواز آئی "حکومتِ ہند اُردو اور ہندی کا 'آج کل' کو ختم کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔"

"پھر——میرا مطلب ہے اس صورت میں تمہاری داڑھی ....."

"داڑھی سے اس بار میں کام نہیں لوں گا——میں پرسوں آسام جا رہا ہوں۔ وہاں سے مشرقی بنگال جاؤں گا اور وہاں سے ....."

"اور اس دوران میں اگر تمہاری نوکری ....."

"نوکری کی اب مجھے زیادہ فکر نہیں——نوکری سالی نے مجھے مفلوج کر دیا ہے——میں تو وہاں جامع مسجد کی سیڑھیوں میں تمہارے قریب آنا چاہتا ہوں۔"

"آسام میں تمہارا کیا پتہ ہوگا؟"

قہقہہ لگاتے ہوئے اس نے جواب دیا "وہی تھیلا، کیمرہ اور داڑھی!"

---

۲۵ ستمبر ۶۲ء

آئینۂ تجربہ

۱۹۱۱ ——— ستمبر ۱۹۴۵

وہ چہرے پر پانی چھپکے جھٹنے آئی اور میرے پلو سے منہ رگڑنے لگی۔ میں نے اس کا چہرہ پونچھ دیا تو وہ اپنا بھولا سا منہ اٹھا کر بولی: "امی دیکھئے خدیجہ نکل آئی" یہ چاند نکل آنے کے مبالغے کا معصوم جواب تھا ــــ خدیجہ کا یہ معصوم فقرہ سن کر ہم بہت ہنسے۔ لیکن میں سوچ میں پڑ گئی کہ دیکھو وہ ننھے پن میں بھی چاند کے مبالغے میں نہیں الجھی۔ وہ تو اپنے آپ کو اتنا اہم سمجھتی تھی کہ "چاند" کے مقابلے میں خدیجہ کو منوا لیا ــــ امی کہتی ہیں وہ دن اور آج کا دن میں نے بچوں کے لئے دلار کے الفاظ استعمال کرنا چھوڑ دیئے۔

خدیجہ ۲۱ دسمبر ۱۹۲۰ء کو پیدا ہوئی۔ وہ مجھ سے ایک سال ایک ماہ پانچ دن بڑی ہے (اگر میرا حساب غلط نہ ہو تو) بچپن میں میں اسے دیدی کہہ کر پکارتی۔ لیکن دیدی کہنے کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ واقعی میری بڑی بہن بن بیٹھی۔ ہم نے ساتھ ساتھ ہوش سنبھالا۔ حد تو یہ ہے کہ الف بے شروع کرنے سے لے کر نکاح کی ہاں تک ساتھ ساتھ کی۔ اس کے باوجود ہمیشہ اسے اپنی بڑی بہن اور محافظ پایا۔ اس طرح اس کے بارے میں میرا علم اتنا ہی گہرا ہے جتنا اپنے بارے میں۔ اور جس طرح اپنے بارے میں لکھنا مشکل ہے اسی طرح خدیجہ کے بارے میں بھی۔ یہ سچ ہے خدیجہ پر لکھنا میرے لئے ایک بہت سخت الجھن میں مبتلا ہو گئی ہوں۔ ہر خدیجہ کی زندگی کے ساحل پر کھڑے ہو کر دیکھتی تو شاید کوئی چٹ پٹی تحریر ملتی لیکن یہاں تو میں اسی کے ساتھ بہتی ہوں اور اسی کا ایک حصہ ہوں۔ اس قصے میں اگر "میں" کہیں کہیں آ جاؤں تو میرا قصور نہیں۔ واقعات کا قصور ہے ــــ

یوں تو میں کہہ رہی تھی کہ وہ مجھے اپنی چھوٹی بہن سمجھتی ہے۔ بچپن میں اسے دیدی کہتی تھی ذرا ہوش آیا تو خدیجہ کو سخت اعتراض ہوا، کہتی میرا نام لیا کرو ہم تم تو دوست ہیں اور ہمیشہ برابر کی سطح پر رہے ہیں۔ لیکن عملاً اس کا رویہ میری طرف بہت مشفقانہ اور سرپرستانہ ہوتا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ میرے ہی ساتھ نہیں بلکہ بعض اوقات تو اپنے سے دگنی چوگنی عمر والوں کے لئے بھی وہی مشفق بڑی بہن والا انداز ہوتا ہے اور مجھے حیرت ہوتی ہے جب یہ لوگ بلا چون وچرا اس کی شفقت قبول کر لیتے ہیں۔

بچپن میں خدیجہ بڑی تیز طرار اور کھلنڈری تھی۔ چھوٹے چھوٹے قصبوں میں تفریح کے کوئی اعلیٰ ذرائع تو ہوتے نہیں۔ وہیں تعینات ہونے والے چھوٹے بڑے افسر یا مقامی وکیل وغیرہ مل کر عموماً ایک جگہ اکٹھا ہو جایا کرتے اور جسے بڑے ارمان سے کلب کہتے۔ ان کلبوں میں ٹینس اور کیرم قسم کے کھیل سے جی بہلا کر اپنے حساب میں شہری روایات سے ناطہ جوڑے رہتے۔ اسی طرح چھوٹی چھوٹی جگہوں پر اپنا رعب، داب قائم رکھنے کے لئے اپنے بچوں کو بھی عام بچوں سے جدا رکھنے کی کوشش میں "کلب" کا ایک حصہ اپنے بچوں کے لئے وقف کر دیتے۔ یہاں ہفتے کو بچوں کا خاص دن ہوتا۔ اور ان چھوٹے افسروں کی پردہ دار بیویاں اپنے بچوں کی گڈیاں صاف کر کے ہلکے کرتے لمبی فراک، اور ریشمی نیکروں سے سجا کر اور کینوس کے جوتے پہنا کر دو روپے مہینے پر رکھی ہوئی آیاؤں کے ہمراہ کلب بھیجتیں۔ اس دن بچوں کو اپنے آباؤں کے سامنے چھوٹے موٹے کھیلوں کے مقابلے میں حصہ لینا پڑتا اور پھر انعامات بٹتے جنہیں پا کر یہ بچے قصبے کے دوسرے بچوں پر رعب جماتے۔ وہ بچے جو خار دار تاروں سے چپٹے دور کھڑے یہ سارے تماشے دیکھتے۔ ان مقابلوں میں خدیجہ ہر معاملے میں چیمپئن ہوتی۔ بڑی تیاریاں ہوتیں۔ ہفتے کے ہفتے نائی کے سامنے بیٹھ کر سر کے بڑھے ہوئے بال ترشوائے جاتے اور ہم سب بڑے پاؤں سے یہ سب کروا لیتے، خواہ نائی کی قینچی کتنا ہی گڑگڑائے یا نوچے ــــ لیکن خدیجہ گنوارن کہلانا پسند کرتی مگر اپنی موٹی موٹی چوٹیاں اس قینچی کو نہ چھونے دیتی۔ ننھے سے قد پر لمبی لمبی چوٹیاں اس وقت بڑی دلچسپ لگتیں جب وہ دوڑ میں حصہ لیتی اور دوڑ کا یہ حال کہ جیتے لپکتے لڑکے گزوں پیچھے ہانپتے رہ جاتے ــــ "پوئم" سنانے کا مقابلہ ہوتا تو دوسرے بچے شرمائے جا رہے ہیں مگر آپ بڑی بے حیائی سے کھڑی ہوئی بڑی بڑی آنکھیں نچا نچا کر پوئم کو قینچی کی طرح کتر کر پھینک دیتی تھیں۔

خدیجہ کی زبان بڑی دھاردار ہے، بچپن میں اس کی تیزی کی وجہ سے بچے اسے "خدیجہ قینچی" کہہ کر چڑاتے لیکن یہ ذرا نہ بگڑتی اور فخر سے سر اونچا کر کے چلتی "ہاں ہاں قینچی ہیں، کچھ بگاڑ لو ہمارا، لاؤ تمہارے کان کتر لیں" کلب کے بنے ٹھنے بچے خدیجہ کو ذرا نہ پسند کرتے، خدیجہ کی اصل مقبولیت تو قصبے کے بھنگیوں، چماروں، کنجڑوں اور چپراسیوں کے بچوں میں تھی۔ مرغی ملا اور مزے سے ان کے گلے میں ہاتھ ڈالے گھوم رہی ہے۔ آپا میاں روئے

پر ہوتے تو تمام تمام دن گلی ڈنڈا، کشتی اور کبڈی ہوتی۔ مجھے بھی ان ممنوعہ چیزوں سے ہم آغوش کرنے کی کوشش کرتی لیکن اب اس لائن کی عادی نہ تھی۔ اپنے کھیلوں سے فرصت پا کر کبھی کبھار اس کا جوش و خروش دیکھنے کھڑی ہو جاتی ——— اور جب وہ اپنے سے فٹ بھر اونچے لڑکے لڑکیوں سے خم ٹھونک کر کشتی لڑتی تو میں بھول بھال رونا شروع کر دیتی ——— یہی نہیں بلکہ انہی بچوں کے انداز کی باتیں بھی ——— "اچھا بیٹا! لنگڑی مارتے ہو! ابھی دیکھو کر پر اٹھا کر پھینکیں گے سالے کی ہڈیاں چور ہو جائیں گی۔" اور اسی قسم کی ساری خرافات ——— جب میں بہت چلاتی تو کھلکھلا کر بڑے انداز سے اکڑتی آتی۔

"بڑی بزدل ہو یار، تم بھی کشتی لڑو، چاہو میں وہ داؤں بتاؤں کہ سالا کوئی سامنے نہ آئے۔" وہ مجھے مشورہ دیتی اور میں اس کا مشورہ قبول کرنے کے بجائے اس کی پھٹی ہوئی فراک اور [illegible] تپا ہوا چہرہ دیکھ دیکھ کر مارے محبت کے رو سکتی ——— اور اگر کہیں خدیجہ کا ازلی بیری کمال جو اسی ڈھونڈھتا ہوا پہنچتا، تو سب ملیا میٹ ہو جاتا۔ غریب بچوں کا دم نکلتا اس کی صورت دیکھ کر۔ سب گھبرا کر بھاگتے جو پکڑا جاتا اسے دھولیں پڑتا اور خدیجہ اس بد نصیب کو بچانے کے لئے کمال کی ٹانگوں سے لپٹ کر اسے نوچ ڈالتی۔ اور پھر وہ سب سے زیادہ کڑوا روپ اختیار کر لیتا۔ "چلو آنے دو صاحب کو، سب شکایتیں کروں گا ——— اور بیگم صاحب ڈنڈا لئے بیٹھی ہیں، دیکھو کیا گت بنتی ہے ——" وہ ہمیں گھسیٹتا ہوا گھر لے جاتا ——— لیکن خدیجہ کی کج کلاہی میں ذرا فرق نہ آتا [illegible] ——— "یہ پاپی ہیں مجھے ذرا چوٹ نہیں لگتی۔" گھر پہنچ کر واقعی پٹائی ہوتی۔ اگر مجھ پر ہاتھ اٹھتا تو خدیجہ فوراً آنکھیں نکال کر چلاتی "ارے ارے اسے کیوں مارتی ہیں، تو تماشہ دیکھتی ہے۔ میں تھک گئی تو پھر دیکھ مجھے بھی مار"۔ پڑ کر خدیجہ کے ساتھ رونا پڑتا روحانی تب ہی لیکن خدیجہ کی روتی اور خاموش بیٹھی تھی۔ گھنٹوں آنکھیں مل مل کر روتی رہتی۔ لیکن دوسرے دن پھر وہی کبڈی اور وہ ——— مگر اب یہ ساری اچھل پھاند اور دوڑ بھاگ، شطرنج کے افیونی کھیل میں تبدیل ہو گئی ہے۔ اس کی لمبی لمبی بانہوں اور آپریشنوں نے اسے تتلیوں کی طرح اڑنے سے مجبور کر دیا ——— اور پھر ماحول بھی تو بدل گیا تھا ——— سینتیں میں گھری ہوئی یتیم لڑکی گھر کے آنگن میں دوڑتی بھی تو کتنا، دیواروں سے ٹکرا کر رہ جاتی ——— جب خود مختاری کی ٹوٹ بھی جسمانی کمزوری نے شطرنج میں پناہ ڈھونڈھ لی ——— ایسا آگ کر کھیلتی ہے کہ دیکھنے والوں کو شطرنج سے نفرت ہو جائے۔ شطرنج کے گھوڑے دوڑانے کے علاوہ اخبار میں اسپورٹس رپورٹس بھی ذوق و شوق سے پڑھتی ہے ——— وہ دن بہت شاندار ہوتا ہے جب کہیں کرکٹ میچ ہو اور سونے پر سہاگہ جب ہوتا ہے کہ ریڈیو پر کمنٹری بھی ہو رہی ہو ——— کہاں بیٹھی ہو، ریڈیو سے کان لگائے بیٹھی ہیں۔ "وہ مارا ——— آؤٹ ——— آؤٹ!" کرسی سے اچھل پڑ رہی ہیں تالیاں بجا رہی ہیں۔ اگر اس دوران میں ہم جیسا کوئی اللہ کا بندہ پہنچ جائے تو اس کے منہ سے نہ صرف میچ کی پوری تفصیل سنئے بلکہ کرکٹ کی تاریخ پر بھی پورا عبور حاصل کیجئے۔ ورنہ بد مذاقی کے طعنے سنئے۔

خدیجہ نے بڑی چوریاں کی ہیں ——— مگر مجھے ایک دفعہ کے سوا یاد نہیں کہ اس نے اپنے لئے کوئی چیز چرائی ہو ——— چوری کی لت یوں پڑی کہ خدیجہ کچھ مکانوں کے مکینوں سے ملی ہوئی تھی اور ان مکانوں میں کیا حالت ہوتی ہے یہ کون نہیں جانتا۔ وہ کہانی سب کو بتاتی "ہم نے آج کھیر کھائی تھی۔"

"بہت سا گڑ ڈالا ہو گا اس میں؟" بچے زبان چٹخاتے۔

"گڑ؟ گڑ تو امی کھانے نہیں دیتیں، شکر کی ہو گی۔" جواب دیتی۔

"شکر کی کھیر کا رنگ لال ہوتا ہے؟" بچے کہتے۔

"بہت سفید ہوتا ہے۔ بالکل سفید!" اور پھر خدیجہ کو اپنی بات کے ثبوت میں دو چار پیالے فیرنی کے گھر سے چرانا پڑتے۔ اس کے بغیر بات مکمل ہی نہ ہوتی۔

یہ چوریوں کا سلسلہ بڑا طویل ہو گیا۔ جوں جوں وہ ان گھروں میں گھستی گئی، ویسے ویسے چیزوں کے مزے سے ان کو متعارف کرانا ضروری معلوم ہوتا گیا۔ دالیں، مصالحے، میوے، چھپا لیا، کتنا شکر پیسے جو ہاتھ لگا اڑا لیتی اور دوستی کے بندھن مضبوط ہوتے رہتے۔ چوریاں پکڑی گئیں اور اس عادت پر کافی مرمت بھی ہوئی، لیکن مکمل تحقیقات کے بعد آبا میاں نے سزاؤں کا سلسلہ یک لخت بند کروا دیا۔ بلکہ آہستہ آہستہ سمجھانا شروع کیا۔ کچھ سمجھیں کچھ نہ سمجھیں ———

جب ابا میاں ہی ختم ہو گئے تو اسٹور اتنا خالی رہنے لگا کہ خاک دھول چرائیں اور بانٹیں۔ مگر بانٹنے اور بخشنے کا یہ سلسلہ آج تک تو نہ چھوٹا — اب چرانے کی تکلیف اٹھانے کی ضرورت نہیں کیونکہ اپنی مالک آپ ہیں۔ اب بھی یہ حال ہے کہ کوئی بہن، نند، دوست یا نوکر یا غیر کسی چیز کی تعریف کر دے تو فوراً اس کو بخش دیں گی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے پاس کپڑے بہت ہی کم ہوتے ہیں۔ اور پیسے کے معاملے میں قطعی کھوکھلی۔ اپنی کوئی کتاب مکمل کرنے سے پہلے ہی یہ طے کر لیتی ہیں کہ اس کتاب کا معاوضہ فلاں فلاں کے لئے ہے۔ — مگر یہ مزا اور لذّت انہی لوگوں کے لئے ہے جن کے لئے اسے ذرا بھی شبہ پڑ جائے کہ یہ اچھا آدمی ہے، اب یہ ضروری نہیں کہ وہ ہمیشہ اسے برا بھلا ہی کہتی آئی ہو، مگر کوئی لمحہ ایسا ہو سکتا ہے کہ اس کے سارے عیب آنکھوں سے اوجھل ہو جائیں — میں شرطیہ کہہ سکتی ہوں کہ نہ صرف اس معاملے میں بڑی جذباتی اور کچی ہے (یہ دوسری بات ہے کہ ان کا یہ کچا پن بھی کوئی پٹیلیٹ بھی ان کے لئے شرط ضروری ہے ثابت ہو جائے) اپنے قریب آنے والوں پر وہ فوراً ہی بھروسہ کرنے لگتی ہے اور پہلے حد شدت سے اس کے گن گانے لگے گی۔ لیکن جب اس طرف سے کوئی چوٹ لگ جائے تو پھر اس سے کھنچی کھنچی رہنے لگے گی۔ لیکن اگر وہ پلٹ کر ذرا بھی تہدید کر دے تو پھر وہی…

اس سلسلے میں کوئی سمجھائے کہ بھئی ذرا احتیاط کیا کرو، جلدی سے سب کو اچھا نہ سمجھ لیا کرو، تو آپے سے باہر ہو جائے گی — "واہ بھئی! انسان نہ ہوا بنیا ہو گیا۔ ہر وقت اسی چکر میں رہے کہ کہاں ڈنڈی ماروں، کہاں ملاوٹ کروں، اور کہاں جھکتا تولوں — اس طرح تو میری زندگی نہیں گزر سکتی۔ کھو تو دنیا میں کسی سے ملوں گی نہیں — بابا میں انسان ہوں، جس کے لئے جو جذبہ پیدا ہوتا ہے، بغیر لاگ لپیٹ کے اسے برتوں گی، مجھ سے یہ تمہارا انگلش اخلاق نہیں سنبھلے گا۔"

"اتنی بہادر ہو تو پھر بعد میں روتی کیوں ہو؟"

"کیوں، رونا کوئی غیر انسانی جذبہ ہے۔ اگر رونا برا ہوتا تو اللہ میاں یہ غدود ہی غائب رکھتے۔ ہزار دفعہ روئیں گے۔ دکھ ہو گا تو روئیں نہیں تو کیا ہنسیں؟ تمہارا کیا! جب جگر خون بنتا ہے تو درد آنسو آتے ہیں۔"

تو جگر کو خون بنانے پر وہ تلی رہتی ہے۔ کیونکہ اسے لوگوں کی طرف سے زک پہنچتے ہیں — مگر کبھی بعض وسوسے اور تصورات تک بلا دینے ہیں مثلاً کسی عزیز کی صحت خراب ہو تو اس سے ہمیشہ کے لئے چھٹ جانے کے خوف سے وہ کبھی کبھی گھٹتی ہے اور آنسو بہا لیتی ہے۔ یہ چھٹ جانے چھن جانے کا خوف اس پر جب مسلط ہو جائے تو ہر چیز سے بیزار ہو جاتی ہے — صرف یہ وسوسے ہی اسے نہیں رلاتے بلکہ کبھی کبھی تو اس کا قلم بھی اسے دکھ دینے لگتا ہے — مثلاً بہت دن گزر گئے ہیں — دنیا جہاں کے منصوبوں میں ڈوبی ہوئی ہے، بخششیں ہیں، سوغاتیں ہیں۔ دنیا جہاں کے غموں میں گھلی ہو رہی ہے۔ اچانک خیال آ گیا کہ بہت دن سے کچھ لکھا نہیں — بس فوراً نہایت وحدانی کیفیت طاری ہو گئی۔ دنیا سے منہ موڑ لیا، سارے جہاں کے درد دفنا دئے۔ ساری محبتوں پر لعنت بھیج دی اور قلم کاغذ لے کر اپنے پلنگ پر کروٹ سے لیٹ گئیں۔ ٹانگ پر ٹانگ اور ندھائے ہلائے جا رہی ہے، آدھی بات بڑبڑاتی ہے۔ دو چار سطریں لکھتی ہے — دیر تک جب بات نہ بنے تو رونا آ جائے گا۔ "ہائے یہ دماغ! زنگ لگ گیا اس میں۔ جہنم میں جائیں یہ ساری محبتیں۔ ظہیر کب جانتے ہیں کہ میں رات دن ان کا خیال کرتی رہوں، پرویز بھی میری پروا نہیں کرتا، دن بھر آپا سے عشق کرتا ہے — لالہ دفتر میں بہت کام کرتے ہیں تو کیا ہوا، سبھی دفتر میں بہت کام کرتے ہیں۔ میں کیوں اس غم میں مبتلا رہوں — عابدہ بیمار ہے تو میں کیا کروں، علاج تو ہو رہا ہے — آخر میں ہی کیوں سب کی خاطر مرتی پھرتی ہوں، ذرا بیٹھ کر نہیں سوچتی، کوئی کام کی بات نہیں سوجھتی؟"

جب یہ دورہ پڑ جائے اور کافی رو لیں تو سمجھ لیجئے کہ کوئی افسانہ لکھ لیں گی۔ اور پھر اس کے بعد پہلے سے زیادہ گرم جوشی سے اپنے چہیتوں پر مرنا شروع ہو جائے گا۔

لکھنے کی بات پر یہ بتاتی چلوں کہ سات آٹھ سال کی عمر سے ہی ان کا ایک اسکینڈل ہو گیا۔ گھر کا ماحول سخت علمی، ادبی، سیاسی قسم کا تھا — والد

زمانہ رسائل کی مضمون نگار، والدان کے بھی استاد۔ دنیا جہان کی کتابیں پڑھنے اور جاننے کا شوق، گھر میں دن رات یہی چرچے۔ کہیں سے خدیجہ کے پلّے لفظ مد پلاٹ پڑ گیا۔ اب سب سے کہہ کہہ کر تھکی جا رہی ہیں کہ میرے دماغ میں اتنے پلاٹ ہیں کہ لکھنا چاہوں تو ڈھیر لگا دوں اور لوگ ہیں کہ مذاق اڑا اڑا کر تھک گئے پر یہ نہ تھکیں۔ اسکول کے زمانے میں بڑا تیز تھیں (ریاضی جیسے بے تکے مضمون میں بھی تیز!) اسی لئے گھر میں کتابوں پر کتابیں، رسالوں پر رسالے پڑھے پھینکے دے رہی ہیں ـــــ اور جناب ادھر بادل گھر کر آئے اور وہ بڑے فلسفیانہ موڈ میں کھڑکی میں بیٹھی "تلاشِ پلاٹ" اور فکرِ شعر فرما رہی ہیں۔ پہلے وہ گیت لکھنے کی کوشش کرتی رہی ہیں، سب ہنستے مگر ان کے کان پر جوں نہ رینگتی۔ ایک بار مجھ سے ان کی یہ قابلِ رحم حالت نہ دیکھی گئی۔ میں نے بڑی رقت سے کہا "بی بی یہ نہ کیا کرو، سب تمہیں اُلّو بناتے ہیں" جواباً انہوں نے نہایت خلوص سے مجھ سے فرمایا کہ "دیکھو بجو بی بی تم بھی بیٹھ کر سوچا کرو پھر ہم لوگوں کا نام چھپا کرے گا۔" (اس وقت تو مجھ پر اثر نہ ہوا، مگر س۴۲ء میں یہ جرائم انہوں نے مجھے لگا کر چھوڑے) انہیں دیکھ دیکھ کر سارے بچے عبرت حاصل کرتے۔

اسکول میں جہاں کلاس میں تیزی کی وجہ سے وہ سب ٹیچرز کی چہیتی تھی۔ وہاں بچے اس سے گھبراتے اور اسے تنگ کرنے کی جرأت نہ کرتے۔ مجھے اگر کوئی تنگ کرتا تو وہ "جناح" کا کاٹ بن کر لپٹ جاتی اور وہ سبق پڑھاتی کہ دوبارہ کسی کی ہمت نہ پڑتی کہ مجھے تنگ کرے۔ اور آج بھی خدیجہ کے سامنے مجھے کوئی کچھ کہہ کر دیکھے۔ ساری دنیا ایک طرف اور خدیجہ ایک طرف۔ خواہ میں اپنی پیروی کروانے پر راضی ہوں یا نہ ہوں مگر وہ کر کے رہے گی۔ حد تو یہ ہے کہ امی تک اسے میرا کوئی عیب نہیں سُن سکتی۔ امی جل کر کہا کرتی ہیں "لو بھئی وہ ابرہ کی والدہ صاحبہ میرے سر پر گئیں!" خدیجہ مجھے لپ بند کرتی ہے اس لئے ہنستے ہنستے یہ طعنے سن لیتی ہے۔ وہ تو جسے بھی پسند کرے اس کے لئے کسی سے کچھ نہیں سن سکتی۔ اس معاملے میں بڑی ڈھیٹ ہے لیکن جہاں اپنے چہیتوں کی وکالت کرتی اور دم دیتی ہے، وہاں انہیں اپنی اپنی جگہ رلکھوا کر نصیحتیں بھی کرتی ہے۔ مثلاً ندیم سے کہیں گی "لالہ بچیوں کے لئے کچھ جمع بھی کیا کرو، انشورنس تو فوراً کرا لو فضول خرچی نہ کیا کرو لالہ" لالہ کہیں گے "یہ تیور لاؤ دکھاؤ تم نے کیا جمع کیا ہے؟" اور خدیجہ کو چوٹ سی لگے گی "ارے لالہ مجھے طعنے نہ دیا کرو سسرال والوں کی طرح، میرے پاس بچا ہی کیا ہے۔ حساب لے لو، اگر میں خود جوڑ کر رہی ہوں نہیں جانتی کہ تہ کرو؟"

اگر اس باریک نکتے کو لالہ نہ سمجھ سکیں تو اداس ہو جائیں گی۔ مجھے بھی جب ملتی ہیں تو نصیحتیں ضرور کرتی ہیں۔ اور ہم میں اکثر لڑائی ہو جاتی ہے۔ میں لڑنے میں کافی تیز ہوں اور لڑ کر خود کو مظلوم بھی نہیں سمجھتی۔ لیکن خدیجہ لڑ کر ذرا ہی دیر بعد سارا الزام اپنے سر تھوپ لیتی ہیں اور پھر بیٹھی گھنٹوں پچھتائیں گی۔ جلد سے جلد موقع تلاش کر کے ہنسی شور مچاتی آ کر ملاپ کریں گی۔ لیکن دوسرے ہی لمحے میری کاہلی اور گھر کے اگڑم بگڑم پن پر گفتگو شروع کر دیں گی۔

انہیں اپنا گھر صاف ستھرا اور خوبصورت رکھنے کا بہت خیال رہتا ہے۔ بس چلے تو دنیا بھر کا حسن لا کر اپنے گھر میں بند کر لیں۔ ذرا سی بدنظمی برداشت نہیں کرتیں۔ نوکروں سے خوب دوستانہ تعلقات رکھتی ہیں اس لئے نوکر بھی خوش رہتے ہیں ـــ پچھلے دنوں لاہور میں قیامت کی بارش ہوئی۔ ظاہر ہے کہ ایسی موسلا دھار بارش لاہور کے گھروں کی چھتوں نے کاہے کو کبھی دیکھی تھی۔ اب دھوپ نکلنے کے بعد چھتیں خشک ہوئیں تو چونا جھڑنے لگا۔ یہ سبھی گھروں کا حال تھا۔ لیکن یہ چھن چھن جھڑتا ہوا چونا خدیجہ کے سر پر ستون کا بوجھ بن گیا۔ اس زمانے میں ندیم بھائی کا اسکیچ لکھ رہی تھیں۔ اسی دوران میں اٹھا کر رکھ دیا۔ اور لگ گئیں رات دن چھت کے پیچھے۔ آج جھاڑو سے جھڑوائی۔ کل کپڑے سے رگڑوائی، پرسوں دوبارہ سفیدی کروائی۔ اس دوران میں طفیل صاحب تقاضے کے لئے پہنچے تو ان سے لالہ کے اسکیچ کی بات سرسری طور پر کی اور جوڑنے کی کوئی پندرہ منٹ۔

اب سگھڑاپے کا سلسلہ چلا ہے تو عرض کر دوں کہ اس سگھڑاپے کے مارے بچپن میں تیرے میرے گھر باجرے کی روٹیاں پکانا سیکھ آئی تھیں۔ کیونکہ گھر پر والد کا حکم تھا کہ لڑکیوں کو تعلیم کے زمانے میں چولہا ہنڈیا کی طرف بالکل متوجہ نہ ہونے دیا جائے گا۔ سو گھر کی ماما یا خانساماں لئے مستعد ہوتے کہ خدیجہ بے چاری کو چوری کے لئے بھی باورچی خانے میں قدم نہ رکھنے دیتے۔ اب بے چاری کو گھرداری کا شوق تو تھا ہی اس لئے اپاہج امامن کی اماں کے گھر موقع پا کر روٹی پکا آتیں۔ ایک دن امامن کی اماں کو ہمارے ہاں کا ایک ملازم اطلاع دینے گیا کہ رات نیاز ہے، کھانا لینے اپنے لونڈے کو بھیج دینا۔

دیکھا تو خدیجہ گھرداری سیکھ رہی ہیں۔ اس دن تو خدیجہ نے نوکر کو دو پیسے رشوت دے کر اتی سے یہ راز چھپا لیا۔ لیکن یہ راز اس وقت کھلا جب ابا میاں کے نہ ہونے سے گھر بگڑا اور خدیجہ نے نہایت ذوق و شوق سے گھرداری میں ایک بچے کچھے وفادار ملازم کا ہاتھ بٹانا شروع کیا۔

اب بھی کبھی کبھی نہایت جوش سے باورچی خانے میں نوکر کو اچھی روٹیاں پکانے کا طریقہ بتانے جاتی ہیں۔ لیکن ضروری نہیں کہ ہاتھوں کے ساتھ دماغ بھی رہے۔ اس لئے اکثر تیزی میں توے پر بڑی سی چپاتی پر دوسری نہایت لکھنوی قسم کی مہین چپاتی کشونک دیتی ہیں۔

کھویا کھویا رہنا، اور بیٹھے بیٹھے غائب ہو جانا ان کے باتیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ محفل جمی ہے۔ خود بھی خوب چہک رہی ہیں کہ اچانک بھاگ لیں، پکڑی اس وقت جاتی ہیں جب کوئی ایسی حرکت کر بیٹھیں بسلاً زیر بحث موضوع پر ان سے کوئی سوال کر بیٹھیے ——"ہوں"—"ہوں"— آپ آنکھوں میں آنکھیں ڈالے فرمائیں گی —— صاف پتہ چل جاتا ہے کہ بے چاری کہیں سے گھوم پھر کر آ رہی ہیں۔

خدیجہ کی طبیعت اونچ نیچ سے واقف نہیں۔ وہ صاف سیدھی لائن پر کھٹ کھٹ کرتی بڑھتی چلی جاتی ہیں۔ پیٹھ پیچھے نہ کسی کو کچھ کہیں نہ منہ سامنے ہی جو منہ میں آتا ہے کہہ بیٹھتی ہیں۔ جو کرنا چاہتی ہیں کر لیتی ہیں۔ کوشش بھی کریں تو بننا بالکل نہیں آتا۔ چھپنے اور پڑھے جانے کا ذرہ بھر احساس نہیں۔ کم از کم بظاہر تو بالکل نہیں ہوتا۔ جہاں آتی جاتی ہیں اپنی مخصوص لاابالیانہ سادگی سے۔ کتنے ہی جغادری ادیب یا نقاد بیٹھے ادب بگھارتے رہیں، مرعوب بالکل نہیں ہوتیں۔ اور نہ خود ادب بگھار کر دوسروں کو متاثر کرتی ہیں۔ کتنے ہی اونچے طبقے کی اپٹو ڈیٹ خواتین و حضرات کے جمگھٹ میں پھنس جائیں، اپنے آپ پر ان کا عکس بھی نہ پڑنے دیں گی۔ —— ایک دفعہ ایک بہت بڑے ویٹ ہوم میں جہاں لاہور کا نہایت چمکیلا طبقہ زیادہ تعداد میں جمع کر دیا گیا تھا۔ مجھے بھی جانا تھا —— میں اس ماحول کے کھوکھلے پن سے گھبراتی ہوں۔ میں اسی کشمکش میں ذرا دیر سے پہنچی۔ دیکھا تو خدیجہ موجود، ایک خاتون سے چہک رہی ہیں۔ اور قریب ہی ایک افسانہ نگار خاتون نہایت تکلف سے کھڑی کچھ کھا رہی تھیں۔ خدیجہ نے ان خاتون سے میرا تعارف کرایا، اور پھر ہم دوسرے دوستوں میں گھل مل گئے۔ تقریب کے خاتمے پر ہم بہنیں ایک طرف کھڑی کچھ ادھر ادھر کی باتیں کر رہی تھیں کہ وہی افسانہ نگار خاتون ہماری طرف آئیں اور خدیجہ سے نہایت پلی پٹی مسکراہٹ کے ساتھ مخاطب ہوئیں "آپ کا شکریہ ادا کر لوں میں نے سوچا۔ کیونکہ آپ نے اپنا تعارف خود کرایا تھا۔" ہاتھ ملا کر دوسرے لمحے وہ اس شام کی گہماگہمی میں غائب ہو گئیں، اور ان کا انتہا اعلیٰ ادبی فقرہ میرے کانوں میں گونجتا رہ گیا۔ خدیجہ نے ایک لمحے ادھر دیکھا، اور پھر پرانے موضوع پر اس جوش سے باتیں کرنے لگیں جیسے کوئی بات ہی نہیں ہوئی —— لیکن مجھے ان کا تکیہ کلام "بہت کھلا تھا۔ اس لئے میں خدیجہ پر برس پڑی۔ "کتنی دفعہ کہتی ہوں، ایسے لوگوں سے انہی جیسا رویہ اختیار کیا کرو۔ یہ محترمہ اپنے آپ کو لاثانی ——"

"لاحول ولا"، خدیجہ نے سختی سے میری بات کاٹ دی۔ "میں تو ہرگز یہ نہیں کروں گی۔ میرا جی چاہا کہ ان سے بات کروں کیونکہ وہ تنہا منہ بسورے کھڑی تھیں۔ ہنہ۔ کیا بیہودہ بات ہے کہ ایک شخص اکیلا کھڑا ہو اور دوسرا اس سے بات نہ کرے —— اب رہا محترمہ کا اپنے آپ کو لاثانی سمجھنا تو کیا ہرج ہے، آج ان کی شام ذرا زیادہ تاریخی ہو جائے گی —— اس میں تمہیں دکھ کیوں ہوا —— سچ کہہ دوں تم میں سے تمہاری ذات غائب ہوتی جا رہی ہے۔ تم تو جوں جوں آگے بڑھ رہی ہو آئینہ بن رہی ہو —— جو تمہارے قریب آئے اپنا ہی عکس پائے —— کبھی میں ایسی تہذیب سے باز آئی۔"

اس قسم کے لمبے چوڑے لیکچر سے میں مکدر رہ کر خاموش ہو رہی۔ لیکن خدیجہ۔ مجھے آج تک قائل کرتی رہتی ہیں۔

خدیجہ میں مزاح اور طنز کی سادگی کی حس بھی کافی موجود ہے۔ اس لئے پھبتی اڑانے میں بہت تیز ہیں۔ مشکل ہی سے کسی کو بخشنے پر تیار ہوتی ہیں۔ اور اس سلسلے میں زیادتی بھی کر بیٹھتی ہیں —— ۱۹۴۶ء میں ہم عام انتخابات کے سلسلے میں مسلم لیگ کی طرف سے رضاکاری فرما رہے تھے۔ یہ لکھنؤ کا ذکر ہے۔ اتفاق سے ہم جس پولنگ اسٹیشن پر پہنچے وہاں مدمقابل والوں کا زور تھا اور لیگی امیدوار کا کیمپ سائیں سائیں کر رہا تھا۔ ہمارے ساتھ اور کئی لڑکیاں بھی تھیں۔ ان میں ایک نہایت فربہ قسم کی خاتون بھی تھیں۔ ہم سب تمام دن خالی بیٹھے بیٹھے کرسیوں پر پہلو بدلتے رہے۔ شام تک پہلو بدلنے کی طاقت بھی

جواب دے گئی۔ وقت ختم ہونے پر ادھر ادھر سے اور بھی لڑکیاں آ گئیں۔ خدیجہ نے بمشکل کرسی پر سے اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے کراہ کر کہا "اسپرنگ نک سن ہو گئے۔" اور پھر ان ضرورت سے زیادہ فربہ خاتون کی طرف مخاطب ہو کر سنجیدگی سے پوچھا "کیوں بیگم صاحبہ! آپ تو آج ہی کشن بدلوا لیں گی؟" یاد رہے کہ ان فربہ بیگم کی نہایت شاندار فرنیچر کی دکان تھی۔ یقین کیجئے کہ وہ بیگم صاحبہ عمر بھر کے لئے دشمن ہو گئیں۔

ایک دن ہم دونوں کچھ شاپنگ کرنا چاہتے تھے۔ تانگے میں بیٹھنے ہی والے تھے کہ ایک عزیز کی کار سامنے سے گزری، خدیجہ نے جلدی سے ہاتھ ہلایا۔ کار رکی تو ہم دونوں تانگہ چھوڑ کر فوراً کار میں گھس پڑے اور کہا "شاپنگ کرنا ہے ذرا پہنچا دیجئے۔" ان صاحب کو کہیں اور پہنچنا تھا شرما حضوری لے چلے مگر ذہن وقت کہا کہ بی بی خدیجہ ذرا جلدی کرنا۔ شاپنگ تو ہم نے پورے اطمینانِ قلب سے کی اور ان صاحب کو بھی کچھ خریداری کروا دی لیکن جب بیکٹ بندھنے لگے تو خدیجہ نے بڑی سنجیدگی سے دکاندار سے کہا "یہ مہربانی ذرا کر جلدی کیجئے، ہماری کار چھٹ جائے گی۔"

اس "کار چھٹ جانے پر" ہماری کار" کا سارا بھرم کھل گیا اور دکاندار دل کھول کر ہنسا۔

خدیجہ میں عام عورتوں کی طرح دوسروں میں کیڑے ڈالنے اور ان سے جلنے کی عادت نہیں۔ کوئی کتنا ہی شاندار ہو، زلفت کی جھاڑن بنائے، یا بیٹھ کر موتی نگلے، یا چاند کی طرح جگمگائے، ذرا حسد نہیں کریں گی۔ عام طور سے لکھنے والے دوسرے ہم عصروں سے نہار کھاتے ہیں اور ڈر کے مارے کسی کے سامنے نام نہیں لیتے کہ کہیں کوئی انہیں بھی لکھنے والا نہ سمجھ لے، مگر یہ ہیں کہ اپنے سوا ہر ایک لکھنے والے کا ذکر کرنا ضروری سمجھتی ہیں۔ نئے سے نئے لکھنے والے کی اچھی چیز کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیں گی۔ شرط یہ ہے کہ کسی کی کوئی تحریر ان کے دل کو لگ جائے۔ شاید یہی فراخ دلی ہے جس نے ان کی ازدواجی زندگی کو اتنا خوبصورت خواب ناک اور پُرسکون بنا رکھا ہے۔ ظہیر خدیجہ سے صرف سات آٹھ ماہ عمر میں بڑے ہیں۔ دونوں خوب برابری سے بسر کرتے ہیں۔ ایک چھوٹا سا بچہ ہے جس کی ہر جنبش دونوں کے لئے دنیا کی دلچسپ سے دلچسپ چیز بن جاتی ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے لئے کوئی بات اپنی اپنی اماں بہنوں سے بھی سُننا پسند نہیں کرتے ——— یہ دیکھ کر بعض اوقات ہم جیسے کہہ بیٹھتے ہیں "بھئی کب تک بلبل بنو گے؟" مگر کوئی بنے گا کہاں تک۔ ساڑھے چار سال کا عرصہ کافی ہوتا ہے کھلنے کے لئے ——— اس مکمل زندگی کے باوجود اگر کوئی خدیجہ سے کہہ دے کہ "تمہارے شوہر" تو جل کر خاک ہو جائیں گی "یہ کیا بکواس لگا رکھی ہے۔ شوہر، شوہر۔ کیا کوئی شریفانہ لفظ نہیں اس مقدس رشتے کے لئے۔ مثلاً دوست کہہ لو، چلو دوست عام سہی، ساتھی کے بارے میں کیا خیال ہے؟" گھر کے اندر بھی وہ دوستی ہی برتتے ہیں۔ اگر ظہیر مذاقاً بھی تیزی دکھائیں تو پھر لینے کے دینے پڑ جاتے ہیں۔

خدیجہ چار فٹ گیارہ انچ کی مختصر سی انسان ہیں۔ مجھے یاد ہے بچپن میں وہ ہمیشہ بازوؤں کی موٹائی کا مقابلہ مجھ سے کرتی تھیں۔ مگر اب دُبلی پتلی سی ہیں۔ میں نے جلدی سے پیدا ہو کر ان کے حصے کا دودھ چھین لیا، مگر وہ اس حق تلفی پر بھی مجھ سے ناراض نہیں ——— جن بالوں پر وہ کبھی فخر کرتی تھیں اور کبھی نائی کے سامنے نہ جھکی تھیں، اب لمبی لمبی بیماریوں نے وہ گھنے بال ہلکے اور چھوٹے کر دئیے ہیں ——— خوب تیکھا ناک نقشہ، رنگ سانولا، آنکھیں خوبصورت لیکن آدھی اندھی۔ قطعی اندھی ہونے کے بعد شاید ہر وقت عینک لگائیں گی۔ ابھی تو صرف پکچرز میں یا باہر نکلتے ہوئے تکلف کر لیتی ہیں۔ کیونکہ تین چار گز کے فاصلے سے سُوجھتا نہیں ——— انہیں دیکھ کر مجھے نہ جانے کیوں ہمیشہ سے کچے آم کی میٹھی چٹنی یاد آتی ہے جس میں تھوڑا نمک اور تھوڑی لال مرچ بھی ملائی گئی ہو۔ کپڑوں کے معاملے میں پرلے سرے کی لاپروا، سوائے ساری کے ہر لباس سے الجھتی ہیں۔ مصنوعی خوبصورتی کے تمام لوازمات سے ایسے بدکتی ہیں جیسے وہ گھوڑے ہیں اور ولات رسید کر کے ہی رہیں گے۔ یہ وہ خدیجہ ہیں جن کی زندگی کے ساحل پر کھڑے ہو کر میں تماشہ نہیں دیکھتی رہی ہوں، میں تو اسی کا ایک حصہ ہوں میں نے ان کی زندگی کا ہر رُخ، ہر موڑ دیکھا ہے ——— وہ کس قسم کی انسان ہیں، یہ میں نے بتا دیا مگر میں اتنا ضرور سوچتی ہوں کہ ایسے لوگوں کی اس نظام میں کتنی گنجائش ہے اور ہے بھی یا نہیں ——— میں اس وقت ایک عجیب درد سے اپنے آنسو ضبط کرتی ہوں، جب وہ اپنے پیاروں کا اتنی گرم جوشی سے ذکر کرتی ہے ——— توصیف ہمارا چھوٹا بھائی پرلے سرے کا لاپروا آدمی ہے، وہ کہتا ہے میں چونچلوں کا قائل نہیں۔ اور بہنوں کو اپنے گھر دیکھ کر نہایت پُرتکلف لہجے میں صرف "ہلو" کہتا ہے لیکن جب میں خدیجہ کو اس کے لئے سگریٹ رکھتے دیکھتی ہوں، اور چاؤ سے ایسی جگہوں پر جاتے دیکھتی ہوں جہاں توصیف، اس کا چھوٹا بھائی نظر آ سکے۔ تو میں سوچتی ہوں، خدیجہ کا ہے کو بڑی بہن ہے۔ میری ہی نہیں سب کی بڑی بہن ———

ایک ماہر جاسوس سمجھتا تھا۔ وہ اکثر سائیکل پر خیالی ڈاکوؤں یا مجرموں کا تعاقب کیا کرتا۔ وہ اپنی کارکردگیوں کی لمبی عجیب العقول کہانیاں سناتا جو ہمیں اس کی خوش قسمتی پر رشک کرنے پر مجبور کر دیتیں۔ بازار میں ایک دکان تھی جہاں چاند تارے کی شکل کی چوسنے والی مٹھائیوں کے علاوہ فضل بک ڈپو کے ناول بھی شاید ایک پیسہ یومیہ کرایہ پر مل سکتے تھے۔ شفیق کے توسط سے میں بھی ان ناولوں سے متعارف ہو گیا۔ ورنہ رفتہ رفتہ ان کا رسیا بن گیا۔ ہم ان ناولوں کو کلاس میں لے کر آتے۔ اور ماسٹر کی موجودگی میں انہیں ڈسک کے نیچے چھپا کر پڑھتے۔ ہم ضخیم سے ضخیم ناول کو ایک دن میں ختم کر کے دم لیتے۔ نہ صرف اس لئے کہ انہیں ایک بار شروع کر کے ختم کئے بغیر چھوڑنا ناممکن ہوتا بلکہ اس لئے بھی کہ ایک زائد دن کتاب کو رکھنے سے ہمیں خواہ مخواہ ایک پیسہ مزید کرایہ دینا پڑتا تھا۔ جب ماسٹر جماعت میں سو دیا تجارت کی گتھیاں سلجھا رہا ہوتا۔ ہم بڑے مزے سے اپنی نہ خانوں اور نقاب پوشوں کی دنیا میں گم ہوتے۔ ہم دونوں کو پڑھنے کی عادت انہی ناولوں نے ڈالی۔ ہم ان جاسوسی ناول لکھنے والوں کی ذہانت اور قابلیت پر رشک کیا کرتے۔ ان مصنفوں کے ناموں میں ہمیں ایک شان، ایک عظمت نظر آتی اور ہم دونوں کے دلوں میں اس اثنے نے پہلی بار جڑ پکڑی کہ ہم بڑے ہو کر مصنف بنیں گے۔ اور فضل بک ڈپو کے ناول نگاروں کی طرح سنسنی خیز اور ہوش ربا ناول لکھا کریں گے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے، میری یہ مصنف بننے کی خواہش اور ہوس ایک غلطی تھی۔ اس کی مجھے ایک بڑی قیمت ادا کرنا پڑی ہے۔ اب جب کہ مجھے اس غلطی کا احساس ہو چلا ہے کسی نئی زندگی کی طرف لوٹ جانا ناممکن ہے۔

شفیق میں ان دنوں بھی قصے لکھنے کا ایک قدرتی ملکہ تھا۔ اس وقت بھی اس میں وہ دوسروں کو ہنسی سے لوٹ پوٹ کر دینے کی وہ لاابالیانہ ادا تھی جس نے اسے اس قدر مسرت بخش مصنف اور دوست بنا دیا ہے۔ وہ بیٹھے بٹھائے پانچ منٹ میں چھوٹی مزاحیہ نظمیں چست کر لیتا۔ مضمون آفرینی اور طباعی کا خلقی مادہ اس میں موجود تھا۔

ہم گھر والوں سے چوری چھپے دارالاشاعت پنجاب سے بھی کتابیں منگواتے۔ ان کی وی پی چھڑانے کے لئے ہم اپنے جوڑے ہوئے پیسوں کو پول کرتے۔ گیا ہم بادشاہوں کی طرح خوش نہ ہوتے تھے جب کتابوں کا بنڈل ہمارے قبضہ میں ہوتا تھا۔ اور کس دھڑکن اور اضطراب سے ہم اس بنڈل کو کھولتے تھے۔ اور کیسی خوبصورت کتابیں وہ ہوتی تھیں۔ "قصر صحرا" "عمر عیار" "جنوبی سمندر کی کہانی" "الحمرا کی کہانیاں" میں نے ایسی کتابیں پھر نہیں پڑھیں۔ اور نہ کبھی پڑھوں گا۔ وہ لڑکے خوش قسمت ہیں جنہوں نے اپنے لڑکپن میں انہیں پڑھا ہے۔ شفیق اکثر کہتا ہے کہ وہ جو کچھ ہے انہی کتابوں کی بدولت ہے۔ انہوں نے ہمیں اصل ادب کے حسن اور لطافت سے روشناس کیا اور ہمارے تخیل کو جلا دی۔

ہم دونوں میں سے ایک بھی ابھی تک ان کتابوں کے سحر کے تلے سے نہیں نکل سکا۔ میری اپنی چہیتی کتابیں "قصر صحرا" کے تین حصے اور "جنوبی سمندر کی کہانی" تھے جو پہلی بحری لڑائیوں اور عجیب ملکوں میں دہشتناک مہموں کے متعلق ایک ناول ہے۔ اور اس سے زیادہ اچھی کہانی کی کوئی لڑکا خواہش نہیں کر سکتا۔ شفیق کو جو کتاب سب سے اچھی لگی وہ غلام عباس کی "الحمرا کی کہانیاں" تھی۔ ان کہانیوں کے اسرار، جادو اور رومان نے اُسے بالکل مسحور کر لیا۔ اور پھر اس کتاب میں رنگین تصویریں بھی تھیں۔ ان دنوں میں بھدی سے بھدی تصویریں بھی کس قدر حقیقی اور جاندار لگتی تھیں۔ ہم دونوں کے دل پر ابھی تک وہ عجیب تصویریں نقش ہیں۔ جو ان کتابوں کے متن کو السٹریٹ کرتی تھیں۔ ویسے آرٹسٹ آج کل کیوں نہیں ہوتے؟

آٹھویں پاس کر کے شفیق غالباً محض تبدیلی آب و ہوا کی خاطر بہاولپور سکول چھوڑ کر بہاولنگر کے ہائی سکول میں جا داخل ہوا۔ ہم پھر ایک سال تک نہ ملے۔ جب وہ گرمیوں کی چھٹیوں میں چند ہفتوں کے لئے بہاولپور آیا تو وہ جسمانی طور پر ایک مختلف شفیق تھا۔ اور اس کی آواز بھاری ہو گئی تھی۔ یہ مجھے بڑا عجیب اور دلچسپ معلوم ہوا۔ میں اس سے آگاہ نہیں تھا کہ بعینہ وہی تبدیلیاں مجھ میں بھی آ چکی تھیں۔ حقیقت میں ہم دونوں کے قدوں میں یک لخت اضافہ ہو گیا تھا۔ ہم نے پھر کچھ وقت اکٹھے گزارا۔ میرے والد صاحب کی کتابوں میں واشنگٹن اِرونگ کی انگریزی کتاب "الحمرا کی داستانیں" کی ایک جلد نکل آئی۔ اسے میں نے شفیق کو دے دیا۔ اور وہ چھٹیوں کے بعد اسے اپنے ساتھ بہاولنگر لے گیا۔ اس نے اس میں سے دو تین کہانیوں کے آزاد ترجمے کئے۔ میرا خیال ہے وہ عصمت میں چھپے۔ وہ بڑے خوبصورت ترجمے تھے۔ شوخ اور شگفتہ اور بے تکلف۔ ان کے بعد شفیق مختلف رسائل میں چھپنے لگا۔

اس نے پہلے ہفتے میں ہی چھاپے کی عجیب دنیا کو فتح کر لیا تھا۔ اور وہ غالباً اردو کا واحد مصنف ہے جس کا کوئی مضمون ناقابلِ اشاعت سمجھ کر نہیں لوٹایا گیا۔ اسے اس کی خوش نصیبی پر محمول نہیں کیا جا سکتا۔ ابتدا ہی سے اس کی طنازی نے زبان کی روانی اور شوخی کے پردے میں اپنا رنگ جما دیا۔۔۔ ادبی شہرت اسے اس عمر میں ہی حاصل ہو گئی۔ جب بہت سے اپنے مطلب کے اظہار کے لئے زبان کی مشکلات سے ایک مایوسانہ پیکار میں سرگرداں ہوتے ہیں۔

میٹرک پاس کرنے کے بعد شفیق نے رہتک میں ایک کالج میں داخلہ لیا (یہ لوگ رہتک کے راجپوت ہیں۔ اور شفیق کا پورا نام راؤ شفیق الرحمٰن ہے) رہتک سے اس نے ایف ایس سی (میڈیکل) بڑے اچھے نمبروں پر پاس کیا۔ اور لاہور کے کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج میں داخلے کے لئے منتخب کر لیا گیا۔ میں نے ۱۹۳۰ء میں بہاولپور کالج سے بی، اے کیا۔ اور اپنے والد کو لا کالج بھیجنے پر اکسایا۔ اگرچہ قانون سے مجھے کوئی طبعی رغبت نہیں تھی۔ اسی سال میں لا کالج میں داخل ہوا۔ لا کے پہلے سال میں باعزت طریقے سے فیل ہوا۔ کیونکہ ممتحنوں نے قانون کی اس تشریح سے جو میں نے (متعدد کارٹونوں کی مدد سے) اپنے پرچوں میں کی تھی، اتفاق نہیں کیا تھا۔ دوسرے سال میں مغلپورہ کے انجینیرنگ کالج میں داخل ہو گیا۔ انجینیرنگ کے لئے مجھے قانون سے بھی کم رغبت تھی، مگر میرا خیال تھا کہ انجینیرنگ کالج میں جا کر میں "پریکٹیکل" ہو جاؤں گا۔ دوسرے لوگ "پریکٹیکل" تھے۔ میں "پریکٹیکل" PRACTICAL نہیں تھا۔ اور یہ خیال مجھے کافی ناخوش رکھتا تھا۔

شفیق اب میڈیکل کالج کے تھرڈ ایئر میں تھا۔ جب میں لا کالج میں تھا تو ہم کسی وجہ سے بہت کم ایک دوسرے سے ملتے تھے۔ اب ہم دوسرے تیسرے ملنے لگے۔ وہ بلاناغہ ہر چھٹی کو سائیکل پر میرے پاس آ جاتا۔ ہم وہاں سے سیدھے آوارہ گردوں کی طرح پاپیادہ کھیتوں میں سے کسی طرف چل پڑتے۔ ہم دونوں انتھک چلنے والے ہیں۔ ہم راستے میں دم لیتے۔ دھوپ سینکتے۔ کسی درخت کے ساتھ ٹیک لگا کر وہی باتیں کرتے جو کرب زدہ جوان ہمیشہ کرتے ہیں۔ ہم راہ میں پڑتے ہوئے تاریخی کھنڈروں کی دیواروں پر سکول کے لڑکوں کی طرح اپنے ناموں کو چاقو سے کندہ کرتے —— تاکہ ہم لافانی ہو جائیں۔ اور آیندہ نسلوں کے سیلانی جان سکیں کہ ہمارا بھی کبھی اس ویرانے و دروازہ میں گزر ہوا تھا۔

بعض وقت ہم اپنے ساتھ کوئی کتاب لے جاتے اور کسی سبزا و شاداب جگہ پر بیٹھ کر اس میں سے صفحے پڑھ کر ایک دوسرے کو سناتے۔ ہم نے مزاح نگار اسٹیفن لیکاک کی بیشتر کتابیں انہی سیروں میں اسی طریق سے پڑھی ہیں۔ ہم چھوٹے شرارتی بچوں کی طرح بے تکلفانہ قہقہے لگا کر ہنستے۔ اور کئی بار سنجیدہ دہقانی راہ گیر ہمیں عجیب نظروں سے دیکھتے جیسے کہ ہم باؤلے ہوں۔

میں نے شفیق کے قہقہوں سے اونچے اور صحت مند اور کسی کے قہقہے نہیں سنے۔ اور میں کسی اور کو نہیں جانتا جس کی باتوں میں اتنی شگفتگی اور چمک ہو۔ اس کے قہقہے مجھے اپنے تاریک خول سے باہر کھلی ہوا اور چمکیلی دھوپ میں لے جاتے۔ اس کی مسرت مجھے چھو جاتی، اور میں اس قدر ہنستا کہ میری آنکھوں سے آنسو بہہ نکلتے۔ وہ کون سی ایسی باتیں ہوتی تھیں جو ہمیں یوں بے تحاشا ہنساتی تھیں۔ دو تین مجھے یاد ہیں، مگر میں ان کو یہاں اس لئے نہیں لکھوں گا کہ ایسی باتیں لکھے جانے کے بعد اپنی آب و تاب کھو دیتی ہیں اور سپاٹ اور بے جان لگتی ہیں۔

شفیق اور میں اب تک ان لمبی سیروں کو نہیں بھولے۔ ان سیروں کا سرا کا نیلا آسمان اب تک ہم پر جھکتا ہے۔ اب تک کسی اکیلے پرندے کی راگنی ہمارے کانوں کو سنائی دیتی ہے۔ ان سیروں نے دماغی میں ایک دوسرے کے نزدیک کر دیا۔ کھلی سڑک کی رفاقت سی اور کوئی رفاقت نہیں۔ —— انہوں نے زندگی کو بھی قابلِ برداشت بنا دیا۔ اور انجینیرنگ کالج کے خشک ماحول میں رنگینی کی لہر پیدا کر دی۔

کالج کے دنوں ہی سے شفیق کو ایک خوبصورت جسم بنانے کا خبط تھا۔ وہ اب تک اپنی روزانہ ورزش میں باقاعدہ ہے۔ کالج میں اس کا معمول تھا کہ وہ صبح اٹھ کر ہوسٹل کے سامنے کے لان میں ایک میل دوڑتا۔ شام کو وہ کرکٹ کے لئے چلا جاتا (وہ ایک وقت میں اچھا خاصا فاسٹ باؤلر سمجھا جاتا تھا) کھیل کے بعد وہ گرما میں اکثر کالج سوئمنگ ٹینک میں آدھ میل تیرتا۔

وہ ایک اچھا طالب علم تھا۔ اور جہاں تک مجھے یاد ہے، وہ کسی سال میں فیل نہیں ہوا۔ وہ اپنے کالج کی دوسری سرگرمیوں میں بھی چمکا اور اپنے فائنل ایر میں اتفاق رائے سے اس سال کے لئے ڈرامیٹک کلب کا سیکرٹری منتخب ہوا۔ اس کی سیکرٹری شپ کے دور میں میڈیکل کالج کے ڈرامیٹک کلب نے ایک ڈرامہ سٹیج کیا جو بہت کامیاب رہا۔

سنہ ۱۹۴۲ء میں اس نے ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کا امتحان پاس کیا۔ اسی سال اس کی پہلی کتاب "کرنیں" خوشنما جیبی سائز میں، ور حجاب امتیاز علی کے حوصلہ افزا دیباچے کے ساتھ چھپی۔ یہ شفیق الرحمٰن کے لئے ایک مسعود اور مبارک سال تھا — نئی کامرانیوں اور نئی آزادیوں کا سال۔ امتحان میں کامیابی نے اسے وہ معاشی خود مختاری دی جس کے لئے وہ اتنا بے تاب تھا۔ اس کے اعزّہ اسے سول میں ڈاکٹر دیکھنے کے خواہاں تھے۔ شفیق کو سویلین ڈاکٹر کی زندگی سے نفرت تھی۔ فوج کی ملازمت کی ونگ اور ایڈونچر نے اس کے نوجوان دل کو اپیل کیا۔ اس نے کمیشن کے لئے درخواست دی جو اسے فوراً مل گیا۔ وہ جنگ کے دن تھے اور فوج میں ڈاکٹروں کی بڑی مانگ تھی۔

لاہور چھوڑنے سے پہلے دو دن اس نے میرے ساتھ گزارے۔ میں نے ہوسٹل چھوڑ دیا تھا۔ اور اب ریلوے اسٹیشن کے سامنے ریوالی سینما کے پاس ایک تاریک اور اداس دو منزلہ ہوٹل میں اقامت پذیر تھا۔ ہر ایک شخص کی طرح وہ اپنی پہلی تقرری کے متعلق نروس اور مضطرب تھا۔ اسے لاہور چھوڑنے پر افسوس تھا۔ اور اپنی نئی زندگی کے لئے وسوسے اسے کچھ بے سکون اور اداس بنا رہے تھے۔ یہ وسوسے ایک ایسے شخص کے لئے قدرتی تھے جو بنیادی طور پر شرمیلا ہے۔

ٹریننگ کے بعد اس کی مختلف جگہوں پر تقرری ہوتی رہی۔ مجھے اس کے خط باقاعدگی سے رومینٹک ناموں والے شہروں سے آتے رہے — فورٹ سنڈیمن۔ دارجیلنگ۔ آسام اور جنوبی ہند کے مقامات سے۔ وہ ایک بڑا دلچسپ خط لکھنے والا ہے۔ اس کے خط بتاتے تھے کہ وہ اپنی ابتدائی جھجک اور شرمیلے پن پر غالب آ گیا ہے۔ اور اپنی نئی زندگی کی کڑی روٹین میں نہ صرف رچ گیا ہے بلکہ اسے پرلطف اور مزاج کے موافق پا رہا ہے۔ وہ اپنی یونیفارم اور اپنے سٹارز پر اتنا مغرور تھا جتنا ایک چھوٹا سکول کا لڑکا پہلی بار انگریزی کپڑے پہننے پر۔ اور یہ کہنا کوئی مذاق نہیں کہ اس نے کمیشن یونیفارم پہننے کے لئے لیا۔ وہ اپنی نئی شان میں جو میرے لئے باعثِ رشک تھی کبھی کبھی لاہور میں ایک دو روز کے لئے آنکلتا۔ وہ ایک خاکی چوڑے چھجے کا فیلٹ پہننے کا بڑا اشتیاق تھا۔ اس میں وہ کسی امریکن فلم کا "کاؤبوائے" لگتا۔ مجھے یہ فیلٹ ایک آرمی ڈاکٹر کے لئے بہت فلیمبائنٹ FLAMBOYANT معلوم ہوتا۔ شفیق کو اس چیز سے محبت تھی۔ اور ایک دفعہ اس نے اس چیز کی دوسری سب ٹوپیوں پر برتری ثابت کرنے کے لئے مجھے ایک گھنٹے کا لیکچر دیا۔ اپنے دوستوں کے احتجاجات کے باوجود اس نے اس "ٹوپی" کا پہننا جاری رکھا۔

سنہ ۱۹۴۳ء میں خوش قسمتی سے اس کی ایک ایسے اسٹیشن پر تقرری ہوئی جس سے بہتر اسٹیشن اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ نیا اسٹیشن خوبصورت اور شاداب وادی کلو میں ایک پہاڑ کے دامن میں واقع تھا۔ یہاں تقریباً چار ہزار اطلی کے جنگی قیدی جنگ کے شور و شغب سے دور ایک مکمل چین اور امن میں اپنی ویکیشن گزار رہے تھے۔ یول کیمپ۔ یہ اس جگہ کا نام تھا۔ ایک قیدیوں کے کیمپ کے علاوہ ایک ہالی ڈے کیمپ تھا۔ اور اطالوی یہاں جنگ کے خاتمے تک ایک مسلسل پک نک کے مزے لے رہے تھے۔ یہاں میں نے شفیق کے ساتھ ایک حسین مہینہ گزارا۔ اس نے دو تین سالوں میں انگریزی ادب کی کتابوں کی اچھی خاصی لائبریری اکٹھی کر لی تھی۔ ہم نے ایک دوسرے کو صفحے پڑھ کر سنانے کے خوشگوار طریقے سے ڈیمن رینان کی ور دوسری کئی مزاحیہ کتابیں ختم کر ڈالیں۔ بہترین کتاب جو ہم نے اس طرح پڑھی "گڈ سولجر شویک" (GOOD SOLDIER SHWIEK) تھی۔ گڈ سولجر شویک غالباً جنگوں اور فوجی زندگی پر سب سے پرلطف طنز، ہر لحاظ سے دنیا کی عظیم کتابوں میں شمار کی جا سکتی ہے۔ جب ہم پڑھ نہ رہے ہوتے ہم کیمپ سے دور میلوں لمبی سیروں پر نکل جاتے یا پہاڑوں پر چڑھائی کرتے۔ کیمپ سے نیچے پتھریلی سڑک پر مارچ کرتے ہوئے اطالوی قیدی ہمارے لئے ایک مستقل تفریح کا سامان تھے۔ وہ باتیں کرتے ہوئے اپنے بازوؤں اور ہاتھوں کو مبالغہ آمیز طریق پر ہلاتے — جھگڑتی ہوئی عورتوں کی طرح ان کی زبان کتر کتر

چلتی تھی — تغیرو - لا - تغیرو - فیرو - فیرو - اطالوی بڑی باتونی اور جذباتی نسل ہیں۔ منقطع ماڑھیوں والے۔ چشمے لگے اطالوی جرنیل ہمیں بڑے مضحکہ خیز لگتے۔ شفیق اور میں نے اتفاق کیا کہ اطالویوں کو جنگ میں جھونکنا سراسر زیادتی تھی۔

اسی پول کیمپ میں ہی کاؤنٹ کولا شفیق کا دوست بنا۔ کاؤنٹ کی شخصیت نے اس پر گہرا رومانٹ نقش ڈالا۔ اس نے ایک ناول کے لئے بھی نوٹ لینے شروع کئے جس میں کاؤنٹ کولا کو مرکزی کردار ہونا تھا۔ بعض وجوہات کی بناء پر وہ ناول نہ لکھا جا سکا — جب ۱۹۵۲ء میں شفیق کاؤنٹ کے وطن میں گیا تو کاؤنٹ نے اس کی میزبانی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ "برساتی" میں شفیق نے "کولا" کی فیاضی اور فراخدلی کی ایک نہایت دلآویز تصویر کھینچی ہے۔

پول کے بعد ہم کثر ملتے رہے ہیں۔ اسے سال میں ایک مہینے کی چھٹی ملتی ہے جو وہ بہاولپور میں بسر کرتا ہے کبھی میں اسے چار پانچ دن ملنے کے لئے چلا جاتا ہوں۔ ہم دونوں کے ملازمت کے کھیڑے ان ملاقاتوں کے وقفوں کو طویل کرتے جا رہے ہیں۔ ۱۹۵۸ء میں شفیق آرمی کی طرف سے ڈاکٹری کی اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلینڈ گیا۔ وہ اپنے نام کے ساتھ ایک ڈگریوں کی لڑی لایا ہے جو مجھے ہمیشہ بھول جاتی ہے۔

(۲)

جب اس کی پہلی کتاب "کرنیں" چھپی تو اس کا نام ایک مزاحیہ افسانوں کے مصنف کی حیثیت سے کافی مشہور ہو چکا تھا "کرنیں" ۱۹۴۲ء میں طبع ہوئی — اسی سال میں اس نے ایم بی بی ایس کیا اور کمیشن لیا۔ یہ کتاب خوب بکی اور ایک سال میں ہی اس کے دوسرے ایڈیشن کے چھپنے کی نوبت آگئی۔ "شگوفے" "لہریں" "مد و جزر" "حماقتیں" اور "پچھتاوے" ایک دوسرے کے بعد ایک ایک سال کے وقفے سے شائع ہوئیں۔ ان کی شگفتگی اور تازگی نے اس کے پڑھنے والوں کو مسخر کر لیا۔ اور اس کی شہرت کو بڑھا دیا۔ بقول اس کے "ہندوستان بھر میں اس کا طوطی بولنے لگا"۔ اس کی سب کتابوں کے تین یا اس سے زیادہ ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ اس سے اس کی مقبولیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

"الحمرا کی کہانیوں" نے جنہیں اس نے اسکول کے زمانہ میں پڑھا تھا اسے بے حد متاثر کیا ہے۔ اور وہ ابھی تک اس کے جادو کے اثر سے (خوش قسمتی سے) نہیں نکل پایا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر کوئی اچھی خواہشیں پوری کرنے والی پری اسے اس کے لڑکپن کے زمانے کی چند گھڑیاں واپس دینے پر تیار ہو جائے تو وہ ان گھڑیوں کو چنے گا جن میں وہ الحمرا کے رومانوں کی پراسرار دنیا میں کھویا ہوا تھا۔ ایک لکھنے والے پر اس کے بچپن اور لڑکپن کی پڑھی ہوئی کتابوں کے اثر کا اندازہ کرنا بڑا مشکل ہے۔ مگر اس میں کوئی کلام نہیں کہ ان کا اثر گہرا اور دیرپا ہوتا ہے — شفیق کی سنجیدہ کہانیوں میں رومانیت اور حسن کی جستجو "الحمرا" کی دین ہے۔

مزاح میں اس کا استاد کینیڈین مصنف "اسٹیفن لی کاک" (STEPHENLEACOCK) ہے۔ مجھے اس بات پر فخر ہے کہ لی کاک سے پہلے پہل میں نے شفیق کا تعارف کرایا۔ میں اس بڑے مزاح نگار سے واقفیت کے لئے اپنے باپ کا زیر بار احسان ہوں۔ جس کا لی کاک ایک زمانہ میں چہیتا مصنف تھا۔ اور جسے لی کاک کی کتاب "لٹریری لیپسز" (LITERARY LAPSES) کے کئی مزاحیہ مضمون ازبر یاد تھے۔ میں نے لٹریری لیپسز کو پڑھا اور اس قدر ہنسا کہ میں پہلے کسی کتاب کو پڑھ کر نہ ہنسا تھا۔ میں نے یہ کتاب شفیق کو دی۔ لی کاک اس کے دل کو بھا جانے والا مزاح نگار تھا۔ اور وہ ایک "لی کاک فین" بن گیا۔ اس نے لاہور کی ساری سیکنڈ ہینڈ کتابوں کی دکانیں پروفیسر لی کاک کے دوسرے ورکس WORKS کی تلاش میں چھان ماریں۔ اور کافی "لیکاک" اکٹھا کر لیا۔ جب شفیق کسی کباڑیے کی دکان پر لی کاک کی کوئی کتاب دیکھتا تو اس کا چہرہ روشن ہو جاتا۔ اور وہ اس پر ایک طفلانہ بے تابی سے جھپٹتا۔ گویا کہ اس نے ایک سونے کی کان دریافت کر لی ہے۔

ہم دونوں لی کاک سے محبت کرنے لگے۔ وہ ہمیں ہنساتا تھا۔ اور ان دنوں قہقہے لگا کر ہنسنا ہماری زندگی کا واحد مقصد تھا۔ اگر شفیق

کے اندر اس کی طبعی ظرافت اور شوخی کا جوہر نہ ہوتا تو جیس لی کاک بھی اسے مزاح نگار نہ بنا سکتے۔ اس نے بڑی خوبی اور لطافت سے اردو نثر میں انگریزی مزاح کے مزاج کو رچایا ہے۔ جو اردو میں ایک نئی چیز تھی۔ ایک نئی وضع کو اس خوبصورتی اور شگفتگی سے فروغ دینا کہ نثر کا چہرہ نہ بگڑے ہر کسی کا کام نہیں۔ وہ لوگ جو اسے آسان خیال کرتے ہیں ذرا اس کے رنگ میں دو صفحے لکھ کر دیکھیں۔ اس کے نقادوں نے اس سے انصاف کا سلوک نہیں برتا۔ اور اکثر اس کی کتابوں کی طرف ایک برترانہ اور سرپرستانہ انداز اختیار کیا ہے۔

ایک کتاب کا پہلا فرض یہ ہے کہ وہ پڑھی جا سکے اس کا پڑھنا ایک فرض نہ بن جائے —— شاید یہ بھی کہ وہ پڑھنے والے کے دل کو مسرت بخشے۔ شفیق کی کتابیں اور کہانیاں اس آزمائش پر پوری اترتی ہیں۔ کوئی اس پر ایک پھیکا یا بے جان فقرہ لکھنے کا الزام نہیں دھر سکتا۔ اس کی رواں، زبان اور شگفتہ نثر ایک قدرتی پہاڑی ندی کی طرح اچھلتی اور نغمے سناتی بہتی جاتی ہے۔ اس کی انشا کی قوت پیدائشی اور طبعی ہے۔ اس کی نثر اپنے کئی مشہور ہم عصروں کی نثر کی طرح دھچکوں اور ہچکچاہٹوں کے ساتھ آگے نہیں بڑھتی۔ اور کہیں یہ احساس نہیں ہوتا کہ اس کا قلم چلتے چلتے رک گیا ہے۔ اسے شاذ و نادر ہی صحیح لفظ یا موزوں استعارے کے لئے سوچنا پڑتا ہے۔ ایک بڑے ذہین اور سلجھے ہوئے ترقی پسند افسانہ نگار نے ایک دفعہ میرے سامنے اقرار کیا "جہاں تک انشا کا تعلق ہے۔ خالص ناریٹو (NARRATIVE) کا شفیق کا مقابلہ ہم میں سے بہت کم کر سکیں گے۔ اس کا ہلکا خوبصورت اسلوب جو ہر قسم کے مطلب کا بار آسانی سے اٹھا سکتا ہے، واقعی قابل رشک ہے۔ لیکن ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ " لیکن کے بعد جو اس نے کہا اس کا مطلب یہ تھا کہ شفیق کا دماغ پوری طرح پروان نہیں چڑھا۔ اس کا سماجی شعور ناپختہ اور چھوٹا ہے۔ کہ اپنی کہانیوں میں وہ اپنے کو "گلیمرائز" (GLAMOURIZE) کرتا رہتا ہے۔ کہ وہ ڈانس ہالوں اور ناکس ٹراٹ کی "کلاؤڈ کوکو لینڈ" سے باہر نکلنے سے گریزاں ہے۔ اس افسانہ نگار کا فیصلہ یہ تھا کہ شفیق ایک "بورژوا" مصنف ہے۔

ان الزامات میں سے اکثر کوتاہ نظری اور ہمدردی کی کمی پر مبنی ہیں۔ اور اس مختصر مضمون میں ان پر تفصیل سے بحث کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا ہم میں سے وہ جنہیں شفیق کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا ہے جانتے ہیں کہ وہ سڑک پر کبھی کسی اپاہج یا بوڑھی مانگنے والی عورت کو کچھ دئے بغیر نہیں گزر سکتا۔ انگلستان جاتے وقت وہ اپنے بیرے علی کے متعلق بڑا فکرمند تھا کہ اس کے پیچھے وہ بے روزگار یا اداس نہ ہو جائے۔ اور انگلستان سے وہ اسے باقاعدگی سے دل جوئی کے خطوط لکھتا رہا۔ کیا کوئی ایسے شخص کے بارے میں یہ کہے گا کہ وہ دوسروں کے لئے درد سے بیگانہ ہے!

ہم ایک ایسے لکھنے والے کے بارے میں جس کا واحد مقصد ہمیں مسرت دینا اور ہنسانا ہے تنگ نظری سے نہیں سوچ سکتے۔ میں ہمیشہ اس شخص کا احسان مند اور شکر گزار رہوں گا جو جاتے ہوئے مجھے سڑک پر ملے اور چند شوخ زندہ دلانہ فقروں سے میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ لے آئے۔ ۔ ۔ یہی شگفتگی اور زندگی ہے جس نے اسے اتنے ادبی اور غیر ادبی لوگوں کا چہیتا مصنف بنا دیا ہے۔ اگلے روز کی بات ہے کہ میں نے ریل کے سفر کے دوران میں سامنے کی نشست پر ایک درشت اور متین ادھیڑ عمر کے شخص کو بڑے انہماک سے ایک کتاب کا مطالعہ کرتے ہوئے پایا۔ ہر چار پانچ منٹ کے بعد درشت چہرہ کے نقوش کو مسکراہٹ کی سلوٹیں نرم اور جاندار بنا دیتیں۔ اور مسرت اس کے دھموں کے طور پر) بے روح چشموں میں سے باہر دکنے لگتی۔ مجھے یقین ہے کہ ایک دو بار اس کی ہنسی بھی نکل گئی۔ اب یہ ایک ایسا آدمی تھا۔ (غالباً کوئی متفکر وکیل یا بینک کا ہیڈ اکاؤنٹنٹ) جس کے دل پر عموماً پریشانیوں اور سنجیدگی کے تاریک روح فرسا سائے چھائے رہتے تھے۔ اور جو شاذ و نادر ہی مسکراتا تھا۔ میں بیٹھا تعجب کرتا رہا کہ وہ کون سا خوش نصیب مصنف ہے جس نے اس بجھی ہوئی راکھ میں خوشی کی چنگاری ڈال دی ہے۔ میں اس مصنف پر رشک کرنے لگا - ایک اسٹیشن پر جب وہ آدمی تھوڑی دیر کے لئے کوئی چیز لینے کی خاطر اٹھا تو میں نے فوراً سیٹ پر پڑی ہوئی کتاب کو اٹھا کر دیکھا۔ یہ نئے یونیفارم ایڈیشن میں شفیق الرحمٰن کی "حماقتیں" تھیں۔

شفیق سہل نویس نہیں ہے، جیسا کہ اس کی نثر کی بے ساختہ روانی سے کئی ایک کو گمان ہوگا۔ اس نے آج تک کوئی چیز قلم برداشتہ یا

ایک نشست میں نہیں لکھی۔ جب کسی چیز یا کہانی کے جراثیم اس کے ذہن میں پیدا ہوتے ہیں تو وہ اس پر اچھی طرح سوچتا ہے۔ اپنے دوستوں سے مشوروں کی خاطر اس پر بحث کرتا ہے۔ اپنی کاپی بک کے بیسیوں صفحے کرداروں کے سکیچوں اور پلاٹ کے ارتقا کے مختلف ممکنات سے سیاہ کر ڈالتا ہے۔ کئی کئی ہفتے وہ ایک جینیس کی طرح اس "آئیڈیا" کی جگالی کرتا رہتا ہے۔ اور جب تک اسے پورا اطمینان نہیں ہو جاتا وہ اصل کہانی کا لکھنا شروع نہیں کرتا ـــ "چھپا وسے" اور "مدوجزر" کی اکثر کہانیاں دو تین مہینے کی مسلسل سوچ اور محنت کا نتیجہ ہیں۔

اکثر وہ ایک کہانی کو دوبارہ اور سہ بارہ لکھے گا۔ اور اسے اشاعت کے لئے اس وقت تک نہ بھیجے گا۔ جب تک اس کا "فنکارانہ ضمیر" (ARTISTIC CONCIENSE) اسے یہ نہیں کہے گا "اسے اشاعت کے لئے بھیج دو۔ یہ اچھی چیز ہے"۔ وہ ایک بے حد دیانت دار فنکار ہے۔ وہ اپنے پڑھنے والوں کو سونے کے بدلے پیتل دے کر دھوکا نہیں دیتا۔

کیا وہ شہرت کا بھوکا ہے؟ رسالوں اور کتابوں میں اس کے نت نئے فوٹو گراف چھپتے ہیں۔ اور کپور کے الفاظ میں "وہ اپنی ہر نئی تصویر میں اپنی پچھلی تصویر سے جوان نظر آتا ہے۔ اس سے کئی لوگوں کو خیال ہو گیا ہے کہ وہ باغ میں ایک مور کی طرح شیخی خورہ ہے۔ اور اپنی ذات سے محبت کرتا ہے۔ یہ درست نہیں۔ پیٹر پین (PETER PAN) کی مانند دراصل وہ ایک لڑکا ہے جو بڑا نہیں ہوا۔ اسے جینے کے عمل سے ـــ اور نمائشیت سے جو اس کا لازمہ ہے، محبت ہے۔ سب سے اچھی بات جو اس کی زندگی میں ہوئی اس کی پیدائش تھی۔ اس عجیب اور خوبصورت کرّہ پر اس کا ورود۔ وہ ابھی تک اس معجزے پر مغرور اور حیران ہے۔ اس کے فوٹو گراف اس کی "جینے کے عمل" سے محبت کے آئینہ دار ہیں۔

اور وہ شہرت کا بھوکا کیوں ہو؟ شہرت اور مقبولیت اسے ایک بڑی کم عمر میں بن مانگے ہی مل گئیں۔ اس نے مشہور ہونے کے لئے وہ کمینہ اور گھٹیا حربے کبھی نہیں استعمال کئے جو کئی ناکامیاب ادیب کرتے ہیں ۔۔۔۔۔۔ اور ایک اور طرح سے دیکھا جائے تو شہرت یا نمائشیت کی خواہش ایک بالکل قدرتی اور فطرتی خواہش ہے۔ پچھلے دنوں اسی رسالہ میں مجھے حضرت فراق گورکھپوری کے ان ولآویز خطوط پڑھنے کا اتفاق ہوا جو انہوں نے وقتاً فوقتاً ایڈیٹر "نقوش" کو لکھے تھے۔ فراق اردو ادب میں ایک بڑی اور محترم ہستی ہیں۔ اور وہ خطوط بڑے خیال افروز اور اعلیٰ ذہنی کاوشوں کا نتیجہ ہیں۔ لیکن ان "پرائیویٹ" خطوط کو پڑھتے ہوئے اس خیال سے بچنا ناممکن ہے کہ وہ اشاعت اور آئندہ نسلوں کو مدنظر رکھ کر لکھے گئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ ریکگنیشن (RECOGNITION) کے لئے تڑپ رہے ہیں۔ یہ انسانی کمزوری فراق کی شخصیت کو میری نظر میں زیادہ محبوب بنا دیتی ہے۔ پھر بھی پڑھنے والے کو اس خواہش میں ایک مریضانہ گھٹن کا احساس ہوتا ہے ـــ جیسے لکھنے والا خود رحمی کا شکار ہو رہا ہے۔

شفیق کی "نمائشیت" میں اس مریضانہ گھٹن کا دخل نہیں۔ وہ سٹیج پر محض اس لئے چلبیلے پروں اور کلغیوں میں سج سجا کر اٹھلاتا ہوا آتا ہے کہ "سٹیج" پر ہونا اس کے لئے بڑا پر لطف ہے۔ "اچھے لوگو تالیاں بجاؤ" وہ کہتا ہوا معلوم ہوتا ہے "میں شفیق الرحمٰن ہوں اور تمہیں ہنسانے آیا ہوں"۔ اور اگر کوئی تالی نہیں بجاتا تو اس کو صدمہ پہنچتا ہے لیکن وہ اس شخص سے کوئی میل نہیں رکھتا۔

شفیق قہقہے تو ہر وقت لگاتا رہتا ہے۔ مگر میری رائے میں اس کے خمیر میں ایک بنیادی یاسیت ہے۔ ایک بڑی گہری یاسیت۔

اس کی وجہ میرے نزدیک یہ ہے کہ اسے زندگی سے بے حد محبت ہے ـــ زندگی جس میں چمکتا ہوا سورج ہے۔ نغمہ ریز جھرنے ہیں۔ حسین آنکھوں والی لڑکیاں ہیں۔ سنہری کاغذوں والے چاکلیٹ ہیں۔ اسے اس پُر رنگ میلے سے محبت ہے۔ اور بیشتر وقت اسے چیزوں اور لوگوں کی وقتی اور عارضی نوعیت کا احساس رہتا ہے۔ یہ دو دن کا تماشا ہے۔ گزرا ہوا لمحہ پھر نہ آئے گا۔ میں یہ شفیق پھر نہ دیکھ سکوں گا۔ یہ لڑکی مجھ سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو جائے گی ۔۔۔۔۔ زندگی کی گھڑی کی ریت گرتی ـــ گرتی جاتی ہے اور ایک وقت، کسی وقت، اسے اس سٹیج سے یک لخت رخصت ہونا پڑے گا۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ بزدل ہے یا موت سے ڈرتا ہے ـــ سر والٹر سکاٹ کے داماد، دوست اور سوانح نگار۔ لاک ہارٹ (LOCK HART) نے ناولسٹ کی لائف میں لکھا ہے کہ جب سر والٹر کو یقین ہو گیا کہ اس کا آخری لمحہ اب دور نہیں ہے۔ اور وہ مرنے لگا

ہے تو اس کا چہرہ دہشت سے پیلا پڑ گیا۔ اور وہ ایک بچے کی طرح رو پڑا —— مرد الٹر بزدل نہیں تھا اور موت سے خائف نہ تھا۔ آنسو زندگی سے رخصت ہونے کے لئے تھے۔ وہ رویا کیونکہ اسے پتہ لگ گیا کہ کل سورج اس کے لئے نہیں ابھرے گا۔ نہ ابابیلیں پھر کبھی اس کی حسین بسیدر سے ڈھنپی ہوئی پہاڑیوں کو اپنی گنجار سے نغمہ ریز کریں گی۔

اسی لئے یہ تضاد ہے۔ کہ یہ کامیڈین ایک ٹریجیڈین بھی ہے۔ اس کے افسانوں کے دو مجموعوں "پچھتاوے" اور "مد و جزر" میں اس کی یہ یاسیت ایک اندوہناک چیخ بن جاتی ہے۔ "پچھتاوے" کے افسانے ایک دبی ہوئی جدت اور ایک نادر لطافت سے لکھے ہوئے ہیں۔ اور انہیں اس کی آدھی تعریف بھی نہیں ملی جس کے وہ حقدار ہیں۔

"مد و جزر" "پچھتاوے" سے پہلے آئی۔ اور اسی لئے "پچھتاوے" میں جو پختگی اور مشاہدہ ہے وہ "مد و جزر" میں نہیں ملتا۔ "مد و جزر" کی بیشتر کہانیوں میں ایک یکسانیت ہے۔ اور اس کی کہانیاں ایک ہی تھیم پر "مختلف دیری ایشنز" (VARIATIONS) ہیں۔ یہ کتاب اس زمانہ میں لکھی گئی جب شفیق اپنی سب سے پہلی محبت کی میٹھی تلخیاں برداشت کر رہا تھا۔

بچپن کی سنہری دنیا اور بلوغت کے شروع کی گلابی محبت (جسے انگریزی میں بچھڑے کی محبت یا گرین سک نیس (GREEN SICKNESS) کہتے ہیں) کی تصویریں سارے اردو ادب میں اس سچائی اور لطافت سے شاید ہی کسی اور نے پیش کی ہوں گی۔ اس کی یہ دو کتابیں (اور ان میں وہ شاہکار ناولٹ "برساتی" بھی شامل کر لیجئے) کئی ایک لحاظ سے اس کی اپنی آپ بیتیاں ہیں۔ اس کی ساری شخصیت اس کی ان کتابوں میں ہے۔ یہ سب صیغہ واحد متکلم میں لکھی ہوئی ہیں۔ اور ان کا ہیرو خود شفیق الرحمن ہے۔ ان کتابوں کے پڑھنے کے بعد ایک شخص اس کی شخصیت۔ اس کے خیالات۔ اس کے انداز گفتگو سے پوری طرح واقف ہو سکتا ہے۔ "برساتی" پڑھئے آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ شفیق لنچ نہیں کھاتا۔ کرکٹ اور باکسنگ کا شوقین ہے۔ لڑکیوں میں بڑا مقبول ہے۔ ایک چنچل اپریل کی طرح ہنستا رہتا ہے۔ کبھی زندگی کے کھیل سے "بور" نہیں ہوا۔ یہ "بور ہونا" ہی میری نظر میں بذات خود ایک "اچیومنٹ" ہے۔

لیکن یہ ایک مزاح نگار اور پیروڈسٹ کی حیثیت میں ہے کہ اس کی انفرادیت سب سے نمایاں ہے۔ مزاح میں جدید نسل میں اس کا کوئی رقیب نہیں —— کپور کے استثنا کے ساتھ۔ مگر پھر کپور مزاح نگار سے زیادہ ایک طنز نگار ہے۔ ایک طنز نگار کی حیثیت سے شفیق اتنا کامیاب نہیں۔ اس کی تحریر میں وہ کٹیلا پن۔ وہ پرکینہ شرارت نہیں آ سکتی جس کے لئے سب کا۔ ہاضمہ کا ہونا ضروری ہے۔ شفیق کا ہاضمہ بالکل درست ہے۔ کیونکہ وہ "لنچ" نہیں کھاتا۔

شفیق کے "رومانس" اس کے دوستوں میں ایک مذاق بن چکے ہیں۔ وہ متعدد اور دلچسپ ہیں۔ چند ایک سے عبرت کا پہلو بھی نکلتا ہے۔ وہ ایک "مستقل" عاشق ہے۔ یعنی پچھلے سترہ اٹھارہ سال میں شاید ہی کوئی ایسا لمحہ اس کی زندگی میں آیا ہو گا جب وہ کسی بت طناز کے دام زلف میں اسیر نہ تھا۔ وہ اپنے محبوبوں کو اس کثرت سے بدلتا ہے جس کثرت سے لوگ اپنی قمیضیں یا اپنے ہیٹ بدلتے ہیں۔ ایک رومان ابھی بیچ میں ہوتا ہے کہ وہ دوسرا شروع کر چکتا ہے۔ ترک شدہ "محبوب" کا نام تک اس کے ہونٹوں پر نہیں سنا جاتا۔

اس نے اپنی ایک پیروڈی "قصہ حاتم طائی" میں بہت سی مہ وشوں کے درمیان حاتم طائی کی ذہنی کیفیتوں کا جو نقشہ کھینچا ہے۔ وہ اس کے حسب حال ہے۔ اس میں ایک مقام پر حاتم طائی کو ایک حور شمائل نازنین دکھائی دیتی ہے۔ وہ والہانہ اس کا عاشق زار ہو کر اس کی سمت چل پڑتا ہے۔ اتنے میں راہ میں اسے ایک اور ہوشربا حسینہ نظر آتی ہے۔ وہ فوراً پہلی کو چھوڑ کر دوسری کے پیچھے ہو لیتا ہے۔ راستے میں اسے ایک تیسری عشوہ طراز جاتی ہوئی ملتی ہے۔ حاتم طائی فوراً اس پر ہزار جان سے عاشق ہو جاتا ہے اور عشق صادق کا دم بھرنے لگتا ہے۔

شفیق اور حاتم طائی دونوں حضرات نازنینوں کے تیرِ مژگان سے فوراً گھائل ہو جاتے ہیں۔ ان کے لئے نسائی ادا ہلاکت کا حکم رکھتی ہے۔

لیکن شفیق کا پہلا عشق فی الواقع ایک طویل اور سنجیدہ "افیئر" (AFFAIR) تھا۔ ۱۹۳۲ء کے برکت کے سال میں جب وہ میڈیکل کالج لاہور میں تھرڈ ایئر کا طالب علم تھا۔ اس نے وائی۔ ایم۔ سی۔ اے میں ایک بیڈمنٹن کے میچ میں (یا شاید سینما میں، مجھے اچھی طرح یاد نہیں) مس ج — کو پہلی بار دیکھا۔ مس ج اس وقت اس عمر میں تھی جسے انگریزی میں سیٹھے چودہ SWEET FOURTEEN کہا جاتا ہے۔ ج۔ کشیدہ قامت، سپید اور معصوم تھی۔ اس کا بالوں کو گوندھنے کا سٹائل ہوش ربا تھا۔ اس کی آنکھیں گرما کے آسمان کی مانند نیلی تھیں۔ بہرحال شفیق کی رائے تھی کہ وہ نیلی ہیں۔ نوجوان میڈیکو میچ کے ختم ہونے تک کانوں اور سر تک ج — کی محبت میں ڈوب چکا تھا۔

ج — سے اس کی محبت بڑی طویل اور صبر آزما تھی۔ اس نے اس ایک عشق میں ایسی ثابت قدمی اور پامردی کا ثبوت دیا کہ اس کے دوست حیران ہو گئے۔ متعدد وقفوں اور "انٹرپشنز" INTERUPTIONS کو چھوڑ کر یہ محبت پورے آٹھ سال تک رہی۔ ج — جو تین بہنوں میں سب سے چھوٹی تھی، شفیق سے زیادہ بیڈمنٹن کو چاہتی تھی۔ شفیق کو اس سنگ دل محبوبہ سے کبھی دو بدو ہو کر بات کرنے کا موقعہ نہ مل سکا۔ ج — نے غیروں سے کہا اور غیروں سے سنا۔ لیکن اپنوں سے یعنی شفیق سے نہ کبھی کچھ کہا نہ سنا۔ محبوب کی اس بے اعتنائی نے شفیق کو اسے رام کرنے کے لئے اور زیادہ بے صبر اور ضدی بنا دیا۔ اس نے ج — کے والدین کو رشتے کے لئے درخواست دی جو انہوں نے رد کر دی۔

شفیق نے "مدوجزر" لکھ کر ج — کے کنبے سے انتقام لیا۔ "مدوجزر" کی سب کہانیوں میں وہ خود ہیرو ہے۔ مس ج — ہیروئن (اس کے نام مختلف کہانیوں میں مختلف ہیں، مگر وہ حقیقت میں ایک ہی لڑکی ہے)۔ کنبے کے بعض قابلِ اعتراض افراد کے "عقب میل" خاکے تیکھی اور لطیف طنز کے شاہکار ہیں۔ "مدوجزر" ج — کے نام ایک شعر کے ساتھ منسوب کی گئی جس میں ج — سے غیروں سے کہنے سننے کا شکوہ کیا گیا تھا۔ اس نے کتاب کی دو جلدیں تحفۃً ج — کے ہاں بھجوا دیں۔ مجھے یہ معلوم نہیں کہ آیا ج — کے کنبے والوں نے "مدوجزر" کے مختلف کرداروں کے روپ میں اپنے کو پہچانا یا نہیں۔ البتہ یہ یقینی ہے کہ ان کا انداز اس کے بعد سخت ہو گیا۔ ج — کے ساتھ شفیق کی نسبت کے "پراسپیکٹ" بالکل مدھم ہو گئے۔

"مدوجزر" — غالباً ۱۹۴۳ء میں شائع ہوئی۔ اس وقت "ج — افیئر" اپنے پورے عروج پر تھا۔ شفیق کی فوجی ڈیوٹی اسے لاہور سے دور لئے پھرتی رہی۔ وہ اب دوسرے "محبوبوں" کے اشارے دینے لگا۔ اور ہم نے سمجھ لیا کہ "ج — افیئر" ہمیشہ کے لئے ختم ہو چکا ہے۔ اور ہم سب نے اطمینان کا سانس لیا۔

میری حیرت کا اندازہ کیجئے کہ جب میں ۱۹۴۶ء میں انگلستان سے واپسی پر شفیق سے لاہور میں ملا تو "ج — افیئر" ابھی چل رہا تھا۔ شفیق نے ج — کے کنبے کے افراد میں سے ایک صاحب سے جو "شیطان سیریز" کی کہانیوں میں شیطان کے اوبجنل بن کر مشہور ہوئے، اور جو خود بھی ج — کو "کورٹ" کر رہے تھے۔ دوستی اور بے تکلفی کی راہ و رسم پیدا کر لی تھی۔ ان صاحب نے کمال فراخ دلی سے کام لیتے ہوئے ج — کے معاملے میں شفیق کی مدد کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ ایک شام کو جب میں شفیق کے ساتھ میس میں تھا تو ان صاحب نے فون پر مطلع کیا کہ ج — کے والدین رشتے پر راضی ہو گئے ہیں۔ یہ خوشخبری سنتے ہی شفیق کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ ازدواجیت کے خیال نے اسے پینکی PANICKY بنا دیا۔

"اب کیا ہوگا؟" اس نے مجھ سے پوچھا "وہ لوگ مان گئے ہیں"۔

"ہوگا کیا!" میں نے چڑ کر کہا۔ "یہی تم چاہتے تھے"۔

"نہیں یار خالد! اب یہاں سے تبدیلی کرانا پڑے گی"۔

یہ "رومان" کچھ عجیب لگتا ہے۔۔۔ ج — کو حاصل کرنے کے لئے آٹھ نو سال کی مسلسل اور پیہم تگ و دو اور پھر کامیابی پر افسوس

اور مسرت کا اظہار! "سیاحت نامہ نادر شاہ افغانی" میں نادر شاہ صاحب کے "فلسفۂ شادی و محبت" سے مندرجہ ذیل پرلطف اقتباس پڑھنے کے بعد یہ رومان غالباً اتنا عجیب نہیں لگے گا۔

"ہمارا فلسفہ شادی و محبت۔ ہمارے خیال میں اگر محبت کو شادی سے اور شادی کو محبت سے دور رکھا جائے تو دونوں نہایت مفید چیزیں ہیں۔ لیکن نوجوان نہایت جلد بازی سے کام لیتے ہیں۔ دوسروں کے تجربے سے مستفیض نہیں ہوتے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خواہ مخواہ شادی مول لے بیٹھتے ہیں۔

اکثر مشاہدے میں آیا ہے کہ جو لوگ شادی سے پہلے پچھتاتے تھے وہ شادی کے بعد بھی پچھتاتے ہیں۔ ہم کبھی نہیں پچھتائے۔ حالانکہ ہم کسی زمانے میں بڑے بانکے البیلے نوجوان مشہور تھے۔"

راولپنڈی میں شفیق کئی غیر شادی شدہ لڑکیوں کی ماؤں کا منظور نظر رہا ـــــ آٹھ نو سو روپے تنخواہ پانے والا صحت مند سمارٹ اور خندہ جبیں فوجی ڈاکٹر جو اتنی اچھی کتابیں بھی لکھتا تھا، انہیں اپنی لڑکیوں کے لئے آئیڈیل شوہر دکھائی دیتا۔ اس کے پاس ایک چھوٹی اطالوی "ٹاپالینو" کار بھی تھی ـــــ صرف دو کے لئے۔ ماؤں نے اس مستقل عاشق کو مسخر کرنے کی کوشش کی۔

اس کے "رومانس" کی تاریخ لکھنے کے لئے بڑی فرصت درکار ہے ـــ کچھ عرصہ وہ راولپنڈی میں رہا (اس کے انگلستان جانے سے پہلے کا قصہ ہے) اپنی "ٹاپالینو" میں ایک جرمن لڑکی کو بٹھائے نظر آتا رہا۔ اس لڑکی نے فوراً بعد ایک اینگلو انڈین لڑکے سے شادی کر لی۔ پھر ایک اور لڑکی تھی۔ جسے وہ پیار سے "مینڈھا" کہا کرتا تھا۔ اس کی آنکھیں بڑی بڑی اور غزالی تھیں۔ اس کی صورت بھولی بھالی اور پرکشش تھی۔ اس کا قد ذرا چھوٹا تھا (شفیق کو چھوٹے قد کی لڑکیاں سخت ناپسند ہیں۔ مگر "مینڈھے" کی دوسری خوبیاں اس کے چھوٹے قد کے عیب کی تلافی کر دیتی تھیں) وہ اس سے شادی کر لیتا، مگر اسی اثنا میں وہ ایک اور لڑکی سے ملا جس کے نقوش "مغلئی" تھے۔ اور قد لانبا۔ اسے وہ چھوڑ دینے کے بعد مس گھوڑا کے لقب سے یاد کیا کرتا۔ اس نے اس سے اس لئے شادی نہ کی کہ اس کا بھائی (یا ماموں) کمیونسٹ نکلا۔

اس کے "رومانس" اس کی ذہنی صحت مندی اور ابلتے ہوئے ولولے کی OUTLET ہیں۔ شادی سے یہ دائمی کنوارا سخت خائف ہے۔ انگلستان سے واپسی کے بعد یا تو اس میں متانت اور پختگی آگئی ہے۔ اور یا وہ اپنے "رومانسوں" کے متعلق کم سخن ہو گیا ہے۔ اس کا آج کل کوئی "رومان" سننے میں نہیں آتا۔ ایک اور امکان بھی ہے کہ اس محبت کرنے والے شخص نے آخر اپنے ساتھی کا انتخاب کر لیا ہو۔ اس نے اتنے لوگوں کو مسرت دی ہے۔ وہ مسرت اور طمانیت کا سب سے زیادہ حقدار ہے۔

یہ میرا دوست شفیق الرحمٰن ہے!

اس کے چہرے پر علم اور محبت کی جوت ہے۔ اس کی متنوع رنگارنگ کی معلومات۔ اس کا بات کرنے کا شگفتہ اور دلچسپ انداز۔ اس کی دانانیت ـــ یہ سب صفات اسے ایک بڑا پر لطف ساتھی اور دوست بناتی ہیں۔ ڈرائنگ روم میں یا باہر کھلی سڑک پر اس کی باتیں ایک سا سحر ڈالتی ہیں۔ اور مردہ ترین سے مردہ ترین دل میں بہار لے آتی ہیں۔

اکثر ادبی مزاج کے لوگوں کو سفید بالوں اور ایک اعصابی بے سکونی کی شکل میں عملی زندگی میں داخل ہونے کی قیمت ادا کرنا پڑتی ہے لیکن یہ قیمت ادا نہیں کرنا پڑی۔ کیونکہ اس نے ادب کے فن کے ساتھ زندہ رہنے کے فن سے غفلت نہیں برتی۔ لکھنا اس کے لئے خون اور پسینہ بہانا نہیں بلکہ زندہ رہنے کی مانند ایک دلچسپ اور پرلطف شغل ہے۔

میرے ترقی پسند دوست کا اعتراض کہ شفیق طبقاتی شعور سے بے گانہ ہے، شاید درست ہو۔ ایک اچھا ایماندارانہ دل اور تندرست جسم طبقاتی شعور سے زیادہ ضروری چیزیں ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ ایک آدمی میں بڑا گہرا طبقاتی شعور ہو، اور جذباتی اور روحانی طور پر وہ اتنا بے حس ہو جتنا ایک پتھر کا ٹکڑا۔۔۔۔۔ مجھے یہ تمنا ضرور ہے کہ شفیق بھی کالو بھنگی یا اپنے ہیرے علی کے متعلق کوئی افسانہ لکھے۔ ڈرائنگ روم اور ڈانس ہال کی گھونٹ دینے والی فضا سے باہر زندگی کے کوچوں میں نکل آئے۔ جب وہ ایوننگ سوٹ کے ڈمیوں کی بجائے ان عام آدمیوں کے بارے میں لکھے گا جو جرنیلوں اور بادشاہوں سے کہیں زیادہ اہم اور عظیم ہیں۔ تو اس کے قلم میں ایک نئی توانائی اور جولانی آجائے گی۔ فن کار کے لئے سب سے بڑا خطرہ اس کا ذریعۂ معاش ہوتا ہے۔ روٹی تو اسے بہر طور کمانا ہی ہے۔ مگر اُسے چوکس رہنا چاہئے کہ کہیں وہ اپنے پیشے کے ماحول میں ڈھل کر نہ رہ جائے یہ فن کار کی موت ہے۔ اور ایک سچا فن کار ہمیشہ سوسائٹی کی قبول شدہ قدروں اور معیاروں کے خلاف برسرِ پیکار رہتا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ ضرور لمبے بال ہی رکھے اور کلب میں چادر پہن کر جا بیٹھے! بلکہ یہ کہ اسے یہ احساس رہنا چاہئے کہ دنیا کی عزت اور آدابِ محفل کے NOTIONS ضروری طور پر صحیح نہیں۔۔۔۔۔ شفیق سے مجھے اکثر یہ شکایت رہی ہے کہ اپنی تحریروں اور افسانوں میں وہ اخلاق کے معاملے میں ایک بوڑھی کنواری چچی کا رویہ رکھتا ہے۔ وہ احتیاط برتتا ہے کہ اس کے قلم سے کوئی ایسا خیال نہ ادا ہو جائے جو بستر میں پڑھتی ہوئی سکول کی لڑکی کے چہرے کو شرم سے لال کر دے۔ اسے شریف لوگوں کی طبائع نازک کا بڑا خیال رہتا ہے۔ اس سے اس کی تحریروں میں 'دودھ اور شہد' کا اثر آجاتا ہے۔ ہم اپنے ادب کو واڈکا کی طرح تیز اور چڑھ جانے والا پسند کرتے ہیں۔

یہ میری تمنائیں اور شکایتیں ہیں۔ 'برساتی' میں اس نے انشاء کی بڑی قوت کا ثبوت دیا ہے۔ میں اس قوت کو کسی عظیم تر مقصد کے لئے استعمال ہوتے دیکھنا چاہتا ہوں ——

تسنیم سلیم چھتاری

سلمیٰ خورشید منیر

لوگ مجھے کتنا ہی کم عقل سمجھتے ہوں اپنے بارے میں میری یہ رائے کبھی نہیں رہی مگر آج تسنیم پر مضمون لکھ کر میں نے اپنی حماقت کو حق بجانب ثابت کر دیا۔ تسنیم کے بارے میں مجھے بے شمار "خوش فہمیاں" رہی ہیں جن میں ایک یہ بھی تھی کہ وہ مجھ سے بے حد مرعوب ہیں۔ ان کی پہلی کتاب "دھنک" شائع ہوئی اور اس کی ایک جلد مجھ تک پہنچی تو پہلا صفحہ میں نے بڑے اعتماد سے یہ سوچ کر کھولا کہ انتساب یقیناً میرے نام ہوگا ——— لیکن، توبہ کیجئے تسنیم میں اتنی وضعداری کہاں۔ میں نے اپنے دل کو یہ سمجھا کر بہلا لیا کہ "پہلی حقیر کوششوں کا نتیجہ" آخر وہ میرے نام کس طرح معنون کر سکتی تھیں جبکہ انہیں میرے "ادبی ذوق" کے بارے میں "کافی علم" ہے۔ لیکن جب ان کا دوسرا افسانوں کا مجموعہ "رقصِ شرر" کے بعد "موصول" ہوا تو ——— یقین آ گیا کہ تسنیم کا فن ہنوز تجربہ کے دور سے گذر رہا ہے ——— اور جونہی انہیں خود پر بھروسہ ہوا ——— ظاہر ہے ——— عقلمند کو اشارہ کافی ہے۔

تسنیم کے اوپر مضمون لکھنے میں ایک بڑی دشواری یہ درپیش ہے کہ وہ خود بھی یہ مضمون پڑھیں گی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو میرے لئے بڑی سہولت ہو جاتی۔ مضمون محض پڑھ لینا ہی ہوتا تو بھی زیادہ مضائقہ نہیں تھا۔ ستم تو یہ ہے کہ وہ اسے ہنس ہنس کر لطف لے لے کر اور اپنے چبھتے ہوئے جملوں کے اضافے کے ساتھ پڑھیں گی ——— یقین نہ آئے تو خود تسنیم ہی سے پوچھ لیجئے ——— وہ ایسا ضرور کریں گی۔

تسنیم اور میری "دوستی" (کاش ہم دونوں کو اس کا یقین ہوتا) کی ابتدا ہماری دوستی کی انتہا کی طرح نامعلوم ہے۔ یعنی کچھ ٹھیک طرح یاد نہیں کہ کب اور کس طرح یہ حادثہ پیش آیا تھا ——— کہتے ہیں کہ محبت پہلی جھلک میں اپنا رنگ جما لیتی ہے اور ہماری پہلی ملاقات، جہاں تک مجھے اس کی دھندلی سی یاد ہے دونوں کے لئے سخت باعثِ کوفت ثابت ہوئی تھی اور حال ہی میں دونوں نے اس باہمی نازک خیالی کا اعتراف بھی کر لیا۔ میں نے انہیں دیکھ کر سوچا تھا "بنتی بہت ہیں امارت کا زعم شدید ہے" تسنیم نے اس ناچیز کے بارے میں بیان دیا "کس بلا کی بد دماغ ہیں" میرا خیال تو بہت جلد غلط فہمی میں تبدیل ہو گیا۔ تسنیم کی رائے البتہ "زبان زدِ خاص و عام" ہوئی۔

دھیرے دھیرے جب ملاقاتیں جلدی جلدی ہونے لگیں تو ہم دونوں نادانستہ طور پر ایک دوسرے سے "مانوس" ہوتے گئے تعلقات استوار کرنے کے لئے میں نے طے کیا کہ اپنے گڈے کی شادی تسنیم کی گڑیا سے کر دوں۔ تسنیم کو یہ تجویز بہت پسند آئی۔ بہت جی لگا کر ہم دونوں نے

شادی کا انتظام شروع کر دیا، دو چار ہی دن میں ہم دونوں تو اس ہنگامے سے اکتا گئے اور اپنے "روزمرہ" میں مبتلا ہو گئے اور ہمارے بزرگوں کو یہ کارِ خیر انجام دینا پڑا۔ تقریب بہت دھوم دھام سے ہوئی اور گڑیا کے جہیز میں بیشتر ایسی چیزیں ملیں کہ اگر میں ذرا بھی دور اندیشی سے کام لیتی تو یقیناً میرے جہیز میں بھی کام آ سکتی تھیں مگر اس وقت اپنے بارے میں قطعاً وثوق سے نہیں کہہ سکتی تھی کہ یہ مصیبت بھی کوئی مول لے گا۔

اس زمانے میں ہمیں کچھ پڑھنا، لکھنا، کتابیں پڑھنا، لڑنا جھگڑنا، اور چاندنی راتوں میں راحت منزل (علی گڑھ میں نواب صاحب چھتاری کی کوٹھی) کے وسیع اور شاداب لان پر رات گئے تک ٹہلنا بہت مرغوب تھا۔ یہی وہ زمانہ تھا جب ہماری "آمائیں" ہمارے مستقبل سے سخت مایوس تھیں اور ہمارے پھوہڑپنا اور بدسلیقگی کے تذکرے اکثر گھروں کی چہار دیواری میں بھنبھنایا کرتے مگر ہم "بڑے آدمیوں" کی طرح چھوٹی چھوٹی باتوں کی پروا نہیں کرتے تھے اور خود کو حجاب امتیاز علی کے افسانوی ماحول کی ہیروئن سمجھا چاہتے تھے مگر مشکل یہ تھی کہ راحت منزل میں عرب نشین، فرانسیسی دریچے، جیلسن زوناش اور ڈاکٹر گار ڈھونڈھے سے بھی نہ ملتے اور ہمیں مجبوراً یہ خواہش ترک کرنا پڑتی۔ عجیب بات یہ تھی کہ اس قدر ساتھ ساتھ رہنے اور ایک دوسرے سے انتہائی وابستگی کے باوجود ہم ایک دوسرے کی کوئی بات ماننے پر تیار نہیں ہوتے تھے نہ کسی فیصلہ پر متفق ہوتے۔ ہر وقت ایک نامعلوم ذہنی کھچاؤ قائم رہتا جس میں ایک دوسرے پر چھینٹا اڑانے میں بڑا لطف آتا۔ اگر کوئی شعر تسنیم کو پسند ہوتا تو یقیناً مجھے اس شاعر تک سے چڑ ہو جاتی۔ مجھے کوئی کہانی پسند آتی تو کوئی وجہ نہ ہوتی کہ تسنیم کو اس افسانہ نگار کے نام تک سے کوفت نہ ہو جاتی ہو۔ میں کرشن چندر کی بڑی مداح تھی اور تسنیم محض مجھے زک دینے کے لئے کرشن کی کہانیوں سے بے حد چڑتی تھیں۔ تسنیم احمد ندیم قاسمی کی طرزِ تحریر کی بڑی قائل تھیں۔ انتقاماً میں نے قاسمی کی کہانیاں ہی پڑھنا چھوڑ دیں۔ اگر کوئی پوچھ بیٹھے کہ اپنی ان حماقتوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کو ہم نے ان عظیم فن کاروں کا انتخاب کیوں کیا تھا تو یقیناً ہم دونوں کے پاس اس بارے میں کوئی جواب نہ ہو گا۔

تسنیم کی شادی بہت کم عمری میں ان کے ماموں زاد بھائی سلیم سے کر دی گئی تھی۔ مگر تسنیم نے شادی شدہ ہونے کو بہت کم اہمیت دے رکھی تھی۔ اس وقت تو مجھے بھی کچھ ایسا ہی محسوس ہوتا تھا کہ یوں ہی ہونا بھی چاہئے۔ کیونکہ شادی تو "شادی ہے ہی" جو ہونے ہی کے لئے ہوتی ہے۔ پھر اس کا ذکر کیا۔ البتہ دوستوں سے ملنا جلنا، سنیما دیکھنا، مشاعرے سننا، نمائش گھومنا اور ٹھاٹھ سے پڑا رہنا، شادی سے کہیں زیادہ ضروری اور برتر ہیں۔ اس سلسلہ میں سلیم کا رول بہت ہی دلچسپ تھا۔ اس شخص نے کبھی کہیں اور کسی لمحے بھی یہ محسوس نہ ہونے دیا کہ تسنیم کے اوپر کچھ حقوق وہ بھی رکھتے ہیں۔ ہماری مشغولیتوں، دلچسپیوں، اور نت نئے پروگراموں کے درمیان کبھی کوئی رکاوٹ نہ ڈالی۔ اگر یہ شادی محض بزرگوں کے کئے ہوئے فیصلے کے مطابق ہوتی جب بھی کچھ صبر آ جاتا مگر تسنیم اور سلیم کی شادی میں سلیم کے والہانہ شوق اور وابستگی کو بھی دخل تھا۔ ان سب باتوں کے باوجود سلیم نے کبھی تسنیم پر کسی قسم کی پابندی نہیں عائد کی۔ بلکہ ان کے ہر شوق، پروگرام اور فیصلہ پر ہمیشہ صاد کیا اور تسنیم باوجود بالعوض سکہ رائج الوقت قسم کی زوجہ اور سسرال کی بہت ہی مستند سی "بہو" ہونے کے بڑے اطمینان سے تتلی کی طرح ادھر سے ادھر ہوا کے رخ پر تیرتی رہیں۔ شوہر سے ملاقات کا تذکرہ یوں ہوتا گویا کسی اچھی فلم کی آمد یا کسی پسندیدہ کتاب کا ذکر ہو۔ اسی دوران میں اکثر اپنی سسرال "طالب نگر" بھی جانا پڑ جاتا تو لگتا جیسے پک نک پر جا رہی ہوں۔ زندگی قطعاً "رس بھرے خوابوں کا ہجوم" تھی — طالب نگر میں کچھ عرصہ قیام کرنا ناگزیر ہو جاتا تو وہاں بیٹھے بیٹھے ڈرامے لکھا کرتیں۔ پھر سلیم سے فرمائش ہوتی کہ اس کو اسٹیج کیا جائے۔ ایک ڈرامہ "روپ متی باز بہادر" دیکھنے کا اتفاق مجھے بھی ہوا۔ اس میں باز بہادر کا کردار سلیم ہی نے پیش کیا اور سچ تو یہ ہے کہ بہت کامیابی سے پیش کیا۔ اسٹیج کی سج دھج، پنڈال کے جگمگاتے ہوئے قمقمے، زریں و بیش قیمت ملبوسات اور اداکاری کا معیار سب کچھ ہی دلفریب رہا۔ سب کچھ سلیم اور ان کے دوسرے ساتھی کرتے رہے اور تسنیم پورے وقت بڑے اعتماد، فخر، پیار، چاؤ اور ٹھہراؤ سے اسٹیج پر نظریں گاڑے رہیں۔ گویا اپنی مخلوق کو پھولتے پھلتے دیکھ کر مسرور و مطمئن ہیں۔

لکھنے کا شوق تسنیم کو بہت بچپن سے ہے۔ ان کے بیان کے مطابق وہ "تختی پر بھی کہانی" ہی لکھا کرتی تھیں۔ میں نے ان کی سب سے پہلی کہانی "بجلی بر

خود انہی کی زبانی چھتاری میں شمی تھی مقصد تو اب یاد نہیں البتہ وہ ماحول اور وہ فضا اب تک نہیں بھول سکی جو اس وقت چھتاری میں تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اُتر پردیش میں زمینداری کو فروغ حاصل تھا۔ چھتاری کے وہ وسیع اور دور دور تک پھیلے ہوئے کھیت جن میں سرسوں کے پھول اپنی تمام شادابی اور رنگینی سے کھلے رہتے اور گوبھی کے بیج اور معصوم سے پھول اوپر سے جھکتے ہوئے کتنے بھلے لگتے تھے۔ قلعہ کی وہ باوقار سی فصیل، وہ بہت دور سے نظر آنے والے میناروں کی بُرجیاں، وہ تنہا کھجور کا درخت کس قدر پُراسرار نظر آتا جو پختہ فصیل پر نہ جانے کس طرح اُگ آیا تھا اور یوں پروان چڑھ رہا تھا۔ وہ خوبصورت عمارت جو "باغ کوٹھی" کے نام سے موسوم تھی جس میں شادی بیاہ کے موقع پر نئی دلہن کو قلعہ میں لانے سے پہلے اتار کر سنوارا جاتا تھا، وہ بڑا قدیم اور مضبوط پھاٹک، وسیع صحن، کشادہ دالان اور دردالان جس میں پرانے پرانے جھاڑ فانوس، قدیم خاندانی تصاویر، ایرانی قالین اور پرانا بھاری بھرکم فرنیچر، کسی مستند تہذیب اور قدیم مشرقی روایات کے نقوش بکھیرتے ہوئے ـــــــ مجھے وہ چھتاری ہمیشہ یاد رہے گا۔

تسنیم کو میں نے کہانی پڑھتے ہی نہیں کہانی لکھتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔ اور مجھے حیرت ہوتی ہے جب میں سوچتی ہوں کہ کس طرح وہ اکثر ایک ہی نشست میں اپنی کہانی مکمل کر لیتی ہیں۔ یہی نہیں لکھنے کے دوران میں سب کی باتوں کے جواب دیتی جاتی ہیں، پان بناتی ہیں۔ لفافے پر پتہ بھی لکھ دیتی ہیں اور روزمرہ کے حساب کتاب میں بھی ترمیم و اضافہ کرتی جاتی ہیں اور پھر کہانی پڑھئے تو کس بلا کی روانی، برجستگی، چستی اور توازن ملتا ہے۔ تسنیم کی تعلیم کسی ادارہ کی محتاج نہیں رہی۔ اسی لیے ان کی شخصیت میں وہ انفرادیت، وضاحت، اور ذہنی کشادگی ملتی ہے جو کسی ادارہ سے منسوب ہونے کے بعد اکثر کھو جاتی ہے۔ انہوں نے زندگی کی بڑی خوشگوار صبحیں اور شامیں دیکھی ہیں۔ وہ محبت، آسودگی اور فراغت کے سایے میں پلی ہیں۔ لیکن تسنیم کے دل میں ان کی فطرت میں، ان کی شخصیت میں جو رچاؤ ہے وہ فراغت، دولت اور خوشحالی سے نہیں پیدا ہوتا، یہ پیدا ہوتا ہے نظر کی وسعت، فطرت کے مشاہدے، خیال کی ندرت اور شخصیت کے اعتماد سے!

وہ کسی حد تک جذباتی بھی ہیں۔ میں نے ان کو اکثر سخت کشمکش کے موقع پر مسکراتے دیکھا ہے اور چھوٹی سے چھوٹی معمولی بات پر بڑی طرح بے چین ہوتے بھی دیکھا ہے۔ یہ گنگا جمنی کیفیت تسنیم کے وجود کا ایک جزو ہے۔ ان کی طبیعت میں مزاح کو بھی بڑا دخل ہے۔ تسنیم سے ملتے ہی پہلا احساس یہ ہوتا ہے کہ جلد سے جلد اپنی مدافعت میں کچھ کہہ لو، ورنہ تسنیم بولنے لگیں گی تو سوچا سمجھا سب دھرا رہ جائے گا۔ جملے چسپاں کرنے اور برجستہ جواب دینے میں تسنیم کو ملکہ حاصل ہے۔ مجھے ان کی خوش دلی، حاضر جوابی اور مزاح کے سلسلہ میں ایک لطیفہ اکثر یاد آتا ہے۔ سنہ ۱۹۴۶ء کے وسط میں ایک بار میں تسنیم کے ساتھ دہلی آئی۔ نواب صاحب چھتاری اس زمانے میں حیدرآباد کے صدر اعظم تھے اور انہی کے سیلون میں ہم نے علی گڑھ سے دہلی تک کا سفر کیا تھا اور نئی دہلی کی ایک عالیشان کوٹھی کے بالائی حصے میں ہمارا قیام تھا۔ ایک رات نچلی منزل میں کسی میٹنگ کے سلسلہ میں مرحوم لیاقت علی خان صاحب، جناح صاحب اور سر اسٹیفورڈ کرپس موجود تھے اور ہم لوگ ایک روشندان میں سے ان سب کو دیکھنے کی کوشش میں آنکھیں لگائے بیٹھے تھے۔ اچانک ایک بڑا سا پتنگا ہوائی جہاز کی طرح کچھ اُڑتا، لرزتا اور بھنبھناتا ہوا ہمارے قریب آکر گرا۔ تسنیم بہت چونک کر اُچھلیں پھر سنبھل کر اُس سے مخاطب ہوئیں "ہلو نواب صاحب چھتاری!" ہم نے گھبرا کر صورتِ حال سمجھنا چاہی۔ ننھے سے پتنگے کے وجود کو دائیں اور بائیں دو بہت ہی لمبی سی پتلی پتلی پروں کی نوکیلی مونچھوں نے چھپا رکھا تھا۔ چھتاری خاندان کے ساتھ مونچھوں کا جو رشتہ ہے اسے مدِ نظر رکھتے ہوئے اس جملے نے بہت لطف پیدا کیا۔ تسنیم جملہ کہنے میں کبھی نہیں چوکتیں، اور مجھے کوئی ایسا واقعہ یاد نہیں جب کبھی ان کے کسی جملے کی گرفت کمزور پڑی ہو یا کوئی بات کہہ کر ان کو اس کی معذرت کرنا پڑی ہو۔

تسنیم کے افسانے پڑھئے تو بے اختیار آپ کے ذہن کا گوشہ گوشہ مسکرا اٹھے گا۔ ان کی کہانیوں میں اکثر درد، اُلجھن اور سماجی مجبوریاں ملیں گی۔ ان کی بیشتر کہانیاں انہی واقعات و حالات کے گرد چکر کاٹتی ہیں۔ اور ہم سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ بظاہر اس قدر مطمئن زندگی میں ایسی کون سی بے رنگی ہے جس نے ان کی تحریر میں یہ رنگینی پیدا کر دی ہے۔ تسنیم کی کہانیاں کرک، دور دیس کا رہنے والا، خبطی، اور نشیب و فراز، ان کے کرداروں کی

نفسیاتی الجھنیں اور ذہنی خلش کی آئینہ دار ہیں۔ ٹاک بنگلہ، شجرۂ نسب، ٹوٹ گیا کنارہ اور حسنِ انتخاب میں ان کا فن نکھرا ہوا اور نسبتاً واضح ہے۔ دیبو کا ہے بنگال اپنے موضوع ہی کے نہیں، زبان، بیان، خیالات اور جذبات کے اعتبار سے بھی جامع اور مکمل ہے۔

تسنیم کے بارے میں کچھ لکھنے سے پہلے میرا پورا ارادہ یہی تھا کہ ان کی ادبی کاوشوں پر میں کسی قسم کی رائے نہ دوں گی۔ مگر میں دیکھتی ہوں کہ تسنیم ادبی میدان میں اب اس حد تک پہنچ چکی ہیں جہاں فن اور فن کار ایک ہو جاتے ہیں۔ اب اگر ہم چاہیں بھی تو تسنیم کی شخصیت کو ان کے طرزِ تحریر سے الگ نہیں کر سکتے۔ اس لئے کہیں کہیں بے اختیار میں ان کے ادبی ذوق کا تذکرہ کرنے لگتی ہوں۔ ایسا کرنے میں کچھ ایسا حرج بھی نہ ہوتا بشرطیکہ میں تسنیم کے فن کے ساتھ انصاف کر سکتی!

تسنیم کی سنجیدہ اور ذمہ دار زندگی کا آغاز ہوتا ہے سلیم کی نوکری سے۔ گویا وہ دور آ پہنچا تھا جب رؤسا کے لڑکے بھی اپنی محنت کی کمائی کو آباؤ اجداد کی جائداد پر بیکار محض بن کر پڑے رہنے کے مقابلے میں ترجیح دینے لگے تھے۔ سلیم کو بارہ چکیہ (بہار) میں ایک شوگر فیکٹری میں جگہ مل گئی اور وہ فوراً ہی کام سنبھالنے روانہ ہو گئے تھے۔ مکان وغیرہ کا بندوبست ہونے پر تسنیم کو بھی وہاں جانا پڑا۔ وہ وہاں گئیں تو اپنی مخصوص بے فکری اور لاپروائی کے انداز سے! مگر ــــ جب کچھ عرصہ بعد ان سے ملاقات ہوئی تو ان میں ذمہ داری کا احساس پیدا ہو چلا تھا۔ گرمی کی چھٹیاں تھیں اور جب تسنیم واپس بارہ چکیہ جانے لگیں تو مجھے بھی ساتھ لیتی گئیں۔ ان دنوں ہماری بے فکری اور لطف و تفریح کی کوئی حد ہی نہیں تھی۔ تسنیم کے گھر جا کر میں دنگ رہ گئی جب میں نے دیکھا کہ وہ باورچی کو کھانا پکانے کے بارے میں ہدایات دیتیں، دھوبی کو کپڑا جلد لانے اور بہشتی نہ چڑھانے کی تلقین کرتیں اور خوش خوشی "پتی ورتا استریوں" کی طرح سلیم کے آفس سے آنے کے وقت چائے بنا کر ان کا انتظار کرتیں۔ یہ میرے لئے سخت اچنبھا تھا۔ یہی نہیں ایک دن تو ستم ہو گیا جب باورچی کے اچانک بیمار ہو جانے کی وجہ سے بیرے کے ہاتھ کا بدمزہ کھانا کھانا پڑا تو تسنیم نے مجھ سے کہا کہ سالن وہ خود پکائیں گی اور چپاتی بیرا۔ میں نے یہ صورتِ حال دیکھی تو اخلاقاً اپنی خدمات بھی پیش کر دیں۔ ہم دونوں نے طرح طرح سے خود کو بہلانا چاہا کہ ہم خود ہی کھانا پکانے میں ماہر ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ پکاتے نہیں ــــ ایک انگیٹھی اور دوسرے لوازمات لے کر ہم کھانا پکانے بیٹھ گئے۔ سلیم بھی ہماری تسکینِ قلب کو (گویا مصیبت میں برابر کے شریک ہیں) کرسی لے کر وہیں بیٹھ رہے۔ مسالہ دیگچی میں ڈالا جا چکا تھا کہ اچانک کسی کی یہ رائے ہوئی کہ سالن تو پکتا ہی رہتا ہے اور پھر بھی پک جائے گا اس وقت تو بیسن کی پکوڑیاں تلی جانی چاہئیں۔ والنٹیئرز تو تیار ہی تھے فوراً ہم نے بیسن گھولنا شروع کر دیا۔ سلیم نے کہا، "بھئی پکوڑیاں ذرا چٹپٹی ہونی چاہئیں" بس پھر کیا تھا نمک ڈالنے کا تو تسنیم نے لیا اور مرچ ملانے کی خدمت میں نے اپنے سر لی۔ ہمیں رہ رہ کر یہ اندیشہ ہوتا کہ فرض میں کوتاہی نہ رہ جائے لہٰذا تھوڑے تھوڑے وقفے پر تسنیم نمک کی چٹکی اور میں مرچ کا چمچہ بیسن میں ڈالتے رہے ــــ پہلا گھان اُترا تو سلیم مع اپنے دو مہمانوں کے، سنہری سنہری نہایت اشتہا آمیز پکوڑیوں پر لپکے ــــ اور پکوڑیاں منہ میں ڈالیں! خدا کی پناہ ــــ ہم دونوں گھبرا گئے ــــ سلیم اور ان کے دوستوں کے چہرے ایسے ہو رہے تھے گویا کسی نے ان پر اچانک ٹیئر گیس استعمال کی ہو ــــ یوں بھی ایک مہمان بھوت سے بہت خائف رہتے تھے۔ پکوڑے کھا کر انہیں اور بھی پکا یقین ہو گیا کہ یہ بھوت کی کارستانی ہے۔ جس کمرے میں ان کو ٹھہرایا گیا تھا اس کے بارے میں ہم سب نے مشہور کر رکھا تھا کہ رات کو کوئی رُوح روشندان کے ذریعے کمرے میں اُترتی ہے۔ ان بچارے مہمان کا بُرا حال تھا اور ہمارا بھی ہنستے ہنستے بُرا حال ہو گیا جب ایک دن ان صاحب کو تنہائی میں اس کمرے میں ہاتھ باندھے دیکھا۔ وہ آنکھیں بند کئے نہایت عقیدت سے روشندان سے مخاطب تھے کہ "اے پاک رُوح! تو ہم پر رحم فرما۔ جب ہم تجھے نہیں ستاتے تو تو بھی ہمیں نہ ستا!" وہ پاک رُوح دراصل چوکیدار کی تھی جسے ہر رات ہم لوگ سفید چادر اوڑھا کر روشندان میں بٹھا دیا کرتے تھے۔

یہ تسنیم کے "خانہ داری" کے ابتدائی مرحلے تھے۔ اب تو وہ نہ صرف کھانے پکاتی ہیں بلکہ باغ میں سبزی اُگاتی ہیں کھیت میں گیہوں بوواتی ہیں!

مویشی پالتی اور ڈیری فارم چلاتی ہیں، نمک اور مرچ بہت سوچ سمجھ کر اچار اور چٹنیوں میں ڈالتی ہیں اور پیارے پیارے سے بچوں کے لئے کپڑے سیتی ہیں، گھر کے لئے کشن پردے تیار کرتی ہیں۔ غرضیکہ سب کچھ انتہائی سلیقے سے کرتی ہیں مگر —— ان کے ماضی کی جھلک اب بھی ان کے کہانی لکھتے وقت یا کتاب پڑھتے وقت نظر آتی ہے جس میں اب بھی وہی بے فکری، لاپروائی، زندہ دلی، شگفتگی اور حرکت ملتی ہے جس کے بغیر تسنیم کی شخصیت نامکمل ہوتی ہے!

مخلص دوستوں کے معاملے میں، میں بہت خوش قسمت واقع ہوئی ہوں۔ (دوستوں کی رائے چنداں ضروری نہیں ہے) اور جب کبھی اپنے ماضی کی طرف نظریں دوڑاتی ہوں، متعدد جانے پہچانے اور خلوص بھرے چہرے، محبت و انسیت سے لبریز نگاہیں اور لطف و شفقت سے بھرپور کلمات، ذہن و دماغ میں تیرنے لگتے ہیں —— لیکن ذرا بھی غور کرتی ہوں تو اکثر تصویریں لمحے ہی بھر میں دھندلی پرچھائیاں بن کر فضا میں تحلیل ہونے لگتی ہیں۔ ان سب کے اوپر ایک نقش ابھرتا چلا آتا ہے اور دوسرے ہی لمحے تسنیم کی دلآویز شخصیت، طنزیہ مسکراہٹ اور ذہین وجود ایک ٹھوس اور واضح حقیقت بن کر ذہن پر جگمگانے لگتی ہے۔ مجھے تسنیم کے ساتھ گذارے ہوئے اپنے لڑکپن کے بے شمار برسوں کی یاد کبھی کبھی یوں بھی آنے لگتی ہے جیسے اچانک کوئی عمدہ شعر یاد آجائے، کوئی دلکش منظر نگاہوں میں تیر جائے یا کوئی حسین چہرہ ذہن پر چھا جائے یا جیسے بیمار کو بے وجہ قرار، اور ویرانے میں چپکے سے بہار آجائے —— تسنیم کے تذکرے سے وابستہ ہے گذرے ہوئے خوبصورت دنوں کی وہ جان لیوا مہک جو روح کی گہرائیوں میں اتر جاتی ہے۔

[illegible]

[illegible]

تیسرا ضمیمہ

[illegible]

[illegible]

پر عشیر یہ پتہ سہار ے (فراق صاحب کے چھوٹے بھائی) اور دیگر چند حضرات بیٹھے تھے، مگر وہ سب سے زیادہ جس شخص کے شاکی اور جس شخص سے "خائف" تھے وہ اشرف علی تھے ——— "خائف" کا لفظ میں قصداً استعمال کر رہا ہوں۔ اس لئے کہ اشرف علی فراق صاحب کو ان سب حضرات سے زیادہ جانتے اور سمجھتے تھے۔ میں اس وقت جب فراق صاحب بڑے جوش و خروش کے ساتھ کسی مسئلہ پر گفتگو کرتے وہ ان کو ——— اگر انہیں اختلاف ہوتا ——— ٹوک دیتے یا کہہ دیتے: "فراق صاحب! اس سلسلے میں آپ نے جس مصنف کا حوالہ دیا ہے غلط ہے۔ یوں نہیں یوں ہے" یا "یہ حوالہ کسی کتاب کا نہیں ہے۔ یہ آپ ہی کا ایجاد کردہ ہے جو آپ صرف اپنی بات منوانے کے لئے کسی اور کے نام سے منسوب کر رہے ہیں" اور فراق صاحب بپھر جاتے۔ مگر وہ ان کی برہمی کی پرواہ کئے بغیر اپنی بات پر اڑے رہتے ——— "فراق صاحب! جو بات آپ نے کہی ہے وہ اپنی جگہ بہت مناسب ہے، مگر یہ کیا ضروری ہے کہ آپ اسے کسی دوسرے کے نام سے پیش کریں؟" فراق صاحب اور برہم ہو جاتے۔ ان کا چہرہ سُرخ ہو جاتا۔ گفتگو سخت اور درشت لہجے میں ہونے لگتی۔ صبح سے شام ہو جاتی اور پھر رات۔ دو دو تین تین بج جاتے مگر بحث جاری رہتی۔ فراق صاحب کی بھاری، کھردری، لوہے کی طرح تپتی ہوئی آواز گونجتی گرجتی آس پاس کے مکانوں سے ٹکراتی۔ اس وقت ایسا معلوم ہوتا جیسے ان کی آواز پوری کائنات پر پھیلا رہی ہے ——— ادب، سائنس، مذہب، اخلاق، فلسفہ، نفسیات، جنس، جمہوریت، اشتراکیت، فسطائیت ——— سارے مسائل کی تہ ان کے لہجے کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ کھلتی چلی جاتی۔ گویا سارے مسائل لہجے ہی میں سمیٹ کر رکھ دیے گئے ہیں ——— اس لہجے میں تجربات کا پُر جوش تھا۔ یہ ایک طویل مسافت طے کرتا ہوا، زندگی کی پیچیدہ اور پُر اسرار راہوں سے گزرتا ہوا، نور و ظلمت دونوں کو سمیٹتا ہوا لوگوں کے دلوں میں اترتا رہتا اور انہیں بھی اپنے ساتھ کھینچتا ہوا اپنے کبھی نہ ختم ہونے والے سفر پر روانہ ہو جاتا۔ اس لہجے میں کبھی عظمت ہوتی کبھی پستی، کبھی سکون ہوتا کبھی اضطراب، کبھی شدید محبت کبھی شدید نفرت، کبھی صرف بُغض، عناد اور تحقیر! مگر یہ ہر حال ہر صورت میں ایک للکار، ایک چیلنج، ایک دعوت فکر ضرور ہوتا۔ اسی کے ساتھ بڑی بڑی بے تحاشہ، کھلی ہوئی آنکھوں میں سیاہ پتلیاں ایک جنون کے عالم میں گردش کرتی رہتیں۔ یہ پتلیاں لہجے کے ساتھ ساتھ دوڑتی رہتیں ——— ہر لفظ کے گرد گھوم جاتیں ——— اور ہر جملے کے اختتام پر سننے والے پر جم جاتیں اور اسے کچل کر رکھ دیتیں۔ یہ جیسے سارے خیالات اور لفظوں کو پہلے ہی سے جمع کئے ہوئے ان کے مناسب اظہار اور استعمال کا موقع سوچتی رہتیں۔ انہیں ٹٹول ٹٹول کر دھیرے دھیرے ——— اور کبھی برق رفتاری کے ساتھ جملوں پر لکھتی جاتیں، کھینچتی جاتیں ——— یہاں تک کہ جملہ پورا ہو جاتا اور بالکل وہی تاثیر پیدا ہو جاتی جو وہ پیدا کرنا چاہتیں ——— سننے والا دم بخود مبہوت بیٹھا رہتا۔ اسے ایسا محسوس ہونے لگتا جیسے آج ہی اسی گھڑی وہ تمام چیزوں کے باہمی ربط سے واقف ہو رہا ہے۔ اب تک جو کچھ اس کی معلومات تھیں وہ بہت ناکافی، معمولی اور سطحی تھیں۔ اس نے اس طرف کبھی دیکھا ہی نہیں تھا جہاں متضاد چیزیں الگ ہوتے ہوئے بھی ایک ہو جاتی ہیں ——— آنکھوں اور لہجے کے ساتھ ہی ساتھ ہاتھ بھی "ان دیکھی" فضاؤں سے خیالات کو سمیٹتے رہتے۔ لفظوں کے ساتھ اٹھتے اور گرتے رہتے۔ انگلیاں آگے بڑھ بڑھ کر سننے والوں کو برابر متوجہ کرتی رہتیں، دھمکاتی رہتیں، ان پر فردِ جرم عائد کرتی رہتیں اور اگر ان کا بس چلتا تو وہ شاید سننے والوں کی گردن بھی مروڑ دیتیں ——— "دیکھئے صاحب! ادھر دیکھئے!" آواز میں غصے کی دبی ہوئی لرزشیں، کشادہ اور سیاہ پیشانی پر لمبی لمبی شکنیں، سڈول اور بھرا ہوا جسم ——— بے چین، متحرک پورے کمرے پر چھایا ہوا ———!

"صاحب ———!" کھنچا ہوا "صا" اور دبا ہوا "حب" ——— "صاحب آپ چپ ہیں۔ جواب دیجئے میری بات کا ——— یہ دیکھئے، دیکھا آپ نے ——— میری انگلی یہاں سے اب تک نہیں ہٹی ہے" چھنگلی کی آخری پور پر انگوٹھا رکھا ہوا۔ "بتائیے صاحب! نمبر ایک۔ دیکھئے میں انگلی رکھے بیٹھا ہوں۔ کیا شکایت ہے آپ کو ——— جی ہاں! آپ ہی کو ——— دیکھئے یہ انگلی ہٹی نہیں یہاں سے اب تک ——— صاحب آپ بولتے کیوں نہیں، نمبر ایک کیا شکایت ہے آپ کو ——— صاحب خون کر دیتے کو جی چاہتا ہے آپ کی خاموشی سے ——— کتنے لمحے برباد کئے آپ نے ——— آپ کو نہیں احساس ہے اتنے عرصہ میں جنگ میں شکست اور فتح دونوں ہو سکتی ہیں" لمحے بھر کے لئے کمرے میں خاموشی چھا جاتی۔

اتھاہ خاموشی —— باہر بینک روڈ پر سواریوں کے بڑے گھنگروؤں کی جھنکاریں کچھ اونگھتی ہوئی بڑھتی رہتیں۔ پھر اشرف علی کچھ بول اٹھتے اور بات خاص گالم گلوچ تک پہنچ جاتی —— "میں تو گالیوں کا بادشاہ ہوں"۔ اور اس میں شک نہیں کہ فراق صاحب کی گالیاں کھا کر ادب کبھی بے مزہ نہیں ہوا۔ یہ گالیاں بارہ بارہ گھنٹے کی یک لخت نشست میں کبھی کبھی ایک RELIEF بن کر آتیں۔ کبھی یہ بہت سی الجھی ہوئی باتوں کو نہایت آسانی سے سلجھا دیتیں۔ یہ ایک ٹیلی ویژن کا کام دیتیں جس کے ذریعے معنی کے خدوخال ابھر آتے۔ کبھی یہ سارے فاصلوں کو ختم کر کے اپنائیت کی فضا پیدا کر دیتیں —— اور کبھی ان گالیوں کے بعد محفل برخاست ہو جاتی۔ اشرف علی اور دوسرے حضرات رخصت ہو جاتے اور دوسرے دن پھر آ دھمکتے۔ اشرف علی نے غلطیات سے، یا جس کو وہ غلطیات سمجھتے اس سے سمجھوتہ نہ کرنے کا "گر" فراق صاحب ہی سے سیکھا تھا اور وہ اس کو ان پر آزمایا بھی کرتے۔ اسی لئے شاید فراق صاحب نے انہیں کبھی معاف نہیں کیا۔ "صاحب! اگر آپ تھانے میں رپٹ نہ کریں تو میں اس شخص کو شوٹ کر دوں۔" اشرف علی نے مجھے بتایا تھا کہ دلّی میں فراق صاحب نے جوش سے لڑنے کے بعد اشرف علی کے بارے میں کچھ اسی قسم کے کلمات کہے تھے۔ مگر اشرف علی کار کی زد میں آنے سے صرف دو تین دن قبل بھی فراق صاحب ہی کی باتیں کہہ رہے تھے۔ وہ بڑی سے بڑی بات کہتے وقت بھی فراق صاحب کو QUOTE کرتے اور اپنی معمولی سے معمولی باتوں کی سطح بلند کرنے کے لئے بھی فراق صاحب ہی کا سہارا لیتے۔ وہ کراچی میں "فراق کا ایک مرکز" تھے جہاں وہ سب لوگ جمع ہو جاتے جنہیں فراق اور اشرف علی سے دلچسپی تھی۔ فراق صاحب ان سے سخت نفرت کرتے۔ وہ فراق صاحب سے بڑی محبت کرتے تھے۔ یہ بات نہیں ہے کہ ان کی اپنی شخصیت نہیں تھی۔ انہوں نے اپنی شخصیت کو فراق صاحب ہی کی طرح بڑی محنت اور محبت سے پالا تھا اور اپنی شخصیت کی عظمت کے اسی طرح قائل تھے جس طرح فراق صاحب۔ شاید ان میں اور فراق صاحب میں تصادم کی ایک وجہ یہ بھی تھی، مگر وہ بڑی شخصیتوں کے کبھی منکر نہیں ہوتے، اسی لئے وہ فراق صاحب کے بھی منکر نہیں تھے۔ یہاں کراچی میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جسے ادب سے دلچسپی ہو اور انہوں نے اس سے فراق صاحب کا ذکر نہ کیا ہو —— اپنے مخصوص انداز میں، آہستہ آہستہ، اپنی باتوں سے خود لطف اندوز ہوتے ہوئے، ہر لفظ کو سنبھال سنبھال کر، رُک رُک کر استعمال کرتے ہوئے، نہایت احتیاط کے ساتھ —— آنکھوں میں خود اعتمادی کی چمک —— لہجے میں متانت اور تہذیب —— وہ بڑے سرکش اور باغی ہوتے ہوئے بھی بڑے وضع دار اور منکسر مزاج تھے۔ کسی صورت میں حفظ مراتب اور رکھ رکھاؤ میں فرق نہیں آنے دیتے، یوں چاہے وہ جو کچھ بھی کریں۔ وہ ہمارے ہاں کے جاگیری دور کے تو نہیں البتہ وکٹورین عہد کے انسان معلوم ہوتے تھے۔ فراق صاحب ان کے لئے صرف ایک شاعر، ایک استاد کی حیثیت نہیں رکھتے۔ وہ ان کے لئے ایک "طرز فکر" بن گئے تھے۔ بعض وقت کہتے۔ "جتینی! فرقوا (وہ کبھی کبھی پیار سے یوں بھی پکارتے) کو ہم لوگوں سے بہتر کون جانتا ہے اور ......" ذرا سا رُک کر اور مسکرا کر "...... اور تم بھی کیا جانتے ہو۔ بڑی زبردست سوانح عمری ہوگی اس کی اگر لکھی جائے۔" پھر کچھ سوچ کر کہتے: "مگر ایک دقت ہے۔ اس کی گفتگو کا پورا حسن اس وقت تک اجاگر نہیں ہو سکتا جب تک وہی لب و لہجہ تحریر میں منتقل نہ کر دیا جائے۔ یہ اگر نہ ہو سکا تو اس کی (فراق صاحب) گفتگو کا وزن نصف ہو جائے گا۔ یہ کام بڑا کٹھن ہے۔"

اس کے بعد وہ خاموشی سے کچھ سوچنے لگتے۔ میں پوچھتا "پھر کیا ارادہ ہے؟" —— "پھر اگر کبھی یہ سوانح عمری لکھی گئی تو ہمیں لوگ لکھیں گے۔" مگر وہ لکھنے سے پیشتر ہی چل بسے اور وہ لکھتے بھی نہیں۔ عرصہ ہوا انہوں نے لکھنا پڑھنا چھوڑ دیا تھا اور صرف باتیں کرتے یا باتیں بناتے۔ اس میں ان کا جواب نہیں تھا۔ اس لحاظ سے وہ اپنی جگہ خود ایک ادارہ تھے۔ ادب میں صرف ادیبوں ہی کی اہمیت نہیں ہوتی۔ اس میں ان کی بھی اہمیت ہوتی ہے جو ادب پر اچھی گفتگو کر سکیں۔ کبھی کبھی تو ایسے لوگ ادیبوں سے بہتر ادب کو سمجھتے اور دوسروں کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ ان کی گفتگو بیشتر ادیبوں کے شائع شدہ ادب سے بلند پایہ، بہتر، زیادہ فکر انگیز اور تخلیقی ہوتی ہے۔ اشرف علی اگرچہ ادیب نہیں تھے مگر وہ "ادیب گر" تھے۔ وہ جہاں بیٹھتے ایک ادبی ماحول، ایک ادبی فضا پیدا کر دیتے۔ اس فضا میں ادب جاندار ہو کر سامنے آ جاتا اور وہ [illegible] جو آج بہت سے ادیبوں کی کتابوں میں تلاش کرنے پر بھی نہیں ملتی۔ اشرف علی کی یہی سب سے بڑی اہمیت تھی۔ انہوں نے ادب کے سلسلے میں ایک قسم کی "اقوام متحدہ" کی حیثیت حاصل کر لی تھی۔ مجھے یقین ہے کہ اشرف علی کو اس

سامنے پر لگانے میں فراق صاحب نے بڑا اثر چھوڑا تھا۔

اس مضمون کو لکھتے ہوئے میں نے بڑی دیانت داری کے ساتھ اپنا جائزہ لیا ہے کہ کہیں میں صرف بربنائے دوستی تو اشرف علی کا ذکر نہیں لکھ رہا ہوں۔ آخر فراق صاحب پر لکھنے کے لئے اشرف علی یا ان کے اور کسی جاننے والے کی شخصیت کے ذکر کا کون سا محل ہے؟ مگر میں بڑی ذمہ داری کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ فراق صاحب کی وہ شخصیت جو غزلوں میں ہے، اس تک تو ممکن ہے سب کی رسائی ہو سکے اور کوشش کرنے پر بہت سے لوگ اسے پہچان بھی سکیں، مگر وہ شخصیت جو غزلوں میں نہیں ہے اور اس سے بڑی بھی ہے، جو اپنے دوستوں، اپنے شاگردوں کی بے تکلف محفل میں نمایاں ہوتی ہے، وہ بغیر ان لوگوں کے ذکر کے کبھی نہیں جا سکتی جو فراق صاحب کی صحبت میں رات دن اٹھتے بیٹھتے تھے۔ یہ لوگ ایک ایسا محور رہتے جس کے گرد فراق صاحب کی گفتگو گھومتی تھی اور فراق صاحب کی گفتگو ہی ان کی سب سے بڑی تخلیق ہے۔ ان کی غزلوں، نظموں اور رباعیات سب سے بڑی! فراق صاحب نے اسی گفتگو کے ذریعے اپنے ذہن کو سلجھایا ہے۔ ایک راہ پر لگایا ہے۔ بہت سی چیزیں دریافت کی ہیں۔ اپنے جذبات کا تزکیہ کیا ہے۔ یہ ان کی پوری شخصیت کا مکمل اظہار ہے۔ اس گفتگو کی کچھ جھلک ان سطروں میں بھی مل جاتی ہے جو فراق صاحب کسی زمانے میں "ساقی میں" باتیں کے عنوان سے گھسیٹ دیا کرتے تھے۔ ان کی اس گفتگو کے سننے والے محض تختۂ مشق کا کام نہیں دیتے تھے وہ خود بھی فراق صاحب کو بہت کچھ دے کر اٹھتے تھے۔ انہوں نے فراق صاحب کی "آگہی" کو جدید سے جدید تر بنائے رکھا ہے۔ سوچنے اور سمجھنے کا نیا ڈھنگ اور نیا جذبہ جو فراق صاحب کو ہمہ وقت بے چین رکھتا ہے، اسے ان لوگوں کی گفتگو نے برقرار رکھنے اور نکھارنے میں بڑی مدد دی ہے۔ فراق صاحب کی بزرگی کی یہ بھی بڑی دلیل ہے کہ وہ نئے زمانے کے پڑھے لکھے لوگوں سے بحث کر کے نئے خیالات کو قبول کرنے سے کبھی گریز نہیں کرتے ہیں۔ ہر ابھرتے ہوئے شاعر کی آواز پر ان کے کان لگے رہتے ہیں۔ وہ شاعری اور ادب کے نو بہ نو امکانات سے کبھی غافل نہیں ہوتے۔ اگرچہ انہوں نے بہت سے نئے شاعروں اور ادیبوں کی تصانیف نہیں پڑھی ہیں یا ادھر ادھر سے پڑھی ہیں، مگر وہ ان کا ذکر ہمیشہ سننا چاہتے ہیں اور اس "نہ پڑھنے" کی کمی کو وہ دوسروں سے بحث کر کے پوری کر لیتے ہیں۔ فراق صاحب کی قوت، ادراک اور اکتساب اتنی زبردست ہے کہ ان کی معلومات کے لئے صرف یہی گفتگو اور بحث کافی ہو جاتی ہے۔ ایک سرسری نگاہ میں وہ ساری کتاب کے نفسِ مضمون سے واقف ہو جاتے ہیں۔ ان کی نگاہیں بہت زود رس اور دور رس ہیں۔ فراق صاحب نے ادھر عرصے سے پڑھنا تقریباً ملتوی کر رکھا ہے۔ انگریزی ادب میں بھی ان کا مطالعہ ٹی ایس ایلیٹ پر آ کر ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد انہیں کوئی دلچسپی نہیں رہ جاتی۔ جب تک بڑا ادب سامنے نہ آئے۔ فراق صاحب توجہ مشکل ہی سے کرتے ہیں۔ انگریزی ادب میں انہیں ROMANTIC AGE کے شاعروں سے سب سے زیادہ دلچسپی رہی ہے اور ان میں بھی وہ غالباً WORDSWORTH سے سب سے زیادہ متاثر ہیں لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ جدید ادب کی رفتار سے ناواقف اور بے خبر یا کم باخبر ہیں۔ وہ جدید ادب کی رفتار سے شاید اس سے زیادہ واقف ہیں جتنا خود جدید شاعر یا ادیب۔ بات یہ ہے کہ فراق صاحب نے ادب کی اصل روح کو پا لیا ہے۔ ان کو باتیں کرتے ہوئے دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ یہ فراق نہیں خود ادب بول رہا ہے ——— دنیا کا سارا ادب جو کبھی دانتے کی زبان میں بولتا ہے، کبھی شیکسپیئر کی زبان میں، کبھی گوئٹے، کبھی ملٹن، کبھی فردوسی، کبھی حافظ، کبھی میر، کبھی غالب، کبھی کالی داس، کبھی تلسی داس کی زبان میں ——— اس وقت وہ ایک شاعر اور ادیب ہی نہیں، کچھ اس سے بڑے بھی معلوم ہونے لگتے ہیں ——— الہ آباد یونیورسٹی کے ایک پروفیسر! جو ادب پر دوسروں ہی کی رائے نہیں اپنی بھی رائے دے سکتا ہو اور اتنی ہی معتبر اور "گرہ کشا" رائے جو شیکسپیئر یا کسی اور مغربی ناقد کی ہو سکتی ہے۔ ادب پر فراق صاحب کی نظر عالمانہ اور محققانہ نہیں ہے اور نہ وہ ادیبوں اور شاعروں کے سنِ پیدائش سے واقف ہیں اور نہ ان کی زندگی کے پورے پورے واقعات سے۔ وہ ان کے زمانے کے تمام سیاسی اور سماجی رجحانات سے بھی ایک مورخ کی طرح واقف نہیں ہیں۔ انہیں ان سب باتوں سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ادب کی تاریخ بیان کرتے وقت ان کا بے تکان قلم لڑکھڑانے لگتا ہے اور ان کی تحریر کمزور معلوم ہونے لگتی ہے۔ وہ غلطیاں کر جاتے ہیں۔

کبھی کبھی فاش غلطیاں۔ وہ ادب کے عالم نہیں ہیں ـــــ خالق ہیں۔ وہ ادب کو پہچانتے نہیں جانتے ہیں۔ اسی لئے انہیں اب زیادہ پڑھنے کی ضرورت کم پڑتی ہے۔ الٰہ آباد یونیورسٹی کے ایک مشہور پروفیسر کے بارے میں ایک دفعہ کہنے لگے "صاحب! ان کے پاس کوئی گیا جائے وہ تو کہہ دیتے ہیں جنگ کی وجہ سے (دوسری جنگ عظیم) یورپ سے کتابیں آنی بند ہو گئی ہیں اس لئے THINKING رک گئی ہے ـــــ ذرا سوچئے چالیس سال STUDY کرنے کے بعد بھی آپ بغیر کتاب کے THINKING نہیں کر سکتے۔ اب کچھ اپنے دماغ سے بھی سوچنے کی عادت ڈالو۔" ایک اور مشہور پروفیسر کے بارے میں ایک دن کہنے لگے "آپ کو کتابیں پڑھنے کا بڑا شوق ہے۔ کہتے ہیں میں نے HAMLET کو سو بار پڑھا ہے ـــــ اگر ایک بار پڑھنے پر سمجھ میں نہیں آیا تو ہزار بار پڑھنے کے بعد بھی سمجھ میں نہیں آئے گا۔" یہ فراق صاحب کی صریح زیادتی ہے۔ جن لوگوں کے بارے میں فراق صاحب نے یہ فرمایا ہے وہ علم و فضل میں ہندوستان کے گنے چنے لوگوں میں سے تھے۔

فراق صاحب صرف اپنی کمزوری کے جواز میں اس قسم کے نظریات اور نکتے وضع اور بیان کرتے ہیں۔ لیکن اس میں بھی شک نہیں ہے کہ ان کی ہر بات میں کچھ نہ کچھ صداقت ضرور ہوتی ہے۔ کتابوں کے مطالعے کی طرح اور بہت سی چیزوں کے بارے میں فراق صاحب کا رویہ بڑی حد تک داخلی اور سخت قسم کا انفرادی ہے۔ وہ جست لگا کر اشیاء کی ماہیت تک پہنچنا چاہتے ہیں۔ لیکن اس جست میں وہ کبھی کبھی بیچ ہی میں گر جاتے ہیں اور اصل شئے تک نہیں پہنچ پاتے۔ وہ تجزیے کی زحمت سے بچنا چاہتے ہیں اور ہر چیز کو اپنی ذات کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں مگر اس سے حقیقت کا چہرہ کبھی کبھی دھندلا پڑ جاتا ہے۔ ان تمام باتوں کے باوجود ان کا تیار ذہن "صحیح نتائج اخذ کرنے میں بڑی سرعت سے کام لیتا ہے اور چشم زدن میں اس منزل پر پہنچ جاتا ہے جہاں پہنچنے کے لئے "تجزیہ نگار" حضرات کو برسوں کا سفر طے کرنا پڑتا ہے اور بعض اوقات وہ پھر بھی وہاں نہیں پہنچ پاتے۔ فراق صاحب کی نگاہ ادب کو پہچاننے میں مشکل ہی سے خطا کرتی ہے۔ یہ ان کی ذہنی تربیت کی تکمیل اور "مہ بدیلی" ہے جس کو وہ 'وجدان' سے تعبیر کرتے ہیں۔ فراق صاحب حقائق سے آنکھیں نہیں چراتے وہ خارجیت کے بہت سے ماہرین سے زیادہ خارجیت کا احترام اور اعتراف کرتے ہیں۔ مگر ان کی فکر جامد اور پابند نہیں ہے۔ اس میں جستجو ہے اور جستجو عقیدہ نہیں ہوتی۔ یہ سوچ کر میں ڈر جاتا ہوں کہ کیا کبھی ایسا بھی ہو جاتا ہے کہ آدمی کو پڑھنے کی ضرورت نہ پڑے اور وہ صرف اپنے دماغ کے سہارے زندہ رہ سکتا ہو ـــــ یہ شاید نہیں یقیناً ناممکن ہے مگر فراق صاحب پر کبھی کبھی ایسا گمان ضرور ہوتا ہے۔ پڑھنے کی حد سے فراق صاحب کی اسی "بے نیازی" کے خلا کو ان کے شاگردوں کی موجودگی نے پورا کر دیا تھا۔ وہ ان سے بحث کر کے اپنے کام کی باتیں چن لیتے۔ بہت سی نئی چیزیں اخذ کر لیتے پھر ان اخذ شدہ چیزوں کو ادب کی مجموعی اور مرکزی روح سے ربط دے کر مستحکم، وسیع اور متحرک کر دیتے۔ اس کے بعد وہ جو باتیں کرتے وہ ان کی اپنی ہوتیں۔ ان میں کسی اور کا دخل نہ ہوتا۔ فراق صاحب کی گفتگو ہمیشہ بڑی معتبر ہوتی ہے۔ باتیں کرتے وقت ان میں بڑی خود اعتمادی پائی جاتی ہے۔ اس خود اعتمادی کو پروان چڑھانے میں بھی ان کے پاس بیٹھنے والوں کا کافی حصہ ہے۔ انہی لوگوں نے ان کی غزلوں کو پہلی بار "دریافت" کیا۔ ان کو پسند کیا۔ ایک سے دوسرے تک پہنچایا۔ ان کے نئے فکری انداز کو سراہا۔ کھلے دل سے ان کی بے پایاں عظمت کا اعتراف کیا۔ ان کی آواز کو (وہ شاعری کی ایک نئی آواز سے تعبیر کیا۔ کھردری سے کھردری غزل کو ایک نیا موڑ، ایک نیا تجربہ بتایا۔ اور اس طرح فراق صاحب کی غزلوں کے بارے میں ان لوگوں کی یہ رائے یونیورسٹی کے محدود دائرے سے نکل کر دور دور تک پھیل گئی۔ ان چیزوں نے بھی فراق صاحب کی خود اعتمادی کو سینچا ہے، ابھارا ہے اور اس کی تائید کی ہے۔ جس زمانے میں ان لوگوں کا جمگھٹ تھا، وہی زمانہ شاید فراق صاحب کی بہترین غزلوں کی تخلیق کا زمانہ تھا ـــــ ۱۹۳۹-۴۰ء سے لے کر ۱۹۴۵-۴۶ء تک! اس کا یہ ہرگز مطلب نہیں ہے کہ فراق صاحب کی غزلوں کی زندگی انہیں لوگوں کے دم سے تھی۔ اس کا مطلب صرف اتنا ہے کہ یہ لوگ فراق صاحب کی غزلوں کے نہ صرف بہت دیانت دار سامعین میں سے تھے بلکہ ان کی غزلوں کا "صلہ" بھی تھے اور نہ فراق صاحب کی عدم خود اعتمادی کے ذکر سے یہ مطلب تھا کہ انہیں اپنی فکر کی صداقت پر یقین

نہیں ہے ــــ وہ بڑے گھتین آدمی ہیں۔ ان میں اگر بعض اوقات خود اعتمادی کی کمی نظر آنے لگتی ہے تو اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ بیک وقت بہت بڑے شاعر اور بہت بڑے ناقد ہیں۔ ان کے پیشِ نظر اپنا اور دنیا کے تمام بڑے ادیبوں اور شاعروں کا ادب ہے۔ وہ سب کے مرتبہ داں ہیں۔ اسی "ادب شناسی" کی بدولت شاید انہیں اندیشہ ہونے لگتا ہے کہ کہیں نئی نسل ان کی عظیم تعمیری کوششوں اور کاوشوں سے منکر نہ ہو جائے۔ لہٰذا وہ پیش بندی کے طور پر اپنی اور دوسروں کی شاعری کے بارے میں عجیب و غریب باتیں بھی کہہ جاتے ہیں۔ اپنا رنگ چھوڑ کر کبھی دوسروں کے رنگ میں، کہنے لگتے ہیں۔ کبھی ایک نیا رنگ پیدا کرنے کے سلسلے میں بالکل بے رنگ ہو جاتے ہیں۔ کبھی طولانی نظموں کی طرف رجوع ہو جاتے ہیں۔ کبھی ادب کے ایسے نظریے پیش کرنے لگتے ہیں جن کے وہ خود شدید مخالف ہیں۔ اور یہ سب بقول وہ صرف اپنی شاعری کی "خاطر" کرتے ہیں۔ انہی "نظریات" کو بعض "فراق پسند" ناقد فراق صاحب کے اصلی نظریات سمجھ کر اپنی تنقید میں جگہ دے کر وہ موشگافیاں کرتے ہیں کہ خود فراق صاحب دل ہی دل میں کڑھتے ہوں گے مگر فراق صاحب اپنے اس کڑھنے کا اظہار زبان سے نہیں کرتے اس لیے کہ آجکل انہیں اپنے حلقے کو وسیع کرنے کی دُھن ہے، حالانکہ فراق صاحب کو نہ کل اس کی ضرورت تھی نہ آج۔ وہ ادب میں جس جگہ کھڑے ہیں وہاں انہیں ادب کی ضرورت نہیں ہے، ادب کو ان کی ضرورت ہے۔ فراق صاحب کی یہ ذہنیت اس وقت تک سمجھ میں نہیں آسکتی جب تک آدمی ان سے پوری طرح واقف نہ ہو جائے۔ اسی لئے ان کی شخصیت کو جاننے اور پہچاننے کے لئے ہمیں اس آدمی کی ضرورت پڑتی ہے جو ان سے بخوبی واقف ہو، جو دن رات ان سے بحث کرتا ہو، جو ان کو اس حد تک جانتا ہو کہ وہ چِڑ جائیں، خفا ہو جائیں، گالیاں دینے لگیں اور کبھی معاف نہ کریں۔ اسی لئے اشرف علی کا ذکر ناگزیر ہے۔ وہ فراق صاحب کے سب سے بڑے مفسّر اور مبلغ تھے۔ فراق صاحب کی شخصیت کا ایک یہ پہلو بھی بہت اہم ہے کہ جہاں ان کے چار جاننے والے اکٹھے ہو گئے ان کی بات مزدور چل نکلتی ہے۔ آخر ایسا کیوں ہے؟ کیا بات ہے؟ یہ کیسی شخصیت ہے جو ماہ و سال کے تغیرات کو رد کرتی، میلوں کا فاصلہ طے کرتی ہوئی آنِ واحد میں سامنے آکھڑی ہوتی ہے اور اس کے حوالے سے ہر بات کی جاسکتی ہے، ہر مسئلہ کو خوش اسلوبی سے سمجھایا جا سکتا ہے۔ بات یہ ہے کہ فراق صاحب کی شخصیت سے فیض نہیں ہے۔ یہ ایک "وسیلۂ اظہار" زندگی کا ایک رویّہ بن گئی ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ایسی توانا اور ہمہ گیر شخصیت ساری اُردو تاریخ میں شاذ و نادر ہی ملتی ہے۔ اس کے پرتو سے ذہن جاگ اٹھتے ہیں۔ اشرف علی نے اسی پرتو کو اپنی پُر نور شخصیت سے ملا کر اور نورانی کر دیا تھا اسی لئے آج جب میں فراق صاحب کی ذاتی زندگی پر لکھنے بیٹھا ہوں تو اشرف علی بار بار یاد آ رہے ہیں۔

اشرف علی کی باتوں میں ایک "بانکپن ہوتا" غالباً خود فراق صاحب بھی اس کے منکر نہ ہوں گے۔ وہ کسی کی دھونس میں نہیں آتے تھے۔ اناڑیوں اور بہروپیوں کے چہرے سے نقاب اتار لینے کو وہ اپنا "دھرم" سمجھتے اور یہ سب فراق صاحب ہی کا فیضِ صحبت تھا۔ اشرف علی جلدی کبھی کسی کو قبول کرنے کے عادی نہیں تھے خواہ کتنا ہی بڑا آدمی کیوں نہ ہو ــــ لیکن ان کے لہجے میں فراق صاحب کی طرح تشدد نہیں تھا۔ ان کا لہجہ اپنی بات پر اڑے رہنے کے باوجود نرم ہوتا۔ اسی لئے ان کی شخصیت فراق صاحب کے مقابلے میں کمزور رہتی۔ ایک اعلیٰ تہذیبی احساس نے انہیں ہمیشہ "ناکام" بنائے رکھا۔ ان کا نازک جسم تہذیب اور بغاوت دونوں کے بار کو ایک ساتھ سنبھال نہیں سکا۔ مجاز کے بارے میں ایک دن بات کرتے کرتے فراق صاحب نے اپنے بارے میں جو جملہ کہا ہے، وہ مجھے ہمیشہ یاد رہے گا۔ فراق صاحب کو غیر ذمہ دار آدمیوں سے جو اپنی زندگی کو دانستہ تباہ کرنے پر تلے ہوں، سخت چِڑ ہے۔ ایسے آدمیوں کو وہ زیادہ دیر برداشت نہیں کر پاتے۔ وہ انہیں "اکھڑے ہوئے لوگ" کہا کرتے۔ وہ ایسے ہی لوگوں کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے کہ یکایک اپنے بارے میں کہنے لگے "ــــ میں اور جوش بھی اپنی زندگی میں سخت غیر ذمہ دار واقع ہوئے ہیں، مگر پھر بھی ہمارا دماغ توازن کے احساس سے کبھی خالی نہیں رہتا ــــ ہمارے غموں کی طنابیں ڈھیلی

منور ہو جاتی ہیں مگر کھمنے کس کر گڑھے رہتے ہیں۔" اشرف علی کبھی کبھی سرور کے عالم میں فراق صاحب کے بارے میں کہتے "فراق کی شخصیت بھی ABNORMAL ہے۔" جب وہ یہ کہتے تو مجھے الہ آباد یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر امرناتھ جھا کے والد ڈاکٹر گنگا ناتھ جھا کی بات یاد آ جاتی ——— "فراق اگر یونہی رہا تو ایک دن پاگل ہو جائے گا۔" اشرف علی اور گنگا ناتھ نے مختلف پیرایے میں قریب قریب ایک ہی بات کہی ہے۔ مگر فراق صاحب کی شخصیت کو اسی توازن نے بچا لیا جس کی طرف انہوں نے مجاز پر گفتگو کرتے ہوئے اشارہ کیا تھا۔ فراق صاحب خود سے کبھی غافل نہیں ہو پاتے۔ میں بے خبری کے عالم میں بھی وہ خبردار رہتے ہیں۔ اپنے نیک و بد کو خوب سمجھتے ہیں۔ اسی لئے وہ درحقیقت اتنے ABNORMAL ہیں نہیں جتنے نظر آتے ہیں ——— میں اشرف علی کی اس بات سے اختلاف کرتا تو وہ ذرا کھل کر اپنی بات کی تشریح کرنے لگتے ———

"میاں تمہاری سمجھ میں فراق نہیں آئے گا اور نہ تم اس کی غزل سمجھ سکو گے۔"

"کیوں؟"

"اس لئے کہ اس کی غزل اس کی شخصیت ہے ——— بڑا کرب اور درد ہے اس شخصیت میں۔ یہ دوزخ اور جنت دونوں سے مل کر بنی ہے۔ اس میں شدید انانیت پائی جاتی ہے مگر اسی کے ساتھ انسانیت سے بھی یہ بڑی محبت کرتی ہے۔ ایک طرف اپنے پورے گھر بار سے متنفر ہے دوسری طرف یہ سب کو چاہتی ہے۔ یہ شخص، فراق صاحب، ایک طرف تو پیسے کو دانت سے پکڑتا ہے دوسری طرف نادار مگر ذہین طلبا کی فیس بھی جمع کرتا ہے۔ اور اپنا نام تک نہیں ظاہر کرتا ——— اس نے زہر کو تریاق بنایا ہے اور یہی اس کی غزل کی رُوح ہے۔ اسی کشمکش' اسی تضاد نے اس کی فکر کو جنم دیا ہے۔ کبھی موقع ملا تو لکھوں گا اس کے بارے میں ———"

آج جب وہ نہیں رہے تو معلوم ہوتا ہے کہ فراق صاحب کی شخصیت کتنی بڑی ہے جس نے اشرف علی ایسے شخص کو متاثر کیا جو خود ایک دو نہیں بیسیوں آدمیوں کو متاثر کر چکا ہے۔ اشرف علی ان ادبی روایات کی ایک کڑی ہیں جن سے مل کر فراق صاحب کی شخصیت کا پورا سلسلہ تعمیر ہوتا ہے اسی لئے ان کے اُٹھ جانے سے ایک بہت ہی مضبوط اور اہم کڑی گم ہو گئی ہے۔ انہوں نے فراق صاحب کی ادبی روایات کو آگے بھی بڑھایا تھا۔ ادب اور ادیبوں کو پسند کرتے ہیں وہ صرف سفّاکی اور بیباکی سے کام نہیں لیتے۔ اس میں انہوں نے دردمندی کی بھی 'آمیزش' کی تھی۔ مجھے اس وقت ان کا یہ جملہ یاد آ رہا ہے۔" فراق کی زندگی میں بڑی تنہائی ہے۔" جب میں اس پر غور کرتا ہوں تو میری نظر فراق صاحب کی اس قوتِ فکر پر پڑتی ہے جس نے اس تنہائی کو بڑی شاعری میں بدل دیا۔ اس کو انسانیت سکھائی۔ ؏ اس بھری دنیا میں ہم تنہا نظر آنے لگے ——— کے بعد کی منزل پر فراق صاحب کی شاعری جس طرح پہنچی ہے وہ اردو ادب کا گراں قدر سرمایہ ہے ———

رفتہ رفتہ عشق مانوسِ جہاں ہوتا گیا
خود کو تیرے ہجر میں تنہا سمجھ بیٹھے تھے ہم

اشرف علی۔ کے اس جملے سے میری نظر میں الہ آباد کی متعدد شامیں پھر جاتی ہیں . . . .

جب ہم لوگ پہنچے ہیں تو شام ہو رہی تھی۔ فراق صاحب حسبِ معمول متوحش سے برآمدے میں تنہا ٹہل رہے تھے۔ ابھی ہم لوگ کچھ دوری پر تھے کہ ان کی آواز آئی ——— "آئیے صاحب!"

"آداب عرض ہے!"

"آداب عرض! آداب عرض! ——— چلو!" ان کی آواز گونجی اور نوکر بیچارا لرزتا ہوا کانپتا ہوا دوڑتا آیا ——— "کرسیاں باہر لگا دو۔" کرسیاں

ختم ہوگئی تو یہ حقیقت ہے کہ انہوں نے اسے فروخت کر دیا۔ اسی طرح انہیں سینما سے مطلق دلچسپی نہیں ہے، مگر وہ باتیں سب موضوعات پر کرسکتے ہیں اور پورے عبور کے ساتھ۔ انہیں دو چیزوں سے البتہ دلچسپی ہے' اچھے کپڑے پہننے اور اپنی کتابوں کے لئے اپنے بنائے ہوئے ڈیزائن کے مطابق نہایت خوبصورت الماریاں بنوانے سے۔ ان الماریوں کو بھی وہ سال دو سال کے بعد فروخت کر دیتے ہیں اور پھر نئے سرے سے بنواتے ہیں۔ —— خیر تو اس وقت وہ کچھ گنگنا رہے تھے۔ پھر انہوں نے شعر سنانا شروع کر دیا ؎

شام بھی تھی دھواں دھواں حسن بھی تھا اداس اداس   دل کو کئی کہانیاں یاد سی آکے رہ گئیں

اس زمین میں اس وقت انہوں نے صرف دو ہی تین شعر کہے تھے، غزل انہوں نے ایک عرصہ بعد پوری کی ہے۔ شعر و شاعری کے بعد بحث مباحثہ ہونے لگا —— رات ہو چکی تھی۔ اسی اثنا میں ریڈیو سے خبریں آنے لگیں۔ جو صاحب ریڈیو پر بیٹھے تھے انہوں نے ریڈیو کو ذرا تیز کر دیا۔ فراق صاحب شد و مد سے بحث کر رہے تھے —— معاً رک گئے۔ ذرا سے توقف کے بعد ان کی گھٹی ہوئی آواز آئی " صاحب! آپ ریڈیو سمیت کمرے میں تشریف لے جائیں اگر آپ کو خبریں سننے کا اتنا ہی شوق ہے۔"

وہ عزیب ذرا سی خاموشی کے بعد کہنے لگا "مگر فراق صاحب! آج ہٹلر کی تقریر ہے ...... "

فراق صاحب نے جملہ پورا نہیں ہونے دیا " صاحب یہاں ادب کی بات ہو رہی ہے —— ہٹلر کا یہاں کہاں گذر ......"

ریڈیو کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ پھر دوسری باتیں چھڑ گئیں —— سیاست، فلسفہ اور اخلاق کی —— دفعتاً گفتگو نے پھر پلٹا کھایا —— "آپ لوگوں کو معلوم ہے اس لفظ "چاہئے" سے بڑھ کر گندہ کوئی لفظ نہیں ہے؟" ہم لوگ حیران کہ اس سوال کا یہاں کون سا محل ہے؟ ذرا دیر ڈرامائی فضا پیدا کر کے فراق صاحب نے خود ہی تشریح فرمائی —— "خبر سننے کا وقت آگیا ہے اس لئے خبر سننا چاہئے۔ صاحب آپ محسوس کیوں نہیں کرتے کس قدر بد اخلاق ہے اس لفظ میں —— ؟ میں فلاں شخص سے اس وقت ملنا نہیں چاہتا مگر چونکہ وہ برا مان جائیں گے اس لئے ان سے ملنا چاہئے —— کتنا دکھاوا، ریاکاری، تصنع اور غلاظت ہے اس لفظ میں —— !" اب ان کی گفتگو پوری طرح شباب پر آچکی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ مختلف موضوعات پر دنیا کی ہزاروں لاکھوں ایسی بڑی بڑی کتابوں کے ورق پر ورق الٹتے چلے جا رہے ہیں جو کہیں چھپی نہیں ہیں صرف ان کے ذہن میں لکھی ہوئی ہیں —— ان کی گفتگو جب عروج پر ہوتی تو ان کی تقریر کے انداز سے مل جاتی۔ فراق صاحب اردو اور انگریزی دونوں کے بڑے اچھے مقرر ہیں۔ جس انداز سے وہ تقریر کرتے ہیں، وہ اپنا جواب آپ ہے۔ یونیورسٹی یونین کا ہال کھچا کھچ بھرا ہوا ہے —— فراق صاحب آئے —— اس سے قبل انہوں نے اپنی تقریر کے بارے میں کچھ بھی نہیں سوچا ہے بلکہ جان بچانے کا موقع ڈھونڈھ رہے ہیں —— وہ ہمیشہ فی البدیہہ تقریر کرتے ہیں اور کبھی تیاری نہیں کرتے —— اب وہ کشاں کشاں ہال میں آتے ہیں اور تقریر شروع کر دیتے ہیں۔ شروع شروع میں سامعین اکتانے لگتے ہیں مگر جیسے جیسے ان کی تقریر آگے بڑھتی جاتی ہے سامعین مسحور ہونے لگتے ہیں۔ ان کی تقریر کنول کے پھول کی طرح کھلنے لگتی ہے —— بالکل ان کی گفتگو کی طرح —— جیسے جیسے وہ گفتگو کرتے جاتے ہیں ان کی گفتگو میں بیشمار دریچے کھلنے لگتے ہیں۔ یہی حال ان کی تقریر کا ہے۔ وہ خطابت سے کام نہیں لیتے۔ سامعین کو ادھر ادھر کی باتوں میں نہیں لگاتے۔ چٹکلے بازی اور لطیفوں کا سہارا نہیں ڈھونڈھتے۔ اس سے انہیں بڑی نفرت ہے۔ اسے وہ ذہنی تہی مائیگی سے تعبیر کرتے ہیں۔ اسی لئے وہ اردو کے بعض بسیار نویس مزاح نگاروں سے بدظن ہیں۔ اپنی تقریر میں وہ زباندانی کے جوہر نہیں دکھاتے —— وہ صرف تقریر کرتے ہیں —— ان کی تقریر کے ہر لفظ کے پیچھے جو شاعرانہ معنویت اور فکری رعنائی ہوتی ہے وہی خطابت بن جاتی ہے۔ یہ سامع کو جتائے اور بتائے بغیر اپنا بناتی رہتی ہے۔ چپکے چپکے۔ اور پھر سامع آہستہ آہستہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ اس میں اور مقرر میں کوئی فرق نہیں رہ گیا ہے۔ یہ تو وہ خود تقریر کر رہا ہے۔ فراق صاحب کی تقریروں میں بڑی انسانیت اور یگانگت ہوتی ہے وہ اپنی گفتگو کی طرح تقریر میں بھی چھوٹی چھوٹی اور آسان تمثیلوں سے کام لیتے ہیں۔ یہ تمثیلیں ہماری روزمرہ کی زندگی سے تعلق رکھتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سامع فوراً مقرر سے قرب محسوس کرنے لگتا ہے۔ فراق صاحب تقریر کرتے کرتے رو دیں ہال سے باہر بھی نکل جاتے ہیں —— شیروانی کی دونوں جیبوں میں ہاتھ ڈالے

ایک آدھ منٹ گیلری میں ٹہلنے کے بعد پھر خراماں خراماں اندر آجاتے ہیں اور پھر تقریر شروع کر دیتے ہیں۔ سامعین اسی طرح ساکت و صامت کھوئے ہوئے بیٹھے رہتے ہیں ــــ تقریر کا سلسلہ کہیں سے بھی ٹوٹا ہوا محسوس نہیں ہوتا ــــ دیکھئے! بات پھر دوسری طرف جا پڑی۔ ذکر تھا ان کی گفتگو کا اور قصہ چھڑ گیا تقریر کا۔ بات دراصل یہ ہے کہ فراق صاحب کی شخصیت اتنی "پہلو دار" ہے کہ ایک پہلو پر غور کرنے سے ہزاروں پہلو سامنے آنے لگتے ہیں ــــ فراق صاحب بحیثیت پروفیسر کے، فراق صاحب بحیثیت شاعر اور ناقد کے، فراق صاحب ایک دوست، ایک باپ، ایک بھائی کی حیثیت سے ــــ اتنے رُخ اور راستے موڑ ہیں ان کی زندگی کے، جس کا ایک مضمون احاطہ کر ہی نہیں سکتا۔ بہرحال اخلاقیات کے فلسفہ پر دھواں دھار گفتگو کر رہے تھے۔ بیچ بیچ میں حسب معمول گالیاں اپنا جوہر دکھاتی جا رہی تھیں۔ اب رات کافی ہو چکی تھی۔ ہم لوگوں نے اجازت مانگی ــــ وہ بولتے بولتے رُک گئے ــــ "ہاں صاحب! کافی دیر ہو گئی۔ اچھا صاحب جائیے، کل تو کوئی کام نہیں ہے آپ لوگوں کو، صبح ہی آجائیے گا۔ دھوپ بہت سخت ہو جاتی ہے۔" وہ ذرا رُکے۔ ہم لوگ اُٹھ کھڑے ہوئے ــــ "ابھی آپ لوگ بیٹھے ہوئے تھے ــــ خیال تھا آپ لوگ بیٹھے ہوئے ہیں۔" ان کی آواز آہستہ اور بھاری ہو گئی ــــ "اب آپ لوگ چلے جائیں گے پھر خیال آجائے گا کہ گھر میں میری بیوی ہے!" ہم لوگ ان سے رخصت ہو کر چلے گئے۔ لیکن فراق صاحب کا یہ بھیانک جملہ آج بھی میرے ذہن کا تعاقب کرتا رہتا ہے ــــ فراق صاحب کی زندگی کا یہ پہلو بڑا دردناک ہے ــــ ان کے اور ان کی بیوی دونوں کے لئے ــــ ذمہ داری کس کی ہے؟ اس کو فراق صاحب تمام لوگوں سے بہتر سمجھتے ہیں ......

۱۹۴۹ء میں پرمٹ بنوا کر میں ہندوستان گیا۔ کچھ ہم بدل گئے تھے کچھ ہندوستان ــــ الہ آباد جانے پر یہ احساس ہوا کہ جیسے الہ آباد کی زندگی اب ہمیں پہچانتی نہیں ــــ وہی زندگی جو کبھی ہماری تھی۔ یونیورسٹی کے در و بام وہی تھے، طالب علم بھی ویسے ہی تھے ــــ مگر کوئی چیز گم ضرور ہو گئی تھی ــــ شاید طالب علم ــــ اب وہ صرف ڈگری کے طالب رہ گئے تھے۔ شام کو میں فراق صاحب کے ہاں پہنچا۔ وہ برآمدے میں ٹہل رہے تھے۔ اب ان کے یہاں بہت کم لوگ آتے تھے ــــ پرانے بیٹھنے والوں کا مجمع منتشر ہو چکا تھا۔ کبھی کبھار کوئی بھولا بھٹکا طالب علم ادھر آنکلتا مگر وہ بھی ذرا دیر بعد فراق صاحب کی باتوں سے اُکتا کر اُٹھ کھڑا ہوتا ــــ

"آئیے صاحب! آداب عرض ہے!" فراق صاحب نے سلام کرنے میں پہل کی ــــ "کب آئے؟"

"آداب عرض ہے فراق صاحب!"

"جیتے رہو ــــ آؤ بیٹھا!"

میں بیٹھ گیا ــــ دیر تک بیٹھا رہا ــــ

شام بھی تھی دھواں دھواں حسن بھی تھا اداس اداس
دل کو کئی کہانیاں یاد سی آکے رہ گئیں

پھر میں چلا آیا ــــ

ٹالسٹائی کو دیکھ کر گورکی کو "دیوتا" یاد آگئے تھے ــــ فراق صاحب کو دیکھ کر مجھے صرف فراق صاحب یاد آتے ہیں ــــ اور اشرف علی کو دیکھ کر!؟ انہیں دیکھ کر بھی فراق صاحب یاد آجاتے تھے ــــ

فراق صاحب! اشرف علی مرگئے ــــ!!

فیض احمد فیض

ایلس فیض

"کیا تم اپنے شوہر کی شاعری سمجھ لیتی ہو؟" یہ سوال مجھ سے اکثر کیا گیا ہے اور میں نے کافی غور و خوض کے بعد اس کا ایک ایسا جواب ڈھونڈ لیا ہے جو میرے خیال میں صداقت پر بھی مبنی ہے اور حرفِ آخر کی حیثیت بھی رکھتا ہے ۔ میرا جواب ہمیشہ یہی ہوتا ہے کہ میں ان کی شاعری کو سمجھنے کا دعویٰ تو نہیں کرتی لیکن یہ دعویٰ ضرور ہے کہ میں شاعر کو سمجھتی ہوں ۔ اور کسی شاعر کی شخصیت ہی اس کی شاعری کا سرچشمہ اور اس کے وجدان کی قوت متحرکہ ہوتی ہے مگر میں اس مضمون میں ان کی شخصیت کی صورت گری کی کوشش نہیں کروں گی کیونکہ اس کے لئے ان اقلیموں کو طے کرنا پڑے گا جو ایک بیوی کے دائرۂ عمل سے باہر ہیں ۔ بلکہ میں ایک شاعر کے گھر کی زندگی کا خاکہ پیش کروں گی جہاں وہ اپنے اعزا اور احباب کے جمگھٹے میں ہوتا ہے، جس کے کسی گوشۂ تنہائی میں وہ اپنی جسمانی اور ذہنی تکان دور کرتا ہے اور جہاں وہ کبھی شعوری اور کبھی غیر شعوری طور پر شعر کی تخلیق کرتا ہے ۔

میں نے لوگوں کو اکثر کہتے سنا ہے کہ فلاں شخص کا مزاج عجیب و غریب ہے ، اس کے اطوار دنیا جہان سے نرالے ہیں تو کیا ہوا ۔ وہ بہرصورت ایک فنکار ہے ۔ اس کی تلون مزاجی ، اس کی بوقلمونیت اور اس کے لاابالی پن کو صرف اس لئے قابلِ معافی سمجھا جاتا ہے کہ وہ فنکار ہے ۔ اسے کسی حد تک خود فراموشی، تساہل، تن آسانی اور بعض دنیوی فرائض سے گریز کرنے کی اجازت ہوتی ہے بالخصوص وہ فرائض اگر ایسے ہوں جنہیں ادا کرنے کے لئے ہاتھ پیر ہلانے کی بھی ضرورت ہو ۔ لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ عام لوگوں کے مقابلہ میں فنکار زیادہ خود فراموش کیوں ہوتا ہے ۔ غالباً اس کا سبب یہ ہے کہ اس کا ذہن ہمہ وقت مصروف رہتا ہے ۔ بہرصورت یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ فنکار کی بعض کوتاہیوں سے ہر شخص کو سابقہ پڑتا رہتا ہے اور اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اسے ایک حد تک قابلِ معافی بھی سمجھنا چاہئے ۔ وہ لوگوں سے ملنے کے وعدے کر کے بھول جاتا ہے ، اسے اپنے جیب و گریبان کا ہوش نہیں رہتا ۔ کہیں جانا ہو تو ٹرین روانہ ہو جانے کے بعد اسٹیشن پہنچتا ہے ۔ روپے کا بٹوا کہیں رکھ کر بھول جاتا ہے اور اس کے لئے سارا گھر چھان مارتا ہے لیکن ممکن ہے وہ اس کی جیب ہی میں موجود ہو ۔ اس کا فونٹین پن ہمیشہ چوری ہو جاتا ہے ۔ اس کے اعزا و اقربا کو طوعاً و کرہاً یہ تمام باتیں برداشت کرنا ہوتی ہیں بلکہ دن بھر کی مسلسل الجھنوں کا نتیجہ کسی نظم ، کسی شبیہ یا تصویر یا کسی اور شاہکار کی شکل میں ظاہر ہو جائے تو انہیں اپنی قسمت پر شاکر ہونا چاہئے ۔

کئی سال اُدھر کی بات ہے کہ مجھے ایک کوٹ کی گم شدگی کا پہلا تجربہ ہوا ۔ ہماری نئی نئی شادی ہوئی تھی اور ہماری آمدنی بہت کم تھی ۔ جنگ چھڑ چکی تھی اور قیمتیں تیزی سے چڑھ رہی تھیں ۔ میں ہندوستان میں تھی اور میرے والدین انگلستان میں ۔ اس لئے ان سے بھی ہمیں کوئی مدد نہیں مل سکتی تھی ۔ پھر

تنخواہ بھی اتنی ہی تھی جتنی جنگ سے پہلے ملتی تھی۔ ہمیں شادی یا فنکار کی ان کمزوریوں کے لئے کوئی الاؤنس بھی نہیں ملتا تھا جنہیں وہ اپنا حق تصور کرتا ہے۔ اس کے باوجود ہم نے ایک سوٹ بنوا ہی ڈالا۔ نیا سوٹ بنوانا اس زمانے میں ایک عیاشی سے کم نہ تھا۔ فیض اسے لینے کے لئے امرتسر گئے اور رات گئے لاہور واپس آئے۔ ان دنوں ہم نہر کے قریب ایک دور دراز اور الگ تھلگ مکان میں رہتے تھے۔ اس وقت کوئی تانگے والا وہاں تک جانے پر تیار نہیں ہوتا تھا۔ بڑی مشکل سے ایک تانگے والا اس پر راضی ہو گیا کہ وہ انہیں کچھ دور تک پہنچا دے گا۔ تانگے والے نے فیض کو جس جگہ اتار دیا وہاں سے ہمارا گھر تقریباً ایک میل تھا اور انہیں یہ مسافت پیدل طے کرنی پڑی۔ قیمتی بنڈل ان کے بغل میں دبا ہوا تھا۔ گھر پہنچ کر فیض نے مجھے جگایا اور میں نے بنڈل ان سے لے لیا۔ لیکن اسے ہاتھ میں لیتے ہی میرا ماتھا ٹھنکا۔ کیونکہ اس میں ایک گرم سوٹ ہونے کے باوجود بنڈل بہت ہلکا تھا۔ بنڈل کا ایک کنارا کھلا ہوا تھا اور کوٹ ندارد تھا۔ فیض نے کہا کہ رات بہت ہو گئی ہے اب اسے صبح تلاش کروں گا لیکن مجھے یقین ہے کہ جہاں تانگے والے نے مجھے اتارا تھا وہاں سے گھر تک آنے ہی میں کوٹ کہیں گر گیا ہے۔ لیکن تھوڑی سی بحث کے بعد جو ایک حد تک یک طرفہ تھی یہ طے پا گیا کہ وہ ٹارچ لے کر اسی وقت کوٹ تلاش کرنے چلے جائیں۔ لیکن ان کی تلاشِ نیم شبی کے باوجود کوٹ نہ ملا۔ پتلون البتہ میرے پاس کئی سال تک اور جوں کی توں رکھی رہی۔ اسے کسی نے استعمال نہیں کیا اور ہماری ازدواجی زندگی کے پہلے اسراف کی یاد تازہ کرتی رہی لیکن ۱۹۵۰ء کے سیلاب کے بعد یہ نشانی میرے پاس باقی نہیں رہی۔ اسے ایک مستحق کو دے دیا گیا۔

چند مہینے بعد کپڑوں سے بھرا ہوا ایک سوٹ کیس گم ہو گیا تو میں نے کسی ناگواری کا اظہار تک نہیں کیا۔ لیکن ۱۹۴۹ء میں کراچی جاتے ہوئے فیض کا بستر ایک اور مسافر سے بدل گیا تو میری قوت برداشت قریب قریب جواب دے گئی۔ بستر کھولنے پر مجھے اس میں جو گدا ملا وہ اس گدے سے بہت اچھا تھا جو کہیں اور چلا گیا تھا لیکن مجھے اپنی جگہ پر کچھ ندامت اور کچھ پریشانی سی تھی کہ اس بستر کے مالک نے اپنے دل میں کیا سوچا ہو گا۔

بعض اوقات میرا یہ بھی خیال ہوتا ہے کہ فیض کا یہ لاابالی پن ان کی طبعی فراخدلی اور بے نیازی کی غمازی کرتا ہے اور انہیں کسی چیز کی افادی قدر و قیمت کی کوئی پروا نہیں ہے۔ اس سے صرف ان کی کتابیں مستثنیٰ ہیں جنہیں وہ بڑی حریفانہ نظروں سے دیکھتے ہیں اور انہیں اس طرح اپنے سینے سے لگا کر رکھتے ہیں جیسے کوئی بندۂ زر اور بخیل اپنے مال و دولت پر اپنی جان نچھاور کر رہا ہو۔ لیکن کوئی شخص ان سے کوئی کتاب مانگتا ہے تو ان سے انکار بھی بن نہیں پڑتا جب میں ان سے پوچھتی ہوں کہ تم نے بلا سوچے سمجھے کتاب کیوں دے دی۔ معلوم نہیں اب وہ واپس بھی ملے گی یا نہیں، تو وہ بڑی متانت اور برجستگی سے جواب دیتے ہیں "جب تک کوئی اس کتاب کو پڑھتا رہے اسے دینے کا خطرہ مول لینے میں کوئی مضائقہ نہیں"۔

۱۹۴۷ء میں میرے تمام زیورات چوری ہو گئے۔ میری خوشدامن نے مجھے کچھ چھوٹے چھوٹے لیکن پُر تکلف زیور دئے تھے۔ چند چیزیں میں نے خود بھی خریدی تھیں۔ چور وہ سب اٹھا لے گئے۔ میرے اپنے گھر میں یہ پہلی چوری تھی۔ پولیس کی مدد سے بھی ہمیں کوئی فائدہ نہیں پہنچا اور ہم یہ سوچ کر بیٹھ رہے کہ جانے والی چیز کا غم ہی کیا۔ میرے چہرے پر احساسِ محرومی کی جھلک دیکھ کر فیض کہنے لگے۔ تم نے شاعر کا یہ مصرع نہیں سنا۔ رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو۔ اور میں اچانک یہ محسوس کرنے لگی کہ میرے احساسِ محرومی میں ایک طرح کا احساسِ مخلصی بھی شامل ہو گیا ہے۔ ان دونوں شاعروں سے میری اپنی رائے کبھی زیادہ مختلف نہیں ہے۔

میرا یہ قیاس آہستہ آہستہ یقین کی منزل پر پہنچ گیا ہے کہ ہماری بڑی بچی سلیمہ بھی اپنے والد کے نقشِ قدم پر چل رہی ہے اور ان سے کافی مماثل ہے۔ لیکن میں یہ بھی جانتی ہوں کہ جو لوگ بڑی فراخدلی سے اپنی اچھی سے اچھی چیز دوسروں کو اٹھا کر دے دیتے ہیں یا کسی چیز کی گم شدگی پر ذرا بھی ملول نہیں ہوتے بلکہ جن کے لئے احساسِ محرومی بھی لذت بخش بن جاتا ہے ان کی معیشت انتہائی مسرت افزا، ان کی شخصیت انتہائی دلپذیر اور ان کی رفاقت ہمیشہ تفننِ طبع کا باعث ہوتی ہے۔

ان خامیوں یا خصوصیتوں کا توڑ کرنے کے لئے خوش قسمتی سے مجھ میں ایک طرح کی ملکیت پسندی پیدا ہو گئی ہے اور کبھی کبھی کوئی ایسی چیز بھی واپس لے لیتی ہوں جس کی واپسی کی کوئی امید نہیں رہ جاتی کیونکہ ہمارے پاس بھی تو کچھ ہونا چاہیئے ورنہ ہم دوسروں کو دیں گے کیا؟ منیزہ اپنی بڑی بہن سے زیادہ حقیقت پسند ہے اور ہر چیز کا باقاعدہ حساب رکھتی ہے وہ بہت چھوٹی سی تھی لیکن کتابیں پڑھنے اور تصویریں دیکھنے کی حد سے زیادہ شوقین تھی ایک دن اس نے اپنی باجی کی کتاب اٹھاتے ہوئے پوچھا "باجی۔ میں آپ کی یہ کتاب دیکھ لوں؟" سلیمہ کو بھی اپنی کتابیں بہت عزیز ہیں۔ اس نے جواب دیا "نہیں تم خود اپنی کتاب کھولا نہیں

دیکھتیں:— "باجی میں اپنی کتاب بہت زیادہ دیکھوں گی تو وہ گھس جائے گی۔" منیزہ نے جواب دیا۔ فیض کو اس واقعہ کا علم ہوا تو انہوں نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا "ہمارے گھر میں کوئی تو ایسا بھی ہونا چاہیے۔"

ظاہر ہے کہ فیاض اور فراخدل آدمی انسانوں کے ہجوم اور ان کی معیت کو بھی بہت پسند کرتے ہیں۔ عید، ہولی، بسنت اور دوسرے تہواروں پر سیر و تفریح کرنے والوں کا ہجوم دیکھ کر فیض خوشی سے پھولے نہیں سماتے۔ وہ ان کا دور سے تماشہ نہیں دیکھتے بلکہ ان کی رنگ رلیوں میں خود بھی حصہ لیتے ہیں۔ اپنی خاموشی اور کم آمیزی کے باوجود — اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ وہ ہمیشہ ذہنی یکسوئی، ایک پرسکون گھریلو زندگی اور عزت گزینی کے متمنی رہے ہیں۔

ہمارے گھر کے معمولات بچوں کے نظام اوقات کے تابع ہیں اور فیض نے اسے بے چون و چرا قبول کر لیا ہے تاکہ بچوں کی باقاعدہ زندگی میں کوئی خلل نہ پڑے یا انہیں کسی قسم کی زحمت نہ ہو۔ ممی کا ہر قول بچیوں کے لئے حکم کی حیثیت رکھتا ہے جس کے خلاف کسی اور عدالت میں اپیل ممکن نہیں۔ رات کو سونے سے پہلے اگر انہیں بہت چھوٹی سی کہانی سنائی جائے یا بچے کہتے رہ جائیں کہ ہم نے ابا جان کو دن بھر سے نہیں دیکھا انہیں آ جانے دیجئے لیکن ممی اگر یہ کہہ دیں کہ نہیں اب سو جاؤ تو ان میں سرتابی کی مجال نہیں۔ بچوں کی پرورش و پرداخت کے معاملات سے اپنی لاعلمی کا اعتراف خود فیض کو بھی ہے اور وہ اکثر کہتے ہیں کہ یہ کام میرے دائرۂ عمل سے باہر ہے۔

جون ۱۹۵۲ء میں فیض جب حیدرآباد جیل میں تھے تو میں نے انہیں ایک خط میں لکھا تھا کہ "ان بچیوں کی بیک وقت ماں اور باپ کے فرائض انجام دینا میرے لئے کتنا مشکل ہے"۔ اس کے جواب میں انہوں نے مجھے یہ لکھا تھا کہ "میری بچیوں کو تم سے اچھی ماں نہیں مل سکتی۔ کتنی خوش نصیب ہیں وہ!" ان کی تعلیم و تربیت سے فیض کی بے تعلقی کے باوجود بچیاں فیض سے بالکل نہیں ڈرتیں بلکہ باپ بیٹیوں نے ایک دوسرے کے عجیب و غریب اور بڑے دلچسپ نام رکھ چھوڑے ہیں۔ ان کے مقدمے کے دوران میں ہمارے وکیل صاحبزادہ نوازش علی خاں مرحوم نے ایک بار جیل جاتے ہوئے مجھ سے پوچھا تھا کہ تم نے فیض کے نام میرے تار میں جن کبوتروں کا ذکر کیا تھا وہ کون ہیں۔ اور میں نے دونوں بچیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جو میرے سامنے اسی وکٹوریا پر بیٹھی تھیں کہا "وہ کیا بیٹھی ہوئی ہیں"۔

منیزہ نو مہینے کی جدائی کے بعد جب اپنے والد سے پہلی بار جیل میں ملی اس وقت اس کی عمر صرف ساڑھے چار سال تھی۔ اس نے انہیں دیکھتے ہی کہا۔ "ابا جان آپ تو بالکل بوڑھے ہو گئے۔ میں تو سمجھی تھی کہ آپ کی عمر بہت کم ہو گی اور آپ بڑے خوبصورت ہوں گے۔ ارے آپ کے تو بال بھی سفید ہو گئے"۔ لیکن ان کی گود میں پہنچتے ہی جیسے وہ بالکل ہی بدل گئی اور اس نے کہنا شروع کیا "ابا جان آپ گھر نہیں چلیں گے۔ امی مجھے مارتی ہیں"۔ یہ سن کر جیسے میری اندر کی سانس اندر اور باہر کی باہر رہ گئی۔ کیونکہ بچوں کو مارنا ہمارے خاندان میں قریب قریب بالکل منع ہے۔ لیکن فوراً ہی میں نے محسوس کیا یہ شکایت بڑی بامعنی ہے اور وہ دراصل کہنا چاہتی ہے کہ گھر میں ان کی کمی کس شدت سے محسوس کی جاتی ہے۔

منیزہ انہیں ہر خط میں یہ ضرور لکھتی ہے کہ دیکھئے میرا خط کسی اور کو نہ دکھائیے گا۔ لیکن اسے کیا معلوم کہ ان کے نام جتنے خط جاتے ہیں ان کے ایک ایک لفظ کو سنسر بڑے غور سے پڑھتا ہے۔ پچھلے سال ایک بار منٹگمری جیل کے اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ مسٹر لودھی کی تو شامت ہی آ گئی۔ بے چارے نے کہیں اس سے یہ کہہ دیا کہ تم نے اپنے ابا جان کو جو خط لکھے ہیں وہ مجھے بہت پسند آئے۔ یہ سنتے ہی منیزہ غصے سے سرخ ہو گئی اور ان پر برس پڑی۔ چھوٹی بچی بڑی لڑاکا، چلبلی اور زود حس ہے، غصہ تو اس کی ناک پر رکھا رہتا ہے۔ لیکن وہ محبت کا ایک ننھا منا مجسمہ بھی ہے۔ اس میں صبر و تحمل کی ضرور کمی ہے لیکن اس کے باوجود وہ بڑی دلچسپ اور باغ و بہار ہے ہم میں ہمت ہوتی تو غالباً ہم سب اسی طرح بن جانا چاہتے۔ اس میں اپنے والد کا بے پایاں صبر و تحمل نہیں ہے نہ وہ اپنی بڑی بہن کی طرح متین اور سلیم الطبع ہے۔ بلکہ بعض رشتے والیاں تو یہ کہتی ہیں کہ یہ بالکل اپنی ماں پر گئی ہے۔ لیکن میری رائے میں اس کی تصدیق تو اس کی نانی اماں ہی کر سکتی ہیں۔

بعض لوگ مجھ سے کہتے ہیں آپ تو بڑی اچھی اردو بول لیتی ہیں۔ شاید یہ فیض کا اثر ہے۔ حقیقت اس کے برعکس نہ سہی مگر اس سے مختلف ضرور ہے۔ باتیں میں کچھ فطری طور پر آسانی سے سیکھ لیتی ہوں لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہم جس ماحول میں رہتے ہیں وہ ادبی اور بول چال کی زبان سیکھنے کے لئے انتہائی سازگار ہے۔ جہاں تک بچیوں کا تعلق ہے فیض کی ہمیشہ یہی کوشش رہی ہے کہ وہ اردو ہی کو اپنائیں۔ وہ اکثر کہتے ہیں کہ بچیاں میری "نوشدامنی زبان" تو بہر صورت سیکھ لیں گی اور ان کی ماں اسے سکھانے کے لئے کافی ہے لیکن اب اپنی زبان پر عبور حاصل کرنے کی ضرورت تیزی سے بڑھتی جا رہی ہے جس وقت تمام گھر والے بیٹھے ہوتے ہیں اور آپس میں باتیں ہوتی ہیں تو بچیاں کبھی ایک زبان بولتی ہیں کبھی دوسری۔ وہ مجھ سے انگریزی میں اور فیض سے اردو میں باتیں کرتی ہیں اس لئے کسی خاص کوشش کے بغیر وہ دونوں زبانیں بولنے لگی ہیں۔

بعض دوست مجھ سے سوال کرتے ہیں کہ تم نے کبھی فیض کو غصے کے عالم میں بھی دیکھا۔ فیض اپنی نرم مزاجی کے لئے مشہور ہیں اور ہر شخص کو معلوم ہے کہ غصہ انہیں کبھی آتا ہی نہیں۔ میں اپنے دوستوں کو یقین دلانا چاہتی ہوں کہ گھریلو زندگی میں بھی انہوں نے کبھی کسی آبگینے کو ٹھیس نہیں لگائی۔ میرا یہ جواب سن کر ایک بار ایک دوست نے بڑی نیک نیتی کے ساتھ کہا تھا کہ جنگ کے بعد ملاپ میں جو مزہ ملتا ہے اس کی لذت سے تم محروم ہو۔ یہ درست ہے کہ ہم اس مسرت سے محروم رہے ہیں جسے معلوم نہیں مسرت کہا بھی جا سکتا ہے یا نہیں لیکن اس کرب اور کوفت سے ہم یقیناً محفوظ رہے جو برافروختگی یا جلد بازی کے عالم میں کوئی بات کہہ جانے میں اس پر متاسف ہونے سے ہوتی ہے۔ ہم اپنے اختلافات پر باتیں ضرور کرتے ہیں لیکن بات اس سے آگے کبھی بڑھنے ہی نہیں پاتی اور آخر کار ہم اختلاف رائے ہی پر متفق ہو جاتے ہیں۔

ہماری خانگی زندگی کے اس پہلو پر ایک بار جوش صاحب نے بڑا دلچسپ تبصرہ کیا تھا۔ ۱۹۴۱ء میں وہ دہلی گئے۔ اس سے پہلے ان سے سری نگر میں ہماری شادی کے موقع پر ملاقات ہوئی تھی لیکن عقد کے بعد ہی ایک مشاعرہ شروع ہو گیا جس میں انہوں نے اور مجاز نے خوب خوب اپنا کلام سنایا۔ اس لئے باتیں کرنے کا موقع ہی نہیں مل سکا اور اسے بعد کے لئے اٹھا رکھا گیا۔ دہلی میں ملاقات ہونے پر انہوں نے مجھ سے سوال کیا۔ "آپ اور فیض میں لڑائی بھی ہوتی ہے یا نہیں؟" میرا جواب نفی میں سن کر انہوں نے افسوس کے ساتھ اپنا سر ہلاتے ہوئے کہا "کتنے افسوس کی بات ہے یہ؟" انہوں نے اپنا جملہ پھر دہرایا لیکن ان کی آنکھوں میں تمسخر جھلک رہا تھا۔ "یہ بڑے ہی افسوس کی بات ہے۔ پھر آپ لوگوں میں محبت کیسے ہو سکتی ہے؟" میں نہیں کہہ سکتی کہ جوش صاحب نے یہ نتیجہ کیسے اخذ کیا لیکن میں آج تک ان سے اتفاق رائے نہیں کر سکی۔

ہماری ازدواجی زندگی کے دوران میں دکھ درد اور رنج و ملال کے مواقع بھی آئے ہیں۔ میں نے فیض کو ایک پیاری بہن، ایک بھائی اور بہت سے عزیز اور محبوب دوستوں سے محروم ہوتے دیکھا ہے۔ لیکن وہ جیسے ان غموں کو برداشت کرنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ ان کی جبین کبھی شکن آلود نہیں ہوتی۔ ان میں ایک ایسا تحمل اور ایک ایسی رجائیت پیدا ہو گئی ہے جو محض موروثی نہیں ہے بلکہ ان کا فلسفۂ حیات، اور ان کی امیدیں اس کی آئینہ دار ہیں۔ انسان کی فطری شرافت پر ان کا عقیدہ بہت راسخ ہے۔ یہ شرافت ناسازگار حالات میں مسخ تو ہو جاتی ہے لیکن اس کا وجود ختم کبھی نہیں ہوتا۔ وہ کہتے ہیں کہ انسانی فطرت کا جائزہ لیتے ہوئے ہم اس کی خامیوں ہی پر کیوں انگشت نمائی کریں ہم اس کی خوبیوں کی بات کیوں نہ کریں یا انہیں اپنا موضوعِ سخن کیوں نہ بنائیں۔

گزشتہ ساڑھے تین سال میں انہوں نے مجھے بارہا لکھا ہے کہ بچیوں کو خوش رکھو اور انہیں دکھ پہنچاؤ۔ انہیں رنج و غم سے روشناس کرنے کے لئے کافی وقت پڑا ہے اور یہاں بھی اپنی تمام پہیلیاں، لطیفے اور پُر مذاق کہانیاں اپنے والد سے ملاقات کے لئے اٹھا رکھتی ہیں ان کی باتیں سن کر اکثر سنگدل اور ترش رو وارڈر بھی اپنی ہنسی ضبط نہیں کر سکے۔ فیض نے غم کا ایک روشن اور رجائی پہلو بھی تلاش کر لیا ہے یعنی غم کے باوجود حصولِ مسرت کے لئے مسلسل جدوجہد۔

ہمارے گھر میں اگر کسی کی سالگرہ ہو تو خوب خوشیاں منائی جاتی ہیں اور ایک دوسرے کو تحفے دیئے جاتے ہیں۔ مجھے ننھی سلیمہ کی پہلی سالگرہ کی تقریب ابھی تک اچھی طرح یاد ہے۔ فیض تہیہ کر چکے تھے کہ وہ اس کے لئے تحفے ضرور لائیں گے۔ لیکن میرا دعویٰ ہے کہ اتنے چھوٹے بچے کے قابل تحفوں کے انتخاب

ہوسکتا ہے لیکن شاعر یا فنکار کی ذات سے نہیں۔ فنکار کا مشغلہ چونکہ خالص ذہنی ہوتا ہے اس لئے وہ اس دنیا کی حدوں سے نکل جاتا ہے، اسے اپنے تن بدن کا ہوش نہیں رہتا اپنے گھر بار اور روزمرہ کی مزدوریوں کی پروا نہیں رہتی۔ اسے ایسے رفقا کی ضرورت ہوتی ہے جو اس کے دنیاوی معاملات کی دیکھ بھال کر سکیں۔ یہ مہنت خواں اگر آسانی اور خوش اسلوبی سے طے ہو جائیں تو شاعر، مصنّف یا مصنف اپنی دنیا میں لکھ سکتا ہے اور اسے یہ اطمینان ہوتا ہے کہ کار دنیا تمام ہو چکے ہیں۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ مصنفوں کی ایک بہت بڑی تعداد اپنی تصانیف کو اپنے دوستوں اور ان لوگوں کے نام معنون کرتی ہے جو انہیں عزیز ہوتے ہیں کیونکہ وہ نہ ہوتے تو ان کی تصنیف بھی تشنۂ تکمیل رہ جاتی۔ واقعی مجھے یقین ہے کہ فیض نے "دست صبا" کا مسودہ بھیجتے وقت مجھے جب یہ لکھا تھا کہ "یہ تمہاری ہے" تو ان کا بھی یہی مطلب تھا۔

کنہیّا لال کپور

فکرؔ تونسوی

کنہیا لال کپور سے میری پہلی ملاقات کب ہوئی؟ یہ مجھے بالکل یاد نہیں۔ شاید وہ ملاقات کوئی اہم واقعہ نہ ہو۔ یا شاید کپور اس کا اہل نہ ہو کہ پہلی ملاقات پر کوئی گہرا نقش چھوڑ جائے ——— (یا شاید میرے مادّہ قبولیت میں ہی کوئی نقص ہو سکتا ہے)

لیکن اب یہ عالم ہے کہ کپور سے ملنے کے لئے طبیعت میں اُبال سا اُٹھنے لگتا ہے۔ حالانکہ وہ نہ حسین و جمیل جسم کا مالک ہے نہ اس کے لمبے تڑنگے قد میں کوئی کشش ہے اور نہ اس کی گفتگو اور لب و لہجہ میں کوئی چٹی تلی شائستگی ہے۔ صرف ایک ٹیڑھی کٹ طنز کے سوائے اس کی پوری شخصیت میں کوئی چیز چمکیلی نہیں ہے ——— فن کے ماہرین کا خیال ہے کہ ہر شخصیت کے جسم میں سے کچھ خاص قسم کی لہریں نکلا کرتی ہیں۔ ان لہروں کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک قسم کی لہریں اپنی طرف کھینچتی ہیں مگر دوسری قسم کی لہریں دھکے دے دے کر اپنے سے دُور پھینکتی ہیں۔ کپور کے نصیب میں دوسری قسم کی لہریں لکھی ہیں جو جسم سے پھوٹتی ہیں تو انسان کو بھگا دیتی ہیں۔ سید سجاد ظہیر اور کپور مندرجہ بالا دونوں قسم کی لہروں کے دو الگ الگ نمائندے کہے جا سکتے ہیں۔

لیکن اس کے باوجود میرا عالم یہ ہے کہ میں کپور سے ملنے کے لئے مضطرب ہو اُٹھتا ہوں اور میرا خیال ہے کہ میرے اپنے عالم یعنی میری اپنی لہروں میں ہی کوئی گڑبڑ ہے ورنہ کپور کے لئے مضطرب ہونا کہاں کی دانشمندی ہے؟

وہ شہروں میں رہتا ہے مگر دیہاتی خدوخال رکھتا ہے۔ اگر وہ کسی گاؤں کے جاگیردار کا بیٹا ہوتا تو ضلع کا مجسٹریٹ بن کر اپنی دیہاتیت کو چھپا لیتا مگر وہ تو ایک غریب پٹواری کا بیٹا ہے جس کی پرورش اور تربیت لائل پور کے ضلع کے جانگلی بلوچوں کے درمیان ہوئی۔ اس لئے اب چاہے وہ یونیورسٹی کا چانسلر ہی کیوں نہ ہو جائے اور بورژوا سوسائٹی کے آداب ہی کیوں نہ اپنا لے لیکن محفل میں وہ توس پر آملیٹ رکھ کر ہاتھوں سے ہی کھانے لگے گا چھری کانٹے سے نہیں۔ کیونکہ وہ ٹھونسی ہوئی بناوٹ کا مذاق اُڑانے کے لئے پیدا ہوا ہے۔ خود اس کا شکار ہونے کے لئے نہیں۔

لیکن کپور کا خیال ہے کہ وہ پھر بھی مایوس نہیں ہے۔ اس جنم میں اسے فطرت کی طرف سے جتنی بھی چیزیں ودیعت نہیں کی گئیں وہ اگلے جنم میں مل جائیں گی۔ اگلے جنم میں بھی نہ ملیں تو اس سے اگلے میں ملیں گی۔ انسان کو ابھی چوراسی لاکھ مرتبہ جنم لینا ہے اس لئے جلنے اور کڑھنے کی کوئی ضرورت نہیں —— ”چوراسی لاکھ جنم کا آئیڈیا بہت مسرت انگیز ہے“ وہ ایک سنجیدہ قہقہہ لگا کر کہتا ہے۔ یہ آئیڈیا سینے میں امید کی مشعلیں جلا دیتا ہے۔ چنانچہ میں آنے والے کسی نہ کسی جنم میں ہر ایک سے انتقام لوں گا۔ راجندر سنگھ بیدی سے، کرشن چندر سے، فکر تونسوی سے۔ !!!!!! ———“

کیا کپور یہ بات کہہ کر "چوراسی لاکھ جون" کے آئیڈیا پر طنز کرتا ہے؟ کون کہہ سکتا ہے۔ کپور کی کسی بھی بات کا کیا اعتبار ہے۔ کیونکہ وہ اپنی آنکھوں کے سامنے ہی دیکھ رہا ہے کہ وہ ساٹھویں سال میں داخل ہو چکا ہے۔ جس میں سے عمر کا بیشتر قیمتی حصہ (اس کے خیال میں تین بٹہ چار حصہ) تو ضائع چلا گیا ہے یعنی ایک پورا جنم تباہ و برباد ہو گیا ہے اور اب جبکہ "دم واپسیں اب سر راہ ہے" تو اب چاہے وہ انڈیا کا پریذیڈنٹ ہی کیوں نہ بن جائے اس سے کیا فرق پڑے گا۔ خوشی اور امنگ کے وہ لمحے تو ہاتھوں سے نکل ہی گئے، جبکہ وہ ایک دور افتادہ گاؤں میں سوکھے ٹکڑوں پر پلتا رہا، تلخیوں کے زہریلے گھونٹ پیتا رہا، یہاں تک کہ آٹھویں سال ہی میں ماں کی ممتا سے بھی محروم ہو گیا۔ اس لئے اب چاہے پورا بھارت اس کی ممتا بن جائے وہ اس سے محبت کی کونسی نہر کھینچ لے گا۔

اس لئے آنے والے جنم پر بھروسہ رکھو اور قہقہے اڑاتے چلے جاؤ۔

یہ قہقہے وہ اپنے مضامین میں بھی اڑاتا ہے اور روزمرہ زندگی میں بھی یہ قہقہے اسے اپنے داخلی کرب و غم سے فرار اختیار کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ وہ غم سے بھاگ کر قہقہے کے دامن میں پناہ لیتا ہے، چاہے کوئی سا بھی غم ہو۔ وہ اس سے بھاگ جائے گا۔ اگر اسے کسی حسین ترین عورت نے نگاہِ التفات سے نہیں دیکھا اور اس کے ذہن و دل میں غم کی ایک سیاہ لکیر چھوڑ گئی تو کپور اس حسین عورت پر آوازے کسے گا۔ اس کے حسن پر نہیں بلکہ اس کی بدذوقی پر۔ وہ اس حسین عورت کا یہ کہہ کر مذاق اڑائے گا کہ نہیں تو غالب کا ایک شعر سمجھنے کی بھی تمیز نہیں ——— گویا یہ کپور کا ایک فرار ہوگا جسے وہ بے التفاتیٔ حسن کے غم سے نجات پانے کے لئے اختیار کرے گا۔

کبھی کبھی تو یوں لگتا ہے جیسے طنز نگار کپور بڑا بہادر اور جیالا انسان ہے۔ کیونکہ وہ دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت کو ایک ہی فقرہ میں چٹکیوں سے اڑا دیتا ہے لیکن کبھی کبھی اس کی بزدلی دیکھ کر اس کے جیالے پن پر شبہ ہونے لگتا ہے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ کسی کالج میں اسے پرنسپل بننے کا یقینی چانس مل رہا تھا۔ کپور کی اپنی بھی یہی خواہش تھی کہ اتنی عمر پروفیسری کرتے بیت گئی۔ اب اسے پرنسپل ضرور بن جانا چاہئے۔ کوالیفکیشن، تجربہ اور سفارش سبھی کچھ مکمل تھا۔ اسے انٹرویو کے لئے بلایا گیا اور اس پر سوالات کئے گئے:

"کیوں جناب! کیا آپ سپورٹس میں دلچسپی رکھتے ہیں؟"

"جی نہیں!"

"کیا کالج میں کلچرل کنکشن کروا سکتے ہیں؟"

"جی نہیں!"

"کیا آپ کالج کی از سرِ نو تنظیم میں حصہ لیں گے؟"

"جی نہیں!"

اور پھر کپور نے مجھے بتایا کہ وہ یہ سن کر بے حد مسرور ہوا کہ انٹرویو بورڈ اسے نہایت نااہل سمجھتا ہے اور اسے پرنسپل بننے کا چانس نہیں دیا جائے گا۔ اس نے جان بوجھ کر سبھی جوابات نفی میں ہی دئے تا کہ اسے ایک ذمہ دار پوسٹ سے فرار ہونے کا لطف حاصل ہو سکے۔

یہی حالت اس کی گھریلو زندگی میں ہے۔ وہ گھر سے بھاگنا چاہتا ہے۔ حالانکہ سات بچے ایک بیوی اور ایک باپ اسے معاشی طور پر اپنے شکنجے میں جکڑے ہوئے ہیں۔ لیکن پھر بھی اس کا یہ فارمولا ہے کہ جب تک آدمی جاگتا ہے، جب تک اس کی آنکھیں بیدار ہیں اسے گھر میں دن اور رات بھر میں زیادہ سے زیادہ ایک آدھ گھنٹہ ہی رہنا چاہئے اور باقی وقت گھر سے باہر حالتِ فرار میں گزارنا چاہئے۔ چنانچہ اگر اس کا بچہ بیمار ہے تو وہ اسے اس ڈر سے ڈاکٹر کے ہاں نہیں لے جائے گا کہ کہیں ڈاکٹر یہ نہ کہہ دے کہ بچہ کا بچنا محال دکھائی دیتا ہے۔ چنانچہ وہ اس مفروضہ خوف سے فرار چاہنے کے لئے بیوی سے کہہ دیتا ہے کہ تم خود جا کر اسے دکھا آؤ۔ وہ یہ جانتا ہے کہ بیوی سودا سلف خریدنے کے لئے بازار جائے گی تو ڈیڑھ قیمتے دام سے آئے گی

لیکن وہ اس نقصانِ مایہ کو بھی خوشی خوشی برداشت کرے گا۔ وہ تو یہاں تک جانے کو تیار ہو جاتا ہے کہ اس کی پینٹ کا کپڑا خریدنے کے لئے آٹھ سال کے بچے کو بھیج دیا جائے۔ زیادہ سے زیادہ کتنا فرق پڑے گا آخر؟ یہی پانچ دس بارہ روپے کا؟ مگر فرار تو ایک بیش قیمت چیز ہے۔ پانچ دس بارہ روپے سے زیادہ قیمتی ——— !!

اور اس فراریت کے حق میں اس کے پاس بڑی بڑی دلچسپ دلیلیں بھی ہیں، مثلاً وہ کہتا ہے کہ دنیا کی یہ ساری جدوجہد آسائش کے لئے ہے، آسائش اور فراریت کی سرحدیں بالکل قریب قریب ہیں۔ تم کام کس لئے کرتے ہو؟ اس لئے کہ کام کرنے کے بعد کام سے فرار حاصل کر کے پلنگ پر لیٹ جاؤ۔ تم کام کے زیادہ بوجھ کو شینوں پر کیوں ڈالنا چاہتے ہو؟ تاکہ تم کام سے فرار حاصل کر سکو۔ اور پھر وہ نہایت غرور سے گردن اٹھا لیتا ہے اور کسی حد تک جھجکتے ہوئے بے باکانہ یہ بھی کہتا ہے ——— "سوویت روس میں بھی تو کام کے چھ گھنٹے مقرر کئے گئے ہیں۔ آخر کیوں؟ کیا اسی لئے نہیں کہ باقی اٹھارہ گھنٹے کے لئے انسان فرار کی لذت سے آشنا ہو سکے۔ گویا وہاں اٹھارہ گھنٹے فرار کے اور چھ گھنٹے کام کے ہوتے ہیں"

اور جب میں اس مسئلہ پر اس سے شدید اختلاف کرتا ہوں اور اسے کہتا ہوں کہ "کپور صاحب! آپ صرف اپنی ذاتی فراریت پسندی کو صحیح ثابت کرنے کے لئے سوویت روس کی مثال کو توڑ مروڑ کر پیش کرتے ہیں ——" تو وہ شاید ایک طنزیہ ہنسی ہنس کر کہتا ہے ——— "توڑنا مروڑنا بھی تو ایک فرار ہی ہے جو چیز کی اصلیت کے مقابلہ پر اختیار کیا جاتا ہے"

اور فرار کا یہ جذبہ اس وقت نقطۂ عروج پر پہنچ گیا جب لاہور چھوڑنے کے بعد کپور نے موگا ایسے معمولی قصبے کا رخ کیا اور بمبئی یا دہلی کی بجائے موگا کو اپنی فراریت کا مسکن بنا لیا۔ موگا سے بھاگ کر وہ کہاں جائے گا؟ اس کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ موگا کے بعد مختصر ترین جگہ قبر ہی ہے ———
(لیکن سوال یہ ہے کہ کیا وہ موت سے فرار اختیار نہیں کرے گا؟)

اس کا حلقۂ احباب بہت مختصر ہے۔ بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ اس نے کوئی ایسا دوست نہیں بنایا جس پر وہ جی جان سے مٹ جائے تو زیادہ قرینِ قیاس رہے گا۔ یوں کہنے کو تو اس کے سینکڑوں دوست ہیں مگر میرا خیال ہے کہ کپور نے کسی کو اپنا دل نہیں دیا۔ اگرچہ اس میں کپور کی بدمزاجی کو دخل نہیں ہے کیونکہ ترکیب ہی یہ ہے کہ اس کے اس دل کی مقدار ہی بے حد کم ہے۔ وہ کسی کے لئے بھی بے محابا نہیں تڑپ سکتا۔ نہ اس کی یاد میں تارے گن سکتا ہے نہ آہیں بھر سکتا ہے ——— یہ بات بھی نہیں ہے کہ وہ جذبات سے بالکل کورا ہے۔ بلکہ جھگڑا صرف مقدار کا ہے۔ وہ اگر کسی کو اپنی محبت سونپتا ہے تو دل سے نہیں بلکہ دماغ سے۔ اس کا دماغ ہی محبت کا فیصلہ کرتا ہے ——— اگر کوئی مرد ذہانت سے عاری ہے تو چاہے وہ یوسفِ ثانی ہی کیوں نہ ہو کپور اسے منہ نہیں لگائے گا۔ وہ کہتا ہے کہ مرد کو ذہین اور عورت کو حسین ہونا چاہئے۔ عورت کے حسن کا فیصلہ بھی وہ دل سے نہیں دماغ سے کرتا ہے ——— علمِ جمالیات کے فیصلے سے ہی وہ حسن نازک کو ماپتا ہے۔ پورا اترا تو زہے نصیب۔ ورنہ کہاں میں!!

ہاں اس کے ایسے احباب کی تعداد بے شمار ہے جو کپور کو اپنا دوست سمجھتے ہیں مگر کپور انہیں بناتا رہتا ہے ——— کیونکہ اگر کپور کسی کو نہ بنائے تو اس کی زندگی اجیرن ہو جائے۔ ایک مرتبہ اس نے ایک نہایت بدصورت شاعر کو اپنا دوست بنایا۔ یہ شاعر اسے لاہور کے کافی ہاؤس میں ملا۔ وہ اپنے نہایت ہی گھٹیا شعر سنا سنا کر محفل سے اپنا مذاق اڑوا رہا تھا۔ کپور نے اس کے اشعار کی تعریف و توصیف شروع کر دی اور نہایت سنجیدہ لہجہ میں اہلِ محفل کے سامنے اشعار کی گہری خوبیوں کو اجاگر کرنے لگا۔ بدصورت شاعر کپور پر لٹو ہو گیا۔ دوستی کا ہاتھ آگے بڑھایا جسے کپور نے بڑے خلوص قلب کے ساتھ پکڑ لیا۔ یہاں تک کہ سبھی سمجھنے لگے کہ کپور اور بدصورت شاعر میں گاڑھی چھن رہی ہے۔

ایک بار وہی شاعر اسے مال روڈ پر مل گیا۔ علیک سلیک ہوئی۔ شاعر نے جذبۂ محبت سے چور چور ہو کر کہا۔ "کپور صاحب! مجھے کوئی خدمت بتائیے۔ میں آپ کے لئے کبھی کوئی کام آنا چاہتا ہوں"

کپور نے کہا "رہنے دیجئے! دوستی میں بے تکلفی ہی اچھی رہتی ہے۔"

شاعر نے کہا "آپ میرے مخلصانہ جذبات کو ٹھکرا رہے ہیں۔"

کپور بولا "تو پھر آپ میرا صرف ایک چھوٹا سا کام کر دیجئے۔"

شاعر بولا "فرمایئے۔"

کپور نے نہایت سادگی سے کہا "آپ ذرا تکلیف فرما کر چند منٹ کے لئے میرے غریب خانہ پر تشریف لے چلئے۔"

شاعر نے کہا "وہاں کیا کام کرنا ہوگا مجھے؟"

کپور نے کہا "یہ کچھ بھی نہیں۔ میں صرف آپ کو اپنی بیوی سے ملاؤں گا اور پھر اسے بتاؤں گا کہ دیکھو تم مجھ پر خواہ مخواہ کڑھتی ہو۔ حالانکہ دنیا میں مجھ سے بھی زیادہ بدصورت آدمی موجود ہیں ——"

تو کیا اس کے اس بیانیہ رہنے میں صرف تفریح کو دخل ہے؟ کیا وہ صرف طنز کرتا ہے اور طلبیانہ لذت اخذ کر کے رہ جاتا ہے؟ کیا وہ اس کردار —— یا اس کیفیت کے ساتھ ہمدردی رکھتا ہے جس پر وہ اپنے طنز کا نشتر چلاتا ہے؟ نہیں! کپور یہ بات نہیں مانتا۔ وہ کہتا ہے اگر میں طنز کرنے وقت ہمدردی کے جذبہ کی لپیٹ میں آجاؤں تو میرا وار خطا جائے گا۔ اور اگر خطا نہیں جائے گا تو پھس پھسا سا وعظ ہو کر رہ جائے گا۔ میں واعظ نہیں ہوں بلکہ طنز نگار ہوں۔ جس کیفیت یا جس کردار کی مضحکہ خیز حرکت پر میں طنز کر رہا ہوں وہ مجھے ناپسند ہوتی ہے۔ میری پسند کیا ہے؟ یہ سوچنا اسی کا کام ہے جس پر وار کیا جا رہا ہے۔ میرا کام رحم کرنا نہیں ہے بلکہ قابلِ رحم افراد اور کیفیتوں پر چوٹ کرنا ہے کسی میں دانائی ہو تو اس چوٹ میں لپٹی ہوئی ہمدردی کے لطیف ترین عناصر ڈھونڈ لے۔ مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟

چنانچہ اسی بنا پر وہ کیفیتوں کو بناتا رہتا ہے۔ جو لوگ اس کی طنز کا نشانہ بنتے ہیں ان کی مختلف قسمیں بن جاتی ہیں۔ ایک وہ جو شکار ہوتے ہیں اور آخری دم تک اسی سادگی کے ساتھ بنے رہتے ہیں۔ ایک وہ جو اس کی طنز کے راز کو پا جاتے ہیں اور بس کر بیتاب ہو جاتے ہیں اور اس سے گھٹیا قسم کے انتقام لینے پر تل جاتے ہیں اور ایک وہ جو چوٹ سہہ کر اسے حسبِ معمول سہلانے لگتے ہیں تو شدتِ لذت سے مسکرا دیتے ہیں اور ان کی آنکھوں سے تبسم آمیز آنسو بہہ نکلتے ہیں اور طنز کے اثر کی یہی معراج ہوتی ہے۔

ایک مرتبہ جب وہ پہلگام کی سیر کو جا رہا تھا تو راستے میں اسے ایک بہت بڑے پنجابی زمیندار کے ساتھ سفر کرنے کا موقع مل گیا جسے اپنے لمبے اور بھاری تھلے پر سرپٹے اور رسیلے ہونے کا یقین تھا۔ چنانچہ اسی مضحکہ خیز یقین کی بنا پر کپور نے اسے بتایا کہ کیا آپ نے کشمیر میں اچھی ہونے والے کے نالاب بھی ملاحظہ فرمائے ہیں —— تو زمیندار نے حیرت کے ساتھ وہ نالاب دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ کپور اس کیفیت کو انتہائی سنجیدگی کے ساتھ آگے بڑھاتا رہا کہ بالآخر اس زمیندار کو پہلگام کے قریب گندھک کے ایک پہاڑی چشمہ پر لے گیا اور اس میں سے چائے کا ایک کپ بھر کر اسے پلایا جس پر زمیندار نے صرف اتنا کہا کہ یہ چائے کچھ نمکین زیادہ ہے۔ کپور نے کہا کہ کشمیری لوگ نمکین چائے ہی پسند کرتے ہیں کیونکہ یہاں کی آب و ہوا ہی کی پیداوار ہے —— مشکل ہے۔

علم اور جذبات کا یہ افلاس واقعی ایک مضحکہ خیز کیفیت کو جنم دینے والا ہے اور کپور کو اس بات سے بے حد تسکین ملتی ہے کہ ان مضحکہ خیز کیفیتوں پر ایسے بھی طنز کیسے جو مسرت خیز بھی ہوں اور عبرت انگیز بھی۔

اسے اپنے دبلے پتلے جسم کا شدید احساس رہتا ہے اور اسی بنا پر وہ کسی عورت کی زلفِ عشق میں گرفتار نہیں ہونا چاہتا بلکہ گلی محلے میں گھومتے ہوئے ایک نیک اور شریف کھلاڑی کی طرح نکل جاتا ہے۔ وزن تولنے والی مشین سے یوں خوف کھاتا ہے جیسے شیطان لاحول سے۔ نہانے سے بہت ڈرتا ہے کیونکہ نہانے میں کپڑے اتارنا پڑتے ہیں اور جسم کا پتلا پن صاف جھلکی کھانے لگتا ہے۔ سفر کرنے سے بھی گھبراتا ہے کیونکہ سفر کے دوران میں دھکے لگتے ہیں ٹکٹ لینے کے لئے گاڑی میں سیٹ حاصل کرنے کے لئے اسٹیشن پر اترنے چڑھنے کے لئے، سامان اتارنے اور چڑھانے کے لئے۔ اور اس سارے عمل میں [illegible] اس کا ساتھ نہیں دیتا

انکار کر دیتا ہے۔ چنانچہ وہ سفر کو سفر سمجھتا ہے ۔۔۔ ایک مرتبہ ایک انگریز خاتون نے اس کے ساتھ مذاق کرتے ہوئے کہا ۔۔۔ "کپور صاحب!

"YOU ARE AS THIN AS A NEEDLE —"

"آپ تو سوئی کی طرح پتلے ہیں" کپور نے بے ساختگی سے اس چوٹ کا جواب دیتے ہوئے کہا "محترمہ آپ ذرا مبالغہ سے کام لے رہی ہیں کیونکہ چند ایک سوئیاں مجھ سے موٹی بھی ہوتی ہیں"
جسمانی کمزوری کا یہ احساس اس میں مقابلہ کرنے کی سپرٹ کو کم کر رہا ہے۔ ایک مرتبہ ایک پبلشر نے اس کی کتاب شائع کر دی۔ اور جب کپور نے اس سے رائلٹی مانگی تو پبلشر اسے سرپرا زا جسمانی مقابلہ کے لئے للکار دیا۔ جس پر کپور نے بڑی بے تکلف مسکراہٹ کے ساتھ وہ کتاب پبلشر کو منت دے دی۔ اسی طرح ایک مرتبہ لاہور کے ایک سیاسی وکیل اور ادبی مجاہد نے اسے ایک طنزیہ مضمون لکھنے پر ڈوئل کے لئے پکارا تو کپور نے معافی مانگ لی۔ اس کا مقولہ ہے کہ لڑائی صرف عقلمندوں سے کرنی چاہئے۔ مورکھوں سے لڑائی کرنے میں ہڈیاں ٹوٹ جانے کا احتمال ہوتا ہے جو ایک نہایت احمقانہ عمل ہے ۔۔۔ چنانچہ عقلمندوں کے ساتھ لڑائی کرنے میں اسے بے حد لطف آتا ہے۔ ایک مرتبہ محفل جمی ہوئی تھی تو ایک انٹلکچوئل قسم کے حضرت تشریف لائے جو کپور سے بے حد نالاں تھے۔ چنانچہ انہوں نے باتوں باتوں میں اپنی ذہانت کا ہتھیار نکال کر کپور سے نبرد آزمائی شروع کر دی۔ کپور نے کہا "صاحب! میں تو آپ کو بہت ذہین سمجھتا تھا" ان صاحب نے فوراً چوٹ کی اور کہا "کپور صاحب! میں بھی آپ کو شریف ہی آدمی سمجھتا تھا" اس پر کپور بھڑک اٹھا اور بولا "معاف کیجئے۔ آپ ٹھیک سمجھے تھے۔ غلطی مجھ سے ہوئی"
چنانچہ ذہانت کے میدان جنگ میں اکثر پالا مار جاتا ہے۔ اگرچہ منٹو کا خیال ہے کہ ابھی تک منٹو اس میدان میں نقطۂ وحدت ہے مگر منٹو کے اس دعویٰ پر اوپندر ناتھ اشک بگڑ جاتا ہے اور یوں ایک خاصا میدان کارزار گرم ہو جاتا ہے۔

کنہیا لال کپور صرف طنز نگار اور "پالا مار" ہی نہیں ہے۔ بلکہ اس میں سنجیدگی اور متانت کے جراثیم بھی کافی مقدار میں ہیں۔ وہ زندگی اور سماج کے ہر مسئلہ پر اپنی ایک نہ ایک رائے رکھتا ہے۔ مثلاً خدا کے متعلق اس کا خیال ہے کہ اس کے وجود کو ضرور تسلیم کر لینا چاہئے۔ کیونکہ دنیا میں بیک وقت اتنی خوبصورتی اور اتنی بدصورتی پیدا کرنا کسی بہت بڑے اعلیٰ اور برتر وجود کا ہی کام ہے۔ مگر وہ کسی مذہب کو نہیں مانتا۔ کیونکہ اس کا خیال ہے کہ کسی بھی مذہب میں کوئی ایسی غیر معمولی بات نہیں کہی گئی جسے ایک ذہین آدمی پہلے سے نہ جانتا ہو۔ لیکن ۔۔۔ وہ اچانک ڈرامائی موڑ بنا کر کہتا ہے "مذہب میں جہاں جہاں بھی شعریت کے عناصر پائے جاتے ہیں وہ اسے بے حد پسند آتے ہیں۔ گیتا کے اشلوک اور قرآن کے آہنگ پر وہ جھوم اٹھتا ہے۔
وہ اردو زبان کو ایک الہامی زبان سمجھتا ہے کیونکہ اس کا خیال ہے کہ دنیا کی ہر الہامی زبان کے خوبصورت ترین اور تاثر انگیز پہلو اردو زبان میں موجود ہیں۔ اس زبان کو مارنے کی کوشش بالکل ایسے ہی ہے جیسے کوئی چنگیز خان کسی بہت بڑے علمی کتب خانہ کو جلا دے اور اس جگہ پر ایک فوجی خیمہ کھڑا کر دے "کیا اردو زبان صرف دہلی اور لکھنؤ کی زبان ہے؟" میں نے اس سے ایک بار پوچھا تو اس نے بھڑک کر جواب دیا "لکھنؤ میں ۔۔۔ لکھنؤ میں تو اردو زبان بے حد غلط بولی جاتی ہے۔ انہیں تو ابھی اتنا بھی شعور نہیں کہ کونسی چیز مذکر ہے اور کونسی مونث"
اس کا خیال ہے کہ موجودہ ہندی میں ایک بہت بڑی تعداد متروک الفاظ کی ہے۔ ان متروکات کو فوراً نکال دینا چاہئے تاکہ ہندی زبان چل سکے۔ ورنہ زمانے کی سوئی کو تین سو سال پیچھے کی طرف گھما دینا تاریخ کی سب سے بڑی حماقت ہوگی"
جب اس کے احباب اسے بتاتے ہیں کہ تم ادبی اعتبار سے سٹیفن سن سے مشابہت رکھتے ہو تو وہ خوشی سے پھولا نہیں سماتا۔ لیکن جب اسے یہ خیال آتا ہے کہ سٹیفن سن تپ دق سے مرا تھا۔ تو وہ گھبرا جاتا ہے اور سوچتا ہے کہ وہ سٹیفن سن بالکل نہیں بنے گا۔
حالانکہ ایک ماہر پامسٹ نے اسے صاف صاف بتا دیا تھا کہ تمہاری موت جگر کی خرابی کے باعث ہوگی۔

شاہد احمد دہلوی

جمیل جالبی

جب میں اس دکان میں داخل ہوا تو وہاں ایک نئے صاحب کو بیٹھے دیکھا۔ ڈھیلی ڈھالی گہرے کتھئی رنگ کی شیروانی، کھلتا ہوا سیاہ رنگ، پھیلی ہوئی کھڑی ناک، مسکراتے ہوئے سنجیدہ ہونٹ، منہ میں بیڑی، آنکھوں پر موٹے فریم کا چشمہ، داڑھی مونچھ صاف، سر پر جناح کیپ، چہرے پر ایک وقار اور سنجیدگی۔ کوئی بات کرتا تو مسکرا کر خاکسارانہ انداز میں مختصر سا جواب دیتے اور خاموش ہو جاتے۔ کوئی کچھ اور کہتا تو زور سے ہنس کر تھوڑی دیر میں پھر سنجیدہ ہو جاتے۔ وہ کتابوں کی دکان تھی۔ بہت سے خریدار آ جا رہے تھے۔ آنے والوں میں سے اکثر ان صاحب سے سلام علیکم کرتے احترام سے ہاتھ ملاتے۔ خیر صلا خیر عافیت پوچھتے۔ کچھ دیر ٹھہرتے اور چلے جاتے۔ یہ دیکھ کر میں نے سوچا کہ آخر یہ صاحب ہیں کون؟ میں نے برابر کھڑے ہوئے ایک صاحب سے پوچھا جو ان سے بات چیت کر کے ابھی فارغ ہوئے تھے۔ انہوں نے ایک دفعہ مجھے اوپر سے نیچے تک دیکھا اور پھر جلدی سے بولے ——— "شاہد احمد دہلوی ہیں!" یہ نام سنتے ہی میرے جسم میں ایک لہر سی دوڑ گئی۔ شاہد صاحب کا نام میں نے سیکڑوں بار سنا اور پڑھا تھا اور ان سے ملنے کی تمنا ایک زمانہ سے تھی۔ چونکہ دکان میں بہت سے لوگ کھڑے تھے میری ہمت نہ ہوئی کہ میں ان سے ہاتھ ملاؤں۔ کچھ دیر الگ کھڑا ان کو ایک خاص احترام کے ساتھ دیکھتا رہا اور جب میں نے یہ محسوس کیا کہ اب لوگ مجھے دیکھنے لگے ہیں، میں دکان سے باہر آ گیا۔

شاہد صاحب اس زمانہ میں ایک عزیز کے ساتھ مارٹن روڈ پر رہتے تھے۔ چھوٹا سا مکان اور اس میں کئی کنبے، نہ بجلی نہ پانی۔ ابھی بن رہے تھے۔ ایک دن میں ملنے کے ارادہ سے چلا۔ بڑی مشکل سے مکان ملا۔ شاہد صاحب ململ کا کرتہ پہنے، تہمد باندھے پلنگ پر بیٹھے بیڑی پی رہے تھے۔ شام کا وقت تھا۔ سورج غروب ہو چکا تھا۔ تاریکی نہایت تیزی کے ساتھ اپنا جال بن رہی تھی۔ میں نے کہا۔ "شاہد صاحب! میں آپ سے ملنے آیا ہوں۔" مسکرا کر میرا خیر مقدم کیا۔ کہا "آئیے یہیں بیٹھ جائیے۔" اندر سے لیمپ منگوایا جو کراچی کی تیز ہوا کے جھونکے سے فوراً ہی بجھ گیا۔ پھر لالٹین منگوائی جو کچھ دیر تو ٹھیک ٹھاک جلتی رہی اور پھر ایک دم بھڑکنے لگی۔ اتنے میں کوئی بچہ اسے اندر اٹھا کر لے گیا۔ اسی اندھیرے میں ان سے باتیں ہوتی رہیں۔ دنیا زمانے کی باتیں، فسادات کے قصے، دلی کا ذکر، ورنہ جانے کیا کیا۔ کہنے لگے "بہت سوں کو تو ابھی معلوم بھی نہیں کہ میں جیتا ہوں۔ کرشن چندر کا خط آیا تھا۔ جس میں میرے انتقال پر ملال کے بارے میں تعزیتی جلسہ اور قرارداد کا ذکر کیا تھا۔ مگر میں ابھی زندہ ہوں۔ جما جمایا سارا کام بکھر گیا۔ دلی چھٹ گئی۔ بہار کالونی میں مکان بنوا رہا ہوں۔" میں کئی گھنٹے بیٹھا باتیں کرتا رہا۔ ان کے اخلاق اور خلوص کو دیکھ کر میرا دل بڑھ گیا۔ اور پھر ہمارے تعلقات

اتنی تیزی سے ساتھ بیٹھے کہ وہ میرے دکھ درد میں شریک اور میں ان کے دکھ تکلیف میں ساتھ۔ اُٹھنا بیٹھنا، آنا جانا بڑھ گیا۔ شام کو ہم ساتھ جاتے، چائے پیتے۔ بے مقصد گھومتے۔ میں نے قدم قدم پر ان کے خلوص اور محبت کو محسوس کیا۔ شاہد صاحب ان لوگوں میں سے ہیں جن کی دوستی پر فخر کیا جا سکتا ہے۔

کچھ دن بعد شاہد صاحب نے بہار کالونی کا مکان فروخت کر دیا۔ وہاں کی آب و ہوا خراب تھی۔ تمام دیواروں میں شورا اور سیل۔ اور پیر الٰہی بخش کالونی میں مکان خرید لیا۔ وہیں اتفاق سے میں نے بھی ایک مکان خرید لیا تھا۔ جب جی گھبراتا اور کہیں جانے کو جی نہ چاہتا تو میں ان کے ہاں چلا جاتا۔ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا، گپیں لڑاتا اور چلا آتا۔ جی ہلکا ہو جاتا۔ ساری کوفت دور ہو جاتی۔ اگر میں ایک آدھ دن نہ جاتا تو خود آ جاتے، اور نہ آنے کی وجہ پوچھتے۔

فسادات کے بعد کون سی مصیبت تھی جو ان پر نہ ٹوٹی۔ دوست دشمن ہو گئے۔ اپنے بیگانے ہو گئے۔ یہ سب کچھ چھوڑ کر دلی کے پرانے قلعے میں آ پڑے۔ کئی دن وہاں رہے۔ جو مصیبتیں سب نے جھیلیں ان سے زیادہ انہوں نے جھیلیں۔ زندگی بسر آرام سے گزر رہی تھی، مصیبت یا پریشانی کاہے کو دیکھی تھی۔ یہاں کئی دن دھوپ، بارش، بدبو اور تعفن میں چھوٹے بڑے بچوں کے ساتھ پڑے رہے۔ اور پھر ایک دن مہاجرین کی ٹرین میں بیٹھ کر راستہ کی صعوبتیں اور تکلیفیں برداشت کرتے لاہور آ گئے۔ اور جب لاہور میں کچھ نہ بنا تو کراچی آ پڑے۔ اور اپنا پرانا مشغلہ پھر سے شروع کر دیا۔ اور جو پونجی [illegible] سکے تھے اسی پر گزارا تھا۔ دلی کی ساری جائیداد اور کتب خانہ کچھ کسٹوڈین صاحب کی نذر ہو گیا اور کچھ خورد برد ہو گیا۔ ساقی آج تک کبھی فائدہ میں نہیں چلا تھا۔ کراچی میں تو کیا چلتا۔ لوگوں کو گھر بار اور دال روٹی کی پڑی تھی۔ کتابیں اور رسالے کون پڑھتا۔ تہذیب اور کلچر کی باتیں کون سنتا۔ شاہد صاحب کی صحت خراب ہو گئی تھی۔ صدمہ پر صدمہ، بڑا کنبہ، کھانے والے سب اور کمانے والا کوئی نہیں۔ شاہد صاحب اگر ساقی نہ نکالتے اور گانے بجانے کا شوق نہ ہوتا تو شاید وہ زندہ بھی نہ رہ سکتے۔ کچھ ساقی میں مصروف رہے، کچھ گانے بجانے میں۔ برے دن گزر گئے۔ بات پرانی ہو گئی۔ غم ہلکا ہو گیا۔

اس عرصہ میں سب کچھ ہوا۔ لیکن شاہد صاحب کی وضعداری میں فرق نہیں آیا۔ اس مصیبت کے زمانے میں نہ انہوں نے کسی کی خوشامد کی، نہ کسی سے گر کر بات کی۔ نہ کہیں خود غرضی کا مظاہرہ کیا۔ بے وطنی اور غربت میں انسان کے جوہر کھلتے ہیں۔ کمینے اور شریف کی پہچان ایسے ہی موقع پر ہوتی ہے۔ لیکن انہوں نے نہ اپنی خو چھوڑی نہ وضع بدلی۔ نہ سبک سر بن کے کسی سے سرگردانی کی وجہ پوچھی۔ اور یہ بات ان کے کردار کا وہ جوہر ہے جو گنتی کے چند لوگوں میں پایا جاتا ہے۔

شاہد صاحب میں سب سے بڑی بات ان کی سادگی ہے۔ جھوٹی عزت ان کے پاس سے کبھی چھو کر نہیں گزری۔ تہمد باندھے چلے آ رہے ہیں۔ کھل کر باتیں کر رہے ہیں۔ نہ کسی کی برائی، نہ کسی کی غیبت۔ سب پہ فقرے چست کریں گے۔ سب کا ذکر کریں گے۔ مزا لیں گے، مذاق اڑائیں گے۔ جس قسم کی صحبت میں بیٹھیں گے، اس میں گھل مل جائیں گے۔ بڈھوں میں بڈھے، جوانوں میں جوان اور بچوں میں بچے۔ ہر ایک کے متعلق بہت کچھ جانتے ہیں۔ ہر ادیب کا ذکر کریں گے۔ اپنی ملاقات کی تفصیل سنائیں گے۔ لچھے دار انداز میں گفتگو کریں گے۔ خود بھی ہنسیں گے اور سننے والوں کو بھی ہنسائیں گے۔ گھنٹوں چہل رہے گی۔ اچھی بری ہر قسم کی بات کریں گے۔ شاہد صاحب سے باتیں کرتے وقت آدمی سب کچھ بھول کر ایک الگ دنیا میں کھو جاتا ہے۔ جہاں خلوص، ہنسی، دلچسپی، اور ادب اور موسیقی کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا۔ ادیبوں اور شاعروں کے قصے ہوں گے۔ ان کے جو مر گئے، ان کے بھی جو جیتے ہیں۔ اور ان کے بھی جو ابھی ابھر رہے ہیں۔ ادیبوں کا ذکر آئے گا۔ ان کی اچھی بری عادتوں کا ذکر کریں گے۔ چال چلن، اطوار اور حماقتوں پر روشنی ڈالیں گے۔ کھل کر ان کے لین دین، مروت، معاملہ، شراب، عورت، شادی بیاہ، عشق اور ہوس کا ذکر کریں گے۔ ایک دن فرصت میں باتیں کر رہے تھے۔ کہنے لگے کہ دلی کے ایک ہوٹل میں بیٹھے تھے۔ مجاز بھی تھے۔ مجاز شراب کا رسیا، عورت کا عاشق، [illegible]

چل بسے۔ مجازؔ نے شراب پی پی کر اپنی صحت خراب کر لی تھی۔ شاہد صاحب نے کہا۔ مجازؔ! مر جاؤ گے۔ مجازؔ نے بے ساختہ کہا، شاہد صاحب!

موت بھی اس لئے گوارا ہے

موت "آتا" نہیں ہے "آتی" ہے

کہنے لگے حیدر آباد میں جوشؔ سے ملاقات ہوئی۔ جوشؔ شراب پی رہے تھے محفل جمی ہوئی تھی۔ دور چل رہا تھا۔ مجھ سے کہنے لگے شاہد صاحب! آپ بھی پیجئے۔ میں نے انکار کیا۔ ان کا اصرار بڑھا۔ جب اُدھر سے اصرار اور اِدھر سے انکار بڑھا تو جوشؔ اپنے مخصوص انداز میں بولے:

"ساقی" کے "مدیر" اور نہیں ہیں مخمور

برعکس نہند نام زنگی کافور

ہر ایک سے ملتے ہیں اور کھل کر ملتے ہیں۔ آپ سے ملاقات ہو یا نہ ہو۔ لیکن ملیں گے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ وہ آپ کے نئے واقف کار نہیں، بڑے پرانے دوست ہیں۔ ایسے موقع پر ہمدردی کی باتیں کریں گے۔ اور مقدور بھر جو کچھ کر سکتے ہیں کریں گے۔ بہت سے لوگ ایسے ہیں جو انہی کی وجہ سے پیٹ پال رہے ہیں۔ ان میں ادیب بھی ہیں۔ اور ڈوم ڈھاڑی بھی۔ نا سمجھ کہتے ہیں، پانی پھر کے گالیاں بھی دیں گے۔ چھیڑ چھاڑ بھی کریں گے، مگر سنجیدگی طبع موجود رہے گی۔ ساقی جب کراچی سے نکلا تو ساقی کے پرانے منشی جی وہیں کام کرنے لگے۔ ان سے بیٹھے گھنٹوں باتیں کرتے۔ مزے لیتے۔ کام کرنے جاتے، ٹھہر کے کہتے جاتے۔ ایک دن شاہد صاحب، منشی جی اور میں ایک ہوٹل میں چائے پی رہے تھے۔ منشی جی اپنی بیوی سے بے زاری کا اظہار کر رہے تھے۔ بڑھے آدمی ہیں۔ لیکن اس کے بُرے سلوک کے ایسے شاکی کہ میں حیرت میں رہ گیا۔ شاہد صاحب دیر تو سنتے رہے پھر ایکدم بولے۔ کیوں بھئی! تمہاری "سوتیلی بیوی" ہے؟ اور پھر ہنسنے لگے۔

مارٹن روڈ پر سرکاری کوارٹر ہیں جو سب کے سب ہم شکل اور یکساں ہیں۔ ایک دن شام کو گھر لوٹ رہے تھے۔ غلطی سے کسی اور مکان میں گھس گئے۔ بلا تکلف اندر کمرے میں گئے۔ شیروانی اتاری اور کھونٹی پر لٹکانے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ کھونٹی وہاں نہ تھی۔ کسی کو آواز دی۔ ایک عورت کمرے میں آئی۔ غیر مرد کو دیکھ کر اس کی چیخ نکل گئی۔ انہوں نے اسے دیکھا تو ان کے بھی پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ جلدی سے شیروانی لئے اور دونوں ہاتھوں سے دستار تھامتے باہر نکلے۔ اندر سے عورتیں چیخنے چلانے لگیں۔ انہوں نے معذرت چاہی۔ کہنے لگے جمیل صاحب! قربِ قیامت ہے۔ ہر چیز ہم شکل ہونے لگی ہے۔ اور پھر زور زور سے ہنسنے لگے۔ شاہد صاحب، ہنستے بڑے مزے سے ہیں۔ پہلے بات کہیں گے مزے لے کر، تفصیل کے ساتھ۔ بات کے دوران میں وہ بالکل سنجیدہ رہیں گے۔ صرف الامسکرانا رہے گا۔ جب بات ختم ہو جائے گی تو پھر گہری گہری آنکھوں سے دیکھیں گے اور یک لخت زور زور سے ہنسنے لگیں گے۔ پھر ہنسی کا غوطہ لگائیں گے اور پھر ہموار ہو جائیں گے۔ ان کے ہنسنے کا انداز دیکھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ جیسے گنگھور گھٹا میں ابابیل سیدھی اُڑتے اُڑتے بھیگی بھیگی فضا میں غوطہ لگاتی ہے اور پھر سیدھی اُڑنے لگتی ہے ——— پھر غوطہ لگاتی ہے اور سیدھی اُڑنے لگتی ہے۔

شاہد صاحب کو شاعروں سے چڑ ہے۔ چڑ ان معنی میں نہیں کہ وہ شعر و شاعری کو پسند نہیں کرتے بلکہ ان معنی میں کہ شاعروں کو سنانے کا مرض ہوتا ہے اور انہیں سننے سے اللہ واسطے کا بیر ہے۔ اس معاملہ میں وہ بڑے کھرے ہیں۔ صاف صاف لحاظ مروت کو بالائے طاق رکھ کر سختی سے انکار کر دیں گے۔ کہنے لگے جمیل صاحب! اگر میں ایسا نہ کروں تو میری زندگی عذاب بن جائے۔ مجھے سڑک پر، ہوٹل میں، بسوں میں، گھروں پر، دعوتوں میں ہر جگہ غزلیں سنانے لگیں ——— دو تین سال پہلے کی بات ہے۔ ایک صاحب لکھنؤ سے آئے۔ طبلہ بجاتے تھے۔ موسیقی کے سلسلہ میں شاہد صاحب کی تعریف سنی تھی۔ شاہد صاحب سے ملنے آئے۔ کند ہم جنس با ہم جنس پرواز کے مصداق پھر روز آنے لگے۔ اپنے طبلے کی بہت ڈینگیں مارتے۔ کئی محفلوں میں انہوں نے طبلہ بجایا۔ شاہد صاحب نے تعریف کی۔ کچھ مروت سے،

کچھ ویسے ہی علاقائی تھے۔ ایک دن گانے بجانے کی ایک محفل میں مصر ہوئے کہ شاہد صاحب میرے ساتھ گائیے۔ شاہد صاحب راضی ہو گئے۔ لیکن طبلہ بجانے وقت وہ اس فکر میں پڑ گئے کہ کسی صورت سے گانے والے پر غالب آجائیں۔ اور شاہد صاحب کو من چھ جی سرایم کا احساس ہو جائے۔ شاہد صاحب نے جب یہ دیکھا تو ایسے استادانہ انداز سے راگ گایا کہ کچھ دیر بعد طبلہ صاحب عاجز ہو گئے۔ شاہد صاحب نے کہا۔ میر صاحب! کیا بجا رہے ہیں؟ وہ ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو گئے۔ اور ان کے عقیدت مندوں میں شامل ہو گئے۔

یہی صاحب ایک دن تشریف لائے۔ دوپہر کا وقت تھا۔ میں بھی وہیں بیٹھا تھا۔ سالنامہ کی تیاری تھی۔ کاپیاں جوڑی جا رہی تھیں۔ وہ فرمانے لگے۔ شاہد صاحب! میں نے ایک غزل کہی ہے۔ ذرا سُن لیجئے۔ طبیعت خوش ہو جائے گی۔ شاہد صاحب نے انہیں دیکھا۔ آگ ہی لگ گئی۔ کہنے لگے صاحب! مروت میں ایک دفعہ بُرا کام کرایا جا سکتا ہے مگر غزل نہیں سُنی جا سکتی۔ ایک دفعہ میں غزل سُن چکا ہوں۔ اب بار بار تو یہ حرکت نہیں ہو سکتی۔ وہ بے چارے دم بخود رہ گئے۔ کچھ دیر بیٹھے اور پھر چلے گئے۔ مگر شاہد صاحب کا پیچھا اس پر بھی ان سے آج تک نہیں چھوٹا۔

ایک دن ڈاک دیکھ رہے تھے۔ ایک خط میری طرف بڑھایا۔ بولے۔ پڑھ لیجئے۔ اس میں لکھا تھا "مکرمی! غزل روانہ ہے۔ بڑی محنت اور کاوش سے کہی ہے۔ یہاں کے لوگوں نے بہت پسند کی ہے۔ براہِ کرم ساقی میں نمایاں طور پر شائع فرما کر ممنون فرمائیے"۔ خط پڑھ کر میں نے واپس کیا۔ کہنے لگے "جیں صاحب! کیا سالے کو ٹائٹل پیج پر چھاپ دوں؟"

ایک دن باتوں باتوں میں سرکاری افسروں کا ذکر آ گیا۔ کہنے لگے "یہ سالے ہر وقت اور ہر جگہ افسر ہی رہتے ہیں۔ انسان کبھی نہیں ہوتے۔ ایسے ایسے لائق افسر پڑے ہیں کہ جو جس کام پر لگایا گیا ہے بس وہی کام اسے نہیں آتا"۔ ایک محکمہ کے ایک بڑے افسر کا ذکر کرنے لگے۔ وہ طباعت کے نگران تھے۔ ایک صاحب ان کے پاس گئے۔ ان کے گہرے دوستوں میں سے تھے۔ بڑے مسخرے اور منہ پھٹ۔ ان سے کہنے لگے ...... صاحب آپ کی سرکاری طباعت میں لفظوں میں ذرا بھی چمک نہیں ہوتی۔ شاید آپ کتابت کے بعد مسطر پر زیتون کا تیل نہیں پھرواتے؟ یہ بات نہایت سنجیدگی سے کہی گئی تھی۔ انہوں نے فرمایا ــــ "نہیں تو"۔ "یہی وجہ ہے کہ الفاظ چمکنے نہیں ہوتے۔ یہ تو کاتب کا کام تھا کہ وہ کتابت کے بعد مسطر پر تیل کا پھارا پھیرے"۔ وہ غصہ میں بھر گئے۔ فوراً انچارج کاتب کو بلایا۔ ڈانٹا اور کہا "عجیب بات ہے کہ آپ اپنے تجربہ کا اتنا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں۔ لیکن زیتون کا تیل تک مسطر پر کتابت کے بعد نہیں پھیرتے"۔ کاتب یہ سُن کر سناٹے میں آ گیا۔ کہنے لگا "ہیں صاحب!" ــــ "صاحب واب کچھ نہیں۔ آئندہ سے خیال رہے"۔ کاتب چلا گیا۔ وہ صاحب ہنسنے لگے "یار! میں تو مذاق کر رہا تھا"۔

شاہد صاحب چائے کے بہت رسیا ہیں۔ دن میں بیسیوں پیالیاں پی جاتے ہیں۔ اس میں اچھی بُری کی کوئی تخصیص نہیں۔ چائے ہو اور بس۔ مہینہ میں پندرہ سو بیڑیاں پی جاتے ہیں۔ ساقی کا سارا کام اپنے ہاتھ سے کرتے ہیں۔ ایک دن حسب معمول بنیان پہنے، تہمد باندھے زمین پر بیٹھے ہوئے پرچہ پیک کر رہے تھے۔ میں پہنچ گیا۔ میں نے کہا شاہد صاحب! ایسے میں آپ کی تصویر لے لی جائے۔ زور سے ہنسے۔ کہنے لگے۔ اور ہاں اس کے نیچے لکھ دینا ــــ "پچیس سال ادب کی خدمت کرنے کا حشر"

گانے کے رسیا ہیں اور اس فن کے استاد۔ ہندوستان و پاکستان میں ایک آدھ ہی شخص ایسا ہو گا جو اس فن سے ایسا واقف ہو جیسے کہ شاہد صاحب ہیں۔ میں نے بڑے بڑے خاندانی خانصاحبوں کو ان کے سامنے عقیدت مندانہ طریقہ سے بیٹھے دیکھا ہے۔ استاد بندو خاں میں ایک بڑا عیب یہ ہے کہ وہ سارنگی بجانے سے پہلے کم از کم تیس چالیس منٹ تک بھری محفل میں سارنگی کے تاروں کو چلاتے رہتے ہیں۔ سامعین بیٹھے

استغفار کرتے رہتے ہیں۔ ہر محفل میں ان کی یہ روش قائم رہتی ہے۔ کس کی مجال کہ کوئی ان سے کچھ کہے۔ اپنے فن کے لاثانی فنکار۔ ناراض ہو جائیں یا روٹھ جائیں تو پھر منائے نہ منیں لیکن میں نے دیکھا ہے کہ شاہد صاحب ان کو غصہ بھرے لہجہ میں ڈانٹ دیتے ہیں۔ یا پھر جل کر اس عرصہ میں کسی اور کو گوا دیتے ہیں۔ اور وہ ان کی بات ایسے سن لیتے ہیں جیسے کوئی ان کا استاد یا بزرگ ہوں۔ وہ اس فن پر لکھ بھی ماہرانہ انداز سے لیتے ہیں اور صاحبِ حالت گا بھی استادانہ طریقہ پر لیتے ہیں۔ میں نے انہیں بیسیوں دفعہ سنا۔ ریڈیو پر بھی اور محفلوں میں بھی۔ گانے والے کے جوہر محفل میں کھلتے ہیں۔ شاہد صاحب جب محفل میں گاتے ہیں تو وہ لوگ بھی جو کلاسیکل موسیقی سے ناواقف ہیں۔ تال اور سُروں کے زیر و بم اور اتار چڑھاؤ سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ایک دن میرے ہاں محفل تھی۔ کراچی کے سب مشہور گویے اور سازندے جمع تھے۔ رات کے تین بجے شاہد صاحب کی باری آئی سب نے آنکھیں ملیں۔ پہلو بدلے اور انہیں سننے کے لئے ہمہ تن گوش ہو گئے۔ شاہد صاحب سامنے آئے۔ طبلچی نے طبلہ کھڑکھڑایا۔ سارنگیئے سارنگی کے تار کسے۔ ستاریے نے ستار کی کھونٹیاں گھمائیں۔ ایک شاگرد نے تان پورا سنبھالا۔ شاہد صاحب نے گانا شروع کیا۔ تقریباً پون گھنٹہ گائے۔ ایسا سماں باندھا کہ سب محو ہو گئے۔ محفل کو سانپ سا سونگھ گیا۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ کسی جادوگر نے ساری محفل کو باندھ دیا ہے۔ ڈھلتی رات، چاروں طرف فضا میں سناٹا۔ وقت کی راگنی مال کونس گا رہے تھے۔ ترانہ میں "تنا نا دیم" کی تکرار پر ستاریہ اور سارنگیہ ہاتھ چھوڑ بیٹھے گویا تاروں کی موسیقی سے بہت آگے نکل گیا۔ طبلچی بے قابو ہو کر رہ گیا۔ ایسا معلوم ہوتا کہ فضا میں رس گھل رہا ہے۔

گلے میں اونچی آوازیں ہیں۔ بول بہت یاد ہیں۔ بیسیوں شاگرد ہیں۔ سب استاد کہتے ہیں۔ طبلہ، سارنگی اور دوسرے ساز کمرے میں رکھے رہتے ہیں۔ ڈوم ڈھاڑی، عطائی اور خانصاحب سب ان کے فن کا لوہا مانتے ہیں۔ شاہد صاحب کا کہنا ہے کہ فنِ موسیقی کو ہندوؤں نے اپنایا حالانکہ جتنی خدمات، ایجادیں اور اضافے مسلم فنکاروں نے کئے، دوسری قوم اس کے پاسنگ کو بھی نہیں پہنچتی۔ اس سلسلہ میں ان کے متعدد مضامین شائع ہو چکے ہیں۔

ان کی شرافت ضرب المثل ہے۔ پچیس تیس سال ہو گئے ہیں۔ لیکن آج تک کسی طوائف کے کوٹھے پر نہیں گئے۔ اور نہ آج تک کسی طوائف کو شاگرد بنایا۔ اور وہ صرف اس لئے کہ اسی چیز نے اس عظیم فن کو بدنام کر دیا ہے اور شرفاء اس سے نفرت کرنے لگے ہیں۔ ان کا ایک شاگرد ایک مرتبہ کسی طوائف کے ہاں چلا گیا۔ کچھ آتا جاتا بھی نہیں تھا۔ ابھی مبتدی تھا۔ شاہد صاحب کو معلوم ہوا تو بہت بگڑے۔ کہنے لگے اللہ تعالیٰ نے موسیقی و شراب کو اسی لئے حرام کیا ہے کہ اس میں بڑے ظرف کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ عام آدمی کے پاس ہوتا نہیں ہے۔ اسے ہی دیکھو (اپنے شاگرد کی طرف) کچھ آتا جاتا ہے نہیں۔ سبق دینے لگے ہیں۔ کراچی میں مسلمان، ہندو، پارسی لڑکیاں عام طور پر اسی محفل میں شریک ہوتی ہیں جس میں شاہد صاحب شریک ہوں۔ موسیقی کی وہی محفلیں کامیاب ہوتی ہیں جن کے محرک شاہد صاحب ہوں۔ اور اسی وجہ سے پاکستان میوزک اکاڈمی کے جلسے اور محفلیں کراچی میں سب سے زیادہ شاندار اور کامیاب ہوتی ہیں۔ شاہد صاحب اس اکاڈمی کے بانی اور صدر ہیں۔ ایسی محفلوں میں وہ خاص طور پر اپنے بیوی بچوں کو ضرور لے جاتے ہیں۔

آج سے پچیس تیس سال پہلے کا ذکر ہے۔ شاہد صاحب ابھی پڑھتے تھے۔ دلّی میں کوئی گانے کی محفل تھی۔ دلّی کے مشہور گویے چاند خاں کے چھوٹے بھائی رمضان خاں بھی اس میں شریک تھے۔ بڑے اور خاندانی گویّوں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ شاہد صاحب کی جب باری آئی تو وہ گانے کے لئے سامنے آئے اور "خیال" گانا چاہا۔ رمضان خاں اس پر الٹ گئے۔ کہنے لگے "خیال" نہیں گا سکتے۔ میاں صاحبزادے غزل گاؤ۔ ان کے خیال میں استادوں کی محفل میں نو مشق اور غیر خاندانی گویے کا 'خیال' گانا ان کی ہتک اور بے عزتی تھی۔ شاہد صاحب بے چارے اٹھ آئے۔ ذلت کا ایک احساس ان کے سارے وجود پر چھا گیا۔ انہوں نے اس فن کو انتہائی کاوش اور محنت سے حاصل کرنا شروع کیا۔ دن رات کا ریاض، بڑے بڑے گویّوں کی صحبت، اچھے استادوں کی شاگردی۔ چھپے ہوئے جوہر نکھر آئے اور ایسے چمکے کہ خود استادوں کی صف میں شامل ہو گئے۔

اور اب پچیس تیس سال بعد عبید کے چاند دان کے بڑے لڑکے کی شادی تھی۔ ولیمہ کی دعوت کے بعد رات کو گانا بجانا تھا۔ استاد بندو خان، رمضان خان، امراؤ خان، ظہوری، کبیر خان اور دوسرے نامی فنکار جمع تھے کہ ایک نوجوان لڑکا گانے کے لئے آیا اور "خیال" گانا شروع کیا۔ شاہد صاحب جو ایک طرف کھڑے تھے بولے۔ میاں صاحبزادے خیال مت گاؤ۔ غزل گاؤ۔ اور اس پر اتنا اصرار بڑھا کہ وہ خیال نہ گا سکا۔ میں نے شاہد صاحب کے چہرے کو دیکھا۔ پھر رمضان خان کی طرف دیکھا اور میرا ذہن ماضی کے دھندلکوں میں کھو گیا۔

شاہد صاحب دلّی کے دائی ہیں۔ دلّی کی ہر بات، ہر رسم و رواج، ہر عمارت، ہر پہلو، ہر شخص سے خوب واقف ہیں۔ دلّی کا کبابی ہو یا باورچی، کبوتر باز ہو یا قلفی ملیم والا سب کے متعلق پوری معلومات رکھتے ہیں۔ جو زندہ ہیں ان سے دعا سلام ہے۔ اکثر کہتے ہیں۔ جمیل صاحب۔ چلو بھئی دلّی کے کباب کھالیں۔ فلاں کبابی کا لڑکا آ گیا ہے۔ دلّی میں یہ اپنے باپ کے ساتھ کام کرتا تھا۔ اب تو گدّی پر بیٹھتا ہے۔ لیکن اس زمانہ میں بچّہ سا تھا۔ دلّی سے شاہد صاحب کو والہانہ محبت ہے۔ بی۔ اے کرنے کے بعد داخلہ کے لئے علی گڑھ گئے۔ ابھی غازی آباد ہی پہنچے تھے کہ دلّی کی یاد ستانے لگی۔ علی گڑھ پہنچے، پروفیسر ادی سے ملے اور دوسرے دن دلّی واپس آ گئے اور پھر واپس نہ گئے۔ کراچی آ کر دلّی کے بارے میں شاہد صاحب نے بہت سے مضامین لکھے۔ یہ مضامین دلّی سے متعلق اچھوتے اور مخصوص اسلوب میں ایسی تہذیبی دستاویز ہیں جن کا لکھنا صرف شاہد صاحب ہی کا حصہ ہے۔ ان کے پاس معلومات بھی ہیں اور کوثر و تسنیم سے دُھلی ہوئی دلّی کی پیاری اور ٹکسالی زبان بھی۔ ان سب مضامین کو یکجا کر دیا جائے تو خاصے کی چیز بن جائے۔ یہ سب مضامین دلچسپ، اچھے لطیف اور ایسے پیارے ہیں کہ افسانہ کی طرح پڑھے جاتے ہیں۔ دلّی کی بپتا، چوک کی بہار، دلّی کی عید، سترھویں کی پیر شائع ہو کر خاص و عام سے خراجِ تحسین حاصل کر چکے ہیں ——— ایسے ہی ان کے ترجمے ہیں۔ وہ اُردو کے ایک بہترین مترجم ہیں۔ انہوں نے سینکڑوں مشہور افسانوں اور ڈراموں کے ترجمے کئے۔ ان کے ترجمہ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ ترجمے نہیں بلکہ اصل معلوم ہوتے ہیں۔ ترجمہ کرنے کی مشق اتنی بڑھی ہوئی ہے کہ بڑی تیزی سے ترجمہ کرتے چلے جاتے ہیں۔ مسوّدہ میں کہیں کانٹ چھانٹ نہیں ہوتی۔ جو مسوّدہ ہوتا ہے وہی مبیضہ۔ یہ خوبی مجھے بہت کم مترجموں میں نظر آتی ہے۔

ایک دن ترجمہ کر رہے تھے۔ میں پہنچ گیا۔ دیکھ کر مسکرائے۔ کہنے لگے مزدوری کر رہا ہوں۔ ریڈیو بج رہا تھا۔ پکا گانا ہو رہا تھا۔ جب تال سُر کا اتار چڑھاؤ ہوتا تو ان کی آنکھ اور سر بھی اسی اتار چڑھاؤ پر ہلتے۔ میں نے کہا۔ شاہد صاحب! موسیقی کے پس منظر میں ترجمہ ہو رہا ہے۔ کہنے لگے۔ نہیں بھئی یکسوئی لازم کی مشق کر رہا ہوں۔ ایک وقت میں دو کام۔

ہنسی مذاق ان کی فطرت میں شامل ہے۔ میاں بیوی میں بڑے خوشگوار تعلقات ہیں۔ سب کی موجودگی میں بھابی کا مذاق اڑاتے رہتے ہیں۔ ان کی ہمت شکنی کرتے رہتے ہیں۔ پانچ بچوں کی ماں۔ کوئی بیس سال کے بعد انہیں شوق ہوا کہ وہ بی۔ اے کا امتحان دیں۔ تیاری شروع کر دی۔ امتحان قریب تھا۔ میں پہنچ گیا۔ وہ مجھ سے انگریزی شاعروں کے متعلق کچھ پوچھنے لگیں۔ شاہد صاحب بولے۔ جمیل صاحب! اگر یہ پاس ہو گئیں اور انہیں بی۔ اے کی سند مل گئی تو میں اپنی سند واپس کر دوں گا۔

پاکستان بننے کے بعد جب ترقی پسندوں نے واویلا مچائی اور اپنے سے جدا نظریہ رکھنے والوں کو رجعت پسند اور قدامت پرست قرار دیا تو لاہور کے جلسہ میں ساقی کے خلاف بھی قرارداد پاس ہوئی۔ ساقی اور ادارۂ ساقی کو رجعت پسند قرار دیا۔ ساقی کو رجعت پسند قرار دینے اور بائیکاٹ کرنے میں وہ لوگ بھی شامل تھے جنہیں ساقی اور شاہد صاحب کے توسط یا توسل سے شہرت ملی تھی یا ان کی ادبی حیثیت قائم ہوئی تھی ——— بات کچھ بھی نہ تھی۔ عسکری صاحب بے چارے "جھلکیاں" لکھتے تھے۔ اس میں کھری کھری باتیں کرتے تھے۔ وہ باتیں جو ان کے فارغ میں آتی تھیں

واضح طور پر ایمانداری کے بل بوتے پر لکھ دیتے تھے۔ اور وہ اس فکر میں تھے کہ انتشار اور غبار آلود فضا کو چیر کر صاف اور واضح فکر تک پہنچ سکیں۔ اس زمانے میں ترقی پسندوں کے محدود نظریات بھی آ گئے۔ ادب میں سطحی سیاست، غلط پالیسی اور پروپیگنڈا کا ذکر بھی آیا۔ ترقی پسندوں کو یہ بات ناگوار گذری ساقی مطعون ہوا۔ سب نے لکھنا چھوڑ دیا۔ اس سے سب سے بڑا فائدہ تو یہ ہوا کہ لوگوں پر یہ بات واضح ہو گئی کہ ترقی پسند کس حد تک آمرانہ رویہ رکھتے ہیں اور وہ کیا چاہتے ہیں اور کس انداز سے۔ دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ ترقی پسندوں کو خود اس بات کا احساس ہو گیا کہ ان کے قرارداد پاس کرتے یا کسی رسالہ کا بائیکاٹ کرنے سے رسالہ اشاعت و مقبولیت کے اعتبار سے کس حد تک متاثر ہو سکتا ہے۔ شاہد صاحب کہا کرتے تھے کہ ابھی کچھ دن کی بات ہے سب ڈھنگ پر آجائیں گے۔ میں تو جب بھی ان کو چھاپنے کو تیار تھا اور اب بھی ہوں۔ ساقی کی پالیسی ہمیشہ یہی رہی ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ اور مختلف الخیال قسم کے مضامین اور نظریات پیش کر سکے تاکہ اس تنوع سے ادب صحیح معنی میں ترقی کر سکے۔ مثال کے طور پر انہوں نے ایسے مضامین شائع کئے جو خود ادارہ کے ایک آدمی — عسکری صاحب کے خلاف تھے۔ نہ اس پر ان کو اعتراض تھا اور نہ خود عسکری صاحب کو۔ انتظار حسین نے عسکری کے خلاف سخت مضمون لکھا۔ وہ ساقی میں چھپا اور پسند کیا گیا۔ میں نے خود بارہا عسکری صاحب کی مخالفت باتوں میں کی۔ ادب one way traffic تو ہے نہیں کہ جو ایک گروہ یا جماعت پیش کرے وہی صحیح ہو۔ اور جو راستہ اس نے خیالات کی آمد و رفت کا مقرر کر دیا اس کے علاوہ دوسرا راستہ ہو ہی نہیں سکتا۔ شاہد صاحب کا کہنا تھا کہ ادیب کو کبھی بھی سیاسی یا جماعتی ہرکارہ نہیں بننا چاہئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب ترقی پسندوں کے ہوش و حواس ٹھکانے آئے تو انہوں نے کراچی میں جلسہ کیا اور اس میں کھلے بندوں اپنی غلطی کا اعتراف کر کے اپنے گناہوں سے توبہ کی اور وہی راستہ اختیار کیا جس کا پرچار ساقی ہمیشہ سے کرتا آیا تھا۔ ساقی کی یہ پالیسی دوسروں کو کھٹکتی ہو تو کھٹکا کرے لیکن اس سے ادب کو بہت فائدہ پہنچتا رہا ہے۔ اور ساقی کی اشاعت کا یہی مقصد رہا ہے جسے وہ گزشتہ پچیس سال سے حتی الوسع پورا کر رہا ہے۔ جب ترقی پسند تحریک کا سلسلہ شروع ہوا تھا اور یاران حاشیہ کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ تحریک کیا ہوتی ہے؟ اور ترقی پسندی کس چڑیا کا نام ہے؟ شاہد صاحب نے ہی سب سے پہلے دلی میں "انجمن ترقی پسند مصنفین" قائم کی تھی جس کے وہ ایک زمانہ تک جنرل سکریٹری رہے۔ ساقی نے ترقی پسند ادب کی خوب خوب اشاعت کی۔ ان کی کتابیں شائع کیں۔ ان کے حوصلے بڑھائے۔ ان کی شہرت کو چار چاند لگائے۔ اسے ان کی جوہر شناسی کہئے یا ادب کی خدمت کا صحیح و صحت مند جذبہ۔ کرشن چندر سے شاہد صاحب کہہ رہے تھے، کرشن ناول لکھو میں شائع کروں گا۔ کرشن اس وقت دلی میں تھے۔ انہوں نے کہا شاہد بھائی ایک ہزار روپیہ دے دیجئے۔ کشمیر جا کر لکھوں گا۔ شاہد صاحب نے ایک ہزار روپیہ دے دیا۔ کرشن چندر کشمیر چلے گئے اور وہاں کی صحت مند آب و ہوا میں ایک ناول لکھ لائے جو بعد میں "شکست" کے نام سے شائع ہوا۔ عصمت نے ساقی ہی میں لکھنا شروع کیا اور یہیں سے عصمت، عصمت بنیں۔ ساقی نے جتنے ادیبوں کو پیدا کیا اور ابھارا کسی دوسرے اردو رسالے کو یہ فخر حاصل نہیں ہے اور یہ شاہد صاحب اور ساقی کی وہ خدمت ہے جسے اردو ادب کی تاریخ نظرانداز نہیں کر سکتی۔

وہ واحد شخص ہیں جو نئے اور پرانوں سب کو جانتے ہیں۔ دلی میں ایک دکان تھی —— کتب خانہ علم و ادب —— یہ ہمیشہ ادیبوں کی بیٹھک اور نشست گاہ رہی ہے۔ وصی اشرف اس کے مالک تھے۔ شام کو یہاں ادیبوں کا جمگھٹا رہتا۔ شعر و شاعری ہوتی۔ تبادلۂ خیالات ہوتا۔ اچھی بری باتیں ہوتیں۔ جو باہر سے دلی آتا وہ یہاں آ جاتا اور سب سے مل لیتا۔ سامنے چوک تھا۔ شام ہوئی اور میلہ لگ گیا۔ یہ جگہ دلی کے عوامی کلچر کا مرکز تھی۔ کبوتر باز، مرغ باز، کبابی، قلفی والے، حلیم والے، کباڑی، کپڑے والے، دہی بڑے اور پھلکی والے اور نیواڑی —— کوئی چیز ایسی نہ ہوگی جس کا سودا یہاں نہ ہوتا ہو۔ سامنے اردو بازار تھا اور یہیں یہ کتب خانہ۔ ایک دن وصی اشرف نے کہا۔ شاہد صاحب! اگر آپ ان لوگوں پر لکھ دیں جو کتب خانہ میں آتے اور بیٹھتے تو بڑی مزے دار چیز بن سکتی ہے۔ شاہد صاحب نے کہا۔ آپ فہرست بنا دیجئے۔ جو رہ جائیں گے میں شامل کر لوں گا۔ فہرست جو بنی تو تین سو سے زیادہ افراد تھے —— شاہد صاحب کے علاوہ ان ادیبوں پر دوسرا مکمل کر نہیں لکھ سکتا۔ میں بھی چار سال سے سر پھوڑ رہا ہوں۔ میں نے

یہ بھی کہا کہ ژاں پال سارتر نے بھی ایک طویل سلسلۂ مضامین لکھا ہے، جس میں ان تمام ادیبوں، فن کاروں، شاعروں کا ذکر کیا ہے جن سے اس کی ملاقات ہوئی۔ ضمنی طور پر ادبی تحریکات۔ میلانات اور نظریات پر بھی بحث ہوتی چلی گئی ہے۔ میرے زیادہ اصرار پر انہوں نے کچھ لکھا۔ جو "خریطۂ خیال" کے عنوان سے ساقی میں اور کچھ مختلف عنوانات سے "نقش" "ماہِ نو" وغیرہ میں شائع ہوا۔ اگر وہ اس عنوان سے کچھ لکھیں تو خاصہ کی چیز بن جائے۔ اس طرح سے تیس چالیس سال کے زمانہ کا احاطہ ہو سکتا ہے۔ اور سارے دوادب کے قدیم و جدید رجحانات پر روشنی بھی پڑ سکتی ہے ——— ایک تو خاقی حالات اور پھر شاہد صاحب کا اسلوب ——— واقعی مزا آ جائے ——— دیکھئے اللہ میاں شاہد صاحب کو کب نیکی دیتا ہے۔

شاہد صاحب بڑے کاہل ہیں۔ یہ چیز ان کے وجود کا ناگزیر جزو بن کر رہ گئی ہے۔ کہیں آنے جانے سے انہیں وحشت ہوتی ہے۔ پابندیٔ اوقات کا یہ عالم کہ اگر کہیں پانچ بجے جانا ہے تو وہاں سات بجے پہنچیں گے۔ یا پھر اتنی پابندی ہوگی کہ وقت سے آدھ گھنٹہ پہلے پہنچ جائیں گے۔ انتظامی صلاحیت بالکل نہیں ہے اور یہ شاید اس وجہ سے ہے کہ طبیعت میں مروت اور لحاظ حد درجہ ہے۔ کراچی آئے تو مالی اعتبار سے پریشان رہے۔ قدردانوں نے جب دیکھا تو ریڈیو میں رکھ لیا۔ بڑی قدر کی۔ معقول مشاہرہ دیا۔ زندگی بھر نوکری کی نہیں تھی۔ نوکری کے لئے کچھ اور خوبیاں چاہئیں، وقت کی پابندی ——— مکھن لگانے کی غیر معمولی صلاحیت ——— آنا جانا ——— کھانا پینا ——— اٹھنا بیٹھنا ——— اور نہ جانے کیا کیا۔ یہ باتیں ان میں سرے سے ہی نہیں۔ کچھ ہی دنوں میں وہ لوگ جو قدردان تھے شاکی ہو گئے اور نوکری کا یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔ ایک دن کہنے لگے ——— جمیل صاحب! پاکستان میں ملازمت اور منافقت شاید ہم معنی الفاظ ہیں۔ واقعی نوکری کرنا بڑے دل گردے کا کام ہے۔ یہ کہہ کر بیڑی سلگائی اور زور زور سے کش لگانے لگے۔

ایک دلچسپ واقعہ اور سنئے۔ جب پاکستان بنا اور یہ لاہور آئے تو لوگوں نے بڑی آؤ بھگت کی۔ ایک دن ریڈیو پاکستان لاہور میں بیٹھے حسبِ معمول بیڑی پی رہے تھے۔ ریڈیو لاہور والے ان کی خاطر تواضع سے اپنی عقیدت مندی اور احترام کا ثبوت دے رہے تھے۔ ہمدردی، خلوص اور محبت کی باتیں ہو رہی تھیں۔ ایک خاتون کچھ فاصلہ پر بیٹھی سب کچھ دیکھ رہی تھیں۔ اور سوچ رہی تھیں کہ آخر یہ صاحب ہیں کون کسی سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ شاہد احمد دہلوی ہیں۔ یہ سنتے ہی چونک پڑیں۔ غالباً دورانِ خون تیز ہو گیا تھا۔ دماغ پر استعجاب اور عقیدت کا کوندا لپکا۔ وہ پہلو بدلنے لگیں اور بے ساختہ بولیں اگر یہ بیڑی نہ پیتے ہوتے تو میں ان پر ابھی عاشق ہو جاتی۔ کہنے لگے۔ خدا کا شکر ہے کہ میں کیوپڈ صاحب کی ستم ظریفیوں سے بال بال بچ گیا اور بیڑی میرا (organ of defence) بن گئی۔

شاہد صاحب کو عظیم بیگ چغتائی اور عظیم بیگ چغتائی کو شاہد صاحب سے والہانہ محبت تھی۔ دونوں ایک دوسرے پر جان چھڑکتے تھے۔ یہ "نیرنگِ خیال" کے عروج کا زمانہ تھا۔ اردو داں طبقہ میں اس کا طوطی بول رہا تھا۔ عظیم بیگ اسی میں لکھتے تھے۔ جب ان کا مشہور افسانہ "انگوٹھی کی مصیبت" شائع ہوا تو گھر گھر اس کا چرچا ہوا۔ انہوں نے بھی جو کبھی افسانہ نہیں پڑھتے تھے بڑے شوق اور اشتیاق سے اسے پڑھا۔ اس افسانہ کی اشاعت سے عظیم بیگ کی شہرت ایک دم پھیل گئی۔ شاہد صاحب نے ابھی ساقی نکالا ہی تھا۔ نیا نیا زمانہ تھا۔ مضمون نگار ملتے نہ تھے۔ حجاب امتیاز علی اور فرحت اللہ بیگ لکھنے لگے تھے۔ انہیں فکر ہوئی کہ کسی طرح عظیم بیگ کا پتہ معلوم کریں۔ بہت کوشش کی مگر پتہ معلوم نہ ہو سکا۔ کچھ عرصہ بعد ساقی کی ڈاک میں ایک خط آیا۔ یہ عظیم بیگ کا خط تھا ——— اس میں لکھا تھا کہ میرے پاس سب پرچے آتے ہیں لیکن ساقی نہیں آتا کیا آپ ایک پرچہ نمونے کے طور پر بھیج سکتے ہیں؟ اس خط کے ساتھ ہی دونوں کے تعلقات اتنے تیزی سے بڑھے کہ دانت کاٹی روٹی بن گئے۔ عظیم بیگ دلی آتے تو شاہد صاحب کے ہاں ٹھہرتے۔ شاہد صاحب عظیم بیگ کے ہاں جاتے تو کئی کئی دن رہتے۔ راتوں باتیں کرتے۔ وہ افسانے لکھتے اور شاہد صاحب کو دے دیتے۔ ایک ہفتہ میں ناول لکھ دیتے۔ شاہد صاحب اسے شائع کرنے کے منصوبے بناتے۔ تپ دق کے مریض تھے۔ دس سال بیمار رہے اسی بیماری میں بہترین افسانے لکھے۔ وصول وصیّا اور ہنسی مذاق کرتے رہے۔ اور یونہی مر گئے۔ جب ان کے مرنے کی اطلاع شاہد صاحب کو ملی تو

لیے روسے کہ اگر کوئی قریبی عزیز بھی مرتا تو نہ روتے۔ کئی روز تک سوگ مناتے رہے۔ اب بھی بیگم چغتائی آتی رہتی ہیں اور شاہد صاحب خلوص کے مارے بچھ بچھ جاتے ہیں۔ شاید ان کو دیکھ کر عظیم بیگ یاد آجاتے ہیں۔ دبے زخم ابھر آتے ہیں۔ پرانا دوست یاد آجاتا ہے۔ وہ دوست جو وقت سے پہلے مرگیا۔ جواں مرگ۔

شاہد صاحب ۱۹۰۶ء میں پیدا ہوئے۔ دلّی میں پلے بڑھے۔ بچپن جوانی وہیں گذرا۔ بال سفید ہوئے تو پاکستان آگئے۔ ۱۹۴۸ء سے پیر الٰہی بخش کالونی میں مقیم ہیں۔ یہیں ساقی کا دفتر ہے۔ وضع وہی ہے جو دلّی میں تھی۔ دلّی میں سکون تھا۔ آسودگی تھی۔ کراچی میں نہ سکون ہے نہ آسودگی۔ بڑا کنبہ ہے پیٹ پالنے کے لیے اپنی ساری صلاحیتوں کو وضعداری کے ساتھ بروئے کار لاتے ہیں۔ کبھی گا کر کماتے ہیں۔ کبھی لکھ کر۔ زمانے کی نیرنگیاں ہیں۔ سدا زمانہ ایک سا نہیں رہتا۔ اب وہ ہیں اور ریڈیو پاکستان ہے گذر رہی ہے اور ایک ایسے شخص کو دیکھیں جو ڈھیلی ڈھالی شیروانی پہنے جس کا ایک یا دو بٹن لگے ہوں، سیاہ رنگ ہو۔ آنکھوں پر چشمہ ہو۔ بیڑی منہ میں ہو۔ سر پر سیاہ یا گہرے کتھئی رنگ کی جناح کیپ ہو۔ ذرا دائیں طرف کو جھکی ہوئی، بائیں طرف سے اٹھی ہوئی، اور وہ شخص کسی کا بازو پکڑے یا کندھے پر ہاتھ رکھے چشمہ میں سے جھانکتی ہوئی چمکدار آنکھوں سے سامنے دیکھتے ہوئے، چھوٹی مہری کا پاجامہ پہنے جس کے پائنچے کی مہری کے ڈورے نکلے ہوں اور ہلکا سا کشیدہ کاری کا جال بنا ہو۔ نیو کٹ کا جوتا ہو تو سمجھ لیجئے کہ شاہد احمد دہلوی ہیں ——— دلچسپ انسان، فاضل مدیر، بہترین مترجم، صاحب زبان، دلّی والے۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

طرح نہیں جانتا تھا۔ ایک اُردو شعر پیش کیا اور اس نے فرانسیسی میں جو اس کا ترجمہ کیا ہے پڑھا۔ فرانسیسی سے کل حاضرین واقف نہ تھے اس لئے ذرا سی کی عبارت کو اردو شعر میں منتقل کرنا ضروری تھا، لیکن سوء اتفاق سے ایک معمولی سے لفظ کے معنی اس وقت یاد نہ تھے۔ میں نے کلیم الدین احمد صاحب کی طرف رجوع کیا لیکن انہوں نے نہ تو اس کے معنی بتائے اور نہ یہ کہا کہ مجھے معلوم نہیں۔ دوسرا واقعہ علی گڑھ کا ہے جو میں نے ایک معتبر راوی سے سُنا ہے۔ اپنی پہلی اشاعت کے بعد ان کا علی گڑھ جانا ہوا تھا اور وہاں رشید احمد صدیقی صاحب نے انہیں چائے پر مدعو کیا تھا۔ اُس دفعہ پر کچھ اور لوگ بھی موجود تھے اور ان سے ان کی کتاب کے متعلق سوال کئے گئے تھے مگر جواب دینا درکنار، انہوں نے ٹالنے کی بھی کوشش نہ کی تھی۔

ایسے لوگ بہت ہیں جو قلم پر تو قدرت رکھتے ہیں لیکن ان کی زبان ان کے اختیار میں نہیں۔ اس لئے نجی کی صحبت ہو یا عام مجمع وہ خاموشی ہی میں اپنی نجات سمجھتے ہیں۔ ایسے لوگ بھی کم نہیں جو نجی کی صحبتوں میں خوب چہکتے ہیں لیکن عام مجمع کا رعب یا تو انہیں قوتِ گویائی سے بالکل محروم کر دیتا ہے یا اس کی وجہ سے ان کا دماغی توازن اس قدر درہم برہم ہو جاتا ہے کہ اپنے خیالات کو منظم طور پر پیش نہیں کر سکتے۔ کلیم الدین احمد صاحب کا معاملہ بالکل جداگانہ ہے۔ اپنے فرائضِ منصبی کی انجام دہی میں انہیں مجمع سے خطاب کرنا اور مباحثوں میں شریک ہونا پڑتا ہے۔ سید حسن عسکری صاحب کا بیان ہے کہ بعض ایسے مواقع پر بھی انہیں تقریر کرنا پڑی ہے جب وہ اس کے لئے بالکل تیار نہ تھے۔ اور انہوں نے اپنے خیالات کو سلجھے ہوئے انداز اور شستہ زبان میں پیش کیا تھا۔ میں نے اصلی زندگی میں ان کا نظیر نہیں دیکھا۔ دُنیائے افسانہ میں آرنلڈ بنٹ کی مخلوق ذہنی لیڈی مسولم ان سے مشابہ ہے۔ بنٹ نے اس کے متعلق لکھا ہے:۔

"It was not that Lady Masulam was tongue tied, nor that She was impolite; it was merely that with excellent calmness She did not talk, if anybody handed her a Subject, She just dropped it, The floor around her was strewn with subjects".

کلیم الدین صاحب کم سخن ہی نہیں کم آمیز اور دیر آشنا بھی ہیں۔ سید حسن عسکری صاحب پٹنہ کالج کے ایم۔ اے کلاس میں اس وقت داخل ہوئے ہیں جب مقدم الذکر کا متعلم کی حیثیت سے وہاں آخری سال تھا۔ سید صاحب کا بیان ہے کہ دوستی تو خارج از بحث ہے فضل الرحمٰن کے سوا جو اُن کے ہم جماعت تھے اور جن سے ان کے گہرے تعلقات تھے۔ کسی طالب علم سے وہ کبھی بات چیت بھی نہیں کرتے تھے۔ میرے چھوٹے بھائی قاضی محمد فرید کیمبرج میں ان کے ہم عصر تھے، وہ کہتے ہیں کہ وہاں بہت کم لوگوں سے ان کا ملنا جلنا تھا، اور مطالعہ ان کا واحد شغل تھا۔

کلیم الدین احمد صاحب نئی بات صرف اس لئے تو نہیں کہتے کہ وہ نئے ہیں، لیکن اگر کوئی ایسی بات کہنا چاہتے ہیں تو یہ نہیں دیکھتے کہ پیچھے آنے والوں کی ایک جماعت موجود ہے یا نہیں۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں کھلم کھلا کہتے ہیں۔ اور طنز ہے خواہ منفی ہو یا جلی بہت کم کام لیتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ تنقیدی مباحث میں ایسے الفاظ استعمال ہوتے ہیں جن کے معانی متعین ہیں۔ مبالغے سے بھی وہ بچنا چاہتے ہیں۔ لیکن ایک آدھ جگہ ان سے خود اس کا ارتکاب ہوا ہے۔ ان کی کتاب "اُردو تنقید پر ایک نظر" کے افتتاحی جملے ہیں:۔

"اُردو میں تنقید کا وجود محض فرضی ہے۔ یہ معشوق کی موہوم کمر ہے یا اقلیدس کا خیالی نقطہ"

اُردو میں اعلیٰ درجے کی تنقید مفقود سہی، مگر تنقید کے وجود سے کس طرح انکار کیا جا سکتا ہے؟ ان کی تحریروں میں کہیں کہیں تحکم اور تضاد بھی ملتا ہے لیکن اس وقت مثالیں پیش کرنے سے قاصر ہوں۔ وہ بھولے کو بُرا نہ کہنا شہرِ ہاد کی طرح اچھوں سے ظلم کا مترادف سمجھتے ہیں۔ اور اس سے جو نتائج نکل سکتے ہیں، ان سے

ـــه میں نے سُنا ہے کہ جس زمانے میں ڈاکٹر سچدانند سنہا پٹنہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے انہوں نے کلیم الدین احمد صاحب سے فرمائش کی تھی کہ اقبال پر جو ان کی کتاب ہے اس کا دیباچہ [illegible] مگر اس طرح کہ وہ ان کے معتوبین میں شامل ہو گئے بعض اصحاب اس سے منکر ہیں۔ مجھے خود کلیم الدین احمد صاحب سے اس کے متعلق دریافت کرنے کا موقع نہیں ملا۔

بدھواہیں ۔ اُنہیں اپنی ناقد انہ رائیوں پر کامل اعتماد ہے اور مُخالف سے نہیں ڈرتے ۔ ان کے خلاف جو کچھ لکھا جاتا ہے وہ عموماً اس کا جواب نہیں دیتے ۔ لیکن اس قاعدے کا استثنا بھی ہے ۔ رسالۂ اُردو میں ان کی پہلی کتاب پر جو ایک غیر ذمہ دارانہ تبصرہ نکلا تھا ۔ اُنہوں نے "تنقید یا استہزا" کے عنوان سے اس کا مسکت جواب دیا تھا ۔ ایک ایماندار نقاد کو تعف نس (اس انگریزی لفظ کا اردو بدل اس وقت ذہن میں نہیں) کی بڑی ضرورت ہے ۔ ان میں اس کی کمی نہیں لیکن بعض امور میں وہ بڑے ذکی الحس واقع ہوئے ہیں ۔ "معاصر" کے ابتدائی دور میں ان کی نظمیں اس رسالہ[1] میں شائع ہوا کرتی تھیں ۔ سرور صاحب نے ان پر اعتراض کیے ۔ کلیم الدین احمد نے ان کا جواب دیا ۔ لیکن اعتراضات کو تسلیم نہ کرنے کے باوجود وہ دن اور آج کا دن ان کا ایک مصرع بھی منظر عام پر نہیں آیا ۔ لکھ کر رکھ چھوڑی ہوں تو اور بات ہے ۔ نقاد کی حیثیت سے وہ بڑے سخت گیر ہیں ۔ لیکن جہاں تک میرا علم اور مشاہدہ ہے عملی زندگی میں بڑے نرم ہیں ۔ "معاصر" کے اڈیٹر کی حیثیت سے بھی وہ کبھی کبھی ایسی نظم و نثر شائع کر دیا کرتے تھے جو کسی طرح ایک اچھے رسالے میں شمول کے لائق نہ تھی ۔ میں نے اس پر اعتراض بھی کیا تھا ، مگر وہ تشفی بخش جواب نہ دے سکے ۔

کروچے کی طرح کلیم الدین احمد صاحب کا بھی یہ عقیدہ ہے کہ ذہن انسانی کی تمام سرگرمیوں میں شاعری سب سے بلند درجہ رکھتی ہے ۔ فرائیڈ کے متعلق ان کا خیال ہے کہ اس نے "کچھ کام کی باتیں بتائی ہیں لیکن ادب کو سمجھنے یا تنقید پر عملا کرنے میں اس کے نظریوں سے زیادہ مدد نہیں ملتی" ۔ مارکسیت کی نسبت ان کی رائے ہے کہ "اس کی بنیاد ہیگل اور خواجہ پارخ کے متضاد فلسفوں پر ہے ۔ یہ فلسفہ ہے تو ادھورا ، کچا اور مانگا ہوا ۔ تاریخ ہے تو من مانی اور خیالی ۔ سائنس ہے تو غیر سائنٹیفک"

کلیم الدین احمد صاحب کو وہابی تحریک سے بڑی دلچسپی ہے اور اس کے متعلق بہت کچھ مواد انہوں نے فراہم کیا ہے ۔ میں ان کے مذہبی عقائد کے متعلق کچھ لکھنے سے قاصر ہوں لیکن ان کے والد کا شمار کسی طرح اہل حدیث میں نہیں ہو سکتا ۔ ایک بار نہیں بار بار میں نے انہیں یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ قرآن میں سب کچھ جو ایک مسلمان کے لئے ضروری ہے ، موجود ہے ۔ اگر کوئی بات اس میں نہیں تو اس کے یہ معنی ہیں کہ مسلمانوں کو اس کے متعلق کامل آزادی فکر و عمل حاصل ہے ۔

---

[1] یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ کلیم الدین احمد صاحب کسی زمانے میں غزل بھی کہتے تھے ۔ بلکہ ان کی شعر گوئی کا آغاز اسی سے ہوا تھا ۔ کلیم الدین احمد صاحب کو خاندانی شاعر کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا ۔ ان کے والد کا تو مجموعۂ اشعار طبع بھی ہو چکا ہے ۔ حکیم عبد الحمید پریشاں بھی جو ان کے والد کے نانا تھے ، اور جن کے زیر سایہ اُن کے نواسوں نے تربیت پائی تھی ۔ اردو ، فارسی ، عربی میں شعر کہتے تھے ۔ یہ اپنے زمانے کے بڑے نامی طبیب تھے اور سنا گیا ہے کہ سرزمین پٹنہ کے ابتدائی دور میں شاد عظیم آبادی کی نظم و نثر پر انہوں نے بکثرت اعتراض بھی کیے تھے ۔

[2] حکیم عبد الحمید مرحوم کے والد پٹنہ کے نہایت ممتاز اہل حدیث میں تھے ۔ اور گذشتہ صدی میں وہابیوں کے خلاف جو مشہور مقدمہ ہوا تھا اس میں انہیں بھی حبس دوام بعبور دریائے شور کی سزا ملی تھی اور جزیرۂ انڈمان میں انہوں نے وفات پائی تھی ۔ ان کی ساری جائداد بھی جو معتد بہ تھی بطور سزا ضبط کر لی گئی تھی ۔ ممکن ہے کہ اس تحریک سے یہ تعلق دلچسپی کا باعث ہو ۔

سرور صاحب

وقار عظیم

سرور صاحب سے میری پہلی ملاقات ۱۹۳۵ء کے شروع میں ہوئی تھی۔ اس بات کو اب تھوڑے دن بعد تیس برس ہو جائیں گے لیکن تیس برس کی یہ مدت اتنی تیزی سے گذری ہے کہ ۱۹۳۵ء کی وہ باتیں جن کا ذکر میں اس وقت کر رہا ہوں، کل کی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ ممکن ہے اس احساس میں وقت کی ضرب المثل تیز گامی کو بھی دخل ہو، لیکن میرے نزدیک اس کی زیادہ اچھی وجہ یہ ہے کہ جو نقش دل پر اتنی مدت پہلے قائم ہوا تھا، اس کی سادگی میں ایک ایسی کشش تھی جس پر ہزاروں رنگینیاں قربان ہوں۔ یہ وہ زمانہ ہے جب سرور صاحب انگریزی میں ایم۔ اے کر چکنے کے بعد اردو کے ایم۔ اے کا امتحان دے چکے تھے۔ انہیں دنوں علی گڑھ کے شعبۂ اردو میں ایک لکچرار کی اسامی خالی ہوئی تھی اور بہت سے لوگوں کے علاوہ میں اور میرے دوست طالب الہ آبادی بھی اس کے لئے امیدوار تھے اور اسی سلسلہ میں علی گڑھ آئے ہوئے تھے۔ طالب صاحب ابو طالب نقوی صاحب کلکٹر علی گڑھ (ریٹائرڈ چیف کمشنر کراچی) کے بھائی تھے اور ان کے توسل سے معاملات کو آسان بنانے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں اپنے پھوپھی زاد بھائی تجمل حسین انصاری صاحب سب پوسٹ ماسٹر کے یہاں ٹھہرا ہوا تھا۔ ان کی ملاقات خان صاحب کرم احمد صاحب (ریٹائرڈ انسپکٹر ڈاک خانہ جات) سے تھی۔ مجھ سے کہنے لگے کہ "خان صاحب کی یونیورسٹی کے حلقوں میں رسائی ہے، اس لئے چلو تمہیں ان سے ملا دیں، شاید کوئی کام کی بات معلوم ہو۔" میں نے کہا، "چلئے!"

ہم دونوں خان صاحب کی خدمت میں پہنچے تو وہ بڑی محبت اور شفقت سے پیش آئے۔ بھائی صاحب سے ادھر ادھر کی بہت سی باتیں کیں۔ گھر کے ہر چھوٹے بڑے کی خیریت پوچھی اور اس انداز سے تواضع فرمائی جو شرفا اور بزرگوں کے لئے مخصوص تھا۔ تھوڑی دیر بعد یونیورسٹی کی اسامی کا ذکر نکلا۔ خان صاحب بولے "یونیورسٹی کے معاملات سے اب مجھے لگاؤ نہیں رہا۔ اب یہ کام علو میاں نے سنبھال لیا ہے۔ وہ بھی شاید گھر ہی میں ہوں گے۔ میں بلوائے دیتا ہوں۔" نوکر کو آواز دی اور کہا "جا کر علو میاں کو بھیج دو۔" ایک آدھ منٹ کے اندر علو میاں آ گئے۔ پستہ قد اور چھریرے جسم کے ایک گورے چٹے نوجوان، ذہین اور شگفتہ چہرہ، سیدھی سادی وضع، منکسر مزاج۔ یہ آل احمد سرور تھے۔ خان صاحب تعارف کرا کے کسی کام سے اندر چلے گئے۔ سرور صاحب نے بیٹھ کر باتیں شروع کیں اور ایسے بے تکلفی انداز سے شروع کیں کہ منٹوں بلکہ لمحوں میں دنوں، ہفتوں اور مہینوں کی ساری منزلیں طے ہو گئیں۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ میں سرور صاحب کو مدتوں سے جانتا ہوں اور بغیر کسی تکلف اور حجاب کے انہیں ہم راز بنا سکتا ہوں — نہ صرف یہ بلکہ ان سے بہترین رفاقت اور دوست داری کی توقع کر سکتا ہوں۔ یونیورسٹی کے معاملہ پر بھی سادگی اور صفائی سے گفتگو ہوئی۔ مصلحت اور سیاست کے تقاضوں کا ذکر آیا اور جس خاص معاملہ کے سلسلہ میں میں علی گڑھ گیا تھا اس کے ہر پہلو پر باتیں ہوئیں تو مجھے اندازہ اور یقین ہو گیا کہ اس اسامی پر کون لیا جائے گا۔ ایسے ہر فیصلہ پر تہذیب کی جو اداسی [illegible] ہوتی ہے سرور صاحب کی

باتوں سے وہ دور ہو گئی اور میں نتیجہ اور انجام کی طرف سے قطعی بے نیاز ہو گیا۔ ممکن ہے مجھے یہ سوچ کر کوفت ہوتی کہ ناحق الٰہ آباد سے علی گڑھ آکر زیر بار ہوا۔ لیکن ایک اچھے آدمی سے قریب ہونے کا جو موقع ملا تھا، اس نے ہر زیاں اور احساسِ زیاں کی تلافی کر دی۔ سرور صاحب سے تعارف ہی بجائے خود ایک ایسی چیز تھی جو زندگی کے بہت سے مرحلوں میں زادِ راہ بن سکتی ہے۔

میں علی گڑھ سے بہت مطمئن، بلکہ مسرور لوٹا۔ الٰہ آباد آکر پھر پہلے کی طرح زندگی کی کشمکشوں میں گھر گیا۔ علی گڑھ کا سفر اور سرور صاحب سے ملاقات کی یاد بہت جلد ماضیِ بعید کے تصور کی طرح بہت سی چیزوں کے نیچے دب کر رہ گئی۔ اور اسی طرح دو سال گذر گئے۔

دو سال بعد میں نے جون ۱۹۳۴ء میں بی ٹی میں داخلہ لیا۔ اس زمانہ میں سرور صاحب شعبۂ اردو میں لکچرار تھے۔ جو لوگ علی گڑھ کی تعلیمی زندگی سے واقف ہیں، وہ جانتے ہیں کہ بی ٹی میں داخلہ لینے والے علی گڑھ کے روایتی ہنگاموں سے الگ، ایک ایسی دنیا میں رہتے ہیں، جہاں تک دوسروں کی رسائی کم ہوتی ہے اور خود یہاں کے رہنے والوں کو اتنی فرصت نہیں ہوتی کہ آنکھ اٹھا کر بھی کسی طرف دیکھ سکیں۔ چنانچہ علی گڑھ آکر میں اسی ماحول میں ایسا کھو گیا کہ کسی سے ملنے جلنے کی طرف توجہ نہ ہوئی۔ یوں کبھی کبھی رشید صاحب اور سرور صاحب سے ملنے کو جی ضرور چاہتا رہا۔ کبھی کبھی ایسے لوگوں سے اتفاقی ملاقاتیں بھی ضرور ہوتی رہیں۔ جن سے رشید صاحب اور سرور صاحب کی باتیں سننے میں آتی رہیں۔ ان باتوں سے میں نے جو کچھ نتیجہ نکالا وہ یہ تھا کہ سرور صاحب نے زندگی کی جو ذمہ داری سنبھالی ہے، اسے پورے انہماک اور خلوص سے پورا کرنے میں مصروف ہیں۔ انہیں ایک استاد، ایک ادیب اور ایک نقاد کے جو منصب ماحول نے بیک وقت سونپے ہیں ان کی اہمیت کا انہیں پورا پورا احساس ہے اور اس احساس کے بعد وہ پوری سنجیدگی کے ساتھ ہر ایک کا حق ادا کرنے کو اپنا فرض سمجھ رہے ہیں۔ زندگی نے انہیں اپنا ہم سفر بنایا ہے۔ زندگی ایک مرتبہ ہر شخص کو یہ موقع دیتی ہے۔ جسے یہ موقع دیا گیا ہے وہ اس سے فائدہ اٹھائے یا نہ اٹھائے، یہ اس کا اپنا کام ہے۔ سفر شروع کر کے اسے منزل بہ منزل طے کرنا اور کسی آخری منزل تک پہنچانا ہی اچھے راہی کا سب سے بڑا منصب و مقصد ہے۔ لیکن اس منصب اور مقصد کو بہت کم لوگ محسوس کرتے اور پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ سرور صاحب کے متعلق میں نے علی گڑھ کے قیام کے ابتدائی چند مہینوں میں جو کچھ سنا وہ یہی تھا کہ زندگی کے ہم سفر ہو کر سرور صاحب کسی قیمت پر بھی اس سے بچھڑ جانے میں اپنی ہیٹی سمجھتے ہیں۔ انہوں نے طے کیا ہے کہ وہ سفر کی رفاقت کا ایسا حق ادا کریں گے کہ زندگی انہیں اپنا ہم سفر بنا کر پچھتانے کے بجائے مسرور ہو کر فخر محسوس کرے۔

سرور صاحب ان دنوں، اپنے اس سفر کی راہ کو استوار کرنے کی فکر میں تھے۔ وہ زندگی میں اپنے لئے کوئی جگہ بنانے کی کشمکش اور جدوجہد سے دوچار تھے اور اس لئے لازمی طور پر انہیں تصادم سے سابقہ پڑتا تھا۔ لیکن اس تصادم میں انھوں نے کبھی غیر معمولی جوش سے کام لے کر، اپنے حاسدوں کو قلعیں بجانے کا موقع نہیں دیا۔ خلوص، انہماک، محنت، مشقت، اور وسیع النظری کو اپنا ہمدم و دمساز بنا کر اس کام میں مصروف رہے، جو ابھی شروع ہوا تھا۔

بی ٹی کے ابتدائی چند مہینے گزر جانے کے بعد اتفاق سے سرور صاحب کہیں مل گئے۔ وہی دو برس پہلے کی سادگی و شگفتگی اور وہی بے اندازہ خلوص اس مرتبہ اس سادگی میں ایک ہلکا سا نکھار، شگفتگی میں ایک لطیف سی سنجیدگی اور خلوص میں محبت و شفقت کی چاشنی البتہ زیادہ تھی۔ ملتے ہی شکایت کی نہ ملنے کی شکایت کی۔ پھر خود ہی میری وکالت میں، بی ٹی کی مصروفیتوں کا عذر پیش کر دیا۔ اس کے بعد اپنی مصروف زندگی کا ذکر کر کے خود نہ مل سکنے کی معذرت چاہی۔ یونیورسٹی، شعبۂ اردو اور گھر کی باتیں سنائیں اور میرا حال پوچھا۔ لیکن نہ اس پرسشِ حال میں تکلف کا کوئی شائبہ تھا، اور نہ گزشتہ ڈیڑھ برس کی زندگی کے بیان میں کسی قسم کی دنیاداری۔ تھوڑی سی دیر میں بہت سی باتیں ہو گئیں اور ان باتوں نے سرور صاحب کو مجھ سے اور مجھے سرور صاحب سے اور قریب کر دیا۔ مجھے رنج ہو رہا تھا کہ میں نے بی ٹی کی مصروف زندگی کے باوجود سرور صاحب سے اکثر ملنے کا وقت کیوں نہیں نکالا۔

اس کے بعد کئی مہینے میں علی گڑھ میں رہا اور اس دوران میں سرور صاحب سے کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ پڑھنے لکھنے اور سیکھنے کے کام میں ان کا انہماک دیکھ کر میں بہت متاثر ہوا تھا اور مجھ پر یہ ظاہر ہو گیا کہ طالب علموں، استادوں اور یونیورسٹی کے اعلیٰ اور ادنیٰ ہر طبقہ میں ان کے ذکر کا خاص چرچا تھا۔

طالب علموں میں ایک شفیق رہنما، استادوں میں ایک ذہین، شگفتہ طبع اور مخلص رفیق کار اور یونیورسٹی کے ارباب اقتدار میں ایک ہونہار استاد کی حیثیت سے انہیں ایک ایسی جگہ مل رہی تھی جو ان کے دوستوں کے لئے سرمایۂ مسرت اور بعض ہم چشموں کے لئے باعث حسد تھی۔

تقریباً سال بھر علی گڑھ میں رہ کر میں پھر الٰہ آباد آگیا اور چند ہی مہینے بعد میرا تقرر اردو کے استاد کی حیثیت سے جامعہ ملیہ (دہلی) میں ہوگیا۔ یہ بات جون یا جولائی ۱۹۴۳ء کی ہے۔ تقریباً اسی زمانہ میں میرے خسر عابد حسین خاں صاحب پنشن لے کر علی گڑھ آگئے اور وہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ ان کے علی گڑھ کے قیام نے مجھے اور علی گڑھ کو ایک دوسرے سے بہت قریب کر دیا۔ ہر چھوٹی بڑی چھٹی علی گڑھ میں گذرنے لگی اور اس طرح فرصت کے نسبتاً طویل زمانوں میں مجھے سرور صاحب سے زیادہ ملنے اور ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو زیادہ قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ جولائی ۱۹۴۳ء میں جب جامعہ میں گرمی کی چھٹیاں ہوئیں تو میں یہ زمانہ گذارنے کے لئے علی گڑھ آیا۔ شروع کے دو تین دن گھر جانے میں لگے۔ ایک دن شام کو سرور صاحب کے گھر پہنچا۔ دستک دی، ایک بچہ باہر آیا۔ اسے اپنا نام بتایا۔ وہ اندر گیا اور چند لمحے میں سرور صاحب ہمہ تن تبسم و شگفتگی بنے ہوئے باہر نکلے۔ آتے ہی نہ جانے کتنے سوال کر ڈالے۔ سوال جواب کے اس سارے مرحلہ میں جس بات نے انہیں سب سے زیادہ مسرور کیا وہ یہ خبر تھی کہ میں دو مہینے کی چھٹیاں علی گڑھ میں بسر کروں گا۔ یہ باتیں کھڑے کھڑے ہوئیں۔ پھر بیٹھک کھولی گئی۔ سرور صاحب کی بیٹھک ایک کشادہ فراخ کمرہ تھا۔ لیکن ہر طرح کے تکلف سے بے نیاز۔ صرف چند کرسیاں اور ایک بڑی سی میز اس کا کل سامان آرائش تھا۔ میز پر کچھ اردو اور کچھ انگریزی کی کتابیں اور بعض تازہ رسالے پڑے ہوئے تھے۔ ہم بے تکلفی سے کرسی پر بیٹھ گئے۔ بے تکلفی کچھ اس انداز کی جیسے کرسی پر بیٹھ جانے اور باتیں کرنے کے علاوہ زندگی کا اور کوئی مقصد نہیں۔ اس صحبت میں پان کھائے گئے، حقہ پیا گیا اور بہن باتیں کی گئیں۔ طرح طرح کی باتیں۔ لیکن ان میں زیادہ تر باتیں میری نئی زندگی کے متعلق تھیں۔ سرور صاحب بڑی محبت سے میرے نئے ماحول کے بارے میں باتیں پوچھتے اور مشورے دیتے رہے۔ رات گئے دیر تک بیٹھ کر رخصت ہوا تو ایک اور پان پیش کرتے ہوئے سرور صاحب نے کہا۔ "اچھا ہے، دو مہینے خوب گپ رہے گی۔" اور سچ مچ دو مہینے خوب گپ رہی۔

کبھی میں سرور صاحب کے گھر پہنچ جاتا، کبھی وہ میرے گھر آجاتے۔ کبھی ہم دونوں شام کی سیر کو ایک ساتھ جاتے اور کبھی شعبۂ اردو میں ملاقات رہتی۔ ان ساری ملاقاتوں میں خوب گپ رہتی۔ "گپ" کا مفہوم کتنا وسیع ہے اور اس میں کیا کیا چیزیں شامل کی جاسکتی ہیں، اس کا اندازہ مجھے پہلے سرور صاحب کی ان ملاقاتوں میں ہوا اور اس کے بعد شعبۂ اردو کے اسٹاف روم کی غیر رسمی نشستوں میں۔ اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے مسکرا کر، ہنس کر اور قہقہے لگا لگا کر سرور صاحب جن موضوعات پر گپ کرتے تھے ان میں گھریلو باتوں کے علاوہ یونیورسٹی کی سیاست، ادب و شعر کے رجحانات، نئی تصانیف، رسالوں کے تازہ نمبر اور ان رسالوں میں چھپنے والے خاص خاص مضامین، ادب، سیاست اور یونیورسٹی کی شخصیتیں، دوست و دشمن اور ان کے کردار و روزمرہ اعمال جیسی چیزیں شامل ہوتی تھیں۔ اس گپ میں سرور صاحب کی شخصیت اور کردار کے جتنے پہلو میرے سامنے آتے، ان کی عزت اور محبت دل میں زیادہ ہوتی۔

سرور صاحب سے کسی موضوع پر بھی گفتگو ہوتی، وہ جذبات کی رو میں ہرگز نہ بہتے۔ بات کہتے تو اس میں شگفتگی و توازن کو ہاتھ سے نہ جانے دیتے۔ دوست داری سے زیادہ، غیر جانب داری ان کے میزانِ عدل کی زینت ہوتی۔ اپنا نقطۂ نظر پیش کرتے تو دوسرے کے نقطۂ نظر کا احترام ملحوظ خاطر رہتا۔ جو بات کہتے اس میں اعتماد کے باوجود لچک ہوتی۔ کسی کے حق میں کہتے تو اس میں جانب داری کا شائبہ نہ ہوتا، کسی کے خلاف کچھ کہنا ہوتا تو اس طرح کہتے کہ اخلاص و صداقت و شگفتگی کی بدولت اس میں ذرہ برابر تلخی نہ پیدا ہوتی۔ اچھائی خواہ کسی میں ہو اس کا اعتراف ان کا مسلک ہوتا۔ برائی کی پردہ دری انہیں مسرور نہ کرتی۔ لیکن جب اس کا ذکر آجاتا تو اس کی تنقید اس طرح کرتے کہ اندھیرے اجالے میں صاف فرق دکھائی دیتا۔

سرور صاحب کو اب شعبۂ اردو میں آئے کئی سال ہوگئے تھے۔ دو برس پہلے تک میں نے انہیں قدیم جانشینی اور اپنے لئے کوئی راہ متعین کرنے کی جس کشمکش میں مختلف اور مصروف دیکھا تھا، اس میں اب پہلے کی سی شدت باقی نہیں رہی تھی۔ اس کی وجہ یہ ہرگز نہیں تھی کہ انہیں اب اس مقصد کی اہمیت کا احساس

نہیں رہا تھا۔ احساس تھا اور غالباً پہلے سے کچھ زیادہ ہی تھا۔ لیکن اتنی مدت کے انہماک اور اس انہماک کی وجہ سے جو کامیابی حاصل ہوئی تھی اس نے انہیں اعتماد کی قوت پیدا کر دی تھی۔ اب ماحول پر ان کی گرفت پہلے سے زیادہ مضبوط تھی۔ اول اول اس میں رنگ میں رنگنے کے بجائے آہستہ آہستہ ان کی شخصیت کا رنگ قبول کر رہا تھا۔ اور جوں جوں ماحول اور شخصیت میں مفاہمت اور ہم آہنگی زیادہ ہوتی گئی سرور صاحب اپنے کام کو ایک پر مشقت مشغلہ سمجھنے کے بجائے اس میں زیادہ لذت محسوس کر رہے تھے۔ تنقید و تدریس کو انہوں نے اپنی زندگی کا مشغلہ سمجھ کر اختیار کیا تھا۔ ان دونوں کاموں سے ان کے مزاج کو بڑی فطری مناسبت تھی۔ اس میں سرور صاحب کی محنت، انہماک اور خلوص شامل ہوا تو دونوں کام ان کے لئے اور اس سے کچھ زیادہ دوسروں کے لئے بھی [illegible] اور کے [illegible] ایک لطیف [illegible] شروع شروع میں انہیں تدریس و تنقید کی ضرورت تھی۔ اب کچھ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ تدریس اور تنقید دونوں کو سرور صاحب کی سخت ضرورت ہے۔ دونوں ان کی منت پذیر ہیں اور دونوں کا مستقبل ان کے نقوش تاباں سے درخشاں بننے والا ہے۔ گرد و پیش کے [illegible] نے سرور صاحب پر یہ بات پوری طرح روشن اور واضح کر دی تھی۔ سرور صاحب کی جگہ کوئی اور ہوتا تو یہ نشہ اسے بدمست کرنے کے لئے کافی تھا لیکن اس اہم حقیقت کے علم نے انہیں زیادہ محتاط، زیادہ معتبر اور زیادہ سنجیدہ بنا دیا۔ مگر اس احتیاط اور سنجیدگی نے ان کی شخصیت کی فطری شگفتگی میں ذرا بھی کمی نہیں آنے دی۔ احتیاط اور اعتبار سے ان کی شگفتگی زیادہ ابھری، زیادہ نکھر گئی۔ ان کے عام انداز میں بے نیازی کی جو کیفیت مجھے پہلی ہی ملاقات میں نظر آئی تھی اور جس پر کچھ لا ابالی پن کا شبہ کر کے ایک خوشی سی محسوس ہوئی تھی۔ اب ذرا زیادہ ہو رہی تھی۔ بظاہر ان دونوں باتوں کا ایک ساتھ تقاضا ہے یہ بات ذرا مشکل سے سمجھ میں آتی ہے کہ ایک [illegible] اور نقاد، ایک [illegible] متوازن، دیانت دار اور غیر جانبدار بھی ہو اور ساتھ ہی شگفتہ طبیعت اور دوست دار اور دوست نواز بھی۔ لیکن سرور صاحب کی شخصیت کا یہ تضاد ایک ایسی کشش پیدا کرتا ہے جو انہیں دوستوں میں محبوب اور دشمنوں کے لئے قابل قبول بناتی ہے۔

علی گڑھ کی زندگی کے جس دور کا میں ذکر کر رہا ہوں اس میں سرور صاحب آہستہ آہستہ علی گڑھ کی متنوع زندگی کے مختلف شعبوں میں اس حد تک دخیل ہو چکے تھے کہ جس جگہ وہ نہ ہوں وہاں ان کی کمی محسوس کی جاتی تھی۔ اور سچ ان کے وجود کے بغیر اب ہر محفل سونی سونی سی لگتی تھی۔ اسٹاف کلب میں ٹینس اور تاش کی رونق [illegible] ہی سے وابستہ تھی۔ یونین کے ہنگاموں اور میگزین کے کارناموں میں سرور صاحب جان ڈالتے تھے۔ دوستوں کی محفل میں ان کے قہقہے اور لطیفے [illegible] روم میں گپ کے ساتھ پان کی گلوری۔ علی گڑھ کے مختلف حلقوں کا موضوع بنتے جا رہے تھے۔ اور شعبۂ اردو کے تمام کاروبار کی روح رواں سرور صاحب ہو گئے تھے۔

سرور صاحب ادب اور تنقید میں ارضیت (THIS WORLDLINESS) کے اصول کو بنیادی مانتے ہیں۔ ان کا منشا یہ ہے کہ ادیب اور نقاد کا منصب یہ ہے کہ وہ اپنی دنیا کے حدود میں رہ کر اسی زندگی کی سطح کو اپنے فکر، تخیل اور تخلیق کی سطح سمجھیں تو اس سے ادب کو اونچا اٹھنا ہے اور زندگی کو بھی۔ ادب، انسان، انسانیت اور وسیع تر زندگی کی خدمت سب سے بڑا اسی سطح پر رہ کر انجام دے سکتا ہے۔ ایک استاد کی حیثیت سے انہوں نے ہمیشہ اسی پر زور، اسی اصول کی تبلیغ کی ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اپنی روزمرہ زندگی میں سرور صاحب خود بھی اسی "ارضی سطح" پر رہنے میں عافیت جانتے ہیں۔ وہ فکر، تخیل اور اخلاق کی بلندی کے پیرو ہونے کے باوجود بہت اونچا اڑنے اور بہت تیز چلنے کے قائل نہیں۔ محض اونچا اڑنے اور تیز چلنے کی عادت انسان کو اس کی منزل سے بیگانہ بھی رکھتی ہے۔ اور اس کی جادہ کا زیاں ہوتی ہے۔ منزل منصور ہمیشہ ان کے قدم چومتی ہے جو رک رک کر، ٹھہر ٹھہر کر، اعتماد اور استقلال کے ساتھ منزل کی طرف بڑھتے ہیں۔ [illegible] سرور صاحب کو کبھی تیز چلتے نہیں دیکھا۔ وہ شام کی سیر کے لئے جا رہے ہوں، انہیں سینما دیکھنا ہو، یا وہ کلاس لینے ہو یا کسی جلسے کی صدارت کرنی ہو۔ ان کے چلنے کی رفتار ایک ہی ہوتی ہے جس سے کہ خود وقت کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بن جانے سے بچا سکے۔ انہوں نے اسے اپنا حلقہ بگوش بنا لیا ہے۔ وہ وقت کے ساتھ گھسٹتے گھسٹتے چلنے کے بجائے اس کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر چلتے ہیں۔ وقت سے ان کے مراسم و روابط مجاہدانہ یا نیازمندانہ ہونے کے بجائے دوستانہ بلکہ بے تکلفانہ ہیں اور اس لئے وہ کبھی اس میں کوئی حرج نہیں سمجھتے کہ وقت کی گزرت کو بالکل ڈھیلا چھوڑ دیں۔ اور کبھی پیچھے کی طرف سے بالکل [illegible]

یہی وجہ ہے کہ لوگ کھلے عام اپنے پیغام دیں۔ اس بے نیازانہ انداز نظر کے باوجود وقت نے انہیں یہ انعام دیا ہے کہ وہ جب چاہیں اور جس حال میں چاہیں اپنی مدد حاجت کے لئے طلب کر سکتے ہیں۔ وقت بے چون و چرا ان کے پاس آتا اور بے چون و چرا ان کی خدمت انجام دیتا ہے۔

سرور صاحب کی اس نرم اور دھیمی رفتار کو بعض لوگوں نے آسائش پسندی، تن آسانی اور سہل انگاری کہا ہے۔ اس میں شبہ بھی نہیں کہ سرور صاحب کا عام انداز زندگی دیکھنے والوں کو ان کے متعلق اسی طرح کے نتیجے مرتب کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ لیکن ایک دوسری چیز جس تک عام نظر نہیں پہنچی یہ ہے کہ سرور صاحب کو اس بات پر پوری قدرت حاصل ہے کہ جب کوئی کام آپڑے تو وہ اس تن آسانی کو ترک کر کے ہمہ تن مصروف ہو جاتے ہیں اور اسے اسی طرح انجام دیتے ہیں جیسا کہ اس کا حق ہے۔

سرور صاحب سے آدمی جوں جوں زیادہ قریب ہوتا جائے ان کے مزاج کی نرمی اور دھیمے پن کا نقش اس کے دل پر گہرا ہوتا جاتا ہے لیکن یہ جاننے کے لئے کہ اس دھیمے پن کے پیچھے ایک طوفان موجزن ہے ان سے زیادہ قریب ہونے کی ضرورت پڑتی ہے —— اور پھر یہ اندازہ لگانے کے لئے کہ یہ طوفان کشتیوں کو ڈبونے کے بجائے انہیں ساحل سے لگاتا پا رہا ہے۔ ان سے قریب تر ہونا ضروری ہے۔ سرور صاحب کا زندگی تخریبی عناصر سے یکسر خالی ہے اور اس خاص معاملہ میں بھی ان کے کردار میں ایک نمایاں تضاد موجود ہے۔ نہ وہ انقلاب کے ساتھ (بشرطیکہ وہ ہلکا پھلکا ہی چلنے سے گریز کرتے) اور گھبراتے ہیں اور نہ کسی سازش میں شریک ہوسکتے ہیں۔ لیکن انقلاب اور سازش کی ہمنوائی کرتے وقت یہ بات ہمیشہ ان کے پیش نظر رہتی ہے کہ اس انقلاب یا سازش کا مقصد تخریب تو نہیں۔ اپنے نتیجے کی غرض سے جانے والے انقلاب اور تعمیر کا جذبہ رکھنے والی سازشوں میں ہم نے سرور صاحب کو ہمیشہ پیش پیش دیکھا ہے۔ اور اس طرح دیکھا ہے کہ نہ ان کے پائے استقلال میں جنبش تھی اور نہ چہرے کے تبسم اور شگفتگی میں کمی۔

سرور صاحب نے علی گڑھ میں رہ کر اپنی دلچسپیوں کے دائرہ کو جتنا زیادہ وسیع بنایا تھا۔ اس کا لازمی نتیجہ تھا کہ ان کی دوست نوازی کا حلقہ بھی وسیع ہو۔ انہیں ہر طرح کے لوگوں سے سابقہ پڑتا تھا۔ اچھے بھی اور برے بھی، بہت اچھے بھی اور بہت برے بھی۔ ان میں سے کچھ ایسے تھے جو مختلف معاملات میں ان کے ہم مذاق اور ہم مسلک تھے۔ ان سے ان کا اتنا قریبی تعلق ظاہر ہے کہ زیادہ ہونا چاہیے تھا۔ وہ اس خاص حلقے میں اٹھتے بیٹھتے ملتے جلتے اور ان کی خوشیوں اور غموں میں ان کے برابر کے شریک ہوتے۔ اس حلقہ کے لوگوں سے بے لوث اور بے غرض اخلاص و محبت کا رشتہ قائم کرتے لیکن اس مخلصانہ تعلق میں بھی انہوں نے ہمیشہ جس چیز کو ہر حال میں سامنے رکھا یہ تھی کہ دوستوں کی خوبیوں کا بڑی فراخ دلی سے اعتراف کیا، اور ان کی کمزوریوں کی بے باک نکتہ چینی کی۔ صحیح نکتہ چینی کو سرور صاحب اچھی دوستی کی نشانی سمجھتے ہیں۔ دوستی کے پردے میں دشمنی کرنے کو انہوں نے کبھی اپنا مسلک نہیں بنایا، اس لئے کہ اس سے بہت سے اندیشوں اور خطروں کے دروازے کھلتے ہیں۔ سرور صاحب دوستوں سے مسرور تو ہوتے ہیں، مرعوب نہیں ہوتے۔ ان کے ظاہر میں باطن کی جھلک دیکھ لینے کے بجائے بھرپور نظر سے کام لے کر ہر ایک نیک و بد کا سراغ لگاتے ہیں، اور اس طرح راز داں شناسا بن کر وہ دوسروں کی خدمت کر کے خوش ہوتے ہیں۔

جس طرح زندگی میں سرور صاحب نے مردم شناسی اور قدر دانی کو اپنا مسلک بنایا ہے اسی طرح تنقید میں وہ ادب، نقاد، ادیب اور شاعر کے صحیح مرتبہ کا اندازہ، تعین اور اعتراف ہے۔ اسی لئے ادب میں جہاں کہیں انہوں نے یہ محسوس کیا ہے کہ کسی ادیب یا فنکار کو زمانے نے اس کا پورا حق نہیں دیا انہوں نے اس کی پوری حمایت کی ہے۔ کوتاہ نظروں اور تنگ نظری کرنے والوں کی کوتاہیوں کا پوری طرح جائزہ لے کر بڑی جرأت اور قوت سے اپنے موکل کی وکالت کی ہے، اور عموماً اس طرح کی ہے کہ حقدار کو اس کا حق مل گیا ہے۔ اس وکالت میں منطقی تجزیہ، متوازن لہجہ اور شیریں و دلنشیں انداز بیان ان کے ممد و معاون رہے ہیں۔

منطقی تجزیہ، فکر و احساس کا توازن اور انداز کی شیریں دلنشینی سرور صاحب کی شخصیت اور کردار کے اہم اجزا ہیں۔ ایک نقاد کی حیثیت سے بھی انہیں جو مرتبہ و مقام حاصل ہوا ہے اس میں ان مختلف چیزوں کا بڑا گہرا اثر ہے۔ لیکن جس چیز نے انہیں ہر طبقہ کا محبوب نقاد بنا دیا ہے وہ ان کا وہ تخلیقی مسلک ہے جس میں بیک وقت مختلف اور متضاد تصورات و نظریات کو ایک جان دو قالب بنا لینے کی صلاحیت ہے۔ سرور صاحب

کی زندگی، ان کا اندازِ حیات، ان کے اسالیبِ فکر و تخیل اور ان سب سے بڑھ کر ان کے مزاج کی تشکیل میں قدیم و جدید اور مشرق و مغرب کا جو حسین اور شیریں امتزاج ہے، وہ اس دور کے کسی اور ادیب اور نقاد کے یہاں نہیں۔ یوں تو اس دور میں ادب اور تنقید میں ایسے لکھنے والوں کی کمی نہیں جن کی نظر مشرقی ادب اور شاعری پر بھی خاصی گہری ہے اور جنہوں نے مغربی تنقید سے بھی پورا استفادہ کیا ہے۔ لیکن ان میں اور سرور صاحب میں سب سے بڑا فرق یہ ہے کہ دوسرے مشرقی اندازِ تخیل اور مغربی طرزِ فکر کو پوری طرح آپس میں سمو نہیں سکے اور سرور صاحب نے ان دونوں چیزوں کو شیر و شکر کر کے ان کے امتزاج سے ایک ایسا مرکب تیار کیا ہے جو بدمذاق کے کام و دہن کے لئے لذت و سرور کا سرمایہ بہم پہنچاتا ہے۔ سرور اس طرح اردو کے واحد نقاد ہیں جن کی تحریریں "ادب برائے ادب" اور "ادب برائے زندگی" دونوں کی حامل اور ترجمان ہیں۔ انہوں نے ادب کو سرمایۂ لذت و سرور سمجھتے ہوئے بھی محض ذہنی عیاشی بننے سے باز رکھا ہے۔ وہ اشتراکی نہ ہونے کے باوجود زندگی کی مادیت اور ادب کے گہرے رشتے کے قائل اور اس کے پرجوش مبلغ ہیں جس طرح سرور کی قدامت پسندی زندگی پر جدت اور تجربے کے دروازے بند نہیں کرتی اسی طرح ان کی ترقی پسندی ہر طرح کے ہر تجربہ کو کہہ کر ادب کی بارگاہ میں اذن باریابی دینے کے خلاف ہے۔

سرور صاحب نے ادب اور تنقید کی دنیا میں اپنی زندگی کا خاصا طویل عرصہ گزارنے کے باوجود صرف چند مضامین لکھے ہیں۔ لیکن ان تھوڑے سے مضامین کی مجموعی اہمیت و افادیت اس سے کئی مستقل تصنیفات سے کم نہیں کہ ان میں سے اکثر مضمون سرور صاحب کے علم، ان کے غور و فکر اور منطق و شعور میں رچ بس کر منظرِ عام پر آئے ہیں۔ انہوں نے زندگی کو کبھی کوئی تلخ و ناگوار حقیقت نہیں سمجھا بلکہ اسے متحرک، بامعنی، بامقصد اور حسین شے سمجھ کر برابر اس سے اپنا رشتہ استوار رکھا ہے۔ اور اپنے تنقیدی رنگ کے مدھم سرور صاحب نے ہمیشہ اخلاص و محبت کو اپنا ہمدم و دمساز بنایا ہے۔ اسی لئے اپنے ادیب اور اپنی تنقید کو بھی انہوں نے کبھی بے مقصد نہیں ہونے دیا۔ ادب کے داغوں کو دھونا، اس کی تاریک راہوں کو روشن کرنا، کھوٹے اور کھرے کو الگ کر کے رکھنا، ان کا تنقیدی مسلک ہے۔ انہوں نے اجتماعی حیثیت سے ادب میں ماضی اور حال کے تعلق کو ہموار اور مضبوط بنانے اور انفرادی نقطۂ نظر سے حقدار کو اس کا حق دلانے کی جو خدمت انجام دی ہے وہ ہماری تنقید کی تاریخ میں منفرد ہے۔ اجتماعی زندگی کے مختلف شعبوں میں ان کے چھوٹوں بڑوں نے معاملات کو سلجھانے اور سمجھوتے کرانے کی جو قابلِ رشک خدمت ان سے لی ہے، ادب میں سرور صاحب نے وہ خود اختیار کی ہے اور اسے کمالِ حسن و خوبی سے انجام دیا ہے۔

سرور صاحب کی تدریسی اور ادبی زندگی کی عملی گڑھ میں شروع ہوئی۔ یہیں اس نے ترقی کی ساری منزلیں طے کیں۔ اس تدریسی و ادبی زندگی کے آغاز میں ایک محدود اور مخصوص حلقے کے لوگ ان کی صلاحیتوں سے واقف اور ان کے معترف تھے۔ لیکن آہستہ آہستہ ان کی شہرت یہیں آفتاب بن کر بام عروج تک پہنچی۔ ملک تقسیم ہوا، اور سرور صاحب علی گڑھ کے مانوس اور محبوب ماحول کو چھوڑ کر لکھنؤ پہنچے۔ تقسیم کے بعد کا زمانہ اردو اور اہلِ اردو کے لئے بڑی سختی اور آزمائش کا زمانہ تھا۔ سرور صاحب نے اس سختی اور آزمائش کے زمانہ میں ایک محبوب مقصد کے لئے ہر ممکن جد و جہد کی۔ قیادت کا بارِ گراں بھی سر پر اٹھایا اور اتباع کی آزمائشوں میں سے بھی گذرے ——— لیکن ایک دل آویز بے نیازی اور شانِ استغنا جسے سرور صاحب نے ہر حال میں عزیز رکھا ہے۔ اس سخت دور آزمائش کے دور میں بھی ان کی رفیق رہی۔ میں نے سرور صاحب کو تقسیم کے بعد سے نہیں دیکھا ہے۔ میری نظر میں بہت معلومات کا ذریعہ یا تو وہ خطوط ہیں جو کبھی کبھی اس دوران میں سرور صاحب لکھتے رہے، اور یا ان دوستوں کی گفتگو جو کبھی کبھی لکھنؤ جا کر وہاں کی دل دوز اور دل نشین یادیں اپنے ساتھ لاتے ہیں۔ ان پیامیوں نے سرور صاحب کے متعلق جو کچھ بتایا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی بے نیازی اور استغنا کے حسن میں اب اور بھی اضافہ ہوا ہے۔ پان اور تاش اب ان کے مستقل ہم نشین و ہم جلیس ہیں۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ادب ان کی رہبری و رہنمائی سے محروم ہو گیا ہے۔ یوں، جو کوئی پان اور تاش میں ان کا شریک ہوا، اس کے لئے ان کی نکتہ آفرینیوں سے لذت اندوز ہونے کے موقعے بے شمار ہیں۔ لیکن جنہیں یہ قرب حاصل نہیں، وہ حسرت سے بس یہی کہہ سکتے ہیں کہ

اے خانہ برانداز چمن کچھ تو ادھر بھی

[illegible]

(۴)

چمن کا جلوہ باعث ہے مری رنگیں نوائی کا

(غالب)

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

احمد شجاع خود ایک ادارے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ خوش کلامی میں اپنی نظیر آپ ہیں۔ خوش وضع۔ خوش قامت اور خوش لباس بھی۔ سلسلۂ
انھوں نے اپنی خوش ذوقی کو ملحوظ رکھتے ہوئے نکالا۔ حصۂ نثر کی ادارت اپنے ذمے لی اور حصۂ نظم کا مدیر سہا کو مقرر کیا جن کا پورا نام زیب
عنوان ہے۔ سہا نے علی گڑھ کالج سے بی۔ اے کیا تھا اور پہلے غالباً بلند شہر سے بھوپال گئے تھے پھر لاہور آ گئے۔ اُن کا قد کسی طرح تین فٹ
سے زیادہ نہ ہوگا۔ چوڑی دار پاجامہ پہنتے تھے پاؤں میں پمپ شو۔ اچکن۔ سر پہ عام طور پر قراقلی کی ٹوپی۔ اُن کے اس قد و قامت کو دیکھ کر
اور وضع قطع کا مشاہدہ کر کے ذہن کو ایک دھچکا سا لگتا تھا اور ابھی آدمی سنبھلنے نہیں پاتا تھا کہ سہا نہایت شستہ اور فصیح زبان میں
مچھے دار باتیں شروع کر دیتے تھے۔ پڑھے لکھے آدمی تھے۔ طب سے لے کر انتقادِ نک اور مراۃ العروس سے لے کر دیوانِ غالب
کے مطالب تک ہر چیز سے بحث کرتے تھے۔ ہنسنے کا انداز بہت شگفتہ اور بے تکلف تھا وہ جو یہ تصنع آدابِ محفل والا قسم ہوتا ہے اُسے
بالکل صرف نہیں کرتے تھے۔ پان کے بہت رسیا تھے ہر وقت ڈبیا ساتھ رہتی تھی صرف یہی نہیں بلکہ پان میں کوکین کھاتے تھے۔ اُن دنوں
میں بھی پان سے شغل کرتا تھا چنانچہ ایک دن سہا نے (ذرا بے تکلفی بڑھی تو) پانوں کی ڈبیا پیش کی۔ میں نے پان لینے کے لئے ہاتھ
بڑھایا ہی تھا کہ سہا نے کہا بھئی کوکین ہے پان میں۔ میں ٹھٹکا تو بولے اور کہا اچھا پان بھی کھاتے ہو اور کوکین سے پرہیز بھی کرتے ہو یا پان
کھانا چھوڑ دو یا کوکین کھاؤ۔ مشورے کی دوسری شق پر عمل کرنا میرے لئے بہ وجوہ ناممکن تھا۔ میں نے احتراماً پہلی شق پر عمل کرنا شروع کر دیا
کہ پان کھانا چھوڑ دیا۔ معلوم نہیں مولانا دستِ غیب رکھتے تھے یا کیا بات تھی بہر حال میرا اندازہ ہے کہ وہ دن میں پانچ چھ روپے کی کوکین
ضرور کھاتے تھے۔ اُس زمانے میں حصۂ نظم کو مرتب کرنے میں ڈیڑھ دو سو روپے سے زیادہ کیا تنخواہ ملتی ہوگی۔ یہ تنخواہ تو کوکین پر ہی
صرف ہو جاتی ہوگی۔

مولانا مجھ سے عمر میں بڑے تھے۔ اس لئے بہت بے تکلف وہ مجھ سے کبھی نہ ہوئے۔ سُنتا تھا کہ بے تکلف دوستوں کی محفل میں اُن کی شیریں
کلامی لطیفہ گوئی بذلہ سنجی اپنی نظیر آپ ہے۔ شعر کا مطلب وہ خوب سمجھتے تھے اور اچھے بُرے شعر کی پہچان بھی انھیں بہت اچھی تھی۔ میرے اُن
کے روابط کا نقطۂ آغاز یہ ہے کہ میں نے ایک غزل لکھی اور چاہا کہ ہزار داستان میں شائع ہو جائے اب یاد نہیں وہ کونسی غزل تھی۔ زمین
حسرت موہانی کی تھی خیالات بھی کم و بیش انہی کے تھے۔ میں نے ذرا اُلٹ پھیر سے کام لے کر مضامین کی صورت بدل دی تھی۔ ایک آدھ شعر
ایسا بھی تھا جس سے یہ سراغ ملتا تھا کہ شاید شعر کہنے کا جوہر موجود ہے۔ سہا کو میں نے غزل دکھائی۔ انھوں نے پڑھی۔ نہ ہوں کی نہ ہاں۔ نہ
مذمت کی نہ داد دی اپنے کاغذات میں رکھ لی۔ بس اتنا کہا شائع ہو جائے گی اور پھر ادھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے۔

سہا نے شعر کہنے کا ایک منفرد اسلوب نکالنا چاہا تھا اور اس میں وہ بڑی حد تک کامیاب ہوئے تھے۔ یعنی کم از کم یہ تو ہو گیا تھا کہ سہا کی
غزل پہچانی جاتی تھی۔ اس کی وہ شعوری کوشش کرتے تھے۔ کبھی کبھی بہت اچھا شعر کہتے تھے لیکن جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں سخن فہم بہت اچھے
تھے اور اپنے ذوقِ نظر پہ انھیں بہت ناز تھا اس لئے بے حد مستغنی، بے پروا اور بے نیاز تھے۔ شعر بہت اچھا ہو تو داد دیتے تھے ورنہ چپکے
بیٹھے رہتے تھے، لیکن اچھے شعر پر اس طرح داد دیتے تھے گویا پہلے سو رہے تھے اور اب ہڑ بڑا کر اُٹھ بیٹھے ہیں۔ کچھ عرصہ لاہور کے مشاعروں
میں وہی جانِ عالم بنے رہے اُن کے قد و قامت نے ایک دن بھی اُن کو مذاق کا ہدف نہیں بننے دیا وہ سٹیج پر آتے تھے بلکہ سٹیج کی میز پر
کھڑے کر دیئے جاتے تھے اور ابھی رگ حیرانی کی منزل سے تمسخر و استہزا کی منزل تک نہیں پہنچتے تھے کہ وہ شعر پڑھ کے سامعین کی تمام
توجہ رنگِ سخن کی طرف منعطف کر لیتے تھے۔ اسے اُن کی شخصیت کا کمال کہیئے کوئی طلسماتی اثر کہیئے، کسی فقیر کی دعا کا نتیجہ قرار دیجئے
بہر حال جو بھی ہو، وہ مشاعروں میں بہت کامیاب ہوتے تھے۔ مشاعرے بھی الامان۔ لاہور کے مشاعرے سامعین شاعر کا بیڑا غرق کرنے پر
تلے ہوئے۔ صدر اکثر غیر مؤثر۔ سیکرٹری کی آوازیں صدا بہ صحرا۔ ایسے مشاعروں میں جو شاعر کلام سنا جائے، داد لے جائے، اُسے بہت

بکاؤل گیا ہے۔

کئی مضمون اِن میں سہاؔ کے قد و قامت پر دوست پھبتیاں ضرور کستے تھے۔ کچھ پھبتیاں مجھ تک بھی پہنچی تھیں لیکن وہ فحاشی کا ایسا عنصر رکھتی ہیں کہ نقوش کے صفحات اس کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ ان پھبتیوں کے جواب بھی جو سہاؔ نے دیئے تھے میں نے سُنے وہ بھی پھبتیوں کے مطابق ہی تھے۔

لاہور میں مشاعروں کی محفلیں گرمانے کے بعد یا تو سہاؔ کا دل لاہور سے اُچاٹ ہو گیا یا انھیں محسوس ہُوا کہ خرچ زیادہ ہے اور آمدنی کم (میرا خیال ہے کہ سہاؔ شادی شدہ تھے اور اُن کے بچے بھی تھے لیکن اس مسئلے پر قطعی قسم کی بات صرف حکیم احمد شجاع ہی کر سکتے ہیں) بہر حال وہ دربارِ خیر پور کے شاعرِ خاص ہو کر چلے گئے۔ حکیم احمد شجاع صاحب اس تقرب کا وسیلہ بنے۔ کچھ عرصہ وہاں رہے پھر اُن علاقوں کا رُخ کیا جنھیں آج بھارت کہتے ہیں۔ مجھے اُن کا ایک خط بھوپال سے آیا تھا۔ (اُن دنوں میں گجرات میں وکالت کا شغل کرتا تھا) جس میں انھوں نے لکھا تھا کہ لکھنوال کا ایک تیر میرے دل میں ابھی تک پیوست ہے۔ "ناظرین بانکین" پر واضح ہو کہ لکھنوال ضلع گجرات کا ایک چھوٹا سا قصبہ ہے جو شاہدانِ بازاری کی کثرت کی وجہ سے مشہور ہے یا بدنام۔ یہ نہیں معلوم کہ سہاؔ لکھنوال کب گئے اور گئے بھی یا انھوں نے محض لطیفہ بازی کے طور پر لکھنوال کے تیروں کا ذکر فرما دیا کہ میں یہ نہ سمجھوں کہ سہاؔ پنجاب سے زخم خوردہ نہیں گئے۔ بہر حال حقیقتِ حال تو سہاؔ ہی کو معلوم ہے۔

میری اُن سے غالبؔ کے اشعار کے متعلق اکثر باتیں ہُوا کیں۔ میرے علم میں دو ادیب ایسے ہیں جنھوں نے غالبؔ کے کلام پر اس نقطۂ نظر سے بھی غور کیا ہے کہ وہ اہلِ زبان ہے اور اسی لئے اس کے اشعار میں بھی بعض مقامات پر لہجے کا لطف اور اس کا اُتار چڑھاؤ غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے کہ اس بات کو ملحوظ رکھے بغیر غالبؔ کے بہت سے اشعار کا مطلب واضح نہیں ہوتا۔ یہ دو ادیب رام رچپال سنگھ شیداؔ دہلوی اور سہاؔ مرحوم ہیں۔ پہلے سہاؔ نے اور پھر شیداؔ نے مجھے اس بات کی طرف متوجہ کیا کہ غالبؔ صرف اپنے فکر کے اعتبار ہی سے نکتہ طراز نہیں ہے بلکہ اس کا لہجہ بھی شعر کے سمجھنے میں اس کا معاون ہوتا ہے اس بات کی تفصیل پھر کسی وقت کیلئے اُٹھا رکھتا ہوں۔

جن دنوں سہاؔ لاہور میں تھے، اُن کی غزلیں "ہزار داستان" میں اکثر شائع ہُوا کرتی تھیں۔ میرے پاس اس زمانے کے فائل تھے لیکن ایک دوست جو آزاد پہ کام کرنا چاہتے تھے یہ فائل لے گئے اور آج تک واپس نہیں دیئے اُن کا نام اُن یادداشتوں میں شائع ہوگا جو میری وفات کے بعد "حیرت افزائے ناظرینِ بانکین" ہونگی۔

سہاؔ کی ایک غزل کے کچھ اشعار میں نے ماہِ اگست کے ماہِ نو میں نقل کر دیئے ہیں۔ سہاؔ کے متعلق کچھ لطائف میرے رفیقِ کار سید سرفراز حسین تسنیمؔ کو یاد تھے خیال تھا کہ اُن سے کہوں گا کسی وقت ان لطائف کو قلمبند کر لیں کہ تسنیمؔ خود بھی اللہ کو پیارے ہو گئے۔

سہاؔ کی ایک اور غزل جو "ہزار داستان" ہی میں شائع ہوئی تھی۔ اس کے کچھ اشعار سُن لیجئے۔ ؎

جذبۂ سرورِ جاں اضطراب ہو گیا — آرزو کے کھیل میں دل خراب ہو گیا
یوں ندامت ستم کچھ ستم سے کم نہیں — خامشی سے اور وہ لاجواب ہو گیا
ہر نظر کی نذر ہے عہدِ ترکِ عاشقی — رندِ مئے پرست کا اجتناب ہو گیا
ان کی مہربانیاں شب کا خواب ہو گئیں — روز رات کاٹنا اِک عذاب ہو گیا
اپنے جوشِ شوق میں ہم ہی ہوش میں نہ تھے — ورنہ لاکھ بار وہ بے حجاب ہو گیا

اب سہا کا ذکر بھی ناصواب ہو گیا   پھر ترے غرور کا اور کیا دماغ ہے

اصغر گونڈوی

مجھے سال تو ٹھیک یاد نہیں لیکن تخمیناً کہہ سکتا ہوں کہ ۱۹۲۳ء کے بعد اور ۱۹۲۶ء سے پہلے مولانا تاجور مرحوم نے لاہور میں ایک ادارہ اُردو مرکز کے نام سے قائم کیا اس کی تفصیل میں مولانا تاجور کے تذکرے میں عرض خدمت کروں گا یہاں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ مولانا نے اس سلسلے میں مولانا اصغر گونڈوی کو لاہور بلوا لیا اور اُردو مرکز کے دفتر کا مہتمم بنا دیا۔ انہی دنوں یاس یگانہ چنگیزی اور جگر بھی لاہور آئے۔ ساغر و سیماب بھی لاہور پہنچے۔ سیماب صاحب کو غالباً مولوی فیروزالدین صاحب نے طلب فرمایا تھا جو اُن سے کچھ اُردو کتابیں تالیف کروانا چاہتے تھے۔ بہرحال یہ بڑا باغ و بہار زمانہ تھا کہ اصغر، یاس، جگر، ساغر، سیماب سب لاہور جمع تھے۔ ان تمام لوگوں میں سیماب اور اصغر رکھ رکھاؤ، متانت، وضعداری اور علم و فضل کے اعتبار سے ممتاز تھے۔ سیماب صاحب بھی جس سے ملتے تھے ایک ڈھنگ پر ملتے تھے اور اس ڈھنگ کو ملحوظ رکھتے تھے وہ عروض قافیہ اور دوسرے علوم شعری کے رازدار تھے اور تاریخ اسلام سے بھی واقف تھے۔ عربی فارسی بھی خوب جانتے تھے، لیکن اس کے باوجود ان کی باتوں میں وہ کشش، دلبستگی اور مٹھاس نہ تھی جو اصغر گونڈوی کی باتوں میں تھی۔ اصغر صاحب نے بہت زمانہ دیکھا تھا۔ بہت پاپڑ بیلے تھے۔ زندگی کے بہت کھیل کھیلے تھے علم و فضل کی بہت سی منزلیں گذار چکنے کے بعد آخر وہ تصوف کی طرف جھک پڑے تھے اور میں نے جس وقت انھیں دیکھا ہے تو وہ اسی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ سر پہ لمبے لمبے بال جو گردن تک آتے تھے۔ داڑھی اچھی خاصی۔ مجھے تو یہی یاد ہے کہ چوڑی دار پاجامہ اور اچکن پہنتے تھے سر پر کالے رنگ کی ٹوپی۔ یاد پڑتا ہے کہ لا کالج کے قریب سے جو سڑک پیسہ اخبار کی طرف جاتی ہے وہاں کہیں کسی گلی میں قیام فرماتے تھے۔

میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔ کہ اصغر نے انگریزی کی تعلیم کس منزل تک حاصل کی تھی۔ عربی سے میرا خیال ہے وہ بقدر ضرورت آگاہ تھے۔ فارسی خوب جانتے تھے اور کلاسیکی فارسی شاعری کی تمام تلمیحات، علامات، اور اصطلاحات انھیں گویا نوک بر زبان تھیں۔ اُردو ادبیات کی تاریخ سے آگاہ تھے۔ اور اُردو شاعری پر جو کچھ بیتی ہے، اس پر بھی مطلع تھے۔ مجھے اُن کی جس بات نے سب سے زیادہ متاثر کیا، وہ اُن کی مشرقی وضعداری رکھ رکھاؤ، زندگی بسر کرنے کا سلیقہ اور متانت آمیز شگفتگی ہے، میں نے اُستادوں کے سامنے ممتاز ہمعصر شعراء کے سامنے اُدباء کے حضور میں گستاخیاں کی ہیں، لیکن اصغر گونڈوی مجھ سے اس طرح ملتے تھے کہ میں اُن کے سامنے کوئی ناشائستہ بات کرنے کا تصور بھی نہ کر سکتا تھا۔ وہ مسکراتے تھے، لیکن اُن کی مسکراہٹ میں بزرگوں کی سی شفقت تھی۔ اور اُس کے متعلق یہ گمان ہوتا تھا۔ کہ یہ مسکراہٹ کسی وقت تیوری کی شکل اختیار کر سکتی ہے۔ جب تک وہ لاہور میں رہے، میں نے انھیں نہ کبھی جھنجھلاتے ہوئے دیکھا۔ نہ خستگی کے عالم میں دیکھا۔ نہ انھیں قہقہے لگاتے سنا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ تصوف سے جو اُن کا رابطہ تھا، اُس کی کیا کیفیت تھی۔ حال تھا کہ قال۔ اور واقعی ان پہ وجد کی کیفیت طاری ہوتی تھی یا نہیں، لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ وہ بددیانت ہرگز نہ تھے۔ اگر انھوں نے اشعار میں کسی متصوفانہ کیفیت کا ذکر کیا ہے تو اُسے محسوس بھی ضرور کیا ہوگا۔

میں کہہ چکا ہوں کہ اصغر مرحوم فارسی کی کلاسیکی شاعری کے رازدار تھے۔ اُردو شاعری کی علامات کو بھی اچھی طرح سمجھتے تھے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ میں نے اس سلسلے میں اُن سے بہت استفادہ کیا ہے۔ میں اُن دنوں مبتدی شمار کیا جاتا تھا۔ نو آموز تھا۔ طالب علم تھا۔ لیکن اصغر مرحوم مجھ سے ملنے کے لئے میرے گھر تشریف لاتے تھے۔ اُن سے جو صحبتیں رہی ہیں، اُن میں یوں تو میں نے بہت کچھ سیکھا ہے۔ لیکن فارسی شاعری کی علامات کے رموز بالخصوص مجھ پر انھیں کے ذریعے روشن ہوئے ہیں۔ اور انہیں سے کن کن سے رموز اُردو میں منتقل

جوسکے ہیں، یہ بھی اُنہی سے مجھے بتایا ہے؛ بہار، فارسی کی کلاسیکی روایت میں عہدِ شباب کا عشق ہے۔ کہ نشاط سے لبریز ہے۔ گل محبوب کا استعارہ ہے۔ اور بلبل ظاہر ہے کہ عاشق کی علامت ہے۔ فارسی میں اس سے بہت خوبصورت مضمون پیدا ہوئے ہیں مثلاً

نمی گریم دریں گلشن کہ ایں باغ و بہار از من
گل از یار و بہار از یار و باغ از یار و یار از من

اور غالب کہتا ہے :-

یار در عہدِ شبابم بکنار آمد و رفت
ہمچو عیدی کہ در ایامِ بہار آمد و رفت

اُردو میں میر کہتا ہے :-

پتّہ پتّہ بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

اور حالی کہتا ہے :-

یہی انجام تھا اے فصلِ خزاں
گل و بلبل کی شناسائی کا

جگر کے اس شعر میں بھی بہار کے علامتی مفہوم پر غور کیجئے گا کہ بدلا ہوا ہے۔

کبھی شاخ و سبزہ و برگ پر کبھی غنچہ و گل و خار پر
میں چمن میں چاہے جہاں رہوں میرا حق ہے فصلِ بہار پر

بہرحال میں نے مثال کے طور پر بہار کی علامتی اہمیت کا ذکر کیا۔ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں۔ فارسی اور اُردو شعری روایت کے بہت سے رموز اصغر گونڈوی کے ذریعے مجھے معلوم ہوئے ہیں۔ اور وہ بھی مشفقانہ اور مربیانہ انداز میں تقریر کر کے اُنھوں نے مجھے نہیں بتائے۔ باتوں باتوں میں سمجھا دیتے تھے۔ گویا میں اُن کا معاصر ہوں۔ ہم پلّہ ہوں۔ ہم سِن ہوں۔ ہم رُتبہ ہوں۔ اصغر گونڈوی کی یہ وضعداری اور اُن کا یہ انداز مجھے نہ کبھی بھول سکتا ہے، نہ بھولے گا۔ لاہور سے چلے جانے کے بعد بھی اُن سے تعلقات قائم رہے۔ اور انھوں نے مرتے دم تک وضعداری نبھائی۔ غفلت میری ہی طرف سے رہی۔

مولانا تاجور نجیب آبادی

تاجور مرحوم سے میرے روابط کی ابتدا ۱۹۲۰ء کے لگ بھگ ہوئی۔ جب میں رنگ محل مشن ہائی سکول میں پڑھتا تھا۔ میرے ایک ہندو دوست ـــ کنھیا لال ـــ مجھے اُن کے ہاں لے گئے۔ اور میں نے اُن کی خدمت میں اصلاح کے لئے اپنا کلام پیش کیا۔ اُنھوں نے کہیں کہیں اشعار میں کچھ تبدیلیاں کیں۔ اور ایک شعر مرحمت بھی فرمایا۔

رنگِ چمن طرازی داماں نہ پوچھئے
گلزار ہے یہ دیدۂ خوں نابہ بار کا

افسوس کہ میری ابتدائی مشق کا یہ نمونہ کہیں شائع نہیں ہوا۔ اس لئے یہ شعر بھی کہیں شائع نہ ہو سکا۔

مولانا پہلے دیال سنگھ سکول میں مدرس تھے۔ پھر دیال سنگھ کالج میں عربی، فارسی اور اردو پڑھانے پر مامور ہوگئے۔ ۲۲-۱۹۲۱ء سے علامہ تاجور نجیب آبادی
پنجاب میں اردو کی ترویج اور اس کے فروغ کے لئے انتھک کوششیں کیں۔ وہ یوں بھی ہنگامہ پرور اور جنگ آزما آدمی تھے۔ ہر وقت کسی نہ کسی سے
ان کی ٹھنی رہتی تھی۔ بہرحال انھوں نے بڑا کام کیا۔ ایس۔ پی۔ ایس۔ کے ہال میں مشاعرے منعقد ہونے لگے۔ ان مشاعروں میں مولانا صدر کی حیثیت
سے صدر کے ساتھ سٹیج پر جلوہ افروز ہوتے تھے۔ میرے متعلق انھیں بدگمانی ہوگئی تھی۔ کہ ذہین ہوں اور شعر اچھے کہتا ہوں۔ چنانچہ ان مشاعروں
میں وہ اور ان کے عقیدت مند مجھے بہت داد دیتے تھے۔ ظاہر ہے۔ کہ میں بھی فراخ دلی سے مولانا اور ان کے شاگردوں کے کلام کی تعریف
کرتا تھا۔ ان مشاعروں میں عمائد و اکابر، علماء، ادباء، شعراء سبھی شریک ہوتے تھے۔ یہاں میں نے شیخ عبدالقادر مرحوم کو دیکھا ہے۔ بخاری
(پطرس) کی بذلہ سنجیاں سنی ہیں۔ ابوالاثر حفیظ جالندھری کو معرکے سر کرتے دیکھا ہے۔ اختر شیرانی کو نظمیں اور غزلیں پڑھتے سنا ہے۔ پنڈت
ہری چند اختر کو چٹکلے بیان کرتے اور نہایت اچھے شعر کہتے دیکھا ہے۔ جن لوگوں نے ان مشاعروں کی صدارتیں کی ہیں، ان میں سر شانتی سروپ
بھٹناگر سے لے کر مولانا ظفر علی خان تک ہر وضع کے لوگ شامل تھے۔ ایس۔ پی۔ ایس ہال کے ان مشاعروں میں مولانا نے یہ قید لگا دی تھی۔
کہ غزل میں کوئی بات ایسی نہ ہو جس سے جنسی بے راہ روی کا پہلو نکلتا ہو۔ محبوب کے لئے ضمیر مونث بھی اکثر شعراء یہاں استعمال کرتے تھے۔
نظمیں بھی پڑھی جاتی تھیں۔ گائی بھی جاتی تھیں۔ ترنم سے پڑھنے والوں میں مولانا مرحوم نے حفیظ کے بالمقابل گویا ایک اور صاحب کو صف آرا
کیا تھا۔ یہ صاحب حبیب بکرم (بادش بخیر) وجاہت حسین عندلیب شادانی ہیں۔ جو مشاعرے میں ترنم سے پڑھتے تھے۔ اور اس طرح
پڑھتے تھے کہ محفل پر چھا جاتے تھے۔ حفیظ کے ساتھ کبھی کبھی نشتر جالندھری بھی تشریف لاتے تھے۔ اور سید امتیاز علی تاج اور مولانا عبدالمجید
سالک بھی رونق افروز ہوتے تھے۔

مولانا کا خیال تھا۔ کہ پنجاب میں اردو کی ترویج تبھی ممکن ہے۔ کہ ہندو اور سکھ بھائیوں کو یقین دلایا جائے کہ وہ بھی اردو نثر لکھ سکتے ہیں۔
اور اچھا شعر کہہ سکتے ہیں۔ چنانچہ مولانا کے اردگرد ہندو اور سکھ شعراء کا ہمیشہ ایک جمگھٹ ہوتا تھا۔ پنڈت میلارام وفا، سردار دیوے سنگھ
شاعر اور بعد میں کرپال سنگھ بیدار ان کے ہندو اور سکھ شاگردوں میں بہت نمایاں تھے۔ رفتہ رفتہ ایس۔ پی۔ ایس ہال کے مشاعرے
شکوے شکایتوں اور تلخیوں کا موجب بنے۔ ابوالاثر حفیظ جالندھری نے ایک نئی انجمن کی بنیاد رکھی۔ کیونکہ کچھ لوگوں کو یہ گمان ہونے لگا
تھا۔ کہ مولانا اور ان کے شاگرد اپنے حلقے کے شعراء کو داد سے نوازتے ہیں۔ اور بس۔ اس کھینچا تانی میں تاثیر، تبسم، بخاری اور سالک حفیظ
کے ساتھ تھے۔ لیکن مولانا سے بھی ان کے تعلقات بالکل بگڑے نہیں۔ البتہ حفیظ نے اور پنڈت ہری چند اختر نے کچھ ایسے اشعار ضرور کہے۔
جن سے جھلکتا تھا۔ کہ دل میں بہت غبار ہے۔

اسی زمانے میں مولانا نے عطر چند کپور کی مالی اعانت کے بل بوتے پر لاہور میں اردو مرکز قائم کیا۔ اس سلسلے میں جگر، اصغر اور ریاض بھی
لاہور بلوائے گئے۔ اور جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں۔ اس کے کچھ عرصہ بعد —————— یا کچھ عرصہ پہلے ٹھیک یاد
نہیں۔ ساغر و سیماب بھی آپہنچے۔

مولانا تاجور کا مذاق سلیم شعر کے معاملے میں بہت اچھا تھا۔ اور بالعموم ان کی رہنمائی میں ان کے شاگرد منزلِ مقصود تک جا پہنچتے تھے۔ لیکن
میں نے ان سے جب بات کی، یہ محسوس کیا کہ علوم شعری کے علاوہ انھیں کسی چیز کی پروا نہ تھی۔ مولانا بڑے محفل آرا، بذلہ سنج، نکتہ رس اور
لطیفہ گو ادیب تھے۔ ان کے بعض لطیفے کلاسیکی بن چکے ہیں۔ ایک سن لیجئے۔ اس کا میں شاہد عینی ہوں۔
ایک نو آموز شاعر جو نوزوں پر غزلیں کہنے چلے جاتے تھے۔ اور کسی کے قابو میں نہیں آتے تھے، انھوں نے طے کیا کہ اپنا دیوان
چھپوائیں۔ اصلاح وہ مولانا تاجور سے لیتے تھے۔ ایک دن مُنہ لٹکائے صورت بنائے مولانا کی خدمت میں حاضر ہوگئے۔ اور فرمایا۔ مولانا! بڑا

غضب ہوا۔ مولانا نے پوچھا کیا ہوا؟ تو کہا۔ کہ میرا دیوان کسی نے چرا لیا ہے۔ یہ بات سن کر طوطا گری آدھ منٹ تو بالکل خاموش رہے۔ پھر بولا۔ بھئی برا نہ ماننا۔ سچ تو یہ ہے۔ کہ جس نے تیرا دیوان چرایا ہے۔ اُس نے اُردو ادب پر بڑا احسان کیا ہے۔ محفل کشتِ زعفران بن گئی۔ اور نوآموز شاعر مولانا کا منہ دیکھتے گئے۔

۱۹۲۹ء میں کچھ سال گجرات میں وکالت کا شغل کرنے کے بعد لاہور آیا۔ تو مولانا نے جو رسالہ ادبی دنیا جاری کیا تھا۔ اُس کے حلقۂ ادارت میں منسلک ہو گیا۔ انہی دنوں ایک اخبار نکلتا تھا۔ اُس کا نام ٹھیک یاد نہیں رہا۔ حبیب کرم وقار اخباری اُس کے ایڈیٹر تھے۔ ادبی دنیا مولانا نے بڑے ٹھاٹھ سے جاری کیا تھا۔ اور میں خوب جانتا ہوں۔ کہ بیوی کا زیور بھی بک کر رسالے کے مصارف کا جزو بنا۔ مولانا کسی طرح تیار نہ ہوتے تھے۔ کہ ادبی دنیا کا بوجھ اپنے کاندھوں سے اتار پھینکیں۔ یہ میں ۱۹۳۰ء کی بات کر رہا ہوں۔ اُن دنوں ادبی دنیا کے لئے میں نے بہت سی تصویری نظمیں لکھیں۔ اور مولانا کو برائے اصلاح دکھائیں بھی۔ لیکن غزل کے معاملے میں میں اُن سے بے نیاز ہو گیا۔ کیونکہ اس سلسلے میں ہم دونوں کا نقطۂ نظر بالکل مختلف تھا۔ اُس کے بعد مولانا دیال سنگھ کالج میں میرے رفیقِ کار ہو گئے۔ اور تقریباً بیس سال تک یہ رفاقت قائم رہی۔ اِس دوران میں مولانا مجھ سے بگڑے بھی۔ مجھ پر برسے بھی۔ مجھے برا بھلا بھی کہا۔ لیکن وضعداری وہ نبھاتے گئے۔ اور میں بھی نبھاتا گیا۔ اِس دوران میں رسالہ بازی کا چسکا چھوٹا نہیں۔ اُنھوں نے شاہکار جاری کیا۔ لیکن وہ بھی خسارے کا موجب ثابت ہوا۔

مولانا مرحوم کے متعلق مجھے ہمیشہ یہ محسوس ہوا ہے۔ کہ دُنیا میں جو کچھ وہ کر سکتے تھے۔ وہ کر نہیں گئے۔ بےشک اُردو مرکز نے اُردو ادب کا انتخاب شائع کیا۔ مولانا کی کچھ تصانیف بھی شائع ہوئیں۔ لیکن اُن کے علم و فضل اُن کے ذوقِ سلیم اور اُن کے تعلیمی تجربے سے جو توقعات وابستہ تھیں، وہ پوری نہیں ہوئیں۔ مولانا اواخر عمر میں شمس العلما ہو گئے تھے۔ لیکن ساتھ ہی اُن کو دو بچوں کی موت کا پے در پے صدمہ برداشت کرنا پڑا تھا۔ کچھ اور بھی اُلجھنیں تھیں۔ جن کا ذکر بے محل ہے۔ بہرحال وفات سے پہلے اُن میں وہ شگفتگی اور تر و تازگی نہیں رہی تھی۔ جو اُن کی طبیعت کا خاصہ تھی۔

میرا خیال ہے۔ کہ وفات سے تین چار سال پہلے وہ امراضِ قلبی میں مبتلا تھے۔ میں نے اُنہیں مشورہ دیا۔ کہ وہ طویل رخصت پر چلے جائیں۔ لیکن وہ مانے نہیں۔ کہ ایسا کرنا اُن کی ہنگامہ پروری کے خلاف تھا۔ اور آخر وہی ہوا۔ جس کا خدشہ تھا۔ ایک رات اچانک اُن کو دورہ پڑا۔ اور وہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔

مولانا تاجور مرحوم ظریف کے نام سے بھی لکھا کرتے تھے۔ بیگم تاجور نے اُن کے مضامین غزلیات اور منظومات کا مجموعہ مرتب کرنے کی کوششیں شروع کر دی تھیں۔ لیکن معلوم ہوتا ہے۔ کہ ابھی تک اِس سلسلے میں کوئی ٹھوس کام نہیں ہوا۔

تاجور مرحوم ہوا کے رُخ کو خوب پہچانتے تھے۔ زمانے کے مزاج شناس تھے۔ ادب کی بدلتی ہوئی قدروں سے آگاہ تھے۔ اُن کی غزل کے مختلف دور ہیں۔ اور ہر دوسرا دور پہلے سے زیادہ صحت مند اور توانا ہے۔ اُن کا بہت پہلے کا کلام یہ ہے۔

تم نے لڑا لڑا کے نگاہیں چرائی آنکھ
ہم نے ملا ملا کے نظر دل ملا دیا
دن رات اُن کو کھیل یہ رہتا ہے تاجور
مٹی پہ میرا نام لکھا اور مٹا دیا

جائیں۔ تو وہ ہر ممکن مدد کریں گے۔ لیکن کبھی کسی محفل میں بیٹھ کر اس بات کے مدعی نہ ہوں گے کہ فلاں صاحب نے فلاں علم میں مجھ سے استفادہ کیا۔ غالباً نہیں بلکہ یقیناً اُنھوں نے میری بھی اسی طرح پردہ پوشی کی۔ جب ایم۔ اے کے بعد میں نے تدریس کا شغل اختیار کیا تو اُن کی خدمت میں حاضر ہونا شروع کیا۔۔۔ میں کسی تلمیح کے سلجھانے کی درخواست کروں یا کسی استفادے کی گرہ کشائی میں مدد کا طالب ہوں، شیرانی کا اسلوب کار ایک ہی تھا۔ وہ جواب میں معلومات کا دریا بہا دیتے تھے۔ میں نے سلمان ساوجی کے ایک شعر کا مطلب پوچھا، مطلب تو گویا خبط ہو گیا۔ شیرانی نے پہلے شعر ساوہ پر ایک عالمانہ تقریر کی۔ پھر سلمان کا مقام متعین کیا۔ اس کے دلبستان شعر کی تعریف اور توضیح کی۔ یہ سب کچھ ہو چکا تو پھر شعر کے الفاظ کی طرف متوجہ ہوئے۔ اُن کی تاریخ بیان کی معانی کے تغیرات سے بحث کی۔ اُن کی مختلف دلالتیں بتائیں۔ اُن کا صحیح تلفظ بتایا۔ اب تلمیحات استعارات اور تشبیہات کا مرحلہ آیا۔ اس سے فارغ ہوئے تو شعر کی تشریح کی طرف توجہ کی۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ میں کہہ دیتا تھا کہ میں شعر کا مطلب سمجھ گیا اور وہ کہتے تھے۔ ابھی کہاں۔ اور تقریر جاری رکھتے تھے۔ یہ تو سب جانتے ہیں کہ وہ نایاب کتابیں اور سکے جمع کرنے رہتے تھے۔ جب وہ یونیورسٹی کی ملازمت سے سبکدوش ہوئے تو انھوں نے یہ علمی ذخیرہ فروخت کر دیا۔

میں نے عرض کیا ہے کہ شیرانی بڑی شگفتہ نثر لکھتے تھے۔ بشرطیکہ مضمون ہی ایسا نہ ہو کہ شگفتگی کی تاب نہ لائے۔ فردوسی پر چار مقالے اور تنقید شعر العجم میں اُن کے انداز نگارش کی شگفتگی کی اُنھی ہی مثالیں ہیں۔ دیکھئے اِن کتابوں کے صفحات۔

مجھ میں لفظوں کی تاریخ دریافت کرنے کا شوق اُنھی نے پیدا کیا۔ پنجابی زبان کی اہمیت کی طرف اُنھی نے متوجہ کیا۔ یہاں تک کہ میں نے ایک مضمون میں دعوے کیا ہے کہ پنجابی حقیقت میں قدیم فارسی اور پہلوی (ایک طرف) اور سنسکرت (دوسری طرف) کے درمیان ایک کڑی کی سی حیثیت رکھتی ہے۔ پنجابی زبان کا مطالعہ کئے بغیر نہ اُردو الفاظ کی تحقیق مکمل ہو سکتی ہے، نہ فارسی زبان کی۔

اواخر عمر میں شیرانی مرحوم (اقبال مرحوم کی طرح "تاثیر کی طرح" تاجور کی طرح، حسرت کی طرح اور اب یہ بھی کہہ دینا چاہیئے کہ میری طرح) امراض قلبی میں مبتلا ہو گئے تھے۔ اُن کے جو خطوط شائع ہوئے ہیں اُن سے پتہ چلتا ہے کہ اُنھیں وجع القلب تھا۔ یعنی دردِ دل۔ اِس موذی مرض کا دورہ جب پڑتا ہے (اور مجھ پر یہ کیفیت گذر چکی ہے) تو مریض کو یوں معلوم ہوتا ہے۔ گویا اِس حملے سے جانبر نہیں ہوگا۔ پھر یکایک درد رفع ہو جاتا ہے۔ اور کچھ عرصے کے بعد طبیعت بحال ہو جاتی ہے۔ اور یوں معلوم ہوتا ہے۔ جیسے درد کبھی تھا ہی نہیں۔ اِس مرض کے دوران میں ۱۵ اپریل ۱۹۴۵ء ٹونک راجپوتانے سے شیرانی صاحب ڈاکٹر محمد اقبال پرنسپل اورینٹل کالج کو ایک خط لکھتے ہیں۔ (اور شگفتہ کلامی دیکھیئے گا) اقبال صاحب کے فرزند ارجمند محمد داؤد رہبر ٹونک جانا چاہتے ہیں۔ شیرانی صاحب یہ خبر سن کر خط لکھتے ہیں:-

مہندی باغ، ٹونک، راجپوتانہ

۱۵ اپریل ۱۹۴۵ء

مخدومی و محترمی جناب ڈاکٹر صاحب!

عنایت نامے کا جواب جلد دے رہا ہوں۔ میری خرابی صحت بڑھتی جاتی ہے۔ رات کو بارہ بجے کھانسی اور زکام کا حملہ ہو گیا۔ دو گھنٹے کے بعد نیند آسکی۔ صبح آٹھ بجے سے دل پر درد شروع ہوا۔ خاصہ تیز ہو گیا۔ اور اب تک ہے (یہ چار بجے کا وقت ہے۔ پُرانا وقت) کوئی دو گھنٹے سے تخفیف ہے۔ اب صرف گہرے سانس کے ساتھ معلوم ہوتا ہے۔ آج ہی بارہ بجے دن کو پھر زکام اور کھانسی شروع ہو گئی۔ ساتھ ہی بخار ہو گیا۔ لیکن ہلکا۔ اب آپ ہی دیکھیں۔ میری صحت اگر تماشہ نہیں تو کیا ہے اس وقت دل میں یہی سما رہا ہے کہ آپ کی خدمت میں عریضہ لکھوں۔ اِسی لئے لکھ رہا ہوں۔ داؤد آئیں۔ میری آنکھوں اور سر پر آئیں۔ میرے

جائیں۔ تو وہ ہر ممکن مدد کریں گے۔ لیکن کبھی کسی محفل میں بیٹھ کر اس بات کے مدعی نہ ہوں گے کہ فلاں صاحب نے فلاں علم میں مجھ سے استفادہ کیا۔ غالباً نہیں بلکہ یقیناً اُنھوں نے میری بھی اسی طرح پردہ پوشی کی۔ جب ایم۔ اے کے بعد میں نے تدریس کا شغل اختیار کیا تو اُن کی خدمت میں حاضر ہونا شروع کیا۔۔۔۔ میں کسی تلمیح کے سلجھانے کی درخواست کروں یا کسی استعارے کی گرہ کشائی میں مدد کا طالب ہوں، شیرانی کا اسلوبِ کار ایک ہی تھا۔ وہ جواب میں معلومات کا دریا بہا دیتے تھے۔ میں نے سلمان ساوجی کے ایک شعر کا مطلب پوچھا۔ مطلب تو گویا ضبط ہو گیا۔ شیرانی نے پہلے شہر ساوہ پر ایک عالمانہ تقریر کی۔ پھر سلمان کا مقام متعین کیا۔ اُس کے دبستانِ شعر کی تعریف اور توضیح کی۔ یہ سب کچھ ہو چکا تو پھر شعر کے الفاظ کی طرف متوجہ ہوئے۔ اُن کی تاریخ بیان کی۔ معانی کے تغیرات سے بحث کی۔ اُن کی مختلف دلالتیں بتائیں۔ اُن کا صحیح تلفظ بتایا۔ اب تلمیحات استعارات اور تشبیہات کا مرحلہ آیا۔ اس سے فارغ ہوئے تو شعر کی تشریح کی طرف توجہ کی۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ میں کہہ دیتا تھا کہ میں شعر کا مطلب سمجھ گیا اور وہ کہتے تھے۔ ابھی کہاں۔ اور تقریر جاری رکھتے تھے۔ یہ تو سب جانتے ہیں کہ وہ نایاب کتابیں اور سکے جمع کرتے رہتے تھے۔ جب وہ یونیورسٹی کی ملازمت سے سبکدوش ہوئے تو انھوں نے یہ علمی ذخیرہ فروخت کر دیا۔

میں نے عرض کیا ہے کہ شیرانی بڑی شگفتہ نثر لکھتے تھے۔ بشرطیکہ مضمون ہی ایسا نہ ہو کہ شگفتگی کی تاب نہ لائے۔ فردوسی پر چار مقالے اور تنقید شعر العجم میں اُن کے اندازِ نگارش کی شگفتگی کی اُتنی ہی مثالیں ہیں۔ جتنے اِن کتابوں کے صفحات۔

مجھ میں لفظوں کی تاریخ دریافت کرنے کا شوق اُنھی نے پیدا کیا۔ پنجابی زبان کی اہمیت کی طرف اُنھی نے متوجہ کیا۔ یہاں تک کہ میں نے ایک مضمون میں دعوےٰ کیا ہے کہ پنجابی حقیقت میں قدیم فارسی اور پہلوی (ایک طرف) اور سنسکرت (دوسری طرف) کے درمیان ایک کڑی کی سی حیثیت رکھتی ہے۔ پنجابی زبان کا مطالعہ کئے بغیر نہ اُردو الفاظ کی تحقیق مکمل ہو سکتی ہے نہ فارسی زبان کی۔

اواخرِ عمر میں شیرانی مرحوم (اقبال مرحوم کی طرح، تاثیر کی طرح، تاجور کی طرح، حسرت کی طرح اور اب یہ بھی کہہ دینا چاہیئے کہ میری طرح) امراضِ قلبی میں مبتلا ہو گئے تھے۔ اُن کے جو خطوط شائع ہوئے ہیں اُن سے پتہ چلتا ہے کہ اُنھیں وجع القلب تھا۔ یعنی دردِ دل۔ اس موذی مرض کا دَورہ جب پڑتا ہے (اور مجھ پر یہ کیفیت گزر چکی ہے) تو مریض کو یوں معلوم ہوتا ہے۔ گویا اس حملے سے جانبر نہیں ہوگا۔ پھر یکایک درد رفع ہو جاتا ہے۔ اور کچھ عرصے کے بعد طبیعت بحال ہو جاتی ہے۔ اور یوں معلوم ہوتا ہے۔ جیسے درد کبھی تھا ہی نہیں۔ اس مرض کے دَوران میں ۱ اپریل ۱۹۴۵ء کو ٹونک راجپوتانے سے شیرانی صاحب ڈاکٹر محمد اقبال پرنسپل اورینٹل کالج کو ایک خط لکھتے ہیں۔ (اور شگفتہ کلامی دیکھیئے گا) اقبال صاحب کے فرزند ارجمند محمد داؤد رہبر ٹونک جانا چاہتے ہیں۔ شیرانی صاحب یہ خبر سن کر خط لکھتے ہیں:-

مہندی باغ، ٹونک، راجپوتانہ
۱۵ اپریل ۱۹۴۵ء

مخدومی و محترمی جناب ڈاکٹر صاحب!

عنایت نامے کا جواب جلد دے رہا ہوں۔ میری خرابیٔ صحت بڑھتی جاتی ہے۔ رات کو بارہ بجے کھانسی اور زکام کا حملہ ہو گیا۔ بعد گھنٹے کے بعد نیند آ سکی۔ صبح آٹھ بجے سے دل پر درد شروع ہوا۔ خاصہ تیز ہو گیا۔ اور اب تک ہے (یہ چار بجے کا وقت ہے۔ پُرانا وقت) کوئی دو گھنٹے سے تخفیف ہے۔ اب صرف گہرے سانس کے ساتھ معلوم ہوتا ہے۔ آج ہی بارہ بجے دن کو پھر زکام اور کھانسی شروع ہو گئی۔ ساتھ ہی بخار ہو گیا۔ لیکن ہلکا۔ اب آپ ہی دیکھیں۔ میری صحت اگر تماشہ نہیں تو کیا ہے اس وقت دل میں یہی سما رہا ہے کہ آپ کی خدمت میں جو لطیفہ لکھوں۔ اسی لئے لکھ رہا ہوں۔ داؤد آئیں۔ میری آنکھوں اور سر پر آئیں۔ میرے

لئے تو یہ بڑی نوید ہے، مگر میں کیا کروں۔ وہ آئے اور میرے ضعفِ صحت کی بنا پر ان کو تکلیف ہوئی۔ تو میں آپ کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہوں گا۔ اور اب مجھ میں برداشت کی طاقت نہیں رہی۔ ادنیٰ سی تشویش اور خیالی تکلیف مجھ کو بہت پریشان رکھتی ہے۔ اگر وہ آئیں تو پتھر کا دل لے کر آئیں۔ ورنہ میں درخواست کروں گا۔ نہ آئیں۔ اگر کبھی تقدیر میں ہوگا مل لیں گے۔ ورنہ ۔ ع

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔"

ایک اور خط میں جو ۲۹ اگست ۱۹۴۳ء کا لکھا ہوا ہے۔ اور ڈاکٹر اقبال ہی کے نام ہے۔ وہ ٹونک میں اپنے روز و شب گذارنے کا ذکر کرتے ہیں۔ بیماری کی تکلیف ان دنوں بھی تھی۔ لیکن شگفتہ کلامی کا اسلوب دیکھئے گا۔

" مہاری باغ ٹونک راجپوتانہ

۲۹ اگست ۱۹۴۳ء

محترمی جناب ڈاکٹر صاحب

شفقت نامہ عین انتظار میں پہنچا۔ جب میں نے لاہور کا ارادہ کیا تھا۔ وہ وقت کچھ اور ہی تھا۔ اتنے میں گرامی نامہ شرفِ ورود سے آیا۔ اور میری تشویش رفع ہوگئی۔ اب میں کیا دیوانہ تھا۔ جو لاہور آنے کا قصد کرتا۔ آپ فرماتے ہیں۔ کہ لاہور آج کل جہنم کا نمونہ بن رہا ہے۔ تو آپ وہاں کیوں پڑے ہیں۔ یہاں تشریف لے آئیے۔ یہاں حالت یہ ہے۔ کہ گرمیاں اس سال میں نے ندی میں گذاریں۔ بڑے لطف سے گذاریں۔ راتوں کو نہایت پُر لطف موسم ہوتا تھا۔ اور چادر اور رولائی اوڑھنی پڑتی تھی۔ گرمی کے چند دن میں نے وہی دیکھے جب میں دہلی اور رامپور میں تھا۔ ٹونک میں ایک رات بھی گرم مجھے یاد نہیں۔ دہلی سے واپسی کے بعد میں مستقلاً گیارہ بارہ بجے رات کو ندی آ جاتا ہوں۔ یہاں دریا کے کنارے کے قریب پھوس کا ایک جھونپڑا ڈلوا لیا ہے۔ آس پاس کھیت ہیں۔ اور بیچ میں مابدولت کا جھونپڑا۔ ہم تنہا میں فرعون بے سامان بنے بیٹھے ہیں۔ دل میں آئی سو گئے۔ ورنہ کتاب دیکھتے رہے۔ یا اپنا کام کرتے رہے۔ برسات کی وجہ سے منظر نہایت پُر لطف ہے۔ ایک طرف پہاڑوں کا سلسلہ ہے جو سرتاپا سبز ہے۔ دوسری طرف ندی ہے جو جنوبی سمت سے آ کر موڑ کھاتی ہوئی شمالی رخ سے ہوتی ہوئی مشرق میں نکل گئی ہے۔ تازہ ہوائیں ہر وقت چل رہی ہیں۔ عصر سے خنکی ہو جاتی ہے۔ رات کو معلوم نہیں کیا حالت رہتی ہے۔ میں تو مغرب کے وقت یہاں سے رخصت ہو جاتا ہوں اور گھر پہنچ جاتا ہوں۔ پچھلے پانچ چار روز سے پھر بارش شروع ہوگئی ہے۔ سورج مہاراج گاہے ماہے گھنٹے دو گھنٹے کے واسطے وہ بھی حاضری دینے کی غرض سے آ جاتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ندی کے پانی اور اس کی ہوا نے میری صحت میں بڑا فرق پیدا کر دیا ہے۔"

یہ خطوط کی شگفتگی کا عالم ہے۔ اسی سے علمی مضامین کے اسلوب کا بھی اندازہ کر لیجئے کہ آخر ذہن تو ایک ہی ہے جو دونوں جگہ کارفرما ہے۔

(چند علمی و ادبی شخصیتیں)

دلّی کا ایک دَور

شاہد احمد دہلوی

اب سے پچیس تیس سال پہلے دلّی میں میں نے جن بزرگوں کو دیکھا اور ان سے قریب ہونے کا بھی مجھے موقع ملا، ان میں سے بیشتر تو اللہ کو پیارے ہو گئے، باقی جو ہیں (اللہ انھیں ہزاری عمر دے) وہ چراغِ سحری ہیں۔ ان بزرگوں کے دم سے دلّی کچھ نہ رہ جانے پر بھی دلّی بنی تھی۔ یہ اگلے وقتوں کے لوگ تھے۔ ان کے دم قدم سے اگلی وضعداریاں قائم تھیں۔ دلّی کی تہذیب زندہ تھی۔ دلّی کی زبان ہانکے پکارے کہہ رہی تھی کہ "میری گل افشانی اب دیکھ لو، پھر تمھاری آنکھیں ڈھونڈا ہی کریں گی۔ میری البیلی من موہنی باتیں اب سُن لو، ورنہ کان ترستے ہی رہیں گے۔ میرے جادو کا اثر محسوس کر لو، بعد میں تمھارا دل پھڑکتا ہی رہ جائے گا۔"

وہ شکلیں ایک ایک کر کے مٹ گئیں۔ اُن کی یاد بھی اب دُھندلی پڑ گئی۔ اُن کے نورانی چہرے ماضی کے دھندلکوں میں چمکتے دکھائی دے رہے ہیں مگر ان کے نقوش مدھم اور مانند پڑتے جا رہے ہیں۔ میں یاد کا چراغ جلا کر ان مقدس شکلوں کو دیکھتا ہوں تو خواب کے سائے سے دکھائی دیتے ہیں۔ ڈرتا ہوں کہ کہیں یہ خواب، یہ سائے بھی نہ مٹ جائیں، کہیں عہدِ رفتہ کی بھول بھلیوں میں نہ کھو جائیں۔ اس لئے ان کے دُھندلے نقوش نذرِ نقوش کرتا ہوں۔ یہ طاقِ نسیاں کے چند مٹے مٹے سے نقش و نگار ہیں۔ کاش کوئی انھیں اجاگر کر دے!

شاہد احمد دہلوی

اُستاد بیخود دہلوی

منشی وحید الدین بیخودؔ دلّی کے ایک قدیم خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ تعلیم واجبی واجبی ہی تھی۔ داغؔ کے محبوب شاگرد تھے، داغؔ کے انتقال کے بعد بہادر شاہ بادشاہِ دہلی کے پوتے مرزا خورشید عالم نے جانشینی کی پگڑی بیخودؔ صاحب کے باندھ دی مگر دیکھتے ہی دیکھتے اُستاد کے سینکڑوں جانشین پیدا ہو گئے۔ ان میں سائلؔ دہلوی بھی تھے جن سے الجھنا بیخودؔ صاحب نے اپنا شعار بنا لیا تھا۔ دلّی کے مشاعرے اکھاڑے اور دنگل بن گئے اور

فرمانے لگے " در اصل یہ شعر ایک واقعہ سے متعلق ہے ۔ میں فلاں ریاست میں ملازم تھا ۔ رئیس کی محفل خاص روزانہ رات کو ہوتی ۔ جب دَور شراب چلتا تو رئیس کی منظورِ نظر طوائف جام بھر بھر کر مقربین کو پیش کرتی ۔ انکار کی مجال کسی کو نہ ہوتی تھی ۔ میں بھی اس سے جام لے لیتا اور مُنہ تک لے جا کر جھٹکے سے اپنے گریبان میں اُلٹ لیتا تھا ۔

بڑے آدمیوں کی بڑی کمزوریاں ۔ ہر سوال کا جواب ضرور دیتے تھے ۔ لاعلمی کا اظہار کبھی نہ کرتے ۔ اور جب کہیں مجبور ہو جاتے تو ناراض ہو کر بات کو ٹال جاتے ۔ ایک زمانے میں شہاب مودی کو غالب فلم بنانے کا خیال ہوا ۔ مرکالمے اور سینار یو منٹو نے لکھا تھا ۔ اس سلسلے میں وہ مجھے بھی بمبئی بلوانا چاہتے تھے مگر میں نے انکار کر دیا ۔ اس کے بعد اُن کے ایک ڈائرکٹر ندا مجھ سے ملنے دلّی آئے اور سو سال پہلے کے لباس وغیرہ کے متعلق مجھ سے کچھ پوچھنے لگے ۔ مجھے بہت کم باتیں معلوم تھیں ۔ میں اُنھیں لے کر بیخود صاحب کے ہاں پہنچا ۔ بیخود صاحب ملاقات کی غایت سُن کر کچھ خوش نہیں ہوئے ۔ آپ کہہ اٹھے " پوچھیے " ۔ ندا صاحب نے کہا مثلاً پالکی اور نالکی میں کیا فرق تھا اور ان کی شکلیں کیسی ہوتی تھیں ؟ بیخود صاحب جھنجھلا کر بولے " پالکی پالکی ہوتی ہے ، نالکی نالکی ۔ پالکی نالکی کیسے ہو سکتی ہے ، نالکی پالکی کیسے ہو سکتی ہے ؟ " میں نے دیکھا کہ یہاں دال نہ گلے گی ۔ مزاج بھی برہم ہے ۔ میں نے ندا صاحب سے کہا کہ آپ ایسا کیجیے کہ ایک فہرست بنا لیجیے ، پھر کسی دن حضرت کو زحمت دیجیے ۔ زحمت دینے کی پھر نوبت نہ آئی ۔

شاگرد بنانے تو شیر ہی ضرور لیتے ۔ ایک مہربان ایک صاحبزادہ کو لے کر پہنچے ۔ بیخود صاحب کبوتر اُڑانے میں چھت پر مصروف تھے ۔ بہت دیر تک انتظار کیا ۔ ہو کر نیچے بیٹھک میں آئے ۔ مہربان نے مٹھائی کی ٹوکری پیش کی اور عرض مدعا کیا ۔ ٹوکری تو اُن کا پوتا فوراً اندر لے گیا اور بیخود صاحب نے پوچھا " صاحبزادے ، شعر کہتے ہو ؟ " اس نے کہا " جی ہاں " ۔ فرمایا " سناؤ " ۔ شامتِ اعمال ، وہ غریب نہ جانے کس سے لکھوا لایا تھا ، ناموزوں شعر سنانے لگا ۔ بیخود صاحب ایک دم سے بکھر گئے ۔ گالیوں کا سیلاب اُمنڈ پڑا ۔ " نکل میرے گھر سے ، نکل " ۔ اور کوئی گالی ایسی نہ تھی جو اس پر صرف نہ کی گئی ہو ۔ کھڑے کھڑے اُسے گھر سے نکالا اور کُنڈی لگا اوپر جا کر پھر کبوتر اُڑانے لگے ۔

بیخود صاحب کی عمر اس وقت کوئی ۹۵ سال کی ہے ۔ حکومتِ ہند نے ڈیڑھ سو روپے ماہوار وظیفہ مقرر کر دیا ہے ۔ اسے بہت بڑی قدردانی تصور کرنا چاہیے ۔

میر باقر علی داستان گو

داستان گوئی کا فن اب ہمارے ہاں بالکل ختم ہو چکا ہے ۔ دلّی کے آخری داستان گو میر باقر علی تھے ۔ جن کے انتقال کو اب بیس برس سے اوپر ہو گئے ۔ دُبلے پتلے سے آدمی تھے ۔ سفید چھوٹی سی داڑھی ، سر پر دو پلّی ، پاؤں میں دیسی جوتی ، انگرکھا اور چُست پاجامہ پہنتے تھے ۔ عمر ساٹھ اور ستّر کے درمیان ۔ کھلتا ہوا رنگ ، ستواں ناک ، میانہ قد ۔ باتیں کرتے تو مُنہ سے پھول جھڑتے ۔ داستان سُنانے دُور دُور جاتے تھے ۔ رجواڑوں اور نوابین میں بلائے جاتے ۔ ایک زمانے میں ریاست پٹیالہ میں داستان سنانے کے لئے ملازم بھی رہے ۔ رئیس مر گیا تو دلّی واپس آ گئے ۔ املی کی پہاڑی پر گھر تھا ۔ آخری وقت میں افلاس نے گھیر لیا تھا ۔ سیٹھا ایسا پایا کہ میر صاحب کی پرسش ختم ہو گئی ۔ دلّی کے ہندو رئیس چُھنّامل کے ہاں کسی وقت میں چالیس پچاس روپے ماہوار پر ملازم تھے ۔ چُھنّامل والوں کا بیان ہے کہ ہم میر صاحب سے بچپن سے داستان سن رہے ہیں ۔ بیس پچیس سال ہو گئے ، ایک داستان ہی ختم ہونے میں نہیں آتی ۔ میرے بچپن میں میر صاحب قرائش خانہ میں داستان سنایا کرتے تھے ۔ ہفتے میں ان کا ایک دن مقرر تھا ۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ داستان کہتے ۔ برسوں یہ سلسلہ جاری رہا ۔ داستان کا ایک حصّہ سنانے پائے تھے کہ یہ سلسلہ ختم ہو گیا ۔ میر صاحب ہمیشہ داستانِ امیر حمزہ ہی سنایا کرتے ۔ ایک نے اُن سے پوچھا کہ میر صاحب ، یہ داستان کبھی آپ نے ختم بھی کی ہے ؟ بولے " عمر بھر میں

مولوی عنایت اللہ

شمس العلماء منشی ذکاء اللہ کے صاحبزادے مولوی عنایت اللہ نے بھی اپنے والد کی طرح ترجمہ کرنے میں بہت نام پایا۔ بلکہ سر سید احمد خاں نے اپنے ایک خط میں ذکاء اللہ کو لکھا تھا کہ "تمہارا لڑکا تم سے اچھا ترجمہ کرتا ہے"۔ مولوی صاحب نے سرسید کے زمانے میں علی گڑھ میں پڑھا تھا اور بی۔ اے کرنے کے بعد سرسید کے پرائیویٹ سکریٹری کے فرائض انجام دینے لگے تھے۔ سرسید احمد کی فرمائش پر مولوی صاحب نے سر ولیم میور کی کتاب سیرت نبوی کا ترجمہ کیا تھا۔ اسی ترجمے سے مولوی صاحب کی شہرت کا آغاز ہوا۔ مولوی صاحب مختلف سرکاری ملازمتوں پر مامور رہے۔ جب حیدرآباد میں عثمانیہ یونیورسٹی کے سلسلے میں دارالترجمہ قائم ہوا تو عنایت اللہ صاحب اس کے ناظم مقرر کئے گئے۔ اس ملازمت میں آنے سے پہلے مولانا نے جغرافیہ اندلس اردو میں ترتیب دیا تھا۔ یہ عظیم علمی کارنامہ دارالترجمہ سے شائع ہوا۔ اس پر دس ہزار کا انعام انھیں ریاست سے ملا تھا۔ مولانا فرماتے تھے کہ یہ کتاب میری ساری عمر کی محنت کا نتیجہ ہے اور اس پر وقتاً فوقتاً جو خرچ ہوا وہ بارہ ہزار سے کم نہیں۔ مولانا نے دارالترجمہ کے لئے اور بھی بعض دقیق کتابوں کے ترجمے کئے تھے۔ ڈوزی کی تاریخ کا ترجمہ انھوں نے خود اپنے صرفہ سے دو جلدوں میں چھپوایا تھا اور کوئی اور پرانی مغلوں کی تاریخ تھی، چار ضخیم جلدوں میں، اس کا ترجمہ فرصت میں کرتے رہتے تھے۔ ایک دفعہ مجھے لکھا کہ "تین جلدوں کا ترجمہ کر لیا ہے، چوتھی کا شروع کر دیا ہے۔ دیکھئے ترجمہ پہلے ختم ہوتا ہے یا زندگی"۔ بارے اُن کے انتقال سے پہلے چاروں جلدوں کا ترجمہ ہو گیا تھا۔ یہ ترجمہ جمیرز ڈکشنری سائز کی چار مجلد کاپیوں میں اُن کے پاس تھا اور فرماتے تھے کہ "علی گڑھ یونیورسٹی لائبریری کے لئے یہ جلدیں بھیج دوں گا۔ چھپنا تو اس کا ناممکن ہے"۔

مولوی صاحب کو میں نے پہلے "زلفی" اور پھر "ٹائمیں" کے ذریعے جانا۔ اُن سے ملنے کا بڑا اشتیاق تھا مگر کوئی دس سال بعد اُن سے پہلی ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ مولوی صاحب حیدرآباد میں ایک عالی شان کوٹھی میں رہتے تھے۔ میرے برادر نسبتی سید وزیر حسن اُن سے ملانے مجھے لے گئے۔ گورا رنگ، سفید مونچھیں، داڑھی صاف، چھوٹے قد کے دھان پان سے آدمی تھے۔ سُرخ مخمل کی ٹوپی اُن کے سفید بالوں اور اُجلے رنگ پر بڑی بھلی لگتی تھی۔ محبت سے ملے۔ بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔ بھولی بھولی باتیں کرتے تھے۔ حیدرآباد کی سازشوں سے سخت بیزار تھے۔ ادبی گفتگو بھی ہوئی۔ "ٹائمیں دتی ہیں" ایک مضمون سید وزیر حسن نے لکھ کر ساقی میں چھپوایا تھا۔ اس سے متأثر اور خوش تھے۔ مولانا نے فرمایا "عجیب بات ہے یہ کتاب سب کو پسند آئی ہے۔ راس مسعود کہتے ہیں کہ تمہارے ترجمے میں جو لطف ہے وہ فرانسیسی زبان کی اصل کتاب میں بھی نہیں۔ مگر مجھے ٹائمیں سے زیادہ نجم السحر پسند ہے"۔ میں نے پوچھا "نجم السحر کہاں سے شائع ہوئی ہے؟" کہا "مسودہ رکھا ہوا ہے۔ چھاپے کون؟" یہ کہہ کر الماری میں سے اس کا مسودہ نکال لائے۔ میں نے کہا "اگر آپ پسند فرمائیں تو میں اسے چھاپ دوں"۔ بہت خوش ہوئے اور بولے "لے جائیے"۔ میں نے کہا "گستاخی معاف، معاوضہ بھی فرما دیجئے"۔ حیرت سے دیکھ کر بولے "معاوضہ! معاوضہ تو آج تک کسی نے مجھے نہیں دیا اور نہ میں نے مانگا۔ کتاب چھپ جائے، بس یہی بہت ہے۔ میں نے تو جتنی کتابیں چھپوائیں (انھوں نے دو بڑے اداروں کے نام لئے) انھوں نے کتابوں کی پوری لاگت مجھ سے لی اور ہمیشہ انھیں نقصان ہوا۔ آپ نجم السحر چھاپ دیجئے مگر میں اس میں روپیہ نہیں لگا سکتا۔ دیکھ لیجئے کہیں آپ کو اس کے چھاپنے میں نقصان نہ ہو جائے"۔

اس کے بعد مولانا سے تعلقات بہت بڑھ گئے۔ وہ حیدرآباد سے دل برداشتہ ہو کر یکایک دِلی چلے آئے۔ بارہ پندرہ ہزار روپیہ انعام کا ملنے والا تھا وہ بھی چھوڑا۔ چند روز دِلی میں رہے، اس کے بعد دہرہ دُون میں ایک کوٹھی خرید کر وہیں رہنے لگے۔ اب انھیں فرصت ہی فرصت تھی۔ میری فرمائش پر انھوں نے کئی ترجمے کئے جن میں سلامبو بھی شامل ہے۔ جانسن کی راسِلاس کا ترجمہ بالاقساط ساقی میں چھپا۔ پھر

شیکسپیئر کے ڈراموں کے ترجمے کرنے شروع کئے تو بارہ چودہ ڈراموں کو اُردو میں منتقل کر دیا۔

گرمیوں کے دو سیزن میں نے دہرہ دُون اور مسوری میں گزارے۔ میرا کرایہ کا بنگلہ مولوی صاحب کی کوٹھی کے قریب ہی تھا۔ بیشتر وقت مولانا ہی کے ساتھ گزرتا تھا۔ پُرانے منسٹیوں کی سی زندگی تھی۔ ساری عمر شادی نہیں کی۔ دس بارہ کمروں کی عمدہ کوٹھی تھی۔ مولوی صاحب نہایت نفاست سے رہتے تھے۔ گھنٹوں ترجمہ کرتے۔ انھیں اور کوئی کام ہی نہیں تھا۔ بہت کم دوست تھے۔ ویسے بھی مولانا کم آمیز بلکہ مردم بیزار تھے۔ دہرہ دُون کے دَوران قیام میں میں صبح شام ان کے پاس جایا کرتا تھا۔ اگر کسی دن نہ جاتا تو خود مجھے بلانے آجاتے۔ اُن کی پُرانی باتوں میں میرا بھی جی لگا رہتا۔

اسی زمانے میں مولانا کے چھوٹے بھائی کی لڑکی سے میرے ایک بھائی کی شادی ہوگئی۔ مولوی صاحب شادی میں شریک تھے۔ نکاح کے بعد بولے "اِس شادی سے دو شمس العلماؤں کے خاندان ایک ہوگئے۔ مفتی ذکاءُ اللہ اور مولوی نذیر احمد دلّی کالج میں ہم جماعت تھے۔ ان دونوں میں اتنی محبت تھی کہ سگے بھائیوں میں بھی کیا ہوگی۔ جب آپا کے انتقال کی خبر میں نے مولوی صاحب کو دی تو آبدیدہ ہو کر بولے ذکاءُ اللہ نے جلدی کی۔ ساتھ ہی چلتے"۔

آخری بار جب مجھے ان کی علالت کی اطلاع ملی تو میں اُن سے ملنے گیا۔ اندر کمرۂ خواب میں اکیلے لیٹے ہوئے تھے۔ نحیف آواز میں بولے "معاف کیجئے، میں تکلیف کی وجہ سے اُٹھ نہیں سکتا۔ مرنے کا کوئی ہراس نہیں مگر مرض کی گندگی سے سخت پریشان ہوں"۔ کھانسی بہت سخت تھی۔ میں تھوڑی دیر بیٹھ کر چلا آیا۔ بیچ میں طبیعت کچھ سنبھل گئی تھی یا انھوں نے سنبھالا لیا تھا۔ ایک دن صبح کو لان میں کرسی ڈلوا کر بیٹھے۔ مالی پھولوں کی کیاریاں ٹھیک کر رہا تھا۔ مولوی صاحب کو کھانسی اُٹھی اور اس غضب کی اُٹھی کہ کرسی ہی میں منکا ڈھلک گیا۔ مالی نے دوڑ کر سہارا دیا، مگر وہاں کیا رکھا تھا؟ طائرِ روح قفسِ عنصری سے پرواز کر چکا تھا۔

شمس العلما مولوی عبدالرحمٰن

مولوی صاحب مشن کالج دہلی میں عربی کے پروفیسر تھے۔ عربی، فارسی اور اُردو تینوں زبانوں میں غیر معمولی قابلیت رکھتے تھے۔ مگر بڑے لٹھڑ اور سست آدمی تھے۔ کبھی نام و نمود کی طرف توجہ نہ کی۔ بہت کچھ لکھ سکتے تھے مگر کچھ نہ لکھا۔ نہ جانے "مراۃ الشعر" بھی کیسے لکھ گئے۔ کالج میں یہ "بڑے مولی صاحب" کہلاتے تھے۔ ان کی سنجیدگی، بُردباری اور علمی قابلیت کی وجہ سے عیسائی پرنسپل تک ان کا احترام کرتا تھا۔

میں نے جب انگریزی ادب میں بی۔ اے کیا تو خیال ہُوا کہ اب فارسی ادب میں ایم۔ اے کرنا چاہیئے۔ اُس زمانے میں فارسی کے پروفیسر ڈاکٹر اظہر علی تھے جو ڈاکٹریٹ کے لئے ولایت گئے ہوئے تھے۔ کالج میں ایک نئے پروفیسر آگرہ سے آئے تھے۔ انھوں نے نظامی پڑھانا شروع کیا۔ وہاں بسم اللہ ہی غلط ہوگئی۔ چھوٹتے ہی عربی کا شعر آگیا۔ پوچھنے لگے "مولانا، آپ کو عربی آتی ہے؟" میں نے کہا "نہیں"۔ بولے "مجھے بھی نہیں آتی۔ آپ عربی کے شعر بڑے مولوی صاحب سے پوچھ لیجئے گا"۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی قصائدِ قاآنی پڑھانے بیٹھے۔ اُن سے اشعار کے معنوں میں اختلاف ہُوا تو بولے "ہاں یہ معنی بھی ہوسکتے ہیں۔ بلکہ بہتر معنی یہی ہیں۔ آپ تو خود اچھی فارسی جانتے ہیں۔ کوئی شعر دشوار معلوم ہو تو پوچھ لیا کیجئے"۔ اس کے بعد ڈاکٹر صاحب سے دوبارہ ملنے کی نوبت نہ آئی۔ فارسی والے مولوی صاحب نے کچھ دن تو کام چلایا پھر وہ کالج ہی چھوڑ کر چلے گئے۔ بڑے مولوی صاحب سے کبھی ملنے کا اتفاق نہیں ہُوا تھا۔ لڑکے ان کے رعب میں ہی مرے جاتے تھے۔ میں بھی کچھ تنگ ہی آگیا تھا۔ جان پر کھیل کر مولوی صاحب سے اسٹاف روم میں ملا اور انھیں بتایا کہ کوئی پڑھانے والا نہیں۔ مولوی صاحب نے فرمایا "آپ میرے گھر آجایا کیجئے مگر بہت سویرے آنا پڑے گا، صبح کی نماز کے فوراً بعد"۔ میں نے بہ جبر اسے منظور کیا اور مولانا کے گھر سورج نکلتے ہی پہنچ جاتا۔ مولانا

نے چند مہینے میں "وقائع نعمت خانِ عالی" اور "اخلاقِ جلالی" دو کتابیں پڑھائیں۔ دوسری کتاب ابھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ رمضان شریف آ گئے مولانا روزے رکھتے تھے۔ میں اب گویا ان کے آرام میں مخل ہونے لگا۔ وہ سر سے پاؤں تک کمبل تانے پلنگ پر پڑے رہتے اور میں بہ آوازِ بلند پڑھتا رہتا۔ جہاں اٹکتا وہ فوراً آگے بڑھ جاتے۔ ایک دن پہنچا تو ایک اور شاندار بزرگ ان کے پاس بیٹھے دکھائی دیئے۔ بڑی بے تکلف اور مذاق کی باتیں ہو رہی تھیں۔ وہ بھی یہی چھینک رہے تھے کہ تم کوئی کام کیوں نہیں کرتے اور مولوی صاحب انھیں بہ لطائف الحیل ٹال رہے تھے۔ ان کے جانے کے بعد مولوی صاحب نے بتایا کہ مسلم یونیورسٹی کے پروفیسر ہیں تھے۔

ایک دن میں حسبِ دستور پڑھ رہا تھا اور مولوی صاحب کمبل تانے پڑے تھے کہ کسی عربی کے فقرے پر اٹک گیا۔ مولوی صاحب نے کہا "رُک کیوں گئے؟" میں نے کہا "جی عربی ہے۔" بولے "تو کیا ہوا؟" میں نے کہا "ممکن ہے کوئی قرآن کی آیت ہی ہو۔ غلط پڑھ جاؤں گا۔" فرمایا "آپ پڑھئے، عذاب ثواب مجھ پر ہوگا۔" میں نے بھی دھڑ کے عربی کو اردو کی طرح گھسیٹ ڈالا۔ مولوی صاحب نے کہا "سبحان اللہ سبحان اللہ! مولوی نذیر احمد کے پوتے اور قابلیت کا یہ حال!" اُس وقت ہم اپنے آپ کو بڑا قابل سمجھتے تھے۔ مولوی صاحب کا کہنا بہت برا لگا۔ بھولے کہ بیٹھے رہے۔ اب مولوی صاحب للکارتے ہیں "ہاں صاحب، پڑھیئے۔ ارے بھئی آگے چلو۔" مگر یہاں گم سُم بیٹھے تاؤ کھا رہے ہیں۔ مولوی صاحب سمجھ گئے کہ صاحبزادے اکڑ گئے۔ اُٹھ بیٹھے اور کمبل ہٹا کر بولے "بہت غصہ آتا ہے آپ کو؟" میں نے کہا "جی ہاں آتا ہے۔ یہ کوئی میرا قصور ہے کہ میں مولوی نذیر احمد کے ہاں پیدا ہوا؟ نہیں آتی مجھے عربی۔" فرمایا "ارے بھئی تو میں نے کیا تمھیں منع کیا ہے عربی بھی پڑھ لیا کرو۔" میں نے کہا "بس مولوی صاحب، پڑھائی تو آج ختم ہو چکی۔ کل سے میں نہیں آؤں گا۔" مولوی صاحب سمجھے مذاق سے کہہ رہا ہے۔ ہنس کر چپکے ہو رہے۔ مگر میں اُس دن کے بعد نہ تو مولوی صاحب کے ہاں گیا اور نہ کالج۔ کئی دن بعد میں اپنے ماموں کے ساتھ لال کنوئیں سے گذر رہا تھا کہ سامنے سے مولوی صاحب آتے دکھائی دیئے۔ ماموں سے ان کے دیرینہ مراسم تھے۔ اس لئے وہ لپک کر مولوی صاحب کی طرف چلے۔ مجھے بھی جانا پڑا۔ ماموں نے سلام کے بعد مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا تو مولوی صاحب نے فرمایا "نہیں، پہلے ان سے پوچھئے کہ یہ روٹھے ہوئے شاگرد ہیں۔" مجھ پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ مولوی صاحب نے کہا "ہاں بھئی، اُستاد زادہ ہیں۔ ہمیں تو ان کا احترام ملحوظ رکھنا ہی پڑتا ہے۔" گویا اوپر سے پانچ جوتے اور مار دیئے۔ ماموں نے بعد میں بتایا کہ مولوی صاحب نے تمھارے دادا سے بھی ایک زمانے میں پڑھا ہے۔ اِس واقعہ کے بعد مولوی صاحب سے کبھی کبھی ملاقات ہوتی رہی۔ انھوں نے معافی کے لئے کچھ لکھا بھی مگر تعلیم کا دروازہ مجھ پر ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا۔

ایک عرصے کے بعد مولوی صاحب کو کراچی میں دیکھا۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی وزیر بن گئے تھے۔ انھیں مشن کالج والوں نے "خوشنامہ" دیا تھا۔ مولوی صاحب ڈاکٹر اشتیاق کے بھی اُستاد رہ چکے تھے۔ اس لئے اُنھیں خاص طور پر جا کر لایا گیا تھا۔ میں نے کوئی بیس سال کے بعد مولوی صاحب کو دیکھا۔ بالکل سُوکھ گئے تھے۔ آنکھوں سے کم دکھائی دیتا تھا۔ بہرے بھی ہو گئے تھے۔ میں آگے بڑھ کر اُن سے لپٹ گیا۔ ان کے لڑکے نے کان میں چیخ کر کہا "شاہد احمد دہلوی ہیں۔" فرمایا "اچھا!" پھر بڑی محبت سے دیکھ کر بولے "بھائی اندھا ہو گیا، بہرا ہو گیا، معاف کرنا۔" میرا دل بھر آیا۔ کچھ نہ کہہ سکا۔ بس یہ اُن سے آخری ملاقات تھی۔ کسی نے بعد میں بتایا کہ وزیر صاحب ان کے شاگرد ہیں۔ مگر مولوی صاحب کے پاس رہنے کو گھر تک نہیں ہے۔ کسی نے توجہ بھی دلائی مگر دُعا قبول نہ ہوئی۔ مالی دُشواریوں، بیماریوں اور سخت پریشانیوں میں چند مہینے ہوئے یہ آفتابِ علم و ادب کراچی کے ایک بوسیدہ سے کمرے میں غروب ہو گیا۔

[illegible]

[illegible] (PROPAGANDIST) [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

خواجہ صاحب نے شہرت حاصل کرنے کے لئے کوئی ذریعہ نہ چھوڑا۔ اُن کی شہرت کا آغاز ان کے حُلیے سے ہوا۔ نمایاں ہونے کے لئے انھوں نے اپنی وضع قطع سب سے الگ بنائی۔ پیلے رنگ کی قبہ نما ٹوپی۔ چھریری داڑھی، شانوں پر بل کھائے ہوئے کاکل، ٹخنوں تک کی قبا۔

جب شُدھی نے سوامی شردھانند کی سرکردگی میں بہت زور پکڑا تو اُنھوں نے اُسے مباہلہ کا جو چیلنج دیا وہ بھی دُنیا سے نرالا تھا۔ خواجہ صاحب نے کہا "آؤ ہم اور تم دونوں جامع مسجد کے مینار پر سے چھلانگ لگاتے ہیں۔ جو سچا ہوگا وہ بچ جائے گا جو جھوٹا ہوگا مر جائے گا" اس کے لئے اُنھوں نے دن اور وقت بھی مقرر کر دیا اور وقت مقررہ پہ جامع مسجد پہنچ بھی گئے۔ ہزاروں آدمی یہ تماشہ دیکھنے جمع ہو گئے تھے مگر شردھانند نہیں آئے۔

انگریز یا کوئی اور غیر ملکی حکومت اگر مسلمانوں کے ساتھ کبھی بھلائی کرتی تو خواجہ صاحب "تمام ہندوستان کے مسلمانوں کی طرف سے" اس کا شکریہ ادا کرتے۔

سیاسی اعتبار سے خواجہ صاحب نے کئی قلابازیاں کھائیں۔ کبھی کانگریس کا ساتھ دیا، کبھی مسلم لیگ کا، اور کبھی دونوں سے الگ ہوگئے۔ کبھی مسٹر جناح کی مخالفت کرتے اور کبھی حمایت۔ جب پاکستان بننے کا یقین ہو گیا تو مسلم لیگ کی حمایت میں اتنا غلو کیا کہ قرآنِ کریم کی ایک آیت پیش کر کے مولانا ابوالکلام آزاد کو واجب القتل ٹھہرا دیا۔

خواجہ صاحب نرم دل بھی اتنے ہیں کہ روپے پیسے اور سعی و سفارش سے ہر ایک کی مدد کرنے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ انھوں نے ہزاروں آدمیوں پر احسانات کئے ہیں، اور اکثر اپنی غلط بخشیوں سے نقصان اُٹھایا۔ زندہ دلی میں اب بھی اُن کا جواب نہیں۔ بڑے مضبوط اعصاب کے آدمی ہیں۔

میر ناصر علی

دُبلے پتلے، کمر جھکی ہوئی، اسّی کے پیٹے میں، گندمی رنگ، خشخاشی داڑھی، سر پر عمامہ، لمبا سا چُغہ، پیچھے ہاتھ باندھے، میر صاحب روزانہ تیسرے پہر جھومتے جھامتے اپنی حویلی "نمک والوں کے پھاٹک" میں سے برآمد ہوتے اور فراش خانہ کی دو ایک دکانوں پر بیٹھکیاں لیتے لال کنواں، سرکی والان، حوض قاضی، چاوڑی بازار، ہیبل ملے کرتے ہوئے مغرب کے لگ بھگ چوک پہ پہنچ جاتے۔ آندھی جائے مینہ جائے ان کے اس روزانہ کے معمول میں فرق نہ آتا تھا۔ چوک پہنچ کر کباڑیوں میں گھس جاتے۔ پُرانی کتابیں، پُرانے زیورات دیکھتے بھالتے، بھاؤ تاؤ کرتے، پیسے کی جگہ چار پیسے دیتے اور خوش خوش اپنا مال اُٹھائے پھر اسی طرح جھومتے جھامتے اسی راستہ سے اپنے گھر عشا کے وقت پہنچ جاتے۔ میر صاحب نے نمک کے محکمے میں پچیس سال ملازمت کی تھی اور کوئی پینتالیس سال پنشن کھائی تھی۔ پنشن خواروں میں دِلّی کے دو بڈھے مشہور تھے، ایک میر ناصر علی اور دوسرے پنڈت امرناتھ ساحر۔ یہ دونوں تقریباً ہم عمر تھے اور مرے بھی بہت تھوڑے وقفے سے۔ اعلیٰ کارکردگی اور حکام رسی کی وجہ سے میر صاحب کو خان بہادر کا خطاب بھی ملا تھا۔

میر ناصر علی جیسا فلسفیانہ انشاپرداز اُردو میں اور کوئی پیدا نہیں ہوا۔ انگریزی ادب میں اگر ان کے مقابلہ پر کوئی ٹھہرتا ہے تو بیکن۔ مگر وہ بھی نازک خیالی میں ان کے آگے گرد ہو جاتا ہے۔ میر صاحب نے اپنی ساٹھ سال کی طویل ادبی زندگی میں بہت لکھا اور بڑے بڑے معرکے سر کیے۔ سرسید کے تہذیب الاخلاق کے جواب میں "تیرھویں صدی" اور پھر "ناصری" نکالا۔ میر صاحب کے آبا و اجداد اپنے وقت کے بڑے عالم فاضل سمجھے جاتے تھے اور مناظرہ کرنے میں دُور دُور مشہور تھے۔ ایسے مذہبی ماحول میں تربیت پانے کی وجہ سے علم دین سے کما حقہٗ واقفیت رکھتے تھے۔ اس پر طرہ

تعلیم سونے پر سہاگہ ہوگئی۔ سرسید کی آزاد خیالی کے سانچے میں ڈھلتے تھے۔ مگر آخر آخر میں خود دہریے مشہور ہو گئے تھے۔ کوئی تیس سال تک اُن کا رسالہ "صلائے عام" جاری رہا۔ ایک زمانے میں اس کا طوطی بولتا تھا۔ بیشتر مضامین میر صاحب ہی کے ہوتے تھے۔ نظر نکتہ رس تھی، بال کی کھال نکالتے۔ ریاض خیر آبادی، مہدی افادی، نیاز فتحپوری اور دلگیر اکبر آبادی صلائے عام کے لکھنے والوں میں تھے۔ میر صاحب کے قدر دان مرتے گئے "صلائے عام" سسکنے لگا۔ مگر مرتے دم تک انھوں نے پرچہ بند نہ ہونے دیا۔ اپنی پنشن میں سے دو سو روپے اس کے اخراجات کے دیتے تھے اور صرف سو کاپیاں چھپ کر قدردانوں میں تقسیم ہو جاتیں۔ اگر کوئی خریدار چندہ بھیج دیتا تو اس کا چندہ واپس کر دیتے کہ "یہ پرچہ آپ کی سمجھ میں نہیں آسکے گا۔ کچھ اور پڑھیے۔" لوگ عقیدت سے ملنے آتے مگر ان کی اکھڑی اکھڑی باتیں سن کر مایوس لوٹتے۔ میر صاحب پرانے منتشام فلسفیوں کی سی زندگی گزارتے تھے۔ ایک زمانے میں ان کا ذاتی کتب خانہ اتنا عمدہ تھا کہ لالہ سری رام کے بعد انہی کے کتب خانے کا نمبر آتا تھا۔ جب میر صاحب زیادہ بوڑھے ہو گئے اور ذہن بٹنے لگا تو ان کا بیش بہا ذخیرۂ کتب چوری ہو کر کوڑیوں کے مول کباڑیوں میں بکنے لگا۔ میر صاحب شام کو چوک جانے تو اپنے کتب خانے کی کتابیں نہ مانگے دموں پر پھیر کر لاتے۔ گھر میں رہنے والے پوتوں نواسوں نے میر صاحب کو گھکھہ کر دیا۔

میر صاحب راستہ چلتے چلتے جھکے تے کسی لونڈے کے چانٹا مار دیتے۔ وہ پلٹ کر بُری سی گالی دیتا اور میر صاحب کے دل کی کلی جیسے کھل جاتی "آہا ہا ہا۔ دلّی کا روڑا ہے نا۔ کیا بات کہی ہے، مزہ آگیا" اور میر صاحب جھومتے چلے جاتے۔

میر صاحب اپنی قابلیت کے آگے کسی کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ نواب سائل سے کہتے "ارے بھئی تو تو نواب ہے۔ شاعر کہاں؟ ہم نے دیکھا نہیں کہ کبھی اُن کے ہاں احباب جمع ہوئے ہوں۔ سب اُن کی کڑوی کسیلی باتوں سے گھبراتے تھے۔ اکثر تو انھیں سڑی کہتے اور بعض "پاگل ڈپٹی"۔ لیکن اصل بات یہ تھی کہ وہ بڑے نفیس مزاج اور نفیس خیال آدمی تھے۔ انھیں نئی نسل کے لوگوں کی کوئی بات پسند نہ آتی تھی۔ حد یہ کہ گفتگو بھی۔ جانتے تھے کہ کسی سے ملوں گا تو مجھے صدمہ پہنچے گا۔ اور کچھ نہیں تو غلط محاورہ یا غلط لفظ ہی بولے گا اور میرے کان خراب ہوں گے۔ چنانچہ ایک بڑے ادیب سے محض اس لئے ناراض ہو گئے کہ اُس نے کہیں "معافی مانگنا" کہہ دیا۔ میر صاحب بولے "میاں بھیک مانگو بھیک۔ معافی کیا مانگنے ہو بھیک مانگو!"

میر ناصر علی میر تقی میر کی طرح مردم بیزار اور بددماغ ہو گئے تھے۔ مگر جو اُن کے مزاج کو پا گئے تھے وہ ان کی باتوں سے بہت کچھ سیکھ کر اُٹھتے تھے۔ چھیاسی برس کی عمر پائی۔ افسوس کہ آج میر صاحب کے نام سے بھی کم آدمی واقف ہیں۔

علّامہ راشد الخیری

دلّی کے ایک ممتاز مولویوں کے خاندان سے مولانا کا تعلق تھا۔ والد حیدر آباد دکن میں ملازم تھے اور بیوی بچوں سے بے پروا۔ مولانا کو ان کی اماں نے پالا اور میٹرک تک تعلیم دلائی۔ ددھیال میں سب عالم اور واعظ تھے۔ مولانا نے بھی ابتدا میں وعظ کہنا شروع کیا تھا مگر ابتدا میں ایک مقامی سرکاری دفتر میں ملازمت کر لی تھی۔ مولانا بچپن ہی سے بڑے غیور تھے۔ اس لئے ابتدائی عمر عسرت میں بسر ہوئی۔ لکھنے پڑھنے کا شوق بچپن سے تھا۔ شروع کے مضامین اپنے پھوپھا مولوی نذیر احمد دہلوی کو دکھائے اور ان سے اصلاح لی۔ جب مخزن نکلا تو اس میں ان کے مضامین شائع ہونے لگے اور دُنیائے ادب میں مشہور ہونے لگے۔ سر عبدالقادر دہلی آ گئے تو ان سے مولانا کے روابط بڑھ گئے اور جب وہ بیرسٹری کے لئے انگلستان گئے تو ادارت کے فرائض مولانا کو سونپ گئے۔ اسی زمانے میں مولانا نے لکھنے کی مشق بڑھائی۔ اُس زمانے میں کم پیسوں میں دائمی حقوق خرید کر دلّی کے بعض ناشر کتابیں چھاپا کرتے تھے۔ انہی میں سے ایک سے مولانا کو بھی کچھ تعلقِ خاطر تھا۔ مولانا نے اپنی ابتدائی تصانیف ان صاحب کے ہاتھ اونے پونے بیچیں۔ ہوتا یہ کہ جب کبھی مولانا کو کچھ روپے کی ضرورت ہوتی، دو چار دن میں ایک ناول لکھ کر بیچ ڈالتے۔ مولانا نے پچاس پچاس روپے میں اپنی بعض کتابوں کا حقِ تصنیف بیچ ڈالا تھا۔ عجب بے نیاز طبیعت پائی تھی۔ سستی فروخت کا یہ سلسلہ اُس وقت ختم ہوا

جب واحدی صاحب نے مولانا سے کتابیں معقول معاوضے پر لکھوانی شروع کیں۔ مولانا اُس زمانے میں ضرورت کے تحت لکھتے تھے۔ اب ان سے، اگر ان کی کوئی ضرورت اٹکی نہ ہو تو، کیسے لکھوایا جائے؟ واحدی صاحب نے ان سے دو تین گھنٹے روزانہ لکھتے رہنے کا معاہدہ کیا۔ مولانا گھر سے آتے تو واحدی صاحب ان کی ضرورت کی سب چیزوں کے ساتھ انھیں ایک کوٹھڑی میں بند کر دیتے اور مولانا دو تین گھنٹے تلے کر پسینے میں شرابور باہر نکلتے۔ اس طرح "صبح زندگی"، "شام زندگی"، "شب زندگی" وغیرہ لکھی گئیں۔ اسی عرصے میں مولانا نے اپنا پرچہ "عصمت" خواتین کے لئے جاری کر دیا تھا۔ مولانا نے سرکاری دفتر کی ملازمت چھوڑ دی تھی۔ گھر کا خرچ قلم چلا کر مہیا کرتے۔ پھر وہ زمانہ آیا کہ ان کے بڑے صاحب زادے رازق الخیری صاحب "عصمت" مرتب کرنے اور "عصمت" ایک ڈپو قائم کرنے میں ان کا ہاتھ بٹانا شروع کیا اور رازق صاحب کی محنت ہی سے ادارہ "عصمت" نے وہ فروغ پایا کہ آخری عمر میں مولانا دلّی کے اچھے خاصے رئیس آدمی سمجھے جاتے تھے۔

مولانا نے نامساعد حالات میں ہوش سنبھالا تھا اور بڑی صعوبتیں برداشت کی تھیں۔ ان کا دل بہت کمزور تھا۔ ذرا سے غم پر بھر آتا۔ ذرا سے دکھ پر (چاہے پرایا ہی کیوں نہ ہو) تڑپ اُٹھتا۔ مسلمان عورتوں کے حقوق کے لئے ساری عمر لڑتے رہے اور اپنی زندگی میں اپنے مشن کو کامیاب ہوتے دیکھا۔ دل کی اس کمزوری نے انھیں مصورِ غم بنا دیا۔ اردو ادب میں ان سے زیادہ دردناک ٹریجڈی اور کسی نے نہیں لکھی۔ لوگ طنز یہ انھیں "رونے رُلانے کے اُستاد" کہتے تھے۔ ایک صاحب نے تو یہاں تک لکھ دیا کہ مسلمان عورتوں کو دق ہونے کے جو اسباب ہیں ان میں سے ایک سبب مولانا راشد الخیری کی کتابیں بھی ہیں۔ مگر وہ شاید یہ بھول گئے کہ مولانا نے عورتوں کو اُس لمبی بیماری سے چھڑایا جس میں مردوں نے انھیں مبتلا کر رکھا تھا۔

مولانا نے ایک کتاب بڑے اہتمام و احترام سے لکھی ہے۔ یہ کتاب ہے "آمنہ کا لال"۔ مولانا عاشقِ رسول تھے۔ یہ کتاب بڑی محنت و عقیدت سے بھی لکھی گئی ہے۔ مولانا روزانہ اس کے لکھنے سے پہلے غسل فرماتے، اُجلے کپڑے پہنتے، خوشبو لگاتے، مصلّیٰ بچھاتے، نماز پڑھتے، اگر بتیاں اور لوبان سُلگاتے، پھر لکھنے بیٹھتے۔ ان کی باقی سب کتابیں اور مضامین قلم برداشتہ لکھے گئے ہیں۔

مولانا رانڈ بیواؤں، یتیموں اور غریب رشتہ داروں کی روپے پیسے سے مدد کرتے رہتے تھے۔ اور اس خاموشی کے ساتھ کہ اس ہاتھ کی خبر اُس ہاتھ کو نہ ہوتی تھی۔ اُن کے انتقال کے بعد معلوم ہوا کہ غریبوں اور مسکینوں کا کتنا بڑا حلقہ ان کے سہارے پل رہا تھا۔

مولانا کو بدزبانی یا بدکلامی کرتے ہم نے کبھی نہیں دیکھا۔ ہم نے انھیں کبھی غصّہ آتے بھی نہیں دیکھا۔ اپنے عزیزوں کے لئے بے قرار رہتے۔ ایک ایک کے گھر جا کر خیریت معلوم کرتے۔ بیوی بچوں پر تو جان ہی چھڑکتے تھے۔ اسی دَور میں صادق الخیری کو موتی جھرہ ہوا تو دیوانہ وار ان کے پلنگ کے چکر کاٹتے رہتے۔ راتوں کو پٹی کے پاس بیٹھے رہتے۔ بچوں سے بڑی خوش مزاجی سے پیش آتے، بلکہ اکثر ان سے ہنسی مذاق کی باتیں بھی کرتے۔ ہم عمر بے تکلف دوستوں سے وہ چھوٹ کا مذاق ہوتا کہ الٰہی توبہ! بالخصوص قاری سرفراز حسین اور خواجہ فضل احمد شیدا سے۔

علامہ راشد الخیری بڑے صابر و ضابط آدمی تھے۔ مرض الموت میں مبتلا ہوئے تو ہمیشہ یہی ظاہر کرنے کی کوشش کرتے رہے کہ گویا مرض بہت معمولی ہے اور طبیعت ٹھیک ہے۔ انتقال سے چند روز پہلے دلّی کے ایک ماہر امراض سینہ نے معائنہ کے بعد نہایت بھونڈے پن سے اعلان کر دیا کہ پھیپھڑے کا کینسر ہے اور مریض کے بچنے کی کوئی اُمید نہیں۔ مولانا اس کی ضرورت سے زیادہ صاف گوئی پر برافروختہ ہو گئے۔ بولے "ڈاکٹر صاحب، میں جانتا ہوں کہ میں مر رہا ہوں۔ اس کا اعلان کرنا ہی کیا ضرور تھا۔" انھیں اس سے رنج پہنچا کہ بیوی بچے ہراساں اور نااُمید ہو گئے۔ انھیں اس کا شدید احساس تھا کہ تیمار دار سخت پریشان ہیں۔ ڈاکٹر کے اعلان نے ان کی پریشانی میں مایوسی بھی شامل کر دی۔ آخری وقت میں بھی مولانا کا احساسِ ظرافت زندہ تھا۔ ڈاکٹر کے جانے کی تھوڑی دیر بعد مولانا کے بھانجے حاجی محمد میاں بخاری آ گئے۔ ہم قدرے سادہ لوح آدمی ہیں۔ جارج پنجم کا انتقال انھیں دنوں ہوا تھا۔ مولانا سے حاجی جی بولے "بادشاہ کے تخت پر تو اب بادشاہ کا لڑکا ہی بیٹھے گا!" مولانا نے

نحیف آواز میں فرمایا "نہیں، تمھارے حق میں وصیت کر گئے ہیں"۔ اور سب کے سب کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

خواجہ ناصر نذیر فراقؔ دہلوی

خواجہ میر دردؔ کی بارہ دری کسی زمانے میں بارہ دری ہو تو ہو ہم نے تو جب سے ہوش سنبھالا اِس بارہ دری میں چند پُرانے گھروندے ہی دیکھے۔ انہی گھروندوں میں سے ایک میں خواجہ ناصر نذیر فراقؔ دہلوی رہتے تھے۔ میں نے بچپن میں انھیں اپنے والد کے پاس آتے جاتے دیکھا۔ سُرخ و سپید رنگ، سفید کھلواں داڑھی، گول چہرہ، بھاری ڈیل، انگشتیا گھنڈی کا بڑا ہُوا فرغل سر پہ کبھی صافہ کبھی ٹوپی، پاؤں میں سلیم شاہی۔ ہاتھوں میں رعشہ تھا اور بہت تھا مگر خود ہی لکھتے۔ ان کی تحریر شکستہ کی تحریر ہوتی تھی کہ پڑھنے ہی میں نہ آتی۔ نومبر ۱۹۲۹ء میں مجھے ان کے ہاں جانے کا پہلا اتفاق ہُوا۔ پتہ پوچھتا پوچھتا ان کے گھر پہنچا۔ کنڈی کھٹکھٹائی، غالباً کہیں قریب تھے، خود ہی دروازے میں آگئے۔ مجھے جانتے نہ تھے پوچھا "کون ہو بھائی؟" میں نے اپنا نام بتایا کوئی اثر نہ ہُوا۔ باپ کا نام بتایا بے قرار ہو کر سینے سے لگا لیا۔ برابر والی مردانی بیٹھک میں لے جا کر بٹھایا۔ بولے "تم تو بھتیجے ہو۔ تمھارے ابّا مجھے سگے بھائیوں سے زیادہ سمجھتے تھے۔ ہائے، اب وہ اگلی سی وضعداریاں کہاں! اچھا بتاؤ گھر میں تو سب خیریت ہے! تم آج کیسے آئے؟" میں نے کہا "ایک ادبی ماہنامہ دلّی سے جاری کرنے کا ارادہ ہے"۔ پوچھا "نام کیا رکھا؟" میں نے کہا "ساقی"۔ خوش ہو کر بولے "اچھا نام ہے۔ بدہ ساقی مے باقی کہ در جنت نہ خواہی یافت"۔ بیسیوں شعر ساقی کے سُنا ڈالے۔ "ہاں بھئی ساقی کے لئے ضرور لکھوں گا۔ بھتیجے کے لئے ضرور لکھوں گا، نثر بھی اور نظم بھی"۔ اتنے میں ایک اُن سے بھی زیادہ معمّر بزرگ بیٹھک میں در آئے۔ کرخنداروں کا سا لب و لہجہ، دروازے ہی میں سے جھکڑ پن شروع کر دیا۔ بارے ایک غیر آدمی کو دیکھ کر سنبھل گئے۔ فراقؔ صاحب نے کہا "بھائی بشیر کے صاحبزادہ ہیں۔ رسالہ نکالنا چاہتے ہیں"۔ مگر انھوں نے سُنی اَن سُنی کر دی اور فراقؔ صاحب سے باتیں کرنے لگے۔ فراقؔ صاحب نے کہا "اب دِلّی میں کیا رہ گیا ہے؟ نظم میں تم ہو، نثر میں ہیں۔ باقی اللہ کا نام ہے"۔ میں نے چونک کر اُن بزرگ کی طرف دیکھا، وہ دو باتیں کر کے رخصت ہوئے۔ اُن کا قدم دہلیز سے باہر نکلا ہی تھا کہ فراقؔ صاحب نے کہا "اور یہ بھی کیا ہیں، بس میں ہی رہ گیا ہوں"۔ میں نے پوچھا "یہ کون صاحب تھے؟" بولے "تم انھیں نہیں جانتے؟ راماں بیخود دہلوی ہیں"۔

ناصر نذیر فراقؔ کوئی چار سال اور جئے۔ مفلسی اور بڑھاپے نے اُن کا دھڑ توڑ رکھا تھا۔ ساقی کے لئے انھوں نے قسط وار "لال قلعہ کی جھلک" لکھی۔ بڑی پیاری زبان لکھتے تھے۔ مخزن کے ابتدائی دَور کے لکھنے والوں میں سے تھے۔ جب مخزن بند ہوگیا تو انھوں نے لکھنا چھوڑ دیا تھا۔ پھر ساقی کے لئے لکھا۔ لکھنے میں اُنھیں بڑی زحمت ہوتی تھی مگر مرتے دم تک اپنی وضعداری پر قائم رہے۔ بڑی محبّت سے ملتے تھے اور مل کر خوش ہوتے۔ آخری بار اُن سے ملا تو پردہ کروا کے اندر گھر میں بلوا لیا۔ ایک پلنگڑی میں لحاف اوڑھے پڑے تھے۔ ان کے صاحبزادے ناصر خلیق فگارؔ بہت پریشان تھے۔ فراقؔ صاحب کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ بولے "لو بھئی شاہد میاں، چلنے کا وقت آ پہنچا ؎

ساقیا یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ
جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

بھئی تھے، ہمارے مرنے کی خبر ان کو ضرور کر دینا"۔ میرا دل بھر آیا۔ منہ سے کچھ نہ کہہ سکا۔ اُن سے مصافحہ کر کے باہر چلا آیا۔ فگارؔ صاحب نے بتایا کہ "ابّا کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ کوئی دم کے مہمان ہیں"۔

تیسرے دن اُن کی سُناؤنی سُنی۔ خواجہ میر دردؔ کی یادگار ختم ہوئی۔ اُردوئے معلّیٰ کا کوئی لکھنے والا نہ رہا۔ شمس العلماء مولانا محمد حسین آزادؔ کے شاگرد تھے۔ اُستاد کا ذکر بڑی عقیدت سے کرتے تھے۔ ان کی ناتمام تصنیف "ڈرامہ اکبر" کی تکمیل فراقؔ صاحب ہی نے کی تھی۔ افسوس

گو زمانے نے انھیں اتنی فرصت نہ دی تھی کہ کوئی مستقل تصنیف اپنی یادگار چھوڑ جاتے۔ عرصہ ہوا سر عبدالقادر کی فرمائش پر ایک ناول "المورکھا" لکھنا شروع کیا تھا۔ مخزن بند ہوا تو ان کی ہمت بھی پست ہو گئی۔ پھر اور لوگوں کے اصرار پر اُسے مکمل بھی کر لیا تھا مگر اس کے چھپنے کی نوبت نہ آئی۔ نہ جانے اس مسودے کا کیا حشر ہوا۔

قاری سرفراز حسین

قاری سرفراز حسین عزمی دلّی کے اُن شرفا میں سے تھے جنھوں نے انگریزی تعلیم حاصل کی مگر مذہب کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ ادب کا بھی بہت ستھرا ذوق رکھتے تھے۔ طوائفوں کی اصلاح کے لئے ایک ناولوں کا سلسلہ لکھا۔ اس کی پہلی کڑی "شاہدِ رعنا" بہت مشہور و مقبول ہوئی۔ دلّی کی ایک ڈیرہ دار طوائف کی پوری زندگی اس ناول میں پیش کی گئی تھی۔ "شاہدِ رعنا" کے جواب میں مرزا رسوا نے "امراؤ جان ادا" لکھی۔ اِس طرح اُردو ادب میں دو عمدہ ناولوں کا اضافہ ہوا۔

قاری صاحب گوناگوں خوبیوں کے آدمی تھے۔ مولانا شوکت علی نے "اولڈ بوائے" میں قاری صاحب کا مختصر تعارف اس طرح کرایا تھا۔ "فیشن نژاد، دل پھینک، عشقِ مجازی کے ساتھ عشقِ حقیقی دل میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا۔ قاری صاحب سب کچھ ہیں۔ مُبلّغ اسلام بھی اور مُفکّر بھی۔ شاعر بھی اور ادیب بھی۔ سحر البیان مقرر بھی۔ قاری اچھا ہے یا بُرا لیکن علی گڑھ کا کھلنڈرا ہے، اور عجیب الخلقت۔"

قاری صاحب مٹیا محل میں رہتے تھے۔ بڑے کلّے ٹھلّے کے آدمی تھے۔ ورزشی بدن، گیہواں رنگ، تُرکی ٹوپی، سیاہ فراک کوٹ، پتلون اور پیٹنٹ کا جوتا پہن کر بچ جاتے تھے۔ ہاتھ میں چھڑی اور سفید دستانے ہوتے تھے۔ تقریر کرنے میں علی گڑھ یونین میں کیمبرج پرائز لے چکے تھے۔ تبلیغِ اسلام کے لئے انگلستان اور جاپان جا چکے تھے۔ نہایت بذلہ سنج، ظریف الطبع اور چھبیلے آدمی تھے۔ جاورہ اور رامپور کے نواب ان کے گرویدہ تھے۔ نواب حامد علی خاں تو ان پر ایسے فریفتہ ہوئے کہ انہیں دِلّی سے اغوا ہی کر کے لے گئے۔

قاری صاحب کی خوش گفتاری کے سلسلے میں ایک پُرلطف واقعہ یاد آ گیا۔ نواب صاحب شیش محل مسوری میں فروکش تھے۔ کسی نے اُنھیں خبر دی کہ قاری صاحب بھی مسوری میں موجود ہیں۔ وہ غائبانہ بہت تعریف سُن چکے تھے۔ انھوں نے ایک مصاحب کو بھیجا کہ قاری صاحب کو لے آئے۔ قاری صاحب کو یہ اندازِ طلب ناگوار ہوا۔ بولے "میں اُمرا کے ہاں حاضری کی فیس سو روپیہ فی گھنٹہ لیتا ہوں۔" نواب صاحب نے جُز رسی کے باوجود اِس شرط کو منظور فرما لیا۔ قاری صاحب نے اپنا فراک سوٹ پہنا اور وقتِ مقررہ پر نواب صاحب کے دربار میں حاضر ہو گئے۔ جب ایک گھنٹہ ہو گیا تو گھڑی دیکھ کر اجازت طلب کی اور دوسرے روز سو روپے کا بل بھیج دیا جو وصول ہو گیا۔ یہ رقم مسجد کے تعمیری فنڈ دے دی گئی۔

اپنے لڑکے قاری عباس حسین کی شادی کی تو سہرا خواجہ حسن نظامی صاحب سے بندھوایا۔ سہرا کچھ اُلجھ گیا اور بندھنے میں دیر لگی تو حکیم اجمل خاں نے فقرہ کسا "آدمی وہ کام کیوں کرے جو اُسے آتا نہ ہو۔" خواجہ صاحب تو مسکرا کر رہ گئے مگر قاری صاحب بھلا کب چُوکنے والے تھے۔ بولے "حکیم صاحب! یہ سہرے والے بڑے بے وجاہت ہوتے ہیں، اگرچہ ترکیبِ استعمال ساتھ نہیں رکھتے۔" حکیم صاحب کے ساتھ خواجہ صاحب بھی شرمندہ ہوئے کیونکہ انھوں نے بھی دوائیں بیچنے کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔

بڑھاپے میں جوان شادی کر لی تھی۔ ناخوش اور پریشان رہنے لگے تھے۔ ہاتھوں میں رعشہ آ گیا تھا۔ لکھا نہ جاتا تھا۔ ایک منشی ملازم رکھ لیا تھا جو ان کی تقریر لکھتا رہتا تھا۔ اسی حالت میں انھوں نے ساقی کے ابتدائی پرچوں کے لئے ایک پورا ناول "مس عنبرین" لکھوایا۔ صحت تیزی سے گرتی چلی جا رہی تھی۔ آخری بار دیکھا تو بالکل بتاسے کی طرح گھُل گئے تھے۔ اور ایک دن سُنا کہ یہ ہزار داستان ہمیشہ

ہنستے ہنستے خاموش ہو گیا۔ اُن کا صرف ایک شعر یاد رہ گیا ہے

تم تم کے کہہ رہی ہیں دمِ نزع ہچکیاں
کس کس کو بھولتا ہے، ذرا یاد تو کرو

نواب سائل دہلوی

نواب سراج الدین احمد خاں سائل، دہلوی لوہارو کی نوابی کے اصل وارث تھے مگر انگریزوں نے ان کے والد کو گدّی سے لاحق کر کے ان کے چچا کو گدّی پر بٹھا دیا تھا۔ ان کے والد پر الزام لگایا گیا تھا کہ ہنگامۂ ۱۸۵۷ء میں انھوں نے باغیوں کا ساتھ دیا۔ نواب سائل پہلے لال دروازے میں رہتے تھے، پھر فراش خانہ میں اُٹھ آئے تھے۔ سب سے پہلے ہم نے انھیں اپنے بچپن میں ایک مشاعرے میں دیکھا۔ عجب شان و شوکت کے بزرگ تھے۔ میدہ و شہاب رنگ، گول چہرہ، سفید براق داڑھی، سنہری فریم کی عینک، سر پر چوڑی زرکار لیس کی مخملی ٹوپی۔ قریب سے دیکھو تو اس پر زردوزی میں سائل دہلوی لکھا ہوا۔ چست پجامہ، چوڑیاں پنڈلیوں تک پڑی ہوئیں۔ پاؤں میں سلیم شاہی۔ بائیں ہاتھ میں چاندی کی مُٹھ کی چھڑی، داہنے ہاتھ میں چھ انچ لمبا سگار۔ مخصوص ترنّم سے غزل پڑھتے اور سُننے والوں کو پھڑکا تے۔ پھر نواب صاحب کو اکثر دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ مشاعروں میں، پارٹیوں میں، شادی بیاہ کی محفلوں میں اور جب میرے والد کو آخری عمر میں شعر کہنے کا شوق ہوا تو انھوں نے نواب سائل کو اپنا کلام دکھانا شروع کیا، اکثر میرے والد ان کے ہاں جاتے اور کبھی کبھی نواب صاحب بھی ہمارے ہاں آتے۔ کلام دکھانے کا بھی عجب لطیفہ ہے۔ شاگرد نے دس دس پندرہ پندرہ غزلیں رداغ کے رنگ میں اور زمین میں بھی) روزانہ کہنی شروع کر دیں۔ نواب صاحب کوئی ترمیم کرتے تو شاگرد صاحب اُن سے اُلجھ جاتے اور ان کی اصلاح کو نہ مانتے۔ لہٰذا اُستادی شاگردی زیادہ دن نہ چل سکی، دوستی البتہ قائم رہی۔

نواب سائل بڑے حلیم الطبع اور بردبار آدمی تھے۔ دلّی کے معززین میں شمار ہوتے اور انگریزوں میں بھی اُن کی خاصی پوچھ تھی۔ اُن کا کلام خود ان کی شہرت کو چار چاند لگاتا تھا مگر ان کی بعض باتیں بالکل بچکانہ ہوتی تھیں، مثلاً ٹوپی پر نام لکھوانا یا کسی نہ کسی بہانے یہ جتانا کہ "میں داغ کا داماد ہوں"۔ اُن کی یہ کمزوری ان کے اکثر مقطعوں میں بھی ظاہر ہوتی ہے، مثلاً۔ ع

جنابِ داغ کے داماد ہیں ہم دلّی والے ہیں

یا وہ مقطع جس پر لکھنؤ والوں نے بہت اعتراض کیا تھا۔ ع

اُنگلیاں اُٹھنے لگیں داغ کے داماد آئے

ایک دفعہ میں اُن سے سالانہ کے لئے غزل لینے ان کے گھر گیا۔ اور بھی کئی احباب اور شاگرد جمع تھے۔ سائل صاحب نے اپنی تازہ غزل سنائی۔ ہر شعر پر واہ واہ ہوتی رہی اور وہ یہی فرماتے رہے "میں کیا کہتا ہوں؟ وہ کہلوا رہی ہے جو گھر میں بیٹھی ہے"۔ "داغ کی بیٹی کہلوا رہی ہے"۔ اصل بات یہ تھی کہ نواب صاحب کو بیگم سے اور انہی کی وجہ سے اُستاد سے بے حد محبت تھی۔ ورنہ بیگم صاحبہ داغ کی حقیقی بیٹی نہیں تھیں بلکہ ان کی سالی کی صاحبزادی تھیں، داغ نے انھیں گود لے لیا تھا۔ اسی طرح اُن کا ایک مصرعہ تھا

"غالب میرے دادا تھے میں غالب کا پوتا ہوں"

حالانکہ نہیں تھے۔

نوابوں میں عام طور سے اتنے شریف طبیعت کے لوگ نہیں ہوتے تھے جتنے کہ نواب سائل۔ ان کے بڑے بھائی نواب تاباں ان کی ضد تھے، گالیاں دینے پر آتے تو شیطان بھی کانوں پر ہاتھ دھرتا۔ اکثر سائل صاحب پر برس پڑتے اور وہ مغلظات سناتے کہ الٰہی توبہ، مگر وہ بچارے تھے

سے اُف تک نہ کرتے۔ دبی زبان سے اتنا البتہ کہہ دیتے کہ "بھائی جان، گالیاں آدھی مجھ پر پڑ رہی ہیں اور آدھی آپ پر" اسی طرح جب بیخود صاحب مشاعروں میں برہم ہو کر مار دھاڑ پر اُتر آتے تو سائل صاحب جواب میں ایک لفظ بھی نہ کہتے۔ دلّی میں بیخود والوں اور سائل والوں کے بڑے بڑے پلّے ہوتے۔ اکثر مشاعروں میں مار پیٹ تک نوبت پہنچ جاتی۔ سائل صاحب ان جھگڑوں سے بہت گھبراتے تھے اور بالآخر انھوں نے دلّی کے مشاعروں میں شریک ہونا ہی چھوڑ دیا تھا۔ بیخود اور سائل کے اختلاف کی اصل وجہ داغ کی جانشینی تھی جس کے مدعی دونوں تھے۔

آخر عمر میں سائل صاحب کی ران کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ چلنے پھرنے سے معذور ہو گئے تھے۔ ایک رکشا رکھ لی تھی۔ اس میں ان کا سوار ہونا اور اس میں سے اُترنا ہی ایک بڑا مرحلہ ہوتا تھا۔ ایک دن اس رکشا کا پہیہ لال کنوئیں پر ٹریم کی لیکھ میں ایسا اڑا کہ رکشا اُلٹ گئی۔ سائل صاحب کے سر میں سخت چوٹ آئی۔ لوگوں نے دوڑ کر انھیں اُٹھایا۔ ہائے ہائے کرتے تھے اور اپنی بے بسی پر روتے تھے۔ میں بھی پرسش احوال کو گیا۔ آبدیدہ ہو کر کہنے لگے "ایک وقت وہ تھا کہ جب ابّا جان کا ہاتھی ڈیوڑھی پر آتا تو میں لپک کر اس کی دُم پکڑ اُوپر جا بیٹھتا۔ یا اب یہ حال ہے کہ دوسروں کے سہارے بغیر اُٹھ بیٹھ بھی نہیں سکتا۔"

سائل صاحب نے ہزاروں غزلیں کہیں، ان کے دیوان بھی چھپے مگر ان کا عمر بھر کا حاصل نظروں سے پوشیدہ ہی رہا۔ نورجہاں اور جہانگیر کے عشق پر ایک مثنوی لکھ رہے تھے جس کے پندرہ ہزار شعر کہہ چکے تھے۔ افسوس کہ یہ بھی بند دفینہ بن کر رہ گیا۔

مولوی احتشام الدّین

مولوی احتشام الدین صاحب دلّی کے حقی خاندان کے سپوت تھے۔ علی گڑھ کے پرانے گریجویٹ۔ برسوں تک وہیں لائبریرین رہے۔ کتابیں پڑھتے کیا تھے نگلتے تھے۔ انھوں نے سارا اُردو ادب چاٹ رکھا تھا۔ حافظہ بہت اچھا تھا۔ طلسم ہوشربا اور بوستانِ خیال جیسی ضخیم کتابیں انھیں از بر تھیں انھیں یہ تک یاد تھا کہ کونسا لفظ کس کتاب میں کس صفحے پر آیا ہے۔

مولوی عبدالحق صاحب نے جب اُردو کی بڑی لغت کی نئیں نئیس جلدوں میں مرتب کرنی شروع کی تو بڑے بڑے جغادری بطور مددگار رکھے گئے مگر سب رسے تڑا کر بھاگ گئے۔ بالآخر احتشام الدین صاحب ان کے ہتھے چڑھے۔ حیدر آباد دکن میں ان کا کمرہ دیکھنے کی چیز تھا۔ سینکڑوں ننھے ننھے خانوں کی الماریاں دیواروں میں لگی ہوئی تھیں۔ مولوی صاحب بیچ میں بیٹھے پرچیوں پر الفاظ لکھتے اور ان خانوں میں ڈالتے رہتے۔ مولوی صاحب کے کام کرنے کا کوئی وقت مقرر نہیں تھا، جب تک جاگتے رہتے یہی کام کرتے رہتے۔ ایک ایک لفظ کے کئی کئی معنی نکالتے اور سند کے لئے کسی مستند کتاب کا حوالہ بھی دیتے۔ جب انجمن دلّی آ گئی تو مولوی صاحب نے اپنے گھر کے ایک کمرے میں یہی دھندا پھیلایا۔ انھیں اپنے کام میں اتنا انہماک ہوتا تھا کہ کھانے کا بھی ہوش نہ رہتا۔ ان کی بیگم صاحبہ اکثر یاد دہانی کراتیں اور اکثر خود آ کر کہتیں تب کہیں کھانا کھانے اُٹھتے۔ تہمد اور بنیان پہنے پسینے میں شرابور کتابوں اور پرچیوں کے ڈھیر میں دبے رہتے۔

پھر ایک وقت ایسا آیا کہ اس کام کے لئے انجمن کو جو حیدر آباد سے امداد ملتی تھی وہ بند ہو گئی تو مولوی عبدالحق صاحب نے ان سے کہا کہ کام روک دیا جائے۔ مگر مولوی صاحب اُسی تندہی سے کام کرتے رہے۔ لغت ختم پہ آ رہی تھی اور وہ چاہتے تھے کہ کسی طرح جلدی ختم ہو تو اس کی چھپائی کا کام شروع ہو۔ کم و بیش بیس سال کی محنت تھی بلکہ عمر بھر کی جانفشانی کا حاصل۔ عبدالحق صاحب کے ہاں سے تنخواہ آنی بند ہو گئی مگر مولوی صاحب کا کام بند نہ ہوا۔ انھیں اپنے کام سے محبت ہو گئی تھی، جنون ہو گیا تھا۔ بڑھاپا، غذا کم، محنت زیادہ، صحت نے جواب دینا شروع کر دیا تھا۔ دوستوں اور گھر والوں نے بہت سمجھایا کہ کام چھوڑیئے اور آرام کیجئے، مگر مولوی صاحب کہتے کہ اگر یہ کام نہ کروں تو پھر کیا کروں؟ غرض تنخواہ نہ ملتی تھی نہ ملی مگر مولوی صاحب اسی طرح کام کرتے رہے۔

مولوی صاحب شاعر بھی تھے۔ اس سلسلے میں ان کا زبردست کارنامہ دیوانِ حافظ کا منظوم ترجمہ تھا۔ مولوی صاحب نے ترجمہ بقید بحر کیا تھا افسوس کہ یہ کاوشِ ذہنی زمانے کی ناقدری کے ہاتھوں برباد ہوئی۔

مولوی احتشام الدین جیسا محققِ الفاظ ہم نے کوئی اور نہیں دیکھا۔ ہمیں بھی اپنی زباندانی پر بڑا ناز تھا مگر مولوی صاحب کے سامنے ہماری حیثیت ایک طفلِ مکتب کی رہ جاتی۔ مثلاً مولوی صاحب نے ایک دفعہ فرمایا "یہ اردو زبان بھی عجیب زبان ہے۔ فقرے کے لحاظ سے ایک لفظ کئی کئی معنی تو دیتا ہی ہے مگر "اچھا" بمعنی "برا" اور "برا" بمعنی "اچھا" کسی اور زبان میں کبھی سنا؟" اور زبان کا تو ذکر ہی کیا؟ ہم نے تو اردو میں بھی ان الفاظ کے کبھی ان معنوں میں استعمال ہونے پر غور نہیں کیا تھا۔ اب جو مولوی صاحب نے جتایا تو معلوم ہوا کہ ہم روزانہ ان دونوں لفظوں کو متضاد معنی میں بولتے ہیں مگر لفظوں کے اس نازک پہلو کو دیکھنے کی آج تک توفیق نہ ہوئی۔ اس قسم کے سینکڑوں لفظ مولوی صاحب کو یاد تھے اور لغت میں تو خدا جانے الفاظ کے کتنے خزانے تھے۔

ایک دن سنا کہ مولوی صاحب بیمار ہیں۔ میں خیریت معلوم کرنے گیا۔ دیکھا لیٹے لیٹے پرچیاں الٹ رہے ہیں۔ کئی دن سے بخار تھا، اس وقت بھی پنڈا پھنک رہا تھا۔ ان کے صاحبزادے میاں شان الحق بہت پریشان تھے۔ انھیں تسلی دے کر چلا آیا۔ دو دن بعد معلوم ہوا کہ مولوی صاحب اردن ہسپتال میں داخل کر دیئے گئے۔ ہسپتال جاکر ان سے ملا تو بہت خفیف آواز میں شکریہ ادا کیا۔ چہرے پر خوشی کے آثار پیدا ہوئے۔ بولے "اب کے اچھے ہونے کے بعد ساقی کے لئے ایک سلسلۂ مضامین لکھوں گا"۔ مگر دوسرے دن سنا کہ مولوی صاحب کا انتقال ہو گیا۔ ؎

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

مرزا چپاتی

مرزا فخرالدین نام، فخر تخلص۔ عرف مرزا چپاتی۔ دلی کے شاہی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ گورا رنگ، کشادہ پیشانی، غلافی آنکھیں گالوں کی ہڈیاں ابھری ہوئیں، گول سفید داڑھی، کسرتی بدن، سرو قد، بر میں سفید انگرکھا، آڑا پاجامہ، سر پر چوگوشہ، پاؤں میں سلیم شاہی جوتی۔ واقعی مغل شہزادہ دکھائی دیتے تھے۔ بڑھاپے میں عسرت نے گھیر لیا تھا۔ سر پر چوڑی لیس کی ٹوپی، گلے میں پھٹا ہوا ململ کا کرتہ، پاؤں میں لیترے ہلکائے پھرتے تھے۔ مگر مرزا کی خوش مزاجی میں آخر تک فرق نہ آیا۔

جب تک پیسہ رہا خوب اللّے تللّے سے گزر کی۔ شاید ہی کوئی بازی ان سے چھوٹی ہو۔ کبوتر، لال اور بٹیریں اڑانے تو اوروں کو بھی دیکھا لیکن طوطے اڑاتے مرزا چپاتی ہی کو دیکھا۔ پتنگ بنانے اور پیچ لڑانے میں جواب نہ رکھتے تھے۔ آخر آخر میں بیرم خاں کے ترا ہے کے قریب ایک بوسیدہ سی دکان لے کر بیٹھ گئے تھے۔ پتنگیں بناتے اور پیٹ پالتے۔

غضب کے توتلے تھے۔ "ت" "ٹ" بولتے۔ زندہ دل اور فقرے باز تھے۔ سیر سپاٹے کے دلدادہ، ذرا رُت بدلی اور انھیں دور کی سوجھی۔ برسات کا چھینٹا پڑا اور انھوں نے قطب کی راہ لی۔ کسی کھنڈر کے ایک در میں مرزا بھی اپنی گڈیاں لگا کر بیٹھ جاتے۔ کانپ ٹھڈے چاقو سے چھیلتے رہتے اور انھیں جھکا جھکا کر دیکھتے رہتے۔ دمڑ پل، دوسبل پل، پٹیل، پری، اھبیڑیا، ل دما، کل دما، بیسیوں قسم کی گڈیاں ان کے پاس تیار رہتیں۔ برکھا رُت ساری قطب ہی میں گزارتے۔

مرزا کی وجہ تسمیہ بھی عجیب ہے۔ مرزا بڑے چاؤ اور ارمانوں کے بعد پیدا ہوئے تھے۔ ان کی اماں نے منت مانی تھی کہ جب میرا بچہ بڑا ہوگا تو قطب صاحب کی درگاہ پر اس کے ہاتھ سے حلوہ اور چپاتیاں بٹواؤں گی۔ بارھویں برس ان کی منت بڑھائی گئی تو مرزا نے چپاتیاں بانٹنی شروع کیں۔ لینے والے "مرزا چپاتی" "مرزا چپاتی" کہہ کہہ کر چپاتیاں مانگتے تھے۔ اسی دن سے مرزا کا نام مرزا چپاتی مشہور ہو گیا۔

مرزا صاحب اپنی خوش گفتاری کی وجہ سے ہر دلعزیز تھے۔ اپنے خاندانی وقار کی وجہ سے اُمرا میں بلائے جاتے تھے۔ شعر بہت اچھا کہتے تھے اس لئے مشاعروں میں بلاوے ہوتے۔ تتلا کر پڑھتے تو لوگ اور بھی محظوظ ہوتے۔ ان کے اکثر اشعار دلّی والوں کو ازبر ہو گئے تھے۔ اس ایک شعر پر مرزا نے مشاعرہ اُڑا کر رکھ دیا ؎

بنائی شوٹ میں تمّا اُڑنے پہ یہ نہیں سمجھا
نہ میں جنت کے ثابل ہوں نہ جنت میرے ثابل ہے

ایک مسالمہ میں اُن کا یہ شعر بہت مشہور ہوا ؎

شہ نے عابد سے کہا بدلہ نہ لینا شمر سے
سر فدا کا ہو نہیں سکتا مرے سر کا جواب

اُن کے تین شعر اور یاد آگئے ؎

صرّاف کسوٹی پہ گھِسا کرتے ہیں زر کو
ہم وہ ہیں جو آنکھوں سے پرکھتے ہیں بشر کو
دل دِل کے ہیں جو نتیں سارے حرف بھی دو ہی
بے لکھے سمجھ لیتے ہیں ہم زیر و زبر کو
ان چاروں کو جادو سے ستم دیکھا ہے فخرو
اک حسن کو، آواز کو، دولت کو، ہنر کو

دِلی کی دو ڈیرہ دار طوائفیں اب سے کوئی چالیس سال پہلے بہت مشہور تھیں۔ نام تو خبر نہیں ان کے کیا تھے دوتی اور چوتی کہلاتی تھیں۔ دلّی کے شہزادوں میں ایک بڑی دھوم دھام کی شادی ہوئی۔ اس میں دوتی جان کا مجرا تھا۔ جب مجرا جم گیا اور دوتی جان ذرا [illegible] گانے سنا چکیں تو انھوں نے اپنی پسند کے گانے سنانے شروع کئے۔ مرزا چپاتی نے کہا "بائی جی ذرا ٹھہرنا۔ ایک شعر ہو گیا ہے، پہلے وہ سن لو" محفل میں سناٹا ہو گیا۔ مرزا نے شعر پڑھا ؎

ڈھِستے ڈھِستے ہو ڈئی اِتنی ملٹ
ساٹ پیسے ٹی ڈوتی رہ ڈئی
(گھِستے گھِستے ہو گئی اتنی ملٹ
سات پیسے کی دوتی رہ گئی)

محفل میں ایک قہقہہ پڑا اور سب ہنستے ہنستے لوٹ گئے۔ دوتی جان بڑی [illegible] کی خاتون تھیں، ان کی تیوری پر ہلکا سا بل آیا مگر انھوں نے مجلس میں کدورت نہ ڈالنی چاہی۔ خود بھی ہنسنے لگیں اور بولیں "سبحان اللہ، مرزا صاحب۔ میں تو بیماری میں بالکل سُت گئی تھی۔ اب بھی مجھ میں پوری سی جان کہاں آئی ہے۔ صاحب عالم نے یاد فرمایا تھا اس لئے حاضر ہو گئی" صاحب خانہ نے کہا "بائی جی، تم تو جانتی ہی ہو مرزا کی عادت شوخی کی ہے۔ ہاں، آپ سنائیے کیا سنا رہی تھیں" اور گانا پھر شروع ہو گیا۔

مرزا بڑے لاڈ پیار میں پلے اس لئے کورے جاہل رہے۔ مگر ان کی گفتگو سے جہالت ظاہر نہ ہوتی تھی۔ لمبی عمر پائی۔ آخری وقت اچھا نہ گزرا۔ عسرت و تنگدستی میں مرے۔

(چند علمی و ادبی شخصیتیں)

لکھنؤ کا ایک دور

شوکت تھانوی

؎ خدا آباد رکھے لکھنؤ کو پھر غنیمت ہے" یہ مصرع جب سے کہا گیا ہے اس وقت سے لکھنؤ کے ہر دور میں دہرایا گیا ہے۔ کم سے کم اس وقت تک تو ضرور دہرایا جاتا تھا جب تک میں وہاں تھا معلوم نہیں اب بھی دہرایا جاتا ہے یا نہیں۔ بہرحال جہاں تک میرا تعلق ہے میں نے نہ صرف اس مصرع کی آئے دن تکرار سنی ہے بلکہ میں خود بھی اس مصرع کی صداقت کا قائل تھا۔ ہر چند کہ میں نے وہ لکھنؤ تو نہیں دیکھا جو انیس کا لکھنؤ تھا نہ میں وہ لکھنؤ دیکھ سکا جو مرزا محمد ہادی رسوا کا لکھنؤ تھا بلکہ منشی سجاد حسین کے زمانے کے لکھنؤ میں بھی میرا وہ بچپن گزرا ہے جس کے نقوش اس قدر دھندلے ہیں کہ ان کو معتبر نہیں کہا جا سکتا۔ مگر ہوش کی آنکھیں کھول کر جو لکھنؤ میں نے دیکھا ہے وہ واقعی غنیمت تھا اور اس قابل تھا کہ اس کے آباد رہنے کی دعائیں مانگی جائیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ میری دوسری دعاؤں کی طرح یہ دعا بھی لکھنؤ کو بددعا ہو کر لگی اور لکھنؤ نے میرے سامنے ہی اس تیزی سے اجڑنا شروع کیا کہ واقعی یہ خطرہ اسی وقت پیدا ہو گیا تھا آخر کب تک "پھر غنیمت ہے" کہا جا سکے گا۔ مگر شکر ہے کہ تقسیم ملک سے بھی دو سال قبل مجھ کو وہ لکھنؤ چھوڑ دینا پڑا جو اجڑتے اجڑتے بھی ایسا ضرور تھا کہ اس کو اس انحطاط کے باوجود "پھر غنیمت ہے" کہا جا سکتا تھا اور اس کے آباد رہنے کی دعائیں مانگی جا سکتی تھیں۔

بہرصورت لکھنؤ کے جس دور کا میں ذکر کر رہا ہوں اس دور میں ایسے ایسے صاحبانِ کمال لکھنؤ میں جمع ہو گئے تھے جن کے دیکھنے کو اب آنکھیں ترستی تھیں۔ اگر ان سے تعارف کرانے کے لئے میں یہ طریقہ اختیار کروں کہ خود ایک سیاح کی طرح لکھنؤ کے ریلوے اسٹیشن پر اتروں اور پھر شہر میں داخل ہو کر اس ترتیب سے لکھنؤ کی علمی ادبی شخصیتوں سے ملتا چلوں جو راستے میں ملتی جائیں تو اس ترتیب کے اعتبار سے لکھنؤ سے لاٹوش روڈ پر مڑتے ہوئے میں شہر میں داخل ہونا چاہتا ہوں۔ اسٹیشن سے تھوڑی ہی دور چل کر غازی الدین حیدر کی نہر عبور کر کے ایک زرد عمارت پر ایک بہت بڑا بورڈ آویزاں نظر آتا ہے جس پر لکھا ہے "روزنامہ ہمدم" اس اخبار کے دفتر میں داخل ہوتے ہی داہنے ہاتھ کے ایک کمرے میں ایک لمبی سی میز کے دونوں طرف تین چار اخبار نویس اپنے کام میں مصروف نظر آتے ہیں اور سامنے کی میز پر ایک معمر بزرگ بیک وقت حقے کی نے بھی منہ میں لگائے ہوئے ہیں اور سلگتا ہوا سگریٹ بھی ہاتھ کی چھنگلی اور پانچویں انگلی کے درمیان پھنسا ہوا ہے۔ وہ لکھنے میں اس طرح مصروف ہیں کہ جیسے دنیا و مافیہا کی خبر نہیں۔ عجیب اجاڑ سی صورت ہے سر پر ترکی ٹوپی، ٹوپی سے نکلے ہوئے سفید بال۔ شیروانی کے

نو ٹھنوں میں سے دو بند ہیں اور سات کھلے ہوئے ہیں۔ داڑھی سے زلفِ پریشاں کا کام لیا جا رہا ہے۔ اگر وہ ہاتھ جنبش میں نہ ہو جس میں قلم ہے تو معلوم ہو کہ کسی نے عمر خیام کا ماڈل بنانے کی ادھوری کوشش کی ہے یہ ہیں —

سیّد جالب دہلوی

اُردو کے مشہور و معروف اخبار نویس، جیتی جاگتی انسائیکلو پیڈیا۔ آپ لاکھ اجنبی بن کر جائیں مگر جہاں آپ نے اپنا نام بتایا اور والد کا نام سنایا آپ کے متعلق باقی حالات وہ آپ کو سنانا شروع کر دیں گے کہ آپ کے دادا اس سنہ میں ہجرت کر کے افغانستان کے راستے پشاور تشریف لائے، اتنے دن تک خشک میووں کی تجارت کی اور اس تجارت میں اتنا کمایا۔ پھر خشک میووں کی تجارت پہ ایک سیر حاصل تقریر کریں گے۔ میووں کے باغات کو اگر موضوعِ سخن بنا لیا ہے تو سمجھانے چلے جائیں گے کہ باغ کس طرح بناتے ہیں اور ان میں کاریزوں کے ذریعے کس طرح پانی پہنچاتے ہیں، ان زمین دوز نہروں کے پانی کا مزہ کیسا ہوتا ہے، ان کا پانی کس قسم کے امراض پیدا کرتا ہے اور اُن امراض کے لئے کون کون سی دوائیں معتبد ہیں، پھر اُن دواؤں سے جو مزید امراض پیدا ہوتے ہیں ان کا کیا علاج ہے۔ اگر آپ نے گھبرا کر ان کی توجہ خود ان ہی کے حقّے کی طرف مبذول کرا دی کہ "سید صاحب حقّہ جل بجھا ہے شاید"، تو اب وہ حقّے کے موضوع پر ایسی بحث کریں گے کہ حقّے کی تمام تاریخ آپ کے سامنے آجائے گی کہ کب یہ ایجاد ہوا، کن کن ممالک میں کس کس قسم کا حقّہ پایا جاتا ہے۔ علیم اللہ خانی حقّہ کیا چیز ہے، پیچوان، گڑگڑی، ناریل، ہشک یہ سب کیا ہیں، لکھنؤ نے حقّے کے معاملے میں کن تکلفات سے کام لیا ہے، ہر دم تازہ حقّے کی کونسی قسم ہے۔ مختصر یہ کہ اگر آپ اُسی وقت حقّے پر ایک تھیسس لکھ دیں تو ڈاکٹریٹ کہیں نہیں گئی۔ اور ایک حقّے پر کیا منحصر ہے کسی موضوع پر بات کر لیجئے انشاء اللہ بات کریں گے۔ بات کی جڑ بنیاد تک اور بات کی پھنگی تک بحث کرتے چلے جائیں گے۔ مثلاً چھیڑ دیجئے حلوہ سوہن کا ذکر، بس وہ شروع ہو جائیں گے کہ "جی ہاں خوب ہوتا ہے حلوہ سوہن مگر در اصل یہ مٹھائی نہیں ہے بلکہ حکماء نے اُمرا کو زیادہ سے زیادہ مقدار میں گھی کھلانے کا یہ طریقہ اختیار کیا تھا اور تاریخ کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ حلوہ سوہن سب سے پہلے نانا فرنویس کے لئے ان کے طبیب ہندی عبد الستار سرہندی نے بنایا تھا مگر وہ اس کو ترقی نہ دے سکے اور یہ نسخہ صرف بیاضِ سرہندی میں رہ گیا یہاں تک کہ حکیم الحکماء میر فضل اللہ سبزواری نے اس نسخے کو حاصل کیا اور کئی امرا پر آزمایا اور دماغ کی خشکی اور سینہ کی کمی کے لئے یہ بہترین نسخہ ثابت ہوا۔ پھر اس میں ترمیمیں کی گئیں اور آخری صورت یہ ہوئی کہ شہد کی مکھیوں کے چھتّے کی طرح کی ایک چیز بنائی جاتی تھی جس کے سوراخوں میں گھی ہوتا تھا اور اس میں ایسے اجزا بھی ہوتے تھے کہ یہ گھی نقصان نہ پہنچا سکے اور معدہ اس کو قبول کرے۔ سینہ بہ سینہ یہ نسخہ دلی کے رحمت علی حلوائی تک پہنچا اور ان کے خاندان نے حلوہ سوہن کو اتنی ترقی دی کہ ملکہ وکٹوریہ اس ہندوستانی تحفے کو کرسمس کا بہترین تحفہ کہا کرتی تھیں۔" عرض تو کیا کہ کیا حقّہ اور کیا حلوہ سوہن، اُن کو تو اپنی معلومات کے اظہار کے لئے ایک موضوع چاہئے ہوتا تھا، وہ حقّہ نہ سہی حلوہ سوہن سہی۔ حلوہ سوہن نہ سہی، اجنتا کے غار سہی۔ جو موضوع چھڑ جائے جالب صاحب اس پر گھنٹوں بول سکتے تھے خواہ وہ جنگِ بلقان سے متعلق ہو یا سائمن کمیشن سے متعلق۔ وہ زر دوزی کا قصہ ہو یا نقب زنی کا، اُن کو اپنی معلومات کے خزانے لٹانے سے مطلب۔ افیون سے شوق فرماتے تھے اور پرانی کتابیں جمع کرنے کے افیون سے زیادہ رسیا تھے۔ دعوتوں کی شرکت عبادت کی طرح فرض سمجھتے تھے اور یہ حق اسٹاف کے کسی ممبر کو کبھی نہ دیتے تھے۔ روزنامہ ہمدم ہی کے زمانے میں بڑے بڑے شاگرد پیدا کئے۔ سیاست والے سید حبیب، چودھری رحم علی ہاشمی، قاضی محمد حامد حسرت، انیس احمد عباسی اور نہ جانے کون کون۔ نام تھا بشارت علی مگر مشہور ہوئے جالب دہلوی کے نام سے۔ یہ پتہ نہ چل سکا کہ جالب صاحب نے اپنے اس تخلص سے بھی کبھی کام لیا یا نہیں، بہرحال جالب صاحب کا کوئی شعر کبھی نہیں سنا۔ جالب صاحب ہمدم سے دست بردار ہو کر اپنے ذاتی اخبار روزنامہ ہمت کے مالک اور مدیر بن گئے مگر وقت پورا ہو چکا تھا۔ عمر نے وفا نہ کی۔ جالب صاحب سے رخصت ہو کر

لاٹوش روڈ پر آگے بڑھیے تو لاٹوش روڈ ہی سے ایک گلی قندھاری لین کے نام سے نکلتی ہے اور لکھنؤ کی مشہور انجمن ایک آنہ فنڈ کو جاتی ہے بلکہ اسی گلی سے ایک چھوٹی سی گلی اور پھوٹتی ہے جس کا نام ہے ایک آنہ فنڈ لین۔ اس گلی میں لکھنؤ کے ایک نہایت قابلِ ذکر بزرگ رہتے ہیں

قدیر لکھنوی

جی ہاں اب تو یقیناً قدیر صاحب بزرگ ہو چکے ہیں ورنہ لکھنؤ کے بزرگ شعرا کی بزرگی سے گھبرا کر جن نوجوان شاعروں نے ینگ پارٹی کے نام سے اپنی علیحدہ تنظیم کی تھی اُن ہائی نوجوانوں میں قدیر لکھنوی اور سراج لکھنوی کے نام سرِفہرست تھے۔ لکھنؤ کی مشہور انجمن شعر و سخن معین الادب سے یہ حضرات علیحدہ ہو گئے تھے اور بہارِ ادب کے نام سے اپنی علیحدہ انجمن بنالی تھی۔ اور آخرکار بہارِ ادب ہی میں سب سمٹ آئے تھے۔ قدیر لکھنوی غزل کے شاعر ہیں اور بہت اچھے غزل گو۔ اپنے زمانے میں پڑھتے بھی خوب تھے اور ہر غزل میں کسی نہ کسی طرح موسیٰ اور طور کا ذکر لے ہی آتے تھے۔ یہ مضمون انہوں نے ایسا اپنایا کہ کیا کسی یہودی نے اپنایا ہوگا۔ مشاعروں میں ان کو ہمیشہ نہایت ذمہ دار حیثیت حاصل ہوتی تھی اور جب انجمن بہارِ ادب کے سکریٹری مقرر ہوئے پھر تو ذمہ داری ہی ذمہ داری تھی۔ سراج اور قدیر کا اتحاد اسی طرح ضرب المثل کی حیثیت رکھتا تھا جیسے نور الٰہی محمد عمر کا اتحاد یا اصغر علی محمد علی تاجران عطر کا اتحاد۔ قدیر لکھنوی سے مل کر ہر شخص ان کی تواضع اور ان کے اخلاق کا گرویدہ ہو جاتا تھا اور وہ نہایت وضعداری کے ساتھ دوستی نباہنے کی پوری کوشش کرتے تھے۔ اب نہ جانے کیا حال ہے اور اب بھی غزل کہہ رہے ہیں یا لکھنؤ کا مرثیہ۔ قدیر صاحب سے رخصت ہو کر لاٹوش روڈ ہی سے موتی لال بوس روڈ پر مڑ جائیے اور نئے گاؤں کا رخ کیجئے تو ڈگنگ صاحب کے اسپتال کے پاس ہی نگار کا دفتر ہے یہاں

مولانا نیاز فتحپوری

سے ملاقات ہو سکتی ہے۔ صاحب طرز انشا پردازوں میں نیاز صاحب کا نام سب سے پہلے ذہن میں آتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ نیاز صاحب نے افسانوی ادب میں اضافہ کرتے کرتے ایک دم مذہبیات سے چھیڑ چھاڑ شروع کر دی۔ اور پھر مذہب سے ایسی کھلم کھلا بغاوت فرمائی کہ بہت سے ہنگامے بھی ہوئے۔ مولانا عبد الماجد دریابادی سے نہایت زبردست رن پڑا اور خاصی بدمزگی پیدا ہوئی۔ خیر یہ تو جو کچھ ہوا اُس سے یہاں بحث نہیں مگر اصل نیاز شہاب کی سرگزشت اور کیوپڈ اور سائیکی والے نیاز کو اس رنگ میں دیکھ کر کم سے کم مجھے کبھی خوش نہیں ہوئی۔ مولانا نیاز فتحپوری کے علم و فضل سے انکار نہیں ان کی ذہانت کا بھی میں قائل ہوں۔ میرا اکثر جی بھی چاہا ہے کہ اُن سے محبت کروں مگر اُن سے ڈر ہی لگتا ہے۔ وہ جس قدر دلچسپ اور محبوب شخصیت ہیں اسی قدر کھرے اور سپاٹ بھی بن جاتے ہیں اور بعض اوقات تو اس قدر کاروباری آدمی نظر آتے ہیں کہ وحشت ہونے لگتی ہے وہ جو چند بے پردہ سے اعتبارات ہیں مثلاً مروت، ایثار، دوست نوازی وغیرہ نیاز صاحب ان لغویات کے بس اسی حد تک قائل ہیں کہ ان سے خود ان کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔ بہرحال یہ بھی ایک اصول ہے اور اگر کوئی شخص اپنے کو یہ کہہ کر سمجھا سکے کہ ان کی ان باتوں سے ہم کو کیا مطلب تو اس کو نیاز صاحب نہایت خوشگوار دوست ثابت ہوں گے یعنی اگر ان کی ناگواریاں نظر انداز کر دیجئے تو وہ واقعی خوشگوار ہیں۔ نیاز صاحب کے گھر میں پہلے وصل صاحب بلگرامی بھی رہتے تھے مگر اب ان سے ملاقات یہاں نہ ہوگی۔ بہرحال نیاز صاحب کے گھر سے چل کر پھر لاٹوش روڈ پر آ جائیے اور اس چڑھائی پر چڑھ جائیے جو کیمہ گھاٹی کی طرف جاتی ہے یہاں

حامد اللہ افسر میرٹھی

رہتے ہیں۔ پروفیسر حامد اللہ افسر جو ایک زمانے میں اپنے نام کے ساتھ بی۔ اے لکھا کرتے تھے مگر جب سے بی۔ اے کے طالب علموں کو پڑھانا شروع کیا ہے

پھکنا چھوڑ دیا ہے۔ بچّوں کے نہایت کامیاب شاعر ہیں اور مشاعرے کے شاعر قطعاً نہیں؛ اس لئے کہ نہایت ہولناک انداز سے پڑھتے ہیں البتہ وہی نظم یا غزل اگر وہ خود نہ سنائیں تو پڑھ کر پڑھنے والے کو زیادہ لطف آتا ہے۔ نہایت محتاط قسم کے لئے دیئے سے آدمی ہیں اور ایک حد تک الگ تھلگ سے رہتے ہیں۔ نہ کسی ہنگامے میں کبھی حصّہ لیا نہ کسی سے اتنی دوستی بڑھائی کہ دشمنی کا خطرہ پیدا ہو۔ نہ کسی کو ان سے خواہ مخواہ کی کوئی توقع ہوتی ہے نہ وہ کبھی خلافِ توقع ثابت ہوتے ہیں۔ کالج جاتے ہیں۔ گھر آجاتے ہیں۔ کوئی مل گیا تو ہنس بول لئے ورنہ اپنے کام سے کام۔ ادبی خدمات سے ایک زمانے میں کافی کمایا اور جو کمایا وہ لٹایا نہیں بلکہ سلامت روی سے چلتے رہے۔ ان سے رسالوں میں ملاقات کا امکان زیادہ ہے۔ یوں ملاقات ذرا کم ہی ہوتی ہے اور ہو بھی جائے تو بہت مختصر اور سرسری۔ لہٰذا ان سے سرسری ملاقات کر کے نظیر آباد سے ہوتے ہوئے قیصر باغ چلئے اور

مولانا وصلؔ بلگرامی

سے ملاقات کیجئے۔ سُرخ و سفید معمّر بزرگ، چہرے پر نورانی داڑھی اور منہ میں نقلی دانت۔ اسمِ مبارک ہے مقبول حسین مگر مشہور ہیں وصلؔ بلگرامی کے نام سے وصلؔ صاحب کے تخلص کا جو پول مولانا نیازؔ فتحپوری کی بیگم صاحبہ مرحومہ نے کھولا تھا ہمیشہ یاد رہے گا۔ نیازؔ صاحب کو ایک مرتبہ زچانک یہ خیال آیا کہ وصلؔ صاحب کو ہر ایک وصلؔ یا وصلؔ بلگرامی کہتا ہے مگر بیگم صاحبہ مقبول حسین کہتی ہیں چنانچہ انھوں نے پوچھا کہ یہ آخر مقبول حسین کہنے کا کیا تُک ہے، وصل کیوں نہیں کہتی ہو۔ تو بیگم صاحبہ نے بڑی سادگی سے کہا: "تو کیا میں بھی گالی بکوں"۔

وصلؔ صاحب اپنے زمانے کی نہایت ہنگامہ پرور شخصیت گذرے ہیں۔ ان کے افسانے اگر دہرائے جائیں تو بھی ایک داستان امیر حمزہ کی داستان کو آئینہ دکھا دے۔ مختصر یہ ہے کہ وصلؔ صاحب کے نزدیک دُنیا کی کوئی بات ناممکن نہ تھی بلکہ وہ لفظ ناممکن کو نہایت بے معنی لفظ سمجھتے تھے اور اپنے کارناموں سے واقعی یہ ثابت کر دکھایا تھا کہ ان کے لئے دُنیا کی کوئی بات ناممکن نہیں ہے۔ میں اکثر ان کا امتحان لیتا رہتا تھا۔ ان کے اکثر کمالات پر مختلف مضامین میں روشنی بھی ڈال چکا ہوں اس وقت ان کا ایک کارنامہ یاد آ رہا ہے۔ بیان کئے ہوئے واقعات کو دہرانے کے بجائے یہی کارنامہ پیش کئے دیتا ہوں۔

رائے بریلی میں مشاعرہ تھا جس میں لکھنؤ کے بہت سے شعرا شرکت کے لئے گئے ہوئے تھے۔ یہ مشاعرہ ساری رات ہوتا رہا اور صبح اس وقت ختم ہوا کہ رائے بریلی سے لکھنؤ جانے والی ٹرین ہم کو مشکل مل سکی۔ جس وقت ہم تار پھاند کر پلیٹ فارم پر پہنچے ہیں ٹرین رینگ رہی تھی لہٰذا ٹکٹ لینے کا موقع ہی نہ مل سکا اور جو ڈبہ سامنے آ گیا اسی میں سب سما گئے۔ ٹراونگ ٹکٹ کلکٹر نے بھانپ لیا کہ یہ بے ٹکٹ کے مسافر ہیں، لہٰذا ہم لوگوں کے ساتھ ہی وہ حضرت بھی اسی ڈبے میں آ گئے۔ سب سے پہلے امینؔ سلونوی صاحب سے ٹکٹ مانگا۔ انھوں نے وصلؔ صاحب کی طرف اشارہ کر دیا۔ مجھ سے ٹکٹ مانگا میں نے بھی یہی کیا۔ پھر تو سراج، قدیر، مولانا آسیؔ، مولانا امید سب ہی نے وصلؔ صاحب کی طرف اشارہ کیا، یہاں تک کہ ٹکٹ کلکٹر صاحب وصل صاحب کے پاس پہنچ گئے جو اتفاقاً اس وقت اونگھ رہے تھے چنانچہ ٹکٹ کلکٹر نے ان کا شانہ ہلا کر سب کے ٹکٹ مانگے۔ وصل صاحب نے گویا چونک کر پہلے تو ایک منٹ تک محض اُن حضرت کو غور سے دیکھا۔ پھر نہایت شفقت سے ایک طمانچہ اُن کے رخسار پر مار کر کہا: "کتنا لمبا ہو گیا ہے تو اچھا خاصا قد آدم"۔

اور پھر ہم سب سے مخاطب ہو کر بولے: "یہ صاحبزادے اتنے سے تھے اور دن بھر ٹنگے رہتے تھے میری گود میں۔ مگر صاحب ایسا بد معاش تھا یہ کہ جہاں آکر بیٹھا گود میں اور میرے نمازی کپڑے اس نے ناپاک کئے۔ پیشاب کرنے کی سب سے مناسب جگہ گویا میری گود تھی ان کے لئے اسی لئے میں اس کو شنو کہتا تھا اور ایک اس پر کیا ہے۔ ان کے باوا جان سے زندگی بھر کے مراسم، ساتھ اُٹھنا ساتھ بیٹھنا، مگر قسم لے لیجئے جو میں ان کا نام بھی جانتا

ہوں ہمیشہ ان کو چھنڈ کہا اور یہی ان کا نام پڑ گیا تھا۔"

پھر ان حضرت سے مخاطب ہو کر کہا "ہیں کہاں آجکل ہمارے چھنڈ بھائی؟"

اس بیچارے نے نہایت سعادتمندی سے کہا "جی ان کا تو دو سال ہوئے انتقال بھی ہو گیا۔"

لیجئے وصل صاحب نے واقعی آنسوؤں سے رونا شروع کر دیا۔ ان کے کارنامے، ان کی وضعداری کے قصے، ان کی دولت نوازی کی داستانیں سناتے رہے ہیں اور روتے رہے ہیں باتوں ہی باتوں میں یہ بھی پوچھ لیا کہ مرزا پور میں انتقال ہوا ہے پھر کیا تھا اپنے اور مرحوم کے مرزا پور کے قصے سنانا شروع کر دیئے۔ اس بیچارے نے حیرت سے کہا "مگر وہ تو مرزا پور اپنی زندگی کے آخری دنوں میں گئے تھے۔"

وصل صاحب نے اس کو ڈانٹ دیا کہ "تم کو کیا معلوم اپنی والدہ سے پوچھنا کہ جب مرحوم ان کو طلاق دینے والے تھے اس وقت میری اور ان کی مرزا پور میں کیسی جنگ ہوئی ہے۔ کہہ دینا اپنی ماں سے کہ مقبول چچا ملے تھے۔"

نتیجہ یہ کہ جب باقاعدہ چچا بن گئے تو اس سے برسبیل تذکرہ یہ بھی کہہ دیا کہ "بیٹے وہ بات یہ ہوئی کہ ہم میں سے کوئی بھی ٹکٹ نہیں لے سکا۔ گاڑی چل چکی تھی لہٰذا مجبور ہو گئے۔ حد یہ ہے کہ چائے تک نہیں پی۔"

اس نے کہا "لاحول ولا قوۃ۔ بھلا کوئی بات بھی ہو۔ ٹکٹ نہیں لیا تو کیا ہوا، میں جو حاضر ہوں۔"

اور لکھنؤ کے اسٹیشن پر پہنچ کر اب وہ سعادت آثار مصر ہیں کہ چچا پہلے ریسٹوران چل کر آپ سب چائے پی لیں۔ چنانچہ سب کو اس غریب نے چائے پلائی اور ریسٹوران ہی کے راستے باہر نکال دیا۔ غالباً یہ بتانے کی اب ضرورت نہیں کہ وصل صاحب کے یہ تو تصنیف بھتیجے اس کے بعد سے زندگی بھر بھتیجے رہے۔ لو یہ حکایت اگر طویل ہو جائے تو بھی مزہ دے جاتی ہے۔ لگے ہاتھوں ان کا ایک قصہ اور ملاحظہ فرمائیے۔

وصل صاحب کے ساتھ میں شریک سفر ہوں۔ رفیع احمد خاں مرحوم بھی ہیں اور جوش ملیح آبادی بھی۔ اسی ڈبے میں ایک نوجوان صاحبزادے اپنی نئی نویلی دلہن کے ساتھ سفر کر رہے ہیں اور یہ ارمان انگیز جوڑا سب کے سامنے بے تکلفی میں مصروف ہے کبھی دلہن صاحبہ ایک ادائے خاص کے ساتھ دولہا کے شانے پر سر رکھ دیتی ہیں کبھی دولہا میاں اپنی دلہن کے دست ناز پیرا کو اپنے ہاتھ میں لے کر دباتے ہیں اور کبھی دونوں تقریباً لپٹ جاتے ہیں۔ وصل صاحب سامنے کی برتھ پر بیٹھے ہوئے وظیفہ پڑھ رہے ہیں کہ یکایک انھوں نے تسبیح رکھی اور لپک کر اس لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر کھڑے ہو گئے کہ "تم کو جو کچھ انھوں نے دیا ہے اس سے زیادہ رقم ہم دیئے دیتے ہیں اب ادھر آؤ۔"

پیروں تلے کی زمین نکل گئی کہ وصل صاحب کو یہ کیا سوجھی۔ وہ نوجوان جوش میں کھڑا ہو گیا کہ "مطلب کیا ہے تمھارا۔ تم نے میری بیوی کا ہاتھ کیسے پکڑا؟"

اور وصل صاحب نے اس سے بھی زیادہ کڑک دار آواز سے کہا "بکتے ہو تم۔ یہ بیوی ہو ہی نہیں سکتی۔ بیوی ہوتی تو یہ بے تکلفی تم گھر جا کر کرتے۔ سر راہ مجمع عام میں یہ بے تکلفی اسی کے ساتھ ہو سکتی ہے جو بیوی نہ ہو۔"

اور پھر اس نوجوان کو ڈانٹا "صاحبزادے مجھ کو معلوم ہے کہ یہ تمھاری بیوی ہے اور مجھ کو یہ بھی معلوم ہے کہ تم ایک شریف باپ کے بیٹے ہو مگر اتنی دیر سے جو حرکتیں تم کر رہے ہو وہ ہرگز شریفانہ نہیں ہیں۔ میں نے تم کو ایک سبق دینے کے لئے یہ حرکت کی ہے۔ اور اب میں تمھارے باپ سے بھی مل کر یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ان کی خاندانی شرافت تم سر راہ کس طرح لٹاتے پھرتے ہو۔ ڈوب مرو تم ننگ خاندان۔"

اور ہم سب نے دیکھا کہ واقعی وہ نوجوان ڈوب مرنے کو تیار تھا۔ وصل صاحب جب کافی ڈانٹ چکے تو اس نے ندامت سے صرف یہ کہا کہ "آپ نے مجھ کو زندگی بھر کے لئے ایک ایسا سبق دیا ہے کہ اب میں کبھی نہ بھول سکوں گا۔"

اس کے جواب میں وصل صاحب نے اس کو گلے سے لگا لیا۔ دلہن کے سر پر ہاتھ پھیرا اور پھر وظیفہ پڑھنے لگے۔

وصّل صاحب تو مر گئے۔ مگر کیا ایسے آدمی بار بار پیدا ہوتے ہیں۔ وصّل صاحب کا قصہ خواہ کتنا ہی طول کھینچے اس کو ادھورا ہی چھوڑنا پڑتا ہے آپ بھی اس قصے کو ادھورا چھوڑ دیجئے اور اسی قیصر باغ میں وصّل صاحب کے گھر سے دس پانچ قدم آگے بڑھ کر

سید آل رضا

سے ملئے۔ اگر مولانا عبدالحلیم شرر نے اپنی کتاب کا نام "مشرقی تمدن کا آخری نمونہ" نہ رکھا ہوتا تو سید آل رضا کو مشرقی تمدن کا آخری نمونہ کہتا۔ صرف شکل و صورت ہی کے نہیں سیرت اور طینت کے بھی حسین، چہرے پر خاندانی شرافت کا نور، مزاج میں تکلفاً نہیں بلکہ واقعی انکسار، شخصیت میں اس بلا کی جاذبیت کہ جو ایک مرتبہ ملا اُس نے ہمیشہ دم بھرا، شائستگی اور نفاست کا معیاری پیکر۔ میں جب سب سے پہلے سید آل رضا سے ملا ہوں وہ قیصر باغ میں نہیں بلکہ نعمت اللہ روڈ پر رہتے تھے اور مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس خلوص اور یگانگت کے ساتھ سید صاحب ملے تھے کہ مجھے یہ شبہ بھی نہ ہو سکا کہ میں ان سے پہلی مرتبہ مل رہا ہوں ان سے مل کر مجھ کو بڑی تقویت حاصل ہوئی تھی کہ میں آج ایک ایسے انسان سے ملا ہوں جس پر پورا بھروسہ کیا جا سکتا ہے معلوم نہیں کیوں یہ ملاقات رسمی ملاقات نہیں معلوم ہوئی بلکہ یگانگت کا دل کو جیسے یقین سا ہو گیا۔ اور اس کے بعد میں ہمیشہ سید آل رضا سے اس طرح ملتا رہا کہ میرا دل چاہتا تھا کہ ان سے محبت کروں۔ محبت کو احترام کا رنگ دوں اور ان کی زیادہ سے زیادہ توجہ حاصل کروں۔ ان کا کلام پڑھا، ان کو مشاعروں میں سنا اور ان کی شاعری کے متعلق ہمیشہ یہی رائے رہی کہ یہ شاعری ان کے دل کا چور ہے۔ وہ اپنے شعر میں مجھ کو ہمیشہ چوٹ کھائے ہوئے محسوس ہوئے مگر یہ پتہ نہ چل سکا کہ یہ چوٹ کب کھائی ہے اور کہاں کھائی ہے۔ رفتہ رفتہ ان کی رعنائیوں پر مذہبی رنگ غالب آتا چلا گیا اور دوستوں والے آل رضا اللہ والے آل رضا بن کر رہ گئے بہرحال وہ بھی لکھنؤ کے ان لٹیروں میں سے ہیں جو لکھنؤ کی چہل پہل لوٹ کر پاکستان آ گئے اور اب کراچی میں ہیں۔

قیصر باغ سے پھر امین آباد کا رخ کیجئے تاکہ گوٹن روڈ پر آپ کو اس بدنام شاعر سے ملایا جا سکے جس کا کوئی تخلص نہیں ہے جس کا کوئی دیوان نہیں ہے جس کا کوئی شعر چھپ نہیں سکتا مگر جس کے اشعار سینہ بہ سینہ جانے کہاں تک پہنچ چکے ہیں۔ ؎

یہ ذکر اب کارواں در کارواں ہے

ہمی ماں کارواں در کارواں۔ یہ وہی شاعر تو ہے جس کے متعلق شاعرِ مشرق علامہ اقبال نے کہا تھا کہ خیریت ہوئی کہ یہ حضرت اس رنگ میں شعر کہتے ہیں ورنہ سنجیدگی سے شعر کی طرف توجہ فرماتے تو بہت سے شاعروں کا پتہ نہ چلتا کہ کیا ہوئے۔ یہ ہیں

رفیع احمد خاں

وہ ذہین ترین انسان جس کی ذہانت کی داد "لاحول ولاقوۃ" سے دی جاتی ہے۔ جس کا کلام سن کر ثقہ قسم کے لوگ عجیب گو مگو مشکل و گر نہ گویم مشکل میں مبتلا ہو کر کہتے ہیں "استغفراللہ۔ مگر سبحان اللہ۔ کیا خوب کہا ہے"۔ فحاشی کو آرٹ بنا کر اس فحاشِ اعظم نے پیش کیا اور اپنے ساتھ ہی اس فن کو ختم کر دیا۔ صرف گالیاں نہیں بکی ہیں بڑے بڑے مسائل اپنے اسی رنگ میں پیش کئے ہیں۔ سیاسی گتھیاں اسی رنگ میں سلجھائی ہیں۔ معاشی اور معاشرتی مسائل کو اسی رنگ میں حل کیا ہے اور بڑے بڑے ماہرینِ فن شعر سے کم سے کم اس بات کا لوہا منوا لیا ہے کہ جہاں تک شعر کا تعلق ہے نہایت پختہ کارانہ انداز سے ٹھکا ہوا شعر کہتا ہے۔ اور اس رنگ میں جو انفرادیت اس کو حاصل ہوئی مشکل ہی سے کسی اور کو نصیب ہوئی ہو گی اور یہ اس کے کلام کا سحر ہے کہ نہ مشاعرے میں پڑھا گیا نہ دیوان کی صورت میں آیا نہ کہیں چھپا مگر حافظوں میں محفوظ ہے۔

جہاں تک علم و فضل کا تعلق ہے انگریزی زبان کے چند فاضلوں میں سے ایک سمجھا جاتا تھا۔ اور شعری سلیقے کے لئے غالباً صرف یہ کہہ دینا کافی

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

مولانا صفی

رہتے ہیں۔ لکھنؤ کے نہایت قابلِ احترام شاعر۔ عزیز لکھنوی کے استاد۔ حضرت آرزو کے ہمعصر۔ وہ کیا بیٹھے ہیں اپنی چارپائی پر نہا نا گاندھی بنے ہوئے۔ ہڈیوں کا ڈھانچہ معلوم ہوتا ہے۔ نہ جانے کب سے بیمار ہیں حالانکہ بیمار نہیں بلکہ تندرستی ہی ایسی ہے۔ چاروں طرف کتابیں بکھری ہوئی ہیں اور خود ان کے درمیان اس چارپائی پر بیٹھے ہیں جس کے سرہانے بستر گول کیا ہوا رکھا ہے۔ حقہ قریب ہی رکھا ہوا ہے اور صراحی اسٹول پر دھری ہے جس پر کٹورا اوندھا ہوا ہے۔ جس کا جی چاہے چلا جائے اور جب تک جی چاہے بیٹھ کر ان کا دماغ تناول فرماتا رہے نہ گھر کا دروازہ بند کریں گے نہ کسی آنے والے سے کبھی اپنی مصروفیت کا ذکر کریں گے اور یہ سلسلہ تقریباً دن بھر جاری رہے گا۔ ایک گیا تو دو اور آ گئے وہ اٹھے تو کوئی اور آ گیا البتہ بس دو قسم کے آنے والوں سے ذرا گھبراتے تھے ایک وہ جو کلام سننے آئیں دوسرے وہ جو کسی مشاعرے میں مدعو کرنا چاہیں۔ اور جب یہ اطمینان کر لیتے کہ آنے والا ان دونوں میں سے کسی کام سے نہیں آیا تو چہرے پر خوف کی جگہ اطمینان کی بشاشت نظر آنے لگتی پھر خواہ کوئی کتنی ہی دیر بیٹھے اور کتنا ہی ان کا وقت برباد کرے ان کو پروا نہ ہوتی۔ انجمن معین الادب اور بہار ادب کے سالانہ مشاعروں اور شیعہ کانفرنس کے ان اجلاسوں میں تو چلے جاتے تھے جن میں ان کو نظم پڑھنا ہوتی تھی اس کے علاوہ نہ کہیں اور جانے کو جی چاہتا تھا نہ صحت اجازت دیتی تھی پھر بھی آئے دن تقاضے اور اصرار ہوتے ہی رہتے تھے اور مولانا صفی کبھی کبھی اپنی انتہائی مروت کے باوجود چڑچڑے پن پر مجبور ہو جاتے تھے۔ مولانا صفی کی شاعرانہ عظمت سے کسے انکار ہو سکتا ہے مگر میں ایک مرتبہ ان کی تصویر دیکھ کر سخت رنجیدہ ہوا جس میں وہ تمغے لگائے بیٹھے تھے۔ مجھ کو ان کی بلند شخصیت پر یہ تمغے کچھ بدنما داغ نظر آئے اور میں نے اپنی اس تکلیف کا ان سے اظہار بھی کر دیا۔ قصہ یہ ہوا کہ میں اس زمانے میں شباب نامی ایک ماہنامے کا ایڈیٹر تھا اس میں مولانا پر ایک مضمون حضرت ماجد الہ آبادی نے لکھا تھا لہٰذا میں مولانا سے تصویر لینے گیا اور مولانا نے وہی تصویر دینا چاہی۔ مگر میں نے صاف صاف کہہ دیا کہ یہ تمغے والی تصویر چھاپ کر میں اپنے اس اعتقاد کو مجروح نہ کروں گا جو مجھ کو آپ سے ہے۔ میں اس تصویر کو آپ کے شایانِ شان نہیں سمجھتا۔ مولانا نے اس کے متعلق مجھ سے کوئی بحث نہیں کی بلکہ یہ عذر کر دیا کہ یہ تمغے مشاعروں کے نہیں بلکہ شیعہ کانفرنس کے ہیں۔ بہرحال چونکہ اس وقت اور کوئی تصویر موجود نہیں لہٰذا آپ فوٹوگرافر کو لے آئیں اور اپنی مرضی کی تصویر کھنچوا لیں چنانچہ مجھ کو یہی کرنا پڑا۔ مولانا صفی کے مکان کے قریب ہی ان کے برادر عزیز سید مقبول حسین ظریف لکھنوی کا بھی مکان ہے۔ ان سے بھی ملتے چلیں۔ آہنی پھاٹک کے اندر میدان میں کرسی ڈالے جو بزرگ اپنی بڑی بڑی مونچھوں کے بالوں کا خود ہی جائزہ لے رہے ہیں اور قینچی سے ان بالوں کو بغیر آئینے کی مدد کے برابر کرنے جا رہے ہیں یہی ہیں

ظریف لکھنوی

جن کو اردو کی مزاحیہ شاعری میں بہت ہی بلند مقام حاصل ہے۔ ظریف لکھنوی کی شہرت اودھ پنچ سے شروع ہوئی اور مشاعروں سے آمد کر تمام دنیائے اردو پر چھا گئی۔ میں نے ان کو سب سے پہلے خود ان ہی کے گھر میں انجمن معین الادب کے ایک مشاعرے میں دیکھا تھا جس میں تمام مشاعرہ ختم ہونے کے بعد سب کے آخر میں ظریف صاحب نے غزل پڑھی تھی۔ لکھنؤ کے طرحی مشاعروں میں مزاحیہ کلام مشاعرے کے آخر ہی میں پڑھا جاتا تھا۔ اس مشاعرے میں بھی آخری غزل ظریف صاحب کی تھی۔ ظریف صاحب سے پہلے مولانا صفی غزل پڑھ چکے تھے جن کی غزل کا ایک شعر اب تک دماغ میں محفوظ ہے۔

قسمت میں جو لکھا ہے ملتا ہے بہر صورت دانہ نہ سہی خرمن، خرمن نہ سہی دانہ

اور صفیؔ صاحب سے پہلے حکیم دانش لکھنوی نامی ایک منفی صورت بزرگ نے ایک عجیب و غریب شعر پڑھا تھا اور انتہائی سنجیدگی سے پڑھا تھا ؎

رخسار بہ رخسارہ و شانہ بسر شانہ　　ہو گرم شب وصلت یوں پہلوئے جانانہ

ظریفؔ صاحب کی غزل کا یہ شعر جو غالباً غزل کا تیسرا مطلع تھا اب تک یاد ہے ؎

مجنوں کی شکایت کیا دیوانہ تو دیوانہ　　لیلیٰ تری محمل میں گھس پڑتا ہے دیوانہ

ظریفؔ صاحب ایک خاص قسم کے ترنم کے ساتھ شعر پڑھتے تھے اور جب سامعین ان کے کلام پر ہنستے تھے تو وہ اس قدر سنجیدہ نظر آتے تھے کہ ان کی اس سنجیدگی پر اور بھی ہنسی آتی تھی۔ ظریفؔ صاحب کی غزلوں کے علاوہ ان کی شہرت کا باعث ان کی نظمیں ہیں۔ سفرنامۂ عراق ان کی ایک ایسی نظم ہے جس میں ان کے رنگ سخن کے تمام پہلو نمایاں ہیں۔ ہم سفر مستورات کا ذکر کیا ہے تو خالص بیگماتی زبان ہے ؎

اُترے یہاں پہ کوئی کہاں اس کی لاش پر　　بیوی کی جھاڑو ایسے مرئے بدمعاش پر

نوکر کا ذکر کیا ہے تو اس کی زبان پوربی ہے۔ وہ ملازم سخت نالاں ہے کہ اس کو جہاز کے خلاصیوں میں ٹھونس دیا گیا ہے اور اس کی کوئی نہیں سنتا چنانچہ وہ کہتا ہے کہ ؎

کپتان سے کہی تو سسر پھاڑ کھات ہے　　کھلاسیں میں کون سنت ہمری بات ہے

اور جب خود اپنا حصہ نظم کرتے ہیں تو اپنی زبان ہے اور اپنا بیان کہ ؎

عورت پہ مرد، مرد پہ عورت سوار تھی　　اسٹیشنوں کی بھیڑ بھی اک یادگار تھی

اس شعر میں جو غیر محتاط انداز بیان ہے وہ کبھی کبھی ظریفؔ صاحب کے کلام میں آجایا کرتا تھا مثلاً ؎

اُدھر وصلت کا نام آیا یہ پہلے سے لگا ہلنے　　مذاق اچھا کیا عاشق سے یہ حسرت بھرے دل نے

بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ ظریفؔ صاحب کے کلام کا بیشتر حصہ مولانا صفیؔ کا ہے۔ اور یہ شبہ اس وقت سے تقویت حاصل کر گیا جب لکھنؤ کے مشہور ماہر امراض جنسی ایس۔ اے حکیم کا ایک منظوم اشتہار مولانا صفیؔ نے اپنے نام سے لکھا تھا اس اشتہار میں جو شوخی اور ظرافت تھی وہ تقریباً وہی تھی جو ظریفؔ صاحب کے کلام میں نظر آتی ہے۔ بہرحال ہم کو اس سے بحث نہیں اگر یہ واقعہ بھی ہے تو اس کو گھر ملو لین دین سمجھنا چاہیئے۔ ظریفؔ صاحب بہرحال مولانا صفیؔ ہی سے مشورہ فرماتے تھے۔ بڑے بھائی اور اُستاد نے اگر کچھ بخش دیا ہو تو کیا عجب ہے۔ بہرحال نہ صفیؔ زندہ رہے نہ ظریفؔ۔ دونوں ہی لکھنؤ کی ادبی صحبتوں کو ویران کر گئے۔ ظریفؔ صاحب کے مکان سے چل کر رکاب گنج کے پُل کی طرف ہو کر جانا چاہیئے اس لیے کہ رکاب گنج کا پُل آنے سے پہلے ہی داہنے ہاتھ کو ایک گلی مڑتی ہے جس میں سراجؔ لکھنوی کا مکان ہے۔ لکھنؤ کی ینگ پارٹی کے سربراہ اور مقدمۂ سراجین کے ہیرو

سراج لکھنوی

سراجؔ لکھنوی نے اگر جام جہاں نما کے ایڈیٹر مولانا افقر موہانی پر مقدمہ نہ بھی چلایا ہوتا تو بھی لکھنؤ کی تاریخ کی تدوین کے وقت ان کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا تھا۔ وہ نہ صرف نہایت خوش گو غزل کے شاعر ہیں بلکہ ان کے کلام میں نقاد کو بہت کچھ مل جاتا ہے اور غزل کی تہی مائیگی کی شکایت کرنے والے سراجؔ کا کلام دیکھ کر اپنی شکایت پر نظر ثانی کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ سراجؔ نے بھی بعض اوقات صرف زبان کے چٹخاروں سے کام لیا ہے مثلاً ؎

سکے صاحبزادے۔ اسی طرح کے بے شمار لطیفے ہمدم کے دفتر میں آتے اور سنائے جاتے۔ ہمدم کے دفتر میں ان کی آمد و رفت اس زمانے میں بہت بڑھ گئی تھی جب ان کے شاگرد چودھری رحم علی الہاشمی ہمدم کے ایڈیٹر تھے۔ ایک دن میں نے عزیز صاحب سے پوچھا کہ بجنور کے اخبار مدینہ کی پیشانی پر آپ کا جو شعر لکھا رہتا ہے ؎

معجزہ شق القمر کا ہے مدینے سے عیاں ۔۔۔ مہ نے شق ہو کر لیا ہے دیں کو آغوش میں

یہ محض کاریگری ہے یا کچھ اور۔ تو ہنس کر بولے کہ ہے تو یہ واقعی کاریگری مگر آپ کاریگری کے اتنے مخالف کیوں ہیں مدینہ کی 'م' ادھر اور 'ہ' ادھر بیچ میں صرف دین رہ گیا اور مہ گویا شق ہو گیا۔ یہ بات اگر مجھے سوجھ گئی اور میں نے نظم کر دی تو آپ ناراض کیوں ہیں۔ میں نے لاکھ لاکھ سمجھایا کہ میں ناراض نہیں ہوں بلکہ صرف یہ پوچھنا چاہتا تھا کہ اور کوئی بات تو نہیں ہے اس شعر میں مگر ان کو یہی شبہ رہا کہ میرے دل میں کوئی اعتراض ہے جسے میں بیان کرنا نہیں چاہتا۔ چنانچہ پھر جب کبھی ملے یہی پوچھتے تھے کہ ہاں بھئی وہ بات کیا تھی اور میں از سر نو یقین دلاتا تھا کہ میں نے کسی اعتراض کی غرض سے یہ بات نہیں پوچھی تھی۔ عزیز لکھنوی میں اپنے خوردوں کو بھی دوست بنا لینے اور اپنے کو ان کے لئے دلچسپ ثابت کرنے کا خاص ملکہ تھا۔ چنانچہ ان کے انتقال کے بعد صرف ان کے ہمعصروں اور ان شاگردوں ہی کو ایک کمی محسوس نہیں ہوئی جو ان سے مشورۂ سخن کرتے تھے بلکہ امین آباد ہائی اسکول کے ان لڑکوں کو بھی ایک خلا محسوس ہوا جو ان سے صرف درسی کتابیں پڑھتے تھے مگر عزیز لکھنوی ان کے دل و دماغ میں بھی رچے اور بسے ہوئے تھے۔ عزیز صاحب کے مکان سے تھوڑی ہی دور کے فاصلے پر

پروفیسر مسعود حسن ادیب

بھی رہتے ہیں ان سے بھی ملتے چلئے۔ پروفیسر مسعود حسن ادیب پروفیسر تو خیر ہیں ہی لکھنؤ یونیورسٹی کے صدر شعبۂ اردو اور مسعود حسن بھی ہیں مگر یہ جو ادیب ان کا تخلص ہے اس کا مصرف کبھی سمجھ میں نہ آیا۔ ممکن ہے یہ تخلص بھی مسعود حسن صاحب اسی احتیاط سے رکھتے ہوں جس طرح وہ قلمی نوادر احتیاط سے رکھتے ہیں جن کو وہ اپنی زندگی کا سرمایہ سمجھتے ہیں اور یہ گوارا نہیں کر سکتے کہ ان نوادر کو ہوا بھی لگ سکے۔ اس میں شک نہیں کہ ان کے کتب خانے میں بہت ہی قیمتی چیزیں ہیں اور ان کی قیمت کا راز صرف ان کی نایابی میں ہے۔ مثلاً اندر سبھا کا نایاب نسخہ، واجد علی شاہ کی بیگمات کے خطوط، واجد علی شاہ کی قلمی مثنویاں اور اسی قسم کی بے شمار چیزیں جن کو لوگ عجائبات کے طور پر دیکھنے جاتے ہیں اور مسعود حسن صاحب اگر بہت مجبور کئے گئے تو وہ نوادر اس طرح دکھاتے ہیں جس طرح نظام حیدر آباد نے علامہ اقبال کو اپنے جواہرات کا خزانہ دکھایا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ مسعود حسن صاحب کا خزانہ بھی جواہرات سے کم نہیں مگر وہ اس کو دولت بیدار بنانے کی جگہ دفن کئے ہوئے ہیں۔ مسعود حسن صاحب اردو کے شیدائیوں میں سے ہیں ان کی خدمات سے قطع نظر صرف ان کو اردو بولتا ہوا سنکر یہ محسوس ہوتا ہے کہ جیسے کوئی مزہ لے لے کر مٹھائی کھا رہا ہو وہ ایک ایک لفظ سے ایسا مزہ لیں گے اور ان کے چہرے پر ایسا انبساط ہوگا کہ سننے والے کے منہ میں پانی بھر آئے۔ ویسے بھی ان میں رہنے سہنے اٹھنے بیٹھنے اور بات چیت کرنے کا بڑا سلیقہ ہے۔ ہر بات سے فطری نفاست پسندی جھلکتی ہے اور ان سے ملنے والے کو ان سے مل کر یہ محسوس ہوتا ہے جیسے اس نے خطاطی کا کوئی نہایت نفیس نمونہ دیکھا ہو۔ مسعود صاحب سے مل کر نخاس ہوتے ہوئے جھوائی ٹولے کی طرف مڑ جائیے تو حکیم عبدالعزیز روڈ پر

مرزا محمد عسکری

کا نہایت بلند و بالا مکان ہے جس میں اب صرف ان کی یاد رہتی ہے وہ قبر کا کونہ آباد کر چکے ہیں مگر یہ ذکر ہے اس وقت کا جب وہ زندہ تھے اور ان میں زندگی کی ہر چہل پہل موجود تھی۔ وہ بھی بڑی چٹخارے دار زبان بولتے تھے اور بات کرتے وقت بات کا مزہ لیتے تھے۔ رام بابو سکسینہ کی

تاریخ ادب اردو کے مترجم کی حیثیت سے ان کی شخصیت اتنی بلند نہیں ہے جس قدر اپنی دوسری کتابوں نے ان کو ہر دلعزیز اور ساتھ ہی ساتھ قابلِ ذکر بنایا ہے۔ نوادر، من کیستم اور آئینہ بلاغت ان کی وہ کتابیں ہیں جن میں مرزا صاحب اپنے صحیح خد و خال کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ بڑے اچھے دوست، بڑے دلچسپ بزرگ مگر ساتھ ہی ساتھ منتظم اتنے تھے کہ اگر آپ ان کے پاس پہنچ جائیں اور آپ کی تواضع ان کے بجٹ سے باہر جا رہی ہو تو وہ شاید آپ کو پان کے لئے بھی نہ پوچھیں اور سلیقہ اتنا کہ پان اگر کھلائیں گے تو گلوریوں پر کیل کے ساتھ گلاب کی پنکھڑیاں بھی لگی ہوں گی کہ دیکھتے ہی طبیعت خوش ہو جائے۔ بات بات میں لطیفہ سنائیں گے آپ کو ہنسائیں گے اور خود بھی ہنسنا چاہیں گے مگر آپ ذرا غلط زبان بولے اور ان کا مزہ کرکرا ہوا۔ لوگ ان کے پاس صرف ٹکسالی بولی ٹھولی اور کبھی کبھی ضلع جگت سننے جایا کرتے تھے مگر جب ٹکسالی بولی ٹھولی اور ضلع جگت ہی نہ رہا تو اب وہ کیا کرنے رہ گئے۔ مرزا محمد عسکری کے مکان سے جھوائی ٹولہ ہوتے ہوئے آگے بڑھ جائیے تو

مولانا عبد الحلیم شرر

کا مکان ہے جہاں وہ سفید گھنی داڑھی والے نحیف و نزار سمس کی شکل کے بزرگ رہتے تھے جن کا ناول نویسی میں طوطی بولا کرتا تھا۔ گھر میں داخل ہوتے ہی ان کا کتابوں اور کاغذوں سے اٹا ہوا وہ کمرہ نظر آتا تھا جس میں ایک میز پر کتابوں میں دفن یہ بزرگ ہر وقت کچھ نہ کچھ لکھتے نظر آتے تھے۔ مجھ کو ان سے بات کر کے کبھی لطف نہ آیا نہایت سپاٹ قسم کی باتیں کرتے تھے البتہ اس زمانے میں وہ دلچسپ بن گئے تھے جب ایک شخص فسانہ رام شرر پیدا ہو گیا تھا جو ان کی ہر ناول کو ہتھیا لیتا تھا۔ مثلاً انھوں نے لکھا دربار رام پور۔ اس نے دربار حرام پور کے نام سے کچھ اِدھر اُدھر سے بدل وہی کتاب چھاپ دی بخت عاجز تھے مولانا اس کے ہاتھوں اور کچھ بنائے نہ بنتی تھی۔ نہ جانے ان کی کتنی کتابوں کا اس نے اسی طرح ناس مارا اور اپنے کو شرر کہہ کر اپنی خرافات بھی ان ہی کے سر تھوپ دیں۔ اس زمانے میں مولانا کی اس نورانی صورت پر وہ گالیاں بڑی بھلی لگتی تھیں جو فسانہ رام شرر کو دے دیتے تھے۔ اس کے علاوہ مولانا کو میں نے ہمیشہ نہایت خشک اور کھرا پایا۔ وہ مصنف کم اور تاجر زیادہ نظر آتے تھے۔ مولانا شرر سے رسمی ملاقات کے بعد پھر جھوائی ٹولے سے ہوتے ہوئے نوراچوک میں داخل ہو جائیے جہاں سید حسین خاں کے پھاٹک سے آگے بڑھ کر چودھرائن کے امام باڑے کے سامنے ہی ایک قابلِ ذکر بزرگ

خواجہ عبد الرؤف عشرت

کی کتابوں کی دوکان ہے۔ اب نہ خواجہ عشرت رہے نہ ان کی دوکان مگر تصور میں اس وقت بھی یہ دوکان موجود ہے جس میں خواجہ صاحب نہایت دھان پان قسم کے بزرگ اپنی ہی لکھی ہوئی شاعری سکھانے کی کتابیں شاعری کی پہلی کتاب۔ شاعری کی دوسری کتاب۔ شاعری کی تیسری کتاب۔ شاعری کی چوتھی کتاب بیچا کرتے تھے۔ شاگردوں کی غزلیں بناتے تھے اور شام کو یہی دوکان دوسرے شاعروں کا اڈا بن جاتی تھی جن میں صفدر مرزا پوری نظر آتے تھے۔ مشاطۂ سخن کے مصنف

صفدر مرزا پوری

ریاض خیر آبادی کے شاگرد اور بہت سے شاگردوں کے استاد تھے۔ مشاعروں میں بڑی پابندی سے شرکت کرتے تھے اور غزل اس طرح پڑھتے تھے کہ کبھی کسی نے قافیہ اور ردیف نہ سنا قافیہ اور ردیف تک پہنچتے پہنچتے اس قدر انکسار میں مبتلا ہوتے کہ بس "ہیں ہیں ہیں" کہہ کے رہ جاتے تھے مثلاً ـــ

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

خواجہ مجذوب غوری

سے ہوسکتی ہے۔ خان بہادر خواجہ عزیز الحسن غوری۔ جو حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کے مرید بن کر ڈپٹی کلکٹری کو چھوڑ بیٹھے تھے اور اپنی خدمات محکمۂ تعلیم میں اس لئے منتقل کرالی تھیں کہ ڈپٹی کلکٹری میں نہ جانے کب سود کی ڈگری دینا پڑ جائے یا کوئی اور خلاف شرع فیصلہ کرنا پڑ جائے چنانچہ خان بہادر رہیں ڈپٹی انسپکٹر مدارس ہیں۔ بڑے سینیئر ڈپٹی کلکٹر رہ چکے ہیں مگر وضع قطع سے معلوم ہوتا ہے کہ ابھی کسی مسجد سے اذان دے کر آرہے ہیں سر پر چوگوشیہ ٹوپی سرخ سفید رنگ چہرے پر بھوری داڑھی لمبا کرتہ۔ اٹنگا پاجامہ۔ بغل میں لٹکا ہوا کلام مجید۔ مگر آپ کو مل جائیں گے تو سڑک ہی پر کھڑے کھڑے اپنی غزل سنانا شروع کر دیں گے اور غزل بھی وہ جس میں کم سے کم بہتر شعر ہوں گے۔ لہراتا ہوا ترنم اور ترنم کے ساتھ لہراتے ہوئے ہاتھ بلکہ کبھی کبھی سارے جسم سے لہرا جائیں گے اور غزل سناتے رہیں گے۔ ؎

ہر تمنا دل سے رخصت ہوگئی اب تو آجا اب تو خلوت ہوگئی

ایک مرتبہ میرے گھر پر مشاعرہ تھا مجذوب صاحب نے مطلع پڑھا ؎

تو نے ان کو کیا سے کیا ذوقِ فراواں کر دیا پہلے جاں پھر جانِ جاں پھر جانِ جاناں کر دیا

میں نے کہا مجذوب صاحب تو اردو ہو گیا ہے میرا مطلع ہے ؎

تو نے اکبر کیا سے کیا بیرم کو ہاں ہاں کر دیا پہلے خان پھر خانِ خاں پھر خانِ خاناں کر دیا

بڑی زور سے ہنسے اور پھر غزل شروع کر دی۔ ایک مرتبہ میں اور مولانا عنایت اللہ فرنگی محلی ان کے ساتھ ان ہی کے موٹر پر جا رہے تھے جسے وہ خود چلا رہے تھے راستے میں غزل سنانا شروع کر دی اور اسٹرنگ وہیل چھوڑ کر ہاتھ لہرانے لگے نتیجہ یہ کہ موٹر ایک کھڈ میں قلابازی کھا گئی۔ شکر ہے کہ کسی کو چوٹ نہیں آئی سب کپڑے جھاڑ کر کھڑے ہو گئے مجذوب صاحب نے پوچھا کہ "چوٹ تو نہیں آئی" مولانا عنایت اللہ نے فرمایا کہ "اللہ نے بڑا فضل کیا" مجذوب صاحب نے کہا "تو اس کا دوسرا مصرعہ یہ تھا کہ ——" اور غزل شروع ہی کرنے والے تھے کہ مولانا عنایت اللہ نے ڈانٹ کر چپ کر دیا کہ پہلے کار کی خبر لو۔ اب کہاں ملتے ہیں یہ لوگ مجذوب صاحب بھی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ مجذوب صاحب سے ملتے ہوئے حضرت شاہ مینا صاحب کی درگاہ پر فاتحہ پڑھ کر جگت نرائن روڈ پر ہو لیجئے۔ یہ سڑک پنڈت جگت نرائن ملا کے نام نامی سے منسوب اور اسی سڑک پر گولہ گنج میں ان کے صاحبزادے پنڈت آنند نرائن ملا صاحب جوئے شیر رہتے ہیں

پنڈت آنند نرائن ملاّ

اردو کے ان چند ہندو شاعروں میں سے ایک ہیں جو آج بھی بھارت میں اردو کے لئے سینہ سپر بنے ہوئے ہیں۔ ہائی کورٹ کے جج ہیں اپنی ذمہ داریوں کا پورا احساس رکھتے ہیں۔ وطن پرست ہیں مگر ساتھ ہی ساتھ اردو پرست بھی اور ہندوستان کی اردو دشمنی سے آگاہ بھی۔ چنانچہ اپنا مجموعۂ کلام جوئے شیر پیش کرتے ہوئے اس کا انتساب یوں کیا ہے :-

مٹتی ہوئی اردو کے نام

اک موت کا جشن بھی منا لیں تو چلیں پھر پونچھ کے اشک مسکرا لیں تو چلیں

آ تجھ کو گلے لگا کے مٹتی اردو اک آخری گیت اور گا لیں تو چلیں

اور اسی کے بعد دوسرے صفحے پر اس سے بھی زیادہ سخت ایک چیز ہے :-

آشفتہ تاریخ کا ایک صفحہ

یہ سانحہ سالِ چہل و نو میں ہوا　　ہندی کی چھری تھی اور اُردو کا گلا
اُردو کے رفیقوں میں جو مقتول ہوئے　　ملّا نامی سنا ہے شاعر بھی تھا

پنڈت آنند نرائن ملا اُن کشمیری پنڈتوں میں سے ہیں جن کے یہاں ہمیشہ مسلمان باورچی رہا کرتا تھا۔ جو بات بات میں انشاءاللہ اور ماشاءاللہ کہتے تھے۔ اور تقسیم ملک کے بعد۔ وہ اپنے ہم زبانوں۔ ہم سفیروں اور ہم نفسوں سے محروم ہوگئے ہیں اس تکلیف کا اظہار پنڈت آنند نرائن ملا نے مجھ سے اس طرح کیا کہ اپنا مجموعہ مجھے دیتے ہوئے اس کے پہلے صفحہ پر لکھا ہے:۔

بھائی شوکت کی خدمت میں

بیاد ایامے
کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کوئی پوچھے پنڈت جی سے کہ یہ باتیں بھلا دینے والی ہوتی ہیں؟۔ میں جذباتی ہو رہا ہوں لہٰذا یہاں سے چلئے بھلا غضب خدا کا راستے میں وزیر گنج پڑتا ہے وہاں آپ اُردو کے جلیل القدر شاعر اور جلال لکھنوی کے جانشین

آرزو لکھنوی

کو بھول آئے ہیں۔ کانوں سے بہرے مگر صحیح معنوں میں بحرالعلوم۔ ڈرامہ کا میدان سر کئے ہوئے۔ تغزّل میں اپنا جھنڈا گاڑے ہوئے زبان دانی میں اپنا لوہا سب سے منوائے ہوئے اس طرح مسکین صورت بنائے بیٹھے ہیں گویا ان باتوں سے اور ان حضرت سے کوئی تعلق ہی نہیں مگر یہ واقعہ ہے کہ اُردو زبان کے محسنوں کی جب تاریخ مرتب ہوگی اور اس کا ایک جگمگاتا ہوا باب جلال لکھنوی کو ملے گا تو اس میں سب سے نمایاں آرزو کا نام ہوگا۔ لکھنؤ کی مٹی سے یہ آفتاب ابھرا تھا مگر خود اس کی مٹی کراچی کی تھی جہاں یہ سورج پاکستانی پرچم کے ہلال کے زیر سایہ غروب ہوا اور اُردو شاعری کو مرتے مرتے آبِ حیات پلا گیا۔ آرزو لکھنوی سے مل کر گولہ گنج ہوتے ہوئے امین آباد کا رُخ کیا ہی تھا کہ کسی کو دیکھ کر ٹھٹھک جانا پڑا۔ اور اخاہ کہہ کر آگے بڑھے اور

سید علی عباس حسینی

سے بغل گیر ہوگئے۔ عہد حاضر کا یہ جلیل القدر افسانہ نویس اپنی آنکھوں میں ذہانت کا تبسم لئے سامنے کھڑا تھا باسی پھول کا یہ شگفتہ مصنف جس نے اُردو کے فن افسانہ نگاری کو نئی راہوں سے آشنا کیا خود اب تک پرانی روش پر چلتا ہے۔ وہی کھلے پائنچوں کا پاجامہ اور دہی شیروانی نہ سوٹ ہے نہ ہیٹ اور نہ زمین پر اس طرح چلنے کا انداز کہ قدم آسمان پر پڑ رہے ہوں اتنا بڑا فن کار اور خود اتنا سادہ کہ اپنی پرکاری کو بھی ابھرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ ملئے تو خلوص ہی خلوص۔ پرکھیئے تو اعتماد ہی اعتماد۔ علی عباس حسینی سے مل کر آگے بڑھے ہی تھے کہ ایک تانگہ خود ہی آکر قریب رُکا۔ ہاتھوں میں ایک مجلد کاپی، کاپی پر رکھی ہوئی چاندی کی پانوں والی ڈبیا دبائے سفید مونچھوں والے چہرے پر بچوں کی سی مسکراہٹ اور بھولپن لئے ایک صاحب آگے بڑھے اور گلے سے لگا لیا۔ یہ ہیں

جعفر علی خاں اثر

لکھنؤ کی تہذیب و تمدن اور اودھ کی وضعداری اور شرافت کی ایک زندہ مثال۔ بہت بڑے شاعر، بہت بڑے نقاد، بہت بڑے

انشاپرداز مگر ان سب سے بڑے انسان جن کی زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جس سے انسانیت نہ برستی ہو۔ خان بہادر ہیں ایم۔بی۔ای ہیں۔ کمشنری سے لے کر وزارت تک کر چکے ہیں مگر عالی ظرفی کا یہ عالم کہ کہیں بھی چھلکنے نہ پائے جس سے ایک مرتبہ مل لئے اس نے جیشان کو اپنا سمجھا کیا عزیز اور کیا دوست۔ دوستوں کے عزیز بنے رہے اور عزیزوں کے دوست اور جس سے جو تعلقات قائم کر لئے ان کو آخر تک نباہ کر دکھا دیا۔ مرزا جعفر علی خاں اثر سے مل کر آپ کو محسوس ہوگا کہ آپ اس لکھنؤ سے مل لئے جو اب لکھنؤ میں بھی دراصل نہیں ہے وہ روایتی وضعداری۔ وہ سُنا سُنایا اخلاق اور وہ افسانہ بن چکنے والا علم اس ایک ہیکل میں یکجا نظر آتا ہے۔

مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی سے مل کر امین الدولہ پارک ہوتے ہوئے گونگے نواب کے باغ کی طرف اگر گذر ہو گیا تو وہاں منشی احمد علی

شوق قدوائی

اور ان کے بھائی منشی واحد علی آبر سے ملنے کا خطرہ ہے۔ شوق قدوائی مرحوم اس وقت تک زندہ ہیں جب تک مثنوی عالم خیال زندہ ہے۔ ان کی شاعرانہ عظمت سے اُردو شعر و ادب کی تاریخ کبھی انکار نہیں کر سکتی۔ ان کا شمار اپنے وقت کے ان اساتذہ میں تھا۔ جو شاعر ہی نہیں بلکہ شاعر گر تھے۔ ان کا فنی تبحر مسلم سمجھا جاتا ہے۔ ان کی پُرگوئی سے ان کے معاصرین لرزہ براندام رہتے تھے۔ اور دم نکلتا تھا۔ ان کے احباب کا اس وقت کے خوف سے جب شوق صاحب ان کو پکڑ لے جائیں۔ اپنے گھر اور سنانا شروع کریں۔ اپنا کلام۔ حال یہ تھا کہ دوستوں نے ان کی گلی کا راستہ چھوڑ رکھا تھا۔ شوق صاحب اگر دُور سے نظر آ جاتے تو لوگ بھاگتے تھے۔ سر پر پیر رکھ کر۔ مگر اس کے باوجود شوق صاحب کو ہر روز کوئی نہ کوئی شکار مل ہی جاتا تھا۔ جس کو نہایت محبت سے گھیر کر گھر لاتے تھے۔ بڑے خلوص سے بٹھاتے تھے۔ اچھے سے اچھا کھلاتے تھے۔ اور پھر اپنا کلام سنا کر کھلایا پلایا سب اس سے وصول کر لیتے تھے۔

لکھنؤ میں گونگے نواب کے باغ میں ایک بارہ دری میں شوق قدوائی مرحوم اور ان کے برادرِ عزیز منشی واحد علی آبر مرحوم کی بیٹھک تھی۔ اس بیٹھک کے ایک در میں شوق صاحب کی نشست ہوتی تھی اور دو تین در چھوڑ کر ایک اسی قسم کے در میں منشی واحد علی آبر کچھ لکھا اور پڑھا کرتے تھے۔ خود تو خیر کس کی شامت آتی تھی۔ کہ وہ شوق صاحب کے پاس آتا البتہ لوگوں کو پرچے لکھ لکھ کر دعوتوں کے بہانے سے اور بیماری کا دھوکہ دے دے کر دوستوں کو بلواتے تھے۔ پھر بھی اگر کوئی نہ آئے تو شکار کی تلاش میں نکل جاتے تھے۔ اور کسی نہ کسی کو پکڑ ہی لاتے تھے۔ خاطر و مدارات کے دام بچھاتے تھے ناشتہ کرائیں گے۔ مرغن کھانے کھلائیں گے۔ آم خربوزوں سے تواضع کریں گے۔ اور اس کے بعد کلام سنانے بیٹھ جائیں گے۔ حال یہ تھا کہ لوگ پاؤں سے دُودھ اور بیویوں سے مہر بخشوا کر ان کا کلام سننے آتے تھے۔ بلکہ جب پکڑ کر لائے جاتے تھے تو آتے تھے۔ اور عموماً ہوتا یہ تھا۔ کہ مثلاً کوئی شکار سہ پہر کو پھنسا اس کو ناشتہ کرایا اور رات کے کھانے کے وقت تک کلام سنایا۔ کھانے کا وقت ہو گیا تو اس کو ہزاروں قسمیں دے کر دسترخوان پر لے گئے۔ بہت ہی تواضع سے کھانا کھلایا اور دسترخوان سے اُٹھا کر پھر مقتل میں لے آئے۔ اور سنانا شروع کر دیا کلام۔ اس کو انتظار کہ غزل ختم ہو اور اجازت حاصل کرے۔ اور یہاں غزل کے ختم ہوتے ہی دوسری غزل کا مطلع۔ جب دیکھا کہ سننے والے کی داد میں تھکاوٹ کے آثار پیدا ہوئے ہیں تو چائے منگا لی۔ اس نے اجازت چاہی تو اس کے زانو پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ بھئی کب کب ملنا ہوتا ہے۔ ہم سخن کب کب ملتے ہیں۔ تمہارے ہی رنگ میں ایک غزل کی نئی مطلع ملاحظہ ہو۔

اور جب سننے والے کو آدھ موا کر دیا تو پان کھلا دیا۔ کبھی حقہ بڑھا دیا۔ مگر غزل کے بعد غزل کا سلسلہ جاری رہا۔ رات زیادہ آگئی تو بستر کا انتظام کر دیا۔ کہ اب کہاں جاؤ گے۔ سواری بھی نہ ملے گی۔ اور صبح قبل اس کے سونے والا جاگ کر بھاگے شوق صاحب خود اس کے سرہانے موجود اور منتظر کہ وہ جاگے تو سلسلہ شروع ہو۔ اور اگر شوق صاحب غسل خانے جانے کے لئے یا کسی اور ضرورت سے اُٹھے بھی تو ان

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

(چند علمی و ادبی شخصیتیں)

حیدرآباد کا ایک دور

قطب الّنسا ہاشمی

کائنات کی وہ پیچیدہ و گراں قدر تخلیق جس پر خالقِ ازل کو بھی ناز ہوا بار یک بینی اور گہرا مطالعہ چاہتی ہے۔ انسان کو جاننا پہچاننا کوئی آسان کام نہیں۔ ہم دن رات انسانوں میں رہتے بستے ان کے میٹھے بول اور کڑوے جملے سنتے ہیں ان کے طور طریق دیکھتے ہیں اور کبھی کبھی ان کی اندرونی کیفیت اسباب اور واقعات سے ایک دم ہمارے سامنے عیاں بھی ہو جاتی ہے۔ پھر بھی زاویۂ نظر کی صحت کامل نہیں ہو سکتی۔ یہ کیوں اور بھی مشکل ہو جاتا ہے کہ ہر انسان کسی نہ کسی اعتبار سے کسی نقاب میں روپوش رہتا ہے۔ اس کی داخلی زندگی اور خارجی زندگی میں بیّن تفاوت ہے۔ شاذ و نادر کوئی بے حجاب بے نقاب نظر آ سکے تو آ جائے ورنہ اصلیت اپنے اصلی نقوش میں ظاہر ہونا نہیں چاہتی۔

لیکن وہ لوگ جو انسانیت کے خادم ہیں علم و ادب کے پیاسے ہیں صداقتوں کو ٹٹولنے اور حقیقتوں کو جاننے کے لئے بے چین رہتے ہیں اس کے مستحق ہیں کہ ان کا تعارف عوام سے کرایا جائے۔ یعنی انسانی تمناؤں اور آرزوؤں کو پالنے والی یہ ہستیاں قابلِ ستائش ہی نہیں قابلِ تعارف بھی ہیں میں بھی آج اسی جذبہ کے تحت ذیل کے چند افراد کا مختصر سا تعارف قارئینِ کرام سے کرانا چاہتی ہوں وہ بھی اپنی مرضی سے نہیں بلکہ مدیرِ نقوش کی خواہش پر اس مشکل مسئلہ پر میں نے قلم اٹھایا ہے۔ اس لئے پہلے ان سب شخصیتوں سے معافی چاہتی ہوں جن کے تعارف میں اگر میں بخل یا غلو سے کام لوں تو اس کا سبب میری کم علمی کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔

ڈاکٹر زورؔ (سیّد محی الدین قادری)

حیدرآباد کی دنیا کے پہلے ادبی ڈاکٹر — آپ کے نام سے کون واقف نہیں — طالب علمی کے زمانے ہی سے آپ نے تصنیف و تالیف شروع کر دی تھی۔ اردو زبان جب پروان چڑھ رہی تھی آپ نے اس کا اندازِ قد پہچان لیا تھا اور اس میں تحقیقی و تنقیدی نظریے پیدا کر دی تھیں۔ دکنی زبان کی بڑی کچھ محترم نے کی ہے۔ آپ کی کئی تصانیف و تالیفات ہیں جن کا آج فنِ تنقید میں بھی ایک نمایاں مقام ہے۔ اردو زبان کی حفاظت و اشاعت ان کی زندگی کا مقصدِ عظیم ہے۔

"ادارۂ ادبیاتِ اردو" کی زندگی میں آپ کی سعی اور محنت ایسے رچ گئی ہے کہ گویا اس کا تانا بانا آپ کی ذات ہی تو ہے۔ وقت کے بڑے نباض ہیں ڈاکٹر صاحب قدیم روایتوں کو لے کر وقت کے دھارے پر برابر آگے بڑھتے جا رہے ہیں۔ ان کی کوششیں قابلِ تعریف ہی نہیں بلکہ قابلِ قدر بھی ہیں۔ ادارہ سے انہیں دلی محبت ہے۔ اس کی ترقی پہلے اور بعد سب کچھ —— ادارہ جو اردو کی خاموش اور مسلسل خدمت کر رہا ہے وہ آپ کے تدبر اور مصلحت

کی کھلی نشانی ہے۔

"چلو تو سارے زمانے کو ساتھ لے کے چلو"

اس مسلک پر محترم کی نظر بڑی گہری ہے اور اردو دوستوں کو اس مسلک کے تحت بڑا سہارا دیتے ہیں۔
تنقیدی نظر کی رسائی گفتگو، ورعلمی صحبتوں میں بھی جھلک جاتی ہے۔ بے باک انسان ہیں، لیکن مصلحتوں کا دامن تھامے رہتے ہیں۔ راستہ سے الگ ان کی آنکھیں پہنچ جاتی ہیں۔

آپ کی زندگی کامیاب زندگی ہے۔ اردو دان حلقہ میں امتیازی مرتبہ رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کا علمی ذوق ابھی دھیما نہیں ہوا بلکہ عمر کے ساتھ ساتھ اس کی رفتار تیز ہوتی جارہی ہے۔ گھر میں اچھا کتب خانہ ہے جو علمی ذوق کا ثبوت ہے۔ کالج کے پرنسپل ہیں جو وقت بچ جاتا ہے وہ ادارہ کی خدمت اور اردو دوستی میں گذار دیتے ہیں۔ آپ کی تحریریں علمی تحقیقی سادہ اور لچکدار ہوتی ہیں۔ طرز بانکا اور منفرد ہے۔ پان بڑے چاؤ سے کھاتے ہیں۔

پروفیسر عبدالقادر سروری

کامیاب پروفیسر ـــــ سلجھے ہوئے منتظم ـــــ صلح جو کارگذار ـــــ امن کے متلاشی اور کام کے بندے ہیں۔ حیدرآباد کے اس بے چین دور میں جہاں اردو اپنی اکھڑی سانسیں جمع کر رہی ہے بڑی مصلحت اندیشی اور عاقبت کوشی سے محترم نے اپنے شعبہ کو مستحکم کیا ہے۔ شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ کے صدر رہیں۔ ساتھ ہی ساتھ اردو دوستوں سے رکھ رکھاؤ، شاگردوں سے خاص محبت اور ان کی سدھار و زندگی کے دھارے ہیں جس رواداری اور محنت سے آپ نے ساتھ دیا ہے وہ بڑا قابلِ قدر کام ہے۔

یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ محترم علم دوست بھی ہیں اور انسان دوست بھی ـــــ وقت کے تقاضے اور اس سے کام لینے کی خاص صلاحیت رکھتے ہیں۔ آج یونیورسٹی میں اپنی محنت اور کاوش سے جو درجۂ امتیاز آپ کو حاصل ہے وہ ہر کس و ناکس کے بس کا نہیں۔ کاروباری دنیا میں کون سب کو خوش رکھ سکتا ہے۔ مصلحتیں ہمیشہ غلط افہام پیدا کرتی ہیں۔ لیکن پروفیسر صاحب بڑے کمال اور تدبر سے اپنا زاویۂ نظر دنیا کے سامنے پیش کرتے رہتے ہیں۔ دانشمندی اور رکھ رکھاؤ نے ان کی ذات میں ایک خاص اعتماد پیدا کر دیا ہے اور بڑے تدبر اور دھیمے پن سے گتھیوں کو سلجھا دیتے ہیں۔ پھر ایسے معلوم ہوتا ہے کہ اب کوئی مشکل ہی نہ رہی۔ مشکلات کا مقابلہ نڈرپن اور رجان داری سے کرتے ہیں۔ آج اردو زبان کی جان پر جو کٹھن گھڑیاں آگئی ہیں، محترم نے ان کا اچھی طرح جائزہ لیا اور پس منظر پر بھی گہری نگاہ ڈالی اور ہر اس لمحہ کو حاصل کیا جس میں وہ اپنی زندگی پاتی تھی اور پھر اس کو اپنا لیا۔

پروفیسر صاحب کا مطالعہ وسیع اور نظر نکتہ رس ہے۔ ان کی اکثر تصانیف تنقیدی اور ٹھوس چیزوں پر مشتمل ہوتی ہیں۔ لسانیات ان کا محبوب مضمون ہے، لسانیات میں ان کی نظر امتیازی ہے۔ تنقیدی مضامین ٹھوس ہونے کے علاوہ جزئیاتی تفصیل سے بھی پرچھتے ہیں۔ اس طرح محترم کا قلم قیمتی بن جاتا ہے۔
زمانہ کے نشیب و فراز سے اچھی طرح واقف ہیں۔ اخلاق اور انصاف پسندی میں ان کی مثال منفرد ہے۔ ان کی گھریلو زندگی پُرامن، یونیورسٹی کی زندگی مطمئن ہے۔ اپنے بچوں سے بہت محبت کرتے ہیں۔

فضل الرحمٰن

میں نے پہلی مرتبہ آپ کو نظامت تعلیمات کی کرسی پر دیکھا تھا مدرسہ عالیہ سے ایک میگزین کی ادارت و اجازت کے سلسلے میں گئی تھی۔ مجھے اجازت بھی مل گئی اور میگزین کا ایک کچا خاکہ بھی۔ ان کی شخصیت کی ہمہ گیر قابلیت اور صلاحیت ہم سب سے پوشیدہ نہیں۔ کئی محکموں کی نظامت کر کے محترم نے ہمہ گیر صلاحیت کا ثبوت دیا ہے لیکن ہر جگہ علمی ذوق وادب کے بھی پرستار رہے۔ آپ ایک فطری شاعر ہیں۔ چاندنی رات ہو یا صبح کوئی آپ کو بہار کی پہاڑیوں اور قدرتی مناظر سے لطف اندوز ہوتے دیکھ کر فوراً یہ اندازہ کر لیتا ہے کہ حسنِ فطرت کے آپ کتنے پرستار ہیں۔ کئی نظمیں اس کی گواہ ہیں

نثر اور شعر میں ڈراموں نے آپ کو دنیائے ادب میں ممتاز و بلند کر دیا ہے۔ مجرد زندگی نے ادبی کام کے لئے کافی وقت دے رکھا ہے۔ طبیعت کی تندی، غلط چیزوں سے انحراف و خاموشی لیکن موقع محل سے۔ ان پر بے باکانہ اظہار جو ایک خاص سلیقہ و نفاست سے کیا جاتا ہے، انسانی محبت کے تقاضے کو ظاہر کرتا ہے۔

آپ ان سے ملئے! ایسے معلوم ہوتا ہے کہ ایک "انسان" سے مل رہے ہیں۔ بات کہنے کا سلیقہ اتنا پاکیزہ اور صحیح زاویۂ نظر لئے ہوتا ہے کہ آپ کھنچتے رہ جائیں گے۔ نظریات میں رواداری اور علمی نوک جھونک ملے گی۔ میں آپ کو محترم غلام یزدانی صاحب کے الفاظ پیش کرتی ہوں یہی میرے لئے کافی ہے:۔

"فضل الرحمٰن صاحب جتنے متین، سنجیدہ ہیں اتنی ہی ان کی طبیعت شوخی اور مزاح پر مائل ہے لیکن ذوق پاکیزہ ہے۔ ان کی شکل و صورت بھی اچھی ہے، کھلتا ہوا رنگ، کھڑا نقشہ، بڑی بڑی آنکھیں، متوسط قامت، چھریرا بدن، بات کرتے ہیں تو شرافت ٹپکتی ہے۔ ظاہر و باطن یکساں ہے۔ کوئی طمطراق نہیں۔ پھر بھی اپنے وقار کا بڑا خیال رکھتے ہیں۔ انہی صفات نے حیدرآباد کے نوجوان طبقہ میں ان کو بہت محبوب بنا دیا ہے۔ حیدرآباد کے اسٹیج کی بنیاد اور رونق انہی کی سعی کا نتیجہ ہے۔

حکومت کو بھی ان کی قابلیت کو ماننا پڑا۔ حیدرآباد لاسلکی محکمہ کے ضمن میں ولایت بھیجے گئے اور پھر ناظم تعلیمات رہ چکے ہیں۔

فضل الرحمٰن صاحب کا مطالعہ وسیع ہے اور حقائق اور قدرت کے کرشموں پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ یہ رجحان ان کی اکثر نظموں میں نمایاں ہے۔ ان کا ذوق نہایت نفیس اور وہ اعلیٰ پایہ کے نقاد بھی ہیں۔ ان ہی صفات کی بنا پر ان کو دکن کی اردو شاعری کا میتھیو آرنلڈ سمجھتا ہوں۔ ان کا کلام ایک استادانہ حیثیت رکھتا ہے۔"

(ماخوذ ایوان حیدرآباد نمبر)

رائے جانکی پرشاد

ایک یونانی فلاسفر کے لئے مشہور ہے کہ دن کے اُجالے میں ہاتھ میں چراغ لئے گلیوں میں گھس جاتا تھا۔ لوگوں نے اس دیوانگی کا سبب پوچھا تو کہنے لگا: "انسان کو تلاش کرتا ہوں" کیا تعجب ہے انسانوں کی اس بھری دنیا میں اسے ایک انسان نہیں مل سکتا تھا۔ یہ بالکل سچ ہے۔ حقیقی معنوں میں انسان ملنا بہت مشکل ہے لیکن یہ دنیا انسانوں سے خالی بھی نہیں۔ انسان مل سکیں گے۔ لیکن ان کی تعداد انگلیوں پر ہوگی۔

رائے جانکی پرشاد اوپر کے نظریہ سے انسان ہیں۔ ان کی خاموش انسانی خدمتیں بہت سی ایسی ہیں جو منظر عام پر نہ آسکیں۔ اس کی وجہ بھی یہ ہے کہ اس کے اظہار سے انسانی خدمت کا جذبہ متاثر ہوتا تھا۔ رواداری اور خدمت انسانی نے انہیں ایک بڑا انسان بنا دیا ہے۔ مشرقی تہذیب و تمدن، بلند اخلاق، پرانی حسین روایات کے دلدادہ ہونے کے ساتھ ساتھ ایثار کے صحیح معنی بھی جانتے ہیں۔ ایسے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مسلک یہ ہے کہ اس دنیا میں کسی کا دل نہ توڑیں۔ یہ بہت بڑی بات ہے، بہت ہی بڑی ــــ جیسے "انسان" کے رازِ تخلیق کی بات ــــ ان کے انسانی پہلو کو بیان کرنے کے لئے اتنا ہی کافی ہے۔

عالم، صحافت پر عبور رکھنے والے، اردو زبان کے شیدائی، انگریزی کا بلند مطالعہ کرنے والے، خاموش خدمت گار، کام کے قدر دان اور انسان شناس۔

ــــ اس بڑے انسان پر اتنا لکھنا کافی ہے۔

جہاں بانو

محترمہ "بانو" حیدرآباد کے تمام علمی حلقوں میں "بانو آپا" کے نام سے مشہور ہیں۔ ان کی شخصیت میں بلا کی جاذبیت ہے۔ ایک مرتبہ ملنے کے بعد دوبارہ کی خواہش باقی رہتی ہے۔ بات سوچ کر اور تول کر کرتی ہیں۔ آواز دھیمی مگر سُریلی، جملے مختصر مگر دل میں کھب جانے والے۔ موزوں اور برمحل شعر گفتگو میں جان ڈال دیتے ہیں۔ باتوں باتوں میں بہت سی باتیں سکھا جاتی ہیں۔ بے محل اور بے ڈھب چیزوں پر طنز ضرور کرتی ہیں۔ اچھائی اور بُرائی میں ایک قدم کا ہی تو فاصلہ ہے۔ ایک قدم آگے بڑھاؤ یا پیچھے ہٹاؤ، اچھائی بُرائی یا بُرائی اچھائی بن جاتی ہے۔ ان کے دل میں انسانیت کا دُو جا ہوا ہے، جیسے ایک آبلہ جسے ٹھیس کی بھی ضرورت نہیں۔ صرف بادِ مخالف کا ایک سرسری جھونکا اس میں ٹیس پیدا کرنے کے لئے کافی ہے۔ اس لئے کسی کو دُکھی دیکھ نہیں سکتیں۔ خود ان کا کہنا ہے:

"دل ٹوٹ کر ہی تو انمول ہو جاتا ہے۔ ٹوٹا ہوا دل ہی ہستی کے لئے سامانِ زینت ہے۔"

سب سے بڑھ کر ان کو بدمذاقی سے نفرت ہے:

"جن کو مذاق کا سلیقہ نہیں ان کو مذاق نہیں بدمذاقی کرتے دیکھ کر مجھے اپنی زندگی خود ایک مذاق محسوس ہونے لگی —— مذاق کرنا ایک زبردست فن ہے۔ مذاق کا عموماً کوئی سطحی مطلب نہیں ہوتا، صرف ہنسنا ہنسانا مذاق نہیں، یہ تو ایک سطحی عکس ہے۔ اس کی گہرائیوں میں چیخیں اور آنسوؤں کے سیلاب ہوتے ہیں۔"

سچ تو یہ ہے کہ عوام ان کی انفرادیت اور شخصیت کو سمجھ نہیں سکتے۔ اسی لئے کسی نے ان کی شخصیت کو خشک اور رجعت پسند کہا۔ کسی نے طعن و طنز کا ہدف بنا دیا۔ لیکن وہ ایسی انسان ہیں جو انسانیت کے صحیح مفہوم سے آشنا ہیں۔ ان کو لیکچرار کا نام دیں یا ادیب و افسانہ نگار کا، سب سے بڑھ کر انہیں "خاتونِ مشرق" سجتا ہے۔ سینکڑوں میں ایک ہیں جو اپنا وزن اور انفرادیت رکھتی ہیں۔

محترمہ کئی تصانیف کی مالک ہیں۔ محمد حسین آزاد، رفتارِ خیال، بربطِ ناہید، فنراک وغیرہ۔ ایک عرصہ تک اردو انجمن کی صدارت اور کئی رسالوں کی ادارت کر چکی ہیں —— خوش پوش، نفاست پسند، ذوقِ سلیم کی مالک۔

ان کے اکثر مضامین ہلکے پھلکے سے ہوتے ہیں، جیسے بہت ساری غیر متناسب چیزیں ان کے سامنے آ گئی ہیں۔ کس کو سلجھاؤں اور کیسے سلجھاؤں کا سوال پیشِ نظر رہتا ہے۔ لیکن ان کی اس برگشتہ روی میں بھی دیکھنے والی آنکھ کے لئے "بہت کچھ" مل جاتا ہے جو "سب کچھ" کے برابر ہے۔

سکندر علی وجد

وجد کی شاعری وجدان کی دنیا ہے۔ فن پختہ اور اس پر ناز بھی۔ اپنے آپ پر اعتماد اور فن سے واقفیت نے انہیں بہت قیمتی بنا دیا ہے۔ ان کے اشعار میں عظمتِ رفتہ کی یاد بہت گہری ہے۔ ان کو اپنے آبا و اجداد کے کارناموں پر ناز و تفاخر ہے۔ لیکن اپنے آپ پر بھی کچھ کم نہیں۔ درد و تڑپ کے ساتھ گرجدار آواز، طرزِ کلام میں موسیقی جو محفل کو سکتہ کی حالت میں تبدیل کر دیتی ہے، اس بات کی گواہ ہے کہ شاعر نے کیسا درد بھرا دل پایا ہے۔

دُبلی پتلی شخصیت، گورا رنگ، چھریرا بدن، آنکھیں نغمہ و شعر سے متلاطم اور اس پر جامہ زیبی ان کی شخصیت کے ظاہری رعب داب ہیں۔ لیکن اگر ان کو اصلی روپ میں دیکھنا ہو تو اس وقت دیکھئے جب وہ شعر پڑھتے ہیں۔ یوں کہئے ہمہ تن شعر بن جاتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ شعر نغمہ ہے اور نغمہ شعر —— جس کا نتیجہ تاثیر ہے۔ کئی بار میں نے شعر پڑھتے سُنا اور ہر بار "ایک اور" کی تمنا رہ گئی۔

بلند اخلاق، دوستوں کے اچھے رفیق، سوسائٹی کے نمایاں نمائندہ، دل سوز شاعر، حیدرآباد کی علمی فضا میں ان کا خاص اور بلند مقام ہے۔

اس لئے آج بھی دل چاہتا ہے کہ ان کی کوئی تازہ غزل یا نظم ان ہی کی آواز میں سنوں اور جھوم جاؤں۔

نصیرالدین ہاشمی[1]

"دکن میں اردو" کے یہ مصنف اپنی شہرت کے آپ مالک ہیں۔ جب سے انہوں نے قلم اٹھایا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نہ رکھنے کی قسم کھائی ہے مشغق ہوں اب بھی روزانہ بلاناغہ کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے ہیں۔ ان کی طبیعت میں ایک خاص بات یہ ہے کہ وہ عملی انسان ہیں۔ خیالی ڈول میں بہت کم بعد رکھتے ہیں۔ اِدھر کسی چیز کا خیال آیا اُدھر کام شروع ہوگیا۔ یہی وجہ ہے کہ اب تک چوبیس پچیس کتابوں کے مصنف ہوگئے اور تقریباً اتنی ہی کتابیں لکھی دھری ہیں جن کی طبع و اشاعت کا سامان اب تک نہ ہو سکا۔ تھوڑے دنوں کی بات ہے "لائبریری خواتین دکن" کی ایک مشاورتی محفل میں انہوں نے اپنی تصانیف کو ایک تخت پر سجایا تھا۔ تخت اس سرے سے اس سرے تک بھر چکا تھا۔ خدا نظرِ بد سے بچائے۔

محترم محقق زیادہ ہیں ادیب کم۔ ذخیرہ اندوزی کا ذوق ہے اور اسے خاص ڈھب سے عوام کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ ذاتی رائے اور تبصروں کے لئے انہیں وقت کم ملتا ہے۔ ایک کام ختم نہ ہوا کہ ابھی ان کی "اُدر" کی فطری خواہش نے نیا سامان فراہم کر دیا۔ زود فہم، زود نویس اور زود رس ہیں۔ میرے خیال میں یہی وجہ ہے کہ محترم نے اپنی ابتدائی زندگی ہی سے قلم اٹھا لیا ہے۔ اُردو سے اور خصوصاً "دکنی" سے خاص عشق ہے۔ ان کی تمام تصانیف اسی محبت کا ثمرہ ہیں۔

یہ دُبلے پتلے انسان دیکھنے میں ناتوان مگر ارادہ کے پکے ہیں۔ ان کا مسلک کام ہے اور بس۔ ان کے گھر میں علم و ادب کا کافی ذخیرہ ہے لیکن وہ اس کے قائل نہیں کہ کتابوں سے ایسی محبت کرو کہ انہیں سینے سے لگائے رکھو۔ وہ کتابوں کا استعمال جانتے ہیں۔ ان کو چھانتے ہیں، خود پڑھتے ہیں، دوسروں کو پڑھنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ ان کی دعوت عام ہے۔

حیدرآباد کی تمام ریسرچ خواتین ان کی کتابوں سے فائدہ اٹھاتی ہیں۔ مزا یہ ہے کہ یہ خود ان کی خواہش پر کتابوں کی سربراہی کا انتظام اپنے سر لیتے ہیں اور جو کچھ نقصان ہو خود برداشت کر لیتے ہیں۔ خواتین ان کی اس کمزوری یا فیاضی سے بے حد فائدہ اٹھاتی ہیں۔ کوئی تحقیقی کام سر پہ آن پڑا اور محترم کو ایک پوسٹ کارڈ سے اس کی اطلاع کر دی۔ پھر کیا، بیسیوں کتاب حاضر، حوالے موجود ——— اس لئے خواتین ان کی دل سے مشکور ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اتنی سب ذمہ داریوں کو وہ کیسے سہارتے ہیں اور ان کا نحیف و نزار جسم تھکن بھی محسوس نہیں کرتا اس لئے کہ یہ سب کام بڑی خوش اخلاقی سے سرانجام دیتے ہیں۔

آج کل ایک خاص تاریخ لکھنے میں مصروف ہیں۔ اس سے پہلے کتب خانہ آصفیہ کی قلمی کتابوں کی تفصیلی فہرست کا صبر آزما کام اپنے مخلق انداز میں ختم کر دیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ کتب خانہ سالار جنگ کی قلمی کتابوں کی فہرست بھی ترتیب دے رہے ہیں۔ بہ حیثیت انسان خوش اخلاق، صاف گو، سادہ دل، محنتی، بے لوث خادمِ قوم ہیں۔ میرے خیال میں بہ حیثیت مؤرخ و محقق آپ نے ہند و پاکستان میں اپنا نام دائمی جانب لکھوایا ہے۔ اس لئے اب مزید تفصیل خود بخود ختم ہو جاتی ہے۔ ہر فن اور ہر مذاق کے لوگ آپ کے دوست ہیں۔

زینت ساجدہ

زینت ساجدہ نے ایک ناتوان جسم اور قوی دماغ سے دنیائے علم و ادب میں قدم رکھا۔ جب وہ ہائی اسکول میں پڑھتی تھیں جب ہی سے ان کی انفرادیت نمایاں تھی۔ محنتی کم ذہین زیادہ ——— خاموش رہنے والی لیکن بہت سوچنے والی ——— وسیع زاویۂ نظر اور گہرا مشاہدہ ——— اپنی اس سوچ اور گہرائی میں ایک خاص رچاؤ رکھتی ہیں۔ اپنی کمزوریٔ صحت کے باوجود اکثر جماعت میں اوّل رہا کرتی تھیں۔

---

[1] راقمہ کو ہاشمی صاحب کے خاندان سے کوئی رشتہ داری نہیں ہے اگرچہ میرے نام کے ساتھ بھی ہاشمی کی نسبت ہے لیکن بالکل جداگانہ خاندان ہے۔

ان کی ادبی زندگی کالج میں چمکی۔ وادا کی تربیت نے ان کی خوبیوں کو ابھار کر دیا۔ آنکھیں کھلیں اور وہ آگے بڑھتی گئیں۔ آگے اور بہت آگے ——
آج ترقی پسندوں کی صف میں خاص درجہ رکھتی ہیں۔

زندگی کے تقاضوں کو بہت سُلجھی ہوئی نظر سے دیکھتی ہیں۔ ماں باپ کے گھر کی زینت اور اپنے شاگردوں میں بہت مقبول ہیں۔ دیکھنے سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ اپنی ذات سے بے خبر صرف آگے بڑھنے پر نگاہ ہے۔ نہ زیادہ آرائش و زیبائش کا خیال نہ اپنی صحت کا فکر، لیکن کچھ دنوں سے اس خیال میں تبدیلی پائی جاتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب وہ اپنی خبر گیری کرنے لگی ہیں اور اپنی ذات سے انہیں کچھ محبت ہو چلی ہے، ان کی شخصیت کا پورا مدار ان کے رکھ رکھاؤ اور علمی وسعت نظر میں ہے۔ بات بہت پُرکشش کرتی ہیں۔ موقع و محل کو جان کر جس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ حیدرآباد کی علمی فضا میں جانی پہچانی ہستی ہی نہیں مقبول ہستی ہیں۔

کامیاب افسانہ نگار، سیدھا سادا طرز، دلچسپ اور صحیح زاویۂ نگاہ اسی لئے ان کی پہلی کتاب "جلترنگ" اب تک بہت سی خوش آئند امیدوں کی آماجگاہ بنی ہوئی ہے لیکن اب وہ جلترنگ والی دنیا سے بہت آگے بڑھ چکی ہیں۔ ان میں ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ دوسروں سے کم متاثر ہوتی ہیں لیکن دوسروں کو بہت جلد متاثر کر دیتی ہیں۔

ہندی اُردو کی محبت نے انہیں دونوں جگہ خاص امتیاز دے رکھا ہے۔ خوش مزاج اور سادگی پسند ہیں۔ طبیعت میں انکسار ہے لیکن خودی کی قوت اس پر غالب ہے۔

سید محمد صاحب

سید محمد صاحب بڑے خاموش آدمی ہیں۔ ان کا شعار علمی خدمت اور کتابوں سے محبت ہے۔ ہم سید صاحب کو بہت نزدیک سے بھی دیکھتی ہوں یونیورسٹی سے کبھی فرصت ملی کہ بازار جا کر اچھی اچھی کتابیں خرید لائے۔ حیدرآباد میں شاید ہی اتنی زبردست "خانہ لائبریری" ملے گی جتنی سید صاحب کے پاس ہے۔ پھر حُسنِ سلیقہ و صفائی کا یہ عالم کہ لائبریری میں خاموش و پاکیزہ علمی لہر مل جائے گی۔ کتابوں سے آپ کو بہت محبت ہے۔ بڑی احتیاط اور دلدہی سے ان کی حفاظت کرتے ہیں۔

علم دوستی نے انسان دوستی کا جذبہ بڑی شدت سے پیدا کر دیا ہے۔ جب جہاں، جس وقت کسی کو مدد کی ضرورت ہوتی ہے خاموشی اور فیاضی سے اس کا ہاتھ بٹاتے ہیں۔

رہنمائی کا طریقہ بھی اچھا ہے۔ ان سے ملاقات ہو تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی گھر کے سردار سے مل رہے ہیں۔ جو تمہارا دکھ شکھ ایسے ہی سنے گا جیسے بڑا بھائی سُن رہا ہے۔ پھر اس کی مدد پر تھوڑی دیر غور کریں گے۔ دامے، درمے، قدمے، قلمے کبھی کوتاہی نہ کریں گے —— یہ تو رہا ان کا جذبۂ خدمتِ انسانی۔ اس کے علاوہ محترم کی سب سے بڑی خوبی ان کی انتظامی صلاحیت ہے۔ وہ کافی حد تک ایک کامیاب منتظم ہیں۔ سلیقہ صفائی، تنظیم و ترتیب کی صلاحیتیں ان کے گھر کے قرینہ میں بھی ملتی ہیں۔ یونیورسٹی میں اردو کے ریڈر ہیں۔ بہت زمانہ سے اُردو کی خاموش خدمت کرتے آئے ہیں۔

مرزا عصمت اللہ بیگ (مرحوم)

میرا مضمون ادھر ختم ہوا اور ادھر معلوم ہوا کہ مرحوم اس چلتی پھرتی دنیا سے رخصت ہو گئے۔ آہ کیا ہستی تھی۔ ان کے بات کرنے کا انداز، شعر پڑھنے کا طریقہ، نثر لکھنے کا سلیقہ —— کوئی سنجیدہ علمی محفل ان کے بغیر سُونی ہو جاتی تھی۔ وہ ہر مجلس کے روحِ رواں تھے۔
علمی ادبی محفلیں عوام کو زیادہ دیر تک دماغی کاوشوں میں پھنسائے رکھنے میں اکثر ناکام رہتی ہیں۔ سنجیدہ سے سنجیدہ صاحب ذکر بھی اس الجھن سے گھبرا جاتے ہیں اور کسی طرح فرار کی کوشش کرتے ہیں۔ یہاں مجلس پر یہ حالت طاری ہوئی اور صدرِ مجلس نے مرزا صاحب کو کھڑا کر دیا۔ [illegible]

گیا۔ ایک خوشی کی لہر دوڑ گئی اور ہر شخص ہنستا ہنساتا پایا گیا۔ وہ گرماگرمی اور مرحوم کی وہ خاص لَے اب تک میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔

مرحوم ظریف ادب کے سرو بیان تھے۔ آج حیدرآباد میں ان کا کوئی بدل نہ مل سکے گا۔ میں نے ان کو قریب سے بھی دیکھا اور دور سے بھی ہر وقت میں یہی سوچتی رہی کہ یہ قدرت کا کتنا زبردست شاہکار ہیں۔

اُردو دانی کا ذوق، سلیقہ سے انگریزی الفاظ کی کھپت، بات میں بات پیدا کرنے کا انداز، پاکیزہ اور دھیمی ظرافت جس کا اثر عوام اور خواص دونوں پر ہوتا تھا۔ مرزا صاحب کو مصوّری و نقاشی سے بھی خاص لگاؤ تھا میں یہاں ان کی شخصیت کی ایک عام جھلک دکھانے کی کوشش کروں گی۔ اگر ان کے علمی و ادبی کارناموں کا جائزہ لوں تو ایک کتاب بن جائے۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اکبر کا ایک جانشین غلط چیزوں کی خبر لے رہا ہے لیکن اکبر کی طرح کھلم کھلا وقت سے انحراف کرنے کے عادی نہیں تھے۔ بلکہ حُسنِ طلب کا رنگ ہی اور تھا۔ وہ وقت کے تقاضوں کا ساتھ پوری قوت سے دیتے تھے اور اپنی ظرافت کے باریک تاروں سے بڑی بڑی گتھیوں کی گرہ کھول کے رکھ دیتے تھے۔ ان کی کوئی نظم پانسر اٹھائیے۔ اس میں وہ حال سے باخبر ماحول سے بے چین اور صداقت کی تلاش میں ملیں گے۔

ان کو ایک نظر دیکھنے ہی سے محسوس ہوتا تھا کہ اس شخص میں کوئی خاص بات ہے۔ الفاظ اس کے اظہار کی قوت نہیں رکھتے۔ کوئی نرالی اور انوکھی بات جو عام انسانوں میں نہیں ملتی۔ گویا وہ اس دنیا کو ایک خاص زاویۂ نظر سے دیکھ رہے ہیں۔ یا یوں کہہ رہے ہیں:

ع بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے

ان کی متلاشی آنکھیں دیکھنے والے کو حیرت میں ڈال دیتی تھیں۔ ہنستے کم تھے، ہنساتے زیادہ تھے۔ آخر دنوں میں ایک میگزین "تماشا" کے نام سے جاری کیا تھا۔ خود ادارت کرتے تھے۔ تماشے کے تمام صفحات اندازِ تمسخر میں سچی باتوں سے بھرے ملتے ہیں۔ ہم نے ایک بڑے ادیب اور خاموش فنکار کو کھو دیا۔ ان کی موت بھی ایسے ہوئی جیسے وہ ہماری محفل سے اٹھ کر پردہ کے پیچھے چلے گئے اور ہم ان کی راہ تکتے تکتے اپنا ہی منہ تکنے لگے ہیں۔ خدا مرحوم کو جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ آمین!

بشیر النساء بیگم بشیر

آپ دکن کی وہ واحد شاعرہ ہیں جن پر طبقۂ اناث کو ناز و فخر ہے۔ جب ان کے اشعار انہی سے سُنتی تھی تو سر دُھنتی رہ جاتی تھی۔ شعر اپنے فطری پاکیزہ جیسے سانچے میں ڈھل رہے ہیں۔ جذب و تاثیر میں ڈوبے ہوئے۔ الفاظ پر پوری قدرت کی شان لئے ہوئے۔ لہجہ میں انفرادیت اور بانکپن تخیل اونچا اور منجھا ہوا۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ شاعرہ ہی نہیں پیدا ہوئی ہیں۔

یوں عام طور پر محترمہ شاعرہ معلوم نہیں ہوتیں۔ سچ مچ سے ایسا لگتا ہے کہ ایک مکمل کامیاب گھریلو خاتون ہیں۔ اجنبی انہیں شاعرہ نہ کہے گا۔ لیکن کسی محفل میں انہوں نے اپنے اشعار پیش کئے اور سب کی نگاہیں محوِ حیرت طور پر محترمہ کی طرف جھک گئیں اور محترمہ نے ازراہِ انکسار سر جھکا لیا۔ ان کی شاعری میں جگہ جگہ سچائی ملے گی، آرزو بھرا دل ملے گا، سکون کی تلاش ملے گی، جذب و اثر کا یہ عالم رہے گا کہ بات دل سے نکل کر دلوں میں سما جائے گی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی گوشے سے دُکھ درد کی آواز آئی اور محترمہ نے اسے شعر میں سمو لیا۔ انسانیت کے خادم کی سب سے بڑی نشانی یہ ہے کہ وہ دُکھ درد سے دور نہیں رہتا بلکہ اس میں ڈوب کر ابھرتا ہے وہی کامیاب شاعر ہے جو سراپا دکھی ہے۔ زمانہ کے نشیب و فراز پر ایک خاص نظر اور اتار چڑھاؤ کے مرحلوں نے انہیں ایک کہنہ مشق شاعرہ بنا دیا ہے۔ ان کا فن پختہ ہے جس کا اعتراف بھی کرتی ہیں ؎

تجھ پہ کیا خاک اے زمیں ہوتا
ہم نہ ہوتے تو کچھ نہیں ہوتا

خدا کا شکر ہے کہ یہ "کچھ" ہماری سرزمین کو پھر آب و تاب سے منور کر رہا ہے۔ اقبالؔ سے بے حد متاثر ہیں۔ پہلے مرحوم شاگردوں میں [illegible]

اشعار سناتی تھیں اور محفل تڑپ جاتی تھی۔ اب اپنے اشعار دوسروں سے پڑھواتی ہیں۔ وہ گرمی و جوش تو نہیں ملتا لیکن کلام کی تاثیر اور تغزل کا وادلے کے رہتا ہے۔ ان کے کلام میں اکثر جگہ اقبال کے خیالات سے ٹکراؤ ہے۔ نظام کائنات حرکت پسند ہے۔ اقبال کے فلسفہ کی جھلک تحریر کے پاس زیادہ نہ ہو تو کیا، اس کا جذب و تاثر تو قریب آجاتا ہے۔

رفیعہ سلطانہ

رفیعہ سلطانہ سے گفتگو کیجئے ——— دھیما انداز اور شیریں بیانی آپ کو ان کے قریب کر دے گی۔ گویا موسیقی کی جھلک مل رہی ہے۔ لکچرر بیٹے کھڑی ہیں تو مجمع کر اس قوت سے متاثر نہ کر سکیں گی۔ علمیت بہت رکھتی ہیں۔ اس کے اظہار میں اکثر ناکام رہ جاتی ہیں۔ مطالعہ وسیع ہے۔ زاویۂ نظر بھی تلاش ہے۔ اپنی بات منوانے اور اپنے نظریات عام کرنے کی متمنی رہتی ہیں۔ لیکن خیالات گھٹک اس لئے نظر آتے ہیں کہ وقت واحد کا بہت سی باتیں کہہ دینا چاہتی ہیں۔ "کچے دھاگے" اس کی تفسیر ہیں۔ ان کے مضامین مغربی خیالات سے متاثر رہتے ہیں۔ یہ ایک اچھی نشانی ہے لیکن گھر سے زیادہ گھر پر وارد ہونے والے اثرات دیرپا زندگی نہیں پاتے۔ اطراف واکناف کے وہ مسائل جو اپنے اندر درد بھری آواز رکھتے ہیں ان پر اگر یہ سوچنے لگیں تو بہت کار آمد چیزیں ان کے ہاتھ سے نکلنے لگیں۔

سلطانہ نے طبیعت بڑی با اخلاق پائی ہے۔ دشمن کی بھی تعریف ایسی کریں گی جیسے قریب کے دوست کی کر رہی ہیں۔ قناعت پسندی اور بے نیازی نے انہیں اتنا آگے نہیں بڑھایا جتنا وہ بڑھ سکتی تھیں۔ بڑی مہمان نواز، اچھی دوست ——— نقصان پہنچانے کا جذبہ ان میں نہ ملے گا ——— سوسائٹی سے واقف ——— فیشن کی دلدادہ ——— لہجہ اورنگ آبادی جس میں مقامی رنگ اور علمیت کی جھلک ملتی ہے ——— زمانہ سے بھی ایک حد تک بے نیازی برتتی ہیں۔ ایک خاص شخصیت کی مالک ہیں۔ اپنی مثال آپ ہیں ——— حریف کی تیغ مقابل نہ ہو سکیں گی ——— خاموش اپنے راستہ پر چلتی رہیں گی۔

رشید قریشی

اپنے پاؤں آپ بڑھنے والا یہ افسانہ نگار وادیب دنیا کو کھلی آنکھوں سے دیکھتا اور گہری سوچ سے پرکھتا ہے۔ بلند ارادہ اور عزم مستقل نے انہیں ایک کامیاب ادیب بنایا۔ خود ان کا کہنا ہے "آج نہیں کل ——— کل نہیں پرسوں"۔ لیکن ہمت ہارنے والی آسامی نہیں۔ یہ ان کے مضبوط کردار کی نشانی ہے۔ کمال یہ ہے کہ انتہائے رنج وغم کے تاثرات میں ڈوبے ہوئے دل ودماغ کو بھی اپنے قابو میں رکھتے ہیں۔ اور اس عالم میں بھی ایسے زبردست مزاحیہ یا طربیہ لکھ سکتے ہیں۔ "عورتوں کی عدالت" اسی المی اثر میں رکھا ہوا زبردست مزاحیہ ہے۔ یا کسی خوشی ومسرت کے موڈ میں انہوں نے سوچا اور ایک زبردست المیہ لکھ ڈالا۔ یہ ان کی انفرادیت ہے۔ ادیب وشاعر موڈ (MOOD) کے نقش قدم پر چلتا ہے۔ ایسا کم ہوتا ہے کہ ادیب نے موڈ کا دھارا خود بدل دیا ہو۔ یہ ان کے فن کی قوت کی نشانی ہے۔ انہیں اپنے کمال کا احساس ہے ——— دماغی صلاحیتوں پر ناز ہے لیکن اوروں کی آنکھ سے دیکھنے کی بجائے اپنی آنکھ پر بھروسہ کرتے ہیں۔ یہ جذبات کو پوری صداقتوں اور کرداروں کو ان کے اصلی خدوخال میں پیش کرتے ہیں۔

ماحول سے باخبر اور ہم جنسوں کے حال سے متاثر رہتے ہیں۔ زمانہ کے اشاروں اور زندگی کے تقاضوں سے بڑی دوستی ہے۔ "ایجنتا کی آوازیں" کے عنوان سے گوتم بدھ کی روحانی زندگی کا تجزیہ پانچ ڈراموں میں کیا ہے جس پر انہیں فخر ہے۔ کامیاب اور مشہور افسانہ نگار ——— فن افسانہ پر بھی ان کو نگاہیں جم چکی ہیں۔ ان کے فیچرس بھی بہت مقبول اور کامیاب ثابت ہوئے جو کہ وہ نشرگاہ کے لئے لکھتے تھے۔

تمّ الجزء الثاني

سرسید احمد خان
ڈپٹی نذیر احمد
ریاض خیرآبادی
پریم چند
سر عبدالقادر
ڈاکٹر تاثیر
میراجی

ظفر علی خان
نیاز فتحپوری
پطرس

جوش ملیح آبادی
عبدالمجید سالک
چراغ حسن حسرت
غلام رسول مہر

وقار عظیم
ابواللیث صدیقی
عبادت بریلوی
غلام عباس
حجاب امتیاز علی
ہاجرہ مسرور
شوکت تھانوی

سرسیّد احمد خاں

عنایت اللہ دہلوی

محترم شیخ محمد اسماعیل پانی پتی کی بدولت ہمیں دو بڑے ہی نادر اور غیر مطبوعہ مضامین ملے۔ جن میں ایک حالی پر خواجہ غلام الحسنین کا مضمون ہے (جو نقوش کے ابتدائی صفحات کی زینت ہے) خواجہ غلام الحسنین، خواجہ غلام الثقلین ایڈیٹر عصر جدید کے برادرِ بزرگ اور مولانا حالی کے نواسے تھے۔

دوسرا سرسید کے بارے میں مولوی عنایت اللہ دہلوی (مرحوم) کا یہ مختصر سا مضمون ہے۔ جس میں سرسید کی طرزِ معاشرت اور گھریلو زندگی پر روشنی پڑتی ہے۔

ہمیں سرسید پر ایک بڑا اہم اور طویل مضمون شیخ صاحب نے لکھ کر مرحمت فرمایا ہے۔ جس میں مولوی عنایت اللہ دہلوی کی مندرجہ ذیل تحریر، سرسید کا ایک غیر مطبوعہ فارسی خط، اور سرسید کے فرسٹ اسسٹنٹ سید وحید الدین سلیم کی زبانی کچھ اہم کلمات درج ہیں۔

ہمیں افسوس ہے۔ کہ پرچے کی بڑھتی ہوئی ضخامت کے خوف سے اس قیمتی مضمون کو آئندہ شمارہ میں لے جا رہے ہیں اور اب اُس مضمون میں سے صرف مولوی عنایت اللہ دہلوی کی ایک تحریر یہاں پیش کر رہے ہیں۔ جو انھوں نے شیخ صاحب کو اپنے حالاتِ زندگی کے ضمن میں لکھ کر بھیجی تھی — آئندہ شمارہ میں پورا مضمون پیش کریں گے۔

(محمد طفیل)

"غالباً جولائی ۱۸۷۶ء کا زمانہ تھا کہ میرے والد مرحوم (مولانا ذکاء اللہ) جو اُس وقت میور کالج الہ آباد میں پروفیسر تھے۔ گرمیوں کی تعطیل دہلی میں ختم کر کے الہ آباد واپس جانے لگے۔ اِس مرتبہ اُنھوں نے مجھے اور میرے بڑے بھائی کو جو مجھ سے تین برس بڑے تھے اپنے ہمراہ لے جانا چاہا تاکہ الہ آباد میں ہماری تعلیم کا کوئی بہتر بندوبست کریں۔ راستہ میں سید صاحب (سرسید مرحوم) کے پاس علی گڑھ میں قیام کرنے کا قصد کیا۔ میری عمر اُس وقت آٹھ برس کچھ مہینے کی تھی اور یہ پہلا موقع تھا کہ مجھے اپنی والدہ سے جدا ہونے کا اتفاق ہوا۔ چلنے کا وقت آیا تو اُنھوں نے ہم دونوں بھائیوں کو گلے لگایا۔ پیار کیا اور کوئی دعا پڑھ کر دم کی۔ مجھے بے اختیار رونا آیا مگر میں نے ضبط کیا۔

اس سے پہلے میں کبھی ریل پر سوار نہ ہُوا تھا۔ سٹیشن پہنچ کر گاڑی میں بیٹھا۔ بیٹھا کیا، کبھی دوڑ کر اس کھڑکی سے منہ لگا کر جھانکتا تھا کبھی اُس کھڑکی سے۔ اور سب سے زیادہ بے قراری اس بات کی تھی کہ دیکھئے ریل کب چلتی ہے؟ اور کیونکر چلتی ہے؟ آخر کار یہ وقت بھی آگیا۔ ریل کھسکی سٹیشن کی جتنی عمارتیں تھیں ایک ایک کرکے پیچھے رہتی گئیں۔ ٹرین کبھی سیدھی، کبھی سانپ کی طرح لہراتی جمنا کا پُل اُترنے ہی فراٹے بھرنے لگی۔ پہیوں کی تے دار آوازیں اور رفتار کی تیزی کے ساتھ ہوا کے جھونکے دل میں ایک اُمنگ پیدا کرنے لگے۔ اب یہ معلوم ہُوا کہ میدان، کھیت، گاؤں، آدمی، درخت، مویشی کوئی ایسا نہ تھا جو دتی کی طرف نہ بھاگا جاتا ہو۔ میں اپنے وطن سے نکلا اور یہ میرے وطن کی طرف چلے۔ دُور کی چیزیں آہستہ اور پاس کی اشیائے تماشا دوڑتی نظر آئیں۔ جدھر دیکھا آسمان کے کنارے زمین سے ملے ہوئے معلوم ہوتے۔ اُوپر سورج تھا اور چلتے پھرتے بادل۔ نیچے دھوپ تھی اور چھاؤں کے ٹکڑے کبھی یہاں کبھی وہاں۔ انجن کی طرف کبھی کبھی سیاہ گھٹا دُور نظر آتی تھی۔ مگر تھوڑی دیر میں ٹرین دھوپ میں سے نکل کر بادلوں کے سایہ میں آجاتی اور ہر طرف اندھیرا چھا جاتا۔ بادل کی گرج جسے گھر میں سُن کر ڈر لگا کرتا تھا اب یہاں سُنائی بھی دیتی تو بہت ہلکی۔ یہ کیفیت بھی تھوڑی دیر میں بدل جاتی اور ٹرین اندھیرے کو چھوڑ کر روشن مطلع میں آجاتی۔

جب کوئی سٹیشن قریب آنے کو ہوتا تو انجن ٹرین کو پلیٹ فارم پر لانے کے لئے پٹڑی بدلتا اور پھر کونسا لڑکا ایسا ہوگا جس کا منہ کھڑکی سے باہر ہو اور انجن کو اس حال میں دیکھ کر تالیاں نہ بجانے لگے۔ چھوٹے اسٹیشنوں پر ریل کے ٹھہرتے ہی مسافروں کی بھاگ دوڑ، گارڈ کا اپنی گاڑی سے اُتر کر انجن تک بخطِ مستقیم جانا اور پھر ہری جھنڈی دکھا کر ٹرین کو چلتا کرنا۔ اس کے بعد اپنی گاڑی کی طرف آ، چلتی ریل میں دوڑ کر پائے دان پر کھڑا ہو جانا۔ بڑے سٹیشنوں کے قریب بہت سے انجنوں کا نظارہ۔ کوئی کھڑا ہے۔ کوئی چل رہا ہے۔ کوئی صاف نظر آرہا ہے۔ کوئی دھوئیں اور بھاپ میں چھپا ہُوا ہے مگر چیختے چلاتے سب ہیں۔ پھر ٹرین کا ہلکی چال سے دفعتاً بڑی گرج اور لرز سے سٹیشن کی اُونچی اور لمبی چھت کے نیچے داخل ہونا۔ پلیٹ فارم پر لوگوں کا ہجوم۔ قلیوں اور مسافروں کا شور، سودے والوں کی بے تکی بولیاں۔ ہوٹلوں اور چائے خانوں کا چمکتا ہُوا سامان۔ اگرچہ یہ سب معمولی چیزیں تھیں مگر میرے لئے تو آج دنیا کے مشاہدوں کا ایک دفتر کھل گیا تھا۔ جو نئی چیز دیکھنا چاہتا کہ والد بھی اسے دیکھیں کئی دفعہ آنکھوں میں کوئلے کی راکھ بھی پڑی مگر میں دیکھنے سے نہ ہارا۔ غرض اسی حال میں چند گھنٹوں کے سفر کے بعد علی گڑھ آگیا۔ والد یہاں اُترے۔ اتنا یاد ہے کہ کسی نے آکر کہا کہ "سیّد صاحب کی گاڑی آئی ہے"۔ سٹیشن سے نکل کر ہم سب اُس گاڑی میں بیٹھے اور تھوڑی دیر کے بعد ایک احاطہ میں جو مجھے باغ معلوم ہُوا داخل ہوئے۔ ایک بڑے بنگلے کے سامنے برساتی میں آکر گاڑی ٹھہر گئی۔

میں نے اب تک انگریزی وضع کے مکان دُور سے دیکھے تھے۔ کبھی اُن کے اندر نہیں گیا تھا۔ گاڑی سے اُتر کر ہم کئی کمروں سے گزرتے ہوئے ایک بڑے کمرے میں آئے جو مجھے بہت وسیع معلوم ہُوا۔ اس کمرے کے سب سے بڑے دروازے میں خس کی ٹٹی لگی ہوئی تھی اور پنکھا چل رہا تھا۔ مگر کھینچنے والا نظر نہ آتا تھا۔ کمرے میں بہت سی خوبصورت کرسیاں کئی وضع کی رکھی ہوئی تھیں اور خس کی خوشبو کے ساتھ کوئی اور خوشبو بھی وہاں موجود تھی جو بہت اچھی معلوم ہوتی تھی۔ خس کی ٹٹی کے قریب ایک میز پر جس کی پوشش سبز تھی بہت سے کاغذ اور کتابیں اور کچھ چمکتی ہوئی چیزیں نہایت سلیقے اور خوبصورتی سے رکھی ہوئی تھیں۔ میز کے قریب ہی کرسی پر ایک بھاری بھرکم آدمی، سفید سر، سفید داڑھی، سفید لباس، موٹے موٹے پاؤں اور اُن میں سلیپر جو مجھے قالین کے ٹکڑے معلوم ہوتے تھے۔ شیر کا سا کلہ۔ عینک لگی ہوئی۔ برہنہ سر بیٹھے تھے یہی سیّد احمد خاں تھے جنہیں دلّی کے بعض لوگ صرف "علی گڑھ والا" کہنا کافی سمجھتے تھے اور وہ ایک خوف اور پرہیز کی چیز سمجھے جاتے تھے۔ سیّد صاحب والد صاحب کو دیکھ کر السلام علیکم کہتے ہوئے کرسی سے کچھ جھکے جھکے اُٹھے اور یہ کہہ کر کہ "آپ آگئے" والد سے مصافحہ کیا۔ اور ہم دونوں بھائیوں کو دیکھ کر کہا "ارے یہ کون ہیں؟" ہم دونوں قریب گئے اور جھک کر آداب کیا۔ سیّد صاحب نے ہماری صورتیں غور سے دیکھیں۔ پھر خوب ہنسے اور والد سے باتیں کرنے لگے۔ اب میں کبھی سیّد صاحب کی صورت دیکھتا تھا اور کبھی کمرے کے ساز و سامان کو۔ فرشی پنکھے کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا، ہر طرف

صفائی اور سلیقہ۔ نیچے فرش پر زرد حاشیے کے کرنٹ اور نیلی دھاریوں کی دری اور سفید براق سی چھت گیری۔ دیواروں پر ہلکا فیروزی رنگ۔ کہیں کہیں سنہری چوکھٹوں میں تصویریں لٹکی ہوئیں۔ جن میں پہاڑ، سبزہ زار اور چشمے نظر آتے تھے۔ جی چاہتا تھا کہ میں بھی انہی میں کہیں ہوتا۔ آتش دان کا کارنس میرے لئے اس قدر پُر لطف تھا کہ اب بڑی سے بڑی نمائش گاہ بھی لطف نہیں دے سکتی۔ اس کارنس پر بہت سی خوبصورت رنگ برنگ کی چیزیں رکھی ہوئی تھیں اور ان سب کے اُوپر دیوار میں ایک عجیب صورت کا گھنٹا لگا ہوا تھا۔ سید صاحب اور میرے والد جب باتیں کرتے کرتے چپ ہو جاتے تھے تو پنکھے کی ہلکی آواز کے ساتھ اس گھنٹے کی کھٹ کھٹ میرے تصور میں اس کمرے کی بزرگی اور متانت کو دوبالا کر دیتی تھی۔ کارنس پر جو چیزیں آراستہ تھیں اُن میں سب سے زیادہ دلکش سنگِ مرمر کا ایک چھوٹا سا روضہ تھا جو شیشے کی صندوقچی میں رکھا ہوا تھا۔ یہ مجھے منصور کا مقبرہ معلوم ہوا جسے میں دلی میں بار بار دیکھ چکا تھا۔ لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ یہ تاج بی بی کا روضہ ہے۔ میں اس کو ایک کھلونا اور اس لڑکے کو جو اس کا مالک ہو قابلِ رشک سمجھنے لگا۔ مگر یہ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ اتنے اُونچے پر کیوں رکھا ہوا ہے کہ کسی لڑکے کا ہاتھ وہاں تک نہیں پہنچ سکتا۔

سید صاحب اس قدر جسیم و شحیم تھے کہ مجھ کو اپنے والد اُن کے سامنے بہت دُبلے اور مختصر معلوم ہونے لگے۔ در آں حالیکہ اس سے پہلے میں اُن کے برابر کسی کو بڑا آدمی نہ سمجھتا تھا۔

سید صاحب والد سے بھی باتیں کرتے جاتے تھے اور کبھی کبھی ہم دونوں بھائیوں سے بھی کوئی بات پوچھ لیتے تھے۔ میرے بڑے بھائی تو کرسی پر بیٹھ گئے تھے۔ مگر میں کھڑا رہا۔ کیونکہ سخت عدیم الفرصت تھا۔ میں سید صاحب کے پاس کھڑا اُن کے لکھنے کی دوات کو بڑی محویت کے ساتھ دیکھنے میں مصروف تھا۔ اس دوات کا ڈھکنا مجھے بالکل شیر ببر کا سر معلوم ہو رہا تھا۔ بالکل اُسی صورت کا جس کی تصویر میری ریڈر میں بنی ہوئی تھی۔ اُس کی آنکھیں لال لال نگینوں کی طرح خوب چمک رہی تھیں۔ میں اس خوابِ حیرت سے اُس وقت چونکا جب سید صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ "تم کیا پڑھتے ہو؟" میں نے ایک ہی سانس میں جواب دیا "اُردو کی چوتھی ختم کر چکا ہوں۔ فارسی کی دوسری پڑھتا ہوں اور رائل ریڈر شروع کر رکھی ہے۔" اس سیدھے سادے جواب پر سید صاحب اور میرے والد بہت زور سے ہنسے۔ وجہ میری سمجھ میں نہ آئی۔ شاید میرا یہ "علم و فضل" باعثِ مسرت ہوا ہو۔

وہ دونوں پھر باتیں کرنے لگے اور تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد قہقہے بھی لگاتے تھے۔ سید صاحب نے کچھ کاغذات والد کو دیئے جب وہ اُن کو دیکھنے لگے تو سید صاحب لکھنے میں مصروف ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد سید صاحب نے لکھتے لکھتے قلم ہاتھ سے رکھ دیا اور ایک چھوٹے سے بکس کی طرف ہاتھ بڑھا کر ایک عجیب آواز میں کہا "پنکھا روکو" جس پر فرشی پنکھا فوراً رُک گیا۔ سید صاحب نے بکس میں سے ایک چرٹ نکال کر دیا سلائی جلائی اور جب دیا سلائی چرٹ کے قریب ہوئی تو مجھ کو اُن کا چہرہ اور بھی عظیم الشان اور خوفناک معلوم ہونے لگا۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ خس کی خوشبو کے علاوہ جو خوشبو کمرے میں پھیلی ہوئی تھی وہ اسی چرٹ کی تھی۔

اس آواز اور چہرے کا خوف دل پر ایسا بیٹھا کہ میں سید صاحب سے ڈرنے لگا اور یہ اُس خوف کی ابتدا تھی جو ہمیشہ قائم رہا۔ حاضر و غائب کبھی دل سے نہ گیا۔

جس کمرے میں سید صاحب کی نشست تھی اس کے قریب ہی ایک کمرہ والد کے لئے مخصوص کر دیا گیا تھا۔ وہیں ہمارا اسباب رکھا گیا تھا۔ کچھ دیر سید صاحب کے پاس ٹھہر کر جب والد اس کمرے میں آئے تو ہم دونوں بھائی بھی اُن کے ساتھ آئے۔ اس کمرے میں جو غسل خانہ تھا اُس کا چینی کا سامان اتنا صاف ستھرا اور میرے لئے عجیب تھا کہ ہم دونوں کو کسی چیز کو برتنے کی ہمت نہ ہوئی۔ کپڑے بدلنے کے کمرہ میں جو آئینہ دار خوبصورت میز تھی اُس پر کچھ چیزیں شیشے کی بھی رکھی تھیں۔ مگر اُن سب کو مجھ سے سخت دشمنی تھی۔ کیونکہ جہاں میں نے خوش ہو کر کسی چیز کو ہاتھ لگایا۔ اور وہ آپ سے آپ ٹوٹ کر گر پڑتی تھی۔

شام ہوئی تو سید صاحب بنگلے سے باہر آئے۔ کوٹھی کے احاطے میں ایک طرف کو باغ تھا۔ اس کے سرے پر ایک چبوترہ تھا۔ اُس پر بہت سی کرسیاں

رکھی ہوئی تھیں۔ کرسیوں پر بیٹھ کر سیّد صاحب اور میرے والد پھر باتیں کرنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد سیّد صاحب نے مجھے اپنے قریب بلایا اور میرے دونوں ہاتھ پکڑ کر کہا "منہ کھولو" میں نے منہ کھولا تو کہنے لگے "ارے اس لڑکے کے منہ میں سے تو خون نکل رہا ہے توبہ۔ توبہ!" میں دلّی سے چلا تھا تو پان کھایا تھا۔ اس لئے دانت لال ہوگئے تھے۔ میں نے شرمندہ ہو کر جلدی سے منہ بند کر لیا اور سمجھ لیا کہ پان کھانا بری بات ہے۔

جب کچھ رات ہوگئی تو آدمی نے آ کر کہا "کھانا میز پر ہے" اس پر سب لوگ اُٹھے اور کھانے کے کمرہ میں آئے۔ یہاں پھر میری آنکھوں کے لئے عجیب و غریب منظر تھے۔ میز پر نہایت سفید چادر۔ چینی کے برتن۔ شیشے کے گلاس۔ چاندی کے چمچے۔ ہاتھی دانت کے دستہ کی چھریاں میز پر رکھی تھیں۔ میز پر دو بڑے شاندار لیمپ روشن تھے۔ پنکھا چل رہا تھا۔

اس سامان کو دیکھ کر مجھے اپنے گھر کا دسترخوان۔ برتن اور فتیل سوز یاد آیا۔ میری والدہ دسترخوان ہمیشہ اُجلا بچھوایا کرتی تھیں۔ مگر وہ گاڑھے کا ہوتا تھا۔ اس میز پوش کی صفائی اور چمک سے اُسے کیا نسبت تھی۔ برتن تانبے کے قلعی دار ہوتے تھے۔ چینی کے برتن خاص خاص کھانوں کے لئے یا جب کوئی مہمان آئے تو برتے جاتے تھے۔ شیشے کے گلاس صرف گرمیوں میں یا رمضان شریف میں افطاری کے وقت نکالے جاتے تھے۔ مامائیں اُن کو ہاتھ لگاتے ہوئے ڈرتی تھیں۔ چھریاں اور چاندی کے کانٹے تو میں نے کبھی خواب میں بھی نہ دیکھے تھے۔ گھر کا فتیل سوز اگرچہ روز مرّہ منجھوایا جاتا تھا مگر اُس کی صورت شکل اور ٹمٹماتی ہوئی روشنی اِن لیمپوں کی صاف اور تیز روشنی کے سامنے کیا حقیقت رکھتی تھی۔

باتیں کرتے اور قہقہے لگاتے سب لوگ میز کے گرد کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ تین چار سفید پوش ملازم اور ایک بہت بڑی لمبی داڑھی کا دُبلا پتلا شوکھا مگر بجد چست و چالاک اور تیز خانساماں طرح طرح کے کھانے سامنے لاتا تھا۔ اور سب لوگ چمچوں سے حسب ضرورت کھانا اپنی رکابی میں نکال کر کھاتے تھے۔ ہم دونوں بھائیوں کی رکابیوں میں بڈھے خانساماں نے اپنے ہاتھ سے کھانا نکال کر دیا۔ کھانے کے ذائقہ کی نسبت میں نے غور نہ کیا مگر یہ یقین ہے کہ وہ گھر جیسا نہ تھا۔ اور سچی بات یہ ہے کہ میں نئی نئی چیزوں کے دیکھنے میں ایسا مصروف تھا کہ کچھ سمجھ ہی میں نہ آیا کہ کیا کھا رہا ہوں۔

جب ہم دونوں کھانا کھا چکے تو سیّد صاحب نے ایک نوکر سے کہا کہ "اِن بچّوں کو اُن کے پلنگوں پر لے جا کر سُلا دو۔"

صبح ہوتے ہی چڑیوں کی آواز پر آنکھ کھلی۔ میں بے انتہا خوش تھا۔ جتنی چیزیں اب تک دیکھی تھیں اُن کی نسبت بیسیوں سوال والد سے کرتا تھا۔ اور بار بار پوچھتا تھا کہ الہ آباد میں یہ سب چیزیں ہونگی یا نہیں؟ والد کبھی تو جواب دے دیتے تھے۔ کبھی ہنس کر چُپ ہو جاتے تھے۔

والد نے علی گڑھ میں دو دن قیام کیا۔ پھر الہ آباد روانہ ہوگئے اور دوسرے دن سورج ابھی نہیں نکلا تھا کہ وہاں پہنچ گئے۔

ساڑھے آٹھ برس کی عمر میں سیّد صاحب کی طرز معاشرت پر میرا چھوٹا سا دماغ غور کرنے کے قابل تو کیا ہوتا۔ مگر اُن کے بنگلہ کی بہت سی چیزیں ایسی تھیں کہ جی چاہتا تھا میرے پاس بھی ہوتیں۔ اب یہ شوق پیدا ہوا کہ جہاں بھی رہوں وہاں کی ہوا ایسی ہی اچھی ہو۔ ایسے ہی کھلے میدان ہوں۔ باغ ہو۔ باغوں کے پھولوں کے پودے ہوں۔ گرد و پیش کی سب چیزیں صاف ستھری چمکتی ہوئی ہلکے ہلکے رنگوں کی ہوں۔ اور کوئی چیز میلی اور خراب نہ ہو۔ یہ ایسا خیال تھا جس کا بہت کچھ اثر طبیعت پر تمام عمر غالب رہا۔"

شمس العلما مولوی نذیر احمد

قاری عباس حسین

موضع ریڑھ ضلع بجنور کے ایک شریف مگر غریب خاندان کے ایک صاحبزادے جن کا نام نذیر احمد تھا مذہبی تعلیم مکمل کرنے کی غرض سے دلی آئے۔ جس طرح بہت سے بچے حصولِ تعلیم کے لئے دلی آیا کرتے تھے۔ کیونکہ دلی علم و فضل کا مرکز اور تعلیم و تربیت کا گہوارہ تھی جہاں سے ہر کس و ناکس فیض پاتا اور تعلیم حاصل کرتا۔ لاتعداد طلبا دوسرے شہروں سے آتے کیونکہ آنے والوں کو دلی میں معاش و فراغت میسر آتی اور وہ اسی ذریعہ حصولِ معاش کی غرض سے مدتوں رہتے۔ دلی آئے ہوئے یہ طلبا دینیات کے مدارس میں جو اکثر مسجدوں سے ملحق ہوتے ہیں، داخل ہوا کرتے تھے۔ اکثر و بیشتر حالات میں ان کے کھانے پینے کی صورت یہ ہوتی تھی کہ دلی کے لوگ شادی و غمی کے موقعوں پر اسلامی درس گاہوں میں زیرِ تعلیم بچوں کو کھانا کھلانے کی غرض سے بلاتے اور جب بھی کہیں سے دعوت ہوتی تو پندرہ بیس یا زیادہ تعداد میں بھی لڑکے وہاں جا کر کھانا کھاتے ورنہ مختلف طور پر مختلف لوگوں کے ہاں سے دونوں وقت کی روٹی مقرر ہوگئی اور یہ لڑکے کھانے کے وقت اپنا کھانا جا کر لاتے۔ نذیر احمد نے بھی اسی طرح تعلیم حاصل کی۔ نہ ان کے جسم پر ڈھنگ کے کپڑے تھے نہ سونے کے لئے بستر بلکہ ہوتا یہ تھا کہ یہ رات کو مسجد کی ٹاٹ کی کسی صف میں لپیٹ کر پڑ رہتے۔ اکثر صبح ایسا ہوتا کہ مؤذن لات مار کر انہیں لڑھکا دیا کرتا اور یہ اپنے شاندار بستر میں سے اس طرح نکل آتے جس طرح بازی گر کی پٹاری میں سے کوئی جانور یا پھل وغیرہ نکل آتا ہے۔ نذیر احمد مولوی عبدالخالق صاحب کے گھر کی کھاتے تھے اور چونکہ عمر کے چھوٹے تھے اس لئے ان سے کوئی پردہ بھی نہ تھا اور گھر کا کام کاج مثلاً جھاڑو دینا، مسالہ پیسنا وغیرہ کی خدمات انجام دیتے تھے۔ مولوی صاحب کی پوتی مسالہ خراب پیسنے پر کبھی کبھی بٹے سے ان کے ہاتھ کچل دیتیں۔ ان سب محنتوں اور ریاضتوں سے نذیر احمد نے اپنی تعلیم جاری رکھی۔ اپنی ذہانت کی وجہ سے قدیم دلی کالج میں داخلہ لیا۔ ذکاء اللہ اور محمد حسین آزاد کے ساتھ پڑھے عربی میں اعلیٰ استعداد حاصل کی اور مولوی کہلانے لگے۔ اللہ کی شان مولوی عبدالقادر صاحب کی لڑکی سے جو مرچوں بھرے ہوئے بٹے سے ان کا ہاتھ کچلتی تھیں، نذیر احمد کی شادی ہوئی۔ جب مولوی نذیر احمد فارغ التحصیل ہوگئے تو فکرِ معاش میں سرگرداں پھرے۔ ایک دن ایک صاحب بہادر کے پاس پہنچے جو ڈائرکٹر تعلیمات تھے، جیب سے اپنی ڈگری نکال کر سامنے رکھ دی اور کہا کہ یا تو نوکری دلوایئے ورنہ میں اُپلوں کی منڈی سے کر بیٹھوں گا اور اس ڈگری کو وہاں لٹکا دوں گا۔ ڈائرکٹر صاحب نے متاثر ہو کر مدرسی کی ایک جگہ انہیں دے دی۔ یہ سرکاری ملازمت اور سرکاری اعزازات کی پہلی سیڑھی تھی جس پر چڑھ کر مولوی نذیر احمد صاحب نے انتہائی اعزازات اور شہرت حاصل کی۔ انہیں قانون کی ڈاکٹری کی

ڈگری بھی ملی اور خان بہادر شمس العلماء کے خطاب بھی، اور حیدرآباد میں کئی ہزار تک کی تنخواہ ہوئی اور مرتے دم تک پندرہ سو روپیہ ماہوار پنشن ملتی رہی چونکہ اکثر میری والدہ ماجدہ "اصغری اکبری" پڑھا کرتی تھیں اس نام سے ڈپٹی صاحب کی کتاب مراۃ العروس عورتوں میں یاد کی جاتی تھی اس سے مولوی نذیر احمد صاحب کا نام تو دل پر نقش تھا ہی۔ انہیں دیکھنے کو بھی جی چاہتا تھا۔ یہ تمنا اس طرح پوری ہوئی کہ جب میری عمر تقریباً گیارہ برس کی ہوگی تو ڈپٹی صاحب کے خاندان میں کوئی شادی تھی۔ اس شادی میں سب سے پہلے میں نے ڈپٹی صاحب کو دیکھا۔ چونکہ ڈپٹی صاحب کو دیکھنے کا خاصا شوق تھا اس لئے ان کی اس وقت کی تصویر اب بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ موزوں قد گٹھا ہوا بھرا بھرا جسم، چھدری ڈاڑھی، لمبیں کتری ہوئی مونہیں منڈی ہوئی، سر پر ترکی ٹوپی، جسم پر شیروانی مگر معمول سے نیچی، ٹخنوں اور ٹخنوں کے درمیان تک لٹکتی ہوئی، آواز گرجدار ——— ابا جان نے سلام کیا، انہوں نے سر پر ہاتھ رکھ کر جب نام پوچھا تو ان کی آواز کی کڑک سے میں کچھ گھبرا سا گیا۔ میرے اس بیان سے معلوم ہوگا کہ ڈپٹی صاحب کے لہجہ میں کرختگی ہوگی۔ یہ بات نہیں تھی بلکہ بات یہ تھی کہ ڈپٹی صاحب کی آواز میں لوچ کم تھا۔ اپنی آواز کی اس خصوصیت کی وجہ سے وہ بہت کامیاب مقرر تھے اور اچھے بڑے مجمع میں ان کی آواز سب کو سنائی دیتی تھی۔

ہاں تو ڈپٹی صاحب کو پہلی مرتبہ دیکھنے کے بعد بہت دفعہ ان کو دیکھنے کا اتفاق ہوا اور ان کے متعلق سننے کا اتفاق تو اتنا ہوا کہ اس زمانہ کے کسی شخص کا نام اتنا زیادہ سننے میں نہیں آیا۔ اس لئے کہ جوں جوں بڑا ہوتا گیا ڈپٹی صاحب کا نام زبان زدِ خاص و عام پایا۔ پہلے پہلے تو بحیثیت مصنف ان کی تعریف سنی، پھر بحیثیت مقرر کے۔ لیکن بعد میں ان کی برائیاں زیادہ ہونے لگی تھیں۔ ڈپٹی صاحب کے ترجمۂ قرآن مجید کے بعد عوام میں اور خصوصیت کے ساتھ اس زمانہ کے علماء میں ڈپٹی صاحب کی مذمت اتنی بڑھ گئی تھی کہ شاید ہی کوئی محفل یا مجمع ایسا ہوتا ہوگا جہاں کسی نہ کسی طرح ڈپٹی صاحب کا ذکر اور وہ بھی برائی کے ساتھ نہ آتا ہو۔ ایک دن شام کا وقت تھا ڈپٹی صاحب عبدالرحمٰن صاحب کے (جو ڈپٹی صاحب کی ترغیب کی بدولت وکیل دلی یونیورسٹی کے وائس چانسلر اور ہائی کورٹ کے جج اور سر ہوئے) والد کی دوکان پر بیٹھے تھے کہ برابر سے ایک صاحب کی آواز آئی۔ وہ اپنے ساتھی سے کہہ رہے تھے "وہ بیٹھا ہے نیچری" کرخندار نے انگلی سے اشارہ کیا۔ میری نگاہ بھی اس طرف گئی۔ دیکھا کہ ڈپٹی صاحب بیٹھے ہیں۔ ڈپٹی نذیر احمد صاحب عقائد کے اعتبار سے سر سید احمد سے متفق نہ تھے اور بعض امور میں ان کے اور سر سید احمد کے درمیان بنیادی اختلافات تھے۔ لیکن عام طور پر ڈپٹی نذیر احمد صاحب سے ممتاز لوگوں کی شدید مخالفت کی ایک خاص وجہ یہ بھی تھی کہ وہ بڑے ضدی اور غصیل آدمی تھے۔ اپنے علم پر انہیں اتنا اعتماد تھا کہ کسی کو اپنے آگے گردانتے نہ تھے۔ دوسرے زبان دانی کے غرّے میں رسمی ادب آداب کو بالائے طاق رکھ دیتے تھے۔ کلام مجید کے بامحاورہ ترجمہ پر مولویوں نے بہت شورش برپا کی ——— ویسے تو سر سید اور ان کی پارٹی کی مخالفت میں بھی علماء پیش پیش تھے لیکن ڈپٹی صاحب کی مخالفت میں علماء نے اس قدر زور مارا کہ ڈپٹی صاحب کے لئے سوائے اس کے کوئی چارہ نہ رہا کہ وہ اپنی کتاب امہات الامہ کو نذرِ آتش کر دیں۔ ڈپٹی صاحب کے خلاف جو ہنگامہ برپا ہوا اور ان کے خلاف الحاد اور کفر کے جو فتوے تیار ہوئے اور انہیں قتل کئے جانے کی جو دھمکیاں دی گئیں ان کو دیکھتے ہوئے اگر ڈپٹی صاحب کے کردار پر نظر ڈالی جائے تو سخت تعجب معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے کہ ڈپٹی صاحب عقیدتاً ہی ایک کٹر مسلمان نہ تھے بلکہ عملی طور پر بھی ایک سچے اور پکے مسلمان تھے۔ ڈپٹی صاحب پر سب سے بڑا الزام یہ لگایا جاتا ہے کہ انہوں نے اسلام کی تضحیک اور توہین کی لیکن جو لوگ مولانا نذیر احمد سے واقفیت رکھتے ہیں وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ——— ان پر شرح نویسی اور محاوروں کی بے احتیاطی کے استعمال کا الزام لگایا جائے تو لگایا جائے لیکن ان کے متعلق یہ کہنا کہ وہ اسلام کی تضحیک اور اکابرین دین کی توہین کرتے تھے، غلط ہے۔ ڈپٹی صاحب مرحوم کی تصانیف اس کا کافی ثبوت ہیں اور مجھے تو ذاتی طور پر معلوم ہے کہ ڈپٹی صاحب اسے کسی حالت میں بھی گوارا نہ کرتے تھے کہ کوئی شخص اشارتاً، کنایتاً، مزاحاً کوئی ایسی بات مذہب کے بارے میں کہے جس سے استہزا کا پہلو نکلتا ہو بلکہ اس بات پر وہ سخت ناراض ہوتے تھے۔ میں اس سلسلہ میں ایک واقعہ کا ذکر کروں گا۔ "رسالہ تمدن" کے پہلے پرچے میں جون ۱۹۱۱ء میں علامہ راشد الخیری اور شیخ محمد اکرام صاحب بیرسٹر نے دلّی سے جاری کیا تھا۔ والد ماجد قاری سرفراز حسین مرحوم کا ایک مضمون شائع ہوا جس کا عنوان تھا

"افسانۂ فرشتہ کی عینک سے" اس مضمون کو دیکھ کر ڈپٹی صاحب جس قدر ناراض ہوئے اس کی کیفیت علامہ راشد الخیری نے اس طرح بیان کی:

"یہ مضمون جب مولانا مرحوم نے پڑھا چہرہ سُرخ ہوگیا۔ بدن کانپ رہا تھا۔ ناخوش ہوئے اور میرے سامنے ایک
مختصر سا لکچر شروع کیا ـــــ وہ وقت میری آنکھوں کے سامنے ہے کہ رسالت مآب کا نام آتے ہی ان کی
حالت بگڑ گئی، زار زار رونے لگے اور مجھ سے فرمایا اگر اجرائے "تمدن" کا مقصد اسلام کی تضحیک ہے تو
آئندہ مجھے صورت نہ دکھانا ـــ"

جو بزرگ مذہب کے متعلق اس درجہ شدید جذبات رکھتا ہو اس پر کفر کے فتوے لگائے گئے اور اس کی تصنیف جلائی گئی۔ یہ میری آنکھوں دیکھی باتیں ہیں۔ غالباً سنہ ۱۹۱۱ء کے جاڑوں کا ذکر ہے کہ اجمیری دروازہ کے باہر عربک اسکول دہلی کے کھیل کے میدان میں ندوۃ العلماء کا جلسہ ہوا۔ تمام ہندوستان سے بڑے بڑے مولوی آئے۔ عربک اسکول کے بورڈنگ ہاؤس میں مہمانوں کے ٹھہرنے کا انتظام تھا۔ عربک اسکول کے بہت سے طالب علم ان مہمانوں کی خاطر مدارات اور جلسہ کے انتظام کے لئے والنٹیر بنے تھے۔ میں بھی ان میں شامل تھا۔ اس جلسہ کی بہت سی خصوصیات تھیں لیکن ـــــ سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ مولوی نذیر احمد پر نہایت شدید لعن طعن ہوئے، کفر کا فتویٰ لگایا گیا اور ان کی تازہ ترین تصنیف "امہات الامہ" نذرِ آتش کی گئی۔ اس جلسہ میں مولوی صاحبان نے درشت کلامی کا جو مظاہرہ کیا وہ حد درجہ نامناسب تھا۔ ایک ایک مولوی اٹھتا تھا اور انتہائی درشت آواز میں سخت الفاظ کہتا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ مولوی نذیر احمد پر سب و شتم کر کے وہ اسلام کی کوئی بڑی خدمت انجام دے رہا ہے۔ مقررین جوش میں آپے سے باہر ہو جاتے تھے اور ایسے جملے استعمال کرتے تھے جو کوئی پڑھا لکھا آدمی تو کیا جاہل عوام آپس کی لڑائی جھگڑے میں بھی استعمال نہ کرتے تھے۔ علماء کا یہ جلسہ تھا جس نے علماء کرام کے اس احترام کو جو میری گھٹی میں پڑا ہوا تھا، بہت کچھ متزلزل کر دیا۔ جلسہ میں جو جوش تھا اور ڈپٹی صاحب کے خلاف جو آگ لگائی گئی تھی اور اسے جس طرح ہوا دی جا رہی تھی اگر اس کو فرو کرنے کی کوشش نہ کی جاتی تو اس کا قوی اندیشہ تھا کہ کوئی سرپھرا جاہل ڈپٹی صاحب کو قتل کر دیتا لیکن یقیناً یہ حکیم اجمل صاحب کا بہت بڑا کارنامہ تھا کہ انہوں نے ڈپٹی صاحب کو اس پر آمادہ کیا کہ تمام کتابیں انہیں دے دیں۔ چنانچہ جلسہ کے دوران ہی میں پنڈال کے سامنے میدان میں امہات الامہ کا ڈھیر لگایا گیا اور علماء نے اس میں آگ لگائی۔ ایک مولوی صاحب تو برسوں اس پر فخر کرتے رہے کہ میں نے اس کتاب کے ڈھیر پر تیل چھڑکا اور اس میں دیاسلائی لگانے کی اولیت کا شرف حاصل کیا۔ ایک ایسی کتاب کے جلنے پر علماء خوش ہو رہے تھے جو ایک پادری کے اسلام پر اعتراضات کے جواب میں لکھی گئی تھی اس وقت امہات الامہ جل گئی۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا تھا کہ کتاب صفحۂ ہستی سے مٹ گئی لیکن بہت سی کتابیں اس جلے ہوئے ڈھیر میں سے اٹھ گئیں۔ چنانچہ ایک کتاب میں نے بھی اٹھالی تھی جس کا ایک کونہ جل گیا تھا جو عرصہ تک میرے پاس رہی جہاں علماء کرام کا ایک مخصوص حصہ اور ان کے جاہل پیرو امہات الامہ کے جلائے جانے پر خوش تھے وہاں ایسے لوگ بھی تھے جو علماء کی اس حرکت کو دھبا نہ سمجھتے تھے۔ شاید اسی کا ردِ عمل ہو یا لڑکوں کی شرارت مگر ہوا یہ کہ اس رات کو جب اس پنڈال میں تقریریں ہو رہی تھیں اور مولوی صاحبان جوتے تارے ہوئے آلتی پالتی مارے کرسیوں پر رضائیوں میں دبکے بیٹھے تھے اور جلسہ پر ایک ہیجانی کیفیت طاری تھی تو ان میں سے بیشتر کی جوتیاں غائب ہو گئیں۔ بہرحال جوتیاں اس رات تو نہ مل سکیں لیکن دوسرے دن صبح کو دیکھا گیا کہ جلسہ گاہ سے کچھ دور کھائی میں جوتیوں کا ڈھیر لگا ہوا ہے اور جو علماء رات کو ننگے پاؤں اپنے کمروں میں گئے تھے ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر اپنی جوتیاں لا رہے ہیں۔

امہات الامہ جل گئی۔ ڈاکٹر نذیر احمد کے خلاف جو ہنگامہ برپا تھا وہ کچھ نہ کچھ دب گیا۔ لیکن ان سب واقعات کا ڈپٹی صاحب پر بہت گہرا اثر ہوا۔ وہ اس حادثہ کے بعد زیادہ دن نہ جی سکے اور جب تک جئے انہوں نے ایک لفظ بھی نہیں لکھا۔ اب تک آپ نے جو کچھ پڑھا وہ زیادہ تر اس عظیم المرتبت شخصیت کے متعلق میرے ذاتی تاثرات تھے جو اپنی ذاتی کوشش سے بام رفعت پر پہنچے۔ اب مختصراً وہ حالات بھی سن لیجئے جن سے ان کی تدریجی ترقی پر

روشنی پڑتی ہے۔

نذیر احمد سنہ ۱۸۴۵ء میں دلی آئے اور بہت بڑے فاضل صاحب کمال، جید عالم حضرت مولانا عبدالخالق کے شاگرد ہو گئے۔ مولوی عبدالخالق نے جو علمی ادبی فنون کے ماہر تھے نہایت شفقت فرمائی اور نذیر احمد کو علم و فضل کے مکمل اور کامیاب راستوں پر سے گذرنے کا سلیقہ سکھایا۔ انہی ایام میں مولوی مملوک علی صاحب ایک بزرگ جو دلی کالج میں عربی کے پروفیسر تھے اور ایک قابل مستی مانے جاتے تھے، انہوں نے مولانا نذیر احمد کو آنکھوں ہی آنکھوں میں بھانپا اور دلی کالج میں اصرار کے ساتھ داخل کرا دیا جہاں مولانا نذیر احمد نے عربی، فلسفہ اور ریاضی کی تعلیم مکمل کی، سنداً حاصل کی اور اب یہ بالکل مجلا ہو گئے۔ مسٹر ٹیلر جو دلی کالج کے پرنسپل تھے، ان پر مولانا کی با فہم و ذکا شخصیت کا بہت گہرا اثر ہوا اور مسٹر ٹیلر نے از راہ محبت و خلوص ——— مولانا نذیر احمد کو انگریزی پڑھنے کی ترغیب دی۔ جس پر مولانا نے انگریزی کی تعلیم بھی حاصل کرنی شروع کر دی۔

دلی کالج میں مولانا نذیر احمد کے ہم سبق ساتھیوں میں مولانا محمد حسین آزاد، مولوی ذکاء اللہ، منشی کریم الدین و لالہ پیارے لال آشوب تھے جو ہمیشہ مولانا کے قریب ترین اور صف اول میں رہے۔ مولانا نذیر احمد کی زندگی نہایت سادہ رہی اور مزاج کی کیفیت نہایت مہذب تھی لیکن ساتھ ہی ساتھ مولانا کی طبیعت میں بلا کی ظرافت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی اور وہ اس وجہ سے بھی مشہور رہتے۔ باوجودیکہ وہ بڑے جزرس تھے تاہم وہ اپنا فرض سمجھتے تھے کہ جب بھی موقع ملے غریب شریف گھرانے کے بچوں کی مدد کی جائے۔ اور مولانا نے بطور مدد اپنا بہت کافی روپیہ حسب المقدور اس نیک کام پر خرچ کیا اور بہت سے لڑکوں کی مالی مدد کی۔

۱۸۹۷ء میں مولانا نے شمس العلماء کا خطاب پایا۔ ۱۹۰۲ء میں پنجاب یونیورسٹی سے ڈی۔او۔ایل کی ڈگری لی۔ جس وقت مولانا کو گورنر پنجاب نے جو وائس چانسلر تھے ڈگری پیش کی تو مولانا کی قابلیت و فہم و ذکا کی بہت تعریف کی۔ گو شروع میں مولانا نے پنجاب کے ایک ضلع میں مدرسی کی ملازمت کی لیکن کچھ عرصے کے بعد ہی وہ ڈپٹی انسپکٹر مدارس ہو گئے۔ چونکہ ۱۸۵۷ء میں مولانا نے ایک انگریز عورت کی جان بچائی تھی اس کے صلے میں مولانا کو ایک طلائی تمغہ اور کچھ نقد انگریزی حکومت سے بطور انعام ملا تھا اور ساتھ ہی ساتھ ان کو انسپکٹر مدارس مقرر کر کے الہ آباد میں تعینات کر دیا گیا تھا جہاں انہوں نے تعزیرات ہند کا بے نظیر ترجمہ کیا جو آج تک مروج ہے۔ اس پر مولانا کو تحصیلدار بنانے کے بعد افسر بندوبست مقرر کیا گیا۔ اسی دوران میں مولانا کے کسی واقف کار نے حیدر آباد میں مولانا کی قابلیت کا ذکر سر سالار جنگ اول کے روبرو کر دیا اور سر سالار جنگ اول نے مولانا کو حیدر آباد دکن بلا لیا۔ حیدر آباد پہنچ کر مولانا نے سالار جنگ کے زور دینے سے انگریزی ملازمت ترک کر دی اور نظام گورنمنٹ میں مشیر مال کا عہدہ قبول کر لیا۔ انہی ایام میں مولانا نے ایک نصاب تعلیم تیار کیا جو بہت مقبول ہوا۔ اس طرح مولانا کافی مدت تک حیدر آباد دکن میں رہے۔ ملازمت سے سبکدوش ہو کر دلی میں آ گئے اور تصانیف و کتب کے شغل میں مصروف رہے اور ۱۹۱۲ء میں انتقال فرمایا۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

لیکن کوئی تکلیف، وہ سے تکلیف وہ واقعہ بھی ان پر اس طرح اثر انداز نہیں ہوا کہ وہ کسی دوست سے راہ و رسم منقطع کر لیتے، یا اس کی دوستی سے باز آجاتے خان بہادر حبیب اللہ بھی ان کے دوست تھے جو مہاراجہ صاحب محمود آباد کے حقائق کل تھے۔ دوستی کے باوجود، دشمنی سے کبھی باز نہ آئے، مہاراجہ کے دربار میں ہمیشہ دراندازی کرتے رہے۔ ریاض بہت برہم ہوئے تو ایک دفعہ چند اشعار دل کے جلے پھپھولے پھوڑنے کو کہہ ڈالے۔

نگاہ شیخ میں سید کی آبرو کیا ہے

لیکن سوا اس کے کہ چند احباب کو یہ اشعار سنائے، نہ کسی کو نقل دی، نہ چھاپنے کی اجازت دی، نہ دیوان میں شامل کیا۔ نہ ان اشعار کو غیر مطبوعہ کلام کے فائل میں محفوظ رکھا کہ وفات کے بعد ان سے کوئی کام لے سکتا۔ منشی نظام احمد خیرآبادی بچپن کے دوست تھے۔ ان کا انتقال ہوا تو ان کے گھر کا راستہ چھوڑ دیا۔ اسٹیشن جاتے ہوئے راستہ میں وہ گھر لازمی طور پر پڑتا تھا، ریاض سواری چھوڑ کر چکّر کا راستہ اختیار کر کے پاپیادہ کھیتوں میں ہوتے ہوئے اسٹیشن جاتے اور آتے تھے لیکن زندگی بھر اس راستہ سے نہیں گزرے۔

شوخی، زندہ دلی اور بذلہ سنجی ریاض کی سرشت تھی۔ قاضی سرعزیز الدین اور ان کے بھائی خان بہادر شکیل الدین نوعمری کے بے تکلف دوست تھے۔ ایک مرتبہ وہ تشریف لائے، گرمی کا موسم تھا، شربت کی ایک بوتل میز پر رکھی تھی، ریاض اور قاضی صاحب گفتگو میں مصروف تھے۔ اتنے میں حضرت وسیم خیرآبادی آتے ہوئے نظر آئے۔ وسیم صاحب ریاض کے بہنوئی تھے۔ بڑے ثقہ، متین اور بزرگ صورت ——— انہیں دیکھتے ہی ریاض نے بوتل کی طرف اشارہ کر کے قاضی صاحب سے کہا ؎

اُٹھواؤ میز سے مے و ساغر ریاض جلد
آتے ہیں اک بزرگ پرانے خیال کے

وسیم صاحب تو مسکرا کر خاموش ہو گئے لیکن قاضی صاحب ہنستے ہنستے لوٹ ہو گئے۔

امین آباد لکھنؤ کے پرنس ہوٹل میں ایک مرتبہ جوش ملیح آبادی جا کر ٹھہرے۔ ان کے کمرے سے ملا ہوا ایک دوسرا کمرہ تھا جس کے دروازے بھڑے ہوئے تھے۔ جوش صاحب نے ایک مرتبہ کراچی میں خود مجھ سے یہ روایت بیان کی کہ رات کو ذرا دیر سے وہ اپنے کمرہ میں آئے اور اپنے ساتھی سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے، دوسرے کمرہ سے جو بالکل ملا ہوا تھا اور جس کا دروازہ بھڑا تھا، دفعتاً آواز آئی:

"خاموش ہو جاؤ، بک بک نہ کرو۔"

جوش صاحب نے سُنی اَن سُنی کر دی اور باتوں میں مشغول رہے۔ اتنے میں پھر کانوں سے ایک آواز ٹکرائی:

"ایسا معلوم ہوتا ہے یہ لوگ بغیر پٹے ہوئے نہیں مانیں گے۔"

جوش صاحب آخر آفریدی پٹھان ٹھہرے۔ کہاں تک ضبط کرتے؟ آخر پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا۔ انہوں نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ اندر سے آواز آئی:

"کیا لڑنا چاہتے ہو؟"

جوش صاحب نے نہایت برہمی کے عالم میں جواب دیا:

"ہاں ——— لڑیں گے!"

اندر سے پھر جواب ملا:

"تو اندر آجاؤ!"

جوش صاحب نے آستینیں چڑھا لیں اور کہا:

"بڑے مرد ہو تو باہر آؤ!"

جواب ملا:

"تم اندر آنے سے ڈرتے ہو! بزدل! جاؤ ہم نے معاف کیا۔"

اب جوش صاحب ہیں کہاں تاب — بپھرے ہوئے اندر پہنچے اور یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ ریاض صاحب نہایت اطمینان سے بستر پر تشریف فرما ہیں۔ اب جنگ و پیکار کا کیا سوال تھا۔ معانقہ ہوا، مصافحہ ہوا۔ باتیں ہونے لگیں۔ شعر و شاعری کا چرچا شروع ہوا اور ساری رات اسی طرح بیت گئی۔

ریاض کی زندگی کا ایک دور وہ تھا کہ وہ ریاض الاخبار، صلح کل، فتنہ اور امیر المطابع کے مالک تھے۔ آمدنی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ اتنے ٹھاٹھ سے خرچ کرتے تھے۔ اچھے سے اچھا کھاتے تھے، اچھے سے اچھا پہنتے تھے۔ اندر اور باہر ملازموں اور ماماؤں کی ریل پیل تھی۔ اسٹاف اور عملہ کی تنخواہوں پر بہت کافی رقم ہر ماہ خرچ ہو جاتی تھی۔ لیکن ایک الم انگیز سانحہ سے متاثر ہو کر ہنگامہ آرائیوں سے کچھ ایسے دل برداشتہ ہوئے کہ چلتے ہوئے کارخانے میں تالا لگا دیا اور پاؤں توڑ کر خیرآباد میں بیٹھ رہے۔ آمدنی کاروبار سے تھی۔ وہ ختم ہوا تو آمدنی بھی بند ہو گئی۔ گورکھپور میں مولوی سبحان اللہ خان نے زنجیر پا بننے کی کوشش کی، لکھنؤ میں مہاراجہ محمود آباد نے ترغیب و تحریص کے اسباب پیدا کر کے روکنا چاہا، لیکن وہ کسی طرف متوجہ نہ ہوئے۔ خیرآباد کے ویرانہ میں آ کر اس طرح بیٹھے کہ مر کر اُٹھے — البتہ گورکھپور کی یاد ان کے دل سے کبھی نہ گئی!

وہ گلیاں یاد آتی ہیں جوانی جن میں کھوئی ہے
بڑی حسرت سے لب پر ذکرِ گورکھپور آتا ہے

پریم چند

جینندر کمار

پریم چند جی کا نام بچپن سے سُنتا، دیکھتا آیا تھا۔ یہ نام کچھ اس طرح دل و دماغ میں رچ بس چکا تھا جیسے قدیم رشیوں کے نام۔ جیسے وہ دل کی بستی کے باسی ہوں۔ ان کا کوئی جسمانی وجود بھی ہے اور وہ ہم آپ کی طرح دنیاوی کام دھندا بھی کرتے ہیں ——— اس قسم کی کوئی بات ذہن قبول نہیں کرتا تھا۔ بہت ۱۹۲۶ء میں یا شاید ۱۹۲۰ء میں ان کا ناول "رنگ بھومی" ہاتھ لگا۔ اسے پڑھنے کے بعد تو میرے لئے وہ اور بھی مافوق البشر ہوگئے۔

لیکن دن نکلتے گئے اور ادھر میرا شعور بھی بالغ ہوتا گیا۔ ادھر اُدھر کی اطلاعات سے معلوم ہوا کہ پریم چند جی مصنف ہی نہیں اور کسی آسمانی سرزمین میں ہی نہیں رہتے، وہ ہم آپ ایسے انسان بھی ہیں۔ یہ جان کر مجھے مسرّت ہوئی یہ تو نہیں کہہ سکتا لیکن یہ معلومات عجیب ضرور معلوم ہوئیں اور ان سے ملنے کا مجھے اشتیاق پیدا ہوا۔

۱۹۲۹ء میں اچانک میں ایک کہانی لکھ بیٹھا اور میری جرأت دیکھئے کہ پہلی چیز کو ہی اس زمانے کے مشہور ہندی رسالے "مادھوری" اور اس کے معروف ایڈیٹر پریم چند جی کو بھیج دیا۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ کہانی شکریہ کے ساتھ واپس آ گئی اتنا ہی نہیں یہ بھی مجھ سے پوچھا گیا کہ لکھئے یہ کسی کہانی کا ترجمہ تو نہیں ہے۔ کچھ دنوں بعد میں نے ایک اور کہانی انھیں بھیجی اس بار انھیں لکھ دیا کہ یہ کہانی قابلِ اشاعت تو ہوگی نہیں لیکن پریم چند جی اس پر اپنی رائے دیں یہ میری تمنا ہے۔ رائے نہیں دو سطروں کا یہ خط ملا۔

" محترمی ۔ دو مہینے بعد "مادھوری" کا خاص نمبر نکلنے والا ہے۔ آپ کی کہانی اس کے لئے چُن لی گئی ہے۔"

اور یوں پریم چند جی سے میرا تعارف ہوا اور پھر باقاعدہ خط و کتابت ہونے لگی اور بالآخر ۱۹۳۰ء میں جب میں کنبھ کے میلے پر الٰہ آباد گیا تو مجھے ان کا یہ خط ملا ——— " امین الدولہ پارک کے پاس لال مکان ہے لوٹتے وقت آؤ گے ہی۔ ضرور آؤ۔"

جنوری کا مہینہ تھا۔ گاڑی لکھنؤ رات کے تقریباً چار بجے ہی جا پہنچی تھی۔ اندھیرا تھا اور سردی بھی کم نہ تھی۔ ایسے عالم میں امین الدولہ پارک کے قریب لال مکان مل تو جائے گا مگر ممکن ہے کچھ دقت بھی ہو۔ ایسا میں سوچ رہا تھا لیکن فی الواقع جو دقت اور پریشانی اُٹھانی پڑی اس کے لئے میں ہرگز تیار نہیں تھا۔

کیا مجھے معلوم نہیں تھا کہ میں پریم [illegible] شہر کے نام کا چرچا ہے مجھے معلوم تھا اور بڑے فخر کے ساتھ میں ہر کسی کو یہ بتانے کے [illegible] رہا ہوں۔ پانچ بجے کے لگ بھگ میں امین الدولہ پارک کی سڑک کے بیچوں بیچ آ کھڑا ہوا۔ سامان سامنے کی ایک بند دوکان کے تھڑے پر ٹکا دیا۔ اکا دکا شریف لوگ سیر کی غرض سے آ جا رہے تھے۔ میں نے تقریباً ہر ایک سے پوچھا۔ جی معاف کیجیے۔ پریم چند جی کے مکان کا پتہ آپ بتا سکتے ہیں ؟

" پریم چند"، ہر کسی نے بڑے تعجب سے کہا " کون پریم چند ؟"

" جی وہی بلند پایہ ادیب، ناولسٹ، صاحب وہ ایڈیٹر بھی ہیں ——— مشہور آدمی ہیں "

لیکن ہر کسی نے اپنی ناواقفیت کی بنا پر مجھ سے معافی مانگی اور سیر کے لئے آگے بڑھ گیا۔

اس سڑک پر ہی مجھے چھ بج گئے۔ ساڑھے چھ بجنے لگے۔ اس عرصہ میں میں درجنوں اصحاب کو معاف کر چکا تھا۔

آس پاس مکان کم نہ تھے اور لال مکان بھی کم نہ تھے اور جہاں میں کھڑا تھا وہاں سے پریم چند جی کا مکان مشکل سے بیس گز دور تھا لیکن اس روز مجھے مہذب اور معزز لوگوں کی رہنمائی میں اس بیس گز کے معمولی سے فاصلے کو طے کرنے میں کافی دیر لگی اور گیا اسے محض اتفاق نہ کہا جائے کہ بالآخر جس شخص کی رہنمائی میں میں ان بیس گزوں کا فاصلہ طے کر کے پریم چند جی کے پاس پہنچا سماجی حیثیت سے وہ غیر معزز اور غیر مہذب ہی تھا۔

مکان پر پہنچ کر آواز دی گئی اور جب اوپر کا کواڑ کھلا تو زینے کے نیچے سے اوپر جھانکنے پر جو کچھ مجھے نظر آیا اس کے لئے بھی میں ہرگز تیار نہیں تھا۔ جو صاحب اوپر کھڑے تھے ان کے بڑی گھنی مونچھیں تھیں۔ پانچ روپے والی لال اٹلی کی چادر اوڑھے ہوئے تھے جو کافی بوسیدہ اور چکنی تھی۔ بالوں نے آگے بڑھ کر ماتھے کو کچھ ڈھانپ سا دیا تھا اور ماتھا کافی چھوٹا معلوم ہوتا تھا۔ سر ضرورت سے زیادہ چھوٹا نظر آیا۔ کیا جیتے جی پریم چند انھیں صاحب کو سمجھنا ہوگا۔ اتنی دور سے اتنے اشتیاق کے ساتھ میں اس شخص کے نیاز حاصل کرنے یہاں آیا تھا ؟ ایک بار تو جی میں آیا کہ اگر اپنے ذہن میں پریم چند جی کی عظمت کو برقرار رکھنا ہے تو مجھے فوراً وہاں سے لوٹ جانا چاہیئے۔ پریم چند کے نام پر یہ سامنے کھڑا شخص کس درجہ معمولی، کس درجہ عام، کس درجہ دیہاتی تھا۔

خیر! میں اوپر پہنچا۔ سب کام چھوڑ کر پریم چند جی مجھے لے کر بیٹھ گئے۔ سات بج گئے، ساڑھے سات بج گئے، آٹھ ہونے کو آئے۔ باتوں کا سلسلہ ٹوٹتا ہی نہیں تھا۔ اس دوران میں میں بہت کچھ بھول گیا۔ یہ بھول گیا کہ وہ پریم چند ہیں۔ ہندی، اردو کے عظیم ادیب ہیں، یہ بھی بھول گیا ——— کہ میں ادب کے کنارے پر بھونچکا کھڑا ایک معصوم بچہ ہوں۔ یہ بھی بھول گیا کہ لمحہ بھر پہلے اس شخص کو دیکھ کر میرے دل میں کچھ ناپسندیدگی سی پیدا ہوئی تھی۔ دیکھتے دیکھتے میں ایک انتہائی گہری اپنائیت میں گھر کر اوپری سب باتوں کو بھول گیا۔ ان کے چہرے پر بہت کچھ لکھا تھا جو پڑھنے کے قابل تھا۔ میں سوچتا ہوں کہ بادام کی میٹھی گری کے لئے کیا یہ نہایت ضروری اور ناگزیر نہیں ہے کہ اس کے اوپر کا چھلکا بہت سخت ہو۔ اگر ایسا نہ ہو تو بادام کو کبھی بادام بننے کا شرف حاصل نہیں ہو سکتا۔ اب وہ کسی بھی لباس میں، کسی بھی رنگ روپ میں ہوتے، میں ان کے پیر چھوئے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔

اب نو بج چکے تھے باتوں کا سلسلہ برابر چل رہا تھا کہ اندر سے اطلاع آئی کہ ابھی ڈاکٹر کے یہاں سے دوا لا کر نہیں رکھی گئی ایسی بھی کیا مصروفیت ہے۔ پریم چند جی اٹھ کھڑے ہوئے اور مجھے حاجات ضروری سے فارغ ہونے کو کہہ کر انھیں کپڑوں میں سلیپر پہن کر باہر نکل گئے۔

میرے دل پر پریم چند جی کی شخصیت کی پہلی چھاپ یہ پڑی کہ یہ شخص جو کچھ بھی ہے اس سے ذرہ برابر مختلف دکھائی دینے کا خواہشمند نہیں۔ اس شخص کو اپنے بارے میں صرف اتنا ہی علم ہے کہ لاکھوں کروڑوں انسانوں کی طرح وہ بھی ایک انسان ہے۔ اس سے زیادہ کچھ ہونے کا یا پلنے کا وہ دعویدار نہ بنے گا۔

کیا مجھے معلوم نہیں تھا کہ میں پریم چند جی کے یہاں جا رہا ہوں ؟ جی ہاں ، وہی جو شہنشاہِ ادب ہیں۔ گھر گھر جن کے نام کا چرچا ہے مجھے معلوم تھا اور بڑے فخر کے ساتھ میں ہر کسی کو یہ بتانے کے لئے بے چین تھا کہ میں ان کے ، انھیں کے یہاں جا رہا ہوں ۔ پانچ بجے کے لگ بھگ میں امین الدولہ پارک کی سڑک کے بیچوں بیچ آ کھڑا ہوا ۔ سامان سامنے کی ایک بند دکان کے تختوں پر ٹکا رہا ۔ اکا دکا شریف لوگ سیر کی غرض سے آ جا رہے تھے ۔ میں نے تقریباً ہر ایک سے پوچھا : جی معاف کیجئے ۔ پریم چند جی کے مکان کا پتہ آپ بتا سکتے ہیں ؟

" پریم چند " ، ہر کسی نے بڑے تعجب سے کہا ، " کون پریم چند ؟ "

" جی وہی بلند پایہ ادیب ، ناولسٹ ، صاحب وہ ایڈیٹر بھی ہیں ——— مشہور آدمی ہیں ۔ "

لیکن ہر کسی نے اپنی ناواقفیت کی بنا پر مجھ سے معافی مانگی اور سیر کے لئے آگے بڑھ گیا ۔

اس سڑک پر ہی مجھے چھ بج گئے ۔ ساڑھے چھ بجنے لگے ۔ اس طرح میں میں درجنوں اصحاب کو معاف کر چکا تھا ۔

آس پاس مکان کم نہ تھے اور لال مکان بھی کم نہ تھے اور جہاں میں کھڑا تھا وہاں سے پریم چند جی کا مکان مشکل سے بیس گز دور تھا لیکن اس روز مجھے مہذب اور معزز لوگوں کی رہنمائی میں اس بیس گز کے معمولی سے فاصلے کو طے کرنے میں کافی دیر لگی اور کیا اسے محض اتفاق نہ کہا جائے کہ بالآخر جس شخص کی رہنمائی میں میں ان بیس گزوں کا فاصلہ طے کر کے پریم چند جی کے پاس پہنچا ، سماجی حیثیت سے وہ غیر معزز اور غیر مہذب ہی تھا ۔

مکان پر پہنچ کر آواز دی گئی اور جب اوپر کا کواڑ کھلا تو زینے کے نیچے سے اوپر جھانکنے پر جو کچھ مجھے نظر آیا اس کے لئے میں ہرگز تیار نہیں تھا ۔ جو صاحب اوپر کھڑے تھے ان کے بڑی گھنی مونچھیں تھیں ۔ پانچ روپے والی لال اٹلی کی چادر اوڑھے ہوئے تھے جو کافی بوسیدہ اور میلی تھی ۔ بالوں نے آگے بڑھ کر ماتھے کو کچھ ڈھانپ سا دیا تھا اور ماتھا کافی چھوٹا معلوم ہوتا تھا ۔ سر ضرورت سے زیادہ چھوٹا نظر آیا ۔ کیا یہی ہیں پریم چند ؟ انھیں صاحب کو سمجھنا ہوگا ۔ اتنی دور سے ، اتنے اشتیاق کے ساتھ میں اس شخص کے نیاز حاصل کرنے یہاں آیا تھا ؟ ایک بار تو جی میں آیا کہ اگر اپنے ذہن میں پریم چند جی کی عظمت کو برقرار رکھنا ہے تو مجھے فوراً وہاں سے لوٹ جانا چاہیئے ۔ پریم چند کے نام پر یہ سامنے کھڑا شخص کس درجہ معمولی ، کس درجہ عام ، کس درجہ دیہاتی تھا ۔

خیر ، میں اوپر پہنچا ۔ سب کام چھوڑ کر پریم چند جی مجھے لے کر بیٹھ گئے ۔ سات بج گئے ، ساڑھے سات بج گئے ، آٹھ ہونے کو آئے ۔ باتوں کا سلسلہ ٹوٹتا ہی نہیں تھا ۔ اس دوران میں میں بہت کچھ بھول گیا ۔ یہ بھول گیا کہ وہ پریم چند ہیں ۔ ہندی ، اردو کے عظیم ادیب ہیں ، یہ بھی بھول گیا ——— کہ میں ادب کے کنارے پر بھونچکا کھڑا ایک معصوم بچہ ہوں ۔ یہ بھی بھول گیا کہ مجھ پر پہلے اس شخص کو دیکھ کر میرے دل میں کچھ ناپسندیدگی سی پیدا ہوئی تھی ۔ دیکھتے دیکھتے میں ایک انتہائی گہری اپنائیت میں گھر کر اوپری سب باتوں کو بھول گیا ۔ ان کے چہرے پر بہت کچھ لکھا تھا جو پڑھنے کے قابل تھا ۔ میں سوچتا ہوں کہ بادام کی میٹھی گری کے لئے کیا یہ نہایت ضروری اور ناگزیر نہیں ہے کہ اس کے اوپر کا چھلکا بہت سخت ہو ۔ اگر ایسا نہ ہو تو بادام کو کبھی بادام بننے کا شرف حاصل نہیں ہو سکتا ۔ اب وہ کسی بھی لباس میں ، کسی بھی رنگ روپ میں ہوتے ، میں ان کے پیر چھوئے بغیر نہ رہ سکتا تھا ۔

اب نو بج چکے تھے باتوں کا سلسلہ برابر چل رہا تھا کہ اندر سے اطلاع آئی کہ ابھی ڈاکٹر کے یہاں سے دوا لا کر نہیں رکھی گئی ایسی بھی کیا مصروفیت ہے ۔ پریم چند جی اٹھ کھڑے ہوئے اور مجھے حاجاتِ ضروری سے فارغ ہونے کو کہہ کر انھیں کپڑوں میں سلیپر پہن کر باہر نکل گئے ۔

میرے دل پر پریم چند جی کی شخصیت کی پہلی چھاپ یہ پڑی کہ یہ شخص جو کچھ بھی ہے اس سے ذرہ برابر مختلف دکھائی دینے کا خواہشمند نہیں ، اس شخص کو اپنے بارے میں صرف اتنا ہی علم ہے کہ لاکھوں کروڑوں انسانوں کی طرح وہ بھی ایک انسان ہے ۔ اس سے زیادہ کچھ ہونے کا یا پلنے کا وہ دعویدار نہ بنے گا ۔

ان دنوں اپنے سرسوتی پریس بنارس سے وہ ہندی ماہنامہ 'ہنس' نکالنے کا فیصلہ کر رہے تھے۔ میں نے پوچھا کہ پریس چھوڑ کر، اپنے گاؤں کا گھر چھوڑ کر یہاں لکھنؤ میں ملازمت کریں، آپ کو ایسی کیا لاچاری ہے؟

میری ان سے یہ پہلی ملاقات تھی۔ ہم میں کوئی برابری نہ تھی۔ اس قسم کے ذاتی سوال کو نامناسب سمجھا جا سکتا تھا لیکن میں کہہ چکا ہوں کہ اس پہلے موقعہ پر ہی ان کے تئیں میں اپنی تمام دوری کھو چکا تھا۔ میں لاکھ چھوٹا سہی لیکن پریم چند جی اتنے بڑے تھے کہ اپنی موجودگی میں وہ مجھے ذرہ بھر بھی اپنے تئیں چھوٹا محسوس نہ ہونے دیتے تھے۔ اس سوال کے جواب میں انھوں نے بلا جھجک اپنی اقتصادی حالت یا یوں کہیے کہ اقتصادی بدحالی کی داستان کہہ سنائی۔ تب مجھے معلوم ہوا کہ یہ پریم چند جو لکھتے ہیں وہ صرف لکھتے ہی نہیں ہیں اس کو مانتے بھی ہیں۔ اس پہ زندہ بھی رہتے ہیں۔ سول نافرمانی کے دنوں میں انھوں نے سرکاری ملازمت چھوڑ دی تھی۔ کچھ دنوں تک تو اسی تحریک میں کام کرتے رہے پھر کچھ دنوں تک کانپور کے ایک اسکول میں پڑھاتے رہے۔ پھر کاشی ودیا پیٹھ میں آئے۔ تحریک اس وقت بہت مدھم پڑ چکی تھی۔ سوچنے لگے کہیں ایسا تو نہیں کہ میں اور میری تنخواہ ودیا پیٹھ پر بار ہو۔ اور یہی سوچ کر اسے بھی چھوڑ دیا۔ اب کیا کریں؟

"میں نے کہا، "آپ کے ہاتھ میں قلم ہے پھر یہ کیسا سوال کہ اب کیا کریں"؟

"نہیں جینندر" انھوں نے کہا "تمہارا خیال درست نہیں ہے۔ یہ ملک ولایت نہیں ہے۔ ولایت بن جائے یہ بھی شاید میں نہیں چاہوں گا۔" پھر بتایا کہ محض لکھنے سے کام نہیں چلتا۔ دل کو بھی تسکین نہیں ہوتی اور اخراجات بھی پورے نہیں ہوتے۔ طبیعت بے چین ہو جاتی ہے۔ پھر کن حالتوں میں سے گذرنا پڑا، یہ بھی سنایا۔ آخر یہاں وہاں سے کچھ پونجی بٹور کر پریس کھولا۔ لیکن بازار والوں سے نپٹنا نہ آتا تھا۔ پریس ایک ایسا لقمۂ سخت بن گیا جو نہ نگلا جاتا تھا نہ اگلتے بنتی تھی۔ اپنا لینا پٹتے نہیں، لینداروں کو دینا بہرصورت پڑے۔ ان حالات میں پریم چند جی ایسے شخص کی حالت ناقابلِ بیان ہو گئی اور کچھ نہ سوجھا تو پریس میں تالا ڈال ادھر بیٹھ گئے۔ پریس چلے نہ چلے، جان کو کب تک گھلایا جائے؟

"اب بتاؤ جینندر" وہ بولے "کیا اس حالت میں بھی نوکری نہ کرتا۔ اب اتنا تو ہے کہ روٹی چل جاتی ہے۔"

کھانے وغیرہ سے فارغ ہو کر انھوں نے مجھ سے پوچھا "کیا دفتر چلو گے؟"

میں چلنے کو پہلے سے تیار تھا۔ جس ڈھنگ سے انھوں نے یکے والے کو پکارا۔ اس کو پٹایا، یکے میں بیٹھے بیٹھے اس کی خیر خیریت پوچھ ڈالی، جس آسانی اور جلدی سے انھوں نے یکے والے سے اپنائیت پیدا کر لی وہ سب لکھنے کی جگہ شاید یہاں نہ ہو لیکن میرے ذہن میں وہ سب کچھ بڑے خوبصورت انداز میں مرتسم ہے۔

راستے میں معاً بولے ——— "کہو جینندر، جیوتش ودیا کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟"

میں نے پوچھا "کیا آپ یقین رکھتے ہیں؟"

بولے "کیا بتاؤں۔ دفتر میں ایک صاحب بہت اچھا ہاتھ دیکھنا جانتے ہیں۔ ان کی بتائی ہوئی کئی باتیں ایسی ٹھیک بیٹھی ہیں کہ میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ پوری ودیا پاکھنڈ ہے۔"

میں نے کہا "اس کا مطلب ہے آپ کو یقین ہے۔ مجھے تو کبھی نہیں ہوا۔"

بولے "اتنے لوگ اتنے زمانے سے پوری ایمانداری کے ساتھ اس کھوج میں لگے ہوئے ہیں۔ ان کے اخذ کیے ہوئے نتائج کو ہم کس طرح نظر انداز کر سکتے ہیں۔"

مجھے یہ سن کر تعجب ہوا۔ میں نے کہا "تو کیا اسی بنا پہ یقین کرنا ہوگا؟ خدا میں تو آپ یقین نہیں رکھتے۔"

پریم چند جی سنجیدہ ہو گئے۔ بولے "جینندر! میں کہہ چکا ہوں۔ میں خدا تک نہیں پہنچ سکتا اس لئے یقین نہیں کر سکتا۔ کیسے یقین کروں، جب میں دیکھتا ہوں کہ بچہ بلک رہا ہے۔ مریض تڑپ رہا ہے۔ یہاں بھوک ہے، افلاس ہے، مصیبتیں ہیں۔ اس صورت میں مجھے یہاں خدا کی حکومت نظر نہ آئے تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔ مشکل تو یہ ہے کہ خدا کو مان کر اسے رحمدل بھی ماننا پڑتا ہے۔ مجھے وہ رحمدلی کہیں نظر نہیں آتی ——— کیا تمہیں خدا پر یقین ہے؟"

میں نے کہا "اس سے بچنے کا راستہ مجھے نظر نہیں آتا۔"

پریم چند جی خاموش ہو گئے۔ ان کی آنکھوں کی پتلیاں گویا جم سی گئیں اور دُور کسی نقطے پر مرکوز ہو گئیں۔

دفتر پہنچ کر ان صاحب کو میرا نمبر دکھایا گیا۔ انھوں نے کافی بحث طلب باتیں کیں۔ میرے لئے یہ کہنا مشکل تھا کہ جو کچھ بتایا گیا ہے وہ درست نہیں ہے۔ دفتر سے لوٹتے وقت پریم چند جی نے پوچھا "کہو! اب کیا کہتے ہو؟"

میں نے کہا "جیوتش بدیا پر میرے یقین کے نہ ہونے کی بات پوچھتے ہیں تو وہ جوں کا توں ہے۔"

یہ سن کر پریم چند جی کو افسوس ہوا۔ اس جواب میں انھیں دوسروں کے تجربوں کی توہین معلوم ہوئی۔ پریم چند جی کے دل میں بنیادی عنصر یعنی خدا کے بارے میں اگرچہ لایقینی تھی لیکن انسان کی تخلیق کردہ سائنس اور اس کے نتائج پر ان کا یقین مستحکم تھا۔ توہین، چاہے وہ کسی قسم کی ہو، اس سے انھیں سخت نفرت تھی۔ وہ کچھ بھی تھے لیکن کٹّر ہرگز نہیں تھے۔ مذہب کی مخالفت لیکن جیوتش بدیا میں ان کا اس قسم کا یقین ——— یہ دونوں چیزیں ایک ساتھ دیکھ کر کبھی کبھی مجھے تجسس بھی ہوا مگر میں نے ان کی زندگی میں ہمیشہ ان دونوں متضاد قسم کے نظریات کو نبھتے دیکھا ہے۔ کئی چھوٹی چھوٹی باتوں کو وہ جوں کا توں مان لیتے تھے اور کئی بڑی بڑی باتوں میں وہ بڑے بے باک اور نڈر مصلح تھے۔

رات کو جب چلنے کی بات آئی تب بولے "تو آج ہی تم چل بھی دو گے۔ میں سمجھتا تھا کچھ روز رہو گے۔"

ان کے الفاظ میں کچھ زیادہ اصرار نہیں تھا۔ اصرار ان کے مزاج میں تھا ہی نہیں۔ کسی کے آنے جانے کی آسانی کے درمیان وہ کبھی اپنی خواہش کو حائل نہیں کرتے تھے۔ کسی کے کام میں خلل انداز ہونے سے وہ ہمیشہ بچتے تھے یہاں تک کہ لوگوں سے ملتے ہوئے بھی انھیں تذبذب ہوتا تھا کہ کہیں وہ ان کا وقت تو ضائع نہیں کر رہے آج کے مشینی دَور میں ان کے مزاج کی یہ خصوصیت بہت ہی بیش بہا تھی، ادب دوستوں کو بھلے ہی یہ پسند نہ آئے۔

پھر ۱۹۳۰ء کی قومی تحریک آگئی جس میں بہت سے لوگ جیل چلے گئے۔ اس دوران میں پریم چند جی نے "ہنس" نکالنا شروع کر دیا تھا۔ یہ خوش قسمتی ہی ہوئی کہ وہ جیل نہیں گئے۔ ان کا جیل سے باہر رہنا زیادہ سخت عبادت تھی۔ جیل میں مجھے جو ان کے خطوط ملے ان سے مجھے معلوم ہوا کہ پریم چند جی کی بدولت مجھے کیا کچھ حاصل ہوا ہے۔ شروع میں ہی پریم چند جی نے اطلاع دی ——— "میری بیوی صاحبہ بھی پکٹنگ کے جرم میں دو مہینے کی سزا پا گئی ہیں۔ کل فیصلہ ہوا ہے۔ ادھر پندرہ دن تک اسی میں پریشان رہا۔ میں جانے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ انھوں نے خود جا کر میرا راستہ بند کر دیا۔"

ان کے خطوط میں ہندی ادب پر بھی خاصی بحث ہوتی تھی اور کچھ اپنے دل کی، اپنے حالات کی اور سُکھ دُکھ کی باتیں بھی ہوتی تھیں۔

ایک خط میں انھوں نے لکھا :-

"..... 'غبن' ابھی تیار نہیں ہوا۔ ابھی سو صفحات اور رہیں گے۔ یہ ایک سماجی واقعہ ہے۔ میں پرانا ہو گیا ہوں اور پرانے طرزِ تحریر کو نبھائے جا رہا ہوں۔ کہانی کو درمیان سے شروع کرنا یا اس طرح شروع کرنا کہ جس سے ڈرامے کا سا انداز پیدا ہو جائے، میرے لئے

مشکل ہے۔"

ان کی اقتصادی حالت کا اندازہ اس خط سے کیجئے :۔

"پیارے جینندر!

تمہارا خط کئی دن کے بعد ملا۔ مجھے امید تھی کہ دہلی (گھر) سے آرہا ہوگا لیکن آیا لاہور (جیل) سے۔ خیر لاہور (جیل) ملتان (جیل) سے کچھ کم دور ہے۔ اس سے کئی دن پہلے میں نے ملتان بھی ایک خط بھیجا تھا شاید وہ لوٹ کر آگیا ہو۔ تمہیں مل گیا ہو۔ اچھا میری کہانی سنو۔ 'ہنس' کی ضمانت مانگی گئی۔ میں سمجھا تھا آرڈیننس کے ساتھ ضمانت بھی ختم ہو جائے گی لیکن نیا آرڈیننس آگیا اور اس کے ساتھ ضمانت بھی بدستور قائم رہی۔ جون اور جولائی کا شمارہ ہم نے چھاپنا شروع کر دیا ہے لیکن جب منیجر صاحب نیا ڈیکلیریشن دینے گئے تو مجسٹریٹ نے رسالہ جاری کرنے کی اجازت نہ دی۔ اگر ضمانت اٹھ گئی تو رسالہ فوراً نکل آئیگا۔ چھپ، کٹ، سل کر تیار رکھا ہے۔ اگر اجازت نہ ملی تو معاملہ ٹیڑھا ہو جائے گا میرے پاس نہ روپے ہیں نہ پرامیسری نوٹ نہ سکیورٹی۔ کسی سے قرض لینا نہیں چاہتا۔ یہ سال کا آغاز ہے چار پانچ سو وی۔پی جاتے تو کچھ روپے ہاتھ آتے۔ لیکن اب شاید ایسا نہیں ہو سکے گا۔

"اس دوران میں میں نے "جاگرن" (ایک رسالہ) لے لیا ہے۔ 'جاگرن' کے بارہ شمارے نکلے لیکن خریداروں کی تعداد دو سو سے آگے نہ بڑھی۔ اشتہار تو ویاس جی نے بہت کیا لیکن کسی وجہ سے رسالہ نہ چلا۔ انہیں اس پر لگ بھگ پندرہ سو کا گھاٹا رہا۔ وہ رسالے کو بند کرنے جا رہے تھے، مجھ سے بولے اگر آپ اسے نکالنا چاہیں تو لے لیں۔ میں نے اسے لے لیا۔ ہفتہ وار اخبار کی صورت میں نکالنے کا ارادہ ہے۔ پہلا شمارہ اس جنم اشٹمی سے شائع ہوگا۔ تمہارا ارادہ بھی ایک ہفت روزہ اخبار نکالنے کا تھا۔ یہ سب سامان تمہارے ہی لئے ہے۔ میں جب تک اسے چلاتا ہوں اس کے بعد یہ تمہاری ہی چیز ہو گی سرمائے کا فقدان ہے۔ 'ہنس' میں کئی ہزار کا گھاٹا اٹھا چکا ہوں لیکن ہفتہ وار اخبار نکالنے کے لالچ کو نہ روک سکا۔ کوشش کر رہا ہوں کہ اخبار عوام الناس کے رجحانات کا آئینہ دار ہو۔ اس کام میں بھی ہزاروں کا گھاٹا ہوگا لیکن کیا کروں یہاں تو زندگی ہی ایک مسلسل گھاٹا ہے۔"

ایک گلے کا خط دیکھئے :۔

پیارے جینندر!

آداب عرض! بھئی واہ۔ مانتا ہوں۔ جون گیا، جولائی گیا اور اگست کا مہینہ بھی جانے والا ہے۔ لیکن حضور کو یاد ہی نہیں۔ کیوں یاد آئے۔ بڑا آدمی ہونے میں یہی تو عیب ہے روپیہ تو ابھی کہیں سے ملے نہیں لیکن شہرت تو مل ہی گئی ہے اور شہرت یافتہ شخص سرمایہ دار شخص سے کم بھلکڑ اور مغرور نہیں ہوتے۔

اچھا دل لگی چھوڑو۔ یہ بات کیا ہے؟ تم کیوں مجھ سے تنے بیٹھے ہو۔ نہ کہانی بھیجتے ہو نہ خط۔ کہانی نہ بھیجو خط تو بھیجتے رہو۔ میں تو ادھر بہت پریشان رہا۔ یاد نہیں آرہا کہ پہلے بھی یہ داستان لکھ چکا ہوں یا نہیں۔ بیٹی کے یہاں بچہ پیدا ہوا اور زچگی میں ہی اسے بخار نے جکڑ لیا۔ مرتے مرتے بچی۔ ابھی تک نیم جان ہے۔ بچہ بھی کسی طرح بچ گیا ہے۔ آج بیس روز ہوئے یہاں آگئی ہے۔ اس کی ماں بھی دو مہینے اس کے ساتھ رہی۔ میں تنہا رہ گیا تھا۔ بیمار پڑا، دانتوں میں تکلیف ہوئی مہینوں اس میں لگے دست آئے اور ابھی تک کچھ نہ کچھ شکایت باقی ہے۔ دانتوں کے درد سے بھی پنڈ نہیں چھوٹا۔ بڑھاپا بذات خود

[illegible]

[illegible] ENTERTAINMENT VALUE [illegible] POPULARITY

[illegible]

ان کا ایک فلم بنا تھا "مزدور" اس کا ذکر کرتے ہوئے ایک خط میں لکھا :-

" مزدور تمہیں پسند نہ آیا، یہ میں جانتا تھا۔ میں اسے اپنا کہہ بھی سکتا ہوں اور نہیں بھی کہہ سکتا۔ اس کے بعد ہی ایک رومانس آرہا ہے وہ بھی میرا نہیں ہے، میں اس میں بہت تھوڑا سا ہوں۔ فلم میں ڈائرکٹر ہی سب کچھ ہوتا ہے۔ ادیب قلم کا بادشاہ ہی کیوں نہ ہو، یہاں ڈائرکٹر کی عملداری ہے اور اس کے راج میں ادیب کی حکومت نہیں چل سکتی۔ وہ یہ کہنے کی جرأت نہیں رکھتا کہ "میں عوام کے رجحانات کو جانتا ہوں آپ نہیں جانتے" اس کے برعکس ڈائرکٹر بڑے زور سے کہتا ہے "میں جانتا ہوں عوام کیا چاہتے ہیں اور ہم یہاں عوام کی اصلاح کرنے نہیں آئے ہیں۔ ہم نے کاروبار کھولا ہے، دولت کمانا ہماری غرض ہے۔ جو چیز عوام مانگیں گے وہی ہم دیں گے" اس کا جواب یہی ہے "اچھا صاحب ہمارا سلام قبول کیجئے، ہم گھر جاتے ہیں" وہی میں کر رہا ہوں۔ مئی کے آخر میں بنده بنارس میں بیٹھا ناول لکھ رہا ہوگا۔ اس کے علاوہ مجھ میں کسی نئے فن کو نہ سیکھ سکنے کی بھی ضعف ہے۔ فلم لائن میں میرے دل کو اطمینان نہیں مل سکا۔ اطمینان ڈائرکٹروں کو بھی نہیں ملتا لیکن وہ اور کچھ نہیں کر سکتے جھک مار کر پڑے ہیں۔ میں کچھ اور کر سکتا ہوں چاہے وہ بیگار ہی کیوں نہ ہو اس لئے چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ میں جو پلاٹ سوچتا ہوں اس میں آدرش واد گھس آتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اس میں ENTERTAINMENT VALUE نہیں ہے۔ اسے میں تسلیم کرتا ہوں۔ مجھے لوگ بھی ایسے ملے جو نہ ہندی جانیں نہ اردو۔ انگریزی میں ترجمہ کر کے انہیں کہانی کا مفہوم سمجھانا پڑتا ہے ورنہ کام کچھ نہیں بنتا۔ میرے لئے وہی پرانی لائن مرنے کی ہے۔ جو چاہا لکھا۔"

اس طرح فلم لائن سے کنارا کر کے انھیں واپس آنا پڑا۔ اس کے بعد وہ کچھ زیادہ دنوں تک زندہ نہیں رہے۔

مرنے سے ایک سوا مہینہ پہلے کی بات ہے۔ پریم چند جی چارپائی پر پڑے تھے۔ مرض بڑھ گیا تھا، چل پھر نہیں سکتے تھے۔ لیکن چہرے پر مکمل سکون تھا۔

ایسی حالت میں ایک دن انھوں نے کہا "جینندر! لوگ ایسے وقت میں خدا کو یاد کیا کرتے ہیں۔ مجھے بھی خدا یاد دلایا جاتا ہے لیکن ابھی تک مجھے خدا کو تکلیف دینے کی ضرورت معلوم نہیں ہوئی۔"

الفاظ آہستہ آہستہ بڑی دلجمعی سے کہے گئے تھے اور میں اس انتہائی مطمئن دہریے درویش کی طاقت پر حیران تھا۔

موت سے ایک رات قبل بھی میں ان کی کھاٹ کے برابر بیٹھا تھا۔ صبح سات بجے انھیں اس دنیا سے اٹھ جانا تھا۔ اسی سویرے تین بجے مجھ سے باتیں ہوئیں۔ چاروں طرف گہرا سناٹا تھا۔ سب سوئے پڑے تھے۔ الفاظ ان کے منہ سے بھسپھسا کر نکل جاتے تھے۔ کانوں سے زیادہ انھیں دل سے سننا پڑتا تھا۔ رات کے بارہ بجے "ہنس" کی باتیں ہوتی رہی تھیں۔ اپنی امیدوں اور تمناؤں کو وہ کچھ الفاظ کے ذریعے اور کچھ آنکھوں کے ذریعے مجھ پر ظاہر کر چکے تھے۔ "ہنس" کی اور ادب کی فکر انھیں اس وقت بھی کھائے جا رہی تھی۔ اپنے بچوں کا مستقبل بھی ان کے ذہن پر بار بنا ہوا تھا۔ مجھ سے انھیں کچھ ڈھارس تھی۔

اب تین بجے رات کے وقت میں ان کے پھولے ہوئے ہاتھ کو، جسے انھوں نے واپس نے کو کہا تھا، اپنے ہاتھ میں لے کر سوچ رہا تھا کہ کیا مجھ سے جو ان کی ڈھارس ہے وہ سچ ہے؟ رات کے بارہ بجے میں نے ان سے کچھ بحث کرنے کی زیادتی بھی کی تھی۔ وہ کانٹا میرے دل میں کھٹک رہا تھا —— کیا کہوں؟ کیا کروں؟

اتنے میں پریم چند جی بولے —— "جینندر!"

اور یہ کہہ کر خاموشی سے میری طرف دیکھنے لگے۔ میں نے ان کے ہاتھ کو دونوں ہاتھوں سے دبایا۔ ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "آپ کچھ فکر نہ

کیجیے بابوجی۔ آپ جلد اچھے ہو جائیں گے پھر کام کرنے کے لئے ہم سب لوگ موجود ہی ہیں۔"

تھوڑی دیر تک خاموش رہنے کے بعد یکایک وہ بولے "آدرش سے کام نہیں چلے گا۔۔۔"

میں نے کہنا چاہا۔۔۔۔ "آدرش۔۔۔۔۔۔"

"بحث نہ کرو" اور یہ کہہ کر انھوں نے کروٹ بدل کر آنکھیں بند کر لیں۔

اس وقت میرے دل پر لاچاری کا ایک ناقابلِ برداشت بار آپڑا۔ اس وقت پریم چند جی کو طرح طرح کی پریشانیاں گھیرے ہوئے تھیں میں یا کوئی اور ان پریشانیوں کو کسی طرح نہ بٹا سکتا تھا۔ پریشانیوں کا مرکز یہی تھا کہ "ہنس" کیسے چلے گا؟ نہیں چلے گا تو کیا ہوگا؟ "ہنس" کے لئے جینے کی اس وقت بھی انھیں حسرت تھی اور "ہنس" نہ جیئے گا یہ تصور ان کے لئے ناقابلِ قبول اور ناقابلِ برداشت تھا۔ "ہنس" کے لئے اس وقت نہ جانے وہ کس دھن میں کیا کیا کرنے کو تیار رہتے۔

میری خواہش تھی کہ ان سے کہوں ——— "ہنس" نہیں مرے گا۔ وہ جیئے گا۔ وہ آپ کا رسالہ ہے پھر وہ کس طرح جھک سکتا ہے" لیکن میں کچھ بھی نہ کہہ سکا اور کوئی تسلی اس شہنشاہِ ادب کو تسکین نہ پہنچا سکی۔

تھوڑی دیر بعد بولے ——— "گرمی بہت ہے پنکھا کرو۔"

میں پنکھا کرنے لگا۔ انھیں نیند نہ آتی تھی۔ تکلیف بے حد تھی لیکن کراہتے نہیں تھے، چپ چاپ آنکھیں کھولے پڑے تھے۔

دس پندرہ منٹ بعد بولے "جاؤ جینندر، سو رہو۔"

کیا معلوم تھا کہ اب صرف چند گھڑیاں باقی ہیں۔ میں جا کر سو رہا۔

صبح ہوتے ہوتے انھیں ایسا غش آیا کہ پھر دوبارہ ہوش میں نہ آئے۔

پریم چند کو گئے اب اٹھارہ برس ہونے ہیں لیکن دل کو یہ سمجھانا مشکل ہے کہ وہ اب جنت کے ہیں، ہمارے سماج اور زمانے کے نہیں رہے۔ سچ تو یہ ہے کہ انھیں اٹھا کر موت نے غلطی ہی کی ہے۔ نہ ان کی عمر اس قابل تھی نہ کسی طرح وہ وقت سے پیچھے تھے۔ تھے تو ایک قدم آگے تھے اور موجودہ حالات میں شاید وہ پہلے سے بھی زیادہ صحیح اور ضروری ثابت ہوتے۔

---

* اور ہاں محمود صاحب نے مجھے لکھا ہے کہ وہ آپ کو میرے پاس یاد دہانی کے لئے بھیجیں گے۔ میں اگر تندرست ہوتا تو خود اُنھیں لکھتا لیکن یہ اچھا ہوا کہ آپ آگئے۔ آپ اُنھیں لکھ دیں کہ میں اُن کے متعلق اچھی رائے کا اظہار کر دوں گا۔"

میں نے دیکھا کہ بغل کے پھوڑے اور بخار کی تکلیف اِس قدر زیادہ ہے کہ آسانی سے پہلو بھی نہیں بدل سکتے۔ یہ ۱۹۴۶ء کا ذکر ہے۔ عمر ساٹھ سال سے متجاوز ہو چکی تھی لیکن اِس حالت میں بھی احباب اور نیاز مندوں کے نقائص چُھپانے کے لئے نہ صرف آمادہ تھے بلکہ بیتاب تھے۔ یہ اُن کے اخلاق کا ایک پہلو تھا۔

شیخ صاحب لندن میں وزیرِ ہند کے مشیر تھے جب پہلی دفعہ راقم کو اُنھیں قریب سے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ یہ ۱۹۳۷ء کی بات ہے۔ اُردو سے محبت رکھنے والے حلقوں میں ہندوستان اور بیرونِ ہندوستان میں ایسا کوئی فرد نہ تھا جو شیخ صاحب کو نہ جانتا ہو۔ لیکن اُن سے ملنے کے بعد یہ حقیقت کھُلی کہ وہ نہ صرف اُردو کے عظیم المرتبت ادیب اور غدا کار تھے بلکہ اپنی ممتاز شخصیت کے اعتبار سے ایک لاثانی انسان تھے۔ اپنے عہد کے اُن بزرگوں میں اُن کا مرتبہ بہت بلند تھا جنھوں نے مشرقی اور مغربی تہذیب کے محاسن کو اپنے اندر خوش اسلوبی سے جذب کیا تھا۔ وہ مشرقی اور مغربی طرز کے اجتماعات میں اپنے اِس وصف کی وجہ سے ہمیشہ ممتاز ترین جگہ پیدا کر لیتے۔

۲۹ جُولائی ۱۹۳۸ء کو لندن میں سر فیروز خان نون کے مکان پر پنڈت جواہر لال نہرو کے اعزاز میں دوپہر کا کھانا دیا گیا۔ کھانے پر سر ظفر اللہ خان، نائب وزیرِ ہند سر فنڈلیٹر سٹوآرٹ اور وزیرِ ہند کے پارلیمنٹری سکرٹری کرنل میور ہیڈ کے علاوہ سر عبدالقادر بھی مدعو تھے۔ سر فنڈلیٹر نے کھانے پر بیٹھتے ہوئے سر عبدالقادر کے ایک چٹکی لی۔ اور کہا :-

" سر عبدل میں نے سُنا ہے آپ کے ہاں ابھی تک لوگ ہاتھ سے کھانا کھاتے ہیں !" (مراد یہ تھی کہ چھچہ اور کانٹا استعمال نہیں کرتے)۔

سر عبدالقادر ایک لمحہ کے لئے مسکرائے اور پھر فوراً بول اُٹھے "بالکل اُسی طرح جیسے حضرت عیسیٰؑ اور موسیٰؑ کھاتے تھے !"

اس پر ایک قہقہہ پڑا اور سر فنڈلیٹر اپنا سامنہ لے کے رہ گئے۔ یہ جولائی ۱۹۳۸ء کی بات ہے۔ میرے پاس اِس موقعہ کی اپنی کھینچی ہوئی تصویر ہے۔ کبھی حالات مساعد ہوئے تو یہ شائع کر دوں گا۔

مجلسی انسان کی حیثیت سے شیخ صاحب نوادر میں سے تھے۔ وہ گھنٹوں آپ کو اپنی زندگی کے وہ واقعات سُناتے رہتے جن میں اُن کے اپنے کردار کی اہمیت نمایاں طور پر نظر آنے لگتی لیکن اُن کا اندازِ بیان اِس قدر شگفتہ اور اظہارِ تفاخر سے مبرا ہوتا کہ آپ یہ واقعات سُنتے ہوئے نہ تو اُکتاتے اور نہ یہ محسوس کرتے کہ شیخ صاحب اپنی عظمت سے آپ کو متاثر کرنا چاہتے ہیں۔

اُن کی آخری علالت نے طوالت اختیار کی تو مجھے یہ شبہ ہونے لگا کہ شاید اُن کی کہولت باوصف پامردی بیماری سے جانبر نہ ہو سکے۔ اور ایک دن میں نے اپنے اندیشہ کا ذکر کچھ اِس طرح کیا، آپ جیسی بزرگ ہستیاں یُوں تو دُنیا میں نادر ہیں لیکن ہمارے معاشرے میں اِن کی جو کمی ہے، وہ اظہر من الشمس ہے۔ اور اب جبکہ ہم خود عمر کے اُس حصّے سے گزر رہے ہیں جہاں شباب بڑھاپے سے دست و گریباں ہے تو اکثر یہ احساس ہوتا ہے کہ اچھے اچھے لوگ جتنے تھے شاید ختم ہو گئے۔ اور پھر میں نے اپنے مرحوم اُستاد محمود شیرانی کا ذکر چھیڑا اور کہا کہ اُن کی موت سے جو نقصان ہوا اُس کی تلافی ناممکن ہے۔ بجائے میرے اندیشہ کو کیسے بھانپ گئے۔ بولے "باقر صاحب! اچھے آدمیوں کے روز بروز فقدان کا احساس سوجھ بوجھ والے انسانوں کو ہمیشہ دامنگیر رہا ہے۔ لیکن حقیقت یُوں نہیں۔ اچھے اور بڑے آدمی ہمیشہ ہی پیدا ہوتے رہے ہیں اور مرتے بھی رہے ہیں۔ مجھے یاد ہے جب میں ملازمت کے سلسلے وزیرِ ہند کا مشیر ہو کر دوبارہ لندن میں قیام کے لئے پہنچا۔ تو میں نے بھی ایک دن کھانے پر بیٹھے ہوئے اِسی خدشہ کا اظہار مالکِ مکان کے صاحبزادہ سے کیا، اور کہا۔ "مجھے کچھ یوں محسوس ہوتا ہے کہ جب میں کئی سال پہلے یہاں طالب علم کی حیثیت سے آیا تھا تو انگریزوں کی قوم میں بہت بڑے بڑے آدمی تھے جن کی تعداد اب نسبتاً بہت کم

"COME RIGHT IN" (سیدھے اندر چلے آیئے) بیگم مجھے گول کمرہ میں لے گئیں۔ میں نے دیکھا کہ وہاں دو تین اور ہندوستانی نوجوان سمٹے سمٹائے بیٹھے ہوئے ہیں اور باقی کمرے میں چند انگریز لڑکیوں کا ہجوم ہے جن کے درمیان سر عبدالقادر بیٹھے ہوئے لطیفے سنا رہے ہیں اور گپ شپ ہو رہی ہے۔ میرا تعارف حاضرین سے کرایا گیا اور میں بھی ہندوستانی نوجوانوں کے ساتھ بیٹھ گیا۔ شاہ صاحب سے ملاقات ہوئی معلوم ہوا کہ ہندوستانی نوجوان بھی میری طرح سے نو وارد ہیں۔ انگریزی بولنے سے بھی خائف ہیں۔ انگریزوں کے بقول

THEY HAD NOT FOUND THEIR FEET

یعنی ابھی لندن میں اُن کے قدم نہیں جمے تھے۔ چائے بڑی پُر تکلف اور بڑے پیمانے پر دی گئی۔ اور اس مخلصانہ انداز میں پیش کی گئی کہ میں اور میرے نو وارد ہندوستانی شاہ صاحب اور اُن کی بیگم کا شکریہ ادا کرنے کے لئے اپنے پاس الفاظ نہیں پاتے تھے۔ شام کے قریب چائے ختم ہوئی تو ہم نے رخصت چاہی۔ اس موقعہ پر مہمان لڑکیوں نے منزل اور راستہ کے متعلق استفسار شروع کر دیئے۔ میں چونکہ سر عبدالقادر کے ساتھ واپس آنا چاہتا تھا اس لئے میں نے فوراً کہہ دیا۔ میں سر عبدالقادر کو اُن کے مکان پر چھوڑنے جاؤں گا۔ لیکن اس سے پہلے میرے پاس بیٹھی ہوئی لڑکی نے نہایت مشفقانہ انداز میں مجھ سے میرا کارڈ، گھر کا پتہ اور ٹیلیفون کا نمبر لے لیا تھا۔ اور یہ وعدہ بھی لے لیا تھا کہ ہم پھر بھی ملیں گے۔ چنانچہ میں اور سر عبدالقادر رخصت ہونے کے لئے اُٹھے تو ہندوستانی نوجوان بھی اُٹھ کھڑے ہوئے لیکن اس طرح کہ شاہ صاحب کی تجویز پر ان لڑکوں نے اُن لڑکیوں کو اُن کے گھر تک پہنچانے کا فرض اپنے ذمہ لے لیا جو اُن کی سمت میں جا رہی تھیں۔ راستہ میں شاہ صاحب کا مخلصانہ سلوک اور چائے زیرِ بحث رہی۔ لیکن ایک بات سمجھ میں نہ آئی کہ شاہ صاحب نے میرا پتہ کیسے معلوم کیا تھا اور چائے کی تقریب کا سلسلہ کیا تھا۔ میں نے سر عبدالقادر سے اپنی اُلجھن کا ذکر کیا تو کہنے لگے۔ چند دن اور انتظار کریں آپ کو معلوم ہو جائے گا۔ میں خاموش ہو گیا۔

بات آئی گئی ہوئی۔ آئندہ جمعہ کو جب ہم مسجد میں جمع ہوئے تو میں نے دیکھا کہ اُن دو ہندوستانی لڑکوں کے ساتھ اُن کی دو دوست لڑکیاں بھی ہیں جو شاہ صاحب کی چائے پر ملے تھے۔ آج اُن کا میاں پن ختم ہو چکا تھا۔ اور وہ بڑی بے باکی سے ہر ایک سے مل رہے تھے۔ اور اپنی دوستوں کا تعارف ملنے والوں سے کرا رہے تھے۔ مجھ سے بھی تعارف کرایا گیا تو لڑکیوں نے کہا۔ آپ بھول گئے شاہ صاحب کے ہاں چائے پر آپ سے ملاقات ہو چکی ہے۔ فوراً مجھے یاد آگیا کہ یہ صحیح کہہ رہے ہیں۔ نماز کے بعد مسجد میں چائے اور حالاتِ حاضرہ پر تبصرہ کرنے کے لئے ہم کچھ دیر بیٹھے رہتے تھے۔ لندن میں بہت دیر سے مقیم ایک دوست سے میں نے برسبیلِ تذکرہ شاہ صاحب کی چائے کا ذکر کر دیا۔ پہلے تو وہ چند لمحے میری طرف حیران ہو کر دیکھتے رہے پھر بولے "تو آپ بھی اُن کے ہاں سے ہو آئے؟" میں نے کہا "سر عبدالقادر سے مشورہ کر کے گیا تھا۔" دوست بولے "وہ بزرگ آدمی ہیں۔ اور آپ کو تو شکار کرنے کے لئے بلایا گیا تھا۔" میں نے تفصیل پوچھی تو اس دوست نے کہا "بیگم شاہ کا تو یہ کاروبار ہے۔ کہ وہ آوارہ لڑکیوں کو اپنے ہاں بلاتی ہیں۔ اور نو وارد ہندوستانیوں سے اُن کا تعارف کرا کے پیسے کماتی ہیں۔" میں نے کہا "لیکن ہم سے تو کسی نے پیسے وصول نہیں کئے۔ بلکہ ہم تو نہایت عمدہ چائے مفت پی کر چلے آئے۔" دوست کہنے لگا "آپ اتفاقیہ طور پر بچ گئے جو سر عبدالقادر کے ساتھ واپس چلے آئے۔ ورنہ آپ کو بھی کسی لڑکی کو اُس کے گھر پہنچانا پڑتا۔ اور راہ و رسم کا آغاز یہیں سے ہوتا۔ پھر یہ لڑکی آپ کے گلے کا ہار ہو جاتی اور آپ سے جو کچھ بٹورتی اُس میں بیگم شاہ کا حصہ ہوتا۔" میں یہ سن کر حیران رہ گیا۔ لیکن یہ خیال تشویش انگیز تھا کہ اگر سر عبدالقادر کو یہ سب کچھ معلوم تھا تو وہ وہاں کیوں تشریف لے گئے اور پھر مجھے اُنھوں نے کیوں نہ روکا۔ چند اور لوگوں سے بھی یہ ذکر آیا تو اُنھوں نے بھی بیگم شاہ کے دلچسپ کاروبار کی تصدیق کی۔ چنانچہ آئندہ ملاقات پر میں نے سر عبدالقادر سے سارا قصہ کہہ سنایا اور اپنے خدشات اُن کی خدمت میں پیش کئے۔ کہنے لگے۔ میری ان شاہ صاحب سے اُس وقت کی ملاقات ہے۔ جب میں صرف عبدالقادر تھا۔ نہ سر عبدالقادر تھا نہ وزیرِ ہند کا مشیر۔ مجھے اِن کے کاروبار کا بھی علم ہے لیکن میں اپنے قدیم مراسم کے پیشِ نظر ان کی چائے کو رد نہیں کر سکتا۔ دوسرے مجھے اُن کی نجی زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔ ہمارے راستے الگ الگ ہیں

نہ جانے یہ میاں بیوی کس خیال سے مجھے بلاتے ہیں۔ اور میں ان کے ہاں پہنچ جاتا ہوں۔ اور پھر زیر لب مسکراتے ہوئے کہا "آپ کو بلانے کا تو ایک مقصد تھا۔ اور اسی لئے انھوں نے انڈیا ہاؤس سے نو واردوں کی فہرست منگوا کر اس میں سے آپ کا نام منتخب کیا تھا۔ میں نے عرض کیا۔ "اگر حضور کو یہ سب کچھ معلوم تھا تو آپ نے مجھے ایسی جگہ پر جانے سے کیوں نہ روکا۔" کہنے لگے" یہ شاہ صاحب نے مجھے بعد میں بتایا کہ انھوں نے آپ کا پتہ کہاں سے لیا تھا۔ اُس وقت مجھے معلوم نہیں تھا۔ لیکن آپ متاہل آدمی ہیں اور میرا خیال ہے کہ آپ کے وہاں جانے میں کوئی قباحت نہ تھی، کیونکہ میرے اندازے کے مطابق آپ خطرے کی لکیر سے باہر تھے۔" اس پر شیخ صاحب نے پھر ایک روایتی قہقہہ لگایا۔ اور میں یہ سوچ کر خاموش ہوگیا کہ اتنا بڑا آدمی درویش مزاج بھی ہے اور اس حد تک کہ کوئے بدنامی سے بھی خائف نہیں۔

مزاح کا صحیح مفہوم سمجھنے کی اہلیت عوام میں کم ہے لیکن خواص میں بھی گنے چنے آدمی اس کی حدود کی پابندی بہرحال اپنے اوپر فرض سمجھتے ہیں۔ شیخ سر عبدالقادر کو میں نے ہمیشہ اس سلسلے میں مزاح کی نازک اور لطیف حدود کی پابندی کرتے ہوئے دیکھا۔ ڈاکٹر شاکر محمدی کے ہاں دعوت تھی۔ ان لوگوں کے علاوہ مرحوم عبدالرحمٰن صدیقی (جو اس وقت کلکتہ کے میئر تھے اور بعد میں بنگال کے گورنر بھی ہوئے) چوہدری خلیق الزمان۔ سر عبدالقادر اور علی گڑھ کے ایک نوجوان پروفیسر بھی مدعو تھے۔ ڈاکٹر شاکر محمدی لندن سے اتنے فاصلے پر رہتے تھے کہ ہمیں اُن تک پہنچنے کے لئے اُس گاڑی میں بھی سفر کرنا پڑا جو زمین کے اوپر چلتی ہے۔ ورنہ لندن میں سفر تو زیر زمین ہی ہوتا ہے۔ ڈاکٹر محمدی کی بیگم جرمن خاتون تھیں اور انگریزوں کی بہ نسبت زیادہ خلوص اور کشادہ پیشانی سے پیش آئیں۔ شام کے کھانے کے بعد ہم کافی دیر تک اُن کے ہاں بیٹھے رہے۔ اور چونکہ میزبانوں کا اصرار ہندی اور جرمن تپاک کا متحدہ نمونہ تھا اس لئے ہم وہاں سے واپس آنے کی خواہش کرنے کے باوجود جلدی رخصت نہ ہوسکے۔ علی گڑھ سے تازہ وارد پروفیسر بھی ہماری طرح لندن واپس آنے کے لئے بیتاب تھے۔ بالآخر انھوں نے کہا "صاحب میری لینڈ لیڈی کی ہدایت ہے کہ شام کو مکان پر جلدی پہنچ جایا کرو۔ اس لئے میں اجازت چاہتا ہوں۔" سر عبدالقادر فوراً بول اُٹھے "پروفیسر صاحب ہمیں بھی لندن تو واپس پہنچنا ہے، لیکن لینڈ لیڈی سے ہم خائف نہیں ہوسکتا ہے کہ آپ سے کسی اور نے بھی یہی تقاضا کر رکھا ہو۔" اس پر معنی اور لطیف مزاح کے حامل جملہ سے ایک قہقہہ پڑا۔ اور ہم سب رخصت ہونے کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے۔

شیخ صاحب مجلسی اعتبار سے منفرد شخص تھے۔ اُن کی وفات سے مجلسی حلقوں میں ایک ایسا خلا پیدا ہوچکا ہے جو شاید کبھی پر نہ ہو۔ میں نے اُن سے علمی اور ادبی مباحث میں بہت کچھ سیکھا۔ وہ بڑی شفقت سے کبھی کبھی میری کوتاہیوں کی طرف بھی توجہ دلاتے لیکن اُن کی شفقت اُس وقت عروج پر ہوتی تھی جب وہ قدردانہ انداز میں ازراہ لطف و کرم اُن بڑے آدمیوں سے میرا تعارف کراتے جو اُن کے سامنے ادب و احترام سے جھکے رہتے ہوتے تھے۔ اس وقت میں اپنی بے مائگی کے شدید احساس کے باوجود اپنی سرافرازی پر ناز کرتا۔ اور بعد میں اُن سے کہہ بھی دیتا کہ اس بڑے آدمی کے سامنے مجھ جیسے ہیچمدان اور بیکس آدمی کو آپ نے اس طرح پیش کرکے مجھ پر تو آپ نے احسان کیا لیکن یہ صاحب دل میں کیا کہتے ہوں گے۔ وہ اکثر مسکرا کر جواب دیتے "عظمت کی راہیں نرالی ہیں۔ کون جانے ان میں سے کتنے آدمی میرے کسی تعارف کا حوالہ دے کر تمہارے پاس اپنی مطلب براری کے لئے پہنچیں۔" اور میں یہ دعا سن کر اُن کے احسانِ عظیم کے نیچے دب کر خاموش ہوجاتا۔

سر عبدالقادر کے پاس ایک وسیع اور گراں قدر کتاب خانہ تھا۔ اُن کی ساری زندگی مطالعہ میں گزری۔ وہ اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں بے تکان گفتگو کرسکتے تھے اور دونوں زبانوں کے ادیب تھے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اُن کی انگریزی اور ادبی کاوشوں کا ایک تفصیلی جائزہ لیا جائے۔ یہ بات سب کو معلوم ہے کہ انھوں نے اپنی عمر میں بہت سے ادبا اور شعرا کی حوصلہ افزائی کرکے اُن کی تربیت

[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

سکتا اور وہ تو یقیناً مجھ سے کبھی متعارف نہ ہوتے۔

میراجی کا نام میں نے رسالہ ادبی دنیا میں پہلی مرتبہ ۱۹۳۹ء میں دیکھا۔ میں ایک نظم کے نیچے لکھا ہوا دیکھا۔ لاہور کے اکثر ادیبوں کو میں ذاتی یا غائبانہ طور پر جانتا تھا۔ چونکہ یہ نام میرے لئے بالکل نیا تھا اس لئے میں نے اس سے یہی اندازہ لگایا کہ یہ شاید کوئی ہندو خاتون ہیں جنھیں ہندی اُردو الفاظ کی آمیزش سے ہندی یا فارسی بحروں میں شعر کہنے کا بہت اچھا ذوق ہے۔ اس کے بعد بھی میں نے اسی نام کے ساتھ کئی اور نظمیں دیکھیں اور میں سمجھا کہ مجلّہ ادبی دنیا نے کہیں سے ایک اچھی ہندو شاعرہ کو ڈھونڈ نکالا ہے۔ چند ماہ بعد میں ایک دن گیلانی پریس لاہور کے سامنے سے گزر رہا تھا کہ بشیر ہندی کسی سے باتیں کرتے ہوئے نظر آگئے۔ انھوں نے مجھے آواز دے کر روک لیا اور ہم کچھ عرصے کے لئے ادھر اُدھر کی گپ میں مصروف ہو گئے۔ میں چونکہ ان صاحب کے عقب کی طرف سے وارد ہوا تھا جن سے ہندی میری آمد سے قبل مصروفِ کلام تھے۔ اس لئے مجھے ان کی طرف دیکھنے کا دھیان نہ رہا۔ میری بے توجہی سے متأثر ہو کر ہندی نے پوچھا تم اِن ذاتِ شریف کو نہیں جانتے؟ میں نے پلٹ کر ان صاحب پر نظر ڈالی اور انھوں نے میری طرف دیکھا اور پھر ہم جلدی جلدی ایک دوسرے کا جائزہ لینے لگے۔ ایک ساعت جو مشاہدے اور غور کے لئے ہمیں ملی اس میں میں نے دیکھا کہ یہ حضرت اپنے حُلیے کی وجہ سے بھارت ماتا کے ان سپوتوں کا نمونہ تھے جن پر ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی بیک وقت سبھی کچھ ہونے کا شبہ گزرتا تھا۔ سر پر سادھوؤں کی تقلید میں لمبے لمبے اُلجھے ہوئے چپٹ بیٹھے بال۔ چہرے پر چینی طرز کی نیچے کو لٹکی ہوئی مونچھیں۔ گلے میں ایک طرف کو بڑی سی گلوری نیچے پیک سے لتھڑی ہوئی باچھیں۔ جسم پر مٹی، کتھے اور سیاہی کے دھبّوں سے اَٹی ہوئی ایک بوسیدہ سی شیروانی۔ اس کے نیچے ٹخنوں سے اوپر تک اٹھی ہوئی مُہری کی میلی کچیلی پتلون، اس سے اور نیچے ایک گندا سا خستہ حال فل بوٹ۔ اور پھر ہاتھ میں ایک ٹوٹی پھوٹی سائیکل۔ اور ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ یہ صاحب کس مذہب اور پیشے سے متعلق ہو سکتے ہیں کہ ہندی نے میرے استعجاب کو رفع کرتے ہوئے کہا: "یہ میراجی ہیں"۔

کئی مہینے گذر گئے۔ پھر ایک دن میں اعجاز بٹالوی کی دعوت اور اصرار پر حلقۂ اربابِ ذوق میں شرکت کے لئے جا نکلا۔ حلقہ ابھی نیا نیا وجود میں آیا تھا۔ اس زمانے میں اس کے اجلاس ایبٹ روڈ پر نشاط سینما کے بالمقابل ایک دو منزلہ مکان کے نچلے حصے میں ہُوا کرتے تھے۔ اور اس کے ارکان مقامی کالجوں کے وہ چند ادب پسند طلبہ تھے، جو آج ہمارے نوجوان ادیبوں کی صف میں ممتاز جگہ پر نظر آتے ہیں۔ یہ شاید حلقے کا تیسرا یا چوتھا اجلاس تھا اور میں جب اس تاریک سے کمرے میں پہنچا ہوں تو اٹھارہ یا بیس نوجوانوں کی مختصر سی جماعت عاشق حسین بٹالوی کی صدارت میں دیویندر ستیارتھی سے ان کا کوئی افسانہ سُننے میں محو تھی۔ اپنی نشست پر پہنچ کر میں نے ایک اچٹتی ہوئی نظر کمرے میں دوڑائی، کچھ لوگ ایک اونچی سی میز پر چڑھ کر بیٹھے ہوئے تھے۔ ان سے ہٹ کر دروازے کی اوٹ میں دو تین نوجوان کھڑے تھے۔ اور ان کے پیچھے وہی سادھوؤں کے بالوں اور چینی مونچھوں والا چہرہ آگے کو جُھکا ہُوا بالکل ساکت و جامد نظر آ رہا تھا۔ گویا اسے کسی نے پتھر سے تراشا ہے۔

دفعتاً اس میں زندگی کے آثار پیدا ہوئے دو تین جنبشوں کے بعد اُس نے دائیں جانب کو حرکت کی اور میں بھانپ گیا کہ وہ ادھر ہی کو پلٹ رہا ہے جہاں آکر میں ابھی ابھی بیٹھا تھا جیسے ہی ہماری آنکھیں چار ہوئیں اس چہرے کی مسکراہٹ سے مجھے یوں محسوس ہُوا گویا اس پر وہی تبسّم کھیل رہا ہے جس سے بعض اوقات برسوں کے بچھڑے ہوئے دوست ایسی محفلوں میں ایک دوسرے کا خیر مقدم کیا کرتے ہیں جہاں آدابِ محفل انھیں ہمکلام ہونے کی اجازت نہیں دیتے اور پھر سادھو کے بال لہرائے، پان کی پیک سے لتھڑی ہوئی باچھیں ایک ساعت کے لئے کھلیں اور اس کے ساتھ ہی ہونٹ سُکڑ کر پہلی حالت پر آ گئے۔ سادھو کے بالوں میں ایک اور جنبش ہوئی اور پھر وہ چہرہ ادھر ہی کو پلٹ کر جامد ہو گیا جدھر سے اس نے میری جانب پانچ سیکنڈ پہلے حرکت کی تھی۔

جلسہ ختم ہونے سے ایک منٹ پہلے ایک صاحب نے اُٹھ کر چند حضرات کے نام لئے اور کہا کہ اجلاس کے بعد یہ لوگ حلقہ سے متعلق بعض ضروری

اُس کے سر ہو جانے ۔ میراجی کی تحریر کو دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ اس شخص کو ریڈیو کی طرف مائل کرنا چاہیئے ۔ چند روز میں "معجونِ مرکب" کے عنوان سے ایک ورائٹی پروگرام نشر ہونے والا تھا ۔ جس کے مختلف ٹکڑے میرے پاس لکھے رکھے تھے ۔ انھیں منطقی سلسلے میں جوڑنے کے لئے "راوی" کے فقروں کی ضرورت تھی ۔ جنھیں لکھنے کا کام میں نے میراجی کے سپرد کیا ۔ بادی النظر میں یہ کام شاید بہت معمولی دکھائی دے لیکن فی الحقیقت مختلف لوگوں کے لکھے ہوئے الگ الگ خاکوں، تمثیلوں، افسانوں، گانوں، لطیفوں وغیرہ کو ایک ہی منطقی سلسلے میں فنکارانہ کامیابی کے ساتھ منسلک کرنا کوئی ایسی آسان بات بھی نہیں ۔ لیکن جب میراجی دوسرے دن مکمل مسودہ واپس لائے تو مجھے مزید حیرت ہوئی کہ انھوں نے کس خوبی سے یہ کام سرانجام دیا تھا ۔ اس کے بعد انھوں نے حلقۂ اربابِ ذوق کے بعض ارکان کے ساتھ مل کر تین پروگرام اور لکھے ۔ ان کی کامیابی سے متاثر ہو کر میں نے انھیں ایک بالکل نئی طرز کا پروگرام لکھنے کو کہا ۔ میں ریڈیو پر ایک ایسے پروگرام کو پیش کرنا چاہتا تھا جس میں ملک کے نامور فنکاروں کو اپنے اپنے کام اور فن پر بے تکلف تبادلۂ خیال کے لئے ایک ہی جگہ پر اکٹھا کیا جا سکے ۔ یہ پروگرام جو "خرابات" کے عنوان سے پیش کیا گیا اور جس میں وینا نانو زنتنی، نفیس خلیلی، عبدالمجید سالک، فیض احمد فیض، اُستاد غلام علی خاں، ملکہ پکھراج اور دوسرے فنکاروں نے اپنے اپنے ناموں کے ساتھ شرکت کی ۔ میراجی نے میرے لئے لکھا ۔ اس میں شک نہیں کہ اس پروگرام کی کامیابی میں نامور فنکاروں کا بھی ہاتھ تھا ۔ لیکن میراجی نے اس پر جس قدر محنت کی تھی اس سے ہمارے لئے ریڈیو سٹیشن پر یہ اندازہ لگانا مشکل نہ تھا ۔ کہ نشریات کو ایک نیا فنکار مل گیا ہے ۔

دراصل اس نئے ذریعۂ اظہار کے جملہ لوازم کو جسے نشریات کہا جاتا ہے سمجھنے اور ان پر حاوی ہونے کے لئے میراجی نے بہت محنت کی تھی انھوں نے متواتر مطالعہ، تجربے اور محنت سے اندازہ لگا لیا تھا کہ اظہارِ خیال کا یہ نیا ذریعہ انسانی تقریر کو ایک مقام سے دوسرے مقام تک پہنچانے ہی کا نام نہیں بلکہ ایک مخصوص فن ہے جس کی تکمیل کے لئے ذاتی جوہر اور اہلیت کا ہونا ازبس ضروری ہے ۔ ورنہ ٹیلیفون ہی کے چونگے کی طرح مائیکروفون کے سامنے کون کچھ نہیں کہہ سکتا ۔ لیکن اصل اہمیت اس میکانکی عمل میں مائیکروفون پر کچھ کہنے یا پڑھنے کی نہیں، بلکہ اُس تاثر کی ہے ۔ جو مائیکروفون میں جاتے ہوئے نہیں بلکہ لاؤڈ سپیکر سے نکلتے ہوئے الفاظ پیدا کرتے ہیں ۔ اگر بولنے والے کے جملوں نے سننے والوں کی دلچسپی کو اپنی گرفت میں لے کر چند منٹوں کے لئے ان کے تصور میں سوئی ہوئی دُنیا میں زندگی کی لہر دوڑا دی ۔ تو سمجھ لیجئے کہ بولنے والا ان چند منٹوں کے لئے ضرور فنکار بن گیا گویا ریڈیو کا کام بے بصر سننے والوں کی ذہنی نگاہ میں ایسی بینائی یا بصیرت پیدا کرنا ہے جس سے تصور کے پردہ سیمیں پر حلوہ بہ تصاویر ابھرتی ہوئی اور معنی پیدا کرتی ہوئی چلی آئیں ۔ میراجی کی نشری تحریروں کی یہی خوبی تھی کہ وہ جس طبقے اور جماعت کے لئے لکھی جاتیں انھیں کی ذہنی سطح اور فہم و فراست کے مطابق ہوتیں ۔ سننے والوں کے لئے ان کا ساتھ دینا حاد درجہ آسان ہوتا ۔ اور اُس کی قوتِ متخیلہ آسانی سے حرکت میں آ جاتی ۔

کچھ عرصے کے بعد لاہور سے میرا تبادلہ دہلی کر دیا گیا ۔ میرے لاہور سے رخصت ہونے سے دو تین دن قبل میراجی مجھے اتفاقیہ طور پر ملنے آگئے انھیں دیکھتے ہی مجھے فوراً خیال آیا کہ میں انھیں ساتھ کیوں نہ کھینچ لے چلوں ۔ دہلی میں میرے ذمّے فوجی پروگرام کی تشکیل اور نگرانی کا کام تھا جس کے لئے مجھے ایسے مصنف کی ضرورت پیش آ سکتی تھی جو میری فرمائش پر قلیل عرصے میں پروگرام لکھ کر دے سکتا ۔ میں نے سوچا جب میراجی ہر ڈھب کے پروگرام لکھ سکتے ہیں تو دہلی میں کسی نئے آدمی کو آزمانے کی بجائے انھیں ہی کو ساتھ کیوں نہ رکھا جائے ۔ میں نے فوراً اُن سے اپنا عندیہ بیان کیا ۔ وہ کچھ سوچ میں پڑ گئے پھر بولے کل بتلاؤں گا ۔ اس کے بعد وہ ملنے نہیں آئے ۔ آخر روانگی کا دن آ گیا ۔ اور میں دوست احباب سے رخصت ہو کر ریلوے سٹیشن پر پہنچا ۔ وہاں جا کر دیکھتا ہوں تو میراجی مجھ سے قبل اپنا مختصر سا سامان ایک ڈبے میں جما کر میرے انتظار میں پلیٹ فارم پر کھڑے ہیں ۔ انھیں دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہوا گویا میرے بازوؤں میں پھر سکت آ گئی ہے اور میرے ذمے نئے شہر میں جو کام سپرد کیا گیا ہے اس کی مشکلات آسان ہو گئی ہیں ۔

دفتر میں چارج لینے کے دوسرے دن میراجی اپنی رہائش کے انتظامات سے فارغ ہو کر میرے پاس پہنچ گئے۔ مگر ادھر اُدھر کی باتوں کے دوران میں اچانک مجھے جس چیز کا بڑی شدت سے احساس ہُوا وہ میراجی کی ہیئت کذائی تھی۔ مجھے خیال آیا کہ اس نئی جگہ پر شاید ان کی ظاہری حالت ان کے خلاف جائے۔ دِلی ریڈیو کا عملہ ایک خاص قسم کے خوش پوش نوجوانوں کی ایک ایسی جماعت پر مشتمل تھا جو کالجوں کے ماحول سے نکل کر تازہ تازہ اس نئے ادارے میں وارد ہوئے تھے۔ ان میں سے اکثر افراد کی نظریں ملنے والوں کی وضع قطع اور ان کی پوشش پر ضرور جا کر اٹکتی تھیں۔ ظاہر تھا کہ اپنے عجیب وغریب حلیے کی وجہ سے میراجی ایسے افراد کے مجمع میں آسانی سے نہ کھپ سکتے تھے۔ جہاں ان کا دوست تو کیا کوئی واقف تک نہ تھا۔ جب کمرے سے میرے دوسرے ساتھی چلے گئے اور میراجی اور میں اکیلے رہ گئے تو میں نے کہا۔ میراجی میرا ایک مخلصانہ مشورہ ہے۔ آپ میرے ساتھ جس ارادے سے یہاں آئے ہیں۔ اس کو عملی جامہ پہنانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ آپ اپنی اوّلین فرصت میں اپنے بے ڈھنگے بالوں اور مونچھوں کو صاف کرا دیں۔ اور پھر اپنے لباس کی طرف توجہ دیں۔ ان کپڑوں میں آپ پر ریڈیو کے ادیب ہونے کی بجائے لکڑہارے کا گمان ہوتا ہے۔

میراجی میری تجویز سے بگڑ گئے۔ کہنے لگے آپ کو مسودات لکھوانا ہیں یا خود سے اپنی مصاحبت کے فرائض سرانجام دلوانا ہیں۔ میں نے جو کچھ آج تک لکھا ہے انھیں کپڑوں اور داڑھی مونچھ کی موجودگی میں لکھا ہے۔ یہ چیزیں میری سوچ بچار اور طرزِ نگارش میں پہلے حائل ہوئی ہیں نہ اب ہوں گی۔ اس لئے آپ کے مذاق کا میں لطف اُٹھانے سے قاصر ہوں۔ آخر مجھے اپنا نقطۂ نظر سمجھانے کے لئے میراجی سے پہلے ایک طویل مناظرے اور پھر مجادلے میں اُلجھنا پڑا۔ اس کے آخر میں میراجی خفگی کے عالم میں کھڑے ہوئے اور جھنجھلا کر بولے "آپ شاید ثناءاللہ سے ملنا چاہتے ہیں۔ عرصہ ہُوا میں اسے دفن کر چکا ہوں اور اب اس کی خاطر میں میراجی کو مار نہیں سکتا" اتنا کہا۔ اور غصے میں کمرے سے نکل گئے۔

اور ان کے جاتے ہی مجھے وہ سرگذشت یاد آگئی جو لاہور میں میں نے دلی کی طرف روانہ ہونے سے چند ہفتے قبل ایک دوست کی زبانی سنی تھی۔ اور ثناءاللہ اور میراجی کے متضاد کردار میرے تصور کی دنیا میں اُبھر کر میرے سامنے آئے۔

ثناءاللہ خاں ڈار لاہور کے ایک طالب علم تھے۔ جو میٹرک کے امتحان میں کامیابی کے بعد بعض وجوہ کی بنا پر مزید تعلیم کے لئے کالج میں داخل نہ ہو سکے۔ اتفاق سے ان کے دوستوں میں سے ایک صاحب ایسے بھی تھے جنھیں ثناءاللہ خاں افسانہ نویس بنانے کی بڑی آرزو رکھتے تھے۔ انھیں ادبی مشورے دینے کے لئے یہ کبھی کبھی ان کے کالج میں جا نکلتے۔ ان صاحب کی سبجیکٹ کے برابر ایک بنگالی لڑکی بیٹھا کرتی جس کا نام میرا سین تھا۔ ثناءاللہ خاں نے اس لڑکی کو نہ جانے کس عالم میں دیکھا۔ کہ وہ ہمیشہ کے لئے اس پر مر مٹے میرا کو اس کے اعزا پیار سے میراجی کے نام سے پکارتے تھے۔ ثناءاللہ خاں نے پہلا کام تو یہی کیا کہ اپنا اصل نام ہمیشہ کے لئے ترک کر کے یہی نام اپنے لئے اختیار کر لیا۔ پھر میرا کے بال انھیں خاص طور پر پسند تھے۔ جب اس کے بالوں تک ان کی دسترس نہ ہو سکی۔ تو خود اپنے بال بھی میرا ہی کی تقلید میں بڑھا لئے۔ کچھ عرصے میں میرا کے گیان دھیان نے انھیں ایسا بے سُدھ کیا۔ کہ انھیں نہانے دھونے اور لباس کا بھی ہوش نہ رہا۔ زندگی کے تمام مشاغل ختم ہوئے۔ اگر کوئی لو باقی تھی تو وہ میرا کے دھیان کی تھی اور جو وقت اس سے بچ رہتا، وہ مطالعے کی نذر تھا۔ ثناءاللہ خاں ڈار یوں عشق کی آگ میں جل کر ہمیشہ کے لئے ختم ہوئے۔ اور ان کی راکھ میں سے جو نیا کردار میراجی کے نام کے ساتھ معرضِ وجود میں آیا، وہ اپنے ادراک واستعداد، اپنی طبیعت، اپنے حلیے، اور اپنے اعمال و افعال کی وجہ سے اس قدر جاندار ثابت ہُوا کہ اس نے ثناءاللہ کے تمام نقوش احباب کے دل سے یُوں مٹا کر رکھ دیئے۔ گویا اس نام کا کوئی شخص زندگی میں کبھی تھا ہی نہیں۔

دوسرے دن جب میراجی وقتِ مقررہ پر دفتر میں دیکھے نہ گئے تو شُبہ گزرنے لگا۔ کہ وہ مجھ سے شاید خفا ہو گئے ہیں۔ دل نے ملامت کی

کہ میں نے اپنے نقطۂ نظر کو تسلیم کروانے کے لئے ان سے خواہ مخواہ بحث میں اُلجھنے کی کوشش کی۔

دو دن گزر گئے میراجی یوں غائب تھے گویا دلّی میں ہیں ہی نہیں۔ گمان گزرنے لگا شاید وہ خفگی کے عالم میں لاہور چلے گئے ہیں۔ اور انھیں پکڑنے کے لئے دہلی جانا پڑے گا۔ میں بے دلی کے عالم میں اس معاملے پر غور کر ہی رہا تھا کہ مجھے کمرے میں کسی نو وارد کی موجودگی کا احساس ہوا۔ نظر اُٹھائی۔ تو میز کے سامنے ایک ایسے بزرگوار کو کھڑا پایا جن کا چہرہ تو مانوس معلوم ہو رہا تھا لیکن یہ یاد نہیں آ رہا تھا کہ زندگی میں ان سے کہاں ملاقات ہوئی تھی۔ اور پھر یک لخت منڈی ہوئی مونچھوں، کٹے ہوئے بالوں اور بدلے ہوئے کپڑوں کے باوجود میراجی کے تبسم نے ان کی نئی ہیئت کا راز فاش کر دیا۔ آج میراجی عمر میں دس برس کم دکھائی دے رہے تھے۔ ان کی اُجلی قمیص اور صاف ستھری پتلون سے پتہ چلتا تھا کہ اس ہیئت کو اختیار کرنے سے قبل انھوں نے بڑی محنت سے کام لیا ہے۔ مگر جیسے ہی ہماری آنکھیں چار ہوئیں تو مجھے یوں محسوس ہوا گویا اس ظاہری تبدیلی میں میراجی کچھ کھسیانے سے ہو رہے ہیں۔ اور پھر اپنی خفت کو کم کرنے کے لئے انھوں نے پان کی پڑیا میری طرف بڑھائی۔ اور مسکرا کر میری طرف دیکھنے لگے۔ مطلب یہ تھا گویا مجھ سے پوچھ رہے ہیں کہ کہو پسند آیا یہ نیا حلیہ۔

میراجی کی پرانی ہیئت ان کی شخصیت کا ایک لازمی جزو بن چکی تھی۔ کہ اس کے بغیر میراجی کو دیکھ کر مجھے خوشی کی بجائے قلق سا ہوا۔ میراجی کی اس تبدیلی ہیئت سے ان کی ظاہری حالت میں ایک معقولیت ضرور پیدا کر دی تھی۔ لیکن آج ان میں وہ کشش دکھائی نہیں دے رہی تھی جس نے روزِ اوّل مجھے ان کی شخصیت کو سمجھنے کی ترغیب دی تھی۔ پہلے تو میرے جی میں آئی کہ میراجی سے صاف صاف کہہ دوں کہ جو تجربہ یہ کرنا چاہتا تھا اس کا نتیجہ کچھ بہت حوصلہ افزا ثابت نہیں ہوا۔ لیکن پھر میں نے مصلحتاً خاموش رہنا مناسب سمجھا۔ اور ان کے نئے حلیے کے بارے میں اپنی رائے کے اظہار کی بجائے ان سے کام کے اس طومار کا ذکر چھیڑ دیا جو پچھلے دو دن سے میرے لئے سوہانِ روح ہو رہا تھا۔ میراجی نے کاغذات اُٹھائے اور ساتھ کی میز پر بیٹھ کر ان کا مطالعہ کرنے لگے۔ فاصلے پر سے میں نے یوں جو ان کا [illegible] دیکھا تو مجھے رہ رہ کر افسوس ہوتا کہ میں نے انھیں اپنا حلیہ بدلنے کا مشورہ کیوں دیا۔ اور پھر مجھے اعتراف کرنا پڑا کہ اگر میراجی نے ثناء اللہ خاں ڈار والا گھونٹ ڈالا تھا۔ تو انھوں نے کوئی زیادتی نہ کی تھی۔ ثناء اللہ خاں بہرحال ایک غیر مخصوص انسان تھے۔ اور میراجی بہرطور ایک حد درجہ پُرکشش شخصیت!

دن گزرتے گئے اور آہستہ آہستہ دلّی میں میراجی کا حلقۂ احباب وسیع ہونے لگا۔ حلقے کی وسعت کے ساتھ میراجی کے مشاغل میں بھی کئی گنا اضافہ ہو گیا۔ اور جب ان مشاغل کی نوبت سے ان کی آمدنی کے وسائل وسیع ہوئے تو میراجی کی اکثر شامیں بھولا رام کے شراب خانے کی نذر ہونے لگیں۔ جیسے ہی چار بجتے میراجی کی طبیعت بے قرار ہونے لگتی۔ اور انھیں موری دروازے کی نکڑ والی اُس عمارت کی یاد ستانے لگتی۔ جس میں بھولا رام کا بار مرجع خواص و عوام تھا۔ وہ جلدی جلدی کام سے فارغ ہو کر ہم مشرب دوستوں کو اکٹھا کرتے اور ان کی معیت میں سیدھے بار کا رُخ کرتے یہاں رات گئے تک ان کے رفقا کے ہنگاموں کی آوازیں باہر سڑک پر سنائی دیتیں۔

پھر میراجی پر "میراجیت" دوبارہ طاری ہونے لگی۔ ایک دن دفتر میں آئے تو دیکھتا ہوں قمیص کے نیچے کوئی چیز ان کی گردن کے قریب اُبھری ہوئی ہے معلوم ہوا ہو نہ ہو یہ وہی پرانی مالا ہے جو حلیہ بدلنے سے قبل ہمیشہ سے ان کے گلے کا ہار ہوا کرتی تھی۔ دو چار دن میں قمیص کے اوپر شیروانی بھی نمودار ہو گئی اور پھر ہفتے میں دس دن بعد جسمانی غلاظت کے آثار بھی دکھائی دینے لگ گئے۔ گویا میراجی پھر میراجی نظر آنے لگے۔

۱۹۴۵ء میں ہندوستانی فلموں پر ایک پروگرام مرتب کرنے کا کام میرے سپرد کیا گیا۔ اس پروگرام کی تکمیل کے لئے مجھے بمبئی جانا تھا۔ سفر پر روانہ ہونے سے تین چار دن قبل مجھے خیال آیا۔ کہ پروگرام کا مسودہ مرتب کرنے کے لئے میراجی کو ساتھ لے جانا چاہیے۔ مگر اس وقت بظاہر میراجی دلّی کی گوناگوں رنگینیوں میں کچھ اس طرح کھوئے ہوئے تھے کہ سفر پر چلنے کے لئے ان سے کہنا کچھ بیکار دکھائی دیتا تھا۔ لیکن جیسے ہی میں نے اس سفر کا ذکر کیا وہ فوراً میرے ساتھ چلنے کے لئے آمادہ ہو گئے۔ بمبئی پہنچ کر پہلے چار پانچ دن بڑی مصروفیت میں گزرے مگر ایک دن ایسا بھی آیا۔ کہ میں بعض وجوہ کی بنا پر میراجی کو کام پر ساتھ لے جانے کی بجائے انھیں مختشب جار چری ہی کے ہاں مسودے کی تکمیل کے لئے چھوڑ گیا۔ رات کو جب بہت دیر کے بعد میں واپس پہنچا تو

دیکھتا ہوں غضب آلود نوابزادہ شمشاد علی خاں بڑے فکر کے عالم میں گم سم کھڑے ہیں۔ میری راہ تک رہے ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی وہ میری طرف لپکے اور مجھے اشارے سے خاموش رہنے کے لیے کہا۔ معلوم ہوا، میری غیر موجودگی میں شام کو میرا جی بہت زیادہ شراب پی کر گھر آئے تھے۔ انھوں نے پہلے تو آتے ہی ان آہنی گولوں سے جنھیں وہ ہر وقت ساتھ رکھتے تھے، کھڑکیوں کے تمام شیشے توڑ ڈالے۔ پھر کھڑکی میں کھڑے ہو کر راہگیروں پر آوازے کسے۔ بعد میں ہر شخص کو صلواتیں سنائیں اور آخر میں غسل خانے کا فلش توڑ دیا۔

صبح جب میں اور میرا جی ناشتے کے لیے میز پر بیٹھے تو میں نے میرا جی کو رات کی حرکات سے آگاہ کیا۔ کہنے لگے "شاید میں زیادہ پی گیا تھا۔" میں نے پوچھا "کس علت میں؟" بگڑ کر بولے "منشی مہتاب دین کی آنکھیں خراب ہو گئی ہیں۔" میں نے غصے سے کہا "مہتاب دین کی بینائی کو آپ کی شراب خوری سے کیا کام ہے؟" بولے "مہتاب دین میرے والد ہیں شاید آپ سمجھتے ہوں گے میں یہاں بمبئی میں پروگرام لکھنے کے لیے آیا تھا۔ میں یہاں غم غلط کرنے آیا ہوں۔"

چند روز کے بعد مجھے دتی واپس جانا پڑ گیا۔ اگر میں اس وقت میرا جی کو ساتھ لے جاتا۔ تو شاید صورت حال وہ نہ ہوتی۔ جو بعد میں ہوئی۔ بہر حال جب ایک ہفتے کی غیر حاضری کے بعد میں بمبئی لوٹا تو دیکھتا ہوں۔ میرا جی اب وہ میرا جی نہیں تھے۔ ان کے مشاغل اور حلقۂ احباب دتی کی طرح یہاں بھی بہت وسیع ہو چکا تھا۔ شراب کا دور اب کم و بیش ہر وقت چلتا اور میرا جی بمبئی کی فلمی دنیا کی رنگینی میں بتدریج کھوئے چلے جا رہے تھے۔

جب ہمارا پروگرام تیار ہو گیا۔ تو میں نے میرا جی سے دتی واپس چلنے کو کہا۔ مگر اب کہاں۔ میرا جی اب کچھ اور ہی تھے۔ کہنے لگے "آپ جائیے میں دتی نہیں جاؤں گا۔ آپ لاہور سے مجھے دتی لائے میں آگیا۔ آپ دتی سے مجھے بمبئی لائے تو میں چلا آیا۔ آگے چلیے تو تیار ہوں پیچھے نہیں جاؤں گا۔"

چار سال اور گزر گئے اور پھر اچانک اطلاع آئی کہ میرا جی بمبئی سے بھی آگے چلے گئے ہیں۔ بہت آگے۔ جہاں سے واقعی کوئی نہیں لوٹتا۔

ظفر علی خان

شورش کاشمیری

جدید پود کے لیے ظفر علی خان ایک بھولی بسری کہانی ہیں۔ آج سے پچیس تیس برس پہلے ان کا طوطی بولتا تھا —— وہ ہندوستان کے پنجابی مزاج میں سرفہرست مجموعۂ اضداد اور جامع صفات تھے —— اب تو خیر گور کنارے ہیں لیکن جب جوان تھے، آگ تھے۔ ایک زندگی میں کئی زندگیاں اکٹھی ہو گئی تھیں ادیب، خطیب، صحافی، شاعر اور سیاسی —— آج بظاہر وہ ایک گم شدہ ورق ہیں۔ دور لیل ونہار کی بہت سی گردشوں نے ان کے آفتاب کو گہنا دیا ہے، لیکن ایک زمانے میں ان کا آفتاب نصف النہار پر تھا حتیٰ کہ ان کا وجود ملی جدوجہد کی ایک تاریخ بنتا گیا۔ ہر چند اس تاریخ میں ایک عجیب سا تضاد ملتا ہے اور ظفر علی خان اس تضاد کا ایک شدید مظہر ہیں —— لیکن اس تضاد میں بھی اتنی دلکشی ہے کہ اس زمانے کے احوال و ظروف سے ملا کر ان کی شخصیت کو دیکھیں تو اس میں نہ صرف ادب کی فرزانگی اور سیاست کی دیوانگی نظر آتی ہے، بلکہ وہ ایک عجیب و غریب پیکر دکھائی دیتے ہیں —— ان کا ادب ان کی زندگی سے متاثر ہے اور ان کی زندگی ان کی سیاست کا عکس اور ان دونوں کے امتزاج سے جو صورت بنتی ہے اس سے ایک ایسا وجود ابھرتا ہے جس میں مصوری تھوڑی سنگتراشی زیادہ ہے —— ظفر علی خان سراپا ہنگامہ تھے اور ظاہر ہے کہ ہنگامے میں حکایتیں شاذ اور شکایتیں وافر ہوتی ہیں۔ ظفر علی خان کی شخصیت سے ہم عصروں اور ان کے جانشینوں نے جو تغافل برتا اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ظفر علی خان نے گرد و پیش کی عمارتیں ڈھانے میں زبان اور قلم کو ہمیشہ گرز البرز شکن بنائے رکھا نتیجہ معلوم کہ —— آج وہ ماضی کی تمام ہما ہمی کے باوجود فسردہ چراغ محفل نظر آتے ہیں لیکن اس کے باوجود کوئی ادبی یا سیاسی نقشہ ایسا نہیں جس میں ان کا خط نہ ہو —— اور پھر وہ محض خط ہی نہیں رنگ بھی ہیں۔ کہیں مدھم کہیں شوخ۔ انہیں ان خطوں اور رنگوں سے علیحدہ کر کے پرکھنا زیادتی ہے۔ وہ جو کچھ بھی ہیں اپنے ماحول کی صدا ہیں —— اور اسی سے ان کی سیرت عبارت ہے —— وہ ایک ایسی تصویر ہیں جس میں بوقلمونی ہی بوقلمونی ہے۔

اب سے چالیس پچاس برس پہلے پنجاب سپاہیوں کی کھلی منڈی تھا۔ صدیوں تک لشکریوں کی گذرگاہ رہا۔ برطانیہ نے پنجاب کو حیطۂ اختیار میں لیا تو یہ سینیت اور پختہ ہو گئی —— حتیٰ کہ تمام صوبہ برطانوی مقاصد کی جولانگاہ بن گیا —— اس سارے عرصہ میں صوبے کی اصل پیداوار سپاہی ہی رہے یا پھر ظفر علی خان کی مخصوص سیاسی اصطلاح میں کاسہ لیسان سرمدی —— جن کا طغرائے امتیاز "وفاداری بشرط استواری" تھا۔ ادھر ہندوستان کے دوسرے حصوں میں سیاسی شعور کی کرنیں پھوٹ چکی تھیں لیکن پنجاب کا مطلع بدستور تاریک تھا۔ بعض سمتوں میں چند گونجدار آوازیں اٹھتی جاتی تھیں لیکن ان کا دائرہ نہایت مختصر تھا —— ایک انجمن تھی اور

اس میں چند چراغ ـــــ بالفاظِ دیگر ایک طبقاتی مذاق پیدا ہو رہا تھا جس سے عامۃ الناس بوجوہ محروم تھے۔ ظفر علی خان نے ایکا ایکی اسی جمود میں نعرۂ رستخیز بلند کیا۔ ادھر لاہور میں کئی ادبی محفلیں جم چکی تھیں۔ ان کے بانی محمد حسین آزاد تھے۔ عبدالقادر نے مخزن نکالا تو ایک بزم آراستہ ہو گئی۔ ادھر صحافت میں دو چار اخبار پیش رو تھے لیکن ظفر علی خان جو شبلی، حالی، داغ، محسن الملک اور اس عہد کے دوسرے اکابر کی صحبتوں سے فیض یاب ہو چکے اور حیدر آباد کی خوشگوار ادبی فضا میں رہ چکے تھے، ایک نیا رنگ لے کر اٹھے ـــــ وہ کسی روایت کے تابع نہیں تھے لیکن انہوں نے بزم کو رزم میں ڈھالا۔ "زمیندار" جو ان کے والد کی امانت تھا، اس کی ہیئت بدل ڈالی۔ وزیر آباد سے لاہور منتقل ہو گئے اور یہیں سے "زمیندار" نکالنا شروع کیا۔ ان کا ادبی مذاق بہت منجھ چکا تھا۔ علی گڑھ کی تعلیم، حیدر آباد کی صحبتیں، سرسید، شبلی اور حالی کا تلطف ـــــ ان سے ایک منفرد ظفر علی خان نکلا ـــــ اردو جو بکل پنجاب کے چند گھرانوں میں راہ پیدا کر سکی تھی، اب عوام کے مزاج میں دخیل ہونے لگی۔ پڑھے لکھوں کا تناسب چنداں حضری تھا ـــــ لیکن قارئین کی قلت نے سامعین کی کثرت پیدا کر دی اور دیکھتے دیکھتے آنکھوں اس سرے سے اس سرے تک ظفر علی کا نام ہو گیا جس کا مطلب تھا کہ ظفر علی خان کے رشحاتِ قلم نوکِ زبان ہوتے گئے ـــــ اتفاقات بڑی چیز ہیں۔ ادھر ظفر علی خان نے زمیندار کی ادارت سنبھالی ادھر بلقان میں جنگ چھڑ گئی۔ یہ پہلا سیاسی موڑ تھا جو مسلمانوں کو ۱۸۵۷ء کے بعد مڑنا پڑا اور ان میں اپنے پاؤں پر اٹھنے کی قدرے ہمت پیدا ہوئی ـــــ ظفر علی خان ادبی اعتبار سے سونا بنے تپا تھے، اس سیاسی اتفاق نے سہاگہ کا کام کیا اور چند ہی دنوں میں ایک نیا ولولہ پیدا ہو گیا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب مسلمانوں کی نشاۃِ ثانیہ کا آغاز ہو چکا یا بعض روایتوں کے مطابق ہو رہا تھا۔ اپنے نہ سہی کہ ان کی مصلحتیں بسا اوقات غبار آلود ہوتی تھیں لیکن ہمارا خیال ہے کہ اس دور کے اسلامی جذبات کی مظہر چار شخصیتیں ہیں۔ ابوالکلام، اقبال، محمد علی اور ظفر علی خان۔ ان چاروں میں بہت سی خصوصیتیں مشترک اور بعض میں تضاد تھا۔ لیکن ان کے اشتراک اور تضاد دونوں میں حیاتِ ملی کی روح کارفرما تھی۔ ابوالکلام علم و عمل کا مرقع تھے لیکن وہ جس مقام سے پکارتے رہے، وہاں انہیں یہی احساس رہا کہ وہ اپنی ہی قوم میں ایک اجنبی آواز اور اپنے ہی ملک میں ایک غریب الدیار ہیں ـــــ اقبال کی فکر میں ان کا شمول تھا ـــــ محمد علی ایک نصب العین تھے جس کا اقتباس نہ تھا ـــــ "کسے کہ کشتہ نہ شد از قبیلۂ ما نیست" ـــــ اور ظفر علی خان ـــــ "من از سرِ نو جلوہ دہم دار و رسن را" کی صدائے بازگشت ......

اس وقت مولانا کی عمر چونسٹھ برس سے کچھ اوپر ہے اور سن پیدائش ۱۸۷۳ء ضلع سیالکوٹ کے ایک گاؤں کوٹ مہرتھ میں پیدا ہوئے۔ وزیرآباد مشن اسکول میں داخلہ لیا، پٹیالہ سے میٹرک کیا اور علی گڑھ سے ۱۸۹۲ء میں ایف۔ اے کی سند لی۔ والد کشمیر میں ڈاک اور تار کے افسرِ اعلیٰ تھے۔ ان کے بلاوے پر سری نگر چلے گئے اور اسی محکمہ میں ملازمت کر لی۔ وہاں اپنے ایک افسر سے الجھ پڑے۔ ان کی ہجو لکھی اور ملازمت سے دست کش ہو کر مزید تعلیم کے لئے علی گڑھ لوٹ گئے۔ فرسٹ ڈویژن میں بی۔ اے کیا۔ نواب محسن الملک کو خواجہ غلام الثقلین کے استعفا دینے کی وجہ سے پرائیویٹ سیکرٹری کی ضرورت تھی۔ آپ نے اخبار میں اشتہار دیکھا، درخواست گذاری ـــــ اور خواجہ صاحب کی جگہ ملازم ہو گئے۔ وہاں تھوڑا عرصہ قیام کیا، پھر محسن الملک سے سفارشی خط لے کر حیدر آباد چلے گئے۔ نواب افسر جنگ سے ملے، انہوں نے فوج میں ملازم رکھ لیا۔ وہاں کسی نہ کسی طرح فوج سے دارالترجمہ میں چلے گئے۔ چند ہی دنوں میں اسسٹنٹ رجسٹرار ہو گئے۔ میر عثمان علی خان کے اتالیق بنے۔ عزیز مرزا ہوم سیکرٹری تھے، ان کی توجہ سے اسسٹنٹ ہوم سیکرٹری کے عہدے تک پہنچے۔ ان کا تبادلہ ہو گیا تو نواب سربلند جنگ، ان کی جگہ ہوم سیکرٹری ہو گئے۔ وہ قدرے ترش رو اور چڑچڑے تھے۔ مولانا کی جودتِ طبع کو مضمون ہاتھ آ گیا۔ محمد رفیع سودا نہیں تھے کہ غنچہ سے کہتے "قلمدان لاؤ" ـ قلم اٹھایا اور ہجو لکھ ماری۔ سربلند جنگ کو بھی خبر ہو گئی۔ مولانا چھٹی لے کر میر محفوظ علی بدایونی کے ہاں بمبئی چلے گئے۔ ادھر وہ بھی ملازمت سے بیزار تھے، دونوں نے بمبئی میں امپورٹ ایکسپورٹ کا دفتر کھولنے کی ٹھانی اور استعفا دے کر رخصت ہو گئے۔ وہاں مکان کرایہ پر لے کر اورنیٹل کمرشل ایجنسی کے نام سے ایک تجارتی ادارہ قائم کیا ـــــ جاپان سے ریشم اور افریقہ سے ہاتھی دانت کا سامان درآمد کیا مگر بیل منڈھے نہ چڑھی۔ دونوں ادیب تھے اور یہ کاروبار تھا۔ عزیز مرزا تو دل شکستہ ہو کر بدایوں چلے گئے لیکن آپ نے دکن ریویو نکالنے کا فیصلہ کیا۔ ابھی سوچ ہی رہے تھے کہ

سو یہ مرزا دوبارہ ہوم سیکرٹری ہو گئے۔ انہوں نے تار سے بلوا بھیجا، بمبئی سے حیدرآباد پہنچے اور لیجسلیٹو اسمبلی کے رجسٹرار مقرر ہو گئے۔ یہاں آپ نے لارڈ کرزن کی تالیف خیابانِ فارس کا اردو میں ترجمہ کیا اور شہرت پائی۔ پنجاب یونیورسٹی نے پانچ سو روپے انعام میں دیے جو ایک پنجابی نژاد کو کسی اردو ترجمے پر پہلا انعام تھا۔ حضور نظام نے از راہِ خوشنودی تین ہزار روپے مرحمت فرمائے — داغ، میر محبوب علی خان کے استاد اور مرجعِ امرا تھے۔ انہوں نے تقریظ لکھی جس میں مصنف اور زبان کی بے حد تعریف کی — احسن مارہروی راوی ہیں کہ داغ کے قلم سے نثر کا جو سب سے بڑا ٹکڑا نکلا وہ یہی تقریظ ہے — اس سے پہلے مولانا سیرِ ظلمات، فسانۂ لندن اور سنہری گھونگا کا ترجمہ کر چکے تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کا کہنا ہے کہ ظفر علی خان فسانۂ لندن کے بجائے کسی علمی کتاب کا ترجمہ کرتے تو ان کی خدماتِ علمی میں شمار ہوتا۔ معرکۂ مذہب و سائنس کے متعلق ان کی رائے ہے کہ ایک مفید دینی خدمت ہے۔ غرضیکہ ان تراجم سے مولانا کی ادبی قابلیت کا شہرہ ہو گیا۔ انہی دنوں موسیٰ ندی میں طغیانی آ گئی جس نے تمام ریاست کو ہلا ڈالا اور متاثرہ لوگوں کی امداد کے لیے تحریک چل نکلی۔ مولانا نے اس پر جو طویل نظم کہی اس سے ادبی و شعری حلقوں میں ان کا نام اور ثقہ ہو گیا۔ اس نظم کو موضوع کے اعتبار سے اولیت کا درجہ ملا۔ اسی اثنا میں دکن ریویو جاری کیا۔ جنگِ روس و جاپان کے نام سے ایک طویل منظوم شاہنامہ لکھا۔ گو اس کی فنی حیثیت پیچ کی نہیں لیکن ادبی اعتبار سے قادر الکلامی کا نمونہ ہے —

ایک روز نواب افسر جنگ فوج کے جوانوں کی نیزہ بازی دیکھ رہے تھے۔ آپ بھی قریب ہی کھڑے تھے — جی مچلا تو نواب افسر جنگ سے عرض کی ؎

تو دستگیر شو اے خضرِ پے خجستہ کہ من
پیادہ می روم و ہمرہان سواران اند

افسر جنگ مسکرائے۔ نیزہ موجود تھا، گھوڑا طلب کیا — فرمایا:

یہی میدان وہی گوئے اسد

مولانا تامل کیے بغیر گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھ گئے اور آنِ واحد میں میخ اکھاڑ لائے — ایک دن داغ کے ہاں شریکِ مجلس تھے کہ محلے میں شور ہوا کہ کوئی بچہ کنوئیں میں گر گیا ہے۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ، انگرکھا اتار کنوئیں میں اتر گئے اور بچے کو نکال باہر کیا۔

حیدرآباد میں کسی یورپین تھیٹریکل کمپنی نے ڈرامہ کیا جس میں نیم برہنہ عورتوں کا رقص بھی تھا۔ ریاست کی طرف سے کمپنی کا شکریہ ادا کرنے کے لیے اٹھے تو اظہارِ تشکر کے بجائے اظہارِ ملامت کر ڈالا۔ ریذیڈنٹ کو ناگوار گذرا، دل میں گرہ باندھ لی، اور آخر حیدرآباد سے نکلنا پڑا — والد حیات تھے۔ یہاں آ کر زمیندار میں شریک ہو گئے لیکن ایک آدھ برس ہی میں دوبارہ طلبی ہو گئی۔ سر مائیکل اوڈوائر حیدرآباد میں ریذیڈنٹ رہ چکے اور اب پنجاب میں گورنر تھے، ان کے اشارے پر خواجہ حسن نظامی نے چغلی کھائی اور حیدرآباد سے دوبارہ نکالے گئے۔ حتیٰ کہ پنشن بھی ضبط ہو گئی۔ الزام یہ تھا کہ نظامِ حیدرآباد کو پان اسلامزم کی راہ پر لاتے اور انگریزوں کے خلاف اکساتے ہیں۔ لاہور پہنچے تو والد بسترِ مرگ پر تھے یا غالباً انتقال ہو چکے تھے۔ زمیندار کو وزیرآباد سے اٹھایا اور لاہور چلے آئے۔ بلقان کی جنگ نے مہمیز کا کام کیا۔ اخبار کہیں سے کہیں پہنچ گیا۔ سر مائیکل گھات میں تھا ؎

اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

زمیندار کا گلا گھونٹ دیا گیا اور مولانا کرم آباد میں نظر بند کیے گئے۔ وہاں سے ستارۂ صبح نکالا لیکن تا بکے؟ بالآخر اس کی شہ رگ بھی کٹ گئی۔ جن لوگوں کے سپرد احتساب کا کام تھا وہ ادبی استعاروں اور شعری کنایوں کو بھی شک کی نظر سے دیکھتے تھے۔ ایک زمانہ میں زمیندار کو محض اس لیے ایک بڑی رقم کی ضبطی سے دوچار ہونا پڑا کہ اس میں کسی مقالہ کا سرعنوان یہ شعر تھا ؎

گل پھینکے ہیں اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی
اے خانہ برانداز چمن کچھ تو ادھر بھی

لاہور کے ایک سرکاری قبیلے نے مخبری کی اور زمیندار موت کے گھاٹ اتر گیا۔ اب جو ضبطیوں، قرقیوں اور بندشوں کا سلسلہ چلا تو سیلاب تھمتا نہیں — تحریکِ خلافت

میں یہ طغیانی اور تیز ہو گئی حتیٰ کہ حضور کی ایک تقریر میں ماخوذ ہو کر پانچ سال کے لئے قید ہو گئے اور پھر ۱۹۳۶ء تک کبھی رہائی کبھی اسیری۔ آپ کی مجموعی قید جو آپ نے مختلف وقتوں میں کاٹی، تقریباً بارہ برس ہوتی ہے۔ ہر تحریک میں حصہ لیا اور ہمیشہ پیش پیش رہے لیکن تنظیم میں شامل ہو کر اس سے الگ ہو گئے ——— کانگرس میں گئے تو برہنہ تلوار، اس سے نکلے تو ذوالفقار ——— مجلس خلافت کی روح رواں تھے لیکن کنارہ کشی اختیار کی تو اپنے ہی ہم عصروں سے دو دو ہاتھ کئے۔ احرار کی عمارت اٹھائی لیکن شہید گنج کی کدال سے گرا بھی دی۔ اتحاد ملت کی منبر رکھی لیکن جلد ہی ڈھا دی ——— لیگ میں تھے، بار کر شریک ہو گئے اور اس کو گوشہ عافیت سمجھا مگر جمعیت کا انداز جوں کا توں رہا۔ مولانا ابو الکلام نے ایک دفعہ آپ کی انہی صلاحیتوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا:

> "ملک میں کسی تحریک کو مہینوں کے بجائے ہفتوں میں چلانا چاہو تو ظفر علی خان اور
> شوکت علی کو چھوڑ دو۔ وہ بسرعت تمام پروگرام نافذ کر دیں گے لیکن جب قلعہ بن جائے تو
> ان کو فوراً باہر کر دو، کیونکہ وہ پھر اسی تیشے کو ڈھا دیں گے۔"

الغرض ظفر علی خان انہی عادتوں کی مخلوق اور یہ عادتیں ان کے ادب کو محیط ہیں۔ بظاہر یہ ان کی زندگی کا سیاسی پہلو ہے لیکن حقیقتاً ادبی ہے کیونکہ ان کا ادب ان کی سیاست کی تخلیق نہیں۔ ان کی سیاست ان کے ادب کی پیداوار ہے۔ ان کی سیاسی زندگی ختم ہو چکی ہے، وہ ان کے ادب کی وجہ سے ہے۔ ظفر علی خان میں سے ادب کو حذف کر دیں تو ایک فرد رہ جاتا ہے جس کی شخصیت اوجھل ہو جاتی ہے۔ بعض ثقہ لوگوں کی رائے ہے کہ ظفر علی خان کا ادب ان کی سیاست کے ہاتھوں پٹ گیا۔ وہ سیاست کے پیچھے نہ پڑتے تو ادبی اعتبار سے اقبال اور ابو الکلام کی صف میں ہوتے اور ہنگامی ادب کی جگہ تخلیقی ادب پیدا کرتے۔ اس کے برعکس دوسرا خیال یہ ہے کہ یوں ہوتا اور دوں ہوتا کی بحث سرے سے غلط ہے۔ ظفر علی خان کا یکی ہی اس امتزاج سے بنا ہے ——— اگر ادب کا کوئی مقصد ہے تو ظفر علی خان کے ادب نے بوجہ احسن اس مقصد کو پورا کیا ہے۔ بلکہ ان لوگوں سے زیادہ مقصد کی نشو و نما کی ہے جن کے ہاں ادب محض ایک سماجی نظام کی اکھاڑ پچھاڑ کے لئے آلۂ تخریب ہے جیسے آرنلڈ کے الفاظ میں ادب تنقید حیات، تفسیر حیات، تطہیر حیات اور تعمیر حیات ہے۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ خود حیات کیا ہے؟ اس کا موقف کیا ہے؟ اور اس کے مقاصد کیا ہیں؟ اپنے لئے وہ کون سے اصول ہیں جن پر زندگی کا نظم قائم ہے ——— ظاہر ہے کہ زندگی ایک فرض ہے اور اس فرض کے کچھ مقاصد ہیں۔ ان مقاصد کے بارے میں یہاں تک احوال و ظروف کا تعلق ہے، ہمیشہ اختلاف رہا ہے۔ ہر دائرۂ انسانی میں حرکت و عمل کے نقطے ایک دوسرے سے جدا ہیں۔ ظفر علی خان نے جس ماحول میں قدم رکھا، وہ مسلمانوں کے لئے حد درجہ ابتری کا تھا۔ تمام عالم اسلامی کے مسلمان صنعتی یورپ کے ہاتھوں پٹ رہے تھے ——— ابھی ایسے لوگ زندہ تھے جنہوں نے ہندوستان میں اسلامی سلطنت کے مرجھا جانے کا سانحہ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا یا جن کے لئے یہ غم تازہ تھا۔ ادھر ملک میں قومی تحریک نے بال و پر پیدا کر لئے اور حریت کا احساس کروٹیں لینے لگا تھا۔ ظفر علی خان نے ایک مرد کارزار کی راہ اختیار کی ——— اب تک رمز و کنایہ اور استعارہ و تشبیہ میں باتیں کہی جاتی تھیں۔ چنانچہ غالب اس ابہام پر کیے آئے، سرد نظر آتے ہیں۔ ان کے خوشہ چینوں میں حالی نے نالہ درد بلند کیا، شبلی صف ماتم بچھا کر نوحہ کناں رہے لیکن آخر تاریخ کی راہ پر نکل گئے۔ اکبر نے تنقید و تطہیر کو اختیار کیا۔ ان کے ہاں آنسوؤں اور قہقہوں کا امتزاج ہے ——— اقبال ایشیائی کارل مارکس کی حیثیت سے آگے بڑھے اور وہ قومی سے زیادہ بین الاقوامی نظر آتے ہیں لیکن ان کے مخاطب مسلمان ہی تھے۔

ظفر علی خان نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ ادب کو عوام کے لئے ڈھالا اور اس کی عزت بھی قائم رکھی۔ انہوں نے اپنے آپ کو مسلمانوں کے جذبات کا سفیر بنا لیا۔ جو باتیں اب تک وضعداری سے کہی جاتی تھیں وہ کھل کر سامنے آ گئیں ——— ظاہری رکھ رکھاؤ سے ہاتھ اٹھا لیا۔ مرحلہ یہ تھا کہ جن غیر ملکوں کے قبضہ میں ہندوستان ہے، ان کے خوف اور جبر کو ذہنوں سے خارج کیا جائے ——— اور یہ کسی قومی تحریک کا ابتدائی شیوہ ہوتا ہے۔ ظفر علی خان نے غیر ملکی حکومت پر تابڑ توڑ حملے کئے۔ جوں جوں قومی تحریک پھیلتی گئی، توں توں ان کا قلم تیز ہوتا گیا۔ انہوں نے برطانوی نظم و نسق اور اس کے کل پرزوں کو

ہدفِ تنقید نہیں بنایا بلکہ ان کے ہندوستانی معاونوں کو بھی آڑے ہاتھوں لیا۔ ان کے اس حملے کی لپیٹ میں سبھی آ گئے ——— افراد، مجالس، عقیدے، نظریات، تحریکیں اور اپنے پرائے ——— ان کی مدارات کے لئے ایسی اصطلاحیں اور ترکیبیں وضع کیں کہ سبھی داد دے اُٹھے ——— ان میں تلخیاں بھی تھیں اور کڑواہٹ بھی لیکن اس کے سوا چارہ بھی نہ تھا۔ عوام ہمیشہ جذبات پر کٹتے مرتے ہیں۔ شاعری بجائے خود جذبات ہی پیداوار ہے اور صحافت کی بنیاد بھی جمہور پر ہے۔ ادھر قومی تحریک میں جذبات کا بوجھ نفرت اور محبت سے ہوتا ہے۔ لوگ جذبات ہی کے بل پر نفرت کرتے اور جذبات ہی کے ذریعہ محبت کرتے ہیں۔ ان تمام محرکات نے ظفر علی خان کے قلم کا اسلوب متعین کیا اور وہ نظم و نثر کے میدان میں یکہ تاز ہو گئے۔ پھر ان عوامل سے صحافتی شاعری پیدا ہوئی جس میں فنجیدہ تھا یا ہجو ——— اور ظفر علی خان کو سارا کردار اس میں جھلکتا ہے۔ ان کے ممدوحین کی فہرست مختصر لیکن مذمومین کی فہرست طویل ہے۔ جن ہستیوں اور عقیدوں کو انہوں نے خراج ادا کیا ان میں حمد باری تعالیٰ اور نعت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم تو مستقل ہیں۔ اس باب میں انہوں نے سنگلاخ سے سنگلاخ زمینیں منتخب کیں اور شگفتہ سے شگفتہ شعر نکالے۔ ان کے نعتیہ کلام کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ وہ دوسرے شعرا کی طرح غلو سے کام نہیں لیتے بلکہ حضورؐ کی سیرت کا نقشہ اور ان کے محاسن کی تصویر اس کمال سے کھینچتے ہیں کہ آنکھوں کے سامنے سیرت النبی چلتی پھرتی نظر آتی ہے۔ چنانچہ خواجہ حسن نظامی نے ایک دفعہ آپ کے قلمی چہرے میں لکھا تھا کہ قیامت کے روز اپنی نعتوں کے باعث بخشے جائیں گے۔ خود ظفر علی خان اپنے اس کلام کو توشۂ آخرت سمجھتے ہیں۔ اس کے علاوہ انہیں اسلام اور تاریخ اسلام سے والہانہ عقیدت ہے ——— بعض مسلمان بادشاہوں کی تعریف میں انہوں نے بہت کچھ لکھا اور ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی مسلمانوں کو تلقین کی ہے ——— مثلاً صلاح الدین ایوبی، محمود غزنوی، اورنگ زیب اور اس زمانہ میں ابنِ سعود، امان اللہ خان، مصطفےٰ کمال ان کے ممدوحین تھے۔ بعض تحریکوں کی تائید و اعانت کے لئے جذبات کی شیفتگی کے ساتھ قلم اٹھایا۔ مثلاً کانگریس، خلافت، احرار، آل انڈیا مسلم لیگ، اتحادِ ملت وغیرہ۔ اسی طرح بیشتر ہم سفر رہنماؤں اور ہم نوا عزیزوں کو بھی مدیحہ سپاس پیش کیا لیکن ان رہنماؤں، عزیزوں اور تحریکوں کے معاملہ میں ان کے ہاں دونوں طرح کے جذبات عام ہیں۔ جن کی تعریف کی اس کی ہجو بھی لکھی، اور جس کی ہجو لکھی اس کی ستائش بھی کی۔ مولانا کے تینوں مجموعے "بہارستان" "نگارستان" اور "چمنستان" اس سے لبریز ہیں بلکہ ان واقعات کی دستاویز۔ حقیقت یہ ہے کہ مولانا کا کلام پوری نصف صدی کے سیاسی واقعات کی منظوم تاریخ ہے۔ ایک مورخ اس میں واقعات اور سالات کی بہت سی گم شدہ کڑیاں تلاش کر سکتا ہے۔

اس کے علاوہ مولانا کے تین مجموعے اور تھے۔ پہلا "روحِ معانی" ——— یہ اصلاً گورکھپور خلافت کانفرنس کا خطبہ تھا۔ اسی کے آخر میں چند نظمیں بھی تھیں جنہیں بہارستان میں شامل کر لیا گیا۔ دوسرا "حبسیات" یہ مولانا کے زندانی کلام کا مجموعہ ہے جو آپ نے پانچ سالہ قید کے دوران میں منٹگمری سنٹرل جیل میں سپردِ قلم کیا۔ تیسرا "ارمغانِ قادیان" جس میں مقالات کے علاوہ وہ نظمیں تھیں جو آپ نے قادیانی فرقہ پر لکھیں اور اب ان کے دوسرے مجموعوں میں ملتی ہیں۔

جہاں تک مذمومین کا سوال ہے، ان کا کوئی معاصر اور جماعت ان کے قلم سے نہیں بچی۔ یہاں تک کہ علامہ اقبال، قائدِ اعظم، ابوالکلام آزاد، محمد علی جوہر، گاندھی جی، جواہر لال بھی ان کے قلم کی زد میں آ چکے ہیں۔ اور جماعتوں کا تو ذکر ہی کیا۔ یہی حال عقیدوں اور نظریوں کا ہے۔ اس طنز بلکہ تضحیک میں ان کا جواب نہیں۔ اس میدان میں انہوں نے اچھے اچھوں کی دستارِ فضیلت کے پیچ کھولے اور بڑے بڑوں کو چاروں شانے چت کیا ہے۔

مولانا سے پہلے ہجو کا انداز شخصی یا ذاتی تھا۔ جس کی بہترین مثالیں سودا، انشا اور مصحفی کے ہاں ملتی ہیں۔ یا پھر اجتماعی طنز جس کے موجد و خاتم اکبر الٰہ آبادی ہیں۔ ظفر علی خان نے سیاسیات میں ہجو کو استعمال کیا اور اس کی بنا قومی و ملکی مقاصد پر رکھی۔ گو ان میں ذاتیات کا زہر بھی ہے اور یہ ایک بشری تقاضا ہے۔

مولانا عبدالقادر قصوری کے متعلق کہا ارشاد ہے ـــ

اور پھر یہ معرکے محض مہر و سالک تک ہی محدود نہ تھے ـــ ان کا دائرہ پورے ہندوستان میں پھیلا ہوا تھا۔ بعض حوادث و وقائع پر ایسے ایسے برجستہ شعر کہے ہیں کہ ان کا جواب نہیں۔ شنواریوں کی بغاوت سے متعلق زمیندار میں افتتاحیہ لکھا تو سرآغاز تھا ـــ

جنگ کا کب سے سلیقہ کسی شنواری میں
کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں

کسی مسئلہ میں مسٹر جناح سے بگڑ گئے ـــ قلم اٹھایا، اداریہ لکھا اور عنوان میں یہ شعر ـــ

کیونکہ اس کی اگر بانت سے پیدا ہوگا ‏ ‏ ‏ زہر دے اس پہ یہ تاکید کہ پینا ہوگا

ایک زمانہ میں علی برادران سے گاڑھی چھنتی تھی۔ پھر ان کا ... ہوا پڑا تو راستے ... پڑ گئی ـــ

دونوں نے مل کے ڈالی ہے اسلامیوں میں پھوٹ ‏ ‏ ‏ ہے صلح و آشتی سے علی بھائیوں کو ضد
منڈلا رہے ہیں آن خلافت کی لاش پر ‏ ‏ ‏ دہلی کے اور بمبئی کے موٹے موٹے گدھ

اور پھر ایسے ایسے قافیے نکالے کہ مضمون سے قطع نظر لطف (غذا) و داد دینے کو جی چاہتا ہے ـــ علامہ اقبال سے عمر بھر دوستانہ تعلقات رہے۔ ایک زمانہ میں ... روزنامہ احسان کے ظفر علی خاں نمبر کو پیغام دیتے ہوئے کہا تھا کہ ـــ مولانا کا قلم مصطفےٰ کمال کی تلوار ہے ـــ لیکن سائمن کمیشن کی آمد پر مولانا ان کی توضیع بھی کر چکے تھے ـــ

مانگ کر احباب سے رجعت پسندی کی کدال ‏ ‏ ‏ قبر آزادی کی کھودی کس نے؟ سر اقبال نے
کاٹ لی پنجاب کی ناک آپ اپنے ہاتھ سے ‏ ‏ ‏ آبرو ملت کی کھودی کس نے؟ سر اقبال نے

گاندھی جی سے کرم کا سب تھے ـــ تو ان کے قصیدے لکھے مثلاً ـــ

پروردگار نے کہ وہ ہے منزلت شناس ‏ ‏ ‏ گاندھی کو بھی یہ مرتبہ پہچان کر دیا

لیکن روٹھے تو پھر منے نہیں ـــ زاویۂ نظر ہی بدل گیا ـــ

بھارت میں بلائیں دو ہی تو ہیں اک ساورکر اک گاندھی ہے ‏ ‏ ‏ اک جھوٹ کا چلتا جھکڑ ہے اک مکر کی اٹھتی آندھی ہے

ـــ الغرض مولانا کا تمام کلام ان شعری سانحات سے بھرا پڑا ہے ـــ ایک عام آدمی کے لئے یہ تضاد ہے، بظاہر حیرت انگیز ہیں لیکن مولانا نے جو کچھ لکھا وہ اصلاً ہماری پچاس سالہ سیاست کے داخلی اختلافات کا رنگا رنگ مرقع ہے۔ ان کے جذبات کی دو آنکھیں ہیں، مدح اور قدح ـــ وہ جس آنکھ سے جو تصویر دیکھتے ہیں اسی کو کھینچتے ہیں۔ ان کے ہاں صحیح شعر کی کمی نہیں۔ انہوں نے بہت سی ثبت نظمیں اور سینکڑوں ثبت شعر کہے ہیں لیکن کمی یہ ہے کہ ان کا انتخاب نہیں ہو سکا۔ مولانا نے زندگی بھر جتنے شعر کہے وہ دس بارہ ہزار سے کیا کم ہوں گے؟ اور جو کچھ ان کے قلم سے نثر میں نکلا ہے اس سے کئی جلدیں مرتب ہو سکتی ہیں۔ مگر اس کام کے لئے فرصت اور محنت کی ضرورت ہے۔ خود مولانا بوڑھے ہو گئے اور زمانہ کا مذاقِ سخن بدل چکا ہے ـــ

ایک خوبی جس نے مولانا کو ہندوستان میں نامور کیا وہ ان کی بدیہہ گوئی ہے۔ ان کا تمام کلام ارتجال کی یادگار ہے۔ راقم الحروف نے بدیہہ گوئی کے ان معرکوں کو آنکھوں دیکھا ہے۔ کسی نے فرمائش کی اور شعر ہو گئے۔ جلسہ میں گئے، حاضرین نے اصرار کیا، نظم کہہ ڈالی۔ طبیعت کی آمادگی کا یہ عالم رہا کہ ایک ایک نشست میں دس دس نظمیں موزوں ہو گئیں ـــ ادھر کالج کے نوجوانوں کا ایک وفد حاضر ہوا، عرض کیا۔ مولانا شعر ـــ فرمایا بھائی شعر کہاں ـــ ہر وقت طبیعت حاضر نہیں ہوتی۔ انہوں نے اصرار کیا ـــ چپ ہو گئے، حقے کا کش کھینچا اور کہا ـــ اچھا لکھو ـــ اب فی کش ایک شعر لکھوائے جا رہے ہیں اور اس طرح پندرہ بیس شعر کہہ ڈالے ـــ

[illegible]

نیاز فتحپوری

سیّد ابوالخیر مودودی

نیاز صاحب ... بلکہ اپنی تعلیم کے ساختہ پرداختہ ہیں۔ وہ انیسویں صدی کی آخری دہائیوں میں پیدا ہوئے۔ اگرچہ اس زمانے میں انگریزی حکومت کی جڑیں مسلمانوں ... میں پوری استوار ہو چکی تھیں لیکن یہ تجاوز زیادہ تر صرف ذہن میں تھا۔ ہماری زندگی کا تعلق ان کے بننے اور پھیلنے کا اس وقت تک پیش نہیں آیا تھا ... ہمارا معاشری دروبست ان کی گرفت سے بہت کچھ آزاد تھا۔ دور زندگی کی قدریں بھی کچھ ایسی زیادہ نہیں بدلی تھیں ... خصوصاً مغربی تہذیب و تمدن کے مشئوم اثر سے دیہات تقریباً محفوظ تھے اور جدید مدارس کا جال شہروں ہی تک محدود تھا۔ دیہات میں شرفا کے گھرانے اپنے بچوں کی تعلیم کا خود انتظام کرتے تھے۔ ہر خاندان کا ایک مکتب ہوتا جس میں اس خاندان کے تمام بچے تعلیم پاتے۔ تعلیم قرآن مجید سے شروع ہوتی۔ پھر فارسی عربی پڑھائی جاتی۔ زیادہ زور فارسی پر دیا جاتا اور درس نظامی کی تکمیل کے معنے یہ تھے کہ بچے ... یہی ماحول تھا جس میں نیاز صاحب نے آنکھ کھولی، اور یہی تعلیم تھی جو انھوں نے اپنے وطن فتح پور کے مکتب میں حاصل کی۔

اس مکتبی تعلیم سے بہت زیادہ فائدہ نیاز صاحب کو خود اپنے والد سے پہنچا اور ان کی ادبی صناعت پر اثر انداز ہوا۔ وہ امام بخش صہبائی کے شاگرد تھے اور فارسی ادب کا ... نظر ... رکھتے تھے۔ انھوں نے فارسی کی متداول درسیات کے علاوہ نیاز صاحب کو دوسرے اساتذۂ ہند و عجم کا کلام نظم و نثر بھی پڑھایا۔ اسی ... درس تعلیم نے نیاز صاحب میں ادبی نکھار پیدا کیا۔ وہ بیدل سے روشناس ہوئے، ان کا 'انا' بیدل کے 'انا' سے ہم آہنگ ہو گیا۔ اسی ہم آہنگی کے نقوش ان کی ابتدائی تحریروں میں بہت نمایاں ہیں۔ خصوصاً "ایک شاعر کا انجام" طرز بیدل میں ایک کامیاب ریختہ ہے، جس میں نیاز کی انفرادیت تاثر میں اور تاثر انفرادیت میں تحلیل ہے۔

انگریزی نیاز صاحب نے تقریباً خود پڑھی، اور ان کی ذہانت و ذکاوت نے برق رفتاری سے کمال رسی کی منزلیں طے کر لیں۔ اس کو خرق عادت ہی کہا جا سکتا ہے۔ اپنی دراک ذہانت اور بلند ادبی ذوق کے سہارے بڑی آسانی اور روانی سے انگریزی ادب کے فن کاروں کی صناعتوں سے استفادہ کرنے لگے۔ "کیوپڈ و سائکی" اسی خارق عادت کمال رسی اور استفادے کا نقش جمیل ہے، جس میں نیاز نے مغربی ادب کے اسالیب کو اپنے فن میں جذب کیا ہے۔ انشائے لطیف میں یہ ان کی ابتدائی ادبی زندگی کا دوسرا کارنامہ ہے۔

انگریزی کی طرح ترکی بھی انھوں نے خود پڑھی اور دو تین مہینے میں اتنی استعداد حاصل کر لی کہ نامق کمال کے فن سے اسی کی زبان میں لطف اندوز

ہونے لگے۔ یہ سنی سنائی کہانی نہیں، آنکھوں دیکھی بات ہے۔

کم و بیش کچھ یہی معاملہ ہی کے زمانے کا ایک اور پُرشکوہ ادبی کارنامہ "گیتانجلی" کا ترجمہ ہے۔ شاید خود ٹیگور بھی اردو میں عرضِ مناجات کرتے تو اس سے زیادہ بہتر حسنِ بیان کی قدرت نہ پاتے۔ لیکن جس طرح ٹیگور کو ان کے اہلِ وطن نے اس وقت جانا پہچانا جب ان کو نوبل پرائز ملا، اسی طرح نیاز کو بھی اپنی زبان کے ادبی افق پر اس وقت ممتاز و نمایاں ہوئے جب ان کا یہ ترجمہ شائع ہوا۔

نیاز صاحب کی یہ ادبی مناعی ان کی قلم کاری کا صرف ایک پہلو ہیں۔ انشائے لطیف و ادبِ عالیہ کے سوا انھوں نے اپنی ادبی زندگی کے اسی دور میں اور بہت کچھ لکھا ہے۔ اور یہ بہت کچھ اسی اسلوب میں لکھا ہے جس اسلوب میں آجکل لکھ رہے ہیں۔ یہ طرزِ انشا تو صاف کہہ رہی ہے کہ جس آمد ہی آمد ہوں، لیکن انشائے لطیف کی وہ نثری گذرگی جا بجا عجب طرزیاں بھی آمد پر نظم، آورد نہیں۔ نیاز کا ذہنی سانچہ کچھ ایسا ہی ہے، ہو سکتا ہے کہ وہ اسلوبِ نگارش اظہارِ انفرادیت کے لئے اختیار کیا ہو اور قدرتِ بیان آورد سے آمد میں ڈھل گئی ہو۔

نیاز صاحب کے انشائے لطیف کے متعلق اس زمانے میں عام گمان یہی تھا کہ اس طرح کی تحریر کمالِ تکلف و تصنع ہی سے موجود پا سکتی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ندرتِ فکر و اسلوب کے یہ انمول موتی آورد اور تکلف کے اتنے بھرمٹ کش نہیں جتنی کاٹنے پر آویں ہوتی ہے۔ "شہاب کی سرگزشت" کا ایک بڑا حصہ اس طرح لکھا ہے کہ احباب سے بیٹھے گپ شپ کر رہے ہیں، کسی بات سے ذہن کو مہمیز ہوئی، "شہاب" کلھایا اور انھوں نے یہ کہتے ہوئے کہ "آپ لوگ باتیں کیجئے اور مجھے ہم کلام ہی سمجھئے" کاغذ کے چند سلپ ہاتھ میں لئے، پان کی گلوری منہ میں رکھی، اور قلم رُکا یا پونہیں بلکہ نراٹ چل نکلا۔

نیاز صاحب اپنی زندگی کے ایک دور میں ریاست بھوپال میں ملازم بھی رہے ہیں۔ میری ان سے ملاقات بھوپال ہی میں ہوئی۔ میں نے ان کو رقعہ بھیجا: "آپ سے ملنے کا مشتاق ہوں، آپ تشریف لائیے یا مجھے وقت دیجئے" نیاز صاحب بے تکلف تشریف لے آئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب "گیتانجلی" کا ترجمہ ادبی فضا پر چھایا ہوا تھا، اور رقعہ لکھنے والا محض طفلِ مکتب تھا —— اور آج بھی وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں —— خوانندگانِ نیاز، اس سے نیاز کے "انا" اور ان کی شخصیت کو سمجھ سکتے ہیں۔ میں نے ان میں کوئی "بڑا" و تکبر نہیں پایا۔ تعلقات بڑھے، لیکن یہ تعلقات دوستانہ نہیں خوردانہ و بزرگانہ تھے۔ میں نے ان کی صحبت میں بے پڑھے بہت کچھ پڑھا، اور انھوں نے بے سکھائے مجھے بہت کچھ سکھایا۔

نیاز میں رسمی تکلف بالکل نہیں۔ ان کی بے تکلفی میں دوستانہ اور شریفانہ شان پائی جاتی ہے۔ وہ اسی حد تک بے تکلف ہوتے ہیں جس حد تک آدابِ تہذیب کا اقتضا ہوتا ہے۔ مجلسی دل لگی میں بھی میں نے ان کے منہ سے کبھی ایسے الفاظ نہیں سنے جو آدابِ شرافت کے منافی یا مذاقِ سلیم پر بار ہوں۔ میں نے ان کو اپنے آپ پر کبھی فخر کرتے نہیں سنا، اور یہ بھی نہیں آپے سے باہر پایا۔

ایک سچے ادیب کی طرح وہ اہلِ مناصب سے کبھی مرعوب نہیں ہوئے ہیں نے انھیں عہدہ داروں کی گردی کرتے کبھی نہیں دیکھا۔ ان کے "انا" کا حقیقی اظہار یہ تھا کہ وہ اپنی شفقت سے میرے پاس تشریف لاتے لیکن میرے بڑے بھائی سے ملنے کے کبھی خواستگار نہ ہوئے۔ ہمیشہ یہی ہوا کہ اتفاقیہ آمنا سامنا ہو گیا اور وہ سرِراہ علیک سلیک کرتے گزر گئے۔

ایک دفعہ بہت مزیدار حادثہ پیش آیا۔ بھائی جان کے پاس چند عالی مقدار وارد تھے۔ حسنِ اتفاق یا سوئے اتفاق سے میرا کمرہ ان کے ڈرائنگ روم سے متصل واقع ہو گیا تھا۔ نیاز صاحب میرے پاس تشریف لائے اور عین اسی وقت چند بزرگانِ کرام بھائی جان کے پاس، ان میں قابلِ ذکر صرف ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری مرحوم ہیں، کہ حادثہ آورا انہی کی ادب دوستی تھی۔ وہ نیاز کے بڑے مداح تھے ایش قدمی کی اور نیاز کو اپنا شریکِ بزم کر لیا۔ ڈرائنگ روم کی فضا بدل گئی، ادبی بات چیت ہونے لگی۔ شرکائے بزم میں ایک انجنیئر صاحب بھی تھے، اپنے فن کی متعدد ڈگریوں سے ارجمند، انگلستان کے تعلیم یافتہ، لیکن شئے لطیف سے محروم! ان کو بھی اپنی ادب نوازی کا اظہار ضروری محسوس ہوا، کہنے لگے: نیاز صاحب! وہ مضمون

تو آپ نے بہت ہی خوب لکھا ہے جس کا عنوان رقاصہ ہے ۔ مگر رقاصہ کا آرٹ کیا ہے ۔ یہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔" وہ بچارے فقرہ تمام کرکے سانس بھی نہ لینے پائے تھے کہ نیاز نے جواب کھینچ مارا "آپ سمجھنے کی کوشش بھی نہ کیجئے ۔ اس کا آرٹ آپ کی سمجھ میں آنے کا بھی نہیں ۔" وہ غریب کھسیا کے رہ گیا اور مجلس پر سناٹا چھا گیا۔

نیاز نفرت تو کچھ کرتے ہیں اور ان کا یہ کھرا پن ، کھردرا پن بھی بن جاتا ہے ۔ وہ معاف کرنا جانتے تو ہیں ، مگر معاف کر دینا پسند نہیں کرتے ۔ وہ طبعاً انتقام جو ہیں اور انتقام پسند بھی ۔ نیاز کے مزاج کی یہ کیفیت خصوصیت کے ساتھ ان کی تنقیدوں سے عیاں ہے اور کسی حد تک ان کی اس تصویر سے بھی جو انھوں نے "گیتان جلی" میں لگانے کے لئے بڑے اہتمام سے کھنچوائی تھی۔

نیاز کے ایک دلچسپ ترین رفیق طریق ایک ملک صاحب تھے ۔ یہ کچھ نیاز کی خوش قسمتی تھی اور کچھ ملک صاحب کی ۔ دونوں کا اقتران ایک ایسے دفتر میں ہوا جس پر عدم ہی کا اطلاق کیا جاسکتا تھا نہ وجود کا ۔ ملک صاحب کا واحد امتیاز میرے نزدیک تو یہ تھا وہ شیخ عبدالقادر مرحوم کی باغ و بہار صحبتوں سے ازحد بہرہ مند رہیں ۔ لیکن خود ملک صاحب اپنا واحد امتیاز یہ سمجھتے ہیں کہ وہ بہت اچھے شکاری ہیں ، چھاپہ مار ہیں اور ان کا چھاپہ کبھی خالی نہیں جاتا ۔ ملک صاحب کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ ہمیشہ لنگوٹ طور پر جہاں دیدہ ہیں ۔ عالم اور عامل کا یہ **اقتران دونوں** کے لئے خوشگوار تھا ۔ دفتر بے صرف ، وجود کی تہمت تھی ۔ افسری اور ماتحتی کا وہاں کوئی سوال ہی نہ تھا ۔ نیاز اور ملک دونوں بیٹھے گپ لڑایا کرتے تھے ۔ نیاز اپنے ذہن سے چیزیں تراشتے اور ملک بہت سی سنی سنائی باتوں کو اپنا کر بیان کیا کرتے ۔ نیاز تو پھر بھی کچھ وقت لکھنے پڑھنے میں صرف کرتے تھے ۔ دو ڈھائی گھنٹے روز وہیں اوقات دفتر میں ، مطالعہ ان کا معمول تھا ، لیکن یہ اسی وقت تھا جب ملک صاحب گپ لڑانے کے شوق میں دفتر یعنی اپنے گھر سے باہر کہیں گئے ہوئے ہوں ۔ ملک صاحب خوش رو بھی تھے ، خوش لباس بھی اور جامہ زیب بھی ۔ انگلستان جاکر وہ کچھ اور سیکھ کر آئے ہوں ، یا نہ آئے ہوں ، لیکن لباس پہننے کا سلیقہ اور کچھ اور ایسے فنون ، جو اس قسم کے نوجوان ، بہت چابکدستی سے حاصل کرلیا کرتے ہیں ، ضرور سیکھ آئے تھے ۔

ملک صاحب کی شومیٔ قسمت سے مسز نائیڈو بھوپال تشریف لائیں ۔ نواب صاحب بھوپال سے ان کے مراسم تھے اور ایک مسز نائیڈو ہی کیا ، بہت سے قومی لیڈروں اور اس عہد کے اکابر سے نواب حمیداللہ خاں کے دوستانہ تعلقات تھے ۔ نواب زادگی کے ساتھ یہ تعلقات ، علی گڑھ کی تعلیم و تربیت کے رچاؤ کا ثمرہ تھا ۔ مسز نائیڈو سرکاری مہمان تھیں ۔ ملک صاحب نے سوچا قسمت آزمائی کا اچھا موقع ہے ۔ بن سنور کے ان سے ملنے پہنچے ۔ دو تین ملاقاتیں فرمائیں ۔ ان کی شاعری کی بہت شعر شناسانہ دادیں دیں اور اظہار عشق فرما دیا ملک صاحب اپنی نگاہ میں کچھ بھی ہوں ، مسز نائیڈو کی نگاہ میں بچہ ہی تھے ۔ انھوں نے کمال شفقت سے فرمایا :

"میں آپ کے عرض محبت کو مادرانہ شفقت کے ساتھ قبول کرتی ہوں !"

ملک صاحب نے اپنی ذہانت سے شرمندگی کو تشکر و سپاس میں منتقل کردیا ، لیکن وہاں سے آئے اس شان سے کہ چہرہ بے حد اترا ہوا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ لقوہ کی لہر ملک صاحب کے چہرے سے ٹکرا کے نکل گئی ۔ نیاز صاحب سے روداد بیان کی ۔ نیاز کی شریر طبیعت نے ـــــ اور نیاز کی یہ شرارت ان کی اسی تصویر میں گوشۂ چشم سے جھانک رہی ہے ، جو گیتان جلی میں انھوں نے چھپکائی ہے ـــــ بہت لطف لیا ۔ بہت دیر تک ہنساتے رہے اور کہنے کی بات یہ ہے کہ ان کے حق میں بھی ویسا ہی دو ٹوک فیصلہ صادر کیا ، جیسا فیصلہ نذیر صاحب کے حق میں صادر کیا تھا :

"ملک صاحب ! آپ بھی کہاں پہنچے ۔ آپ کا میدان ہیرا منڈی ہے ، سفید گلی ہے ۔ گرکھلے کی جھی کی ہرنی بھلا آپ کے دام میں کہاں آنے والی تھی!"

نیاز صاحب کو ملازمت کے آخری دنوں میں انسپکٹر جنرل پولیس کے دفتر میں بھی چسپاں ہونے کا سانحہ پیش آیا اور یہ سانحہ ان کے لئے مفید ثابت ہوا ۔ ڈاکٹر بجنوری مرحوم نے نواب حمیداللہ خاں کو ، جو اس زمانہ میں ریاست کے چیف سیکرٹری تھے ـــــ لیکن حقیقت میں

سب کچھ وہی تھے ——— توجہ دلائی کہ بہت ہی بد زیب بات ہے کہ نیاز جیسی اعلیٰ ادبی صلاحیتوں کا آدمی آپ کی ریاست میں پولیس کے دفتر میں ہیڈ کلرک ہے۔ نیاز کے لئے ادبی خدمات کا وظیفہ مقرر فرما دیجئے۔ نواب صاحب نے ان کی تجویز کے مطابق وظیفہ مقرر فرما دیا اور نیاز صاحب کو دفتری جھنجھٹ سے نجات مل گئی۔ یہ ۱۹۱۹ء کا واقعہ ہے۔ نیاز صاحب کے دوستوں نے اصرار کیا کہ وہ اسی سال بیگم صاحبہ کی سالگرہ کے موقعہ پر کوئی تصنیف پیش کریں۔ سالگرہ دو مہینے بعد ہی ہونے والی تھی۔ معاملہ کٹھن تھا۔ لیکن نیاز بہرحال اس سے عہدہ برآ ہوئے۔ نواب سلطان جہاں بیگم کی رعایتِ مذاق کے مطابق کتاب تصنیف کی اور دو مہینے کی قلیل مدت میں کتاب تصنیف ہو کر اور طباعت کے مراحل سے گزر کر سالگرہ کے دن پیش ہو گئی یہ کتاب "گہوارۂ تمدن" ہے۔ یہاں میرا مدعا اس کے صرف انتساب کو پیش کرنا ہے کہ نیاز کی شخصیت اس انتساب میں ہے:

ماناکہ لعل و گہر بغیر کسی وصفِ انسانی کے بھی دنیا میں اک مستقل امتیاز رکھتے ہیں!
لیکن ان کا حقیقی شرف تو اسی طرف کُلہ سے وابستہ ہے، جہاں جگمگانے کے لئے
وہ حقیقتاً وضع ہوئے ہیں۔ اس لئے اگر میں ان اوراق کو علیا حضرت، بلقیس مرتبت،
نوشیرواں معدلت گردوں رکاب، والا جناب، سلطان جہاں بیگم۔۔۔۔۔۔
ادام اللہ بالعزّ و الکمال فرمانروائے دار الاقبال بھوپال کے اسمِ گرامی سے
منسوب کرنے کی عزت حاصل کر کے مسرور و مفتخر ہوں، تو جائے حیرت نہیں، کیوں کہ
اربابِ نظر لعل و گہر کو نہیں، بلکہ

عروجِ طالعِ لعل و گہر کو دیکھتے ہیں

نیاز کو ایک مرتبہ اپنے انا کا بہت سخت امتحان دینا پڑا۔ حیدر آباد میں ان کے ایک دوست جوش ملیح آبادی ہیں بڑے صاحبِ کمال اور صاحبِ فن، ذہانت اور طباعی میں اگر نیاز سے زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں دونوں میں فرق صرف میدانِ تگ و تاز کا اختلاف ہے۔ بحث یہ تھی کہ انا اس محدود دائرہ ہی میں ظہور کر سکتا ہے یا اس پھیلی ہوئی کائنات اور حیات کی رنگا رنگی میں بھی اس کا ظہور ممکن ہے جوش دربار داری کے فن میں یکتا نہ تھے ——— تھے اس وجہ سے کہ اب وہ گھروندا ہی ٹوٹ چکا ——— ان کے انا نے چاہا کہ اپنے میدان میں نیاز کی صلاحیتوں کی آزمائش کریں وہ نیاز کو نظام کی پیش گاہ میں لے جانے پر مُصر تھے اور میرا خیال تھا کہ نیاز اس میدان میں نہیں چل سکیں گے اول تو نظام کی پیش گاہ میں جانے کے آداب ہی ایک مستقل عذاب۔ کٹھے و کرتے ایک خاص وضع کی پٹی باندھو سر پہ ایک فینہ رکھو نا بہ رکوع جھک کر سات سلام کرو دربار میں نیچی کئے دست بستہ دم بخود کھڑے رہو۔ پھر بادشاہوں کی قوم ایک ایسی مخلوق ہے جس کا خمیر تمام حیوانات مرضعہ اور غیر مرضعہ کے مجموعہ سے تیار کیا گیا ہے ان سے وہی لوگ برسرِ آ سکتے ہیں جن میں اس قوم کا خمیر مایہ شامل ہو نیاز نے کہا کہ یہ نہ سمجھو کہ میں اس میدان میں چل نہیں سکتا دو چار دفعہ چلا جاؤں تو جوش تمہاری کمان میں اُتر جائے گی اور تم تو صرف ناک کا بال ہی ہو میں نفسِ ناطقہ بن جاؤں گا جوش صاحب کا انا، بلبلا اٹھا انھوں نے کہا تو پھر چلو کل، نیاز نے کہا کہ میرا جینا بلا سے جانے پر منحصر ہے تم بلواؤ میں آؤں گا۔ بات ٹھن گئی تھی جوش صاحب نے اس طمطراق سے تقریب کی کہ طلبی ہو گئی وہاں نیاز نے دربارداری کے آداب و فنون کا ایسا مظاہرہ کیا کہ گویا پیدائشی دربار دار اپنے اصلی مقام پر پہنچ گیا۔

نیاز کی انشائے لطیف میں عورت کا بڑا عمل دخل نظر آتا ہے شاید اس عمل دخل کے بغیر انشائے لطیف ممکن بھی نہیں یہ عمل دخل سجاد یلدرم کے ہاں بھی ہے اور دوسرے انشاء پردازوں کے ہاں بھی یلدرم اس عمل دخل سے خیالات کی رنگینی و رعنائی کا کام لیتے ہیں مہدی افادی اعصاب میں تشنج پیدا کرتے ہیں اور نیاز جذبات کی شدت اور خیالات کی رنگینی کا مرقع بنتے ہیں۔ نیاز کے ہاں جذبات کی شدت جس قدر زیادہ بڑھتی ہے اسی قدر خیالات کی رنگینی و رعنائی زیادہ ہوتی ہے میں سمجھتا ہوں نیاز کے ہاں جذبات کا ہیجان و طغیان جنس کا نتیجہ ہے وہ بظاہر اپنے فن میں موپساں کا ایک کردار نظر

آتے ہیں لیکن فی الحقیقت وہ افلاطونی تصورِ عشق کا کردار ہیں۔ ان کی انشائے لطیف کی حقیقت ریاض کے خمریات سے زیادہ اور کچھ نہیں۔ وہ رقاصہ جس کی انہوں نے عکاسی کی ہے ان کی ذہنی قربانی و حسنی ہے۔ اس عالم رنگ و بو اور ہست و بود کا کوئی وجود نہیں۔ وہ ایسے فن کار ہیں جو اپنے فن کے نشہ میں بے پئے مست رہتے ہیں جس سے چار پانچ برس کے تعلقات ہیں ان کو ایسا ہی پایا۔ ہو سکتا ہے تعلق کی نوعیت نے یہ بات روا نہ رکھی ہو کہ غرق بزم رامش و رنگ میں بار پانے کیونکہ وہ بہر حال اس ماحول کے پروردہ یا فتہ ہیں جس میں ان باتوں کا بہت لحاظ رکھا جاتا تھا۔

نیاز صرف مجموعۂ خوبی ہی نہیں۔ نہیں! ان میں کمزوریاں بھی ہیں ان کی کمزوریاں جو کچھ بھی ہوں اور جتنی بھی ہوں ان کے لئے ہیں۔ مجھے صرف ان کی خوبیوں سے سروکار ہے۔ متاع نیک ہر دکاں کہ باشد۔ خاکروبی کوئی پیشہ۔ وہ فعل نہیں اور میں اس پر اپنے آپ کو آمادہ بھی نہیں کر سکتا لیکن یہاں نیاز کی صرف ایک کمزوری کا ذکر ضرور کروں گا وہ کمزوری ان کی تنگ دلی اور تنگ نظری ہے وہ بحیثیت نقاد کے حد سے گزر جاتے ہیں اور جس سے ذرا سا بھی کوئی اختلاف ہو اس کے ساتھ انصاف نہیں کرتے یہ بات ان کے درجہ سے فروتر ہے اور مجھے افسوس ہے کہ جس قدر یہ بات دون مرتبہ ہے اسی قدر زیادہ وہ اس بے اعتدالی کے مرتکب ہوتے ہیں۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

آتے ہیں لیکن فی الحقیقت وہ افلاطونی تصورِ عشق کا کردار ہیں۔ ان کی انشائے لطیف کی حقیقت ریاض کے خمریات سے زیادہ اور کچھ نہیں۔ وہ رقاصہ جس کی انہوں نے عکاسی کی ہے ان کی ذہنی آفریدہ ہستی ہے اس عالمِ رنگ و بو اور ہست و بود کا کوئی وجود نہیں۔ وہ ایسے فنکار ہیں جو اپنے فن کے نشہ میں بے پئے مست رہتے ہیں جن سے چار پانچ برس کے تعلقات میں ان کو ایسا ہی پایا۔ ہو سکتا ہے کہ تعلق کی نوعیت نے یہ بات روا نہ رکھی ہو کہ خود بزمِ رامش و رنگ میں بار پاتے کیونکہ وہ بہرحال اس ماحول کے پرورش یافتہ ہیں جس میں ان باتوں کا بہت لحاظ رکھا جاتا تھا۔

نیاز صرف مجموعۂ خوبی ہی نہیں۔ نہیں! ان میں کمزوریاں بھی ہیں ان کی کمزوریاں جو کچھ بھی ہوں اور جتنی بھی ہوں ان کے لئے ہیں۔ مجھے صرف انسانی خوبیوں سے سروکار ہے "متاعِ نیک ہر دکاں کہ باشد" ثنا کر دی کرنی لیپنا۔ یہ فعل نہیں اور میں اس پر اپنے آپ کو آمادہ بھی نہیں کر سکتا لیکن یہاں نیاز کی صرف ایک کمزوری کا ذکر ضرور کروں گا وہ کمزوری ان کی تنگ دلی اور تنگ نظری ہے وہ بحیثیت نقاد کے حد سے گزر جاتے ہیں اور جس سے ذرا سا بھی کوئی اختلاف ہو اس کے ساتھ انصاف نہیں کرتے یہ بات ان کے درجہ سے فروتر ہے اور مجھے افسوس ہے کہ جس قدر یہ بات دون مرتبہ ہے اسی قدر زیادہ وہ اس بے اعتدالی کے مرتکب ہوتے ہیں۔

پطرس بخاری

صوفی غلام مصطفےٰ تبسم

۱۹۴۸ء کی بات ہے۔ شام کا وقت تھا۔ پروفیسر بخاری اور میں بیٹھے کالج کی باتیں کر رہے تھے۔ میں نے کالج کی تدریسی اور ادبی سرگرمیوں کے سلسلے میں کچھ تجویزیں پیش کیں۔ ہنس کر بولے "صوفی! یہ تو شعر ہوئے۔ تم نے سنائے اور میں نے سن کر داد دی۔"

میں چپ ہو گیا۔

کچھ وقفے کے بعد بولے "سنو! تم استاد ہو اور میں کالج کا پرنسپل۔ ہمارا کام اس درسگاہ کے نظم و نسق کو عملی طور پر آگے بڑھانا ہے۔ میرے نزدیک وہ تجویز جو عملی صورت میں نہیں آتی خواہ وہ آسمان ہی سے کیوں نہ نازل ہوئی ہو، محض ذہنی عیاشی ہے۔ اور میں ذہنی عیاشیوں میں شعروں اور دوستانہ خوش گپیوں کو ہمیشہ ترجیح دیتا ہوں۔"

میں نے مرزا بیدل کی ایک غزل جو اسی روز پڑھی تھی سنانی شروع کر دی۔

رات مجھے بے چینی سی رہی۔ ایک مدت سے کالج میں اردو کی تدریس شبانہ جاری کرنے کا ارادہ تھا۔ صبح ہوتے ہی میں نے "ادیب فاضل کلاس" کی تدریس کا ایک مکمل "پیش نامہ" مرتب کر لیا۔ اور اس کی تین نقلیں بھی تیار کر دیں۔ شام کو یہ مسل بغل میں دبائے بخاری صاحب کے مکان پہ پہنچا۔

انھوں نے پوچھا "ضلع کچہری سے آ رہے ہو؟"

میں نے کہا "نہیں گھر سے آ رہا ہوں۔"

"تو یہ پلندا کیسا ہے؟"

"میرے ذاتی کاغذات ہیں۔"

"ٹھیک۔ بیٹھو۔"

ان دنوں پرنسپل کے مکان میں سرکاری کاغذات کا داخلہ ممنوع تھا۔

ایک آدھ ادھر ادھر کی بات کرنے کے بعد میں نے جھجکتے جھجکتے اپنا تجویزی کلام سنانا شروع کیا۔

میں نے کہا "عام شائقین کے لئے اردو کی اعلیٰ تدریس کے لئے کوئی خاطر خواہ انتظام نہیں، ارادہ ہے کالج میں ادیب فاضل کی ایک کلاس

شام کو جاری کی جائے۔ اس کلاس کے جملہ نظم و نسق، ترتیب و تدوین اور درس و تدریس کا کفیل کالج ہی ہو۔

حسب معمول کہنے لگے: "یہ طرحیہ اشعار ہیں؟"

میں نے کہا "جی ہاں، مطلع سنا چکا ہوں، پوری غزل یہ رہی۔"

یہ کہہ کر میں نے کاغذات کا پلندا اُن کے ہاتھ میں دے دیا۔ وُہ اسے پڑھتے جاتے تھے اور اُن کا چہرہ خوشی اور مسرت سے تمتما جاتا تھا۔

درمیان میں کہیں کہیں وہ کچھ سوال بھی پوچھتے جاتے۔ میں جواب دیتا اور کہتا "آپ سارا مسودہ پڑھ لیں آپ کو معلوم ہو جائے گا۔"

کاغذات ختم ہوئے تو بولے:

"ہوں! گویا میں بھی پڑھاؤں گا۔"

میں نے کہا "آپ نقطہ پرنسپل ہی نہیں اُستاد بھی ہیں۔"

"کیوں نہیں؟"

اس کے بعد انھوں نے ایک سگرٹ سلگایا جس کا دھواں تھوڑے ہی وقفے میں برآمدے کے ہر گوشے میں لہرا رہا تھا۔

شام کا کھانا کھانے کے بعد وہ موٹر کار میں بیٹھ کر شہر میں گھومنے لگے۔ جہاں جاتے اسی غزل کی تلاوت ہوتی، اور پڑھنے کے ساتھ ہی اس طرح داد بھی دیتے کہ دوسروں کے منہ سے بے ساختہ واہ نکل جاتی۔ اہلِ فکر حضرات اور مشفق احباب سب نے اسے سراہا۔ اس تبلیغی اعلان اور نشری بہ بیار میں آدھی رات گزر گئی۔

صبح کو یہ بات لاہور کی گلی گلی اور کوچے کوچے میں گشت لگا رہی تھی۔ ایک ہفتے کے اندر تمام ضروری مراحل طے ہو گئے۔ محکمانہ اجازت، اشتہار و اعلان اور درخواستوں کی طلبی، امیدواروں کی پیشی، داخلہ اور پڑھائی۔

پروفیسر بخاری اپنے روزمرّہ مشاغل میں خواہ وہ فرائضِ منصبی سے تعلق رکھتے ہوں یا نجی ہوں ایسی ہی مستعدی سے کام لیتے ہیں، زندگی میں اُن کی کامیابی کا سب سے بڑا راز یہی ہے۔

قدرت نے انھیں غیر معمولی ذہانت عطا کی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اُن کی معاملہ فہمی اور جزرسی اس ذہانت کو اور بھی چمکاتی ہے۔ وہ کسی کام میں ہاتھ ڈالنے سے پہلے اس کے تمام امکانی پہلوؤں کو بھانپ لیتے ہیں، اُس کے حسن و قبح اور دُور رس نتائج کو دیکھتے ہیں۔ بظاہر یوں معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی قوتِ عمل بڑی تیزی سے کام کرتی ہے اور وہ کسی خیال کے آتے ہی اُسے فی الفور عملی جامہ پہنا دینے کی عادی ہیں لیکن اکثر دیکھا گیا ہے کہ وہ معمولی اقدام کے لئے بھی کئی دن تک غور کرتے رہتے ہیں۔ اُٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے سوچتے ہیں، دوسروں سے مشورہ بھی لیتے ہیں اور اس مشورہ طلبی میں ایسے حسنِ تدبّر سے کام لیتے ہیں کہ بات بھی سلجھ جائے اور کسی کو اصلی راز کا پتہ بھی نہ چلے۔ جب ذہنی جائزہ لینے کے بعد انھیں پورا اطمینان ہو جاتا ہے، تب وہ قدم اُٹھاتے ہیں۔ اور بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اس کام کی تکمیل کے درپے ہو جاتے ہیں۔

کاموں کی تکمیل کے لئے دوسروں سے مدد لینے میں انھیں خاص ملکہ حاصل ہے، وہ اپنے عملی اقدام کا پرچار بڑی خوش اسلوبی سے کرتے ہیں۔ دوستوں کی ہمدردی اور رفیقانِ کار کی اعانت ہمیشہ اُن کا ہاتھ بٹاتی ہے۔ پھر اُن کے کام کرنے کا طریقہ بھی اتنا خوش آیند ہوتا ہے کہ دیکھنے والوں میں بھی تکمیلِ کار کا ایک غیر معمولی ولولہ پیدا ہو جاتا ہے اور وہ خود بخود اُن کے شریکِ کار بن جاتے ہیں اور اس شرکت میں ایک راحت محسوس کرتے ہیں۔

بخاری کا مقولہ ہے کہ کسی کام کی صحیح تکمیل کے لئے انسان میں محض شوق نہیں بلکہ چسکا ہونا چاہیئے۔ چنانچہ وہ جب بھی کسی کام کو کرتے ہیں تو ایسے ذوق و شوق سے کرتے ہیں کہ گویا انھیں اس کام کا چسکا ہے۔ اُن کا یہ ذوق و شوق ایک سہولت اور آسانی پیدا کرتا ہے۔ اُن میں ایک

خاطر کیا جائے اور پھر اس کام کو یوں ٹھکرا یا جائے تو انسان کے دل کو ضرور ٹھیس لگتی ہے۔ نا اہل ہاتھوں نے جو چرکے لگائے تھے معلوم نہیں کہاں تک ان پھٹے ہوئے کاغذوں پہ چیپیوں نے مرہم کا کام کیا۔ یہ بخاری صاحب کا دل ہی بتا سکتا ہے۔ میں تو یہی کہہ سکتا ہوں کہ اُن کی جاں گداختی دونوں طرح اپنا جوہر دکھا کے رہی۔

ایک مرتبہ اُن کے رفیقوں میں سے ایک صاحب یونیورسٹی کے کسی رُکن کی غلط کاریوں پر چیں بہ جبیں ہو رہے تھے۔ بخاری صاحب کہنے لگے "بھائی صاحب! میری دو باتیں یاد رکھو۔ زندگی میں کسی سے اُلجھنا ہو تو کسی بڑے مسئلے پر اُلجھنا چاہیئے۔ اور اپنے سے بڑے آدمی کے ساتھ اُلجھنا چاہیئے۔ ورنہ مزا نہیں آتا۔ انسان کی قوتیں اور کوششیں ضائع ہو جاتی ہیں۔ کمزور آدمی کو دبانے میں کوئی شان نہیں۔ بڑے آدمی سے تصادم ہو تو انسان کی استعداد کار اور بھی چمکتی ہے۔ مجھے دیکھو! میں نے ریڈیو کی ملازمت کے دَوران میں ہمیشہ بڑے آدمیوں سے ٹکر لی ہے اور اللہ کے فضل و کرم سے کامیاب رہا ہوں"۔

بظاہر ٹکراؤ ایک ناگوار شے ہے اور کاموں کی تکمیل میں ایک رُکاوٹ سا نظر آتا ہے لیکن جب اس کی بنیاد کسی بڑے اصول پر ہو اور ٹکرانے والے اہل لوگ ہوں تو اس سے مفید نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ بخاری کی طبیعت کا خاصہ ہے کہ وہ ہمیشہ ایسی رکاوٹوں سے خوش ہوتے ہیں۔ رکاوٹوں سے اُن کی طبعی صلاحیتیں اور استعدادیں اور بھی اُبھرتی ہیں۔ اُن کا بڑا کمال یہ ہے کہ وہ ان رکاوٹوں سے عہدہ برآ ہوتے وقت کبھی تھکن یا تلخی محسوس نہیں کرتے۔ اور تو اور خود اُن سے ٹکرانے والا جب اُن سے شکست کھاتا ہے تو اُسے اپنی شکست کا اتنا احساس نہیں ہوتا جتنا اُن کی عظمت اور برتری کا۔

ریڈیو کے محکمے میں اُن کا بالتدریج آگے بڑھنا اور آگے بڑھ کر محکمے پر چھا جانا ایک ایسا ہی کارنامہ ہے۔ انھوں نے دس سال کے عرصے میں ریڈیو کو جو وسعت اور شہرت دی وہ اُن کی ذہانت اور مستعدی کی بیّن دلیل ہے۔ جنگ عظیم کے دَوران میں ریڈیو پروگرام اور بالخصوص خبروں کی نشر و اشاعت کا کام بہت کٹھن تھا۔ اس بارے میں انگریز حکام اور اُن کی پالیسی بارہا اُن کے آڑے آئی لیکن انھوں نے بڑی خوش اسلوبی سے ایک طرف اُن کے تصرفات کی روک تھام کی اور دوسری طرف اپنی پالیسی کے پیش نظر ریڈیو کے وقار کو برقرار رکھا۔ خبروں کا اہتمام ریڈیو کے پروگرام کا سب سے اہم کام ہے۔ اس کی اہمیت کو غالباً ریڈیو کے عملے کے کارکنوں کے سوا کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ یہ امر واقعہ ہے کہ اسے لوازم جانے بلکہ ایک فنی شکل و صورت دینے میں بخاری صاحب کا زبردست ہاتھ تھا۔ اس میں اُن کی شخصیت کا پورا پورا عکس نظر آتا ہے۔

انھیں نئی نئی تجویزیں سوجھتی تھیں۔ ایک مرتبہ حسبِ معمول انھوں نے حکومت کو لکھا کہ ریڈیو پروگرام میں بہت سی چیزیں مستقل اہمیت رکھتی ہیں۔ اگر انھیں شائع کرکے محفوظ کر لیا جائے تو ایک ادبی خدمت بھی ہوگی۔ چونکہ جنگ کا زمانہ تھا انھوں نے ایک دلیل یہ بھی دی کہ بعض پروگراموں میں جنگی پرچار کے عنصر پوشیدہ ہوتے ہیں چھپ جانے کی صورت میں وہ بھی کارآمد ثابت ہوں گے۔ اس تجویز کا جواب کوئی آٹھ مہینے کے بعد موصول ہوا۔ تجویز رد کرنے میں جہاں بہت سے دلائل تھے وہاں ایک دلیل یہ بھی تھی کہ جنگ اب جلد ختم ہونے والی ہے لہٰذا ایسے مواد کا چھپنا بے موقع ہے۔ بخاری نے اس دلیل کو پڑھ کر لکھا "ہاں درست! لیکن اگر ہماری حکومت اسی "رفتار" سے کام کرتی رہی تو "امن" کا دور بھی جلد ختم ہو جائے گا"۔

"پطرس کے مضامین" بخاری صاحب کی مزاجِ طبیعت کے آئینہ دار ہیں۔ مزاح نگاری بظاہر بڑی ہلکی پھلکی شے ہے لیکن طنز نگاری کی طرح اس لطیف شے کو پیدا کرنے کے لئے ایک بڑی شخصیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب تک کسی شخص میں غیر معمولی ذہانت، عمیق مشاہدہ کی عادت اور شگفتہ طرزِ بیان کی قوت نہ ہو وہ کامیاب مزاح نگار نہیں ہو سکتا۔ انسانی اعمال میں بعض حرکات بڑی مضحکہ خیز ہوتی ہیں لیکن ہر انسانی آنکھ انھیں نمایاں طور پر نہیں دیکھتی۔ ایک مشاہدہ کار انسان انھیں بروئے کار لاتا ہے اور اُن کا اظہار لطیف اور شگفتہ انداز میں اس طرح

کرتا ہے کہ وہ تحت شعور سے اُبھر کر اجاگر ہو جاتی ہیں اور ہم ان انسانی لغزشوں کو دیکھ کر مسکرا دیتے ہیں۔ بخاری کی نظر بڑی وسیع اور گہری ہے اور پھر اُسے بیان پر قدرت حاصل ہے۔ اس لئے وہ بے ساختہ ان حرکات کو دیکھتے، سمجھتے اور چمکاتے رہتے ہیں۔

مذکورہ بالا ریڈیو سلسل کا التوا میں پڑ جانا روزمرّہ کا معمول ہے۔ کوئی اور ہوتا تو اسے دفتری سُرخ فیتے کے سلسلے کی ایک کڑی سمجھ کر ٹال دیتا لیکن بخاری کی نظر التوا کے تمام پہلوؤں پر پڑی تھی۔

مشاعروں کی بے طرحی سے کون واقف نہیں اور شہروں کی گندی حالت کو کون نہیں جانتا لیکن "کتے" اور "لاہور کا جغرافیہ" بخاری ہی لکھ سکتے ہیں۔

بخاری کا مزاحیہ انداز اُن کی تحریروں تک ہی محدود نہیں۔ اُن کی تقریریں بھی مزاح سے مزیّن ہوتی ہیں۔ وہ بڑے سے بڑے اہم اور سنجیدہ مسائل پر بحث کرتے ہوئے اسی حربے کو کام میں لاتے ہیں۔ احباب کی صحبتوں اور عام موقعوں پر بھی اسے بے ساختہ استعمال کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ہر مجمع میں اُن کی گفتگو لوگوں کی توجہ کا مرکز بن جاتی ہے اور لوگ پہروں اُن کے پاس بیٹھے نہیں اُکتاتے۔

لیکن اس سے یہ اندازہ نہیں لگانا چاہیئے کہ بخاری کی ذات میں جو کشش ہے، وہ محض اُن کی مزاح گوئی کی وجہ سے ہے۔ بےشک اُن کا مزاح ملنے والوں کے دل میں ایک شگفتگی پیدا کرتا ہے لیکن انھیں قریب سے دیکھنے والے جانتے ہیں کہ اُن میں خلوص بھی ہے۔ وہ اپنے عزیزوں دوستوں اور عام لوگوں سے بڑے رکھ رکھاؤ سے ملتے ہیں۔ اس رکھ رکھاؤ میں دوستداری بھی ہوتی ہے اور سلیقہ بھی۔ عام ملاقاتوں میں جہاں انسانی منافقت کام کرتی ہے وہ اس آراستگی سے بات کرتے ہیں کہ طبیعت کو خوشگوار معلوم ہوتی ہے۔ وہ چھیڑ چھاڑ کے خوگر ہیں لیکن اس چھیڑ چھاڑ سے اُن کی مراد کسی کی دل آزاری نہیں بلکہ اس سے لگاؤ کا اظہار ہوتی ہے۔

بخاری صاحب کو اپنے ان کرشموں کا پورا پورا احساس ہوتا ہے بلکہ وہ دوسروں پر اکثر ایک خاص تفوّق محسوس بھی کرتے ہیں اور اس تفوّق سے دوسروں کو اپنے مطابق چلنے بھی دیتے ہیں جہاں کہیں اُن کی طلاقتِ لسانی کارگر نہیں ہوتی وہ اپنی مزاحیہ گفتگو کو چھوڑ کر کوئی ایسی حرکت بھی کر گزرتے ہیں جو دوسروں کو چُپ کر سکے یا انھیں شکست دے سکے ۱۹۴۷ء کے اواخر میں جب قومی زبان کا مسئلہ پیش ہُوا تو بنگال کے ایک صاحب اقتدار بزرگ نے بنگالی زبان کی حمایت میں بڑی پُرزور تقریر کی۔ بخاری نے اپنی بذلہ سنجیوں سے انھیں بہت کچھ مرعوب کرنا چاہا لیکن خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی۔ دوسرے روز وُہ بزرگ اپنے عقائد کی تائید میں کچھ اعداد و شمار پیش کرنے والے تھے۔ بخاری صاحب کو ایسے مسودے کے مؤثر ہونے کا اندیشہ تھا۔ آپ ان کے پاس ہی بیٹھے تھے۔ اچانک آپ کی نظر ایک کاغذ پر پڑی۔ تاڑ گئے، ہو نہ ہو یہ اعداد و شمار کا پلندا ہے۔ انھوں نے چپکے سے وہ پلندا نکال لیا۔ جب وُہ بزرگ پُرجوش خیالات کا اظہار کرنے کے بعد اعداد و شمار پر آئے اور کاغذوں پر ہاتھ ڈالا تو غائب تھے۔ پریشانی میں جیبوں کو ٹٹولتے رہے اور یہ معصوم صورت بنائے اُن سے ہمدردانہ استفسار کرتے چلے گئے اُن کی بدحواسی پر محفل میں ایک کہرام سا مچا۔ جب محفل کا رنگ بگڑ گیا تو بخاری نے اچانک جُھک کر میز کے نیچے سے وہی پلندا اُٹھا کر انہیں دکھایا اور بھولے انداز میں کہا۔

"آپ یہ تو نہیں تلاش کر رہے؟"

اس پر ایک زور کا قہقہہ لگا، اور ساری بات ہنسی مذاق کی نذر ہو گئی۔

دوستداری، بخاری صاحب کا شیوہ ہی نہیں مسلک بھی ہے اگرچہ اس دوستداری میں گرمجوشی اور وفورِ جذبات کا اظہار بہت کم ہوتا ہے۔ وہ آہوں اور آنسوؤں سے زیادہ جذباتِ محبت کے اعتدال اور اخفا کے قائل ہیں۔ اس بارے میں اُن کا گرم جوش دل مغرب کی خنک فضاؤں میں سانس لیتا رہتا ہے اور اپنی آگ کو دبائے رکھتا ہے۔

بظاہر دیکھو تو بخاری صاحب پورے صاحب لوگ ہیں۔ اُن کی وضع قطع، اُن کا لباس، اُن کے اُٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے، کھانے پینے، باتیں کرنے سے یورپین انداز ٹپکتے ہیں۔ وہ مشرقی طرزِ بود و باش پر اکثر پھبتیاں کستے رہتے ہیں۔ اُن کے ساتھ بازار میں گھومنے جائیے تو معلوم ہوتا ہے انھیں یہاں کی کوئی حرکت پسند نہیں۔

"وہ دیکھو تہ بند کے ساتھ انگریزی قمیص!"

"سبحان اللہ چپلی کے ساتھ پتلون!"

"ٹائی اور شلوار کیا کہنے!"

"یہ شخص بازار میں کھڑا کباب کھا رہا ہے"۔

"یہ دیکھیے اس نے بائیسکل بازار میں بغیر اشارے کے گھما دی!"

"اور یہ چار آدمی صف باندھے چلے جا رہے ہیں میں موٹر کہاں سے گزاروں!"

یہ فقرے مسلسل آپ کے کان میں پڑیں گے اور آپ انھیں سُنتے سُنتے اپنے ملک، بلکہ اپنے آپ سے بیزار ہو جائیں گے۔ آپ کو اپنی کم سوادی کا احساس ہونے لگے گا جو خامی آپ میں نہیں وہ بھی نظر آئے گی۔

لیکن اس سے آپ یہ نہ سمجھ لیں کہ بخاری صاحب مغربی طرزِ زندگی کے قالب سے نکلے ہوئے ایک مجسمہ ہیں اور اُن میں کوئی لوچ نہیں۔ اُن کی صورت شکل مغربی اور مزاج مشرقی ہے۔ اُن کی ذات مغرب و مشرق کا تضاد نہیں بلکہ ایک لطیف امتزاج پیش کرتی ہے

اُن کی مشرق مزاجی کو دیکھنا ہو تو انھیں گھر کی چار دیواری میں دیکھیے جہاں ہر شے مغربی انداز میں جلوہ گر ہے لیکن جہاں زندگی کی حرکات ٹھیٹھ مشرقی فضا میں سانس لیتی دکھائی دیتی ہیں۔ وہی بے پروا، لاابالیانہ پن، وہی بے تکلف گفتگو، وہی خلوص آمیز میل ملاپ، یوں معلوم ہوتا ہے جیسے لنڈن یا نیویارک کے کسی مکان میں دلّی کے بلّی ماروں کے محلے والے اچانک آ بسے ہوں اور وہ ماحول کے لئے اجنبی اور ماحول اُن کے لئے اجنبی ہے۔

کوئی یہ اندازہ نہیں کر سکتا کہ دن بھر اتنی باقاعدگی اور مستعدی سے مشین کی طرح مسلسل کام کرنے والا رات کو کیونکر جاگتا ہوگا، لیکن بخاری صاحب کی شب بیداری کو اُن کے ساتھ راتیں گزارنے والے ہی جانتے ہیں۔ رات کے دس گیارہ بجے کے بعد گھر سے گھومنے کے لئے نکلنا اُن کا روزمرّہ کا شیوہ بلکہ معمول ہے، کوئی مقصد، کوئی منزل مقصود نہیں، محض گھومنا اور گھومنا، اور گھومتے گھومتے کسی سنسان سڑک کے کنارے کھڑے ہو کر گھنٹوں گپیں ہانکنا، یہ ہے اُن کی تفریح جس میں اُن کے تمام ہم قدم دوست برابر کے شریک ہوتے ہیں۔ مجال نہیں کہ کوئی شب خیز اس ثواب سے محروم رہ جائے۔ بیدل کے دقیق اشعار، شیکسپیئر کے ڈرامے، ایلیٹ کی سحر نگاری، منٹو کے افسانے انہی خوش گپیوں کے تحت میں آ جاتے ہیں۔

راتوں کی یہ بیداری اُن کے روزانہ کاموں میں مخل نہیں ہوتی۔ جس طرح دوستوں کو ایک ایک کر کے جمع کیا تھا اسی طرح ایک ایک کو گھر پر چھوڑنے کے بعد وہ بستر پر آ کر لیٹتے ہیں اور ایک آدھ گھنٹہ آرام کے بعد حسبِ معمول اُٹھ کر روزمرّہ مشاغل میں کھو جاتے ہیں۔ اور اس معمول پر وہ سختی سے کاربند ہیں اور خود ہی نہیں بلکہ اپنے رفیقانِ کار سے خواہ وہ اُن کے کتنے ہی بے تکلف دوست کیوں نہ ہوں، اسی باقاعدگی اور ضبط و نظم کی توقع رکھتے ہیں کسی طرح کی بے قاعدگی کو برداشت نہیں کر سکتے۔

بارہا ایسا ہوا کہ رات بھر گھومنے کے بعد ہم پانچ بجے صبح کو گھر لوٹے۔ پونے آٹھ بجے انھوں نے میرے یہاں ٹیلیفون کر کے پوچھا۔

"صوفی کہاں ہے؟"

بیگم نے کہا "وہ یونیورسٹی گئے ہیں۔ کوئی کام؟"

"کوئی نہیں یونہی پوچھا تھا۔"

اُن کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ کہیں ایسا تو نہیں ہوا کہ رات کی سیر نے مجھے اپنے فرائضِ منصبی سے غافل کر دیا ہو۔

اُن کے نزدیک دوستی اور فرائض کی بجا آوری دو الگ الگ خانے ہیں۔

ریڈیو کے زمانے میں اُن کے ایک دوست سے کوئی کوتاہی ہوئی۔ انھوں نے بڑی سختی سے مواخذہ کیا۔ دوست اُن کی غیر معمولی خفگی پر بگڑ گئے اور استعفا لکھ کر اُن کے حوالے کیا۔ انھوں نے بڑے انکسار و وقار کے ساتھ لے لیا اور کہا۔ بہت اچھا آپ تشریف لے جائیں۔

دفتر کے بعد بخاری صاحب اس دوست کے مکان پر بیٹھے دیگر احباب کے سامنے معافی مانگ رہے تھے۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] [illegible]
[illegible] [illegible]
[illegible]
[illegible] [illegible]
[illegible] [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible] [illegible]
[illegible] [illegible]
[illegible] [illegible]
[illegible] [illegible]
[illegible] [illegible]
[illegible] [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] [illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]

شاعر جوش کے ہاں بھی شخصیت کے اس جارحانہ اظہار کی تصویریں ملتی ہیں۔ ان کی تعلّی روایتی تعلّی کے انداز سے مختلف اور شاعری کے متعلق ان کے خیالات دوسرے شعراء سے مختلف ہیں۔ انہوں نے نو برس کے سن سے شعر کہنا شروع کیا۔ مکتب میں کتابوں کے حاشیوں پر شعر لکھے، امتحان کی کاپیوں میں شاعری کی۔ خود ان کے الفاظ یہ ہیں کہ "نو برس کی عمر سے شعر نے اپنے کو مجھ سے کہلوانا شروع کیا" یہاں بھی جبر کے تصور کی کارفرمائی ہے جس کا ذکر آگے آئے گا، کہتے ہیں کہ "جب میرے دوسرے ہم سن بچے پتنگ اڑاتے اور گولیاں کھیلتے تھے اس وقت کسی گوشے میں شعر مجھ سے اپنے کو کہلوایا کرتا تھا اور یہی وجہ ہے کہ پتنگ اڑانے اور گولیاں وغیرہ کھیلنے کے فن سے میں اب تک نا واقف ہوں۔" گھر پر ہر وقت شعراء کا مجمع ہوتا تھا، ادبی محفلیں گرم ہوتی تھیں، وحید الدین سلیم پانی پتی اکثر ملیح آباد میں جوش کے والد کے مہمان رہتے تھے۔ اس لئے جوش کے لئے محرکات شاعری کی کمی نہ تھی۔ ہاں ان کے والد البتہ یہ چاہتے تھے کہ شاعری کرنے کے بجائے ان کا بچہ کسی کام کا بنے چنانچہ وہ اسے روکتے رہتے تھے۔ یہی نہیں بلکہ انہوں نے جاسوس مقرر کر دئے تھے کہ جوش (اس وقت شبیر حسن خاں شبیر تھے) کو شعر کہتے پائیں تو مطلع کریں۔ اس خبر رسانی پر جاسوسوں کو انعام اور انہیں جھڑکیاں ملتی تھیں۔ جوش نے خود بتایا کہ ایک زمانے میں یہ کام داروغہ حامد علی کے سپرد تھا، ہر دفعہ خبر پہنچانے پر انہیں پانچ روپے ملتے تھے۔ انہوں نے اپنی آمدنی بڑھانے کے لئے جھوٹی سچی خبریں پہنچانا شروع کر دیں، مجھے جہاں تنہا دیکھتے فوراً والد کو جا کر مطلع کرتے کہ میاں! شبیر حسن خاں شعر کہہ رہے ہیں۔ انہیں پانچ روپے مل جاتے تھے اور مجھے تنبیہ ——— اس طرح جوش نے شاعری شروع کی۔ جب باپ نے دیکھا کہ اب انہیں روکا نہیں جا سکتا تو خود اپنے ساتھ لا کر مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی کے سپرد کر دیا۔

تخلص شبیر سے کس طرح جوش ہوا، یہ بھی ایک دلچسپ قصہ ہے۔ اس کے متعلق جوش نے ایک دفعہ خود کہا: "ابتدائے شباب و شاعری کا زمانہ تھا، لکھنؤ میں قیام تھا۔ شہر میں ایک تھیٹریکل کمپنی آئی ہوئی تھی، رات گئے چند دوست تھیٹر دیکھ کر واپس آ رہے تھے۔ اس خوبصورت ایکٹرس کا ذکر تھا جس کے حسن سے سب متاثر تھے، کچھ اشعار پڑھے جا رہے تھے، دوران گفتگو میں کسی نے کہا 'ہم لوگ بڑے جوش میں ہیں اس وقت'۔ بس نہ جانے کیسے اسی وقت یہ طے ہو گیا کہ میرا تخلص اب شبیر کے بجائے جوش ہو گا" معلوم نہیں یہ رائے کس نے دی تھی لیکن جس نے بھی یہ سوچا ہو گا اس نے جوش کی ابتدائی شاعری میں اس رومانی دور کو دیکھا ہو گا جس نے کبھی ان کا ساتھ نہیں چھوڑا۔

بہرحال جوش نے بچپن ہی سے شعر کہنا شروع کیا ہے اور بہت معمولی وقفوں کو چھوڑ کر ہمیشہ ایک تپسیا کرنے والے کی طرح شاعری کی دیوی کے قدموں پر پھول چڑھاتے رہے ہیں۔ وہ روزی کے لئے کسی قسم کا کام بھی کرنے پر مجبور ہوئے ہوں لیکن سب سے پہلے وہ شاعر ہیں پھر کچھ اور ——— ان کی زود گوئی بعض اوقات حیرت انگیز شکل اختیار کر لیتی ہے، اس حالت میں وہ اس قدر غیر واضح لکھتے ہیں کہ پڑھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ جب دوسری جنگ عظیم چھڑی اس وقت جوش کچھ دنوں کے لئے ملیح آباد اپنے مکان "قصر سحر" میں مقیم تھے، کبھی کبھی لکھنؤ آتے تھے۔ ایک دن وہاں سے چلے تو سیدھے میرے یہاں آئے اور خلاف معمول جیب سے ایک کاپی نکال کر کہنے لگے، رات ایک نظم ہو گئی ہے اور محض دس منٹ ہیں، ذرا سنئے تو ——— یہ نظم تھی "ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے"۔ میں نے سوچا اس کی ایک نقل لے لوں، ممکن ہے ضبط ہو جائے اور پھر نہ ملے۔ چنانچہ بغیر جوش کی مدد کے اس کا لکھنا ناممکن ہو گیا۔ یہ بھی لکھ دوں کہ میرے یہاں سے اٹھ کر جوش "نیا ادب" کے دفتر گئے، وہاں سبط حسن اور سردار جعفری نے یہ نظم ان سے لے کر "نیا ادب" میں شائع کر دی اور رسالہ کا وہ نمبر ضبط ہو گیا۔

یہ زود گوئی جذباتی ابال کی بھی غمازی کرتی ہے۔ جس وقت جو جذبہ ان پر طاری ہوتا ہے اس وقت وہی ان کے لئے ساری شاعرانہ صداقتیں رکھتا ہے اور وہ اسی کی گرفت میں ہوتے ہیں۔ جب اس جذبہ کی شدت کی بنا پر کوئی رائے قائم کر لیتے ہیں تو ان کی ذہانت اور طبّاعی اس کے لئے استدلال بھی تلاش کرتی ہے، رفتہ رفتہ وہ جذباتی نتائج کو منطقی نتائج سمجھنے لگتے ہیں۔ جس شخص نے بھی جوش سے علمی مسائل پر گفتگو کی ہے، وہ ان کے خیالات میں یہ خصوصیت ضرور دیکھے گا لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ پوری توجہ سے یا دلچسپی سے گفتگو ہی نہ کر رہے ہوں۔ اگر ان کو کسی طرح یہ اندازہ ہو جائے کہ گفتگو کرنے والا ان میں

نہیں ہے محض گفتگو کے لئے گفتگو کرنا چاہتا ہے، مقصد وقت گزاری ہے تو پھر ان کی گفتگو یونہی سی ہو سکتی ہے، ہو سکتا ہے کہ گفتگو کرنے والے کی صورت یا آواز انہیں اچھی نہ معلوم ہوتی ہو، اس کے ساتھ کوئی ایسا آدمی ہو جو انہیں ناپسند ہو یا اس شخص کو کبھی انہوں نے کسی ایسے شخص کے ساتھ دیکھا ہو جو معقول نہ ہو۔ ان تمام حالات میں ان کی گفتگو ٹالنے اور نامناسب جوابات سے بچنے کے لئے ہو گی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس وقت بات چیت میں طنز اور کڑواپن زیادہ ہو۔ اگر جوش کا جی لگ جائے، موضوع علمی یا ادبی ہو تو اکثر ان کی باتیں بہت دل کش اور شگفتہ ہوتی ہیں اور گفتگو کرنے والا مایوس نہیں ہوتا۔

جوش کی شراب نوشی کا مطالعہ بھی کئی دلچسپ پہلو رکھتا ہے۔ اس کے کچھ آداب اور ضوابط ہیں، معین وقت ہے، تقریباً معین نشہ کی کیفیت ہے مخصوص لوگوں کے ساتھ مختلف کیفیتیں وابستہ ہوتی ہیں، شراب ملتی ہے، گنگناتی ہے، بولتی ہے، خوب بولتی ہے اور خاموش رہتی ہے۔ بعض اوقات صحبتیں خراب ہو جاتی ہیں بعض اوقات یادگار بن جاتی ہیں۔ جوش نے متعدد مقامات پر اور متعدد اشعار میں اس کا اظہار کیا ہے کہ جب آفتاب غروب ہونے کے قریب ہوتا ہے تو میں پیمانہ بکف طلوع ہوتا ہوں۔ اس کا اثر سہ پہر ہی سے شروع ہو جاتا ہے، تیاریاں ہونے لگتی ہیں اور سب تیار ہو کر بیٹھ جاتے ہیں، پھر جام میں شراب انڈیلی جاتی ہے اور "بنام فلاں بنت فلاں" دور چلنے لگتے ہیں۔ باتیں ہر سطح پر پہنچتی ہیں اور جوش بزم کے صدر کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ اس بزم میں سب سے زیادہ احمق وہ شخص ہوتا ہے جو محض تماشائی ہو، کبھی کبھی وہ طنز و استہزا کا نشانہ بنتا ہے، کبھی اس پر رحم کیا جاتا ہے کبھی اس کی بزدلی پر افسوس۔ ایسی مجلسوں میں ہر قسم کا ظرف رکھنے والے ہوتے ہیں، کوئی دو ہی جام میں چھلک کر بیکار ہو جاتا ہے کوئی دیر تک جوش کا ساتھ دیتا ہے۔ وہ احتیاط سے پیتے ہیں اور عام طور سے مدہوش نہیں ہوتے۔ ایک بار ایک ایسی ہی محفل میں جو کئی مشہور پینے والوں کو مستی کے اس عالم میں پہنچا چکی تھی جہاں صرف وہی ہوتے ہیں، میں نے محسوس کیا کہ جوش بھی بہک رہے، وہ کھڑے ہوئے تو بار بار قدم ادھر ادھر پڑ رہے تھے۔ ایک دفعہ مجھے معلوم ہوا کہ جیسے وہ گر رہے ہیں، میں نے ہاتھ پیٹھ پر رکھ کر اپنے خیال میں انہیں سنبھالنا چاہا، جوش نے قہقہہ لگایا اور کہا میں بالکل حواس میں ہوں آپ کو آزما رہا تھا کہ آپ حواس میں بھی میری مستی کا اندازہ لگا سکتے ہیں یا نہیں۔ اس بزم ناؤ نوش کی حیثیت کبھی کبھی دربار کی سی ہو جاتی ہے۔ لوگوں کا اٹھنا بیٹھنا، چلنا پھرنا، باتیں کرنا تمام چیزیں ایک خاص نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں۔ میں اکثر اس دربار کی رونق کو برہم کرنے کا جرم کر دیتا ہوں اور دلچسپ فقرے سنتا ہوں۔ لیکن اسی بزم میں جوش اپنی تازہ ترین اور پسندیدہ نظمیں سناتے ہیں۔ دوسروں کے اچھے اشعار پڑھتے ہیں۔ اشعار کی بعض خوبیوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور داد چاہتے ہیں۔ وہاں کبھی مصرعے اٹھاتے ہیں اور کبھی فردوسی اور رودکی کا مرتبہ حاصل کرتے ہیں، کبھی سخن شناس معلوم ہوتے ہیں اور کبھی جی کھول کر داد دیتے ہیں۔ یہاں نظموں کی تنقید نہیں ہو سکتی، دنیا کے بڑے سے بڑے شاعر کی حیثیت پست ہوتی ہے اور جوش غیر معمولی نشاط اور اطمینان محسوس کرتے ہیں۔ اگر اس محفل میں کوئی ایسا ہوا جو "نامطبوع" ہے یا جوش کا جی نہ چاہتا ہو تو (نناوے فی صد) ایسا ہوتا ہے کہ جوش کوئی نظم نہیں سناتے۔

جو شخص جوش کی مکمل سوانح عمری لکھے گا وہ اس مجلس سے نتائج اخذ کرے گا، بزم میں بیٹھنے والوں کا ذکر کرے گا اور اس کی تفصیلات پیش کر کے جوش کے کردار پر روشنی ڈالے گا کیونکہ یہاں کے لطائف اور ظرائف، لوگوں کے متعلق رائیں، ماضی کی طرف بازگشت اور بیتی ہوئی یادوں کے تذکرے سب معنی خیز ہوتے ہیں، جوش مستقبل سے زیادہ ماضی کے واضح نقوش ابھار سکتے ہیں اور جب عالم کیف میں گذرے ہوئے دن نگاہوں کے سامنے رنگین تصویریں بنا رہے ہوں اس وقت معمولی معمولی اشاروں میں بھی جوش بہت سی کام کی باتیں کہہ جاتے ہیں۔ ان باتوں کو بدحواسی کی گفتگو سمجھنا درست نہ ہو گا کیونکہ میں نے یہی باتیں اور تقریباً انہیں الفاظ میں دوسرے اوقات میں بھی سنی ہیں۔

غیر مستی اور ہوش کے عالم میں جوش کی حالت میں کوئی بڑا فرق اس کے سوا نہیں ہوتا کہ رات کو ان کے موضوعات گفتگو محدود ہو جاتے ہیں اور کچھ الفاظ کے استعمال میں بے احتیاطی برتنے لگتے ہیں۔ حالانکہ میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ جب کبھی ایسی صحبتوں میں ڈاکٹر رشید جہاں مرحومہ یا ہاجرہ بیگم یا کوئی اور ایسی ہی ذی وقار خاتون موجود ہوتیں تو جوش کبھی سنجیدگی نہیں کھوتے تھے۔ ویسے ان سے بدحواسیاں تو ایک خاص رنگ میں ہوش و حواس کے عالم میں

بھی سرزد ہوتی ہیں جن میں سے چند کا ذکر انہوں نے اپنے رسالہ 'کلیم' میں بھی کیا تھا لیکن ان کا تعلق ایک طرح کی خود فراموشی سے ہے۔

ایک اور ضروری اور اہم پہلو ——— جوش نے اپنے بچپن کے واقعات میں ایک ایسے رجحان کا بھی ذکر کیا ہے جس سے اُن کے کردار پر تیز روشنی پڑتی ہے۔ ایک جگہ وہ لکھتے ہیں کہ:

'شاعری سے جب فرصت پاتا تھا تو یہ میرا محبوب ترین مشغلہ تھا کہ ایک اونچی میز پر بیٹھ کر اپنے ہم عمر بچوں کو، جو جی میں آتا تھا اناپ شناپ درس دیا کرتا تھا۔ درس دیتے وقت میری میز پر ایک پتلا سا بید رکھا رہتا تھا اور جو بچہ توجہ کے ساتھ میرا درس نہیں سنتا تھا اسے میں بید سے اس بری طرح مارتا تھا کہ بیچارہ چیخیں مار کر رونے لگتا تھا، اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ میں کسی کند ذہن بچے کے کاندھوں پر سوار ہو کر اسے اس طرح بید مار مار کر دوڑاتا کہ وہ عزیب بے دم ہو کر گرنے لگتا ——— اور میرے مزاج کی یہی وہ بنیادی کجی ہے جو میری سیاسی خطیبانہ شاعری میں تلخ و ترش بن کر آج بھی نمودار ہوتی رہتی ہے اور میری شاعری کا لفا میرے لہجے کی درشتی پر چیخ چیخ اٹھتا ہے۔'

یہ اقتباس دلچسپ حقائق کا حامل ہے۔ میرے خیال میں صرف اتنی ہی بات نہیں ہے، بچپن میں درس دینے کا مشغلہ بڑی عمر میں پیمبری اور رہبری کی خواہش میں تبدیل ہو گیا ہے۔ بچپن میں جو بچے درس کی طرف متوجہ نہ ہوتے تھے وہ سزا پاتے تھے اور آج جو لوگ جوش کی شاعری پر دھیان نہیں دیتے انہیں جوش اپنے مخصوص انداز میں گونگا، بہرا، اندھا، جاہل اور نہ جانے کیا کیا کہہ ڈالتے ہیں مثلاً ؎

اندھوں سے جب پڑا ہو نمانے میں سابقہ
اے جوش آپ یوسفِ کنعاں ہوئے تو کیا

صد حیف کہ قدرت سے ملا ہے یہ حکم — بہروں کو سنائے جا ترانہ اپنا

اس کے علاوہ بید مارنے میں بھی گہرے نفسیاتی رمز ہیں جن میں سے بعض طنز، صاف گوئی، نازک مزاجی، سریع الحسی اور کسی حد تک ایذا دہی میں لذت اندوزی کے جذبات کی شکل میں آج بھی نمایاں ہوتے ہیں۔ یہ پہلو روز بروز بڑھتے جا رہے ہیں۔ طنز شاعری اور گفتگو میں زیادہ جگہ پانے لگا ہے۔ احساسِ برتری رسمی تعلی کے پردوں کو چیر کر نمایاں ہوتا جا رہا ہے۔ یہ احساسِ برتری محض ایک نفسیاتی کیفیت نہیں ہے۔ حالات نے انہیں اس کا موقع بھی دیا کہ وہ بچپن سے اس وقت تک اس کو اپنے رگ و پے میں محسوس کریں۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ جا ہے جن دوسرے عناصر نے یہ بات پیدا کی ہو لیکن سب سے زیادہ جس چیز نے ان میں یہ خود اعتمادی، خود بینی اور احساسِ فخر پیدا کیا وہ ان کی شاعری ہے۔ اسی چیز نے انہیں ہر میدان میں عزت بخشی، اسی نے انہیں ہندوستان کے مختلف حلقوں میں سربلند کیا اور اسی نے انہیں آج یہ موقع دیا ہے کہ وہ بے جھجک، وقت بے وقت پنڈت نہرو اور مولانا آزاد سے بھی صاف صاف باتیں کر آتے ہیں اور وہ ان کے غرورِ شاعرانہ کو ہنسی خوشی برداشت کرتے ہیں۔ جو کچھ بھی ہو شاعری نے ان کے مزاج میں ایک بانکپن اور شخصیت میں ایک دلکشی پیدا کی ہے جس کی وجہ سے ان کی نازنین بننے اور ناز برداری کرانے کی تمنا برابر پوری ہوتی رہتی ہے۔

شدتِ جذبات اور سریع الحسی نے جوش میں بہت سے متضاد عناصر پیدا کر دیئے ہیں اور چونکہ وہ سب باتیں ان کی شاعری اور گفتگو میں نمایاں جگہ پا چکی ہیں اس لئے جوش ان سے دست بردار بھی نہیں ہوتے۔ گو تفکر بچپن سے انہیں عزیز رہا ہے اور انہوں نے اسے سینے سے لگائے رکھا ہے لیکن ان کا ذہن طبعاً جذباتی ہے منطقی نہیں ہے۔ ان کی منطق بھی جذبات ہی کی گود میں پرورش پاتی ہے۔ مذہب، خدا، حیات بعد موت،

جبر و اختیار، مقصدِ حیات، علم الانسانی، عقل و عشق، جنون و حکمت ان تمام مسائل پر انہوں نے غور کیا ہے اور حسین ترین شاعرانہ انداز میں ان کے نازک مقامات کو پیش کیا ہے لیکن ہر مقام پر عقل اور جذبہ کی آویزش اتنی شدید رہی ہے کہ مفکر جوش کو شاعر جوش نے اکثر شکست دے دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایک طرف مطلق جبر کے قائل ہیں اور دوسری طرف انسان کو عمل پر اکسا کر خدا بننے اور نئی کائنات کی تشکیل کرنے کی دعوت دیتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ دونوں باتیں جبر کے تحت ہو رہی ہیں۔ یہاں ان کے خیالات اور معتقدات کی بحث بے محل ہو گی۔ کہنے کا مقصد صرف اتنا ہے کہ جوش جذبے کی والہانہ تندی اور شدت کی گرفت میں اس طرح آجاتے ہیں کہ ان کی شعوری کوششیں بھی اسی میں رنگ جاتی ہیں، اس میں ان کے خلوص یا ان کی صداقت پر حرف نہیں آتا۔

اس جذباتیت کی بہت سی مثالیں ان کی زندگی سے دی جا سکتی ہیں۔ وہ ہر شخص کی سفارش کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں کیونکہ وہ کسی کو تکلیف میں نہیں دیکھ سکتے۔ اس میں انہیں یہ بھی یاد نہیں رہتا کہ وہ ایک ہی جگہ کے لئے کئی آدمیوں کی سفارش کر رہے ہیں۔ جوش مردم شناس نہیں ہیں، انہیں اس میں دھوکا ہوتا رہتا ہے لیکن جب وہ ایک دفعہ ایک رائے قائم کر لیتے ہیں تو اس کے مخالف پچاس دلیلیں اور واقعات بھی ان کے پہلے نقش کو مٹا نہیں سکتے۔ اس میں ان کی کوئی غلطی یا بدنیتی شامل نہیں ہوتی۔ اس جذباتیت کی ایک اور شکل کبھی کبھی یادگار حیثیت بھی اختیار کر لیتی ہے۔ غالباً ۱۹۳۵ء کی بات ہے۔ الٰہ آباد یونیورسٹی کے مسلم بورڈنگ ہاؤس میں وہاں کا شاندار سالانہ مشاعرہ تھا۔ یہ مشاعرہ برسوں سے ہوتا آیا تھا۔ ایک طرف چلمن ڈال کر کچھ عورتوں کے بیٹھنے کا انتظام ضرور کر دیا جاتا تھا۔ لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ مردوں کی صف میں خواتین بیٹھ کر مشاعرہ سنیں۔ اتفاق سے اس دن الٰہ آباد میں ہاجرہ بیگم، ڈاکٹر رشید جہاں (مرحومہ) اور بعض دوسری خواتین موجود تھیں، ان لوگوں نے مشاعرہ میں شرکت کی خواہش ظاہر کی۔ معلوم ہوا کہ چلمن کے پیچھے بیٹھ کر سنیں تو سنیں ورنہ مجبوری ہے۔ ان لوگوں نے جوش سے کہا کہ ہم تو سامنے ہی بیٹھ کر سنیں گے، آپ کچھ مدد کیجئے۔ جوش نے منتظمین سے کہلا بھیجا کہ جب تک ان خواتین کو مشاعرے میں بیٹھنے کی اجازت نہیں دی جائے گی میں شریک نہیں ہوں گا۔ تھوڑی دیر کے بعد مشاعرے کے دروازے پر آ کھڑے ہوئے اور بہت سے شعراء ان کی وجہ سے باہر ہی رہے۔ اچھی خاصی ہلچل رہی۔ یہاں تک کہ ان خواتین کو مشاعرے میں بیٹھنے کی اجازت دی گئی۔ اس سے کچھ ہی دن پہلے انہوں نے اپنی نظمیں "خاتونِ مغرب" اور "خاتونِ مشرق" لکھی تھیں۔ اب تو جوش ان نظموں کو ایامِ جاہلیت کی نظمیں کہتے ہیں اور سماج میں عورت کے مقام کے متعلق ان کے خیالات میں کچھ تبدیلیاں بھی ہوئی ہیں لیکن اس کا اظہار ابھی تک واضح شکل میں صرف "حرفِ آخر" کے ایک مقام پر ہوا ہے جس سے بہت تھوڑے سے لوگ واقف ہیں۔ جوش میں عجیب طرح سے ایک بت پرست اور بت شکن کی روح مل گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے سمجھنے میں دشواری پیش آتی ہے اپنی ایک رباعی میں وہ لکھتے ہیں:

عفریت، خبیث، دیو، اژدر، شیطاں
درویش، اقطاب، امام، مرسل، یزداں
گیتی، گردوں، بہشت، دوزخ، اعراف
یہ سب ہیں مرے دل میں خروشاں و تپاں

جوش کا سینہ کتنے متضاد اور متصادم عناصر کی جولاں گاہ ہے! کیا ان کی شخصیت میں ان کا اظہار نہیں ہوگا؟ پھر کیا جوش کی شخصیت ایک پارہ پارہ شخصیت ہے؟ نہیں ایسا نہیں ہے۔ ان کا کردار ایک ایسے ذہین، ذکی اور زود حس انسان کا کردار ہے جو عمل میں کم اور خیال میں زیادہ اپنے ماحول اور گرد و پیش کے واقعات سے متاثر ہوتا ہے، یعنی ان کا ذہن جن تاثرات کو بجلی کی طرح قبول کر لیتا ہے ان کا اظہار ان کے تخیل کا رنگ میں فوراً ہو جاتا ہے چاہے عمل میں نہ ہو سکے۔ یہ چیز ان کے افتادِ مزاج سے ہم آہنگ ہے کیونکہ جوش میں ناز برداری کے متمنی ایک عیش پسند کی روح سے جس کا

بچپن پسرلوں کی سیج پر گذرا، جو محبت میں کامیاب رہا، جس نے اپنی راتیں زلفوں کے سائے میں گذاریں، جو اپنے حسبِ توقع نہ سہی پھر بھی ملک کی ایک متاعِ عزیز بننے میں کامیاب ہوا۔ جوش کی عملی اور خیالی زندگی میں یہ تضاد حقیقتاً جنون و حکمت کی کشمکش کا وہی پہلو ہے جو ہر ایسے حساس انسان کے یہاں نمایاں ہوتا ہے جسے عمل کی زندگی میں وہ سب کچھ کرنے کا موقع نہیں ملتا جو وہ سوچتا ہے یا سوچ سکتا ہے۔ سریع الحسی جلد بازی ہے جو جوش بھی بہت جلد نتائج تک پہنچنا چاہتے ہیں۔ جو باتیں ان کے جذبات سے ہم آہنگ ہوں انہیں وہ جلد قبول کر کے ایک نئی قوت سے پیش کرتے ہیں ان پہلوؤں کو نہیں دیکھتے جنہیں دوسرے دیکھ سکتے ہیں اور دوسرے نتائج نکال سکتے ہیں۔

ان حالات میں اگر جوش کی شاعری اور کردار کے سمجھنے میں الجھنیں پیدا ہو رہی ہیں تو تعجب کی کیا بات ہے! ان کے مذہبی اور سیاسی معتقدات محض ایک ذہنی کیفیت کا پتہ دیتے ہیں۔ ان کی سماجی زندگی وضع کی پابندی اور آزادی کی آمیزش کا ایک عجیب مجموعہ ہے۔ ان کی گفتگو بھولے پن اور لاابالی ہوشیار دونوں کیفیات سے بھری ہوئی ہوتی ہے اس لئے دو چار ملاقاتوں میں انہیں سمجھنا آسان نہیں ہے۔ مجموعی طور پر ان کی شخصیت اور شاعری دونوں کے متعلق رائے دینے میں جلد بازی مفید نہیں ہوگی۔

سالک صاحب

احمد ندیم قاسمی

شروع ہی میں بتا دوں کہ میں سالک صاحب کی شخصیت کو ان چند صفحات میں سمیٹنے سے قاصر رہوں گا۔ اس عجز کا اعتراف ہی میں خیریت ہے کیونکہ جس شخصیت میں مشرق کا کلچر مجسم ہو گیا ہو اس کا کما حقہٗ احاطہ کرنا میرے بس کی بات نہیں اور جس طرح ایشیائی کلچر کی ان گنت، ایک سے ایک دلآویز موتیوں کی طرح جگمگاتی ہوئی پرتیں ہیں، اسی طرح سالک صاحب کی شخصیت کے بھی بے شمار محبوب پہلو ہیں اور اگر میں ان سب کا ذکر کرنے بیٹھوں گا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ میں ایک ضخیم کتاب تصنیف کر رہا ہوں حالانکہ مدیرِ نقوش نے مجھے صرف ایک 'اسکیچ' لکھنے کو کہا ہے۔

شعر و افسانہ کی دنیا میں میرے ذہن نے جو بھی موضوع سوچا ہے اس سے میں نے بہت کم شکست کھائی ہے۔ میں نے موضوع کو فنی تخلیق پر کبھی مسلط نہیں ہونے دیا بلکہ میری کوشش ہمیشہ یہ رہی ہے کہ میں تخلیقی عمل کے دودھ میں موضوع کو کھانڈ کی طرح گھول لوں۔ مگر میں سالک صاحب کی شخصیت کا ایک ذرا سا پرتو پیش کرنے کے تصور ہی سے کانپ رہا ہوں۔ اس موضوع اور میرے تخلیقی جذبے کے درمیان بہت بڑا فاصلہ ہے اور یہ فاصلہ افق تا افق کا نہیں، فراز و نشیب کا فاصلہ ہے۔ آپ کہیں گے 'یہ ندیم نہیں بول رہا، ندیم کی بے پناہ عقیدت بول رہی ہے۔ آپ نے صحیح اندازہ لگایا ہے اور سالک صاحب کے متعلق کچھ لکھتے ہوئے میرے قلم کی روانی کو اسی عقیدت نے جکڑ رکھا ہے۔

سالک صاحب کے اور میرے درمیان عقیدت و شفقت کا رشتہ ہے۔ عقیدت میری اور شفقت ان کی۔ اور گزشتہ اٹھارہ برس کے طویل عرصے میں نہ میری عقیدت میں کوئی کمی آئی ہے اور نہ ان کی شفقت میں۔ حالانکہ ہماری راہیں عموماً الگ الگ رہی ہیں بلکہ اکثر اوقات ہم دو قطعی مخالف راہوں پر گامزن رہے ہیں۔

میں مولانا ظفر علی خان کے نیلی پوشوں میں شامل تھا کیونکہ مولانا نے مسلمانوں کو حکم دیا تھا کہ مسجد شہید گنج کے حصول کی خاطر نیلی پوش ہو جاؤ — "نہ خدا کا نام لو اور عاقبت بر دوش ہو جاؤ۔" میں نے سفید لٹھے کی تہمد قمیص کو نیلے رنگ میں ڈبو لیا اور بزعم خود غازی بنا لاہور کی سڑکوں پر ٹہلتا رہا، مگر نیلی پوشوں کے معاملے میں سالک اور مہر کے "انقلاب" کا رویہ کچھ ایسا ہمدردانہ نہیں تھا۔ میرا عنفوانِ شباب تھا۔ رائے کے ذرا سے اختلاف کو دشمنی قرار پا جانا چاہئے تھا مگر سالک صاحب سے میری عقیدت بدستور رہی۔ اس وقت بہ طفیلِ عقیدت غزل کے چند اشعار "ہجرا" کے ترجمے اور "افکار و حوادث" کے کالم تک محدود تھی)۔ پھر میں نے اس علاقے میں مسلم لیگ کا پرچم بلند کیا جس کی نمائندگی صوبائی اسمبلی میں ملک خضر حیات خان ٹوانہ کر رہے تھے—

ملک صاحب پنجاب کے وزیرِ اعلیٰ تھے تو "انقلاب" ملکی پیمانے پر مسلم لیگ کا ہمنوا ہونے کے باوجود صوبائی مسائل میں ملک صاحب کی یونینسٹ پارٹی کا حامی تھا۔ پنجاب میں قائداعظمؒ کی تشریف آوری کے بعد ان سے ملک خضر حیات خان کے شدید اختلاف اور "انقلاب" کی یونینسٹ حکمتِ عملی ملک بھر میں ہدفِ طعن بن رہی تھی اور خود مجھے بھی "انقلاب" کی صوبائی پالیسی کے لفظ لفظ سے اختلاف تھا مگر سالک صاحب سے میری عقیدت مندی میں شمہ بھر بھی فرق نہ آیا۔ اس وقت تک میں سالک صاحب کی شخصیت سے بھی متعارف اور متاثر ہو چکا تھا۔ قیامِ پاکستان کے بعد جب ترقی پسند ادب کی تحریک زوروں پر تھی اور بعض علماء کا واحد وظیفۂ حیات یہ رہ گیا تھا کہ وہ ترقی پسند ادیبوں کے خلاف نت نئے فتوے جاری کریں۔ پھر جب اس رو میں سالک صاحب کے اور میرے بعض مشترک احباب بھی بہ گئے اور انہوں نے میرے نظریۂ فن سے اختلاف کی وجہ سے مجھے ننگی گالیوں سے بھی نوازا، اور جب خود سالک صاحب کے بیٹے اور میرے دوست مسٹر عبدالسلام خورشید کو بھی اس ادبی انجمن سے متعدد اختلافات پیدا ہو گئے جس کا میں سیکرٹری تھا تو جب بھی سالک صاحب سے میری عقیدت کا وہی عالم رہا۔ اس سارے سلسلۂ واقعات کا نقطۂ اوج یہ ہے کہ حکومت نے مجھے کچھ عرصہ کے لئے تدارکی نظربندی کے تحت جیل بھیج دیا اور سالک صاحب "انقلاب" کے بند ہو جانے کے بعد کسی سرکاری محکمہ سے منسلک ہو گئے لیکن جب میں رہا ہوا تو سب سے پہلے جس شخص نے میرے گھر آ کر مجھے اپنے سینے سے لگایا وہ سالک صاحب ہی تھے۔ آج میں سالک صاحب کی طرح ایک روزنامے کا ایڈیٹر ہوں اور سالک صاحب میری طرح گھر میں بیٹھ کر تصنیف و تالیف میں مصروف ہیں۔ ایک ہی شہر میں رہتے ہوئے ہم مہینوں ایک دوسرے سے نہیں مل سکتے۔ لیکن اگر اس عالم میں بھی کوئی مجھے یہ بتائے کہ سالک صاحب کچھ عرصہ کے لئے لاہور سے باہر جا رہے ہیں تو میں اُداس ہو جاؤں گا اور میرے لئے لاہور ایک دم خالی ڈھنڈار ہو کر رہ جائے گا۔ سو میری عقیدت کا معیار وہی ہے اور اس کے ساتھ ہی سالک صاحب کی شفقت کا بھی۔

ایک ایسی محدود و مصنفِ ادب اتنی طویل تمہید کی یقیناً متحمل نہیں ہو سکتی لیکن یقین کیجئے کہ یہ خالی خولی تمہید نہیں تھی۔ سالک صاحب کی شخصیت کے ایک نہایت ہی دل آویز رخ کا ایک ایسا اظہار تھا جس میں راقم الحروف کی "میں" کو ان تمام افراد کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے جو سالک صاحب سے متعارف ہیں اور جنہوں نے اس ازلی و ابدی مسکراہٹ کو قریب سے دیکھا ہے جسے میں نے صرف ایک بار ان کے ہونٹوں سے غائب پایا تھا۔

یہ ۱۹۴۶ء کا واقعہ ہے۔ میں "نروس بریک ڈاؤن" کا مریض تھا۔ اچانک پسینے چھوٹ جاتے۔ ہاتھ پیر سُن ہونے لگتے اور میں "حاضرین" کو وصیت تک کر دیتا۔ سالک صاحب نے میری حالت دیکھی تو فوراً سے اُٹھے۔ مجھے چیمبرلین روڈ کے چوک میں حکیم دینا ناتھ کپلی کے یہاں لے آئے اور انہیں میرے مرض کی کیفیت بتانے کے بعد کہا کہ "اگر آپ نے ندیم کو تندرست نہ کیا تو میں "افکار" میں آپ کو نیم حکیم کوہلو ناتھ دہلی لکھ دوں گا۔" حکیم صاحب ادب دوست اور با ذوق بزرگ تھے۔ میرا معائنہ کیا اور اچانک چونک کر سالک صاحب سے کہا "ندیم کا دل دس بارہ ضربوں کے بعد ایک ضرب "مِس" کر جاتا ہے" اور اس وقت میں نے سالک صاحب کی ازلی و ابدی مسکراہٹ کو ان کے ہونٹوں سے غائب ہوتے دیکھا۔ الگ جا کر دونوں بزرگ کچھ کھسر پھسر کرتے رہے۔ واپس آئے تو دونوں مسکرا رہے تھے۔ دونوں نے مجھے بہلانے کی کوشش کی۔ حکیم صاحب نے کہا "جس چیز کے لئے جی چاہے وہی کھاؤ البتہ دال مت کھاؤ۔ دال ہم لالاؤں کا کھاجا ہے، اسے ہمارے لئے رہنے دو۔"

ہم مطب سے باہر نکلے تو چند بچے مسلم لیگ کے جھنڈے اُٹھائے نعرے لگاتے جا رہے تھے۔ سالک صاحب نے حکیم صاحب سے کہا: "آج کل تو جسے دیکھو آپ کے ہری چند اختر کو بانس پر اٹھائے پھرتا ہے۔"

حکیم صاحب نے لطیفے سے محظوظ ہونے میں دیر لگائی تو سالک صاحب نے بتایا کہ جھنڈا ہرا (ہری) ہے اور اس پر چاند (چند) ستارے (اختر) کا نشان ہے۔ اور ——— "ظالم اب تو ہنس دو!"

اور میں اپنی آدھی بیماری وہیں کہیں راستے ہی میں جھٹک آیا۔

سالک صاحب کی محبوبیت، ان کا خلوص، ان کی فراخ دلی، وسیع المشربی اور نیک نیتی ان کی اسی مسکراہٹ میں سمٹ آئی ہے اور یہی مسکراہٹ

اٹھا کر دھاڑ ہے اور جب یہ مسکراہٹ لمحے بھر کے لئے غائب ہوتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ان پر کوئی حادثہ گزر گیا ہے۔ ان "حادثوں" کی نوعیت کیا ہوتی ہے؟ اس کی ایک جھلک تو اوپر کے واقعہ میں موجود ہے مگر ایک مثال اور بھی سن لیجئے۔

آغا شورش کاشمیری نے ایک بار ایک جلوس کی رہنمائی کرتے ہوئے دفتر "انقلاب" پر حملہ بول دیا اور انقلاب کے دفتر اور پریس میں کچھ دیر تک توڑ پھوڑ کا سلسلہ جاری رہا۔ چند روز کے بعد حکومت نے شورش صاحب کو نظر بند کر دیا۔ جب سالک صاحب کو ان کی گرفتاری کی اطلاع ملی تو آپ کے لبوں سے مسکراہٹ غائب ہو گئی اور وہ بولے "یہ حکومت کو آخر ہو کیا گیا ہے۔ شورش ذرا سا جذباتی ضرور ہے مگر جذباتیت پر تو غصے کے بجائے پیار آنا چاہئے اور بد ذوق حکومت کو شورش پر ہمیشہ غصہ ہی آتا ہے، پیار کبھی نہیں آیا۔"

علاوہ مبالغے کی حد تک وسیع القلبی اور نرم دلی صرف ان لوگوں کے لئے مخصوص نہیں جو سالک صاحب سے متعارف ہیں۔ میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ ایک عجیب الخلقت بھلے سال بزرگ دفتر انقلاب میں آئے اور بتایا کہ وہ ضلع گوجرانوالہ کے کسی گاؤں کے باشندے ہیں۔ ان کا بیٹا پٹوار کی تربیت حاصل کر رہا تھا کہ اچانک اسے جواب مل گیا اور وہ چاہتے ہیں کہ محکمہ مال کے کسی خدا ترس اور منصف مزاج افسر سے ان کے بیٹے کے حقوق کا لحاظ رکھنے کی درخواست کی جائے ——— ظاہر ہے کہ عام حالات میں ایسے لوگوں کو ٹالا جاتا ہے۔ مگر سالک صاحب اٹھے، پگڑی ہاتھ میں لی، سائل کو ہمراہ لے کر تانگے میں بیٹھے اور سیکرٹریٹ میں جا کر اس وقت تک وہاں سے نہ ہلے جب تک اس بزرگ کے بیٹے کی ٹریننگ کی اجازت نہ لے لی۔

میں سالک صاحب کی اس خدا ترسی کو ایک آزمائش میں ڈالنے کا بھی گنہگار ہوں۔ خود سالک صاحب کو بھی معلوم نہیں ہوگا کہ ایک بار میرے ایک عزیز سالک صاحب سے کوئی سفارش حاصل کرنے کے لئے میرے پاس آئے۔ کام ایسا بھونڈا سا تھا کہ میں سالک صاحب کے سامنے اس کا ذکر کرتے ہوئے جھجکتا تھا۔ مزاروں، مجاوروں کا کوئی قصہ تھا اور سالک صاحب نے "پیر افکار شاہ" کی حیثیت سے مسلمانوں کی قبر پرستی پر بڑی زبردست چوٹیں کی ہیں۔ سو میں نے ایک ترکیب سوچی۔ اپنے عزیز سے کہا کہ میں سالک صاحب کو بلا ناغہ ایک نہ ایک کام کہتا ہوں۔ آج کا "کوٹا" آپ کے آنے سے پہلے پورا ہو چکا ہے مگر میں نے سنا ہے کہ سالک صاحب سے امداد حاصل کرنے کے لئے کسی تعارف کی ضرورت ہی نہیں۔ آپ سیدھے ان کے پاس چلے جائیے، یہ بھی نہ بتائیے کہ آپ میرے رشتہ دار ہیں۔ اپنی مظلومیت کا ذکر کیجئے اور پھر دیکھئے پردۂ غیب سے کیا ظہور میں آتا ہے۔

میرے عزیز دفتر "انقلاب" میں گئے اور دو تین گھنٹے تک واپس نہ آئے۔ میں نے فون کیا تو معلوم ہوا کہ سالک صاحب دو تین گھنٹے پہلے کسی شخص کے ساتھ اٹھ کر چلے گئے ہیں۔ کچھ دیر کے بعد میرے عزیز واپس آئے اور معلوم ہوا کہ سالک صاحب نے ان سے بے انتہا ہمدردی کی۔ پہلے فون کیا لیکن جب انہیں محسوس ہوا کہ فون پر انہیں ٹرخانے کی کوشش کی گئی ہے تو وہ انہیں ساتھ لے کر متعلقہ افسر کے پاس پہنچے اور کام کرا کے اٹھے جب واپس آنے لگے تو اس افسر نے سالک صاحب سے کہا "کام تو میں نے کر دیا مگر قبلہ! مجھے یہ وہم بھی نہ تھا کہ آپ ایسے معاملات میں بھی دلچسپی لے سکتے ہیں۔" اور سالک صاحب نے مسکرا کر کہا "یہ تو ایک بزرگ کے مزار کا معاملہ تھا اور بعض لوگ تو میرے پاس اپنے محلے کی مسجد کے لئے سستے داموں پر مٹی کے ڈھیلوں کا انتظام کرانے آ نکلتے ہیں!"

سالک صاحب کے پاس اس قسم کے ضرورت مندوں کا ہمیشہ تانتا لگا رہتا ہے۔ اور آج بھی جب وہ ایک حد تک گوشہ نشین ہو چکے ہیں، ضرورت مند انہیں جا ہی لیتے ہیں اور اگر ضرورت معقول ہو (یعنی مٹی کے ڈھیلوں کی سی ضرورت نہ ہو) تو حسب عادت ان کے ساتھ چل کھڑے ہوں گے۔ بلکہ اب تو انہوں نے موٹر کار بھی خرید لی ہے اور میری ذاتی رائے یہ ہے کہ یہ تکلف بھی انہوں نے محض اس لئے کیا ہے کہ لاہور سے ان کے پاس مسلم ٹاؤن آنے والوں کو واپسی میں تکلیف نہ ہو۔

"ضرورت مندوں" کی ایک اور قسم کا بھی ان کے ارد گرد ہمیشہ ہجوم رہا ہے۔ یہ ادب و فن، شعر و نغمہ اور لطافت و جمال کے "ضرورت مند" ہیں، اور سالک صاحب کی انجمن آرائی گزشتہ ربع صدی کی علمی و ادبی دنیا کی ایک حقیقت بن چکی ہے۔ جس محفل میں بیٹھیں گے آن کی آن میں جانِ محفل بن جائیں گے۔

اور گفتگو صرف لطیفہ اور پھبتی تک محدود نہیں ہوگی بلکہ دنیا جہان کا کوئی سا موضوع لے آیئے اور ع

اک ذرا چھیڑیئے پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے

معلومات کا ایک دریا رواں ہو جاتا ہے۔ اور پھر یہ بھی نہیں کہ ان معلومات میں علم کی خشکی یا ضرورت سے زیادہ سنجیدگی کی یبوست راہ پا جائے —
سالک صاحب بنیادی طور پر فن کار ہیں اور اگرچہ اردو صحافت میں ان کا درجہ بہت بلند ہے مگر وہ اوّل و آخر شاعر ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ بات تاریخ کی ہو یا فلسفے کی، نفسیات کی ہو یا جغرافیے کی، سائنس کا کوئی موضوع ہو یا سیاسیات کا، توحید کا ذکر ہو رہا ہو یا الحاد کا، ان کی گفتگو کی ادبی چاشنی برقرار رہے گی۔ ایک بار سائنس کی ترقی کا ذکر چلا۔ سائنس کی ترقی کو ماقبل تاریخ کے دور سے شروع کیا اور جب وہ اٹھارویں انیسویں صدی تک آئے تو مجھے نام یاد نہیں) کسی ایسے سائنس دان کا ذکر کر رہے تھے جس نے اپنی تحقیقات تو مکمل کر لی تھیں اور وہ ایجاد کی حدوں تک بھی پہنچ گیا تھا مگر وہ اپنی ایجاد کو مناسب انداز میں اہلِ علم کے سامنے پیش نہ کر سکا اس لئے کسی نے اس پر اعتماد نہ کیا اور تمام عمر اسے یہی حسرت رہی کہ وہ ایجاد کننے کے باوجود موجد نہ کہلا سکا۔ اسی سلسلے میں سالک صاحب نے کہا کہ سائنس دان کی کیفیت میرزا بیدل کے اس شعر کی سی تھی —

ہمہ عمر با تو قدح زدیم و نہ رفت رنجِ خمارِ ما
چہ قیامتے کہ نمی رسی ز کنارِ ما بہ کنارِ ما

ایک بار ترقی پسند ادب کی تحریک کا ذکر چلا تو کہنے لگے کہ تاریخ کے ہر دور میں اپنے زمانے سے کچھ آگے بڑھ کر سوچنے والے اور اپنے وقت کے نقائص پر بیزار ہو جانے والے موجود رہے ہیں۔ دور کیوں جاؤ یہی دیکھ لو کہ ذوق کے زمانے میں غالب بھی موجود ہے اور امیر مینائی کے زمانے میں حالی کی آواز بھی آ رہی ہے اور نوح ناروی کے وقت میں اقبال کا نغمہ بھی گونج رہا ہے۔ اور پھر یہ تو اب کی بات ہے۔ آج سے چار صدی پہلے فیضی وہی بات کہہ گیا ہے جسے تم لوگ قطعی نئی بات سمجھ کر اس پر اپنے فن کی تعمیر اٹھا رہے ہو۔ دیکھو فیضی کی یہ رباعی دسویں صدی ہجری کی پیداوار معلوم ہوتی ہے یا تمہاری چودھویں صدی ہجری کی —

ما عقل بہ صد جام لبالب ندہیم
یک پرتوِ دل بہ سبعہ کوکب ندہیم
با ما زفسانۂ شبِ مہتاب مگو
ما یک دمِ صبح را بہ صد شب ندہیم

اور اس کے ساتھ ہی جب سالک صاحب شگفتگی کے موڈ میں آ جائیں (آ جانے کا جھگڑا ہی نہیں بلکہ ان کے مزاج کی شگفتگی سدا بہار ہے) تو پھر وقت پر بڑا غصہ آتا ہے جو گزرا جا رہا ہے اور وہ لمحہ قریب آ رہا ہے جب یہ محفل جسے قیامت تک برپا رہنا چاہئے، منتشر ہو جائے گی۔

گرمیوں کا موسم تھا۔ سالک صاحب نے اپنے دفتر میں چھڑکاؤ کرا رکھا تھا، چقیں گرا رکھی تھیں اور چھوٹے سے کمرے میں گرمی کا نشان تک نہ تھا۔ محفل میں دو ہندو بزرگ بھی بیٹھے تھے اور بے تعصبی اور فراخ دلی کے موضوع پر باتیں ہو رہی تھیں۔ سالک صاحب تاریخی حوالوں سے مسلمانوں کی بے تعصبی کا ذکر کر رہے تھے۔ اچانک چق اٹھی اور دو نوجوان طلبا اندر آئے۔ آتے ہی انہوں نے اطمینان کی لمبی لمبی سانسیں لیں اور ان میں سے ایک بولا "مولانا آپ نے تو اپنے دفتر کو بالکل جنت بنا رکھا ہے" سالک صاحب نے فوراً کہا "تشریف رکھئے۔ اب جنت بالکل مکمل ہو گئی، صرف غلمان کی کمی تھی"

محفل کا رنگ بدلا تو ایک ہندو بزرگ کو سالک صاحب سے مذاق کرنے کا شوق چرایا۔ بولے "ہندوؤں اور سکھوں کی بے تعصبی کی ایک مثال عرض کرتا ہوں۔ اردو کے مشہور افسانہ نگار راجندر سنگھ بیدی نے اپنے ایک افسانے میں لکھا ہے کہ دہلی سٹیشن پر ایک ہندو اور ایک مسلمان (آپس

حکام کی بدمعاشیوں کا ذکر کر رہے تھے۔ جب مسلمان پوسٹ مین نے کہا ع

"چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی؟"

تو ہندو پوسٹ مین نے فوراً کہا "تو تمہیں مسلمانی کی فکر نہ کرنی چاہئے۔ بھابی کو میرے ہاں بھیج دینا۔"

زور کا قہقہہ پڑا اور پھر سالک صاحب نے فوراً کہا "اور لالہ جی! کیا آپ نے علامہ اقبال کا یہ مصرع نہیں سُنا ع

"عروس لالہ! مناسب نہیں ہے مجھ سے حجاب"

ہندو بزرگوں نے ہاتھ تک جوڑ دیئے مگر سالک صاحب کی طرف سے "لالہ" کے سلسلے میں اُردو اور فارسی کے اشعار کا سلسلہ رُکنے ہی میں نہ آتا تھا۔ اچانک ساتھ کے کمرے سے مہر صاحب کی آواز آئی "سنیئے تو سالک صاحب! میرے پاس ضلع راولپنڈی کے ایک صاحب بیٹھے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ گاندھی جی نے سنہ انیس سو سنتری ([illegible]) میں فلاں تقریر کی تھی۔ یہ "سنتری" کیا ہوتی ہے؟" اور سالک صاحب نے فرمایا "یہ سنتر کی بیوی ہوتی ہے!"

آج سے دس بارہ برس پہلے میں دارالاشاعت پنجاب میں "پھول" اور "تہذیب نسـ[illegible]ـب کرتا تھا اور دفتر "انقلاب" بھی دارالاشاعت والی سڑک پر ہی واقع تھا۔ سالک صاحب کا معمول تھا کہ شام کو چار بجے کے قریب جب [illegible] دفتر سے اٹھتے تو میرے پاس تشریف لے آتے میرے کمرے میں پھول اور تہذیب کے دو خوشنویس منشی فرزند علی اور منشی تہوّر علی بھی بیٹھتے [illegible] یہ دونوں اس ادارے میں اس وقت سے کام کر رہے تھے جب شمس العلماء مولوی ممتاز علی مرحوم کی زندگی میں سالک صاحب پھول اور تہذیب کے ایڈیٹر تھے۔ اس لئے سب ایک دوسرے کے پرانے مزاج دان تھے۔ سالک صاحب کمرے میں آتے ہی فرماتے "چپراسی سے کہو کہ دلی والے کی چاٹ کی چار پلیٹیں لے آئے" ہم چاٹ پر جھپٹتے تو سالک صاحب چپراسی سے کہتے "چار پلیٹیں قلفی کی بھی تو لے آؤ" پھر قلفی کی چار پلیٹوں کا صفایا کیا جاتا۔ اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتیں اور سالک صاحب دو ڈھائی روپے ادا کر کے مسلم ٹاؤن روانہ ہو جاتے۔ دو تین مہینے تک یہی سلسلہ جاری رہا تو میں نے اپنے خوشنویسوں کے ساتھ (جو اب تک میرے عزیز دوست ہیں) مشورہ کیا کہ آخر کب تک ہم سالک صاحب پر بوجھ بنے رہیں گے۔ وہ ہم پر ماہانہ ستر پچھتر روپے خرچ کئے جا رہے تھے اور یہاں اپنی تنخواہ ہی ستر پچھتر تھی۔ طے پایا کہ ہم تینوں اپنی اپنی تنخواہوں میں سے بارہ بارہ روپے نکال کر الگ رکھ لیا کریں اور چاٹ اور قلفی کے اخراجات کا نصف اپنے ذمے لے لیں۔ مجھ میں تو اتنی جرأت نہیں تھی کہ سالک صاحب پر اپنی "سازش" کا انکشاف کرتا۔ منشی تہوّر علی رام پور کے پٹھان تو تھے مگر "نہ بھئی ہم سے تو یہ نہ ہوگا" کہہ کر رہ گئے۔ البتہ موچی دروازے کے منشی فرزند علی نے ہماری ترجمانی کی ذمہ داری اٹھائی اور سالک صاحب کے تشریف لانے سے پہلے ہی ہم نے چاٹ اور قلفی والے کو پیشگی رقم ادا کر دی۔ سالک صاحب حسب معمول تشریف لائے۔ چاٹ اور قلفی کا آرڈر دیا اور جب رقم نکالنے کے لئے جیب میں ہاتھ ڈالا تو منشی فرزند علی نے (جن کے گنج پر پسینے کے قطرے بجلی کی روشنی میں چمکنے لگے تھے) اپنی ٹھیٹ دہلوی ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں ادا کر دی اور سالک صاحب جیسے ایک دم سناٹے میں آگئے ہم تینوں کو باری باری گھورا اور بولے "تم لوگوں نے پچھلے تین مہینوں کی چاٹ کا نمک اور قلفی کی مٹھاس غائب کر دی ہے۔ اسے سرمایہ دارو! میں تم سے زیادہ کماتا ہوں اس لئے مجھے ہی خرچ کر لینے دیا کرو۔ تم اپنی تنخواہیں چاٹ پر اڑا دوگے تو تمہاری بیویاں اور بچے کیا تمہیں چاٹیں گے؟ بڑی بیہودگی کی تم لوگوں نے ——" اور چند مہینے بعد تک سالک صاحب بلاناغہ ہمیں چاٹ کھلاتے رہے حتیٰ کہ مجھے بیمار ہو کر گاؤں بھاگ جانا پڑا۔

آخر وہ کیا بات تھی کہ ایک بلند پایہ ادیب اور اولوالعزم صحافی جس کے پاس چند لمحے بیٹھنے کے لئے امراء و وزراء تک ترستے رہتے تھے، پچھتر روپے ماہانہ پانے والے ایک غریب اور نومشق شاعر اور دو کاتبوں کے پاس روزانہ دو گھنٹے گزار جاتا تھا۔ میں نے یہیں لاہور میں وہ شعراء اور ایڈیٹر بھی دیکھے تھے جو نومشق شاعروں اور کاتبوں کی سی اقتصادی حیثیت والے لوگوں سے کترا کر نکل جاتے تھے تاکہ ان کا کوئی شناسا انہیں

"غربا" سے معانقہ کرتے دیکھ کر ان کی بلند سماجی حیثیت پر شبہ کرنے لگے۔ اور یہاں "انقلاب" کا مدیر اور ملک کا مسلّم الثبوت شاعر اور ادیب کہہ رہا تھا " دیکھو بھئی اکل اتوار ہے۔ کل تم تینوں میرے ہاں کھانا کھاؤ گے۔ پھر تحقیق و تفحص کا موڈ سوار نہ ہوا تو اسے بھی بلا لیں گے اور خوب باتیں ہوں گی۔ اور شعر اور لطیفے ہوں گے اور غالب کا فارسی دیوان پڑھا جائے گا۔ غالب کی فارسی غزلوں کی عظمت کو اب تک بہت کم لوگوں نے پہچانا ہے۔ وہ ....؟

اور پھر میرزا بیدل کی شاعری، غالب پر بیدل کے اثرات، غالب کی اردو شاعری میں فکر کی گہرائی کے دور دور تک پھیلے ہوئے ڈانڈے، غالب سے جدید اردو شاعری کی اثر پذیری، اور یوں بیدل اور غالب کی فارسی شاعری سے بیسویں صدی کی معیاری اردو شاعری کا بالواسطہ رشتہ ——— اور ستم یہ ہے کہ ہمارے شاعر غالب کی فارسی شاعری کو پڑھتے ہی نہیں ——— غرض یہ سب گرہیں کھلنے لگتیں۔ مگر یہاں مجھے سالک صاحب کے بے پناہ تبحر علمی کی نمائش مقصود نہیں۔ کہنا صرف یہ ہے کہ ایک بہت بڑی شخصیت جب اپنی عظمت کے باوجود ذرا سا نشیب میں آ کر ہم بچوں کو بھی اپنی عظمت میں شریک کر لیتی ہے تو زندگی پر کتنا پیار آتا ہے۔ سالک مجسم عظمت ہے اور مجسم پیار، اور اس کے ہزاروں شناساؤں میں سے اگر کسی کو اس سے شکایت ہے تو میں قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ اس نے سالک کو سمجھا ہی نہیں۔ اور پھر بعض لوگوں کا " ذائقہ " ہی خراب ہوتا ہے اور ان کا ذہن شہد میں بھی کونین کا مزا ڈھونڈ نکالتا ہے۔

پچھلے دنوں لاہور کے ناشرین کا ایک وفد سالک صاحب کے پاس گیا کہ ان کی ایک تحریک میں وہ ان کی اخلاقی امداد کریں۔ سالک صاحب کو اس تحریک سے اختلاف تھا اس لئے کوئی لگی لپٹی اظہار کئے بغیر صاف صاف کہہ دیا کہ "میرے خیال میں آپ لوگ غلطی پر ہیں اس لئے آپ کی حمایت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ البتہ آپ کی مخالفت ضرور کروں گا اور یہ مخالفت اصولی ہو گی۔" جب میں نے بعض ناشرین کو سالک صاحب سے ایسی باتیں منسوب کرتے سنا ہے جو سالک صاحب کا جانی دشمن بھی ان سے منسوب نہیں کر سکتا، بشرطیکہ وہ سالک صاحب کو جانتا ہو، تو میں نے ان دوستوں میں سے ایک دو سے کہا کہ تمہیں سارے لاہور میں صرف سالک ہی اپنا مخالف نظر آیا۔ اس لئے کہ اس نے ریاکاری کے بجائے صداقت سے کام لیا اور اس کی اخلاقی جرأت نے (اور اخلاقی جرأت کی امید صرف بلند اخلاق انسان ہی سے کی جا سکتی ہے) تمہیں دھوکے میں نہیں رکھا ورنہ یہیں لاہور میں تمہیں ایسے "ہمدرد" بھی ملے تھے جنہوں نے تمہارے ... میں چپو تھمانے کے بعد تمہاری کشتی میں چپکے سے چھید کر ڈالے، اور پھر خود تمہارے اندر بھی ایسی شخصیتیں موجود تھیں جنہوں نے تمہارے پاس جماعتی مفاد کا رونا رویا اور تنہائی میں جا کر اپنے ذاتی مفاد کی قربان گاہ پر اپنے ضمیر کی بھینٹ دے دی۔ سو یہ سب "ذائقے" کی باتیں ہیں! (یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ میں اپنی ذاتی حیثیت میں ان ناشرین کے مطالبات کا ہمنوا تھا اور آج تک ہوں)

سو یہ ہیں مولانا عبدالمجید سالک جو آج پاکستان کے علمی و ادبی حلقوں میں وسیع القلبی اور متوازن اجتہاد کا ایک نشان ہیں اور جن کی شخصیت کے قریبی مطالعہ کے بعد غالب کا یہ شعر زبان پر رواں ہو جاتا ہے ؎

راہ زن دیدہ وراں پرس کہ در گرم روی ——— جادہ چوں نبضِ تپاں در تنِ صحرا بینند

باقی رہے وہ سالک جو گھر میں دھوتی باندھے پھرتے رہتے ہیں، جنہوں نے کرسی اور میز کے بجائے ہمیشہ پلنگ پر گاؤ تکیہ کا سہارا لے کر بلکہ لیٹ کر لکھا ہے، جن کے تیس تیس صفحات کے "فی البدیہہ" لکھے ہوئے علمی مقالات میں بھی آپ کو کوئی لفظ کٹا ہوا نظر نہیں آئیگا، جن کی شیروانی کی ایک جیب میں رومال اور دوسری میں "شومال" ہوتا ہے، جن کی بہنے کی باتیں جیب میں گھڑی اور دائیں میں کاغذ کا وہ طویل ٹکڑا ہوتا ہے جس پر ضرورت مندوں کے ناموں اور کاموں کی فہرست درج ہوتی ہے، جو مطالعہ کرتے وقت عینک کو آنکھوں پر سے اٹھا کر ماتھے پر رکھ لیتے ہیں، جو اچھا پہننے، اچھا کھانے اور اچھے رہن سہن کے سلسلے میں بلا کے وضعدار ہیں اور جو اپنے تمام بیٹوں بیٹیوں کی شادیوں کے بعد اطمینان سے ایک گوشے میں بیٹھے ماضی اور حال کے بعد اب مستقبل پر بھی مسکرا رہے ہیں۔ تو ان سالک صاحب کے بارے میں مسٹر عبدالسلام خورشید سے پوچھئے۔ میں نے ان کی شخصیت سے جو اثرات قبول کئے ہیں، وہ مجملاً آپ کے سامنے رکھ دئے ہیں۔ یہ درست ہے کہ میں ان کا عقیدت مند ہوں لیکن میری عقیدت اندھی نہیں، نہایت باشعور ہے۔ میں نے تو خدا کو بھی حسبِ مقدور پرکھ لینے کے بعد مانا ہے۔

چراغ حسن حسرت

ظہیر بابر

۱۹۴۳ء کا آخری مہینہ تھا جب میں نے صحافت کے کوچے میں قدم رکھا۔ ساعت بری تھی یا بھلی؟ اس کا فیصلہ میں آج تک نہ کر سکا۔ مگر یہ فخر اس فیصلے سے بالا ہے کہ اس کوچے میں مولانا چراغ حسن حسرت سے نہ صرف متعارف ہونے کا موقعہ ملا بلکہ ان کی نگرانی میں کام کرنے کا بھی شرف حاصل ہوا۔ اس سے پہلے میں نے حسرت صاحب کو کہیں دیکھا تک نہ تھا۔ "مردم دیدہ" "پنجاب کا جغرافیہ" "کیلے کا چھلکا" اور خصوصاً مرحوم ہفت روزہ "شیرازہ" کے ذریعے تعارف ضرور تھا مگر تصور قطعاً مختلف تھا اس لئے ان کے کمرے میں قدم رکھنے کے بعد میں تھوڑی دیر کے لئے حیرت زدہ رہ گیا۔ چھ سوا چھ فٹ کا بھاری بھرکم شخص، خاصی نمایاں مونچھیں اور مونچھوں کے بال سر کے بالوں سے کہیں گھنے، بڑی بڑی سرخ آنکھیں، ایک ہاتھ میں قلم اور دوسرے میں سگریٹ تھامے لکھنے میں مصروف تھا۔ دفتری میز پہ ہر طرف اخبارات اور کتابیں بکھری ہوئی تھیں اور چہرے پر رسمی مسکراہٹ کے بھی دور دور تک آثار نہ تھے۔ تعارف کرایا تو جواب میں صرف "اچھا" سنا وہ بھی ایسی گرجدار بلکہ بارعب آواز میں کہ حرف و حکایت کے سندباد جہازی اور "امروز" کے چراغ حسن حسرت پر دو قطعی الگ شخصیتوں کا گمان ہونے لگا۔ اس وقت سنجیدگی سے اخبار نویسی کا پیشہ اپنانے کا ارادہ بھی نہیں تھا۔ اس لئے جی چاہا کہ چپکے سے سلام کروں یا سلام کئے بغیر ہی چلتا بنوں۔ ایسی جگہ ہماری گذر ممکن نہیں۔ جہاں ایسے ایڈیٹر کا راج ہو۔ مگر نہ جانے کیوں ان کے ارشاد کی تعمیل پہ مجبور رہا اور "سب ایڈیٹرز" کی میز پر جا بیٹھا۔ دوسرے ہی روز ملازمت تو مل گئی۔ مگر اس کا احساس بہت بعد میں ہوا کہ حسرت صاحب کے متعلق میرا پہلا تاثر کتنا بے جا اور خام تھا۔ انھیں ایک مرتبہ سمجھ لینے کے بعد کوئی شخص بھی ان سے نفرت نہیں کر سکتا۔

ان کی شخصیت اتنی خوبیوں کا مرقع ہے کہ ان کے پیش نظر ہر شخص ان کے وقتی اور لمحاتی "موڈ" خندہ پیشانی سے برداشت کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ بالغرض ان کے "موڈ" سے کسی کے جذبات مجروح ہوں تو خود حسرت صاحب اس کی تلافی کرنے میں تاخیر نہیں کرتے۔ یہ غالباً ۱۹۴۹ء کی بات ہے جب سر عبدالقادر کے انتقال پر دن بھر کی محنت کے بعد میں نے معلومات حاصل کیں۔ اور رات گئے تک ان کے متعلق فیچر لکھتا رہا جو سر عبدالقادر مرحوم کے انتقال کی خبر کے ساتھ ہی اخبار میں شائع ہوا۔ مگر صبح حسرت صاحب اس پر برہم تھے کہ کاپی جوڑتے وقت آخری چند سطور کالم پورا کرنے کے لئے قدرے کھٹی کیوں چھوڑ دی گئیں۔ میں یقیناً اس قسم کی داد کی توقع نہیں رکھتا تھا۔ مگر دوسرے ہی لمحے غالباً حسرت صاحب کو بھی اس کا احساس ہو گیا اور فوراً طلبی ہوئی۔ چائے پلائی۔ فیچر کی تعریف کی اور اپنی صحافتی زندگی کے بعض ایسے واقعات سنائے جو کسی بھی نئے صحافی کو محنت کرنے کی ترغیب دے

سکتے ہیں ۔ اسی قسم کا سلوک میرے پہلے فیچر سے ہوا ۔ دو دن کی محنت کے بعد وہ فیچر مکمل ہوا تھا اور تین یا چار مرتبہ حسرت صاحب کا مخصوص جملہ "صاحب بات نہیں بنی" سُنا ۔ مگر جب وہ شائع ہو گیا ۔ تو اس وقت بھی حسرت صاحب کو اس میں کوئی خصوصیت نظر نہ آئی ۔ وجہ یہ تھی کہ اس ادارے کے ایک اور "بڑے صاحب" نے اس کی بے حد تعریف کی اور حسرت صاحب کو غالباً یہ خدشہ تھا کہ کہیں یہ تعریف ایک نوعمر صحافی سے سیکھنے کی صلاحیت اور خواہش نہ چھین لے ۔ البتہ تھوڑی دیر بعد خود حسرت صاحب نے کچھ اس انداز میں اس کا ذکر کیا کہ اس میں اصلاح کی گنجائش نہ تھی مگر بُرا نہیں تھا ۔ میرے اطمینان کیلئے یہی کافی تھا ۔ یہ سلوک ادارے کے ہر رُکن سے ہوا ۔ اور اسی نے سب کی صلاحیتیں نکھارنے میں مدد دی ۔ "محنت" ادارے کے ہر رُکن کے لئے یکساں لازمی تھی اور خود حسرت صاحب اس معاملے میں پیش پیش تھے ۔ شاید ہی کسی ایڈیٹر نے اتنی محنت کی ہو ۔ جتنی حسرت صاحب نے "امروز" کے ابتدائی تین برس میں کی ۔ ان کی مثال ادارے کے ہر رُکن کے سامنے تھی اس لئے کسی کے لئے بھی محنت سے جی چرانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا ۔ جو اصحاب اس کے لئے تیار نہ تھے انھیں بہت جلد "امروز" کو خیرباد کہنا پڑا ۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس زمانے میں حسرت صاحب نے اپنے ارد گرد نوعمر مگر اُردو کے بہت اچھے صحافیوں کی ایک ٹیم جمع کر لی تھی ۔

حسرت صاحب خود بلا کسی کاوش کے اس درجے تک نہیں پہنچے ۔ اسی لئے آج یہ دعوے کرتے ہیں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں ہوتی کہ ملک میں ان کے پایہ کا ایک بھی صحافی موجود نہیں ۔ اگر وہ بعض اوقات یہ کہہ دیتے تھے کہ "میں تنہا اخبار مرتب کر سکتا ہوں" تو یہ کوئی تعلّی نہیں تھی بلکہ وہ حقیقت میں اس پر قادر تھے ۔ وہ صحافت کے ہر شعبے کا تجربہ رکھتے ہیں اور ہر پہلو سے اس کے ماہر ہیں ۔ انھوں نے کم و بیش درجن بھر روزناموں میں کام کیا اور مترجم سے لے کر مدیر تک کے فرائض سر انجام دیئے ہیں ۔ وہ خداداد صلاحیتوں کے مالک ہیں مگر بعض اوقات یہ احساس ہوتا ہے کہ اگر ان کے والد بزرگوار اسلام قبول نہ کرتے تو شاید اُردو صحافت اور ادب کو یہ عظیم شخصیت میسّر نہ آتی ۔ اس صورت میں دادا کی دولت میں وہ برابر کے شریک ہوتے اور ممکن ہے یہ دولت انھیں ادب اور صحافت کی طرف متوجہ ہونے کا موقع ہی نہ دیتی ۔ مگر ان کے والد بزرگوار کے مشرف بہ اسلام ہونے کے بعد وہ آبائی جائیداد میں حصّہ دار نہ رہے ۔ کشمیر کے ڈوگرہ حکمران کا قانون ہی تھا ۔

حسرت صاحب تقریباً اکاون برس پہلے بارہ مولا کے قریب ایک گاؤں میں پیدا ہوئے ۔ اُردو اور فارسی کی تعلیم اپنے والد بزرگوار کی وساطت سے حاصل کی ۔ جنھوں نے اپنے صاحبزادے کے رجحان کا غالباً اندازہ کرکے ادبِ عالیہ سے روشناس کرا دیا ۔ باقاعدہ تعلیم بی ۔ اے تک حاصل کی ۔ مگر حالات نے انھیں سند کا انتظار کرنے کی مہلت نہیں دی ۔ انھوں نے کچھ عرصہ کشمیر ہی میں اور اس کے بعد شملہ میں درس و تدریس کا سلسلہ قائم رکھا ۔ ۱۹۲۵ء میں کلکتہ جا پہنچے ۔ یہیں سے ان کی صحافتی زندگی کا آغاز ہوا ۔ "عصرِ جدید" کے ادارے میں سب ایڈیٹر کی حیثیت سے شامل ہوئے اور ایک ماہ ختم ہونے سے پہلے اس کے مدیر ہو گئے ۔ کچھ عرصہ بعد "آفتاب" کے نام سے اپنا ایک ادبی جریدہ جاری کیا مگر وہ مالی گورکھ دھندوں میں اُلجھ گیا ۔ اور حسرت صاحب کو روزانہ صحافت کی طرف لوٹنا پڑا ۔ اب کی مرتبہ "نئی دنیا" کے دو کالم انھیں سونپے گئے ۔ "کوچہ گرد" کے نام سے "کلکتے کی باتیں" لکھنا شروع کیں ۔ جنھوں نے حسرت کی شہرت کو کلکتہ سے لاہور تک پہنچا دیا ۔ مولانا محمد علی مرحوم اور مولانا ظفر علی خاں بھی اس کام کے مدّاحوں میں سے تھے ۔ اسی زمانے میں مولانا ابوالکلام آزاد نے "پیغام" جاری کیا اور حسرت صاحب اس کے ادارے میں شامل ہو گئے ۔ اگرچہ یہ تعلق زیادہ دیر قائم نہ رہ سکا ۔ مگر حسرت صاحب جس عقیدت سے مولانا آزاد کا ذکر کرتے ہیں ، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس مختصر سے دور میں حسرت صاحب کو مولانا آزاد کی شخصیت اور علمیت نے بے حد متاثر کیا ۔ چنانچہ جب کبھی حسرت صاحب کو کسی کی خود پسندی کا ذکر کرنا ہو تو وہ ہمیشہ بڑے طنز سے یہ کہتے ہیں کہ "مولانا وہ تو اپنے آپ کو ابوالکلام آزاد سے بھی بڑا صحافی سمجھتا ہے" حسرت صاحب کے دور میں اس طنز کا نشانہ ادارے کے تقریباً ہر رُکن کو بننا پڑا ۔ ویسے سنجیدہ محفل میں بھی حسرت صاحب ہمیشہ اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ "پیغام" سے انھوں نے بہت کچھ حاصل کیا ہے ۔ مولانا آزاد کے علاوہ حسرت صاحب نصیر حسین خیال اور آغا حشر کاشمیری سے بھی خاصے متاثر ہیں ۔ اقبال کے زبردست مدّاح ہیں اور ٹالسٹائی کے ناول "جنگ اور امن" کو اپنی پسند کے

چند علیم ناداروں میں شمار کرتے ہیں۔

حسرت صاحب جب لاہور میں وارد ہوئے تو ان کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں تھا۔ یہاں کے صحافی حلقوں میں انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ سب سے پہلے "زمیندار" کے ادارے میں شامل ہوئے۔ کچھ عرصے کے بعد "انصاف" کے نام سے ایک روزنامہ جاری کیا مگر اسے بھی "آفتاب" کے انجام سے دوچار ہونا پڑا۔ اس کے بعد "پھول" اور "تہذیب نسواں" کے ادارے میں پہنچے۔ اور کئی برس تک اس سے منسلک رہے۔ تحریک کشمیر کے دنوں میں جب "احرار" کے نام سے ایک اخبار جاری ہوا تو حسرت صاحب اس کے مدیر مقرر ہوئے۔ مگر یہ اخبار زیادہ عرصہ زندہ نہ رہ سکا اور حسرت صاحب پھر "زمیندار" کے عملے میں شامل ہو گئے۔ "احسان" کے اجرا پر اس کے عملے میں شامل ہوئے۔ اور دوسری عالمگیر جنگ سے پہلے اس سے الگ ہو کر "احسان" کے دوسرے عملے کے ساتھ مل کر "شہباز" جاری کیا۔ چند روز ڈاکٹر ستیہ پال کے روزنامہ "نیشنل کانگرس" سے بھی منسلک رہے۔ ۱۹۳۹ء میں برٹش براڈکاسٹنگ کارپوریشن کی طرف سے ایک عہدہ پیش کیا گیا مگر حکومت انھیں پاسپورٹ دینے پر آمادہ نہ ہوئی۔ البتہ اسے مولانا حسرت کے آل انڈیا ریڈیو کے عملے میں شامل ہونے پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ چنانچہ حسرت صاحب ریڈیو سے ہوتے ہوئے ہفت روزہ "پنچایت" میں پہنچے، اس کے بعد فوج میں ملازم ہو گئے۔ کچھ عرصہ "فوجی اخبار" مرتب کرنے کے بعد ملایا بھیج دیئے گئے۔ جہاں فوجیوں کے دو روزناموں کے ایڈیٹر بنا دیئے گئے۔ اور جب فوجی ملازمت سے سبکدوش ہوئے تو ان کی وردی پر میجر کا "کراؤن" تھا۔

تقسیم کے بعد جب "امروز" جاری ہوا۔ تو اس کی ادارت حسرت صاحب کو سونپی گئی۔ اس اخبار سے اُردو صحافت پر دُور رس اثرات مرتب ہوئے اور یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ حسرت صاحب نے اس کے ذریعے اُردو صحافت میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔ ۱۹۵۱ء میں حسرت صاحب اس پرچے سے الگ ہوئے اور ریڈیو پاکستان کے نیشنل پروگرام کے ڈائرکٹر مقرر ہوئے۔ مگر ریڈیو کا ماحول ان کے مزاج کے مطابق نہ تھا۔ اس لئے اس سے دستکش ہو گئے۔ صحت کی خرابی کی وجہ سے "ڈیلی جرنلزم" سے ان کا گہرا تعلق تو اس وقت قائم نہیں ہے مگر انھوں نے اُردو صحافت کو اس دَور میں بھی اپنے کالم "حرف و حکایت" سے محروم نہیں رکھا۔

یہ تو بہت سے اصحاب کے متعلق سُنا ہے کہ وہ بذاتِ خود ایک انجمن ہیں اور ان کی معلومات کی حد متعین کرنا ممکن نہیں۔ مگر میں اس قسم کی رائے (تردید کے خوف سے بے نیاز ہو کر) صرف دو شخصیتوں کے متعلق ظاہر کر سکتا ہوں۔ اور اتفاق سے دونوں صحافی ہیں۔ ایک حسرت صاحب اور دوسرے سالک صاحب۔ دونوں حضرات کو چلتا پھرتا "انسائیکلوپیڈیا" کہنا بے جا نہیں۔ سالک صاحب کے ساتھ کام کرنے کا تو مجھے کبھی شرف حاصل نہیں ہوا صرف چند ملاقاتوں ہی سے یہ اندازہ کیا۔ مگر حسرت صاحب کے تبحر اور معلومات کی صحت کا تجزیہ کرنے کا مجھے کئی مرتبہ موقعہ ملا۔ سچ تو یہ ہے کہ حسرت صاحب کی علمیت کے سامنے صرف میں نہیں بلکہ میرے کئی ساتھی احساسِ کمتری کا شکار ہونے لگے۔ مگر ہم میں سے بیشتر اسے قبول کرنے پر آمادہ نہیں تھے۔ کچھ چڑچڑا اُٹھتے مگر چند ایسے بھی تھے جنھوں نے ان کی علمیت سے استفادہ کرنے کی سوچی اور وہی فائدے میں رہے۔ ایک سچے صحافی کی طرح حسرت صاحب کی معلومات کا دائرہ وسیع ہے۔ انھیں ہر شعبۂ حیات سے دلچسپی ہے۔ اور اس کے متعلق وہ زیادہ سے زیادہ معلومات جمع کرنے کی کوشش میں رہتے ہیں۔ اُردو ادب کو اُنھوں نے پڑھا، سمجھا اور اس پر عبور حاصل کیا۔ مغربی ادب سے بھی بے تعلق نہیں۔ مصوری کے رموز بھی جانتے ہیں۔ موسیقی کے اسرار سے بھی واقف ہیں۔ مذاہبِ عالم اور خصوصاً اسلام پر ان کی نظر بڑی وسیع ہے۔ تاریخ کا گہرا مطالعہ رکھتے ہیں اور سیاست کے اونچ نیچ سے بھی بیگانہ نہیں۔ جس موضوع پر بھی بات چھڑے وہ اس پر بے تکان بولتے چلے جائیں گے اور کسی مسئلے پر بھی ان کی گفتگو میں کہیں جھول نہیں پڑے گا۔ یہ ان کی شخصیت کا ایک ایسا پہلو ہے جس سے بہت کم لوگ آگاہ ہیں۔ وہ انھیں صرف طنز و مزاح میں ہی اُستاد مانتے ہیں، جس میں کسی کو بھی کلام نہیں۔ مگر ان کا میدان صرف طنز و مزاح ہی نہیں۔ وہ اگر چاہیں یا انھیں متوجہ کیا جا سکے تو بعض دوسرے امور میں بھی کئی نامی نہاد ماہرین کو اپنے دعوے پر نظرِ ثانی کرنے پر مجبور کر سکتے ہیں۔ برناڈ شا صحافت سے اس لئے متنفر تھا کہ وہ ذہانت کو قحبہ بنا دیتی ہے۔ اس لئے اسے اختلاف بھی

ممکن نہیں۔ اس نے بڑے بڑے ذہین افراد کو "کھا" لیا ہے۔ یقیناً ایسے اصحاب نے صحافت میں بھی بڑا نام پیدا کر لیا مگر وہ اس میدان سے بہت دور چلے گئے جہاں وہ واقعی اپنی ذہانت اور صلاحیتوں کے جوہر دکھا سکتے تھے۔ صحافت بلاشبہ ایک بہت بڑا فن ہے مگر ہمارے ملک میں ابھی اس فن کی یہ قدر اور حیثیت متعین نہیں ہو سکی بخصوصاً اُردو صحافت میں تو ایک صحافی سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ ہر موضوع پر قلم اُٹھا سکے اور ہر مسئلے کے متعلق نہ صرف مکمل معلومات رکھتا ہو بلکہ اس کے متعلق رائے بھی ظاہر کر سکے۔ کسی ایک شعبے میں مہارت کافی نہیں۔ یہ "ذمہ داری" بیشتر ذہین صحافیوں کی راہ میں حائل ہو گئی اور وہ صرف صحافت کے ہو کر رہ گئے۔ حسرت بھی ان ہی میں سے ایک ہیں۔ وہ ایک مکمل صحافی ہیں مگر صحافت کے علاوہ ادب، تاریخ اور مذہب کے متعلق بھی ملک کو بہت کچھ دے سکتے ہیں۔ لیکن صحافت نے انھیں اس کا موقعہ نہیں دیا۔ اور اب شاید صحت انھیں اس کی اجازت نہ دے۔

حسرت صاحب کے نظریات کے متعلق میں نے مختلف حلقوں میں مختلف رائے سنی، اس کی وجہ یہ ہے کہ حسرت صاحب صحیح معنوں میں آزاد خیال یا "لبرل" ہیں۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاں آزاد خیالی کا مفہوم ہی مختلف لیا جاتا ہے۔ اور لبرل طبقہ انتہائی محدود ہے۔ رجعت پسند اور ترقی پسند ایسے لوگوں کو پوری طرح اپنا ہم خیال نہیں پاتے اس لئے انھیں سرے سے نظریات سے ہی عاری سمجھنے لگتے ہیں۔ حسرت صاحب کو شہری آزادیاں بے حد عزیز ہیں۔ وہ کسی بھی شخص کو ان سے محروم نہیں دیکھنا چاہتے۔ اسلام ان کا ایمان ہے مگر اسلام میں وہ "پاپائیت" کے قائل نہیں۔ اور جب کوئی شخص زمینداریوں وغیرہ کو اسلام کی رُو سے جائز ثابت کرنے کی کوشش کرے تو ان کے تن بدن میں آگ سی لگ جاتی ہے۔ معاشرے میں غیر ضروری پابندیاں اور بے معنی رسوم کے وہ پُر زور مخالف ہیں مگر قابلِ قدر مشرقی روایات کا دامن کبھی ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ وضعداری اور دوست نوازی ان کے مزاج میں رچی بسی ہے۔ ۱۹۵۱ء میں جب حکومت نے ادارہ "امروز" کے دو ارکین سیفٹی ایکٹ کے تحت نظر بند کر دیئے۔ تو باہر کی دنیا میں ان کا سب سے زیادہ خیال حسرت صاحب نے ہی رکھا۔ اتفاق سے اسی دوران میں عید پڑ گئی۔ اس روز حسرت صاحب کے ہاں سے نہ صرف کھانا آیا بلکہ مہینہ بھر کے سگریٹوں کا کوٹہ بھی ساتھ بھیجا گیا۔ عام حالات میں شاید یہ معمولی سی بات معلوم ہو مگر اس زمانے میں دہشت کا یہ عالم تھا کہ بعض عزیز دوست تک برائے نام تعلق ظاہر کرنے پر بھی آمادہ نہ تھے اور بعضوں نے تو سرے سے لاہور کا رُخ ہی نہیں کیا۔ حسرت صاحب ان چند بزرگوں اور دوستوں میں سے تھے۔ جنھیں سیاسی دہشت مرعوب نہ کر سکی۔

تاثیر مرحوم حسرت صاحب کے عزیز دوستوں میں سے تھے۔ مگر بعض امور پر اختلاف ہو گیا اور روزنامہ "مغربی پاکستان" اور "امروز" کے صفحات پر شعروں کی "جنگ" چھڑ گئی۔ سنگلاخ زمینوں میں طبع آزمائی ہونے لگی۔ ایک دوسرے کے نظریات پر چوٹیں ہوئیں۔ ادب دوست حلقے اس "جنگ" سے خوب لطف اندوز ہوئے۔ اسی زمانے میں یہ احساس ہوا کہ شعر کے معاملے میں بھی حسرت صاحب کی طبیعت میں کتنی روانی ہے۔ اور وہ کس سلیقے سے اپنی بات کہنے پر قادر ہیں۔ انھوں نے دوسری اخباری ذمہ داریوں کے باوجود دن میں دو دو نظمیں کہیں۔ اس "جنگ" میں حسرت صاحب کا پلہ بھاری رہا۔ مگر عرصہ بعد تاثیر صاحب کا اچانک انتقال ہو گیا۔ اور یہ تفریحی "لڑائی" بھی حسرت صاحب کے لئے رنج کا باعث بن گئی۔ دوست کی دائمی جدائی کے علاوہ انھیں یہ دُکھ بھی تھا کہ انھوں نے اپنے ایک عزیز دوست سے یہ لڑائی کیوں مول لی۔ اور اگر یہ گلے پڑ بھی گئی تھی تو اس کے بعد وہ تاثیر مرحوم سے ملے کیوں نہیں۔ تاثیر کے جنازے پر ان کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ "امروز" میں تاثیر مرحوم کے انتقال پر سب سے زیادہ سوگ منایا گیا۔ حسرت صاحب نے جی کھول کر انھیں خراجِ عقیدت پیش کیا۔

یہ دوسرا موقعہ تھا کہ میں نے حسرت صاحب کی آنکھوں میں آنسو دیکھے۔ اس سے پہلے مجھے ان کی نرم دلی کا اندازہ اس وقت ہوا تھا جب ان کے بڑے صاحبزادے کی گمشدگی کی اطلاع ملی تھی۔ ان دنوں کراچی سے "امروز" جاری ہوا تھا۔ حسرت صاحب بھی کراچی ہی میں مقیم تھے۔ لاہور سے یہ اطلاع ملی کہ دو تین دن سے ان کا صاحبزادہ گم ہے اور اب تک تلاش کی تمام کوششیں بے سُود ثابت ہوئی ہیں۔ حسرت صاحب کو جب اس کی اطلاع ملی تو وہ لکھنا پڑھنا سب معطل کر گئے۔ ہم میں سے کسی کو بھی توقع نہیں تھی کہ حسرت صاحب اپنے بچوں سے اتنا پیار کرتے ہیں یا وہ اس حد تک نرم دل ہیں۔ ان کی پریشانی

بلکہ کسی کو جرأت نہ ہوئی کہ "حرف و حکایت" کے کالم کے بارے میں پوچھے مگر وہ خود کہنے لگے کہ "اب تو شاید حرف و حکایت کا کالم کبھی نہ لکھا جا سکے۔" خدا کا شکر ہے کہ چند روز بعد ان کا صاحبزادہ مل گیا اور اخبار میں جلتے کو "حرف و حکایت" کے کالم کا زیادہ دنوں انتظار نہ کرنا پڑا۔

حسرت صاحب کی بعض کمزوریاں بڑی دلچسپ ہیں۔ جس روز حسرت صاحب کا موڈ خراب ہوتا۔ یا وہ کسی بات پر برہم ہوتے تو ادارتی عملے کی میٹنگ میں انھیں بطور حربہ استعمال کرتے۔ مثلاً میٹنگ کے باقاعدہ آغاز سے قبل کوئی ملایا کا ذکر لے بیٹھا کیونکہ حسرت صاحب ملایا کے بڑے مداح ہیں۔ بات نہ چلی تو دوسرے نے کشمیر کی گل پوش وادیوں کی بات چھیڑ دی۔ اگر ناکامی ہوئی تو کسی نے کلکتہ یا مولانا آزاد کا نام لے دیا۔ حسرت صاحب نے زچہ نہ دی۔ تو اس روز سے حرف و حکایت کے کسی دلچسپ حصے کے متعلق کسی محفل کی رائے پیش کر دی۔ اگر یہ تمام حربے بے سود ثابت ہوئے تو ہر ایک ہوشیار ہو گیا کہ آج کچھ سننا ہی پڑے گا۔ بعض اوقات کوئی خاص بات ہی نہ ہوتی۔ لیکن عموماً حسرت صاحب کسی بہت بڑی کوتاہی پر ہی ٹوکتے۔ بات ہو یا نہ ہو، ہر فرد اسے سننے پر مجبور تھا۔ محض اس لئے نہیں کہ حسرت صاحب ایڈیٹر تھے بلکہ اس لئے کہ وہ بزرگ، ہمدرد، غمگسار اور صحیح معنوں میں انسان ہیں۔ ان کی برہمی ہمیشہ عارضی ہوتی۔ تھوڑی دیر بعد محفل اپنے اصل رنگ پر آجاتی۔ چائے کی پیالیاں بج رہی ہیں۔ سگریٹ پر سگریٹ پھونکے جا رہے ہیں۔ چٹکلے اور لطیفے ہو رہے ہیں۔ حسرت صاحب اپنے دلچسپ تجربات دُہرا رہے ہیں اور ادارتی میٹنگ "حرف و حکایت" کے کالم کی تصویر بنی ہوئی ہے۔ نہ کسی کی گستاخی سے حسرت صاحب کا دل میلا ہوا نہ حسرت صاحب کی سرزنش کسی کو یاد رہی۔

پچھلے دنوں حسرت صاحب اچانک بیمار پڑ گئے۔ ان کے دوستوں، مداحوں اور عقیدتمندوں کی پریشانی کی وجہ تو سمجھ میں آتی تھی مگر حیرت تو اس بات پر ہے کہ ان کے نکتہ چین بھی اداس تھے۔ صحافتی اور ادبی حلقوں میں ان کی علالت پر تشویش ظاہر کی جا رہی تھی۔ اس کی وجہ محض ان کی بذلہ سنجی اور ظلبیت نہیں بلکہ اس میں خود ان کی شخصیت کا سب سے زیادہ ہاتھ ہے۔ ان کے نظریات سے بہتیروں کو اختلاف ہوگا، مگر ان کی ذات سے وہی نفرت کر سکتا ہے جو انھیں سمجھنے کی صلاحیت ہی نہ رکھتا ہو۔ یا جس کے دل میں کسی کے لئے بھی جگہ موجود نہ ہو۔ خدا کا شکر ہے کہ ان کی صحت بحال ہو گئی۔ بہرحال مجھے نہ جانے کیوں اس وقت بھی جب ڈاکٹر بھی تشویش کا اظہار کر رہے تھے یہ یقین تھا کہ زندگی اتنی بڑی دولت سے آسانی کے ساتھ دستبردار نہیں ہو سکتی۔

غلام رسول مہر

خلیل الرحمٰن داؤدی

جانسن کو باسویل مل گیا اور گاندھی کو ڈیسائی، ذوق کو آزاد مل گئے اور غالب کو بجنوری۔ مہر صاحب کی شخصیت ان میں کسی سے کمتر نہیں لیکن نہ میں باسویل ہوں اور نہ ڈیسائی۔ نہ آزاد ہوں اور نہ بجنوری، کہ اپنے ممدوح کے حق میں اس درجہ زورِ انشاپردازی دکھاؤں جس سے ناظرین کو افسانوی اجسام اور اساطیر الاصنام کا گمان گزرے۔ آج مہر صاحب کی شخصیت محتاجِ تعارف نہیں۔ اُس مہرِ مُنیر سے ایک عالم مستنیر ہے۔ اس کی ضوافگنی اور ضیاگستری نے تاریکیِ صحافت کی دھجیاں فضائے دہر میں اُڑا ڈالی ہیں۔ مسلمانوں کے روشن مستقبل کے نقیب، داعیِ انقلاب، انقلاب انگیز، انقلاب آگیں، انقلاب آفریں روزنامہ 'انقلاب' کے ایڈیٹر اپنے وقت کے مسلّم و مستند مورخ اور بلند پایہ مصنف۔ اتنی عظیم المرتبت شخصیت کے محامد و محاسن کا استقصاء مجلدات کی صورت میں ہی ممکن ہے ع

سفینہ چاہیئے اس بحرِ بیکراں کے لئے

مشاہیر کی سیرت کے خاکے یوں تو چھوٹے چھوٹے مقالات کی صورت میں ہر ایک زبان میں ملتے ہیں لیکن اُردو میں یہ خاکے افراط و تفریط کے بُری طرح شکار ہیں۔ یہاں یاروں کی ایک مخصوص نہج ہے یا تو کسی کی ہجو لکھ کر اسے تحت الثریٰ میں اُتارنے کے لئے "غنچہ"، "تے تعلمدان" لکھتے ہیں یا کسی کی مدح گستری میں قصیدہ و کہہ کر اس کو بامِ ثریا سے ہمدوش کر دیتے ہیں۔ آج کل ایک اسلوب اور بھی چل نکلا ہے۔ وہ یہ کہ کسی شخصیت کا عنوان قائم کر کے اس سے اپنے روابط و علائق دکھلاتے ہیں، جگہ جگہ اس کے ساتھ نظر آتے ہیں اور اگر اس بچارے نے کسی موقع پر رسمی انداز میں بھی ان کے بے شمار مراسلات کے جواب میں کچھ لکھ دیا تو نمائش کے لئے اس کی نقل کرتے ہیں۔ ان سب باتوں سے مضمون نگار کا مقصد اپنی شخصیت کو ابھارنا اور دوسرے کی آڑ لے کر خود کو مشتہر کرنا ہوتا ہے۔ میں ان سطور میں حتی الامکان ایسی باتوں سے اجتناب کروں گا۔ مجھے مہر صاحب کی نشستوں اور ان کے ساتھ اپنی ملاقاتوں کی رُوداد سنا کر یا موصوف کے خطوط کے اقتباسات شائع کر کے اپنا پروپیگنڈہ کرنا مقصود نہیں۔ میں تو انتہائی سادہ طور پر بالاجمال کچھ باتیں پیش کروں گا جن سے ان کی شخصیت کے چند اہم خدوخال سامنے آجائیں گے۔

مہر صاحب انتہائی فراخ حوصلہ، سیر چشم، فیاض طبیعت اور مخلص انسان ہیں۔ میں نے ان کی طبیعت میں انقباض اور گرفتگی کبھی نہیں دیکھی۔ ان کی نگاہوں کی کشش اور یگانگت، چہرہ کی حیات آفریں مسکراہٹ، گفتگو کی بے پناہ حلاوت، ملاقات کی حد درجہ گھلاوٹ ان سے ملنے والوں کو ہمیشہ یاد رہتی ہے۔

جو شخص مہر صاحب سے ایک بار مل لیتا ہے اسے دوبارہ ان سے ملنے کی ہوس رہتی ہے۔ عام علماء و فضلا کی طرح مہر صاحب اپنے علم و فضل کے سلسلہ میں بخیل نہیں۔ وہ بڑے خلوص، محبت، شفقت اور محنت سے تشنہ کامانِ علم و فضل کی تشفی کا سامان بہم پہنچاتے ہیں۔ کوئی شخص ان کے یہاں کسی وقت چلا جائے وہ آرام کر رہے ہوں یا کسی ضروری کام میں مصروف ہوں لیکن وہ ہر آنے والے شخص کا استقبال نہایت خندہ پیشانی اور شگفتہ خاطری سے کرتے ہیں۔ ان کے چہرے سے اس کا مطلقاً احساس نہیں ہوتا کہ انہیں اس شخص کا بے وقت آنا بار خاطر ہوا ہے۔ وہ نہایت فیاضانہ اور مخلصانہ انداز میں ہر شخص کی مدد کرتے ہیں۔ اپنی بساط اور مقدرت کے مطابق کسی کی امداد کو ان کے ہاں کوئی عذر مانع نہیں ہوتا۔ آج کل اس درجہ وسیع و خوش خلق اور ایثار و قربانی سے پیش آنے والے شخص کی نظیر ملنا محال ہے۔ وہ اگر کسی شخص کے کام آسکتے ہیں تو اس کے لئے کسی قسم کی امکانی سعی و سفارش سے دریغ نہیں کریں گے۔ ان سے کام لینے کے لئے متعارف ہونا ضروری نہیں۔ کوئی شخص ان کے پاس چلا جائے ان کی دستگیری کا باب ہر ضرورت مند کے لئے ہر وقت کھلا ہے۔

مہر صاحب کے ذاتی خصائص کا احاطہ اس مختصر خاکہ میں دشوار ہے۔ مجھے انتہائی قلق ہے کہ میں اپنی دفعتہً علالت کی وجہ سے مہر صاحب کا اسکیچ خاطر خواہ طریق پر پیش نہیں کر سکا۔ لوگ دنوں، ہفتوں اور مہینوں میں مشاہیر کے سوانحی مقالات تیار کرتے ہیں اور مجھے اس سلسلہ میں چند گھنٹے بھی نصیب نہ ہوئے۔ بہر حال ایک مختصر وقت کی یہ مختصر تحریر ہے۔ انشاء اللہ اس کی تلافی پھر کسی وقت کر دی جائے گی۔ میں اس سلسلہ میں مخدومی مہر صاحب اور ناظرین کرام سے عذر خواہ ہوں۔

مہر صاحب کا نام سنتے ہی انقلاب کی تصویر سامنے آجاتی ہے۔ وہی انقلاب جس نے صحافت کے معیار کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ وہی انقلاب جو پابندیٔ وقت، تازہ خبروں، برمحل مضامین، مزاحیہ کالم، دلچسپ مباحث، احتیاطِ رائے اور عالمانہ شان کے لحاظ سے تمام معاصرین میں ممتاز و منفرد تھا۔ وہی انقلاب جس کا انداز دلچسپ، ترتیب مربوط اور اداریہ کا بانکپن چسکا لگا دینے والا ہوتا تھا۔ اسی انقلاب کا ایڈیٹر مہر عالمتاب افقِ کائنات پر آج سے ۶۰ سال پیشتر مئی ۱۸۹۶ء کو طلوع ہوا۔ سب سے پہلے جس قریہ میں اس کی شعاعیں نمودار ہوئیں وہ جالندھر سے چار میل کے فاصلہ پر پھول پور ہے۔ مہر صاحب نے ابتدائی تعلیم دیہاتی پرائمری اسکول میں پائی۔ مشن ہائی اسکول جالندھر سے میٹرک پاس کیا اور ۱۹۱۵ء میں ڈگری اسلامیہ کالج لاہور سے لی۔ شعر گوئی کا ذوق زمانۂ طالب علمی میں ہی پیدا ہو گیا تھا۔ ابھی مہر صاحب نویں جماعت ہی میں تعلیم پا رہے تھے کہ مشغلۂ سخن طرازی اپنے شباب پر پہنچ چکا تھا۔ اس زمانہ میں نوجوان شعراء انجمن حمایت الاسلام کے جلسوں میں اپنے جوہر دکھایا کرتے تھے۔ علامہ اقبال نے بھی انجمن کے ہی جلسوں میں اپنی نظمیں پڑھ کر ملک میں دھوم مچا دی تھی۔ مہر صاحب بھی انجمن کے جلسوں میں اس شان سے اپنا کلام پڑھا کرتے کہ نہ صرف جوان سال شاعر بلکہ انتہائی کہنہ مشق استاد بھی عش عش کرنے لگتے۔ مہر صاحب کو زمانۂ طالب علمی میں ہی سیاست اور مذہب کے مطالعہ کا شوق پیدا ہوا۔ اس زمانہ میں مولانا ابوالکلام کا الہلال بڑی آب و تاب کے ساتھ کلکتہ سے نکل رہا تھا۔ وہ نوجوانوں کے دلوں کو برما اور خون کو گرما رہا تھا۔ چنانچہ مہر صاحب بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ اور ان کے عام تصورات زندگی میں یک گونہ تغیر پیدا ہوا۔ مولانا ابوالکلام نے نوجوانوں کی دینی تربیت کے لئے ایک انجمن کا خاکہ تیار کیا تھا جس کا نام ”حزب اللہ“ تھا۔ مہر صاحب اپنی طالب علمی کے زمانہ میں ہی اس کے ممبر بن گئے اور مولانا کے رجسٹر میں مہر صاحب کا نام درج ہو گیا۔ الہلال نے مولانا سے عہد لیا کہ وہ ملک اور قوم کی خدمت کے لئے اپنی زندگی وقف کر دیں گے۔ مولانا نے تعلیم سے فارغ ہو کر اپنا اخبار نکالنے کا منصوبہ باندھا لیکن حالات کی ناسازگاری کے باعث فوراً ایسا نہ کر سکے۔ اور حیدر آباد دکن چلے گئے۔ وہاں پہنچ کر بارگاہ وقار الامراء میں انسپکٹر تعلیمات ہو گئے۔ جنگ عظیم کے خاتمہ پر ترکی کے ساتھ اتحادیوں کے سلوک کی کیفیت منظر عام پر آئی تو اسلام کا درد رکھنے والے دل بے قرار ہو گئے۔ ایسے میں مہر صاحب نے حیدر آباد کے دوران قیام میں ہی اپنے چند دوستوں کی معیت میں ایک روزنامہ نکالنے کا فیصلہ کیا۔ ”سلطنت“ اس کا نام تجویز ہوا۔ کئی مہینے اس کی اجازت حاصل کرنے میں گزر گئے۔ اس زمانہ میں مولانا ابوالکلام نظر بند ہو گئے اور ان کے تمام کاغذات پولیس کے قبضہ میں گئے۔ ان

کاغذات میں حزب اللہ کے ممبروں کا رجسٹر بھی تھا جس میں مہر صاحب کا نام موجود تھا۔ حکومت نے تمام ممبروں کے حالات کی باقاعدہ تحقیقات شروع کر دی۔ اس سلسلہ میں مہر صاحب سے متعلق تفتیش کے کاغذات پہلے ان کے وطن اور بعد میں حیدر آباد پہنچے۔ چونکہ حزب اللہ کے ممبر سیاسی لحاظ سے حکومت کے نزدیک ناقابلِ اعتماد تھے، دوسرے مہر صاحب حیدر آباد کی نقطۂ نگاہ سے غیر ملکی تھے۔ حیدر آباد میں غیر ملکی کو عموماً متعمد علیہ نہ سمجھا جاتا تھا اور نہ اس سے مساویانہ سلوک ہی روا رکھا جاتا تھا اس لئے ان حقائق کے پیشِ نظر مہر صاحب کو حیدر آباد میں اخبار نکالنے کی اجازت نہ مل سکی، اور وہ تقریباً چار سال حیدر آباد میں گزار کر اپنے وطن چلے آئے۔

اس زمانہ میں تحریک ترکِ موالات جاری تھی اور خلافت کمیٹیوں نے مسلمانوں میں سرگرمی سے کام شروع کر دیا تھا۔ چنانچہ مہر صاحب بھی جالندھر خلافت کمیٹی کے سکرٹری ہو گئے۔ اخبار نکالنے کا ارادہ اس زمانہ میں اور بھی پختہ ہو گیا۔ بعض دوستوں نے بہ اصرار رائے دی کہ پہلے کسی اخبار کے دفتر میں کچھ مدت کام کر کے تجربہ حاصل کر لینا چاہیے۔ اسی زمانہ میں سالک صاحب زمیندار کے ایڈیٹر کی حیثیت سے گرفتار ہو چکے تھے۔ مولانا ظفر علی خاں اور اختر علی خاں ان سے پہلے ہی گرفتار ہو گئے تھے۔ مہر صاحب کے دوست مولوی شفاعت اللہ صاحب زمیندار کے منیجر تھے۔ انہوں نے اور سید عبدالقادر شاہ ایم اے نے اصرار کیا اور نومبر ۱۹۲۱ء میں مہر صاحب زمیندار میں چلے آئے۔ جہاں افتتاحیہ (ایڈیٹوریل) لکھنے کی خدمت مہر صاحب سے متعلق ہوئی لیکن یہ تعلق چار چھ روز سے زیادہ نہ رہا کیونکہ اسی پُر آشوب زمانہ میں جب کہ آئے دن گرفتاریاں ہو رہی تھیں مہر صاحب کے بعض عزیزوں نے انہیں اخبار نویسی کی اجازت نہ دی۔ چند روز بعد زمیندار بھی ضمانت ضبط ہونے کے باعث عارضی طور پر بند ہو گیا۔

فروری ۱۹۲۲ء میں زمیندار پھر جاری ہوا۔ مولوی شفاعت اللہ خاں اور مولانا مرتضیٰ احمد خاں میکش (جو مہر صاحب سے پیشتر ہی زمیندار میں شامل ہو چکے تھے) خود مہر صاحب کے وطن پہنچے اور ان کے عزیزوں کو رضامند کر کے انہیں پھر زمیندار میں لے آئے۔ یہ فروری ۱۹۲۲ء کا زمانہ ہے۔ یہاں سے مہر صاحب کی باقاعدہ اخبار نویسی کا آغاز ہوا۔ مہر صاحب زمیندار سے بحیثیت ایڈیٹر آخر مارچ ۱۹۲۷ء تک وابستہ رہے۔ یہاں سے ہٹ کر ۴ اپریل ۱۹۲۷ء کو انہوں نے اپنا ذاتی اخبار 'انقلاب' نکالا۔

اس اثنا میں متعدد اہم مسائل سامنے آئے۔ مثلاً ترکِ موالات کی تبلیغ و اشاعت۔ ہندو مسلم اتحاد کی فضا میں مختلف عناصر نے جو فتنہ انگیزیاں شروع کر دی تھیں ان کا مقابلہ، سلطان ابن سعود کے حملۂ حجاز کی پُرزور حمایت، مجلس خلافت کے پلیٹ فارم سے کاؤنسلوں میں آئینی جدوجہد کی تائید۔ ان تمام مسائل میں انقلاب نے ہندوستان کے تمام اخباروں سے بڑھ کر سرگرمی سے حصہ لیا۔ اسی زمانہ میں مہر صاحب کو حجاز کا پہلا سفر پیش آیا۔

۴ اپریل ۱۹۲۷ء سے مہر صاحب اور سالک صاحب نے روزنامہ انقلاب جاری کر دیا۔ انقلاب کے اجراء کے ساتھ ہی اسلامی سیاسیات کو مستقل اصول و قواعد پر قائم کرنے کی ضرورت پیش آ گئی۔ کیونکہ اتحاد کی فضا بری طرح مکدر ہو چکی تھی اور کانگریس عملاً ہندو مہاسبھا کا ضمیمہ بن کر رہ گئی تھی۔ یہ اسلامی سیاسی جدوجہد کا انتہائی نازک دور تھا۔ اس میں انتہائی سوچ بچار اور غیر معمولی ذمہ داری سے کام لئے بغیر چارہ نہ تھا۔ خود مسلمانوں کے فکر و نظر کی فضا خاص مکدر تھی۔ بعض گروہ کاملاً آزادی کی سعی و کوشش کو قومی مقاصد تک پہنچنے کا واحد ذریعہ سمجھتے تھے۔ اور وہ مسلمانوں کی مستقل کے تحفظ کا سوال پس پشت ڈال رہے تھے۔ ان کی خواہش یہ تھی کہ کانگریس کے خلاف کچھ نہ کہا جائے۔ اگرچہ وہ مسلمانوں کے حقوق کا درست فیصلہ بھی نہ کرے۔ بعض گروہوں کے نزدیک حکمران قوم کے مقاصد تسلط کی حمایت ہی میں مسلمانوں کی بہبود مضمر تھی۔ انقلاب کا مسلک یہ تھا کہ آزادی کے لئے پوری سرگرمی سے کام جاری رکھا جائے لیکن مسلمانوں کی مستقل ملی ہستی کو ہر خطرے سے محفوظ کر دینا بھی لازم ہے۔ یہ دورِ انقلاب کی سیاسی سرگرمیوں کا سب سے شاندار اور درخشاں دور ہے۔ اسی زمانہ میں ہندو مسلم اتحاد کے لئے بارہا کوششیں ہوئیں۔ اسی زمانہ میں سائمن کمیشن ہندوستان آیا۔ انہیں ایام میں مسلم کانفرنس کی بنیاد رکھی گئی جو تمام اسلامی طبقات کو سیاسی مقاصد میں متحد کرنے کی ایک نہایت اہم اور

باعتبار اثرات دور رس اور پہلی منظم کوشش تھی۔

۱۹۳۵ء میں نیا ایکٹ حکومت ہند منظر عام پر آیا۔ اور اس کا پہلا حصہ جو صوبائی خود مختاری سے متعلق تھا جاری ہوا۔ "انقلاب" نے اس دور میں اسلامی مقاصد کے لئے جس اسلوب پر کام کیا وہ ہندوستان میں اسلامی سیاست کی تاریخ کا ایک ہمیشہ یادگار رہنے والا باب ہے۔ جب کانگریس سے مفاہمت کی کوئی امید باقی نہ رہی اور مستقل اسلامی حکومت کے لئے سعی و کوشش کے سوا چارہ نہ رہا جس کی پہلی صدا علامہ اقبال نے ۱۹۳۰ء میں بلند کی تھی۔ چنانچہ "انقلاب" ہی نے سب سے پہلے یہ بیڑا اٹھایا۔ کانگریس کی طرف سے مایوس ہو کر مسلم لیگ نے اپنی منظم جدوجہد شروع کی۔ لیگ نے ایک فارن کمیٹی (مجلس امور خارجہ) بنائی جس کے صدر سیٹھ عبداللہ ہارون مرحوم اور سکرٹری سید علی محمد راشدی تھے۔ سیٹھ صاحب نے پاکستان کی اسکیم تیار کرنے کا انتظام کیا اور اس کا خاکہ تیار کرنے کے لئے ایک کمیٹی بنائی جس میں سید علی محمد راشدی، ڈاکٹر افضال حسین قادری، ڈاکٹر لطیف حیدر آبادی، مولانا رضوان اللہ، اور مولانا غلام رسول مہر شریک تھے۔ یعنی پاکستان کی اسکیم تیار کرنے کے لئے جس اولین کمیٹی کی تشکیل ہوئی مہر صاحب اس کے ایک سرگرم رکن تھے۔ اسی زمانہ میں سیٹھ صاحب کی فرمائش پر مہر صاحب نے ایک رسالہ "سیاسیات اسلامیانِ ہند" بھی لکھا۔ بات دراصل یہ تھی کہ کانگریس نے ہندوستانی مسلمانوں کے متعلق غیر ملکوں میں عموماً اور اسلامی ممالک میں خصوصاً یہ پراپگنڈا کر رکھا تھا کہ وہ تو انگریز کے سایہ میں رہنا چاہتے ہیں یعنی کامل آزادی کے خواہاں نہیں ہیں۔ مہر صاحب نے ۸۰ صفحات کے اس رسالہ میں حیرت انگیز اختصار اور جامعیت کے ساتھ مسلمانانِ ہند کے تزی حسیات کی پوری تاریخ بیان کر دی۔ یہ رسالہ آل انڈیا مسلم لیگ کے دفتر امور خارجہ نے ۱۱ جولائی ۱۹۳۹ء کو شائع کیا۔ ایسی ہی اثر آفریں تحریروں نے پوری قوم کو ایک مرکز پر جمع کر دیا تھی کہ ۱۹۴۰ء میں لیگ نے پاکستان کی قرارداد منظور کر لی تو "انقلاب" ہی کو یہ شرف حاصل ہوا کہ اس نے اس تحریک کو پوری قوم میں زیادہ سے زیادہ ہر دلعزیز بنایا۔ سر اسٹیفورڈ کرپس اور کیبنٹ مشن کی آمد پر "انقلاب" نے مسلم لیگ اور مسلمانانِ ہند کا نقطۂ نظر بڑی شد و مد سے پیش کیا۔ پھر ایک وقت ایسا بھی آیا جب لیگ نے پنجاب و بنگال کی تقسیم قبول کرنے پر آمادگی ظاہر کر دی۔ اس وقت "انقلاب" نے اس تقسیم در تقسیم خصوصاً پنجاب کی تقسیم کے خطرناک نتائج سے قوم کو بروقت آگاہ کر دیا۔ باؤنڈری کمیشن کی ثالثی پر شدید اعتراضات کئے اور اس کے فیصلوں کو بے چون و چرا مان لینے کے خلاف آواز بلند کی۔ قیام پاکستان کے بعد بھی "انقلاب" نے مسئلۂ کشمیر، مہاجرین کی آبادکاری، نہری پانی کے جھگڑے، اسلامی دستور اور جمہوری روایات کے قیام و دوام پر بار بار زور دیا لیکن ....

۱۰ اکتوبر ۱۹۴۹ء کو "انقلاب" کی آواز ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند ہو گئی لیکن اس کی گونج اسلامیانِ ہند کی سیاسی تاریخ کے ایوان میں صدیوں تک سنائی دیتی رہے گی۔ مہر صاحب نے اردو صحافت کو ذمہ دارانہ غور و فکر سے روشناس کر کے ایک باوقار حیثیت عطا کی۔ مسلمانانِ ہند کی سیاسیات کو جذباتی خوش خیالیوں سے پاک کر کے حقیقت پسندی کی راہ پر لگایا۔ ان کا ٹھوس استدلال مخالف کو چاروں طرف سے اس طرح گھیر لیتا تھا کہ اس کے لئے فرار کی کوئی راہ نہیں رہ جاتی تھی۔ اور ہتھیار ڈالے ہی بن پڑتی تھی۔ مہر صاحب نے افتتاحیہ نگاری کا نیا معیار قائم کر کے اسے ایک مستقل فن کی حیثیت عطا کر دی۔ "انقلاب" کی بندش کے بعد اہل نظر ان افتتاحیہ کالموں کو ترس گئے۔ جس نے کچھ دن مسلسل مہر صاحب کے اداریے پڑھ لئے اس کی نظر میں پھر باقی اردو اخبارات کے لئے کوئی کشش باقی نہیں رہی۔ مہر صاحب کی اس خصوصیت پر کتابیں بھی لکھی جائیں تو حق ادا نہیں ہو سکتا۔ دہلی کے ایک روزنامہ "نئی دنیا" کے سالگرہ نمبر مورخہ ۲۴ جولائی ۱۹۵۲ء میں بعنوان "ہندوستان اور پاکستان کے چند ممتاز اخبار نویس" ایک مقالہ شائع ہوا ہے جس میں مولانا غلام رسول مہر کا تذکرہ ان الفاظ میں ہے:۔

"مولانا غلام رسول مہر ——— ہندوستان اور پاکستان کے اخبار نویسوں میں وہ کامیاب ترین افتتاحیہ نگار (ایڈیٹوریل رائٹر) ہیں۔ ان کا استدلال نہایت مضبوط ہوتا ہے اور مطالعہ بہت گہرا۔ بڑی بات یہ ہے کہ وہ محض اخبار پڑھ کر اخبار نویس نہیں بنے بلکہ سیاست کے صحیح پس منظر سے واقف ہیں۔ اور بہت سے سیاسی واقعات کی ترتیب میں ان کا حصہ رہا ہے .... وہ ایک ٹھوس آدمی اور ٹھوس اخبار نویس ہیں اور علم و ادب کا

بہت گہرا مطالعہ کرنے کے عادی ہیں ؛ ص ۴۳

سیاست ، صحافت کے علاوہ مہر صاحب دینی اور علمی حلقوں میں بھی ایک خاص مقام حاصل کر چکے ہیں۔ ایک نقاد اور مصنف کی حیثیت میں ان کا امتیازی مرتبہ مسلّم ہے۔ انہوں نے بچوں کی درسی کتابیں لکھ کر تعلیمی حلقوں میں ایک خاص اثر چھوڑا ہے۔ تقریباً ۵ کتابیں نصاب سے متعلق ان کے قلم سے نکل چکی ہیں۔ ہزار صفحات کی سیرت سید احمد شہید (جو حال ہی میں شائع ہوئی ہے) لکھ کر انہوں نے اسلامی تاریخ پر احسانِ عظیم فرمایا ہے۔ غالب کا کلام بے شک اس کے نام کے دوام کے ضامن تھا لیکن مہر صاحب نے اس کے سوانح حیات لکھ کر غالب کو زندگیِ جاوید عطا فرما دی۔ آپ کسی وقت بھی اپنی الماری سے "غالب" کو نکال کر دیکھیں۔ غالب اپنی ساری ساز بیتوں کے ساتھ ہنستا بولتا، لطائف کے شگوفے چھوڑتا آپ کے سامنے آموجود ہوگا۔ یوں تو غالب پر کافی کتابیں لکھی گئی ہیں لیکن مہر صاحب کا غالب ہمیشہ ممتاز و منفرد رہے گا۔ غالب کے کام کا تفصیلی جائزہ لینے والے ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو نے علی گڑھ میگزین کے غالب نمبر میں شذرات کے تحت لکھا تھا "...... زمانہ حال میں سب سے زیادہ مفصل اور جامع کتاب غلام رسول مہر کی ہے اور بالکل صحیح لکھا تھا۔ مہر صاحب نے "غالب" کے علاوہ غالب کے خطوط بھی دو ضخیم جلدوں میں تاریخ وار ترتیب دیئے ہیں۔ اور ساتھ ہی مکتوب الیہم کے حالات بھی دیتے چلے گئے ہیں۔ مہر صاحب نے ۱۹۴۹ء میں نپولین کی بیوی جوزیفین کی لائف بھی بڑے دلچسپ پیرایہ میں قلم بند کی تھی۔ "غالب" (اشاعت اول ۱۹۳۶ء) کو چھوڑ کر جسے شیخ مبارک علی صاحب نے شائع کیا ہے مہر صاحب کی بقیہ تمام کتابیں شیخ غلام علی اینڈ سنز تاجر کتب لاہور نے شائع کی ہیں۔ اس کا فیصلہ کرنا بہت مشکل ہے کہ مہر صاحب بطور صحافی قوم کی بہتر خدمت کر سکتے ہیں یا بطور مصنف۔ ان کے دماغ میں جتنی صلاحیتیں ہیں اگر خدا نے انہیں لکھنے کے ہاتھ بھی اتنے ہی ویسے ہوتے تو شاید اس الجھن کا کوئی حل ممکن آتا۔ بہرحال موجودہ عہد میں ہمارے ملک میں نہ کوئی صحافت میں ان کا ہم پلہ ہے اور نہ تصنیف و تالیف میں ان کا ہم پایہ۔

مہر صاحب نے اپنی زندگی میں تاریخی اہمیت کے چند سفر بھی کئے ہیں جن کا تذکرہ ضروری ہے :۔

۱۹۲۵ء میں یہ خبر مشہور ہوئی کہ ابنِ سعود نے روضۂ اطہر پر گولہ باری کی ہے۔ واقعات کی تصدیق کے لئے مہر صاحب وفد کے ساتھ اکتوبر ۱۹۲۵ء میں حجاز اور رابغ (عدن سے ۲۵ میل) تشریف لے گئے۔

حجاز کا دوسرا سفر برائے زیارت حرمین شریفین و ادائے فریضۂ حج بیت اللہ شریف ۱۹۳۰ء میں کیا۔

اکتوبر ۱۹۳۱ء میں دوسری گول میز کانفرنس کے موقع پر انگلستان کا سفر کیا۔ راستے میں اٹلی، سوئٹزرلینڈ اور فرانس ٹھہرتے ہوئے گئے۔ واپسی میں علامہ اقبال بھی ساتھ تھے۔ فرانس، سوئٹزرلینڈ ہوتے ہوئے اٹلی پہنچے۔ وہاں چار پانچ یوم قیام کرکے مصر آئے۔ مصر میں چار روز ٹھہرے۔ اس کے بعد مفتی امین الحسینی کی دعوت پر یروشلم پہنچ کر موتمر اسلامی میں شرکت کی اور ۸ روز قیام فرمایا۔ اس کے بعد اوائل ۱۹۳۲ء میں واپس ہندوستان آئے۔ ۱۹۳۴ء میں افغانستان کا سفر کیا۔ افغانستان کے ارباب اختیار چاہتے تھے کہ مہر صاحب وہاں کی سیاحت کے تاثرات قلمبند فرمائیں۔

۱۹۵۲ء میں موتمر عالم اسلامی کے وفد میں مصر کا سفر کیا۔ واپسی میں بیروت اور شام کا دورہ کرتے ہوئے آئے۔

مہر صاحب اپنے عہد کے اکابر میں ایک ممتاز حیثیت کے حامل ہیں اور تمام مشاہیر سے ان کی بے تکلف ملاقاتیں رہی ہیں۔ یہاں موقع نہیں ہے کہ ہم ملک کی عظیم شخصیتوں کے الفاظ نقل کریں جن کے گلدستے ان حضرات نے مہر صاحب کی بارگاہ میں نذر کئے ہیں صرف اتنا اشارہ کافی ہے کہ مہر صاحب کے پاس مشاہیر کے تقریباً ڈھائی ہزار خطوط کا ذخیرہ موجود ہے جن میں سے ہر ایک خط کو اپنی جگہ تاریخی اختصاص حاصل ہے۔

مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری، سر عبدالقادر، علامہ اقبال، سر شفیع، میاں فضل حسین، مہاراجہ محمود آباد، مہاراجہ سلیم پور، حسرت موہانی، مولانا حسین احمد، مفتی کفایت اللہ، مولانا احمد سعید، مولانا ابوالکلام آزاد، عبدالرحمٰن صدیقی، شعیب قریشی، فضل الحق اور شہید حسین سہروردی وغیرہ سے مہر صاحب کی ذاتی ملاقاتیں اور ان سے مراسلت رہی ہے۔ آج ملک کے مقتدر اصحاب اور افاضل میں سے کون ہے جو مہر صاحب

سلامتیِ فراست، ملکۂ صحافت، سیاسی بصیرت اور علمی فضیلت کا معترف و مداح نہیں ہے۔ نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی مرحوم کے انتقال کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد کے وہ عزیز ترین دوست اور آزاد شناس ہیں۔ مولانا ابوالکلام سے مہر صاحب کا تعلق انتہائی قدیم ہے۔ سنہ [illegible]ء میں پہلی ملاقات ہوئی تھی اس کے بعد اس میں تدریجی استحکام آتا گیا یہاں تک کہ اب " من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی" والا معاملہ ہے۔

مہر صاحب کی شادی سنہ ۱۹۱۲ء میں ہوئی لیکن دو ہی بچے ہونے پائے تھے کہ زوجۂ محترمہ داغِ مفارقت دے گئیں۔ سنہ ۱۹۲۹ء میں مولانا نے دوسری شادی کی۔ دوسری بیوی سے دس بچے ہیں۔ کل ۶ لڑکے اور ۴ لڑکیاں مولانا کی اولاد ہیں۔ بڑے صاحبزادے عبدالسلام صاحب آج کل راولپنڈی میں ایکسائز اینڈ ٹیکسیشن آفیسر ہیں۔

مہر صاحب جیسی غیر معمولی شخصیت کے متعلق لوگوں کو ان کی وضع قطع، گفتار و رفتار، طعام و قیام، اکل و شرب، نشست و برخاست اور دیگر معمولاتِ زندگی سے واقف ہونے کی بڑی خواہش رہتی ہے۔ مہر صاحب دوہرے جسم کے طویل القامت، قوی الاعضاء اور صحت مند انسان ہیں۔ سر پہ قراقلی کی شاندار ٹوپی، جسم پہ دیدہ زیب شیروانی اور لٹھے کی نفیس شلوار، پاؤں میں چیک کا عمدہ موزہ اور منقش دیسی جوتا اس عظیم المرتبت شخصیت میں اور زیادہ بانکپن پیدا کر دیتے ہیں۔ ماشاءاللہ مہر صاحب کے اعضاء کا تناسب انتہائی موزوں صورت اختیار کیے ہوئے۔ مہر صاحب کی صحت کے ضامن دراصل ان کی روزمرہ زندگی کے معمولات ہیں جن پر وہ بڑی باقاعدگی سے عمل پیرا ہیں۔ وہ ایک طویل زمانہ سے صبح سویرے چار بجے اٹھتے ہیں۔ غسل کرتے ہیں، فریضۂ نماز سے فارغ ہو کر طلوعِ آفتاب سے بہت پہلے سیر کے لئے نکل جاتے ہیں اور نسیمِ صبح گاہی سے پوری طرح متمتع اور لذت گیر ہوتے ہیں ؎

خوشش جوشش نسیمِ صبح گاہی
کہ دردِ شب نشیناں را دوا کرد

دوپہر کے کھانے کے بعد قدرے آرام کرتے ہیں۔ پھر اپنے کام میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ شام کو چائے پینے کے بعد غروبِ آفتاب کے قریب پھر سیر کے لئے نکل جاتے ہیں۔ شب میں انتہائی ہلکی غذا کھاتے ہیں، اور سویرے ہی سو جاتے ہیں۔ مہر صاحب کے معمولات کی سادگی اور باقاعدگی ان کی صحت کو قائم رکھے ہوئے ہیں۔ ان کی عمر ۶۰ سال سے متجاوز ہے لیکن وہ مجھ جیسے جوان آدمی کے دونوں ہاتھ اپنے ایک ہاتھ سے پکڑ لیں تو چھڑا نہیں جائیں گے۔ خدا ان کی صحت کو اور زیادہ شاندار صورت میں دائم و قائم رکھے۔

وقار عظیم

اقبال عظیم

"ایسے ہوا کرتے ہیں وقار عظیم صاحب؟"

اپنے ایک شوخ اور بے تکلف دوست کا یہ جملہ مجھے آج تک یاد ہے، جو بھائی صاحب کو پہلے پہل دیکھ کر بے ساختہ اس کے منہ سے نکل گیا تھا۔ یہ بات آج سے اٹھارہ برس پہلے کی ہے۔ جب بھائی صاحب الہ آباد یونیورسٹی میں ریسرچ اسکالر تھے۔ اور ہم سب بھائی بہن لکھنؤ میں رہا کرتے تھے۔ حسب معمول وہ ہم سب کو دیکھنے دو روز کے لئے لکھنؤ آئے تھے، اور دوپہر کو باہر کے کمرے میں سو رہے تھے کہ میرا یہ دوست آگیا اور انہیں سوتا دیکھ کر مجھ سے پوچھنے لگا "کون صاحب ہیں؟" میں نے جواب دیا "بھائی صاحب" میرے اس جواب پر اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ کبھی حیرت سے مجھے دیکھتا کبھی انہیں۔ اور جب استعجاب کی یہ کیفیت گزر گئی تو مایوسی کی ایک ٹھنڈی سانس کے ساتھ اس کے منہ سے از خود یہ جملہ نکل پڑا۔

"ایسے ہوا کرتے ہیں وقار عظیم صاحب؟"

اور اس میں شبہ بھی نہیں کہ ایک شخص، جو بھائی صاحب کے متعلق سب کچھ جانتا ہو، ان کے ادبی مقام کو پہچانتا ہو، اور دل سے ان کی قدر کرتا ہو، جب پہلے پہل انہیں دیکھے گا تو اسے کسی نہ کسی حد تک مایوسی ضرور ہوگی۔ اس لئے کہ دراز قد، متناسب اعضا اور اچھے ہاتھ پیروں کے باوجود، بے حد دبلا پتلا بدن، کشادہ پیشانی، اور نرم و ذہین آنکھوں کے باوجود بے آب و تاب اور جھرّیوں دار چہرہ۔ اور بھرپور علم و صلاحیت کے باوجود رفتار و گفتار میں انتہائی درجہ کی سادگی اور عجز ایسی چیزیں ہیں جو "ہیرو ورشپ" کے جذبے کو کسی طرح سیر نہیں کر سکتیں ——— خاص طور سے ایسی صورت میں کہ ان جسمانی کمزوریوں کو چھپانے کے لئے لباس کا تکلف و طمطراق بھی ضروری نہ سمجھا گیا ہو۔ چنانچہ بھائی صاحب نے سوٹ کبھی نہیں پہنا۔ اس وقت بھی نہیں جب پی سی ایس کے انٹرویو کے وقت دنیا بھر نے انہیں سمجھایا اس وقت بھی نہیں۔ جب شادی کے بعد بدلے ہوئے ماحول کے تقاضوں کے پیش نظر انہیں سوٹ کے فوائد سے باصرار آگاہ کیا گیا ——— شیروانی، علی گڈھ کٹ پاجامہ اور اکہرے کالر کی قمیض ہمیشہ سے ان کا لباس ہے۔ جس میں موسم سرما صرف مفلر کا اضافہ کر دیتا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ سوٹ، اور سوٹ پہننے والوں سے یا فیشن پرستوں سے انہیں نفرت ہے۔ بس ایک وضع ہے جو قائم ہے، ضد کو اس میں کہیں سے دخل نہیں۔ جس کا ثبوت یہ ہے کہ شیروانی پر ہیٹ وہ کبھی پہنتے ہیں، اور ... کم و بیش دس برس سے "گلین شیوڈ" بھی ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ یہ دونوں چیزیں فیشن نوازوں کی راہ سے نہ ہوں صرف عزورتاً ہوں۔ یعنی پہلی چیز سخت دھوپ سے بچنے

گئے ہیں۔ اور دوسری وقت کی کفایت اور سہولت کی خاطر۔

لیکن صرف سوٹ نہ پہننے سے لباس کی سادگی پوری طرح ثابت نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ شیروانی اور قمیض پاجامہ میں بھی تکلف و اہتمام کی بڑی گنجائش ہے۔ اس لئے وضاحت ضروری ہے۔ کہ جہاں تک کپڑوں کے صاف ستھرے ہونے کا سوال ہے۔ بھائی صاحب محتاط ضرور ہیں۔ لیکن اس کے آگے ان کا معاملہ "درویشوں" جیسا ہے۔ شیروانی کا کپڑا کس قسم کا ہے، کس وضع، قیمت اور رنگ کا ہے۔ شیروانی کیسی سلی ہے۔ ان چیزوں سے انہیں علاقہ نہیں۔ وہ خوب سمجھتے ہیں کہ دن کو پہنے جانے والے کپڑے رات کو پہن کر سونا مناسب نہیں۔ لیکن وہ کیا کریں کہ "سلیپنگ سوٹ" کا تصور انہیں گوارا نہیں۔ تن زیب کا کرتہ، جالی دار بنیان، ریشمی قمیض، ازار بند، موزہ یا رومال، عطر، سینٹ، کریم، اسنو، پاؤڈر، گھڑی، فاؤنٹین پن اس قسم کی چیزیں ہیں جو نفاست پسندی کی دلیل سہی، لیکن ان کے لئے بے فائدہ اور غیر ضروری ہیں۔ قلم کی تو خیر مجبوری ہے کہ آلۂ کار ہے اور اس کے بغیر کام نہیں چلتا۔ لیکن یہ کسی طرح ضروری نہیں کہ جب گھر سے باہر نکلا جائے تو قلم کو شیروانی کی جیب میں لگا کر بھی نکلا جائے۔ یہی حال گھڑی کا بھی ہوتا ہے جب کبھی ان کے حصہ میں آجاتی ہے۔

یہ سب کچھ ہے لیکن ایک پڑھا لکھا انسان کہیں سر راہ ان سے ملاقات کرے یا اطمینان سے گھر جاکر ان سے باتیں کرلے اور ان کی شخصیت اس کے ذہن پر اپنے گہرے نقوش نہ چھوڑ جائے۔ اور وہ قلب کی گہرائی سے ان کا احترام کرنے پر مجبور نہ ہو جائے، ناممکن، بلکہ احترام کا یہ جذبہ بعض صورتوں میں اس سرحد تک جا پہنچے گا جہاں سے مرعوب ہو جانے کی منزل شروع ہوتی ہے۔

میری اور بھائی صاحب کی عمر میں صرف ۲½ برس کا فرق ہے۔ یعنی میری اکتالیس[1] سے کچھ زیادہ ان کی پینتالیس[45] سے کچھ کم[2]۔ لیکن جہاں تک احساس بزرگی و خوردی کا سوال ہے عمروں کے اس فرق کو میں نے ہمیشہ اس سے کئی گنا زیادہ سمجھا ہے۔ اور ہمیشہ ان سے مرعوب رہا ہوں۔ حالانکہ مرعوب ہونا میری افتاد طبیعت کے خلاف ہے —— چند دیرینہ احباب کو میں نے ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیا ہے، بعض اعزا سے قطع تعلق کر بیٹھا ہوں۔ اور اکثر اپنے افسران اعلیٰ سے بھی برسر پیکار رہا ہوں۔ صرف اس لئے کہ انہوں نے زندگی کے بعض معاملات میں مجھے مرعوب کرنے کی کوشش کی —— لیکن بھائی صاحب سے میں مرعوب تھا اور مرعوب ہوں (اور یہ بات کچھ صرف میرے ہی ساتھ نہیں) یا دوسرے لفظوں میں یوں سمجھ لیجئے کہ سنجیدہ مزاجی، ضبط و تحمل اور وسعت نظری کے پیش نظر جو عمران کی آج ہے۔ میرے نزدیک ان کی وہی عمر آج سے بیس برس پہلے بھی تھی۔ جن چیزوں نے مجھے اور ان کے جاننے والوں کو ہمیشہ متاثر ہونے پہ مجبور کیا ہے وہ ان کی ادبی صلاحیتوں کی عظمت اور کردار کا وقار ہے۔ ان کی ادبی حیثیت سے بحث کرنے کی مجھے، جازت نہیں اور اگر ان کے کردار کے متعلق یہ کہہ کر بات ختم کر دوں کہ وہ کبھی جھوٹ نہیں بولتے، بددیانتی سے کام نہیں لیتے، کریم النفس ہیں، روادار ہیں۔ خلیق ہیں۔ سیر چشم ہیں، متوکل مزاج ہیں، انکسار پسند ہیں، اور وہ سب کچھ ہیں جو ایک شریف النفس اور بلند فطرت انسان کو ہونا چاہیئے تو میرا یہ بیان توجہ سے نہ سنا جائے گا۔ اس لئے کہ ایک مداح کو اپنے ممدوح کے متعلق اسی قسم کی باتیں کہنا چاہئیں۔ اس لئے، صراحت کے ساتھ وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ جب میں کہتا ہوں کہ وہ جھوٹ نہیں بولتے اور بددیانت نہیں ہیں تو میرا مطلب یہ ہے کہ ان چیزوں کا انہیں سرے سے سلیقہ ہی نہیں ہے۔ نجی زندگی میں اور دوست احباب کی بے تکلف محفل میں ہم میں سے کون ہے جو کبھی کبھی از راہ تفنن جھوٹ نہ بولتا ہو۔ لیکن بھائی صاحب کو اس قسم کا جھوٹ بھی بولنا نہیں آتا۔ اگر وہ کبھی اس قسم کی کوشش کرنا بھی چاہیں تو آسانی سے پکڑے جائیں گے۔ اس لئے کہ زمانہ سازی، سیاست، اکتربیونت اور حیلہ جوئی نہ کبھی ان کے بس کی چیزیں تھیں نہ اب ہیں۔ جس کا جی چاہے انہیں دھوکا دے جائے۔ کبھی بے خبری میں، کبھی جان بوجھ کر دھوکا کھائیں گے۔ اور بعد میں انہیں اس کا پچھتاوا بھی نہ ہوگا۔ تحمل اور رواداری کا یہ عالم ہے کہ ہر مزاج کا آدمی ان سے خوش اور ہر مزاج کے آدمی سے وہ خوش۔ ممکن ہے کہ کبھی کسی سے وہ خفا بھی ہو جائیں۔

---

[1] "جعفر علیم" ان کا تاریخی نام ہے۔ جس سے ۱۳۲۶ھ ان کا سن پیدائش نکلتا ہے۔ اور سن ہجری کے حساب سے ۴۶ برس عمر۔

لیکن اس خفگی میں نہ شدت ہوگی، نہ تنفر۔ چنانچہ ساری زندگی انہوں نے فریب کھایا ہے۔ اور ایسا کھایا ہے کہ قدم قدم پر انہیں اپنی زندگی کی راہیں بدلنی پڑیں۔ لیکن جن لوگوں نے انہیں فریب دیا، آج بھی ان سے وہ متنفر نہیں ہیں۔ بلکہ جب کبھی موقع ہوتا ہے زبان وقلم دونوں سے ان کی صلاحیتوں کا اعتراف کرتے رہتے ہیں، اور دل سے ان کی قدر کرتے ہیں۔ اس بات کو ذرا اور وضاحت سے بیان کرتا۔ لیکن وضاحت میں کچھ نام لینا پڑیں گے۔ اور نام گنوانے سے نزاکتیں پیدا ہوں گی۔ اس لئے ان کی خانگی زندگی کی دو ایک چھوٹی چھوٹی باتیں بتاتا ہوں جن سے ان کے کردار کا یہ رخ سمجھ میں آجائے گا۔

ہماری دوسری والدہ صاحبہ گو ہماری سگی خالہ تھیں، تاہم عملاً سوتیلی ماں تھیں۔ جیسے جیسے ماشاء اللہ ہمارے ننھے بھائی بہنوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ فطری طور پر گھر میں تصادم کے امکانات پیدا ہوتے گئے۔ کبھی ہمیں والدہ صاحبہ سے، کبھی والدہ صاحبہ کو ہم سے شکایات رہنے لگیں۔ اور یہ شکایات اکثر کشیدگی میں بھی تبدیل ہوئیں۔ لیکن اس وقت بھی بھائی صاحب کے نزدیک گویا گھر کی فضا پہلے کی طرح خوشگوار تھی۔ نہ صرف یہ کہ وہ والدہ صاحبہ کی میں تھے۔ بلکہ وہ انہیں "اپنا کماؤ بیٹا" اور "اللہ میاں کی گائے" کے ناموں سے یاد کرتی تھیں اور ان کی صورت دیکھ کر باغ باغ ہو جاتی تھیں۔ چنانچہ انتقال کے وقت بھائی صاحب کے نام کا وظیفہ ان کی زبان پر تھا اور برابر اصرار تھا کہ انہیں فوراً الہ آباد سے بلا لیا جائے۔ بھائی صاحب آئے اور پھر وقت اس طرح ان کی تیمارداری کی کہ کھانا، پینا سب کچھ چھوٹ گیا۔ بھائی صاحب ہی کے زانو پر والدہ صاحبہ نے دم توڑا۔ اپنی پہلی تصنیف بھائی صاحب نے والدہ صاحبہ ہی کے نام منسوب کی ہے۔ اور اس انتساب کے الفاظ بتاتے ہیں کہ انہیں ان سے کس درجہ محبت تھی۔ کوئی اپنی سگی ماں سے بھی ایسی محبت کیا کرے گا! کچھ والدہ صاحبہ ہی پر منحصر نہیں۔ بھائی، بہن، دیگر اعزا، احباب، ہم جماعت، اساتذہ، سب سے ہمیشہ بھائی صاحب کا رویہ یہی رہا کہ انہوں نے دوسروں کی خوشنودی کو اپنی سہولت پر ترجیح دی ہے۔ اور یہی وہ چیز ہے، جو انہیں ہر دلعزیز بناتی ہے حتیٰ کہ خود والد صاحب کو میں نے ان سے جیسی احتیاط اور احترام سے گفتگو کرتے دیکھا ہے۔ کوئی باپ اپنی اولاد سے اس طرح بات نہیں کرتا۔ بس بھائی صاحب کے پورے ماحول کو ایک بڑا سا کنبہ سمجھ لیجئے اور انہیں اس کنبہ کا ایک فرد اور ان کے کردار کو اس ماحول پر پھیلا دیجئے، بات سمجھ میں آجائے گی۔

بھائی صاحب کی تعلیم ایک پنڈت جی کے مدرسے سے شروع ہوئی۔ جہاں ٹاٹ کی پٹیوں پر بیٹھ کر کھریا کی بنی ہوئی سفید روشنائی اور سرکنڈے کے قلم سے تختی پر لکھا جاتا تھا۔ لیکن اللہ جانے پنڈت جی نے انہیں کون سا گر سکھا دیا تھا کہ ایک دم سے ان کا داخلہ پانچویں درجے میں ہوا۔ اور پھر ہمیشہ صفِ اول کے طلبا میں شمار ہوتے رہے۔ یہ پنڈت جی ہی کی تعلیم کا اثر تھا کہ حساب اور ہندی جیسے مضامین میں بھی، جو مسلمان طلبا کو راس نہیں آتے۔ بھائی صاحب ہمیشہ غیر معمولی طور پر نمایاں رہے۔ اور اپنے درجہ پر حاوی۔ یہ بات بڑھ کر یہاں تک پہنچی کہ ان کا کمرہ ان کے دوسرے ہم جماعتوں کے لئے ایک مکتب بن گیا۔ جہاں بھائی صاحب کو معلمی کے فرائض سرانجام دینا پڑتے تھے۔ امتحانات کے زمانے میں رات رات بھر پڑھائی ہوتی تھی۔ اور اس حد تک ہوتی تھی کہ جب اپنی لالٹین کا تیل ختم ہو جاتا، تو میونسپلٹی کی سڑک والی لالٹین اٹھا کر وہاں چلی آتی اور اپنا کام ختم کر کے صبح کو اپنی جگہ واپس چلی جاتی۔ لیکن ان دنوں میں بھی وہ پڑھتے کم تھے پڑھاتے زیادہ تھے۔ اور جب امتحان کا نتیجہ سامنے آتا تو وہ فرق پھر بھی قائم رہتا جو معلم اور متعلمین میں قائم رہنا چاہئے۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ تعلیم و ملازمت کے سلسلے میں بھائی صاحب کو ہندوپاک کے پانچ مشہور تعلیمی مرکزوں سے وابستگی کا موقع ملا ہے۔ اور اس راہ میں ہر قدم پر انہیں ایسے اساتذہ، ہم جماعت اور احباب ملتے گئے۔ جن میں سے بیشتر ادبی دنیا میں اپنا اپنا الگ مقام رکھتے ہیں۔ چنانچہ جوبلی کالج لکھنؤ میں علی عباس حسینی، اور افسر میرٹھی۔ لکھنؤ یونیورسٹی میں مسعود حسن رضوی۔ الہ آباد یونیورسٹی میں ڈاکٹر اعجاز حسین اور احتشام رضوی۔ علی گڈھ یونیورسٹی میں غلام السیدین اور رشید احمد صدیقی۔ اور جامعہ ملیہ دہلی میں ڈاکٹر ذاکر حسین اور ڈاکٹر عابد حسین ان سے اس قدر قریب رہے کہ ان کے ادبی شعور کی تشکیل و ارتقا سے ان سب کو کسی نہ کسی طرح منسلک کیا جا سکتا ہے۔

اس سلسلے میں یہ بتا دینا بھی بے محل نہ ہوگا کہ مجھے وہ دن یاد ہے جب بھائی صاحب نے ایک ادیب کی حیثیت سے اپنی زندگی کا آغاز کیا تھا۔ یہ بات ۱۹۳۲ء کی ہے، جب گرمیوں کی تعطیل میں ہم دونوں والدین کے پاس دیہات گئے تھے، اور چھٹیوں میں وقت گزاری کے لئے کچھ کتابیں ہمارے ساتھ تھیں۔ جن میں پریم چند کے افسانے بھی تھے۔ بھائی صاحب نے پریم چند کے تمام افسانے پڑھ ڈالے۔ اور پھر ایک روز دیکھا کہ نیم کے پیڑ کے نیچے بیٹھے افسانہ لکھ رہے ہیں۔ دوسرے ہی دن یہ افسانہ کہیں چلا گیا۔ اور کچھ دنوں بعد شائع ہو گیا۔ اس کے بعد انہوں نے ایک دو افسانے اور لکھے اور بس! ان افسانوں کا مزاج قطعاً پریم چند جیسا تھا —— کچھ عرصے کے بعد میں نے انہیں پریم چند کے علاوہ علی عباس حسینی، پطرس اور رشید احمد صدیقی کی تعریف کرتے ہوئے سنا ہے۔ اور اس کے بعد نیاز فتحپوری، عبد الماجد دریا آبادی اور افادی الہدی کا بھی مداح پایا ہے۔ پرانے نثاروں میں مولانا محمد حسین آزاد اور میر امن دہلوی سے زیادہ کسی اور کا ذکر میں نے ان کی زبان سے نہیں سنا۔ یوں پڑھتے وہ سب کچھ تھے اور توجہ سے پڑھتے تھے۔

شعر گوئی کا شوق بھائی صاحب کو کبھی نہ تھا۔ بلکہ مجھے بھی ہمیشہ اس "تضیع اوقات" سے روکتے رہے ہیں۔ لیکن ان کا مذاق شعری ستھرا اور رواداری کے باوجود سخت گیر ہے۔ حالانکہ موزونی طبع یقیناً قدرت کی طرف سے ان کے حصے میں آئی ہے۔ چنانچہ کبھی یوں بھی ہوا ہے کہ نصابی کتاب مرتب کی جا رہی ہے۔ کسی خاص موضوع پر بچوں کے لئے ایک نظم کی ضرورت ہے، جو نہیں ملتی۔ اس وقت قلم برداشتہ پوری نظم لکھ دی ہے۔ اور اچھی خاصی لکھی —— کسی شعر یا شاعر کی رائے عام طور پر وہ بلا ضرورت کبھی نہیں کرتے۔ لیکن شعر پسند بھی انہیں مشکل سے آتا ہے۔ قدیم شعرا میں سے ہر ایک کا وہ احترام کرتے ہیں۔ لیکن تاثر کے لحاظ سے میر، علمیت کے لحاظ سے غالب اور نہ معلوم کس لحاظ سے نظیر اکبر آبادی کو وہ بہت موقر جانتے تھے۔ اور زمانۂ حال کے شعرا میں حسرت، فانی اور اصغر کے قائل تھے لیکن شعر کی پسندیدگی میں شہرت کو وہ کبھی بنیاد نہیں بناتے۔ چنانچہ ماجد الماجدی، جگت موہن رواں اور آل رضا لکھنوی کے درجنوں اشعار انہیں کسی زمانے میں یاد تھے۔ جو مزے لے لے کر دوسروں کو بھی سناتے تھے۔ اقبال کا ذکر اس سلسلے میں ضروری نہیں، کہ ان کا معاملہ ہی الگ ہے۔ اگر بھائی صاحب بھی ان کی عظمت کے قائل تھے اور ہیں تو عجب نہیں —— خاص طور سے ان دنوں ہماری زندگی کی رفتار اس قدر تیز اور ہمارے دماغ اس درجہ مصروف ہیں کہ ہمیں پیچھے مڑ کر دیکھنے کی فرصت نہیں۔ حالانکہ ہماری موجودہ زندگی کی ساری رونق اگر غور سے دیکھئے تو ہمارے ماضی کے دم سے ہے۔ یہی سبب ہے کہ بھائی صاحب کے ان رجحانات کا ذکر ضروری سمجھا گیا، جن کا تعلق بالکل ابتدائی زندگی سے ہے۔ ان کی مدد سے ممکن ہے کہ ان کے موجودہ رجحانات کا تجزیہ کرنے میں آسانی ہو۔ اس لئے کہ بہرحال ان کی شخصیت کا نمایاں ترین پہلو ان کا ادبی شعور ہے۔

سب سے بعد میں یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ طبیعت کی اس بزرگی اور شدید علمی انہماک کے باوجود بھائی صاحب کے مزاج میں خشکی یا جمود نہیں ہے بلکہ شگفتگی اور لچک ہے، اور وہ اپنے ماحول سے مصالحت کرنا بھی جانتے ہیں۔ چنانچہ جہاں انہوں نے اس شدت سے نمازیں پڑھی ہیں کہ کڑکڑاتے جاڑوں میں منہ اندھیرے محلے والوں کو ایک ایک کر کے فجر کی نماز کے لئے جگایا ہے، اور مسجد میں خود اذانیں دی ہیں۔ وہاں تفریح طبع کے لئے تاش اور کیرم کھیلنے اور کثرت سے سنیما دیکھنے کو بھی روا رکھا ہے۔ ہوائے اسکاؤٹنگ میں بڑی دلچسپی سے حصہ لیا ہے، اور بے شمار انگریزی ناول پڑھے ہیں۔ شکار کا انہیں مدتوں شوق رہا ہے۔ اور بندوق کے نشانے کی کبھی اس حد تک مشق کی ہے کہ ہوائی بندوق سے، اسی بندوق کے دوسرے چھرے کو مسجد کی منڈیر پر رکھ کر پے بہ پے کامیاب نشانہ لگایا ہے۔ گھوڑے کی سواری میں وہ کبھی اتنے مشتاق تھے کہ منہ زور سے منہ زور گھوڑا ان کے زانو کے نیچے جا کر ایسا ہو جاتا تھا جیسے ہمارے آپ کے لئے سائیکل۔ موسیقی کا بھی انہیں ذوق ہے۔ اور ایک زمانہ میں خود بھی اتنے اچھے ترنم کے شعر پڑھتے تھے کہ آج اس کا تصور دشوار ہے۔ کھانا پکانا بھی وہ بہت اچھا جانتے ہیں۔ اور کبھی کبھی اس میدان میں ان کا اور بھابی صاحبہ کا مقابلہ بھی ہو گیا ہے۔ اگر بھابی صاحبہ کے خفا ہو جانے کا ڈر نہ ہوتا تو یہ بھی بتا دیتا کہ ان مقابلوں میں کبھی کبھی میدان کس کے ہاتھ رہتا ہے۔ ضرورت پڑ جائے تو انہیں مشین سے اپنا پاجامہ خود سی لینے میں بھی کسی کا سہارا نہیں ڈھونڈنا پڑتا۔ اسی طرح سفر کے اہتمام، تقریبات کے انتظام، گھر کی صفائی اور آرائش، بچوں کی پرورش اور تیمارداری میں بھی انہیں خاص ملکہ حاصل ہے۔ گویا ایک ادیب کی حیثیت سے

کسی وقت بھی اپنے ماحول سے فرار کی کوشش نہیں کرتے۔ بلکہ ان کی زندگی کے تمام شعبے پوری طرح ایک دوسرے میں حل ہیں۔

نہ بھائی صاحب کا کوئی اسٹڈی روم الگ ہے، نہ لائبریری۔ نہ ادبی مشاغل کے لئے کسی وقت کا تعین بلکہ ادب اور ادیب کے تمام لوازمات ان کی گرہستی میں شامل ہیں۔ شور غل، بچوں کی چیخ پکار ان کے کام میں کبھی مخل نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ ادبی کاموں کو وہ کبھی اپنے لئے بوجھ نہیں بناتے۔ زندگی کے ہنگامے بھی جاری، ادبی مشاغل بھی جاری۔ چنانچہ یوں بھی ہوا ہے کہ کسی مضمون کا عنوان کاغذ پہ لکھا جا چکا ہے۔ اور بھابی صاحبہ نے کھانے کا نوٹس دے دیا ہے۔ اتنے میں کہ کھانا نکلے اور دسترخوان پہ چنا جائے فل اسکیپ کا آدھا صفحہ لکھا جا چکا۔ جب کھانا لگ گیا تو جو جملہ جس جگہ ہے، اسے اسی جگہ چھوڑ کر اور مضمون سے بالکل بے تعلق ہو کر ہنسی خوشی کھانا کھایا گیا۔ اور شام کو تفریح کے لئے نکلنے سے پہلے مضمون ختم —— یہ ان مضامین کا حال ہے جن سے بھائی صاحب بحیثیت ادیب پہچانے جاتے ہیں۔ بالکل یہی حال ان کے مطالعے کا بھی ہے۔ ہر تازہ سے تازہ تصنیف ان کی نظر سے ضرور گزرے گی۔ لیکن یوں کہ ریڈیو کے پاس بیٹھے ہیں، خبریں بھی سن رہے ہیں اور کتاب بھی پڑھ رہے ہیں۔ بچہ گود میں ہے۔ اسے بہلا بھی رہے ہیں اور مطالعہ بھی جاری ہے۔ چنانچہ کتاب پڑھتے وقت انہیں نوٹس لیتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا گیا۔ جو کچھ بھی پڑھا ہے، دماغ میں محفوظ ہے۔ اور اس طرح محفوظ ہے کہ جیسے ابھی ابھی کتاب پڑھ کر اٹھے ہوں۔ بڑے مزے کی بات یہ ہے کہ اگر آپ ان سے گفتگو کریں گے تو شاید آپ کو یہ بھی اندازہ نہ ہو کہ وہ گفتگو کے موضوع پر پوری طرح حاوی ہیں۔ لیکن جب قلم لے کر بیٹھیں گے تو سارا ضروری مواد باقاعدہ بانداز ان کے سامنے آ کھڑا ہوگا۔ اور وہ دریا کی روانی کے ساتھ بغیر کہیں رکے لکھتے چلے جائیں گے۔ اور جو کچھ لکھیں گے بغیر کسی خاص ترمیم و تنسیخ کے ڈاک کے حوالے کر دیں گے۔ چنانچہ اگر ان کا کوئی مضمون کہیں راہ میں گم ہو جائے تو اس کی نقل کہیں نہ ملے گی۔ یہ دوسری بات ہے کہ ایسی صورت میں کسی شدید ضرورت کے تحت اگر وہ اسی مضمون کو دوبارہ لکھنے بیٹھیں تو کم و بیش وہی چیز پھر سامنے آ جائے، جو کبھی پہلے آئی تھی۔

سننے والوں کو حیرت ہوگی کہ قلم کی اس دریا دلی کے باوجود ایک معاملے میں بھائی صاحب بہت کوتاہ قلم ہیں یعنی خط لکھنے میں۔ جس کی شکایت ان کے دوستوں اور عزیزوں کو مستقل ہے، لیکن مجھے شکایت کی بھی اجازت نہیں۔ اس لئے کہ میرے اور ان کے درمیان معاہدہ ہے کہ جب تک خیریت ہے گی خطوط نہ لکھے جائیں گے —— شروع شروع میں جب کبھی ان کا خط آتا تھا تو اسے کھولتے ڈر لگتا تھا۔ لیکن شکر ہے اب کبھی کبھی، تنی مدت گزر جاتی ہے کہ خیریت کی صورت میں بھی ایک آدھ خط آ جاتا ہے۔ حالانکہ اس قسم کا طویل سے طویل خط دس بارہ سطروں سے زیادہ نہیں ہوتا۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

خوش و مطمئن رہتے ۔

بہرحال اس عرصہ میں میں نے لیث صاحب کو بڑے قریب سے اور بہت غور سے دیکھا۔ سب سے پہلے تو میں نے ان کے وسیع مطالعے اور قیامت کے حافظے سے متاثر ہوا۔ کتابوں کے حوالے صفحوں کی قید کے ساتھ وہ ایسے بتاتے جاتے ہیں، جیسے کتاب سامنے کھلی رکھی ہو۔ شعر کا یاد رکھنا نسبتاً آسان ہوتا ہے۔ لیث صاحب کو بھی ہزاروں شعر یاد ہوں گے۔ لیکن ان کے حافظے کا عالم [illegible] ہی ہے۔ لیث صاحب علی گڑھ میں اقبال کی نظمیں پڑھا رہے تھے۔ اتفاق سے جس مجموعے سے نظمیں پڑھائی جا رہی تھیں وہ موجود نہ تھا۔ طالب علم کچھ آج چھٹی ملی [illegible] یا پھر علمی گپ ہوگی۔ لیکن لیث صاحب نے معمول کے مطابق پڑھانا شروع کیا۔ جہاں پہلے دن گفتگو ختم ہوئی تھی اگلے شعر سے بحث شروع ہوئی اور آخر تک پوری نظم اسی طرح پڑھائی گئی۔ نثر کی کئی کئی صفحوں کی عبارتیں وہ اپنے طالب علموں کو حافظے سے سنا دیتے ہیں۔ کوئی قلمی نسخہ یا مطبوعہ کتاب کہیں نظر سے گزرے حافظے میں محفوظ رہ جاتی ہے۔ اور پھر یہ نہیں کہ صرف اپنی خاص دلچسپی یعنی تاریخ ادب، لسانیات اور تنقید ہی کی کتابوں کے بارے میں یہ بات درست ہو۔ تاریخ، تاریخِ اسلام، فنونِ لطیفہ، مذہب، سب حافظے میں ایک ہی طبقے میں آجاتے ہیں۔

شاید اسی حافظے اور وسیع مطالعے کے بل پر لیث صاحب نے بہت کچھ لکھا ہے۔ انہوں نے ۱۹۲۰ء کے قریب لکھنا شروع کیا اور پچھلے پچیس سال میں ہزاروں صفحے کے مضامین، مقالات، تنقیدیں اور مستقل کتابیں لکھ ڈالیں۔ شاید ان کے معاصرین میں کم لوگوں نے اتنے متنوع اور مختلف موضوعات پر ایسے اعلیٰ پائے کی چیزیں لکھی ہوں۔ ان موضوعات میں سب سے پہلے لسانیات اور تاریخ ادب اردو ہے۔ اردو میں لسانیات پر بہت کم لکھا گیا ہے۔ جن لوگوں نے لسانیات پر لیث صاحب کے وہ مضامین پڑھے ہیں جو علی گڑھ میگزین میں برسوں شائع ہوتے رہے، وہ اس میدان میں ان کی محنت اور لیاقت کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ تاریخ ادب اور تنقید میں لکھنؤ کا دبستانِ شاعری، سرسید، تذکرۂ حالی، طبقات الشعراء، میر حسن اور ان کا کلام، مصحفی، جرأت، نظیر اکبرآبادی وغیرہ ان کی مشہور کتابیں ہیں۔ لیکن ان کتابوں کے علاوہ جو مضامین پچھلے پچیس سال میں شائع ہوئے، ان میں اکثر و بیشتر اس قابل ہیں کہ انہیں مرتب اور جمع کر کے مجموعے کی شکل میں شائع کیا جائے۔ غالباً غزل اور متغزلین پر اس طرح کا ایک مجموعہ مرتب ہو کر شائع ہونے والا ہے۔

اس موقع پر میں لیث صاحب کی علمی اور ادبی حیثیت پر کچھ زیادہ لکھنا نہیں چاہتا۔ کیونکہ ان کے بعض دوسرے احباب شاید اپنے مطالعے اور لیاقت کے اعتبار سے اس موضوع پر لکھنے کے زیادہ اہل ہیں۔ اور میں جو کچھ لکھوں شاید اسے ایک دوست یا نیاز مند کے جذبات پر محمول کیا جائے۔ اس لئے اس سلسلے میں صرف اتنا ہی لکھوں گا کہ لیث صاحب اپنی وسیع معلومات، کثیر مطالعہ، تنقید میں توازن اور متانت کے اعتبار سے معاصرین میں ایک نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ اور بلا شبہ ان کا شمار موجودہ زمانے کے چند گنے چنے نقادوں میں ہوتا ہے۔ ان کی تحریر پیچ دار نہیں ہوتی۔ سرسید اور حالی کی طرح انہیں سادہ اور دل نشیں اسلوبِ نگارش زیادہ پسند ہے۔ وہ بات کو طول نہیں دیتے۔ نہ تشبیہوں، استعاروں اور رنگین و رقصاں ترکیبوں کا سہارا لیتے ہیں۔ انہیں اپنی رائے اور بات کی معقولیت پر اتنا بھروسہ معلوم ہوتا ہے کہ وضاحت اور سیدھے طریقے سے اس کے اظہار کو کافی سمجھتے ہیں۔ نہ وہ بعض لکھنے والوں کی طرح غیر ملکی مصنفین اور ان کی تصانیف کے حوالوں سے قاری کو مرعوب کرنا چاہتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ اردو کی ادبی اور تنقیدی کتابیں پڑھنے والوں کی اکثریت ان مصنفین اور ان کے کارناموں کا شاید صحیح تلفظ بھی ادا نہیں کر سکتی، اس لئے ان کے سرسری حوالوں سے کیا فائدہ۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ خود بھی ان مصنفین اور ان کی تصانیف کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھتے۔ ان کے ذاتی کتب خانے میں لسانیات اور تاریخِ زبان کے بعد سب سے زیادہ کتابیں دنیا کے مختلف ملکوں کے ادب اور تنقید پر ہیں۔ یہ سب انہوں نے بڑے شوق اور محنت سے جمع کی اور پڑھی ہیں۔

لیث صاحب کو قلمی نسخوں اور نادر و نایاب مطبوعات جمع کرنے کا بڑا شوق ہے۔ چنانچہ بھوج پتر پر لکھی ہوئی کتابوں سے لے کر لکھنوی دور تک کے شعراء کے نسخے ان کے پاس موجود ہیں۔ میر حسن کی قلمی کلیات، قدرت اللہ شوق کا تذکرہ طبقات الشعراء، سودا کا ایک نادر قلمی کلیات، آتش کے کلیات کا ایک نسخہ جو ان کی زندگی میں لکھا گیا، ان کے قلمی کتابوں کے ذخیرے میں موجود ہیں۔ اردو شاعری کے قدیم و جدید دور کے شعراء کے تقریباً تمام دواوین، تذکرے اور

ان پر شائع شدہ کتابیں میں نے خود دیکھی ہیں۔ پھر تاریخ، آثار قدیمہ، مصوری، موسیقی اور ڈرامے پر بھی بہت سی نادر و نایاب کتابیں ان کے پاس ہیں۔ علی گڑھ میں لوگوں نے اکثر لیث صاحب کو کباڑیوں اور پرانے کتب فروشوں کی دکانوں پر ان چیزوں کی تلاش میں گھومتے دیکھا ہوگا۔ جب تک علی گڑھ میں تھے ان کا دستور تھا کہ جب دلی کا چکر لگاتے تو کباڑیوں کے یہاں کتابیں تلاش کرنے ضرور جاتے۔ اور کتنے ہی گوہر ہائے نایاب انہوں نے اس طرح جمع کئے ہیں۔

علمی اور ادبی زندگی کی طرح ان کی ذاتی اور خانگی زندگی بھی بڑی دلچسپ ہے۔ لیث صاحب کو دیکھ کر شاید کوئی شخص مشکل سے باور کرے گا کہ ان کی شادی ہوئے کوئی بیس بائیس سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ شادی ہوئی تو طالب علمی کا زمانہ تھا۔ یہ خود علی گڑھ میں اور بیگم صاحبہ بدایوں میں تھیں۔ لیث صاحب کا معمول یہ تھا کہ جمعہ کے دن کالج ختم کرکے سیدھا اسٹیشن کا رخ کیا اور بدایوں پہنچ گئے۔ اتوار کی رات کو بدایوں سے روانہ ہوئے اور صبح کو کالج میں پہنچ گئے۔ رشید احمد صدیقی صاحب کو معلوم ہوا۔ انہیں لیث صاحب سے غیر معمولی اُنس تھا اور بڑی شفقت فرماتے تھے۔ ایک دن لیث صاحب بدایوں سے واپس آئے۔ رشید صاحب نے خیریت دریافت کی۔ ایک صاحب جو پاس بیٹھے تھے پوچھنے لگے کیا بات ہے۔ رشید صاحب نے فرمایا بھئی بیچارے آجکل (WIFOFOBIA) میں مبتلا ہیں۔ خدا رحم کرے۔ بات آئی گئی ہوگئی۔ لیکن رشید صاحب کے مشورہ سے یہ طے ہوا کہ ٹھکانے سے پڑھنے کے لئے یہ چکر ختم کرنا چاہئے۔ چنانچہ لیث صاحب بیگم صاحبہ کو علی گڑھ لے آئے اور بورڈنگ ہاؤس چھوڑ کر میرس روڈ آباد کی۔ تعلیم ختم ہوئی تو وہیں ملازم ہوگئے۔ اس عرصہ میں دوسری جنگ عظیم چھڑی۔ علی گڑھ سے باہر اچھی اچھی ملازمتوں کے امکانات پیدا ہوئے لیکن یہ وہاں ایسے جمے کہ کہیں جانے کا نام نہ لیا۔ طالب علم غیر معمولی تھے۔ جب تک یونیورسٹی میں رہے ہر امتحان میں یونیورسٹی میں اول رہے۔ علی گڑھ سے اردو میں پی۔ ایچ۔ ڈی کرنے کی ہمت بھی پہلے پہل لیث صاحب نے کی۔ امتحان سے باہر علی گڑھ کے تمام تحریری اور تقریری مقابلوں میں بھی ہمیشہ یہی امتیاز حاصل کیا۔

لیث صاحب کو گھر اور گھریلو زندگی سے ویسی ہی دلچسپی ہے جیسی ان کے استاد رشید احمد صدیقی صاحب کے مضامین میں جھلکتی ہے۔ یونیورسٹی سے سیدھے بازار جاتے ہیں۔ دنیا بھر کا سامان خرید کر گھر پہنچے تو پھر دوسرے دن کالج آنے کے لئے ہی گھر سے نکلتے ہیں۔ لوگوں نے انہیں بہت کم جلسوں اور دعوتوں میں دیکھا ہوگا۔ ان کا مسلک یہ ہے کہ گھر میں بیوی بچے سامنے ہوں، سارے گھریلو قضیے طے ہو رہے ہوں، یہ اپنی مسہری پر لیٹے، سردی ہو تو دھوپ میں اور گرمی ہو تو لان کے سبزہ زار پر بیٹھے حقہ پیتے ہوں۔ اس سے زیادہ مسرت نہ کسی جلسہ میں شریک ہونے سے مل سکتی ہے نہ دعوت میں۔

لیث صاحب کو اچھے کھانوں اور اچھے تمباکو کا بہت شوق ہے۔ آپ ان سے پوچھ لیجئے شہر میں سب سے اچھا گوشت کہاں ملتا ہے، کونسا باورچی سب سے اچھی نہاری پکاتا ہے۔ شیرمال یا پراٹھے پکوانا ہوں تو کس کی خدمات حاصل کی جائیں۔ کھانے میں مرغ اور کباب شاید لیث صاحب کی کمزوری ہیں۔ خود بھی کھاتے ہیں اور دوسروں کو بھی کھلاتے ہیں۔ کبابوں کا "شوق" کچھ "عشق" کی حد تک پہنچا معلوم ہوتا ہے۔ شاید ہی کسی وقت بغیر کسی قسم کے کباب کے کھانا کھاتے ہوں۔

اس خانہ پسندی کی وجہ سے لیث صاحب کا حلقۂ احباب بڑا محدود ہے۔ لیکن اس محدود حلقے میں احباب ان کے خلوص کی شدت، طبیعت کی قلندری، اور صاف گوئی کی داد دیتے ہیں۔ اس صاف گوئی سے انہیں اکثر نقصان ہی پہنچا ہے۔ وہ اسے جانتے اور محسوس کرتے ہیں، لیکن ترک کرنے پر آمادہ نہیں۔ جس شخص کے بارے میں ان کی جو رائے ہے وہ اس کے اظہار اور اعلان میں کبھی تامل نہیں کرتے اور نہ اس کے عواقب کی پروا کرتے ہیں۔ یہ بات بہت اچھی سہی لیکن کیا کیجئے کہ زمانہ اسے گوارا نہیں کرتا۔ اور لیث صاحب "زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ بساز" کی جگہ "با زمانہ ستیز" کے قائل ہیں اور اس پر عمل کرتے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ سازباز کے ماحول میں انہیں بڑا دکھ پہنچتا ہے۔

لیث صاحب میں ایک اور کمزوری ہے، وہ شدید قسم کے جذباتی انسان ہیں، معمولی معمولی باتوں کا شدید اثر قبول کرتے ہیں، اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اکثر چھوٹی چھوٹی باتیں بہت بڑھ جاتی ہیں۔ جو لوگ ان کی فطرت سے واقف ہیں، وہ جانتے ہیں کہ جذباتی آدمی صاف دل اور صاف طینت ہوتا ہے لیکن ان کے دشمن اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں، کیونکہ جذباتی ہونے کے ساتھ ساتھ انہیں غصہ بھی ذرا جلدی آتا ہے۔ لیکن اس غصہ میں وہ حفظ مراتب کا پورا پورا خیال رکھتے ہیں۔ کسی سے اختلاف ہوئے تو اس کا اظہار کرنے میں شدت اختیار کرتے ہیں۔ لیکن مخالف کی پگڑی نہیں اچھالتے، شاید وہ اب تک اس بات کو محسوس نہیں کر پائے کہ اپنی

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

بیٹھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ان کے گہرے اور ہلکے نقوش آہستہ آہستہ ابھرتے ہیں۔ ان میں استواری اور ثابت قدمی ہے لیکن دھیمے پن اور آہستگی کے ساتھ جس طرح ان کی تنقید نے غیر محسوس طور پر سلامت روی کے ساتھ اور بتدریج اردو ادب میں اپنی جگہ بنالی ہے اسی طرح ان کی شخصیت کا اثر بھی غیر مرئی اور غیر شعوری ہوتا ہے۔ وہ جھنجھوڑتے یا چونکاتے نہیں۔ دوسروں کو کہنی مار کر آگے بڑھ جانے یا کوئی مصنوعی انداز اختیار کرکے اپنی جانب توجہ مبذول کرانے کی ان میں صلاحیت ہی موجود نہیں ہے۔ ان میں برق رفتاری اور طوفان خیزی نہیں اعتدال اور میانہ روی ہے بلاغت اور معنویت ہے۔ تندی اور تابانی کم ہے۔ توازن اور توانائی زیادہ ہے۔ ان کی شخصیت پیچ در پیچ نہیں تہ در تہ ہے۔

عبادت کی شخصیت کے عناصر ترکیبی کو چیر پھاڑ کر اس کے ایک ایک جزو کا مفصل تجزیہ کرنا یا اس کی ایک ایک تہ کو الگ الگ کرکے اس کی کیفیاتی اور کیمیاتی تحلیل کرنا ان کی شخصیت کا خون کرنے کے مترادف ہے اور میں اس سفاکانہ جرم کا ارتکاب کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ عبادت کو جاننے اور پہچاننے کے لئے میرے خیال میں اس کی کوئی ضرورت بھی نہیں ہے۔ کیوں کہ وہ کوئی معمہ نہیں ہیں ان کی شخصیت ان کی زندگی کی طرح صاف اور مستقیم ہے۔ سیدھی اور صاف ہے لیکن سپاٹ یا زمین دوز نہیں۔ اس میں کوئی خاص الجھن یا گتھی نہیں ہے اور اگر ہے بھی تو اس کے چھپانے یا پُراسرار بنانے کے لئے وہ لیپ پوت اور میک اپ نہیں کرتے۔ ان کی خارجی اور داخلی زندگی کے عناصر قریب قریب وہی ہیں جو ہمیں بالعموم نظر آتے ہیں۔ عبادت دنیا دار ہیں لیکن ظاہر دار اور کاروباری نہیں۔ انہوں نے اپنے طبقے یا معاشرے کے خلاف کوئی بغاوت نہیں کی۔ بغاوت یا انقلابیت سے ان کی فطرت میل نہیں کھاتی۔ لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ وہ کسی محاذ پر جم کر مقابلہ کرنے کے قابل نہیں ہیں یا وہ کبھی نرغے میں آجائیں تو فوراً ہار مان لیتے یا سپر ڈال دیتے ہیں وہ فتنہ و فساد سے حتی الامکان گریز کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود ان پر کوئی چڑھ دوڑے تو وہ بڑی بے جگری سے مقابلہ کرتے ہیں۔ عبادت نے اپنی کشتیِ حیات کو موجوں کے رحم و کرم یا بہاؤ کے رخ پر نہیں چھوڑ رکھا ہے۔ ان کی زندگی مشقت اور ریاضت سے بھرپور ہے۔ اس میں کشمکش اور جد و جہد ہے اور وہ اس سے پوری سرگرمی کے ساتھ دست و گریباں ہیں۔ اس کے باوجود عبادت میں ایک عجیب قلندری اور درویشی ملتی ہے۔ ان میں ایک استغنا اور بے نیازی ہے۔ بابمہ اور بے ہمہ والی کیفیت ہے۔ وہ زندگی کے تمام طوفانوں کو اپنے دل میں سمیٹے ہوئے ہیں پھر بھی بڑے جنم قسم کے آدمی نظر آتے ہیں۔ ثابت قدمی اور استقلال ان کی شخصیت کا مرکزی وصف ہے۔ زندگی کے غم آگیں اور کرب انگیز حالات میں بھی ان کا توازن و اعتدال قائم رہتا ہے اور ان کی جبین شکن آلود نہیں ہونے پاتی ان کے لبوں پر ہمیشہ ایک بے ساختہ اور نرم تبسم کھیلتا رہتا ہے۔ ان کی کوشش یہی ہوتی ہے کہ ناسازگار حالات اور انتہائی پریشانی کے کے عالم میں بھی ان کے معمولات میں کوئی فرق نہ آنے پائے۔

عبادت کی زندگی آداب کی پابند لیکن تکلفات سے خالی ہے۔ انہیں نستعلیق قسم کا آدمی تو نہیں کہا جاسکتا لیکن ان کی سلامت سے کبھی انکار نہیں کیا جاسکتا قرینہ اور شائستگی ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ ان میں سادگی ہے لیکن بے رنگی نہیں ہے۔ خوش مذاقی کا فقدان یا نمود و ٹیپ ٹاپ نہیں ہے۔ وہ تصنع سے دور بھاگتے ہیں لیکن زیب و زینت سے نفرت نہیں کرتے بلکہ ان میں سادگی اور نفاست پسندی کا ایک متوازن امتزاج ملتا ہے۔ ان میں اگر تمرد اور جھوٹا پندار نہیں ہے تو مصنوعی خاکساری اور بناوٹی عجز و انکسار بھی نہیں ہے۔ عبادت کے لباس اور رہن سہن، وضع قطع اور ذوق و مذاق غرض ان کی تمام ذاتی خصوصیات سے توازن، انضباط پسندی اور شائستگی کا ثبوت ملتا ہے۔ عبادت خوش خوراک اور مہمان نواز ہیں۔ لباس اور جامہ زیب ہیں۔ ذاتی آرام و آسائش کی جزئیات پر بہت زیادہ زور دیتے ہیں بلکہ اس معاملے میں ضرورت سے زیادہ حساس واقع ہوئے ہیں۔ ایک زمانے میں جب انہیں اپنی پسند کا مکان نہیں ملتا تھا تو اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے اسی کا رونا روتے رہتے تھے۔ انہیں معمولی سا نزلہ کبھی ہو جائے تو وہ بالکل نڈھال ہو جاتے ہیں۔ آنا جانا اور ملنا جلنا ترک کرکے صاحب فراش بن جاتے ہیں۔ ہفتوں گھر سے باہر نہیں نکلتے۔ بعد میں ان سے شکایت کی جائے کہ وہ اتنے دن کہاں غائب رہے تو وہ بڑے درد ناک اور مظلومانہ لہجے میں اپنی بپتا بیان کرتے ہیں " ارے صاحب میں تو بڑا بیمار ہوگیا تھا۔ ایک ہفتہ طبیعت اتنی خراب رہی کہ بالکل بستر سے لگ گیا۔ نزلہ تو تھا ہی ہر [illegible] معلوم ہوتا تھا کہ بخار اب آیا اور اب آیا۔ جوڑ جوڑ میں اتنا شدید درد تھا جیسے کوئی جان نکالے لے رہا ہو میں نے زندگی میں اتنی شدید بیماری کبھی نہیں اٹھائی۔

ان کی باتیں سن کر کسی کو ہنسی آ جائے یا کوئی انہیں ٹوک دے کہ نہیں صاحب آپ مبالغے سے کام لے رہے ہیں ورنہ تو انہیں کوئی بیماری ہے تو وہ ہنس کر خاموش ہو جاتے ہیں لیکن ان کے چہرے کے آثار چڑھاؤ سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہوتا کہ اس تردید سے انہیں جتنی تکلیف ہوئی ہے اتنی تکلیف شاید انہیں اپنی بیماری سے بھی نہیں ہوئی تھی۔ ان کی مبالغہ آرائی کا شکار کبھی کبھی ان کی مروت اور وضعداری کا ہاتھ ہوتا ہے جس سے ناجائز فائدہ اٹھانے والوں کی کمی نہیں ہے۔ اس کی کوشش عموماً وہی لوگ کرتے ہیں جنہیں اپنی بے مائگی اور کہتری کا شدید احساس ہوتا ہے اور جو ادیب کی حیثیت سے ایسے پستہ قد اور کم عیار ہوتے ہیں کہ منظر عام پر آنے اور شہرت حاصل کرنے کے لئے کسی سہارے اور مددگار یا کسی ایسی قد آور شخصیت کی دستگیری کی ضرورت ہوتی ہے جو اس ادبی بونے کو اپنے کندھوں پر بٹھا کر یہ اعلان کر دے کہ اسے حقیر اور بے حقیقت سمجھنا بہت بڑی غلطی ہے۔ عبادت بعض اوقات ان عیاروں کے دام میں گرفتار ہو جاتے ہیں جو ان کی شرافت اور مروت سے پورا پورا استفادہ کرتے ہیں اور اپنی عارضی مشیخت اور تفاخر کی قیمت کی ادائیگی عبادت کی شہرت اور نیک نامی کے سر منڈھ دیتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ عبادت ——— اور صرف عبادت نہیں بلکہ تمام مقدمہ نویس اور نقاد ایسے مواقع پر ہمدردی کے مستحق ہوتے ہیں اور پھر نیت کا علم جب کسی کو ہو ہی نہیں سکتا تو کسی لغزش یا فیصلہ کی غلطی کو فروگذاشت اور افراط و تفریط کو مجبوری کیوں نہ کہا جائے۔

بے رنگ ادبی مجلسوں کو عبادت بڑی خندہ پیشانی اور محبت سے جھیل جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ جن لوگوں کا ادبی مذاق بقول فراق روحانی ضعف باہ کا شکار ہے ان سے ملاقات کے وقت وہ جس تحمل اور قوت برداشت کا ثبوت دیتے ہیں وہ ہر شخص کے بس کی بات نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایم۔ اسلم ایسے لوگ بھی ان کے مداح ہیں۔ ان کی بردباری قابل رشک ہے۔ اعتراف جوہر کے ساتھ احترام جہل کا یہ مادہ میں نے کم لوگوں میں دیکھا ہے۔

عبادت کی علم دوستی، کتابوں سے گہری محبت اور اپنے کام میں ان کی انتہائی محویت و استغراق نے بھی زندگی کی رنگینیوں، رعنائیوں اور محظوظ اور لطف اندوز ہونے کی صلاحیتوں کو کند نہیں کیا۔ انہیں زندگی کی دلچسپیوں سے والہانہ عشق ہے۔ تدریس و تصنیف میں عرصہ تک مصروف رہنے کے بعد وہ فرصت و فراغت سے پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہیں اور طویل تعطیلیں عموماً سیر و سیاحت میں گزارتے ہیں۔ فرصت کے وقت وہ احباب کے ساتھ یا تو کسی چائے خانے میں بیٹھ جاتے ہیں یا لارنس کی پرکیف شاموں میں تنہا شیخ فطرت کی رنگینیاں دل و نظر کے دامن میں سمیٹتے نظر آتے ہیں۔ ماحول اچھا اور پاکیزہ ہو، موسم سہانا اور خوشگوار ہو تو وہ باغ باغ ہو جاتے ہیں اور یہ معلوم کرنا مشکل نہیں ہوتا کہ ان کی ظاہری سنجیدگی کی تہ میں زندہ دلی اور خوش وقتی چھپی ہوئی ہے۔ عبادت کو حسن فطرت کے ساتھ حسن انسانی سے بھی دلچسپی ہے۔ ان کا جمالیاتی شعور ان کی تنقید نگاری کی نذر نہیں ہوا بلکہ وہ کافی رنگین مزاج اور ذہنی عیاش واقع ہوئے ہیں لیکن ان کی رنگین مزاجی بڑی پاکباز اور ذہنی عیاشی انتہائی پارسا ہوتی ہے۔ ان کے جذبات میں اکثر لہریں اٹھتی ہیں لیکن ان میں کبھی بے راہ روی یا جذباتیت پیدا نہیں ہوتی اور ان لہروں کو کبھی طوفان نہیں بننے دیتے۔ ان میں اس چھچھورے پن یا لیتی کا دور دور نشان نہیں ملتا جو بعض معمر اور سن رسیدہ اساتذہ میں بھی قریب سے دیکھنے پر نظر آتی ہے۔ عبادت شدت جذبات کے وقت بھی اپنی حد سے تجاوز نہیں کرتے۔

لیکن زندگی میں انسان کو ہمیشہ بیدار مغز آدمیوں کی نہیں بلکہ اچھے دل والے انسان اور مخلص دوست کی ضرورت بھی محسوس ہوتی ہے۔ میں ادیبوں اور شاعروں سے عموماً بچ کر اور ان کے اجتماع سے ہمیشہ دور بھاگتا ہوں لیکن عبادت محض ادیب نہیں ہیں۔ ان سے ملاقاتیں کم ہی ہوتی ہیں ایک بار مل کر دو عرصہ تک ڈوبے ہوئے اور منقود الخبر رہتے ہیں لیکن ان سے دوری کا احساس کبھی نہیں پیدا ہونے پاتا۔ ان سے ملنے کو دل اس وقت بے اختیار چاہتا ہے جب میں بہت زیادہ قریب رہنے والے دوستوں سے اکتانے سا لگتا ہوں یا جب فراق کے الفاظ میں ان سے پیار کرنے پر مجبور ہو جاتا ہوں جن سے مجھے پیار نہیں ہوتا۔ ملاقات کے وقت اگر عبادت سے کوئی دہلی یا لکھنؤ کا ذکر چھیڑ دے تو ان کا انداز گل افشانی دیکھنے کے قابل ہوتا ہے۔ دہلی کے ادیبوں اور ادبی مجلسوں، وہاں کے پربہار صبح و شام، ہنگاموں اور دلچسپیوں سے معمور فضا اور حسن و لطافت سے بھرپور زندگی کے ذکر میں بڑی رطب اللسانی سے کام لیتے ہیں۔ لکھنؤ کا ذکر چھڑ جائے تو دانش محل کی محفلوں، احتشام صاحب سے ملاقاتوں، [illegible] کے یہاں کی نشستوں، کافی ہاؤس کے جمگھٹوں، امین آباد اور حضرت گنج کی شاموں سے لے کر ٹھنڈے کے کباب تک ہر موضوع کو مزے اور چٹخارے لے کر بیان کر جاتے ہیں۔ عبادت کو کافی عرصہ کے بعد پاکر میں اپنے آپ کو کھو دیتا ہوں۔ ان کے ساتھ خاموش بیٹھنے یا خاموشی کے ساتھ اور کسی منزل کا تعین کئے بغیر چلتے رہنے کو جی چاہتا ہے۔ یہ

خاموشی پیدا اور بے گانگی کی نہیں اُنسیت اور یگانگت کی ہوتی ہے۔ عبادت کی ذات لاہور میں میرے لئے ایک بہت بڑی نعمت ہے۔ ان کا معجزہ یہ ہے کہ ان میں مجھے اپنے بہت سے دوستوں اور کرم فرماؤں کی جھلکیاں نظر آتی ہیں اور ان سے مل کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زمان و مکان کی حدیں ٹوٹ گئی ہیں اور ان سب سے بیک وقت ملاقات ہو گئی ہے۔ عبادت میں مجھے کبھی تو احتشام حسین کی سادگی اور پرکاری ملتی ہے کبھی علی جواد زیدی کی بیدار مغزی اور روشن خیالی کبھی حبیب الرحمان کا چاپلوس دماغ اور قربانی کے جذبے سے معمور دل کبھی منان کی ساحرانہ ذات اور رشید المشربی اور کبھی نسیم احمد کی صداقت جذبات، مزاج کی نرمی اور لہجے کی مٹھاس۔ اس رنگا رنگی کی وجہ غالباً یہ ہے کہ عبادت نے دوستی کو نگلا نہیں ہضم کیا ہے، اپنے ہم نشینوں کے اوصاف اور صحت مند اثرات کو قبول کیا ہے اور ان خوبیوں کو اپنی ذات میں سمویا اور جذب کیا ہے۔ عبادت کم آمیز نہیں لیکن دیر آشنا ضرور ہیں۔ ان کی شخصیت کا کنول آہستہ آہستہ کھلتا ہے لیکن انہیں قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کے بعد ان کا گرویدہ نہ ہو جانا نا ممکن ہے۔

عبادت کی نقادانہ صلاحیتوں کے متعلق کوئی رائے ظاہر کرنے کا یہ موقع نہیں ہے لیکن ان کے ایک پہلو پر شاید ہی کسی کی نظر پڑی ہو۔ عبادت ادب کے افق پر ایک شاعر کی حیثیت سے ابھرے تھے لیکن کچھ عرصے کے بعد انہوں نے تنقید نگاری شروع کر دی اور نقاد کی حیثیت سے ان کا قد و قامت جیسے جیسے بلند ہوتا گیا اُن کی شاعری کم ہوتی گئی۔ اور اب تو یہ حال ہو گیا ہے کہ ان سے شعر سنانے کی فرمائش کی جائے تو ان کے چہرے پر رنگ آجاتا ہے اور وہ کچھ شرمندہ سے ہو جاتے ہیں جیسے ان کی کسی بہت بڑی غلطی یا خامی کا بھری محفل میں ذکر کر دیا گیا ہو۔ ان کی تنقید نگاری کے عیوب و محاسن سے قطع نظر ان کی نقادانہ حقیقت پسندی کے اس پہلو کا ذکر نہ کرنا انتہائی حق ناشناسی ہے۔

عبادت کی سرشت اور مذاق کی تعمیر میں ایک سے زائد آب و ہوا کا دخل ہے۔ روہیلکھنڈ، لکھنؤ، دلی اور پنجاب سب نے ان پر اپنا اپنا مخصوص اثر ڈالا اور اپنا اپنا رنگ چڑھایا ہے اور غالباً یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ ان میں ایک خاص قسم کی طرح داری اور بانکپن کے ساتھ ایک شگفتگی اور زنانگی بھی ملتی ہے۔ سٹے ڈیٹے بننے کے انداز کے ساتھ تصنع سے نفرت نے ان میں ایک منفرد آن بان پیدا کر دی ہے۔ اسی لئے ان کے مزاج میں تباین و تضاد کے بجائے گوناگونی اور مرنجان مرنج بدرجہ اتم ملتی ہے۔ عبادت کی شخصیت بہت دلکش اور دلنشین ہے لیکن ان میں کبھی کبھی تیکھے پن یا دبی دبی سی شوخی کا رنگ بھی جھلکتا ہے۔ عبادت کے دمکتے اور مسکراتے ہوئے چہرے، ان کی سرگیں اور مستعد آنکھوں، ان کی فطرت کی متانت اور سنجیدگی، ان کے مزاج کی شگفتگی اور تازگی، ان کی طباعی اور ان کے ضبط و احتیاط نے ان کی ذات میں ایک دلپذیر جاذبیت اور شخصیت میں ایک وجاہت پیدا کر دی ہے۔ عبادت میں لکھنؤ کا رسیلاپن اور مٹھاس بھی ہے اور پنجاب کا کھرا پن اور بے ریائی بھی۔ انہوں نے لکھنؤ کی خارجیت کے بجائے دلی کی داخلیت کو اپنایا ہے ان میں کرختگی اور کھردرا پن نہیں ملتا۔ عبادت کو لکھنؤ، دلی اور پنجاب نے انہیں مل کر سنوارا اور پروان چڑھایا ہے اور ان پر اپنا اثر ڈالا ہے اور اسی سے پیدا ہونے والے حسین و متوازن امتزاج میں عبادت کی شخصیت کا عطر ہے۔

غلام عبّاس

پریم ناتھ در

غلام عباس ——— ذکر چھڑتے ہی مجھے پوربیوں کا ایک چھوٹا سا گیت یاد آتا ہے جسے اس طرف کے "بھتین" بھی بے تکلفی کے مرقع پر اور دروازے بند کر کے ہی گاتے ہوں گے۔ میں اس گیت کو یہاں نہیں دہرا سکتا۔ لیکن پوربیوں کا وہ گیت میرے ذہن پر نرم نرم، مرٹا مٹا، ابھرا ابھرا، اسی انداز میں بیٹھا ہوا ہے جیسے غلام عباس کے وہ دو ہونٹ جن سے اس نے گیت کے ایک ایک بول کو بھینچ بھینچ کر سُنایا تھا ——— غلام عباس کے ہونٹوں سے بڑھ کر اس کی شگفتہ پیشانی ہے جس پر ہمہ وقت ایک دعوت کھلی رہتی ہے اور ملاقی آنکھیں اٹھاتے ہی صحبت کا حظ لینے لگتا ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ان کو آپ کے ساتھ بات کرنے کی فرصت نہیں ہے، یا فرض کیجئے کہ انسانی جذبے کے تحت وہ عدیم الفرصتی کا اظہار کرنا چاہتے ہیں تو وہ آپ سے لاکھ لاکھ معافیاں مانگیں گے تفصیل کے ساتھ وجوہات بتا دیں گے اور اس مسئلے کی اہمیت سمجھا دیں گے جو اس وقت درپیش ہے۔ مگر جب وہ اپنے مضمون کی طرف دھیان لگا کے کسی لکھی ہوئی سطر کو بنا آواز نکالے اپنے انہی ہونٹوں سے پڑھنے لگیں گے اور آپ رخصت ہونے کو کھڑے ہو جائیں گے تو وہ فوراً کاغذ کو ایک طرف سرکا کے آپ کو کندھوں سے پکڑ کر بٹھائیں گے، موٹے موٹے ہاتھوں سے اپنی بڑی بڑی جیبیں ٹٹول کر سگریٹ کا ایک ڈبہ نکالیں گے۔ ایک سگریٹ آپ کو پیش کر کے، ایک اپنے ہونٹوں میں پھنسا کر، کرسی پر ٹیک لگا کے، ٹانگیں لمبی کر کے، ایک اچھے اونچے درجے کے ماہر فن کے انداز میں بیٹھیں گے۔ پہلے آپ کے کسی کارنامے کی تعریف کریں گے۔ آپ کو دور دراز صوبوں، ملکوں کی پرانی کہانیاں اور لطیفے سُنائیں گے۔ اور غالباً پوربیوں کا وہ گیت بھی سُنا ڈالیں گے۔ پھر نہ ان کو اپنی مصروفیت کا خیال رہے گا نہ آپ کی ملاقات کے ابتدائی ٹکڑے کا۔

غلام عباس فوراً ہی بے تکلف نہیں ہو جاتے، گفتگو بڑھتی جاتی ہے، تکلف گھٹتا جاتا ہے۔ بات جو کہیں کی تھی کہیں پہنچ جاتی ہے اور غلام عباس جو صرف مسکرا رہے تھے ہنسنے لگتے ہیں۔ لیکن پھر بھی وہ کھلکھلا کر کبھی نہیں ہنستے۔ زیادہ ہنسی آئے گی، منہ پر خون بھی چھلکے گا لیکن وہ سر کو جھکا کے آواز کو دانتوں کے نیچے روک روک کر ہی ہنستے رہیں گے، جیسے ان کو یہ ڈر ہو کہ منہ کے زاویے بہت بگڑ جائیں گے۔ غلام عباس کو میں نے کبھی غصے میں بھی چلاتے نہیں سُنا۔ کچھ بھی ہو گیا ہو، کنپٹیاں تک لال ہو گئی ہوں، غلام عباس آپ کی طرف ایسے دیکھیں گے جیسے انہیں غصہ نہیں تعجب ہو رہا ہے۔ ملاقات کتنی ہی لمبی ہو جائے آپ کبھی اکتائیں گے نہیں۔ بیچ بیچ میں پوچھ کے وہ آپ کی بات بھی سُنتے رہیں گے اور آپ پھر دل و جان سے ان کی ساری باتیں سُن لیں گے۔ یوں بھی ان کی باتیں دلچسپ ہوتی ہیں۔ واقعات ایسے بیان کرتے جاتے ہیں جیسے دلپذیر افسانہ سُنا رہے ہوں۔

کئی بار وہ گھر سے ایسے چہک کے آتے ہیں کہ ان کے کلام سے ان کی بزرگی اور وقار ظاہر ہو۔ لیکن آپ اپنے دل میں ان کے لئے بہت زیادہ پیار کا جذبہ لے کر آئیں گے کیونکہ ان کے چہرے کی بھاری، چوڑی اور مرتی بناوٹ کے پیچھے ان کے ٹوٹے ہوئے دانت کی بھری میں سے ان کی معصومیت اور پیارا پیارا مسکراتا ہوا بچپن جھانک ہی لیتا ہے۔

میلہ ٹھیلہ ہو یا تہوار کا دن، عید کی بھیڑ بھاڑ ہو یا محرم کا جلوس، غلام عباس گھر سے باہر نہیں جائیں گے۔ مزاج میں سنجیدگی اور کم آمیزی اس حد کی ہے کہ کسی دوست کے گھر بھی کسی بہت ضروری وجہ کے بغیر نہیں جاتے۔ لیکن کسی ادب نواز افسر کے گھر اگر کھانے کے ساتھ ساتھ ایک بے تکلف مشاعرے کا پروگرام ہے تو غلام عباس اپنے ذمے نامہ بر کا کام بھی لے لیں گے۔ دن بھر ٹیلیفون کرتے رہیں گے اور جو لوگ ٹیلیفون پر نہیں ملیں گے انہیں گھر جا جا کے کہہ آئیں گے۔

انہیں کھلانے کا بے حد شوق ہے۔ ان کے گھر روز ایک مخصوص لذت کا گوشت پکتا ہے جس میں کوئی نہ کوئی سبزی ضرور ہوتی ہے، چاہے سبزی کدو ہی ہو، سالن کا مزا ہر روز ایک جیسا ہوتا ہے اس کے رنگ میں بھی فرق نہیں پڑتا۔ روز گھر سے بندھی ہوئی ایک مقدار دفتر آتی ہے۔ اگر ان کے پاس دو تین آدمی بھی بیٹھے ہوں تو غلام عباس یونہی تواضعاً نہیں پوچھیں گے بلکہ سالن کی اسی مقدار کو ٹفن کیریر کے الگ الگ حصوں اور ڈھکنوں میں بانٹ کر سب کے آگے رکھ دیں گے۔ اگر کوئی ان کے گھر دعوت میں پہنچ جائے تو وہ اسے جی بھر کے کھلائیں گے۔ اتنا کہ عمر بھر یاد رہے گوشت لذیذ ہوگا، اپنے دیسی رنگ ڈھنگ کا، اور غلام عباس اسے ایک انگریزی نام دے کر زیادہ دلچسپ بنائیں گے اور کھانے والا جتنی تعریف کرتا جائے گا اتنا اور گوشت اس کے سامنے آتا جائے گا۔

مذاق مذاق میں عباس صاحب نے ایک دن اپنے گھر ایک سالم بکرا کٹوایا اور چھ "پیٹ پہلوانوں" کو سیر ہونے کی دعوت دی۔ پکا ہوا لذیذ گوشت تگ تگ کے برتنوں میں آتا گیا اور جس نے جس مقدار کا برتن مانگا اس کے سامنے وہی رکھ دیا گیا۔ ان میں ایک حکیم صاحب بھی تھے جنہوں نے دو سیر کھا لیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ حکیم صاحب کو کچھ دن تک ہیضہ نما بدہضمی لاحق رہی اور وہ بال بال بچے۔ غلام عباس نے دراصل ایک اور دوست کا دعویٰ غلط ثابت کرنے کے لئے اتنا گوشت پکوایا تھا لیکن اس شخص نے پورے ڈھائی سیر کھا کر ہڈیوں تک کو سفوف بنا کر رکھ دیا اور حکیم صاحب ہار گئے۔ اس دعوت میں ڈیڑھ سیر سے کم کسی نے نہیں کھایا تھا۔ لیکن غلام عباس نے حسب عادت دو ہی تین نرم نرم بوٹیاں لیں۔ ان کے پسندیدہ کھانوں کی فہرست بہت مختصر ہے۔ وہ چھوٹے بکرے کی اگلی ٹانگوں کا گوشت کھاتے ہیں، دوسری کسی قسم کا گوشت نہیں کھاتے۔ مرغا ہو یا مرغابی مچھلی ہو یا شکار کسی اور جانور کا گوشت وہ کبھی نہیں کھائیں گے۔ کھانے کے معاملے میں وہ حد درجے کے حساس واقع ہوتے ہیں اور کھانے کی ایک قائم شدہ عادت کی حدود سے باہر نہیں آسکتے۔

انہیں ایک ادبی مجلس چاہئے اور ہو سکے تو ہلکی دھن میں ایک آدھ مشاعرہ بھی ہو جائے، ایسے شعروں کا جنہیں شاعر چھپا دیکھیں۔ اور اگر اس قسم کی مجلس کوئی بڑا آدمی یا بڑا ادیب اپنے گھر بلا رہا ہے تو اس وقت بھی غلام عباس سب کو بلاتے اور اطلاع کرتے پھریں گے۔

سنجیدہ ادبی مجلسوں میں جانے سے پہلے غلام عباس یہ ضرور معلوم کریں گے کہ مجلس میں اور کون کون شریک ہوگا۔ خیر یہ بات تو انہیں کوئی امتیازی خصوصیت نہیں دیتی۔ ہر اچھا ادیب اس کا دھیان رکھتا ہے لیکن جب بھی وہ کسی سوسائٹی یا مجلس میں دلچسپی لیں گے تو اس کی خاطر ہر تکلیف برداشت کرنے کے لئے تیار رہیں گے۔ حلقۂ ارباب ذوق دہلی کی دلچسپ مجلسوں کے لئے جب کوئی جائے نشست نہ رہی تو غلام عباس نے اپنا گھر پیش کیا۔ کئی مہینوں تک انہی کے گھر حلقے کی مجلسیں ہوتی رہیں۔ ان کے اشتیاق اور دلچسپی کی حد دیکھئے کہ ایک دن کسی نامعلوم وجہ کی بنا پر صرف ایک ہی صاحب مجلس میں شریک ہونے کو آئے جنہیں اس دن اپنا افسانہ پڑھنا تھا۔ غلام عباس نے اس دن بھی نشست منعقد کی۔ بڑے عجیب و غریب طریقے پر خود مجلس کی صدارت سنبھالی، صاحب افسانہ کو پڑھنے کا حکم دیا اور سامعین کی جگہ اپنے کتے کو بٹھا دیا۔

غلام عباس کے بارے میں کئی لوگوں کو غلط فہمی ہے کہ وہ مغرب پسند ہیں اور زندگی کے ہر شعبے میں انگریزیت کو اپنانا چاہتے ہیں۔ ایسا سمجھنے والے دراصل ان کی سطح کو دیکھتے ہیں، سطح کے نیچے گہرائی میں دیسی غلام عباس کو نہیں پہچانتے۔ مثال کے طور پر آپ ان کے ساتھ انگریزی میں بات کر کے دیکھ لیجئے۔ انگریزی میں صرف ان کے ہونٹ ہلتے رہیں گے لیکن الفاظ جب بھی نکلیں گے خالص اردو کے ہوں گے۔ آپ انگریزی بولتے جائیے وہ "بالکل بالکل بالکل" کرتے ہوئے آپ کے جملوں کا ساتھ دیں گے یا زیادہ سے زیادہ " YES YES ' YES " بالکل بالکل" کہتے جائیں گے۔

ان کے پاس ہزاروں کتابیں ہیں جنہیں انہوں نے بڑی کاوش سے جمع کیا ہے۔ سیکنڈ ہینڈ کتابوں کے پرانے خریدار ہیں۔ مشہور مصنفوں کی بڑی بڑی کتابیں نہ جانے کہاں کہاں سے نکال لاتے ہیں۔ سب کی سب کتابیں الماریوں میں قرینے سے رکھی رہتی ہیں۔ بیشتر کتابیں انگریزی کی ہیں لیکن ان کے دوش بدوش اپنی دیسی کتابیں بھی کم تعداد میں نہیں۔ ان میں اکثر انگریزی کتابیں ایسی ہیں جنہیں غلام عباس نے پڑھا ہی نہیں یا پڑھا ہے تو زیادہ سے زیادہ اس عبارت کو جو کتاب کے گرد پوش کے اندر مڑے ہوئے حصے پر ہوتی ہے۔ اسی حد تک وہ انگریزیت پسند ہیں۔ وہ بہت کم پڑھتے ہیں اور اگر کبھی پڑھیں گے بھی تو انگریزی افسانے کیونکہ انگریزی میں دنیا بھر کے افسانے پڑھنے کو ملتے ہیں۔

میں غلام عباس کے لکھنے کے بارے میں یہاں کچھ کہنا ضروری نہیں سمجھتا لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ غلام عباس ایک ایک سطر کو لکھ لکھ کر پانچ پانچ چھ چھ بار بغیر آواز نکالے اپنے موٹے موٹے نرم نرم ہونٹوں سے ایسے پڑھتے ہیں جیسے کوئی عامل بھوت اتارنے کے لئے منتر پڑھ رہا ہو۔

آپ کو ان کے گھر میں ایک آدھ انگریزی ساز بھی رکھا ہوا ملے گا۔ لیکن پوچھئے تو ان کو اس پر آدھی دھن بھی بجانی نہیں آتی ویسے وہ اس فن میں ملک کے ایک بڑے استاد کے شاگرد ہیں اور اس بات پر بڑا فخر کرتے ہیں۔

غلام عباس کبھی کبھی اونچی ٹانگوں والی انگریزی لیگ ہارن (LEGHORN) مرغیاں پالتے ہیں اس لئے کہ ان مرغیوں پر کبھی کبھی انعام ملتا رہتا ہے۔

غلام عباس سے ملے ہوئے مجھے اب سات سال ہو گئے ہیں۔ اس اثناء میں وہ ولایت بھی رہ آئے ہیں اور سُنا ہے وہاں انہوں نے ایک اور شادی بھی کر لی ہے، ہو سکتا ہے کہ وہ بہت بدل گئے ہوں لیکن مجھے یقین نہیں آتا۔ میں اب بھی اسی غلام عباس کو دیکھتا ہوں کہ گھر آئے، اپنا انگریزی قسم کا لمبا کوٹ اتار پھینکا، ہاتھ سے پائپ کو ایک طرف گرا دیا، تہمد باندھا، رضائی کھولی، اوڑھی اور سردی کا لطف لینے لگے اور وہیں بیٹھے بیٹھے اپنے دیسی الٹے توے کے بڑے بڑے پھلکے، ان کے بڑے بڑے نوالے جلد جلد کھائے اور سو گئے۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] —— ٧٩٠

گر میں نے دیکھا میں قایل ہوتا گیا کہ وہ جو کچھ لکھتی ہیں وہی ان کے احساسات بھی ہیں۔ بلکہ ان کی سمجھ میں تو یہ بات آہی نہیں سکتی کہ بغیر ایک کیفیت کو محسوس کئے ہوئے کوئی اس کیفیت کا اظہار کس طرح کر سکتا ہے۔ وہ جو مناظر اپنے افسانوں میں پیش کرتی ہیں ان مناظر میں وہ خود بھی کھوئی رہتی ہیں۔ وہ گرم ایشیا کی دوپہر کا گہرا گلابی رنگ محض لکھتی ہی نہیں ہیں دیکھتی بھی ہیں۔ وہ ماہ مارچ کے گستاخ آفتاب کو پیتل کے تھال کی طرح جگمگاتا ہوا بیان ہی نہیں کرتیں بلکہ اس سے ان کو ہر سال مارچ کے مہینے میں واسطہ بھی پڑتا ہے۔ وہ آسمان کے مختلف رنگ تصنیف نہیں کرتیں بلکہ یہ مختلف رنگ ان کی کیفیات پر براہ راست اثر انداز ہوتے ہیں۔ میں کئی مرتبہ گرمیوں کی دوپہر میں بھی ان کے گھر گیا ہوں اور میں نے ہمیشہ کوٹھی کے نچلے حصے میں خس کے پردوں سے ڈھکے ہوئے کمرے میں صرف تاج صاحب اور یاسمین کو پایا ہے۔ مگر حجاب صاحبہ اس تپتی ہوئی دوپہر میں بھی باہر پائی گئی ہیں۔ جہاں وہ کھلے ہوئے دروازوں سے اس گہری گلابی دوپہر کو درختوں پر بکھرے ہوئے زرد رنگ کو اور اس گہرے آسمان کو دیکھتی رہتی ہیں جس پر کسی نے جیسے نیلم پگھلا کر دور دور پھیلا دیا ہو۔ اور یہی مناظر ان کے لئے افسانے پیدا کرتے ہیں۔ لو کے تھپیڑے ان میں لکھنے کا ولولہ پیدا کرتے ہیں۔ اور وہ اس قدرتی ماحول سے گھبرا کر خس کے پردوں اور مصنوعی تاریکی کے غیر قدرتی ماحول میں کبھی پناہ نہیں ڈھونڈتیں۔ اور یقیناً وہ سمجھتی ہیں ان ہی موسموں کا تغیر ان کی کیفیات میں تنوع پیدا کرتا ہے۔ اور یہی موسم اور یہی موسمی مناظر تو ان کے مطالعے میں رہتے ہیں۔ یہ بدلتے ہوئے رنگ ہی تو ہیں جو ان سے اس قسم کے بے ساختہ فقرے لکھوا لیتے ہیں:-

"گرم ایشیائی مئی کے سبز آسمانوں پر ہلکے کاسنی رنگ کا چاند متبسم تھا"

ہم اور آپ سب مئی میں بھی آسمان کی طرف دیکھتے ہیں مگر ہم میں سے کتنے ہیں جن کو آسمان کا رنگ سبز اور چاند کا ہلکا کاسنی نظر آتا ہو۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم رنگ کے بے بصر ہیں۔ البتہ یہ واقعہ ہے کہ ہم رنگ ڈھونڈتے بھی نہیں چاند ضرور دیکھ لیتے ہیں مگر یہ ہوش نہیں ہوتا کہ اس کا رنگ کیا ہے اور کس موسم میں کیا ہوتا ہے۔ حجاب امتیاز کو چونکہ اپنے لئے شگفتگی یا پژمردگی ان ہی مناظر قدرت اور موسم کے ان ہی تغیرات سے حاصل کرنا ہوتی ہے' لہذا وہ ان ہی میں کھوئی رہتی ہیں۔ اگر کوئی ان کو گرمیوں کی کسی دوپہر میں اس طرح دیکھے کہ وہ ساری احتیاط سے اٹھائے ہوئے سنبھل سنبھل کر کمرے میں ٹہل رہی ہیں اور وہ آپ سے کہیں کہ آسمان کا رنگ اتنا گہرا ہے کہ گویا اس کا نیل بہہ بہہ کر کمرے میں آتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ اور مجھے ڈر ہے کہ میری ساڑی بھی اس رنگ میں رنگ نہ جائے تو شاید آپ یا کوئی اور ان کو اس طرح دیکھنے والا یہ سمجھے کہ وہ بن رہی ہیں مگر مجھے یقین ہے کہ وہ واقعی یہی محسوس کرتی ہیں۔ اور وہ اپنے احساسات کو اسی حد تک شدید بنا چکی ہیں کہ موسم کی کیفیات براہ راست ان پر گزرتی ہیں۔

حجاب امتیاز علی تجزیۂ نفس کی دلدادہ ہیں، اس فن کا گہرا مطالعہ بھی کر چکی ہیں اور خود بھی اس فن کے لئے اپنے کو مطالعہ بنا کر پیش کر چکی ہیں۔ جب کبھی خود ان کو کوئی شکایت ہوتی ہے ماہرین معالجۂ نفس کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں۔ مگر پچھلے سال جب وہ بیمار ہو کر صاحب فراش ہوئیں تو ان کی نظر انتخاب ایک اور مسیحائے دوراں، افلاطون زماں پر پڑی، اور وہ تھا یہ خاکسار۔ چنانچہ طے کیا گیا کہ میں روزانہ کچھ وقت ان کی خدمت میں حاضر ہو کر بیماری کا غم غلط کرنے کی کوشش کیا کروں۔ چنانچہ میں نے یہ خدمت بسر و چشم قبول کر لی اور روز ان کے پاس بیٹھ کر ادھر ادھر کی گپ ہانکا کرتا۔ لطائف بیان ہوتے۔ تاج صاحب۔۔ یاسمین، حجاب صاحبہ اور میں، یہ چار ایک کمرے میں بیٹھ جاتے اور تھوڑی ہی دیر میں وہ کمرہ قہقہوں سے گونجنے لگتا۔ میرا کام صرف یہ تھا کہ میں ان کی بیماری کا مذاق اڑاتا رہوں۔ چنانچہ وہ رفتہ رفتہ ٹھیک ہونے لگیں۔ جو بستر سے نہ اٹھ سکتی تھیں وہ سیڑھیاں اترنے لگیں۔ ڈرائیو پر جانے لگیں اور صحت اتنی اچھی ہو گئی کہ نظر بد سے بچنے کی دعائیں دی جانے لگیں۔ وہ تو کہئے کہ حجاب امتیاز علی نے میرے اس ماہرانہ علاج کا پروپیگنڈا نہیں کیا ورنہ اس وقت میرا مطب کافی چل چکا ہوتا۔ اور علاج بالنفس کو بہت بڑا درجہ حاصل ہوتا۔ اسی زمانے میں میں نے دیکھا کہ وہ بے شمار ذمہ داریاں اپنے سر لئے ہوئے ہیں۔ مثلاً درجنوں تو بلیاں ہی ہیں، کوئی برما کی ہے کوئی کہیں کی اور کوئی کہیں کی۔ گویا آپ کا گھر بلیوں کی جمعیۃ اقوام کا دفتر ہے۔ کسی کے لئے خانساماں کو ہدایت ہو رہی ہے کہ غسل خانے میں ایک کشن رکھ کر بلی کو وہاں بند کر دو اور اس کا کھانا وہیں پہنچا دو۔ کسی کے لئے خود طشتری میں خاصہ لئے پھر رہی ہیں کہ ماحضر تناول فرمالیں۔ ایک دن میں نے ان کو بے حد متفکر پایا۔ ڈرتے ڈرتے خیریت پوچھی تو معلوم ہوا کہ کوئی صاحب ہیں جعفر، ان کی طبیعت خراب ہے۔ ظاہر ہے کہ میں یہی سمجھا کہ کوئی

قریب مردہ ہوں گے۔ مگر جب تاج صاحب نے کہا کہ "اس کا پنجرہ اندر رکھوا دو" تو میں بھی چونکا اور تحقیقات کی تو معلوم ہوا کہ جعفر اسم مبارک ہے ایک طوطے کا اور ان ہی حضرت کی طبیعت ناساز تھی۔

تاج صاحب کو مع یاسمین اور حجاب صاحبہ کے کراچی جانا تھا۔ مگر فکر یہ تھی کہ ان کی عدم موجودگی میں اس زندہ عجائب خانے کی دیکھ بھال کون کرے گا۔ ان طوطوں اور بلیوں کی فکر سب سے زیادہ تھی۔ آخر یہ خدمت میرے سپرد ہوئی کہ میں کبھی کبھی آکر ان سب کی خیریت پوچھ جایا کروں۔ مگر میری قسمت میں ایک بدنامی لکھی ہوئی تھی کہ اسی زمانے میں ایک طوطے نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ اور میں اب اس فکر میں کہ کس طرح اس غم جانکاہ کی اطلاع تاج صاحب کو دوں۔ بہرحال اس طوطے کی تجہیز و تکفین کے بعد میں نے ڈرتے ڈرتے تعزیتی خط تو لکھ دیا مگر ساتھ ہی ساتھ یہ بھی لکھ دیا کہ اس کی خبر بھابی کو فی الحال نہ دیجئے گا۔ اس لئے کہ ڈر یہ تھا وہ شیریں چھوٹی چھوٹی باتوں سے بڑے بڑے نتیجے اخذ کرنے والی نہ جانے اس حادثے کا کیا اثر لے بیٹھیں۔

بہرحال حجاب امتیاز علی ایک ایسے ماحول میں رہتی ہیں جو ان کا وضع کیا ہوا ہے۔ وہ اپنے افسانوں کا خود بھی ایک پیکر ہیں، ان کے افسانے ان کے اسی ماحول سے ابلتے ہیں۔ اور ان کے ہر افسانے میں ان کی وہ کیفیت نمایاں ہوتی ہے جو ان دنوں ان پر طاری ہو۔ یوں ان کی مختصر سی دنیا میں صرف تین افراد ہیں۔ وہ خود، ان کی بچی یاسمین جس کے نام میں ان کو تین حسن نظر آتے ہیں۔ پھول، موسیقی اور چاندنی رات۔ اور ان کے شوہر جو یقیناً ایک معیاری شوہر ہیں۔ وہ شوہر جو اپنی شریک حیات کے لطیف سے لطیف احساس کا بھی نبض شناس ہو۔ یاسمین ان کے گھر کا اجالا بھی ہے اور رونق بھی، زمزمہ بھی ہے اور تبسم بھی۔ اور گو ظاہر نہیں کرتے مگر یہ دونوں انشاپرداز میاں بیوی اسی کو دیکھ دیکھ کر جیتے ہیں۔ وہی ان کا حال ہے اور وہی ان کا مستقبل!!

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

کیا گیا۔ خدیجہ نے اپنے سے فٹ فٹ بھر نیچے لڑکوں لڑکیوں کو ٹھنی دے کر ان کی تتیسیاں ڈھیلی کر دی تھیں اور ہاجرہ کو اچھے خاصے سمجھتے بوجھتے سیانے بچوں کی یہ گت کبھی بھی نہ لگتی۔ گڑیوں سے بھی اسے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ رہ گئی پڑھائی تو جب ابّا اسے ماسٹر کے پاس بٹھا کر رٹ رہے تھے تو تھوڑی دور رہ جا کر، دیکھا کہ ہاجرہ بھی واپسی پر ان کے ساتھ ساتھ چلی آ رہی ہے۔ وہ تو بھلا ہو عائشہ کا کہ انھوں نے ایک بار گھر بھر کو جمع کر کے بچوں کے ایک رسالے میں سے "سنڈریلا" کی کہانی پڑھ کر سنائی تو ہاجرہ چونکی ورنہ وہ تو جھے ہوئے چوٹے کو کھود کھود کر ننھے ننھے گھروندے بنانے میں مگن تھی اور وہ بھی اس حد تک کہ کوئی دیکھ نہ پائے۔ اس نے عائشہ سے "سنڈریلا" کی کہانی دوبارہ سنی۔ سہ بارہ سنی اور پھر جب بار بار فرمائش کی تو عائشہ بور ہو چکی تھیں۔ انھوں نے کہانی سنانے سے انکار کر دیا اور کہا "بڑی ہو کر خود پڑھ لینا"۔ اس وقت ہاجرہ نے فیصلہ کر لیا کہ کسی کا محتاج ہوئے بغیر "سنڈریلا" کی کہانی سے محظوظ ہونے کے لئے ماسٹر صاحب سے سبق لینے میں کوئی خاص قباحت نہیں۔

چارلس پیدالت کی کہانی "سنڈریلا" سے لے کر ہاجرہ کی اپنی کہانی "بندر کا گھاؤ" تک کا عرصہ آٹھ نو برس پر محیط ہے۔ میں ماہنامہ "ادب لطیف" کا ایڈیٹر تھا جب میں نے رسالہ "ساقی" میں یہ افسانہ پڑھا اور اس کے معیار پر فنی تاثر کے تحت میں نے ہاجرہ سے "ادب لطیف" کے لئے ایک کہانی طلب کی۔ لیکن اس وقت مجھے وہم بھی نہ تھا کہ جس خاتون کو میں "محترمہ" کے رسمی القاب سے مخاطب کر رہا ہوں وہ چار ہی برس کے بعد اپنے گھرانے کے گیارہ افراد سمیت میرے گھرانے کے اس قدر قریب آجائے گی جیسے ہم سب ایک ہی ماحول اور ایک ہی گود میں پلے بڑھے ہیں۔ اور جس تیرہ چودہ برس کی "محترمہ" سے (ہاجرہ کی تاریخ پیدائش ۱۷ جنوری ۱۹۲۹ء ہے) میں "ادب لطیف" کے لئے افسانے کی درخواست کر رہا ہوں وہ پانچ چھ برس کے بعد اپنی ماں کی بات ٹوکنے پر میرے ہاتھوں پٹ بھی جائے گی۔

اکتوبر ۱۹۴۷ء میں جب ہاجرہ اپنے گھر کے تمام افراد سمیت لکھنؤ سے بمبئی، بمبئی سے کراچی اور کراچی سے لاہور پہنچی (لکھنؤ سے لاہور کے صراطِ مستقیم کو انسانی خون کے ایک دریا نے کاٹ ڈالا تھا) تو میں پشاور ریڈیو اسٹیشن میں مسلمان شہنشاہوں کے عدل و انصاف کو ڈراموں اور فیچروں کے لباس پہنا رہا تھا۔ ان دنوں رسالہ "سویرا" کی ادارت بھی میرے سپرد تھی اور ڈیکلیریشن حاصل کئے بغیر رسالہ شائع کرنے کے جرم میں رسالے کے مالک کے علاوہ مجھ پر بھی مقدمہ چل رہا تھا۔ اسی مقدمے کے سلسلے میں لاہور آیا۔ فسادات کی وجہ سے ڈاک میں بہت گڑبڑ تھی اس لئے مجھے ہاجرہ کے لاہور پہنچنے کی اطلاع نہیں مل سکی تھی۔ بھائی طفیل (مدیر نقوش) نے بتایا تو سیدھا نسبت روڈ پر پہنچا۔ اس روز سے لے کر آج تک کی ہاجرہ سے تو میں بہت اچھی طرح واقف ہوں لیکن اس سے پہلے کے اٹھارہ انیس برسوں کے سلسلے میں بھی میری معلومات ہمہ گیر ہیں۔ میں ان سب کو خط و کتابت کے ایک طویل سلسلے کے بعد بہت اچھی طرح جان چکا تھا بلکہ مجھے تو ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے میں تو انھیں جنم جنم سے جانتا ہوں۔ ویسے بھی ہاجرہ کی شخصیت سے متعلق میری معلومات ان مشاہدات پر مبنی ہیں جن کے غلط ہونے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کیونکہ یہ مشاہدات باقاعدہ انٹرویو کے رہین منت نہیں ہیں جب انٹرویو دینے والا کسی "تکلیف دہ" سوال کے جواب میں کترا کر بھی نکل سکتا ہے۔ یہاں تو ہاجرہ نے خدیجہ پر کوئی چھینٹا کسا تو خدیجہ نے ہاجرہ کا سارا کچا چٹھا بیان کر ڈالا۔ اور پھر جب سرما کی طویل راتوں میں باجی اماں کے پاس بیٹھ کر ہم سب نے اپنے اپنے بچپن کے قصے مزے لے لے کر سنائے اور ہاجرہ نے اپنے سلسلے میں جہاں بھی غلطی کی وہاں فوراً اس کی تصحیح کر دی گئی۔ مثلاً خدیجہ کہتی: "یہ "میں نے کہا" "میں نے کہا"، کی کیا رٹ لگا رکھی ہے۔ تم نے خاک کہا ہوگا۔ تم تو "کم سخن" مشہور تھیں۔ اتنی بچی تلی بات تو جہاں تک میری یاد میرے ذہن کا ساتھ دیتی ہے، خدیجہ مستور ہی نے کہی ہوگی"۔ ہاجرہ نے بتایا: "افوہ۔ حساب سے تو میری جان نکلتی تھی"! اور خدیجہ نے اطلاع دی: "صاف صاف بتا دو نا کہ تم پڑھائی میں بالکل "ڈل" تھیں اور حساب تو خیر تم سے چلتا ہی نہ تھا"۔ معلوم ہوا کہ ہاجرہ دو اور دو پانچ، اور پانچ اور پانچ چھ کا کچھ ایسا چکر چلاتی تھی کہ ریاضی کے سلسلے میں آئن سٹائن کے نظریات بھی منہ تکتے رہ جاتے۔ ایک بار انگریزی کا پرچہ ہاجرہ کے مبلغ علم سے اونچا نکلا۔ بقراط تو تھی ہی۔ کچھ دیر بیٹھی سر کھجاتی رہی۔ پھر سب سوالوں کا یہ

" اور جو ہم آپ کے مُلک میں اُردو پڑھانے آئیں ؟"

ایک دفعہ انگریزی لفظ پنک (PINK) کو فقرے میں استعمال کرنے کی ہدایت ہوئی تو کہیں دُور جانے کی ضرورت ہی نہ تھی اور اپنے آپ کو ہی فقرے میں استعمال کر ڈالا :-

MY CHEEKS ARE PINK .

ہاجرہ آٹھ برس کی تھی جب (دسمبر ۱۹۳۶ء میں) والد چل بسے ۔ اور متوسط درجے کا یہ خاصا لکھا پڑھا گھرانا اچانک جیسے ایک لق و دق صحرا میں بھٹک گیا ۔ گھر میں صرف ایک " مرد " تھا جس کی عمر اس وقت بمشکل پانچ برس ہو گی ۔ یہ چھ بہنوں کا بھائی تو صیف تھا ۔ گھرانے کی یہ بے بسی دیکھ کر اقارب عقارب میں بدل گئے اور ایک بیوہ اور سات یتیموں کا سارا اثاثہ چھین جھپٹ کر الگ ہو بیٹھے ۔ ماں اپنا دامن جھاڑ کر اُٹھ بیٹھیں اور بچوں کو ساتھ لے کر مستقل طور پر لکھنؤ میں اپنے ابا کے پاس آ گئیں ۔ اس کے بعد مصائب کا ایک ایسا طوفان اٹھا جس میں سب رُلتے پھرے ۔ عزیزوں سے ایسے ایسے چرکے پہنچے کہ آپس ہی میں بچھڑ بچھڑ گئے ، ٹکرا ٹکرا گئے ۔ ماں کا صبر و ضبط ، دُور اندیشی اور خودداری ان زخموں پر مسلسل پھاہے رکھتی رہی اور آخر ماں نے ہی سب کو ایک لڑی میں پرو دیا ۔ ہاجرہ کی حساسیت نے یہیں سے بڑی گہری اور شروع شروع میں قنوطی اور کلبی صورت اختیار کر لی ۔ اور وہ جو بچپن میں کم سخن مشہور تھی ۔ اپنے ننھے منے معصوم خوابوں کے ملبے میں بھٹک کر رہ گئی ۔

ہاجرہ کے وہ تمام خواب چکنا چور ہو گئے تھے جو وہ اپنی تنہائیوں میں دیکھا کرتی تھی ۔ ہاجرہ آج بھی خواب دیکھتی ہے مگر ان کی نوعیت یکسر بدل گئی ہے ، ابا کی وفات سے پہلے ہاجرہ کے خوابوں اور ان کی تعبیروں میں کچھ زیادہ بُعد نہیں ہوتا تھا ۔ اِدھر اس نے کسی خواب کا اظہار کیا اُدھر ملازم بازار سے اس خواب کی تعبیر خرید سے چلا آ رہا ہے ۔ مگر اب اس کے خواب " ایسا کیوں ہے " سے شروع ہوتے اور " اگر یوں ہو جائے " اور " ایسا کس طرح ہو " کی وسعتوں میں نکل جاتے ۔ اور یہ وسعتیں بیکراں تھیں ۔ ان کا کوئی اور چھور نہیں تھا ۔ سفر ختم نہیں ہوتا تھا اور خواب جاری رہتے تھے ۔ یہی وجہ ہے کہ ہاجرہ کے سوتے جاگتے کے خوابوں میں ہمیشہ ایک تسلسل قائم رہتا ہے ۔ دھوپ میں بارش کے خواب ۔ بارش میں حدِ نظر تک پھیلے ہوئے سبزہ زاروں کے خواب ۔ سبزہ زاروں میں نگینوں کی طرح جڑی ہوئی جھاڑیوں اور ان پہ اُمڈتے ہوئے پھولوں کے خواب ۔ اور یہ سلسلہ رواں رہتا ہے ۔ آج بھی اگر آپ اس سے بات کر رہے ہوں تو آپ یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ وہ آپ کی بات سن رہی ہے یا کوئی خواب دیکھ رہی ہے ، ڈرائنگ روم میں بیٹھی بیٹھی اچانک وہ اپنے خوابوں کی دُنیاؤں میں چلی جاتی ہے اور اسی لئے بعض عزیزوں کو شکایت ہے کہ ہاجرہ کسی کی بات تو سنتی ہی نہیں ۔ شادی سے پہلے اس کے خوابوں کی اُڑان اس وقت کٹتی جب باجی اماں کی آواز آتی ۔ " بھئی ہاجرہ ۔ ناشتہ کرو گی یا مہترانی کو بھجوا دوں ؟ " اور شادی کے بعد تو ہاجرہ کے خوابوں میں اس کی بیٹی نوید مسلسل اور مستقل ناچتی اور تھرکتی پھرتی ہے ۔ مگر نوید تو ہاجرہ کے لئے ایک مجسم خواب ہے ۔ یہ الگ بات ہے کہ مٹی کھانے یا جوتا نہ پہننے پر اس نے اپنے ہی خواب کو دو مرتبہ جھڑک بھی دیا ہے ۔

جب بھی اس کے خوابوں کا ذکر چلا ہے ۔ اس نے اپنی اس عادت کی بڑی پُر زور وکالت کی ہے مگر کبھی کبھی وہ میرے کان میں کہتی ہے " بھیّا ۔ یہ خواب دیکھنے کی عادت ایک لحاظ سے تو بُری بھی ہے ۔ اس سے عمل کی قوتیں پُوری طرح بیدار نہیں ہو پاتیں " ۔

مگر میری رائے میں جو انسان خواب نہیں دیکھ سکتا وہ بڑا ہی غبی ہوتا ہے ۔ خواب ہی تو انسان کے تخلیقی تسلسل کی بنیاد ہیں اور خواب دیکھنے والا ہمیشہ بہت حساس ہوتا ہے ۔ جب ڈراؤنے افلاس ، گھناؤنے امراض اور انسان کے ہاتھوں انسانوں ہی کے استحصال کے مناظر اس کے خوابوں کو نا تار دیتے ہیں تو وہ جذبہ صورت پذیر ہوتا ہے جس نے انسانی تاریخ کا رُخ پلٹ پلٹ دیا ہے ۔ ہاجرہ کے بچپن کا واقعہ ہے ۔ گلی میں سے ایک بوڑھا چاٹ والا گزر رہا تھا ۔ شریر بچوں نے اسے گھیر لیا اس کے لباس کو نوچنے کھسوٹنے لگے ۔ اور آخر کار اس کے خوانچے کو

گرا کے دم لیا۔ ہاجرہ بھی ان بچوں میں موجود تھی مگر وہ شرارت میں حصہ لینے کے بجائے کھڑی سوچتی رہی کہ ایسا کیوں ہوا؟ بوڑھے نے بچوں کا آخر کیا بگاڑا تھا۔ یہ بڑھا خوانچے والا برسوں تک اس کے خوابوں کے پس منظر میں منڈلاتا رہا ہے اور اسی لئے آج بھی جب وہ غریب کے معاملے میں خاصی حکمت سے، افلاس زدہ لوگ اس سے کچھ نہ کچھ لے ہی مرتے ہیں۔ بعض لوگ کہیں گے "جذباتیت۔ نری جذباتیت" مگر کاش یہ "جذباتیت" عام ہو کر انسانی فطرت بن سکتی!

دو برس کی بات ہے۔ میں ہاجرہ کے ہاں گیا تو ایک بڑھیا اس کے پاس بیٹھی اپنا دکھڑا رو رہی تھی۔ وہ سرحد کی رہنے والی تھی اور ہاجرہ کو بتا رہی تھی کہ اس کا شوہر سردی میں ٹھٹھر کر مر گیا ہے۔ جوان بیٹے کو نمونیہ ہو گیا ہے۔ وہ ایک دکان کے چھجے تلے پڑے ہیں اور اللہ کی قدرت دیکھ رہے ہیں۔ بھیک نہیں مانگ سکتے، کیونکہ عمر بھر اپنے ہاتھوں کی کمائی کھائی ہے اور ہاتھ ڈھیلے کر کے بات کرنے کی عادت نہیں —— اس قسم کے لوگ ایشیا کے شہروں کے ہر چوراہے پر مل جاتے ہیں اس لئے میں نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ دی اور ایک رسالے کے ورق الٹتا رہا۔ اپنی رام کہانی سنانے کے بعد بڑھیا نے رو رو کر ہاجرہ سے قرض حسنہ کا مطالبہ کیا اور ہاجرہ جو نہایت سوچ سمجھ کر رحم کھاتی ہے۔ اسے چند روپے دے ڈالے۔ بڑھیا کے جانے کے بعد میں نے اس کی وجہ پوچھی تو اس نے کہا کہ وہ جو اس نے اپنی محنت سے کما کر کھانے کی بات کی تھی، تو وہ اس کے دل میں اتر گئی۔ چند روز بعد معلوم ہوا کہ ہاجرہ کے کچھ اور روپوں سے بڑھیا کے لڑکے نے مزنگ کے کسی چوک میں خشک میووں کی ریڑھی لگا دی ہے۔ پھر پتہ چلا کہ بڑھیا ڈبی بازار کے بزازوں کی معرفت رؤسا کی کوٹھیوں میں جاتی ہے اور کپڑے کا سودا کر کے دکانداروں سے کمیشن حاصل کرتی ہے۔ ایک روز وہ سستے کپڑے کا وعدہ کر کے ہاجرہ سے بیس روپے لے گئی اور آج دو برس سے وہ ڈبی بازار سے جیل روڈ کا فاصلہ طے نہیں کر سکی۔ میں نے ایک روز طنزاً پوچھا "اس مسکین بڑھیا کا کوئی سراغ چلا؟" بولی "لالہ۔ میں سوچتی ہوں۔ کہ وہ جھوٹی نہیں تھی، اس نے محنت کر کے کھانے کی بات کی تھی، وہ سچی بھی تھی۔ یہ جو بڑی بڑی ایکٹریسیں لاکھوں روپیہ کماتی ہیں، وہ بھی تو اپنے فن سے ہمیں رلاتی ہیں، ہنساتی ہیں اور سوچنے پر مجبور کرتی ہیں، بڑھیا جو اتنی دیر روئی تو کیا یہ کردار ادا کرنے کے لئے اس نے کوئی محنت نہیں کی؟ میں سوچتی ہوں، اس قسم کی چھوٹے پیمانے کی ایکٹریسیں اگر کسی سے کچھ لے مریں تو اس میں غصے کی کیا بات ہے۔ بے چاریاں اپنی اس "فنکاری" کے سلسلے میں کتنا خطرہ مول لیتی ہیں۔ اور کتنی محنت کرتی ہیں!"

آپ کہیں گے یہ ہاجرہ کی نرم دلی اور خدا ترسی ہے۔ نرم دل اور خدا ترس تو وہ ہے مگر باون تولہ پاؤ رتی قسم کی۔ اس معاملے میں تو وہ اتنی خوفناک حقیقت پسند ہے کہ دو میل پیدل چل لے گی مگر ٹانگے والے کو آٹھ آنے سے نو آنے نہیں دے گی "یہ اصول کی بات ہے" وہ کہتی ہے مگر ہم لوگوں نے قسم قسم کے لطیفے گھڑ رکھے ہیں۔ حمید اختر کا کہنا ہے کہ لاہور بھر کے ٹانگے والوں نے ایک ہزار کا نقد انعام اس کوچوان کے لئے مقرر کر رکھا ہے جو ہاجرہ مسرور سے جیل روڈ سے نسبت روڈ تک کا کرایہ آٹھ آنے کے بجائے سوا آٹھ آنے وصول کر لے اور آج چار برس سے یہ انعام جوں کا توں رکھا ہے۔ ہاجرہ ان لطیفوں پر خوب خوب ہنستی ہے۔ بلا کی حاضر جواب ہے اس لئے محض ہنسی پر اکتفا نہیں کرتی بلکہ اُلٹا مذاق کرنے والوں کو چکرا دیتی ہے۔

۱۹۴۱ء کے دن تھے۔ پانی برس رہا تھا۔ ساری فضا سرمئی ہو رہی تھی جب ہاجرہ کے پاس خدیجہ آئی اور بولی "کہتے ہیں ایسے موسم میں لوگ لکھتے ہیں۔ آؤ ہم بھی لکھیں" ذرا سی رد و کد کے بعد دونوں بہنیں قلم لے کر لکھنے بیٹھ گئیں اور ابتدا شاعری سے ہوئی۔ دونوں نے گیت لکھنے شروع کئے مگر یہ مرحلہ سر ہونے تک مطلع صاف ہو گیا اور "موڈ" ختم ہو گئے۔ خدیجہ اس دوران میں ہاجرہ کو لکھنے کے لئے بار بار اکساتی رہی۔ حالات خراب تھے۔ اور پھر جنگ کی وجہ سے مہنگائی عروج پر تھی۔ دونوں اداس اداس ایک کمرے میں پڑی رہتیں اور ادب کی باتیں ہوتیں۔ اماں رسالہ "عصمت" کی مضمون نگار تھیں۔ ابا مرحوم ادبی کتابوں کے رسیا تھے سو لاشعور میں تو ادب رچا بسا ہوا تھا۔ ایک دن خدیجہ نے کہا "شاعری نہیں چلتی تو لاؤ افسانہ لکھیں"

"ہمیں تو نہیں آتا" ہاجرہ نے بے دلی سے کہا۔

مگر خدیجہ نے "کوشش تو کر دیکھیں" کی صلاح دی۔ دونوں ادھر اُدھر کروٹ بدل کر لکھنے لگیں۔ خدیجہ کے افسانے کا عنوان "صہبا" تھا اور ہاجرہ نے "لاوارث لاش" سے ابتدا کی۔ لکھ چکیں تو دونوں دم بخود رہ گئیں۔ ارے یہ کہانیاں ہیں۔ ہماری کہانیاں! پھر ہاجرہ نے اپنی کہانی خدیجہ کو سنائی، اور خدیجہ نے اپنی کہانی ہاجرہ کے گوش گزار کی۔ اور دونوں احساسِ کمتری میں مبتلا ہو گئیں۔ ہاجرہ خدیجہ کی کہانی کو شاہکار بتا رہی تھی اور خدیجہ ہاجرہ کی کہانی کو بے مثال قرار دے رہی تھی۔ دلی میں ایک عزیز تھے جن کی خاصی ادبی حیثیت بھی تھی۔ دونوں نے انھیں اپنی اپنی کہانیاں اشاعت کے لئے بھجوائیں۔ انھوں نے نصیحتوں بھرا خط لکھا کہ شریف اور پردہ دار مسلمان گھرانوں کی یتیم بیٹیاں ایسا نہیں کرتیں۔ باجی اماں نے یہ خط دیکھا تو کہا کہ شریف مسلمان گھرانوں کے بزرگوں کو ایسی پوچ نصیحتیں نہیں کرنی چاہئیں مگر خیر، جانے دو اور تم لکھتی جاؤ۔ دلی کے عزیز نے افسانے تو چھپوا دیے مگر ہاجرہ مسرور کی جگہ ہ۔ م کا نام دینا مناسب سمجھا۔ اور ادھر ہاجرہ کی یہ حالت کہ چھوٹی سے بھی چھوٹی بہن عابدہ تک کو اپنی کہانی سنا ڈالی۔ جب لکھنؤ کے عزیزوں کو پتہ چلا کہ ان ذرا ذرا سی لڑکیوں کے نام اخباروں میں چھپ گئے ہیں تو ٹوٹ ٹوٹ کر برسے مگر یہ اپنی ماں کے سہارے لکھتی رہیں۔ بمبئی کے ایک ماہنامہ اور ہفت روزہ کے پروپرائیٹر نے ہاجرہ کو لکھا کہ اگر وہ مہینے میں چار افسانے ہفت روزہ کے لئے اور ایک افسانہ ماہنامہ کے لئے لکھا کریں تو انھیں مبلغ تین روپے فی افسانہ کے حساب سے مبلغ پندرہ روپے ماہوار پیش کئے جائیں گے۔ اقتصادی حالات بھی اچھے نہ تھے اور پھر تیرہ برس کی عمر میں لکھے ہوئے افسانوں کا معاوضہ اور وہ بھی بمبئی ایسے سوجھ بوجھ والے شہر سے۔ ہاجرہ نے مارے فخر کے پانچ افسانے لکھ مارے اور پندرہ روپے حاصل کئے مگر دوسرے ہی مہینے احساس ہوا کہ اس ذہنی مزدوری کی شرح معقول نہیں ہے۔ اور یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔ ابتدا معمولی رسالوں سے ہوئی۔ پھر دونوں بہنیں ساقی، ادبی دنیا اور ادبِ لطیف میں نمودار ہوئیں اور جب وہ ستمبر ۱۹۴۷ء میں لاہور آئیں تو ہاجرہ کے افسانوں کے دو مجموعے "چرکے" اور "ہائے اللہ" شائع ہو چکے تھے اور ہاجرہ کا شمار اُردو کے ان افسانہ نگاروں میں ہوتا تھا جنھوں نے اُردو فکشن کو زبان، بیان اور موضوع کے لحاظ سے نئے امکانات اور وسعتوں سے روشناس کرایا ہے۔

لکھنؤ میں سونے کے کمرے سے ملی ہوئی ایک بے ڈول سی کوٹھری تھی جس میں صرف ایک کھڑکی تھی۔ کھڑکی میں سے باہر کی دنیا کے چند درخت، تکمیل الطب کالج کا اناٹومیکل بلاک اور چند پختہ قبریں نظر آتی تھیں۔ ایک طرف جھک کر دیکھنے سے مولانا عبدالحلیم شرر مرحوم کا مقبرہ بھی دکھائی دے جاتا۔ کمرے میں ایک پرانی میز تھی۔ ایک کرسی، میز پر کاغذ بکھرے ہوئے۔ بہت سے قلم اور پنسلیں، خطوط کا انبار، کتابیں، رسالے، آل پن کی ڈبیا، روشنائی کی بوتل اور ایک گلاس۔ یہ کل کائنات تھی۔ عموماً رات کو لکھا پڑھا جاتا۔ بروقت ادائیگی نہ ہونے کے باعث بجلی کا میٹر اکھڑ چکا تھا اس لئے لالٹین کی روشنی سے کام چلایا جاتا۔ لکھنا ہوتا تو پلنگ پر بیٹھ کر یا اوندھے ہو کر یا کروٹ سے لیٹ کر، ایک ہاتھ پر سر رکھ کر دوسرے ہاتھ میں قلم تھام لیا جاتا۔ افسانہ تین روپ بدلتا۔ پہلی بار جو کچھ ذہن میں ہے وہ کاغذ پر منتقل کر دیا جاتا۔ دوسری بار فنی انتخاب کا درجہ آتا اور خامیاں دور کی جاتیں اور تیسری بار افسانہ صاف ہوتا۔ دونوں بہنیں ایک دوسرے کی نقاد تھیں۔ اس لئے افسانے کی خوبیوں یا خامیوں پر خوب بحثیں رہتیں۔ اس دوران میں افسانوں کے پلاٹوں پر خوب خوب جھگڑے ہوتے۔ ایک نے دوسرے کو اپنی اگلی کہانی کا پلاٹ سنا دیا تو "اس پر تو ہم لکھیں گے" کا حکم صادر ہو جاتا۔ اس معاملے میں ہاجرہ اور خدیجہ کے درمیان وہ چھینا جھپٹی ہوئی ہے کہ اللہ دے اور بندہ لے۔ اس ہاتھا پائی سے ایک آدھ بار میں نے یوں فائدہ اٹھایا ہے کہ ان کی لڑائی کے دوران میں میں نے ہی اس پلاٹ پر اپنی کہانی تعمیر کر لی اور دونوں میرا منہ تکتی رہ گئیں۔

یہ ہاجرہ کے ساتھ خدیجہ کا جو بار بار ذکر آجاتا ہے تو یہ میری مجبوری نہیں، حقیقت ہی یہی ہے کہ ان دونوں بہنوں میں سے ایک کو دوسری سے جدا کر کے دیکھا ہی نہیں جا سکتا۔ میں نے ایک بار ہاجرہ سے پوچھا تھا کہ آخر تمہاری سہیلیوں کی تعداد اتنی معمولی کیوں ہے تو اس نے کہا تھا۔

"دراصل خدیجہ نے یہ سارے خلا پُر کر رکھے ہیں۔"

میں جب پہلی بار اس گھر میں آیا ہوں تو جب بھی سب سے پہلے خدیجہ ہی سے ملاقات ہوئی۔ اکتوبر ۱۹۴۷ء کی کسی شام کا ذکر ہے۔ میں بھائی طفیل کے ہمراہ ہاجرہ کے ہاں آیا تو ایک کمرے میں بیٹھ کر میں نے محسوس کیا کہ میرے پہنچتے ہی گھر میں ہلچل سی پیدا ہو گئی ہے۔ سب افراد اور وہ کے سبالا بچے بدر کے ملیریا میں ناک ناک تک ڈوبے ہوئے تھے۔ ذرا سی دیر کے بعد مجھے ایک کمرے میں لے جایا گیا جہاں تین پلنگ بچھے تھے۔ ایک پر تو ضعیف ابوہ سے گزر کر مرنے کی سرحدیں طے کر رہا تھا۔ دوسرے پر چھوٹی بہنیں عابدہ اور شاہدہ اکٹھی لیٹی ایک دوسرے کا بخار ناپ رہی تھیں۔ تیسرے پلنگ پر سے ایک لڑکی اٹھی اور بھیا بھیا پکارتی ہوئی مجھ سے لپٹ کر بے اختیار رو دی۔ یہ خدیجہ تھی۔ اس کے بعد خدیجہ نے دوسرے کمرے میں سب سے میرا تعارف کرایا۔ سب کو بخار میں پھنستا دیکھ کر مجھے بے حد دُکھ ہوا۔ اور یہ بھی یاد نہ رہا کہ ابھی ہاجرہ سے ملاقات نہیں ہوئی۔ پھر خدیجہ نے آواز دی کہ ہاجرہ آؤ۔ بھیا سے ملو۔ معلوم ہوا کہ ہاجرہ دروازے کے پاس گیلری میں کھڑی ہے۔ میں اُٹھ کر اس کے پاس گیا۔ اس کے سر پہ ہاتھ رکھا اور اسے اندر لے آیا۔ وہ مجھے اتنی چھوٹی سی لگی کہ ایک بار جی چاہا۔ کہوں بیٹی مجھے اس ہاجرہ سے نہیں "ہائے اللہ" کی مصنفہ ہاجرہ مسرور سے ملنا ہے۔ کیونکہ جب ہم بڑی ریاضت کے بعد چوبیس پچیس برس کی عمر میں اس قابل ہوئے ہیں کہ اپنے شعروں اور افسانوں سے لوگوں کو ذرا سا اپنی طرف متوجہ کر سکیں تو یہ اتنی سی لڑکی جو اپنے مُنہ بولے بھائی سے پہلی ملاقات کے بعد خدیجہ کی طرح مارے خوشی کے لئے جا رہی ہے، اور رونے کی وجہ سے اور بھی چھوٹی ہو گئی ہے ان کہانیوں کی مصنفہ کیسے ہو سکتی ہے جن میں انسان اور سماج سکے۔ ان پڑھے ہیں اور جن میں نفسیات، مشاہدات اور بڑی جاندار توقعات کی دُنیائیں آباد ہیں۔

ذرا دیر بعد سب میری خاطر مدارات میں لگ گئے۔ میں دیکھتا رہا کہ وہ بڑی پھرتی سے اکیلی سارے گھر کی تیمارداری کر رہی ہے اور ساتھ ہی میرے کھانے کا انتظام بھی۔ میں نے سوچا کس قدر سلیقہ مند لڑکی ہے۔ (یہ راز بعد میں جا کر معلوم ہوا کہ ہاجرہ مجبوری کے تحت اتنی سگھڑ نظر آ رہی تھی) پھر تو ہمرت نے دوسرے کمرے میں شور مچا دیا کہ بھیا میرے پاس کیوں نہیں آ بیٹھتے؟ میں اُٹھ کر اس کے پاس چلا گیا اور وہ اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے مجھے پیار سے دیکھے جا رہا ہے۔ مگر بولتا نہیں۔ پھر معلوم ہوا کہ اوپر کے کمرے میں کسی طرح نانا کو پتہ چل گیا ہے کہ ندیم آیا ہے اور وہ اندھیرے میں سیڑھیوں سے اُتر رہے ہیں۔ میں تصور نہیں کر سکتا تھا کہ اس گھر کا بچہ بچہ مجھے اتنی اچھی طرح جانتا ہے اور میں اچانک اتنی گھریلو فضا سے دوچار ہو جاؤں گا۔ میں مارچ ۱۹۴۸ء میں پشاور چھوڑ کر مستقل طور سے لاہور آ گیا اور ہاجرہ اور میں نے بھائی طفیل کے تعاون سے نقوش کے پہلے نمبر کی تیاریاں شروع کر دیں۔ ہاجرہ کے سگھڑاپے کے جوہر اب آ کر کھلے۔

میں نقوش "کا اداریہ لکھ رہا ہوں۔ وقت کم ہے طفیل صاحب کا آدمی نیچے گلی میں منتظر کھڑا ہے۔ ہاجرہ بیکار مسودات کو اُلٹ پلٹ رہی ہے۔ سگریٹوں کے تواتر نے میرا گلا خشک کر دیا ہے۔ میں کہتا ہوں "پیٹو۔ جلدی سے ایک گلاس پانی پلا دو!" اور ہاجرہ جواب دیتی ہے "نوکر کو پکار دو نا بھیا۔ میں تو آج بُری طرح تھک گئی ہوں!"

سنتا کر سارا خون میری کنپٹیوں میں جمع ہو جاتا ہے اور میں نوکر کو پکارنے کے بجائے پاؤں پٹختا ہوا خود ہی پانی پینے چلا جاتا ہوں۔ اب ہاجرہ کی آواز آتی ہے "پلیز بھیا۔ اب گئے ہو تو لگے ہاتھوں ایک گلاس میرے لئے بھی لیتے آنا۔ مجھے بھی پیاس لگی ہے!"

میں جل کر رہ جاتا ہوں۔ خدیجہ بے چاری ڈانٹتے ڈانٹتے ہار جاتی ہے مگر جب سمجھا کر اٹھتی ہے تو ہاجرہ کی آواز آتی ہے "پھر نیچے کمرے میں آتا ہو تو میری چائے لیتی آنا۔ گرم کرنے کی ضرورت نہیں۔ ٹھنڈی ہی پی لوں گی!"

میں اس کی کاہلی پر کئی بار سنجیدگی سے خفا ہو گیا اور سمجھانے کی کوشش کی کہ عورت کو یہ کاہلی قطعی نہیں جچتی۔ میری دانائی حکے پکھروں کے وہ مزے سے سُنتی رہتی اور جب پیالہ لبریز ہو جاتا تو ہمیشہ ایک بات کہتی "یہ کاہلی تو بھیا کسی پر زیب نہیں دیتی۔ چاہے کوئی عورت ہو یا مرد!"

"لیکن عورت پر تو محبت سے ۔ کیونکہ ذرا جانے کیسا گھر ملے ۔"

"جناب بڑے بوڑھیوں والی باتیں مجھے مطمئن نہیں کر سکتیں ۔ مجھے عورت ہونے سے کیوں رات دن ڈراتے ہو ۔ بُری چیز سب کے لئے بُری ۔"

"مگر تم ۔ تقسیم کار بھی تو دیکھو ۔"

"جہنم میں جائے تقسیم کار ۔ مزے سے اچھے اچھے کام خود چن کر بیٹھ گئے ہو اور عورت کو تقسیم کار کے کولھو میں جوت دیا ۔ اس تقسیم کار کا شکار دہ مرد اور عورتیں ہوں جو کچھ نہ کر پائیں ۔ میں تو برابر سے کام کرتی ہوں ۔ دن رات قلم گھستی ہوں ۔ بھلا دوسرے کاموں میں اپنی "انرجی" کیوں ضائع کروں ۔"

"فرض کرو شادی کے بعد ——"

"بھئی شادی سے تو ڈراؤ گے تم لوگ ۔ بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی ۔"

اور دہ جو کسی نے کہا ہے کہ شکر خورے کو خدا شکر دے ہی دیتا ہے تو واقعی شادی کے بعد بھی ہاجرہ میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ۔ کیونکہ احمد علی خاں بھی ہاجرہ سے خوش تھے بڑی شکایت یہ ہوتی ہے ۔ صاحب ۔ تین چار "بیٹے ہونے کو آئے ہیں تو "سارہ" نے ایک سفر بھی لکھ کے نہیں دی" مطلب یہ کہ احمد علی بھی ہاجرہ کو ذرا بھی "انرجی" ضائع کرتے نہیں دیکھتے ۔ خدا جوڑ ملا ہی دیتا ہے ۔

ویسے یہ بات بھی نہیں کہ ہاجرہ محض بستر پر لیٹ کر ہی زندگی گزارنے کی قائل ہو ۔ وقت اور ضرورت اور موڈ پر سبھی کچھ کر لے گی ۔ میں نے اسے اپنی کوٹھی میں کئی بار پھاؤڑا اور کھرپی لئے "گارڈننگ" کرتے پکڑا ہے ۔ اور اس نے بتایا ہے کہ بچپن کا کھیتی باڑی کا کھیل اب اس "باغبانی" کی صورت میں ظاہر ہوا ہے ۔ اور آ جائے تو مالی سے قینچی لے کر ایسی خوبصورتی سے باڑ تراشے گی جیسے کشیدہ کاری کر رہی ہے ۔

مگر اس کو کیا کیا جائے کہ اس سے کشیدہ کاری نہیں ہوتی تاکہ اسے سارے زنانہ کاموں اور سلیقہ مندیوں سے اُلجھن ہوتی ہے ۔ میں نے کئی دفعہ کہا "بچی ۔ میرے لئے سوئٹر بن دو" "مگر تو بہ کیجئے ۔ آج تک حسرت ہی رہی ۔ احمد علی خاں نے تو ایک بار "نٹنگ" کو مذاق مذاق میں محبت کی آزمائش قرار دے دیا ۔ لیکن وہ امتحان میں اس طرح پوری اتری کہ بازار سے بنا بنایا سوئٹر لا دیا ۔ اللہ اللہ خیر سلا ۔

سوئی دھاگا لئے ہوئے میں نے اسے صرف ایک بار دیکھا ۔ بڑی حیرت ہوئی کہ یہ کیا ہو گیا اور آسمان کیوں نہیں ٹوٹا ۔ معلوم ہوا کہ نوید کی فراک سل رہی ہے ۔ لیکن وہ اس وقت بڑی جھینپی جب فراک تیار ہونے کے بعد خود اسے ہی پسند نہ آئی ۔ خدیجہ کو گھریلو کاموں میں دلچسپی لیتے دیکھتی ہے تو ظہیر کو نصیحت کرتی ہے کہ خدیجہ کو وقت نہ ضائع کرنے دیا کرو ۔ ایک تو اس کی صحت اچھی نہیں ۔ دوسرے اس نے عرصے سے کوئی کہانی بھی تو نہیں لکھی ۔"

شادی سے پہلے وہ کبھی خوبصورت ، رنگین یا قیمتی کپڑے پہنے نظر نہیں آئی ۔ گھر بھر میں مضبوط اور بدرنگ سے بدرنگ لباس اسی کا ہوتا تھا ۔ بلکہ بدرنگی پر میل مستزاد تھا ۔ وہ ہمیشہ سفید ساری پہننے کی عادی رہی ہے اور سفید کپڑا جس تیزی سے میلا ہوتا ہے وہ ظاہر ہے ۔ اور پھر اگر تین تین دن تک ایک ہی سفید ساری کو استعمال کیا جائے تو سفیدی ایک ایسے رنگ میں بدل جاتی ہے جسے زیادہ سے زیادہ گدلا پن کہہ لیجئے ۔ بہرحال میں نے شادی سے پہلے ہاجرہ کو اسی گدلے لباس میں دیکھا ہے ۔ ویسے شلوار ، فراک اور ڈریسنگ بھی اسے محبوب ہے ۔ کسی زمانے میں چوڑی دار پاجامہ اور لکھنؤ فیشن کا غرارہ بھی پسند کرتی تھی مگر جب سے قیام پاکستان کے بعد غرارے پر بڑے ہی اونچے طبقے کی مہر ثبت ہو گئی ہے تو وہ مجھے غرارہ پہنے کبھی نظر نہیں آئی ۔ ریشمی کپڑوں کی نسبت سوتی اور رنگین کپڑوں کی نسبت سفید اسے زیادہ پسند تھے ۔ شادی کے بعد بھی یہی ڈھنگ جاری رہے لیکن سُنا ہے کہ نفاست پسند احمد علی کو کافی عرصہ محض اس بحث مباحثے میں گزارنا پڑا کہ عورت ہی کو نہیں مرد کو بھی لباس کے معاملے میں بدذوق نہیں ہونا چاہیے ۔ سو جب ہاجرہ اس منطق کی قائل ہو گئی تو پھر کپڑے خریدنا ایک "مسئلہ" بن گیا ۔ اوّل تو وہ ہمیشہ بڑبڑاتی کہ خواہ مخواہ کی فضول خرچی ۔ اور اگر کچھ خرید لیا تو یوں تنگ کہ پہنا کہ ہیر ساڑیاں دونوں میں ہوا ہو گئیں ۔ بے تکا پن بھی قائم ہے ۔ ساری ہے تو بلاؤز نہیں ۔ بلاؤز ہے تو ساری پکا نہیں کرتی اور نہ "کنٹراسٹ"

پیدا ہوتا ہے حالانکہ وہ نہ کرتے ہوئے کپڑوں سے اسے ہمیشہ سے نفرت رہی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ زیادہ شوخ اور بھڑکیلے کپڑے دیکھ کر وہ بھاگ کھڑی ہوتی ہے۔ لیکن اگر اس کے "میاں" کوئی نہایت شوخ رنگ کا کپڑا بھی خرید لائیں تو خوشی خوشی پہن لے گی۔ کوئی اس کے گھر ملنے آئے تو جیسے بھی بے تکے لباس میں ہو، فوراً مل لے گی۔ کپڑے تبدیل کرنے کا تکلف ہرگز نہیں کرے گی۔

بازار جائے گی تو انتہائی محویت سے دکانوں میں گھسے گی اور ایک دم بہت سی چیزیں خرید لے گی۔ اور جب اس ملغوبے کو تانگے میں لاد کر گھر آئے گی تو اچانک اس پر انکشاف ہوگا کہ یہ سب چیزیں بیکار ہیں "میں سوچتی ہوں مجھے تو ان کی ضرورت نہ تھی۔ اور جن چیزوں کی ضرورت تھی وہ ذہن ہی سے اتر گئیں۔ یعنی یہ بیکار کا جھنڈار جمع کر لائی۔ لاحول ولا قوۃ"

شادی سے پہلے اس کا یہ عالم تھا کہ کئی کئی مہینے اپنے ہاتھ میں ایک پیسہ لے کر بھی خرچ نہیں کیا۔ اس کی ضروریات ہی محدود تھیں۔ معمولی کھانا، معمولی کپڑا۔ خط بھیجنے کے لئے ٹکٹ۔ کبھی کبھی کاغذ اور روشنائی اور بس۔ ویسے دولت جمع کرنے کا بھی اسے شوق نہیں تھا۔ اس کے قلم سے اسے جو آمدنی ہوتی وہ بھی اس نے اپنے اوپر شاید ہی کبھی خرچ کی ہو۔ اور اگر اس میں سے کچھ اس کے حصے میں پڑ جاتا تو وہ پریشان ہوتی کہ آخر کس ضرورت پر صرف کرے۔ شادی کے بعد بھی یہی حالت رہی لیکن جیسے ہی وہ ماں بنی ہے۔ وہ اپنی بیٹی کے آئندہ کم سے کم پچیس برس تک کے مستقبل کو اپنے خوابوں کی مدد سے کھنگال آئی ہے۔ اور اب آنکی کے بجائے بیٹی پر پیسے خرچ کرنے کے موڈ بھی طاری ہونے لگے ہیں۔ اور یہیں میں اس سے گھبرا کے درپے ہو جاتا ہوں۔ مذاق کرتا ہوں۔ لطیفے گھڑتا ہوں۔ مگر وہ نہایت سنجیدگی سے مجھے میری دو بیٹیوں کے مستقبل اور خود میرے سفید ہوتے ہوئے بالوں کا واسطہ دے کر مجھے اپنے خوابوں کی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ عجیب بات ہے کہ اس کے پاس کچھ بھی جمع نہیں۔

ہاجرہ مجھ سے تیرہ برس چھوٹی ہے، لیکن جب وہ مجھے نصیحتیں کرنے بیٹھتی ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ ان تیرہ برسوں کو طے کر کے تیرہ برس اور آگے کی طرف زقند بھر گئی ہے۔ نصیحتیں کرتے وقت وہ اس قدر سنجیدہ ہو جاتی ہے اور اتنا بھرپور حملہ کرتی ہے کہ ہتھیار ڈالے بغیر چارہ نہیں رہتا۔ اول اول تو میں سخت گھبرایا کیونکہ میں ایک ایسے خاندان کا فرد ہوں جو گذشتہ کئی صدیوں تک محض وعظ و نصیحت کے سہارے زندہ رہا اور۔ ع

میراث میں آئی ہے جسے مسندِ ارشاد

مگر بعد میں معلوم ہوا کہ اس کی علمیت اور دانائی کا رعب تو گھر بھر پر طاری ہے۔ دراصل اس کے اس رعب داب میں چند اور عناصر بھی شامل ہیں، مثلاً ان کی چھوٹی بہنیں کہتی ہیں کہ "آپی نے ان پر آج تک ایک بار بھی ہاتھ نہیں اٹھایا۔ ہماری شرارتوں سے تنگ آ کر بہت ہوا تو رو دیں مگر پیٹا نہیں۔" یہی وجہ ہے کہ چھوٹوں کو اس سے اندھا دھند پیار ہے۔ رہے بڑے تو انہیں ہاجرہ کی شخصیت نے گرفتار کر رکھا ہے۔ (میں ان بڑوں میں خدیجہ کو شامل نہیں کروں گا کیونکہ ہاجرہ اور خدیجہ کا رشتہ تو اس تشبیب و فراز سے حیرت انگیز طور پر بلند ہے) عالم یہ رہا ہے کہ اگر چھوٹی بہنوں کو کسی سہیلی کے ہاں جانا ہے تو ہاجرہ سے اجازت لیں اور اگر اجازت مل گئی تو سمجھئے سارے گھر سے اجازت مل گئی۔ اور اگر کسی نے ہاجرہ کا سامنا کرنے سے بچنے کے لئے اماں سے اجازت طلب کر لی تو کہا گیا "ہاجرہ سے پوچھ لو" اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ گھر میں اس کی حیثیت ایک آمر کی سی رہی ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ ماں بہنوں اور بھائیوں کی محبت اور قرب کے بغیر وہ خود کو لٹا لٹا سا محسوس کرتی ہے۔ آج بھی یہ حالت ہے کہ کسی کے سر میں درد کی تکلیف ہوئی اور ہاجرہ کو اطلاع ملی تو حواس باختہ ہو کر بھاگی آ رہی ہے۔ مزاج پرسی ہو رہی ہے۔ دعائیں تجویز کی جا رہی ہیں اور مریض اس کی اس گھبراہٹ پر ہنسے جا رہا ہے۔ گھر میں اس کی "انی، وقعت" پر جب میں نے غور کیا تو محسوس کیا کہ اس کا باعث ہاجرہ کی فراخدلی ہے۔ وہ اپنی زندگی اور اپنے ہر نئے تجربے سے فوراً سیکھتی ہے۔ اپنی حماقتوں اپنی غلطیوں کو ذرا

[illegible]

پانی آیا۔ کلی کی اور چپ چاپ بیٹھ گئی۔ چائے رکھی ہے تو ایک پیالی بھجوا دی گئی ورنہ ہاجرہ کوئی شکایت کئے بغیر پڑی رہے گی۔ کافی دیر کے بعد اٹھے گی اور اپنے کمرے کو جھاڑ پونچھ کر پھر پلنگ پر گر پڑے گی۔ گھر کا کوئی کام سپرد ہوا تو جی جان سے کر ڈالا ورنہ لیٹی پڑے پڑھ رہے ہیں یا یونہی خواب دیکھ رہے ہیں۔ البتہ اگر "نقوش" کی ترتیب کا کام ہو رہا ہے تو کلی کرنے کے بعد پہلا کام یہ کیا کہ تمام مسودات اپنے قریب کھینچ لئے۔ اور ندیم ہو کر مسودات کا جائزہ لیا جا رہا ہے۔ قلم چل رہا ہے۔ مسودہ برا ہے تو "اُفوہ" کہہ کر اُدھر ڈال دیا۔ اچھا ہے تو "واہ" کہہ کر ادھر رکھ دیا۔ فہرستیں بن رہی ہیں۔ ترتیب کی ندرتیں سوچی جا رہی ہیں۔ غرض اگر ادبی کام ہے تو اس میں یوں کھو جائے گی جیسے باقی سب ہیچ ہے۔ ادب میں اس وارفتگی کا لطف اس وقت آیا جب ہم دونوں "نقوش" سے الگ ہوتے۔ مہینوں تک وہ ایسی اداس رہی جیسے وہ اسی عمارت کے نیچے دب گئی ہے جسے اس نے اپنے ہاتھوں سے تعمیر کیا تھا۔ "نقوش" کا نام آتے ہی وہ بالکل بچوں کی طرح رو دیتی اور جس روز "نقوش" (ملا) شائع ہوا (جس پر ہم دونوں کے نام نہیں تھے) تو اس نے اپنے کمرے میں اس شمارے کا داخلہ ہی بند کر دیا۔ البتہ شام کو وہ بھی رسالہ پڑھتی نظر آئی اور پھر آہستہ آہستہ اس کڑی حقیقت کو قبول کر لیا۔

نومبر ۱۹۴۹ء کی کل پاکستان ترقی پسند مصنفین کانفرنس کے بعد بعض "مہربانوں" نے نام لے لے کر ہاجرہ اور خدیجہ کو گالیاں دیں۔ ان کے کارٹون چھاپے۔ اور ترقی پسند مصنفین کو سازندے بنا کر دونوں بہنوں کو اپنے اخبارات کے صفحات پر ناچتا ہوا دکھایا۔ یا پھر جب دونوں بہنوں کی شادی ہوئی اور بڑے بڑے "مؤقر" اخبارات اور بڑے بڑے "ایثار پیشہ" ایڈیٹروں نے جی بھر کر گندگی اچھالی اور صحافت کو نجاست کے درجے پہ لے آئے تو اس وقت شروع شروع میں تو ہاجرہ ہونقی سی رہ گئی مگر پھر آہستہ آہستہ اس نے ایسے صبر و ضبط کا ثبوت دیا کہ بعض اوقات جب میں اپنے ہم پیشہ قلمکاروں کی ان انسانیت سوز حرکات کے خلاف منتقمانہ جذبات کا اظہار کرنے لگتا تو ہاجرہ کہتی "جانے بھی دو بھیا۔ تمھیں یقین ہے ناکہ تم ترقی پسند ادب کی تحریک میں شامل ہو کر کوئی برا کام نہیں کر رہے۔ تمھیں اعتماد ہے ناکہ ادب میں زندگی اور اس کی توانائی کی قدروں کی علمبرداری تمھارے عقائد پہ اثر انداز نہیں ہو سکتی۔ پھر جب تم اپنے آپ کو سچائی، حقیقت اور انصاف کا علمبردار کہتے ہو تو کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ سچائی اور حقیقت اور انصاف کی قوتیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مطعون قرار دی جاتی رہیں۔ وقت آئے گا جب ہمارے ادبی نظریات کو ایک زندہ قوم کے نظریات تسلیم کیا جائے گا۔ اور اس وقت یہ کارٹون اور یہ گالیاں ہمیں طے شدہ راہ کے چند حقیر روڑے معلوم ہوں گی۔ اس لئے انھیں کہنے دو جو وہ کہہ سکتے ہیں اور تم لکھو جو تمھیں لکھنا چاہیئے۔ اپنی نظم مکمل کر دو۔"

"نقوش" سے علیحدگی کے سلسلے میں ہاجرہ کی چیخم دھاڑ اور پھر گالیوں کی بوچھاڑ کے مقابلے میں ہاجرہ کی یہ سنجیدگی اور صبر و ضبط اس کی شخصیت کو پوری طرح واضح کرتا ہے۔ بظاہر ہاجرہ تیز مزاج اور انتہا پسند معلوم ہوتی ہے مگر دراصل وہ نہایت متوازن انداز میں سوچتی ہے اور اکثر مسائل میں تو میں اسے رجعت پسندی تک کا طعنہ دے ڈالتا ہوں۔

بعض لوگ عرصے تک اسے لکھنؤ کی مشہور سیاسی ورکر "ہاجرہ بیگم" سمجھتے رہے اور میرے خیال میں پنجاب کی سی۔ آئی۔ ڈی اب بھی اسے "ہاجرہ بیگم" ہی سمجھتی ہے، جبھی تو مہینے میں ایک آدھ بار خفیہ پولیس کا کوئی نہ کوئی آدمی اس کی کوٹھی پر "ہاجرہ بیگم" کا پتہ پوچھتا آنکلتا ہے۔ اور وہ نہایت نرمی سے اسے بتاتی ہے کہ ہاجرہ یہیں رہتی ہے۔ وہ احمد علی خاں اسسٹنٹ ایڈیٹر پاکستان ٹائمز کی بیوی ہے اور ان دنوں اس کی تنہا سرگرمی یہ ہے کہ وہ ایک ناول لکھ رہی ہے۔ میں نے ایک روز کہا کہ پولیس کی یہ غلط فہمی دور ہو جانی چاہیئے مگر اس پر ہاجرہ بولی کہ آخر یہ کیا جانیں کہ ہاجرہ بیگم کون ہیں اور ہاجرہ مسرور کون ہے۔ یہ بے چارے تو اپنی ڈیوٹی ادا کرنے آتے ہیں۔

میں نے ایک دن ایک الگ مدرسۂ فکر کے کسی شاعر کا ذکر کیا جس نے ایک ناشر کو اپنی نظموں کے مجموعہ کے حقوق کسی مجبوری کے تحت چالیس پچاس روپے میں دے ڈالے تھے۔ اور پھر جب چند روز بعد اسے اپنی نادانی کا احساس ہوا اور اس نے ناشر سے

مقابلے میں خدا سے اضافے کے لئے کہا تو ناشر نے شاعر کو سرِ بازار تھپڑ مار دیا۔ مجھے گمان تک نہ تھا کہ یہ واقعہ سن کر ہاجرہ کتنا شدید اثر قبول کرے گی۔ وہ ایک دم مجھ پر برس پڑی اور بولی: "اور تم لاہور کے ادیبوں اور شاعروں نے یہ واقعہ سنا اور چپ چاپ پی گئے؟ تم لوگوں کو شرم نہ آئی کہ ایک شاعر سرِ بازار ایک ناشر کے ہاتھوں بے بات کی بات پر پٹ گیا اور تم لوگ کافی ہاؤسوں میں بیٹھ کر لطیفے گھڑتے اور قہقہے لگاتے رہے۔ تم سب نے اکٹھے ہو کر اس ناشر کو نوچ نہ ڈالا؟ کیا ہوا اگر وہ شاعر ترقی پسند مصنفین کی انجمن کا ممبر نہ تھا۔ وہ شاعر تو تھا اور شاعری کسی ایک مدرسۂ فکر کا اجارہ تو نہیں۔ تم لوگ اس بات پر تو آپس میں جھگڑوں پر تُل جاتے ہو کہ فلاں شاعر نے زندگی کو "اک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا" کیوں کہا اور یوں زندگی کی ہتک کیوں کی لیکن شاعر کی ہتک پر تمہاری غیرتیں کہاں سو جاتی ہیں" وغیرہ وغیرہ۔

ہاجرہ کو ترقی پسند ادب کی تحریک سے ہمیشہ والہانہ پیار رہا ہے مگر وہ اس تحریک کی بڑی بے رحم نقاد بھی ہے۔ اسی طرح وہ اس بات کو ماننے کے لئے کبھی تیار نہیں ہوئی کہ غیر ترقی پسند شاعر شاعر ہی نہیں ہے۔ کسی نظریاتی امتیاز کے بغیر وہ فن اور فنکار کی عظمت کی بڑی سختی سے قائل ہے بشرطیکہ فن کار خود بھی اپنے منصب کی عظمت کا احترام کرنا جانتا ہو۔

اپنی تحریروں سے وہ کبھی کماحقہٗ مطمئن نہیں ہوتی۔ ہمیشہ ہر افسانے کے بعد ایک آہ سرد کھینچے گی اور کہے گی "بات ہی نہیں"۔ اور پھر آئندہ افسانے میں "بات بنانے" کی کوشش میں سر دھڑ کی بازی لگا دے گی۔ یہ سلسلہ اب تک چل رہا ہے اور میرے خیال میں ہمیشہ چلتا رہے گا۔ ہاجرہ کا یہ احساس اسے اپنے فن کو نکھارنے کے لئے نئے سے نئے انداز کھوجنے پر مجبور رکھتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کے افسانوں میں فن کا تدریجی ارتقاء بہت واضح نظر آتا ہے۔

مطالعہ اور چھالیہ اس کی عادت ہے۔ چھالیہ پاس رکھ دیجئے اور کتابوں کا ڈھیر لگا دیجئے اور چاہے دو دن کھانا نہ دیجئے۔ لیٹے لیٹے سب کتابیں بہت تیزی سے پڑھ ڈالتی ہے، اچھی کتابوں کو تین چار مرتبہ پڑھ لے گی۔ لیکن شاید ہی اس نے کبھی کوئی کتاب خرید کر پڑھی ہو۔ ایک خریدی تھی جو میرے ہاں بھول گئی اور میں نے اسے اپنی لائبریری میں داخل کر لیا۔ آج ہی یہ راز فاش کر رہا ہوں۔

کتابیں ہوں تو اسے نیند بھی نہیں آتی۔ ویسے نیند اس کی کمزوری ہے۔ بے تحاشہ سوتی ہے۔ ایک بار اسے منہ میں جگایا نہیں گیا تو مسلسل بیس گھنٹے سوتی رہی۔

تاش کیرم قسم کے کھیلوں سے ایک آدھ بازی کے بعد بور ہو جائے گی۔ اور میں اس عادت سے بے حد چڑتا ہوں۔ اچھا خاصا کھیل ہو رہا ہے کہ کیرم بورڈ کو الٹ دے گی اور کہے گی "لاؤ بھئی کوئی ادھر اُدھر کی بھی بات کریں"۔ کہتی ہے کھیل جسم کو تر و تازہ کرنے کے لئے ہوتے ہیں اس لئے کھیلنا ہے تو ایسا کھیل کھیلو کہ ذرا دوڑ بھاگ ہو۔ یہ کیا کہ اپھیموں کی طرح بیٹھے ٹھک ٹھک کریں۔

موسیقی سے اسے حد درجہ کا عشق ہے، مگر ریڈیو سے چڑ ہے۔ ریڈیو سے چڑ اس لئے ہے کہ اگر ریڈیو رکھا ہو تو وہ دن رات سارے جہاں کے اسٹیشن پکڑ کر کے ملکوں ملکوں کی موسیقی اس شدت سے سنتی ہے کہ پھر پڑھنے لکھنے میں اس کا جی نہیں لگتا۔ شادی سے پہلے میں یہ تماشہ دیکھ چکا تھا۔ لیکن اس وقت مجھے سخت حیرت ہوئی جب اس نے اپنی شادی کے بعد اپنے گھر کے لئے آج تک ریڈیو نہیں خریدا۔ میں نے پوچھا تو پتہ چلا کہ وہ ریڈیو کی کشش سے ڈرتی ہے۔ "لالہ پھر تم جانو لکھنے پڑھنے کا سارا پروگرام ٹھپ ہو جاتا ہے" سنا ہے احمد علی تازہ بتازہ خبریں سننے کے لئے ان دنوں ریڈیو کی ضرورت سختی سے محسوس کرتے ہیں اور ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو ریڈیو خریدنے نہ خریدنے پر ان کے گھر میں مباحثہ منعقد ہوتا ہے تا دمِ تحریر ہاجرہ جیت رہی ہے، یعنی ریڈیو ابھی تک اس کے گھر میں داخل نہیں ہوا۔

لے ندیم بھائی! چلتے چلتے اتنا تو بتا دیجئے ــــ کیا سارے پبلشر ایسے ہی ہوتے ہیں؟ اگر آپ نے میرے اس سوال کا جواب نہ دیا تو اس "بے قلم" طبقہ کے ساتھ انصاف نہ ہوگا ــــ میں تو اس باب میں کچھ نہ لکھوں گا۔ اس لئے کہ میرے اور اہلِ قلم کے درمیان کچھ نازک قسم کے رشتے ہیں۔ ورنہ اس ضمن میں کچھ میں بھی عرض کرتا۔
(محمد طفیل)

پھر کئی بار ایسا بھی ہوا ہے کہ میں گھر میں اپنی نئی نظم یا غزل سنانے بیٹھا ہوں۔ بچوں کو ڈانٹ کر خاموش کر دیا گیا ہے۔ باورچی خانے میں ملازم نے برتن بجانے بند کر دیئے ہیں۔ سب لوگ میرے آس پاس سمٹ آئے ہیں۔ میں پہلا شعر پڑھتا ہوں۔ کوئی ہوں" کہتا ہے، کوئی داد دیتا ہے۔ کوئی خاموش رہتا ہے اور پھر طاہرہ کی آواز آتی ہے "لالہ۔ معاف کرنا۔ لے بھئی طاہرہ۔ مجھے ذرا سی ڈلی تو لا دو۔ دانتوں میں عجیب کھجلی سی ہو رہی ہے۔" "لالہ تم کیوں خاموش ہو گئے۔ پڑھتے جاؤ نا۔" میں سچ مچ خفا ہو جاتا ہوں۔ کسی کے سنبھالے نہیں سنبھلتا۔ طاہرہ منتیں کرتی ہے "پھر ایسا نہیں کروں گی کمبخت عادت ہی ایسی ہے۔ پھر میں نے ایسی کون سی گستاخی کر دی کہ تمہارے دماغ ہی نہیں ملتے۔ بڑے آئے وہاں سے۔ چپکے سے غزل سنا دو ورنہ یاد رکھو پھر اس گھر میں قدم نہیں رکھوں گی۔ خدا جانے تم اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہو؟" سارے گھر کے مجبور کرنے سے میں پھر بیاض کھولتا ہوں۔ چند شعر پڑھتا ہوں کہ اچانک دبی دبی آواز آتی ہے "ذرا ایک کو دیکھنا تو صبوحی۔ بے بی کا دودھ گرم ہوا کہ نہیں۔ چپکے سے جاؤ ورنہ لالہ مار ڈالیں گے۔" پھر سب کو اپنی طرف متوجہ پاکر طاہرہ مجھ سے مخاطب ہو کر کہتی ہے "واہ، بڑا اچھا شعر نکالا ہے۔" "کونسا شعر؟" میں امتحان لینے پر آمادہ ہوتا ہوں اور طاہرہ کہتی ہے "وہی جو سب سے اچھا تھا۔" اور ہم سب ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو جاتے ہیں "کمبخت جاہل، بد ذوق" میں خفا ہوئے بغیر کہتا ہوں۔ "جس شخص کو شعر کا ذوق نہ ہو وہ فن کار تو قطعی نہیں بن سکتا ہے۔ دکانداری کی بات دوسری ہے۔ کیوں خدیجہ تمہارا کیا خیال ہے؟"

"میں اپنے بھتیجے سے متفق ہوں اور طاہرہ کی بد ذوقی پہ آٹھ آٹھ آنسو گرانے کے لئے اِدھر باورچی خانے کی طرف جا رہی ہوں کیونکہ مجھے شدید بھوک لگی ہے۔" خدیجہ حسبِ معمول طاہرہ کے شعری ذوق پہ حملہ کر کے بھاگ جاتی ہے اور میں طاہرہ سے جھگڑنے لگتا ہوں۔

"تم اتنی بد ذوق کیوں ہو بجو؟"

"میرے دشمن بد ذوق ہوں" وہ کہتی ہے "بد ذوق تو گالی ہے، مجھے تو شعر بہت پسند آتے ہیں۔ مجھے تو اردو اور فارسی کے بیسیوں شعر یاد تھے کسی زمانے میں۔

"شعر پڑھ بھی لیتی ہو؟" خدیجہ باورچی خانے میں سے چلاتی ہے "نثر میں شعر پڑھنا تو کوئی ایسی مشکل بات نہیں۔ یہ کام تو ظہیر بابر صاحب بھی کر لیتے ہیں۔"

ہنستے ہنستے سب کی بُری حالت ہو جاتی ہے مگر اس کے باوجود طاہرہ بضد رہتی ہے کہ وہ فن کی رسیا ہے۔ اور معنی کا حسن شعر میں ہو یا افسانے میں۔ رقص میں ہو یا نغمہ میں۔ رنگ میں ہو یا سنگ میں اسے اپنی طرف محض متوجہ ہی نہیں کرتا بلکہ ڈبو لیتا ہے۔ اور وہ جھوٹ نہیں کہتی۔ شعر کے معاملے میں اس کے ذوق کا معیار شعر سُننا نہیں گنگنانا ہے۔ رقص، نغمہ، تصویر، مجسمہ، پھول اور رنگ میں اس کا ذوق سارا سلجھا ہوا اور معیاری ہے مگر سچی بات یہ ہے کہ جب فکشن کا ذکر آتا ہے تو اس کی گفتگو سے اندازہ ہوتا ہے کہ چاہے وہ زبان سے اس کا اعتراف نہ کرے لیکن وہ فکشن کو تمام فنونِ لطیفہ کی جان سمجھتی ہے۔

ان دنوں اپنی بچی نوید سے جاہل ماؤں کی طرح محبت کرتی ہے، اس کا بس چلے تو اسے پیٹھ پر باندھے پھرے۔ وہ تو کہیئے نوید خود فطرتاً عالی ظرف ہے اور ماں کو زیادہ لفٹ نہیں دیتی ورنہ اب تک بچی کا ستیاناس ہو چکا ہوتا۔ کوئی سمجھائے تو کہے گی "میں چاہتی ہوں میری بچی کو محبت کی پیاس نہ رہ جائے۔"

اگر کوئی سمجھائے کہ "اچھا اگر اسے زندگی میں تمہارے برابر پیار نہ ملا تو پھر؟" تو پھر وہ سنبھل سنبھل کر اور گن گن کر نوید سے محبت کرے گی۔ اور چائلڈ سائیکالوجی پڑھنے پر جُٹ جائے گی۔

وہ کہا کرتی ہے کہ پہلے میں مایوس ہو جایا کرتی تھی "شاموں کو تو میری اداسی ناقابلِ بیان ہوتی تھی۔ میں جس جگہ ہوتی، شام کو وہاں سے بھاگ جاتی۔ مگر جب سے نوید آئی ہے میں ایک بار بھی مایوس نہیں ہوئی۔ میرے دل میں کسی کی بات اب نہیں چبھتی۔ میں اب جلدی سے معاف کر دیا کرتی

[illegible] اور واقعی توبیہ کی آمد کے بعد سے شاید ہی کبھی اسے اتنا غصہ آیا ہو کہ وہ رو دی ہو۔ اسے ہر وقت ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی بہتر بات ہو رہی ہو۔ کوئی بہت اہم اور دلچسپ تبدیلی۔

یہ اہم اور دلچسپ تبدیلی کے خواب بہت پرانے ہیں۔

وہ تصورات کی دھند میں آنکھیں جھپکا کر کہا کرتی ہے: "میرے پاس کچھ جمع ہو جائے تو میں دنیا بھر کے سفر پر چل پڑوں۔ کہیں پیدل۔ کہیں لمبے سمندری سفر۔ برف زاروں میں۔ ریگستانوں میں۔ سبزہ زاروں میں۔ زندگی سفر میں کٹ جائے۔ یہ گھر بنانے کی کٹ کٹ کہیں نہ ہو۔ احمد علی اور میں مل کر سفرنامہ لکھیں۔ بڑا شاندار سفرنامہ ہوگا۔ لالہ۔ تم بھی کچھ جمع کر لو تاکہ تمہارے بچے بعد کو پریشان نہ ہوں۔ تم بھی ہمارے ساتھ چلنا۔ خدیجہ اور تکبیر کو بھی چلنا چاہیے اور" ——— آہستہ آہستہ اس کی ساری محبوب ہستیاں اس کے پیچھے قافلے کی طرح رینگنے لگتی ہیں۔

وہ اپنی محبتوں، یادوں اور حماقتوں سے پیچھا نہیں چھڑا سکتی۔ اس کے ذہن میں بچپن کے بوئے ہوئے دانے اب بھی لہلہاتے ہیں۔ اور نشیب میں کسانوں کی آبادی سے شام کے وقت اُپلوں کے اٹھتے ہوئے دھوئیں کا نقش اب بھی اس کے ذہن میں اُجاگر ہے جسے وہ شام کو تنہائی کے پھندے کھیلوں سے تھک کر احاطے کی دیوار سے لگی خواہ مخواہ دیکھا کرتی تھی۔

(محمد طفیل پرنٹر پبلشر نے اشرف پریس لاہور میں چھپوا کر شائع کیا)

شوکت تھانوی

عشرت رحمانی

اوائل جنوری ۵۸ء میں میں، ایک اچانک آپریشن کے زیرِ عتاب صاحبِ فراش تھا کہ فرمائشوں کی یورش
ہوئی "شوکت تھانوی" پر "نقوش" کے "شخصیات نمبر" کے لئے فوراً مضمون لکھ دوں ۔ یہ بھی آپریشن کی طرح ایک شدید ناگزیر
حملہ تھا۔ ایک زخمی مریض کا "شوکت" جیسے شاندار ظرافت نگار شخص کے بارے میں شایانِ شان مضمون لکھنا ———
اور پھر فوراً ...... ! شاید بیمار نہ ہوتا تو منہ چھپا کر گریز کی کوشش میں کامیاب ہو سکتا ——— لیکن بستر پر دراز تھا
بچنے کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ سوچنے سمجھنے کی بھی طاقت نہ تھی ——— جو کچھ لکھنا چاہتا تھا اس کے لئے وقت بھی نہ تھا۔
احباب کی تعمیل میرے نزدیک گناہ ہے۔ اس لئے یہ مختصر مضمون "عذر" کے طور پر حوالے کر دیا تاکہ گناہ کی بدتری کا
ثبوت ہو، اور "عیادت" کے شکریہ کے طور پر کام آسکے! ——— (عشرت)

دہلی کے محلہ مچھلی والان میں جو اب اردو بازار کہلاتا ہے، ایک خوشنما مکان "اکبر منزل" کے نام سے موسوم تھا۔ قیام پاکستان سے پہلے وہاں اس مکان کے مالک کا خاندان رہتا تھا، اور اب ایک سردارجی کا کنبہ قابض ہے۔

اسی اکبر منزل کے ایک گوشہ کا ذکر ہے۔ ۱۹۳۲ء کے اوائل میں گرمیوں کی ایک دوپہر، چند ادیبوں کی مختصر مجلس منعقد تھی۔ یوں تو اس کو باقاعدہ قسم کی ادبی مجلس نہیں کہا جا سکتا۔ صاحبِ خانہ خود خوش گو صاحبِ ذوق ادیب و شاعر تھے، ان کے چند ادبی دوست باہر سے آئے ہوئے تھے۔ اور یہ مجلس ان کی ملاقات کی تقریب کے طور پر منعقد کی نہیں گئی بلکہ ہو گئی تھی۔ میزبان تھے اکبر حیدری (جو ۱۹۴۰ء میں غیر متوقع طور پر بے وقت رحلت کر گئے)، مہمانوں میں لکھنؤ سے "سودیشی ریل" کے مصنف شوکت تھانوی آئے اور ان کے ساتھ ان کے پیشہ دوست نسیم انہونوی تھے۔ لاہور سے "نیرنگ خیال" کے اڈیٹر یوسف حسن، دہلی سے ہفتہ وار "ریاست" کے مدیر حنیف ہاشمی (جوانمرگ ادیب) اور راقم الحروف مدیر "نیرنگ"۔

ان تمام احباب کے درمیان اول طعام کے بعد سلسلۂ کلام جاری تھا۔ اور نہایت گرماگرم بحث ہو رہی تھی۔ لطف یہ کہ موضوعِ بحث ادبی ہونے کی جگہ غیر ادبی "صوبہ جاتی تعصب" کے بارے میں تھا۔ دلچسپ انداز میں نوک جھونک ہو رہی تھی۔ بحث میں حصہ لینے والوں میں نسیم صاحب کچھ زیادہ سنجیدہ رہے۔ اور یو پی کا تفوق جتانے میں بہت بڑھ چڑھ کر مباحثہ کرتے رہے۔ ان کے مقابلہ میں مرحوم حنیف ہاشمی پنجاب کے سرگرم طرفدار تھے۔ بات یو پی اور پنجاب کے ادیبوں اور

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

جس بلا کا مزاح نگار اور بذلہ سنج ہے وہ اسی غضب کا سنجیدہ انسان بھی ہے۔ اور پھر لطف یہ کہ کسی محفل میں شوکت کو بے اختیار ہنستے ہنساتے دیکھ کر حاضرین کو کبھی گمان تک نہیں ہو سکتا کہ یہ موجِ تبسم یا "دیوارِ قہقہہ" کسی لمحہ انتہائی درجہ کا سنجیدہ بن کر اہلِ محفل کو ساکت و صامت کر دے۔ اور سب حیرت زدہ ہو کر منہ تکتے رہ جائیں۔ پھر یہ بھی یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ "سنجیدگی" شوکت کی ادائے خاص ہے یا واقعی کوئی سنجیدہ پہلو نکل آیا۔ لیکن شوکت جب واقعی سنجیدہ ہو تو آفت ہے۔ کیونکہ شوکت فطری طور پر دوستوں کا پکا دوست اور دشمنوں کا سخت دشمن ہے۔ بلکہ خصوصیتِ مزاج اور افتادِ طبع کے لحاظ سے وہ "یکسانی" کا دشمن ہے۔ تبدیلی عام انسان کی عادت میں داخل ہوتی ہے۔ لیکن شوکت ان انسانوں میں ہیں جن کی فطرت کا دوسرا نام تبدیلی ہے۔ شوکت صاحب کو زیادہ قریب سے جاننے کے لئے یہ ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ ان کی شخصیت "زود رسی" کا مجسمہ ہے۔ وہ ادبی لحاظ سے بسیار نویس، زود گو، طبعاً زود فہم و زود رس اور زود رنج ہیں۔ ادیب و شاعر کی حیثیت سے وہ جس قدر زود گو ہیں عام زندگی کے معاملات حتیٰ کہ شادی اور اولاد کے معاملہ میں بھی اسی قدر زود گو اور بسیار نویس واقع ہوئے ہیں۔ شوکت کے نام میں نہیں تخلص میں جو شان ہے اس کے لحاظ سے ان کی طبیعت میں بھی انتہائی نفاست ہے۔ رہائش و زیبائش لباس اور وضع قطع ہر انداز میں یہ کیفیت پوری طرح نمایاں نظر آتی ہے۔ ایک زمانہ میں تخلص سے وہ اپنے نام اور مقام کی رعایت سے حضرت نے مقطع ریش بھی رکھ ڈالی تھی۔ لیکن اس کی نفاست کو برقرار رکھنے کے لئے بھی خاص اہتمام اور روغنیات برتتے رہے۔ واضح ہو کہ شوکت کا پورا نام "محمد عمر" اور مقام حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کا وطن "تھانہ بھون" ہے۔ اور اس کعبہ سے اس "بت" کو دور کی نہیں قریب کی نسبت بھی ہے۔ چنانچہ اسی نسبت سے اگر وہ "مولانا" نہ بن سکے تو صرف "حضرت" بن کر داڑھی کے احترام پر مجبور ہو گئے تھے۔ لیکن صاف دلی کا بھلا ہو کہ پھر صفاچٹ ہو کے رہے۔

شوکت صاحب کی نفاست پسندی ان کی ہر ادا سے ظاہر ہوتی ہے۔ چنانچہ ان کی تحریر کی خوشنمائی یقیناً قابلِ دید ہوتی ہے۔ اور ایک خصوصیت تو ایسی ہے جو شاذ ہی دیکھنے میں آتی ہے۔ شوکت ایک صفحہ کا مضمون لکھیں یا کئی سو صفحات کی پوری کتاب۔ لیکن ان کے مسودے میں ایک حرف حاشیہ خارج نہیں پایا جاتا۔ ہر لفظ، ہر سطر اور ہر صفحہ ابتدا سے آخر تک ایک ہی انداز کا ہوتا ہے۔ تحریر و نشست الفاظ میں کہیں بھی تبدیلی نہیں پائی جاتی۔ ان کی تحریر کا بناؤ چناؤ اور بے تکلف سلیقہ ضرب المثل ہے۔ اور اس حقیقت کا آئینہ دار کہ شوکت کی شخصیت اسی قدر صحیح ہے جس قدر ان کا مسودہ! اور ان کی طبیعت میں اسی انداز کی صفائی اور نزاکت ہے۔ جیسی ان کے الفاظ کی نوک پلک میں۔ اگر کوئی ناواقف شخص شوکت کو کسی مضمون یا کتاب کا مسودہ لکھتے دیکھے تو وہ کبھی یہ یقین نہ کرے کہ وہ طبعزاد تصنیف میں مصروف ہیں۔ بلکہ یہ قیاس کرے کہ کہیں سے کوئی رٹا ہوا نکڑہ لیا ہے۔ اور اس کو اس تیزی اور صفائی سے رقم کر رہے ہیں۔ کیونکہ عموماً نقل کرنے میں بھی زیادہ تکلف اور تاخیر ہوگی۔ مگر شوکت کا زود نویس قلم تصنیف میں بھی بلا تکلف سرعت سے چلتا رہتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے شوکت لکھتا پہلے ہے اور سوچتا بعد میں ہے۔ اور یہی حال گفتگو کا بھی ہے۔ بذلہ سنجی اور لطیفہ گوئی کا جو غیر معمولی ملکہ شوکت کو ودیعت ہوا ہے عام طور پر دیکھنے میں نہیں آتا۔ عام گفتگو میں جس طرح برجستہ فقرے شوکت کی زبان سے بلا تکلف ادا ہوتے ہیں یہی کیفیت تحریر میں بھی ہوتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ شوکت کا اسلوبِ تحریر نہایت سادہ اور عام بول چال کی طرح بے تکلف ہے۔ یہی ثبوت ہے کہ شوکت کی گفتار و کردار و تحریر میں تصنع نام کو نہیں۔ مگر سلیقہ اور نفاست کی شان نمایاں ہے۔ اور شوکت کی سب سے بڑی شان یہی ہے جس کو وہ سنِ شعور سے لے کر آج تک پوری آن بان کے ساتھ قائم رکھتے ہوئے ہے۔ اور عمر بھر برقرار رکھنے کا اہل ہے۔ شوکت کو اپنی مخصوص شان اور نفاست و نزاکتِ مزاج سے بے حد پیار اور خلوص ہے۔ شاید ان کو اپنی جان بھی اتنی پیاری نہیں جتنی شان۔ غالباً شوکت اپنی اس خصوصیت سے خود بھی خبردار نہیں ہیں۔ اور بعض اصحاب کو ان کے بارے میں کبھی ہو اس بات کی شکایت پیدا ہوتی ہے کہ وہ بہت تنک مزاج اور زود رنج ہیں۔ وہ یقیناً اس حقیقت سے ناواقف ہیں۔ دراصل شوکت کی شکر رنجی کا باعث اس کی اپنی شان کا خلوص ہے۔ جب اس کو کسی شخص کے بارے میں یہ شک ہوتا ہے کہ وہ اس کے مزاج و شان کے ساتھ خلوص نہیں برت رہا ہے اس وقت شوکت بلا پس و پیش اس کو اپنی جان کا مخالف سمجھنے لگتا ہے۔ اس رنجش کو شخصِ مخالف کی ذاتیات سے براہِ راست کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

شوکت اپنے متعلق خود بہت کچھ لکھ چکے ہیں۔ "مابدولت" میں انہوں نے اپنی ذات و صفات کے بارے میں بہت سی کھری کھری حقیقتیں بیان کر ڈالی

ہیں۔ اور بہت سی چھپی ڈھکی باتوں کو بے نقاب کر کے رکھ دیا ہے۔ اس لئے بڑی حد تک ان کی شخصیت، عادات وخصائل اور ادبی سرگرمیوں کی تفصیل پہلے سامنے آچکی ہیں۔ لیکن میری ذاتی رائے یہ ہے کہ انہوں نے اب تک اپنی ذات کو اپنی شان کے آئینہ میں دیکھا ہے۔ جو ان کے تمام حالات و کمالات اور خصائص پر پوری طرح چھائی ہوئی ہے۔ ان کے رہن سہن، تعلقات اور تمام کوائف پر اسی کا اثر ہے۔ اور شوکت خود اس سے حد درجہ متاثر ہیں۔ یہی خلوص وصداقت شوکت کی زندگی میں رچی ہوئی ہے۔ جس کے لئے اکثر وہ دوستوں اور دشمنوں کی نظر میں بعض اوقات مطعون بھی قرار پاتے ہیں۔ اور اس کے سبب سے وہ اکثر ناکردہ گناہ بعض حلقوں میں معتوب بھی بن جاتے ہیں۔ مگر شوکت کو اس کی بہت کم آگاہی ہوتی ہے۔ اور ہوتی بھی ہے تو اس کا علاج ان کے بس کی بات نہیں۔ اس کیفیت کی بہت کچھ تفصیل اگر بغور دیکھا جائے تو شوکت کے اکثر مضامین اور افسانوں میں ملتی ہے۔ چنانچہ بہت سے ناولوں اور افسانوں کے کرداروں میں ان کی اپنی یہی شان جلوہ گر نظر آتی ہے۔

شوکت کا ایک بڑا کمال (جو معدودے چند ادیبوں میں ملتا ہے) ان کا تحریری خلوص ہے۔ عموماً کہنے یا بولنے اور لکھنے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ لیکن شوکت نے ظاہر و باطن کو کمال خلوص و صداقت سے یکساں بنا کر اس تفریق کو غیر محسوس طور پر مٹا ڈالا ہے۔ جن حضرات نے شوکت کی غیر معمولی ذہانت و شگفتہ بیانی کا آمنے سامنے اندازہ کیا ہے وہ اس حقیقت کو بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔ اور شوکت کی ہر تحریر کو پڑھ کر ان کی گفتار کا لطف حاصل کرتے ہیں۔ اس مختصر مضمون میں میں نے دانستہ ان عام باتوں کو نظر انداز کر دیا ہے جو اس سے پہلے اکثر مضامین اور "ما بدولت" میں تفصیل سے بیان کی جا چکی ہیں۔ اور نہ ان کے اسلوب تحریر پر کوئی تبصرہ ضروری سمجھا ہے۔ کیونکہ متذکرہ بالا خصوصیت کو بیان کرنے کے بعد ان تمام تفصیلات کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اور شوکت کے مجسم کردار کو ہم اپنے سامنے چلتا پھرتا، ہنستا بولتا اور بنتا بگڑتا دیکھ سکتے ہیں۔

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ کسی ادیب یا شاعر کے نام اور تخلص کا اس کی شخصیت، کردار اور عام زندگی پر بڑا اثر ہوتا ہے۔ لیکن میں ذاتی تجربہ کی بنا پر اس کلیہ کو دوسرے الفاظ میں اس طرح سمجھا ہوں کہ انسان اپنے لئے ادبی نام یا تخلص انتخاب کرتے وقت غیر محسوس طور پر اپنی فطری کیفیت نمایاں کرتا ہے چنانچہ "محمد عمر" نے اپنا تخلص "شوکت" اس لئے منتخب کیا کہ ان کی ذاتی شان و شوکت، ان کو سب سے زیادہ پیاری تھی۔ اور دلی صداقت کا اظہار اس تخلص کے ذریعہ ضروری تھا۔ اس حقیقت کی مثالیں ہمارے شعر و ادب کی اکثر شخصیتوں کو سامنے رکھ کر پیش کی جا سکتی ہیں۔ شوکت علی خاں بدایونی اپنا تخلص شوکت بھی رکھ سکتے تھے۔ عرفانی تخلص اختیار کرنے کے بعد وہ "فانی الشعر" نہیں ہوئے بلکہ ان کی ذات میں یہ خصوصیت فطری طور پر موجود تھی جو تخلص کے انتخاب سے بکمال خلوص نمایاں ہوئی۔ یہی کیفیت مولانا فضل الحسن حسرت موہانی، حضرت علی سکندر جگر مرادآبادی۔ نواب شبیر حسن خاں جوش ملیح آبادی، پنڈت رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری وغیرہ حضرات کی ہے۔ اسی طرح متقدمین کا بھی حال ہے۔

جہاں تک "تھانوی" ہونے کا تعلق ہے۔ وہ ایک بار ان کی داڑھی سے ثابت ہو چکا ہے۔ لیکن اس سلسلے میں ایک دلچسپ لطیفہ قابل ذکر ہے۔ شوکت اور عشرت کے درمیان جو ربط ہے اس کا اظہار ابتدائی سطور میں کر چکا ہوں۔ لکھنؤ کے قیام کے دوران میں میرے پاس ایک "خانساماں" ملازم تھا جو نہایت معقول مگر سخت بہرہ تھا۔ شوکت صاحب کو اس زمانہ میں "پنچولی" کا فلمی عارضہ لاحق ہوا اور وہ لاہور میں مقیم ہو گئے۔ لاہور سے جب کبھی وہ لکھنؤ جاتے تو "فلاش" وغیرہ کے عشق میں شب و روز کہیں اور مقیم رہتے مگر روزانہ ایک دورہ میرے مکان کا ضرور لگا لیتے۔ اور لوگوں کو اطلاع یہ ہوتی کہ میرے پاس مقیم ہیں۔ اس اطلاع کے ثبوت میں بھی شوکت کا میرے پاس آنا ضروری تھا۔ یا خلوص کے خوف میں ——— بہرحال جب وہ آتے اور "خانساماں" ان کو دور سے دیکھتا تو وہ ذکر مجھ کو اندر اطلاع کرتا کہ "آپ کے بھائی تھانیدار صاحب آئے ہیں"۔ میں اور میرے گھر والے "بھائی" کی نسبت کو تو تعلقات کی بنا پر صادق آتا سمجھ لیتے۔ لیکن "تھانیدار" کا عہدہ ان کو کیونکر ملا۔ یہ کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ آخر ہم نے مفاہمت کے طور پر فرض کر لیا تھا کہ شوکت کی شان سے اس نے یہ عہدہ تفویض کر دیا ہوگا۔ لیکن ایک عرصہ کے بعد اس حقیقت کا انکشاف اس طرح ہوا کہ شوکت صاحب جب پہلی بار آئے تو انہوں نے خانساماں کے بہرے پن سے واقف ہو کر مجھے اطلاع کرانے کی غرض سے ایک پرچہ پر اپنا نام لکھا اور اس نے جلدی میں "شوکت تھانوی" کو "تھانیدار" پڑھا۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

قول و قرار
عبدالحمید عدم

عدم کی غزلیں آج اس مقام پر ہیں کہ شعر سنتے ہی دل پر چوٹ پڑتی ہے اور ذہن اہتزاز محسوس کرنے لگتا ہے۔ حسن و جمال اور کیف و مستی کے اظہار میں عدم کا مرتبہ بہت بلند ہے اور قول و قرار میں وہ اپنے فن کے اوجِ کمال پر ہے۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے

جانِ عالم
عبدالحلیم شرر

اودھ کے مرحوم المقسمت آخری تاجدار واجد علی شاہ کے حالات روز بروز پردۂ اخفا میں آتے جاتے ہیں۔ اور ان کو بدنام کرنے کی کوششیں کامیاب ہوتی جا رہی ہیں۔ شرر مرحوم نے جو برس ہا برس ان کے ساتھ رہے ہیں مٹیا برج کے واقعات اور واجد علی شاہ کا کردار اس کتاب میں پیش کیا ہے۔ اس میں واجد علی شاہ کی خود نوشت سوانح عمری "حزنِ اختر" بھی شامل ہے۔ قیمت دو روپے چار آنے

رخسانہ
مترجم حبیب اشعر

دنیا کہتی ہے کہ طوائف نسوانیت کے دامن پر بدنما دھبہ ہے اس لئے کہ وہ چاندی کے چند ٹکڑوں کے عوض اپنا جسم بیچتی ہے لیکن منفلوطی ثابت کرتا ہے کہ طوائف نسوانیت کا سرتاج ہے۔ یہ دلچسپ اور دلدوز داستان "رخسانہ" میں ملاحظہ فرمائیے۔ قیمت دو روپے

پندرہ اگست
رشید اختر ندوی

۱۵ اگست ۱۹۴۷ء جب مشرقی پنجاب خون میں نہایا ہوا تھا مسلمانوں کے لہو سے ہولی کھیلی جا رہی تھی۔ رشید اختر ندوی نے ہزاروں لاکھوں انسانوں کے خون میں قلم ڈبو کر یہ ناول لکھا۔ اور جن لوگوں نے فسادات کے یہ مناظر نہیں دیکھے تھے ان کو یہ کتاب پڑھنے کی دعوت دی۔ قتل و غارت گری کی ایسی ہولناک تصویر اگر مجموعی طور پر نظر آتی ہے تو اسی ناول میں۔ قیمت تین روپے

بُری بات
انتظار حسین

"بری بات" کو ناول کے رنگ میں لکھ کر یہ اتنی بڑی حقیقت سامنے لے آئے ہیں کہ انگشت بدنداں ہونا پڑتا ہے۔ بری بات کہنے کا جو ڈھنگ انھوں نے اختیار کیا ہے وہ زندگی کی بسیط معلومات اور صدیوں کے انسانی تجربہ پر مبنی ہے۔ ان کی تحریر کا بے ساختہ پن اور خلوص ناول نگاری میں ایک نئے باب کی بسم اللہ ہے۔ قیمت دو روپے

پانچ ناولٹ
مرتبہ سید وقار عظیم

لکھنے والے:- ۱۔ سعادت حسن منٹو۔ ۲۔ شوکت تھانوی۔ ۳۔ اے حمید۔ ۴۔ انتظار حسین۔ ۵۔ اشفاق احمد

ان پانچوں فنکاروں نے ایسے ایسے معرکے کے ناولٹ لکھے ہیں جو ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ یہ کتاب "نقوش" کے "ناولٹ نمبر" کے طور پر پیش کی جا چکی ہے۔ قیمت تین روپے

تصانیف شوکت تھانوی

سسرال یہ ناول اتنا دلچسپ اور لطیف ہے کہ اسے پڑھ کر ذہن جھوم جھوم اٹھتا ہے۔ اور خواہش پیدا ہوتی ہے کہ خدا سب کو ایسی ہی سسرال بخشے۔ لیکن اس کتاب کا ہیرو تو مرپیر رکھ کر بھاگا ہے۔ عجیب بات ہے۔ قیمت دو روپے چار آنے

مضامین شوکت اگر کوئی شخص صرف شوکت تھانوی کی کتابوں کا مطالعہ کرتا رہے تو وہ اور کچھ بنے یا نہ بنے زبان دان تو بن ہی جاتا ہے۔ آب کوثر سے دھلی ہوئی صاف زبان۔ پلاٹ کی دلآویزی شگفتہ و لطیف پیرایۂ بیان۔ یہ ہیں وہ خصوصیات جو شوکت تھانوی کے آرٹ کو زندۂ جاوید بنائے ہوئے ہیں۔ مضامین شوکت میں جو مضامین شامل ہیں وہ ہمیشہ زندہ رہنے والے ہیں۔
قیمت دو روپے آٹھ آنے

غنڈالہ اس ناول میں مزاح تو ہے ہی۔ اس لئے کہ اس کو شوکت تھانوی نے لکھا ہے مگر مزاح کے علاوہ کچھ اور بھی ہے۔ کچھ کشمکش۔ کچھ جدوجہد۔ کچھ سراغرسانی۔ اور کچھ مقامات حیرت و استعجاب۔ شوکت تھانوی اپنے اس ناول میں کچھ نئے نئے سے۔ کچھ بدلے بدلے سے۔ کچھ اپنے محور سے ہٹے ہوئے سے نظر آتے ہیں۔ اور یہی انوکھا پن اس ناول کی جان ہے۔ قیمت چھ روپے

قاضی جی (دو حصے) ریڈیو سننے والے "قاضی جی" سے بخوبی واقف ہوں گے۔ ریڈیو پر قاضی جی ہر ہفتہ ایک نئے روپ میں آتے ہیں اور پھر سننے والے ان کے فقرے یاد کرتے رہ جاتے ہیں۔ شوکت تھانوی نے انہی تمثیلوں کو دو حصوں میں مرتب کیا ہے۔ قیمت فی حصہ ساڑھے تین روپے

جوڑ توڑ جوڑنا ایک مستقل کام ہے۔ توڑنا ایک دوسرا مستقل کام ہے۔ پھر توڑ کر جوڑنا اور جوڑ کر پھر توڑنا یا اللہ یہ سلسلہ کبھی ختم بھی ہو سکتا ہے یا نہیں۔ اس کا اندازہ کرنے کے لئے شوکت تھانوی کا ناول "جوڑ توڑ" ملاحظہ فرمائیے۔ جب تک یہ ناول آپ کے مطالعہ میں رہے گا آپ اس کے پلاٹ میں گم اور ہر فکر دنیا اور غم روزگار سے آزاد رہیں گے۔ قیمت چار روپے

سودیشی ریل شوکت تھانوی نے اپنی تمام مزاحیہ کائنات کا نچوڑ اس مجموعہ میں یکجا کر دیا ہے۔ پرانے مضامین سے اپنے شاہکار خود منتخب کئے ہیں۔ اور نئے مضامین بھی اپنے ہی انتخاب سے شریک کئے ہیں۔ مصنف کا خود اپنا انتخاب کیا ہو سکتا ہے اس کی آئینہ دار یہ کتاب ہے۔ قیمت تین روپے

وغیرہ وغیرہ شوکت تھانوی کے ایسے مضامین کا مجموعہ ہے جن میں ہنسی کی ایسی پھلجھڑیاں چھوڑی گئی ہیں جن سے قہقہوں کی چنگاریاں رہتی دنیا تک برستی رہیں گی۔ قیمت تین روپے

کارٹون شوکت تھانوی کارٹونسٹ ہیں اس لئے کہ ان کے ایک لاجواب مزاحیہ ناول کا نام کارٹون ہے۔ اس ناول میں شوکت کا قلم کہیں بھی آورد کا شکار نہیں ہوا ہے۔ وہی رواں اور سبک۔ وہی بے ساختہ اور بے تکلف مزاح۔ شروع سے آخر تک تبسم کی موجوں کا جال بچھاتا چلا گیا ہے۔ جو اس منفرد مزاح نگار کا طرۂ امتیاز ہے۔ قیمت تین روپے آٹھ آنے

ان کے علاوہ ہر قسم کی علمی۔ ادبی۔ تاریخی کتب ہم سے طلب فرمائیے ہم آپ کو محصول ڈاک کی رعایت بھی دیں گے،

اِدارۂ فروغِ اُردو ۰ ۱۱۔ مال روڈ — لاہور

۱۔ ڈی۔ ۱۱۔ ایبک روڈ۔ انارکلی


دِن بدِن
صاف اور حسین جلد
آپ کے لئے بھی ریکسونا کا کیڈل
یہ جادو جگا سکتا ہے
ریکسونا کے کیڈل سے مالامال
جھاگ کو اپنی جلد پر نرمی سے ملئے
اور پھر دھو ڈالئے پھر دیکھئے آپ کی جلد
دن بدن نرم اور ملائم ہوتی جائے گی جس سے
آپ کا حسن درخشاں ہو جائے گا
ریکسونا
کیڈل آمیز واحد صابن
جلد کو ملائم کرنے اور مقوی جلد
تیلوں کے ایک خاص مرکب کا کیمیائی نام ہے


"مَیں جانتی ہوں
لکس ٹائلیٹ صابن آپ کی جلد
زیادہ دلکش بنائے گا"
— ثریا
ثریا کہتی ہیں: "اس خالص و سفید صابن کی دلفریب خوشبو میری جلد میں بس جاتی ہے۔ آپ بھی اپنی جلد نہایت ملائم اور خوبصورت بنانے کیلئے لکس ٹائلیٹ صابن استعمال کیجئے"
LUX
TOILET SOAP
لکس
ٹائلیٹ صابن
فلمی ستاروں کا
حسن بخش صابن
کتنا سفید، کتنا خالص، کتنا خوشبودار

نقاشِ فطرت حضرت ایم اسلم کے غیر فانی ناول!

اِس عظیم فنکار نے جس خوبی کے ساتھ یہ بے حد مفید اور انتہائی دلچسپ اصلاحی ناول لکھے ہیں پاکستان و ہند کے تمام بلند پایہ نقادوں اور مشاہیر ادب نے ان کی بہت زیادہ تعریف کی ہے۔ دل کی گہرائیوں میں پیوست ہو جانے والے ان ناولوں کو بڑے اہتمام سے نہایت دیدہ زیب صورت میں شائع کیا گیا ہے۔ ہر طبقہ کے لاکھوں علم دوست اور ادب نواز خواتین و حضرات ان دلکش ناولوں کو بڑے شوق سے پڑھتے ہیں۔ زندگی کی پُر فریب رنگینیوں میں پاکیزگی پیدا کرنے کے لئے آپ ان اثر انگیز ناولوں کا ضرور مطالعہ فرمائیں۔

تیغِ ابدالی } احمد شاہ ابدالی نے کل ۳۰ ہزار فوج سے مرہٹوں کی تین لاکھ سپاہ کو پانی پت کے میدان میں ایسی شکستِ فاش دی کہ پھر یہ قوم آج تک نہ ابھر سکی اور اُس کی لوٹ مار کی داستانیں بھی ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئیں۔ پُر جوش اور ولولہ انگیز تاریخی ناول۔ قیمت پانچ روپے آٹھ آنے ۸/۵

فاتحِ قسطنطنیہ } سلطان محمد ثانی نے حضور اکرم صلعم کی پیش گوئی کو ایک ۲۱ سالہ مسلمان کا قسطنطنیہ پر قبضہ ہو گا حرف بحرف پوری کر کے دکھا دی۔ سلطان کی ترکی بحری بیڑے کو خشکی پر سے گزار کر آبنائے باسفورس میں ڈال دینا ایک عظیم اور محیر العقول کارنامہ ہے۔ دنیا کو محوِ حیرت کر دینے والا عظیم تاریخی ناول۔ قیمت پانچ روپے ۔ ۔ ۔ ۔ ۵/

جوئے خون یا حسینۂ شام } ان مشہور خونی معرکوں کے پُر جوش مناظر جو ارضِ شام و فلسطین میں ہرقل قیصرِ روم کی فوجوں کے ساتھ متواتر ہوتے رہے اور حضرت خالدؓ کے محیر العقول جنگی کارنامے انتہائی دلچسپ رومان کے ساتھ۔ قیمت چار روپے ۸/۴

خونِ شہیداں } یہ ایمان افروز ناول ان سرفروشانِ اسلام کے عظیم کارناموں کی یاد دلاتا ہے جنہوں نے محض رضائے الٰہی کی خاطر سسلی کے کفر خیز میدانوں میں ہنسی خوشی جانیں قربان کر دیں۔ بڑا ہی ولولہ انگیز اور دلچسپ ناول۔ قیمت ۸/۴

فتنۂ تاتار } تاتاری سردار ہلاکو خاں نے خلیفہ مستعصم باللہ کی عیاشی و بے تدبیری اور مسلمان اکابرینِ سلطنت کی ہوسِ اقتدار کے لئے باہم آویزش اور سازشوں کے سبب خلافتِ عباسیہ کو ختم کر ڈالا اور ایشیا کے حسین ترین شہر بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ فاضل مصنف نے تاریخِ اسلام کا ایک المناک مگر عبرتناک اسلامی دور پیش کیا ہے۔ ہماری قوم کے ہر فرد

کو معلوم ہونا چاہیے۔ عظیم تاریخی ناول۔ قیمت پانچ روپے آٹھ آنے ۸/۵

پاسبانِ حرم } اس انتہائی دلچسپ ناول میں جنگِ قادسیہ کا وہ معرکہ دکھایا گیا ہے جس میں ہلال نامی ایک مسلمان جانباز نے ایرانی سپہ سالار رستم کا سر قلم کر کے کفار کو شکستِ فاش دی تھی۔ قیمت چار روپے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۴/

مردِ غازی } دکن کی اسلامی سلطنت بیجاپور اور ہندو ریاست وجیانگر کی جنگِ حق و باطل میں ایک ترکی جانباز کے حیرت انگیز کارنامے۔ قیمت ۸/۲

ضربِ مجاہد } ایک جانباز مجاہد کے کارنامے۔ جو طرابلس کے حکمران جارجری کو قتل کر کے اور شکست دے کر اس کی حسین و جمیل شہزادی انعام میں حاصل کرتا ہے۔ قیمت تین روپے ۳/

معرکۂ بدر } یہ اُن ۳۱۳ مسلمان جانبازوں کے جنگی کارناموں کی ولولہ خیز داستان ہے جنہوں نے حضور صلعم کی سرکردگی میں بے سر و سامانی کے باوجود تائیدِ ایزدی سے ایک ہزار مسلح کفار کو میدانِ بدر میں شکستِ فاش دے کر تاریخ کا رُخ بدل دیا۔ ہجرت سے لے کر فتحِ بدر تک کے تمام واقعات بڑے ہی دلچسپ انداز سے پیش کئے گئے ہیں۔ قیمت صرف چار روپے ۸/۴

رنگیلا تاجدار } محمد شاہ رنگیلا تاجدارِ ہند اور اس دور کے مسلمانوں کی عیش کوشی اور عاقبت نا اندیشی اور عیش پرستی سلطنت کی تباہی اور مسلمانوں کی بربادی کا کیسے موجب بنی۔ اس عبرتناک اور انتہائی دلچسپ رنگین ناول میں اس کا نقشہ نہایت عمدگی سے دکھایا گیا ہے۔ تاکہ موجودہ مسلمان ان غلطیوں کے اعادہ سے باز رہیں۔ قیمت ۸/۵ زیرِ طبع

زوالِ الحمرا } وہ معرکۃ الآرا تاریخی ناول جس میں اندلس کے آخری مسلمان تاجدار کی تباہی و بربادی کا عبرتناک نقشہ سچے واقعات کی روشنی میں کچھ ایسے مؤثر انداز سے دکھایا گیا ہے کہ ہر درد مند مسلمان اسے پڑھ کر تڑپ اٹھے گا اور اپنی اخلاقی پستی اور قومی کمزوریوں پر ہزار لعنت بھیجے گا۔ بڑا دلچسپ اور دلگداز ناول۔ قیمت چار روپے ۔ ۔ ۔ ۴/ زیرِ طبع

مہدی } سرزمینِ مصر کا زبردست تاریخی ناول جس میں ملتِ اسلامی کی شوکت و عظمت اور سرفروشوں کی جنگِ آزادی کی پوری داستان درج ہے۔ مہدی اور مجاہدینِ اسلام کے شاندار کارنامے جو صداقت کا بول بالا کرتے ہیں۔ قیمت پانچ روپے زیرِ طبع

رقصِ ابلیس } قیامِ پاکستان پر مشرقی پنجاب میں بے بس نہتے مسلمانوں کے بے دریغ قتلِ عام کی دردناک داستان۔ قیمت صرف چار روپے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ للعہ

خونِ مسلم } خونی انقلاب ۱۹۴۷ء پر درد ناک اور عبرت افروز مضامین اور سچے تاریخی افسانے۔ قیمت ۸/۲

دریتوبہ } ایک غلط کار حسین لڑکی کی رنگین مزاجیوں جوانی کی شوخیوں، حول کی بیباکیوں اور حسن و عشق کی عاقبت نا اندیشیوں کی وہ خوبصورت کہانی جس کا لفظ لفظ پڑھنے والے کو تخیل کی ایک خوبصورت دنیا میں پہنچا دیگا۔ آخر میں نیکی و بدی کی جنگ جس میں نیکی کی فتح ہوتی ہے۔ قیمت تین روپے آٹھ آنے

چراغِ محفل } دو سہیلیوں کی ارمان بھری زندگی کا پُر لطف اور حیرت انگیز و دلچسپ ناول۔ قیمت پانچ روپے

ریحانہ } ایک آزادی پسند دوشیزہ کی بے حد دلچسپ آپ بیتی۔ حیات جس کا ہر باب آپ کے خیالوں میں ہی [illegible]

فرنگن } ایک مل تعلیم یافتہ نوجوان کا ایک آوارہ مزاج ولایتی فرنگن سے شادی کرنے کا عبرتناک انجام۔ قیمت [illegible]

میری کہانی } ایک البیلا ارمان حسین اور خوبصورت بیگم بہ سلسلہ زندگی کا نہایت مؤثر قصہ بیان کیا گیا ہے۔ نئی طرز کا بے حد دلکش ناول۔ قیمت [illegible]

خونِ مزدور، اشتراکی نوجوانوں کی سرگرمیاں اور کارگزاریاں۔ سادہ لوح مزدوروں کو کس طرح یہ لوگ مرعوب کرتے اور ان سے اپنا مطلب پورا کرکے انہیں حکومت اور عوام کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتے ہیں اور اپنی عیاریوں سے کس طرح ان کا گلا گھونٹتے ہیں۔ سرمایہ پرستوں کے دغا فریب اور اشتراکی لیڈروں کی ہوس پرستیوں کی عبرت انگیز اور بےحد دلچسپ کہانی۔ قیمت [illegible]

بیسوی صدی ایک غم کردہ راہ حسینہ کی دلچسپ داستان حیات جسے [illegible] اختیار کرنے پر بھی زندگی میں سکون نصیب ہوا۔ قیمت چھ روپے آٹھ آنے۔ قیمت [illegible]

ساون جس طرح ساون کی گھنگھور گھٹائیں کھیتوں کو سرسبز و شاداب کرتی اور قلب کو گرماتی ہیں۔ اسی طرح سراپا رنگین شاہکار کشتِ محبت کو سیراب کرتا ہے۔ ایک مفلس حسین اور خوددار دوشیزہ اور ایک امیر نکر نیک نوجوان کی محبت کی دلچسپ کہانی۔ قیمت پانچ روپے ...... [illegible]

خوابِ جوانی ایک دو لوح حسین دوشیزہ کا ایک بدچلن عیار کے جنگل میں پھنس کر صاف بےداغ نکل جانا۔ رونگٹے کھڑے کر دینے والا ناول [illegible]

پی کہاں ایک حسین افسانہ نگار دوشیزہ اور ایک نوجوان افسانہ نگار کا دلچسپ قصۂ محبت۔ قیمت [illegible]

چشمِ لیلیٰ نشیلی اور رس بھری آنکھوں والی لیلیٰ ایک سیاح کو اپنے جاں نواز نغموں کے ساتھ اپنی نہایت دلچسپ داستانِ محبت سناتی ہے۔ قیمت چھ روپے آٹھ آنے [illegible]

فریادِ خاموش ایک دیہاتی دوشیزہ کی رنگین زندگی کا دلچسپ قصہ جو ناتجربہ کاری کے سبب اپنی شاندار زندگی برباد کر لیتی ہے۔ قیمت پانچ روپے [illegible]

اشکِ ندامت کالج کی ایک شوخ و شنگ دوشیزہ کی عبرتناک داستان جو فلمی زندگی اپنا کر اپنی دنیا تباہ کر لیتی ہے۔ قیمت تین روپے آٹھ آنے [illegible]

شفق ایک رنگین مزاج لڑکی اور ایک حسن پرست نوجوان جو کالج میں اکٹھے پڑھتے ہیں کی عبرتناک داستانِ محبت۔ قیمت تین روپے آٹھ آنے ...... [illegible]

شمسہ مغربی تہذیب و تمدن کی ایک فریب خوردہ حسینہ کی بےحد دلچسپ آپ بیتی۔ قیمت [illegible]

شام و سحر حسن و الفت کی دلچسپ داستان اور جوانی کی بےراہ روی کا عبرتناک [illegible] قیمت [illegible]

آخری رات بےپردگی اور عریانی، اصل میں زندگی بسر کرنے کا خوفناک انجام۔ قیمت [illegible]

ساز و نیاز نہایت خوبصورت طوائف اور ایک نوجوان امیرزادے کی محبت کا قصہ۔ معرکۃ الآرا ناول۔ قیمت [illegible]

ہیر رانجھا اردو زبان میں سرزمینِ پنجاب کی زندہ جاوید داستانِ عشق۔ قیمت دو روپے [illegible]

رقصِ بہار دلچسپ ناول۔ اگر اس کے مطالعہ سے خزاں دیدہ دلوں میں بہار آ جائے تو رقصِ بہار نام نہیں۔ قیمت صرف چار روپے [illegible]

میٹھی باتیں ایک جدت پسند لڑکی کی داستانِ حیات جو اپنی تیز رفتار زندگی کا پر سکون لبادہ اتار کر اپنی حیات کے لیے نئے صبح و شام پیدا کرتی ہے۔ قیمت [illegible]

سوزِ عشق ایک خوبصورت اندھے نوجوان اور دیہاتی الھڑ حسینہ کی درد بھری داستانِ محبت۔ اندھے کا صبر ضبط قابلِ مثال ہے۔ قیمت چار روپے [illegible]

رام کلی

ٹھکر عورت کی گذشتہ بےچارگی اور موجودہ بیداری کی عکاسی۔ عجیب غریب ناول۔ قیمت ... ۲/۸

حسنِ سوگوار گذشتہ جنگ چین جاپان میں چینی جانبازوں کی سرفروشانہ جدوجہد اور ایک وطن پرست چینی محبوبہ کا رومان۔ قیمت تین روپے آٹھ آنے ... [illegible]

طلسمِ سامری اس دلچسپ جاسوسی ناول میں نازی روس کے خونچکاں مظالم کی داستان دلکش انداز میں لکھی گئی ہے۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے .... [illegible]

جہنم ایک مفلس نوجوان اور ایک نادار لڑکی کا صدا انگیز رومان۔ قیمت چار روپے .. [illegible]

شامِ غریباں ایک نہایت دلچسپ اور پاکیزہ رومان جس میں غریبوں کی زندگی کی سچی تصویر۔ قیمت صرف تین روپے ..... [illegible]

دوشیزۂ پاکستان تین پاکستانی شریف گھرانوں کی حسین دوشیزہ لڑکیوں کی عجیب دلچسپ اور سنسنی خیز داستان بڑا رنگین مگر پاکیزہ اور شاندار ناول۔ قیمت -/۶

پڑوسن ایک ایسا دلآویز ناول جس کی کہانی کا ہر ایک افسانے کا پلاٹ [illegible]

ممتاز ایک شریف خاندان کی سوشل زندگی کا آئینہ پیش کی گئی ہے کہ سخت گیر والدین اور سنسنی خیز واقعات میں ایک ایسی کشمکش پیدا ہو گئی ہے جس سے سدی داستانِ عشق و محبت شرافت حماقت اور غیرت خودداری کی کشمکش کا حسین مرقع بن گئی ہے۔ بڑا دلچسپ زندہ جاوید ناول۔ قیمت [illegible]

راوی کے رومان پنجاب کی زرخیز فضا سے متاثر ہو کر یہ بےحد رنگین و دلچسپ افسانے ترتیب دیے گئے ہیں جن میں محبت اور جذبات کے طوفان اٹھتے نظر آتے ہیں اور پڑھنے والے پر وجد کا عالم طاری ہو جاتا ہے۔ قیمت تین روپے آٹھ آنے [illegible]

رین ترنگ ہار یہ انتہائی دلچسپ افسانے پھولوں کی پتیوں کی طرح نازک، چاندنی کی کرنوں کی طرح لطیف، شفق کے گلابی آنچلوں کی طرح دلآویز اور حسین ہونٹوں کی غیر محسوس مسکراہٹوں کی طرح پراسرار ہیں۔ قیمت [illegible]

قاتل ان دلکش افسانوں کے بیان میں [illegible] روانی، ان کی زبان میں [illegible] اسلوب میں بہار [illegible] اور سمندروں کی سی گہرائی ہے [illegible]

بادۂ گل رنگ ان رنگین افسانوں میں [illegible] زندگی کے اسرار کو بےنقاب کیا گیا ہے۔ ہر افسانہ عبرت کا مرقع اور درد کی تصویر ہے۔ قیمت [illegible]

ایم اسلم اور اس کا ادب

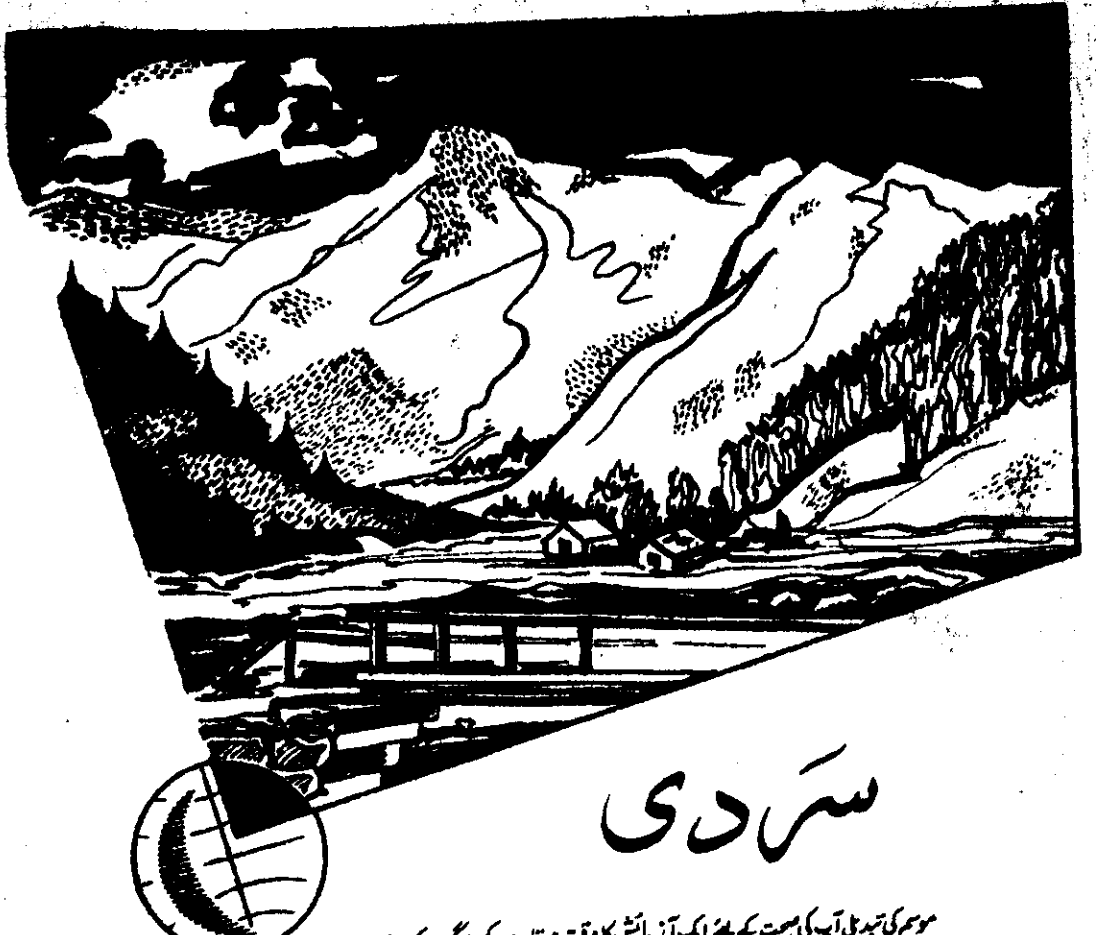
اس لاجواب کتاب میں پاکستان و ہند کے ۱۶ چوٹی کے نقادوں اور مشاہیرِ اردو کے شاندار مقالات ہیں۔ جن میں جناب ایم اسلم کی زندگی، شخصیت و کردار اور ان کے ادب و فن پر ناقدانہ بحث کی گئی ہے۔ ایم اسلم کے پرستاروں کے لئے لاجواب تحفہ اور مخالفین کے لئے دندان شکن جواب۔ قیمت چار روپے [illegible]

بچوں کے لئے ایم اسلم کی ۱۲

اخلاق آموز اور دلچسپ کتابوں کا سٹ

قیمت فی سٹ ... تین روپے آٹھ آنے۔ ۳/۸

ابنِ مسلم سلطان حیدر جوش کا معرکۃ الآرا تاریخی ناول جس میں ایک جوان عربی [illegible] نے اسلامی جہاد و حریت کی بےمثال داستان پیش کی [illegible]



سردی

موسم کی تبدیلی آپ کی صحت کے لئے ایک آزمائش کا وقت ہوتا ہے۔ کچھ لوگوں کے لئے جاڑے کی آمد بحالیٔ صحت کا پیغام لاتی ہے۔ لیکن جو لوگ صحت کے اصولوں سے غفلت برتیں اُن کے لئے یہی صحت بخش موسم جو افزائشِ خون کا زمانہ ہے افزائشِ بلغم کا بہانہ بن جاتا ہے اور طرح طرح کے عوارض میں مبتلا رکھتا ہے۔ نزلہ۔ زکام اور کھانسی اس موسم کی عام بیماریاں ہیں جو رفتہ رفتہ اعضائے تنفس کی خرابی۔ ضعفِ دماغ اور ضعفِ اعصاب کا سبب بن جاتی ہیں یا اس سے بھی زیادہ شدید صورت اختیار کر لیتی ہیں۔

یہ موسم آپ زیادہ تر مکان کے اندر ہی بسر کرتے ہیں۔ لہٰذا مکان۔ صحن اور اُس کے گرد و نواح کی صفائی کا خاص خیال رکھیں۔ تنگ و تاریک گوشوں سے چیزیں ہٹائیں تاکہ مچھروں کو پناہ نہ مل سکے۔ سردی سے گھبرا کر صبح کی سیر اور غسل ترک نہ کریں اور جہاں تک ہو سکے گرم کپڑے پہنیں۔ غذا گرمیوں کے مقابلے میں شیریں۔ مقوّی اور مرغن کھا سکتے ہیں۔ سوتے وقت کھڑکیاں اور روشندان کھُلے رکھئے اور منہ ڈھک کر ہرگز نہ سوئیے۔

اس کے علاوہ ہمدرد کی سُعالین اور صدوری کا استعمال کیجئے یہ آپ کو اس موسم کی عام تکالیف سے محفوظ رکھے گا۔

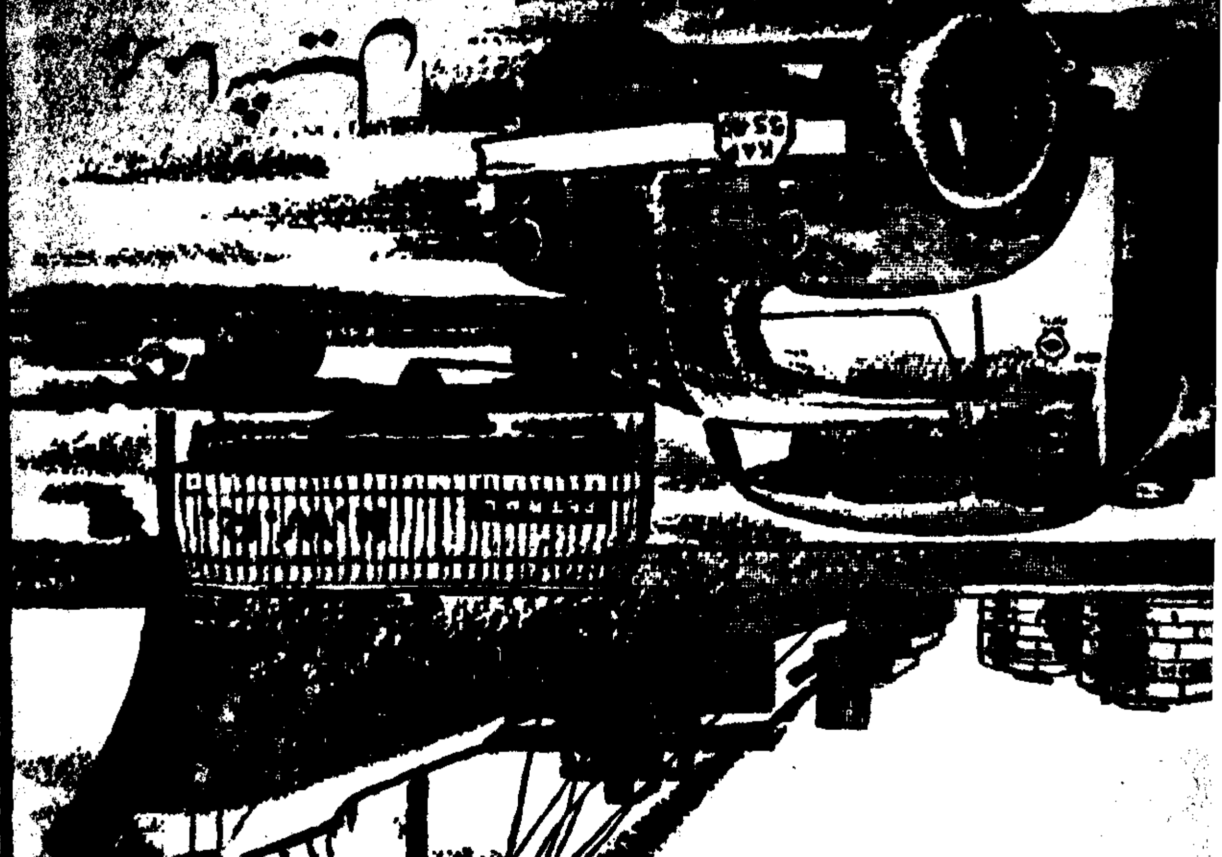
ہمدرد کا نصب العین انسانوں کی صحیح طریقِ زندگی کی طرف رہنمائی کرنا ہے۔

ہمدرد (پاکستان)

کراچی ڈھاکہ لاہور


بچوں کو ہر روز گندگی کے
جراثیم سے بیماری کا خطرہ
رہتا ہے۔
لائف بوائے سے ان جراثیم کو
ان کے جسم سے دھو کر ہر روز
ان کی حفاظت کیجیے۔
لائف بوائے کا "محافظ
جھاگ" ان کی تندرستی کی
حفاظت کرتا ہے۔
لائف بوائے
صابن
ہر روز کی گندگی کے جراثیم سے
آپ کی حفاظت کرتا ہے
LIFEBUOY
SOAP

[illegible]



[illegible]

[illegible]

[illegible]


فوراً جھاگ دینے والا سن لائٹ صابن
کپڑے پٹکے بغیر سفید اور اُجلے دھوتا ہے
کپڑوں کو پٹک کر اپنے آپ کو کیوں تھکانا چاہتے ہیں جبکہ سن لائٹ کا فوری
جھاگ اسی کام کو نصف وقت میں کرتا ہے۔ اور پھر کس خوبی سے کپڑوں کو
منٹوں میں آپ کے سفید کپڑے
شفاف اور رنگین کپڑے چمکدار ہو جائیں گے۔ اگر آپ چاہتی ہیں
کہ آپ کے کپڑے زیادہ دنوں تک کام دیں تو آپ آج ہی سے
سن لائٹ صابن کا استعمال شروع کر دیجئے۔
SUNLIGHT SOAP


خالص ڈالڈا صحت کی حفاظت کرتا ہے۔
اپنے خاندان کی صحت کی نگہبانی ڈالڈا کو کرنے دیجئے۔
ڈالڈا نہایت صحت بخش خالص روغن ہے جو آپ خرید سکتی ہیں!
ڈالڈا خریدتے وقت آپ کو یقین ہوتا ہے کہ پکوان کے لئے یہ نہایت ہی قابل اعتماد روغن ہے جو کہ بہترین اجزاء سے تیار کیا گیا ہے۔ بغیر ہاتھوں کے چھوئے ڈالڈا آپ کو ہمیشہ مہر بند ڈبہ میں تازہ و خالص ملتا ہے۔ یاد رکھئے ڈالڈا تمام پکوان کیلئے بہترین ہے۔ آج ہی ڈالڈا کا ڈبہ خریدئیے یہ نہایت کم خرچ بھی ہے۔
صرف تاڑ کے درخت کے نشان والے ڈبے میں خالص ڈالڈا ملتا ہے۔
DALDA VANASPATI
ڈالڈا
وناسپتی

[illegible]



[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] ○

[illegible] ○

[illegible] ○

[illegible] ○

ہماری کتابیں

اُردو شاعری

دستِ صبا	فیض احمد فیض	۳/-
نقشِ فریادی	"	۱/۸
شعلۂ گل	احمد ندیم قاسمی	۵/-
گنجینہ	یاس یگانہ چنگیزی	۲/۸
سُرخ ستارہ	سردار جعفری	-/۱۲/-

پنجابی شاعری

ترنجن	احمد راہی	۲/-
نویں رُت	امرتا پریتم	(زیر طبع)

انتقاد

میں ادیب کیسے بنا	میکسم گورکی	۱/۴/-
پاکستان میں قومی زبانوں کا مسئلہ	فیروز الدین منصور	-/۶/-
مارکسزم اور لسانیات	اسٹالین	-/۱۰/-
مودودیات	فیروز الدین منصور	۱/۴/-
ابن سینا (انگریزی)	"	-/۶/-

سیاست و سماج

انسان کا عروج	رضیہ سجاد ظہیر	۲/۸/-
دنیا کی کہانی	ظفر اللہ پوشنی	۱/۸
گناہ اور سائنس	ڈائی سن کارٹر	۲/۸
جو مر نہ سکے	عبد اللہ ملک	۲/-
مارکسی فلسفہ	اسٹالن	-/۱۲/-
زمین اور آدمی	ایم۔ ایلین	-/۶/-
دولت مشترکہ اور پاکستان	شوکت علی	-/۴/-
انارکزم یا سوشلزم	اسٹالین	۱/-
اخبار نویس	سمورف	۱/۴/-
سوویٹ یونین کا دستور اساسی	فیروز الدین منصور	-/۱۲/-
سوویٹ روس	مالن کوف	۱/۸/-
سوویٹ یونین میں سوشلزم کے معاشی مسائل	اسٹالین	۱/۴/-
اشتراکی جمہوریت	لینین	-/۶/-

زیرِ طبع

قدیم ناول

جامِ سرشار	رتن ناتھ
مشتاق و زہرہ	عاشق لکھنوی
کامنی	منشی گوہر علی

اُردو ادب

لندن کی ایک رات	سجاد ظہیر
ادبی یادیں	"
نقوشِ جاوداں	"
زندہ تصویریں	رضیہ ظہیر
نیا انسان	دستر ووسکی
کنول	ڈاکٹر تاثیر

پنجابی ادب

ہیر	وارث شاہ
نویں رُت	امرتا پریتم
کچے کوٹھے	سادار نیو

ا :- ہم ملکی اور غیر ملکی زبانوں کی ہر قسم کی کتب اور رسائل فراہم کر سکتے ہیں ؛

ب :- آپ کو جب بھی کسی کتاب یا رسالے کی ضرورت ہو تو ہمیں لکھئے ؛

ج :- اگر آپ لاہور میں ہیں ۔ تو فون پر آرڈر دیجئے ۔ آپ کی فرمائش قیام گاہ پر پہنچ جائیگی ؛

ادبی اور علمی کتابوں کا مرکز

الجدید

فون ۴۵۱۲ — ۳ نسبت روڈ ۔ لاہور

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

علمی، مذہبی، تاریخی، ادبی، اور اخلاقی کتابوں کا مرکز

مکتبۂ دانش ایبک روڈ لاہور

ہماری مطبوعات

لغات الاصلاح احسان دانش۔ اس کتاب میں ایسے پانچ ہزار غلط الفاظ کی تحقیق و تصحیح ہے جو روزمرہ بولے جاتے ہیں۔ اس عنوان پر پہلی اور اچھوتی کتاب ہے۔ قیمت مجلد ــــ ۴

دستور اردو احسان دانش، اس کتاب میں ان خامیوں کو اجاگر کیا گیا ہے جو ہماری عام گفتگو میں پائی جاتی ہیں اور جن کی طرف پڑھے لکھے لوگ بھی توجہ نہیں کرتے۔ قیمت ــــ ۲

اسلامی روایات کا تحفظ جمیل واسطی ایم۔ اے فاضل مصنف نے چند عنوانوں پر مفصل بحث کی ہے مسلمانوں کے موجودہ دور کی مکمل تشریح کی ہے پردہ اور تعدد ازدواج پر بھی دو بسیط مقالے اس کتاب کی زینت ہیں۔ قیمت مجلد ۳ــ۲

لغات احسان دانش، زندگی اور اس کے مختلف پہلوؤں پر تنقید و تبصرہ اور علم و عمل کے لئے بصیرت افروز اشارات۔ قیمت ــ ۴

تفسیر عروض احسان دانش، علم عروض کی باریکیوں اور پیچیدگیوں کا بہترین حل۔ قیمت ــ

زندگی کے جائزے ابوسعید بزمی ایم۔ اے مصنف کے واقعات و شاہکار [illegible]

خوابوں کے ویرانے مسعود جاوید، جدید افسانوی رعنائیوں کے ساتھ مفید اور معیاری ادب کا شاہکار، شروع سے آخر تک انداز بیان فحاشی اور عریانی کے دھبوں سے پاک ہے۔ قیمت مجلد ــ ۲

چاندنی کے سائے مسعود جاوید، ادبی اور افسانوی خطوط کا مجموعہ جو اپنی تحریری دلچسپی کے باعث ایک قابل قدر مجموعہ ہے قیمت ــ ۲

امثال قرآن مولانا محمد ایوب اصلاحی، قرآن کریم کی تمام امثال مشکلہ کی تشریح اور تحقیق اور ان پر مفصل بحث۔ قیمت ــ ۱

مشکلات القرآن ڈاکٹر اکبر اصلاحی، قرآن کریم کے اہم و مشکل مقامات کا آسان اور عام فہم اردو میں حل۔ قیمت ــ ۲

گلدستۂ سخن امرلی و مرشاد، مختلف شعراء کی بہترین غزلوں اور نظموں کا مجموعہ قیمت ــ ۱

تحریر قدرت احتشام الدین۔ علم قیافہ پر اردو زبان میں بے نظیر کتاب۔ قیمت ــ ۲ ــ ۱

ترکش توقیر طاہر، مختلف شعرائے ہند و پاکستان کے جدید و قدیم شعراء کے اشعار کا بہترین مجموعہ۔ قیمت

جام جم باقی صدیقی۔ باقی صدیقی کی غزلوں اور نظموں کا مجموعہ۔ قیمت ــ ۱

ناقوس راج بلدیو راج، راج کی غزلوں اور نظموں کا مجموعہ۔ قیمت ــ ۱

جوش حیات جاوید
عشق و عاشقی
شکایات
زخم و مرہم
جادۂ نو
کوہستان

دوسری مطبوعات

روح ادب جوش ملیح آبادی
عرش و فرش
حرف و حکایت
بیت و تکبیر
نقش و نگار
جنون و حکمت
آیات و نغمات
شاعر کی دنیا
زمزمۂ حیات سراج الدین ظفر
سنگ و خشت
کلیات سہیل
پیام نو
نغمۂ فردوس شکیل بدایونی
حدیث دیگراں
ساحل و سمندر
نیا سبیل
بیاض مریم
پیام

تاریخ، ادب، افسانہ اور ناول

انیس منیر
باقیات غالب
سرمایۂ تغزل
حیات نامۂ علم
مقدمۂ شعر و شاعری
روح عصر اختر انصاری
خطبات مولانا محمد علی / رئیس احمد جعفری
تعلیمات کے زاویے
شاہراہ پہلے
مشرقی وسطیٰ کا معاشی جائزہ
پاکستان کا معاشی جائزہ
تجارت پاکستان
منشور اقوام متحدہ
مجاہد سرائیکی عبدالوہاب
روح، روشن مستقبل
اقبال اور دیگر
شبلی نامہ شیخ محمد اکرام
غبار خاطر ابوالکلام
قول فیصل
اقبال امام ادب / رئیس احمد جعفری
مقالات ماجد / عبدالماجد دریابادی

مطالعۂ غالب
ادب اور سماج
تحقیق و تنقید
خواتین دکن
خوشبو کی دنیا / عبدالمالک آروی
مضامین مالک
مقام محمود
مولانا آزاد
نغمۂ خداوندی
تاریخ اسلام
خطبات عبیداللہ سندھی
مسلمان اندلس میں / رشید اختر ندوی
اورنگ زیب
محمود غزنوی
احمد شاہ ابدالی رئیس احمد جعفری
حیات محمد علی جناح
حیات قائد اعظم
محبوب خدا چوہدری افضل حق
دین اسلام
جواہرات
داستان مجاہد نسیم حجازی
خاک و خون
محمد بن قاسم
آخری چٹان
خاتون

تصویر۔ مسعود کاظمی	۲
شاہد۔ شفیقہ حسینی	۲
سیتا اور بھاگ۔ خلیل جبران	۱
رشک و تبسم "	۲
پاگل "	۱
ان داتا۔ کرشن چندر	۲
پل کے سائے میں "	۲
ہم وحشی ہیں	۲
محلے۔ احمد ندیم قاسمی	۲
آبلے "	۲
آس پاس "	۲
طلوع و غروب "	۲
سناٹا	۲
چپ۔ ممتاز مفتی	۲
اسمارائیں "	۲
ان کہی "	۲
اے اللہ۔ ہاجرہ مسرور	۲
چرکے	۲
پبلک سیفٹی ریزرو۔ ابراہیم جلیس	۲
دو ملک ایک کہانی	۲
جیل کے دن جیل کی راتیں	۲
آزاد غلام "	۲
زرد ایک منٹ "	۱
پاکستان کو حد بیکاری "	۲
گرگٹ۔ راجندر سنگھ بیدی	۳
[illegible]	۳
[illegible]۔ حضرت حسین	۲
[illegible]۔ اختر	۱
[illegible]	۲
[illegible]	۲

اشارے۔ طاہرہ میر	۲
داویاں۔ ساغر نظامی	۵
عورت مرد۔ خلیق ابراہیم	۱
دھرتی کے آنسو۔ ساغر صدیقی	۲
اندھیرے۔ مقدس صہبائی	۲
فیصلہ۔ امین شیدا	۳
چھو۔ ساغر نظامی	۵
جہاں میں رہتا ہوں	۳
خوش انجام۔ سید الحق	۱
بنفشہ کا پھول۔ جیراں	۱
آگ راگ۔ رشید نظامی	۲
گل رخ۔ رشید اختر	۲
ریڈیو ڈرامے۔ اختر	۱
نکتے۔ طاہرہ میر	۱
چناکے۔ نسیم	۱

اسلامیات

تاریخ اسلام۔ عبد اللہ بخاری	۱۲ — ۸
سیرت رسول۔ مولانا عاشق الٰہی	۴
محبوب خدا۔ چودھری افضل حق	۲
علم الکلام۔ مولانا محمد ادریس	۲
عقائد الاسلام "	۲
" " جلد دوم	۲
حیات عیسیٰ "	۱۵
حجیت حدیث "	۳
ختم نبوت "	[illegible]
معارف القرآن "	[illegible]
ایک قرآن۔ [illegible]	۲
سیرت [illegible]	۲
تعلیمات اسلام [illegible]	۲

[illegible]	۱
علم و عرفان [illegible]	۲
تحفۃ [illegible]	۲
رسول اکرم کی سیاسی زندگی۔ ڈاکٹر حمید اللہ	۵
کثرت الازدواج	۱۴
حکومت الٰہیہ۔ [illegible] جعفری	۳
اسلام کا نظام سیاست و حکومت	۲
اسلام کا نظام حیات [illegible]	۲
اسلام کے پہلے اصول۔ عبد الواحد سندھی	۳
اسلام کے پہلے [illegible]	۱
اسلام کیسے شروع ہوا۔ عبد الواحد سندھی	۱۲
اسلامی خطبات	۲
نیچریت	۲
اسلام کے معاشی [illegible]	۲
الدین القیم۔ مناظر احسن گیلانی	۲
اسلام اور عورت [illegible]	۲
اسلام کے [illegible] اصول۔ فرید وجدی	۳
اطمینان قلب	۱
جنت کی کنجی	۲
دوزخ کا کھٹکا	۱
عہد نبوی میں نظام حکمرانی	۴
حیات طیبہ	۵
فتح المجاہدین	۱۵
خلفائے راشدین	۲
حکایات صحابہ	۲
تاریخ اندلس	۲
[illegible] صحابیات	۱

[illegible]